جلد سوم

پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا

بلوچستان

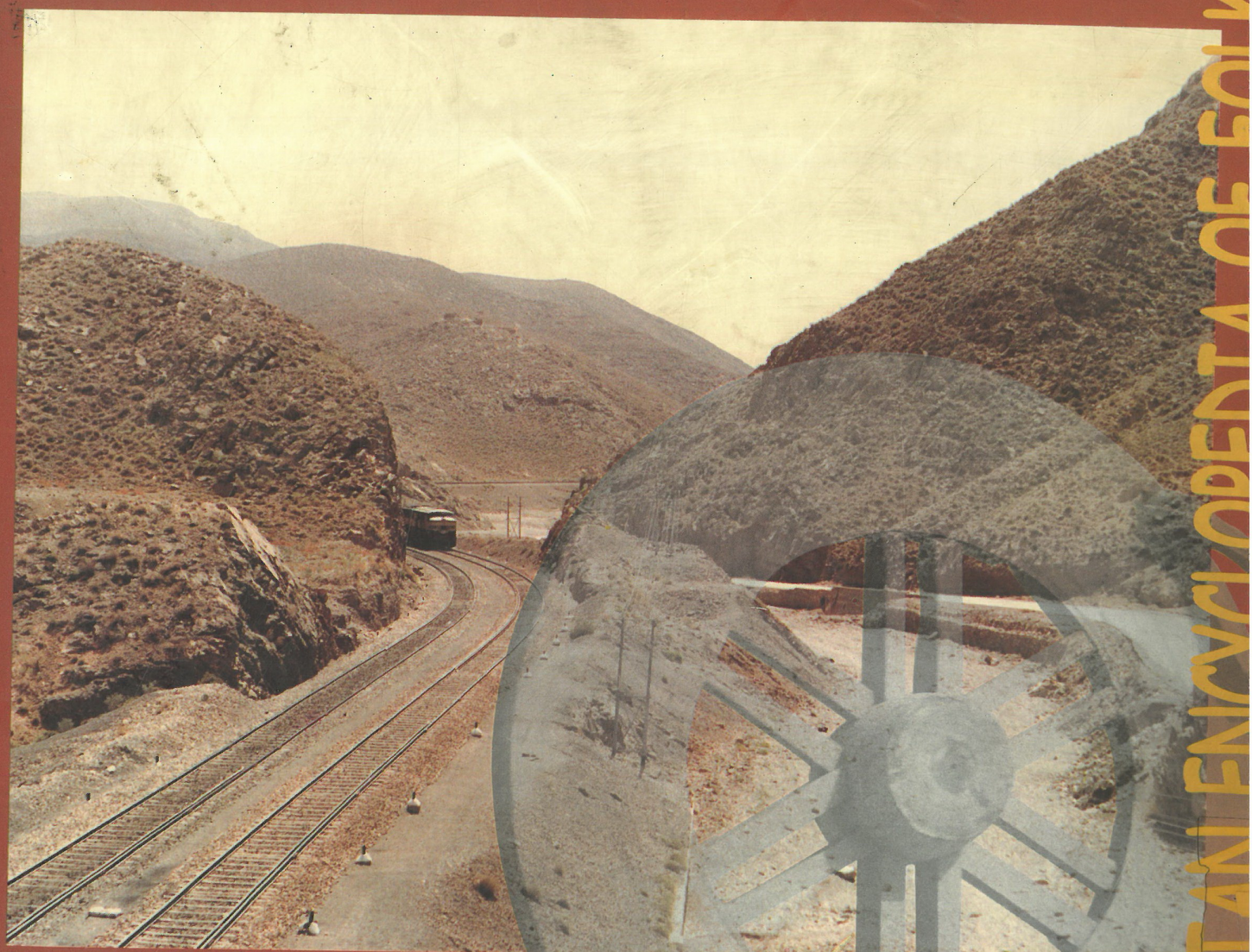

PAKISTANI ENCYCLOPEDIA OF FOLKLORE

BALOCHISTAN

الفیصل

ادارہ ثقافت اسلامیہ
IRSA

جلد سوم

پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا

صوبہ بلوچستان

8845

زیر اہتمام

مشترکہ اشاعتی پروگرام

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

DATA ENTRED

© Lok Virsa, Islamabad 2008

PAKISTAN ENCYCLOPEDIA OF FOLKLORE
BALOCHISTAN

All rights reserved - part of this Encyclopedia may be reproduced in any form without permission in writing from the Publisher, except by a reviewer who wishes to quote brief passages in connection with review written for inclusion in magazine or newspaper.

Executive Editor/Publisher
Uxi Mufti

Joint Editor
Dr. Inam Ul Haq Kasar
Dr. Ali Kamail Qazalbash

Panel of Contributors

Ghous Buksh Sabir — Balochi Portion
Dr. Ali kamail Qazalbash — Pushtoon Portion
Aabid Mir — Brahwee Portion

Title Photo: Mujahid Awais

A joint venture of
Lok Virsa, Islamabad
and
Al-Faial Nashran, Lahore,
in five volumes
NWFP, Sindh, Balochistan, Punjab and Karakorum Region

Sold and distributed in Pakistan by
Al-Faial Nashran, Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore,
Ph: 92-042-7230777
E.Mail: alfaisal_pk@hotmail.com
Lok Virsa, Garden Avenue,
Islamabad, Pakistan.
Ph:+92-051-9252097

فہرست

۱۔ دیباچہ.....i

۲۔ فوک لور اور ثقافتی اقدار کا شعور

عکسی مفتی.....vi

حصہ اول:

بلوچستان کے کوہسار.....1

دربار اور زیارتیں.....1

آبشار، ہامون سراندہ.....2

بندرگاہیں.....4

آثار قدیمہ، کھنڈرات.....7

آبادی، پیشے، تجارت، مکران کے شہر اور قصبات.....9

مکران میں پرندے، مکران کے پہاڑی درندے.....10

درّہ بولان، وجہ تسمیہ، درہ مولا.....11

سبّی اور گاجان کا قلعہ.....12

بلوچستان کے غار.....15

بلوچستان میں خواتین و مردوں کے نام.....22

متفرق بلوچ قبائل.....33

ضلع ژوب کے قبائل.....37

گنداوہ.....39

آبادی کے اجزائے ترکیبی.....43

بلوچی ادب.....46

سلسلہ کوہ سلیمان، سلسلہ کوہ بروہی وسطی.....1

بلوچستان کی جھیلیں.....2

سون میانی، اوماڑہ، کلمت.....3

کوہ باتیل، ماہی گیروں اور کشتیوں کے نام.....6

گوادر: وجہ تسمیہ، حدود اربعہ، موسم.....8

چھوٹے چھوٹے شہر، پہاڑوں کے نام.....10

بلوچستان کے درّے.....11

بلوچستان کے قلعے.....12

قلعہ میری.....13

بلوچستان میں زیارات.....16

بلوچستان کے قبائل.....23

ضلع کوئٹہ پشین.....34

کیچ.....38

سیوی (سبی).....41

بلوچی زبان.....43

بلوچی لوک داستانیں.....47

DATA ENTRED

دستانگ.....95
بچوں کے گیت.....97
گھر، گرہستی.....103
تقریبات، شادی بیاہ کی رسمیں.....106
دیگر دستکاریاں، اُون کی بنی ہوئی چیزیں.....110
ہل چلانے اور بیج ڈالنے کے متعلقات.....111
ذخیرہ اور ناپ تول کے پیمانے.....112
چوپایوں کے باندھنے کے لیے مخصوص مقامات.....114
پہاڑوں اور بادل و بارش سے متعلق.....116

حصہ دوم:

تعارف، جغرافیہ.....121
آبادی کے اجزائے ترکیبی زبان اور بولی.....123
پنجی، بخاری، پہاڑی سلسلے.....132
جھالاوان کی دلچسپ مقامی خصوصیات.....134
درّے.....133
تاریخ خضدار کے بارے میں دلچسپ باتیں.....134
خضدار کے کچھ معروف مقامات.....135
جھالاوان کی دھرتی پر عجیب و غریب چیزیں.....136
براہوی علاقوں کی قدیمی و تاریخی اہمیت.....137
عورتوں اور مردوں کے نام.....141
حالیہ وقتوں میں رکھے گئے اسلامی نام.....142
نامور شخصیات.....144
رسم و رواج.....145
نکاح کے مراحل.....159
تدفین کے مراحل.....166
مرگ سے متعلق توہمات و متروک شدہ رسوم.....170
غسل و کفن کا خصوصی اہتمام.....171
تدفین کے وقت سے متعلق توہمات.....171
روایتی پکوان.....173
سازینے و آلاتِ موسیقی.....97
لوک کھیل.....100
رسم و رواج.....104
کشیدہ کاری.....107
زمین داری کے متعلقات.....111
چمڑے سے بنی ہوئی اشیاء.....112
مالداری اور گلہ بانی.....113
جانوروں کے امراض، زمین سے متعلق.....115
ہوائیں اور موسم.....117
براہویوں کا ماخذ.....122
مختلف قبائل.....124
درے، دریائی اور نہری سلسلے.....133
خضدار شہر و قلعہ کی منظر کشی.....134
جڑی بوٹیاں.....134
خضدار کی سرزمین پر جھیل کی باتیں.....135
خضدار شہر کی آب و ہوا اور ماحول.....136
جنگل میں سفید ہرن کے آثار.....137
چرند پرند.....140
جگہوں اور علاقوں کے نام.....143
مردوں کے نام.....144
علمی و ثقافتی شخصیات.....144
شادی بیاہ کی رسومات.....153
موت کی رسمیں.....164
سوگ اور ماتم.....167
متوفی کی قسمت محفوظ کرنے کا طریقہ.....170
ماتمی لباس کی قسمیں.....172
غمّی کے پکوان، عمومی دسترخوان، خصوصی دسترخوان.....173
گھریلو استعمال کے برتن.....175

گھر، عمارات اور روزمرہ استعمال کی اشیاء..... 174
چمڑے کی بنی ہوئی اشیاء..... 178
روٹی کی قسمیں..... 179
لوک علاج، دم درود، ٹونے ٹوٹکے..... 181
توہم پرستی..... 182
خیرات وصدقہ..... 183
دوڑی، چن اُتارنا..... 194
پیروں فقیروں کے مزارات، عرس اور میلے..... 196
اولاد، شاہوانی پیر، مائی فاطمہ مستوئن..... 202
لڑکوں کے کھیل..... 214
لڑکیوں کے کھیل..... 221
سوتیلی ماں اور سوکن، مقولے..... 223
لوک گیت..... 225
لوک ساز..... 228
لوک کہانیاں..... 231
دوسری کہانی ''انتقام''..... 233
چوتھی کہانی ''واپسی''..... 239

حصہ سوم:

تعارف..... 249
کوئٹہ کا تاریخی قلعہ..... 251
کاریزات، پھل اور سبزیاں..... 253
لائبریریاں، تعلیمی ادارے..... 254
شعروموسیقی..... 262
شخصیات، رہن سہن، لباس..... 264
شادی، بیاہ کی رسمیں..... 267
موت کی رسمیں..... 276
مسافر کی آمد، زیارات پر آمدورفت..... 278
محرم سے متعلق عقائد..... 280
خوشی کے تہوار..... 283
اشیائے ساختہ..... 177
پتھر کی بنی ہوئی اشیاء، اشیائے خوردونوش..... 179
کھجور، شکار اور دیگر متعلقات..... 181
جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج معالجہ..... 182
تعویز، گنڈا اور جادوٹونہ..... 183
بددعائیں..... 192
جانوروں کے امراض اور ان کے علاج..... 195
درویشوں کی تدفین، درویشوں کے مزار..... 196
براہویوں کے ہاں پیری فقیری..... 197
اشیاء کھیل..... 216
مردوں کے کھیل..... 221
لوری..... 224
لوک ناچ..... 227
براہوی کہاوتیں..... 228
پہلی کہانی ''جگ بیتی''..... 231
تیسری کہانی ''آپ بیتی''..... 236
پانچویں کہانی ''بہادر خان کی سرگزشت''..... 244
کوئٹہ..... 251
پہاڑ..... 252
سیرگاہیں..... 253
اکادمیاں اور ثقافتی ادارے..... 255
فنون ودستکاریاں..... 262
عورتوں اور مردوں کے نام..... 267
پیدائش کے رسمیں..... 275
سفر کی رسمیں..... 277
مذہبی تہوار..... 279
دس بیبیوں کی کہانی..... 281
میل جول کے آداب..... 284

سرراہ، تعویذ گنڈے..... 285
کھیل ومشاغل..... 286
ندیاں، مقامی صنعتیں، معدنیات..... 306
تحصیل دکی، رسم ورواج..... 307
آب وہوا..... 310
شیرانی..... 311
کوژک کا پہاڑ..... 313
قائداعظم ریزیڈینسی..... 314
پشتون قبائل کی تشکیل..... 314
معروف شخصیات..... 323
لباس..... 327
زیورات..... 328
وادہ (شادہ بیاہ)، ھوکڑہ..... 331
لوبی (کھیل)..... 337
موت کی رسمیں..... 343
میلے اور تہوار..... 350
لوک ادب..... 362
محاورے..... 365
دوڑے (مہمل باتیں)..... 366
سیاہ دیو..... 373
تین اندھے..... 375
گائیکی..... 378
طرزِ تعمیر..... 379
ٹونے ٹوٹکے..... 381
جانوروں کا علاج معالجہ..... 384
حوالہ جاتی کتب (حصہ اول)..... 389
کتابیات (حصہ دوم)..... 390
کتابیات (حصہ سوم)..... 392
ہفتے کے ایام..... 286
لوک قصے کہانیاں..... 288
علم وادب، ثقافت..... 307
شادی کی رسومات..... 307
کوہ سلیمان..... 311
پشین..... 312
زیارت، تفریحی مقامات..... 313
قلعہ سیف اللہ، قلعہ عبداللہ..... 314
مختصر تاریخ اور سردار خیل..... 321
پیدائش کی رسومات..... 323
خواتین کا لباس، پڑونے..... 329
لباس کی قدریں..... 328
شادی، رقص وموسیقی..... 333
توہمات وشگون..... 339
قدریں..... 343
پشتو ادب..... 351
لوک کہاوتیں..... 364
کیسئ (پہیلیاں)..... 365
لوک کہانیاں اور داستانیں..... 366
نیکی اور بدی..... 373
گائیکی، موسیقی اور آلاتِ موسیقی..... 377
آلاتِ موسیقی..... 378
گھریلو استعمال کی اشیاء..... 379
لوک علاج معالجہ..... 381
مصنفین / کنٹری بیوٹرز کا تعارف..... 383

دیباچہ

پاکستان 14، اگست 1947ء کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ وہ علاقے جو آج مملکت پاکستان کا حصہ ہیں نہ صرف دنیا کی قدیم ترین تہذیب وثقافت کے وارث ہیں بلکہ موہنجوداڑو، ٹیکسلا، ہڑپہ اور گندھارا جیسی ہزاروں سالہ قدیم تہذیب وتمدن کے نقوش اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جو طویل سیاسی جدوجہد اور نظریاتی بنیادوں پر قائم ہوا۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا خواب دیکھا اور قائداعظم محمد علی جناح نے اسے تعبیر دی۔ مگر وہ خواب اور تعبیر ہماری منزل نہیں، یہ منزل پر پہنچنے کا راستہ تھا۔ اُس خواب کو حقیقت میں بدلنے اور منزل پر پہنچنے کے لئے اس دھرتی اور اس مٹی سے پھوٹنے والی لوک ریت اور روایات کے اُن راستوں کو اختیار کرنا ہوگا جو ہمارے اسلاف کا خاصہ تھیں۔

پاکستانی تہذیب وتمدن قدیم وجدید کا حسین امتزاج ہے۔ اس علاقے میں اسلام کی آمد نے اس قدیم تمدن، اس کے تہذیبی اور فطرتِ انسانی اور اس کی روحانی قدروں کی نفی نہیں کی بلکہ ان قدروں کے ہم آہنگ اجزاء کو پروان چڑھایا، انہیں زندہ رہنے میں مدد دی اور پاکستانی تہذیب وثقافت کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پاکستانیوں کو ایک ایسی وحدت کی لڑی میں پرو دیا کہ آج پاکستان کا ہر علاقہ متنوع، رنگارنگ اور جداگانہ ثقافتی رنگ کے باوجود وحدت کی ایسی لڑی سے منسلک ہے جس کی آبیاری اسلامی روحانی قدروں سے ہوتی ہے۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں پاکستانی ثقافت کے ایسے اجزائے ترکیبی کے نقوش کی تفصیل دی گئی ہے جو اس سے قبل کبھی یکجا نہیں کیے گئے۔

لوک ورثہ نے پاکستان کے ثقافتی انسائیکلوپیڈیا کی تیاری میں برسہابرس صرف کیے ہیں۔ اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کے دشوار ترین علاقوں کا سفر کیا گیا بلکہ ہر علاقے کے لکھاریوں، دانا اور معتبر لوگوں کے ساتھ میٹنگ کر کے انہیں اس کام میں باقاعدہ شامل کر کے اسے موجودہ مقام تک پہنچایا گیا ہے۔ یہ کہنا کہ یہ کام مکمل ہو گیا ہے درست نہ ہوگا، ابھی اس میں مزید بہتری تصحیح واضافے کی بہت گنجائش ہے اور امید ہے کہ اس ماڈل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر علاقے کے لکھاری، دانشور اور محقق قلمی تعاون اور مشوروں سے نوازیں گے۔

ثقافتی انسائیکلوپیڈیا پر کام کے لیے ابتدائی طور پر چند رہنما اصول ترتیب دیئے گئے تھے جن کا مقصد لکھاری کو یہ سمجھانا تھا کہ یہ دیگر انسائیکلوپیڈیا سے فرق نوعیت کا کام ہے اور اس میں تاریخ اور جغرافیہ سے زیادہ فوک لور پر فوکس رکھنا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم اپنی اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس سلسلے میں لکھاری کی سہولت کے لئے درج ذیل گائیڈ لائن (رہنما اصول) ترتیب دیئے گئے تھے۔

علاقے کا نقشہ اور حدود اربعہ: علاقے کا ایک بہترین نقشہ جو ثقافتی شناخت اور اسکے مخصوص جغرافیائی خدوخال کو سامنے رکھ کر بنایا جائے جیسے ساندل بار، پوٹھوار، تھرپارکر اور چولستان کا نقشہ وغیرہ۔ جو علاقے کی مخصوص لسانی اور ثقافتی شناخت کی حد بندی کو واضح کرتا ہو۔ اور کچھ اعداد وشمار وغیرہ۔ شہروں اور قصبوں کے نام شمالاً جنوباً اور مشرق مغرب میں علاقے، دریا پہاڑ وغیرہ۔

جغرافیہ: جغرافیائی اعتبار سے صرف تین یا چار پیراگراف کافی ہونگے لیکن اس میں مقامی سطح پر چرند پرند، مشہور مقامات، جھیلیں، دربار، درگاہ، دریا، مزار، موسم، فصلیں، جڑی بوٹیاں، درخت اور مقامی خصوصیات وغیرہ۔ جغرافیے کا فوک لور کے حوالے سے بیان پرزور ہونا چاہیے جیسے سوہنی مہینوال کا دریائے چناب یا وارث شاہ کا ملکہ ہانس، ہیر رانجھے کا تخت ہزارہ اور دوسرے کئی طرح کے جغرافیائی ثقافتی حوالے۔

تاریخ: تاریخ کے بارے میں مختصراً دو یا تین پیراگراف ہوں۔ ان میں فوک لور کے پہلو کو نمایاں جگہ دی جائے مثلاً کسی مشہور قصے کے کرداروں کا ذکر، ادبی فنی ثقافتی، تاریخی شخصیات اور مقامات وغیرہ۔ انتہائی اہم تاریخی اور ضروری حوالے اگر ہوں تو انہیں مختصراً بیان کر دیا جائے۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی، زبان اور بولی: آبادی کے بارے میں پیراگراف میں نسلی اور لسانی معلومات درج کی جائیں جیسے بلوچ کافی تعداد میں ہیں۔ فلاں فلاں قبیلے اور فلاں فلاں زبانیں بولتے ہیں ان کے عادات وخصائل وغیرہ اور اعداد و شمار۔

ہر قبیلے پر ایک چھوٹا پیراگراف علیحدہ علیحدہ لکھیں اس کے علاوہ اگر علاقے میں خانہ بدوش قبیلے آتے ہوں تو انہیں بھی شامل کریں۔ قبیلوں اور زبانوں کا مختصر تاریخی پس منظر بیان کریں۔

مقامی خصوصیات: علاقے کی مشہور مخصوص ثقافتی شناخت کیا ہے۔ مشہور چیزیں مقامی خصوصیات کے زمرے میں آتی ہیں جیسے قصور بابا بلھے شاہ کی وجہ سے یا وہاں کے خاص کھانوں کی وجہ سے۔ اسی طرح اور علاقے مشہور ہیں جیسے کہیں جوتے اور کھیس مشہور ہوتے ہیں کہیں کوئی بہادر آدمی نے نام پیدا کیا ہوتا ہے وغیرہ۔ علاقے کی مخصوص شناخت یا نام کس بناء پر ہے، اس پر زور ہونا چاہیے۔

علاقے کی ثقافتی مشہور شخصیات جیسے دلا بھٹی، عالم لوہار، آدم خان، بالی جٹی، اور مشہور ادبی شخصیات جیسے وارث شاہ، خوشحال خان خٹک وغیرہ۔ ہر شخصیت اور اس کے ہنر یا پیشے کے متعلق الگ پیرگراف میں ذکر کریں۔

عورتوں اور مردوں کے نام:

مقامی کھانے: یہ باب مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔

۱۔ کھانے کے طریقے، اہم رسم ورواج اور آداب

۲۔ خاص خاص پکوان

۳۔ مہمانداری کے طریقے اور سلیقے

۴۔ مٹھائیاں، پھل اور مشروبات۔

۵۔ میزبانی کے طریقے اور اداب دسترخوان۔

مقامی کھانوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا جائے۔ ان کے اجزائے ترکیبی اور لوک روایت وغیرہ۔ صرف مقامی سطح کے کھانوں کے بارے میں جانکاری مہیا کی جائے جیسے ساگ، بھجی، مٹھائیاں، مشروبات اور دیگر چیزوں کے استعمال کے مقامی

طریقے، خوشی غمی کے خاص پکوان وغیرہ۔

روایتی تعمیر و آرائش اور رہن سہن: یہ باب مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہوگا۔

۱۔ لوگوں کا رہن سہن، گھر، تعمیر مکان، سامان آرائش، گھریلو سامان

۲۔ طرز تعمیر عمومی

۳۔ طرز تعمیر خصوصی

۴۔ دیگر تعمیرات کنویں، باولیاں، باغ، تالاب، کاریز، چوپال، حجرے، جھونپڑیاں، تنبو، وغیرہ۔

۵۔ علاقے کی اہم تاریخی اور ثقافتی عمارات وغیرہ۔

علاقے کی روایت، فن تعمیر اور آرائش کے بارے میں مکمل باب اہم چیزوں یا تعمیر کے نقشے اور تصویریں بھی مہیا کی جائیں۔ عمومی گھر کیسے ہیں، علاقے کے بڑے گھر تعمیراتی خصوصیات، حویلیاں وغیرہ۔ فن تعمیر کے مختلف فنون کی تفصیل، مثلاً لکڑی کا کام نقش گری، سجاوٹ کے دوسرے ہنر وغیرہ۔

عوامی پیشے اور دستکاریاں: مقامی اور روایتی پیشوں پر تفصیل سے ایک باب لکھیں جس میں مقامی ہنرمندوں، کمہار، نائی، موچی، اور دیگر پیشوں اور ان پیشوں سے وابستہ لوگوں کے بارے میں معلومات۔

مثلاً کس پیشے کے لوگ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں ان کا تاریخی پس منظر وغیرہ۔ متعلقہ ہنرمندوں میں پیشوں کے رجحان، اسباب وغیرہ۔ اور علاقے کی دستکاریوں پر الگ الگ پیراگراف لکھئے۔ اس کے علاوہ خواتین گھروں تک محدود ہو کر اگر کوئی ہنر جانتی ہوں اور کام کرتی ہوں تو اس پر معلومات درج کریں۔

رسم و رواج: رسومات اور رسم و رواج کے بارے میں تفصیلی باب جس میں

شادی بیاہ، پیدائش اور موت،

ختنہ کی رسم ان کے علاوہ متعلقہ علاقے کی خصوصی رسم مثلاً،

گھر میں داخل ہونے کی رسم،

چھوٹے بڑے کے بارے میں رسومات، آداب وغیرہ۔

حال دینا حال لینا، میل جول

دوستی و دشمنی کی رسومات

سفر پر جانے کی رسومات،

تعویذ باندھنے کی رسم اور اس طرح کی دیگر رسومات وغیرہ۔

مردوں عورتوں کی گھریلو ذمہ داریاں اور مشاغل

بوڑھوں، بزرگوں کے مشاغل،

بچوں کے مشاغل۔

لوک ساز، گیت اور ناچ: الگ پیرا گراف میں فن رقص و موسیقی اور سازوں کے بارے میں عمومی تعارف لکھیں پھر الگ ایک پیرا میں گیت۔ ناچ اور ساز پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔ یہ مقامی رقص اور موسیقی کے بارے میں مکمل باب ہو جس میں ہر ساز کے مقامی نام، مشہور رقص اور گیت اور کن تہواروں اور موقعوں پر یہ پیش کئے جاتے ہیں۔ مشہور گیتوں کے مختصر بول، سازوں اور ناچوں کی تصاویر بھی مہیا کریں۔

لوک داستانیں، کہانیاں، باتیں اور روایات: لوک داستانوں، کہانیوں، قصوں اور روایات کے بارے میں تفصیلی باب جس میں مشہور مقامی قصہ کہانیوں کا مختصر خلاصہ دیا جائے۔ مقامی اکھان اور رومان دیئے جائیں، واریں، جگ نامے، رزمیہ داستانیں بیان کی جائیں۔

لوک لباس اور زیورات اور دیگر سامان آرائش: لباس اور زیورات، عورتوں کے لباس:۔ اس باب میں زنانہ اور مردانہ، بچگانہ مقامی روایتی لباسوں کی قسمیں وہ کن خاص موقع پر پہنے جاتے ہیں، عام لباس کیا ہے، بنائے گئے زیورات اور لباس و آرائش کی تفصیلات وغیرہ۔

مردوں کے آرائشی لباس، اسلحہ جات، کلہاڑی، تلوار، ڈھال وغیرہ اور ان کے باندھنے کے طریقے یا دوسر کسی قسم کا آرائشی لباس و اسلحہ وغیرہ۔ عام لباس، مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کا لباس،

جانوروں کی آرائش اور زیورات جیسے بیل کے گلے میں پٹے، اونٹ اور گھوڑے کا سامان آرائش وغیرہ۔ بچوں کے لباس، عمومی لباس، خاص مواقع کے لباس۔

لوک علاج، دم درود اور ٹونے ٹوٹکے: لوک علاج مختلف بیماریوں کے لئے مقامی سماج کے علاج، جو کہ معمولی قسم کی جڑی بوٹیوں وغیرہ یا دم درود سے کئے جاتے ہوں، ٹونے ٹوٹکے لوک علاج کی روایت اور قصے کہانیاں وغیرہ۔ منتیں، پیری مریدی، ڈاکٹری، حکمت، سنیاسی علاج۔

عرس اور میلے: ایک باب جس میں چھوٹے بڑے میلے اور تہوار متروک قسم کے میلے، موسمی تہوار بھی موجود ہوں جیسے بیساکھی کا تہوار، اقلیتوں کے میلے، پنجہ صاحب کا میلہ، ایسٹر اور کرسمس وغیرہ۔ خانقاہوں، مزاروں کی تفصیل، ان کی انتظامیہ اور تنظیم کے بارے میں معلومات وغیرہ۔

جسمانی کھیل اور لوک تماشے: بچوں اور بڑوں کے مقامی کھیل اور مختلف لوک تماشے، جیسے نٹ، بازی گر وغیرہ۔ قدیم روایتی سانگی، لوک تھیٹر، نقال، بہروپئے۔ نیزہ بازی، کبڈی، کشتی وغیرہ۔

خواتین کے کھیل، اور مشاغل، چغل خوری، بدخوہیاں وغیرہ۔

انسائیکلو پیڈیا میں کوشش کی گئی ہے کہ ثقافت سے متعلق تمام ضروری معلومات مختصراً اور جامع انداز میں بیان کر دی جائیں۔ ساتھ ہی موضوع سے متعلق تصاویر بھی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قارئین کی سہولت کے لئے فہرست میں ذیلی عنوانات بمعہ صفحہ نمبر دیئے گئے ہیں جبکہ انسائیکلو پیڈیا کے آخر میں اُن تمام ماخذات کو لکھ دیا گیا ہے جن سے استفادہ کر کے کنٹری بیوٹرز نے انسائیکلو پیڈیا

ترتیب دیا۔

اس کام میں جن لکھاری نے ہماری معاونت کی، میں ذاتی طور پر اور ادارے کی جانب سے اُن کا بے حد ممنون ہوں۔ خاص طور پر بلوچستان کے دشوار گزار اور دور دراز علاقوں میں کام کرنا خاص طور پر ایسے علاقے جن سے متعلق آج تک کوئی تحریری مواد دستیاب نہیں، بے حد مشکل کام تھا، مگر یہ مشکل کام آپ سب کے تعاون خاص طور پر ڈاکٹر انعام الحق کوثر صاحب اور اُن کے معاونین جناب غوث بخش صابر صاحب، ڈاکٹر علی کمیل قزلباش صاحب اور جناب عابد میر صاحب خصوصی ستائش کے مستحق ہیں کہ اُن کی شب و روز محنت اور تعاون سے ہی ابتدائی مسودہ ترتیب پایا اور ثقافتی انسائیکلوپیڈیا کا بلوچستان والیم چھپ سکا۔

میں یہاں ایک بات کا خصوصاً ذکر کرنا چاہوں گا کہ یہ خالصتاً ثقافتی انسائیکلوپیڈیا ہے اور اسے ترتیب دینے کا ایک بڑا مقصد پاکستان میں بسنے والے لوگوں کی گرانقدر ثقافتی روایات کو محفوظ کرنا، ایک دوسرے سے روشناس کرانا اور آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنا ہے۔ مجھے علم ہے یہ کام ابھی مکمل نہیں یہ ایک بہت ابتدائی نوعیت کا کام ہوا ہے اور یقیناً اب بھی اس میں بہتری اور اضافے کی بڑی گنجائش ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ پاکستان بھر کے لکھاری خاص طور پر ثقافت کے حوالے سے لکھنے والے اس کام پر مثبت ردعمل کا اظہار کریں گے اور ثقافتی انسائیکلوپیڈیا کی دیگر جلدوں کے سلسلے میں ہمیں اُن کا قلمی تعاون حاصل رہے گا تاکہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا قومی وحدت کی علامت بن جائے اور دنیا جان سکے کہ پاکستانی اپنی منفرد، متنوع اور جداگانہ ثقافتوں کے باوجود محبت اور وحدت کی ایک مضبوط لڑی کا حصہ اور دنیا میں امن، محبت اور بھائی چارے کے فروغ کے پیامبر ہیں۔

عکسی مفتی

اپریل ۲۰۰۸ء

فوک لور اور ثقافتی اقدار کا شعور

ایسا کون ہے جسے زندگی اور موت، شادی بیاہ، غمی خوشی اور پیدائش وغیرہ کی عمومی رسومات کا علم نہ ہو یا وہ عشق و محبت کے گیتوں، بزرگوں اور سرکردہ لوگوں کے اقوال، شجاعت و بہادری کی لوک داستانوں، تعویز گنڈوں، عام سماجی زندگی کے طور طریقوں جن میں دوپٹہ رنگنا، ڈالی بھجوانا، تعویذ اور قیمتی پتھر پہننا، گھر کی دیواروں پر لپائی کرنا اور لوک میلوں وغیرہ سے واقف نہ ہو، ان سب باتوں کا ہماری لوک زندگی سے گہرا تعلق ہے اور یہ سب لوک ادب کے شعبے کے علم پر مبنی ہے۔

سب کو علم ہے کہ لوک داستانیں کیا ہیں ہم جبلی طور پر ان کے مفہوم سے آشنا ہیں۔ تاہم جیسے پانی میں مچھلی بغیر کسی کوشش کے رہتی اور تیرتی ہے اسی طرح ہم بھی شعوری طور اپنی لوک زندگی کا ادراک نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوک زندگی اور داستان کی باقاعدہ تعریف ایسی ہی ہے جیسے کسی سے خوراک و لباس کی افادیت معلوم کرنا۔ ایک فلسفی اگرچہ زندگی کی تعریف بتا کر لکھتا ہے تاہم ایک عام آدمی کو صرف زندگی گزارنے سے غرض ہے۔ چنانچہ وہ ان گتھیوں کو سلجھانے کے بجائے صرف اپنی زندگی گزار رہا ہے اور زندگی بہتے پانی کی طرح ایک مخصوص رفتار سے رواں دواں ہے۔

لوک زندگی کیا ہے؟

جب کوئی سماجی طبقہ کسی مخصوص جگہ پر صدیوں ایک مخصوص طرز سے زندگی گزارتا ہے تو اجتماعی زندگی کا ایک خاص انداز جنم لیتا ہے۔ یہ اجتماعی زندگی اپنے تمام سماجی رویوں، جذبات و احساسات کے ساتھ اس طبقے کی لوک یا عمومی زندگی کا مظہر ہوتی ہے۔ اسکی بیحد اہمیت ہے۔ ایک طرف تو لوک طرز زندگی کسی طبقے کی پہچان ہوتی ہے دوسری طرف وہ اسے دیگر طبقات سے ممتاز بناتی ہے اور اس طبقے کو ایک لڑی میں پروئے رکھتی ہے۔ مشترکہ لوک زندگی کے رویے انسانوں کو نہ صرف اکٹھا رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں بلکہ وابستگی کا احساس بھی فراہم کرتے ہیں۔ یہ احساس بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی کے دل میں خونی رشتوں کو دیکھ کر جاگتا ہے۔ ایک نظر نہ آنے والا فطری احساس جس کے تحت ایک طبقہ یا کمیونٹی اپنے افراد کو اس رشتے سے وابستہ رکھتی ہے۔ تاہم یہ وابستگی جبری یا شعوری نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ کسی سیاسی قومیت کے احساس کی مرہون منت ہوتی ہے۔ یہ ایک جبلی احساس ہے جو صدیوں کے ایک جیسے سماجی رویوں اور مشترکہ سوچ سے جنم لیتا ہے۔ اسکا وہی مقام ہے جو انسانی جسم میں خون کا ہے۔

ماضی کو محفوظ کرنے کے حوالے سے بھی لوک رویوں کا ایک اہم مقام ہے۔ اسی لئے انہیں مقبول ماضی یا گزشتہ ادوار کی اہم نشانیوں کا بھی نام دیا جاتا ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ چیزیں زیادہ دیر چلنے والی نہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہو جائیں گی۔ بعض لوگ انہیں توہمات کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ تاہم ان کے باقی رہنے یا بقاء کی صلاحیت کی وجہ سے انہیں زبانی یا سینہ بہ سینہ روایات کہا جاتا ہے جو باپ سے بیٹے کو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ لوک رویے یا طریقہ کار محض ادب یا لٹریچر ہے جو کہ زبانی منتقل ہوتا ہے۔ مگر یہ اپنی فہم کیلئے ان افراد کا مرہون منت ہے جو ادب اور لوک رواج دونوں کا علم رکھتے ہوں۔ دھوتی اور پگڑی باندھنے سے لیکر پختہ اینٹوں سے چنوارے کی تعمیر تک تمام چیزیں لوک ادب اور روایات کا حصہ ہیں۔

لوک رویوں کی زبانی ابلاغ سے تدوین وتبلیغ کی وجہ سے بعض لوگوں نے لوک داستانوں کو زبانی فن کا نام بھی دے دیا ہے۔ تاہم اسکی یہ تعریف تمام تر غیر زبانی چیزوں یعنی رقص، سوت کاتنا اور سماجی رسوم ورواج وغیرہ کا سہارا لیکر ہم پوری انسانی داستان بیان کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس مقصد کیلئے اپنے لاشعور کے پوشیدہ اور اعلیٰ وادنیٰ گوشوں کو کام میں لانا پڑے گا۔ انسانی ذہن کے بعض گہرے اور عمیق پہلوؤں کی سب سے بہتر نمائندگی لوک ادب ہی کرتا ہے۔ لوک ادب کی بڑائی یہ ہے کہ یہ معاشرے کی مجموعی عکاسی کرتا ہے۔

لوک طرز زندگی صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں نہ صرف سماجی زندگی کے رسوم و رواج ہیں بلکہ تمام علوم وفنون شامل ہیں۔ ان میں دریائے سندھ کی کشیدہ وکندہ کشتیاں، مال کوہستان کے ''جاج'' بلوچ شیشے کے کام والے لباس، سندھی اجرک، ہاتھ سے بنی لنگی اور اس قسم کی دیگر بہت سی اشیاء شامل ہیں۔

اسکے علاوہ، دھمال، جوگی کی بین، نٹوں کی ''جنکا حرکات''، بہروپیوں کے سوانگ، مداری کے تماشے اور سندھی ملاکھڑا بھی وادی سندھ کی لوک زندگی کا اہم جز ہے۔

کوئی ماں جب اپنے بچے کو لوری سناتی ہے، جب سکول کے بچوں کو کوئی بھارت بتائی جاتی ہے، جب کوئی قوال قوالی سناتا ہے، یا محفل سماع سجائی جاتی ہے، جب لوگ خوشی کے موقعوں پر گائے جانے والے سہرے اور گیت گاتے ہیں قصہ خواں، بھیراں اور میراثی لوک گیتوں کو چھیڑتے ہیں اور ماں اپنی بیٹی کو سینا پرونا اور کشیدہ کاری سکھاتی ہے، گاؤں کا لوہار اپنے کسی شاگرد کو اوزاروں کا استعمال سکھاتا ہے، کمہار بھٹے میں اینٹیں اور زرگر زیورات بناتا ہے تو ہمیں اُس لوک ریت کے عظیم الشان ورثے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے گزرتا وقت جس کی اہمیت کم نہیں کر سکا۔

لوک رسوم ورواج ایک طبقاتی مظہر ہے۔ یہ کسی ایک آدمی یا گروہ کی اختراع نہیں صدیوں پر محیط ایک مسلسل عمل کے بعد کہیں جا کر ساری انسانیت یا تمام تر طبقے کی نمائندہ ہوتی ہیں۔ تاہم ہمیں ایک فرق روا رکھنا ہوگا کہ غالب کی غزل یا چغتائی کی مصوری اپنی تمام تر مقبولیت کے باوجود لوک ریت کا حصہ نہیں۔ یہ ایک فرد کی اعلیٰ صلاحیتوں کی مظہر ضرور ہیں مگر ڈیرہ غازی خان کے چرواہوں کے گیت، داؤد کے چرواہوں کے نژبیت، پنجاب کی لڑکیوں کا سوت کاتتے ہوئے ترنجن گانے کا دلربا انداز، خوبصورت رنگوں سے مزین کیلنڈر، ٹرکوں اور تانگوں پر بنی اپنی نوعیت کی انوکھی تصویریں اور پشاور کے قصہ خوانی بازار میں چھیڑی گئی داستانیں سب ہی لوک ریت کے شاہکار ہیں، یہ اجتماعی زندگی کا حصہ اور لوگوں کے ایک گروہ کی تخلیق ہیں جو اس طبقے کے ہر فرد کا ورثہ ہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی کے کسی فن پارے کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کیلئے آرٹ کی باریکیوں کا علم اور غالب کی کسی غزل کو سمجھنے کیلئے موسیقی اور اردو ادب سے آشنائی ضروری ہے، بیگم اختر کی کسی غزل کی گائیگی سے لطف اندوز ہونے کیلئے اردو ادب اور کلاسیکی موسیقی دونوں کا علم چاہیے۔ مگر لوک ریت سے لطف اندوز ہونے کیلئے کسی تربیت یا رسمی تعلیم کی ضرورت نہیں یہ ایک خودرو یا قدرتی حس ہے جو بذات خود زندگی کے دامن سے پھوٹتی ہے۔

لوک ریت کی تخلیقات اگرچہ بے نام ہوتی ہیں تاہم وہ صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آنے والی روایات کی مظہر ہوتی ہیں۔ مگر ان کے پھیلاؤ کا طریقہ کار اور ان کا ماخذ ہمیشہ زبانی روایات پر مشتمل نہیں ہوتا، یہ بات وادی سندھ کے تہذیبی ورثے کے لئے زیادہ صحیح ہے۔

کوئی لوک گیت چاہے کسی ۱۸ ویں صدی کے صوفی شاعر کے قلم کی تخلیق ہو، وہ بھی موجودہ دور میں مکمل طور سے اپنا زبانی وجود برقرار رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح ہیر رانجھا، سسی پنوں اور سوہنی مہینوال جیسی معروف رومانی داستانیں جواب کتابوں میں بھی محفوظ ہیں مگر یہ کتابوں میں نہ بھی محفوظ ہوتیں تو ان کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ کیونکہ وہ زبانی روایات کی صورت لوگوں کے سینوں میں بھی محفوظ ہیں اور میراثی، بھات وغیرہ انہیں اکثر دھراتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کسی لوک داستان کو اسلام آباد یا کراچی میں کتابی شکل میں محفوظ کرنے کے باوجود بھی اس کی لوک اہمیت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

چنانچہ لوک ادب زیادہ تر زبانی روایات پر مشتمل ہے جس نے اسے جہاں پایا اور جیسا پایا محفوظ کرلیا۔ یہ صرف زبانی ادب نہیں بلکہ یہ انسان کی مادی نظریاتی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ چاہے کتاب کی شکل میں نمودار ہو مگر اُسے کتابی شکل میں منجمد نہیں ہونا چاہیے۔ یہ الفاظ پر مشتمل ہونے کے باوجود بھی انسانی زندگی کے دیگر ''غیر لفظی'' یعنی (non verbal) پہلوؤں پر محیط ہے۔ اسکی عظمت اس میں ہے کہ یہ انسان اور معاشرے کو ایک شناخت عطاء کرتا ہے اور انہیں مکمل کرتا ہے۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ تاہم نہ تو یہ مکمل طور سے صنعتی ہے اور نہ ہی جدید، اگرچہ اس میں تیزی سے تبدیلی آرہی ہے عجیب بات یہ ہے کہ کم ترقی یافتہ ہونے کے بعض اپنے فوائد ہیں۔ پاکستانی لوک ثقافت اب بھی ایک زندہ روایت ہے جس پر پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد عمل پیرا ہے اور جو عام آدمی کی زندگی کے تمام گوشوں میں بڑی نمایاں نظر آتی ہے مگر لوگوں کو اس لوک روایت کی شان وشوکت کا صحیح ادراک ہی نہیں۔

پاکستان کا لوک ادب صدیوں کی طبقاتی زندگی کا مظہر ہے۔ یہ کسی فرد یا گروہ کی اختراع نہیں بلکہ یہ صدیوں سے جاری بتدریج عمل اور معاشرے کے اجتماعی طور طریقوں کا عکاس ہے۔ یہ اپنے اندر انسانی زندگی کی حکمتوں کو سموئے ہوئے ہے۔ مگر یہ ماضی نہیں۔ بلکہ ماضی حال اور مستقبل میں اپنے ہونے کے شعور کا پرتو ہے۔ انسان نے شعور اور آگہی کی یہ منزلیں صدیوں میں طے کی ہیں۔ لوک رواج نہ صرف انسانوں کو مضبوط رشتوں میں باندھنے بلکہ ابلاغ عامہ کا ایک انتہائی اہم اور موثر ذریعہ بھی ہیں جسکی حقیقت سے پوری دنیا آگاہ ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں شرح خواندگی پاکستان جتنی کم ہو اور جسکی زیادہ تر آبادی کا انحصار زراعت پر ہو، لوک رواج ایسے معاشرے کے سماجی خدوخال وضع کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں اور انکی اہمیت ابلاغ کے دیگر ذرائع سے بہت زیادہ ہے۔

یہ حقیقت پاکستانی لوک ادب کو ایک عملی چیز بناتی ہے۔ یہ ایک زندہ ورثہ ہے یہ ورثے میں ملنے والی چیزوں نہ کہ وراثت پر مشتمل ہے۔ اس چیز کی نمایاں اہمیت ہے۔ ہمیں اپنے بارے میں شعور کو ہر چیز پر مقدم رکھنا چاہیے۔

نسلی، علاقائی اور جغرافیائی حقائق سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں اور پاکستان سندھی، بلوچی، پنجابی اور پٹھان پر مبنی ایک کثیر الجہتی معاشرے پر مشتمل ہے تاہم ان سب کو لوک روایات اور مشترکہ رسوم ورواج نے ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ اس کے برخلاف کچھ نظریاتی حقائق بھی ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ پاکستان ملت اسلامیہ کا ایک اہم رکن اور مشترکہ مذہبی اقدار پر مبنی ایک ملک ہے۔ یہ نظریہ کہ پاکستان کا علاقائی تہذیبی ورثہ یا د ماضی پر مشتمل ہے جو وقت کے ساتھ فنا ہو جائے گا اور نظریاتی بندھنوں اور دور جدید کی تیز رفتار سائنسی ترقی کا ساتھ نہیں دے پائے گا، غلط ثابت ہو چکا ہے۔

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ وقت کے ساتھ یہ معدوم ہونے کے بجائے ابھرتا ہے اور اکثر نو اہم اور طاقتور سیاسی ایشوز کی شکل اختیار کر لیتا ہے

جنہیں عیار سیاستدان اپنی مطلب برآئی کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

علاقائی کلچر کو دبانے اور مذہب اور قومیت کے نام پر انکی نفی کرنے سے اکثر بڑے گھمبیر مسائل جنم لیتے ہیں جن میں طبقاتی بے چینی اور سیاستدانوں کے ہاتھوں استحصال شامل ہیں۔ نیز اُنکے علاوہ علیحدگی پسند تحریکوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ سرائیکی صوبہ، سندھو دیش اور بلوچ اور پختونوں کی علیحدگی پسند تحریکیں بھی اسی کا شاخسانہ ہیں۔ من حیث القوم علاقائی تہذیبوں کے بارے میں ہمارا رویہ اور اپروچ منفی سوچ کی عکاس ہے جب تک یہ سوچ ایک روشن خیال اور متحرک سوچ میں تبدیل نہیں ہوتی اس وقت تک پاکستان کے سماجی منظر نامہ میں کوئی ڈرامائی تبدیلی ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں ملک کے بیشتر علاقائی سیاسی معاملات میں یہی تہذیبی بحران نظر آتا ہے۔ بہت سارے مسائل جنکا آج لوگوں کو سامنا ہے وہ سماجی و تہذیبی نوعیت کے ہیں۔

علاقائی تہذیبیں پاکستانیوں کے لئے ایک خوشگوار ہم آہنگی اور بھائی چارے والی چیز ثابت ہوسکتی ہیں۔ ان تہذیبوں کے تنوع میں ہی ہمیں ایک واحدانیت نظر آتی ہے اور یہی اسلامی ثقافت کی روح ہے۔ اسلام علاقائی اختلاف اور ان کے فرق کا خیال رکھتا ہے۔ پاکستان کے تہذیبی منظر نامہ میں اگرچہ کوئی حقیقی تصادم نہیں ہے جن چیزوں کو ہم Mutuchly exclusive سمجھتے آئے ہیں وہ درحقیقت ایک گہری واحدانیت کے پرتو ہیں جو علاقائی اور نظریاتی دونوں بنیادوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ جغرافیائی بھی ہیں اور نظریاتی بھی۔

انسان کے بے شمار مسائل اس وقت جنم لیتے ہیں جب فی زمانہ سوچ وفکر کے زاویوں کو الگ الگ خانوں میں رکھا جاتا ہے، مثلاً مادی جسم اور روح، زمینی اور الواحی، مادے اور توانائی وغیرہ کو مختلف مظاہر سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں اس وحدانیت کا حصہ سمجھا جائے جو خود انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ کہنا کہ بلوچ اور سندھی، پنجابی سے مختلف ہیں دراصل انکی کسی مخصوص جگہ سے وابستگی کی وجہ ہے۔ یہ درحقیقت اس کیفیت اور اضطراب کا ردعمل ہے جو معاشی ناہمواری اور سیاسی محرومی سے جنم لیتا ہے۔

ہمارے بے شمار مسائل کی وجہ انسانی اقدار کا خیال رکھے بغیر حاصل کی گئی غیر متوازن صنعتی ترقی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی گرانقدر روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے آپ کو روایت کی جڑوں سے علیحدہ کئے بغیر جدید خطوط پر استوار کریں۔

ہمیں نئے نظام اور نئے حالات کے مطابق اپنی گم شدہ روایات کا پتہ چلانا، انہیں قائم رکھنا، آنے والی نسلوں میں ثقافتی اقدار کا شعور اور ان کی اہمیت اجاگر کرنا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ہم یہاں پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا ترتیب دے کر فنون لطیفہ، صنعت وحرفت، اقتصادیات، مذہب، ادب یا معاشرتی وسماجی تاریخ نہیں لکھ رہے بلکہ ہماری کوشش ہے کہ اُن تجربات پر ایک نظر ڈالتے چلیں جو ہمارے تمدن، ہماری روایات اور ثقافت کی تشکیل کا سبب بنے۔ ہر چند کہ لوک ثقافت تاریخ سے جدا نہیں مگر یہ تاریخ نہیں، یہ ماضی کے ساتھ حال اور مستقبل بھی ہے، اور یہی اہم ہے کہ ہم اپنے فوک لور کو اپنے حال اور اپنے مستقبل سے ہم آہنگ کر کے آگے بڑھیں۔

عکسی مفتی

(عکسی مفتی کے انگریزی مضمون سے ترجمہ کیا گیا)

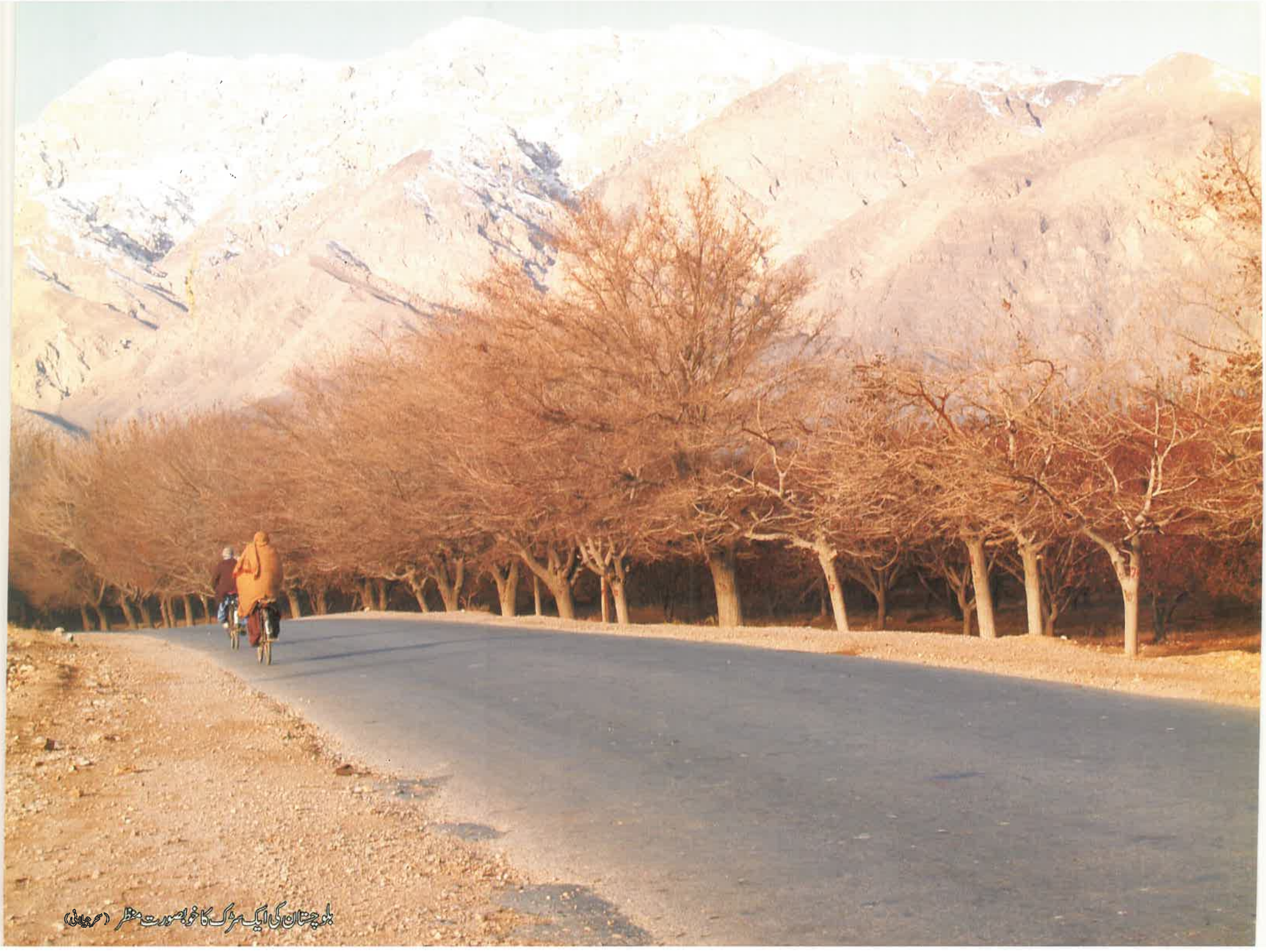

بلوچستان کی ایک سڑک کا خوبصورت منظر (سمر چاندنی)

بلوچستان

بلوچستان کے معنی ہیں بلوچوں کے رہنے کی جگہ جو رقبے کے اعتبار سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ تاہم رقبے کے لحاظ سے یہاں کی آبادی دوسرے صوبوں سے کم ہے۔ بلوچستان کے مشرق میں سندھ، مغرب میں ایران، شمال میں افغانستان اور جنوب میں بحیرہ عرب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ محل وقوع کی رو سے "24-54" اور "32-4" عرض البلد کے درمیان شمال کی جانب "6-56" اور "7-15" طول بلد کے درمیان مشرق کی سمت واقع ہے۔ بلوچستان کا کل رقبہ ایک لاکھ چونتیس ہزار دو مربع میل ہے جو سندھ، پنجاب سابق ریاست خیر پور اور سابق ریاست بہاولپور کے مجموعی رقبے کے برابر ہے جبکہ ماضی میں بلوچستان کا رقبہ دوگنا تھا۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں بلوچستان کو کمزور کرنے کیلئے کیچ مکران سے بندر عباس تک کے علاقے کو کاٹ کر ایران کے حوالے کیا۔ ڈیرہ غازی خان کو پنجاب، خان گڑھ (موجودہ جیکب آباد) کو سندھ کا حصہ بنایا۔ مورخین کی رائے ہے کہ اگر بلوچستان کے ماضی کو سامنے رکھا جائے تو رقبہ چونتیس لاکھ پنتالیس ہزار مربع میل ہوسکتا تھا۔ بلوچستان موجودہ وقت میں انتیس اضلاع میں منقسم ہے۔ جن کے نام اس طرح ہیں گوادر، کیچ، پنجگور، آواران، خضدار، قلات، لسبیلہ، نوشکی، چاغی، قلعہ عبداللہ، خاران، کوئٹہ، پشین، زیارت، بارکھان، مستونگ، لورالائی، ژوب، سبی، بولان، جھل مگسی، جعفر آباد، واشک، نصیر آباد، کوہلو، ڈیرہ بگٹی، قلعہ سیف اللہ اور موسیٰ خیل۔

بلوچستان جغرافیائی لحاظ سے قدرتی طور پر تین حصوں پر مشتمل ہے۔ کوہستانی، میدانی اور ساحلی۔ مشرق سے مغرب تک اور پھر جنوب مغرب طول و طویل کوہستان سے پٹا پڑا ہے جبکہ جنوب مشرقی علاقہ، جو کچھی سبی اور نصیر آباد پر مشتمل ہے، ایک وسیع و عریض میدانی علاقہ ہے جو زمانہ قدیم میں ناڑی بولان مولہ اور لہڑی کی پہاڑی ندیوں سے سیراب ہوا کرتا تھا۔ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں دریائے سندھ سے کیرتھر نہر نکال کر نصیر آباد کے بیشتر علاقوں کو آباد کیا، جبکہ حکومت پاکستان نے کشمور کے مقام پر دریائے سندھ سے ایک فیڈر نکال کر پٹ فیڈر میں لہڑی اور بھاگ کے علاقوں کو آباد کیا۔ بولان ندی پر پیرالہ یار شاہ کے مقام پر ایک بند باندھ کر پانی کو ذخیرہ کرنے کی کوشش کی، مگر 1987ء میں کوہستانی علاقوں کے سیلاب سے یہ بند ٹوٹ کر تباہ ہوگیا۔ بلوچستان کا دوسرا میدانی ریگستانی علاقہ بلوچستان کا شمال مغربی ضلع چاغی ہے، جو نوشکی سے دریائے ہلمند، گرم سیل اور سیستان تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ بے آب و گیاہ صحرا، صحرائے سیستان ایران کا ایک حصہ ہے۔ جس میں عظیم صحرائے لوط واقع ہے۔ یہ تمام علاقہ خشک اور بنجر ہے۔ ریگستان میں آبنوشی کیلئے کنوئیں کھودے جاتے ہیں، جنہیں مقامی زبان میں ناوڑ کہتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کی توجہ زیادہ تر اونٹ پالنے پر ہے۔

بلوچستان کے کوہسار

سلسلہ کوہ سلیمان: یہ کوہستانی سلسلہ دریائے گومل اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے، جو بلوچستان کو پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے سے جدا کرتا ہے۔ یہ کوہستانی سلسلہ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے بلوچ اور پشتونوں میں حد فاصل ہے۔ اس کی طوالت دوسو پچاس میل اور رخ شمالاً جنوباً ہے۔ سب سے اونچی چوٹی "تخت سلیمان" ہے۔ جو گیارہ ہزار دوسو بانوے فٹ اونچی ہے۔

سلسلہ کوہ بروہی وسطی: کوہ بروہی وسطی کا سلسلہ ساراوان اور جھالاوان مشرق اور جنوب مشرقی سمت شمالاً اور جنوباً پھیلا ہوا ہے۔ اس کی کل طوالت دوسواسی میل ہے۔ بلوچستان کے دو مشہور درے بولان اور مولہ اسی سلسلہ کوہ میں شامل ہیں۔ زرغون اس کی سب سے اونچی چوٹی ہے، جو سطح سمندر سے گیارہ ہزار سات سو اٹھاسی فٹ بلند ہے۔ اس کی دوسری چوٹی کوخلیفت اور تیسری چوٹی کو زرگٹ کہتے ہیں جو بہت ہی سرسبز و شاداب ہے۔ یہ وادی زیارت کے جنوب میں واقع ہے۔

کوہ ماران: اس پہاڑ کی بلندی ۱۰۷۳۰ فٹ ہے۔ ناگاہو اور گینشک اس سے ملحق پہاڑ ہیں۔ اسی سلسلہ کوہ میں قلات سے بیس میل مشرق میں ایک حسین تفریح گاہ ہے، جسے کوہ ہربوئی کہتے ہیں۔ یہ پہاڑ انتہائی شاداب اور سرسبز ہے۔ تاہم یہ بلوچستان کا سرد ترین مقام ہے۔ زیارت، اسکلکو، نیچارہ، پندران، نزمک، جوہان، کسان کے علاوہ مچھ کرتہ بی بی، نانی و ربّی درہ بولان کے مشہور مقامات کا حامل ہے۔

سلسلہ کوہ کیرتھر: کوہ پب، کوہ سیاہان، کوہ چاغی، راسکوہ، سلسلہ کوہ وسطی مکران، کوہ توبہ، شین غر (یعنی سرسبز پہاڑ) کوہ کند، کوہ تورغر (کالا پہاڑ) مشہور پہاڑ ہیں۔ ان میں سے کچھ پہاڑوں میں سنگ مرمر گندھک اور کئی ایک قسم کی معدنیات حاصل ہوتی ہیں۔

دربار اور زیارتیں: بلوچستان کے کوہستان اور ندیوں کے کئی ایک مقامات پر قدیم ترین یادگاریں، بزرگوں کے مقابر اور زیارت علاقے کی شہرت و عظمت کے نقوش اجاگر کرتے ہیں ذیل کے سطور میں ان کا ذکر ناگزیر ہے۔

منگھو پیر: یہ کوہ پب کے آخر میں واقع ایک بزرگ کی زیارت ہے، جہاں سمندر کی قربت سے مگرمچھ زیارت کے پاسبان ہیں۔ سلسلہ کوہ پب کا ایک اور اہم حوالہ اس کے غار ہیں، جو اس خطے کی قدامت کو ظاہر کرتے ہیں۔ (اسی سلسلہ کوہ سسّی پنوں کی مشترکہ تربت ہے وسنگھر کے آس پاس بنی ہے داستانوں کے موقع پر اس پر مزید روشنی ڈالی جائے گی)

لاہوت لامکاں: یہ کوہ پب کا ایک عجوبہ روزگار غار ہے جو کراچی سے ستر میل کے فاصلے پر بلوچستان کے ضلع لسبیلہ میں واقع ہے۔ غار کے اندر کے آثار کو محققین مہا تمابدھ کے زمانے سے منسوب کرتے ہیں کسی زمانے میں یہاں مہاتما بدھ کا بت رکھا گیا تھا، جو اب ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ نقوش مٹ چکے ہیں مگر عقائد پر یقین رکھنے والے اب بھی یہاں زیارت کی غرض سے آتے ہیں۔ غار کی چھت چٹان سے تراشی گئی ہے۔ جو سنگی ستونوں پر قائم ہے۔ اس چھت سے برف کی طرح کا ٹھنڈا پانی ٹپکتا ہے۔

شاہ نورانی کی زیارت گاہ: یہ زیارت گاہ بھی کوہ پب کے ایک وسیع وعریض غار کو تراش کر بنایا گیا ہے جو سیڑھیوں کے ذریعے دو تین منازل تک زیارات کے لئے آنے والوں کی رہائش گاہ بھی ہے۔ اسی سلسلہ کوہ میں سسّی پنوں کی مشترکہ تربت ہے جو سندھ کے آس پاس بنی ہے۔ داستانوں کے موقع پر اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ہنگلاج: کوہ پب ایک کوہستانی ندی ہنگول جو حقیقی معنوں میں ہنگلاج سے مشتق ہے۔ ہنگلاج ہندوؤں کی ایک زیارت گاہ ہے۔ اس زیارت پر ہندوؤں اور بودھوں کے آثار واضح ہیں۔ دریائے ہنگول کے کنارے جہاں ندی سمندر میں گرتی ہے، ایک قدیم مندر کے آثار بھی ملتے ہیں۔ اس مندر کو لوگ مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ کوئی اسے "پاربتی" کہتا ہے کوئی "کالی ماتا" اور "بی بی نانی" کے نام دیتا ہے۔ ہندو اس ہد میں بھی بڑی تعداد میں یاترا کے لیے آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مندر بدوہ مت کے عروج سے قبل تعمیر ہوا تھا۔ سندھ کے مشہور صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام میں اس مندر کا نام "بی بی نانی" ملتا ہے۔ غالباً شاہ عبداللطیف بھٹائی بہ نفس نفیس اس کی زیارت (یاترا) کے لیے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچستان میں آباد ہندوؤں کے ایک دوہے میں ہنگلاج کا ذکر ملتا ہے۔ دوہا فقیر بلونت سے منسوب ہے۔ (پسنی کی بندرگاہ سے بیس میل جنوب کی طرف ایک جزیرہ ہے۔ بلوچی میں اس کا نام ہپت تلار ہے یعنی سات چٹانیں)

سات دیس ستا دیپ میں
آٹھواں دے ہنگلاج
کالی دے کلات میں
مہادیو سُتنگ
بھڈڑا جوگی شال میں
کہے فقیر بلونت

بلوچستان میں بہت سی پہاڑی ندیاں ہیں، جن کے نام اس طرح ہیں۔ ہنگول، ناڑی، رخشان، کھور، (کھور - ندی) دشت کھور لاہوڑہ پشین، ژوب کھور، بولان، مولا، گاج کولاچی، حب کھور، پورالی شادی کھور لہڑی کھور۔

بلوچستان کی جھیلیں

ہامون لوہڑہ: یہ جھیل تحصیل نوشکی اور تحصیل دالبندین کے درمیان شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کا پانی بارشوں کے زمانے میں لبریز ہونے کے بعد ڈاک (صحرا غیر آباد) کو پہنچ کر زمینوں کو سیراب کرنے کے بعد دلدل میں سما جاتا ہے۔ اس جھیل کی طوالت بیس میل اور عرض دس میل کے قریب ہے۔

ہامون ماشکیل: رقبے کے اعتبار سے یہ جھیل بلوچستان کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ اس میں چاغی کی طرف سے کھور مورجین، میر جاوا کی پہاڑیوں سے کھور تہلاپ اور پنجگور کے قرب وجوار سے نکلتی ہوئی رخشان ندی کوہ سیاہان سے اس میں آکر مل جاتی ہے۔

آبشار

گوادر کے قرب وجوار میں کوئی ندی نہیں ملتی۔ البتہ کارواٹ "برم باب" اور "پلیری" کے آبشار پہاڑوں سے بہہ کر آتے ہیں۔ ایک اور اہم آبشار "انکاڑہ" کے نام سے کوہستان سائیجی سے نکل کر مغربی ساحل کے قریب سمندر سے مل جاتا ہے۔ ان پہاڑوں اور پہاڑی آبشاروں میں کچھ موسمی ہواؤں کی اہمیت ہے۔ ۶ جون سے ۱۰ جولائی تک سمندر مچل جاتا ہے۔ اگست کے آخری ایام میں کبھی کبھی ستمبر میں مغرب کی سمت سے ایک تند و تیز ہوا چلتی ہے۔ اکتوبر سے جنوری تک ساحلی ہوا چلتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی شدت مئی کے مہینے تک برقرار رہتی ہے۔ اس ہوا کو "چلیم" یعنی حقہ کہتے ہیں۔ موسم سرما میں شمال مغرب سے آدھی رات کو ایک ہوا چلتی ہے جو دو ڈھائی دنوں تک ٹھنڈ بڑھاتی ہے۔ اس ہوا کو "ناشی" کہتے ہیں۔ اپریل اور مئی کے مہینوں میں اس کا مزاج لُو میں تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔

ہامون سراندہ: یہ جھیل ضلع لسبیلہ کے عین وسط میں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی

زمانے میں یہ سمندر کا حصہ رہی ہے۔ یہ جھیل شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی طوالت نو میل، عرض تقریباً دو میل ہے۔ عام طور پر اس میں تین چار فٹ پانی کھڑا رہتا ہے لیکن سیلابوں کے موسم میں اس کی گہرائی دس بارہ فٹ ہوتی ہے اس کا پانی کھارا اور آبپاشی کے لیے غیر مفید ہے۔

بلوچستان کے جغرافیے کے حوالے سے اختصار سے بلوچستان کی بندرگاہوں پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے جو فی زمانہ علاقے کے لئے حد درجہ اہمیت کی حامل ہیں۔ بحیرہ عرب میں کراچی کی بندرگاہ کو چھوڑ کر اور جتنی بندرگاہیں بلوچستان میں موجود ہیں ان کی وجہ کراچی سے جیونی اور جیونی سے ایرانی بلوچستان کی بندرگاہ بندر عباس تک سمندر جنوب کی سمت میں بہہ رہا ہے۔ ان بندرگاہوں کے ساتھ کچھ تاریخی واقعات بھی قابل بیان ہیں۔

بندرگاہیں: بلوچستان کے جنوب میں بحیرہ عرب کراچی سے جیونی تک پھیلا ہوا ہے۔ جیونی سے آگے خلیج گوئٹر پاکستانی بلوچستان اور ایرانی بلوچستان کی سرحد ہے۔ ایرانی بلوچستان میں بھی تین بندرگاہیں گوئٹر، چاہ بہار اور بندر عباس کی بندرگاہ بلوچ اکثریت کا وطن ہے۔

سون میانی: یہ بلوچستان کی پہلی بندرگاہ ہے جو کراچی سے خشکی کے راستے ۴۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل یہ وسط ایشیاء کی مشہور بندرگاہ تھی، سندھ کے مشہور راجہ داہر کے خلاف عرب حملہ آوروں نے اسی بندرگاہ پر اپنا لشکر اتارا تھا انگریزوں کی آمد سے قبل بیشتر تجارتی کاروان بلخ، بخارا، افغانستان اور ایران کو جاتے ہوئے لسبیلہ کی اس بندرگاہ پر آتے جاتے کسی زمانے یہ بندگاہ تجارت کیلئے بہت مفید تھی۔ یہاں سے اعلیٰ نسل کے گھوڑے رود باری بُغد داونٹ اور کنیزیں برآمد ہوتی تھیں۔ (بُغد۔ دو کوہان والے اونٹوں کو کہتے ہیں)

اورماڑہ: اورماڑہ کی بندرگاہ جنوب اور جنوب مغرب کی طرف سے سمندر میں گھری ہوئی ہے۔ ۱۹۳۸ء تک برٹش انڈیا ٹیم نیوگیشن کے جہاز بندگاہ سے تین میل کے فاصلے پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ بیرونی ممالک بالخصوص سری لنکا اور جاپان سے تجارتی سامان لاتے اور لے جایا کرتے تھے یہاں سے زیادہ تر خشک مچھلی، منقش چٹائیاں یعنی سچکان دساور کو بھیجی جاتی تھیں۔

کلمت: بلوچستان کی یہ بندرگاہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے اورماڑہ اور پسنی کے درمیان واقع ہے۔ یہاں سے ایک خلیج ماکولہ شمالی پہاڑیوں تک چلی گئی ہے اس طرح یہ بندرگاہ شمالی ہواؤں سے محفوظ ہے۔ ماہی گیری کی کشتیوں کیلئے بلوچستان کی یہ بندرگاہ منفعت بخش ہے۔ اڑنگا (اڑنگا۔ مچھلی کے شکار کا ایک خاص موسم) کے موسم میں کراچی اور خلیج فارس کی بندرگاہوں سے جوق در جوق یہاں شکار کے لئے آتے ہیں۔ کھر (کاڈ) مچھلی اس علاقے کے سمندر میں غول در غول جمع ہوتی ہیں کلمت بندرگاہ کے مغرب میں "گزدان" کی مشہور چراگاہ ہے یہاں پر ایک خاص قسم کی گھاس اگتی ہے۔ خشکی کی طرف سے چلنے والی ہواؤں سے گھاس کے بیج بکھر کر سمندر میں پھیل جاتے ہیں جو کھر مچھلی کی من بھاتی خوراک ہے۔

مچھلی کے شکار کے علاوہ کلمت بندرگاہ کی دو بڑی تاریخی اہمیتیں ہیں۔

۱) ہندوستان سے واپسی پر سکندر اعظم اس بندرگاہ کے قریب سے گزرے اس زمانے میں اس علاقے میں ہوت نام کا بلوچ قبیلہ آباد تھا۔ اس سلسلے میں آرین نامی یونانی مورخ رقمطراز ہے کہ:

"سکندر جب بٹالہ سے اپنے واپسی سفر پر اپنی ٹڈی دل فوج کے ساتھ کلمت کے علاقے میں پہنچا تو فوج کی ضرورت کیلئے پانی نایاب تھا اس پر مستزاد یہ کہ کلمت کے ہوتوں نے سکندر کے لشکر پر بار بار شب خون مارے۔ اس سے فوج کی صلاحیتوں کو نقصان پہنچا۔ کلمت کے جنوب مغرب میں شادی کھور کے کنارے ایک وسیع و عریض قبرستان سکندر اعظم کی فوجوں کی یادگار ہے۔ سکندر اعظم کو یہیں پر مچھروں نے کاٹ کر بیماری میں مبتلا کیا۔ کہتے ہیں وہ اس بیماری کی تاب نہ لاکر بابل میں جان کی بازی ہار گیا تھا۔

۲) اس بندرگاہ کا دوسرا اہم تاریخی واقعہ سردار حمل جنید اور انیسویں صدی کے ابتداء میں اور اٹھارویں صدی (میر بشیر احمد نے اپنی کتاب "وگرانا ز" میں یہ زمانہ سولہویں صدی لکھا ہے اس حوالے سے کہ ۱۵۳۰ء میں پرتگیزوں نے پسنی کو نذر آتش کر دیا تھا۔) کے اواخر میں بلوچستان کی بندرگاہوں پر پرتگیزی قزاقوں کا حملہ تھا اور اس سے قبل وہ خلیج فارس میں کارروائی کر کے کامیاب ہو چکے تھے تاہم کلمت آس پاس کے علاقوں میں سردار جنید خان کے بیٹے میر حمل خان نے پرتگیزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ میر حمل کے پاس اگرچہ جدید بحری بیڑے نہ تھے مگر کشتیوں کے ذریعے جن سے وہ ایران، خلیج اور افریقہ کے علاقوں تک تجارت کرتے تھے پرتگیزوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ بالآخر پرتگیزوں نے میر حمل خان سے ایک عہد نامہ کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد جب میر حمل خان ایک اکیلی کشتی میں کہیں جا رہے تھے کہ پرتگیزوں نے اسے گھیر لیا۔ دو بدو لڑائی کے بعد میر حمل خان کو گرفتار کر کے پرتگال لے گئے تاہم پرتگیز بلوچستان میں کوئی نو آبادی قائم نہ کر سکے۔

پسنی کی بندرگاہ: پرتگیز جب بلوچستان میں ناکام ہوئے تو ۱۵۸۱ میں پسنی شہر کو آگ لگائی۔ پسنی بندرگاہ کی دور قدیم میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی مگر انگریزوں کے دور میں ۱۸۹۸ میں انگریزوں نے مکران کی بغاوت کو فرو کرنے کیلئے انگریز فوج کے کرنل مین کی زیر کمان اس بندرگاہ کو استعمال کرتے ہوئے اپنی فوج اتار دی۔ ۲۷ جنوری ۱۸۹۸ میں " گوک پروش" کے تاریخی مقام پر انگریز فوج مجاہدین سے ٹکرائی۔ اس لڑائی میں میر بلوچ خان نوشیروانی اور کئی دوسرے نامی گرامی بلوچ شہید ہوئے۔
(گوک پروش، بلوچستان جدید تاریخ کی روشنی میں۔ میر گل خان نصیر ص ۹۲)

پسنی سے آگے کپر اور سر بندر کی چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں ہیں جو ماہی گیروں کی کشتیوں کیلئے مستعمل ہیں مگر اس حوالے سے گوادر کی بندرگاہ بہت اہم ہے۔

گوادر بندرگاہ: گوادر کی بندرگاہ پسنی کے جنوب مغربی سمت میں واقع ہے۔ خشکی کے راستے ان کے درمیان سو میل کا فاصلہ ہے۔ گوادر کی بندرگاہ سونمیانی کی طرح تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ پرتگیزوں سے مقابلہ ہونے پر ان سے میر حمل نے دو توپیں چھین لی تھیں جو ۱۹۳۸ تک ساحل گوادر پر نمائشی طور پر رکھی گئی تھیں۔ گوادر کی بندرگاہ جنوب، جنوب مغرب اور شمال مغرب میں سمندر میں گھری ہوئی ہے جبکہ شمال مشرق میں کوہ مہدی واقع ہے۔ (مہدی ذکری فرقہ کے عقائد کی رو سے سید محمد جونپوری مہدی ہیں مکران میں ذکریوں کی زیارت گاہیں ملتی ہیں۔ اس پہاڑ کو بھی سید محمد جونپوری سے منسوب کر کے مہدی کا نام دیا گیا ہے۔ ذکری مسئلہ مولانا عبدالحق ص ۴۵) شمالی سمت میں تقریباً چالیس میل کے فاصلے "دھڑام" کا بلند و بالا پہاڑ واقع ہے۔ جنوب مغربی پہاڑی "باتیل" پر قدیم زمانے میں تعمیر کردہ ایک بند اب تک موجود ہے جس میں بارشوں کا پانی جمع کیا جاتا ہے۔ یہ بند تراشے ہوئے پتھروں سے باندھا گیا ہے اسے پرتگیزوں سے منسوب کیا جاتا ہے جنہوں نے گوادر پر قبضہ کیا تھا۔ بعد میں حمل جنید نے ان کو شکست دے کر گوادر ان سے چھین لیا۔ متذکرہ دو توپیں اسی معرکے کی یادگار ہیں۔

گوادر بندگاہ کی ایک طویل تاریخ ہے شروع میں یہ جدگالوں کے قبضے میں رہا جن کا مرکز اس زمانے میں ایرانی بلوچستان کا شہر "باہو" تھا۔ بعد ازاں یہ مسقط کے سلطان ابوسعید کے ہاتھ لگا۔ ۱۷۵۳ء میں سلطان ابوسعید اپنے مخالفین کے ہاتھوں شکست کھا کر میر نصیر خان اول کے پاس قلات پہنچا۔ ان سے امداد طلب میر نصیر خان کے پاس نہ تو باضابطہ فوج تھی، نہ ہی بحری نقل و حرکت کے ذرائع کہ وہ سلطان ابوسعید کی مدد کرتے۔ البتہ میر نصیر خان نے گوادر کی آمدنی سلطان ابوسعید کو اس شرط پر دی کہ جب تک وہ بلوچستان میں پناہ گزیں رہیں گے، اس سے استفادہ کریں۔ چند سال کے بعد سلطان ابوسعید کے حمایتیوں نے مسقط پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور سلطان کو واپس بلا لیا۔ سلطان نے گوادر کی بندرگاہ پر بدستور قبضہ جمائے رکھا۔ ۱۷۶۷ میں میر نصیر خان نے اپنی بیٹی بی بی سلطان خاتون لسبیلہ کے جام غلام شاہ کے ازدواجی رشتے میں دے دی اور گوادر کی بندرگاہ کو جہیز میں لکھ کر اپنی بیٹی کو دیا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر جام غلام شاہ نے گوادر پر قبضہ کیا۔ میر نصیر خان کے صاحبزادے خان میر محمود خان اول کے ابتدائی دور ۱۷۹۴ میں والی مسقط نے پھر گوادر پر قبضہ کیا۔ ۱۷۹۵ میں جام میر خان نے گوادر پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہو کر سلطان مسقط کے آدمیوں کو گوادر سے نکال دیا۔ جن دنوں میں خان میر خداداد خان اور بلوچستان کے سرداروں میں ناچاقی اور خانہ جنگی پیدا ہوئی۔ ان کو گوادر یا کسی اور مسئلے پر توجہ کی فرصت نہ تھی۔ سلطان مسقط نے ایک مرتبہ پھر گوادر پر اپنے چند آدمیوں کو ایک کشتی میں بھجوا کر قبضہ کر لیا۔ اس دفعہ سلطان مسقط کو چونکہ انگریزوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ انگریزوں نے جب بلوچستان پر قبضہ کیا تو گوادر کی بندرگاہ سلطان مسقط ہی کے پاس رہنے دی تا آنکہ ۱۹۶۰ میں حکومت پاکستان نے سلطان مسقط کو ایک خطیر رقم دیکر گوادر کی بندرگاہ حاصل کی۔

گنبد: گوادر کے قدیم قبرستان کے قرب و جوار میں گیارہ چھوٹے بڑے گنبد تھے جن میں عہد قدیم کی اہم شخصیات دفن تھیں۔ اب ان گنبدوں میں صرف ایک گنبد بچا ہے جس میں سترہویں صدی کے حکمران شہ بلال دفن ہیں۔ شہ بلال مکران کے بلیدی خاندان کے فرماں روا تھے جن کے نام سے اب تک بلیدہ کا شہر اور بلیدی قبیلہ موجود ہے۔ مکران میں مذہبی اعتبار سے زیادہ تعداد تو اہل سنت والجماعت کے پیروکاروں کی ہے مگر ایک خاصی تعداد ذکری فرقہ کی بھی ہے۔ ان کا ذکر کیچ کے عنوان کے تابع تفصیل سے کیا جائے گا۔ تاہم شہ بلال کے حوالے سے یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ شہ بلال ذکری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے مگر بعد میں انہوں نے اسلام قبول کیا۔ جس سے ذکری فرقہ کے لوگ ناراض ہوئے اور شہ بلال کے اس عہد کے مخالفین۔ گچکی خاندان کو شہ بلال کے خلاف اُکسا کر اس پر حملہ کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ گچکی اور بلیدیوں میں ایک طویل عرصے تک کشمکش رہی ہے۔ شہ بلال کے مدفن کے گنبد پر میر قنبر کا نام ملتا ہے جو اس کا بھائی تھا۔

جیونی کی بندرگاہ: بلوچستان میں مکران کے علاقے میں ساحلی قرب و جوار میں ایک اور دشت واقع ہے۔ دشت کی ندی کا سیلاب جیونی کے قریب سمندر میں گرتا ہے۔ اس وجہ سے جیونی ہوریا (Greek) کہلاتا ہے۔ جیونی بلوچستان کی تمام بندرگاہوں سے

موزوں ترین بندرگاہ ہے۔ جو پاکستان اور ایران کی سرحد سے متصل ہے۔ اس کی شمال مغرب میں خلیج" گوئتر " ہے جس کے مغربی ساحل سے ایرانی بلوچستان کی سرحد شروع ہوتی ہے جو چاہ بہار سے بندر عباس تک طویل ہے۔ جیونی کی بندرگاہ پر چودھویں صدی عیسوی تک جدگالوں کا قبضہ رہا ہے اس سے متصل مغربی سمت میں دشتیاری کا علاقہ ہے جس میں مشہور جدگال قبائل آباد ہیں۔ سردار جیون خان جدگال کا صدر مقام ہونے کی مناسبت سے اس کا نام جیونی پڑ گیا۔ بعض لوگ اسے جیونٹری بھی کہتے ہیں۔ جیونی بندرگاہ کے قرب و جوار میں ایک قدیم پختہ قبرستان واقع ہے۔ اس کی کھدائی سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے ایک قدیم ترین مہذب آبادی کا سراغ ملتا ہے۔

۱۹۳۸ء تک جیونی ماہی گیروں کی ایک گمنام بستی تھی۔ اسی سال سلطان مسقط اور انگریزوں کے درمیان جو کشیدگی پیدا ہوئی، سلطان مسقط نے برطانوی ہوائی کمپنی (BOAC) کا مستقر گوادر سے اٹھوا دیا۔ تب حکومت برطانیہ نے خان قلات کے ساتھ ایک عارضی سمجھوتہ کر کے یہ ہوائی مستقر جیونی قائم کیا اور ساتھ ہی جیونی ہور (Greek) میں بحری جہازوں کے آنے جانے کا مرکز بھی بنوا دیا۔ دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ کی ہوائی فوج کا ایک دستہ بھی جیونی میں تعینات رہا۔ ان نئی تنصیبات سے جیونی بندرگاہ کی شہرت اور آبادی میں اضافہ ہوا۔ گوادر کے تاجر اور کاروباری لوگ جیونی میں آباد ہونے لگے۔ اس سے جیونی بندرگاہ کی آمدنی میں تقریباً تین لاکھ کا اضافہ ہوا۔ جیونی اور گوادر کے درمیان گنز اور پیشکاں نامی دو چھوٹی بندرگاہیں بھی ہیں، جہاں مچھلی کا بڑا عمدہ شکار ہوتا ہے۔ یہ دونوں بستیاں نسبتاً آباد اور خوشحال ہیں۔ جیونی کی بندرگاہ سے آگے بلوچستان کا جو ساحل طول کھینچتا ہے۔ وہ اس وقت ایران کے قبضے میں ہے گوئتر، چاہ بہار اور بندر عباس اس کی مشہور بندرگاہیں ہیں۔ جن کی تمام تر آبادی بلوچوں کی ہے۔

ماہی گیری بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں بسنے والوں کی سب سے بڑی دولت اور ذریعہ روزگار ہے۔ بلوچستان کا ساحل ماہی گیری کیلئے ایک مشہور خطہ ہے۔ ہر موسم میں کھر (کاڈ) اور گوادر سرمائی مچھلیاں بڑی تعداد میں پکڑی جاتی ہیں۔ مچھلیوں کی تیس قسمیں اس بحر بیکراں میں ملتی ہیں۔ ماضی میں مچھلیوں کو خشک کرنے کا کوئی سائنٹفیک طریقہ نہیں تھا مگر اب نئے نئے طریقے جدید دور کے تحت اختیار کئے جاتے ہیں۔ بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں 1982 میں 67 ہزار کی آبادی تھی جو چوبیس سالوں میں بڑھ کر 97 ہزار سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ اس میں چھیالیس ہزار لوگوں کا گزارہ ماہی گیری پر ہے۔

(بلوچستان-قدیم اور جدید تحقیق کی روشنی میں- میر گل خان نصیر، ص ۱۰۰-۱۰۱)

ہپت تلار: قدیم ترین مورخین میں یونان کے شہرہ آفاق مورخ ہیروڈوٹس کے مرتب کردہ نقشوں میں بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں چار جزیروں کی نشاندہی کی گئی ہے مگر اب ان کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ اسی طرح یونان کے ماہرین جغرافیہ نے ان جزائر کو جو نام دیئے ہیں وقت کی دھند نے ان کو روپوش کر دیا ہے۔

کرنل سر تھامس ہنگر فورڈ ہالڈچ نے قدیم مکران کا جو نقشہ مرتب کیا تھا۔ اس میں ''کرابائین'' نام سے ایک جزیرے کی نشاندہی کی ہے۔ اس دور میں اسے بھی سمندری امواج نے ڈبو کر گم کر دیا ہے۔ بلوچستان کے ساحلی علاقے میں صرف ایک جزیرہ ملتا ہے جسے مقامی طور ہپت تلار (سات چٹانیں) یا "استولہ" کہتے ہیں جو راس "جدی" اور راس سکنی کے درمیان واقع ہے۔ اب اس کا قیاس کرنا ممکن نہیں کہ قدیم ترین جزائر کی وسعت کس قدر ہوگی مگر جب ہم یونانی اور ہندوؤں کی "استولہ" کے بارے میں کہانیاں سنتے ہیں تو یہ اندازہ کرنا خلاف تحقیق نہیں کہ ان جزیروں کی طوالت خاصی ہو سکتی ہے۔

استولہ کے نقوش اور دید سے یہ لگتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ ساحل کا حصہ رہا ہوگا، جسے سمندری موجوں نے زمین سے اکھاڑ کر سمندر کا حصہ بنا ڈالا ہے یہ جزیرہ جسے تاریخ کی دھند سے نکال کر ایک صورت دے دی گئی ہے، مکران کے ساحل سے سولہ میل دور ہے۔ پسنی کی بندرگاہ سے یہ جزیرہ بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ جزیرے کا طول اور عرض مشرق و مغرب میں ایک میل جتنا ہے۔ عرب نے اسے "استالو" کا نام دیا ہے۔ ہندو اسے ''ستادیپ'' کہتے ہیں۔ یونان کے ماہرین جغرافیہ اسے ''نوسالہ'' کہتے ہیں۔ یونانیوں نے اپنے عقائد کی رو سے اس جزیرے کو ''سورج دیوتا'' نریدس کی قیام گاہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں سے جو بھی سمندری جہاز یا بحری سواری گزرا کرتی تھی دیوتا اس میں سوار انسانوں کو مچھلی بنا ڈالتا اور سمندر میں ڈال دیتا جبکہ ہندوؤں کی خوش فہمی یہ ہے کہ ''یہ مہا کالی کا یعنی بھوانی کا مندر تھا کہ وہ یہاں سے ہر روز صبح کو ہنگلاج جا کر متبرک چشمے میں غسل کرتا تھا۔''

مکدونیا کے سپہ سالار کریٹوس کے بیان کے مطابق یہاں پر سونے کے ذخائر تھے جن سے استفاضہ کرنے کے لئے تاجر اور بیوپاری جوق در جوق آتے تھے مگر کچھ ہاتھ نہ لگنے پر مایوس ہو کر لوٹ جاتے تھے۔ جبکہ فنیقیا کے لوگوں نے بھی طلا کی لالچ میں لوگوں کو اس طرف بھیجا تھا۔ سکندر اعظم کے امیر البحر نے سونے کے خزائن کیلئے فنیقی اور مصری اس جزیرے میں بھجوائے تھے جنہیں مقامی ماہی گیروں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بلوچ اپنے اس جزیرے کو ہپت تلار کہتے ہیں۔

یعنی سات چٹانیں۔ تاہم یہ جزیرہ نہایت خوفناک ہے۔ جزیرے کا اندرونی حصہ ایک وسیع میدان کی طرح ہے مگر داخلے کے راستے پر چٹانیں دیوار کی طرح روک بنی ہوئی ہیں۔ ان چٹانوں نے اسے خوفناک بنادیا ہے جزیرے کے جنوب مشرق میں ایک ہیکل کے کھنڈر ہے جس کی اب صرف بنیادیں دیکھنے کو ملتی ہیں اس کے ترشے ہوئے پتھر ایک میٹر سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اسی ہیکل کے آس پاس شکستہ بتوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ قدیم ماہرین آثار قدیمہ کی رائے یہ ہے کہ یہ کسی زمانے میں پانی کی وسیع جھیل رہی ہوگی۔ اس کی تعمیر کی صورت قدیم ایران کے تخت گاہ پالپتر (پائنا) سے مشابہ ہے تاہم اس پر ماہرین کی تحقیق درکار ہے۔ اس وقت یہاں کچھ ماہی گیر پشک یا ویل مچھلی کا شکار کرنے آتے تھے۔ اس جزیرے میں ایک گھاس کا پودا عام نظر آتا ہے جس میں کثرت سے سانپ لہراتے ہیں۔ اس جزیرے کے جنوب میں ایک غار ہے۔ ماہی گیر اس پر اپنے عقیدے کے مطابق جھنڈے آویزاں کرتے ہیں وہ کہتے ہیں۔ یہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دلدل کے قدموں کے نشان ہیں۔ اگر چہ تاریخی اعتبار سے حضرت علیؓ اس علاقے میں تشریف نہیں لائے ہیں۔

کوہ باتیل: کوہ باتیل اندازاً دس کلومیٹر طویل اور دو کلومیٹر عریض ہے۔ سطح سمندر سے ۴۸۰ فٹ بلند ہے۔ اس نے سمندر کو گوادر کے پاس دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ پہاڑ چونکہ جنوب کی سمت ہے سمندر کا رخ مشرق اور مغرب کو ہو گیا ہے اور بیچ میں ایک پٹی پر گوادر آباد ہے۔ سمندر کی مشرقی سمت دور جو پہاڑ واقع ہیں یہ آتش فشانی سے منسوب ہیں جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے تو ان پہاڑوں سے گیس خارج ہو کر سمندری پانی کو زردی مائل بنا دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے مچھلیاں مر جاتی ہیں۔ گوادر میں ڈور سے ملحق ایک گاؤں ہے جسے "دریا کی آنکھ" کہا جاتا ہے۔ کوہ باتیل پر سولہویں صدی میں پرتگیزوں کا تعمیر کردہ گبر بند اب تک اپنے آثار لئے ہوئے ملتا ہے۔ اب اس پہاڑ پر ایک فائیو اسٹار ہوٹل بنایا گیا ہے۔ کچھ دوسری عمارات بھی تعمیر ہو رہی ہیں۔ گوادر کے میدان سے ایک خوبصورت سڑک کی ذریعے کوہ باتیل کے ہموار بلندی پر پہنچا جا سکتا ہے۔ اب سنگار ہاؤسنگ اسکیم کے تحت اس کی ہموار سطح پر تعمیراتی پلاٹ بنائے گئے ہیں۔ جن کے حصول کے لیے مقتدر شخصیات کوشاں رہتے ہیں۔

ماہی گیروں کی کشتیوں کے نام: ماہی گیر کشتیوں میں سمندر میں نزدیک و دور جا کر مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں۔ کشتیاں حسب ضرورت بنتی ہیں۔ ان کشتیوں کی اندرونی وسعت اور سمندر میں ان کی گردش کو خاص طور پر پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ کچھ کشتیوں کے نام یہ ہیں:

۱) گالیٹ، ۲) بدن، ۳) یدّار، ۴) راچن، ۵) بتیل (یہ نام بتیل ہے جو ایک قسم کی کشتی ہوتی ہے کوہ بتیل کے سمندر میں گھری ہوئی شکل اس کشتی کی طرح ہے مگر لوگوں نے غلط العام کے تابع اس پہاڑ کو کو باطل کا نام دیا ہے جو درست نہیں سنج سید ہاشمی اکیڈمی کا چی ص ۱۱۲) ۶) چر پک، ۷) پنس، ۸) کٹی۔

سمندر میں جو مقامات گہرائی کے لحاظ سے خطرناک ہیں یا طوفان کے موقع پر ان سے دور رہنا پڑتا ہے ان کی تعداد تقریباً ۱۳ ہے۔ جن کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱) چانگالی، ۲) دوگوری، ۳) اومال، ۴) دگلگ، ۵) چاڑ آپ، ۶) اشرت، ۷) اُبار، ۸) [illegible]، ۹) بیل، ۱۰) سمبر، ۱۱) آلاڑ، ۱۲) گاجوڑی، ۱۳) تلمب۔

بیل و آلار (یعنی مد و جزر) اس بارے میں ساحلی باشندوں خصوصاً ماہی گیروں کے کچھ تجربات ہیں۔ چاند جوں جوں بلند ہوتا جاتا ہے سمندر میں بیل یعنی مدر آنے لگتا ہے۔ چاند جہاں اپنی حد کو پہنچ جاتا ہے سمندر کا جوش رک جاتا ہے اور چاند ڈھلنے لگتا ہے تو موجیں بھی لوٹ جاتی ہیں اور جب چاند غروب ہو جاتا ہے سمندر کا جزر بھی تھم جاتا ہے۔ (سنج کا معاشرتی نمبر حسن علی سہیل۔ ماہی گیروں کا پیشہ ص ۱۱۱)

مچھلیوں کے نام کمپو، ٹیٹیل، سارم، گور، پشنت، پیشک، گلو، زرد دوم، سونام، لاڑی، پتر، اشتر، گوانز، مشکو، سولیگ، کر۔

(سنج کا معاشرتی نمبر حسن علی سہیل۔ ماہی گیروں کا پیش ص ۱۱۱)

ماہی گیروں کو چونکہ سمندر سے ہمہ وقت واسطہ پڑتا ہے اس لئے انہیں یہ پوری طرح معلوم ہے کہ کم گہرا سمندر کہاں واقع ہے اور اس کی حدود کہاں تک ہیں۔ سمندر کی گہرائی کے لئے دو نام ہیں "کڈو" آم کڈو کم گہرا سمندر ہے جس کی گہرائی تقریباً تین سو میٹر ہے۔ جب کہ راس کڈو کی حدود میں پہنچ کر زمین کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ وہاں کوئی جال کوئی دام کارگر نہیں ہوتا۔ آم کڈو میں اکثر و بیشتر ویل مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔ اس کے لئے کشتیوں کے ذریعے راس کڈو سے مچھلیوں کو چکمہ دے کر آم کڈو کی حدود میں لاتے ہیں۔ راس کڈو کو یہاں کے ماہی گیر سمندر کا ناف کہتے ہیں۔

اسباب و آلات: ماہی گیری کی سب سے اہم ضرورت سمندر میں گشت کرنے کے وسائل ہیں۔ ایک چپو والی چھوٹی کشتیوں کے علاوہ درمیانے درجے کی اور بڑی بڑی کشتیاں بھی کام میں لائی جاتی ہیں۔ ایک چپو والی کشتی کو "یکدار" کہتے ہیں۔ اس میں دو ایک آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے اور یہ سمندر کی گہرائیوں سے دور دور بلکہ ساحل کے ساتھ ساتھ گھومتی ہے۔ اس سے بڑی کشتی کو "بوجیگ" کا نام دیا جاتا ہے یہ درمیانے درجے کی کشتی ہوتی ہے جس میں ایک سے زیادہ ناخدا ہوتے ہیں اور

باقاعدہ بادبان استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ بڑی کشتی کو "بتیل" کہتے ہیں یہ لانچ کے سائز کی ہوتی ہے اور گہرے سمندر میں ماہی گیری اسی کے ذریعے ہوتی ہے۔ ماہی گیری کے جال بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کو ذیل کے ناموں سے نسبت دی جاتی ہے۔

۱) شپ ریچ، ۲) دربند، ۳) آڈنگو، ۴) بیوات، ۵) ھبگواری، ۶) ریچ، ۷) گر، ۸) کڈو (KADDO)، ۹) پرام، ۱۰) چنگوٹ؛ مگر اہم قسم کے بڑے جال تین ہیں:

۱) ماہور، ۲) چیردان، ۳) رگ

ماہور بڑے بڑے سراخوں کا جال ہوتا ہے۔ یہ ساٹھ ستر گز سے بھی بڑا ہے۔ یہ جال اوپر کی سطح میں پانی پر بچھا رہتا ہے جبکہ اس کا دوسرا رخ گہرائی میں چھپا ہوتا ہے۔ درمیانی خول میں مچھلیاں جب بھر جاتی ہیں تو ماہور کو احتیاط سے لپیٹ دیا جاتا ہے اور تمام مچھلیاں شکار ہو جاتی ہیں۔ پہلے زمانے میں چیردان کی بنائی موٹے دھاگوں سے ہوتی تھی مگر اب نائیلون کے دھاگوں سے کام لیا جاتا ہے جن کے ٹوٹنے کا خطرہ نہیں ہوتا اور جو دھاگوں کے مقابلے میں ہلکے ہوتے ہیں۔

اس کی نچلی سطح پانی کے اندر دور دور تک پھیلی ہوتی ہے جبکہ اوپر کا گوشہ (مید) ماہی گیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے جب اسے یہ تسلی ہوتی ہے کہ جال میں ضرورت کے مطابق شکار پھنس چکا ہے۔ وہ اوپر کے گوشے کو کھینچ لیتا ہے۔ جال مچھلیوں سمیت لپٹ جاتا ہے۔ تب اسے باہر نکال کر کشتی میں ڈال دیتے ہیں۔ مچھلی کے شکار کا سب سے اچھا وقت طلوع آفتاب سے قبل اور غروب آفتاب کے وقت ہوتا ہے جب سمندر کا پانی سیاہی مائل ہوتا ہے اور مچھلیوں کو دام بچھا ہوا نظر نہیں آتا۔

سُنگار: یہ ماہی گیری کے شکار کی ایک رسم ہے۔ جب ماہی گیروں کو خبر مل جاتی ہے کہ سمندر کے فلاں حصے میں اعلیٰ قسم کی مچھلیوں کی بہتات ہے تو وہ کئی کشتیوں میں جا لیں، خورد و نوش کا سامان اور ضروری پوشاک لے کر نکل جاتے ہیں۔ اس شکار میں انہیں دس پندرہ دن، خاص حالات میں مہینے بھر کوشش و کاوش کرنی پڑتی ہے مگر ان کی یہ سعی خزینہ قارون سے بھی فزوں تر ہے کہ جب وہ لوٹتے ہیں تو ٹنوں کے حساب سے مچھلی اور جھینگے ساتھ لاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شکار کے لیے جب ماہی گیر مطلوبہ سمندری حصے میں پہنچتے ہیں تو سمندر کے پانی کے رنگت سرخی مائل دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ رنگت مچھلیوں کے ہجوم کی وجہ سے ہے مچھلیاں اپنی فطرت و عادت کے تابع اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر تیرتی رہتی ہیں۔ جس کی وجہ سے پانی میں ہلچل ہوتی ہے۔ ماہی گیروں کی ہر ایک کشتی میں ایک ماہر موجود ہوتا ہے۔ جونہی اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اسی جگہ سے گوہر مقصود حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے سر پر لپیٹے ہوئے رومال کو کھول کر ہلاتا ہے اور سارے ماہی گیر اس کے اِردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور ترتیب سے جالیں پانی میں ڈالتے ہیں مگر اس احتیاط سے کہ مچھلیاں ڈر سے منتشر نہ ہوں۔ اگر ماہی گیر یہ دیکھ لیتے ہیں کہ جال کا کوئی کونہ مچھلیوں کے نکلنے کے لیے کھلا ہوا ہے تو دو تین ماہی گیر پانی میں کود کر اس کونے میں پانی میں ہلچل مچاتے ہیں اور مچھلیوں کی بڑی تعداد جال کے اندر آ جاتی ہے۔ سنگار کی اس رسم سے ماہی گیر اپنی محنت اور مہارت کا معاوضہ پا لیتے ہیں۔ گاہے بگاہے اس شکار میں وئیل مچھلی ہاتھ لگتی ہے جو بہت اچھی قیمت کا ذریعہ بنتی ہے۔

سمندری طوفان کی بھی مختلف شکلیں ہیں۔ ان سب کا ذکر کیا جائے گا تو اس پر بہت زیادہ وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ طوفان کا سبب اکثر تیز ہوائیں ہوتی ہیں پندرہ سے بھی زیادہ قسمیں طوفان اور امواج کی ہوتی ہیں۔

ستک گیں ڈور (سوتنگیں ڈور): بلوچستان کے ساحلی علاقے اور میدانی علاقوں میں آثار قدیمہ کے کئی ایک مقامات آثار قدیمہ کے کھنڈرات کے حامل ہیں۔ ان میں سب سے اہم ترین مہر گڑھ کے آثار ہیں۔ ایک حالیہ تحقیقی مقالے اور علمی اجتماع کے مطابق مہر گڑھ کے آثار نو ہزار سال پر پھیلے ہوئے ہیں، جو سندھ کے آثار قدیمہ کے کھنڈرات موہن جو دارو سے بھی قدیم تر ہیں۔ مہر گڑھ کی قدامت، تاریخی اور معاشرتی اہمیت پر اب تک تحقیقات جاری ہیں۔ یہ علاقہ ضلع بولان میں ڈھاڈر کے گرد و نواح میں ہے جبکہ ساحلی علاقے میں دو اہم مقامات کے آثار بھی بلوچستان کی قدامت کو ظاہر کرتے ہیں۔

ستگیں ڈور (آثار قدیمہ کے کھنڈرات): گوادر سے تقریباً چالیس میل شمال مغرب کی طرف "سوتنگیں ڈور" کے وسیع کھنڈرات ہیں۔ میجر مونکلر نے ان کھنڈرات کو سکندر اعظم کے زمانے کی یادگار لکھا ہے۔ کرنل ٹی ایس ایچ اولڈرج نے اپنی تحریر میں مڈاول مکران کی نشاندہی کی ہے۔ (جنرل آف دی زونل جغرافیکل سوسائٹی)

اس کے علاوہ میجر مونکلر نے گوادر کے قریب "گٹی" نام کے کچھ کھنڈرات کا ذکر کیا ہے جہاں مردوں کی ہڈیاں اور مٹی کے برتن بھی ملے ہیں۔ کرنل سر تھامس اولڈیچ کی تحقیق کی رو سے ان کھنڈرات کا تعلق سومیری کلدانیوں سے ہے۔

مولائی شیدائی اپنی کتاب ''تاریخ و جغرافیہ بلوچستان'' میں لکھتے ہیں۔ "ستگیں ڈور" کے کھنڈرات کی ای مونکلر نے کھدائی کرائی تھی۔ یہاں سے پتھروں سے تعمیر کی ہوئی کوٹھیاں نکل آئیں۔ ساتھ ہی مٹی کے برتن اور ایک یونانی باختری سکہ دستیاب ہوا ہے۔ محققین کی رائے ہے کہ یہ آثار اسی دراوڑی قوم کے ہیں جو

کلد یہ سے ہجرت کر کے بلوچستان میں داخل ہوئے پھر یہاں سے نکل کر موہن جوداڑو سندھ کے لوگوں کی طرز حیات کی بنیاد گزار ہیں۔ ان آثار قدیمہ میں ان کی زبان کے بارے میں معلومات ملی ہیں جو براہوی قوم کی کردگالی زبان میں ہیں۔
(Knirent Medival (Makran MR Huge .R. Society Vol vII)

عوام: سر ہنری ایلیٹ نے اپنی کتاب ''تاریخ ہند'' کی جلد اول صفحہ 521 میں ماہی گیروں کے بارے میں یوں اظہار کیا ہے: ''ماہی گیر بلوچستان کے ساحلی علاقے بیلہ سے لے کر مکران تک پھیل گئے ہیں۔ یہ اپنی زندگی اور رسومات سے آرین ہیں۔ گوادر کے آٹھ گنبدوں میں آرین رسم الخط کے لفظ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ مقامی طور پر کچھی گنداواہ کے لوگ تھے جو وہاں سے ہجرت کر کے ان علاقوں میں آ بسے۔''

گوادر کے ایک عمر رسیدہ شخص جناب عبدالمجید سہرابی کے ہم شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ان گنبدوں میں لکھی ہوئی تقاریر اور اشعار سے روشناس کروایا۔ انہوں نے اپنے والد ملا سہراب سے یہ حوالے دیئے جس سے یہ بات تقریباً قرین صحت ہے کہ یہ لوگ ہنری ایلیٹ کی تحقیق کے مطابق کچھی کے ہندو تھے۔ مثال کے طور پر ایک گنبد میں یہ اشعار درج ہیں۔

" گنداواہ کے لوگ تنگ دل ہیں
جو بنگو سے ناراض ہوئے
بنگو کی جرات اور خوف سے
یہ شکار پور کو جاتے تھے" (بنگو گنداوہ میں ان کا سردار تھا۔)

ہنری ایلیٹ نے ان کو آرین قرار دینے کا جو دعویٰ کیا ہے۔ اس کی تصدیق ایک تراشیدہ سنگی کتبہ میں ملی ہے، جو سر ہنری ایلیٹ کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ گنبد اب تک گوادر میں موجود ہے۔ اسی طرح قحط کے بارے میں جناب مولائی شیدائی نے اپنی کتاب "تاریخ و جغرافیہ بلوچستان" میں جس کتبے کا حوالہ دیا ہے۔ اس کی نقل جناب عبدالمجید سہرابی کے پاس موجود ہے۔ مولائی شیدائی نے اس کتبے کو اس طرح نقل کیا ہے۔

"جب ہم مکران میں وارد ہوئے تو گندم کے ایک من اور آم کے آٹھ مرتبانوں کی قیمت ایک اشرفی تھی۔ چونکہ ہم جفاکش اور محنتی لوگ ہیں قحط سے ہم متاثر نہیں ہوئے"۔ قحط سے نبٹنے کیلئے بلوچستان کے بہت سے علاقوں میں گبر بند ہیں۔ خصوصاً خاران اور ماشکیل ان سے معمور ہیں۔

گوادر

وجہ تسمیہ: گوات بلوچی زبان میں ہوا کو کہتے ہیں۔ در کے معنی ہیں دروازہ۔ ہواؤں کا دروازہ ''گوادر''۔ موجودہ بلوچستان کے ساڑھے تین سو میل طویل ساحل کا مرکزی علاقہ ہے جو تقریباً بیس چھوٹے بڑے قصبات اور دیہات پر مشتمل بندرگاہ ہے۔ پسنی، سر بندر، جیونی، پیشکان، گنر، کلمت، شمال، کپر، کارواٹ بل، بسول او اور ماڑہ، اس کے قرب و جوار میں آباد ہیں۔ ان میں کلمت، پسنی اواور ماڑہ کی تاریخی اہمیت ہے، یہ مکران ڈویژن میں ایک اہم ضلع بھی ہے۔

حدود اربعہ: یہ مقام ۱۹. ۶۲ طول بلد مشرق اور ۱۷ ۳۵۰ عرض البلد شمالاً بلوچستان کے صوبائی دارالحکومت کوئٹہ سے جنوب میں آٹھ سو میل، کراچی سے شمال مغرب کی جانب دو سو نوے میل کی مسافت پر دو ہزار چھ سو فٹ چوڑے ریتیلے خاک نائے کے ایک ٹیلے پر تین میل رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ خاکنائے جنوب مغرب اور شمال مشرق سے سمندر سے گھری ہوئی ہے۔ اس کے شمال مشرق میں کوہ "مہدی" جبکہ شہر کے مغربی جانب سمندر پر ساڑھے سات میل طویل، ڈھائی میل عریض کوہ "باتیل" واقع ہے جس کی بلندی ۴۷۶ فٹ ہے۔ اس پہاڑ اور گوادر شہر کی سطح مرتفع انگریزی حرف T کی صورت میں ہے۔ کوہ باتیل پر پرتگیزوں کا بنایا ہوا ایک تالاب ابھی تک موجود ہے اگرچہ امتداد زمانہ اور پانی کی قلت کے باعث خشک ہے مگر اپنی قدامت اور تاریخی اہمیت کے اعتبار سے ایک قابل دید تعمیر ہے۔ گوادر کے شمال میں تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر "دھڑام" کا سر بفلک پہاڑ واقع ہے۔

موسم: گوادر کا درجہ حرارت جنوری سے مئی تک ۷۳۵ء فارن ہائیٹ ۹۴۱ء فارن ہائیٹ تک بدلتا رہتا ہے بارشوں کا سالانہ اوسط ۶۳ء انچ ہے موسم سرما میں ۵۱۵ء اور بقیہ دوسرے موسموں کا اعشاریہ ہے۔

چونکہ گوادر کے جنوب مغرب کی جانب سے تیز سمندری ہوائیں چلتی ہیں۔ یہ علاقہ یعنی خلیج گوادا پنے محل وقوع کے باعث ان ہواؤں کی زد میں ہے اس لئے بلوچی اصطلاح میں گوات در یعنی ہواؤں کا دروازہ کہلاتا ہے۔ (کثرت استعمال سے حرف ت) تخفیف کی زد میں آجاتا ہے۔ اس لئے تلفظ گوادر بن جاتا ہے۔ مئی اور ستمبر کے مہینوں میں موسمی ہواؤں کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور سمندر متلاطم ہو جاتا ہے ایسے وقت پر بحری جہاز خطرہ محسوس کر کے ساحل سے 100 گز دور لنگر انداز ہوتے ہیں۔

بولان پاس میں ریلوے ٹنل

گوادر کی ایک یادگار تصویر

درہ بولان کا ایک منظر (جاپانی)

آبادی: ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق گوادر کی کل آبادی سترہ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو ۹۴۱۳ گھرانوں میں آباد تھے۔ ان میں ۸۷۱۳ مرد ۸۲۸۷ خواتین کا ذکور ہے۔ ان میں ۸۷۸۴ بلوچ ۱۳۹ پنجابی ۳۶ سندھی ۱۰ براہوی اور ۳۳ اردو بولنے والے تھے۔ تاہم گزشتہ دو تین سالوں سے گوادر ڈیپ سی پورٹ، ساحلی شاہراہ اور دیگر میگا پراجیکٹس کی شہرت سے آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

پیشے: بلوچستان کے ساحلی علاقوں کی اکثریت کی معیشت کا دارومدار ماہی گیری پر ہے۔ تاہم پسنی، کلانچ، نلینٹ اور بسول جیسے مواضعات میں نخلستان بھی ہیں اور زراعت سے بھی گزر اوقات ہوتی رہتی ہے۔ چونکہ معیشت کا زیادہ تر انحصار ماہی گیری پر ہے اس لیے اس کے ذریعے تجارت کو فروغ دینے میں خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس ذریعہ روزگار کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے اقوام متحدہ کے ادارہ خوراک و زراعت کے تعاون سے ۱۹۷۸ میں ایک جامع منصوبہ شروع کیا گیا ہے۔ جس کی ضرورت یہ تھی کہ پرانی طرز کے انجنوں سے محروم کشتیوں میں انجن نصب کئے گئے۔ جس کی بدولت مچھلیوں کی پیداوار چالیس ہزار ٹن سے بڑھ کر بہتر ہزار ٹن سالانہ ہوگئی۔ سمندر میں دور دور تک ماہی گیری کیلئے ماہی گیروں کو ماہرین کی مدد سے تربیت دی گئی اور ماہی گیر اس سے پہلے مچھلیوں کو نمک لگا کر خشک کرتے اور اندرون ملک اور بیرون ملک برآمد کرتے تھے۔ اب انہیں جدید قسم کے برفانی بکس فراہم کئے گئے اس سے مچھلیاں اور جھینگوں کو محفوظ طریقے سے ہوائی سروس کے ذریعے باہر کے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ گوادر میں مچھلی سکھانے کا ایک مرکز بھی دوبارہ کارآمد بنایا گیا ہے۔

۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۱ء کے درمیان وفاقی حکومت نے حکومت جاپان کے قرضوں کے تابع ماہی گیروں کو آسان شرائط اور اقساط پر میرین کے ڈیزل انجن، نائیلون کے جال، ہک، رسی اور فلوٹ فراہم کئے ہیں۔ کشتیوں اور ان کی مرمت کے لیے گوادر میں ایک ورکشاپ تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اسی قسم کے ورکشاپ پسنی، اورماڑہ، جیونی اور حب میں بھی پہلے سے کام کر رہے ہیں۔

۸۵-۱۹۸۴ کے دوران ایشیائی ترقیاتی بینک کے قرضوں سے بلوچستان کے ساحلی علاقوں کے ماہی گیروں کو مزید میرین ڈیزل انجن اور دیگر ضروری آلات اصل قیمت پر دینے کے ساتھ ہی گوادر میں ایک برف خانہ کولڈ سٹوریج وغیرہ تعمیر کر رہی ہے اور مچھلیوں کے چورے سے جانوروں کیلئے خوراک کا کارخانہ بھی گوادر میں قائم کیا جا رہا ہے۔ پاکستان زرعی تحقیقاتی کونسل ڈھائی لاکھ روپے کے خرچ سے یہاں پائی جانے والی مچھلیوں اور شیل فش کے سروے کیلئے ایک منصوبہ منظور کیا ہے جس سے ماہی گیروں کی صنعت کو کافی مدد ملے گی۔

تجارت: گوادر کی اسی فیصد آبادی کا ذریعہ معاش ماہی گیری ہے۔ یہ شہر اگرچہ ماہی گیروں کی جھونپڑی پر مشتمل تھا لیکن غیر مسلم تاجروں نے یہاں پختہ اور نیم پختہ مکانات بنائے۔ گوادر کی موجودہ اہمیت کے باعث اب ماہی گیروں اور دوسرے طبقات نے بھی پختہ مکانات بنائے ہیں۔ گوادر میں یوں تو تمام شہری ضروریات موجود ہیں مگر ایک دور میں یہاں پینے کے پانی کی قلت رہی ہے جب تک جدید پائپ لائن نہیں بچھی تھی گوادر میں پینے کا پانی دو روپے گیلن فروخت ہوتا تھا حکومت نے یہاں شمسی توانائی سے چلنے والا ایک پلانٹ نصب کروایا جو روزانہ دس پندرہ ہزار گیلن پانی پینے کے قابل بناتا تھا۔ یہ بھی شہر کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا کفیل نہیں بنا۔ اب پچاس لاکھ کی لاگت سے گوادر سے چوالیس میل دور "سنٹ سر" سے پائپ لائنوں کے ذریعے گوادر کو پینے کا پانی ضرورت کے مطابق حاصل ہے اس اسکیم کے تحت دریائے دشت کے کنارے واقع "سنٹ سر" نامی مقام پر پانچ ٹیوب ویل کھودے گئے ہیں۔ اس دس انچ قطر کی پائپ لائن سے نگور شریف اور سر بندر کے قصبوں تک پانی کی فراہمی ممکن ہوئی ہے جبکہ بیاڈ اور یونیسیف پروگرام کے تحت ضلع گوادر کے چھپ کلمتی اور گنز کے مقامات پر واٹر سپلائی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ ۱۹۸۵ تک اس ضلع کے گبد، بانڈری، بل بازار، سماتی، پلیری اور پیشکان کے قصبوں کو پانی فراہم کیا جا رہا ہے۔

محکمہ جنگلات نے گوادر کے ریگستانی علاقوں میں متحرک ریت کے ٹیلوں کی منتقلی روکنے کیلئے گوادر اور پیشکان کے علاقوں میں 175 ایکڑ مسکٹ کے پودے اگائے ہیں۔ گوادر، کیچ، پنجگور اگرچہ تاریخی اعتبار سے ایک وسیع خطۂ ارض کے حصے ہیں اور وہ علاقے بھی جو قدیم عہد میں مکران کے حصے رہے ہیں جو مقدد سے بندر عباس تک پھیلے ہوئے ہیں اور موجودہ وقت میں مملکت ایران کے قبضے میں ہیں ان میں تیس، چاہ بہار، سرباز، بھمپور، دزک اور خاش قابل ذکر ہیں جو اس خطے کا حصہ ہیں۔ انگریزوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے تابع یہ ایران کے حوالے کئے تھے۔

مکران کے شہر اور قصبات: مکران میں شہر کی تعریف میں ضلع کیچ کے مرکزی مقام تربت کے علاوہ اور کوئی قصبہ نہیں آتا اس لئے کہ آبادی کے اعتبار سے یہ قصبات و موضعات شہروں کی ہمسری نہیں کرتے۔ مکران کی طوالت چھ سو میل ہے ہم ان قصبات کو گاؤں سے نکال کر چھوٹے چھوٹے شہر کہہ سکتے ہیں۔ "سنٹ سر" سے گبدان جو اورماڑہ کے جنوب میں ہے شمال میں گوسک سے پتاک اور مغرب میں ناگ کا علاقہ ہے۔

چھوٹے چھوٹے شہر: ضلع کیچ تمپ، مند بلیدہ، کولواہ، جوسک، ساسک، گر، پتاک، زامران، ہوشاپ، ضلع پنجگور، خدابادان، چنگان، تسپ ایسی گچک، سوردو، پروم، دشت، شہباز، ضلع گوادر، اورماڑہ، بسول، بلنگور، پسنی، کلگ، کلانچ، نلینٹ، گوادر پیشکان۔

پہاڑوں کے نام: سیاہان کوہ سبز، سوردان، پٹان، سورآپ، درارک، نہنگ، کیچ کوہ اور کیل کور۔

پہاڑی جڑی بوٹیاں جو علاج اور دوا کیلئے تیر بہدف ہیں۔ گل در، درنہ، کلپورگ، ازگند، برنجاسک، گوں جت، مر، ھینگ، گواتک، ازبوتک، کرپچ، سہردار، سدآپ، دربند، بوڈکش، مور، مور پژو، مارموتک۔

مکران میں پرندے: سیاہ بگل، میش مرگ، چرز، بٹ، کبگ، سیسو، کنٹگر، چر، کپوت، شانتو، مرگ سلیمان، ڈاکالوک، سیاہ گوڑ، کینجر، جنگ، کلاگ، کرگز، گوتو، شاہین، وقاب، بھوم۔

مکران کے پہاڑی درندے: شیر، چیتا، بھیڑیا، ریچھ، لگڑ بھگا، ہوز، تولگ، روباہ اور آسک۔

پالتو جانور: اونٹ، گائے، بیل گھوڑے، گدھے، بکری، بکرے، بھیڑ اور ہرن۔

اہم پیداوار: مکران کی سب سے بڑی اور اہم پیداوار کھجور ہے جس کی ساٹھ قسمیں ہیں۔

پنجگور میں کہربا۔ موزاتی۔ جوانسر۔ ربیع۔ ڈنڈاری۔ سبزو، آپ دنتان۔ لینگو۔ مشکیچ پپو۔ زردان کروچ۔ ربو۔ وت رود۔ ردگ وغیرہ۔

کیچ میں کھجور کی قسمیں: بیگم جنگی، ہیلنی، دشتاری، پیش نا، روگنی، گوک نا، کوزہ نبات، شکری، حسینی، سنٹ، گوارک، شوری، شکر، ہارگ، جدگالی اور کونگو۔

مکران کی فصلیں: گندم جو، جوار، چاول، لوبیا، نکنیز، ماش، موٹھ ٹماٹر، آلو، پیاز اور ہر قسم کی سبزیاں۔

پھل: انگور، انار، انجیر، شفتالو، توت، نارنگی، سیب، آم، زیتون، کیلا، خربوزہ اور تربوز۔

مکران کے درخت: کھور، گز، کنر، کبڑ کلیر، پتک، کسوڑ اور پرپک۔

(مکران، تہذیم۔ مضمون یار جان ملازئی۔ رسالہ "سنج" سید ہاشمی اکیڈمی کراچی ص ۸۱ تا ۸۴)

مکران اور ذکری عقائد: "ذکری" دین کا بانی ملا محمد انکی ہے۔ ذکری عقائد کے ماننے والے اپنے اس پیغمبر کا سن ظہور ۹۷۷ھ بمطابق ۱۵۶۸ء بتاتے ہیں۔ سفرنامہ مہدی میں ملا محمد انکی اپنے مقام ظہور کے بارے میں بتاتے ہیں کہ سب سے پہلے میرا ظہور ہند انک میں ہوا۔ ایک دوسرے مطبوعہ کتابچے میں سن و مقام ظہور کی زیادہ تفصیلات ملتی ہیں۔ لکھا ہے۔

"آپ (یعنی ملا محمد انکی) شب دوشنبہ بوقت بام (صبح) قطب (شمال) شہر سے بطرف زمین بصورت انسانی ولباس فقیری انک (ہندوستان) کے پہاڑی علاقے میں ایک اونچے پہاڑ پر ۹۷۷ کو قدم مبارک رکھ کر آشکار ہوئے۔"

"ذکری" دین کے ماننے والے خود کو "ذکری" کہتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق ان کے پیغمبر ملا محمد انکی نے نماز کو منسوخ کر کے ذکر کو فرض قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ خود کو ذکری اور مسلمانوں کو نمازی کہتے ہیں۔ مکران میں ملا محمد انکی جو بعد ازاں مہدوی سے موسوم ہوئے ۲۰-۱۰۱۹ھ ۱۰-۱۶۰۹ء میں مکران کے مرکزی شہر تربت میں آئے جہاں دو مقامی حکومتوں یعنی بلیدی اور ملک نے ذکری دین قبول کیا۔ کیچ کے حکمرانوں کے وزیر دربار اور ذکریت کا سرگرم مبلغ ملا مراد گچکی نے اپنی قوت واقتدار کے بل بوتے پر اس دین کو پورے مکران پر مسلط کر دیا۔ کوہ مراد جہاں رمضان المبارک میں ذکری زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ کوہ مراد پر "کہور" کا ایک درخت جسے ذکری وحی کے نزول کا مقدس مقام بتاتے ہیں اور مکران میں ایرانیوں کی بنائی ہوئی قدیم ترین کاریز "خسروی" کے سرچشمہ ندی دوکرم کو آب زمزم قرار دیتے ہیں۔ یہ ندی کوہ مراد سے نکلتی ہے۔ ذکری عقیدہ کے ماننے والوں کی ذکر کی مسجد میں محراب نہیں ہوتا۔ (ذکری مسئلہ مولانا عبدالحق بلوچ)

مکران کی شمالی حدود سے ایک اور علاقہ "آواران" شروع ہوتا ہے جس کا مرکز کولواہ ہے۔ اس علاقے میں آواران، منگلی مشکے، نال اور پھر خضدار آتا ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ رند اور لاشار جن کی معیشت کا دارومدار مالداری پر تھا۔ جب مکران میں چراگاہوں کی کمی ہوگئی تو یہ قبائل کولواہ کی طرف بڑھے۔ آشال نام کے قصبے میں رند لاشار سردار شہک کے ہاں چاکر خان پیدا ہوئے۔ یہ سال ۱۴۵۴ تھا۔ چاکر خان آشال ہی میں جوان ہوئے۔ والد نے ان کی شادی کرادی چونکہ سردار شہک کی عمر ۸۰ سال کو پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے سرداری کی دستار اپنے محنتی ذہین اور قابل صاحبزادے چاکر خان کو پہنادی۔ رند قبیلہ کی طرح لاشار قبیلہ بھی تعداد اور عسکری صلاحیت سے مالا مال تھا اس کا سربراہ میر گہرام خان لاشاری تھا۔ آشال سے خضدار تک یہ متحدہ قبائل آگے بڑھے پھر ایسا ہوا کہ میر گہرام لاشاری نے درہ مولا کی طرف رخ کیا اور رند سطح مرتفع قلات کی جانب گئے۔

(چاکر اعظم ترجمہ عبدالغفار ندیم باب سوئم بلوچ اعظم ص ۱۰۹) (سفرنامہ مہدی نیاز کیش عمرانی کراچی یکم مئی ۱۹۷۲ء)

بلوچستان کے درے

بلوچستان میں دو درے نہایت اہم اور تاریخی حیثیت کے مالک ہیں۔ بولان اور مولہ۔ بلوچستان کے دو مشہور درے ہیں جہاں سے قندہار، گرم سیل، ہرات اور سیستان سے تجارتی قافلے سندھ و ہند آیا جایا کرتے تھے۔ ان دروں میں سے گزرنے والے حملہ آوروں نے نہ صرف بلوچستان کی تاریخ بدل ڈالی بلکہ سندھ و ہند کی تاریخ اور ثقافت پر بھی ان کا گہرا اثر پڑا ہے۔ لہذا ان دروں سے متعلق کسی قدر تفصیلی بیان ضروری ہے۔

دَرہ بولان: یہ درہ کوئٹہ کی جنوب مشرقی سمت سے شروع ہو کر رندعلی (ڈھاڈر) کے مقام پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی کل لمبائی 64 میل ہے۔ اس میں تمام سال مناسب مقدار میں پانی جاری رہتا ہے جس سے ڈھاڈر اور قرب جوار کا علاقہ سیراب ہوتا ہے۔ پیراللہ یار شاہ کے مقام پر اس پر ایک کچا بند باندھا گیا تھا جس سے بھاگ ناڑی کے بالائی علاقے اور کٹھن کے دیہات کو سیراب کیا جاتا تھا 1984ء کے سیلاب کی وجہ سے یہ بند بہہ گیا۔

(۱) ڈھاڈر برصغیر پاک و ہند کی عظیم شاہراہ درہ بولان کے جنوب مشرقی دہانے پر واقع ہے اس لیے "دہان در" کہتے تھے جو ہوتے ہوتے بگڑ کر ڈھاڈر مشہور ہو گیا۔)

(۲)۔ ڈھاڈر تاریخ کے آئینے میں۔ میر عبدالمجید شاہ، بلوچی دنیا ملتان اکتوبر 1967ء، سرمست بلوچستان۔ ذکیہ سردار خان کوئٹہ 1965 ص ۱۷۳)

وجہ تسمیہ: اس درے کا نام بولان کیسے پڑ گیا؟ تاریخی طور پر محققین کا کہنا ہے کہ جدر جس کا بلوچستان کے یونانی عہد میں نام "جدروشیا" رہا ہے بولان اُسی شخصیت کے بیٹے کا نام تھا۔ میر گل خان نصیر نے اپنی کتاب بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ میں لکھا ہے کہ:

"بل اور بول سورج دیوتا کی اسم صفت ہے جیسے کہ بلوچستان کے بارے میں یہ حوالہ دیا جا چکا ہے کہ بعض مورخ و محقق اسے بل۔ کوچ استان کی بگڑی ہوئی شکل وصورت سمجھتے ہیں اسی لحاظ سے اسے بل یا بول یعنی سورج دیوتا کے نام سے منسوب کرنا قرین قیاس ہے۔" (۱۔ بلوچستان قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں میر گل خان نصیر ص 65 تا 68)

بعض قبیلے اسے قبیلہ بہلانا سے منسوب کرتے ہیں جو "جنگ دہ ملک" میں شامل تھا۔ (۲۔ بلوچستان گزیٹر)

فردوسی شاہنامے میں کیکاؤس نامی شاہ ایران کے زمانے کے سابقات کے بیان میں اس درے کے نام کا اگرچہ ذکر نہیں کرتا لیکن "دشت" کے حوالے سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔

که نزدیک زابل به سی روزه راه
یکے کوه بد سرکشیده به ماه
به یک سوئے او دشت خرگاه بود
دگر دشت زای هندوواں راه بود

یعنی زابل (افغانستان) سے تیس دن کی مسافت پر ایک سر بفلک پہاڑ تھا۔ اس پہاڑ کی ایک طرف دشت خرگاہ (مستونگ) واقع تھا اور دوسری طرف وہ دشت تھا جہاں سے ہندوستان کو راستہ جاتا تھا۔ اسی پہاڑ پر کک کوہزاد اپنے قلعے میں رہتا تھا۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ فردوسی نے جس دشت کا ذکر کیا ہے یہ موجودہ وقت میں سریاب سے کولپور ریلوے اسٹیشن تک پھیلا ہوا ہے۔ فردوسی کہتا ہے۔

نشسته در آں دشت بسیار کوچ
ز اوغان لاچین کرد و بلوچ

درہ مولا یا مُولا: مولا دراصل مورہ ہے جس کے معنی ہیں بھرپور، بھرا ہوا یا طوفان بدوش۔ لسانیات کے مطابق ل۔ ر سے بدل کر مولا ہوا۔ بلوچی میں اسے "میلہ" بھی کہتے ہیں۔

مولا میں اوپر کی طرف سے داخلے کے دو راستے ہیں۔ ایک خضدار کی طرف سے اور دوسرا زہری کی جانب سے۔ خضدار سے کوٹھرو (کچھی) تک جہاں پر یہ درہ گنداوہ میں داخل ہوتا ہے، اس کی لمبائی تقریباً سو میل ہے۔ جنوب مشرقی سمت میں پچاس میل تک یہ درہ ایک گہری وادی اور چٹانوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں لولنگ اور چٹوک کی چٹانیں قابل دید ہیں اسی درے میں میرگٹ اور کیل کی مشہور اور دشوار گذار گھاٹیاں ہیں۔ درہ مولا کئی ایک مشہور حملہ آروں کی گذرگاہ رہا ہے۔ یہ سال تک پانی سے لبریز رہتا ہے جو پہاڑوں سے گذر کر کچھی کے علاقہ گنداوہ کو سیراب کرتا ہے۔ میدانی علاقے میں اس کے پانی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) زور گڈھ (یہ سابق ریاست قلات کا حصہ ہے)، (۲) پنجاک (یہ مگسی قوم کا حصہ ہے)، (۳) نوشہرہ (موسیانی اور سادات کا حصہ ہے)، (۴) پاچ (کرخ کے باسیوں کا حصہ ہے)، (۵) گنداوہ کے لوگوں کا حصہ۔

یہی وہ تاریخی راستہ ہے کہ کولواہ آشال میں رند سردار چاکر خان کی دستار

بندی کے خلاف بطور احتجاج گوہرام خان نے لاشاریوں کی رہنمائی کرتے ہوئے گاجان سے ہوکر کچھی پر قبضہ کیا اور لاشاریوں کا سردار بنا۔ مورخین کا خیال ہے کہ ۵۳۳ق۔م میں سکندر اعظم کا مشہور سپہ سالار نکو ٹار سیلوکس اپنی فوج کیساتھ ہندوستان سے واپسی پر اسی درے سے گزرا اور بلوچستان کو اپنے زیر نگین رکھا۔ سندھ کے راجہ رائے پچ نے بھی گدروشیا پر یلغار کے لیے اسی درے کا استعمال کیا۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے بلوچستان کے حکمران میر محراب خان کو قلات میں شہید کرنے کے بعد اپنی فوج کو درہ مولہ سے گزارا۔

درہ مولہ کی دوسری شاخ قلات کی جنوبی پہاڑیوں سے سوراب پہنچا دیتی ہے جو سوراب کی مغربی سمت میں "جنگل کھور" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہاں پر "مار آپ" "سیاہ کنب" کی پہاڑی ندیاں شامل ہوتی ہیں۔ یہاں سے بڑھنے پر نال کی ندی کے قریب پہلی شاخ سے وادی گریشہ سے گزر کر آواران اور جاہو سے آگے ہنگول پہاڑ کے قریب سمندر میں جا گرتی ہے۔ ہنگول دراصل ہنگلاج سے مشتق ہے جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

انگریز فوج کے کپتان ڈبلیو ایس اے لاک ہارٹ نے جب فوجی نکتہ نگاہ سے اس درے کا جائزہ لیا تو وہ لکھتا ہے کہ اس درے میں جہاں کہیں کھلے میدان (بھینٹ) پائے جاتے ہیں وہ تنگ پہاڑی راستوں سے ملے ہوئے ہیں جو کہ مورچہ بندی کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ علاوہ ازیں ایندھن اور شفاف پانی بھی بکثرت دستیاب ہے۔ اگر ندی کے بائیں کنارے سے سفر کیا جائے تو بہت مناسب اور موزوں ہے اور فوجی مہمات میں خیمہ زن ہونے کے لیے کافی حد تک آرام دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایندھن اور صاف پانی بھی اس درے میں بکثرت دستیاب ہے۔ شکاریوں کے لیے درہ مولا کے قرب وجوار کے پہاڑوں میں پہاڑی بکرے ہرن اور پرندے مل جاتے ہیں۔ (بلوچستان قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں۔ میر گل خان نصیر۔ ص ۱۷ تا ۳۷)

بلوچستان کے قلعے: بلوچستان میں قدیم دور کے قلعے ہر ایک علاقے میں ملتے ہیں۔ یہ قلعے انگریزوں اور پرتگیزوں سے مقابلے سے بھی پہلے زمانے کے ہیں۔ کچھ ایرانی بلوچستان میں ہیں جیسے قلعہ باہو، بھمپور کا قلعہ یا افغان علاقے میں چخا سور کا قلعہ۔ یہ اس دور کے ہیں جب بلوچ قوم نے کرمان سے ہجرت کی تھی۔ پاکستانی بلوچستان میں جب سندھ کی سرحد پھلانگ کر بلوچستان میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے فتح پور کا قلعہ آتا ہے۔ یہ چاکر اعظم کا تعمیر کردہ ابتدائی دور کا قلعہ ہے۔ بعد ازاں چاکر اعظم نے سبی میں قلعہ تعمیر کیا۔

سبی کا قلعہ: یہ قلعہ سبی شہر کے مغرب میں واقع ہے جس کے مغرب میں دو مقابر ہیں۔ ان میں ایک میں بی برگ رند کی اہلیہ بی بی گرانا زدفن ہیں۔ دوسری قبر بھی کسی نامور خاتون کی ہے مگر کتبہ اکھڑ جانے کے باعث نام معلوم نہیں ہو سکتا۔ قلعہ خاصا وسیع ہے۔ مشرقی سمت میں دروازے سے متصل ایک مینار کی سیڑھیاں ہیں جن پر چڑھ کر سبی کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ دیواریں اگرچہ مٹی سے بنی ہوئی ہیں مگر اندر کی خشتیں پختہ ہیں۔ اس قلعے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پندرویں صدی کے زمانے کا ہے جب سردار چاکر خان سبی اور گردونواح کی امارت پر متمکن تھے۔

گاجان کا قلعہ: گاجان کا قلعہ سردار گہرام خان لاشاری کے دور کا ہے لیکن کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ لاشاریوں کی آمد سے بہت پہلے کا ہے۔ جسے ایرانی حکمران بہمن نے تعمیر کرایا تھا۔ بہمن کے دور کی ایک اور یادگار کاریز ہے جو ایران کے حکمرانوں نے نکالی تھی۔ ایسی دو ایک اور کاریزات بھی ہیں جیسے خسروی کاریز یا خاران کے "گبر بند" گاجان کا قلعہ بھی اسی دور کا ہے۔ رند اور لاشار کی تیس سالہ جنگ کا آخری معرکہ قلعہ گاجان کے پاس ہوا۔ جب ۱۴۵۰ء میں بلوچ قبیلہ رند اپنے دوسرے اتحادی قبیلوں کے ساتھ بولان کے راستے قلات سے سبی میں وارد ہوا تو نامور شخصیت میر جان نے ڈھاڈر میں ایک قلعہ تعمیر کیا۔

ڈھاڈر کا قلعہ بولان درے کے مشرقی دہانے پر اب تک میر جان قلعے کے نام سے موجود ہے۔ میر حان رند لاشار کی پہلی لڑائی میں کھیت رہا تھا۔ خاران میں میر آزاد خان کا قلعہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ بلوچستان کے شمالی اضلاع میں جس کی ابتدا کوئٹہ سے ہوتی ہے کوئٹہ، پشین، ژوب، لورالائی کے اضلاع شامل ہیں۔ یہ تمام علاقے پشتون قوم کے مساکن ہیں۔ ان اضلاع میں جو قلعے بنے ہیں، ان کی تفصیل اسی طرح ہے۔ کوئٹہ شہر میں "قلعہ کاسی" کوئٹہ کے شمال میں "قلعہ شال" جبکہ ضلع پشین میں قلعہ عبداللہ (اب قلعہ عبداللہ ایک الگ ضلع ہے)، قلعہ سیف اللہ اور زیارت کا قلعے قابل ذکر ہیں۔ بلوچستان کے جنوب مغرب میں مشہور قلعے:

قلعہ میری: یہ قلعہ قلات میں واقع ہے جو راجہ سیوا سے منسوب ہے۔ 1931ء کے زلزلے میں اسے بہت نقصان ہوا اور ایک نیا قلعہ خان آف قلات نے تعمیر کیا۔ اب قلعہ میری پہاڑی کی مٹی سے دب کر رہ گیا ہے۔ جن لوگوں نے یہ قلعہ دیکھا تھا وہ اس کی بہت ستائش کرتے تھے۔

بلوچستان کے قلعوں میں کیچ میں پنوں کا قلعہ مشہور ہے۔ سندھی زبان

کے شہرہ آفاق مورخ اور سکالر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اس قلعے کو گیارویں صدی میں سندھ کے مشہور حکمران دلورائے کے عہد سے منسلک کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مکران سے دریائے دجلہ وفرات کی وادیوں سے سندھ تک ایک اہم تجارتی شاہراہ پر یہ قلعہ واقع تھا جسے ہوت بلوچوں کے حکمرانوں نے تعمیر کیا تھا۔

(۱۔ داستان سسی پنوں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ص ۷)

مکران میں پنوں قلعہ کے علاوہ قلعہ ناصر آباد اور پنجگور کا قلعہ اب تک موجود ہے۔ یہ قلعے مقامی حکمرانوں نے بنائے تھے تاہم افسوسناک حقیقت ہے کہ تعلیم کے فقدان کے باعث بیشتر قلعوں کے بارے میں تاریخی معمولات دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ بلوچستان کا ایک قلعہ شال (کوئٹہ) ہے جس کے بارے میں جناب ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے ہر اعتبار سے پوری تفصیل سے بیان کی ہے۔

((۱)۔ نقوش بلوچستان۔ پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر ص ۱۶۶ تا ۱۷۱)

کوئٹہ یا کواٹہ کوٹ (قلعہ) کی ہی ایک اور صورت ہے اور اس نام کا وزنی جواز تھا۔ اسے شالکوٹ بھی کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں جب افغانستان برصغیر پاک و ہند کا ایک صوبہ تھا۔ یا ایران کے زیر نگین تھا کوئٹہ کی بڑی اہمیت تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلا یورپین سیاح جو یہاں وارد ہوا، میسن تھا۔ یہ ۱۸۲۸ کا ذکر ہے جب برصغیر میں کمپنی کا عمل دخل تھا اور دہلی کے تخت پر آخری مغل بادشاہ یا مغولان صغیر براجمان تھے۔ میسن نے اپنی روئداد میں لکھا ہے کہ ۱۸۲۸ کے قریب کوئٹہ شہر میری (قلعہ) کے اردگرد آباد تھا۔

میری مٹی کا وہی ٹیلہ ہے جو چھاؤنی میں واقع ہے اور جنگ کے دوران آرسنل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس قلعہ نما ٹیلے کے چاروں طرف خندق کھودی ہوئی تھی اور خندق کے قریب ہی پانی ناتھ کا مندر تھا۔ یہ مندر اس امر کا انکشاف کرتا ہے کہ مسلمان حکمران اپنے دور حکومت میں غیر مسلم رعایا کے مذہبی احساسات و جذبات کا کس حد تک احترام کرتے تھے۔ اس زمانے میں شہر تین سو کے لگ بھگ مکانات پر مشتمل تھا ایک اچھا خاصا بازار ضروریات کی بہم رسانی کے لیے موجود تھا جسے صوبائی شہر کی حیثیت کے مطابق فروتر سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس کے گیارہ سال بعد جب انگریزی حکومت کی منظم کردہ انڈس آرمی کوئٹہ پہنچی تو یہ خطہ پولیٹکل ایجنٹ کا صدر مقام بن گیا اور اکتوبر ۱۹۴۲ تک اس کی یہی حیثیت برقرار رہی۔ مقامی قبیلے اس پر کئی بار حملہ آور ہوئے۔ ۲۳ جون ۱۹۴۰ کا حملہ بڑا شدید تھا جس میں صرف دو گن چلانے والے بلوچ مارے گئے اور ایک سپاہی زخمی ہوا۔ حملہ آوروں میں بائیس قتل، تین قیدی اور بہت سے زخمی ہوئے۔ جب ۱۸۷۶ میں اس پر دوبارہ قبضہ کیا گیا اس زمانے میں میری میں خان قلات کے سپاہیوں کی ایک مختصر محافظ فوج متعین تھی جس میں بندوق چیوں کی ایک ٹولی، پیادہ فوج کی ایک کمپنی اور ۲۰ گھڑ سوار شامل تھے۔ لیکن ۱۸۷۷ میں المناک واقعات رونما ہوئے جن کے باعث لفٹیننٹ ہیوسن مارا گیا۔ لفٹیننٹ کن ہارڈ اور کپتان سکاٹ زخمی ہوئے۔ ان حالات کے تحت انگریزوں نے میری کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ بعدازاں میری کے آس پاس کے شہر کو موجودہ مقام پر منتقل کیا گیا اور میری کو اسلحہ خانہ میں تبدیل کیا گیا۔ ہیوگز نے لکھا ہے کہ شہر کے اردگرد مٹی کی ایک دیوار تھی جس میں مشرقی اور جنوبی جانب دو بڑے بڑے دروازے تھے۔ جنوبی دروازے کو شکارپوری گیٹ کہا جاتا تھا۔ شہر کے وسط میں ایک مصنوعی ٹیلے پر میری کا قلعہ تھا جہاں حاکم وقت امامت پذیر ہوتا۔ یہیں سے گردونواح کی وادی کا دلکش اور جامع منظر دل و دماغ کو فرحت بخشتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قلعہ میں صرف ایک ہی توپ تھی۔

ڈاکٹر بیلیو کا کہنا ہے کہ ۱۸۷۲ میں اس قلعے کا محافظ دستہ ۱۰۰ پیادہ (جن میں زیادہ تر افغان تھے) ۴۰ گھڑ سواروں اور چند ایک توپچیوں پر مشتمل تھا۔ وہی مصنف تحریر کرتا ہے کہ ۳۰ جنوری ۱۸۷۸ کو صبح سات بجے درجہ حرارت ۱۸ درجے تھا۔ موسم گرما میں یہاں کی آب و ہوا خوشگوار سمجھی جاتی تھی کیونکہ چاروں اطراف سے چلنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے گرمی اعتدال پر رہتی۔ اس وادی کے قرب و جوار میں کئی میوہ دار باغ اور باغیچے تھے۔ پانی کی کمی نہ تھی۔

۱۸۷۶ میں انگریزوں کے قبضہ سے پیشتر کوئٹہ شہر میری کے آس پاس آباد تھا۔ جس میں قریباً چار ہزار لوگ بستے تھے۔ ۱۸۷۶ اور ۱۸۹۱ کے مابین جب پہلی مردم شماری ہوئی تو آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۱ میں آبادی ۱۸,۸۰۲ ہو گئی جس میں ۷,۵۰۰ افراد چھاؤنی میں رہتے تھے، ۱,۳۰۲ سول لائنیز اور ریلوے حدود میں سکونت پذیر تھے۔ ۱۹۰۱ میں کل گھروں کی تعداد ۶۹۴۵ ہو گئی جس میں ۵۸۲, ۱۲۴ افراد موجود تھے۔ اس زمانے میں عمارتیں زیادہ گارے مٹی اور کچی اینٹوں سے بنائی جاتی تھیں حتیٰ کہ ریذیڈنسی کی عمارت بھی کچی تھی۔ عمارتی لکڑی کی کمی تھی۔ ٹین کی چادروں کا رواج نہ تھا اس لئے چھتیں لال کھپریل کی مخروطی شکل کی بنتی تھیں۔ شہر کے جس حصے میں بعد میں ریذیڈنسی روڈ بنی، وہاں نہ درخت تھے، نہ سبزے کا نشان ملتا تھا۔ چنار کے سایہ دار درخت بھی ۱۸۷۷ کے بعد لگوائے گئے۔

کوئٹہ میری (قلعے) کی لمبائی بیضوی انداز چھ سو فٹ چوڑائی، چار سو فٹ، سطح زمین سے بلندی ۶۰ فٹ ہے۔ میجر جے ایف گاروڈ نے ۱۸۸۷ میں میری کے بارے میں لکھا تھا کہ کوئٹہ میری سخت مٹی کا ایک ڈھیر ہے جسکی بلندی پر چند ایک گھر

تھے جو غالباً گاؤں یا شالکوٹ کے مختصر شہر کے سرداروں کے قبضہ میں تھے۔ دیگر مکانات میری کے سائے میں ایک دوسرے سے ملحق تھے۔ ۱۸۸۳ء میں اس ٹیلے کی بنیادی تہہ کو کھودا گیا تا کہ اسلحہ خانہ بنایا جاسکے۔ (اس سے قبل اس ٹیلہ میں چند سرنگیں بھی جاتی تھیں لیکن زیادہ اہم قسم کی اشیاء ہاتھ نہیں لگیں ورنہ ان کا کہیں نہ کہیں تذکرہ مل جاتا)۔ چند ہڈیاں دستیاب ہوئیں، جن میں سے کچھ انسانی تھیں۔ گاروڈ مزید لکھتا ہے کہ تقریباً ایک سال پیشتر میں نے میری کی چوڑائی کو چند عمارات کی تعمیر کی خاطر صاف کروانا شروع کیا۔ اس ٹیلہ کی بلندی کو ۵ فٹ تک کھودا گیا جو کھدائی کے مقامات کے مقابلہ میں تقریباً ۱۵ فٹ زیادہ ہی تھا۔ گویا اس طرح سمجھیں کہ قریباً ۲۰ فٹ تک کھدائی ہوئی۔ اس کھدائی کے دوران عجیب مواد سے دوچار ہونا پڑا جس سے اس ٹیلے کو بنایا گیا ہوگا۔ ہر طرف زمین ہڈیوں، مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں، راکھ اور جلی ہوئی لکڑی یا لکڑی کے کوئلہ سے پٹی پڑی تھی۔ ہڈیوں کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ پالتو جانوروں کی ہیں، لیکن کون سے جانوروں کی، اس کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا اس لیے اس کے نمونے کلکتہ میں تحقیق کے لئے بھیج دیئے گئے۔ گہرائی کی زیادتی کے مطابق ان میں بھی کمی ضرور ہوئی لیکن پھر بھی تعداد خاصی ہی رہی۔ چوٹی کے قریب اکثر بڑے بڑے گھڑے ہاتھ لگے۔ ان دنوں ویسے برتن اس ضلع میں نہیں بنائے جاتے تھے۔ وہ لوگ جو مٹی کو ہٹانے کے وقت مستقل طور پر وہاں موجود تھے، ان کا عام تاثر یہ تھا کہ یہ آثار لازمی طور پر زیادہ قدیم وقتوں کے نہیں ہیں اور اس ٹیلے پر یقیناً محدود عرصے کے لیے ایک نسل کے بعد دوسری نسل مقیم رہی ہے۔ گاروڈ آگے چل کر کہتا ہے کہ میں ابھی تک شش و پنج میں ہوں کہ خاص گہرائی پر بنی ہوئی لکڑی کے ڈھیروں کا ذکر کرتا ہوں جن میں زیادہ تر بالکل تازہ تھے اور لکڑی کے اندرونی دھاریوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ سر آلیور سینٹ نے قلعہ عبداللہ کے ٹیلے کے بارے میں بھی ایسی ہی عجیب باتوں کا انکشاف کیا ہے۔

لکڑی کا کوئلہ جو مقابلتاً بہت دیرپا ہوتا ہے، کسی بھی زمانے کا ہوسکتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اس کی کثرت ضرور حیران کن ہے۔ میں یہ خیال نہیں کرتا کہ اس زمانے میں عمارتیں معیاری طور پر آگ سے تباہ و برباد کی جاتی ہوں گی جیسا کہ اس کا ثبوت چند قدیم یونانی شہروں میں ملتا ہے۔ میری ذاتی رائے ضرور ہے کہ جلی ہوئی لکڑی کے ڈھیر اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان سے کام لیا جاتا ہوگا۔ کوئٹہ میری میں جو چند دلچسپ چیزیں برآمد ہوئیں، انہیں کلکتہ کے عجائب گھر کو بھیج دیا گیا۔ ان میں کچھ برتن ایک نگینہ اور زرد سرخ بادامی رنگ کا اناج پیسنے والا پتھر، عجائب گھر والوں کا خیال ہے کہ غالباً زمانہ ماقبل تاریخ سے متعلق ہیں۔ نہ چیزیں نچلی سطح سے ہاتھ آئیں لیکن یہ یونانی مجسمے سے اوپر تھیں اور اس سے نیچے کانسی کا برتن بھی ملا جو یونانی ہوسکتا ہے۔ ٹیلے کے مرکز میں سے ہرکولیس کی ایک مورتی دستیاب ہوئی جو سوا دو فٹ اونچی تھی اور اس نے الٹے ہاتھ میں شیر کی کھال پکڑی ہوئی تھی مورتی کو زیادہ تر گھن نے کھالیا تھا لیکن پھر بھی تقریباً مکمل تھی اور سخت مٹی میں پیوست پائی گئی۔ اس مورتی کے آس پاس اور نیچے کی زمین کو احتیاط سے کئی فٹ کھودا گیا لیکن سوائے جانوروں کی ہڈیوں کے اور کچھ ہاتھ نہ لگا۔ درمیانی سطح پر ایک چھوٹا سا مٹی کا گملا ملا جس پر تنگ حصہ کے نیچے گملہ کے پھیلاؤ کے اردگرد زاویہ دار روغنی نشانات ملتے ہیں۔ میجر شیفرڈ کو بھی اس قسم کے برتن ملے تھے۔

کوئٹہ میری کھدائی صرف بیس فٹ ہوسکی اور یہ صرف اس کھدائی کے نتائج تھے جو بیان کئے گئے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ اس ٹیلہ کی بلندی ۸۰ فٹ ہے۔ گویا ابھی تین حصے باقی ہیں۔ اگر اس طرف مزید توجہ دی جائے تو یقینی طور پر بہت سی باتوں کا علم ہوسکے گا اور عین ممکن ہے کہ انتہائی قدیم چیزیں مل سکیں جو نہ صرف ہمارے لئے بلکہ دنیا بھر کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکیں اور پروفیسر سٹوارٹ پگٹ کا یہ انکشاف کہ وادی سندھ کی تہذیب سے بھی پہلے کوئٹہ میں ایک دیہاتی خود کفیل تہذیب موجود تھی عملی روپ دھار کر ہمارے سامنے آئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی اس میری کے چاروں طرف کوئٹہ آرسنل کی عمارتیں تعمیر کی گئیں جو زلزلے میں گر گئیں۔ زلزلے کے بعد دوبارہ اس مقام پر آرسنل کے گودام اور ورکشاپ، فوجی دفاتر کی عارضی عمارتیں تعمیر کی گئیں، لیکن اب ان عمارتوں سے کوئی کام نہیں لیا جاتا، کیونکہ آرسنل کی نئی عمارتیں چھاؤنی میں منتقل ہوچکی ہیں۔ میری کے گرد جو سرخ رنگ کا بنگلہ نظر آتا ہے وہ انگریزوں کے دور میں بنوایا گیا۔ انگریزوں سے قبل صرف خندق کی کھدائی ہوئی تھی۔ ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ مٹی کا ٹیلہ قدرتی نہیں بلکہ احمد شاہ ابدالی کی فوج کے جو لوگ درہ بولان کی راہ سے ہندوستان گئے تھے وہ اپنے ہمراہ گھوڑوں کے توبڑوں میں مٹی بھر کر لائے تھے اور نشان راہ کے طور پر مٹی یہاں جمع کی تھی۔ جب یہ سپاہی ہندوستان سے واپس آئے تو کئی سپاہی اپنی مٹی کا حصہ اپنے ہمراہ افغانستان لے گئے۔ اس واقعہ کی تاریخی طور پر تصدیق نہیں ہوتی۔ میری کے نام سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اسے قلات کے خوانین نے قلعے کی شکل دی تھی۔ ممکن ہے کہ مٹی کا ٹیلہ قدرتی طور پر پہلے سے موجود ہو۔"

بلوچستان کے غار: بلوچستان کے جنوب مشرق میں لسبیلہ کا علاقہ ہے۔ اس کی تاریخ جانی پہچانی ہے۔ سلسلہ کوہ پب جو خضدار کے جنوب سے شروع ہوتا ہے، منگھوپیر

کراچی کے قریب ساحل تک جاتا ہے۔ یہ شمالاً جنوباً زیرین جھالاوان اور لسبیلہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی کل لمبائی ایک سو نوے میل ہے۔ اس کی سب سے بلند چوٹی کا نام "فراسن" ہے جس کی بلندی سات ہزار سات سو فٹ ہے۔ اس پہاڑ پر گھاس بکثرت ہوتی ہے۔ اس لئے اس پر آباد لوگ بھیڑ، بکریاں، گائے اور بیل پالتے ہیں۔ اس پہاڑ میں بڑے بڑے غار پائے جاتے ہیں۔ ان غاروں میں برسات اور موسم سرما میں مالدار اپنے مویشی رکھا کرتے ہیں۔ ان غاروں میں "لاہوت" جو کراچی سے ستر میل کے فاصلے پر ہے قابل دید ہے۔ غار کے اندرونی آثار سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں پر مہاتما بدھ کی مورتی رکھی گئی تھی جو اب ٹوٹ کر شکستہ ہو چکی ہے۔ اس کے نقوش مٹ چکے ہیں۔ غار کی چھت چٹان ہے جو تراشیدہ تین ستونوں پر قائم ہے جن میں درمیانی ستون چھت سے کچھ نیچے ٹوٹ چکا ہے۔ غار کے اندر چٹان سے تراشا ہوا ایک حوض ہے، جس میں چھت سے پانی ٹپکتا ہے، جو برف کی طرح ٹھنڈا ہے۔

دوسری چھوٹی بڑی ندیوں کے علاوہ پورالی (پر خالی) کی مشہور تاریخی پہاڑی ندی اس سلسلہ کوہ کو عبور کر کے لسبیلہ کی وادی میں جا نکلتی ہے۔ لسبیلہ جٹ، جدگال اور جاموٹ عوام کا مرکزی مقام ہے۔ جٹ، جدگال، جاموٹ ایک ہی نسل کے لوگوں کی پہچان ہے۔ جٹ وہ لوگ ہیں جن کو عرب روزنامچہ نویسوں نے "زط" لکھا ہے۔ بلوچ انکو "جت" کہتے ہیں۔ یہ مالدار اور گلہ بانی کے لوگ ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے بلوچی "جت" کے معنی ساربان یا اونٹوں کا گلہ پالنے والوں کے ہیں۔ ان کے رؤسا اور معتبرین کو جام کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جام کے معنی ہیں تنومند اور قوی غالباً اسی جام سے جاموٹ بنا ہے۔

قدیم تاریخی آثار پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک محقق کا کہنا ہے کہ لسبیلہ کے باشندوں کی اکثریت جٹ اور گجر پر مشتمل ہے جو پانچویں صدی عیسوی میں بلوچستان میں وارد ہوئے اور جنوبی بلوچستان کے قدیم اور اصل باشندوں کو جو ساکا نژاد قبائل سے تھے زیر کرنے کے بعد ان کے تمام وسائل پر قابض ہو گئے۔ ساکا نژاد قبائل یا تو سندھ کی طرف ہجرت کر گئے یا پھر انہیں جٹ اور جاموٹ قبیلوں میں مدغم ہو کر زندگی بسر کرنی پڑی۔ اسی محقق نے مزید لکھا ہے کہ اس بات پر تمام مورخ متفق ہیں کہ ایشیائی ممالک پر جب سفید ہنوں (یعنی منگ) نے حملے شروع کئے تو ان کے ساتھ جٹ اور جاموٹ اور گجر بھی شامل تھے۔ سفید ہن (منگ) بلوچستان میں پانچویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف کے دوران داخل ہوئے۔ سفید ہنوں اور جٹ کا باہمی رشتہ غیر واضح ہے۔ یہ تک معلوم نہیں کہ یہ لوگ کہاں ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔ اکثر مورخین جٹ قبائل کا رشتہ اس قوم سے ملاتے ہیں جو مشرقی ایران میں "مسہ جٹو" کے نام سے مشہور ہے اور یہ باختر کے علاقے میں کثیر تعداد میں بود و باش رکھتے ہیں۔ یہی علاقہ گجر قبائل کا بھی وطن ہے تھا۔ ان کو ایرانی "گاو دار" کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان قبائل کا سیاسی پس منظر کچھ بھی ہو جب یہ لوگ بلوچستان میں داخل ہوئے تو ان کی سوسائٹی تین طبقوں پر مشتمل تھی۔ سب سے اونچا طبقہ سفید ہنوں کا تھا جو منگ کہلاتے تھے۔ جو زبردست جنگی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ بڑے بہادر جری اور نڈر واقع ہوئے تھے۔ دوسرا درمیانی طبقہ جٹ اور گجر قبائل پر مشتمل تھا جنکا پیشہ زراعت کے ساتھ ساتھ پرورش حیوانات بھی تھا۔ تیسرا طبقہ "نقیب" جو خیمہ برداروں کی حیثیت میں مندرجہ بالا دو طبقوں کے ساتھ شامل ہو کر آئے۔ فی زمانہ لسبیلہ کے علاوہ جدگالوں کی ایک بڑی تعداد کچھی اور جھالاوان کے علاقے کرخ میں آباد ہے۔ ایرانی بلوچستان کے علاقہ باہو میں بھی جدگال بستے ہیں، جہاں ان کی مضبوط سرداری قائم ہے۔

((۱) روزنامہ جنگ کوئٹہ کے ۱۸ دسمبر ۱۹۷۵ء کے شمارے میں شائع شدہ مضمون سے اقتباس۔)

بلوچستان میں جہاں غاروں کا ذکر ہوتا ہے وہاں قلعے بھی کثرت سے ہیں۔ خاران جو قلات سے وابستہ ریاست رہ چکا ہے اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ یہ رخشانی قوم کی ایک شاخ نوشیروانی نوابین کی دھرتی ہے جو ایران کے شہنشاہ نوشیروان عادل کی نسل کے مدعی ہیں۔ اس کے نامور نواب آزاد خان گذرے ہیں، جن کا خاران شہر میں قلعہ واقع ہے۔ آزاد خان اور قلات ریاست کے خان خداداد خان میں چند ایک معاملات میں کشمکش ہوئی۔ انگریزوں نے ریاست قلات کی طاقت کو کمزور کرنے کے لیے نواب آزاد خان کی حمایت کی۔ دونوں فریقوں میں خونریز جنگ ہوئی مگر انگریزوں کی در پردہ حمایت سے خاران ریاست قلات سے الگ ہو گیا تھا۔ ان جنگوں میں قلعوں سے دفاعی مقاصد حاصل ہوئے۔ چنانچہ ایک قلعہ خاران میں، دوسرا ماشکیل اور تیسرا الدگشت میں اب تک موجود ہے۔ قلعہ خاران کے علاوہ خاران کے نوشیروانی نوابین نے اپنی رہائش کے لیے نوروز قلات میں بھی ایک پختہ قلعہ بنوایا۔ قلعہ خاران سے چند سو گز پر ایری کلگ کے دہانے پر بلوچستان کا مشہور اور خوفناک غار ہے۔

خاران میں موجود غار جو قلعہ خاران کے قریب ایری کلگ کے دہانے پر ہے بلوچستان کے تمام غاروں سے وسیع اور منفرد ہے۔ یہ پہاڑ کے ایک چٹان سے پہاڑ کی دوسری چٹان تک طویل ہے۔ ماضی میں یہ جنگلی درندوں کا مرکز رہا ہے لیکن عصر حاضر میں اس سے لوگوں نے دوسرے کام لئے۔ جن لوگوں کو سیاسی عقوبت یا جرائم کا خوف رہا ہے وہ اس غار میں نظروں سے اوجھل رہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے اس میں اونٹ، بیل اور دوسرے مویشی باندھے جاتے ہیں۔ خاران اور قلات

کی خانہ جنگیوں میں یہ غار خاران لشکر کا دفاعی مرکز رہ چکا ہے۔

غاروں کے ضمن میں ہرنائی سے چند میل مشرق کی سمت "تورغر" میں ایک غار ہے۔ ایسا ایک غار کہتے ہیں کوئٹہ چمن ریلوے کے راستے خوجک میں رہا ہے جسے بعد میں انگریزوں نے طویل ترین ٹنل میں بدل دیا۔ مچھ بولان سے چھ میل کے فاصلے پر پیر غیب کے پہاڑوں میں بھی ایک غار ہے۔ ایسے تمام غار قدیم زمانے میں جسے پتھر کا زمانہ کہتے ہیں، بنے ہیں۔

بلوچستان میں زیارات: صوفیائے کرام اور بزرگان دین ہر ملک، ہر قوم، ہر معاشرہ اور ہر علاقے کے لیے باعث افتخار ہوتے ہیں۔ بلوچستان میں کوئی ایسی وادی، ایسا شہر، ایسے علاقے نہیں جہاں بزرگان دین، حق کی محبت سے سرشار نیکی اور پاکیزگی سے متصف شخصیات کے مقابر نہ ہوں۔ بلوچستان کے معروف محقق معلم، پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے بلوچستان کو علمی ادبی تاریخی معاشرتی ثقافتی ہر پہلو سے روشناس کرانے کے لیے تصنیف و تالیف کی ان گنت سعی و کاوشیں کی ہیں۔ بلوچستان میں صوفیائے کرام اور بزرگان عظام کے بارے میں ان کی تحقیق ہر طرح کی عملی اور ادبی جوہر سے مالا مال ہیں۔ ہم نہایت ادب سے اپنے محترم استاد کی تالیف "تذکرہ صوفیائے بلوچستان" سے بصد شکر گزاری استفاضہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے جب لورالائی میں تعلیم و تدریس کے لیے قیام کیا۔ ۶ اپریل ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اس کار خیر کی تکمیل کی۔ تصوف کیا ہے اور صوفی کسے کہتے ہیں اس کی تشکیل میں آپ نے "تذکرہ صوفیائے بلوچستان" کے پیش لفظ میں عظیم صوفی شخصیت اور بزرگ حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) کی تصنیف "کشف المحجوب" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"لوگوں نے اس نام کی تحقیق میں بڑی موشگافیاں کی ہیں اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں مگر لفظ "صفا" ان میں سے یقیناً نہایت عمدہ اور دل پسند ہے۔ اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید علی ہجویریؒ کے خیال کے مطابق تصوف اور صوفی لفظ صفا سے مشتق ہے۔ صفو سے مراد خوبی اور لطافت ہے۔ اس کی ضد کدورت ہے جس کے معنی کثافت اور آلودگی کے ہیں چونکہ اہل تصوف روحانی ریاضت سے تہذیب و اخلاق کر کے اپنے آپ کو ہر قسم کے عیوب سے محفوظ رکھتے ہیں، اس لئے انہیں صوفی کہا جاتا ہے۔

تصفیہ باطنی کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ دل غیر اللہ کی محبت سے خالی ہو جائے اور اس خلا کو خدا کی محبت سے پر کیا جائے۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کی مثال سامنے رکھئے۔ آپؓ نے اسلام کی خاطر اپنا سارا مال و متاع نبی کریمؐ کے حضور پیش کر دیا۔ جب آنحضرت نے استفسار فرمایا کہ اپنے لیے کچھ رکھا ہے؟ تو اس مجسم ایثار نے جواب دیا کہ صدیق کے لیے اس کا خدا اور رسول کافی ہے۔ یہ خوبی انسان میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنے دل سے دنیائی محبت نکال کر خدا کی محبت کو دنیا اور آخرت میں اپنا عزیز ترین سرمایہ سمجھے۔

آپ نے مزید لکھا ہے کہ:

صوفی نام ہے کاملوں کا اور محققین نے اولیاء کو ہمیشہ اسی نام سے پکارا ہے۔ ایک شیخ کا ارشاد ہے "جسے محبت صاف اور پاکیزہ بنا دے وہ صافی ہے۔ جسے خود محبوب صفائی و پاکیزگی بخشے وہ صوفی ہے"۔ یعنی جو محبت سے مصفا ہو جائے وہ بھی صافی تو بیشک ہے لیکن صوفی وہی ہے جو دوست میں گم ہو کر رہ جائے اور غیر اللہ سے اس کا تعلق نہ رہے صوفی (صاحب وصول) جو اپنی ذات میں فانی ہو مگر ذات حق کے ساتھ باقی ہو اور طبعی خواہشات سے منہ موڑ کر حقائق زبانی سے ناطہ جوڑ چکا ہو۔

متصوف (صاحب اصول) جو صوفی کے درجے تک پہنچنے کی خاطر مجاہدہ کر رہا ہو اور منزل طلب میں اپنے معاملات کو صوفیوں کی طرح درست رکھنے کے لیے ریاضت میں مصروف ہو۔

متصوف (صاحب فضول) جو مجاہدہ، خلوص اور ریاضت کے بغیر فقط نمائش کی غرض سے اور دنیوی مال و متاع جاہ و حشم اور لذات نفسانی کی خاطر اپنے ظاہر کو صوفیوں کی طرح بنائے رکھے مگر درحقیقت ان کے مقام سے مطلقاً ناواقف ہو۔ ایسا شخص اپنے رویے کی وجہ سے وصل واصل سے بیگانہ رہتا ہے۔

((۱) تذکرہ صوفیائے بلوچستان- پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر- پیش لفظ ص ۱۷ تا ۱۹)

ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے "صوفیائے بلوچستان" کے پیش لفظ میں بزرگان اور صوفیائے کرام کے افکار کے حوالے دیئے ہیں۔ ان میں حضرت شیخ ذوالنون مصریؒ، حضرت ابوالحسن نوریؒ، حضرت ابوبکر شبلیؒ، شیخ ابوعبداللہ ساطیؒ، شیخ ابو سعید ابوالخیرؒ، حضرت جنیدؒ، حضرت ابوالحسن بوشنجیؒ اور علامہ جوزی کے ارشادات رقم کئے ہیں۔ اس عنوان کے زیریں ان کے اسمائے گرامی پر ہی کفایت کی گئی ہے۔ اس لیے کہ بلوچستان کے طول و عرض میں بزرگان دین کے تذکرے کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اگر اختصار سے بھی کام لیا جائے تو طوالت کا خطرہ ہے۔

پیر ابراہیم یک پاسیؒ: یہ بزرگ مستونگ کے چشتی سیدوں کے مورث اعلیٰ ہیں ان کا مزار مستونگ کے علاقے میں واقع ہے۔ ان کا خاندان ایران اور ہرات سے یہاں آیا۔ یہ دو بھائی تھے۔ دوسرے بھائی پیر دو پاسی کہلائے ان کا مزار ڈھاڈر

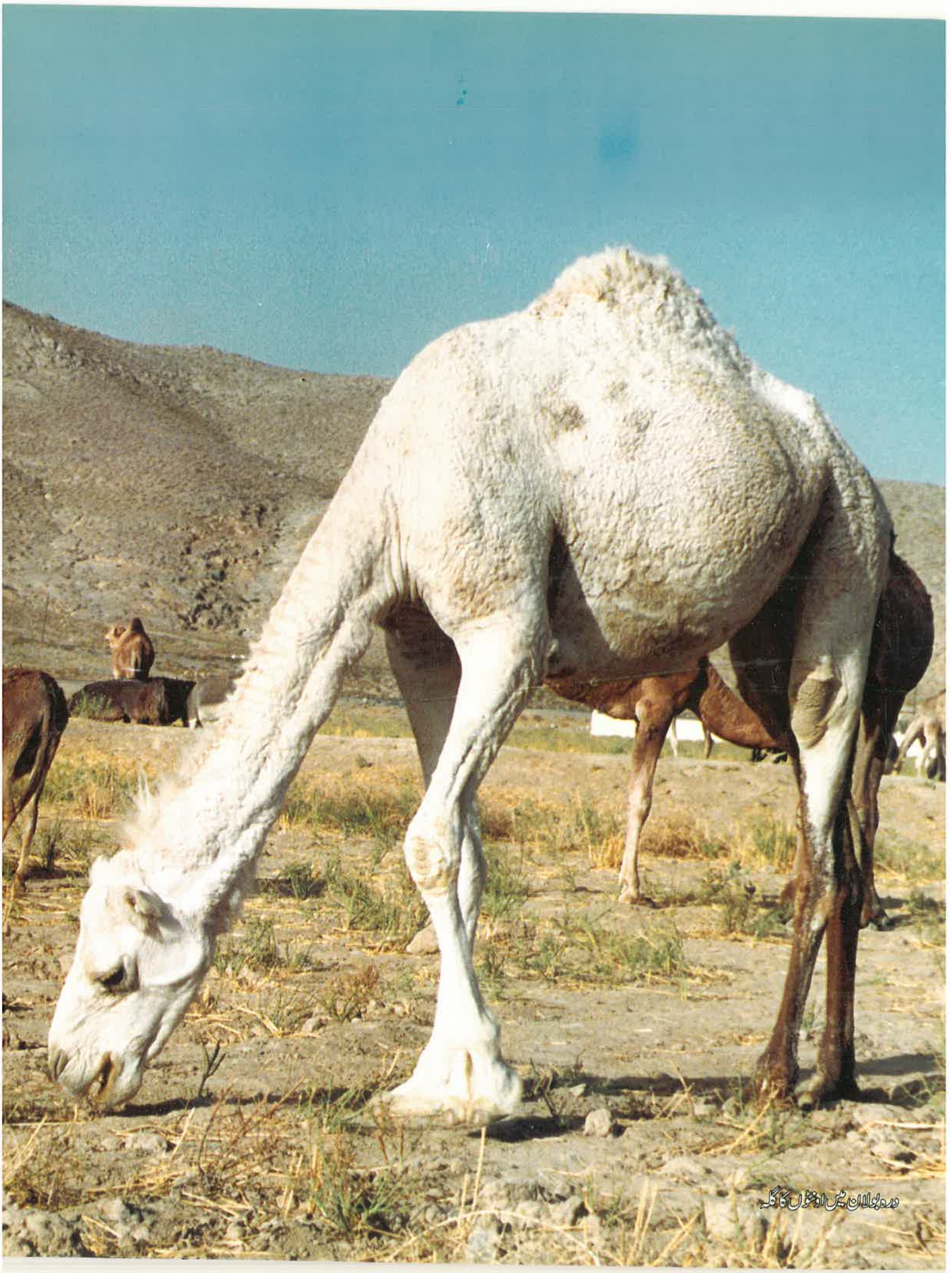

درہ بولان میں اونٹوں کا گلہ

کے قریب زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ سادات ڈھاڑ رانہی کی اولاد میں سے ہیں۔

یک پاسی اور دو پاسی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یہی مشہور ہے کہ مشکل وقت میں بڑا بھائی اپنے عقیدت مندوں کی یک پاس (پہر) میں چھوٹا بھائی دو پاس میں دستگیری کے لیے پہنچ جاتا تھا۔ مستونگ میں ان کے اخلاف آج بھی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ خوانین کے دربار میں بھی انہیں اونچا مقام حاصل تھا۔ یہ خاندان علم وفضل اور ابلاغ وعظمت کا گہوارہ رہا ہے۔ ان کی دینی اور علمی خدمات کی بہت سے روایات تھیں جو ابھی تک زبان زدعام ہیں تاہم یہ کام خاصا تحقیق طلب ہے۔

خواجہ ابراہیم دوپاسیؒ: دوپاسی خاندان کا اصل وطن چشت ہے مگر اس خاندان کے مورث اعلیٰ خواجہ ابراہیم دوپاسی کی اولاد کا مؤلد ڈھاڑ ضلع کچھی ہے۔ آپ اپنے زمانے کے خدارسیدہ بزرگ تھے۔ اس خانوادے کو سارے علاقے کی آبادی کا پیر خانہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ کی خانقاہ ڈھاڑ سے دوکوس کے فاصلے پر درہ بولان کے عین دروازے پر واقع ہے۔ آپ کا مزار صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی بلوچ، براہوئی، جاٹوں اور پٹھانوں کے علاوہ ہندو آبادی کے لیے قابل احترام ہے۔ کہتے ہیں جب سر رابرٹ سنڈیمن (بلوچستان کا انگریز فاتح) اپنے پہلے مشن پر قلات جانے کی خاطر ڈھاڑ پہنچا تو وہ بھی اس خاندان کی تاریخی حیثیت سے صرف نظر نہ کرسکا اور اس علاقے سے اس مشن کے اراکین میں اسی خاندان کے میر اورنگ شاہ اول کو شامل کیا جس نے مشن کی کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کرنے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔

اسماعیل نیکہ: آپ کیدانی سید تھے۔ آپ کی جائے رہائش کھوسٹ ضلع سبی میں تھی۔ ان دنوں کھوسٹ میں پانی کی بے حد قلت تھی اس لیے ایک مرتبہ آپ کے مریدوں نے آپ سے درخواست کی کہ ہمارے پینے کے لیے پانی کی ضرورت ہے، آپ اللہ کے نیک بندے ہیں، اس طرف توجہ فرمایئے۔ آپ نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی جو مستجاب ہوئی اور پانی کا ایک چشمہ پھوٹا جس سے لوگوں کی تکالیف دور ہوگئیں۔ آپ کھوسٹ ہی میں فوت ہوئے وہیں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

قاضی اسماعیل: آپ کا مزار گاجان (ضلع کچھی) میں ہے۔

میاں الٰہی بخش: آپ کا اسم گرامی میاں الٰہی بخش تھا۔ عبادت گزار اور متقی تھے۔ اس لیے لوگ آپ کو مولوی صاحب کہتے تھے۔ آپ کا آبائی وطن لالہ پنڈی جو ضلع گجرات میں ہے۔ پیشہ کاشتکاری تھا مگر علم کی آرزو کی تکمیل آپ نے بھاولپور میں کی۔ آپ ۱۳۰۸ھ تا ۱۸۹۰ء میں بلوچستان چلے آئے۔ پہلے سبی اور پھر براستہ ہرنائی وبوستان کوئٹہ میں وارد ہوئے۔ میاں صاحب نے بلیلی سے کچھ آگے کلی مہترزئی میں ایک معزز خاندان میں شادی کی۔ آپ کی اہلیہ ملک عبداللطیف کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے آپ کی زندگی میں وفات پائی۔ آپ نے ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء میں وفات پائی۔ کاسی قبرستان میں شہید کے مزار کے قریب ایک الگ احاطے میں آپ کی پختہ قبر ہے۔

اختر نیکہ: اختر نیکہ کاکڑ پشتون ہیں۔ آپ کا مزار ہندو باغ (مسلم باغ) تحصیل وضلع ژوب تھانہ ننگی کے پاس ہے اور زیارت گاہ عام وخاص ہے۔

امین شاہ: لہڑی نیابت میں دفن ہیں۔

اللہ یار شاہ: آپ کا مقبرہ بولان بند میں ہے۔ آپ کا تعلق حضرت ابراہیم دوپاسی کے خاندان سے ہے۔

سید شئے بلانوش: آپ پیران پیر سید محی الدین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد ہیں۔ شجرہ نسب اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

شئے بلانوش بن حضرت مالک اکرم حضرت پیر عمر بن حضرت شیخ عبدالعزیز بن حضرت محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی۔ آپ کا اسم گرامی شئے بلیدر ہے لیکن بلانوش کے لقب سے شہرت پائی۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب آپ اپنے مرشد خواجہ مخدوم کی صحبت سے کماحقہ، فیض یاب ہو چکے تو ایک روز ان سے نعمتوں کے لیے گزارش کی مرشد نے فرمایا" میں نے سب نعمتیں اپنے شاگردوں میں تقسیم کردی ہیں۔ آپ کے لیے کوئی نعمت باقی نہیں ہے۔ صرف کچھ بلائیں ہیں۔ آپ قابو میں لاسکیں تو لے لیں۔ آپ نے ان بلاؤں کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ اس کے بعد شئے بلیدر حضرت بلانوش (بلاؤں کو کھا جانیوالا) کی حیثیت سے ابھرے۔ آپ کے زمانے میں قلات کا حاکم غیر مسلم تھا جو ظلم وستم میں جواب نہ رکھتا تھا۔ رعایہ کو ستانے کی غرض سے مقررہ مالیہ سے زیادہ وصول کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر ایک گھر سے مغز پستہ کی پانچ بوریاں بھی لیا کرتا تھا۔ لوگ اس کے متحمل نہ ہوسکے اور انہوں نے شئے بلانوش سے مداخلت کرنے کی درخواست کی۔ حاکم نے آپ کو بھی اپنے ستم کا نشانہ بنایا اور آپ کی زمینوں پر جبراً قبضہ کیا۔

شئے بلانوش ان امور کو طے کرنے کے لیے اپنے مریدوں کی ایک مختصر جماعت لے کر حاکم کے ہاں پہنچے۔ شام کا وقت تھا حاکم نے شام کے کھانے کا بندوبست کرایا۔ اس نے دانستہ ایک بلی ذبح کرائی تاکہ انہیں حرام چیز کھلائی جاسکے اور پینے کے پانی میں زہر ملا دیا۔ لیکن آپ کشف کے ذریعے سے ساری صورتحال سے

آ گاہ ہو گئے چنانچہ آپ نے مریدوں سے کہا کہ جب تک میں کھانے کی جانب ہاتھ نہ بڑھاؤں تم لوگ کھانا نہ کھانا اور اس وقت تک پانی نہ پینا جب تک کہ میں نہ پیوں۔

دسترخوان بچھا سب کے ہاتھ دھلائے گئے خدام کھانا چن کر چلے گئے اور حاکم خود کسی بہانے سے کھانے پر نہ آیا۔ آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھکر اپنی چھنگلی پانی میں ڈبوئی جس سے زہر کا اثر زائل ہو گیا اور پانی شربت بن گیا جسے آپ نے پیا۔ آپ کے بعد آپ کے مریدوں نے بھی وہ پانی پی لیا، اب آپ نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے کی بجائے اپنی چادر کا پلو کھانے پر مارا اور فرمایا: "پشی" (مقامی بولی میں بلی کو پشی کہا جاتا ہے) پشی کہتے ہی بلی زندہ ہو گئی اور میاؤں میاؤں کرنے لگی لیکن اس کے تین پاؤں تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے حاکم سے کہو کہ اس بیچاری بلی کا دوسرا پاؤں تو دے دے تا کہ یہ آسانی سے چل پھر سکے۔ ساتھ ہی کھانے کا شوربا شہد بن گیا۔ یہ صورتحال حاکم کے لیے ندامت کا باعث بنی اور وہ معافی مانگنے لگا۔ مگر اس کا دل سیاہ تھا اس لیے بدلہ لینے کی غرض سے آپ پر اژدہا اور شیر بھی چھوڑے۔ جب آپ نے ان کو گھور کر دیکھا تو وہ پتھر بن گئے۔ آپ خود جلال میں آ گئے اور اسی کیفیت میں اپنی چادر پھینکی جس سے زمین میں آگ لگ گئی۔ حاکم اپنے ناپاک عزائم میں ناکام ہو گیا اور آپ سے معافی مانگنے لگا اور ظلم و ستم سے توبہ کی۔ آپ کو اپنی اراضی کے علاوہ قلات کا تیسرا حصہ بھی پیش کر دیا اور اس کی آمدنی ہر سال آپ کے دربار میں بھیجنے لگا۔ آپ کا مزار نوشکی میں ہے۔

((۱) تذکرہ صوفیائے بلوچستان- ڈاکٹر انعام الحق کوثر ص ۱۴۶ تا ۱۵۰)

پیر بوھر: آپ کا مزار ویل پٹ (ضلع لسبیلہ) کے مقام پر باغ کلاں میں واقع ہے۔ سالانہ میلہ ماہ جون کے پہلے پیر (دوشنبہ) کو منعقد ہوتا ہے۔ بھیڑ بکریوں کے علاوہ دوسرے حلال جانور بھی اچھی خاصی تعداد میں نذرانے کے طور پر ذبح کئے جاتے ہیں۔ ان کا گوشت مزار پر اکھٹے ہونے والے زمینداروں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور بارش کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

پیر حیدر شاہ شہید: آپ کا مقبرہ ناکس اور شاہرگ اسٹیشنوں کے درمیان ایک ریلوے پل کے سامنے شمال کی جانب پہاڑی پر واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ غیر مسلموں کے ایک گروپ سے جھڑپ میں شہید ہو گئے تھے۔ مقامی لوگ آپ کے مزار پر آ کر مرادیں مانگتے ہیں۔ پہاڑی ندی میں اکثر سیلاب آتے ہیں مگر آپ کا مزار محفوظ ہوتا ہے۔

پیر غائب: یہ مزار درہ بولان کے مقام کھجوری سے آدھ میل کے فاصلے پر واقع ہے جہاں ایک پہاڑی ندی گزرتی ہے۔ اس بزرگ کی کرامت کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ کافروں سے جدال و قتال کے دوران آپ نے ایک چٹان کے سینے میں نیزہ مارا جہاں سے پانی کا چشمہ جاری ہوا۔ اس پانی کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ کئی ایک گہرے جوہڑ بن گئے ہیں۔ مزار اس پرشور ندی کے کنارے واقع ہے۔ پتھروں پر کچھ قدموں کے نشان ہیں۔ پہاڑ کی جنوبی جانب بہت سے سفید پتھر دیکھے جا سکتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مزار حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کے ایک بیٹے کا ہے۔ جو کافروں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ چٹانوں پر آپ ہی کے قدموں کے نشان ہیں اور آپ کی دعا سے یہ کافر پتھر بن گئے۔ ان کا اسباب و سامان بھی پتھر بنے تھے۔ اگرچہ تاریخ اسلام میں اس طرح کے واقعات نہیں ملتے ہیں۔ درہ بولان میں برزی لیویز پوسٹ کے قریب ایک پل کی جنوبی سمت چٹانوں کی گود میں بی بی نانی کا مزار واقع ہے جسے مقامی روایات میں پیر غائب کی بہن کا نام دیا گیا ہے۔

بی بی نانی: بلوچستان میں بی بی نانی دو جگہوں پر واقع ہے۔ ایک مزار ضلع لسبیلہ میں ہنگلاج میں اور دوسرا درہ بولان میں۔ درہ بولان میں مدفون مزار جس بی بی نانی کا ہے۔ اسے مقامی روایات میں پیر غائب کی بہن کہتے ہیں جو اپنی عصمت بچانے کے لئے زمین میں دھنس گئی تھیں۔ ان کے مزار کے پاس بولان اور گاجان کی ندیاں آ کر ملتی ہیں۔ سیلابی ریلے میں کئی بار برزی لیویز پوسٹ کے نزدیک کا پل بہہ جاتا رہا ہے مگر ندی کے بالکل سامنے مزار محفوظ ہے۔ یہ اس بی بی کی کرامت کا اظہار ہے۔ مقامی ہندو اس مزار کو مہادیو کا نام دیتے ہیں۔

ہنگلاخ میں بی بی نانی کے مزار کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ نانیہ NANIA کا قدیم نام ہے جسے مسلمانوں نے بی بی نانی کا نام دیا ہے یہ قدیم اہل فارس اور باختریوں کی دیوی ہے۔

بی بی ھاروانا: کا مقبرہ چوتیر ضلع لورالائی میں ہے۔ یہ ایک نیک اور عبادت گزار خاتون گزری ہیں۔

بی بی نیک زن: آپ کا مزار قلات میں ہے آپ کے بارے میں مزید معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ علاقے کے لوگ کتے کے کاٹے کے لیے مزار پر آ کر دعا مانگتے ہیں۔ کوئی مریض نامراد نہیں لوٹتا۔

چلتن بابا: چلتن بابا کے حالات زندگی مفقود ہیں۔ میر گل خان نصیر اپنی کتاب "بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ چلتن پر شاہ مقصود نامی ایک

درویش رہتا تھا۔اس پہاڑ پر جو سلسلہ کوہ سلیمان کا ایک حصہ ہے،اس بزرگ کی زیارت گاہ اب تک موجود ہے۔بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ شاہ مقصود ایک درویش نہیں بلکہ ایک ڈاکو تھا،جس کے جلو میں چالیس گھڑسواروں کا ایک دستہ ہوتا تھا۔اس بارے میں بلوچی کہاوت ہے کہ "چلتن چل سوار-شاہ مقصود جلودار" ایک طرح سے یہ علی بابا چالیس چوروں کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔البتہ جو لوگ شاہ مقصود کو درویش کہتے ہیں،وہ ان چالیس سواروں کو غیبی سوار مراد لیتے ہیں۔

چلتن سے متعلق دوسری مشہور روایت جس کا شاہنامہ فردوسی میں ذکر ہے یوں ہے کہ یہاں پر کک کوہزاد نامی ایک افغان پہلوان رہتا تھا جو سیستان کے سام اور زال جیسے نامی گرامی پہلوانوں سے بھی خراج لیتا تھا۔بعدازاں رستم بن زال نے اسے کوہ کوش کک کے مقام پر پچھاڑ کر قتل کر دیا۔کک کوہزاد کے قلعے کے آثار چلتن کی مستونگ کی طرف کی چوٹی پر اب بھی ملتے ہیں۔

((۱)بلوچستان قدم وجدید تاریخ کی روشنی میں-میر گل خان نصیر ص ۵۹)

حاجی حمل: آپ کا مزار سبی میں (چاکر) قلعہ کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔حضرت میاں محمد حسن (المتوفی ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء) فرماتے تھے کہ کامل اولیائے اللہ سے چار علاقہ سبی میں ہیں۔ان میں سرفہرست حاجی حمل کا نام ہے جو منصب شاہی پر فائز ہیں۔منقول ہے کہ جس وقت ملا محمد خان رئیسانی اپنے اہل وعیال کے ساتھ خانصاحب کے خوف سے کڑک شہر میں اقامت پذیر تھا۔انہی دنوں میں وہ میاں غلام حیدر خلف حضرت میاں محمد حسن کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے معاملات میں ترقی کے لیے دعا کا خواہاں ہوا۔آپ نے حاجی حمل کے مزار پر جا کر دعا پڑھی۔بعد میں مذکورہ سردار سے کہنے لگے انشاءاللہ تعالی اس سال تمہارا کام خوب چمکے گا۔خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی سال انگریز سرکار اپنی فوجیں بلوچستان میں لے آئی سردار موصوف کی عزت وتوقیر ہوئی اور اس کا دل خانصاحب کے خوف سے مطمئن ہوا۔

خنائی بابا: آپ کا نام ملا فاضل اور عرف خنائی بابا ہے۔آپ کی خانقاہ خنائی میں واقع ہے جو بوستان سٹیشن سے اگلا اسٹیشن ہے۔کوئٹہ سے تیس میل کے فاصلے پر ہے آپ بڑے جید بزرگ تھے۔آپ نے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔آپ نے اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جو آج کل بھی موجود ہے۔لوگ وہاں دینی تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

رابعہ دختر کعب: مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اپنے تذکرہ "نفحات الانس" میں رابعہ کا ذکر ان مستورات میں کیا ہے جو معرفت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔وہ تحریر فرماتے ہیں:

"شیخ ابوسعید ابوالخیر قدس اللہ تعالی سرہ گفتہ است دختر کعب عاشق بود بر آن غلام۔اما پیران ہمہ اتفاق کردند کہ این سخنی کہ اومی گوید نہ آن سخن باشد کہ بر مخلوق توان گفت:اور اجای دیگر کار افتادہ بود روزی آن غلام آن دختر را دریافت سر آستین او بگرفت دختر بانگ زد بر غلام وگفت ترا این بس نیست کہ من با خداوندم وآنجا مبتلایم بر تو بیرون دادم کہ تو طمع میکنی شیخ ابوسعید گفت: سخنیکہ او گفتہ است نہ چنان است کہ کسی را در مخلوق اوفتادہ باشد وو ی گفتہ است:

عشق را باز اندر آوردم بہ بند
کوشش بسیار نامد سود مند !!!
عشق دریائے کرانہ نا پدید
کے تواں کردن شناب ای ہوشمند
بسکہ بہ پسندید بائد ناپسند
زشت باید دیدانگار یدخوب
ز ہر بائد خورو انگاریدقند!
تو سنی کردم ندانستم ہمی

رابعہ صاحب عشق حقیقی ومجازی بودہ انجامش بعشق حقیقی کشید۔حکایت او رافقیر نظم کردہ نام آن مثنوی راگلستان ارم نہادہ۔

کعب کی دختر نیک اطوار بلوچستان کے ایک قدیم شہر قزدار یا قصدار یا خضدار کی رہنے والی تھی جس کے بارے میں بلاذری نے ایک عربی شاعر کے کلمات درج کئے ہیں جو قصدار کے بارے میں یوں گویا ہے۔

"خضدار کتنا خوشنما شہر ہے اور اس کے مکین کتنے ممتاز ہیں" رابعہ کا والد خراسان کے تاریخی حادثے میں ابومسلم مروزی کا رفیق کار اور سجستان وطوران اور قصدار (خضدار) کا حاکم تھا۔رابعہ فارسی شاعری کی ابو لآبا رودکی (المتوفی ۳۲۹ھ ۹۴۱ء) ہم عصر تھی۔آج بھی اس کے عارفانہ کلام کی صدائے بازگشت وادی خضدار میں سنائی دیتی ہے۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے رابعہ بنت کعب کا ذکر سرمد ومنصور کی حریف کے تحت کیا ہے۔

پروفیسر انور رومان اپنے ایک انگریزی تحقیقی مضمون "بلوچستان کی تاریخی اہمیت" میں لکھتے ہیں: نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) میں جب ابھی محمود ہندوستانی سٹیج پر نمودار نہیں ہوا تھا اور جب صرف بلوچستان اور سندھ ہی اسلام کی دائرے میں داخل ہوئے تھے۔بلوچستان محض ایک فوجی علاقہ نہ تھا بلکہ ایک اہم

تاریخی خطہ تھا۔ جہاں فارسی ادبی اظہار کا ذریعہ تھی۔ قلات کے جنوب میں خضدار شہر میں رابعہ چھپاتی تھی۔ فارسی کی عظیم شاعرہ، بلوچستان کی قرۃ العین۔

حضرت پیر سلطان قیصر: پیر سلطان قیصر کا مزار نوک کنڈی سے جانب شمال بائیس میل دور کوہ سلطان پر واقع ہے۔ جہاں ۱۹۴۲ میں مجھے گذرنے کا اتفاق ہوا۔ نوک کنڈی سے ایک کچا راستہ کوہ سلطان تک پر پیچ پہاڑوں سے گزرتا ہے۔ یہ جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا۔ بارود کی بڑی اہمیت تھی۔ کوہ سلطان سے گندھک کے ذخائر نکالے جاتے تھے۔ یہ انگریزوں کا دور تھا۔ کوہ سلطان کے دامن میں عمارات دفاتر، موٹروں، ٹرکوں کا ہجوم گندھک نکالنے کے لیے شبانہ روز مصروف رہتا تھا۔ (یاد ین غوث بخش صابر)

کوہ سلطان میں پورے کا پورا پہاڑ گندھک ہے جو چٹانوں کی طرح سخت ہے۔ اسے بارود کے دھماکوں سے نرم کیا جاتا تھا۔ یہ پہاڑ بیس حصوں میں تقسیم تھا اور ہر حصے تک ٹرکوں کو پہنچنے کے راستے بنائے گئے تھے۔ سینکڑوں ٹرک یہاں سے گندھک بھر کر نوک کنڈی سٹیشن تک انبار خانے پہنچاتے تھے۔ حضرت سلطان قیصر کا مزار پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ کوہ سلطان میں ندیوں نالوں میں پانی کی بہتات ہے مگر گندھک کی وجہ سے بے حد نمکین ہے۔ اس لیے ٹرینوں کے ذریعے دالبندین سے پانی بھر کر نوک کنڈی آتا تھا۔ نوک کنڈی سے ٹینکیوں میں بھر بھر کر یہ پانی کوہ سلطان پہنچایا جاتا تھا جس پہاڑ پر حضرت سلطان قیصر کا مزار ہے۔ اسی کے اگلے حصوں میں معدنیات کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ نوک کنڈی سے بجانب شمال وہ کان ہے جہاں لوہا نکلتا ہے جبکہ سائیندک کا مشہور پروجیکٹ بھی اسی پہاڑ پر ہے۔ ضلع چاغی میں یہ پہاڑ نوشکی سے زاہدان تک شمال میں پھیلا ہوا ہے۔ امیری میں اسی سے سنگ مرمر نکالا جاتا ہے جبکہ آدو کے قریب سرمہ اور سیسہ، بیرائیٹ کے ذخائر ہیں۔ اس پہاڑ پر مارخور اور پہاڑی دنبے شکار ہوتے ہیں۔ کوہ سلطان میں سانپوں کی کثرت ہے مگر کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ یہ سانپ مارخور بکروں کی خوراک بن جاتے ہیں۔

کوہ سلطان میں ہمیشہ تو نہیں مگر کسی خاص لمحے میں زوردار آوازیں گونجتی ہیں مگر عموماً رات کو کہتے ہیں حضرت سلطان قیصر اپنے ابتدائی ایام میں ایک رہزن تھے۔ ڈاکہ چوری آپ کا مشغلہ تھا۔ ایک رات ایک دنبہ چھین کر اپنے گھر جا رہا تھا راستے میں ایک غربت زدہ عورت سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے آپ سے کہا میرے بچے بھوکے ہیں۔ میرا شوہر تلاش روزگار میں باہر گیا ہوا ہے۔ اس عاجزہ کی حالت زار پر آپ کو رحم آیا۔ دنبہ ذبح کر کے کباب بنا کر عورت اور اس کے بچوں کو کھلایا۔ اس عورت نے خلوص دل سے دعا کی کہ اے باری تعالیٰ اس بندے نے مجھے اور میرے بچوں کو بھوکا مرنے سے بچایا ہے۔ اسے اپنی رحمتوں سے مالا مال کر۔ عورت کی دعا قبول ہوئی آپ ڈاکو سے پیر سلطان بنے۔

پیر سہری: آپ رند قوم کی پیروزانی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ رندوں کی امارت کے زوال کے بعد یہ قبیلہ بگٹیوں میں مدغم ہوا۔ ڈیرہ بگٹی میں پہاڑ کی عین چوٹی پر آپ کا مزار واقع ہے۔ بگٹی قوم کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں زیارت اور خیرات کے لیے جوق در جوق مزار پر آتے ہیں۔ اسلام خان دوم تمندار بگٹی نے اس دور میں جب سکھ پنجاب کے حکمران تھے، عمر کوٹ کے مقام پر سکھوں پر حملہ کیا۔ سکھوں کا کمانڈر پرسہ سنگھ پچاس ساتھیوں کے ساتھ میدان میں مارا گیا۔ بگٹیوں نے سکھوں کے جھنڈے اور ڈھول وغیرہ چھین لئے جو بطور یادگار پیر سہری کے دربار میں آویزاں ہیں۔ مست توکلی نے پیر سہری کی زیارت کی ہے۔ وہ آپ کی کرامت وعظمت کا اس طرح سے ذکر کرتا ہے۔

پیر سہری ءَ دانگان شہباز ءَ لقا
پیر ملتان ءِ کل مدتان گوں بھاولاں

یعنی پیر سہری اور حضرت لعل شہباز قلندر نے مجھے لقا بخشی اور ملتان کے پیر غوث بہاؤالحق میرے مددگار ہیں۔

پیر بلو: حضرت سید پیر بلو افغانستان کے رہنے والے تھے۔ انہیں علوم شرع پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ صاحب کشف وکرامات تھے۔ بچپن ہی سے عبادت گزار تھے اور ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔ آپ کے والدین کی خواہش تھی کہ ان کا فرزند دین کی بجائے دنیا اور امور دنیوی کی جانب متوجہ ہو، چنانچہ وہ آپ کی عبادت میں مخل ہونے لگے۔ مجبوراً آپ کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ آپ کوئٹہ آئے اور سریاب روڈ کے کنارے ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ آپ کے پاس بڑی تعداد میں لوگ آنے لگے۔ روایت ہے کہ افغانستان کے چند تاجر برصغیر پاک وہند سے واپس اپنے وطن جا رہے تھے۔ وادی شال (کوئٹہ کا قدیم نام) میں پہنچ کر سید پیر بلو کے فیضان کا شہرہ سنا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں سے ایک تاجر نے آپ کو پہچان لیا اور آپ کے والدین کو اطلاع دیدی۔ آپ کے والد جو بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ اپنے بیٹے کے پاس آئے اور انہیں گھر چلنے کے لیے مجبور کرنے لگے حضرت پیر بلو چونکہ دنیاوی کاموں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے اس لئے ایک دم غائب ہو گئے۔ سریاب روڈ پر واقعہ آپ کی خانقاہ پر آج بھی لوگ بڑی تعداد میں حاضری دیتے ہیں۔

شئے کھٹے: آپ قبیلہ کہیر سے تعلق رکھتے تھے۔ صاحب حال تھے۔ پندرھویں

صدی عیسوی کے اواخر میں ہوگزرے ہیں۔آپ میر چاکر سردار اعظم رند بلوچ (۹۶۲ھ/۱۵۵۵ء) کے مرشد تھے۔آپ ایک دن اپنے محافظ دستے کے ہمراہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک پگڈنڈی سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے میر چاکر کے بہنوئی اور نامور بہادر باہر خان رند آ گئے۔آپ کے محافظوں نے مطالبہ کیا کہ وہ شاہ صاحب کے لیے راستہ چھوڑ دیں لیکن باہر خان رند نے انکار کر دیا۔محافظوں نے برافروختہ ہوکر تیر چلائے اور اسے ہلاک کر دیا۔اس انکار کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک دفعہ میر چاکر اعظم کے دربار میں میر باہر خان نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ کسی راستے سے چل پڑے ہوں تو پھر کوئی انکار راستہ نہیں روک سکے گا۔خواہ اسے جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔اس واقعہ کے نتیجے میں میر باہر خان کے بیٹے امیر بیورغ نے ایک مدت کے بعد شئے کھٹے کو انتقام کا نشانہ بنایا۔آپ سبی کے شمال میں ناڑی ندی کے کنارے مدفون ہیں۔زائرین زیارت کے لیے جاتے ہیں۔حضرت مست توکلی بھی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تھے اور رات کا زیادہ حصہ وہیں گزارا تھا۔

شئے عیسیٰ: آپ شئے کھٹے کے بیٹے تھے۔بلوچی شاعروں میں آپ کا اعلیٰ مقام ہے۔

شئے حسن: آپ کا شجرہ نسب یوں ہے:

حضرت شئے حسن بن شئے بلانوش، بن حضرت ملک ارقم بن حضرت پیر عمر بن شیخ عبدالعزیز بن حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز:

آپ کے دو صاحبزادے میر علی اور میر جلال تھے جو مغلوں کے نوشکی پر حملے اور لڑائی کے دوران شہید ہوئے۔دو صاحبزادیاں تھیں۔بی بی شئے اسماعیل کی منکوحہ تھیں اور بسو بی بی کی شادی شئے حسین سے ہوئی۔آپ کا مزار مبارک نوشکی میں مشہور زیارت گاہ ہے۔روایت ہے کہ جب مغل نوشکی پر حملہ آور ہوئے تو واپسی پر ایک ہزار مردوں اور عورتوں کو قیدی بنا کر لے گئے۔حضرت شئے حسن نے خاموشی اختیار کی اور صرف اپنے حرم کو لے کر پہاڑ پر چلے گئے۔جب آپ کے والد سید بلانوش تشریف لائے تو وہ سخت برہم ہوئے اور آپ کو ڈانٹا۔آپ والد کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر جلال میں آ گئے اور اڑ کر پہاڑ کی اس چوٹی پر جا بیٹھے جو نوشکی سے ایک دن کی مسافت کے برابر ہے۔وہاں سے آپ افغانستان کے سبز بار جا پہنچے وہاں نماز ادا کی تو لوگوں نے دیکھا اور جمع ہو گئے۔ایک دوسرے سے کہنے لگے فقیر کا کشکول بھر دو۔آپ نے فرمایا کہ میں صرف اپنے ایک ہزار قیدی واپس لینے آیا ہوں۔انہوں نے قیدیوں کی رہائی کے لیے یہ شرط رکھی کہ آپ ایک رات آگ میں رہیں تا کہ ہم آپ کی کرامت دیکھ سکیں۔آپ نے یہ شرط منظور کر لی اور اپنے خلیفہ دیوانہ سے کہا میں رات آگ میں بسر کروں گا۔تم میرے وضو کے لیے پانی لانا۔گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔آپ بسم اللہ پڑھ کر آگ میں داخل ہوئے۔ان کے ساتھ ایک بیل کو بھی ذبح کر کے آگ میں ڈال دیا گیا۔صبح سویرے جب خادم پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ آپ سردی کے مارے کانپ رہے ہیں اور آگ کی حرارت سے آپ ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے جبکہ بیل جل کر خاکستر ہو گیا ہے۔آپ کے ہاتھ میں ایک پھول بھی تھا۔آپ اٹھے وضو کیا نماز پڑھی اور اپنے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کر دیا۔سب قیدیوں کو حاضر کیا گیا مگر آپ کو کشف کے ذریعے معلوم ہوا کہ دو لونڈیوں کو اوپر کی منزل میں چھپایا گیا ہے، جہاں وہ رو رہی تھیں۔آپ نے مغلوں کے سردار عمر سے کہا دو لونڈیاں ابھی تمہارے قبضے میں ہیں انہیں بھی رہا کرو۔اس نے جواب دیا کہ وہ دونوں مر گئی ہیں اور وہ دو قبریں انہی کی ہیں۔آپ وہاں گئے اور قبروں میں مدفون مردوں سے کہا کہ اپنے نام بتاؤ۔انہوں نے اپنے نام بتا دیئے۔آپ جلال میں آ گئے اور میر عمر سے کہا تم نے غلط بیانی کی ہے اور تھوڑی سے مٹی اُٹھا کر ہوا میں پھینک دی جس سے ہر طرف آگ لگ گئی۔میر عمر فوراً کنیزوں کو لے آیا۔آپ نے تمام قیدیوں کو وطن روانہ کیا اور خود اپنے خلیفہ کے ہمراہ گرم سیل روانہ ہو گئے۔صفار کے مقام پر پہنچے تو وہاں وبا پھوٹ پڑی۔لوگوں نے آپ سے درخواست کی آپ مراقبے میں چلے گئے۔اپنے خلیفہ سے کہا کہ اگر میں زمین کے اندر جانے لگوں یا اوپر جانے لگوں تو مجھے پکڑ لینا۔جب میرا گھوڑا ہنہنائے تو اسے چارہ ڈال دینا۔استغراق میں آپکی حالت دگرگوں ہو گئی۔اسی اثناء میں آپ زندہ زمین میں چلے گئے۔چادر کا صرف ایک ٹکڑا باہر رہ گیا جسے زائرین نے تبرک سمجھ کہ آپس میں بانٹ لیا۔دیوانہ اب اس بات سے ڈرتا تھا کہ اگر شئے حسن کے والد نے مجھ سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو وہ کیا جواب دے گا۔ادھر شئے بلانوش کو کشف سے معلوم ہوا تو آپ نے دیوانہ کے دونوں ہاتھ کاٹ لینے کی قسم کھائی۔دیوانہ جب نوشکی پہنچا تو لوگوں کی زبانی اس کو حضرت کے فیصلے کا پتہ چلا۔وہ چھپتا رہا آخر سادات کے دستور کے مطابق حضرت سے معافی کی درخواست کی گئی اور بالآخر ان کو اس بات پر راضی کیا گیا کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق دیوانہ کے کرتے کی آستین کاٹ ڈالیں۔آپ نے ایسا ہی کیا اور ساتھ ہی اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا۔

(بلوچی میں قبیلے کو شئے کہیری کہتے ہیں روایت ہے کہ ان کا جد امجد کرامت کے زور سے کہیر کے درخت پر چڑھ کر گھوڑے کی طرح دوڑتا تھا)

شئے رجب: آپ سندھ کے بریجاہ تھے نقل مکانی کر کے نیمرغ (قلات ڈویژن)

پہنچے وہیں۔ سید کلان کی بیٹی سے شادی کی۔ جن کی اولاد آجکل سید کلان کہلاتی ہے اور شرود کے علاوہ افغانستان کی سرحد سے متصل سرلٹھ پہاڑوں میں بھی اقامت گزین ہے۔ آپ صاحب حال بزرگ تھے۔ وفات کے بعد نیمرغ میں ہی دفن ہوئے۔ شئے (شیخ) کا مقبرہ مغربی ساراوان، جھالاوان اور شمرود کے لوگوں کی زیارت گاہ ہے۔ ہر سال فصل کٹائی کے بعد ایک تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ اس تاریخ کو میلہ لگ جاتا ہے۔ بھیڑ بکریوں کے نذرانے پیش کئے جاتے ہیں، جن کو ذبح کر کے لوگوں میں گوشت تقسیم کیا جاتا ہے۔ نیمرغ کے لوگ اپنی زمینوں کی آمدنی کا چالیسواں حصہ وٹک کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ اس طرح زائرین کے لیے کھانے کا بندوبست ہو جاتا ہے۔

پیر عمر: آپ کا مزار دریائے سندھ کے کناروں پر خضدار اور واہر کے مابین واقع ہے۔ کہتے ہیں آج سے کئی سو سال پہلے جب منگولوں نے بلوچستان پر حملہ کیا اور منگول فوج نے پنجگور میں داخل ہو کر قتل و غارت شروع کی تو لوگ ان کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور پیر عمر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتحال بیان کی۔

(۱) پنجگور (پنج اور گور سے مرکب ہے پانچ قبروں کی وجہ سے یہ نام پڑا۔ اسے "پنجبور" یا قنز بور بھی کہتے ہیں یہاں کا شیرہ خرما بھی مشہور ہے (بلوچ در بلوچستان قاضی عبدالصمد سربازی) بلوچی دنیا ملتان ستمبر ۱۹۶۶ء)

پہلے تو آپ ذرا خاموش رہے پھر بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا کر دعا کی "کہ الٰہی یہ ظالم تیرے محبوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو تباہ و برباد کر رہے ہیں تو ہی ان کا مناسب تدارک فرما"۔ کہتے ہیں کہ دعا باری تعالیٰ کے ہاں مستجاب ہوئی اور منگول شکست کھا گئے اور یوں پنجگور کے لوگ مزید ستم سے بچ گئے۔

پیر عمر کا وصال پنجگور ہی میں ہوا، جہاں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ وہیں ایک تالاب ہے جس میں مچھلیاں ہیں۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں اس تالاب میں مجرموں کا امتحان لیا جاتا تھا۔

واجہ غریب شاہ بابا: مکران میں آج بھی اس ولی کا نام اہل مکران کی المدد الغیاث کے موقع پر یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا مزار مبارک گوادر سے 15 میل دور نگور کے مقام پر زیارت گاہ خلائق ہے۔ مسافر کئی روز سفر کی تھکان دور کرنے کے لیے قیام کرتے ہیں۔ واجہ غریب شاہ ایران سے وارد ہوئے، جہاں ان کی غریبوں پر ظلم و ستم کرنے والے سرداروں سے ان بن تھی۔ پہلے آپ جیونی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ یہ انگریزوں کا زیر تسلط علاقہ ہے۔ آپ کو انگریزوں سے گریز تھا۔ اس لئے آگے بڑھ گئے۔ گوادر اس دور میں سلطان مسقط کا علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے گوادر کے قریب قیام فرمایا اور اپنے مریدوں ساتھیوں سے ایک بند بنوایا۔ پہاڑی ندیوں کے پانی سے استفادہ ہوا۔ وہ صحرا چند ہی دنوں میں باغ اور گھنے درختوں سے راحت افزا ہوا۔ واجہ کی ہمت و برکت سے میٹھے پانی کے کئی کنوئیں کھودے گئے۔ مسافروں کے آرام کے لیے کئی جھونپڑیاں بنائی گئیں۔ آج کل واجہ کے جانشین ان کے بڑے صاحبزادے واجہ حاجی عبداللہ جان ہیں۔ سادگی مکارم اخلاق اور صفات حسنہ سے سو فیصدی اپنے والد بزرگوار کا نمونہ ہیں۔ خدمت خلق میں خیر الناس من ینفع الناس کے قرآنی اصول کے پیروکار ہیں۔

حضرت مست توکلی: حضرت مست توکلی ایک بلند پایہ صوفی، بزرگ، عشق الٰہی کے متلاشی اہل دل ہو گزرے ہیں۔ بلوچستان کے چپے چپے پر بسنے والے مست کی عظمت شاعری اور کیفیات باطنی کے دل سے قائل ہیں۔ مست توکلی ضلع سبی کے کاہان شہر کے شمال میں "مانٹرک بند" نام کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ اندازاً ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام لعل خان تھا۔ مست توکلی کل چھ بھائی تھے تین بچپن میں فوت ہوئے۔ ایک بھائی مری بگٹی لڑائی میں چمبڑی نام کے گاؤں میں جنگ میں کام آئے۔ تیسرے بھائی پیرک نے خودکشی کی۔ آپ کو ابتدا میں ایک بیاہتا خاتون سمی سے محبت ہوئی جو بڑھتے بڑھتے عشق حقیقی میں تبدیل ہوئی۔ آپ کی شاعری یکسر سمو کے ذکر سے لبریز ہے۔ مست توکلی کو عشق حقیقی نے چین سے نہیں رہنے دیا۔ وہ سندھ کے صحراؤں میں بھٹکتے رہے۔ ڈیرہ جات میں گھومے پھرے اور محبت کے جذبات کو بہلاتے رہے۔ ۱۸۹۵ یا ۱۸۹۶ میں کٹ منڈائی سے پڑہ آئے۔ یہیں اچانک طبعیت ناساز ہوئی۔ قبیلہ شیرانی مری کے لوگوں نے آپ کو وہاں سے چارپائی پر اٹھایا۔ یہ قافلہ کوہلو سے چودہ میل کے فاصلے پر تھا کہ حضرت مست توکلی واصل بحق ہو گئے۔ آپ کو "مست میدان گری" نامی ایک میدان میں دفن کیا گیا جہاں آپ کا مزار زیارت گاہ اہل دل ہے۔

حضرت عبدالحئ چشموی، حضرت فیصل فقیر اور جھل مگسی کے قرب میں حضرت لاکھا سنی شوران میں ہفت ولی غرض کہ بلوچستان کا چپہ چپہ صوفیائے کرام اور بزرگان عظام سے آباد ہے۔ (اس عنوان کے تابع جناب پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب "تذکرہ صوفیائے بلوچستان" سے استفاضہ کیا گیا ہے)

بلوچستان میں خواتین و مردوں کے نام

خواتین کے نام: شاری، شلی، مدی، بانڑی، سمی، سومری، شمی، شہر بانو، زر بانو، ماہ بانو، گل بانو، شاہ بانو، ماہناز، گراں ناز، درناز، زرناز، ملک ناز، شرف ناز، گل ناز، ماہ گنج،

صدرگنج، زرگنج، زلیا، زیبا، آمنہ، زہرہ، گل جان، خیر جان، نورجان، ملکان، مہتاب، زرتاپ، نازبی بی، زربی بی، گل بی بی، شاہ بی بی، جان بی بی، خیر بی بی، لال بی بی، دربی بی، نوربی بی، خان بی بی، نازین، سازین، ہارین، شاہین، ماہین، سیمک، بختاور، تاج بی بی، شریپہ، گل بخت، زربخت، نوربخت، حانی، بےغم، گل خاتون، ماہ خاتون، فتح خاتون، جنت، پیرانی، جتو، کرائی، نازک، آزک، شیرین، بروچانی، کلاچی، ماہو، ملی وغیرہ۔

مردوں کے نام: گہرام، رامین، شیہک، چاکر، میران، عالی، جاڑک، شادین، ہوت، سبزل، نورل پردل، شیردل، گادر، مراد، دلمراد، مرادبخش، غوث بخش، نور بخش، اللہ بخش، پیربخش، علی بخش، رحیم بخش، قادربخش، خیربخش، نبی بخش، کریم بخش، امیر بخش، فیض بخش، شادی خان، باہرخان، شیرخان، گلخان، قادرخان، نادرخان، جعفرخان، امیر خان، وزیرخان، نصیب خان، علی خان، پیرخان، حاصل خان، نورخان، فاضل خان، عادل خان، دولت خان، پہاڑ خان، ولی خان، زہرو، تھنگو، مندوست، شاہ دوست، مرید خان، عبداللہ خان، محمد خان، بی برگ، شنبے، دوشنبے، پنجشنبے، آدینہ، سونا خان، گلستان، شریفو، جورک، سامک، چاروک، گمانی، شیرانی، زنگی، پنوں، کیا، شاہمراد، دوستین، شہداد، دوستین، شہداد، بالاچ، دودا، دینار، حمل، جیند، خداداد، خدابخش، خداداد، خدابخش، خدانظر خان، جیون خان، زرکخان نوروز خان، کاکڑ خان، قمبر خان، سومر خان، بجار خان، روشن خان، مندو، اومر، شاہو وغیرہ۔

بلوچستان کے قبائل

مینگل: بلوچستان میں براہوئی بلوچوں کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ اس قبیلے کی مربوط آبادی نوشکی (ضلع چاغی) میں افغانستان کی سرحد سے جنوب مشرقی سمت میں کراچی تک تقریباً پچاس میل چوڑی اور سات میل لمبی پٹی میں پھیلی ہوئی ہے۔ افغانستان میں نوشکی سے گرم سیل تک کے ریگستانی علاقے اور دریائے ہلمند کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ تقریباً تیس ہزار مینگل آباد ہیں۔ اسی طرح بلوچستان کے مغرب میں اور ایران کی مشرقی سرحد پر بھی گمشادزئی، باران زئی، امیرزئی، باجے زئی اور کئی دوسرے مینگل قبیلے آباد ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ایران کی سرحد پر تقریباً ایک لاکھ افراد تک ہوگی۔ لیکن یہاں بلوچستان کے اعداد وشمار میں ہم نے افغانستان ایران کے مینگلوں کو شامل نہیں کیا ہے۔ بعض مورخین کی رائے میں مینگل سفید ہنوں کا وہ قبیلہ ہے جو ہن یا منگ کہلاتا ہے۔ گل کوشانی، دراوڑی اور بلوچی کا مشترکہ لفظ ہے، جو صیغہ جمع کے لیے بولا جاتا ہے جیسے بزگل (بکریوں کا ریوڑ) جت گل (ساربانوں کا گروہ)۔ جب یہ ہن یا منگ نقل مکانی کر کے اس سرزمین میں وارد ہوئے اس زمانے میں کوشانی آباد تھے تو مقامی زبان میں یہ لوگ "من گل" یا "منگ گل" یعنی ہنوں کی ٹولی یا طائفہ کہلائے۔ بعد میں رفتہ رفتہ یہ لوگ منگل اور مینگل مشہور ہوئے۔

ذیلی قبیلے: بلوچستان میں مینگل قبیلہ آٹھ ذیلی قبیلوں پر مشتمل ہے۔

۱) **مینگل شاہی:** یعنی جھالاوان کے وہ مینگل جو غلط العام کے طور پر شاہی یا شاہی زئی کہلاتے ہیں، حالانکہ شاہی زئی قبیلے کا صرف سردار خیل ہے جو وڈھ میں اپنے صدر مقام میں رہتا ہے۔ یہ لوگ وڈھ سے کراچی تک کے کہستان میں آباد ہیں۔

۲) **میر حاجی مینگل:** یہ لوگ سارونہ میں آباد ہیں اور شاہی زئی سردار کو اپنا سردار مانتے ہیں۔

۳) **ذگر مینگل:** یہ لوگ قلات کے شمال مغربی پہاڑوں اور نوشکی (ضلع چاغی) میں سرحد کے دونوں طرف آباد ہیں۔ نوشکی ان کا صدر مقام ہے۔

۴) **سمالانی مینگل:** ان کا سردار اگرچہ سوراب میں رہتا ہے لیکن قبیلہ خاران، ساراوان اور نوشکی میں منتشر ہے۔

۵) **قلندرانی مینگل:** خضدار کے قریب توتک ان کا صدر مقام ہے۔ قبیلہ منتشر ہے۔

۶) **گرگ ناڑی یا گرگینانی مینگل:** سوراب کے علاقے گدر میں آباد ہے۔

۷) **میروانی مینگل:** زیادہ تر جھالاوان کی تحصیل مشکے میں آباد ہے۔ منگلی ان کا صدر مقام ہے۔

۸) **قمبرانی مینگل:** علاقہ مشکے جھالاوان میں بانسران کا صدر مقام ہے۔ قبیلہ منتشر ہے۔ ایلتازئی، احمد زئی اس قبیلے کے ذیلی طائفے ہیں۔ قلات کا احمد زئی حکمران اسی خاندان سے ہے۔

زہری: آبادی کے اعتبار سے زہری بلوچستان کا دوسرا بڑا قبیلہ ہے لیکن درجے کے اعتبار سے ان کے سردار کو جھالاوان کے تمام سرداروں پر فوقیت حاصل ہے۔ اسے سہ سرداران جھالاوان کا خطاب حاصل ہے۔ اور جھالاوان کے زرد رنگ کا پرچم اسی کے سر پر لہراتا ہے۔ زرک زئی اس قبیلے کا سردار خیل ہے۔ روایت کے مطابق براہوئی اقتدار سے قبل قبیلے کی سرداری ذیلی قبیلہ موسیانی کے پاس تھی جو اس علاقے کے قدیم ترین باشندے متصور ہوتے ہیں لیکن جب خوانین قلات نے علاقہ زہری پر قبضہ کیا تو اپنے ایک معتمد سردار میر زرک کو قبیلہ زہری کی سرداری پر فائز کیا۔ سردار زرک زئی کی اولاد نسل در نسل سے اس قبیلے کی سرداری پر فائز ہے۔

ذیلی قبیلے: ۱) موسیانی ۲) نیچاری ۳) جنگ ۴) ڈایہ ۵) ساسولی ۶) پندرانی ۷) خدرانی ۸) باجوئی ۹) محمودانی ۱۰) لوٹھانی ۱۱) تراہسانی ۱۲) سناڑی۔

ذیلی طائفے: ۱۔زرک زئی، ۲۔شاہوزئی، ۳۔چوہڑزئی، ۴۔سیدزئی، ۵۔رئیس، ۶۔سلمان جو، ۷۔دیگانی، ۸۔جام زئی، ۹۔سموانی، ۱۰۔رکھنی۔

مری: آبادی کے لحاظ سے مری بلوچوں کا تیسرا بڑا قبیلہ ہے۔اس کے چار ذیلی قبیلے ہیں۔

ذیلی قبیلے: ۱) گزینی: قبیلے کی سرداری اس کے ذیلی طائفہ بھاولان زئی کو حاصل ہے۔

۲) بجارانی: قبیلے کا بڑا اور زیادہ معروف طائفہ ہے۔کسی زمانے میں سرداری اسی قبیلے کے سردار بجار خان کو حاصل تھی۔اسی اعتبار سے بجارانی کہلائے۔

۳) لوہارانی ۴) مزارانی

تاریخی حوالوں میں ہر ایک مورخ اس قبیلے کو کسی قوم، کسی ملک، کسی نسل سے قرار دیتا ہے اور دوسرا اس کی تردید کرتا ہے۔میر گل خان نصیر مری قبیلے کو قدیم پارتھین قبیلے سے نسبت دیتا ہے۔جبکہ میر عالم راقب کا نظریہ ہے کہ یہ مری کا لفظ موریا سے نکلا ہے۔وہ چندر گپت موریہ سے اس قبیلے کو ملاتا ہے۔میر محمد سردار خان مری بلوچوں کو عربی النسل المری سے ملاتے ہیں جن کی کسی زمانے میں ایک مشہور و معروف سلطنت رہی ہے۔میر گل خان نصیر اسے مفروضے سے تعبیر کرتے ہیں۔نسلی اعتبار سے صورتحال کچھ بھی ہو لیکن مری ایک عظیم جنگجو قبیلہ ہے۔جس نے انگریز حکمرانوں کو تگنی کا ناچ نچایا۔جانوں کی قربانی دی مگر اپنی سرزمین سے دستبردار نہیں ہوئے۔ایک مشہور و معروف مری شاعر نے مری قبیلے کی بہادری کا اس طرح ذکر کیا ہے:

نفسک ء کنڈگ ء دَانی
ہموداں نشک آں مردانی
منی پھلیں مریانی

نفسک ایک وادی ہے۔شاعر کہتا ہے: "نفسک کی پہاڑی پر اب تک وہ نقوش گواہی دیتے ہیں کہ میرے پھول جیسے مری مجاہدین نے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔"

اس میں بالکل شک نہیں کہ مری قبیلہ نے ہر دور میں اپنی قومی عظمت، وطن سے محبت، میدان جنگ میں جرأت اور معاشرت میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا ہے۔ان پر قلات کے حکمران خداداد خان نے بارہا حملے کئے۔انگریزوں نے خون کی ندیاں بہائیں۔بعد کے حکمران نے بھی بعض غلط فہمیوں کے باعث مری قبیلہ کو مشق ستم بنایا۔اس غیور اور جسور قبیلے نے جان کی قربانی تو دی مگر سر تسلیم خم نہ کیا۔

رخشانی: یہ ایک بہت بڑا قبیلہ ہے جو بلوچستان، ایران اور افغانستان میں پھیلا ہوا ہے۔روایتی طور پر اگرچہ اسے رند لاشار کیساتھ آنے والے قبائل سے محسوب کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ ان قبائل میں سے نہیں۔یہ خود بلوچوں کی ایک جداگانہ شاخ ہے جو "ناروئی" بلوچوں سے وابستہ ہے۔زبان کے لحاظ سے بھی یہ رندی بولی سے مختلف بولی بولتے ہیں۔یہ قبیلہ زیادہ تر خاران اور چاغی میں آباد ہے۔جبکہ افغانستان کے علاقہ گرم سیل اور گریش، ایران کے علاقہ سیستان میں یہ قبیلہ زیادہ بڑی تعداد میں آباد ہے۔یہ لوگ اپنی بولی کو رخشانی اور رندی بولی کو بلوچی کا نام دیتے ہیں۔

ذیلی قبیلے: ۱) نوشیرانی ۲) بادینی ۳) جمالدینی ۴) ماندائی ۵) سیاہ پاد ۶) نوتیزئی

یہ بھی ایک مشہور روایت ہے کہ ان کا جد امجد مشہور تاریخی شخصیت رستم بن زال کے گھوڑے کا سائیس تھا۔رستم کے گھوڑے کا نام "رخش" تھا۔اسی رخش کی نسبت سے رخشانی مشہور ہوئے۔

بگٹی: بلوچستان کا مشہور جری قبیلہ ہے۔آثار و قرائن کے مطابق بگٹی دراصل کرد ہیں۔جو کردستانی کردوں کی بکتائی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔رند اور لاشار کے ساتھ اس سرزمین پر ان کی نقل مکانی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔یہ خود کو کرد قبیلہ زرکھان کا نام دیتا ہے۔بگٹی بلوچوں کا ایک بہادر اور جنگجو قبیلہ ہے۔سندھ اور پنجاب کی سرحدوں پر انہوں نے انگریزوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔سر ولیم میری وور، لارڈ پنجٹر اور دوسرے انگریز افسروں کے زیر کمان بگٹی قوم نے کئی خونریز لڑائیاں لڑیں۔نیٹو ہتورام نے لکھا ہے کہ اس تمن کے چندیں سرداروں، معتبروں اور جری اشخاص نے وطن کے لیے جانوں کی قربانی دی۔

ذیلی قبیلے: ۱) راہیجہ: (یہ قبیلے کا سردار خیل ہے) ۲) نوتھانی، ۳) مسوری، ۴) کھلپر، ۵) نوحکانی، ۶) مندرانی، ۷) شنبانی: (ان میں سے ہر قبیلہ دوسرے کئی ذیلی طائفوں پر مشتمل ہے ڈیرہ بگٹی صدر مقام ہے)

مامسنی / محمد حسنی: مام سنی کا نام غلط العام ہے۔خود کو محمد حسنی کہتے ہیں اصل میں یہ ایک قدیم بلوچ قبیلہ ہے جو مرور ایام میں سیستان میں آباد تھا۔بعد میں نقل مکانی کرتے ہوئے بلوچستان کے ضلع خاران، ضلع چاغی اور جھالاوان میں پھیل گیا۔اس قبیلے کے اکثر افراد قد آور مضبوط دست و بازو رکھنے والے تنومند ہیں اور اپنے ہمسایہ رخشانی قبیلہ سے تن و توش میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ایران کی قدیم تاریخ میں ماشئی، ماشنی، پرکانی اور سرپرہ کا بار بار ذکر آتا ہے۔یہ قبیلے سیستان کے ناروئی

قلات کا پرانا قلعہ (قصبہ، بلوچستان)

اسلامیہ ہائی اسکول کوئٹہ (تصویر بحسن سلطان)

بلوچوں سے میل جول رکھتے تھے جواب بھی گرم سیل اور سیستان کے علاقوں میں آباد ہیں۔ مامسنی قبیلے کا سردار جھالاوان کی تحصیل مشکے کے مقام جبھری میں رہتا ہے۔ مامسنی کہیں بھی ہوں اسے اپنا سردار مانتے ہیں۔ کلملی زئی سردار خیل قبیلہ ہے۔

ذیلی قبیلے: ۱۔شیخ حسنی ۲۔ مردان شئی ۳۔ شہناد زئی ۴۔ کوراچی ۵۔ سمائیلی ۶۔ مزارزئی ۷۔ زنگیانی ۸۔ شاہی زئی ۹۔ یوسفی ۱۰۔ شیروزئی ۱۱۔ زیرکانی ۱۲۔ زنگیانی ۱۳۔ درک زئی ۱۴۔ عیدوزئی ۱۵۔ یاگی زئی ۱۶۔ کیازئی ۱۷۔ منڈازئی ۱۸۔ خبرانی ۱۹۔ بنگلوئی ۲۰۔ شاہوانی ۲۱۔ حسینی۔

کھیتران: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ ایک زراعت پیشہ قبیلہ رہا ہے۔ بنیادی طور پر ممکن ہے یہ جاٹ ہوں لیکن فی الوقت بعض بلوچ قبیلوں کی شمولیت سے اب بلوچ قبائل میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ یہ لوگ بلوچی زبان کے علاوہ اپنی ایک مخصوص بولی بھی بولتے ہیں جو سرائیکی سے ملتی جلتی ہے۔ قبیلہ کھیتران چار ذیلی شاخوں پر مشتمل ہے۔

ذیلی قبیلے: ۱) گنجورہ ۲) کھیتران ۳) دھریوال المعروف چچہ ۴) حسنی گنجورہ۔ کھیتران کا بنیادی قبیلہ ہے جو جاٹ ہے بعض لوگ اسے تورترین پٹھان بھی کہتے ہیں۔

چچہ یا دھریوال بلوچ طائفہ ہے۔ یہ دودائی ہے۔ جن دنوں غلام شاہ کلہوڑہ حاکم سندھ نے ڈیرہ غازی خان پر حملہ کر کے غازی خان بلوچ کو گرفتار کیا۔ تب یہ لوگ وہاں سے فرار ہو کر بارکھان آئے اور کھیتران کے ہمسایہ رہے۔ پھر رفتہ رفتہ کھیتران کے ایک ذیلی قبیلہ کی حیثیت اختیار کی اور اس کے جزو بن گئے۔

رند: براہوئی اور ناروئی کے بعد بلوچوں کی تیسری بڑی شاخ رند ہے۔ یہ بلوچوں کا وہ طائفہ ہے جو روایات کے مطابق سردار جلال خان کی سرکردگی میں جگین (ایرانی بلوچستان) سے ہجرت کر کے مکران میں وارد ہوا۔ یہاں پر سردار شیہک رند کے دور میں رند و لاشار اور کئی دوسرے طائفوں میں بٹ گئے۔ ایک بلوچ محقق (ا۔ میر عاقل خان مینگل (ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان بابت ماہ جون ۱۹۸۱ء)) کی رائے میں رند دراصل ارند ہے جو لفظ "آریازند" کا مخفف ہے۔ آریازند آذربائیجان کا ایک ہمادی قبیلہ تھا۔ جو زند سے ملتا جلتا تھا البلاذری آذربائیجان کے علاقہ کو "مروند" کہتا ہے جو اصل میں "مرزرند" ہے یعنی رندوں کا مسکن۔ ہمدان کے قریب جوزند قبیلہ آباد تھا ان کی زبان بڑی حد تک بلوچی سے ملتی جلتی ہے۔ قدیم روایات کے مطابق رند خود کو العمش رومی کی اولاد بتاتے ہیں۔ العمش کے بعد اس کا بیٹا گلچراغ بلوچوں کا سردار بنا۔ اس وقت یہ چوالیس قبیلے تھے جو ایران کے علاقہ کرمان میں یا اس کے نواح میں آباد تھے بدر دین جو کرمان کا بادشاہ تھا گلچراغ کے خلاف ہوا۔ تو بلوچوں نے کرمان کے نواح سے ہجرت کر کے مکران کا رخ کیا جب وہ مکران پہنچے تو ان کا سردار میر جلال خان تھا۔ میر جلال خان بلوچ کے چار بیٹے تھے۔ ۱) رند ۲) لاشار ۳) کراہ ۴) ہوت اور ایک بیٹی تھی مائی جتو ان سے بلوچوں کے اسی نام کے قبیلے وجود میں آئے البتہ جتوئی کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ بھی میر جلال خان کے جاتن نامی بیٹے کی اولاد ہیں، جس کی ماں ایک رقاصہ تھی۔ اگر تاریخ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا جائے تو اس روایت میں کوئی صداقت نہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ہوت اس زمانے میں بھی، جب سکندر اعظم نے ساحل مکران کا سفر کیا، اسی نام سے "ہوت" (۲۔ بلوچستان قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں۔ میر گل خان نصیر، ص ۱۶۶۔ میر گل خان نصیر کا یہ کہنا بجا ہے کہ ہوت مکران کی قدیم قوم ہے۔ میر نبی بخش بلوچ اپنی کتاب "سسی پنوں" میں ہوت کی حکمرانی کا مکران میں پانچویں صدی ہجری گیارویں صدی عیسوی بتاتے ہیں مکران کیچ میں پنوں کا قلعہ اسی دور کا ہے سردار جلال خان کی ایران سے ہجرت بہت بعد کی ہے جسے پندرھویں صدی لکھا گیا ہے۔ صابر بلوچ) موجود تھے۔ اسی طرح لاشاری بھی اسی علاقے میں رہنے والے بلوچ تھے جو لاشار کے نام سے اب بھی ایران میں موجود ہیں۔ بہرحال رند خود کو سردار جلال خان کی اولاد اور اسکا جائز وارث سمجھتے ہیں اور ان چوالیس بولکوں کا سردار بھی جو کرمان سے ہجرت کر کے آئے اور مکران میں آباد ہوئے تاہم سارے قبیلوں کے نام ان روایات میں مفصل نہیں ملتے۔

رند قبیلہ میر چاکر خان کی وجہ سے مشہور ہوا جو ایک مدبر، بہادر اور جنگجو سردار تھا۔ رند اور لاشار ایک ساتھ سطح مرتفع قلات میں وارد ہوئے۔ میر چاکر نے درہ بولان سے میر گہرام لاشاری نے درہ مولا سے گذر کر سبی اور کچھی پر قبضہ کیا۔ بعد میں مختلف اسباب و وجوہات سے ان دونوں قبیلوں میں تیس سالہ جنگ ہوئی۔ دونوں قبیلے قوت و اقتدار سے محروم ہوئے۔ رند پنجاب کی طرف اور لاشاری سندھ اور گجرات کو جا نکلے۔ رند قبیلہ کا شمار سراوان کے قبیلے میں ہوتا ہے۔ شوران ان کا صدر مقام ہے۔

مگسی: مگسی لاشاری قبیلے کا ایک ذیلی طائفہ ہے۔ یہ ان چوالیس قبائل میں، جو سردار جلال خان کے ساتھ ہجرت کر کے آئے تھے، ایک بولک تھا۔ ہجرت سے پہلے یہ قبیلہ ایران کے مگس نامی علاقے میں آباد تھا اسی نسبت سے مگسی مشہور ہوا۔ جن دنوں میر گہرام خان کچھی گنداوہ پر حکمران تھا۔ مگسی قبیلے کا سردار نندوان کا نائب یا وزیر تھا۔ رند لاشار تیس سالہ جنگ کے دوران نندو نے خاصی طاقت حاصل کی۔ جب میر گہرام خان اپنے خاندان اور دوسری معروف شخصیتوں کے ساتھ کچھی کو خیرباد کہہ کر

سندھ اور گجرات کی طرف نکل گیا تو نندو نے ان کے جانشین کی حیثیت میں اس علاقے پر جو کبھی گہرام خان کے قبضے میں تھا، اپنا قبضہ جمالیا۔ صرف "گاجان" میں چند دوسرے لاشاری افراد قابض رہے۔ خان قلات کے دربار میں مگسی قبیلے کا شمار جھالاوان کے قبائل میں ہوتا تھا۔

ذیلی قبیلے: ۱) بھوتانی ۲) روہیجہ ۳) شنبانی ۴) نندانی ۵) راؤتانی ۶) سوبھانی ۷) ساکھانی ۸) ہوسیانی ۹) چترانی ۱۰) بنگلانی۔

جمالی: یہ قبیلہ خود کو لغاری بلوچ قبیلہ کی ایک شاخ سمجھتا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر بگدار یعنی اونٹوں کے گلے پالتے تھے لیکن جب قلات کے خان میر خداداد خان کو ان کے چچازاد بھائی شیر دل خان نے سرداروں کی سازش سے شدید زخمی کیا اور قلات کے تخت پر قبضہ کیا تو میر خداداد خان کو ان کے حمایتی نورواہ لے گئے، جہاں جمالیوں نے ان کی بڑی خاطر مدارت کی اور اس وقت تک ان کو اپنے پاس رکھا جب تک کہ شیر دل خان کو موت کے گھاٹ اتروا کر میر خداداد پھر سے قلات کے خان بنے۔ جمالی قبیلے کی ان وفاداریوں کے عوض میر خداداد خان نے نصیر آباد کا تمام علاقہ جمالیوں کو عطا کر دیا۔ نصیر آباد اس دور میں ایک خشکابہ علاقہ تھا لیکن انگریزی دور میں انگریزوں نے دریائے سندھ کے کیرتھر بیراج سے اس علاقے کو سرسبز و شاداب کرادیا۔ جمالی قبیلہ جو اس زیر آب اراضی کے بیشتر حصے کا مالک تھا، خوب آباد ہو گیا۔

بینجو یا بیزن جو: بزنجو، جسے وہ خود بینجو کہتے ہیں۔ جھالاوان کا ایک مشہور قبیلہ ہے جو مندرجہ ذیل ذیلی قبائل پر مشتمل ہیں۔

۱) حملانی: (یہ سردار خیل طائفہ ہے) ۲) ہومرانی، ۳) سیاہ پاد، ۴) تمرانی

ذیلی طائفے: ۱) نندوانی ۲) کنگروزئی ۳) بدوزئی ۴) نوتھانی ۵) گزوزئی ۶) زہروانی ۷) بردانی ۸) غیبی زئی ۹) شاہوزئی ۱۰) بوہڑزئی ۱۱) گواران زئی ۱۲) چنال

رائے ہتورام کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے بعض دوسرے اشخاص بھی بیزنجو کو رندوں کا ایک طائفہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب میر چاکر رند سبی اور کچھی کی طرف نقل مکانی کر گئے تو یہ قبیلہ مینگلوں کے ساتھ جھالاوان کے پہاڑوں اور نال و جاہو کی وادیوں میں پیچھے رہ گیا۔ اگرچہ یہ رائے بالکل ہی بے بنیاد ہے۔

میر بجار ولد میر ہومر میروانی اور جدگالوں کے درمیان جب لڑائیاں ہوئیں تو ان دنوں لسبیلہ سے سوراب تک جھالاوان کا تمام علاقہ جدگالوں کے قبضے میں تھا۔ نال اور وڈھ کے علاقے یوسف ولد تمر نامی جدگال سردار کے قبضے میں تھے۔ مینگل ڈن، سوراب، ماراپ، سیاہ کنب، دشت گوران، خیسن دون، چھپر، چھتی اور زیارت کی وادیوں میں نیمرغ تک مال چرائی کیا کرتے تھے۔ میر حمل، جس سے بیزنجو قبیلے کا سردار خیل طائفہ حملانی مشہور ہے۔ جدگالوں کے خلاف لڑائی میں میر بجار میروانی کے ساتھ تھا۔ جب جدگالوں کو جھالاوان سے باہر کیا گیا تب میر بجار میروانی نے جو تمام براہوئی قبائل کا سردار تھا جھالاوان کے متعلقہ علاقے کو براہوئی قبائل میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم میں نال کا علاقہ میر حمل کے حصے میں آیا جس پر وہ آج تک قابض ہیں۔ وڈھ کا علاقہ ملک دوستین نوشیروانی کو ملا، بعدازاں بعد خان قلات میر عبداللہ خان اور خان نصیر خان نوری کے دور حکومت میں جنوب کی طرف وڈھ اور شمال کی جانب نوشکی کے سرحدی علاقے تحفظات سرحد کے پیش نظر مینگل قبیلہ کے سپرد کیے گئے۔ الغرض حملانی، جو بیزنجو قبیلے کا سردار خیل طائفہ ہے، رندو لاشار سے بہت پہلے سردار میرو کے ساتھ اس سرزمین پر آ چکا تھا۔

قبیلے کے جدامجد بیزن کے بارے میں تاریخی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ بیزن وہ تورانی پہلوان تھا جو توران (موجودہ جھالاوان) کے بادشاہ افراسیاب کی بیٹی منیژہ کا عاشق تھا، جسے افراسیاب نے گرفتار کر کے چاہ زندان میں ڈال دیا تھا اور منیژہ کو محل سے نکال دیا تھا۔ منیژہ بیزن کے عشق میں گرفتار در بدر اور خاک بسر پھرتی رہی، تا آنکہ رستم بن زال کے پاس پہنچی۔ اس سے مدد کی درخواست کی۔ فردوسی شاہنامے میں بیان کرتا ہے۔

منیژہ منم دخت افراسیاب
برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب
برائے یکے بیزن شورہ بخت
فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

ترجمہ: میں منیژہ ہوں، افراسیاب کی بیٹی۔ سورج تک نے میرا جسم برہنہ نہیں دیکھا۔ بیزن نام کے بدقسمت کی وجہ سے میں تاج و تخت سے محروم ہوئی ہوں۔

رستم بن زال نے اس کی حالت پر رحم کھا کر بیزن کو زندان سے رہائی دلائی۔ بیزنجو اسی بیزن کو اپنا مورث اعلیٰ کہتے ہیں۔

ڈومبکی: ڈومبکی رند ہیں اور رند کی اعلیٰ نسل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ دلیل کے طور پر وہ رندوں کے نسب نامے کا ایک شعر پیش کرتے ہیں (۱) جس میں شاعر نے کہا ہے کہ رندوں کا بڑا گھرانہ ڈومبکی ہے۔ جوگاج اور سیاہ آپ کے علاقے میں آباد ہیں۔ ڈومبکی کہتے ہیں کہ ایران سے آ کر وہ مکران کے علاقے ڈونگ میں آباد ہونے کی وجہ سے ڈومبکی مشہور ہوئے۔ مکران میں ڈونگ نام کا کوئی علاقہ نہیں۔ البتہ دشت

اور سنڈ سر کے قریب ڈومب کا علاقہ ہے ممکن ہے ڈونگ کو غلطی سے ڈومب لکھا گیا ہو۔اس کی حقیقت ایک مفروضے سے زیادہ نہیں۔(قدیم بلوچی شاعری کے اس شعر پر ڈومبکی نازاں ہیں۔مستریں لوگ ڈومبکی انت گاج وسیاہ آف ءگورانت)

عام رندوں کی طرح ڈومبکی بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ امیر حمزہؓ کی اولاد ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ حضرت امیر حمزہؓ نے ایک پری سے شادی کی تھی جس سے ان کا بیٹا بدیع الزمان تولد ہوا۔بدیع الزمان کی پشت سے ایک بیٹا ہوا جس کا نام "برلچہ" تھا۔برلچہ سے بلوچ نام پڑ گیا۔لہذا سارے بلوچ حضرت امیر حمزہؓ کی نسل سے ہیں۔برلچہ کے ہاں بیٹا ہوا جس کا نام مظہر تھا۔مظہر کے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک حبیب اور دوسرا مختار۔حبیب کربلا میں حضرت امام حسینؓ کے ساتھ شہید ہوئے۔امام حسینؓ کا انتقام لینے جب امام ابوحنیفہ دمشق سے لشکر لے کر یزید کے خلاف لڑنے آئے تو مختار بن مظہر امام ابوحنیفہ کے ساتھ تھے۔یزید کی موت کے بعد ڈومبکی کئی پشتوں تک عربستان میں رہے لیکن جب حجاج بن یوسف عربستان میں صاحب اقتدار ہوا تو چونکہ حجاج سادات کا دشمن تھا اور ڈومبکی سادات کے طرفدار تھے۔سادات سے محبت کرتے تھے۔حجاج اُن کا بھی دشمن ہوگیا۔ڈومبکی حجاج کی مخالفت کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔اس لیے عربستان سے ہجرت کر کے ایران آئے۔بعدازاں ایران سے سردار جلال خان کی سربراہی میں ڈومبکی ایران سے نکلے،مکران میں "ڈونگ" نامی علاقے میں آباد ہوئے۔سردار جلال خان کے جو چار بیٹے تھے ڈومبکی اُن میں سے رند کی اولاد ہیں۔

جہاں تک پری اور امیر حمزہؓ اور بدیع الزمان کا تعلق ہے۔یہ ایک داستان ہے جسکو ہم اساطیر الاولین کہہ سکتے ہیں۔خود کو عربی النسل ثابت کرنا اِس زمانے میں ایک عام اور پسندیدہ خواہش ہے۔اسی خواہش کے تابع اِسے داستان امیر حمزہؓ سے جوڑ کر ایسی کہانی گھڑلی گئی ہے،جس کا حقیقت سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔نام بَرلچہ خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ عربی نام نہیں ہے کیونکہ عربی میں "چ" نہیں ہے۔البتہ اسے ہم برلوصہ یا برلوس کہہ سکتے ہیں۔لیکن اِسے بھی اختراع کہا جاسکتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ ڈومبکی رند بلوچ ہیں۔اُن کے جدِ امجد محمد اور ابراہیم میر چاکر خان کے چچازاد بھائی تھے۔انہوں نے میر چاکر خان کے ساتھ ہندوستان کی طرف نقل مکانی سے انکار کیا۔وہ میر چاکر کے خلاف تھے۔میر چاکر نے دو دائیوں کو اکسا کر ان پر حملہ کرایا۔لڑائی میں محمد اور ابراہیم دونوں مارے گئے مگر اِن کے بیٹے میرو ولد محمد، ولد ابراہیم فرار ہوکر کوہ سلیمان میں جا کر پناہ گزین ہوگئے۔قبیلے کے سیکڑوں لوگوں نے اُن کا ساتھ دیا تھا۔ان سب نے میرو کو اپنا سردار منتخب کیا۔

کچھ عرصہ بعد میرو نے علاقہ لہڑی کچھی پر حملہ کر کے رواہی نامی جدگال کو،جو اس علاقہ پر قابض تھا،شکست دی اور اس علاقہ پر قبضہ کیا۔لہڑی ڈومبکیوں کا صدر مقام ہے۔قبیلہ ڈومبکی کے ذیلی قبیلے یہ ہیں۔

۱)وَریانی،۲)محمدانی،۳)براہیمانی،۴)جھکرانی،۵)گشکھوری،۶)بغداد،۷)ٹالا ۱۴)سینگانی۔((قدیم بلوچی شاعری کے اس شعر پر ڈومبکی نازاں ہیں))

مستریں لوگ ڈومبکی انت　　گاج وسیاہ آف ءگورانت

کھوسہ: مشہور بلوچ قبیلہ ہے۔آج کل نصیر آباد اور سندھ میں بکثرت آباد ہے۔سبی، قلات، مکران اور لسبیلہ میں بھی منتشر ہے۔اِس کا ایک طائفہ ڈیرہ غازی خان میں آباد ہے۔جو کچھی سے نقل مکانی کر کے وہاں جا کر آباد ہوا۔

لانگھا (لانگو): ایک بہت بڑا قبیلہ ہے جو رند و لاشار کی آمد سے بھی پہلے بلوچستان میں آباد تھا اور رفتہ رفتہ سندھ اور پنجاب تک پھیل گیا۔جب میر چاکر رند ملتان کے اطراف میں پہنچے تو لانگھا اُن سے قبل وہاں آباد بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے۔ہمایوں بادشاہ کے ساتھ میر چاکر کی سرکردگی میں چالیس ہزار بلوچوں کا جو لشکر گیا اور جس نے دہلی کی لڑائی میں سوریوں کو شکست دی اس میں لانگھا نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔اس لیے میر شہداد رند دہلی کی اس لڑائی کے متعلق اپنی ایک مشہور نظم میں انہیں "دو تلواروں سے لڑنے والا لانگھا کہہ کر ان کی تعریف کرتا ہے" بلوچستان میں فی الوقت لانگھا ضلع قلات کے علاقہ منگچر میں آباد ہیں، جو غلط العام میں لانگو کہلاتے ہیں۔یہ ایک جفاکش اور بہادر قبیلہ ہے۔بلوچستان کے بعض دوسرے اضلاع میں بھی ان کی آبادی ملتی ہے منگچر ان کا صدر مقام ہے۔سارا وان کے قبائل میں شمار ہوتا ہے۔

بلیدی: بلوچوں کا ایک قدیم قبیلہ ہے۔جو رند و لاشار کی آمد سے پہلے مکران میں رہا اور بلیدہ کے علاقے میں آباد تھا۔دراصل ان کا تعلق ان بلوچوں سے ہے، جو ناروئی کہلاتے ہیں اور سیستان سے مستونگ تک اور پھر خاران سے مکران تک پھیلے ہوئے تھے۔ایران کی قدیم تاریخ اور فردوسی کے شاہنامے میں جن بلوچوں کا ذکر ملتا ہے وہ انہی طائفوں یعنی ناروئی اور براہوئی میں سے ہیں جن کی قدامت مسلمہ ہے۔

بلیدی ایک دور میں کیچ مکران کے حکمران تھے۔زاں بعد کچکیوں سے شکست کھا کر وہ اپنی حکومت کھو بیٹھے۔مکران اور سیستان سے وقتاً فوقتاً ہجرت کر کے وہ کچھی کے علاقے میں آ کر آباد ہوئے۔کچھی کے جس علاقے میں وہ آباد ہوئے اسے "بلیدہ کار" کہتے ہیں، جو بھاگ تحصیل ناڑی میں واقع ہے۔ان کا ایک حصہ کوہستان مری و بگٹی کی طرف نکل گیا اور علاقہ بگٹی کے سیاہ آف میں آباد ہوا۔اس

دوران ان کے اور گورگیجوں کے درمیان قبائلی لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جسے گورگیج قبیلے کے مشہور بلوچ قوم پرور، منتقم اور جانباز شاعر بالاچ نے اختتام کو پہنچایا۔ ان لڑائیوں میں جومی نام کی ایک بیوہ کی گائیوں کے لیے شروع ہوئی، سینکڑوں بلیدی اور گورگیج کام آئے لیکن بالاچ کیوجہ سے گورگیجوں کو بالادستی حاصل ہوئی۔ بلیدی عاجز آ کر سیاہ آف (سیاہ آف سے سندھ کی طرف نکلے جواب بڑی تعداد میں سندھ میں "بردی" کہلاتے ہیں) بلوچستان میں بلیدی اب بھی زیادہ تر مکران اور کچھی میں آباد ہیں۔ قبیلے کا سردار جیکب آباد میں رہتا ہے جو پہلے خان گڑھ کہلاتا تھا۔

بنگلزئی: بنگل نامی ایک رند بلوچ کی اولاد سے ہونے کی نسبت سے بنگلزئی کہلاتے ہیں۔ ساراوان کا ایک نامی گرامی قبیلہ ہے، بلوچی رواج کے برعکس اس قبیلے کے قائد کو میر یا سردار کی بجائے وڈیرہ کہتے ہیں۔ اسپلنجی اور مستونگ قبیلے کا صدر مقام ہے۔ خوانین سلف کے عہد میں اس قبیلے کا گوہرام زئی طائفہ بہت مشہور رہا ہے۔ سلطان زہرو جو نصیر خان اول کے عہد میں گذرے ہیں، اسی گوہرام زئی طائفے سے تھے اور خان کے دست راست اور معتمد خاص تھے۔ کہتے ہیں پہلے بھی قبیلے کی سرداری گہرام زئی طائفے کو حاصل تھی، لیکن اس طائفے کے کمزور پڑ جانے سے سرداری طائفہ سیدزئی کو منتقل ہوئی۔

بنگلزئی جو خود قبیلہ رند کا ایک طائفہ ہے درج ذیل طائفوں پر مشتمل ہے۔

۱) گہرام زئی ۲) دینارزئی ۳) گرانی ۴) شوران زئی ۵) بدوزئی ۶) بجارزئی ۷) شاہوزئی ۸) نندوانی ۹) پڑ ۱۰) مشڈ ۱۱) پھگ۔

دہوار: اصل نام دہ وارا یعنی دیہاتوں کے زمیندار ہے۔ دوسرے بلوچ چونکہ پہاڑوں اور وادیوں میں عموماً رہتے ہیں اور خانہ بدوش خیال کئے جاتے ہیں اس لیے ان لوگوں کو جو دیہات میں رہ کر کاشتکاری کرتے ہیں "دہ وارا" یا دہوار کہتے ہیں۔ یہ قبیلہ اپنے اردگرد دوسرے قبیلوں سے زیادہ متمدن اور متمول ہے۔

یہ قبیلہ زیادہ تر مستونگ اور قلات میں رہتا ہے البتہ ایرانی بلوچستان میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کا سردار ارباب کہلاتا ہے اور خواجہ خیل طائفہ سے ہوتا ہے، جو بنیادی طور پر مامسنی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے، جن کی حکومت میر واڑیوں سے قبل مستونگ اور اس کے مضافات میں قائم تھی۔

ذیلی طائفے: ۱) خواجہ خیل ۲) تیرپچی ۳) شیخ ۴) سارنگ زئی ۵) زڑخیل ۶) آبی زئی ۷) ہیبت زئی ۸) یوسف زئی ۹) محمود زئی ۱۰) توران زئی ۱۱) بڈھازئی ۱۲) سنجر زئی ۱۳) مندوزئی ۱۴) ہوتی زئی ۱۵) دادی زئی ۱۶) قاضی ۱۷) تاجک ۱۸) ڈھاڑی زئی ۱۹) گہرام زئی ۲۰) چکازئی ۲۱) رند ۲۲) سولانی ۲۳) ملازئی۔

قلات کے دہواروں کے پانچ مشہور طائفے ہیں ۱) کابلی زئی ۲) مغل زئی ۳) عالی زئی ۴) ڈوڈکی زئی ۵) رئیس توک۔

دہوار بلوچوں کا واحد قبیلہ ہے جو اگرچہ ساراوان کے براہوئی قبائل میں شمار ہوتا ہے لیکن براہوئی کے علاوہ ان کی اپنی جداگانہ زبان بولی جاتی ہے جو قبیلے کی نسبت سے دہواری کہلاتی ہے جس میں فارسی اور براہوئی کی ملاوٹ ہے۔

قبیلہ دہوار کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ جب انگریزوں نے ۱۸۳۹ میں خان قلات محراب خان کے قلعے پر حملہ کیا تو محراب خان شہید کے ساتھ دوسرے قبائل میں دہواروں کے سردار ارباب خان محمد دہوار بھی اپنے متعدد جاں نثاروں کے ساتھ میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ کہتے ہیں شہادت سے پہلے دہواروں نے اپنی مستورات کو خود قتل کیا تاکہ دشمن ان کے ننگ و ناموس کو ہاتھ نہ ڈال سکے۔

شاہوانی: ساراوان کا مشہور قبیلہ ہے۔ ان کے جدامجد کا نام شاہو تھا، جس سے یہ شاہوانی مشہور ہوئے۔ بنیادی طور پر رند بلوچوں کے پڑ قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اب اس میں دوسرے بعض طائفے بھی شامل ہوئے ہیں۔ ان کی بنیادی جائے سکونت کھڈکوچہ (مستونگ) اور اسکلکو (قلات) ہے لیکن آجکل یہ شیخزئی مستونگ اور سریاب میں بھی آباد ہے۔ شاہوانی کے ذیلی قبیلے یا طائفے یہ ہیں۔

۱) حاجی زئی ۲) شارین زئی ۳) چتروزئی ۴) میروزئی ۵) شیرزئی ۶) خواجو زئی ۷) راوت زئی ۸) شاہوزئی ۹) کلوزئی ۱۰) حسنی ۱۱) سوری زئی ۱۲) ہومرانی ۱۳) غل ۱۴) کشانی ۱۵) سیاہی زئی۔

خوانین قلات کے ابتدائی دور میں اس قبیلے کی بڑی شہرت تھی۔ یہ لوگ خان قلات کے دست بازو سمجھے جاتے تھے۔ لیکن بعد ازاں نصیر خان دوم کے عہد میں ساراوان کا سرخ بیرک ان سے چھین کر رئیسانی کے سپرد کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ خان قلات میر محراب خان شہید کے مقابلے میں اس قبیلے نے انگریزوں کا ساتھ دیا، جس سے ساراوان کے دوسرے قبائل ناراض ہوگئے اور بیرک ان سے چھین کر رئیسانی کے سپرد کیا گیا اور شاہوانی کی سرداری کا درجہ بھی گھٹا کر دوسرے درجے پر رکھا گیا۔ آج کل نواب شاہوانی ساراوان کا دوسرا بڑا سردار شمار ہوتا ہے۔ ڈھاڈر اور بالانائی میں اس قبیلے کی بڑی بڑی جاگیریں ہیں جو خوانین قلات نے ان کو جنگی خدمات کے عوض تفویض کیں۔

لہڑی: عام خیال یہ ہے کہ لہڑی ڈومبکی قبیلے کا ذیلی طائفہ ہے اور میر ابراہیم ڈومبکی کی اولاد ہیں جو اپنے بھائیوں سے لڑ جھگڑ کر کچھی کے علاقہ لہڑی سے نکل آئے اور نرمک کے علاقے میں سکونت پذیر ہوئے۔ چونکہ یہ کچھی کے علاقہ لہڑی سے آئے

تھے اس لیے لہڑی مشہور ہوئے۔ علاقہ زہری میں لہڑی نام کا ایک علاقہ موجود ہے اور جام کے نام سے ایک طائفہ بھی اس علاقے میں اب تک موجود ہے جو دراصل ڈومبکی قبیلے کی ایک شاخ ہے۔ لیکن اب قبیلہ زہری میں شمار ہوتا ہے۔ نصیر خان اول کے دربار کا مالک الشعراء جام درک اسی جام قبیلے سے تھا۔ لہذا ڈومبکی قبیلے کے وہ لوگ جو علاقہ لہڑی میں آباد ہیں اور کچھی کے طرف نقل مکانی کر کے نہیں گئے اور جیسا کہ خانہ بدوشوں کی زندگی میں ہوتا ہے، رفتہ رفتہ نرمک اور جوہان کے علاقے میں پھیل گئے، لہڑی مشہور ہوئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ڈومبکی کی بجائے ان کا تعلق بھی اس سیوائی قبائل سے ہو، جن سے قبیلہ زہری تشکیل پاتا ہے۔

قبیلہ لہڑی سارا وان کا ایک جنگجو قبیلہ ہے اور بہادر بھی ہے۔ ان کے سردار کاکڑ خان نے خان عبداللہ خان کے زمانے میں بولان میں کلہوڑوں کے خلاف لڑائیوں میں بڑی شہرت حاصل کی اور بی بی نانی کے مقام پر ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اسی طرح ان کا دوسرا سردار جہانگیر خان سارا وان کی بغاوت میں خان میر خداداد خان کے خلاف قائدانہ کردار ادا کرتا رہا۔ اور کھڈ کوچہ کی لڑائی میں مارا گیا۔

ذیلی طائفے: ۱) ابراہیم زئی ۲) حیدر زئی ۳) شنگرانی ۴) زبیرانی ۵) شادیانی ۶) غلچانی۔

کوردیا کیرد: کوردیا کیرد بلوچی میں وہی نام ہے جو عربی اور فارسی میں کرد بولا جاتا ہے۔ کرد بلوچستان میں قدیم ایام سے آباد چلے آرہے ہیں، یہاں تک کہ ایران کے بادشاہ کیکاؤس کے زمانے میں بھی جبکہ رستم پہلوان نوجوان تھا اور رزم آرائی کا تجربہ نہیں رکھتا تھا اس کے باوجود کک کوہزاد سے لڑنے کے لیے کوہ چلتن پر آپہنچا۔ کورد اسی دشت کے علاقے میں جہاں اب آباد ہیں، آباد تھے۔ چنانچہ اسی واقع کے بیان میں فردوسی کہتا ہے:

نشستہ دراں دشت بسیار کوچ
ز افغان لاچین کرد و بلوچ

اس میں کوئی شک نہیں کہ کردوں کا جو قبیلہ بلوچستان میں آباد ہے۔ ان کا شمار "براہوئی" قبائل میں ہوتا ہے، مگر جو کرد سیستان یا ڈیرہ غازی خان میں آباد ہیں، وہ بلوچی بولتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کردوں کی آمد سے پہلے سطح مرتفع قلات میں جو لوگ آباد تھے، وہ براہوئی بولتے تھے۔ ان میں گھل مل کر کرد بھی براہوئی بولنے لگے۔ تب بھی زبان کا نام براہوئی ہونا چاہیے نہ کہ کردی۔ کرد بلوچستان میں تقریباً ہر علاقے میں پائے جاتے ہیں البتہ دشت اور کہستان بولان ان کی قدیم جائے سکونت ہے۔ جہاں پر وہ اب بھی ایک قبیلے کی حیثیت میں آباد ہیں۔ گردشِ ایام میں بگٹیوں کی طرح کرد طائفے بھی مشرق کی طرف وقتاً فوقتاً نقل مکانی کرتے رہے۔ چنانچہ ڈیرہ غازی خان کے مزاری بلوچ قبیلے میں کردوں کا ایک بڑا طائفہ آباد ہے جو خود کو مزاری کرد کہتے ہیں۔ کرد کے ذیلی طائفے:

۱) مدے زئی ۲) کرموزئی ۳) زرداوزئی ۴) شدن زئی ۵) مسوانی ۶) گورگیج ۷) شادی زئی ۸) محمد زئی ۹) پلان زئی ۱۰) سفرزئی ۱۱) ساتکزئی۔

بلوچستان میں اس قبیلے کا سردار اللہ ڈنہ خان، میر خداداد خان کے دور حکومت میں اپنی طویل قد و قامت اور انتہائی فربہ جسامت کی وجہ سے مشہور شخص گزرا ہے۔ اسلامی فتوحات ایران کے زمانے میں بستام کو ردسیستان کا ایک بلند پایہ اور نامور شاعر تھا جس نے عربوں کے خلاف جنگ آزادی میں نام پیدا کیا تھا۔

ساجدی: یہ ایک بہت ہی قدیم قبیلہ ہے۔ غالباً قبیلہ زہری کی طرح ان لوگوں کی باقیات میں سے ہے جو سیوائی کوشان دور میں اس سرزمین پر آباد تھے۔ یہ قبیلہ جھالاوان کے علاقہ گریشہ میں آباد ہے جس کی شمال مغرب میں گدر کی وادی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ قدیم نام گدروشیا انہی دو علاقوں یعنی گدر اور گریشہ کا مرکب ہے جو اغلب ہے کہ زمانہ قدیم میں سوراب سے لے کر پنجگور اور کولواہ تک کے تمام علاقے کے لیے بولا جاتا تھا۔ اس قبیلے کے سرداروں میں "ساکا" نام بہت ملتا ہے جس سے بھی ان کی قدامت ظاہر ہوتی ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ کی رائے میں جٹ اور گجر (گاؤدار) قبائل پانچویں صدی عیسوی میں بلوچستان میں وارد ہوئے اور جنوبی بلوچستان کے باشندوں کو، جو ساکا نژاد قبائل تھے، زیر کرنے کے بعد ان کے تمام وسائل پر قابض ہو گئے۔ یہ قدیم قبائل یا تو سندھ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے یا پھر انہی جٹ اور جاموٹ قبیلوں میں مدغم ہوئے۔ ساجدی غالباً ان ساکا قبائل کی باقیات میں سے ہیں۔

مامشئی: (محمد شئی) بلوچستان میں آباد ایک قدیم قبیلہ ہے جو اب غلط العام میں اسلامی اثر سے محمد شئی کہلاتا ہے اور خود کو محمد شاہ نامی کسی جد کی اولاد بتاتا ہے۔ لیکن در حقیقت مامشئی یا مامسنی ایک ہی نسل کے لوگ ہیں جو ان ناروئی بلوچوں میں سے ہیں جو زمانہ قدیم سے سیستان اور خواش کے گرد و انواح سے نقل مکانی کر کے مستونگ شیرین آپ اور منگوچر کی وادیوں میں آئے۔ یہ ان بلوچوں میں سے ہیں جن کا ذکر شاہ کیکاؤس کے زمانے میں فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں کیا ہے۔ جو ایران کی قدیم تاریخ میں مامشئی اور مامسنی کے نام سے ملتے ہیں بلوچستان میں منگولوں کی یلغار سے قبل مستونگ کی وادی میں مامسنی اور مامشئی سکونت پذیر تھے اس قبیلے پر مختلف

زمانوں پر افتاد پڑتی رہی ہے۔اس کے ذیلی طائفے تین ہیں۔

ا) ساماز ئی ۲) سورو ۳) بنگا۔

مستونگ میں خاص بہرام شئی کی بستی قبیلے کا صدر مقام کوہک، کابو اور کوہ خاران کے نواح میں آباد ہیں۔

رئیسانی: رئیسانی اگرچہ قبیلے کے لحاظ سے ایک مختصر قبیلہ ہے لیکن رتبے کے لحاظ سے ساراوان کا بڑا قبیلہ ہے۔اس قبیلے کا سردار، سرسرداران ساراوان ہے۔اگرچہ زہری قبیلے کا سردار بھی سرداران جھالاوان ہے لیکن رتبے کے لحاظ سے خان قلات کے بعد پہلا درجہ سردار رئیسانی کو حاصل ہے۔

رئیسانی اگرچہ خود کو تورترین افغان کہتے ہیں لیکن یہ ایک محض مفروضہ ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہر مقتدر شخص یا خاندان خود کو اپنے پدری قبیلے سے جدا ایک خاندان سمجھنے لگتا ہے اور ان لوگوں سے اپنی نسبت ملا لیتا ہے جنہیں وہ مذہباً نسلاً ارفع و اعلیٰ خیال کرتا ہے۔بلوچوں میں احمدزئی، نوشیروانی، گچکی، عالیانی، جام، زرک زئی اور رئیسانی اس کی روشن مثالیں ہیں جو بلوچستان کے احمدزئی خوانین نے خود کو اپنے جدی قبیلہ مینگل کے بجائے قریشی النسل عرب قرار دیا۔اسی طرح نوشیروانی خود کو رخشانی کہنے کی بجائے ایران کے بادشاہ نوشیروان عادل کی اولاد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔گچکی علاقہ گچک کے بلوچوں سے خود کو منسوب کرنے کی بجائے راجپوتوں کو اپنا جدامجد بتاتے ہیں۔لسبیلہ کے عالیانی خاندان اپنے پدری اور بہادر جاموٹ سے ناطہ توڑ کر اپنا نسب نامہ جونا گڑھ کے جام خاندان سے ملاتے ہیں جبکہ زرک زئی اپنے قدیم زہری قبیلہ کو پس پشت ڈال کر زڑخیل افغان بن گئے اور رئیسانی اپنے جدامجد رئیس سیاہی کو جو میروانیوں کا معتبر معزز اور معتمد تھا چھوڑ کر تورترین پٹھانوں میں شامل ہو گئے۔یہ چند ایسی مثالیں ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے احساس برتری کے فریب میں مبتلا ہو کر اپنے جدی خاندان کو خود سے کمتر ٹھہرایا ہے۔یہ تصور کرنا ہی غلط ہے کہ کسی بلوچ قبیلے میں باہر کا کوئی غیر بلوچ آ کر شامل ہوا اور قبیلے کے ہزاروں بلکہ بسا اوقات لاکھوں بلوچ اسے بے چون و چرا اپنا سردار اور خان تسلیم کریں۔

بلوچستان کی تاریخ گواہ ہے کہ جن دنوں قلات، نغاڑ اور سوراب پر میر ہومر میروانی کی حکومت تھی، سیاہی نامی، اس کے قبیلے کا ایک معتمد اور معتبر شخص دود ران سے سیراب ہونے والی اراضیات چھپر اور زیارت پر اس کا نائب یا رئیس تھا۔ سیاہی نام خود رئیس کے بلوچ ہونے کی غمازی کرتا ہے، پٹھان سیاہی نام کبھی نہیں رکھتے۔کم از کم آج تک ہمیں کسی سیاہی نامی پٹھان کا علم نہیں ہوا۔لیکن بلوچوں میں سیاہ، سیاہی، سیاہ سوار، سیاہ وش اور سیاہی کی بندش سے سینکڑوں نام ہر دور میں ملتے ہیں۔شاہنامہ فردوسی نے بلوچوں کے مشہور سردار سیاہ بلوچ کا خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔میر ہومر میروانی کے مارے جانے کے بعد جب اس کا بیٹا میر بجار چھپر کے مقام پر رئیس سیاہی کے پاس آیا تو رئیس سیاہی اور اس کے دو بیٹوں رستم اور سراج نے اس کا ساتھ دیا۔جب میر بجار میروانی نے قلات اور جھالاوان پر قبضہ کیا تب اس نے رئیس سیاہی کو بڑی عزت دی اور اسے اپنا مشیر بنایا۔یہی سلسلہ خوانین قلات کے اختتامیہ دور تک چلتا رہا۔رئیسانی کے ذیلی طائفے مندرجہ ذیل ہیں:

ا) سیاہی زہی ۲) راؤسین زئی ۳) رستم زئی ۴) سراج زئی۔

قبیلے کی سرداری پہلے رستم زئی قبیلے کو حاصل تھی بعد ازاں سراج زئی طائفے نے اس پر قبضہ کیا۔اس وقت قبیلے کی سرداری اگرچہ سراج زئی طائفے کے پاس ہے لیکن رستم زئی نے بھی اپنے طائفے کی جداگانہ سرداری قائم کر رکھی ہے۔کانک ساراوان قبیلے کا صدر مقام ہے گو کہ سردار آج کل کچھی (مٹھڑی) میں یا زیادہ تر کوئٹہ میں قیام کرتا ہے۔

سرپرہ: قدیمی بلوچ قبیلہ ہے جو کسی زمانے میں افغانستان کے علاقے گرمسیل میں پرکانیوں کے ساتھ آباد تھا۔ایران کی قدیم تاریخ میں سرپرہ اور پرکانیوں کا ایک ساتھ ذکر ملتا ہے۔

سرپرہ اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن بڑے جنگجو اور بہادر واقع ہوئے ہیں۔ سرپرہ روایت کرتے ہیں کہ جب کبھی خان نصیر خان اول کو ان کے علاقہ کردگاب سے گزرنے کا اتفاق ہوتا اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑا کر جلد سے جلد ان کے علاقے سے نکل جاتے اور کہتے تھے کہ اس علاقے کی خاک سے مجھے تلوار کی بو آتی ہے۔

اس قبیلے کی نفری چونکہ بہت کم تھی اس لئے غم لشکر میں وہ قبیلہ ذگر مینگل کے ساتھ شامل کئے گئے تھے۔تیس نفر غم لشکر کے طور پر دیا کرتے تھے۔کردگاب ان کا صدر مقام ہے۔

گچکی: گچکی مکران کا حکمران قبیلہ رہا ہے۔یہ لوگ خود کو مارسنگھ کی نسل سے بتاتے ہیں جو ایک راجپوت سردار گذرا ہے لیکن کیچ کے مشہور گچکی سردار میر محراب خان جنہوں نے انگریزوں کے خلاف "گوک پروش" کی مشہور لڑائی لڑی، اس روایت کو بے بنیاد اور غلط بتاتے ہیں۔انہوں نے بلوچستان کے ایجنٹ گورنر جنرل کے نام اپنی ایک یادداشت میں ہتورام کے اسی بیان پر شدید احتجاج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گچکی علاقہ "گچک" کے رہنے والے ہیں۔ان کے اجداد نے جو بہادر اور جنگجو تھے، طاقت کے بل پر پنجگور پر قبضہ کیا تھا۔بعد ازاں نہ صرف کیچ بلکہ پورے

مکران پر قبضہ کیا۔ سردار میر محراب خان کی رائے کو ہم صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جہاں تک گچکیوں کے جد امجد کے نام مارسنگھ کا تعلق ہے کوئی عجیب بات نہیں۔ دشت مستونگ کے کرد قبیلے میں بھی مارسنگھ نام کے لوگ ملتے ہیں۔ کردوں کا مارسنگ نامی ایک مشہور سردار نصیر خان اول کے عہد میں مشہد کی لڑائی میں مارا گیا۔ دراصل بلوچی نام مارسنگ ان معنوں میں نہیں بولا جاتا جن میں ہتو رام نے مارسنگھ کہا ہے۔ بلوچی میں سنگ پتھر کو کہتے ہیں۔ جبکہ ہندی میں سنگھ شیر کو کہتے ہیں۔ اگر ہم بھی نام کی مناسبت سے ہی قبیلے کی اصلیت کا قیاس کریں تب ممکن ہے گچکی بھی کرد ہوں۔ گچکی قبیلے کے ذیلی طائفے دو ہیں: (۱) عیسی زئی جو پنجگور کے حکمران تھے (عیسی پنجگور انہی کی نسبت سے ہے) یہ خان میر احمد خان کے عہد سے احمد زئیوں کے ساتھ رشتہ ناطہ اور بہت قریبی دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ (۲) درازئی جو بلیدیوں کے بعد کیچ کے حکمران بنے اور ہمیشہ خوانین قلات کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہے۔ پنجگور عیسی زئیوں کا اور تربت درازئیوں کا صدر مقام ہے۔

جاموٹ: بلوچستان میں جٹ جاموٹ اور جدگال ایک ہی نسل کے لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جٹ وہ لوگ ہیں جنہیں عرب روزنامچہ نویسوں نے "زط" لکھا ہے۔ بلوچ ان کو "جت" کہتے ہیں۔ یہ مالدار لوگ (گلہ بان) تھے جو اونٹوں کے گلے پالتے تھے۔ لہذا پیشے کی مناسبت سے بلوچی کے معنی ہیں ساربان اونٹ پالنے والے جدگال جسے غلط العام میں جگدال بھی کہتے ہیں اسی نام جت کا صیغہ جمع ہے جو جت گل بنتا ہے۔ اسی جت گل کے نام کو عام زبان میں جدگال کہا جائے گا۔ جام کا نام بلوچی میں تنومند اور قوی کے ہیں لیکن بسا اوقات بڑے اور معتبر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اس سے نام جاموٹ قبیلے کے بڑے یا معتبر طائفے کے لیے استعمال ہوا۔ جاموٹوں کے سردار کے لیے جام کا لقب اسی سے مشتق ہے۔

یہ جٹ جاموٹ، جت یا جدگال ہمیشہ بلوچوں کے ساتھ رہے ہیں لیکن بلوچ ان کو اپنے سے کمتر خیال کرتے ہیں۔ مکران سے جب سردار شہک رندکی سرکردگی میں بلوچوں نے نقل مکانی کی تو "راچگی" یعنی خدمتگار طائفے کی حیثیت سے جت اور نقیب بھی ان کے ساتھ تھے۔

قدیم تاریخی آثار کے ذریعے سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔ "لسبیلہ کے باشندوں کی اکثریت جٹ اور گجر قبائل پر مشتمل ہے جو پانچویں صدی عیسوی میں بلوچستان میں وارد ہوئے اور جنوبی بلوچستان کے اصل باشندوں کو جو ساکا نژاد تھے زیر کرنے کے بعد ان کے تمام وسائل پر قابض ہوئے۔ یہ قدیم قبائل یا تو سندھ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے یا پھر ان ہی جٹ اور جاموٹ قبیلوں کی قومیت میں مدغم ہو کر زندگی بسر کرنے لگے۔" (روزنامہ جنگ کوئٹہ کے شمارہ نمبر 17 دسمبر 1975ء میں شائع شدہ لسبیلہ سے متعلق ایک مضمون سے اقتباس۔ بلوچستان جدید اور قدیم تاریخ کی روشنی میں۔ میر گل خان نصیر ص 194-195)

غالباً پندرہویں صدی عیسوی میں باہو (ایرانی بلوچستان) میں کیا نامی اس قبیلے کا مشہور عاشق مزاج نوجوان گذرا ہے جس کی محبوبہ کا نام "صدو" (صدگنج) تھا اور وہ لس بیلہ کی حدود میں اور ناچ میں رہتی تھی۔ کیا اور صدو کی نظمیں بلوچی شاعری میں ایک بلند مقام کی حامل ہیں۔ "عشقیہ داستانوں" کے عنوان کے تحت اس پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔ سندھ کی سسّی کے بارے میں بھی اس کے عاشق پنوں کو جدگال کہا گیا ہے مگر سندھ کے عظیم شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی پنوں کو ہوت کہتے ہیں جو تاریخی اعتبار سے درست ہے۔ پنوں ہوت کا قلعہ اب تک کیچ مکران میں موجود ہے۔

ہوت: بلوچوں کا ایک بہت قدیم۔ بہادر اور جنگجو قبیلہ ہے جو سکندر اعظم کے دور میں (۳۲۶ ق م) بلوچستان کے ساحل سمندر کے گرد و نواح میں اور مکران کے جنوب مغربی علاقے میں آباد تھا۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ "سکندر اعظم بٹالہ (پنجاب) سے واپسی پر اپنی بھاری بھرکم اور ٹڈی دل فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس نے سب سے پہلے سمندر کا رخ کیا اور اسے اپنے بائیں ہاتھ رکھا تاکہ خشکی پر جگہ جگہ کنوئیں کھود کر فوج کے اس حصے کو پانی پہنچائے جو سمندری راستے پر سفر میں تھا اور اس کا ارادہ یہ بھی تھا کہ ہوریتانی (ہوت) ہندی قبیلے پر اچانک دھاوا بول دیا جائے۔ جو ہندوستان کی مغربی سرحد پر ایک عرصہ سے آزاد چلا آتا ہے اور اس قبیلے نے سکندر اعظم اور اس کی فوج کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں پس و پیش سے کام لیا تھا۔ سکندر نے ہری بیس (حب) ندی کو راتوں رات پار کر کے ہوریتانی (ہوت) قبیلے پر حملہ کر دیا۔ ہوریتانی قبیلے نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بالآخر شکست کھا کر شمالی پہاڑوں میں جا کر پناہ لی۔ سکندر نے ان کے مشہور شہر رمبیکہ (رمبرو) پر بھی قبضہ کیا۔ سکندر کے ساتھ مختلف جنگوں میں گدروشیائی (گدرو) بھی ہوتوں کے ساتھ تھے۔

مورخین کی عام رائے ہے کہ گدرو اور ہوت جو لسبیلہ اور مکران میں پائے جاتے ہیں، اسی قدیم قوم کے پسماندگان میں سے ہیں جو جٹ قبیلوں کی آمد سے قبل جنوبی بلوچستان میں آباد تھے۔

مندرجہ صدر بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رند بلوچوں کا یہ کہنا کہ سردار جلال خان کے ایک بیٹے کا نام ہوت تھا صحیح نہیں ہے۔ ہوت مکران اور بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں رندوں کی آمد سے پہلے سینکڑوں سال قبل بھی آباد تھے۔ بعد ازاں

بعد یہ قبیلہ منتشر ہو کر بلوچستان میں پھیل گیا۔ آجکل ان کے کچھ طائفے مند اور تمپ میں اور کچھ کلمتی کے نام سے بندرات میں آباد ہیں۔ ویسے بلوچستان کے ہر علاقے میں ہوت ملتے ہیں جو دیگر قبائل بلوچ کے ساتھ ہڈ شریک ہیں۔ بلوچستان میں ہوت قبیلے کے درج ذیل طائفے ہیں۔

۱) کلمتی ۲) ہیسیانی ۳) ہونکانی ۴) نوہکانی ۵) چترانی اور ۶) دیناری۔

پرکانی: پرکانی بھی ماسنی اور سرپرہ کی طرح ایک قدیم ترین قبیلہ ہے۔ ایران کی قدیم تاریخ میں ان قبائل کے ساتھ پرکان کے نام سے اس قبیلے کا ذکر آتا ہے۔ تمام تر خانہ بدوش اور مالدار (گلہ بان) قبیلہ ہے۔ بلوچستان میں کہیں بھی زرعی زمین یا چراگاہی علاقے ان کی ملکیت نہیں۔ گرمیوں کے موسم میں شوراک، قندہار اور گرم سیل کے میدانوں میں یہ (مملکت افغانستان کے علاقے ہیں) چراگاہوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور موسم سرما میں نوشکی، کانک کے درمیانی علاقے میں سے ہو کر درہ بولان سے کچھی کی طرف جاتے ہیں۔

پرکانی گو کہ براہوئی قبائل میں شمار ہوتا ہے اور ٹھیٹ براہوئی بولتا ہے لیکن ان کے ساتھ زمین میں حصہ نہیں رکھتا۔ پٹھان ترکوں کی طرح محض مالداری پر گزر کرتا ہے۔ اس قبیلے کے مرد و زن بڑے بہادر، جری، جفاکش اور جنگجو ہیں۔ آج کل کچھ لوگوں نے ان میں سے کردگاپ میں مختصر سی زرعی زمین خریدی ہے اور پڈین کے نام سے اپنا گاؤں بسایا ہے لیکن ان کی تعداد برائے نام ہے۔ سارا قبیلہ چونکہ پورے سال گردش میں رہتا ہے اس لئے ان کی مردم شماری نہیں ہو سکتی۔ اندازاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے قبیلے کی تعداد دس ہزار نفوس سے زیادہ نہیں۔

پرکانی جہاں بھی ہوں خود کو بلوچ کہتے ہیں اور خان قلات کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ افغانستان یا کہ ایران کی حکومتوں سے دور رہتے ہیں۔ تمام قبیلہ ہر وقت چاک و چوبند اور مسلح رہتا ہے۔

لاشاری: بلوچوں کا ایک نامور قبیلہ ہے۔ یہ ان بلوچوں کا ایک حصہ ہے جو سردار شیہک رند اور میر گہرام لاشاری کے ساتھ مکران سے نقل مکانی کر کے کچھی آئے۔ یہ لوگ کسی وقت ایرانی بلوچوں کے علاقہ لاشار میں آباد تھے اس لیے لاشاری ہوئے۔ سردار شیہک رند نے جب اپنے بیٹے میر چاکر رند کو رند و لاشار کا لس سردار نامزد کرنا چاہا تو لاشاریوں نے میر چاکر کو اپنا سردار ماننے سے انکار کیا اور اسی دن میر گہرام پر سرداری کی پگڑی باندھ کر اپنی جداگانہ سرداری قائم کی۔

بعد ازاں گوہر نامی ایک جتنی کے اونٹوں کے بہانے تیس سال تک رند لاشار کچھی کے میدانوں میں ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے۔ اس خانہ جنگی نے دونوں قبیلوں کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ آخری بار قندہار کے ارغونوں اور رندوں کی متحدہ قوت سے شکست کھا کر میر گہرام لاشاری اپنے قبیلے کے بچے کھچے افراد کے ساتھ کچھی کو الوداع کہہ کر سندھ اور گجرات کی طرف نکل گئے۔ اس کے چلے جانے کے کچھ عرصہ بعد میر چاکر نے بھی پنجاب کا رخ کیا اور وہاں جا کر ستہ گڑھ میں آباد ہوا۔

بلوچستان میں اب صرف مگسی قبیلہ جس کا ذکر ہو چکا ہے، لاشاریوں کی نشانی باقی رہ گیا ہے۔ تھوڑے سے لاشاری گاجان اور بھاگ ناڑی میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن کوئی مربوط قبائلی حیثیت نہیں رکھتے۔

سنجرانی: یہ لوگ اگرچہ خود کو سنجر نامی کسی افغان کی اولاد بتاتے ہیں لیکن دراصل ان کا تعلق بدھ مت کے ان بھکشوؤں سے ہے جو مہاراجہ اشوک کے دور میں اس سرزمین پر پھیلے ہوئے تھے اور ان پہاڑوں میں پانی کے کسی چشمے پر ٹھکانے بنا کر رہتے تھے اور گذر اوقات کے لیے بکریاں پالتے تھے۔ جب اسلام اس ملک میں پھیلا اور ان درویشوں نے اسلام قبول کیا تو بلوچی ''خ'' کا حرف نہ ہونے کے سبب یہ لوگ شیہ کہلائے۔ شیہ اگرچہ شیخ کی بلوچی ہے لیکن معنی کے لحاظ سے مختلف ہے۔ بلوچی شیہ درویش کو کہتے ہیں۔ بھکشوؤں کا یہ تمام طائفہ جو شیہ کہلاتا ہے، اب ایک قبیلے کی صورت اختیار کر گیا۔ کہیری ان کا مشہور طائفہ ہے۔ بلوچی کی مشہور عشقیہ داستان شہہ مرید اسی طائفے سے تھے۔

سنجرانیوں کا جد امجد شیہ سنجر ایک خدا رسیدہ بزرگ اور تارک الدنیا درویش گزرا ہے۔ ان کی اولاد سنجرانی کہلائی اور بلوچوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی گئی۔ شیہ حسن (بلانوش) شیہ حسین (نورانی) شیہ کمال اور شیہ رجب وغیرہ بیسیوں نامی گرامی درویش اسی طائفے سے اولیاء ہو گزرے ہیں۔ ان کے مزاروں پر اب بھی بلوچ زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

چاغی میں گو کہ سنجرانی ایک مختصر قبیلہ ہے جس کی کل نفری دو ہزار نو سو چھیالیس نفوس پر مشتمل ہے لیکن ان کے آباء و اجداد کی درویشانہ صفات اور حسن کردار کے پیش نظر چاغی کے بلوچوں میں ان کی بڑی عزت و تعظیم و تکریم ہوتی ہے۔ جس سے رفتہ رفتہ ان کے بزرگوں کو اقتدار اور حکمرانی حاصل ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ دالبندین اور نوک کنڈی میں آئے تو انہوں نے بھی اس علاقہ پر ان کی حاکمانہ حیثیت کو تسلیم کیا اور اسی حیثیت سے ان سے معاہدات کئے۔

امیر تریہ امیر میر دیر دانی بلوچ

امیر کبیر دادا امیر میر دیر دانی بلوچ

امیر سوری کبرانی بلوچ

۱۴۳۰ تا ۱۴۶۰ امیر بلوچستان

روایتی طرزِ تعمیر کا ایک نمونہ (تصویر: حریانی)

روایتی جرگے کا ایک منظر (تصویر: حریانی)

تلدار: بلوچستان کی قدیم ہندو آبادی تلدار کہلاتی ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر قلات، مستونگ، شال (کوئٹہ)، نوشکی، خاران اور مری بگٹی علاقوں میں آباد ہیں۔ یہ لوگ اپنی ایک مخصوص زبان کے علاوہ بلوچی براہوئی مادری زبان کی طرح بولتے ہیں۔ مرد وزن مقامی بلوچوں کا لباس پہنتے اور غم وشادی میں یکساں شریک ہوتے ہیں۔ جب قلات پر انگریزوں نے حملہ کیا تو کئی ہندو معززین خان محراب خان کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے اور میدان جنگ میں مارے گئے۔ اسی طرح مری اور بگٹی کے علاقوں میں آباد ہندو بھی اپنے اپنے متعلقہ قبائل کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لیتے رہے اور تاوان بھرتے رہے۔

ان کے علاوہ بلوچستان میں ہندوؤں کا ایک دوسرا طائفہ آباد ہے جو کچھی وال کہلاتا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر علاقہ کچھی نصیر آباد اور جھالاوان میں آباد ہیں۔ البتہ بلوچستان کے دوسرے علاقوں میں بھی کاروبار کرتے ہیں اور خود کو وہاں کی آبادی میں مقامی طور پر شمار کرتے ہیں۔

متفرق بلوچ قبائل

بلوچستان میں ان اکتیس مشہور ومعروف بلوچ قبائل کے علاوہ بیسیوں اور ایسے چھوٹے بڑے طائفے ہیں جو اگرچہ بلوچی یا براہوئی زبان بولتے ہیں اور خود کو بلوچ کہتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتلا سکتے کہ ان بڑے مشہور ومعروف بلوچ قبائل میں سے وہ بنیادی طور پر کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی یہ جداگانہ حیثیت کیونکر اور کب قائم ہوئی۔ ان میں سے جو چند ایک نمایاں ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

مید: یہ قبیلہ سونمیانی سے بندر عباس تک بلوچستان کے ساحلی قصبوں اور بندرگاہوں میں آباد ہے، ماہی گیری اور کشتی رانی ان کا پیشہ ہے۔

مید بلوچی زبان میں ماہی گیر کو کہتے ہیں۔ بلوچستان کے ساحل پر سونمیانی سے لے کر جیونی تک اور ایرانی بلوچستان کے چاہ بہار سے بندر عباس تک مید پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ اس علاقے کے قدیم ترین لوگ ہیں جن کا پیشہ ملکک ے لیے قابل قدر زر مبادلہ بناتا ہے۔ مید میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو صرف ماہی گیری کرتے ہیں۔ ان سب میں کچھ لوگ سمندری امور کے ماہرین ہیں۔ جن کو یہ کمال آبائی طور پر حاصل ہوا ہے۔ اب ان میں حبشی بھی گھل مل چکے ہیں جو عربوں کی حکمرانی کے زمانے میں ایتھوپیا اور مشرق وسطی سے غلاموں کی صف میں آئے اور اس علاقے میں ہمیشہ ہمیشکے لیے بس گئے۔ ان کی وجہ سے مقامی لوگوں کی شکل وصورت بھی متاثر ہوئی ہے۔

رئیس: یہ قبیلہ زیادہ تر کیچ مکران میں آباد ہے۔ اچھے خوشحال لوگ ہیں۔ زمینداری ان کا پیشہ ہے۔ گو کہ آج کل تجارت کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کو ایرانی نسل بتاتے ہیں اور کچھ ان کو کچھی کے جدگالوں کا ایک طائفہ سمجھتے ہیں۔

دشتی: یہ لوگ بنیادی طور پر خود کو قحطانی عرب بتاتے ہیں چونکہ مکران کے علاقہ دشت میں آباد ہیں اسی مناسبت سے دشتی کہلاتے ہیں۔ یہ بڑے بہادر اور جفاکش لوگ ہیں۔ زمینداری ان کا پیشہ ہے۔

سنگر: مکران کے ساحلی علاقے کا بڑا مالدار قبیلہ ہے۔ کیچ اور پسنی سے لسبیلہ تک ساحل کی قریبی وادیوں میں آباد ہیں۔ زیادہ تر اونٹ اور بھیڑیں پالتے ہیں اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کو عام طور پر میروانی براہوئی قبیلے کا طائفہ خیال کیا جاتا ہے۔

کٹ ور: یہ طائفہ کیچ میں آباد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب نصیر خان اول نے کیچ پر قبضہ کیا تو ان لوگوں کو اپنی سرکاری اراضیات کی آبادی کیلئے قلات سے یہاں بھیجا گیا۔ یہ لوگ خود کو "خان ءراج" یعنی خان کی قوم کہتے ہیں۔ خان قلات کے دہوار قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

واڈیلہ: تھوڑے سے لوگ ہیں۔ کلانچ میں آباد ہیں اور زراعت پیشہ ہیں۔ یہ خود کو وڈھ جھالاوان سے نقل مکانی کرنے والے مینگل کہتے ہیں۔

ملازئی: ایک مختصر سا طائفہ ہے جو مستونگ نغاڑ دیر (جھالاوان) اور پنجگور میں آباد ہے۔ ان کے اجداد خوانین قلات کے دربار میں اچھے عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ شیراز سے آئے ہوئے فارسی بان بتاتے ہیں۔ انگریز وقائع نگاروں نے ان کو قبیلہ دہوار میں شمار کیا ہے۔

ہومرانی: بلوچوں کے تقریباً تمام قبائل میں شامل ملتے ہیں۔ جھالاوان میں یہ مینگل شمار ہوتے ہیں لیکن کچھی میں ایک جداگانہ طائفے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہندوستانی: قلات اور مستونگ میں آباد ہیں۔ یہ غالباً ہندوستانی ملازمین کی اولاد ہیں جو خوانین قلات کے عہد میں یہاں پر شادی بیاہ کر کے آباد ہوئے۔

بھٹو: ایک مختصر سا طائفہ ہے جو نوشکی کے علاقے احمدوال میں آباد ہے۔ زراعت پیشہ لوگ ہیں۔ آج کل جمالدینی قبیلے میں شمار ہوتے ہیں۔

مہدی زئی: گوادر میں شمالی پہاڑ کوہ مہدی کی مناسبت سے ایک قدیم قبیلہ مہدی زئی کے نام سے آباد ہے۔ اس پہاڑ کا نام اسی قبیلے کی وجہ سے مہدی ہو کر رہ گیا۔ یہ قبیلہ کوہستان سائجی کے دامن میں وسیع میدان میں زراعت کر کے زندگی بسر کرتا ہے۔ گوادر میں چاروں طرف کچھ پہاڑ ہیں۔ ڈرانب پہاڑ ۳۱۲۵ فٹ بلند ہے تاہم اس کی چوٹی "مک" مزید ۳۲۰۰ فٹ ہے۔ سائجی کی بلندی ۳۱۵۲ فٹ ہے۔ سب سے اہم پہاڑ باتیل ہے جس کے دامن میں گوادر کا شہر آباد ہے۔ اس کے دامن میں قریب ترین میدان چوڑائی میں کم ہے مگر جوں جوں شمال کی سمت بڑھتا ہے، خاکنائے کا میدان وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔

بلوچستان کے مشہور قبائل: اس موضوع پر مواد کی کمی کی وجہ سے بلوچستان کے قبائل گزیٹیر سے مدد لی گئی ہے۔ ضلعی گزیٹیر بلوچستان کے قبائلی حصے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے مترجم پروفیسر انور رومان صاحب کے شکریہ کے ساتھ اس کتاب سے مدد لی جا رہی ہے۔ (بلوچستان کے قبائل ترجمہ گزیٹیر پروفیسر انور رومان) یہ گزیٹیر بیسوی صدی کی ابتدائی یعنی 1901ء کا زمانہ ظاہر کرتے ہیں۔ جب بلوچستان کی آبادی کم تھی اور دو دو تین تین علاقوں کو ملا کر ایک ضلع کی شکل دی جاتی تھی۔ اب اضلاع کی تعداد زیادہ ہو چکی ہے مگر بلوچستان کے پشتون قبائل کا تذکرہ عہد قدیم کی روایات کے تابع کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں صرف پشتون قبائل کا انتخاب ہے۔ زبان ادب، ثقافت کے بارے میں عہد حاضر کے محققین اور دانشوروں کی تصانیف علیحدہ حوالوں سے پیش کی جائیں گی۔

ضلع کوئٹہ پشین: کوئٹہ پشین کے لوگ زیادہ تر خانہ گزین ہیں۔ تحصیل کوئٹہ کے ۵۴۰ میل رقبہ اور پشین ۲۷۱۷ میل کوئٹہ ۴۷ اور پشین ۲۷۱ گاؤں پر مشتمل تھا۔ معدودے چند گاؤں ایسے ہیں جن کی آبادی ۱۰۰۰ نفوس ہے۔ ضلع کی نسلیاتی تاریخ کی معلومات معدوم ہیں لیکن یقینی یہ ہے کہ اس کے موجود باشندے افغان اور براہوئی نسبتاً بعد میں وارد ہوئے۔ ان کے پیشرو کون تھے؟ یہ ہنوز ایک معمہ ہے۔ متداولہ روایات کے مطابق بعض قدیم ترین کاریزات گبران کی تعمیر کردہ ہیں اور ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بعض اولین باشندے مذہباً آتش پرست تھے۔ (گبر بلوچستان کے ضلع خاران میں بھی مشہور ہیں)

لیکن ان کی قومیت نامعلوم ہے۔ یوں لگتا ہے کہ افغان اپنے مولاتخت سلیمان کے قرب و جوار سے شمال مشرقی سمت سے اس ضلع میں داخل ہوئے ہیں اور گمان ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں یہاں پہنچے۔ روایات کے مطابق ان کے پیشرو پشین کے زمند تھے جو قدیم ایام میں ایک قدرے اہم قبیلہ تھا جو خیرالدین عرف خرشبون ابن سٹربن کی اولاد مشہور تھا۔

بلوچستان کے دیگر حصوں کی مانند یہاں بھی ہجرت مسلسل جاری رہتی ہے۔ اس کے اسباب بعض قبائل کے خانہ بدوشانہ اطوار، آب و ہوائی تغیرات، سرحد پار کے افغان حکام کی گاہے بہ گاہے ترغیبات اور تجارت میں اب خانہ بدوشیت کم ہو رہی ہے، تو بہ کے قریباً تمام اچکزئی جو دیہی آبادی کا قریباً ۱۵ فیصد ہیں، خانہ بدوش ہیں اور نومبر میں گرم تر حصوں کا رخ کرتے ہیں، صرف حمید زئی سال بھر تو بہ میں رہتے ہیں، عشے زئی مردہ کاریز اور چمن کے صحرا کی طرف چلے جاتے ہیں۔ انہی کا ایک حصہ خواجہ زئی اور بادین زئی ریگ (افغانستان) کی طرف چلے جاتے ہیں جبکہ نصرت زئیوں کا اہم ترین پاڑہ "علی زئی"، تحصیل پشین کے حلقہ سردیشت میں جاگزین ہوتے ہیں۔ قبائل پشین سے عیسی زئی، بیان زئی، شموزئی، چرمی اور احمد خیل کاکڑ گرمی اپنے دیہات میں گزارتے ہیں اور سردیوں میں اپنے ریوڑوں سمیت چراگاہ کی تلاش میں میدان پشین میں پھیل جاتے ہیں۔ افغان پشتو بولتے ہیں اور شورہ رود میں مقیم ہیں۔ دیہی آبادی کا ۷۷ فیصد ہیں۔ قندہاریوں، ہزاروں کے علاوہ اچکزئی سرکردگان اور سادات پشین فارسی بولتے ہیں جبکہ سادات کرانی اور کچھ کاسی افغان اسی کی مسخ شدہ شکل دہواری بولتے ہیں۔

اہم قبائل: ۱) کاکڑ ۲) ترین مشمولہ اچکزئی ۳) کاسی ۴) غلزئی ۵) سادات

ظاہر ہے کہ افغان مشمولہ سادات سب سے زیادہ یعنی میزان کا ۹۱ فیصد ہیں۔ براہوئی میزان کا ۸ فیصد اور بلوچ کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

کاکڑ غورغشت افغان ہیں اور ان کا مورث اعلی کاکڑ وانی ابن غورغشت ابن قیس عبدالرشید کا بیٹا ہے۔ یہ درج ذیل چار حصوں میں تقسیم ہے جن کا باہمی تعلق خفیف ہے کہ قریباً ہر ایک علیحدہ علیحدہ قبیلہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ۱) سنزرخیل ۲) سنائیہ ۳) ترغڑہ ۴) سرغڑہ۔

ان قبائل میں دادی بھی شامل ہیں جو دادی برادر کاکڑ کی اولاد ہیں۔ ایک گروہ یا طائفہ لمر بھی ہے۔ اگرچہ ان کا ماخذ مشتبہ ہے۔ دادی کوئٹہ پشین میں آباد ہیں اور لمر تو بہ کاکڑ میں آباد ہیں۔ سنائیہ اور ترغڑہ ضلع کے دو مضبوط ترین اور تقریباً مساوی التعداد قبائل ہیں۔ اس کے بعد سنزرخیل ہیں، سرغڑہ بالکل قلیل ہیں۔

ترغڑہ دادی کے لحاظ سے کوئٹہ پشین کا مضبوط ترین حصہ ہیں۔ کوئٹہ کے

علاوہ تحصیل پشین کے دادی برشور، توبہ کاکڑی اور حلقہ کاریزات کاکڑی کے کچھ حصوں میں تقسیم ہیں۔ پشین میں ان کے اہم اجزاء درج ذیل ہیں۔

۱)احمد خیل ۲)بارکزئی ۳)سلیمان زئی ۴)احمد خیل ترغڑوں میں اختر زئی، خُدسی بیگانے ہیں۔ سنائیہ طائفہ، ترغڑوں سے کچھ ہی کم ہیں۔ ضلع میں ان کے اہم اجزاء مندرجہ ذیل ہیں۔

۱)بازی ۲)عیسی خیل مشمولہ بہ یاسین زئی ۳)مہترزئی ۴)ملازئی ۵)پانیزئی ۶)سارنگزئی ۷)شموزئی۔

بازی اغمر گ اور دامان کوہ تکاتو میں آباد ہیں، عیسی خیل پشین کے لوہڑہ کاکڑی، کاریزت کاکڑی اور دادی ہنہ، مہترزئی لوہڑہ کاکڑی میں، پانیزئی لوہڑہ کاریزت، ملازئی کاریزت کاکڑی حلقہ میں بمقام رودملازئی اور سارنگزئی دادی ہنہ اور کاریزت کاکڑی میں سکونت پذیر ہیں۔ سنائیہ کاکڑوں میں بیگانوں کی شمولیت کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ دادی ہنہ میں کاروزئی، یسین زئی، عیسی خیلوں کی شاخ عالم زئی متمکن ہیں جو مٹے نامی سنزرخیل کی اولاد ہیں۔ سنائیہ کاکڑوں میں صاحبزادہ فقیر محمد جان کا خاندان تحصیل کوئٹہ کے حلقہ کچلاک صاحبزادہ کاریز پر مقیم ہے اور بہت محترم سمجھا جاتا ہے۔ یہ احترام اور اثر رسوخ ایک نہایت بزرگ پارسا انسان شیخ زادہ نامی نے قائم کیا تھا۔ سنزرخیل سنزرنیکہ کی اولاد ہیں۔ جس کی اکثریت اب بھی ژوب میں رہتی ہیں۔ اس کا جزو اعظم پریزون ہیں جو حلقہ ہائے گلستان وقلعہ عبداللہ میں آباد ہیں۔

ترین: ترین سڑبن افغان ہیں۔ ترین ابن شرف الدین ابراہیم ابن قیس عبدالرشید کی اولاد ہیں۔ روایات کے مطابق ترین کے چار بیٹے تھے۔ اسپین ترین، تورترین، ژڑترین اور بورترین۔ البتہ بورترین کی بجائے ابدال کی اصطلاح رائج العام ہوگئی۔ جب احمد شاہ ابدالی المعروف بہ درانی نے اپنا سلسلہ فتوحات شروع کیا تو یہ جداگانہ سیاسی اکائی تصور ہوتے ہیں۔ تورا اور اسپین ترینوں کا بھی یہی حال ہے ابدال کے طائفے یہ ہیں۔

اچکزئی، باریزئی، نورزئی، پوپلزئی، بارکزئی۔

اسپین ترین معدودے چند ہیں جو تحصیل پشین میں ہیں۔ تورترین کا ایک بیٹا تھا بابو، بابو کے دو بیٹے تھے علی اور ہارون۔ علی کی اولاد علی زئی کہلاتی ہے اور ہارون کی اولاد کے چار بڑے حصوں میں تقسیم ہے جو یہ ہیں۔ ابو بکر زئی، سیکی، نور زئی، ملک یار ابوبکرزئی کی ایک شاخ بٹے زئی ہے۔ اس کا دعوٰی ہے کہ ایرانی افغانی حکومتوں کے تحت ولایت پشین کی موروثی مالک ہے۔

اچکزئی: افغانستان کے حکمران خاندان سے خونی رشتہ، ضلعی سرحد کے آر پار قیام کی وجہ سے اچکزئی ضلع کے اہم ترین قبائل میں سے ہے۔ حیات خان کی تاریخ افغانستان کی رو سے اچکزئیوں کے مورث اعلی بورترین المقلب بہ ابدال سے دو بڑے حصے زرک اور پنجپائی کا خوذ ہیں۔ زرک کی شاخیں پوپلزئی، بارکزئی اور الکوزئی شامل ہیں۔

جبکہ پنجپائی، نورزئی، علی زئی، اسحاق زئی، خاکوزئی اور کلوپر مشتمل ہے۔ اچکزئی اصل میں بارکزئی کی شاخ ہے لیکن احمد شاہ درانی نے (جو خود بھی ابدال تھا) بارکزئیوں کی روز افزوں تعداد سے ڈر کر انہیں سواد اعظم سے الگ کر لیا۔ اس وقت سے اچکزئی ایک جداگانہ تنظیم کے مالک ہیں۔ افغانستان کے محمدزئی امراء ان کے ہم جد ہیں اور عمر خان زئی سے ایک اور شاخ سے مشترکہ بارکزئی مورث کی اولاد ہیں۔

1901ء کی مردم شماری میں، اچکزئی چمن سب ڈویژن، پشین اور کوئٹہ میں قریباً بیس ہزار کی تعداد میں تھے۔ اب یہ تعداد کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ اچکزئی قبیلہ کے دو اہم حصے ہیں۔ ۱)بادین زئی ۲)گجن زئی۔

گجن زئی کے طائفے یہ ہیں: ۱)عشے زئی، ۲)حمید زئی ۳)ملے زئی ۴)نصرت زئی ۵)عثمان زئی۔

اچکزئی قبیلہ توبہ کے مغربی حصے اور چمن میں سب ڈویژن میں خواجہ عمران میں مقیم ہیں۔ اس کے علاوہ پشین میں ارمی کاکوزئی پیر علی زئی، جنگل پیر علی زئی، قلعہ عبداللہ، گلستان اور عنایت کاریز میں سکونت پذیر ہیں۔

کاسی یا کانسی: کاسی یا کانسی سڑبنی افغان ہیں۔ کاسی خرشبون کا بیٹا تھا۔ اس کا ایک بھائی زمند بتایا جاتا ہے جو زمندوں کو مورث اعلی تھا جس کا ذکر تورترینوں کے باب میں ہو چکا ہے۔ کاسی قوم کی روایات کے مطابق ان کے سات پاڑے ہیں اور سات صدیوں سے اپنے مولد و مساکن پر قائم ہیں۔ نواحیات تخت سلیمان سے ہجرت کر آئے ہیں اور سب سے پہلے ضلع کوئٹہ کے حلقہ کچلاک کے ایک گاؤں میں آباد ہوئے جس کا نشان اب بھی ایک ڈھیری ہے جو اس علاقہ میں موجود ہے۔ کاسیوں کے درج ذیل سات پاڑے ہیں:

۱)اچوزئی ۲)احمدزئی ۳)اکازئی ۴)بدازئی ۵)گدازئی ۶)میرزئی ۷)سمنگلی

ان میں کوتوال کا اضافہ کرنا چاہیے کہ وہ مردم شماری میں احمد خان زئیوں میں شامل کیے گئے۔ قطیر اور ساحلی کاسیوں اور شادی و مرگ میں شریک ہیں لیکن اول الذکر کاکڑ اور ثانی الذکر موسی خیلی بتائے جاتے ہیں۔

کاسیوں کے قائد خاندان ارباب خیل ہیں جبکہ سب سے بڑی شاخ احمد خانزئی ہے جس کی بنیاد احمد خان نے ڈالی اور جس سے ارباب بدل خان تیرھیوں

پیڑی (پشت) میں ہے۔ پچھلی صدی میں کاسی خاندان کے رہنے والے مستی خان اکازئی نے اپنی دولت کی وجہ سے زیادہ اثر ورسوخ حاصل کیا۔ ان میں ارباب خداداد خان، ارباب کرم خان اور خان صاحب ملک وزیر محمد معتبرین گزرے ہیں۔ ہر چند کے کاسی عددی لحاظ سے عزائم رہے تھے مگر انگریزوں کی آمد کے بعد کافی نمایاں ہوگئے۔ اس لیے ان کی زمینیں کوئٹہ کے گرد ونواح میں واقع ہیں۔ کوئٹہ کے مشرقی سمت کاسیوں کے نام سے منسوب ایک اہم قلعہ بھی ہے جسے قلعہ کاسی کہتے ہیں۔ سابقہ ایام میں انہیں شمال کی طرف سے کاکڑوں کے اور جنوب کی طرف سے براہویوں کے حملوں نے کسی قدر نقصان پہنچایا تھا۔

سادات: سادات کوئٹہ پشین میں رہتے ہیں۔ ان کی ایک شاخ مشوانی وادی شورہ رود میں آباد ہے۔ مردم شماری میں اگرچہ ان افغان کو شمار کیا گیا ہے لیکن وہ سیّد ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔

سادات مختلف گروہوں میں منقسم ہیں۔ قبائلی اعتبار سے انہیں قبیلہ نہیں کہا جا سکتا۔ سادات حضرت فاطمہ الزہرا بنت رسول اللہ علیہ وسلم زوجہ علی کی اولاد ہیں۔ عادات اور قد وقامت وہ افغانوں سے برائے نام مختلف ہیں جبکہ حضرت علی کے دیگر ازدواج سے اولاد از راہ عنایت علوی کہلاتی ہے۔ افغان دور حکومت میں اپنی عالی نسبی کی وجہ سے بہت با اثر تھے اور مقامی گورنر اور حکام شاذ و نادر ہی ان پر مالیہ لاگو کرنے کی جرات کر سکتے تھے۔ سیاسی وجوہات کی بنا پر انگریزوں کے دور میں بھی نظم ونسق کے تحت یہ معافی جاری رہی۔ بخاری اور چشتی سادات اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے معتبرین جرگوں میں بیٹھتے ہیں۔ کوئٹہ کے کرانی اور ترینوں کے ساتھ رہنے والے سادات کافی حد تک خوشحال ہیں۔ پشین کے جمالی، کربلائی اور چشتی سادات اور شورہ رود کے مشوانی زمینوں کے مالک بھی ہیں اور تاجر بھی جبکہ کرال، غرشین اور تارن اور کوئٹہ کے چشتی زیادہ تر زمینوں پر انحصار کرتے ہیں، چشتی اور تارن لوگوں سے بصورت ''ٹک'' نذرانے بھی وصول کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے چشتی سادات قلات کے علاقہ ساراوان اور ضلع سبی کے مقامات کچ کواس اور ہمدان تک گشت لگاتے ہیں، بخاری سادات ترینوں کے پیر اور تارن کاکڑوں کے پیر ہیں۔

بخاری سادات ضلع میں سب سے زیادہ ہیں یعنی کل تعداد کا ۷۱ فیصد ان کے بڑے بڑے اجزاء یہ ہیں۔ ۱) اسماعیل زئی ۲) شاہ زئی ۳) ہرمزئی ۴) شادیزئی ۵) ابراہیم زئی ۶) گانگھرزئی ۷) حاجی زئی ۸) یسین زئی ۹) حجاب زئی۔

حیدرزئی نہر شیبو اور علی زئی حلقہ جات بند خوشدل خان گاؤں، یسین زئی، قلعہ عبداللہ میں تورخیل اور حلقہ گلستان کی کلی بخوا تحصیل پشین، میں رہتے ہیں۔ بخاری سادات سید در جمال کی اولاد ہونے کا دعوی کرتے ہیں جو چودھویں صدی میں مکہ معظمہ سے حج کر کے واپس آئے ہوئے اپنے بھائیوں سید جلال، سید دلیل اور سید بلبل سمیت پشین سے گزرا اور ہارون نامی ترین کی بیٹی سے شادی کی۔ کہا جاتا ہے کہ ترینوں نے بلآخر سید جمال کی اولاد کو اپنی ایک چوتھائی زمین پر مالکانہ حقوق دے دیئے۔ ان میں ''شادیزئی'' بلحاظ مرتبہ افضل سمجھے جاتے ہیں کیونکہ ان کا مورث سید در جمال کا بڑا بیٹا تھا وہ نذرانوں میں بھی فوقیت رکھتے ہیں۔ بخاری کابرین سید محمد جان آغا، سید محمد حسن شاہ اور سید عالم شاہ ہیں۔ کلی بخو کے سید اسماعیل زئی اور دیگر شمار شدہ سادات کے طائفے یہ ہیں۔

۱) گیلانی یا جیلانی ۲) کرال یا کرل ۳) کربلا ۴) غرشین ۵) مودودی یا چشتی ۶) قریشی ۷) تارن ۸) مشوانی۔

گیلانی یا جیلانی مشہور ومعروف بزرگ شیخ عبدالقادر جیلانی (۱۱۶۴۔ ۱۰۷۷) کی اولاد ہیں جن کا مقبرہ بغداد میں ہے۔ کرال یا کرل کے پاس امیر افغانستان کی ایک سند ہے جس میں وہ علوی سادات بتائے گئے ہیں۔ سادات کربلا ایک سید زادہ کی اولاد مشہور ہیں جیسے ہارون ترین (جس کی بیٹی سے در جمال نے شادی کی) نے اپنی پناہ میں لیا تھا۔ وہ پشین کے حلقہ سرخاب میں کربلا نامی گاؤں کے مالک ہیں۔ اپنی تاجرانہ صلاحیتوں کی بدولت امیر ترین لوگوں میں سے ہیں۔ خرشین یا غرشین شید اسحاق کی اولاد ہیں اور شیرانی ماں کے بطن سے ہیں۔ وہ پشین کے کاریزات کاکڑی حلقہ میں کدین نامی گاؤں میں چشمہ غرشین کے مالک ہیں۔ ضلع لورالائی کی تحصیل موسیٰ میں بھی ان کی زمینات ہیں۔ جہاں ان کا مقدم خان صاحب سید مہر شاہ ہیں۔

چشتی گروہ کے بانی خواجہ مودود تھے۔ جو ہرات کی نواحی بستی چشت میں 1039ء میں پیدا ہوئے اور 1133ء میں فوت ہوئے۔ خواجہ اجمیر حضرت اجمیر حضرت معین الدین چشتی جو بارہویں صدی میں گزرے ان کے چند خاندان پشین میں منزکی میں رہتے ہیں جہاں پر علی زئی ترینوں نے انہیں اپنی زمینوں پر چھٹے حصے پر مالکانہ حقوق دیئے ہیں۔ تحصیل کوئٹہ میں کرانی کے چشتی سادات خواجہ نصر الدین المعروف نہ شال پیران کو اپنا مورث بتاتے ہیں جن کا مقبرہ کوئٹہ میری کے پاس ہے جو تقریباً دوسو سال پہلے منزکی چھوڑ کر کوئٹہ آگئے تھے۔ ولی کرنی میں آباد ہوا۔ پہلی جنگ افغانستان میں انہوں نے کچھ خدمات انجام دیں۔ اس وقت ان کا معتبر مبارک شاہ نامی تھے۔

روایات کے مطابق تارن طاہر آب شناس کی اولاد تھے جو محمود غزنوی کے ہم عصر تھے۔ وہ پشین کے کاریزات کاکڑی حلقہ میں کدین اور برشور حلقہ میں چونگی

تارن میں آباد ہیں۔ وہ کاکڑوں سے ایک کاسہ اناج اور ہر گلے سے ایک بھیڑ یا بکری لیتے ہیں۔ مشوانی سید گیسودراز کی اولاد (ایک کاکڑ بیوی سے) بتائے جاتے ہیں جو آنحضورؐ سے بارہویں پشت میں تھے اور بغداد کے قریب اش کے باشندے تھے کاکڑ بیوی کے علاوہ سید محمد گیسودراز نے ایک شیرانی خاتون سے شادی کی تھی جس سے لورالائی کے استرانا پیدا ہوئے ان کی کرانی بیوی سے جو اولاد ہوئی وہ دروک اور ہانیہ یا مرانی کہلائی۔ ان کا دعوی ہے کہ ان کے آباواجداد خانہ بدوش تھے جو مشوان (عرب) سے آئے تھے۔ ان میں غزنوی خیل کی موجودگی غمازی کرتی ہے کہ گروہ میں بیگانے بھی شامل ہیں۔ ان کے اکابرین پنچپائی کے محمد امیر خان، شیر محمد خان محمد خیل رسول بخش، چچے زئی اور فیض محمد سرکوزئی ہیں۔ یہ جھگڑالو اور کاہل لوگ ہیں۔

غلزئی: غلزئی ایک مقامی قبیلہ نہیں ہے لیکن چند ایک ضلع میں بس گئے اور جائیداد غیر منقولہ حاصل کرلی۔ ان کا ایک معتبر پیر محمد اندر ہے جو کوئٹہ کے قریب کاسی میں رہتا ہے۔ دیگر خانہ بدوش ہیں جو وقتاً فوقتاً ضلع میں مال چرائی کے لیے آتے ہیں یا چھوٹی موٹی تجارت کرتے ہیں یا پھر مزدور اور کاریزگر ہیں جو سردی میں آتے ہیں اور موسم بہار میں سطوح مرتفع کی جانب چلے جاتے ہیں۔ وہ دیگر افغانوں سے خطانت مطابقت اور استقلال میں بھی زیادہ ہیں اور بے حد جیالے تاجر ہیں۔ غلزئی قبیلہ کے اجزاء درج ذیل ہیں۔

۱) ترک ۲) ناصر ۳) سلیمان خیل ۴) اندر ۵) ہوتک ۶) توخی ۷) خروٹ ۸) وردک۔

ضلع ژوب کے قبائل: بلوچستان میں افغانوں کی خصوصی دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نسل کا روائتی مولد و مسکن اسی کی حدود کے اندر واقع ہے۔ افغان شجرات نسب کی قدر و قیمت کچھ بھی ہو لیکن وہ سب قیس عبدالرشید سے شروع ہوتے ہیں جو مالک طالوت (شاہ سال) سے ۳۷ ویں پشت میں بتائے جاتے ہیں۔ ان کا گھر کوہ سلیمان کے قریب ترین مغربی علاقے میں تھا جسے افغان خراسان اور ہم لوگ کاکڑ خراسان پکارتے ہیں۔ قیس عبدالرشید کے تین بیٹے تھے۔ ۱) غورغشت ۲) سٹر بن ۳) بیٹن اور انہی بزرگوں کی اولادیں آج بھی کثیر تعداد میں تخت سلیمان کی ڈھلانوں پر آباد ہیں۔ ماہرین انساب کے مطابق غرغشت کے تین بیٹے تھے مندو، بابی اور درانی۔ مندو کی اولاد کی نمائندگی ژوب کے مندوخیل کرتے ہیں۔ بابی مختصر سی تعداد میں کوئٹہ، پشین اور قلات میں موجود ہیں۔ ہر چند کہ دانی نام کا کوئی قبیلہ نہیں ہے تاہم اس کی اولاد دو اہم ترین قبائل یعنی کاکڑ اور پانی کی صورت میں موجود ہیں۔ سٹر بن کی اولاد اپنے آپ کو دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہے جو اس کے دو بیٹوں خیرالدین عرف خرشبون اور شرف الدین عرف خزخون کی باقیات ہیں۔ خرشبون کے قریب ترین ورثا پشین کے مختصر التعداد زمند اور کوئٹہ کے قرب و جوار میں رہنے والے کاسی ہیں۔ خرشبون کے دیگر ورثا یوسف زئی، ترک لانڑی اور اتمان خیل ہیں جن کا سواد اعظم تو دیر، سوات اور باجوڑ میں ہے کہ وہ خراسان میں واقع غواڑہ مرغہ سے ہجرت کر کے آئے اور میجر سر ہنری میکوہن نے دریائے کندر (کو خراسان سے گومل میں داخل ہوتا ہے) کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس روایت کی عجیب و غریب تصدیق کی۔ گستوئی کے پراؤ پر اسے کافی وسیع اور فصیلوں کے اندر محفوظ لشکر گاہ کے کھنڈرات ملے۔ سوات کے یوسف زئیوں سے قطعاً بابلد مقامی باشندوں سے استفسار پر معلوم ہوا کہ ان کی روایات کے مطابق یہ پرانی لشکر گاہ کسی وقت یوسف زئی نامی قبیلے کے تصرف میں تھی۔

سٹر بن کے دوسرے بیٹے شرخون کے پانچ بیٹے تھے۔ ترین، شیرانی، میانی بڑیچ اور اڑمر ترین، شیرانی اور بڑیچ بلوچستان کے اہم قبائل ہیں جو فوراً پہچانے جاسکتے ہیں لیکن میانی صرف مریوں میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور وہ بھی ایک مختصر گروہ کی صورت میں۔ سٹر بن کے اس پوتے کے دیگر وارث تھل چوٹیالی کے لونی ہیں۔ جن میں میانی کے ایک اور بیٹے کی اولاد یعنی لتھ ژوب تحصیل موسی خیل کے جعفر، کھیتران قبیلہ کا طائفہ حسنی میں گڈمڈ ہو کر سلاچ زمرے اور اسوٹ قبیلے کا طائفہ بلعز زبالغرتھ پیوست ہے۔ بیٹن کی اولاد اس صوبے میں قریب قریب ناپید ہے لیکن ان میں سے بہت سے ہر سال اپنی ہجرت میں آبائی مسکن میں آتے ہیں۔ میرا اشارہ غلزئیوں کے متعدد خانہ بدوش پاڑوں کی طرف ہے۔ سلیمان خیل، ناصر، خروٹی وغیرہ گومل کے پار ہماری سرحدوں کے پاس ہی اس مورث مشترکہ کا نام نامی ہنوز ڈیرہ اسماعیل خان کے بھٹانیوں میں پہچانا جاسکتا ہے۔

مقامی روایات کے مطابق ضلع ژوب کے تقریباً تمام افغان قبائل کا دعوی ہے کہ وہ سنزرنیکہ کے دور میں مغلوں کی جگہ لینے میں کامیاب ہوئے جو سنزرخیل کاکڑوں کا مورث اعلی تھا اور قیس عبدالرشید سے پانچویں پشت میں تھا اور یہ کہ وہ ابتدا میں چرواہے تھے لیکن بتدریج زمین کاشت کرنے لگے۔ پرانے قلعوں، دیہات اور کاریزات کے کھنڈرات ان کے مفلئی نام روایات کی صداقت کے غماز ہیں۔ برغہ شیرانی اور خواستی سادات حالیہ آباد کار ہیں اور اول الذکر کوئی تین سو سال پہلے کوہ سلیمان کے مشرقی علاقے سے یہاں وارد ہوئے۔

ضلع ژوب کا سب سے بڑا نسلی پاڑا افغان ہیں۔ جو مقامی آبادی کا ۹۸ فیصد ہیں۔ معمولی تعداد میں کھیتران ہیں۔ دوسرے قبائل یہ ہیں۔

A-8845

۱) کاکڑ ۲) شیرانی ۳) پانی ۴) صافی ۵) غلزئی ۶) ترین استرانا۔

کاکڑ غورغشت پٹھان ہیں۔ان کا مورث اعلیٰ کاک یا کاکڑ دانی کے چار بیٹوں میں سے ایک اور غورغشت ابن قیس عبدالرشید کا پوتا تھا۔

ضلع ژوب میں جو کاکڑ بستے ہیں ان کے تین طائفے ہیں۔

۱) سنائیہ ۲) سنزرخیل ۳) سرغرہ۔ان میں چند دادی، جو کاکڑ کے بھائی دادی کی اولاد ہیں۔نامعلوم ماخذ سے لمر اور تھوڑے ترغڑ بھی شامل ہیں۔

سنزرخیل کے بڑے طائفے سنزر کے بارہ بیٹوں کے نام سے موسوم ہیں جیسے۔۱) علی زئی ۲) کبزئی ۳) عبداللہ زئی ۴) عرب خیل ۵) نس خیل ۶) ہرمزئی ۷) برات خیل ۹) اتمان خیل وغیرہ۔سنزرخیلوں کا اہم ترین گروہ جوگیزئی ہے جو جلال زئی، شاروزئی، علی زئی کا ایک حصہ ہے۔اس گروہ کا مورث اعلیٰ جوگی سنزر سے گیارھویں پشت میں تھا۔اس کے دو بیٹے تھے دوستان اور مٹھا، بوستان کے پڑپوتے بیکرنیکہ کے بیٹے محکم کے دو بیٹے تھے اسحاق اور نواب جن کے ناموں پر دو مخالف گروہ اسحاق کھول اور نواب کھول موسوم ہوئے۔

قبائلیوں کی نگاہوں میں جوگیزئی ایک مذہبی تقدس کے حامل ہیں اور جوگی کی اولاد میں بیکرنیکہ کو احمد شاہ ابدالی نے حکمران ژوب کا لقب دیا۔موجودہ معتبر (1901ء کے لحاظ سے) سردار محمد اکبر خان تھے جسے ۱۸۹۳ء میں سردار تسلیم کیا گیا اور ۱۸۹۷ء میں اسے سرداد بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔جوگیزئی خاندان کے اکابرین کے کارنامے ہی زیادہ تر ژوب کی تاریخ ہیں جبکہ علی زئیوں کا حصہ میرزئیوں کا پاڑہ، علی زئی واجب الاحترام یعنی ''پیر خانہ'' سمجھا جاتا ہے۔سنزر خیل کی اکثریت کاشتکار ہے۔

دومڑ: معمولی تعداد ہے جو سنزرخیل کاکڑوں میں شمار کیے گئے ہیں۔یہ سب تحصیل ہندوباغ (مسلم باغ) میں رہتے ہیں۔مقامی روایات انہیں ایک پشت سماجی رتبہ دیتی ہیں کیونکہ سنزرخیل کے ایک غلام یا موسیقار کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔لہذا خوشحال سنزرخیل انہیں اپنی بیٹیاں دینے سے کتراتے ہیں۔

ضلع ژوب میں طائفہ سنائیہ اور سرغرہ بھی سکونت پذیر ہیں۔ان قبائلی اوصاف کا ضلع کوئٹہ پشین کے باب میں مذکور ہیں۔

شیرانی: شیرانی شرف الدین عرف شرخبون ابن سٹربن کی اولاد ہیں۔جغرافیائی لحاظ سے دو گروہوں میں تقسیم ہیں یعنی کوہ سلیمان کے مشرق میں رہنے والے ''لرغا'' شیرانی اور مغرب میں رہنے والے برغہ شیرانی۔دیگر افغان قبائل کی طرح وہ بھی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔مثلاً ان میں کچھ شوراوک میں ہیں اور کچھ مری بلوچوں کے طائفہ لوہارانی۔شیرانی کی وجہ تسمیہ بنے ہیں۔شیرانی درج ذیل طائفوں میں منقسم ہیں۔

۱) بابر ۲) چوہڑخیل ۳) ہری پال ۴) حسن خیل ۵) کپیپ ۶) میرہیل ۷) لوبہ خیل: ہری پال سید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کہتے ہیں ان کا مورث اعلیٰ پشین کا سید تھا جس نے شیرانی علاقے میں ہجرت کی اور ایک شیرانی عورت سے شادی کی۔اسی طرح حسن خیل میں بھی کرنان زئی ایک والدالنا معلوم (مندون) کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔

پنی: پانڑی یا پانی اصل میں غرغشت افغانوں کا ایک خانہ بدوش قبیلہ ہے۔اس کی ایک شاخ صافی اب بھی غزنی کے نواحیات میں موجود ہے۔پنی تین بڑے طائفوں میں تقسیم ہیں۔۱) لوانہ ۲) مندوخیل ۳) موسی خیل۔

صافی: صافی پنیوں کا ایک طائفہ ہے۔ضلع ژوب کے صافی ضلع سبی کے صافیوں سے تعلق کے منکر ہیں۔ان کا دعویٰ ہے کہ وہ غزنی سے آئے ہیں۔

خروٹ: اس قبیلے کی دو شاخیں ہیں کندخیل اور بارے زئی۔یہ کوہ سلیمان میں ایندھن بیچ کر گزارہ کرتے ہیں۔

ناصر: خانہ بدوش لوگ ہیں۔مالداری پر گذران ہے۔اس کے بارہ طائفے ہیں۔

۱) کمال خیل ۲) ملے زئی ۳) پانڈی خیل ۴) ترک خیل ۵) یاخیل ۶) بہادر خیل ۷) زنگی خیل ۸) نیامت خیل ۹) تلاک خیل ۱۰) بنوخیل ۱۱) اش خیل ۱۲) جلال خیل۔ مسے زئی بھی ان سے تعلق رکھتے ہیں۔

(بلوچستان کے افغان قبائل کے بارے میں پروفیسر انور رومان کی مرتب کردہ کتاب ''بلوچستان کے قبائل'' سے استفادہ کیا گیا ہے جو ضلعی گزیٹر سے اخذ ہے ان کے نہایت ممنون اور مشکور ہیں۔صابر بلوچ)

کیچ: مکران بلوچستان کا دروازہ ہے اور کیچ اس کی کلید ہے۔مکران کی تاریخ کیچ کی تاریخ ہے۔قدیم عرب مورخین اور جغرافیہ نویسوں نے کیچ یا کیز کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔خاص کیچ درحقیقت اس تنگ خطے پر مشتمل ہے جو دریائے کیچ (کیچ کور) کے دونوں جانب سامی سے لے کر ناصر آباد تک پھیلا ہوا ہے جس میں مذکورہ دونوں جگہیں بھی شامل ہیں۔مزید برآں پیدارک اور بالگتر کے علاقے بھی اس میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔مجموعی طور پر کیچ میں پانی کی کمیابی کا شکوہ نہیں کیا جاتا۔کاشتکاری کا سارا نظام آبپاشی پر منحصر ہے اور ذرائع آبپاشی کاریزات اور کور جو (آبی چشمے جو دریا سے نکالے جاتے ہیں) ہیں۔دوسرے ذرائع پیداوار کے علاوہ اس وادی میں لگائے گئے نخلستان زیادہ قیمت کے حامل ہیں۔کیچ کی اصطلاح وسیع معنوں میں نہ صرف

تربت کے اردگرد کے علاقوں مند تمپ اور خاص کیچ پر مشتمل وسیع تر معنوں میں عظیم وادی مکران اور کولواہ کے طاس کے لیے استعمال ہوتی ہے بلکہ اس وادی کے شمال اور جنوب میں واقع علاقوں بشمول بلیدہ، دشت اور کلانچ کے لیے بھی مستعمل ہیں۔ یہی تاریخ میں مذکور کیچ مکران ہے جو مارکو پولو کا کیز مکران اور ابن بطوطہ کا کیچ مکران ہے۔ اسے اس نام سے اس لئے پکارا گیا تھا تا کہ ایرانی مکران (ایرانی بلوچستان) سے اس کی تمیز اور تفریق ہو۔ قدیم عرب جغرافیہ دان نے ان دونوں خطوں پر مشتمل پورے علاقے کو مکرانات کا نام دیا تھا جو پچانوے ہزار مربع میل ہے۔

کچھ قدیم سلاطین نے کھنڈرات، ٹیلوں، کلبوں اور زیر زمین آبی نہروں کی شکل میں اپنے خاموش دائمی نقوش چھوڑے ہیں۔ وادی کیچ میں تربت کے مغربی جانب دو میل کے فاصلے پر ایک قدیم کھنڈر موسومہ "بہمن" ہے جس کی وجہ تسمیہ فردوسی کی رزمیہ شاعری کے ایک ہیرو اور کردار اسفندیار کے بیٹے بہمن کی وجہ سے ہے۔ کیچ میں شہنشاہاں کاوس و کیخسرو کے ناموں کی مناسبت سے قدیم کاریزات کاوسی و خسروی موجود ہیں۔ خسروی کاریز کو خسری کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ ایک اور کاریز کلاتک میں سعد و باد کے نام سے مشہور ہے جس کا صحیح نام سعد آباد ہے اور جسے مقامی روایات کے بموجب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانے میں عراق کے فاتح اور والی سعد ابن ابی وقاص نے احداث کیا تھا۔ سومرہ شہزادی سسی کا مشہور زمانہ عاشق اور بلوچوں کے ہوت قبیلے کا سردار پنوں کی یادگار مٹی سے تعمیر شدہ قلعہ خستہ حالت میں دریائے کیچ کے کنارے پرانے زمانے کے نشیب و فراز کے مقابلے کے لیے ابھی تک ایستادہ ہے۔

(سسی پنوں کی داستان میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اسے پانچویں صدی ہجری گیارویں صدی عیسوی کا زمانہ لکھا ہے۔)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیچ کے لوگوں کو قدرت نے تجارتی صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے اور اس کے تجارت پیشہ لوگ مشرق وسطی میں تجارتی مال کی درآمد و برآمد کا کاروبار کرتے ہیں۔ مکران میں بحری راستوں سے وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ لنکا، خلیج فارس کے شیوخ کی ریاستوں میں اور افریقی سواحل سے اس کی منڈیوں میں قیمتی ساز و سامان اور تجارتی مال کا کاروبار عام ہے۔ تیرھویں صدی کے اختتام پر مارکو پولو کیز مکران کے لوگوں کے بارے میں رقمطراز ہے کہ "ان کا ذریعہ معاش تجارت اور صنعت و حرفت تھا۔ وہ پیشہ ور تاجر تھے اور بری بحری راستوں سے تمام جانب بڑے پیمانے پر آمد و رفت کرتے تھے" اٹھارھویں صدی میں ہمارے سب سے بڑے وقائع نگار علی شیر قانی لکھتا ہے کہ "مکران سے کسی زمانے میں گجرات تک کارواں جاتے تھے۔" کیچ کی وسعت اور اہمیت میں پندرھویں صدی عیسوی میں فیاض اور جیالے بلوچوں کی مطلق العنان سیادت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ اس زمانے کی منظوم داستانوں میں اس ملک میں کیچ کو سب شہروں پر فوقیت اور فضلیت حاصل تھی۔ ازمنہ قدما میں وادی کیچ اور اس کے مضافاتی علاقوں کو اپنے کماد اور شکر کی بنا پر بڑی شہرت حاصل تھی۔ کاشتکاری کے اوزار و آلات آج بھی نہایت قدیم زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لکڑی کے ایک سادہ اور کند ہل سے، جسے بیلوں سے جوتا جاتا ہے۔ صرف زمین کی سطح پر لکیریں پڑ سکتی ہیں جن پر تخم ڈالنے سے خاطر خواہ فصل نہیں اُگائی جا سکتی ہے۔ کیچ میں سوزن کاری اور کشیدہ کاری کے شاہکار بلوچی فن و ثقافت کے ہمیشہ سے اور آج بھی جزو لاینفک ہیں۔ ان کو تقریباً اس قدر عمومی مقبولیت حاصل ہے کہ مغربی ممالک میں بھی ان کی تخلیق اصلیت اور عمدگی کو داد و تحسین کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

(تحفۃ الاکرام از علی شیر ثانی تالیف ۱۷۷۶) (معجم البلدان از یعقوب بن عبداللہ الہروی)

گنداوہ: کوہستان قلات کے اس پار کچھی کے میدانی علاقے گنداوہ کو ازمنہ وسطی اور دور جدید میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ طوفانی تاریخ کے ایک دور سے گذرا ہے۔ اس کے قریبی سطح مرتفع میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں اس کے اثرات دوسرے روز ہی گنداوہ پر پڑے ہیں۔ اس کے میدانی علاقے کوہستانی مداخلت کاروں کے لیے ہمیشہ سے پرکشش رہے ہیں۔ گنداوہ کو کئی بار سر تسلیم خم نہ کرنے کی بنا پر تباہی و بربادی کی سزا بھگتنی پڑی ہے۔ اس کی ازمنہ وسطی کی تاریخ کے بارے میں ہمیں عرب وقائع نگاروں نے، مورخین نے ایسے حوالے دیئے ہیں جو بہت کم دوسرے علاقوں کو درپیش ہوئے ہیں۔ عرب کے ماتحت گو کہ یہ ایک محدود مطلق العنان امارت تھی مگر پھر بھی ایک بڑا مرکزی شہر تھا۔ عباسی خلیفہ المنصور نے ہشام التغلبی کو سندھ کا والی مقرر کیا تو اس نے عمر بن جمال کو ہند کے علاقوں کی تسخیر کے لیے ایک لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ اس نے کشمیر اور ملتان کو فتح کیا اور آگے بڑھ کر قندابیل (گنداوہ) کے عرب باشندوں کی باہمی شورش کو بھی ٹھنڈا کیا خلیفہ معتصم باللہ نے عمران ابن موسیٰ ابن یحییٰ ابن خالد برمکی کو ۲۲۱ ہجری میں سندھ کا گورنر مقرر کیا تو اس نے قیقانیوں کے خلاف، جو (زط) جت تھے، لشکر کشی کر کے ان کو شکست فاش دی اور المبیضہ کے نام سے ایک شہر آباد کر کے اس میں قلعے تعمیر کر کے ان میں فوجیں جمع کیں اور اسے ایک فوجی مرکز اور چھاؤنی کی حیثیت دی۔ اس کے بعد اس نے المنصورہ کی جانب پیش قدمی کی اور پھر قندابیل (گنداوہ) کی طرف بڑھتا گیا جو کہ

ایک پہاڑی پر واقع تھا اور اس کا حکمران محمد ابن الخلیل تھا۔ عمران نے قندابیل کے شہر پر قبضہ کیا۔ اس کے حکمران کو اسیر بنا کر خضدار لے گیا۔ ابن حوقل نے مکران کی شمال مشرقی سرحدات پر اور ہندوستان کی سرحد کے قریب واقع دو ولائتوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک توران تھی جس کا صدر مقام قصدار (خضدار) تھا اور دوسری اس کے شمال میں بدھا تھی، جس کا مرکز قندابیل (گنداوہ) تھا۔ اس نے قندابیل کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ ایک وسیع و عریض شہر ہے اور وسیع علاقے میں تنہا ایستادہ ہے، جہاں کوئی نخلستان نہیں ہے۔ اس کے ماتحت علاقوں میں قیر قانان یا قیقانان کا شہر بھی شامل تھا۔ اس شہر کی شناخت کو اس کے حالات کی بنا پر موجودہ شہر قلات پر منطبق کیا جاتا ہے۔ الاصطخری کے مطابق قندابیل ایک بہت بڑا شہر ہے۔ صحرا میں واقع ہے اور بدھا کی حدود میں شامل ہے۔ الادریسی رقم طراز ہے "بدھا کی حدود سے لے کر (کیز) تک دس دن کی مسافت ہے۔ بدھا کے باشندے جس شہر سے سب سے زیادہ آمد و رفت کرتے ہیں وہ قندابیل ہے۔ بدھا سے مکران کے آخری کونے پر واقعہ شہر تیز تک سولہ دن کا راستہ ہے۔ سندھ میں عربوں کی فوجی چھاؤنی کے بارے میں ایلیٹ لکھتا ہے: ان میں سے ایک بیضہ تھا۔ دوسرا قصدر تھا اور تیسرا قندابیل تھا۔

میر معصوم کے الفاظ میں سولہویں صدی عیسوی میں گنداوہ کی حالت یوں تھی " گنجابہ کے قریب، جو سیوی کا ماتحت علاقہ ہے، پانی کا ابلتا ہوا چشمہ بہتا ہے اور اس سے کافی بڑی زمین سیراب ہے۔ اس پانی میں مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ گنجابہ کے پہاڑوں میں کسی پہاڑی کے کنارے پر ایک بارہ دری سی باہر ابھری ہوئی ہے جس کے ساتھ ایک آہنی پنجرہ لٹکا ہوا ہے۔ جس میں کوئی خزانہ چھپایا گیا ہے مگر کسی کا بھی ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتا اگر اوپر سے اس تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو کسی کو پہاڑی کی چوٹی پر بھیج کر رسی پھینکنی پڑتی ہے مگر پھر بھی وہ بہت دور فاصلے پر نظر آئے گی اور پہاڑی کی اپنی اوپر کی سطح ہموار ہے۔ جبکہ زمین سے وہ جگہ کافی بلندی پر ہے۔ ایلیٹ کی کتاب مورخین میں مذکورہ بالا متن کو یوں بیان کیا گیا ہے۔" گنجابہ (گنجاوہ) کی پہاڑیوں میں سے ایک بلند و بالا پہاڑی ہے جس کے ساتھ ایک آہنی پنجرہ آویزاں ہے جس میں روایت کے مطابق کوئی قیمتی چیز ہے، مگر اس تک رسائی ممکن نہیں۔ اگر کوئی بالائی جانب سے اس کی طرف ایک رسّی کے ذریعے اُترے تو وہ دور ہو جاتا ہے اگر نیچے سے اس کی طرف چڑھائی کی جائے تو اس کی بلندی آسمان تک بڑھتی جاتی ہے اور زمین نیچے چلی جاتی ہے۔"

سندھ اور مکران پر عربوں کے تسلط کے زمانے میں سندھ اور وسطی سطح مرتفع قلات، جسے عرب وقائع نگاروں نے توران کے نام سے یاد کیا ہے، کے درمیان گنجابہ فوجی رابطے کا وسیلہ تھا۔ سندھ اور باقی بلوچستان کے درمیان تجارت کا راستہ یہی تھا اور پیداواری لحاظ سے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں اس کی اراضیات قابل رشک تھیں۔ پندرہویں صدی کے اختتام پر بلوچوں کا سیلاب گنداوہ اُمنڈ آیا۔ اور کچھی کا سارا میدانی علاقہ جیالے اور جانباز بلوچوں کے جم غفیر کی آماجگاہ بن گیا۔ جن کی قیام گاہیں سفید اور سیاہ خیموں پر مشتمل تھیں اور جسم کے زیادہ تر حصے تیر کمان، لمبی خم دار تلواروں اور نسبتاً چھوٹی گول ڈھالوں سے سجے ہوتے تھے اور تیز رو تازی گھوڑوں پر سوار تخت و تاراج کا شوق پورا کرنے کے لیے کوہستان قلات کی پہاڑیوں تک پھیلے ہوئے علاقے کو پاؤں تلے روندتے رہتے تھے۔ یہ پھلتا پھولتا شہر رند و لاشار بلوچ قبائل کی کئی یادگار جنگوں، تنازعوں اور کشمکشوں کا مستقل نظارہ پیش کرتا رہا اور بلوچی امارت و سیادت کے دور میں شہہ مرید اور اپنے عصر کی یکتائے روزگار نازنین اور مندو کی پری وش دختر حانو ہ شہرہ آفاق رومان اس کے لئے قابل صد افتخار و امتنان تھا۔ بلوچوں کی حکمرانی کے وقت گنداوہ کا علاقہ چاندی اور سونے کے زیورات بنانے (زرگری) کے فن میں بہت مشہور تھا قدیم بلوچی منظوم داستانوں کے ذریعے ہم تک پہنچنے والی تابناک معلومات و تفصیلات کے مطابق ہر آدمی کو پندرہویں صدی کے بارے میں نہایت ہی دلنواز تصور قائم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے جو آج اپنے پر افتخار ماضی کی شان و شوکت اور اہمیت کی کسی طرح بھی غماز نہیں۔

مولا کے عظیم چشمے کا پانی جو سالہا سال سے رواں ہے، خاص طور پر گنداوہ میں پھیل کر اس کی شادابی کا باعث ہے مگر باقی ماندہ قرب و جوار کی اراضیات کوہستانی سلسلے سے شروع ہو کر سندھ کے میدانی علاقوں تک پھیلی ہوئی ہیں، جو ناقابل اعتبار حد تک قدرتی طور پر زرخیز ہیں مگر ان قوت نمو سے بھرپور ذخائر کی اس دولت گراں مایہ کو ایسی سرزمین پر، جو اپنی غربت پر ہمیشہ سے نوحہ کناں ہے، بیکار پا کر انتہائی افسوسناک منظر ابھرتا ہے۔

سولہویں صدی میں رند سردار چاکر خان اور لاشار سردار گہرام خان (جس کا صدر مقام گنداوہ تھا) کی تیس سالہ خانہ جنگی میں، جو ایک جتنی گوہر کے اونٹوں کے تنازعے سے ابھری، بہت سی ناخوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ ایک مختصر سی نظم میں اس دور کے کسی شاعر نے گنداوہ کو یوں بددعا دی تھی۔

بلوچی	ترجمہ
گہرام چہ جہاں بے جاہ بات	گہرام دونوں جہانوں میں مرکز سے محروم ہو
گور باتے مجیں گنداوہ	اس کی قبر گنداوہ میں بنے

ایک بلوچ روایتی میں سجے اپنے اونٹ کے ہمراہ مکرانی پراحسن میلے میں شرکت کے لیے تیار (شاہین رفا)

گوئٹہ بازار میں ایک تربوز فروش (فخر زمان آفریدی)

بلوچ خانہ بدوشوں کا پڑاؤ (راحیل حمید)

ایک خانہ بدوش گھرانہ

چہ ہپت صد بنگو میں ورناہاں	سات سو جری اور بہادر جوانوں سے
کہ پاگش پہ کہپے لبست ات	جو ایک انداز و ادا سے دستار باندھتے تھے
بورش بے لگام ءتنک انت	بغیر لگام گھوڑے دوڑاتے تھے
آہاں پہ نشان یکے نیست	ان میں سے ایک بھی نہیں بچا
تیغان چرتگ انت ہندی ئیں	ہندی تلواروں نے انہیں چر ڈالا
زمانی زہاں زبرنیاں	وہ تلواریں جو خونخوار تھیں
کل ماں گوہرء ہرجان ء	یہ سب گوہر کی بھینٹ چڑھ گئے

سیوی (سبی): سیوی کو کن لوگوں نے آباد کیا اور وہ کون سے ذرائع تھے جو اس کی تباہی کا باعث بنے، ہمارے سامنے اس بارے میں ڈھیر سارا تاریخی مواد رکھا ہوا ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں افسون و اساطیر اور داستانیں ہر جگہ کی وجہ تسمیہ میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ سیوی ایک قدیم بلکہ قدیم ترین شہر ہے۔ مقامی روایات کے مطابق اس کے نام کا ماخذ سیوی ہے۔ جو سیوا نسل اور حکمران خاندان کی شہزادی تھی۔ اس خاندان نے مکران اور سندھ کے عربوں کے ہاتھوں فتح ہونے سے قبل اس علاقے پر حکمرانی کی تھی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق ایک ہندو حکمران، جس کا نام سیوا تھا یا سیوا، نے قلات اور کچھی پر حکمرانی کی تھی اور اسی نے سیوی کا شہر بسایا تھا۔ حالیہ برسوں میں قلات میں میری (یعنی قلعہ) سے کچھ قدیم آثار کی کھدائی ہوئی ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کے اس خطے میں کوئی ہندو خاندان حکمران رہا ہے۔ اسلام سے قبل اور طلوع اسلام کے وقت سندھی تواریخ کے مطابق دریائے سندھ پر ایک مضبوط و محکم ہندو بادشاہت تھی جس کے شمال میں کافی دور کشور کشمیر کی سرحدوں تک مشرقاً مشرقی ریاست قنوج کی سرحدوں تک غرباً مکران اور قیقانان تک اور شرقاً جنوباً صورت پھیلی ہوئی تھی اور اس کی جنوبی سرحد بحستان یا سیستان کی سرحدات تک تھی۔ یہ پورا جنوبی خطہ بلیوس کہلاتا تھا اور بعد ازاں قندہار کے نام سے موسوم ہوا لیکن رے ورٹی RAVERTY طاقتور مشہور مسلمان بادشاہتوں سے گھرے ہوئے کسی ایسی طاقتور ہندو شہنشاہیت اور سلطنت کی موجودگی کے بارے میں سخت دلائل دیتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ عربوں کی فتح کے بعد کوئی ایسی تاریخی شہادت یا کوئی ایسا نشان موجود نہیں جس سے ظاہر ہو سکے کہ کسی بھی ہندو مملکت کا اس علاقے میں وجود تھا۔ سیوی کے نواح اور کچھی درہ بولان میں موجود ٹیلوں کے بارے میں مقامی روایت یہی ہے کہ ان کا تعلق ایک ہندو حکمران دلورائے سے ہے۔

اس حکمران کے بارے میں کچھ حوالے پڑھنے اور سننے میں آتے ہیں۔ ایک سندھی مورخ بیان کرتا ہے کہ دلورائے سندھ کا حاکم تھا اور اس کا اپنے چھوٹے بھائی چھٹا آمرانی سے جھگڑا ہوا جو بھاگ کر بغداد چلا گیا اور اسلام قبول کر لیا۔ خلیفۃ الوقت نے کچھ سیدوں کے علاوہ فوج کا ایک چھوٹا دستہ دے کر اس کی مدد کی۔ وہ واپس سندھ چلا آیا۔ دلورائے نے اپنی ایک بیٹی ان سیدوں میں سے ایک کے عقد میں دی۔ روایات کے مطابق مذکورہ حکمران خونخواری اور غارت گری میں شہرت رکھتا تھا اور شرفاء کی لاشوں پر اپنی عیاشیوں اور بدمعاشیوں کے محل تعمیر کرتا تھا۔ اچھائی اور نیکی اس کے لئے زہر ہلاہل بن چکی تھی اور وہ ہمیشہ لوگوں کی عزت و غیرت کے پیچھے گھات لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ روایت یہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہمبستری کرتا تھا۔ اس سے ان کی کئی اولادیں بھی ہوئیں جو خدا تعالی کے قہر و غضب کے نزول کا باعث بنیں۔ حق تعالی نے اس کے شہر کو تہہ و بالا کر دیا۔ تاریخ طاہری کے مولف کا بیان ہے کہ چھٹا آمرانی واپس سندھ آ گیا۔ سیوستان میں فوت ہوا۔ سہون شریف کے آس پاس دلورائے کے تباہی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ کئی مورخین نے غلطی سے سیوی کو سیوستان کے نام سے تطبیق دی ہے۔ اور دونوں کو خلط ملط کر دیا ہے مگر یہ ایک فاش غلطی ہے۔ سیوی کا چھوٹا محال کبھی بھی ٹھٹھہ کے وسیع و عریض سیوستان سرکار کا جز و نہیں رہا ہے۔ یہ غلط فہمی غالباً اس لیے پیدا ہوئی کیونکہ سیوی کے حالات و کوائف مکران اور قندہار اور ملتان کے ماتحت علاقوں، بلوچوں، راجپوتوں، جتوں اور سندھ کے دیگر قبائل کی نقل مکانی کی قدیم تاریخی داستانوں اور جغرافیائی تذکروں کے ساتھ شامل اور خلط ملط رہے ہیں۔ سلطان ناصر الدین قباچہ کے عہد میں عربی تاریخ "فتح نامہ" کا، جسے ہم ترجمہ کی وجہ سے "چچ نامہ" کے نام سے جانتے ہیں، فارسی میں ترجمہ کیا گیا اور اس کا انتساب سلطان کے وزیر صدر جہان و عین الملک حسین ابن ابی بکر الاشعری کے نام کیا گیا۔ اسی تاریخ میں سیوی اور اس کے شاملات و علاقہ جات کا تذکرہ موجود ہے۔ جو سیوستان سے قطعاً مختلف بتائے گئے ہیں۔ اس زمانے میں پنن چھنن کا بیٹا وکیہ سیوی کے علاقے کا حکمران تھا جو کہ ملتان سرکار کی بھکر صوبے کا ایک حصہ تھا۔ آئین اکبری کے مولف نے قندہار سرکار کی حدود کا تذکرہ کرتے وقت لکھا ہے کہ "یہ عرض میں سندھ سے فرح تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے جنوب میں سیوی واقع ہے۔ مغرب میں فرح ہے۔ کابل غزنین مشرق اور شمال میں درمیان واقع ہیں" اس سے کوئی اور وضاحت نہیں ہو سکتی کہ سیوی کا ضلع سیوستان سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ یہی مولف کسی دوسری جگہ یوں اظہار کرتا ہے " بکھر اور سیوی کے درمیان ایک دشت ہے جس میں متواتر تین مہینوں تک باد سموم چلتی ہے۔ اس دشت کو اس علاقے کے لوگ "پٹ" کے نام سے پکارتے ہیں اور کسی زمانے میں یہ "دشت بیداری" کے نام سے

مشہور تھا۔ بیداری ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں بے خوابی اور آگاہی۔ کیونکہ صحرا کے اس حصے میں سفر کے دوران مسافروں کو اکثر اوقات شمالی جانب کی پہاڑیوں سے لوٹ مار کرنے والے بلوچ جتھوں کے ہاتھوں زک اٹھانی پڑتی تھی۔

اگر ہم تاریخ اصطخری میں پہلی مرتبہ سیوی اور اس کے شاملات کا تذکرہ پاتے ہیں سیوی کے اردگرد کے علاقے کو عرب جغرافیہ دان بالص، بصورت بالش یا والشان کے ناموں سے جانتے تھے۔ اصطخری کے مطابق شہر سیوی یا سیوا تھا لیکن عام طور پر القصر (قلعہ) میں والی قیام کرتا تھا جو کہ اصفانجے یا صفانجوں (یعنی سنجاوی) ہے جو زیارت کے مشرق میں واقع ہے۔ ایک لیگ فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس سے صحیح جائے وقوع متعین نہیں کیا جا سکتا مگر وہ سیوی سے رخاج کے سنجاوی کے راستے سفر کرتے وقت دو جگہوں پر اس کی سرحدیں ملتی ہیں۔ بولان اور ہرنائی کے درؤں کے درمیان واقع ہے۔ اس کی اہمیت کی وجہ سے کئی مرتبہ سیوی کو معاصروں کا نشانہ بننا پڑا۔ اس کی تاریخ کے ابتدائی دور میں سیوی کی تقدیر خراسان اور قندھار کی بجائے سندھ اور ملتان کی تقدیروں سے وابستہ رہیں۔ صوبہ ملتان کے دیگر علاقوں کی طرح خطہ سبی (سیوی) بھی اس کا حصہ رہا ہے۔ یہ قصبہ سلطان ناصر الدین قباچہ کی حاکمیت کے تحت تھا۔ امیر تیمور گرگان کے ۸۰۱ھ ۱۳۹۸ء ہندوستان پر حملے سے قبل وہاں پھیلی ہوئی افراتفری اور عدم اعتماد کی فضاء میں خانوادہ سمہ کے جام فتح علی خان ملتان نے بکھر سرکار پر اپنا تسلط جما لیا۔ جس کے ساتھ سیوی ایک ضلع کے طور پر شامل تھا۔ اس کے بعد جام نندہ نے ۸۶۶ھ مطابق ۶۲-۱۴۶۱ء میں سندھ میں تخت حکمرانی پر جلوہ افروز ہوئے۔ ۸۸-۱۴۸۵ء میں امیر چاکر نے جام نندہ سے سیوی چھین کر اس پر اپنا پرچم لہرایا۔ سردار چاکر خان نے ۲۵ سال تک سبی (سیوی) پر اپنا تسلط مستقلاً برقرار رکھا۔

بعد ازاں سیوی پر ارغون سردار شاہ بیگ قابض ہوا۔ ۱۵۲۲ء میں اس کے انتقال پر اس کے بیٹے میرزا شاہ حسین نے یہاں کی حکومت سنبھالی اور اپنی طرف سے عنان حکومت سلطان محمود بن میر فضل کو کلتاش کے حوالے کر دی۔ میر معصوم لکھتا ہے کہ سلطان محمود نے کئی قلعوں کو فتح کیا جو عرصہ دراز سے بلوچوں کے پاس تھے۔ اس نے کوہستان کے ان مکینوں کو سختی سے دبا کر اپنے زیر نگیں کیا۔ ۱۵۵۴ء میں شاہ حسین کے دار فانی سے کوچ کرنے پر اس کی مملکت میرزا عیسیٰ ترخان اور سلطان محمود کے درمیان تقسیم ہوئی۔ ۱۵۷۳ء میں مؤخر الذکر نے مغل شہنشاہ اکبر اعظم کی اطاعت قبول کر لی جنہوں نے سیوی پر اس کی جاگیرداری پر مہر تصدیق ثبت کی۔ ارغون خاندان کے زوال پر، پنی پٹھانوں نے جو عرصہ دراز سے حالات کے رخ پر نظر جمائے ہوئے تھے، سیوی پر قبضہ کیا۔ میر معصوم بکھری کو سالہا سال بعد سیوی کی کمان سپرد کی گئی اور اس نے ۱۰۰۳ ہجری مطابق ۱۵۹۴ میں پنیوں سے سیوی چھین لی۔ میر معصوم نے اپنی تاریخ میں اس دور کے سیوی اور نواحی علاقوں کی درخشاں یادگاروں اور اہم خصوصیات کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ وہ تحریر کرتا ہے "اس خطے کا ایک عجوبہ روزگار گنبد سیوی کے شمال میں واقعہ ہے جو سندھی زبان میں "مردگھر" کے نام سے مشہور و معروف ہے لیکن جب بھی کوئی وہاں چلا جاتا ہے وہ نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ روایتاً مشہور ہے کہ سلطان محمود نے ایک مرتبہ تین ہزار افراد جمع کئے جو ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اس پہاڑی کی چوٹی پر چڑھنے لگے جہاں پر یہ نظر آتا تھا مگر ان کو وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک طلسمی اختراع ہے جسے قدماء نے وہاں کھڑا کیا ہے اور اس میں خزائن کے انبار پوشیدہ ہیں۔ ایک مرتبہ کسی درویش نے وہاں سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا۔ جس کے بعد کئی افراد نے وہاں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی جستجو کی مگر تمنائے مراد کسی کی بر نہ آئی۔

اکبر شہنشاہ کے زمانے میں سیوی ملتان صوبہ کے بارہ محالوں میں سے ایک تھا۔ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ گنجابہ (گنداوہ) سیوی کا ایک حصہ ہے۔ سیوی سے مغلوں کے خزانہ عامرہ میں ۱۳ لاکھ اکیاسی ہزار نو سو تیس درہم نقد کی صورت میں ادا ہوتا ہے مگر جنس کی صورت میں کچھ نہیں ملتا۔ جیسا کہ قندہار کے محال کا رواج تھا اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت کا مرکزی استحکام روز بروز زوال پذیر رہا۔ طوائف الملوکی، مرکز سے علیحدگی، تخریب کاری، شکست و ریخت روزمرہ کا معمول بن گئے۔ خانہ جنگی، مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی طاقت اور نادر شاہ کے تباہ کن حملے، برطانوی حکومت کی طلوع پر منحصر تمام عوامل نے آہنی انسان شہنشاہ بابر کی دو صدیوں تک برقرار رہنے والی حکومت تواتر سے کٹھ پتلی جانشین حکمرانوں کی تیزی سے زوال پذیری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک قندہار کے درانی آقا سیوی سے فیضیاب ہوتے رہے۔ باقی ماندہ بلوچستان کے ساتھ انیسویں صدی ک وسط سے لے کر برصغیر ہند میں برطانوی سلطنت کے زوال تک مزید ایک صدی تک سیوی کا یہ تاریخی قصبہ برطانوی آقاؤں کی تخت و تاراج کی آماجگاہ بنتا رہا اور سیوی کے ہزاروں سال پرانے نام کو "سبی" میں بدل دیا۔

سیوی اپنے جغرافیائی حیثیت، زمین کی زرخیزی اور پیداوار کی بنا پر اس ملک کی تاریخ میں قرون وسطی اور ادوار جدید میں نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ ایک ایسے ملک میں جو اپنے قابل یادگار مدفون خزائن پر نازاں ہے سیوی کو اپنے کھنڈرات، ٹیلوں اور منہدم شدہ نشانات و خرابات پر فخر ہے۔ سیوی اپنے سینے میں خشتہائے شکستہ و پارینہ کی صورت

میں نقوش کو باوجود متعدد مرتبہ تباہ کن سانحات کے اب تک نمایاں کئے ہوئے ہے۔

حوالہ جات:

ایران اور ایران کے مسئلہ لارڈ این کرزن، قدیم وجدید تمدن ٹی والٹر والیک - کلان یونانیوں کا گدروشیا، لسبیلہ قدیم زمانے میں گدرو کے نام سے مشہور تھا۔ مشرقی خلافت جی لے اسٹرینج، مارکوپولو، سرنامہ ابن بطوطہ، تحفۃ الکرام علی شیر ثانی، معجم البلدان یعقوب بن عبداللہ الہروی، فتوح البلدان، البلادری، المسالک والممالک ابن حوقل، تاریخ سندھ میر معصوم، تحفۃ الکرام، ایلیٹ، تاریخ طاہری، تاریخ معصومی، آئین اکبری۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی: بلوچستان کی آبادی رقبے کی مناسبت سے تو بہت کم ہے مگر بلوچستان میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ آبادکاروں میں پنجاب کے لوگ، ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کے علاوہ بلوچ، براہوی، پشتون، جدگال اور ہزارہ قبیلوں کی آبادی ہے۔ بلوچ اور براہوی کے بارے میں تو یہ ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے کہ نسلاً یہ ایک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ براہوی کی آمد بلوچ سے چند سو سال پیشتر ہے۔ اس لئے کہ بلوچستان کے قبائل ایران، افغانستان اور عربستان سے مختلف ادوار میں ہجرت کر کے وارد ہوئے ہیں۔ میر گل خان نصیر کی تحقیق کے مطابق پہلا گروہ براہوی، دوسرا گروہ ناروئی اور تیسرا گروہ بلوچوں پر مشتمل تھا۔ ان کے ساتھ جدگال بھی شامل کیے جاتے ہیں جبکہ پشتونوں کے علاقے انگریزی دور حکومت میں بلوچستان میں شامل کئے گئے۔ ان شمالی علاقوں کے اقوام کی شمولیت سے پہلے بھی پشتونوں کے کچھ قبائل آباد تھے مگر معاہدہ گندمک ۱۸۷۹ء کے بعد افغانستان کے جنوبی علاقے انگریزوں کو شاہ شجاع کے دور میں دئے گئے۔ جن کو انگریزوں نے خوانین قلات سے اجارہ پر حاصل کردہ علاقوں کے ساتھ ملا کر "برٹش بلوچستان" کی صورت دی۔ اس طرح پشتون بھی بلوچستان کے قبائل میں شامل ہوئے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ جدگال بھی دراصل بلوچ ہیں۔ جدگال بلوچی میں جت گل (یعنی جتوں کے گروہ) کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جت بلوچی میں ساربان یا اونٹ چرانے والے کو کہتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے جت وہ لوگ ہیں جن کو عرب روزنامچہ نویسوں نے (زط) لکھا ہے۔ یہ لوگ مکران، لسبیلہ، باہو دشتیاری، ایرانی بلوچستان میں بڑی تعداد میں آباد تھے۔ اب بھی جدگالوں کی بڑی تعداد انہی علاقوں میں بس رہی ہے البتہ ان کی ایک بڑی تعداد ضلع کچھی میں بھی آباد ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے یہ لوگ اب بھی اونٹوں کے بڑے بڑے گلوں کے مالک ہیں۔ یہ جت یا جدگال ان جتوں کی اولاد ہیں جو سردار جلال خان کی سربراہی میں رندوں اور لاشاریوں کے ساتھ ایرانی بلوچستان باہو دشتیاری سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو رند سردار چاکر خان اور لاشاری سردار گہرام خان کے درمیان جو تیس سالہ خونریز جنگ ہوئی تھی اس کی بنیاد انہی جتوں کی ایک خوبصورت بیوہ حسینہ گوہر مہیری کے پناہ جو ہونے اور اس کے اونٹوں کے گلوں کو لاشاریوں کی دانستہ زیان رسانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ ایسی مفروضہ داستانیں ہر ملک، علاقے اور قبائل میں ہوتی رہی ہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جدگال ایران کے علاقہ باہو میں بڑی تعداد میں رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ وہاں ان کی زبان فارسی اور بلوچی ہے لیکن بلوچستان میں لسبیلہ اور کچھی میں آبادی کے اثرات نے ان کی زبان کو سرائیکی سے نزدیک کر دیا۔ ہزارہ افغانستان سے مختلف ادوار میں روزگار کی تلاش میں بلوچستان میں وارد ہوتے رہے۔ ان کے محنت کشوں پر مشتمل افراد مچھ، ڈگاری، ہنہ اور سورینج کی کوئلہ کانوں میں محنت مزدوری کرتے تھے مگر اب ایک قبیلے کی شکل میں زیادہ تر کوئٹہ شہر میں آباد ہیں۔

بلوچستان میں براہوی، پشتون، جدگال اور ہزاروں کے علاوہ ہندو بھی بستے ہیں۔ شہروں اور دور دراز کے قصبات اور دیہات میں ان کا پیشہ تجارت ہے۔ بلوچستان میں آباد ہندو تین طبقوں میں تقسیم ہیں۔ ان میں بلوچستان اور افغانستان میں قدیم زمانے سے بسنے والے ہندوؤں کو "تلدار" کہا جاتا ہے۔ یہ ہندو جہاں جس قبیلے کے علاقے میں آباد ہیں، انہی کے قبائل میں محسوب ہیں۔ متعلقہ قبائل ان کی حفاظت اور آسائش کے ذمہ دار ہیں۔ برصغیر میں آزادی حاصل ہونے پر پاکستان اور ہندوؤں میں ہندو مسلم فسادات کے شعلے بھڑک اٹھے مگر بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں ہندو پوری طرح محفوظ رہے۔ قبائلی علاقوں کے ہندو اپنے متعلقہ قبائل میں پوڑی تاوان وغیرہ میں عام قبائلیوں کی طرح شریک ہیں۔ اس ضمن میں ایک روشن مثال وہ واقعہ ہے کہ جب انگریزوں نے ۱۸۳۹ء میں قلات پر حملہ کیا تو خان محراب خان کے بہی خواہوں کی صف میں وہاں کے ہندو بہادری سے سینہ سپر ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑے۔ دیوان بچل اور کھیم چند کی قربانیاں تاریخ کا حصہ ہیں۔ کچھی اور لسبیلہ میں آباد ہندو خود کو کچھی والا قرار دیتے ہیں۔ تیسرا طائفہ انگریزوں کے ساتھ آئے ہوئے ہندوؤں کا تھا جو آزادی کے بعد ہندوستان سدھارے۔

بلوچی زبان: کسی قوم کو سمجھنے کے لئے اس کی زبان کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ زبان سے ہی قومیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ صاحب الرائے کہتے ہیں کہ قومیت کی تخلیق میں زبان کا درجہ مذہب کے بعد سب سے بڑا ہے۔ اگر [illegible] تک نہیں سمجھ سکے ہیں تو یقین جانئے کہ ہم اب تک قومیت کے [illegible] دور ہیں۔ (نقوش سلیمان، ص ۷۰) اس لحاظ سے بلوچوں کی [illegible]

لیے زبان کا کچھ تفصیلی ذکر کرنا ضروری ہے بلوچستان کے باشندے فی الوقت بلوچی، براہوی، پشتو، جدگالی اور فارسی پانچ زبانیں بولتے ہیں۔ اُردو قومی زبان ہے جو ان زبانوں میں رابطے کا ذریعہ ہے۔ جو بلوچ پشتو نہیں سمجھتا اُسے اُردو میں سمجھایا جاتا ہے۔ جو پشتون براہوی نہیں سمجھ سکتا، اسے بھی اردو سے رہنمائی ملتی ہے۔

بلوچی بلوچستان کی اکثریت کی زبان ہے جو بلوچستان میں مکران، خاران، چاغی، ڈیرہ بگٹی، کوہستان مری اور بلوچستان کی موجودہ جغرافیائی حدود سے باہر ڈیرہ غازی خان میں بولی جاتی ہے۔ اگر ایرانی، افغانی اور پاکستانی بلوچستان کی مجموعی آبادی کا اندازہ کیا جائے تو ایک کروڑ پچانوے لاکھ افراد یہ زبان بولتے ہیں۔ تاہم ایک کروڑ چالیس لاکھ سے کسی طرح کم نہیں۔

بلوچی زبان اب ایک علمی ادبی زبان بن رہی ہے۔ اس سے متعلق بلوچی ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور محققین نے بہت کچھ لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں۔ اس لیے ہم بلوچی کے مخزن ومخرج کی بحث میں پڑ کر موضوع کو طول دینا نہیں چاہتے۔ صرف ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو بلوچی سے متعلق مستشرقین کی آرا سے پیدا ہو چکی ہے۔ (باب بلوچی زبان-قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں میر گل خان نصیر ص ۲۰۶ تا ۲۱۰)

رندی اور رخشانی، بلوچی کی دو بڑی بولیاں ہیں جن کو بعض حضرات خصوصاً یورپین مستشرقین مثلاً لانگ ورتھ ڈیمز کے تتبع میں مشرقی بلوچی اور مغربی بلوچی کہہ کر گڑ بڑ کر دیتے ہیں حالانکہ ان کی بلوچی (مغربی) اور مری بگٹی اور کچھی (مشرقی) کی بلوچی میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے، صرف لہجہ اور بعض حروف کے تلفظ کا فرق ہے۔ جو ہر زبان میں سو پچاس میل کے فاصلے پر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً مکران کے بلوچ خ، غ اور ف نہیں بول سکتے۔ خان کو حان، غلام کو گلام، اور برف کو برپ بولتے ہیں جبکہ مری، بگٹی اور قرب وجوار کی مشرقی بلوچستان کے بلوچ گ اور پ نہیں بول سکتے وہ "ورگ" کو ورغ "روگ" کو روغ شب کو شف، آپ کو آف بولتے ہیں۔ یہ محض تلفظاتی فرق ہے۔ زبان کا کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ البتہ ایک اور فرق جو ان میں نمایاں نظر آتا ہے وہ "ث" اور "ذ" کا تلفظ ہے جسے مشرقی علاقے کے بلوچ ادا کر سکتے ہیں اور لفظ کے آخری حرف ت یا د کو ث اور ذ میں بدل دیتے ہیں جیسے مات کو ماث اور پاد کو پاذ بولتے ہیں۔ یہ اس قدیم پارتھین زبان کا اثر ہے جس میں اوستا اور کتبات بیستون لکھے گئے ہیں جو کسی زمانے میں بلوچستان میں وارد ہونے سے قبل ان بلوچ قبائل کی زبان تھی۔ مکران کے بلوچ خ، ف، غ کی طرح ث، ذ کا تلفظ بھی اب ادا نہیں کر سکتے اور نہ ہی لفظ کے آخری حرف د کو ذ میں بدلتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں کے باشندے چونکہ زیادہ تر ایران سے قریب ہیں لہذا ان کی بلوچی فارسی سے متاثر ہوتی رہی ہے۔

تیسری اور سب سے بڑی وجہ ان قبائل میں جغرافیائی ماحول، فاصلہ اور معاشی، معاشرتی حالات کا تقاضا ہے مثلاً مکران اور گردانواح کے بلوچ زیادہ تر شہر نشین ہیں۔ خانہ بدوشانہ زندگی تقریباً ترک کر چکے ہیں۔ ان کا گزر اوقات اب صرف گلہ بانی پر منحصر نہیں ہے بلکہ زراعت اور تجارت کی طرف بھی مائل ہیں۔ بڑے بڑے نخلستانوں اور سرسبز وادیوں میں انہوں نے اپنے دیہات بسائے ہیں۔ شجر کاری اور کاشت کاری کے علاوہ تجارت اور صنعت سے بہرہ یاب ہو رہے ہیں۔ ان کی سرحدیں ایران سے ملتی ہیں جہاں ایک فصیح و بلیغ زبان فارسی بولی جاتی ہے جو بلوچی کے مزاج سے موافقت رکھتی ہے۔ سرحد پار کی بلوچی پر اس کا اثر پڑ رہا ہے۔ اس لئے سرحدی بلوچی سلیس، شستہ اور فصیح ہے جبکہ دوسری طرف مشرقی علاقوں میں اکثر بلوچ اب تک خانہ بدوشانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مری، بگٹی علاقے زیادہ تر مال چراگائی (گلہ بانی) پر گزر کرتے ہیں۔ کوہستانی بلوچی خانہ بدوشی کے اثرات سے کچھ کرخت ہو گئی ہے چونکہ بلوچی علاقوں کی حدود سندھ اور پنجاب سے ملتی ہیں، جہاں سندھی، سرائیکی اور پنجابی کے اثرات زبان کو متاثر کر چکے ہیں۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ لہجہ تلفظ اور بولی میں فرق کسی زبان کا بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ بنیادی فرق تب ہوتا ہے جب زبان کے مصادر میں جن سے الفاظ بنتے ہیں فرق ہو، جیسا کہ رخشانی بلوچی اور رندی بلوچی میں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر رندی بلوچی کے مصادر "گ" سے بنتے ہیں جیسا کہ ورگ (ورغ) روگ (روغ) نندگ (نندغ) جبکہ رخشانی بلوچی کے مصادر فارسی کی طرح "ن" سے بنتے ہیں جیسا کہ وارتن، شستن اور نشتن وغیرہ۔

اس لحاظ سے بلوچی کی دو بولیاں جن میں بنیادی فرق ہے وہ مشرقی اور مغربی بولیاں نہیں بلکہ رندی اور رخشانی یا رندی اور ناروئی بولیاں ہیں۔ رندی میں وہ تمام علاقے آتے ہیں جو ایرانی بلوچستان، مکران، لسبیلہ، جھالاوان، قلات، کچھی اور علاقہ جات مری بگٹی یا سندھ میں مستعمل ہیں۔ جبکہ رخشانی یا ناروئی بولی کے علاقے ہیں چاغی، خاران، سیستان، افغانی بلوچستان اور روسی علاقہ کرغیز یا کہ مرو۔ اس فرق کے باوجود بلوچی زبان خواہ رندی ہو یا رخشانی بولی، اس کے بولنے والے اس فرق کو محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح بحیثیت زبان بلوچی ایک ہے۔

(زبان کے بارے میں یہ ایک دانشور میر گل خان نصیر کی رائے تھی جبکہ اس موضوع پر ملک محمد رمضان نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے)۔ بلوچی پاکستان کی قدیم علاقائی زبان ہے۔ ترقی پذیری کے لحاظ سے ایک زبان میں جو وسعت، روانی اور سلاست ہونی چاہیے وہ بلوچی زبان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال درست نہیں کہ بلوچی

زبان فارسی کی مسخ شدہ صورت ہے۔ دنیا کی ہر زبان کی طرح بلوچی زبان نے بھی ارتقائی منازل طے کی ہیں۔ اسے تاریخ کے جس دور میں کسی دوسری زبان کے ساتھ ایک ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے اس نے اس میل کو بڑھانے میں بخل سے کام نہیں لیا بلکہ اس میل جول کو بڑھانے کے لیے اگر اس نے دوسری زبان سے کچھ لیا ہے تو اتنا کچھ اسے دیا ہے۔

پاکستان کی بیشتر علاقائی زبانوں میں بعض کے الفاظ کا معنوی اور صوتی امتزاج اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والوں کو تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں ایک ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ملا ہے اور انہوں نے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کے لیے اس زبان کے الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ پاکستان کی جن علاقائی زبانوں میں الفاظ کی یہ یک رنگی اور ہم آہنگی زیادہ پائی جاتی ہے ان کی نسبت یہی خیال کیا جاسکتا ہے کہ ان زبانوں اور ان کے بولنے والوں کا باہمی ملاپ ضرور زیادہ مدت تک رہا ہے۔ اس طرح جن زبانوں میں الفاظ کے اشتراک کا یہ تناسب کم ہے یا سرے سے ہے ہی نہیں تو ان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ میں یا تو انہیں ایک ساتھ رہنے کا موقع ملا ہی نہیں یا اگر ملا ہے تو اس کی مدت بہت کم رہی ہے یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک زبان کا دوسری زبان کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کرنے کی تمنا اس زبان کی تہی دامنی نہیں بلکہ یہ بات اس کی کشادہ دلی اور رواداری پر دلالت کرتی ہے۔ بلوچ چونکہ من حیث المجموع عالی ظرف اور روادار واقع ہوئے ہیں اس لیے ان کی زبان نے بھی دوسری زبانوں کا اثر قبول کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ ویسے بھی ایک ترقی پذیر زبان کے لئے گردوپیش میں بولی جانیوالی زبانوں سے اثر قبول کرنا ناگزیر ہے۔ میں لسانیات کا ماہر نہیں، لیکن اس قدر کہنے میں باک محسوس نہیں کرتا کہ دنیا کی کوئی زبان نہ ایک دن میں بن کر مکمل ہوئی ہے اور نہ ہی زبان کوئی جامد شئے ہے کہ ایک ہی جگہ کی ہو کر رہ جائے۔

بلوچوں کا تاریخی ارتقا تین ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلا دور اس کے مرزبوم جنوبی عرب کا، دوسرا ایران وسیستان کا اور تیسرا دور حاضر کا۔ ان تینوں ادوار کے اثرات اس کی عمومی اوضاع واطوار کی طرح زبان پر بھی نمایاں ہیں لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ بلوچی کسی دوسری زبان کا چربہ ہے۔ بلوچی ایک علیحدہ اور مستقل زبان ہے۔ یہ چونکہ صدیوں بلکہ ہزاروں سالوں سے فارسی، سندھی، پشتو اور پنجابی زبانوں سے میل جول رکھتی چلی آرہی ہے اس لیے ایرانی سرحدوں کے قریب رہنے والے بلوچوں کی زبان پر فارسی زبان اور لب ولہجہ کا اور مشرقی علاقوں کے بلوچوں کی زبان پر سندھی، پنجابی اور سرائیکی کا کم وبیش اثر ضرور پڑا ہے۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے ہمسایہ علاقوں کی زبان سے متاثر ہونے کا مطلب کسی زبان کی کم مائیگی یا تنگ دامانی نہیں بلکہ یہ اس کی وسعت پذیری اور ترقی پسندانہ صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ ان دلائل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مشرقی اور مغربی بلوچی میں لب ولہجہ کا جو فرق پایا جاتا ہے، وہ مخصوص جغرافیائی حالات کا نتیجہ ہے ورنہ بنیادی طور پر مشرقی اور مغربی میں کوئی فرق نہیں اور ان میں جو لب ولہجہ کا کم وبیش فرق نمایاں ہے اس کے اسباب یہی لسانی اثرات ہیں جو مغربی علاقے کے بلوچوں نے فارسی زبان سے اور مشرقی علاقے کے بلوچوں نے سندھی، پنجابی اور سرائیکی زبانوں سے قبول کئے ہیں۔ مشرقی بلوچی میں ان تمام حروف تہجی کی آوازیں موجود ہیں جو اردو اور سندھی زبانوں میں مستقل ہیں مگر اس کے برعکس مغربی بلوچی میں اردو اور سندھی کے بعض حروف تہجی کی آوازیں سرے سے موجود نہیں۔ اور انہیں متبادل حروف سے ادا کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ مشرقی بلوچی میں ث، ح، خ، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ق اور بھ، پھ، تھ اور کھ کی آواز کے تمام حروف استعمال ہوتے ہیں لیکن مغربی بلوچی میں ان کی جگہ پر متبادل الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچی اکیڈمی کراچی نے، جو مغربی بلوچی کی نمائندگی کرتی ہے، مشرقی بلوچی میں استعمال ہونے والے حروف میں سے بعض کو خارج کر دیا ہے۔

اس سے مشرقی اور مغربی بلوچی کے لہجے میں فرق تو ضرور آ گیا ہے لیکن اس کے باوجود زبان کے اصل مطالب ومعانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مثلاً یہ کہ پگڑی کو پھاغ کہیں یا پھاگ، اس سے مراد بہر حال پگڑی ہی ہے۔ کھانے کو ورغ کہیں یا ورگ، باپ کو پھس کہیں یا پت، ماں کو ماس کہیں یا مات، گائے کو گوخ کہیں یا گوک، چاند کو نوخ کہیں یا نوک ومن علی ہذا، دونوں صورتوں میں نمایاں لہجیاتی فرق کے باوجود ان کے مطالب ومعانی میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ بنیادی طور پر بلوچی ایک ہی زبان ہے جو پاکستان کے مختلف علاقوں میں مختلف لب ولہجے کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اس لہجے کے اس اختلاف کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بلوچ قبائل ایک مدت سے ایک دوسرے سے دور دراز علاقوں میں رہتے چلے آرہے ہیں اور ذرائع آمدورفت کی کمی کے باعث انہیں باہمی ربط وضبط اور میل جول کے مواقع بھی کم بہت کم ہی میسر آتے ہیں۔ ان لسانی اور علاقائی عوامل کے بعد لہجے میں اختلاف کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے پہلے پاکستان کی یہ قدیم علاقائی زبان ضبط تحریر میں نہیں آئی اور اب تک ابتدائی تعلیمی سہولت سے بھی محروم ہے جس کی وجہ سے کوئی ایک لہجہ مشترکہ طور پر فروغ نہ اپنایا جاسکا۔ لیکن اس کے باوجود مشرقی اور مغربی علاقوں میں رہنے والے بلوچوں کے مزاج کی بنیادی خصوصیت یکساں اور مشترک ہیں۔ قیام پاکستان اور خصوصاً ۱۹۵۸ء کے پر امن انقلاب کے بعد موجودہ دور ترقی میں بلوچی زبان نہ صرف ضبط تحریر میں آرہی

ہے بلکہ اخبارات، رسائل اور ریڈیو کے ذریعے دور دراز علاقوں تک بھی پہنچ رہی ہے۔ عوام نہ صرف زبان کے مختلف علاقائی لہجوں سے روشناس ہو رہے ہیں بلکہ ایک وسیع علمی ادبی زبان کی حیثیت بھی اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار بلوچوں کی مشترکہ ثقافت کے صحیح خدوخال ابھر رہے ہیں۔

(ثقافت وادی بولان میں۔ زیر مضمون ثقافت، ملک محمد رمضان 1966 ص ۱۵۷ تا ۱۶۰)

بلوچی ادب: "بلوچی" بلوچستان کی اہم زبان ہے۔ اگرچہ بلوچی میں 1940ء تک تحریری تخلیق کا خانہ خالی ہے۔ راقم نے بڑی کوشش کی کہ مغربی اور مشرقی خطوں کے بلوچی ادب میں ایک اشتراک تلاش کرے مگر کامیابی نہیں ہوئی اس لیے مجبوراً مشرق اور مغرب کا ادبی اثاثہ الگ الگ نذر قارئین ہے۔

بلوچی ادب کے بارے میں میر گل خان نصیر کے رشحات قلم اس طرح ہیں:

"بلوچستان کی زبانوں میں (پشتو اور فارسی کے علاوہ جن کی بنیادیں افغانستان اور ایران میں پیوست ہیں) بلوچی کے ماسوا اور کوئی زبان ایسی نہیں جسے ادبی یا علمی درجہ دیا جائے یا جس میں کوئی تخلیقی کام ہوا ہو۔ بلوچی بھی، جو بلوچوں کی من حیث القوم ادبی اور علمی زبان ہے، 1940ء تک تحریر میں نہیں آئی تھی البتہ بعض علمائے دین اور خواندہ اشخاص کبھی کبھار فارسی رسم الخط میں بلوچی اشعار کے دیوان تحریر کرتے تھے جن میں سے بعض قدیم نسخے انڈیا آفس لائبریری میں پائے جاتے ہیں اور کچھ اندرون ملک خاندانی سندات کی ساتھ بھی ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم بلکہ برائے نام ہے۔"

بلوچی کا علمی ادبی زبان ہونا دور کی بات اس کے لیے کوئی مسلمہ رسم الخط اب تک طے نہیں کیا جا سکا۔ 1940ء کے بعد سے قومی جذبات و رجحانات کے ساتھ ساتھ بعض لکھے پڑھے بلوچ نوجوانوں کے دل میں اپنی زبان کے بناؤ سنگار کا بھی خیال پیدا ہوا۔ کچھ نئے شاعر پیدا ہوئے۔ ایک دو ماہنامے بھی بلوچی میں شائع ہونے لگے۔ کراچی اور کوئٹہ میں بلوچی ادبی دیوان اور بلوچی انجمنیں بھی قائم ہوئیں اور بالآخر حکومت بلوچستان کے تعاون سے کوئٹہ میں ایک بلوچی اکیڈمی کی بنیاد بھی پڑ گئی۔ بلوچی کتب کی اشاعت کا آغاز ہوا ماہنامہ "اٹس" کے نام سے بلوچی کا ایک رسالہ بھی حکومت بلوچستان کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا۔ لیکن ان تمام کاوشوں کے باوجود بلوچی کے لیے ایک مسلمہ رسم الخط کا وجود میں آنا اب تک ممکن نہیں ہو سکا۔

بعض لکھنے والے عربی، فارسی، بعض اردو اور یہاں تک کہ بعض حضرات سندھی رسم الخط میں حسب منشاء اپنی بلوچی کی املا لکھتے رہے۔ بلوچی اکیڈمی بھی جسے حکومت بلوچستان کی سرپرستی حاصل ہے، اس ضمن میں اب تک کوئی مسلمہ رسم الخط پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ علمی نقطہ نظر سے بلوچی ایک تسلیم شدہ تحریری زبان نہیں رہی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مسلمہ رسم الخط رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ایک فصیح و بلیغ اور ادبی زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس میں عشقیہ، رزمیہ، بزمیہ اور لقائیہ منظومات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ملتا ہے جو چودھویں صدی عیسوی سے موجودہ دور تک پھیلا ہوا ہے جو بلوچ شعراء کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور جو اگرچہ زیور تحریر سے آراستہ نہیں ہوا لیکن بلوچ گویوں کو پشت در پشت سینہ بہ سینہ یاد چلا آ رہا ہے۔ یہی بلوچی کا ادبی سرمایہ ہے اور اگر ہم ادب کی کسوٹی پر بلوچی شاعری کو پرکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ اس لحاظ سے بلوچی کا ادبی سرمایہ دنیا کی اور کسی قوم کے ابتدائی دور کے ادبی سرمائے سے کمتر نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں بلوچی کا علمی ادبی سرمایہ اب تک صرف وہ شاعرانہ کلام ہے جو صدیوں سے بلوچی شعراء منظر عام پر لاتے رہے ہیں۔ انہوں نے اس قوم کو زندہ رکھنے کے لیے اور اس کے تحفظ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اب تک جبکہ ہم بلوچی ادب یا ادبی سرمایہ کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد بلوچی کا وہی شاعرانہ کلام ہوتا ہے جسے ہم چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

یہ دور میر چاکر خان اور میر گہرام خان لاشاری کے زمانے پندرھویں صدی کے اواخر سے شروع ہو کر پنجاب کی طرف ان کی نقل مکانی سولہویں صدی کے نصف اول پر ختم ہوتا ہے یہ ہے متقدمین کا دور ہے۔ اس دور میں میر چاکر خان رند، میر گہرام خان لاشاری، بی بکر رند، ریحان، ہمپتان، شئے مرید، شہداد چاکر، نود بندگ، کلاتی حبیب، سہیت زنگی شاہی، جاروَ جلب اور بکر گہرام وغیرہ بڑے شاعر ہو گزرے ہیں جن کا کلام اب تک زبان زد عوام ہے (مگر کوئی ایک شعر بھی نمونے کے طور پر پیش نہیں کیا گیا)۔

دوسرا دور: یہ متوسطین کا دور ہے جو ۱۵۵۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے اور ۱۸۳۰ء میں ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے نامور شاعروں نے بلوچی شاعری کو اپنے بام عروج پر پہنچایا۔ ان شعراء میں بجار، پیروشہ، بابر سہراب، جونگو غلامو، حاجی خان، میر مندوست، بالاچ حسنی، حمل جیئند کلمتی، نوت ابراہیم، عبداللہ خان احمد زئی، جام درک، کیا جدگال، حیدر بالاچانی، گاہی گورگیج، اور اسحاق رند قابل ذکر ہیں۔

تیسرا دور: اسے ہم متاخرین کا دور کہتے ہیں جو ۱۸۳۰ء سے ۱۹۲۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ انگریزوں کی غلامی نے شاعروں کا مزاج تبدیل کر دیا۔ چند ایک کے سوا عام طور پر شاعروں نے بلوچ کی آزاد روح کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالا۔ تن بہ تقدیر ہو کر زندہ رہنے کی تلقین شروع کی۔ شمشیر و سناں کے گیت گانے کی بجائے زلف و گیسو، خدوخال کے نقوش ابھارنے میں اپنا پورا زور صرف کر کے کچھ لقائی یعنی مذہبی

اشعار کہتے رہے۔ اس دور کے شعراء میں ملا فاضل، ملک دینار، ملا عبدالرحمٰن، احمد واجو، ملا اللہ داد، ملا بوہیر میروانی، ملا نور محمد بمپشتی، عزت اللہ پنجگوری، عبدالکریم ساجدی، ملا رگام وشی، جلال خان بالاچانی سدن گور، اور ان کے علاوہ (مشرقی علاقہ میں) توکلی مست، بجار مری، رحم علی مری، جوانسال بگٹی، بہرام جھکرانی، قبیل جت، جیوا کیرو، ان تمام شعراء میں صرف رحم علی مری کا شمار قوم پرور اور رزمیہ گو شعراء میں ہوتا ہے۔ (بلوچستان قدیم وجدید کی روشنی میں۔ ادب میر گل خان نصیر ص ۲۲۱ تا ۲۲۹)

چوتھا دور: یہ جدید شعراء کا دور ہے جو ۱۹۲۰ سے ۱۹۸۰ تک چلا آ رہا ہے اسی دور میں آزادی کی تحریک پروان چڑھی اس سے بلوچستان کا تعلیم یافتہ نوجوان بھی متاثر ہو رہا تھا۔ شاعری کا رنگ بدل رہا تھا۔ اب شاعروں کے کلام میں لب و رخسار اور صاحب بہادروں یا سواروں کی مدح سرائی کی بجائے زندان، تیغ و تفنگ جنم لے۔ برصغیر کی آزادی اس کا اولین دور ہے جو ۱۹۴۷ تک محیط ہے اس دور کے شعراء میں ملا مزار بنگلزئی، یوسف عزیز مگسی، محمد حسین عنقا اور مٹھا خان خضر مری قابل ذکر ہیں۔ بلوچ شاعروں اور ادیبوں کی مخلصانہ کاوشوں کے نتیجے میں ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ بلوچی ایک ترقی پذیر زبان کی صورت میں سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ علاقائی بولیاں چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کی طرح آپس میں مل کر دریا کی شکل اختیار کر رہی ہیں۔ مشرقی اور مغربی رخشانی اور ندی کا فرق مٹتا چلا جا رہا ہے۔ صرف ایک ایسی بلوچی وجود میں آ رہی ہے جو شاعروں اور ادیبوں کی زبان ہے۔ اس دور کے شعراء میں میر گل خان نصیر، سید ظہور شاہ ہاشمی، مراد ساحر، عطاء شاد، جی آر ملا، مبارک قاضی، منظور بسمل، احمد زبیر، غوث بخش صابر، عبدالرزاق نادر، ممتاز یوسف، ڈاکٹر علی دوست، صبا دشتیاری، سلطان قیصرانی، یوسف عزیز بگٹی، یوسف عزیز مگسی، گل محمد وفا مرحوم، اور سینکڑوں نوجوان شعراء بلوچی زبان کو سنوارنے میں محبانہ کاوشوں میں مصروف ہیں۔

بلوچی لوک داستانیں

عشقیہ داستان: بلوچی عوامی داستانیں دو قسم کی ہیں، عشقیہ اور رزمیہ۔ بلوچی عوامی داستانوں کے بارے میں، میری رائے ہے کہ بلوچی ہو یا کوئی اور ہم عصر زبان داستان کے لیے شاعری سند کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ شاعری ان داستانوں کے اپنے کرداروں کی بھی ہو سکتی ہے جیسے شے مرید، بی برگ، مہناز، بالاچ سیمک یا مست توکلی وغیرہ۔ ایسی بھی ہو سکتی ہے جیسے شیرین دوستین، حمل جیند کلمتی، سسی پنوں یا کہ کیا صدو کی جنہیں بعد کے زمانے کے شاعروں نے نظم کیا ہے۔ بلوچی اس اعتبار سے پاکستان کی بہت سی زبانوں سے ممتاز ہے کہ اس میں داستانوں کے اپنے کرداروں کی زبان میں مستند کلام موجود ہے ورنہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمسر زبانوں میں بہت سی عوامی داستانوں کا مذکور دوسرے نامور شعراء کی کاوشوں کا محتاج ہے۔

سسّی پنوں: خدائے لم یزل نے کچھ انسانوں کا خمیر محبت سے تیار کیا ہے۔ ایسے انسانوں کے لیے فنا نہیں ہے۔ وہ فنا ہوتے بھی ہیں تو ان کا نام محبت کی قوت سے جریدہ عالم پر ثبت ہوتا ہے۔ سسّی اور پنوں دو ایسے عاشقان صادق تھے جن کے پاک انفاس لوک گیتوں اور لوک داستانوں میں جذب ہو کر سندھ اور بلوچستان کی فضاؤں میں رچ بس گئے ہیں جن کی محبت خوشبو بن کر صرف ارض پاک ہی میں نہیں بلکہ پورے برصغیر کی عارفانہ شاعری میں، ادب اور ثقافت میں روح بن کر تحلیل ہو گئی ہے اور جب تک محبت کا ایک نام لیوا اس دھرتی پر موجود رہے گا عرفان وفا سے معمور یہ نام زندہ رہیں گے اور سرزمین سندھ و بلوچستان کی قربت و مودت کا باعث ہوں گے۔

سسّی پنوں کی داستان محبت سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے ہر گھر میں معروف ہے۔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے عارفان حق نے "تلاش حق" کے ان متلاشیوں کو اپنے کلام کے ذریعے زندۂ جاوید بنا ڈالا ہے۔ علی الخصوص حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، حضرت سچل سرمستؒ، بابا بلھے شاہؒ، سلطان باہوؒ اور بابا فریدؒ نے کل شی راجع الی اصلہ کے ارشاد ربانی کو دلیل و برہان بنا کر سسّی پنوں کے ناموں کو رمز و استعارہ کی زبان دے ڈالی ہے۔ چنانچہ ایسے عشاق باصفا کا ذکر عام لفظوں میں آتا ہے تو لوگ انہیں درجہ بزرگی و ولایت پر فائز سمجھ کر نہایت عقیدت و احترام کا اظہار کرتے ہیں جن کو مواقع اور استطاعت ہوتی ہے وہ ان کے مقابر پر جا کر عقیدت کے اظہار کے ساتھ دلی مرادیں پاتے ہیں۔

عام قصہ: سسّی پنوں کی داستان عشق سندھ اور بلوچستان میں یکساں مذکور ہے چند ایک اہم باتوں کو چھوڑ کر اس کا قصہ عوام میں یکساں طور پر جا گزین ہے تاہم بلوچستان میں عصری ناخواندگی کی عصری کمی کے باعث اس کی تحقیق و تدقیق عملی پیمانے پر نہیں کی گئی ہے۔ اس تحقیق کی علمی تشنگی یہاں سندھ کے قابل قدر دانشور، مورخ جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے شکریہ کے ساتھ بجھائی جائیگی۔

(۱۔ سسّی پنوں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ ص ۹۔۱۰)

سسّی پنوں کا عام قصہ اس طرح ہے کہ سسّی ایک متمول ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی۔ والدین نے طالع مندی معلوم کرنے کے لیے جوتشیوں سے رجوع کیا جوتشیوں نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا جوان ہو کر یہ لڑکی ایک مسلمان

کے عشق میں مبتلا ہوگی۔

والدین کو مستقبل کی یہ بدنامی گوارہ نہ تھی۔ انہوں نے صندوق میں بند کر کے اس میں بہت دولت ڈال کر بچی کو سمندر میں بہا دیا۔ یہ صندوق ایک دھوبی کے بھنبھور میں ہاتھ لگی ساتھ میں زر و جواہر بھی تھا۔ دھوبی نے نہایت ناز و نعم سے پرورش کی۔ جوان ہوئی تو سسّی کے حسن سے چاند شرمانے لگا۔ کئی ایک رشتے آئے مگر سسّی کسی پر راضی نہ ہوئی پھر کیچ مکران کا شہزادہ پنوں اسے بیاہنے آیا۔ ان کا بیاہ ہوا مگر شاہ مکران کو اپنے شہزادے کی جدائی شاق گزری۔ انہوں نے پنوں کے بھائیوں کو بھنبھور بھجوا کر پنوں کو دھوکے سے بیہوش کر کے اٹھالیا۔ سسّی کو جب حقیقت حال کا علم ہوا تو وہ پنوں کی تلاش میں مکران چل دی۔ راستے کی صعوبتوں نے اسے نیم جان کر دیا۔ اتنے میں ایک چرواہے کی نظر پڑی۔ چرواہا سسّی پر بری نیت رکھتا تھا۔ سسّی نے صدق دل سے دعا مانگی۔ زمین شق ہوئی۔ وہ اس میں سما گئی۔ مکران کے راستے میں پنوں اپنے بھائیوں سے لڑ جھگڑ کر دوبارہ سندھ کی جانب روانہ ہوا۔ راہ میں اسی چرواہے کی زبانی سسّی کے زمین میں زندہ سما جانے کا ماجرا سن کر پنوں نے بھی دعا مانگی۔ زمین ایک مرتبہ پھر شق ہوئی۔ پنوں بھی اس میں سما گیا۔ یوں باوفا عاشق و معشوق دائمی وصل سے فیضیاب ہوئے۔

یہ کہانی سندھ بلوچستان میں اسی طرح مشہور ہے تاہم مختلف علاقوں میں قوی طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ سسّی ایک ہندو راجہ کی بیٹی تھی، کچھ نے بھاولپور کے شہر "بٹاواھن" سسّی کے والدین کی سکونت کے طور پر بتایا ہے۔ سسّی کے والد کا نام "ناؤن" اور والدہ کا نام "مندر" تھا۔ بعض روایتوں میں اسے "متر" بھی کہا گیا ہے۔ مگر ایک روایت یہ ہے کہ سسّی کے والدین سہوان شریف میں رہتے تھے اور سسّی کی بہائی ہوئی صندوق بھنبھور میں محمد نامی دھوبی کے ہاتھ لگی۔ بلوچی میں اس بارے میں ایک نظم دستیاب ہے جسے رائے بہادر ہتو رام نے اپنی تالیف "تاریخ بلوچستان" میں شامل کیا ہے۔ نظم کے اردو مترادف ملاحظہ فرمائیں۔

کیچ میں ایک سجیلا جوان رہتا تھا
پنوں کے نام سے مشہور تھا

پنوں کے ماں باپ، عالی نے اس سے کہا (جام عالی پنوں کے والد کیچ مکران کے حکمران تھے سندھی میں "ل" اور "ر" باہم بدل جاتے ہیں چنانچہ یہ نام آری جام ہوا۔ جام عالی کا نسب نامہ اس طرح ہے۔) عالی بن عمر بن بجار ہوت بن جلال خان، اس میں ایک بڑا تضاد ہے جلال خان پندرھویں صدی میں مکران آئے جبکہ سسّی پنوں کا واقعہ گیارھویں صدی کا ہے گویا ہوت قدیم زمانے سے مکران میں آباد تھے۔ (صابر)

(۱)

تمہاری منگنی کرنا چاہتا ہوں
پنوں نے باپ سے کہا
پہلے میرا ثانی تلاش کریں
مکران میں ایسی حسینہ کہاں ہے۔
البتہ دور دراز علاقوں میں (ہوگی)
تب پنوں کے وکیل نے کہا
مجھے ایک سو گھڑ سوار دیجئے میں جا کر
دور دراز علاقوں کا دورہ کروں گا
چنانچہ اس کو ایک سو چیدہ چیدہ سوار دیئے گئے
وہ اصفہان سے لاڑ تک گھومتا رہا
شاداب قندہار میں آیا
دور دراز کے تمام علاقے چھان مارے
وہاں سے "باغات کی سرزمین" سندھ آیا
ایک شہر کے سامنے ڈیرے ڈالے
یعنی بھنبھور کے شہر میں خیمے نصب کئے
وہاں اسے زیورات سے لدھی ہوئی سسّی نظر آئی
وہ جو سبک رفتار تھی اور باوقار
پوچھا کس کی بیٹی ہے؟
شہر والوں نے بتایا اس کی نہ ماں ہے نہ باپ
ایک دھوبی کپڑے دھونے گیا تھا کپڑے دھوتے ہوئے
اسے زیورات سے لدھی ہوئی سسی مل گئی تھی
جو ایک صندوق میں محو خواب تھی
دھوبی نے بیوی سے کہا خدا نے ہمیں اولاد عطا کر دی ہے
اسے آنکھوں کی طرح عزیز رکھو
لوگوں نے اس کے رشتے کے لیے تگ و دو کی مگر اس بے لحاظ دھوبی نے کسی کو نہ دیا
پنوں کا وکیل دھوبی سے ملا
اسے بتایا میرا ایک آقا ہے۔
پنوں کے نام سے مشہور ہے۔
تیری بیٹی کے قابل ہے۔

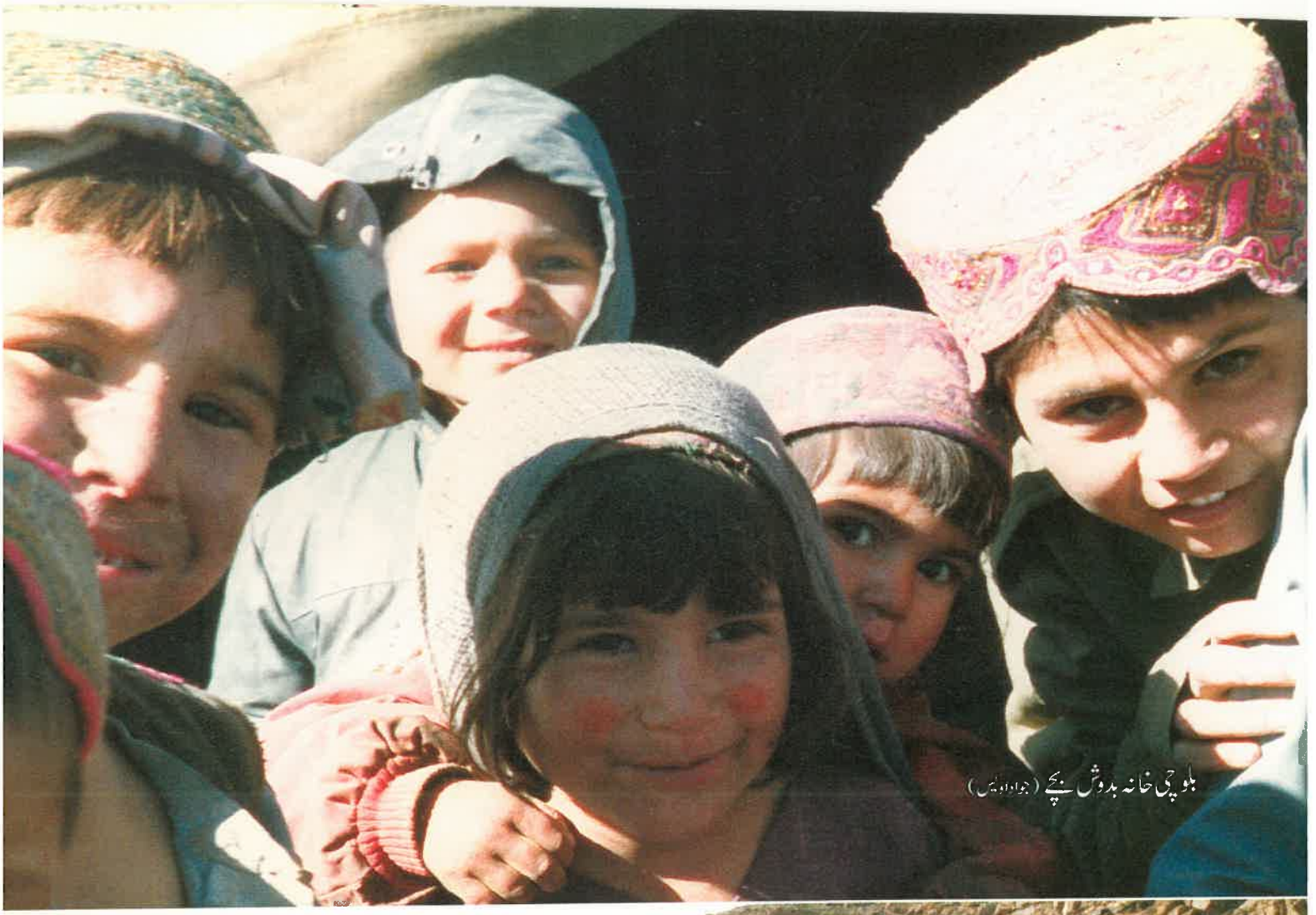

بلوچی خانہ بدوش بچے (جواد اویس)

بلوچستان، خانہ بدوش اپنے مال مویشیوں کے ساتھ (راجہ اویس)

ایک خانہ بدوش (خانہ بدوش)

دھوبی نے کہا مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔
وکیل (بابو) وہاں سے روانہ ہوا
وہ شاداب کیچ جا پہنچا
پنوں کو سارا ماجرا بتایا
بھنبھور میں ایک دوشیزہ ہے۔
اس مہ پیکر کا نام سسّی ہے
یہی حسینہ تیرے نکاح کی قابل ہے۔
ایک سو بار بردار اونٹوں کا کاروان لئے
پنوں وہاں سے چلا
ان اونٹوں پر کپڑے اور زیورات لدے تھے۔
سونا مورا شخاص بھی ساتھ تھے۔
سو کنیزیں ساتھ لیں۔
تین سو نیزہ برداروں کے علاوہ
ایک ہزار عمدہ سپاہی لے کر
منگنی کی نیت کر کے چلا
(اور) باغوں کی سرزمین سندھ جا پہنچا
(ایک) شہر کے سامنے خیمے نصب کئے
بھمبور میں ڈیرے ڈال دیئے
مشک و عنبر آٹے میں گوندھ کر
(اس نے) اونٹوں کو کھلایا
رات بھر ان کے منہ باندھ رکھے
خدا نے جب صبح کا چہرہ دکھایا
اونٹوں کے منہ کھول دیئے گئے
تب اونٹوں نے جگالی کرنا شروع کر دیا
ہر سو مشک و عنبر کی خوشبو پھیل گئی
جو بھی اس راہ سے گذرا
خوشبو نے اس کا دماغ معطر کر دیا
حتی کہ یہ خوشبو پورے شہر میں پھیل گئی۔
سسّی نے اپنی سہیلیوں سے کہا
"میں نے عہد کیا ہے کہ میں اس شخص سے بیاہ کرونگی"

پنوں کا وکیل (بابو) منگنی کا پیغام لے کر گیا
دھوبی نے منگنی قبول کی
کہنے لگا مجھے کوئی عذر نہیں
بیشک تم بڑے ہی دولتمند ہو
مگر ایک مرتبہ شہر بھر کے کپڑے دھونے ہونگے
جبکہ تم رہو گے بھی یہیں پر"
شہر بھر کے کپڑے جمع کر کے
پنوں دریا کے کنارے گیا
سارے کپڑے درست کئے
پھر ہر ایک کپڑے کے ساتھ اشرفی باندھی
اور کپڑے مالکوں کے حوالے کئے
انہوں نے جب کپڑے کھول کر دیکھے
پلو میں بندھی ہوئی اشرفیاں پائیں
تو ہوت پنوں کو پسند کیا
شادی کے شادیانے بج گئے
ایک ماہ تک شادی کے شادیانے بجتے رہے
تب پنوں کے وکیل (بابو) نے وہاں سے کوچ کیا
وہ شاداب کیچ میں پہنچ گیا
(اس طرح) ایک برس بیت گیا
(پنوں کے) باپ نے کیچ سے خط لکھا
"اے جوانمرد پنوں تم کیوں واپس نہ آئے۔
میں تمہارے فراق میں نڈھال ہو رہا ہوں
اور تم اپنی مہ پیکر کے ساتھ خوش ہو۔
اس لعل و یاقوت کے پہلو میں
جو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔
(یہاں) کھجوریں پک چکی ہیں
موصل کی لمبی لمبی کھجوریں"
(پنوں کے بھائی) کیانی نے کہا
جو لباس شاہانہ کا مالک تھا:
(کہ) میں اس جوان کو سندھ سے لاؤں گا۔

جلدی سے سانڈنی تیار کی گئی
اس پر رخت اور کجاوہ باندھ دیا گیا۔
خوش خوش لذت اور چھنر نواب، ہوئے پا بہ رکاب
تزک و احتشام سے کجاؤں میں بیٹھے
باغوں کی سرزمیں سندھ پہنچے۔
بھمبور کے شہر میں پہنچ کر خیمے نصب کئے۔
سسّی اور پنوں کی دعوت کی
دعوت میں یاروں نے خوب شراب لنڈھائی
شراب کے نشے میں دھت ہوئے
جب انہوں نے سسّی کو مدہوش پایا
پنوں کو سانڈنی پر لادھ کر چلے
رات بھر سفر کرتے رہے۔
نہایت تیز رفتاری سے چلتے رہے۔
یہاں جب سسّی کو ہوش آیا
پنوں کو نہ پا کر نہایت غمگین ہوئی
"اہل مکران نے یہ کیا کیا؟
پنوں کے علاوہ میرا دوست کون ہے؟
پنوں کے سوا میرا کوئی ہمدم نہیں"
رات گزری صبح ہوئی
سسّی کے دل میں محبت نے جوش مارا
وہ اونٹوں کے قدموں کے نشان پر چل پڑی
وہ بجلی کی سی سرعت سے چلی
اس طرح پا پیادہ تین منزلیں طے کیں
پیروں کے تلوے آبلہ، جسم نڈھال
ایک چرواہے کی اس پر نظر پڑی
وہ اس کی طرف لپکا
اس مہ لقا نے کہا "رک جاؤ!
جاؤ میرے لئے ایک کٹورہ دودھ لاؤ
تین منزلوں سے میں بھوکی ہوں
پیاس سے میرا تالو خشک ہو رہا ہے"

چرواہا دوڑ کر گیا
اور سسّی نے دعا کی "بارالہ! میری رکھوالی فرما
تو ہی فریادرس، تو ہی ماں باپ ہے
مجھے اس کے ہاتھ میں نہ دے
یہ بیوقوف ملعون اور گنوار ہے"
زمین شق ہوئی
سسّی اس میں سما گئی
جب چرواہا آیا
وہ حیران رہ گیا کیا اسے زمین نگل گئی؟
دوسری طرف جب پنوں ہوش میں آیا
وہ بہت ہی خفا ہوا وہ دوڑ پڑا
بھائیوں سے اس نے بیزاری کا اظہار کیا
باغوں کی زمین سندھ کی جانب چل دیا
راستے میں اسے اس پہاڑی چرواہے نے دیکھ لیا
وہ زمین کھود کھود کر مٹی نکال رہا تھا۔

(۲)

پنوں نے پوچھا "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"
چرواہا بولا "اس سمت سے
ایک عورت یہاں آئی تھی
وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی
ہر چند کہ اس حور شمائل کے پر نہ تھے۔
نہ ہی وہ گھوڑے پر سوار تھی
کوئی خادم بھی ساتھ نہیں تھا۔
میں نے چاہا نیلوفر کو پکڑ لوں۔
زمین شق ہوئی، وہ مہ لقا سما گئی۔
میں اس کے دوپٹے کی نشانی پر کھود رہا ہوں
تا کہ اس گوہر نایاب کو حاصل کروں۔
اس کی صورت کاش کہ تم نے دیکھی ہوتی"
پنوں نے بھی دعا کی "بارالہ
میری جان تجھ پر نثار
مجھے میرے محبوبہ سے جدا نہ کر"

پنوں کی دعا مقبول ہوئی
زمیں شق ہوئی، پنوں اس میں سما گیا
اور سسّی کو اپنے آغوش میں لے لیا
وہ اپنے محبوب کی ہمراہی میں گیا
باہوں میں باہیں ڈال کر
دونوں کی مرادیں بھر آئیں
اور وہ سب سے بے نیاز ہوئے
(تاریخ بلوچستان-از رائے بہادر ہتورام-ص ۳۷ تا ۴۵)

حانی اور شئے مرید: بلوچستان کی عوامی رومانی اور تاریخی داستانوں میں حانی و شئے مرید کی داستان کو جیسی مقبولیت حاصل ہے کسی دوسری داستان کے حصے میں نہیں آئی اس داستان کی اثر پذیری کا دیگر بہت سے اسباب میں سے ایک سبب بلوچستان کے عوام کا مزاج ہے۔اس کی تہذیبی خصوصیت کہ وہ ظالم سے متنفر اور مظلوم کا حامی ہے۔ظالم خواہ کوئی ہو بلوچ کی گردن اس کے روبرو نہیں جھکتی۔مظلوم خواہ کوئی بھی ہو بلوچ کی حمایت سے محروم نہیں رہتا۔بلوچ کے اس مزاج کی گواہی تاریخ نے دی ہے۔

تاریخ میں مرقوم ہے کہ نوشیروان اپنی بے پناہ جلالت وقوت سے بھی بادیہ نشین بلوچ کو اپنا تابع فرمان اور زیر احسان نہ رکھ سکا۔فردوسی نے بلوچوں پر لشکر کشی اور مکران پر تاخت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے البتہ تسخیر کو گول کر گیا ہے اس لئے کہ نوشیروان بھی اس رزم میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

زمیں کوہ تا لشکر گرفت — ہمہ مرز مکران سپہ برگرفت
بیاورد پیلان جنگی دو ویست — تو گفتے کہ اندر جہاں جای نیست
از آواز اسپان و جوش سپاہ — ہمی ماہ بر چرخ گم کردہ راہ
طلایہ بیامد ز مکران بہ شاہ — کہ مکران سیہ شد ز گرد سپاہ

بلاشبہ زمین کیا ہر اک وادی ہر اک گھائی نوشیروان کی فوجوں سے اٹ کر رہ گئی ہوگی جنگی ہاتھیوں سے کہیں بھی امان نہ ہوئی ہوگی افواج قاہرہ کی گرد سے چاند فلک پر اپنا راستہ کھو چکا تھا مگر طاقت کا یہ مظاہرہ بھی اس گردن فراز قوم کو حق و انصاف کے راستے پر چلنے سے باز نہ رکھ سکا۔

تاریخ اسلام کا یہ واقعہ کہ حق و باطل کی کشمکش عروج پر ہے۔ایک طرف یزید اپنی پوری قوت اور تمام انسانی وسائل سے لیس حق کو مٹانے پر تلا ہوا۔دوسری جانب حق کے چند حمائتی میدان کربلا میں صف آرا ہیں۔بلوچ غیر منظم ہیں۔پسماندہ ہیں مگر انہوں نے اپنی طاقت حضرت حسین علیہ اسلام کے پلڑے میں ڈال رکھی ہے وہ ظالم کی طرفداری نہیں کرتے حق کے ساتھی ہیں۔

مامیریداوں یا علی — دین ایمان سیتیں
کربلا بھمبور نیام ء — شہر سیستان منزلیں
گونا گون فوج ء حسین — گوں یزید ء جھیڑویں

ہم حضرت علی علیہ السلام کے مرید اور حامی ہیں۔ہمارا دین اور ایمان مستحکم ہے۔کربلا اور بھمبور کے درمیان شہر سیستان ہماری منزل گاہ ہے۔ہم حضرت امام حسین علیہ السلام کی فوج کے ساتھ ہیں اور یزید سے ہماری جنگ ہے۔

ان حوالوں کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بلوچ مزاج کی نشو ونما ایک خاص حالت میں اس طرح ہوئی ہے کہ وہ ظالم کی کبھی بھی حمایت نہیں کرتے۔جہاں ایسی صورتحال پیش آئے وہ مصالحت کی بجائے مقابلے کو ترجیح دیتے ہیں۔شئے مرید کو بھی اپنے عہد میں ایسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا تھا کہ وقت کے حاکم نے کھیل ہی کھیل میں اس کے ناموس پر ہاتھ ڈالا وہ اگرچہ حاکم جیسی قوت کا مالک تو نہ تھا مگر جس قدر استطاعت تھی۔اپنی ہمت کا اظہار کیا۔

حانی شئے مرید سے بچپن ہی سے منسوب تھی۔کہتے ہیں حانی جب پیدا ہوئی،اسے کوئی ایسا عارضہ لاحق ہوا کہ بہتیرے علاج کرائے مگر افاقہ نہ ہوا۔شئے مرید کا والد شئے مبارک شہ کہیری بزرگوں میں صاحب کرامت ہو گزرے ہیں۔حانی کے والد میر مندو نے حانی لا کر شئے مبارک کو گود میں ڈال دی کہ دعا فرمائیں کہ یہ زندہ رہے تو آپ کی کنیز رہے گی۔شئے مبارک کی دعا سے حانی صحت یاب ہوئی۔وہیں پرورش پائی اور شئے مبارک نے بچپن ہی میں اسے شئے مرید سے منسوب کیا۔کسی کو اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ حانی جوان ہو کر ایسی حور شمائل نکلے گی کہ حکومت اور قوت کا مالک سردار چاکر خان رند اسے حاصل کرنے کے لیے جال بچھائے گا۔

سردار چاکر خان رند اُن دنوں بلوچستان کا ایک عظیم المرتبت حکمران تھا۔شئے مبارک کو اس کے دربار میں رتبہ وعزت حاصل تھی۔شئے مرید اور سردار چاکر خان رند ایک ساتھ کھیل کر جوان ہوئے تھے اس لئے شئے مرید کو سردار چاکر خان رند کی مصاحبت اور ہم نشینی کا اعزاز حاصل تھا۔ایک روایت کے مطابق دونوں شکار کر کے لوٹ رہے تھے۔دونوں بہت پیاسے تھے۔سردار چاکر خان نے بستی کے قریب پہنچ کر تجویز کی کہ چل کر بستی میں پانی پیتے ہیں۔شئے مرید جانتا تھا کہ یہ اس کی اپنی بستی ہے۔اگر وہ دونوں ایک ساتھ وہاں جائینگے تو حانی شئے مرید کے سامنے باہر نہیں آئیگی۔اس نے اس بات کا سردار چاکر خان سے ذکر کیا چنانچہ سردار چاکر خان بستی کی جانب ہولیا اور اتفاق سے جس گھر کے در پر دستک دی وہاں سے حانی ہی برآمد ہوئی۔سردار چاکر خان

نے پانی طلب کیا۔ حانی ایک کٹورے میں پانی بھر کر لائی مگر دانستہ پانی میں چند تنکے بھی ڈال دیئے۔ مقصد یہ تھا کہ سردار چاکر خان دور سے شدت گرمی میں آرہے ہیں فوراً ہی پانی نہ پئیں کہ مضرت رساں ہوگا۔ سردار چاکر خان حانی کی ذہانت کے معترف ہوئے اور دل میں حانی کے حصول کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے سردار چاکر خان نے ایک منصوبہ بنایا۔ ایک دن بھرے دربار میں اس نے یہ دعوی کیا کہ "موت کے خوف سے گھبرا کر وہ اپنی جگہ سے ہرگز نہیں ہلیں گے" اس موقع پر دوسرے سربرآوردہ بلوچ بھی موجود تھے۔ ہر ایک نے ایک نہ ایک دعوی کیا۔ ھیبتان نے کہا جس کا اونٹ میرے گلے میں شامل ہو جائے خواہ میری جان جائے میں اونٹ لوٹا کے نہیں دونگا۔ جاڑو نے جوش میں آ کر قول کیا کہ جو کوئی میری داڑھی کو چھوئیگا میں اسے قتل کردوں گا۔ شئے مرید بھی اس موقع پر موجود تھا اس نے کہا جو کوئی جمعرات کی صبح مجھ سے کچھ طلب کرے گا۔ میں اسے وہ کچھ دینے کا پابند ہوں گا۔ بلاشبہ ہر ایک نے اپنے دعوے کی لاج رکھی۔ ہر چند ہر ایک کو بھاری اور ناقابل تلافی نقصان اٹھانے پڑے۔ شئے مرید کا دعوی بھی اس کے لیے بہت بڑا امتحان بن کر سامنے آیا۔ چاکر خان رند نے در پردہ دو تین مراثیوں کو جمعرات کی صبح شئے مرید کے ہاں بھجوایا۔ انہوں نے ساز و نغمہ گا کر شئے مرید کو محظوظ کیا۔ شئے مرید نے گرج کر کہا: "مانگو کیا مانگتے ہو؟ میرا مرکب تیز رفتار چاہیے؟ میری تلوار مانگتے ہو یا پھولوں سے مرصع میرا نیزہ درکار ہے؟" میراثی بولے "ہمیں ایسی کوئی چیز درکار نہیں۔ ہمیں حانی بخش دو۔" شئے مرید کچھ دیر کے لیے سکتے میں آ گیا۔ مگر اپنے عہد کا پاس رکھتے ہوئے حانی مراثیوں کو بخش دی۔ شئے مرید کے اشعار میں اس سانحے کا ذکر ملتا ہے:

میں مسجد میں چار رکعت نماز ادا کر کے نکلا
دو میراثی میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے
میں نے پوچھا مانگو کیا مانگتے ہو؟
میراثیوں نے یک زبان ہو کر کہا
ہمیں عطر آگیں حانی بخش دے
میں ایک مرتبہ تو سکتے میں آ گیا
سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جاتی رہی
اگر حانی میراثیوں کو نہ بخش دی
تو چاکر خان کے سامنے اپنا عہد نہ نبھانے پر ندامت ہوگی
سردار چاکر خان رند بر ملا دشمنی پر اتر آیا ہے۔
وہ مجھے فریب دینے پر تلا ہوا ہے۔
پہلے حانی کہیں دیکھی ہوگی۔
اب اسے مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔

ان احساسات کے باوجود شئے مرید نے حانی میراثیوں کو بخش دی۔ وہ اسے حاصل کر کے چاکر خان کے ہاں پہنچا آئے۔ یہی تلخ اور جان لیوا احساس تھا جس نے شئے مرید کو ایک روشنی بنکر ایک نئی روح پھونک کر حاکم وقت سے مقابلہ کرنے پر تیار کیا۔ اس اعتبار سے شئے مرید اس دور کا پہلا شاعر ہے جس میں معاشرتی شعور نے انگڑائی لی اور بعض تجربات کے بعد اس کے کلام میں شرف انسانی کا جوہر کھلا۔ ایک مرحلے پر وہ چاکر خان اور اپنا عصری مقتضیات کی رو سے مقابلہ کرتا ہے۔ اقدار انسانی کے حوالے سے یہ اشعار قابل غور ہیں۔

سردار چاکر خان کے دربار میں شئے مبارک شئے مرید کو یہ کہہ کر تنبیہہ کرتا ہے کہ سردار کے مقابلے کا خیال چھوڑ دو۔ وہ قوم کا حکمران ہے اس کے جلو میں رند ہیں۔ ذرہ ہے تو خورشید وہ، خود پر اور ہم پر کر نگاہ۔ ان اشعار کو منظوم ترجمہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

شئے مبارک:	اب چھوڑ یہ بدگوئیاں	شئے سے مبارک نے کہا
	رندوں کا ہے وہ رہنما	تو کیسے گمراہ ہو گیا
	ہے زین جس کی نقرئی	افواج جسکی قاہرہ
	ذرہ ہے تو خورشید وہ	خود پر اور ہم پر کر نگہ
شئے مرید:	لبّا مرے بابا مرے	تجھ پر ہے میری جاں فدا
	چاکر ہے وہ میں شئے سنو	میں بھی نہیں ایسا برا
	وجہ فضیلت ہے اسے	دستہ طلائی تیغ کا؟
	دستار سرداری کی ہے	دو پیچ میں مجھ سے سوا
	مجھ سے نہ جرأت میں فزوں	میداں ہو حرب و ضرب کا
	گر رزم ہو تو قلب میں	گھوڑی گئی ہے ہنہنا
	اس کے جلو میں رند ہیں	میں ہمسروں کا رہنما
	آنکھوں میں جوئے خوں لئے	جو عہد دیتے ہیں نبھا
	فیروزہ گوں، خنجر بکف	شمشیر ہے جنگی نگہ
	ٹہنی بھی ہو گر ہاتھ میں	قلعے نہ روکیں ان کی راہ

(حانی شئے مرید۔ داستان منظوم غوث بخش صابر)

اس سانحے پر حانی بھی احتجاج کرتی ہے۔

حانی دکھ بھری آواز میں فغاں برلب ہے
وہ شرفا سے پوچھتی ہے
شئے مرید کے نزدیک میری خطا کیا تھی کہ

مجھے گویوں کو بخش دیا

مانا کہ لوگ نیک نامی کے لیے اپنے میان کی تلوار، اپنی زمین اور اپنا مرکب بخش دیتے ہیں لیکن کوئی بھی یہ حرکت نہیں کرتا کہ اپنی باوقار محبوبہ کو کسی کو بخش دے۔"

اس داستان میں ایک روایت یہ ہے کہ سردار چاکر خان رند نے حانی سے شادی کرلی اور ایک بچے کا باپ بھی بنا مگر اسی میں ایک معاشرتی روک ہے۔ دانشوروں کا کہنا ہے کہ ابتداء میں چاکر خان نے شئے مرید کو آزمانے کے لیے تو درباری عہد وقول کا مشغلہ کیا مگر جب شئے مرید نے حانی میراثیوں کو بخش دی۔ حانی کے والدین نے بھی شئے مرید کے اس حق پر چپ سادی تو چاکر خان نے بلوچی معاشرت اور رسومات کے پیش نظر حانی کو قلعے میں الگ سے ایک کمرہ دیا اور اسے امانت قرار دیا۔ بلوچستان میں یہ رسم موجود ہے کہ اگر کوئی عورت فریقین کے درمیان باعث تنازعہ ہو تو تنازعے کی تصفیئے تک وہ عورت سردار کی تحویل میں بطور امانت رکھی جاتی ہے۔ چنانچہ حانی بھی تیس سال تک سردار چاکر خان کی تحویل میں بطور امانت رہی اور سردار نے اس کا ہر طرح سے احترام کیا۔ جب شئے مرید تیس سال کے بعد مکہ مکرمہ سے لوٹ آیا تو چاکر خان نے حانی اس کے حوالے کی۔ اگر حانی سردار کی بیوی ہوتی تو وہ بھلا کس طرح اپنی بیوی اپنی زندگی میں کسی کے حوالے کرتا۔ سردار چاکر خان رند اور حانی کی شادی بعد میں نافہم لوگوں نے اس داستان میں شامل کی ہوگی۔ اس کا ثبوت خود حانی کے اس بیان میں بھی ملتا ہے۔

مجھ پر شب گراں گزری ہے — اونچے قصر میں چاکر کے
تھپکیں رات کو گر جھونکے — آ کر ابر سحر پھر مچلے
پہلے بھگو کر آویزے — پھر کھیلئے ریشمی زلفوں سے
پھر سہ پہر دن جب ڈھلے — دل پر چلائے برچھیاں
شے کی اس گھڑی یاد آئے — غم سے دل مرا بھر آئے
بنتی یہ گھٹاؤ سن لو — دھیرے سے برسنا چھوڑو
برسو بحر کے سینے پر — پھر برسو جا در مکہ پر
واں ہے شئے مرید خستہ — تر ہو، تا خط نور ستہ
سایہ بر سرو بر دستار — شئے کے گیسوؤں کی ہوں بیمار
دیکھے جو قامت شئے اک بار — پھر شوق دید میں ہو بیمار
شئے کی جو خبر لے آئے — مژدہ میں بتا کیا پائے
(حانی نے) حسرت سے کیا یوں اظہار — در بخشوں اسے دو شہوار
یہ ہار اور گلے کا سینگار — نتھ دوں ناک کی ہے زرکار
کنگن دوں کلائی کے وار — پیروں کے کڑے مثل مار
سب گنج حشم اور گھر بار — دیدونگی لباس زرتار
چال اپنی بلوچی وار — بڑھ کر ہو فدا جان زار

داستان میں یہ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ قصر چاکر خان میں شئے مرید چوری چھپے حانی سے ملنے جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سردار چاکر خان رند نے اسے دیکھا تاہم باز پرس نہیں کی۔ البتہ دن کو جب دربار ہو رہا تھا۔ چاکر خان رند نے استعارے کی زبان میں درباریوں سے پوچھا۔ گزشتہ شب جب بجلی کوندی تھی۔ کس کس نے دیکھا۔ کس کس نے نظارہ کیا؟ درباری گم سم رہے اس لیے کہ جاڑے کی رات تھی آسمان پر بادلوں کا نشان تک نہ تھا۔ بجلی کیسے چمکی۔ اس کا جواب شئے مرید نے اس طرح دیا:

میرے ہاتھ میں بھنگ کا پیالہ ہے یہ بھنگ کوہسار کی عطا ہے۔
بھنگ وہ لوگ پیتے ہیں جو راتوں کو جاگ کر گزارتے ہیں
ذرا صبر سے کام لو۔ میں بھنگ کا یہ پیالہ پی کر راز کھول دوں گا
گزشتہ شب بجلی تین مرتبہ چمکی تھی پہلی بار رات کا پہلا پہر
دوسری بار دھند چھائی رہی۔ تیسری مرتبہ جھپا کا سا ہوا
حانی حسینوں کی شمع۔ قندیل کالی رات کی۔ آئی بصد ناز و ادا

اس گفتگو سے دربار میں بدمزگی چھا گئی۔ اس سے متاثر ہو کر شئے مرید کے والد شئے مبارک نے شئے مرید پر جوتا کھینچ کر مارا جس سے شئے مرید پر جذبات طاری ہو گئے اور وہ بولا: یہ جوتا اگر اور کسی نے مارا ہوتا تو گھوڑے دو طرف ہنہناتے مگر آپ والد ہیں آپ پر معاف ہے۔ اب میں یہ سرزمین چھوڑ کر فقرا کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ وہ فقر کی حکمت سے اور میں بلوچی شان سے:

حانی اور شئے مرید کی داستان میں یہ مسلمہ واقعہ ہے کہ شئے مرید گھر بار چھوڑ کر حرمین شریفین کو گیا اور تیس سال وہاں رہا۔ جب بھی حانی اسے یاد آتی اپنے کسی جوڑ کو داغ دیتا تا کہ اس کسک سے وہ بھولی بسری یادوں کو دل سے محو کر سکے۔ اس طرح شئے مرید نے اپنے ستر جوڑ داغ دے ڈالے اور حانی کی یادوں کو اشعار میں سموتا رہا۔ وہ کعبۃ اللہ میں کبوتروں کی آوازیں سن کر یہ محسوس کرتا کہ اس کی محبوبہ نے مرغان نامبر کے ذریعے پیغام بھیجا ہے۔ اس نظم میں ایسے ہی خیالات کا اظہار ملتا ہے۔

خوشا اے حرم مکہ کے کبوتر
مکہ کے طاہر خوش نوا
نغمے مت بکھیر

اپنی فریادوفغاں سے میرے دکھ نہ بڑھا
میرا سراپا خوابیدہ اسے بیدار نہ کر
میں اپنی حقیقی منگیتر کے لیے بحرِ ذخار میں پڑا ہوں
بحرِ ذخار میں سات نسلوں تک ڈوبا ہوا ہوں
خوشا اے سبز کبوتر! آ جا محبوبہ کا قاصد بن
میرا چشم انتظار ڈھاڈر اور سبی پر مرکوز ہے
راستے میں زامر کا درخت نہیں ملے گا کہ تو سستائے
نہ ہی دور تک کوئی پہاڑی نظر آئے گی
تاہم مسلسل پرواز کے بعد تو وہاں پہنچ جائے گا
مگر اے طائرِ حرم! تو اسے کیسے پہچانے گا؟
مجھ سے اس شوخ کی نشانیاں سن لے
وہ کہساروں کی ایک خوش خرام چکور کی
طرح سبک گام ہے
ایک بغیر کنچلی کا سانپ جو اونچی گردن
اٹھائے رکھتا ہے۔
دامن کہسار کا خرگوش یا
آہوئے رم خوردہ جو شکاری کی بو پا کر گریزاں ہو
یہ بادل جو برستے ہیں حانی کے آنسو ہیں
یہ ابر سیاہ حانی کے گھنے گیسو ہیں۔

یہ تو شئے مرید کی حالت زار تھی، حانی اس سے کم دکھی نہ تھی اس نے بچپن سے جوانی تک سفر شئے مرید کے ساتھ طے کیا تھا۔ دل میں نجانے کیسی آرزوئیں بسائے تصور میں کیا کیا جنتیں آباد کی ہونگی۔ چاکر خان رند اس کے دکھ کو سمجھتا تھا اور یہ بھی احساس تھا کہ دو خوشگوار زندگیوں کو دکھوں کے دوزخ میں دھکیلنے کا وہ ذمہ دار ہے۔ وہ حانی کے لیے اچھے اچھے لباس، قیمتی زیورات اور خوراک مہیا کرتا مگر خستہ ہجر کو ان چیزوں سے کیا دلچسپی۔ حانی کہتی ہے:

چاکر! تیرے دیئے ہوئے گہنے مجھے زرد بھڑ کی طرح کاٹتے ہیں۔
چاکر! تیرا دیا ہوا شہد میرے منہ میں زہر بنتا ہے۔
چاکر! تیرے ریشمی پوشاک میرے جسم پر آتش سوزاں
یہ دل دیوانہ اب تک اس نوجوان کی یادوں میں محو ہے۔

بہرحال تیس سالوں کی طویل جدائی گزار کر شئے مرید وطن کو لوٹ کر آتا ہے۔ اپنی بستی میں پہنچ کر اس کے قدم ایک نظارہ دیکھنے کے لیے رک جاتے ہیں۔ بستی میں رند ایک جگہ جمع ہو کر خوشیاں منا رہے ہیں۔ اغلب ہے کہ یہ سبی میلہ ہی ہو۔ جوان تیر و کمان سے لیس نشانہ بازی میں مشغول ہیں۔ شئے مرید کو اپنی جوانی یاد آتی ہے وہ بھی ایک ماہر تیر انداز اور نشانہ باز رہا ہے۔ تلوار کا دھنی اور حربی صلاحیتوں کا مالک۔ وہ ان جوانوں میں سے ایک کو مخاطب کر کے تیر کمان مانگتا ہے تا کہ ایک نشانہ لگا کر یادوں کو تازہ کرے۔ وہ ان وارداتوں کو اپنے کلام میں ایک ایک کر کے دہراتا ہے۔

بالآخر ایک روز میں درویشوں کی ایک جماعت کے ساتھ لوٹ کر آ گیا
رندوں کی ایک بستی سے گزرا۔ رند خوشیاں منا رہے تھے۔ نشانہ بازی ہو رہی تھی
دو جھاڑیوں کے درمیان ایک ہدف مقرر کر دیا تھا
دل میں ایک ولولے نے سر اٹھایا۔ بھائی! ایک تیر مجھے بھی دینا
میں بھی نشانے پر ایک تیر چلا کر اپنا دل خوش کر لوں۔
رند کی رنگیں کمان ایک بھی میری تاب نہ لا سکی
اٹھارہ کمانیں توڑ دیں۔ ہائے بستی کے لوگ اب بھی مجھے پہچان نہ سکے
رند آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ کہیں یہ شئے مرید تو نہیں؟
بالآخر میری کمان اٹھا لائے جسے دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رویا
(تیر کمان نے کہا) میرے مالک تیر تیرے کام کے نہیں رہے
ان پر زنگار چڑھ چکا ہے۔ یہ عدم توجہ کے شکار رہے ہیں
میں نے دل میں کرامت شہی جگائی۔ سات مرتبہ کمان کو چوم کر
سات تیر نشانے پر چلائے ایک نے دوسرے کی تصدیق کی
تیروں کی شیکاٹ سے ماں اور باپ حواس باختہ ہوئے
کنیزیں دوڑتی ہوئی حانی کے پاس گئیں۔ آؤ شئے مرید آیا ہے۔
مگر اس کے بال بڑھے ہیں۔ پہچانا نہیں جا سکتا
حانی بن سنور کر نولکھا ہار پہن کر بیٹھی تھی ہار مژدہ گر کو دیا
دُرنگیں حانی کا کہنا تھا کہ ہم کھیلے تھے بچپن میں
حادثاتی طور پر میری انگشتری شئے کے ابرو سے ٹکرائی وہ زخم اس کی پہچان ہے
اس موقع پر امیر چاکر گویا ہوئے
شئے مرید! حانی میں نے تجھے بخش دی
دیوانہ اور مستانہ شئے مرید گویا ہوا:
جب تک اس کی مجھے طلب تھی آپ کا سنگین دل نہیں پگھلا
اب قوی مضمحل ہیں میں حانی کے کب قابل رہا ہوں

ہاں جب تک یہ دنیا زندہ ہے شئے مرید زندہ و جاوداں ہے

اس کے بعد ایک تیز رفتار اونٹنی لائے شئے مرید اور حانی اس پر بیٹھے اور نظروں سے غائب ہو گئے۔

بی برگ اور گراناز: بلوچی داستانوں کا یہ باب سینکڑوں ابواب پر بھاری ہے اس میں بلوچستان کی اس مایہ ناز شخصیت کا ذکر ہے جس کی ہمہ پہلو شخصیت کسی ایک پیمانے میں ناپنے کی نہیں ہے۔ یہ ہستی مشاہیر میں بی برگ رند کی ہے۔ جو بیک وقت جرات و سرفروشی کا آسمان، سخاوت و فیاضی میں یکتائے زمان، شعر و سخن میں دُرّ بیان، حسن و عشق کی جان رہا ہے۔ تدبیر میں فلاطون ثانی، خوش پوشی، خوش فکری اور خوش کلامی بلاشبہ اس پہ تھے، نازاں۔ وہ اپنی شخصیت کا پیمانہ یہ کہہ کر خود مقرر کرتا ہے:

"میرے تیرکش میں اگر صرف چار تیر ہوں تو جوان اونٹ کا بار بن جائیں۔ اگر یہ تیر آٹھ ہوں تو ایک دستہ ان کی تاب نہ لا سکے۔ سولہ ہوں تو دہلی کے ترک جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں"

یہ ضیغم کہستان، سردار چاکر خان رند کا بھانجہ، میر بہادر خان اور بی بی مدی کا نامور صاحبزادہ بی برگ رند تھے۔ ان سے منسوب داستانوں کا شمار نہیں تاہم ان کا ارغون شہزادی گراناز سے محبت صدو سے تعلق، ملّی سے والہیت ان کے شاعرانہ ذوق کی عکاسی کرتی ہے۔ ان پیار محبت کی کہانیوں کو اس لئے آغاز داستان میں جگہ دی جارہی ہے کہ ان میں بی برگ کے خیالات اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں معرکہ آرائی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

تاریخ میں مذکور ہے کہ جب ایک مالدار جتنی گوہر مہیری کے اونٹوں کے تنازعہ پر رند اور لاشاری باہم برسر پیکار ہوئے تو کئی ایک قبیلوں نے لاشاریوں کا ساتھ دیا اور سندھ کا حکمران نظام الدین سمہ بھی در پردہ مدد کر رہا تھا۔ رند سردار چاکر خان کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے ایک مرحلے پر افغان حکمران شجاع الدین زلونی سے فوجی معاونت کی درخواست کی۔ یہ مذاکرات ایک عرصے تک چلتے رہے۔ ایک موقع پر افغانستان کے حکمران نے ایک برائے نام سپہ سالار کو پانچ سو سپاہیوں کی فوج دے کر سردار چاکر خان کی مدد کو بھیجا مگر عین میدان جنگ میں اپنی مصلحتوں کے تابع اس نے پیٹھ دکھائی۔ انہی معاملات کی دیکھ بھال اور مزید رابطوں کے لیے سردار چاکر خان رند نے اپنے لائق بھانجے کو مقرر کیا۔ بی برگ جب قندہار جانے کے لیے تیار ہوا تو اس کے ذہن میں سردار چاکر خان کا یہ قول جاگزین ہو چکا تھا۔

" کل مجھ سے چاکر خان رند نے کہا تھا اب کی مرتبہ داؤ لگانے میں تیرا فائدہ ہے۔ میں نے ایک حسینہ کالے ناگ جیسے بالوں والی دیکھی ہے جو قلعے کی ساتویں منزل پر متمکن ہے"

سردار چاکر خان رند کو بی برگ کی حسن پرستی، شاعرانہ خوش فکری کا اندازہ تو تھا ہی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بی برگ کسی وجہ سے قندہار جانے پر آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے بی برگ کی نفسیات کا اندازہ کرنے کے بعد قندہار جانے کی ترغیب دی ہوگی کہ وہاں اس نے ایک ایسی مہ پیکر دیکھی ہے جس کے لیے جان کی بازی لگانا خسارے کا سودا نہیں۔ سبب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو بی برگ اپنی ہیرزئی گھوڑی پرتن تنہا قندہار پہنچے۔ جن خدشات کی وجہ سے بی برگ قندہار جانے میں متامل تھے شاید انہی کی وجہ سے قندہار پہنچ کر گرفتار ہو کر زندان میں پہنچے۔ ان اسباب کی دقت نظر سے تحقیقات کی گئی ہیں مگر معاملہ کھل کر سامنے نہیں آیا۔ بی برگ کے کلام سے بھی کسی طرح کا تاثیر نہیں ملتا۔ قید خانے کا محل وقوع بی برگ کے اشعار کی رو سے قلعے اور شاہی محل کے آس پاس تھا اور شاہی محل بلندی سے اگر کوئی جھانکتا تو قید خانے کے قیدیوں پر نظر پڑ سکتی تھی۔ بی برگ قید و بند کے دوران اپنے درد بھرے اشعار بہ آواز بلند الاپتا تو شاہی محل کے در و بام سے ٹکراتی اس کی گونج سے شاہی محل کے باسیوں کو کوفت اور بے آرامی ہوتی تھی۔ شہزادی گراناز نے بادشاہ سے درخواست کی کہ اس قیدی کو رہا کر دیا جائے کہ ہمارے آرام اور ہماری نیندوں میں مخل ہے۔ یہ تمام باتیں بی برگ نے اپنے اشعار میں نظم کی ہیں۔

قندہار باغوں کی سرزمین جہاں میلہ سا لگا رہتا ہے۔
مردوں اور گھوڑوں کا ہجوم سمٹ کر آتا ہے۔
میرا گزر ہوا، تو گرفتار ہو کر حاکم کی قید میں جا پہنچا
بادشاہوں کے غیض و غضب کا شکار ہوا
دوران قید ہم درد بھرے نغمے الاپتے
مغلوں کے مقید دوسرے قیدیوں کے ساتھ
شہزادی نے اپنے بھائیوں، باپ سے عرض کیا
یہ کون شخص ہے جو آپ کی قید میں ہے؟
آدھی آدھی رات کو فغان برلب ہوتا ہے۔
ہماری تو اس نے نیندیں حرام کر رکھی ہے۔

بادشاہ نے شہزادی کی درخواست قبول کرتے ہوئے بی برگ کو قید سے رہا کر دیا۔ بی برگ کا بیان ہے کہ:

بالآخر میں حاکم کی قید سے رہا ہو گیا
ہاتھ پیر زنجیروں سے آزاد ہو گئے

اب اس نے گھوم پھر کر قندہار کا شہر دیکھا اور ساتھ ہی شاہی محل کی وہ کھڑکی دیکھی جس سے ایک حور شمائل حسینہ جھانکتی تو رنگ و نور کی بارش ہوتی۔ بی برگ نے یہ اندازہ کرلیا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت ہے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

باغوں کی سرزمین قندہار شہر میں گھومتے ہوئے
اچانک میں نے چاند جیسی محبوبہ کو دیکھا
فارسی زبان میں اس گوہر نایاب نے کہا
جتنی جلدی ہو سکے محل میں اوپر آ کر مجھے سے مل

شہزادی کی یہ دعوت بی برگ کے لیے ایک چیلنج بنی، اس لیے نہیں کہ اس کا حسن شہزادہ بی برگ کے لیے متاثر کن تھا۔ اس لیے کہ وہ خود ایک ملک کا شہزادہ تھا۔ ان گنت شہزادیوں کے دل کی دھڑکن تھا بلکہ اس لیے یہ چیلنج اہم تھا کہ جرات، دلیری، جانبازی اور سرفروشی نے مقابلے کے لیے للکارا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ مردانگی کے اس امتحان سے جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ وسائل کی کمی ضرور تھی، نہ کمان نہ اسلحہ صرف ایک جان تھی۔ بی برگ جورزم کا دھنی تھا۔ جرات و ہمت میں یکتا اور بے مثال تھا اس نے اس دعوت کو قبول کرلیا۔ بلند و بالا شاہی محل پر ایک نظر ڈالی اور اپنے منصوبے کو آخری شکل دے کے وہ لوہار کی دکان پر گیا۔ وہاں سے چند لمبی اور نوکیلی میخیں بنوائیں۔ اپنی ہیرزئی گھوڑی کو ایڑ لگاتا شاہی محل کے قریب پہنچا۔ شاہی محل کے پہرہ داروں نے اسے روکا۔ اس نے جیب سے کچھ اشرفیاں نکالیں، نکال کر پہرہ داروں کو خاموش کردیا۔ شہزادی گرانناز کی خواب گاہ ساتویں منزل پر تھی بی برگ کا عزم آہنی میخوں کو قلعے کی مضبوط دیواروں میں گھڑنے لگا اور بلندیوں کی طرف محو سفر ہوا۔ واقعات کا شاعرانہ اظہار:

میں لوہار کے پاس جا پہنچا — تین چار نوکیلی میخیں بنوائیں
جب محل کے دروازے پر پہنچا — محبوبہ کے پہرے دار آڑے آئے
تین چار اشرفیاں نکالیں — اشرفیاں پا کر انہوں نے آنکھیں جھکائیں
میں آہنی میخوں کے سہارے — محل پر چڑھ گیا.....

بالکل اس طرح جیسے چٹانوں پر پہاڑی بکرے چڑھا کرتے ہیں۔

جب میں محل کی نصف بلندی کو پہنچا میرے جسم میں سنسنیاں دوڑنے لگیں
دل کے خیالوں کو میں نے ڈانٹ کر کہا دیکھنا عظمتوں کے سر نہ لہرائیں،
ورنہ عظمت و عزت کھو جائے گی۔

اس مشکل امتحان سے گزر کر بی برگ بالآخر اس دریچے تک جا پہنچا جو شہزادی گرانناز کی خوابگاہ میں کھلتا تھا۔ بی برگ اس دریچے کی راہ سے شہزادی کی خوابگاہ میں دھم سے کود پڑا۔ شہزادی جو محو استراحت تھی اس آواز سے جاگ اٹھی اور گھبرا کر شب خوابی کے لباس میں کمریز کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ بی برگ ان واقعات کو منظوم کر کے کہتا ہے۔

میرے شیرانہ قدموں کی چھاپ سے گھنیری زلفوں والی محبوبہ گھبرا کر اٹھی
پلنگ اور مخملی بستر چھوڑ کر وہ ایک چادر میں دور کھڑی کانپ رہی تھی۔
(اور کہتی تھی) اے جوان تیری موت تجھے کھینچ کر لائی ہے۔ ترک تیری مغرور
گردن کاٹ کر باب ہرات پر لٹکا دیں گے۔

بی برگ اس مایوس کن مکالمے سے ذرا بھی نہ گھبرایا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا:

میں اس شیر جیسی ہیبت کے مالک رندوں کا احساس کرتا ہوں۔
چاکر خان اور ایرانی منہ زور گھوڑوں کا
کون ہے جو میری مغرور گردن کو کاٹنے کی جرات کرسکتا ہے۔
میں بھوک اور افلاس کا مارا ہوا کوئی ڈاکو نہیں ہوں
جو چھرے کی طاقت پر بھیڑوں کی تاک میں رہتے ہیں
میں شہرہ آفاق سخنور بی برگ ہوں تو نامہ و پیام والی میری محبوبہ ہے۔
یاد ہے میں نے شاہی محل کے قریب تجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔
میں اپنا وعدہ نبھانے آیا ہوں

اس کے بعد شہزادی گرانناز نے اس بہادر بلوچ کی بہادری کے اعتراف میں تاحیات رفاقت قبول کرلی اور وہ دونوں فرط محبت سے ایک دوسرے میں اس طرح سما گئے کہ دوری کا تصور نہ رہا۔

بڑی بڑی مونچھوں نے جھک کر لبوں پر مہر محبت ثبت کی
دوپٹہ اور چادر ایک دوسرے میں سما گئے

مندرجہ بالا شعر میں بی برگ نے سخنوری کا کمال دکھایا ہے بلوچوں میں مرد کی پہچان کندھے پر رکھی ہوئی چادر ہے اور عورت کی پہچان دوپٹہ ہے ان دونوں کا ملاپ نہایت حسین پیرائے میں بیان ہوا ہے۔

بہرحال راز و نیاز کے دوران شہزادی گرانناز نے بی برگ پر یہ منکشف کیا کہ بادشاہ کو اپنی بیٹی سے بہت پیار ہے اگر ان دونوں کے تعلقات کی بھنک بھی اس کے کانوں میں پڑی تو دونوں کو جیتا نہیں چھوڑے گا۔ اس کا حل شہزادی کے نزدیک یہ تھا شان والے معزز بی برگ:

بادشاہ کو مجھ سے غائت درجہ محبت ہے۔
اگر کہیں اس کے کانوں میں بھنک بھی پڑی

تو ہم دونوں کو جیتا نہیں چھوڑے گا۔

اگر آپ میں حوصلہ مردانگی ہے تو

یہ ملک چھوڑ دینا بہتر رہے گا۔

آؤ چل کر وہاں جا بسیں جو بلوچوں کا وطن ہے۔

بلوچوں کے وطن سبی میں جا کر رہیں۔

دونوں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ بی برگ شہزادی کو محل سے اتار لایا دونوں تیز رفتار گھوڑی پر بیٹھے اور بلوچستان کی راہ لی۔ باتوں باتوں میں شہزادی گراناز نے بی برگ سے معلوم کر لیا کہ بلوچستان میں ان کی قوت کیا ہے کون دوست ہے کون دشمن ہے؟ بی برگ کہتا ہے:

چالیس ہزار رند شہسوار ہیں۔

تیس ہزار میر عالی بہادر

دس ہزار ملحقہ قبائل عینی اتحادی

اور پچاس ہزار گہرام کی تلواروں کے دھنی

چاکر ہمارا دوست ہے گہرام دشمن

شہزادی گراناز نے یہ تجویز پیش کی کہ آؤ چل کر دشمن کی پناہ لیں دوست خود ہی بے قرار ہو کر ہمیں اپنا لے گا۔ درہ بولان کے دہانے پر پہنچ کر بی برگ نے باگیں موڑ لیں اور سردار گہرام خان لاشاری کے ڈیرے پر جا پہنچا۔ ہر چند کہ رند اور لاشاری کے درمیان شدید قبائلی مخالفت تھی، عداوت اور رنجشیں تھیں۔ مہمانداری اور پناہ دہی کی عظیم روایات کے احترام میں سردار گہرام خان لاشاری نے بی برگ رند کا شایان شان استقبال کیا۔ بلوچی ثقافت کے حوالے سے بی برگ نے تمام ماجرا سردار گہرام خان کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا:

اے محترم گہرام خان!

میں بادشاہوں کا مال غنیمت لئے ہوئے ہوں

اگر آپ پناہ دیں گے۔ آپ کے ہاں رہوں گا

ورنہ کوئی اور میدان دیکھوں گا

آپ نامور میر بھی ہیں، اصفہانی تلوار بھی

سردار گہرام خان لاشاری کی رگوں میں بلوچی خون موجزن تھا۔ غیرت و حمیت کو اس کے نزدیک اولیت حاصل تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس اقدام کے نتیجے میں افغانستان کی حکومت کے ساتھ اس کے تعلقات خراب ہونگے۔ بادشاہ کے ساتھ جنگ کی نوبت آسکتی ہے۔ خود وہ جو پناہ جو ہے دشمن ہے مگر ان تمام خدشات کو یکسر نظر انداز کر کے سردار گہرام خان نے شان مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بی برگ کو خوش آمدید کہا:

خوش آمدید اے بلوچوں کے سربرآوردہ میر

ہم آپ و آپکی محبوبہ کو امن کی ضمانت دیتے ہیں

بلوچی ناموس و روایات کے تابع

ہم بادشاہ سے بھی لڑیں گے

اپنے معزز مہمانوں کا نہ صرف شایان شان استقبال کیا بلکہ ان کے رہنے کے لیے الگ سے ایک شائستہ مکان، فرش و فروش اور شاہانہ انتظام بھی کر دیا۔ شہزادی گراناز کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ سردار گہرام خان کی جانب سے جیسی بھی ضیافت آتی بی برگ نہ خود اس میں سے کھاتے نہ ہی شہزادی گراناز کو کھلاتے بلکہ در پردہ ایک میمن سے رسم و راہ کر لی تھی جو شاہی جوڑے کے تمام لوازمات فراہم کرتا تھا شہزادی گراناز نے جب اس کی وجہ پوچھی۔ تو بی برگ نے بتایا کہ "پناہ دینا بلوچی شان اور روایت کے مطابق ہے لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کل کلاں رند اور لاشاری رزم آرا ہوں۔ میں لاشاری سردار کا نمک کھا کر پھر کس طرح اس کے مقابلے میں میدان کارزار میں آسکوں گا۔ نمک حرامی تو اندھا کر دیتی ہے۔ اس اقدام کا بہر کیف بھیانک نتیجہ افغانستان کے بادشاہ امیر شجاع الدین زنون کی لشکر کشی کی صورت میں سامنے آیا۔ بادشاہ اپنی افواج قاہرہ کے ساتھ درہ بولان سے گزر کر ڈھاڈر کے مقام پر خیمہ زن ہوئے۔ سردار گہرام خان لاشاری نے اس موقع پر سردار چاکر خان رند کو کہلا بھیجا کہ باہمی عداوت اپنی جگہ پر۔ اس وقت بیرونی جارحیت کا سامنا ہے ساتھ ہی بی برگ کی کارستانی کا بھی حوالہ دیا۔

آؤ بی برگ نے گل کھلائے ہیں

نہ راہ رفتن، نے پائے ماندن

سبی سے سردار چاکر خان رند لشکر لئے ہوئے سردار گہرام خان کی مدد کو پہنچا۔ دونوں سرداروں کی قوت اور بادشاہ کی افواج قریب تھا کہ آپس میں ٹکرا جائیں۔ بی برگ رند کی امن پسند سرشت نے گوارہ نہ کیا۔ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کی غلط حرکت کے باعث معلوم نہیں کل کتنے گھر اجڑینگے۔ کتنے بچے یتیم ہوں گے۔ کس قدر خون خرابہ ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر اس نے ایک ترکیب نکالی اور دونوں لشکروں کے ہائی کمان سے کہا۔ بغیر کسی منصوبہ بندی کے حملہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ مجھے کچھ وقت دیجئے میں بادشاہ کی فوج کی جا کر جاسوسی کروں گا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ بادشاہ کی طاقت کتنی ہے یہ اجازت پا کر بھیس بدل کر بی برگ شاہی فوج میں جا پہنچا یہ بڑا ہی خطرناک مشن تھا وہ کہتا ہے:

میں خدا کے بھروسے پر چلا گیا　　اپنے شاہانہ گھوڑے پر بیٹھ کر
فوج کے ایک سرے پر پہنچ کر　　میں نے اپنا گھوڑا ایک طرف باندھا

شاہی خیمہ گاہ کے قریب پہنچ کر پہرہ دار مانع ہوا۔ بی برگ کی آبدار شمشیر لہرائی۔ چشم زدن میں پہرہ دار خاک وخون میں غلطاں ہوکر رہ گیا۔ راستہ صاف پا کر بی برگ بادشاہ کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا ایک خادم بادشاہ کی پائنتی پر بیٹھا اس کے پاؤں داب رہا ہے۔ تلوار پھر چمکی اور اس صفائی سے خادم کی گردن اڑائی کہ بادشاہ کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ وہ خود خادم کی جگہ بادشاہ کے پیر دبانے کی خدمت کرنے لگا۔ خادم تو اس خدمت کے لیے تربیت یافتہ تھا۔ بی برگ کو بھلا اس کام کا کیا تجربہ۔ جب دو چار ہاتھ زور سے پڑے تو بادشاہ نے آنکھیں کھولیں اور حیرت سے پوچھنے لگا۔

نوجوان ہوت تم کون ہو؟

کس صحرا کے شیروں سے ہو؟

بی برگ نے سر جھکا کر نہایت ادب اور شائستگی سے کہا:

میں نامور سخنور بی برگ ہوں۔ مجھ سے ایک شیطانی حرکت سرزد ہوئی بخش دینا۔ معاف کرنا بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ اگر معاف نہیں فرمائیں گے تو سزا کا آپ کو اختیار ہے

بی برگ کی اس جوانمردی، دلیری اور صاف گوئی سے بادشاہ بہت متاثر ہوا۔ بی برگ پر مرحمت فرمائی۔ اسے اپنے بغل میں جگہ دی، امرا اور وزراء کی طلبی ہوئی۔ بادشاہ نے ان سے بی برگ کا تعارف کرایا اور کہا آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہوسکتی تھی۔ چاہتا تو میرا کام تمام کر دیتا۔ جس طرح پہرہ داروں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ چونکہ اس نے میری زندگی بخش دی۔ مجھ پر احسان کیا۔ میں بھی اسے اپنی دامادی کی عزت سے سرفراز کرتا ہوں۔ بادشاہ نے بی برگ کو خلعت فاخرہ اور تیز رفتار عربی گھوڑی انعام میں مرحمت فرما کر حکم دیا کہ خیمہ وخرگاہ اسی وقت اکھیڑ کر بولان کی راہ سے واپسی ہو۔ اس طرح بی برگ کی جرات کے صرف ایک باب ہی نے رند اور لاشاری قبیلوں کو جنگ اور خون ریزی سے بچا کر گرانا ز کے ساتھ امن اور خوشدلی سے زندگی گزاری۔

جدید تحقیق کی رو سے بلوچی زبان کی قدیم شاعری کے مختلف گوشوں پر نظمیں ملتی ہیں۔ ایسی شاعری گمنام شعراء کی تخلیقات کی ذیل میں آتی ہے۔ جس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے نظم کی نسبت کو مدنظر رکھتے ہوئے بعد میں اسی شخصیت کے نام سے اشعار منسوب کئے گئے ہیں۔ ورنہ بیشتر تاریخی مشاہیر جیسے سردار چاکر خان رند، سردار گہرام خان لاشاری، میر ھیتان، جاڑوک وغیرہم شاعر نہ تھے تاہم یہ بات بصد اطمینان کہی جاسکتی ہے کہ کچھ شخصیتیں بوجوہ شاعر یا شاعرہ ہوگزری ہیں۔ ان میں شئے مرید کو حانی سے بچھڑنے کے غم اور سانحے نے شاعر بنا دیا۔ مہناز کو میر شہداد کے بہتان نے شاعری کی جانب راغب کیا۔ ان شخصیات کے علاوہ اگر وثوق سے شاعری نظر آتی ہے تو وہ بی برگ رند کی ہے کہ اسے زندگی کو جنگ، محبت، امتحان وآزمائش کے رنگ میں بارہا دیکھنا نصیب ہوا۔ اس کے اثرات شعروں میں ڈھل کر ابدی ہوگئے۔ کچھ تجربات تھے، کچھ تلخ یادیں، کچھ شرین کیفیات۔ ان سب کا بیان بی برگ کی شاعری میں ملتا ہے۔ چند ایک مختصر حوالے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ مائیں بیٹوں کو طویل العمری کی لوریاں دیتی ہیں۔ بی برگ کے تجربات کہتے ہیں کہ بڑھاپا راحت آمیز نہیں:

بڑھاپہ: (بیٹوں کی مائیں) بیٹوں کو طویل العمری کی دعا نہ دیں

بڑھاپے میں میں نے بہت سے عیب دیکھے ہیں۔
ہاتھ گھوڑوں کی باگ تھامتے ہوئے کپکپاجاتے ہیں۔
پیر گھوڑوں کو ایڑ لگاتے ہوئے لرزتے ہیں۔
سیپ جیسے دانت چھالیہ چبانے سے رہ جاتے ہیں۔
آنکھیں دور دیکھنے سے معذور ہوتی ہیں۔
اگر دعا ہی دینا ہے تو کہو شمشیر زن بنو، فیاض ہوکر رہو

بی برگ اپنے بڑھاپے کے حوالے دیتے ہوئے کہتا ہے:

میں نے ایک البیلی جوانی ڈیرہ کے علاقے میں دیکھی
زیورات میں لدی پھندی ایک شہزادی
مگر میری وضع وقطع سے وہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوئی۔
بلکہ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی نکل گئی
(کیوں؟) اس لیے کہ بڑھاپے کی چار نشانیوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔
داڑھی اور مونچھوں میں سفیدی سرائت کرگئی ہے
اس بدبخت بڑھاپے کی جنگ رہتی ہے داڑھی سے مونچھوں سے
ہونٹوں سے دانتوں سے
جہاں تک ہوسکے محرومیوں سے بچتے رہو
میں نے کبھی خود میں محرومیت نہیں دیکھی
گھوڑوں کی چندن جیسی زینوں سے، حسینوں کے پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے
امراء کی مجالس اور محفلوں سے
شکار کے پہاڑی بھیڑوں کے گوشت سے کام ودھن کو خوش کیا

غیور خواتین سے خطاب: میں معزز خواتین کو اچھی نصیحت کرتا ہوں۔

آپ اپنی عزت کا سختی سے خیال رکھیں
ایسا نہ ہو کہ لونڈے لمڈے دھوکا دے جائیں۔
شیخی خوروں کے بال دیکھ کر نہ پھسل جانا
تا کہ تمہارے باپ اور بھائی چوپال میں شرمندہ نہ ہوں۔

فکری بلندی: میں منتخب سواروں کی معیت میں سبی کا دورہ کر رہا تھا۔

راستے میں پڑے ہوئے پتھروں سے پوچھا، عہد رفتہ کی کچھ خبر دو
پتھر حسرت و یاس سے گویا ہوئے:
بلوچوں کے میر! کیا پوچھتے ہو؟
گھڑ سواروں اور بہادروں کا وقت یکساں نہیں رہتا
وقت نہ تو کوئی قلعہ ہے۔ نہ ہی مضبوط پہاڑ
وقت نے گہرام خان سے وفا نہ کی
نہ ہی ہمارے عظیم سردار سے

شہداد مہناز: بلوچوں کے سنہرے عہد کی یہ ایک الم انگیز داستان ہے جس کے واقعات سوکن کی لگائی بجھائی کے گرد گھومتے ہیں تاہم اس کے بیان میں جو بلوچی نظمیں ملتی ہیں ان میں شاعرانہ محاسن اس قدر پائے جاتے ہیں کہ یہ اپنے دور کی تاریخی، ثقافتی اور سماجی حالتوں کی ترجمانی میں شاہکار کہی جاسکتی ہے۔

اس داستان کی ایک اور خصوصیت اس کی ڈرامائی شکل و اسلوب ہے جو اسے کئی ایک داستانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ شہداد اور مہناز کی داستان کا خلاصہ یوں ہے کہ:

میر شہداد خان، بلوچ سردار چاکر خان رند کے بیٹے تھے۔ میر شہداد نہ صرف ایک بہادر اور جنگجو جوان تھے بلکہ بلوچوں میں یہ واحد شخصیت ہے جو عصری علوم اور دینی علوم پر دسترس کے مالک رہی ہے۔ مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز تاریخ فرشتہ کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں کہ "میر شہداد سبی سے اپنے والد سردار چاکر خان کے ساتھ نقل مکانی کر کے ملتان میں وارد ہوئے۔ شاید اپنے علوم دینی کی ترغیب سے انہوں نے شیعیت کی بھی تبلیغ کی چنانچہ ملتان اور اس کے گرد و نواح میں انہیں ایک روحانی بزرگ کا مقام بھی دیا گیا ہے۔

میر اشہداد کی دو بیویاں تھیں (ایک شعر میں، جس کا حوالہ اپنے موقع پر آئیگا، میر شہداد کی تین بیویوں کا ذکر ملتا ہے) دونوں بیویوں میں مہناز ان کی چہیتی بیوی تھی۔ دوسری بیوی کا نام "مرگو" تھا۔ سوکن کے جلاپے میں مرگو کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ مہناز کو جو حسن و سیرت میں یکتا تھی اور نجابت کی مالکن تھی کسی نہ کسی طرح میر شہداد کی نظروں سے گرادے۔

زمانہ قدیم سے بلوچوں کی معاشرتی اور ثقافتی رسومات میں یہ ایک ناقابل تنسیخ رسم ہے کہ اگر صاحب خانہ گھر میں موجود نہ بھی ہو اور مہمان آجائے تو گھر کی مالکن کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ مہمان کی خاطر تواضع کرے۔ میر شہداد خان کے ایک ملنے والے کا نام میر عمر تھا جس سے میر شہداد کی گاڑھی چنتی تھی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میر شہداد شکار کرنے گئے تھے۔ میر عمر جھٹ پٹے کے وقت میر شہداد کے ہاں مہمان بن کر آیا۔ مہناز نے میر عمر کی پذیرائی کی۔ کھانا وغیرہ کھلانے کے بعد گھر کے قریب چارپائی پر بستر لگا کر مہمان کو آرام کرنے کا کہا گیا۔ مہمان جا کر اپنی چارپائی پر سو گیا۔ آدھی رات کو جب کہ گھر کے سارے افراد سو رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔ مہناز کی سوکن مرگو نے مہناز کے جوتے پہنے میر عمر کی چارپائی تک گئی اور پھر آ کر سو گئی۔ صبح ہوئی تو مہمان نے اپنی راہ لی۔ جب میر شہداد گھر آئے تو مرگو نے میر شہداد کو یہ کہہ کر بدگمانی میں مبتلا کر دیا کہ رات مہمان کے بستر میں مہناز چوری چھپے جا کر سوئی ہے۔ اس نے اپنے شوہر کو مہناز کے جوتوں کے وہ نشان بھی دکھائے جو گھر سے مہمان کے بستر تک اور بستر سے گھر تک اس نے گذشتہ شب بنائے تھے۔ اس غلط فہمی کو مزید تقویت دینے کے لیے میر عمر کا میر شہداد سے ملے بغیر صبح ہی صبح چل دینے کا بھی ذکر کیا۔ میر شہداد نے بغیر کسی تصدیق کے اپنی وفا شعار بیوی پر تشدد کیا اور طیش میں آ کر مہناز کو طلاق دے دی۔

مہناز کو اس بات کا بڑا رنج رہا کہ میر شہداد نے سوکن کی لگائی بجھائی سے ایک بے قصور معزز شخص پر تہمت باندھی اور مہناز جیسی وفا شعار بیوی کو بدنام کیا۔ مہناز نے اپنے والدین اور بھائیوں کے لیے پیغام بھیج کر انہیں بلایا اور اپنے میکے چلی گئی۔ بات جب میر عمر کو معلوم ہوئی تو اس نے مہناز کو بیوہ کرنے میں اپنی مہمان نوازی کو وجہ طلاق سمجھا اور مہناز کے والدین اور بھائیوں سے مہناز کا رشتہ حاصل کیا۔ اس واقعے سے دونوں طرف سے ہجو و ذم کا ایک طوفان اٹھا جب میر شہداد پر یہ راز کھلا کہ یہ ساری غلط فہمی اور حرکت مرگو کی تھی تو وہ بے حد پشیمان ہوا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مہناز کی شاعری نے میر شہداد کے دل میں آگ کی بھٹی سلگائی اس میں بالکل بھی شک نہیں کہ مہناز ایک سلجھی ہوئی شاعرہ ہو گزری ہے جس کے اشعار شعر و سخن کے قیمتی موتی ہیں۔ اس شاعری میں واقعات کے تانے بانے میں بلوچوں کی سماجی زندگی کے کئی ایک پہلو کھل کر سامنے آتے ہیں۔

ترجمہ شاعری (بی بی مہناز)

ہاں اے خوشنوا کوئل میرے گیت لے جا

لے جا میرے دل شعلہ زن کا حال
جا کر اس ولی تمثال شہداد کو پہنچا دے
میرے خالہ زاد بزرگ کو جا کر بتا
جا کر کے معطر بھنگ پینے والے بیٹے کے لیے
جس کے غزال صفت نین تھے۔
وہ شہداد جو چندن جیسے سواروں کا دستہ لئے
خوشدلی سے شکار کے لیے گیا تھا
شکار کر کے وہ نر آہو کے گوشت کا کباب بناتے ہیں
بھیڑوں کی رانیں اور رودے بھون کر کھاتے ہیں۔
اس کا سینہ حسینوں کے لیے ایک دلکش پیشکش ہے
شہداد جو میرا چچازاد بھی ہے
اے شہداد! ہمارے عظمت مآب عقل سے عاری ہو
تیری عقل مشکیزوں میں پانی کی طرح چھلکتی ہے
قدم بقدم چل کر کیوں تذبذب میں مبتلا ہے
سوکنوں کی گھڑی ہوئی دروغ بافی راستہ روکتی ہے؟
یوں لگتا ہے جیسے لڑکوں بالوں نے گمراہ کیا ہے
بدمست اونٹ کی طرح مجھ پر لاٹھیاں برسائیں
بہار چرنے والے گھوڑوں کی طرح چابک برسائے
(حالانکہ) چابک اور لاٹھیاں بیوارث عورتوں کا نصیب ہیں
چابک کمیں اور خطا کاروں کا مقدر ہے
یہ مہناز کے پھول جیسے نازک جسم کے لیے نہیں
میں انجیر کے چوڑے پتوں کا پیڑ ہوں
جو بلند و بالا کہساروں پر اگتا ہے
جو گہری گھاٹیوں اور وادیوں میں نشوونما پاتا ہے۔
میں ایسے ہی باغوں کی سرو قامت ہوں
کسی سمت سے آنے والی ہوا نے میری ٹہنیوں کو نہیں ہلایا
ساون بھادوں کی بوچھاڑ بھی میری جڑوں تک نہیں پہنچی
سوائے شہداد کے خط نورستہ کے

☆

تُو شکار سے اپنے دوستوں کے ہمراہ آ رہا تھا
میں بھی تین چار سہیلیوں کے ساتھ تیرے استقبال کو آئی
تیری راہ پر کھڑی ہو کر
میرا ایک ہاتھ تیرے امیرانہ موزوں پر
دوسرا ہاتھ گھوڑے کی نقرئی لگام تھام کر
مجھ سے جو بھی خطا سرزد ہوئی ہے بخش دے
مگر بخشنے کی عادات اب اچھے اچھوں میں نہیں رہی
تو نے مجھے کافرانہ دھکا دیا
میں پیٹھ کے بل گر پڑی تھی
میرے زیورات اور گیسو غلطاں خاک ہوئے
تو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر
تین تیر نکال کر میری طلاق کے طور پر دئے
شہداد تو نے بہ رضا و رغبت دئے
اور میں نے (مہناز نے) دکھ بھرے دل سے لئے
ایک آنکھوں سے لگایا
دوسرا مسی مالیدہ ہونٹوں سے چوما
اور تیسرا گہری جیب کی نذر کیا
ان کو مضبوطی سے محفوظ رکھنا ہے
نہ تمہیں اس سے فائدہ نہ مجھے نقصان
لوگ آپ کو نئی شادی کے لیے بجا رہے ہیں
میں اپنی طرف سے بیٹوں کی بجا پیش کرتی ہوں۔
میرا گھر بیٹوں سے سجا ہوا سونے جیسے بیٹے
ماسوائے اس آہو چشم بیٹی کے
لوگ کوچ کر رہے ہیں کہ حملوں کا گمان ہے
مگر میں نہیں ڈرتی کہ یہ عساکر دراصل میرے والد اور بھائی ہیں
جو مجھے لینے کے لیے آ رہے ہیں۔

☆

میں جا کر ایک چوراستے پر بیٹھوں گی
شاید میرے علاقے کا کوئی راہ نورد ملے
اپنے ہاتھ کی چوڑیوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے
اپنے کانوں کے آویزے

اپنے گیسوؤں کے کچھ بال
اپنی اوڑھنی کی ایک ٹکری میں لپیٹ کر
رہنورد کے ہاتھ بھجواؤں گی
تا کہ میرے مہربان والد کو خبر ملے
کہ شہداد نے میری عزت خاک میں ملائی

شہداد اور مہناز دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے لیکن بلوچی معاشرت میں عورت کی بے وفائی کسی طرح بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس لئے شہداد نے طوعاً کرہاً مہناز سے علیحدگی اختیار کی اور اسے طلاق دے دی مگر بعد میں جب مہناز نے اسی شخص سے دوسری شادی کی جسے شہداد متہم کر چکا تھا تو میر شہداد کے شک کو یقین میں تبدیل ہونا پڑا۔ اب مہناز سے علیحدگی کا صدمہ غصے میں بدل گیا۔ میر شہداد کے ہجویہ اشعار اور مہناز کے جوابی اشعار اس داستان کو اور خوبصورت اور فکر انگیز کرتے ہیں۔ میر شہداد کی عمر کے بارے میں ہجو

ہجو: مراثی میری رندانہ گفتار

اس ہرجائی تک لے جا کر پہنچا دے
میں اگر کہیں تیرے مرادوں پائے خاوند کو دیکھ لوں
تلوار کا ایک ایسا بھرپور وار کروں
کہ اس کی لاش کو گدھ اور چیل بھنبھوڑتے رہیں
گیدڑ اور لومڑیاں اس کی لاش کو گھسیٹیں
عمر پہاڑوں کی کھوہ میں رہنے والا ایک لگڑ بگڑ ہے
جسے کاشتکار کھیتوں سے بھگاتے ہیں
عمر ایک کن کٹا مردار خور ہے
جس کی گزر مردار چیزوں کے کھانے پر ہے۔
اس کی پیٹھ مردار ڈھونے سے زخمی ہے۔
باہو کی گندگی اور غلاظت چاٹنے والا
اس کے ہاتھ لکڑی کی گھڑی ہوئی ڈوئی جیسے ہیں
پیٹ گھوڑے کی خورجین جیسا پھولا ہوا
اور سر سندھ کی بنی ہوئی خانہ زاد دیگ کی طرح
ارے بھئی لوہار! جلدی سے گھوڑے کے نعل لگا
گھوڑا ننگے پاؤں ہے اور مجھے جلدی جانا ہے

جواب ہجو مہناز کی زبان سے

اے راہرو! تم وہاں سے گذرتے ہوئے
اس سجیلے جوان کو ہمارا اسلام دیجو
عظمت مآب ہمارے چچازاد شہداد خان
اب تم اپنے قد اور اپنی شان سے محروم ہو چکے ہو
یہی کام رہ گیا ہے کہ بیٹھ کر میرے خاوند کی برائی کرو
اس عمر کی جو اپنے علاقے کا مشہور تیغ زن ہے۔
عمر تو ہمارے گلے کا منتخب سانڈ ہے۔
وہ سانڈ جو چراگاہوں میں خوب پلا ہو
اس کا ریشمی مہار ٹوٹ گیا ہو
ہمارے معطر ہونٹوں پر مہر محبت ثبت کرتا ہے۔
بھڑ جیسی نازک کمر میں اس کے ہاتھ لپٹے ہیں

للہ اور گراناز: للہ اور گراناز کی داستان اگرچہ عشق و محبت سے ذیل میں نہیں آتی۔ اس اعتبار سے نہیں کہ یہ دو محبّ و محبوب میاں بیوی کے درمیان غلط فہمیوں سے پیدا شدہ داستان ہے تاہم حانی و شئے مرید کی داستان کے بعد اس داستان کا شہرہ پورے بلوچی علاقے میں ہے اس لیے کہ اس میں بھی مرکزی نکتہ عہد و قرار کی پابندی اور پاسداری ہے۔

للہ اور گراناز بلوچستان کے تاریخی ساحل اور مشہور بندرگاہ کلمت کے رہنے والے تھے۔ کلمت بلوچستان میں نہ صرف سکندر اعظم کی فوجوں کی واپسی اور اس کے قرب و جوار میں "رومی قبرستان" سکندر اعظم کے فوجیوں کا مدفن ہے بلکہ یہ چھوٹی سی بندرگاہ جری بلوچ سردار میر حمل جیند کی ان سرفروشانہ کاروائیوں کا مرکز بھی تھی جن میں اس نے بحری قزاق قوم پرتگیزیوں سے اپنی سرزمین کے دفاع میں ایک عرصے تک اپنی قومی غیرت کا اظہار کیا تھا۔

للہ اور گراناز کی اس داستان کو تین سو سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے تاہم مکران اور بلوچستان کے دوسرے علاقوں میں للہ اور گراناز کے اشعار نہایت ذوق و شوق سے گائے اور سنے جاتے ہیں اشعار کا رنگ و اسلوب یہ ظاہر کرتا ہے کہ دونوں میاں بیوی کی جانب سے ان اشعار کو کسی دوسرے شاعر نے موزوں کیا ہے اس لیے کہ دونوں کی بحر اور رنگ سخن ایک جیسا ہے۔

یہ داستان کچھ اس طرح ہے کہ کلمت کے ساحلی مقام پر میر باران ایک مشہور اور معزز بلوچ تھا۔ وہ بلوچی معاشرے کا ایک معزز و معتبر شخصیت تھا جس میں

بلوچی وقار، ناموس، قول کی پاسداری اور بہادری کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ گراناز اس کی مہ تمثال بیٹی تھی جس کی شادی للّہ نام کے ایک بہادر شخص سے ہوئی تھی۔ شادی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ میر باران کے قدیم دشمنوں نے میر باران کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ اپنی فلاں دشمنی کا بدلہ لینے آ رہے ہیں جس کا فیصلہ میدان کارزار ہی میں ہوگا۔ بلوچ اپنی روایات واقدار کا بے حد احترام کرتے ہیں جس طرح وہ اپنا خون کسی پر معاف نہیں کرتے اور جلد یا بدیر بدلہ لے لیتے ہیں اسی طرح وہ دشمن کے اس حق کو بھی مانتے ہیں۔ جو بلوچ بدلہ لینے دینے والے خونی چیلنج کو قبول نہ کرے اسے معاشرے میں عزت ووقار کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلوچی زندگی میں مشہور ہے کہ:

"بلوچوں میں بدلہ دو سو سال تک محو نہیں ہوتا بلکہ غزال دو دندان کی طرح جوان رہتا ہے پتھر اگر گہرے کنوؤں میں ممکن ہیں گھل جائیں، مردوں کے دل سے بدلے کا خیال نکل نہیں سکتا۔"

حریفوں کا پیغام ملتے ہی جری اور دلیر میر باران اپنے بیٹوں کے ساتھ تیار ہو کر میدان جنگ کی جانب چلا۔ میر باران اور اس کے جیالے بیٹوں کی طرح کتنے ہی دوسرے بلوچ ہتھیار سجا کر نکل کھڑے ہوئے۔ للّہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی میر باران نے بہت چاہا کہ للّہ گھر پر ہی رہے مگر اس بہادر جوان نے یہ قبول نہیں کیا کہ طبل جنگ کو وہ گھر میں بیٹھ کر سنے۔ اس نے بھی اپنی مصری تلوار صیقل کی۔ گھوڑی سجائی اور میر باران کے بیٹوں کے کندھے سے کندھا ملائے دشمنوں کی للکار کا جواب دینے میدان حرب میں آن کھڑا ہوا۔ جنگوں میں فتح وشکست عموماً فریقین کی تعداد پر ہی منحصر ہے۔ میر باران کے ساتھی تعداد میں دشمن سے کم تھے۔ انہوں نے جی کھول کر داد شجاعت دی مگر دشمنوں کی کثرت نے میر باران اور اس کے بیٹوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ للّہ نے تلوار کے خوب جوہر دکھائے مگر دوران جنگ اس کی تلوار ٹوٹ گئی۔ وہ زخموں سے چور چور تھا کہ اس کے ایک وفادار غلام گلامو نے اپنے آقا کو بری طرح زخمی دیکھ کر میر للّہ کی گھوڑی پر چابک برسائے اور اسے میدان جنگ سے نکال کر اس کا رخ گھر کی سمت کیا للّہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ میر باران اور اس کے بیٹوں کی ہلاکت کی خبر آن کی آن میں گاؤں میں پھیل گئی اور للّہ کے زخمی بچ جانے کی خبر بھی آ چکی تھی۔ گھوڑی کا منہ جدھر اٹھا اسی طرف لے چلی۔ اپنے گھر کی بجائے للّہ کے بھائیوں کے ہاں پہنچی۔ وہ اسے اتار کر اپنے ہاں لے گئے اور زخموں کا علاج کرنے لگے للّہ کی بہادر اور غیور گراناز یہ سن کر ہوش وحواس کھو بیٹی کہ باپ اور بھائی تو عزت پر کٹ مرے مگر شریک حیات سے جیسی توقع تھی پوری نہ ہو سکی اور وہ اپنی جان بچا کر مارے شرم کے گھر آنے کی بجائے بھائیوں کی حویلی میں جا چھپا ہے۔ گراناز نے شدت غم اور شوہر کی مبینہ بزدلی کے صدمے سے شوہر کے لیے اشعار کی زبان میں سخت لفظوں میں پیغام بھیجتے ہوئے یہ بھی کہلایا کہ وہ (یعنی للّہ) آج سے قیامت تک میرے گہنوں کا بھائی جیسا ہوگا۔

گراناز کا پیغام: جہاں جنگوں کی نفسانفسی کا عالم ہو

بہادر اپنے دشمنوں سے نبرآزما ہوں
وہ بہادر لوگ حسیناؤں کو بھول جاتے ہیں
مگر تمہیں تو حسینوں کی محفلیں یاد آئیں
بڑے بوڑھوں کے تعمیر کردہ گھر یاد آئے
الہڑ دوشیزاؤں کی چھیڑ خانی میں محو رہے
اکثر وبیشتر میرے چاند سے چہرے میں کھوئے رہے
للّہ! تم ایسا کر کے
سانپ کی طرح میرے سینے پر لوٹے ہو
میں نے جسے زانوؤں کی پرورش دی
وہ للّہ اب میرے گہنوں کا بھائی ہوگا
قیامت کے دن تک....

گراناز کیے اس طنز وتشنیع کا سبب میدان جنگ میں پیش آنے والے بعد کے حالات سے بے خبری تھی چنانچہ وہ خاوند کی عیادت وخدمت کے لیے بھی نہیں گئی۔ میر للّہ نے پیش آمدہ تمام واقعات اشعار میں پرو کر جب گراناز تک پہنچائے تو گراناز کی آنکھیں کھلیں۔ اسے معلوم ہوا کہ میر للّہ نے جنگ میں نہ تو بزدلی دکھائی نہ ہی میدان جنگ سے پسپا ہو کر بھاگ نکلا تھا۔ مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی کہ گراناز کے منہ سے وہ قسم نکلی جو ان کی بیاہتا زندگی میں تشویش کا باعث بنی، یہی نہیں بلکہ جذبات میں بہہ کر میر للّہ نے بھی ایسی ہی قسم اٹھا رکھی تھی کہ:

للّا کا جواب: سن اے نوخیز مشکبو

آج تک میں نے کبھی سستی نہیں دکھائی
مرد اور بزدل اپنے عمل سے پہچانے جاتے ہیں ۔
مردانگی اور شجاعت جنگوں میں ہویدا ہے۔
بزدل اپنی گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں۔
تجھ سے گراناز لئی کے وہ تنے بھلے
سیلاب جنہیں دور سے بہا کر لاتا ہے۔
شیران کو لاد کر لاتے ہیں۔

بھائی انہیں کندھوں پر اٹھالاتے ہیں۔
یہ تنے رات بھر میرے زخموں کے ساتھ
سلگتے رہتے ہیں
اور ہر زخم چراغاں ہوتا ہے۔
اگر میں اس افتاد سے بچا
دشمن کے لیے جائے پناہ نہ ہوگی
میں نے من کی چادر سے داغ دھوڈالے ہیں۔
تو بھی گراناز میرے بھنگ کے پیالے کی بہن ٹھہری
روز قیامت تک...

للہ بالآخر زخموں سے جانبر ہوا۔ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اپنے دشمنوں پر برق بن کر چپکا اور انہیں نیست و نابود کردیا۔ اس نے اپنی چادر شجاعت سے الزام لگائے گئے بزدلی کے داغ دھوڈالے مگر دل پر جو داغ محبت کی ملامت سے لگے تھے وہ اور بھی ہرے ہوگئے کیونکہ گراناز نے اسے گہنوں کا بھائی کہلوایا تھا اور خود اس نے اپنی پیاری بیوی کو "بھنگ کے پیالے کی بہن" کہہ کر قسم ٹھہرائی تھی۔ تاہم یہ دنیا جہاں محبت بھرے دلوں کو جدا کرنے کے لیے مشہور ہے دلوں کی چارہ سازی میں بھی اسے ملکہ حاصل ہے۔ لوگوں سے گراناز کی وہ بے کسی نہیں دیکھی گئی کہ باپ اور بھائیوں کی دائمی مفارقت کے بعد شوہر بھی جیتے جی اس سے چھوٹ جائے۔ ادھر للہ بھی گراناز کے لیے اتنا ہی بے قرار تھا۔ علمائے دین سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے یہ رائے دی کہ اگر گراناز عمر بھر زیورات نہ پہنے اور میر للہ عمر بھر بھنگ کی طرف نہ پھٹکے تو دونوں میاں بیوی بن کر رہ سکتے ہیں اس طرح محبت بھرے یہ دو دل پھر سے قریب آ گئے اور زندگی بھر محبت سے معمور زندگی گزاری۔ للہ اور گراناز کی اس داستان کی متعدد نظمیں اب تک لوگوں کو یاد ہیں۔ ہم انہیں یہاں ترجمے کے طور درج کر رہے ہیں:

گراناز کا گلہ: سن لے اے للہ (جام معطر کے دلدادہ)
اس وقت تک مجھ کو تمہیں آزمانے کی نوبت نہیں آئی۔
للہ! تیرے عطر بیز گیسوؤں والے سب ساتھی
بہادر اور چیتے جیسی کمر والے جوان ہیں۔
کچھ عرصہ پہلے میں فخر کا اظہار کرتی تھی
اپنی پیاری سہیلیوں میں بیٹھ کر
کہ تیری شیرانہ موت کی خبر آئے گی۔

ان جوانوں کے نام کے ساتھ جو جنگ میں ہلاک ہوئے۔
تب میں اپنے گھر کی چاروں دیواروں پر ماتمی نشان لگاؤں گی
اور پیروں کے بوجھل کڑے نکال کر رکھدوں گی
کانوں کی زینت آویزے اور سونے کے زیورات
نوچ کر ماتمی روپ دھاروں گی۔
للہ! تیرے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ للہ جنگ کے
میدان سے بھاگ نکلا ہے۔
اس نے سارا زور گھوڑے کو ایڑ لگانے میں صرف کیا
اور چابک پر چابک برسائے
وہ میر باران کے گاؤں کی جانب نکلا
گاؤں کے جھونپڑے تو میر باران کی طرح چھوٹ گئے
ہر چند کہ تو میرے بھائیوں سے شریک نہیں رہا
میرے دونوں بھائی عمر جام کی شان والے تھے۔
وہ تیری آنکھوں کے سامنے جان سے گئے۔
خون ان کی گھنی مونچھوں اور داڑھی کو بھگوتا رہا
ان کے جسم زخموں سے چور تھے
جہاں جنگ اور خونریزی کی افراتفری ہوا کرتی ہے
بہادر اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں
وہاں حسین اور نازنین محبوبائیں یاد نہیں آتیں
جبکہ تمہیں حسینوں کی بزم کی یاد ستاتی رہی
بزرگوں کے بنائے ہوئے خوشگوار سائبانوں اور
نازنینوں کی مسکراہٹوں میں کھوئے رہے۔
خصوصاً میرے چاند سے چہرے اور رخشندہ آویزاں کی یاد
للہ آپ میرے سینے پر سانپ بن کر لوٹتے رہے
اب تو یہ سمجھ لو کہ میری گداز چھاتیوں کا دودھ پیا ہے۔
اور بیٹوں کی طرح میری گود میں پرورش پائی ہے
للہ اب تم میرے زیورات کے لیے بمنزلہ بھائی ہو۔
صور پھونکے جانے کے اور محشر کے دن تک
للہ کا جواب
سن لے اے حسن ناز عطر آگیں

اب تک میں نے کبھی بزدلی نہیں دکھائی
بہادر اور بزدل دیکھے بالے ہوتے ہیں۔
بہادروں کے جنگوں کے نشان نہیں مٹتے
جبکہ بزدل شرمسار منہ لئے ہوتے ہیں
اس لیے کہ وہ جان شیریں کی حفاظت کرتے ہیں
میں نے چاہا کہ تیرے دونوں شہزادوں کا دفاع کروں
مگر مجھ سے طاقتور مدمقابل ٹکرا گئے
پرانی دشمنی ان کی آنکھوں میں خون بن کر
اتری تھی
کثرت کے مقابلے میں کسی کے پیش نہیں جاتی
کثرت کی قوت بادشاہوں کو
ٹھیلوں پر تن تنہا کر دیتی ہے
تین چار چیزوں کا کچھ بھی اعتبار نہیں
عورت خوبصورتی میں حور شمائل کیوں نہ ہو
بہر حال اسے دولہا کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔
گھوڑا خواہ لاکھ کی قیمت کا ہو
کوئی نہ کوئی اس کی پیٹھ پر متمکن ہوگا۔
مرد بھی اگر فخر کا اظہار کرے بکواس ہے۔
اے باران کے گھرانے کی تتلی
یقین کر لے
محبت کی دولت، دل کا قرار
کلمتی لوگوں کے بھٹکی ہوئی کوئل
مجھ سے اور اس لشکر سے جس کے ساتھ میں تھا۔
جنگ آزمودہ مگسی آ کر ٹکرائے
سات مرتبہ مجھے گھوڑے سے پٹخ دیا
اور میں گھوڑے کے ریشمی ایال تھامے رہا
کتنی مرتبہ گھوڑے کی زین الٹ گئی
میرا کالا گھوڑا دشمنوں میں تیر تا رہا
سات ہتھیار سجا کر گیا تھا
جب ہوش آیا
تیغ آبدار کا ٹوٹا ہوا دستہ ہاتھ میں تھا
خراسان کی بنی ہوئی ڈھال ریزہ ریزہ ہوئی
سیستان کا بنا خود پارہ پارہ تھا۔
چودہ متحرک تیر میرے جسم میں پیوست تھے
تلواروں کے زخم ان پر مستزاد
میرے جسم میں زخموں کے باعث ناخن دھرنے کی جگہ نہ تھی
اس کے باوجود شکستہ قبضہ تلوار سے جنگ جاری رکھی
میں چاہتا تھا کہ ایک زوردار حملہ کروں
مگر نالائق (غلام) گامو نے باز رکھا
وہ دوستوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا
(بعد میں) بھائی مجھے اپنے گھر اٹھا کر لے گئے
ماں، بہنوں نے محبت اور تیمارداری میں جکڑ رکھا
خون اور پیپ کی اس طرح ندیاں بہتی رہیں
جیسے پہاڑی چشموں کا بہاؤ
خانہ زادوں نے یہ گندگی اپنے ہاتھوں سمیٹی
ساتویں دن ہوش آیا۔ گھوڑا ایک مہیب آواز سے گرا
جیسے کسی نے اسے چھت سے نیچے پٹخ دیا ہو
اپنے قوی مرکب کی اس حالت پر جگر خون رویا
یہ ہوئی میرے قوی الجثہ گھوڑے کی حالت
گراناز! تجھ سے تو درختوں کے تنے بھلے جنہیں دور دور سے سیلاب بہا لاتا ہے
لوگ انہیں سر اور کندھوں پر اٹھا لاتے ہیں
یہ تنے میری تکلیف میں رات رات بھر جلتے رہتے ہیں
اور چراغوں کی روشنی بنتے رہتے ہیں
ان تنوں کو ڈھونے سے میرے بھائی اسماعیل کے کندھے سوجے ہیں
گراناز مجھے تو یہ حسرت رہی کہ
تو میرے چادر کا پلو اٹھا کر میرے بائیں طرف آ کر بیٹھ جاتیں
تب تو پکار اٹھتی کہ دیوانے کیا ہوا ہے؟
کیوں للہ دیوانے تو نے خود کو شعلہ آتش کے حوالہ کر دیا ہے
اور ہاں، سن لے
میں اگر زندہ رہا اس افتاد سے نجات ملی

ایک بلوچی موسیقار نڑ بجانے کا مظاہرہ کر رہا ہے

تو دشمنوں کے لیے ہرگز ٹھنڈا پانی نہیں بنوں گا
گہرے کنوؤں میں پتھر گھل سکتے ہیں
مگر کینہ مردوں کے دل سے محو نہیں ہوتا۔
بلوچوں میں بدلہ تو دو سو سالوں تک نہیں بھولتا
سال بھر تک میں کمان کشائی کی مشق کروں گا
کیونکہ مجھے دشمنوں سے تیرے بھائیوں کے خون کا بدلہ لینا ہے
میں نے درہ مولا کی راہ روکی
بالآخر تیرے بھائیوں کا بدلہ لے کر اپنی برف جیسی چادر سے داغ دھوڈالے
گر ناز تو بھی روز محشر تک میرے بھنگ کے پیالے کی بہنا ہے۔

(سات ہتھیار۔ زمانہ قدیم کی جنگوں میں استعمال ہونے والے سات ہتھیار یہ ہیں)
۱) تلوار ۲) ڈھال ۳) خنجر ۴) نیزہ ۵) کمان ۶) ترکش ۷) خود)

عزت و مہرک:

عشق صد منصور کشت و حسن صد یوسف فروخت
بوالعجب ہنگامہا گرم است در بازار ما

بلوچی عشقیہ داستانوں میں عزت و مہرک کی داستان، حانی اور شئے مرید کی داستان کی طرح عوام میں بہت مقبول ہے۔ عزت اللہ جسے عرف عام میں عزت کہا گیا ہے، پنجگور کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا۔ ان کے کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر للہ کے اس قابل فخر بیٹے نے عربی، فارسی زبانوں کا (جیسے کہ ان ایام میں رواج تھا) درس بھی لیا ہوگا۔ خاندانی طور پر عزت اللہ سنار کے پیشے سے وابستہ رہے مگر جب عشق بتاں نے دل پر اثر کیا تو کام کا یہ آدمی بھی صرف شاعری تک محدود ہو کر رہ گیا البتہ سوز دل کا چارہ کرنے کے لیے بہت سے ملکوں اور علاقوں کی سیاحت کا ذکر ان کے کلام میں بھی ملتا ہے۔

"میں حق کا متلاشی ہوں۔ دین مصطفیٰ پر قائم ہوں
میں کہ عزت بن للہ ہوں۔ شئے مرید کی طرح آتش عشق میں جل رہا ہوں۔
کشکول و عصا لئے کابل کے فقرا کی طرح
گداگری کرتا ہوا ہر شہر گھوما مگر مہرک کو نہ پایا۔
پنجگور سے جیونی اور وہاں سے کابل اور غزنی، گنداوہ اور علاقہ مری
سرباز سے پیردان اور وہاں سے سیستان مگر مہرک نہ ملی"

یہ اشعار اس زمانے کے ہیں جب عزت اپنی محبوبہ مہرک کو کھو چکا تھا اور دردر گدائی کرتا ہوا ملک ملک گھومتا تھا تاکہ سوز دروں کم ہو جائے۔ عزت اللہ بلوچستان کے مشہور و معروف شاعر ملا فاضل کا ہمنشین اور چاکر و شاگرد تھا۔ ملا فاضل رند کا مسکن اگرچہ مند مکران میں پیشن کا قصبہ تھا مگر وہ ایران کی سیر و سیاحت کے دوران پیردان نامی شہر سے گزرا تو میر سامک نام کے ایک متمول گھرانے میں مہمان بنا۔ یہاں اس نے مہر خاتون دیکھی جس کے حُسن کا پورے علاقے میں چرچا تھا۔ ملا فاضل چونکہ عمر رسیدہ تھے اور چہرہ مہرہ بھی اس قابل نہ تھا کہ وہ مہر خاتون کے قرب کا آرزومند ہو وہ جب اپنے علاقے میں آیا تو مہر خاتون کی خوبصورتی پر اشعار موزوں کئے۔ یہ اشعار سن کر عزت اللہ سے آرام و قرار چھن گیا۔ وہ ایرانی بلوچستان کے شہر پیردان کو روانہ ہوا۔ وہ پیردان میں ایک تاجر کے بھیس میں وارد ہوا تاکہ وہ میر سامک کی اکلوتی بیٹی کا دیدار کر سکے جو اپنے چچازاد بھائی سے منسوب تھی۔ عزت مہر خاتون کے باپ کا مہمان بنا تاکہ مہر خاتون یعنی مہرک کو آسانی سے دیکھ سکے۔ جب اس کی یہ کوشش کامیاب ہوئی تو دونوں محبّ و محبوب باہم آشنا ہوئے۔ تب عزت نے مہرک کے رشتے کے لیے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے تو مہرک کے والد میر سامک نے اسے اہمیت نہیں دی مگر جب اصرار بڑھ گیا تو میر سامک نے عزت سے رشتہ ان شرائط پر قبول کیا کہ وہ جس قدر مال و متاع طلب کریگا، عزت کو فراہم کرنا ہوگا۔ کہتے ہیں میر سامک نے دس جوانسال غلام، اور کنیزیں، سو بھیڑیں، سات گائیں، پانچ ہزار نقدی، بہت سے جوڑے کپڑوں کے، زیورات اور شادی کا خرچ طلب کیا جسے عزت نے منظور کیا اور یہ مہلت مانگی کہ وہ اپنے علاقے میں پہنچ کر اس کا انتظام کرے گا۔ میر سامک نے اسے یہ مہلت دے دی، عزت پنجگور کو لوٹ کر آ گیا اور مال و اموال کی جمع آوری میں مصروف ہو گیا۔ داستانگو بتاتے ہیں کہ میر سامک کی نیت میں فتور تھا۔ وہ عزت کو دھوکا دیکر برباد کرنا چاہتا تھا مگر ہوا کچھ اور مہرک اپنی سہیلیوں کے ساتھ ندی پر بال دھونے گئی تھی۔ اسی اثنا میں ایک قافلہ پیردان آ رہا تھا۔ قافلہ جب قریب آیا تو ساری لڑکیاں چوکڑیاں بھرتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئیں۔ مہرک وہاں سے اٹھ نہ سکی کہ بال دھو رہی تھی۔ جب قافلے کے غیر مردوں کی آوازیں قریب ہوئیں۔ مہرک نے اپنے بال کھول کر چھوڑ دیئے جن کی وجہ سے وہ پوری طرح ڈھک کر رہ گئی۔ دور سے وہ بالوں کا ایک جھاڑ بن کر نظر آنے لگی۔ قافلے میں ایک شخص ایسا تھا کہ قریب آ کر اس جھاڑ میں خوبرو دوشیزہ کو تلاش کرنے لگا۔ جب اس نے مہرک کا چاند سا چہرہ دیکھا تو غیر شعوری طور پر اس کے منہ سے "واہ" کی آواز نکلی۔ اس کی نظر مہرک کو کھا گئی مہرک گھر پہنچی تو تیز بخار میں مبتلا ہوئی پھر چیچک نکل آئی، ہفتوں بیمار رہ کر چل بسی۔ اس کا والد سامک اس کے غم میں

دیوانہ ہو کر اس کی قبر کا مجاور بن بیٹھا۔

عزت اس افتاد سے بے خبر میر سامک کی طلب کردہ دولت جمع کر کے پیردان پہنچا۔ راستے میں وہ قبر نظر آئی جہاں مہرک دفن تھی اور اسکا باپ مجاور بنا بیٹھا تھا۔ صورتحال معلوم کر کے عزت پر گویا بجلی سی گری۔ اس نے اپنی تمام مال و متاع لٹا دی اور خود درویشی اختیار کر کے شہر شہر، قریہ قریہ گھوما۔ مہرک کی یاد میں عشق مجاز کی تڑپ نے اسے عرفان کی منزل سے آشنا کر دیا۔ پنجگور میں ادب نواز احباب نے عزت اللہ کی یاد میں "عزت اکیڈمی" قائم کر رکھی ہے۔ عزت کا کلام اس طرح دستیاب ہے۔

جھونپڑے کی نازک اندام پری
چاند سورج کی تمثال
میں تیری مدحت کرتا ہوں
کاش تو مجھے میزبانی کا شرف بخشے
میں دل و جان نثار کر دوں
اور تجھے آنکھوں پر بٹھالوں
شب رفتہ میں ہر چند محو خواب تھا
مگر خواب میں بھی دل بیدار تھا
میری جان اور میرا جگر جل رہا ہے
یہ دنیا تہس نہس ہو جائے
میں دوران خواب
اپنی مشکبو مہرک کا طلب گار ہوں
جی چاہتا ہے کہ اس کی خوشبو سے
مخمور رہوں
مجھے اپنی محبوبہ کی ناگہانی موت کا
بہت صدمہ ہے
اور یہ صدمہ مجھے محشر تک رہے گا
یہ جانتے ہوئے بھی کہ موت خدا کی
طرف سے مقرر ہے
میں ہر صبح درود اکبر کا ورد کرتا ہوں
میرا دل بلبل کی طرح مبتلائے فغاں ہے
خدا تعالی کی ستائش کے بعد
نعت رسول اکرم زبان پر ہے
چار یار کو سلام پیش کرتا ہوں
میرا دل بارہ امامین عالی مقام کی
یاد میں محو رہتا ہے
میں کہ ایک بندہ عاصی ہوں
شاید سلطان مجھ پر رحم کرے
میں نے دیکھا ہے کہ نیلی اندام
جو شمس کو بھی ماند کر دے
اور ستارہ صبح کے وجود کو بھی شرمائے
وہ خوشبوؤں سے اپنی زلفیں معطر کرنے والی
اور مشک و عود سے بالوں کو سنوارنے والی
اس دلربا کے دونوں ابروؤں کے نیچے
آنکھوں کے دو چراغ
وہ اپنی لطیف خرامی اور اداؤں سے
بازار ہند کے جلووں کو شرماتی ہے۔
وہ جو اپنی پوشاک کو کافور چین سے مزین کرتی ہے
یہ کفر کہلائے گا کہ مہر جان کی عشوہ گری کو
ایمان والوں کے لیے امیر غارت کہوں
جب بھی وہ ہار سنگھار کر کے نکلتی ہے
آہوئے تتار کی طرح مجھ سے رم خوردہ ہے
میں تو مست، مئے پرست ہوں
دلبر کو مجھ سے کیا غرض
تنگ دست ہوں اس لیے وہ مجھ سے دور رہتی ہے
گل اگر بلبل کے نصیب میں ہو تو
وہ شاہوں کی ہمسری نہ کرے
عزت بلبل کی طرح فغان برلب ہے
کامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے
وہی سب کچھ کر سکتا ہے
آؤ میرے عزیز دوستو
میرا دل ایک قصہ بیان کرتا ہے
روز میرا وجود مبتلائے غم ہے

خداوند کردگار سے فریاد کناں ہے۔

نعت رسول آخر زماں

آپ پر سود رود اور سو سلام

یہ خدا تعالی کی قدرت کاملہ ہے

خاک سے نور پیدا کرتا ہے

میں نے جس دن سے گل اندام کو دیکھا ہے

صبر و قرار کھو بیٹھا ہوں

میں ایک مجنوں کہ جس کا کوئی سرپرست نہیں

جب کہ مہرک خود کو لیلی کرتی ہے

میں ہوں فرہاد سرگشتہ

مہرک خود کو شیرین سمجھتی ہے

میں ہوں شئے مرید

مہرک حانی بنی ہوئی ہے۔

سیمک اور نتھا: سیمک اور نتھا کی داستان دل و جان سے چاہنے والے دو میاں بیوی کی داستان ہے۔ بی بی سیمک کا شوہر نتھا ایک قبائلی چپقلش میں کام آ جاتا ہے اور سیمک اس کی یاد کو زندگی بھر حرز جان بنا کر رکھتی ہے۔ اس میں غیر معمولی بات یہ ہے کہ سیمک کو نتھا کی جدائی کا یہ غم شاعرہ بنا دیتا ہے ہر چند کہ سیمک کا کلام سوائے ایک نظم کے دستیاب نہیں مگر اس کی یہ نظم بلوچی شاعری کی وہ شاہکار ہے جو رہتی دنیا تک سیمک اور نتھا کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔

سیمک اور نتھا کی داستان میں کوہ ماران کا ذکر ملتا ہے۔ یہ کہستانی سلسلہ قلات سے لے کر مکران تک پھیلا ہوا ہے۔ تاریخوں میں ایسے واقعات بہت ملتے ہیں کہ مشرقی بلوچستان کے مری، بگٹی قبائل کے لوگ مغربی پہاڑوں کی وادیوں میں بھی بستے رہے ہیں جیسے تفتان کی آتش فشاں پہاڑی یا کوہ بروہی وسطی وغیرہ۔ جہاں پانی اور چارہ ملا، وہاں مویشی بان اور چرواہوں نے گھر بسائے ہیں۔ اس کے باوجود اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا گھرانہ بلوچستان کے کوہ ماران کے کس سمت کس وادی میں بس رہا تھا۔ سیمک کی شاعری سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا شوہر نتھا کسی معرکے میں شہید ہوا۔ کب، کہاں اور کیوں؟ اس پر تاریخ خاموش ہے۔ نتھا کی موت سیمک کے جوانی کے دنوں میں واقع ہوئی۔ پاس پڑوس کی بڑی بوڑھیاں اسے دوسری شادی کی ترغیب دیتی رہیں مگر بی بی سیمک نے دوٹوک الفاظ میں ایسی ترغیبوں کو رد کرتے ہوئے اپنے عزم کا اظہار اس طرح کیا:

میری دانست میں نتھا کسی مہم پر گیا ہوا ہے۔

لوٹتے ہوئے میرے لئے چینٹ کے دوپٹے لیتا ہوا آئے گا۔

ہم نے اپنا گریباں مضبوطی سے رفو کر رکھا ہے

اسے موت کھول سکتی ہے یا پھر بہادر اور طرحدار نتھا

بی بی سیمک کی داستان کو بلوچی ثقافت نے ایک جزو کی طرح کیوں قبول کیا اس بارے میں میر شیر محمد مری نے دقت نظر سے تحقیق کی ہے۔ ہم نہایت شکریہ کے ساتھ ان کی اس تحقیق کو یہاں درج کرتے ہیں۔

"مرثیہ اور ماتم دونوں ہی غم، سوگ اور دکھ کا اظہار ہیں تاہم ماضی میں بلوچ معاشرت میں ذہنی اور عملی اعتبار سے اس میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ بہادر اور جیدار جوانوں نے بلوچی شاعری میں ایک سے زیادہ مواقع پر یہ دعائیں مانگی ہیں، اے خدا مجھے مرثیہ کی موت نصیب فرما اور بستر کی موت سے بچا۔ جو ماتم کا باعث بنتی ہے"۔

گویا مرثیہ کی موت وہ ہے جو جنگ و جدال میں جاں بحق ہونے والے سورما کے نصیب ہوتی ہے جبکہ ماتم اس مرنے والے کے لیے ہوتا ہے جو بستر کی موت مرا۔ اس لئے یہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ مرثیہ جنگوں میں ہلاک ہونے والوں کے لیے مروج رہا اور ماتم اپنی موت مر جانے والوں کا حصہ بنا۔ اگرچہ مرثیہ اور ماتم دونوں کا بلوچی ادب سے تعلق بنتا ہے۔ ذیل میں ہم اس کی تفصیلی وضاحت کریں گے۔

خوبصورت اور سجیلی داڑھیوں کے جوان جنہیں میدان جنگ میں آبدار تیغوں اور برستے تیروں کا لقمہ بننا پڑتا ہے اور خون میں نہائی ہوئی میت گھروں میں لائی جاتی ہے۔ خواتین جمع ہو کر سیندور سے مانگ بھر کر اپنی اوڑھنیوں کے پلو ایک دوسرے کے ساتھ باندھتیں ہیں اور میت کے اردگرد کونجوں کی طرح کرلاتی ہوئی مرثیہ پڑھتی ہیں۔ یہ تھا ماضی میں مرثیہ اور جب یہ خواتین میت کر گرد پھیرے لگاتیں اس کا نام تھا گردش مرثیہ۔

میر شیر محمد مری لکھتے ہیں "خود ہم نے شاذ دیکھا ہوگا یا پھر بچپن کی مسرتوں میں ایسی حالت کو بھلا ڈالا ہوگا۔ تاہم ہماری ایک سن رسیدہ ماں کی عمر کی بوڑھی ایسی مل گئی تھی جو مرثیہ خوانی میں عورتوں کی سرخیل رہ چکی تھی۔ ہم نے پوچھا ماں مرثیہ کی صورتحال کیا تھی؟ ماں کی سالخوردہ پیشانی پر شکنیں ابھریں اور چہرے کی جھریاں اور گہری ہو گئیں۔ ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ہاں بیٹے میں آپکو مرثیہ کی کیفیت بتاتی ہوں، یہ کیفیت کیا تھی۔ بی بی سیمک کے اشعار کی بازگشت جس انداز سے اس ماں نے یہ اشعار ادا کئے میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا اس لیے کہ یہ کیفیت تو ساز زندگی کی ٹوٹتی ہوئی

تان تھی۔ میں نے اس تعلق میں آج تک جتنے نغمے سنے ہوں گے وہ سب کے سب فریب ثابت ہوئے۔ یہ ساز ایک ہی صدا میں انسانی زندگی کے رموز و اسرار، تمدن، کلچر، تاریخ اور زمانے کو مجسم بنا رہا تھا۔ بول کے ساتھ کہیں کہیں ماں کا چہرہ اور اس کی جھریاں، نقوش اور خدوخال مدہم پڑ جاتے اور کہیں بہت نمایاں ہوتے.....

بوڑھی ماں خاموش ہوئیں مجھے یوں لگا جیسے ساز زندگی کے تار ایک جھنکار سے ٹوٹ گئے۔ زندگی نے ہچکی لی۔ ماں کی آواز نے مجھے خوابوں کی دھند سے نکال ڈالا۔ بیٹے یہ مرثیہ جو ترنم سے میں نے ابھی ادا کیا۔ معلوم ہے مجھ دکھیاری نے کب کہا تھا؟ یہ انگریزوں کے دور میں فتوحات کے دنوں کی بات ہے۔ ان دنوں کی جب آپ کے بہت سے اجداد جن میں میرا شوہر بھی شامل تھا۔ شہادت کے مرتبے کو پہنچے تھے۔ یہ میری زندگی کا آخری مرثیہ تھا۔ میں نے چاہا کہ ماں کے آنسوؤں کا میں بھی آنسو بہا کر ساتھ دوں، مگر بزدلوں کے لیے رونا بھی معیوب ہے۔ میں نے پوچھا، ماں یہ اشعار کس کے ہیں؟ ماں نے کہا بیٹا یہ اشعار اس کی بہن سیمک کے ہیں۔ آج وہ ماں زندہ نہیں کہ میں اسے ان اشعار کی حقیقت بتا سکتا اس لیے کہ مرثیوں کے بہت سارے مجموعے اپنے ساتھ لے کر مرنے والی ماں کی میت پر کسی نے بھی مرثیہ نہیں پڑھا ہوگا۔

دوسرا طریق ماتم ہے۔ یہ ان مرنوں والوں کے لیے متعین ہے جو اپنی عمر طبعی پوری کر کے کسی بیماری وغیرہ میں مر جاتے ہیں۔ اس میں بھی عورتیں روتی ہیں۔ موت کو کوستی ہیں مگر صدر اول کی موت کے رتبے کے نہیں۔ اس پس منظر کے ساتھ بی بی سیمک کے اشعار کی نہ صرف قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے جو اس نے اپنے شوہر کی بہادرانہ موت مرنے پر منظوم کئے بلکہ اس سے سیمک کے اشعار میں سموئے گئے جذبات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور شاعرہ کی تخیل کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(بلوچی کہنیں شاحری (قدیم بلوچی شاعری) تالیف میر شیر محمد مری ص ۱۸۴-۱۸۶)

دھند کی تہہ سے ایک سفید بدلی جھانک رہی ہے
کوہ ماران کی بلندیوں پر
یوں لگتا ہے کہ یہ ابر مصفا نتھا کی سفید دستار ہے
اور بوندوں کی دھار اس کے مشکبو گیسو
یہ اکا دکا بوندیں یوں لگتا ہے تمہارے ترکش کے تیر ہیں
یہ کڑکتی ہوئی بجلی تمہاری تیغ جوہر دار،
رعد کی گرج گویا نتھا کے بندوق کی گونج

☆

مون سون کے بادلو تم سے یہ عرض ہے۔
لانڈو کی گھاٹیوں کو جل تھل کرنا تمہارا فرض ہے،
کہ وہ شہدا کی زیارات سے معمور ہیں
اور تھوڑی دیر کے لئے موسلا دھار بوندیں برسیں
جن سے مشک کی خوشبو پھیل جائے۔

ہوسکتا ہے بادلوں کی اس گھن گرج سے دولہا جیسا سج دھج والا نتھا نکل آئے

☆

وہ نتھا جو تنگ و تاریک گور میں گھل کر رہ گیا ہے۔
میرے دوست تم وہاں اس عالم میں بھلے نہیں لگتے
قبر کی نمی اور شورہ نے تمہیں دبوچ رکھا ہے۔
ٹہنی جیسی بڑی بڑی مونچھیں گرد سے اٹی ہوئی ہیں
گرد تمہاری مونچھوں اور داڑھی میں بس چکی ہے۔
تمہارے مشکبو گیسو گرد آلود ہیں۔
(میں نے پوچھا بادلوں سے)
تم کس کی اشکبار آنکھوں کے آنسو ہو؟
اٹھتے ہوئے بادلوں نے جواب دیا
ہم تمہیں سیمک کی یادوں میں ڈبوتے ہیں
ہم نے ایک ویران اور حرماں نصیب عورت دیکھی
جو نتھا تمہارے لئے دیوانی ہو چکی ہے
اس کا رنگ راکھ جیسا ہو کر رہ گیا ہے۔

☆

نوجوان اپنی گھوڑیاں سجا کر
ہمارے جھونپڑی کی آس پاس دوڑاتے ہیں۔
وہ ہمیں چمکتے روپے دکھاتے ہیں۔
شکار کا سرخ پکا گوشت لاتے ہیں۔

☆

اور حرافہ بوڑھیاں مجھے ترغیب دیتی ہیں۔
"ان جوانوں سے کسی ایک کو منتخب کر لے"
آہ گاؤں کے سارے جوان میرے بھائی ہیں
بلکہ میرے والد کی طرح محترم

مجھے ایسا لگتا ہے کہ نتھا کسی مہم پر گیا ہے۔

لوٹتے ہوئے میرے لئے چینٹ کے دوپٹے لائے گا

ہائے افسوس اب میرا سر دوپٹوں کی زینت نہیں پائے گا

اور نہ ہی میرے پیروں کے لیے لہڑی کے رنگین جوتے ہوں گے۔

اب چاہے یہ آنکھیں سرمے کی سلائی کے لیے ترس جائیں

ہم نے اپنا گریباں مضبوطی سے رفو کیا ہے

اسے موت کھولے یا پھر سور مانتھا۔

شیرین اور دوستین: بلوچستان کی سابق ریاست قلات کا ایک علاقہ ہے جسے "نرمک" کہتے ہیں۔ یہ ناگاہو پہاڑ کے دامن میں ایک زرخیز وادی ہے۔ تاریخی اعتبار سے ماضی بعید میں جب رندوں نے جاموٹ قوم پر حملہ کر کے ان سے قلات چھین لیا تو اپنا ایک والی میر مندوست کو مقرر کر کے خود درہ بولان کی راہ سے سیوی (موجودہ سبی) پہنچ کر اپنی امارت کا اعلان کیا۔ یہ ایک عمومی سبب ہے کہ قبائل جب ایک جگہ سے نقل مکانی کرتے ہیں تو ان کی باقیات اپنی معاشی ضرورتوں کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ رندوں کے قلات سے سبی کی جانب نقل مکانی میں بھی چند ایک قبیلوں کے لوگ "نرمک" میں رہ گئے کہ اس کی زرخیز اراضیات میں انہیں اپنی گزراوقات کے وسائل نظر آئے۔ چنانچہ زراعت اور مویشی بانی کرنے والوں میں رند، لاشار، جت اور دوسرے قبیلے کے لوگوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی پیدا ہوئی۔ خان قلات میر نصیر خان نوری کے درباری ملک الشعراء جام درک نے اپنی ایک نظم میں دوستین شیرین کی داستان محبت کو یوں متعارف کرایا ہے۔

دوستین لاشاری قبیلے کا نوجوان تھا جس کے والد اسحاق لاشاری قبیلے میں اہم شخصیات تھے۔ ایسی ایک اور اہم شخصیت میر لال خان رند کی تھی جس کی بیٹی شیرین کی دوستین کے ساتھ منگنی ہوئی تھی۔

بلوچوں کی مجلسی زندگی میں خواہ وہ کسی قبیلے سے ہوں، اگر کوئی معزز اور محترم شخص ہے تو وہ ملک "میر" کہدہ کے لقب سے ملقب ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دوستین کو ملک کہا جاتا تھا جیسے کہ ذیل کے اشعار میں ملک دوستین کہا گیا ہے۔

اللہ ملک دوستین کو ہم سے ملادے جو بہادر اور باوقار ہے۔

دوستین اور شیرین کا مسکن ناگاہو پہاڑ کے دامن میں نرمک کی زرخیز اراضی میں واقع تھا۔ قبیلہ آسودہ حال، گزر بسر میں اطمینان و طمانیت تھی۔ کوئی کسی کا دست نگر نہ تھا۔ کوئی کسی سے کمتر و برتر نہ تھا۔ اس آزاد اور پرسکون زندگی کو اچانک ایک افتاد نے گھیر لیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں مغلوں کی حکومت تھی۔ ان کی افواج افغانستان، ایران اور قرب و جوار کے ملکوں کو آتی جاتی تھی۔ فوجوں کا ایک دستہ افغانستان کے شہر ہرات کو جاتے ہوئے نرمک کی وادی سے گزرا۔ اس دور میں افواج کی یہ بدنظمی تھی کہ وہ جہاں سے گزرتی وہاں کے لوگوں کے لیے مسائل و مشکلات پیدا کرتی تھی۔ جب مغلوں کی مغرور اور متکبر افواج نرمک کی وادی سے گذری تو لوگوں کے مال واملاک، عزت و ناموس پر دست درازی کے نتیجے میں بلوچوں اور فوجیوں میں جھڑپیں ہوئیں۔ بلوچ ہمیشہ مادر وطن پر جانیں نثار کرتے آئے ہیں۔ یہاں بھی بلوچ اپنی روایات کے مطابق وطن اور ناموس کے لیے ڈٹ گئے۔ منظم فوج اور عام لوگوں میں فرق تو ہوتا ہے مغلوں نے قتل و مقاتلے کے بعد جوانوں کو گرفتار کیا اور ہرات کی جانب چلائے۔ ان میں جری اور شجاع جوان ملک دوستین بھی تھا۔ قندہار کے راستے یہ فوج اصفہان اور پھر ہرات میں جا پہنچی۔ دوستین ہرات میں ایک متمول شخص کی تحویل میں چار سال تک رہا جس نے ملک دوستین کو اپنے اصطبل کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا۔ اس شخص نے دوستین سے یہ عہد و پیمان کرایا کہ بغیر مالک کی اجازت اور رضامندی کے دوستین اپنے علاقے کو چھپ کر نہیں جائے گا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ بلوچ عہد و پیمان پر جانیں قربان کرتے ہیں جب جنگ اور خون ریزی کی گرد بیٹھ گئی۔ قبیلے نے خود کو دوبارہ معاشرتی زندگی کے قابل بنایا تو میر لال خان کو یہ احساس بے قرار کرنے لگا کہ جوان بیٹی کو کب تک اس امید پر بٹھائے رکھے کہ اس کا منگیتر قید سے رہا ہو کر آئے گا۔ اس نے دوستین نام کے ایک اور جوان کا انتخاب کرنا چاہا تو یہ بات شیرین کے کانوں پڑی تو وہ بہت دکھی ہوئی۔ وہ ملک دوستین کو دل دے بیٹھی تھی۔ اسی اثنا میں ایک تاجر کا شہرہ ہوا جو اپنا مال بیچ باچ کر ہرات کو جا رہا تھا۔ شیرین نے ایک دردانگیز نظم موزوں کی اور تاجر کے ہاتھ ملک دوستین کے لیے ہرات بھجوایا۔ جس میں اپنی شادی کی تیاری اور محبت کی بربادی کا ذکر کیا گیا تھا۔ ملک دوستین نے یہ جواب بھجوایا:

گھنگور گھٹاؤ! جب تمہارا برستے ہوئے گزر ہو زرخیز نرمک کی وادی میں

ہماری محبوبہ کو ہمارا اسلام پہنچا دو

عہد و پیمان کو قرآن کی طرح سینے سے لگائے رکھو دل کی دھڑکنوں میں بسائے رکھو۔

خدا نے چاہا تو میں ضرور آؤں گا۔ میں موسم سرما کے آغاز میں پہنچ جاؤں گا۔

(شاید) مبارک عید کی صبح کو

داستان طراز اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ہرات میں مغلوں کا کوئی تہوار تھا، جوان گھڑ سواری کے لیے میدان میں نکل آئے۔ دوستین کے مالک نے بھی دوستین کو گھوڑے تیار کرنے اور میدان میں لانے کا حکم دیا۔ جب گھڑ سواری کے لیے

سوار تیار ہو کر اشارہ کے منتظر تھے تو دوستین کے مالک نے کہا: دوستین تم خود بھی ایک اچھے گھڑ سوار ہو۔ جاؤ مقابلے میں حصہ لو۔ دوستین نے پوچھا: جانے کی اجازت ہے؟ مالک نے تین مرتبہ دہرایا جاؤ جاؤ چلے جاؤ۔ دوستین نے یہ سن کر خود کو عہد و قرار سے بری الذمہ قرار دیا۔ گھوڑے پر بیٹھ کر ایڑ لگائی۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ شور و غل مچا۔ لینا، پکڑنا، جانے نہ پائے۔ کئی تیز رفتار گھوڑے اس کی تعاقب میں نکلے مگر ملک دوستین جیسے سوار کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔ ملک دوستین کہیں رکے بغیر نرمک کی وادی میں پہنچ گیا۔ جہاں اس کا گھر تھا۔ حسین اور دلربا محبوب منگیتر تھی۔ اس کے اپنے لوگ تھے۔ ابھی وہ گاؤں میں داخل نہیں ہوا تھا کہ ایک قریبی ندی میں ایک کمسن چرواہے کو دیکھا جو زور زور سے رو رہا تھا۔ دوستین گھوڑے سے اترا نہایت ملائمت سے پوچھا: بھئی کیوں رو رہے ہو۔ لڑکے نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا مگر چار سالوں کے تغیر کے باعث پہچان نہ سکا اور یوں جواب دیا: میرے بھائی کو عرصہ ہوا قیدی بنا کر لے گئے ہیں۔ آج اس کی منگیتر کی کسی اور سے شادی ہو رہی ہے۔ مجھے اس کا دکھ رلا رہا ہے۔ دوستین تو لڑکے کو پہچانتا تھا پوچھا۔ تمہارے بھائی کا کیا نام ہے؟ وہ بولا "دوستین" دوستین نے اپنے چھوٹے بھائی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ اب مت رونا خدا کریگا تمہارا بھائی آ جائے گا۔ اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لیے دوستین بستی میں داخل ہوا اور اس تقریب میں شریک ہوا جو شیرین کی شادی کی خوشی میں منعقد ہو رہی تھی۔ رندوں نے مہمان کو بٹھایا اور پوچھا تم کون ہو؟ دوستین نے جواب دیا۔ میں ایک مراثی ہوں۔ لوگوں نے کہا تب تو تمہیں گانا آتا ہے۔ دوستین بولا ضرور ساز جا کر لائیے میں گانا گاؤں گا۔ ساز وغیرہ لائے گئے۔ دوستین نے وہی نظم گائی جو اسے شیرین نے تاجر کے ذریعے بجھوائی تھی۔ دوستین کی آواز جب فضا میں بلند ہوئی تو حجلہ عروسی میں بیٹھی ہوئی شیرین نے سنی اور چیخ کر کہا یہ تو ملک دوستین کی آواز ہے۔ رندوں نے جب یہ سنا کہ ملک دوستین قید سے رہا ہو کر آیا ہے بہت خوش ہوئے۔ اس موقع پر شیرین سے بیاہ کرنے جو نوجوان آیا تھا۔ اس کا نام بھی دوستین تھا۔ اس نے عالی حوصلگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوستین سے لپٹ کر کہا: جو کچھ میں نے خرچ کیا وہ ایک بھائی کا دوسرے بھائی کے لیے نذرانہ ہے آپ کو آپ کی دلہن مبارک ہو۔ شیرین اور ملک دوستین جو محبّ و محبوب تھے ایک دوسرے کے بن گئے اور نرمک و جوہان کے علاقوں میں محبت کی انمٹ داستان چھوڑ گئے۔

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شیرین اور دوستین کے بارے میں جام درک کے اشعار:

زنگی میرا معتبر سر کردہ ہے۔ جام گہرام میرا دوست ہے۔
وہ جو چیتے جیسی گھوڑی کا مالک ہے۔ جس کے پہلو میں تیغ آبدار لٹکتی ہے۔
قسم ہے تیرے نورستہ خط کی، میری کالی گھوڑی ماتم میں ہے۔
کھیت کے مینڈھ کا پانی نہیں پیتی۔ سندھ کا گھاس اور بھوسہ نہیں کھاتی
اسے دشت کا راتب مرغوب ہے۔ ندی کا خوش خرام پانی
اور پٹوک نامی گاؤں کا گھاس
ایک شخص خراسان سے آیا ہے میلی کچیلی مگر مہکتی ہوئی چادر والا
رنگوں کے بار لئے، خورجین بھنگ سے لبریز
قندہار کا مشک اس پر مستزاد
اس شخص کے ساتھ رندوں کے نامہ و پیغام ہیں۔
خصوصاً شیرین کا بھیجا ہوا سلام
(وہ پیغام اس طرح ہے کہ) کونار میں گھٹائیں برسی ہیں۔
دامن دشت اور منگوچر سیراب ہوئے ہیں۔
سنّی کے زمینیں مہک رہی ہیں
ندیان لبالب بھری ہوئی ہے
(درچین-کلام جام درک ترجمہ میر مٹھا خان مری ص ۱۸۶-۱۹۴)
ندیوں کی روانی میں پہاڑی پستہ کے درخت لرز رہے ہیں
مالداروں نے کوچ کی تیاریاں کی ہیں۔
بھیڑ بکریوں کے مالک چل کھڑے ہوئے ہیں۔
اسحاق لاشاری کے بیٹے بھی
خواتین نے اونٹوں پر اسباب لاد رکھے ہیں۔
بھن کی چڑھائی اور ناگاہو پہاڑ پر
جوان اونٹ پیر جھکائے چڑھ رہے ہیں۔
اونٹوں پر غزال چشم حسینائیں بیٹھی ہیں۔
یہ منزل پر اترے، خیمے بلند کئے۔
ایک حسینہ مہین اور منقش چٹائی پر بیٹھی ہے۔
وہ قالین کا ایک کونا اٹھا کر دیکھتی ہے۔
نقرئی آئینہ اس کے گداز گود میں رکھا ہے۔
وہ اپنے حسن میں محو ہے۔
آنسو بہہ بہہ کر اس کے ہار کو بھگوتے ہیں

اس کا گریباں آنسوؤں سے تر ہے۔
پیاری سکھی سہیلیاں آتی ہیں۔ منتخب چوالیس جوان حسینائیں
آ کر پاس بیٹھ جاتی ہیں۔ اس کا گھونگھٹ اٹھاتی ہیں
وہ حال دل جاننا چاہتی ہیں
تمہارے ملبوس میں جڑے ہوئے شیشے کیوں ماند ہیں؟
کیوں تمہارے گہنے کھٹیالی میں پڑ کر رہ گئے ہیں؟
زلفیں کیوں گرد میں اٹی ہوئی ہیں۔
یہ کٹورے جیسی آنکھیں آنسوؤں سے کیوں لبریز ہیں۔
وہ رو کر عورتوں کو ایک طرف دھکیل دیتی ہے۔
"ہٹو اچھی بی بیو!"۔
اے بی بیو ہٹ کر دور بیٹھو
تمہاری بلا سے اگر میرے ملبوس کے شیشے ماند ہیں۔
اگر میرے گہنے کھٹیالی میں پڑ کر رہ گئے ہیں۔
تمہاری بلا سے اگر یہ زلفیں گرد آلود ہیں۔
وہ شخص جو میرا دوست اور دلخواہ تھا۔
ترکوں نے اسے ہرات سے پرے پہنچا دیا ہے۔
عظیم اصفہان میں بس کر
میری تقدیر نے اسے مار ہی تو ڈالا ہے"
رندوں کی عورتیں مل کر چہلیں کرتی ہیں۔
وہ سبزہ زاروں میں پھیل گئی ہیں۔
وہ کرگسوں کی طرح کرلاتی ہیں۔
خوشبودار مور کی بوٹی توڑ کر
لالہ وگلاب کی جستجو میں۔

☆

ان پھولوں سے کچھ وہ اپنے گریبان میں
ٹانک کر زینت بڑھاتی ہیں۔
کچھ سے گیسوؤں کو سجاتی ہیں
اور کچھ اپنے پیاروں کے لیے رکھیں گی
ان میں سے ایک شاید میرے لیے بھی ہو
وہ یہ پھول اس طرح توڑ کر رازداری سے رکھتی ہیں
کہ بدخواہوں کو بھنک نہ پڑے
وہ حسینہ اپنی سہیلیوں کو مخاطب کر کے کہتی ہے
خدا تعالی کے حضور دست دعا بلند کرو
اللہ ہم سے ملک دوستین کو ملا دے۔
وہ جو ہمارا پیارا ہے۔
یہ نہیں سابقہ ملک دوستین
جو گھوڑا دوڑاتا ہوا آ کر شیرین کو لے اڑے
اور ان دیکھی منزلوں پر لے جا کر پہنچا دے۔
خدا سے دعا کرو کہ ہمارے اچھے آقا سے ملا دے
اس سے ملا دے جو بہت دور بستا ہے۔
وہ اپنے ماں باپ سے آ کر مل جائے
اپنے پیارے بھائیوں کی بزم میں رونق افروز ہو
یہ سب کچھ ملک دوستین کا مقدر ہو
اور اسکو میرا دیدار نصیب ہو۔

شیرین کا پیغام: ویسے تو ہمارا کلاسیکی ادب ہر دور میں خود کو دہراتا ہے مگر دور حاضر میں مختلف علاقوں کے سہارے بلوچی ادب میں اس کا ڈھل جانا عصری اسباب وعلل کا قدرتی تقاضا ہے۔ جوں جوں احساسات میں شدت اور افکار میں تناؤ آتا ہے حانی شئے مرید، سسّی پنوں، جمل ماہ گنج اور شیرین دوستیں کے کردار استعاروں کی زبان میں نکھر کر سامنے آتے جائیں گے۔ شیرین کی اس پیغام نے جو اس نے اصفہان جانے والے سوداگر کے ذریعے ملک دوستین کو بھیجا تھا۔ بلوچی زبان کے نامور سخن گو میر گل خان نصیر کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے اس پورے واقعے کو ایک بار پھر بلوچی میں منظوم کیا اور حق یہ ہے کہ اس آتش بجاں شاعر نے شیرین و دوستیں کی داستان کو حیات نو بخشی۔ میر گل خان نصیر کا پرجوش لہجہ، وطن پرستی کے سچے جذبات، عظمت ماضی کی قدر نے ان کی اس تالیف کو شاہکار کا درجہ دیا ہے۔ اس منظوم داستان سے ایک نظم جو شیرین دوستین کے پیام کی مظہر ہے شکریہ کے ساتھ نقل کی جاتی ہے۔

شیرین کی حالت زار: (شیرین دوستیں تصنیف میر گل خان نصیر۔ منظوم اردو ترجمہ غوث بخش صابر ص ۱۳۲-۱۳۳)

دل ہے پرخوں، غموں کے تیروں سے
پوچھ لے درد کے اسیروں سے

شدت تشنگی میں خشک ہیں لب
زرد چہرہ بتائے دل کی طلب
قامت غمزدہ ہے جیسے کماں!!
دن کو آرام ہے نہ خواب شباں
نہ خور و خواب ہی کو جی چاہے
نہ ہی سکھیوں کی گفتگو بھائے
آس، راہوں پہ منتظر ہر آن
گرد کے بادلوں سے کب ہو عیاں
باد پارخش تیز اور طرار
پشت زیں پر وہ طرحدار سوار
وہ ملک دوستیں جواں ذیشاں
ہاتھ میں ہوگی تیز رو کی عنان
پاؤں راکب کے اور رکاب عقاب
دور بیں سے نظارہ گیر حجاب
ہر سو نگراں ہے جستجو میری
ناز و قامت کی آرزو میری
خیر مقدم میں جاں نثار کروں
دل غم دیدہ بڑھ کے پیار کروں

کیا اور صدو کی داستان: بلوچستان اونچے سنگلاخ پہاڑوں، وسیع و عریض وادیوں اور طویل ساحلوں کی سرزمین ہے۔ ان عوامل نے اس کی ثقافت پر بھی اپنے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں چونکہ کہساروں اور وادیوں اور ساحلوں پر بود و باش رکھنے والے شہروں سے دور بستے ہیں۔ ان کے مزاج، ان کے خیالات و جذبات میں ان بلند و بالا کہساروں اور حسین وادیوں۔ صحراؤں کا میلان کسی نہ کسی عنوان سے موجود ہوتا ہے۔ ان کا دل ان انہی شاداب وادیوں کی طرح وسیع اور ان کا سران کہستانوں کی طرح بلند اور ان کی معاشرت ان ساحلوں کی طرح ہمہ جہت ہوا کرتی ہے۔ اس ثقافت کا ایک پہلو تو ان عوامی داستانوں میں نمایاں ہے۔ یہ ہے مویشی بانی جو بلوچستان کی عظیم الشان کوہساروں کی عظمت اور وسیع و عریض وادیوں کا حسن ہے۔ بلوچ عوام کی شاعری ہو یا زندگی کا کوئی اور پہلو، وہ اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ وہ ان کوہساروں اور وادیوں، ساحلوں اور صحراؤں کی سختیاں جھیلتے ہیں اور اپنی معاشرت کے ذریعے ملک کے لیے بہترین وسائل مہیا کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ ببرک، رخشانی، ہرنائی ذات کی بھیڑیں ہوں کہ بھاگ ناڑی کے بیل، خاران کے خچر ہوں یا مکران کے اونٹ۔ انہی کہساروں کے پروردہ اور انہی صحراؤں کے رم خوردہ ہوتے ہیں اور ناچ کی وادی کوہ پب، اور ناگاہو سے گھری ہوئی ایسی دلکشا وادی ہے جو خضدار سے ایک جانب مکران کی راہوں کے سنگم پر واقع ہے تو دوسری طرف لسبیلہ کے تمام راستے یہیں آ کر ملتے ہیں۔ اس طرح یہ وادی بہت سے علاقوں کو ملانے کی ایک منزل ہے۔

جس زمانے کی یہ داستان ہے اس دور میں بلوچستان کی موجودہ سرزمین ایرانی بلوچستان ایک ہی ملک تھا جسے بعد میں انگریزوں نے اپنی مصلحت کے تابع بلوچستان کے حصے بخرے کر کے کیچ سے لے کر بندر عباس تک کا علاقہ ایران کے حوالے کر دیا۔ ہر چند کہ ایرانی بلوچستان میں بھی بلوچ آباد ہیں اور تاریخی، معاشرتی اور ثقافتی طور پر پاکستانی اور ایرانی بلوچستان میں کسی طرح کا بعد نہیں۔ داستان کا مرکزی کردار کیا اور صدو ہیں۔ کیا باہو کا رہنے والا تھا اور صدو اور ناچ کی رہنے والی۔ دونوں خاندانوں کی معیشت کا دارومدار مالداری پر تھا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا جب باہو کے علاقے میں شدید قحط پڑا جبکہ اور ناچ کے علاقے میں بارشوں سے کوہ و صحرا سبزہ سے لہکنے لگے۔ کیا اپنی بھیڑ بکریاں ہانکتا ہوا اور ناچ میں آیا اور ناچ میں صدو کے والدین کا اثاثہ بھی بھیڑ بکریاں تھیں جنہیں صدو لے جا کر چرایا کرتی تھی۔ کوہ و صحرا میں بھیڑ بکریاں چراتے ہوئے کیا اور صدو اکثر ملتے رہتے تھے۔

کیا ایک متمول مالدار ملک دوستین کا بیٹا تھا۔ ان کا آبائی قصبہ بلوچستان کا مشہور مقام باہو تھا۔ باہو کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں اعلیٰ نسل کے اونٹ ملتے ہیں۔ ایک بلوچ شاعر نے ایرانی بلوچستان کے ان علاقوں کا اس طرح سے تعارف کرایا ہے۔

ترجمہ: سرباز اپنے آم اور پھلوں کے لیے مشہور ہے۔
پاروت، اپنی باوقار حسین خواتین کے لیے
پیشن اپنی زردوزی میں شہرہ آفاق ہے۔
باہو اپنے اعلیٰ نسل کے اونٹوں کے لیے
تاہم کیچ کے چنار کا رتبہ ان سے بلند ہے۔

کیا ایک عرصے تک اور ناچ میں رہا اور صدو کے خاندان سے میل جول رہا جب صدو کے حسن کے علاوہ اس کی شرافت، عزت اور کردار سے مطمئن ہوا تب صدو کے رشتے کی بات پکی کرائی جو کیا اور صدو دونوں کے لیے مسرت کا باعث بنی۔ وقت گزرا، موسم بدلے۔ کیا کے علاقہ باہو میں بارشیں برسیں۔ قحط سالی ختم

ہوگئی۔ کیا اپنے مال مویشی ہانک کر دوبارہ باہو کو ہولیا۔ صدو کے والدین سے جلد آ کر شادی کرنے کا عہد و پیمان کیا۔ قبائلی زندگی میں طرح طرح کی لغزشیں، بندشیں اور امتحان تو ہوتے ہی ہیں صدو کے والدین انتظار کرتے رہے مگر کیا نے آنے میں خاصی دیر لگائی۔ صدو کے والدین نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ صدو کا رشتہ کہیں اور کریں کہ کنوار کا طویل عرصہ تک بٹھانا بلوچی معاشرت میں مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ صدو نے جب یہ باتیں اور ارادے سنے۔ اسے پریشانی ہوئی اس نے ایک پالتو کبوتر کو بر پردہ قاصد بنا کر یہ نظم کیا کے لیے بھجوائی:

بلوچی نظم کا ترجمہ:

صدو کا پیغام: شب گزشتہ جب میں محو خواب تھی۔

خواب میں دل بیدار کو یہ بشارت ملی

(کہ) اُٹھ اے صدو نازوں پلی

نازوں پلی اور شان والی

اٹھ دیکھ کیا آ گیا ہے۔

میں نیند سے آنکھیں مَلتی جاگ اٹھی

اندھیرے میری آنکھوں میں رقصاں تھے،

طبیعت اور افسردہ ہوگئی۔

☆

"اے طائر خوش رنگ و منقش

تو یہاں بیٹھے کیا کر رہا ہے۔

دانہ دنکا چن رہا ہے۔

گھاس میں چھپے دانوں سے ترا کیا گزراں ہوگا

یہ دانے تو چیونٹی کے سر جتنے ہیں۔

اے طائر خوش رنگ و منقش

آ جا، میں تجھے عنبر صفت دانے کھلاؤں

اپنی اوڑھنی کے پلو میں چھپا کر

چاندی جیسے برتنوں میں پانی پلاؤں۔

تیری نشست کے لیے میرے کندھے حاضر ہیں۔

میری زلفیں تجھے سایہ کریں گی۔

میں تجھے اپنی گود میں کھلاؤں۔

جب تجھے پرواز کا شوق چرائے

کوکو کر کے مجھے باخبر کرنا

میں گاؤں کے سنار سے تیری چونچ سنہری کراؤنگی

تیرے پروں میں نقش نگار کراؤں گی۔

پھر تو بیلہ کے چمنستان سے اڑ کر

میری آرزوؤں کے شہر باہو کا سفر کر

ایک ندی راستے میں آئیگی اس کا پانی زمزم ہے۔

ایک درخت ملے گا جس کے چوڑے پتے ہیں۔

اونٹوں کا گلہ نظر آئے گا

اور باہو کا قلعہ

جس کے قریب معززین جمع ہو کر مشاورت کرتے ہیں۔

تو کوکو کر کے کیا کے دستار پر بیٹھ جا

اور اسے ایک طرف لے جا کر میرا پیغام دے۔

☆

کیا کی شناخت یہ ہے

وہ ایک جامہ زیب جوان ہے۔

کمر بند نے کمر پتلی بنا دی ہے

کندھے پر ڈھال ہوگی

کیا سے مل کر کہنا

تم نے تو ہمیں بالکل بھلا دیا

آنے کا وعدہ کر کے آتے کیوں نہیں

شادی کے لیے پھلی ہوئی بھیڑیں بوڑھی ہو چکی ہیں۔

پسے ہوئے آٹے میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔

لکڑیوں کو دیمک لگ گیا ہے۔

رقص کرنے والے رقاص مر کھپ گئے۔ منگیتر کے دانت جھڑ گئے۔

فوراً آ جاؤ ورنہ تمہاری جگہ کوئی دوسرا لینے کو ہے۔

کہیں تم نے وہاں محبت تو نہیں کی ہے۔

اگر ایسا ہے تمہاری محبوبہ مر جائے

اس کی ماں کو تیز بخار آئے

مگر تمہیں، تمہارے اکیلے سر کو کوئی تکلیف نہ ملے

(کیونکہ) اس کا نقصان خود میرا نقصان ہے۔

☆

کیّا کا جواب: اے چہکنے والے خوبصورت پرندے

اے کبوتر کہ تیری گردن گھوڑی جیسی ہے

نہایت عجلت سے میری کیفیت لے جا کر

دردانہ صدو تک پہنچا دے۔

اونٹوں کے گلے سے میں نے "شلنگ" منگوائی ہے۔

جو کنر دان کی معطر وادی میں چرتا ہے۔

اسے نرم زمین پر بٹھا کر نہلایا ہے۔

چاندی جیسی چمکدار نکیل ناک میں ڈالی ہے۔

پھولوں سے مزین مہار ڈال کر

حسین دوشیزاؤں نے جھول ڈالی ہے۔

میں اپنی تیز رفتار اونٹنی پر بیٹھا

باہو کی جھیل کے قریب سے گزرا

انکاڑہ کی نہر کے پاس پاس

کوہ مہدی کی بائیں طرف سے

کارواڑ کی طویل مسافت طے کی

شداد کی سنگلاخ راہ سے

کپر پہنچا جو تفریح کی حسین بندرگاہ ہے۔

گرانی کا ہرا بھرا کھیر کا درخت

خوب ہرا مگر پھلوں سے

میری طرح محروم اور تنہا

اب میں دولت کی گنجا باد پسنی میں آیا

مجھے اونگھ سی آئی

جب آنکھ کھلی تو بل کے چھتناروں

سے گزر رہا تھا

ہائے بسول کی معصوم ہوا

فرہاد کی کریدی ہوئی پہاڑی پر پہنچا

تو میرے حریف کی شادی کے نقاروں کی صدا سنی

میں چھپتا چھپتا ہوا داخل خانہ ہوا

صدو کو نیند سے جگایا

ارے کیّا! وعدوں سے منحرف کیّا!

یہ کیسا اچانک نزول ہے۔

اگر آنے کا ارادہ کیا تھا تو

مجھے پہلے سے خبر بھجواتے

میں میمن کی دکان سے تیس روپوں کا

عطر و خوشبو خرید کر خود پر چھڑکتی

کچھ سہیلیوں میں بانٹتی"

"بھئی تم معمولی تیل سے بھی میرے لئے نعمت ہو

اب کیا بلکہ محشر تک"

میں اور صدو دونوں اونٹنی پر بیٹھے

مخالفین نے راہ روکی تھی،

میں نے اونٹنی کو ایک زوردار کوڑا مارا

وہ اچھلتے جھولتے ہوئے سوئے منزل چلی

باہو سے لے کر بیلہ تک کی حسین دھرتی

میرے راکب کی دوہری راہ ہے۔

مست توکلی اور سمو: بلوچستان کے مشرق میں کوہ سلیمان کا طویل و عریض سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اس کوہستان کے جنوب مشرق میں بلوچوں کا بہادر اور شمشیر زن قبیلہ مری آباد ہے۔ جسے انتظامی طور پر "مری ایجنسی" (اب یہ ضلع ہے) کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے شمال میں لورالائی، جنوب میں ڈیرہ بگٹی، مغرب میں سبی اور مشرق میں ڈیرہ غازی خان واقع ہیں۔ ڈیرہ غازی خان جسے بلوچوں نے بسایا تھا آج بھی یہاں بلوچوں کی تعداد اکثریت میں ہے۔ قبیلہ مری عام طور پر چار اہم شاخوں میں منقسم ہے۔ یہ شاخیں آگے جا کر پاڑوں اور پلیوں میں بٹ جاتی ہیں۔ چار اہم شاخیں یہ ہیں:

۱) گزینی ۲) لوہارانی ۳) مزارانی ۴) بجارانی۔

مگر ہم یہاں اس ہستی کو متعارف کرا رہے ہیں۔ جسے ان انتظامی اور سماجی بندھنوں سے واسطہ نہیں۔ وہ سراپا عشق شخصیت مست توکلی کی ہے کہ عشق کے عرفان نے اسے قبائلی تنگنائے سے نکال کر انسانیت کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ لوہانی قبیلے کے محمدانی درکانی صف میں مست توکلی کی ولادت ۱۸۳۱ء میں لال خان

کے ہاں "مانڑک بند" نام کے گاؤں میں ہوئی۔ آپ کا نام چھٹی کی رات سہراب خان رکھا گیا تھا۔ لیکن سردار گھرانے میں ایک بزرگ کا نام سہراب خان تھا اس لیے ازراہ ادب واحترام بدل کر توکلی رکھا گیا۔ سمو سے محبت کی جذب ومستی میں ان کے نام سے "مست" کا لاحقہ لگ کر "مست توکلی" ہوا۔

مست توکلی ایک ناخواندہ دیہاتی تھے۔ بلوغت کو پہنچے تو کسب معاش دوسرے افراد کی طرح ریوڑ ہانکنا ہوا۔ ریوڑ کے ساتھ مست توکلی کبھی "بیہو" میں بھٹکتے کبھی "جانداراں" کی گھاٹیوں میں تو کبھی "بھنٹڑ" کی چراگاہ میں۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں ان کہساروں اور وادیوں کا نام کثرت سے ملتا ہے حتی کہ ایک ایسے ہی پہاڑی مقام پر اس نے دل پر لافانی عشق کے تیر کھائے۔ اپنی اس پاک محبت کے بارے میں مست توکلی خود حوالہ دیتے ہیں۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ
کوہ درابھانی پر موسلا دھار بارش آئی
رعد کی گرج چمک اور بادلوں کی گرگڑاہٹ
میں بارش سے بچنے کے لیے ایک اوٹ کی
تلاش میں۔
دور ایک بستی کے چند گھر نظر آئے
سوچا چلو اس خیمے کی طرف جہاں حوروں کا مسکن ہے
ہتھیار بھی بھیگنے سے محفوظ ہوسکیں گے
بادل لہرا لہرا کر رقص کر رہے تھے
(وہاں پہنچا تو دیکھا) طوفان بادوباراں سے
خیمے کی طنابیں اکھڑ اکھڑ رہی تھیں
ہوا اور تیز بوندوں نے اس کی اوڑھنی اڑائی
سینے کے "پھولوں" نے روح میں ہلچل مچادی
میری آنکھوں نے یہ نظارہ دیکھا
جیسے نرگس بہم ٹکرائیں
چہرہ دئے کی طرح روشن اور تابناک
زلفیں کالے ناگ کی طرح کنڈلی مارے
میرا دل اسی روز سے جنوں آشنا ہوا
ہر چیز سے بیزار صرف اس کی مدہوشی میں

(مست توکلی مرتب غوث بخش صابر ص ۲۶-۳۱)

ان اشعار میں مست توکلی ایک واقعہ بیان کر رہا ہے کہ "کوہ درابھانی پر گہرے بادل گھر گھر کر آرہے تھے۔ تند و تیز ہوا کے تھپیڑوں سے شکار کا شائق توکلی گھر کر رہ گیا تھا۔ وہ بارش سے بچنے کے لیے پناہ گاہ کی تلاش میں قرب و جوار کا جائزہ لے رہا تھا۔ دور ایک بلوچی خیمہ نظر آیا۔ توکلی اس خیمے کی جانب روانہ ہوا۔ خیمے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ بادوباراں سے خیمہ زمین بوس ہونے کو ہے۔ بلوچی جفاکش زندگی کا یہ بھی ایک رخ ہے کہ ایسے مشکل حالات میں مرد اپنے گھروں میں معاشی مجبوریوں کے باعث غیر حاضر ہوتے ہیں۔ خیمے میں صرف خاتون خانہ سمو تھی اور خیمے کو گرنے سے بچانے کے لیے وہ خیمے کی لکڑیوں کو تھامے ہوئے تھی۔ اس جدو جہد کے دوران سمو کی اوڑھنی ہوا اڑا کر دور لے گئی۔ توکلی پر سمو کی قامت نے قیامت ڈھادی۔ دو نین نرگسی نینوں سے ملے۔ دو بے قرار آنکھوں نے اس چہرے کا نظارہ کیا جو دیئے کی طرح روشن و تاباں تھا۔ ناگن جیسی زلف لہرائی، سینے کے پھولوں نے مست توکلی کی روح میں ہلچل مچادی۔ اس کے جنوں آشنا دل نے سمو کی محبت کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ یہ تھی سمو سے مست توکلی کی پہلی ملاقات اور توکلی کے مجازی محبت کا پہلا زینہ جس نے رفتہ رفتہ سمو کو الوہیت کا درجہ دیا۔ مجاز کی سیڑھی سے وہ عرفان کے درجہ رفیع پر متمکن ہوا اور توکلی کے نام کے ساتھ "مست" کا لاحقہ لاگو ہوا۔

بلوچی معاشرت میں کسی عورت سے تعلق کا اظہار اور وہ بھی شاعری میں جو آناً فاناً پورے ملک اور پورے معاشرت میں پھیل جائے سمو کے خاندان اور سسرال کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ پہلے سردار سے شکایت کی گئی۔ سردار نے مست توکلی اور سمو کو ایک دوسرے کے سامنے لاکر یہ ثابت کیا کہ مست توکلی کسی عورت کا عاشق نہیں بلکہ سمو ایک تشبیہ یا استعارے کا نام ہے اس لیے کہ مست توکلی سمو کو دیکھتے ہی ایک چیخ مار کر بیہوش ہوگیا۔ اس کے بعد پھر وئی قبیلہ نے گدا نام کے اس شخص سے در پردہ طے کیا کہ مست توکلی کو سمو کے دید کا چکمہ دے کر پہاڑ کی بلندی پر لے جاکر وہاں سے دھکیل دیا جائے۔ گدا نے یہ حربہ استعمال کیا۔ مست کو لے کر پہاڑ کی اونچی چوٹی پر لے جاکر دھکیل دیا۔ مست توکلی کاغذ کے پرزے کی طرح اڑتا ہوا زمین پر پہنچا۔ اسے کسی طرح کا خراش تک نہیں آیا۔ ایک اور حلقے نے امتحان کی غرض سے ایک آبرو باختہ عورت موران سے ساز باز کر کے اسے تنہا مست توکلی کی خواب گاہ میں پہنچادیا۔ بعد میں اس عورت نے حلفیہ بیان دیا کہ مست نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ مست توکلی نے اس واقعے کا اپنے کلام میں اس طرح سے ذکر کیا ہے۔

منزل مقصود پر پہنچنے کی غرض سے ایک راہ پر ہولئے
کچھی کے ایک آباد شہر سے گزرا

جی میں آیا کہ ڈیرہ کے بازار کی سیر کی جائے
طوائفوں میں موران کی بڑی شہرت ہے،
وہ چودھویں کے چاند کی طرح نمودار ہوئی
مون سون کے بادلوں کی طرح رقصاں آئی
زلفیں خوشبو میں بسائے ہوئے
عطر اور کستوری سے مہکتی ہوئی
اپنے حسین سراپے کے ساتھ آ کر کہتی ہے
میں تمہاری ہوں صرف تمہاری اور کسی کی نہیں
محبت خدا کی دین ہے جو اس کی بارگاہ سے مرحمت ہوتی ہے
ڈیرہ کی ایسی آبرو باختہ عورتوں کے وصل کے لیے
میں سمو سے کیا ہوا عہد نہیں توڑوں گا۔

سمو کی محبت میں توکلی سندھ کے صحرا میں، کچھی اور ڈیرہ غازی خان میں مارا مارا پھرتا رہا۔ حضرت لعل شہبازؒ اور حضرت سخی سرورؒ سے عقیدت اور عارفان صادق سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ ان بزرگ ہستیوں کا انتہائی محبت اور ادب سے اپنے کلام میں ذکر کرتے ہیں:

اب میں لڑکھڑا نہیں سکتا کہ عشاق باصفا نے مجھے تھام رکھا ہے۔
درک کرمو (جام درک) اور شئے مرید نے راہ سجھائی ہے۔
پیر سہریؒ اور لعل شہباز نے کرامت عطا کی ہے۔
ملتان کے سارے بزرگ تمام کے تمام
حضرت بہاؤالحقؒ میری مدد پر ہیں۔

تصوف کے بارے میں مست توکلی کی سوچ اور دانش ان افکار عقیدت
وایقان سے مالا مال ہیں
ہم نے اپنے پیر زینوں میں مضبوط رکھ لئے ہیں۔
ہاتھوں سے وہ طلائی گہنے پکڑ رکھے ہیں۔
ضامن ہمیشہ اسے بنانا چاہیے جس کی ضمانت راسخ ویقینی ہو۔
یار وہی وفا شعار ہے جو پائیدار اور دائمی ہو
جو حیدری اقوال سے باخبر ہو
جس کا پلڑا سونے سے بھاری ہو رہا ہو

مست توکلی کے چھ بھائی تھے۔ ماسوائے ایک کے سب قبائلی جنگوں میں کام آئے۔ خود مست توکلی کو قبیلہ مری بگٹی کے درمیان ایک معرکے میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا مگر وہ خونریزی سے یہ کہہ کر ہاتھ کھینچ آیا کہ:

"جنگ اور خون ریزی کی گفتگو ایک بری زبان ہے۔ کون اپنے پیاروں کو برباد کرنا چاہے گا۔"

مست توکلی کا ایک بھائی "پیرک" جنگ میں کام آنے سے بچ رہا۔ اس نے اپنی محبوب بیوی کی ناگہانی وفات کے صدمے سے محبت کے مارے خودکشی کی۔ وہ سرنگ بجانے کا بہت ماہر تھا۔ مست توکلی کہتا ہے:

تیرے ہاتھ کے سروندے کو میں پہاڑ کی چوٹی پر رکھوں گا
ملائک اسے بجائیں اور طیور رقص کریں

مست توکلی کو عام طور پر بلوچستان کے عوام ایک پاک طینت صوفی اور بزرگ سمجھتے ہیں۔ آپ کی بزرگی پر دوسری باتوں کے علاوہ آپکا کلام دلالت کرتا ہے۔ اس میں تصوف کے اسرار و رموز پنہاں ہیں۔ مست توکلی ہر چند کہ سمو کی محبت میں اس قدر غرق ہے کہ اسے ہر چیز میں سمو کا جلوہ نظر آتا ہے مگر شریعت اور طریقت سے بیگانہ نہیں تھے۔ وہ کئی کئی ہفتے پہاڑوں میں، غاروں میں عبادت ریاضت اور چلہ کشی میں مشغول رہتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام اور بزرگان دین کے مراتب سے آگاہ تھے۔ توحید کا اس طرح ذکر کیا ہے:

"وحدت اور یکتائی خدا تعالیٰ کی ذات کو زیبا ہے۔
وہ ایک ایسا بادشاہ ہے جو پاک ہے اظہار قہر
پر آئے تو اس کی سطوت بے پناہ ہے۔
رحمتوں پر مائل ہو تو نہایت رحم والا اور مہربان ہے۔
میں ہر گھڑی خدائے ستار کے نام کا ورد کرتا ہوں۔
حضرت محمدؐ کا نام یاد ہے معہ مرشد اور بزرگوں کے "

سمو کی موت کے بعد توکلی بیس سال تک زندہ رہے۔ وہ قدرت الٰہی کی حکمت اور کارگزاریوں سے اختلاف نہیں کرتے تھے مست جیسا عاشق صادق جس کی ساری کائنات سمو تھی جب سمو کی وفات کے بعد اس کی قبر پر فاتحہ کرنے آئے تو ان کے کلام سے یہ بات پوری طرح واضح ہوئی کہ وہ عزیز وحکیم رب کی جوڑی ہوئی تقدیر پر قائل وشاکر ہیں۔ ان کے منہ سے جو پہلا کلمہ نکلتا ہے وہ ہے "کل نفس ذائقہ الموت" جس خوبصورت انداز سے انہوں نے اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انسان کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ ناخواندہ شخص تھے۔

پرسوں تھدڑی پہاڑ کی جانب میرا گزر ہوا
جہاں سمو کے خیمے کی باقیات بکھری ہوئی تھیں۔
موت برحق ہے میں اس پر دکھی نہیں

میں نے پتھروں سے استفسار کیا
پتھر کیا جواب دینگے ان کی زبان کہاں ہے
پتھر اپنے مالکن کی عدم موجودگی میں کیا بول سکتے ہیں؟
سمو تیرا غم بیٹوں کے غم کی طرح جان لیوا ہے

-سمو-

سمو کیا ہے؟
میرا محبوب کوہ جاندران پر اگے ہوئے لیموں کا پیڑ
وہ دشوار گزار گھاٹیوں میں چٹانوں کے سائے
میں نشو ونما پاتا رہا
وہ ابر بہار کے خدوخال لئے ہوئے
ہوا کا لہراتا ہوا خوشگوار جھونکا ہے۔
اس کے پتے محبوب کے چہرے کی طرح طلائی ہیں۔
محبوب نزہت گاہ شاہی میں کھلا ہوا پھول ہے
کجاوے لدھے ہوئے اونٹوں کی قطاریں
حسینوں کو لئے رواں ہیں
ان پر شہزادیاں رنگارنگ ملبوس اور گہنوں
سے لدی بیٹھی ہیں
میرا دل ان تہہ بہ تہہ زلفوں میں اسیر نہیں
یہ خرام صرف سمو جیسی کبوتری کا حصہ ہے
جس کی گیسوؤں کی خوشبو لونگ اور عطر
اے سبز پرندے! قاصد بن کر جا
محبوب کی پہچان یہ ہے۔
آنکھوں میں سرخ ڈورے
ستواں ناک سمو کے چہرے کا حسن
اس کونج کے گلے میں
تہرے تعویذ ہیں
اے پرندے! وہاں جا
جہاں چاندنی دھند میں مستور ہے
اس محبوب کی دلنواز یادیں ہوا کے
جھونکوں کی طرح دلفریب ہیں
سمو میرا ایک لعل درخشاں ہے
جس کے انگ انگ میں کوئی عیب نہیں
صانع قدرت نے اسے موزوں اور متناسب بنایا ہے
خم و پیچ کاریگر نے تیشہ حکمت سے درست کئے ہیں
میری محبوبہ قوس قزح کی طرح بادلوں سے جھانکتی ہے
یا وہ چودھویں کا چاند ہے کوہسار کی پشت سے طلوع ہو کر
آسمان پر چھا جاتا ہے اور ہر طرف چاندنی پھیل جاتی ہے

☆

سمو کوہ زین کے پیپل کا ایک درخت ہے
سمو درختوں کا میوہ نورس ہے
سمو ایک شیشہ ہے مئے ناب کا
سمو سنگلاخ چٹانوں کی ایک ہرنی ہے۔
سمو انار کا گل سرخ ہے۔
سمو تاریکیوں میں دیا ہے۔

☆

سمو حوروں کے جھرمٹ میں
طوبیٰ کے سائے تلے جلوہ افروز ہے۔
نور کے پیالوں میں آب کوثر پی رہی ہے
اور نور کا ایک پیالہ مست کے لیے جدا رکھا ہوا ہے۔

☆

سندھ سے کونجوں کی واپسی کا موسم ہے۔
کونجوں کی کرلاہٹ گونج رہی ہے
لیکن یہ میٹھے بول ہمارے درد دل کا علاج نہیں
ہمارے غم کا علاج تو سمو کی شیرین مسکراہٹ ہے۔
کونجیں لوٹ رہی ہیں میں بھی اب لوٹتا ہوں
کونجوں کی قطار میں میں بھی شامل ہو گیا
کونجیں محو پرواز اور میں پا پیادہ
کونجیں خراساں کو جائیں گی میں سیوی میں ٹھہروں گا
کیونکہ میرا دل سمو سے ملنے کے لیے بے قرار ہے۔

☆

رات میں نے سمو کو شاداں وفرحاں دیکھا
دلہن کی طرح حسین لباس میں ملبوس
سرمے کی ہزاروں اقسام سے آنکھیں سنوارے
اس کے نقوش قدم سے لال تاخ کی خوشبو پھوٹ رہی ہے۔
(اس نے کہا) دیوانے اٹھ کر آ جا
یہ سر یر رخ زیبا اور پرنور آنکھیں تجھ پر نثار کروں گا۔

حمل جیئند کلمتی: حمل جیئند بلوچستان کی ایک قابل فخر شخصیت گزری ہے جس میں وہ تمام اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے جو کسی بھی شخص کو قومی ہیرو کا مقام بخشتے ہیں۔ حمل کی دلیری اور بے خوفی اس کی وطن سے محبت، قوم پرستی، آزادی کی قدر و منزلت اور حسن سیرت کے ساتھ حسن وصورت وباذوقی آج تک بلوچستان میں ضرب المثل ہے۔

میر حمل، سردار جیئند خان ہوت کا بیٹا تھا۔ ہوت بلوچوں کا معروف قبیلہ ہے مورخین اور محققین ہوت قبیلے کو سردار جلال خان رند کی مکران آمد سے بہت پہلے کا بتاتے ہیں۔ سردار جلال خان چودھویں پندرھویں صدی میں مکران آئے جبکہ جام عالی جو پنوں کے والد تھے، مکران پر گیارہویں صدی میں حکمران تھے۔ ان کا تعمیر کردہ پنوں کا کیچ مکران میں قلعہ اس قدامت کا ثبوت ہے۔ ہوت بلوچستان کے کیچ مکران سے باہر نہیں آئے۔ ان کی مختلف زمانوں میں مکران میں حکومت قائم رہی۔ میر حمل ہوت تھے۔ کلمت میں مسکن تھا۔ اس لیے ان کے نام کے ساتھ کلمتی شامل ہے۔

مشرقی بلوچستان میں ایک اور حمل رند گزرے ہیں۔ مشرقی بلوچستان کے شعراء نے حمل جیئند اور حمل رند کی داستان کو باہم غلط ملط کر دیا ہے۔ حمل جیئند سے منسوب دو تین واقعات ایسے ہیں جو اسے ممتاز حیثیت عطا کرتے ہیں۔ وہ اس زمانے میں ہوت کے سردار اور کلمت سے جیونی تک ساحلی علاقوں کے حکمران تھے جب پرتگیزی قزاقوں نے ساحل بلوچستان پر دھاوا بول دیا۔ حمل جیئند نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پرتگیزوں کو کئی بار شکستیں دیں۔ ان سے چھینی ہوئی توپیں گزشتہ صدی تک گوادر کی بندرگاہ پر بلوچوں کی جرات و بہادری کی گواہی دیتی رہی ہیں۔

حمل جیئند کے دور کے تین قسم کے واقعات اب تک زبان زد خلائق ہیں۔

۱) پرتگیزوں سے جنگیں ۲) کولواہ کے رند سردار چاکر سے معرکہ آرائی ۳) حمل اور شیر کا مقابلہ۔

حمل جیئند کو اپنے مادر وطن کا غیر ملکی دشمنوں سے دفاع کرنے کے تاریخی کارناموں نے شہرت بخشی، حمل جیئند کے بارے میں وثوق سے کہا جاتا ہے کہ وہ پندرھویں صدی میں بلوچستان کے طویل ساحلی علاقوں کا حکمران تھا۔ جب بحیرہ عرب اور خلیج فارس میں پرتگیزی قزاقوں کی جنگی کشتیاں بادبان اٹھائے پھرتی تھیں۔ بلوچستان کے ساحل پر جیونی پیشکان گوادر، پسنی اور مارہ اور سونمیانی کی بندرگاہوں پر انہوں نے متعدد حملے کئے۔ ان پے در پے حملوں میں انہوں نے شہروں کو لوٹا، آگ لگادی۔ تاریخوں میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ۱۵۸۱ء میں پرتگیزوں نے پسنی کے شہر کو نذر آتش کر دیا تھا۔ لوئیز ڈی آلمیڈ اپنی کتاب کے جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ بالآخر حمل جیئند ایک بحری جنگ میں پرتگیزوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد گرفتار کئے گئے اور پرتگال لے جائے گئے۔ بشیر احمد بلوچ نے یہ ۱۵۸۴ء لکھا ہے۔ MANUEL DE FAREY نے اپنی کتاب Souzai Purtcuse میں تصدیق کی ہے کہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے دور میں ہندوستان کے سمندری راستے سے پرتگیز بلوچستان کے ساحل تک پہنچے تھے۔

حمل جیئند کے مقابلوں، محاربوں پر متعدد نظمیں ملتی ہیں۔ ایک بیان کے مطابق ان کی گرفتاری پر حمل کی بہن نے ایک زہیروک (فراقیہ نظم) موزوں کی۔ اس نظم میں ان واقعات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

ہفتہ کے دن بھائیوں کی بہن بناؤ سنگار نہ کر
ہفتہ بھائی کے لیے نحس ہے۔ چاند کی سولہ تاریخ باپ کے لیے
وہ ہفتے کا دن تھا جب حمل کی کشتی تیار ہو چکی تھی
حمل کشتی میں متمکن تھے اور کشتی سمندر کے نیلے پانی میں
چار کشتیوں نے جن کے پرندوں جیسے پر پھیلے ہوئے تھے
حمل کی کشتی کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا
دشمنوں نے چلا کر کہا "ہم تمہیں گرفتار کرتے ہیں"
حمل کے ساتھی بزدل دشتی تھے
ان کا آتش نفس لئی کے انگاروں کی طرح تپش سے محروم تھا
اور دوسرے مچھیروں نے بھی خود کو چھپایا

حمل جیئند نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ قوت کی کمی کے باعث ذلت آمیز شکست قبول کرے اور ہتھیار ڈال دے۔ وہ پرتگیزوں سے بھڑ گیا اور بلوچی روایات کے مطابق اپنی پوری قوت سے لڑا۔ حد یہ کہ اس کی تلوار ٹوٹ کر سمندر میں گر گئی۔ پرتگیز حمل کو گرفتار کر کے لے گئے۔

میری اصفہانی تلوار میں نے بیٹوں کی طرح تیری پرورش کی
میں نے تجھے بیٹیوں کی طرح پردے میں رکھا۔

برسات کے موسم میں گجراتی گدوں میں چھپائے رکھا۔
نمی سے بچانے کے لیے ریشمی غلافوں میں ڈالی
آج تو میرے شیرانہ پنجے سے کیوں نکل گئی
حمل کو دشمن اپنے وطن لے گئے۔ کہتے ہیں پرتگیزوں نے بڑی کوشش کی کہ حمل ان سے صلح کرے اور ان کی قوم میں شادی کرے تا کہ اس کی بہادر نسل ان کے ہاں پرورش پائے۔ حمل نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔
فرنگی عورتیں حمل کو ناپسند ہیں
ان کے لباس اتلے ہیں کہ ناف تک کو چھپا نہیں سکتے
منہ دھوتے وقت بھی خدا کا نام نہیں لیتیں
کھجور کا حلوہ مکھیوں کے ساتھ ہڑپ کر جاتی ہے
حمل کو اپنے دیس کی حسینائیں بھاتی ہیں
کرتہ، شلوار اور دوپٹہ میں ملبوس
حمل جیئند کو جب یہ یقین ہو گیا اب اس کا وطن لوٹنا مشکل ہے تو سمندری ہواؤں کو مخاطب کر کے یہ پیغام دیتا ہے۔
سمندر کی ہواؤ! میرا پیغام لے جاؤ
الن، شاہو اور نوابو تک پہنچا دو
میری والدہ محترمہ چھوٹی بہن بمی سے کہو
میرے کھانے کے لیے اب مہلب گوں
گندم نہ پیسا کرو
میرے لئے اب بکرے ذبح نہ کرو
میرے اوڑھنے کے لیے اب رنگین کھیس نہ بُنیں
میرے گھوڑے کے لیے خوشنما رسیاں نہ بنائیں
حمل فخر اور غرور کی بدبختیوں میں گر گیا ہے
ایک اور نظم کے خوبصورت بول۔ حمل ایک شکاری تھا شکار کو پناہ حاصل نہ تھی۔
حمل کی موت پر تین چار چیزیں خوش ہوئیں
جاہو میں ملاح، رجڑو میں ہرن
جنگل کے شیر مسرور ہوئے، چراگاہوں میں خرگوش
پہاڑی بکروں نے باہم مشورہ کیا
پہاڑوں کو چھوڑ کر میدان کا رخ کریں۔
حمل جیئند اب نہیں رہا۔
کون شکار کرے گا۔

حمل جیئند کے معرکے مشہور اور زبان زد عام ہیں۔ ان معرکوں میں بیرونی حملہ آوروں سے وطن کے دفاع کے علاوہ مقامی قوتوں سے اپنے تشخص کے لیے رزم آرائی اور اپنی شہرت کے لیے بہادرانہ کارناموں کی داستانیں بلوچستان کی تاریخ کے روشن باب ہیں۔ حمل جیئند کے ہم عصر اور ہم چشم سرداروں میں کولواہ کے چاکر خان رند کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ چاکر کولوائی ایک اور بہادر بلوچ شخصیت ہو گزری ہے جس نے حمل جیئند سے گھڑ سواری، نیزہ بازی اور قوت آزمائی کی تھی۔

شعراء نے اپنی نظموں میں حمل جیئند اور چاکر کولوائی کا ذکر کرتے ہوئے ان شخصیتوں کی کردار نگاری کا فرض حسن وخوبی سے ادا کیا۔ حمل جیئند ایک طرف حسن وصورت، دلیری، وطن پرستی اور اعلیٰ کردار کا مالک نظر آتا ہے تو دوسری جانب چاکر کولوائی خود پرستی، عجب وغرور، خودستائی اور کم نگاہی کا شکار نظر آتا ہے۔ ذیل کی نظم سے دونوں کے مساکن، مشاغل اور طرز زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔
حمل کلمت کی نواح کا ایک ہوت ہے۔
چاکر کولواہ کے سبزہ زار کا ایک رند
حمل کا نام سن کر (قصیدہ خوان) لانگاہ آتے تھے۔
چاکر ان کی اس سے بھی بڑھ کر آؤ بھگت کرتا تھا۔
حمل زنجبار کی خوشبو میں بسا ہوتا تھا۔
چاکر داراجیسا خوش پوش تھا۔
حمل کے جت ڈاچیاں دوھتے
چاکر کے خدام کھیت کھلیانوں میں مصروف رہتے
حمل کی کشتیاں سمندر میں پھرا کرتیں
چاکر کے بیلوں کے جوڑے کھیتوں میں
حمل کے ساتھ پانچ سو جنگجو بہادر تھے۔
چاکر کولوائی کے ہزاران پر بھاری تھے۔
چاکر کی کرمانی تلوار غول تھی۔
جبکہ حمل ترکی تیغ حمائل کیے رہتا
حمل اپنے مغرور گھوڑے پر سوار ہوتا
چاکر کے گھوڑے کا نام گورخر شکار
کرنے والا "سوغات" تھا۔

واقعہ خواہ کہیں کا بھی ہو اور کردار ایک ہو یا ایک سے زیادہ، قابل ذکر

بات حمل کی بہادری، دلاوری اور بے خوفی کی ہے۔ جس طرح وہ خود ایک نڈر اور بے خوف شخص تھا اسی طرح اس کے گھوڑے کی بھی حالت تھی۔ وہ بھی جنگل کے شیروں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور رفتار کا عالم ایسا کہ ایک ہی رات میں سینکڑوں میل کی مسافتیں طے کرتا تھا۔ ذیل کی نظم حمل کی شیر سے دو دو ہاتھ کی ہے۔ حمل اپنی محبوبہ ماہ گنج سے ملنے کلمت سے ایک ہی رات میں گوادر جاتا ہے۔ راستے میں ایک شیر سے سامنا ہوتا ہے۔ حمل اور شیر کے درمیان معرکہ اس نظم کا موضوع ہے:

حمل و ماہ گنج:

راہروؤں کے ذریعے محبوبہ کا پیغام پہنچا ہے
اس محبوبہ کا پیغام جو کوہساروں کی مشکبو
کستوری ہے۔
وہ جو کبک رفتار ہے۔
جو صحراؤں کی غزال ہے۔
جو مشک و عبیر کی مالکن ہے۔
"بڑی طمطراق والیاں ہر شام آتی ہیں۔
آ کر ہمارے پاس بیٹھ کر پوچھتی ہیں
اس مرتبہ حمل ہوت نے خاصی دیر کر دی نہ
خود آیا نہ ہی گہر بار سلام بھیجا
نہ اپنے سائیس اور خدام میں سے کسی کو بھیجا
(میں کیا کہوں) مجھ سے بڑھ کر کوئی حسینہ
دیکھی ہوگی۔
یا کسی جنگ و جدل میں گھر کر رہ گیا ہوگا
یہ سن کر میں دلیرانہ اٹھ کھڑا ہوا
ہندی شمشیر کمر سے باندھ لی
اپنے خادم کمبر کو صدا دی
کمبر! جلدی سے میری گھوڑی لے آ
نہیں یہ سبک رفتار باندھ دے
سیاہ گھوڑی پر زین کس کر لے آ
خادم ہماری منہ زور گھوڑی لے کر آ گیا
مغل ساختہ زین کس کر ڈالی
میں نے پاؤں رکاب میں رکھے اور
پشت مرکب پر متمکن ہوا
رات کا پہلا پہر ہے چاندنی جوبن پر ہے۔
سردی نے کچھ پاؤں پھیلائے ہیں۔
میدان اور نالے سرپٹ دوڑتی گھوڑی نے طے کئے
نیلگوں سمندر کے قریب آ پہنچے
سوجی نامی مقام کے سنگم اور دہانے پر
اچانک میری گھوڑی تنے کی طرح ساکت ہوگئی
میں بار بار ایڑ لگاتا جتن کرتا ہوں وہ
کان کھڑے کر کے قدم نہیں بڑھاتی
ایک موٹا تازہ شیر بڑے تنے کی طرح پڑا ہوا تھا
ہر سو اچھل اچھل کر دھاڑ رہا تھا (ایسا کہ)
کمزور اور مردانگی سے بے بہرہ آدمی کا دل پھٹ جائے
شیر خود کو ایک قوی الجثہ درندہ سمجھتا ہے
تو میں بھی خود کو بڑے جری کا بیٹا مانتا ہوں
شیر بیچارہ سوچتا ہے یہ ایک منہنی سا شخص ہے۔
میری غراہٹ سے سہم کر رہ جائے گا۔
اس کا اصیل گھوڑا ہتھیا لوں گا۔
گھوڑا نوش کر کے خود اسے بھگا دوں گا۔
کندھے پر مشکیزہ لٹکائے گھر پہنچ کر دم لے گا۔
پیدل دوڑتے ہوئے پیروں میں چھالے پڑ جائیں گے۔
عورتیں خوب مذاق اڑا کر خوش ہونگی
شکاری شیر! اس غلط فہمی میں نہ رہنا
میں عظیم حمل ہوں جیئند کا بیٹا
چھ بیویوں کا خاوند اور تیز رو گھوڑوں کا مالک
میری ایک بیوی شال میں ہے تو دوسری شیشال میں
تیسری بیوی مستونگ کے نواح میں
چوتھی کولواہ آواران میں بستی ہے۔
پانچویں بیگم گزدان (کلمت) میں ساحل کے قریب اور
چھٹی نوخیز مہتاب ہے۔
میں اور میری کالی گھوڑی ایک ہی رات میں چھ کے چھ کی خبر لیتے ہیں۔

مرغوں کی لڑائیاں اور تماشائی (زیب داؤد)

ایک چرواہا اونٹوں کے گلے کے ساتھ (مجاہد داؤد)

اس کے بعد بھی گھوڑی کا زین نہیں اترتا
خیالوں پر جدگال دوشیزہ چھائی رہتی ہے۔
شیر ہے کہ شراب خوردہ حاکم کی طرح بھرا بیٹھا ہے۔
اسے اپنے چھ اسلحہ پر ناز ہے۔
چار اس کے چنگل کے نوکیلے ناخن اور دو نوکیلے دانت
یہ تین چار چھانٹوں سے کام تمام کرتا ہے مگر اس پہلوان کو
میرے گرما گرم تیروں نے پچھاڑ دیا
یکے بعد دیگرے ہلاکت خیز تیروں نے
میں گھوڑی سے فوراً کود پڑا
سرگیں زرہ بکتر زیب تن کی
ترکش ہاتھ میں لے کر شیر نر سے معرکہ گرم کیا
مستانہ وار جو جو تیر میں نے منتخب کئے
کمان نے صحیح نشانے پر سنسناہٹ کے ساتھ پہنچائے
سیوائی کمان سے جتنے تیر نکلے
شیر نے سب کے سب سینے پر کھائے
اب شیر نر کا وہ پہلا سا جوش وخروش نہیں رہا
خون اس کی پسلیوں سے ابل ابل کر بہہ رہا تھا۔
میری کمر میں حمائل تلوار میان میں پڑی بڑبڑا رہی تھی
(کہتی تھی) پھولوں کی سوغات والے مالک
کلمتی عوام کے گل شاہانہ
شیر اگر یہ تیر خاطر میں نہ لائے اور حملہ کرنے کی ٹھانے
مجھے زنجیر کے بندھن سے رہائی دلا دئے
اگر اس کی گردن گنے کی طرح قلم نہ کروں تو
حمل تیری نگہداشت اور پرداخت مجھ پر حرام ہو
رات مختصر ہو رہی ہے ملا اذان دینے کو ہے
معلوم نہیں مشیت کی رضا کیا ہے
جاناں یہاں سے دور اپنی سجی ہوئی خوابگاہ میں منتظر
میں اپنے حسین خیالوں کے دھاروں میں بہتا ہوا
شکاری شیر کا ایک پنجہ کاٹ کر
میں نے خوش خوش خورجین میں رکھ لیا
یہ دوستوں رشتہ داروں کے لیے اظہار جرات کا ایک
اچھا تحفہ ہے۔
ہوسکتا ہے محبوبہ میرے خیر مقدم کو نکل آئے
ہاں واقعی ٹاپوں کی آواز سن کر مشکبو محبوبہ نکل آئی
میں نے گھوڑا ایک پوشیدہ مقام پر باندھ لیا
اس نے بڑھ کر تیغ وسپر مجھ سے لے لئے اور
گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئی
رات کے باقی ماندہ تین پہر وصل کی سرشاریوں میں گزرے
چوتھے پہر اس سے طالب رخصت ہوا
اس ملاقات میں رہ نوردی کے قصے بھی چھڑے۔
شیر سے مقابلے کا سن کر اس دلربا نے کہا:
ہائے ہائے کیسی انہونی ہوئی ہے۔
گفتگو کرتے ہوئے وہ اپنی کلائی کی چوڑیوں کو ہلاتی رہی
کبھی دو دو ہتڑ اپنے کتابی چہرے پر مارتی
کبھی نازک نازک زانوں پر
اے نوج! میں اور میری حرکتیں
آدھی آدھی راتوں میں آپ کو جستجو میں ڈالتی ہوں۔
میں نے پھر اسے گلے لگایا
اپنی چاند جیسی محبوبہ سے کہا:
ہمیشہ شیر مرد اور شیر شکاری
کوہ ودشت میں ایک دوسرے سے بھڑا ہی کرتے ہیں۔
وہ مرتے ہیں جن کا وقت پورا ہوتا ہے
اور جن کا پیمانہ حیات لبریز ہوتا ہے
شکر گفتار محبوبہ کو الوداع کہہ کر
گھوڑی تھان سے کھولی
شب گذشتہ کی راہ لی
اس مقام پر پہنچا جہاں شیر سے مد بھیڑ ہوئی تھی۔
شیر کے جسم سے ایک ایک کر کے سارے تیر نکالے
ترکش میں پھر قرینے سے رکھے
تا کہ یہ مشکل وقت میں کام آسکیں۔

بالاچ گورگیژ: بالاچ حسن گورگیژ کی داستان عشق ومحبت کی داستان نہیں بلکہ بلوچستان کی بہترین رزمیہ داستان ہے۔ بالاچ کی داستان ہمت، حوصلہ مندی، جفاکشی اور پناہ جو کے لیے جان کی بازی لگانے کی بلوچی اقدار وروایات کی امین ہے۔ یہ بھائی کے لیے بھائی کی فنا نہ ہونے والی محبت کی وہ داستان ہے جو بلوچستان کے کوہ وصحرا میں انتہائی مقبول ہے۔ غیرت، جوش، قربانی اس داستان کی اعلیٰ ترین اوصاف ہیں۔

بالاچ، حسن گورگیژ کے بیٹے تھے۔ علاقہ ڈیرہ جات میں گورگیژ اور "پژ" قبیلے پاس پاس رہتے تھے۔ اس لحاظ سے ان میں قبائلی چشمک اور معاشرتی عناد بھی موجود تھا۔ قبیلے جب معاشی اعتبار سے آسودہ حال ہوں تب ان کی توجہ باہمی رقابتوں کو جگانے پر مرکوز ہوتی ہے۔ اسی حوالے سے گورگیژ اور پژ قبیلوں میں معمولی ان بن رہی تھی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس مزاج نے ابتدا سے آج تک بلوچ قومی قوت کو مستحکم ہونے نہیں دیا۔ چاکر اور گہرام ہوں یا جمل اور چاکر کولواہی، سردار آزاد خان ہو یا خان قلات خان خداداد خان باہمی جدال وقتال نے انہیں کمزور کر دیا اور بیرونی قوتوں کو اس سے استفاضہ کرنے کے مواقع ہاتھ آئے۔

حسن گورگیژ اپنے قبیلے کا سربرآوردہ شخصیت تھا۔ اس کی وفات کے بعد حسن کے بڑے بیٹے دودا گورگیژ کو قبیلے کی سربراہی ملی۔ ان دنوں بالاچ کمسن سا ایک لڑکا تھا۔ دودا بھی ایک بہادر، دلیر اور تلوار کا دھنی تھا۔ ابھی دودا کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ حجلہ عروسی میں تھا کہ ماں نے آکر اسے جھنجوڑا کہ سمی نام کی جس بیوہ خاتون کو تم نے پناہ دی ہے آج اس کے گائیوں کا گلہ پژ قبیلے کے میر بی برگ اور اس کے حمائتیوں نے چھین لیا اور ہانک کر لے گئے۔ دودا اپنی پناہ میں بسنے والی بیوہ خاتون سمی کے گائیوں کا گلہ چھڑانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور اغوا کاروں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ اس موقع پر بالاچ بھی اپنے بھائی کے ساتھ جانے پر بضد ہوا۔ دودا نے اسے جھڑک کر لوٹا دیا اور کہا" گھر لوٹ جاؤ، وقت آنے پر میرے خون کا بدلہ لینا"

دودا اپنے گھوڑے "سہرنگ" پر بیٹھ کر چل دیا راستے میں ایک نوجوان عورت نے اسے ٹوک کر روکا اور کہنے لگی: دودا رک جاؤ، بہادر اور جری ساتھیوں کے آنے کا انتظار کرو"۔ یہ سن کر دودا نے برا شگون لیا وہ بولا مجھ سے زیادہ بہادر کون ہے جس کا میں انتظار کروں۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دشمنوں سے جا کر بھڑ گیا۔ دودا تنہا تھا یا ایک دو دوست ساتھ تھے۔ مدمقابل تعداد میں زیادہ تھے معرکہ گرم ہوا دودا اس معرکے میں اسماعیل نامی ایک دوست کے ساتھ کھیت رہا۔

بالاچ کے لیے یہ واقعہ سوہان روح تھا۔ وہ عرصے تک گاؤں میں خدمت بجالاتا رہا اور پھر گھر بار چھوڑ کر حضرت لعل شہبازؒ کے درگاہ میں جا کر اس وقت تک خدمت انجام دیتا رہا جب تک کہ اسے درگاہ سے قدرت عطا نہ ہوئی۔ کچھ روایات میں وہ ڈیرہ غازی خان میں حضرت سخی سرورؒ کے مزار پر خدمت گزار رہا تھا۔ بالاچ کو یہ قدرت عطا ہوئی کہ وہ جنگل کے ہرنوں کو دوڑ کر پکڑ لیتا۔ تیر کمان کا ہر تیر اپنی ہدف کو پہنچ جاتا۔ حضرت مست توکلی نے اپنے ایک شعر میں ایسے کمال قدرت کی استدعا کی ہے۔

''میرے بازوؤں کو وہی کمال بخش دے جیسی تو نے بالاچ کے کمان کو عطا کی تھی۔''

بالاچ کی زندگی مسلسل جدوجہد کی آئینہ دار ہے۔ لڑکپن سے جوانی تک وہ دکھوں کے سائے میں پلا، قدم قدم پر امتحان، مصائب، دل شکنی عمر بھر بے چینی۔ ان تمام کیفیات کو وہ اپنے کلام میں بیان کرتا ہے۔

بڑے بھائی کے سایہ عاطفت سے محروم ہو کر وہ کس طرح در در کا ریزہ چین رہا، کیسے طعنے برداشت کرنے پڑے۔ جوان ہو کر انتقام کی آگ نے اسے کس طرح بے چین رکھا۔ بالاچ کے بلوچی کلام کا منظوم ترجمہ حاضر ہے۔ (منظوم اردو ترجمہ کتاب "صدف صدرنگ" تالیف غوث بخش صابر ص ۱۴۹-۲۰۰)

بالاچ کہتا ہے:

جب سے میرا بدلہ دشمنوں پر فرض ہے۔ میرا توشہ دان میرے سر کا بار ہے اور کندھوں پر مشکیزوں کی کردری رسیوں سے بدن فگار ہے۔

آ وَائے رئیسو! خانو!
قومی رہبرو، فرزانو
سردار نامور اور سیانو
کر لیں گفتگو دانش کی
بالاچ عنبریں نکہت مو
گورگیژ منتقم، کینہ جو
دل میں گمرہی تو مت ٹھان
نہ کر گمرہی کے سامان
مشکل میں نہ گر جائے جان
بی برگ پر پڑی تھی جیسے
کوتاہ قامت وٹھگ بجار
جس نے نیکدل سمی کے
ہانکے بے سبب ڈنگر، ڈھور
مولا سے ہنکا کر گلہ

چرواہا اچانک اک دن
لایا یہ خبر پر وحشت
گرگیژ سے کہا یہ اس نے
گرگیژ نامور پر تمکین!
چڑھ آئے مخالف ہم پر
جیدار اور سجیلے گھبرو
مرنے مارنے پر تیار
سج کر اسلحہ سے نکلے
خنجر میان میں چمکیلے
پہچان تیغ حمائل شمشیر
کس کر میان کمر بندوں سے
مرکب ہنہنائے، مچلے
دوڑے برق وش رزم آرء

☆

دودا بستر راحت پر
حجلہ میں عروس نو کے
شادی کے نئے خیمے میں
دنیا مافیہا سے بے غم
وصل وخلوت جاناں میں
ماں نے دی صدا اے فرزند
خوشدامن پکاریں دلبند
ڈلبر نے بصد دل تنگی
دودا ہے بہادر جنگی
بستر سے تڑپ کر اٹھا
مادر مہربان نے جھڑکا
دعوی ہے پناہ جوئی کا
گھر پر مطمئن سوتے ہو
جاگے نیند سے جوں پر جوش
خادم سے کہا لایشموش
مرکب لے کے آ خوش رفتار
سرخند سبک در رفتار
گویا پھر ہوا مرکب سے
پہنچا دے مجھے پل بھر میں
"گرم آب" پر غنیم اترا ہے
ساتھی جو صبح نکلے تھے
لوٹاؤں لئے ڈنگر ڈھور
مولا سے پھرا کر لاؤں
محلے میں شرف پا جاؤں
تب ہے تو سزاوار اس کی
خدمت یاد رکھ دلبر کی
راتب تھا دیا چانوں میں
بھر کر تو برہ دانوں میں
اپنے محترم ہاتھوں سے
مہندی سے رچی پوروں سے
ہر دانہ وفا میں لپٹا
تھپکا کر محبت دے کر
سرخند تجھ کو تھا کھلوایا
تا کہ وقت پر کام آئے
ہم چشموں سے ہو ان بن جب

☆

مستانہ چلا تب مدہوش
شمشیر وکماں تھے بردوش
دشمن یاں ہوا سد راہ
لپکا وہ بڑھا کر گھوڑا
برسے خونچکاں رنگیں تیر
دشمن نے کیا او چھاوار
دودا آ رہا مرکب سے
میدان وغا میں گر کر
اعزاز شہادت پائی
ہمراہ تھا یہاں عمر جام

بولی مادر دودایوں
تحسین ہو مرے بیٹے پر
دو سے اک وہ کر گزرے گا
لوٹا لائے گا لوٹا مال
یا پھر نذر جاں کر دے گا

بالاچ: اے ابر خنک گزرے جب
کہہ دیجو مرا حال زار
نام آور دلاور بی برگ
سردار پڑ کے زور آور
آگے بڑھ قریب آتا جا
آجا کہ نبھیڑیں جھگڑا
پوری ہو خدا کی منشاء
دو طرفہ مبارز نکلیں
کس کا منہ لہو سے پر ہو
ہاتھ آئیں کسے مال اموال
کس کو فتح کا ہوا قبال
بیلار پر گھٹا برسی ہے
دامن کک کا ہے سبزہ زار
سبزہ ہے ہرا جوں گلزار
لائق ڈاچیوں کے تیرے اونٹوں اور ترے گلوں کی

بالاچ: قرض ہے جب سے خون حریفوں پر
توشہ داں مجھ کو ہے وبال جاں
توشہ داں اس پر ایک مشکیزہ
اف یہ الجھن جو توشہ داں سے ہے
اور مشکیزہ مستزاد اس پر
حیف تلچھٹ کے ابلے پانی پر
جس کو وحشی ہیں جبر سے پیتے
جب میں کمسن سا ایک لڑکا تھا
ٹمٹماتے چولہوں کو تکتا تھا
دست مجبوری تھا دہن اپنا

طعنہ زن مجھ پر ہر زن خانہ
بی بیو مجھ پر طعنہ زن کیوں ہو
میں بڑا ہو کر کھیس رکھ لوں گا
اور بلوچوں سی وضع بدلوں گا
شاہ کے در پر میں بنا سقہ
ایک مدت تک مدعا رکھا
پھر بشارت میں نے یہ پائی
تھا مقدر جو یہ عطا پائی
دی صدا مجھ کو شاہ کے در نے
شاہ کے در پر پانی بھرنے کا
یہ صلہ تجھ کو داد کرنے کا
شاہ نے بالاچ تیری سن لی ہے
پا کے بخشش میں شاہ کے در سے
لے کے کشتی ایک عزم منزل کی
دہن مولا پر جا کمر کھولی
دوڑ کر پکڑے آ ہوئے صحرا
دودھ ان کا تھا اپنا روزینہ
شمس جب طے کرتا سفر اپنا
ڈاکوؤں جیسی آگ سلگاتے
ہم پکاتے تب ریت میں روٹی
جوں سپاری کے توڑ کر کھاتے
ہم نفس جنگوں میں نقیبو ہے
تیر دو سو ہیں اس کی ترکش میں
منتخب ترکش میں میرے سو ہیں
یوسف از بہر گاؤ آیا تھا
درمیان دونوں کے کلام اللہ
ضامن پیمان وفا ٹھہرا
تب پتہ خیموں کا دیا اس نے
ڈھال اس پیمان کی نشان ٹھہری
مسکن دشمن کا نشان ہے یہ

مرکب تازی ہیں بندھے در پر
ڈھال کردوں گا اپنی آویزاں
ڈھونڈنا اس سے خیمہ دشمن
ٹیک کر بیٹھا ڈھال میں اپنی
نیند نے غلبہ پالیا دل پر
جوں پرندوں کے اونگھ ہوئی طاری
نام ساتھی نے لے کے للکارا
جاگ بالاچ اب صبح کاذب ہے
توکل مرداں کی کمر کس کر
ہے سگ کوچہ خواب غفلت میں
کان آہٹ پر اور دل شاداں
قہر ہوں دشمن کے لیے ہر آن
اور جب پہنچا صحن مسکن میں
کاٹ کر چھپر کا بنا در گہہ
اندروں خانہ ہو گیا داخل

☆

مہربان محو خواب غفلت ہے
قرب دلبر ہے اور ہوائے بحر
میں نے دل میں پھر اس طرح سوچا
یاں نہیں خنجر کا کوئی موقع
ہاتھ میں فولادی تبر تولی
یہ نہیں ضیغم کش تبر کی جا
منتخب پیکان لے کے ترکش سے
رکھ دیا چلہ میں کماں زہ کی
داہنے پنجے سے کماں کھینچی
چیخ کر سیوائی کماں مچلی
تیر نے پہلو میں پناہ ڈھونڈی
چھید کر رخت و تخت بستر کا
بوریا سے وہ اس طرف نکلا
فرش سے جا کر تیر وہ الجھا
خون کی دھاریں دہن و بینی سے
اس کے چہرے پر ہو گئیں جاری
میں نے اک چلو نوش کر ڈالا
تا کہ بجھ جائے غیض کی آتش
طنزیہ عمر مجھ پر للکارا
شان والے اے جنگجو بالاچ
اس قبیلے سے تو نہ تھا یوسف
بے گناہ جس پر تیر باراں کی
میں نے نفرت سے یوں کیا اظہار
موت آئی تھی اس کی آخر کار
زیست کے اس کے دن ہوئے پورے
یوسف صدقہ ہے قول کا اپنے
کون کرتا ہے رازداں زن کو
اس طرح کہ جیسے کیا اس نے
یوسف ہے وعدوں کا ہلاک اپنے
جھٹ پٹے ہی کے وقت کل ہم نے
بیٹھ کر کھانا ساتھ کھایا تھا
یوسف ہے میرے خانوادے سے
ننگ اور خوں کا مشترک رشتہ
میں جیوں گا یا سور ماہی برگ
یوسف تنہا تو مر نہیں سکتا
ماں کو اپنا ہے جو پسر پیارا
ساس کو بیٹی کا سہاگ اپنا
بہن کو اپنا شیر نر بھائی
جس سہاگن کو ہے عزیز ہمسر
مجھ سے وہ ان کو دور ہی رکھیں
میں ہوں دیوانہ مست مرکب ہے
پر خطر راہوں سے گزرتا ہوں
یہ نہ ہو ان پر آنچ آ جائے

☆

آؤ عزیزو یہ سنو!!!!
طعنے دیئے دشمن نے جو
ہوں زرد مثل زعفران
کتنے گرے ہیں آسمان
دودا کے الفت کی قسم
میرزا کے زین اور رخش کی
سمین کے تیغ تیز کی!!!
سمی کے گلوں کے لئے
گرم آب میں قرباں ہوئے
ستر جیالے سرفروش
مدفون ہیں اس دشت میں
ان سے نہیں جیتا کوئی
کس سے کہوں راز دلی
آ ہمرہ شیرین سخن
آ اے نقیب تیغ زن
تجھ سے کریں راز و نیاز
پچھلے پہر شب رفتہ کے
میں محو خواب خوش رہا
مجھ کو بشارت دی گئی
دودا ہے ہمراہ کساں
نام آور اور شیر جواں
ہاتھوں میں پہنے گل فشاں
آیا برادر مہرباں
بیٹھا میرے پہلو میں وہ!!!
گردن میں باہیں ڈال دیں
بالاچ میرے دلربا
آزردہ خاطر کیوں ہوا
سچ ہے کہ ہم مارے گئے
ناموس کی خاطر و لے
سمی کے حق کے واسطے

ہم نے لیا ہے اپنا خون
اور جنتوں میں ہیں بسے
میں نے یہ دودا سے کہا
دودا دلاور تیغ زن
میں ان دنوں کمسن سا تھا
تیرے تعاقب میں چلا
تو نے پلٹ کر یہ کہا
گھر کو چلا جا لوٹ کر
لینا قصاص پھر خون کا
غصے کے مارے لوٹ کر
میں اپنے گھر آ کر رہا
دکھ اپنے لے کر کوہ کو
مہران کی وادی میں گیا
در پر رہا شہباز کے
صقہ بنا شہباز کا
چرواہا بن کر گاؤں میں
دکھ جھیل کر جیتا رہا
سر پر بڑا کوئی نہ تھا
گردن میں رسی بان کی
ڈالے رہا میں سالہا
شہباز نے بخشی عطا
میں اور نقیب چل دیئے
تیر و کمان سے لیس ہو
دشمن پہ ٹوٹے بن قضا
شمشیر سے مارے دو دس
اور بیس با گرز بلا
مارا تبر سے بیس کو
اور بیس کو خنجر لگا
اسی بلوچ مقتول ہوئے
گھوڑے کا ہے بدلہ لیا

اب تک ترا خوں قرض ہے

☆

دودا نے تب مجھ سے کہا
کر یہ نصیحت حرز جاں
رشتہ نہ لے دشمن سے جا
رستہ نہ ہو تیرا خطا
جس نے جری رشتہ لیا
اغماض خوں اس نے کیا
جب وصل کی راحت ملے
اور قرب کی لذت چکھے
سالوں کا ہوا پنے غلام
جورو کا نوکر بن رہے
پیاسے عدو کے خوں کے
مطلق نہیں ہوتے ہیں وہ
دشمن پہ پیسیں دانت وہ
فرزند ہیں ان کے خدنگ
خنجر بھتیجے ارجمند
شمشیر ان کے سرپرست
ہنگامہ خیز ان کی سرشت
کینہ شتر کا ان میں ہے
آسیب خو ہیں اور زشت
محتاج مرکب کے نہیں!!!
قلعے بلوچی کو ہسار
انبار ان کی گھاٹیاں
محلات ان کی چوٹیاں
پوشش میں پنہاں سادگی
ہیں شیر نر دینارزئی
ان کو نہ جانو بے نوا
ان میں بہت ہیں شہسوار
بالاچ جیسے منتقم!!

☆

آتا ہوں جب گھر کو ذرا
پڑتی ہے بچوں پر نگہ
تیری رفیقہ اشکبار
بالاچ کو کیسا قرار
برچھی سے بھی ہے یہ سوا
دل سے یہی جھگڑا مرا
دل مجھ سے کہتا ہے صدا
بالاچ کیسی عافیت؟
دشمن پھرے زندہ ترا

☆

بجلی گری ہے رات جب
کتنے دیئے ہیں گھر جلا
زنگی نے بامیر کا وڑی
مارے معزز تر بلوچ
ہاتھوں میں ان کے ہاتھ تھے
دیکھی حسیناؤں نے جنگ
ماتم میں ایسا ذکر ہے
کاندھوں پہ ہیں چاروں قبا
مال غنیمت کے نہیں
غیرت کا بی برگ قرض ہے
تیغ وسناں کا قرض ہے

☆

یہ قرض دشمن ہوا دا
ماہی سے ماہی گیر کا
رہتا ہے جیسے سلسلہ
جھپٹے کبوتر پر عقاب
یا خوک سے کھیتی خراب
لُوریت کو برہم کرے
دینارزئی کے نامور

ان کو نہ سمجھو بے نوا

لوک گیت: بلوچی لوک گیتوں کی بڑی اہمیت ہے کہ اس میں قوم کی شادی، غم اور رسومات کو بھی دخل ہے۔ اُردو زبان میں ان گیتوں میں سے چند ایک کو مرحوم عطا شاد اور اُردو کے ایک سنجیدہ شاعر جناب عین سلام نے بھی منظوم کرتے ہوئے ان کی معاشرتی، سماجی اور ثقافتی اہمیت بڑھادی ہے۔ بلوچی لوک گیتوں کی ایک اہم خصوصیت ان کی دھن یا گیت کے دائرہ اظہار میں ہے، گیت یا طرز آہنگ خالصتاً عوام کی پسند کی محتاج ہے۔ اِس لیے اِس کی تشکیل میں عام آدمی کے جذبات کو ذہن میں رکھا گیا ہے۔ ان گیتوں میں ایک طرف دینی جذبہ کارفرما ہے اور دوسری طرف یہ توجہ بھی موجود ہے کہ خواتین اگر ان کو گائیں تو ان میں کوئی ایسا مواد نہ ہو جو باعث نفرت ہو۔ ان گیتوں کو ان کے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جس نوع کی تقریب میں گائے جاتے ہیں۔ وہ درجہ ذیل ہیں:

مالد یا سپت: حمد و نعت اور منقبت کے گیتوں کو کہا جاتا ہے۔ وہ گیت جو صوفی منش حضرات کی پسند پر کسی نیک صحبت میں پیش ہوں۔ خواتین ایسے گیتوں کو بچے کی ولادت کے موقع پر گاتی ہیں اور چھ راتوں تک زچہ اور بچے کی سلامتی مطلوب ہے جبکہ مالد کو صرف وہی گائک گاتے ہیں جو "دف" کے ساز سے واقف ہوں۔ سپت خواتین کے لیے مخصوص ہے، جبکہ مالد پیشہ ور گانے والوں کے لیے ہے جن کو کسی خیرات اور نیاز کے وقت بلایا جاتا ہے۔

سپت: لفظ صفت سے متاثر ہے۔ اس میں خواتین ہمیشہ حمدیہ، نعتیہ اور مناقب ادا کرتی ہیں۔ اس کے لیے ساز کا استعمال ممنوع ہے۔ ایک خاتون ابتدا کرتی ہے۔ دوسری عورتیں آواز سے آواز ملا کر تقریب میں جان پیدا کرتی ہیں۔

فرد: پھول سا بچہ مرا
فرد: کون ہے سویا کون ہے جاگا
پاسباں اس کا خدا
کورس: بندہ سویا رب ہے جاگا
کورس: پاسباں اسکا خدا
فرد: خدا ہی لائق حمد و ثنا ہے
اس پہ ہو ظل الہ
کورس: محمد مظہر نور خدا ہے
فرد: میں ہوں اک بندہ حقیر
فرد: پرچم ہو تیرا قائم
پیر میرا دستگیر
پھولوں سے سجتا دائم
میرا خدا ذوالجلال
کورس: مست قلندر الاہو
قادر و دائم مثال
شہباز قلندر الاہو

لوری: اس کا تعلق ماں بچے سے ہے۔ ماں محبت سے بچے کو بہلاتی ہے۔ اس میں ماں کے دل کی چھپی ہوئی آرزو اور تمنائیں ہوتی ہیں۔ لوری کو مشرقی بلوچی میں "لولی" اور مغربی میں "لیلو" یا نازینک کہا جاتا ہے۔ نازینک کے معنی ہیں ستائش کرنا۔ لوری میں عموماً بہادرانہ، شجاعانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

میں اپنے لال کو لوری دیتی ہوں
میرا لال بڑا ہو کر خوش پوش ہوگا۔
وہ چھ کے چھ ہتھیار سجا کر نکلے گا۔
تلوار، بندوق اور خنجر کا مالک
میرا لال تیز گھوڑے دوڑائے گا۔
امیرانہ مجلس میں بیٹھے گا
سردار قاصد بھجوا کر بلاوا دے گا۔
دشمنوں سے ہماری جنگ ہے۔
یہ مجھ ماں کی دلی آرزو ہے۔
جنگ کی خوفناک گھڑی میں
تلواروں کی چھاؤں میں رہنا
میں تمہاری جرأت کی امیدوار ہوں۔
دور دیس بیاہی تیری بہن
تیری نام آوری کی متمنی
تیری خاتون خانہ تری منتظر ہوگی۔
ماں کے لیے یہی قابل فخر ہے۔
کہ قوم تجھ پر نازاں ہو

بچے انڈے لڑانے کا کھیل کھیل رہے ہیں (زینب اویس)

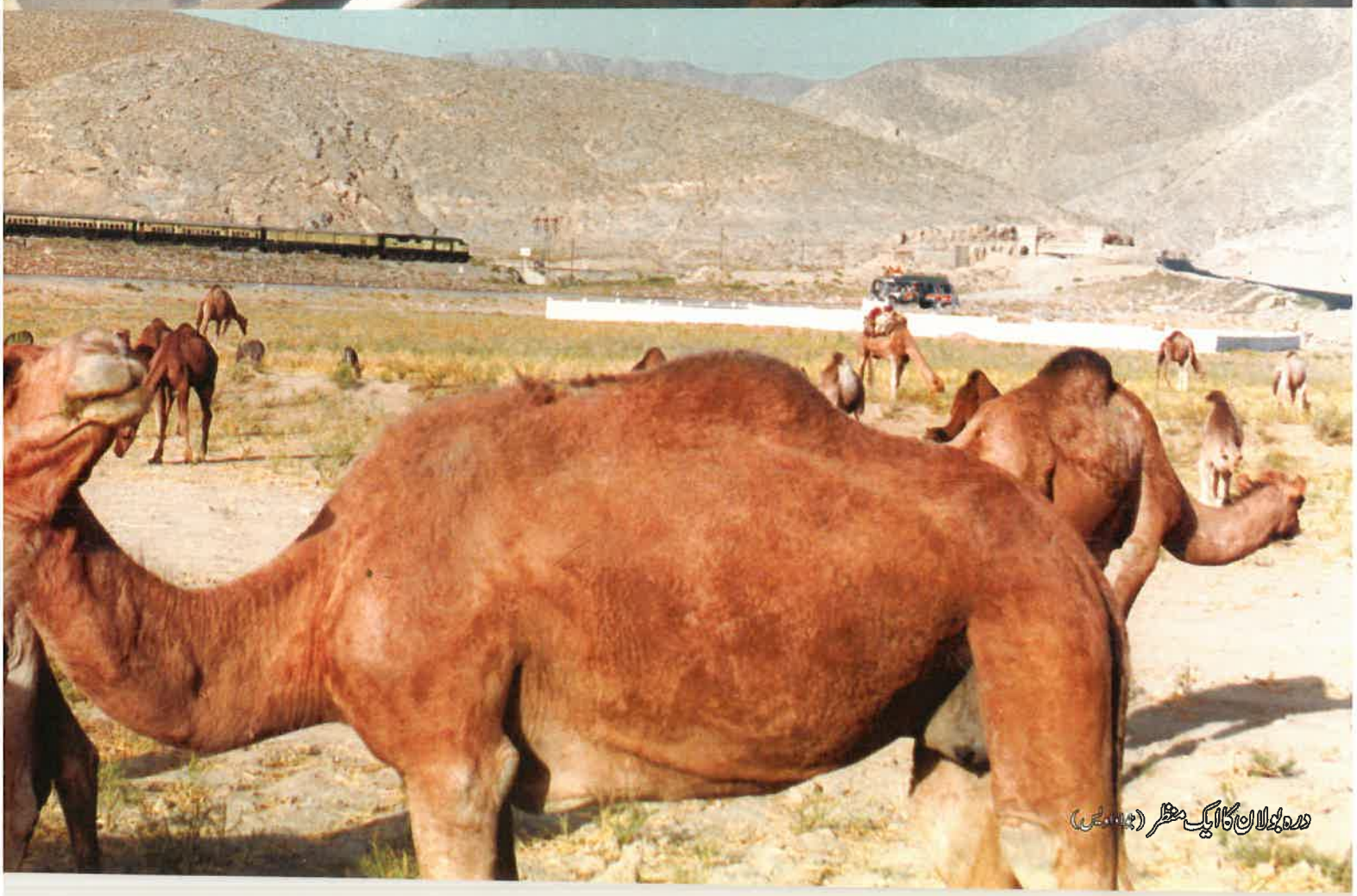

درہ بولان کا ایک منظر (جاوید اویس)

جیسے ماں نازاں ہے۔

لیلو: لوری دیتی ہوں اپنے بچے کو
میرا بچہ سوتا نہیں روتا ہے۔
کل رات میرا لال بہت رویا تھا۔
اس کے آنسوؤں سے لونگ گرتے ہیں۔
جب میرا لال خوش ہو کر ہنستا ہے۔
تو موتی جڑتے ہیں۔
سو جا میرے لال نیند تیری پرورش کرے
بے خوابی تجھے نحیف بنا دیگی
میں نے اپنے لال کو پیدا ہوتے ہی دیکھ لیا
محلے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی
گھر گہوارے سمیت چمک اٹھا
ساگوان کا گہوارہ تیری خوابگاہ
بکری کے بالوں سے بنی طنابیں
تیری پاسباں ہیں۔
میرے لال کا پاسباں
خود میرا اللہ ہے

میرے چاند! مٹھے

میرے دل کے ارمان، آنکھوں کے تارے،
میرے لال، نظر کے اجالے،
تو جلدی سے بڑا ہو کے تلوار اٹھالے،
میں دل کو سنبھالے
اسی دن کی منتظر ہوں۔
جب باپ کے خون کا بدلہ حریفوں سے لے
باپ دادا کی قبروں کو روشن کرے
اے میرے پیارے
دل کے سہارے
تجھ جیسے سپوت پر مجھے فخر ہے۔

لاڑوک / ہالو: شادی بیاہ کے جھمیلوں میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ دولہا دلہن کو سراہنے اور شادی کی اہمیت اور قدر بڑھانے کے لئے خواتین دلہن کے پاس مجلہ عروسی میں ہالو / لاڑوگ گاتی ہیں۔ اس میں دَف کا ساز مستعمل ہے جسے عورتیں خود بجاتی ہیں۔ ان گیتوں کا ایک اور موقع دولہا کو سنوارتے وقت ہوا کرتا ہے۔ بلوچی معاشرت میں شادی کی ان گنت رسومات ہیں جن کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

۱) سب سے پہلے دلہن کو مایوں میں بٹھانے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں مایوں بچھا کر دلہن کی سہیلیاں دلہن کو گھیر کے اس میں بٹھا دیتی ہیں۔

۲) شادی کے عروج سے دو دن پہلے مہندی لگانے کی رسم اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ مہندی لگانے کے دو مرحلوں میں پہلے مرحلے کو "چوری کی مہندی" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر صرف دولہا دلہن کے گھروں کے افراد شریک ہوتے ہیں جبکہ دوسرے دن، رات کو شادی کی تقریب میں شریک خواتین دلہن کو مہندی لگاتی ہیں۔ جو خاتون یہ کام انجام دیتی ہے۔ دلہن اور دولہا کی مہندی کے موقع پر لوگ جو رقومات نچھاور کرتے ہیں وہ اسی خاتون کا حصہ ہوتی ہیں۔

کورگ کی رسم: دولہا کو قریبی تالاب یا ندی پر اس کے دوست احباب لے جاتے ہیں۔ مردوں کے ہجوم سے کچھ فاصلے پر عورتیں جمع ہو کر لاڑوک اور ہالو گاتی ہیں جس میں دولہا کی تعریف اور ستائش کی جاتی ہے۔ اس سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے اور دولہا دلہن کی عمر بھر رفاقت کے لیے دعائیں دی جاتی ہیں۔ جب دولہا کا غسل مکمل کر کے اسے پوشاک پہنائی جاتی ہے تو دولہا کو گھوڑے پر بٹھا کر گھر لاتے ہیں اور سنوارتے ہوئے تخت پر سرہانے تلوار رکھ دیتے ہیں۔ اگر گھوڑا نہ مل سکے تو دولہے کو کوئی گہرا دوست ندی سے گھر تک کندھے پر بٹھا کر تخت تک لاتا ہے خواتین برابر ہالو اور لاڑوک گاتی ہوئی، دَف بجاتی ہوئی ساتھ چلتی ہیں۔

کسی نے مارا تیر نظر کا
تیر نظر کا کسی نے مارا
بن گیا دہکا انگارا
اپنے کئے پر دل ہے شاداں
لیلو لاڑو لیلو لاڑو
عشق محبت کھیل نہیں ہے
کھل نہیں ہے عشق محبت
ہنس کر اٹھانے دہر کی راحت

اپنے کئے پر دل ہے شادان
لیلڑو لاڑو لیلڑو لاڑو

ہالو کے بول: دلہن کی تعریف

ہالو ہلو ہالو ہلو
میرے نظر کے نور کو
اس جگمگاتی حور کو
ہالو ہلو ہالو ہلو
یہ جگمگاتی حور ہے۔
ہم جولیوں کی داستاں
ناز اس پر کرتی ہیں۔
یہ دزگہار ہمجولیاں (دزرگہار-سہیلی)
ہالو ہلو ہالو ہلو
ہالو ہلو ہالو ہلو
اس چاند جیسی حور پر
یہ زندگی قربان ہے۔
دیکھو تو کاجل کو بھی
ان آنکھوں پہ کتنا مان ہے۔
ہالو ہلو ہالو ہلو
ہالو ہلو ہالو ہلو
نازک بدن گل پیرہن
یہ چاندسی صورت دلہن
شوبھا ہے گھر کی لاج ہے۔
کلہ کے یہ زینت دلہن (کلہ-مایوں)
ہالو ہلو ہالو ہلو
ہالو ہلو ہالو ہلو

دولہا کی تعریف: ہالو خوشی کے گیت گاؤ
مناؤ جشن ناچو گنگناؤ
ہالو ہا لو بنا ہے میر دولہا
سجا ہے پھول سا ملبوس کتنا
مقدر ناز کرتا ہے کسی کا
ہالو ہالو بنا ہے میر دولہا
سلامت باد اے شاہ بلوچاں
سلامت باد اے مہر درخشاں
ہالو ہالو بنا ہے میر دولہا

شادی کی آخری تقریب میں نکاح کے بعد دلہن کی سہیلیاں دلہن کے کمرے کا دروازہ روکے رکھتی ہیں۔ دولہا جب ان کی شرط قبول کرتا ہے تو وہ جو کچھ مانگتی ہیں، مان لیتا ہے تو دولہا کو اندر داخل ہونے اور سہیلیوں کو وہاں سے چلے جانے کو کہا جاتا ہے، دوسرے صبح دولہا اور دلہن کے رشتہ دار مبارکباد دینے آتے ہیں۔

صوت: بلوچی لوک گیتوں میں مقبول ترین صنف صوت ہے جو بلوچستان کے قریباً سبھی علاقوں میں مستعمل ہے۔ اس صنف سے متعلقہ گیتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ شادی بیاہ اور دیگر پرمسرت تقاریب میں گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں مسرت و بہجت کے جذبات کے علاوہ گاہے گاہے ہجر و فراق اور رنج و غم کے موقعے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ مشترکہ متضاد احساسات کا پرخلوص اظہار اس صنف کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی بڑی وجہ ہے۔ صوت میں مرد، عورت ناچ اور تالیوں کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ صوت میں دوگانے کا رواج بھی ہے اوستارہ سری (اے آئینہ دار دوپٹے والی) اس صوت میں ناز پرور حسینہ سے خطاب ہے۔

۱) اوستارہ سری
مار ڈالیگی یہ خوش خرامی تیری
مست رفتار ہے جیسے کبک دری
اوستارہ سری
ان سنوارے ہوئے گیسوؤں کی قسم
تو ہے میرے خیالوں کی نیلم پری
اوستارہ سری
تیرا جوبن سنگھار اور میرے لئے
اک قیامت ہے تیری کرم پروری
اوستارہ سری
ترے ہاتھوں کی مہندی ہے افسون رنگ
اور زلفیں گھٹاؤں کی جادوگری

اوستارہ سری

۲) ہیں بلبلیں نالہ فغاں میری جاں
میری خطا کیا ہے؟
تو کیا گئی کہ لٹ گئی آنکھوں کی روشنی
اب تیری یاد لوٹ نہ لے زندگی میری
میری خطا کیا ہے؟
کوہ و دمن بھی کرتے ہیں تیرا ہی انتظار
تو کھو گئی کہاں میری روٹھی ہوئی بہار
میری خطا کیا ہے؟
ڈھونڈے ہیں میری راتوں کی تنہائیاں تجھے
اب چاند آ بھی جا کہ یہ دل کی لگی بجھے
میری خطا کیا ہے؟
آئی گئی یہ رات مگر تو نہ آ سکی
تو ہی نہ اپنا وعدہ و پیماں نبھا سکی
میری خطا کیا ہے؟

دوصوتی - دوگانا:

لڑکی: ذرا رک مجھے اس بلندی سے نیچے اتار لے جانے والے
لڑکا: تجھے میں اتاروں یہ منظور اے شعلہ پوشاک، لیکن مجھے
اس کے بدلے میں کیا مل سکے گا؟
لڑکی: تجھ کو اپنا یہ ہار، اپنے ہاتھوں کے کنگن بخش دوں گی
لڑکا: مجھ کو اس ہار یا تیرے کنگن سے کیا واسطہ
میں تو شیدا ہوں نازک، کٹارا سی ناک اور پھنکارتے گیسوؤں کا
لڑکی: کٹارا سی ناک اور لہراتی زلفوں کا پانا
اس قدر کیوں ہے آسان جانا؟
میں تیرے ہاتھ کب آؤنگی۔ میں تو چھپ جاؤں گی
اونچی ٹہنی کے پتوں میں بن کر ترنج
لڑکا: چاٹ جاوں گا بنکر پہاڑی ملخ سبز پتوں کا جھنڈ
لڑکی: اور اگر میں برسنے لگوں دامن کوہ میں بن کے ہلکی پھوار
لڑکا: اک پہاڑی ہرن بن کے پی جاؤں گا آب شیریں ترا
لڑکی: اور اگر جوار کا دانہ بن جاؤں میں
جو پڑا ہو کسی خشک میدان میں
لڑکا: بن کے صحرا کا پنچھی اچک لوں گا میں
لڑکی: اور اگر بن کے خرگوش سو جاؤں میں، جھاڑیوں میں
لڑکا: بن کے چرواہا لاٹھی کے ضربوں سے میں تجھ کو چونکاؤں گا
لڑکی: اور اگر بن کے میں ایک پگڑی سر نوشہ پر بندھ گئی
او بتاؤ کہ پھر کیا کرو گے؟
لڑکا: تو میں ایک گانک بنوں گا تجھے دا دفن کے عوض مانگ لوں گا
لڑکی: اور اگر یہ کہوں میں ہوں بے آسرا باپ کی ایک مجبور بیٹی
لڑکا: تو بن کر فرشتہ اجل کا تجھے لے اڑوں گا
میں ان آسمانوں کے پہنائیوں میں
لڑکی: مجھے تیرا پیار اور تیرا یقیں دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگا ہے
کہ شہنائیاں گونج اٹھی ہیں اور ہر طرف ایک ہنگامہ
رقص و آہنگ ہے۔

زہیروک: طربیہ گیت ہی صرف زندگی نہیں، عیش و طرب کسی مرحلے پر فراق، رنج و غم کا روپ دھار لیتے ہیں اور ہجر و فراق کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ زہیر کے معنی ہیں یاد۔ گیتوں کی اس صنف میں عام طور پر انتظار، ہجر و فراق کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔ زہیروک یا زہیریگ عام گیتوں سے ذرا مختلف ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ یہ مخصوص غمناک موسیقی خصوصاً سرندہ کے ساتھ یا چکّی کی آواز کے ساتھ گائی جاتی ہے جیسا کہ (مہناز یا اشرف دراوغیرہ کی زہیریگ)

زہیریگ خواتین، خاص طور پر وہ خواتین جو اپنے دکھوں کو پوشیدہ رکھتی ہیں۔ رات کے آخری پہر چکّی کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر گاتی ہیں۔ اس میں گیت کے مواد کی اتنی اہمیت نہیں جتنی کہ اس آواز کی قدر ہے جو دلوں کو مسخر کر کے جذبات کو آنسوؤں کا روپ دیتی ہے۔ مردانہ زہیروک کے گانے والے شتربان ہوتے ہیں جو گھروں سے محلے سے بچھڑ کر دور کی منزل کے راہی ہوتے ہیں۔ اس گیت کے غمناک آہنگ بچھڑے ہوؤں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

۱) دشت جہاں میں
تیری تمنا
روشن ستارا

تیرے غموں سے۔ ہم سوختہ جاں
اے جان جاناں!
تیری جدائی، قلب ونظر کی۔
مرگ اور تباہی
دیوانگی ہے تیرا بچھڑنا۔
دل کا اجڑنا
تو بسی رہی ہے۔ دل میں ہمارے
گیسو سنوارے

۲) اے سبز کبوتر
اے سبز کبوتر مرا پیغام سنا دے
بچھڑے ہوئے من میت۔ اک سال گیا بیت
اے سبز کبوتر مرا پیغام سنا دے
تو آئے نہ آئے لیکن تو کہاں ہے
تو مجھ سے ملی تھی۔ پنگھٹ پہ اکیلی!!
اے سبز کبوتر مرا پیغام سنا دے
یہ قافلہ اور دھوپ۔ اس دل میں ترا روپ
اے سبز کبوتر مرا پیغام سنا دے

۳) شب رفتہ کبوتروں کی صدا
کر گئی میرے دل کو افسردہ
اے میری جان آ
آ میری جاں تجھے خدا لائے
پھوار نیلے سمندروں سے چلی
میں یہ سمجھا تیرے مہکتے ہوئے
مست گھنگھور گیسوؤں سے چلی
آ میری جاں تجھے خدا لائے!!
کوئی دیکھے بھری بہاروں میں
خوشبوؤں کی حسین پھواروں میں
دل ناداں تری اُمنگوں کو
آ میری جاں تجھے خدا لائے
دوست صحرا میں اس کی یاد یہاں
اس کی یادوں میں جل رہی ہے جاں
یاد آتی ہے اس کی ہر اک آن
آ میری جاں تجھے خدا لائے
کوئی مژدہ، کوئی پیام آئے
میں ہوں اس انتظار میں کب سے
چشم بر راہ، گوش بر آواز
آ میری جاں تجھے خدا لائے

لیکو: لیکو کو لئیکو یا ڈئیکو بھی کہا جاتا ہے۔ شتر بانوں اور چرواہوں کا یہ گیت خاران اور چاغی کے علاقوں میں خاص طور پر مقبول ہے۔ اس گیت میں عموماً مسافرت کا کرب، جدائی کا دکھ اور وصال کی آرزو بیان کی جاتی ہے اور مویشیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پہاڑوں اور بیابانوں کی منظر کشی ہوتی ہے۔ کہیں کہیں یہ صنف زہیروک سے بھی مماثل ہوتی ہے۔ لیکن اس کی مخصوص دھن اسے زہیروک سے ممیز کرتی ہے۔ یہ گیت اکثر و بیشتر الغوزہ یا سرندہ پر محفلوں میں گایا جاتا ہے۔ شتر بان لیکو کو اونٹ کے قدموں کی چھاپ کے ساتھ گاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سفر کی علامت بن جاتی ہے۔

۱) بلند آسماں پر
یہ بادل کا ٹکڑا
جو دیکھا
مجھے یاد آیا
بیان میں اونٹ اپنا
میرے اونٹ کا نام ہے۔
چار گوش
اور زینت ہے اس کی
جوانسال بی بی
نئے سرخ جوڑے میں ملبوس
میرا اونٹ ہے چاک و چوبند
پھرتیلا
اور منزل میرے سامنے ہے
میرے اور تیرے سامنے
یہ بلند اور مشکل پہاڑ

کیسے دو دل ملیں
کیسے پہنچے پیام
یہ چاہی کبوتر
سرآب جو
جو خرامان ہے
جب دیکھتا ہوں
تو دل تیری یادوں کی
گہرائی میں ڈوب جاتا ہے
میری محبوبہ سرو قد
آج کس شان سے
منتظر ہے میری

۲) کجیر جان
میں رکھ کے زانو پہ قرآن پاک بیٹھا ہوں
خدا کی حمد خدا ہی کا ذکر کرتا ہوں
کجیر جان یہاں سے کچھ اس طرح گزری
میں کچھ بھی کہہ نہ سکا اور دل کی دل میں رہی
کجیر جان ہے رسیلا توت کا دانہ!!
وہ جیتا جاگتا ماجرا ہے پریوں کا
سیاہ بال گھٹاؤں کے شامیانے ہیں
عذار انار کی کلیوں کے آشیانے ہیں
دل اس کی یاد میں پاگل ہوا اسیر ہوا
میں اس کے در کا بھکاری بنا فقیر ہوا
اس آگ میں میری جلتی ہے کائنات جلے
مگر دلوں کہ یہ سمبند کاش پھولے پھلے

۳) ماہ جان
لانئ مہہ جان کی ہے چاندی کی (۱) لانئ۔نتھ
اور آنکھیں خمار آلودہ
مجھ کو اللہ پر بھروسہ ہے
دل میرا پیار میں ہے آسودہ
زندگی حادثہ ہے کیا کیجئے
کاش یہ عہد استوار رہے
اپنا رومال تحفتاً دیدے
تاکہ یہ ایک یادگار رہے
تیرا رومال تیری ہاتھوں کی
تیری آنکھوں کی تیرے ہونٹوں کی
ساری خوشبو سمیٹ لائے گا۔(بشکریہ "درین" عطا شاد۔عین سلام)

لیلڑی: "صوت" کی طرح لیلڑی بھی بلوچستان کا ایک بیحد مقبول گیت ہے۔ لیلڑی کی تشبیہ پورے گیت میں لفظ "لیلڑی" کی تکرار ہے۔لیلڑی کے ایک ایک مصرعہ کا الگ الگ مطلب تو نکل سکتا ہے مگر جب پورا شعر پڑھا جاتا ہے تو وہ معنوی اعتبار سے غیر مربوط ہو جاتا ہے۔یہی لیلڑی کی خصوصیت ہے۔

۱) چپ چپ کھڑی ہو۔لیلڑی لا
ضو آنکھ کی ہو۔لیلڑی لا
اب نہ رہا جائے۔لیلڑی لا
تم سا نہ مل پائے۔لیلڑی لا
آؤ، چلی آؤ۔لیلڑی لا
اب نہ ترساؤ۔لیلڑی لا
الفت ہے جھل بل۔لیلڑی لا
آنکھوں کا کاجل۔لیلڑی لا
پربت کا پانی۔لیلڑی لا
تیری جوانی۔لیلڑی لا

۲) تو آئے مسکائے۔لیلڑی لا
زلفیں لہرائے۔لیلڑی لا
تو آب کہسار۔لیلڑی لا
ہے کونج رفتار۔لیلڑی لا
دودھ بھرا مشکیزہ۔لیلڑی لا
دل ہے تیرا آویزہ۔لیلڑی لا

۳) سیوی ہے سہ گام۔لیلڑی لا
دلبر کا پیغام۔لیلڑی لا
کونجوں کی ٹولی۔لیلڑی لا

شیریں ہے بولی-لیلڑی لا
سیوی ہے سلطان-لیلڑی لا
اورتو ہے ملتان-لیلڑی لا
سیوی ہے اک جہاں-لیلڑی لا
ڈھونڈ و تجھے کہاں-لیلڑی لا

۴) تو آئے نہ آئے-لیلڑی لا
رہتا کہاں ہے-لیلڑی لا
ترا اونٹ بد کے-لیلڑی لا
میں تیرے صدقے-لیلڑی لا
تو آج آئے-لیلڑی لا
بلوچی وفا ہے-لیلڑی لا

ڈیہی: بلوچستان کے مشرقی علاقوں کا مقبول لوک گیت ہے۔ ڈیہہ کے معنی ہیں "وطن" اور ڈیہی کے معنی ہوتے ہیں "وطن سے متعلق" مگر ضروری نہیں کہ اس صنف میں لازماً وطن یا علاقے کا تذکرہ ہو۔ ڈیہی میں ہجر و فراق کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ یہ صنف کہیں کہیں اپنی مخصوص دھن سے قطع نظر "صوت" سے مشابہت رکھتی ہے۔ یعنی وہ تمام مضامین اور خیالات بیان ہوتے ہیں جو صوت وغیرہ کا لازمہ ہیں۔ بلوچستان کے بعض علاقوں میں ڈیہی لوک گیت پہچانے بھی اسی طرح جاتے ہیں کہ ان میں لفظ "ڈیہی" کی تکرار ہوتی ہے۔

۱) پھوار و نور برساؤ
بہاریں کہہ کر و آؤ
گرج کر قریۂ جاناں میں جا کر رم جھماؤ
حسن و رنگ کیف چھلکاؤ
پھوار و نور برساؤ
زمیں کے کہنہ بیمارو!
کوہسارو!
مرمر و سیم و زر کے آہن کے انبارو
ذرا ان تشنہ لب خشک آب دریاؤں کو چھلکاؤ
پھوار و نور برساؤ
ذرا ان مشک پرورده شب آسا
گیسوؤں والی حسینہ کی خبر لاؤ
پھوار و نور برساؤ
گلاب و چندن و مشک و زباد و
مہلب و دُوپ و کلمپر اور عنبر
نقرئی طاسوں میں بھر بھر کر
خلوص شوق اور حسن تقدس سے
گھنی شب کی مہکتی تیرگی میں کھول کر
وقت سحر رنگیں شفق کی احمریں کرنوں پر بکھراؤ
حسین جذبوں کو اکساؤ
پھوار و نور برساؤ

۲) آ میری جاں کہ ترے بن کو چین نہیں
تیرے شب تاب سوؤں کی بہار
تیری آنکھوں کا مہکا مہکا خمار!!
سلک دنداں پہ گوہر شہسوار
میرے دل کا اجڑ گیا ہے قرار

====

جب سے اے جاں بچھڑ گئی ہے تو
مٹ گئے رنگ، اڑ گئی خوشبو
اب مری کائنات ہیں آنسو
اور یہ پارہ پارہ روح حزیں

====

میری آنکھوں کی روشنی ہے تو
دل کی دھڑکن ہے، زندگی ہے تو
شوخیٔ روح، عاشقی ہے تو
تو مرا غم نہ بن، خوشی ہے تو

موتک: موتک کو بلوچستان میں مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کہیں موتک، کہیں موتیگ اور کہیں مودگ مگر یہ مختلف جسم اس کی وحدت روح کی راہ میں کہیں رکاوٹ نہیں بنتے۔ موتک بلوچی میں موت سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں سوگ۔ اس میں مرنے والے کے لیے رنج و غم کا اظہار کیا جاتا ہے۔ موتک کا ہیئتی آہنگ زہیروک کی دھن سے بہت حد تک مماثلت رکھتا ہے مگر ساز کی اس میں قطعی گنجائش نہیں

موتک چونکہ میت کی موجودگی میں گھروں میں ہوتا ہے۔ زیادہ تر خواتین اسے آنسوؤں کے سیلاب میں گاتی ہیں۔ ایک ماں اپنے بیٹے کے لیے اس طرح موتک کرتی ہے۔

۱) شدت غم سے یہاں!!
اجڑے بھرے بھرے جہاں
آنکھوں سے میری اے خدا!
نور نہ چھین تو میرا
درد کو لا دوا نہ کر
لخت جگر کی دید سے
نور نظر کی دید سے
ویسا نہ بے نصیب کر
حالت مادر شفیق
کتنی زبون وزار ہے
دن میں دھواں دھواں سی میں
راتوں کو اشکبار ہوں
میرے جگر میں درد کا
شعلہ بھڑکتا ہائے ہے
دل ہے کہ غم کے بحر میں
یونہی دھڑکتا ہے سدا
ہائے وہ مادر زبوں
لخت جگر کے سوگ میں کتنی زبون وزار ہے
دن میں دھواں دھواں سے وہ
راتوں کو اشکبار ہے۔

۲) ہائے کریم داد
ہائے کریمداد
فرزند خوش سخن
تیرے فراق میں ہوں میں اسیر غم کہن
میں ایک شکست خوردہ صد رنج وصد محن
اُمید کا چمن
اس چرخ شعلہ بار نے برباد کر دیا
تقدیر نابکار نے برباد کر دیا
ایک ٹھیس اک چُبھن
مجبور زندگی کا مقدر بنی ہوئی
زخم جگر کا جاننے والا کوئی نہیں
میں ہوں شکستہ تن
طوفان غم نے لوٹ لیا حسرتوں کا شہر
تنہائیوں کا روح میں پھیلا دیا ہے زہر
ایسے میں جان من
جب کوئی طفل ماں کو پکارے تو کیا کروں
اِک تیر سا جو دل میں اُتارے تو کیا کروں

دستانگ: دستانگ لوک شاعری کا وہ خوبصورت انداز ہے۔ ایک فنکار الغوزہ بجا رہا ہے، دوسرا اس کے سامنے بیٹھا الغوزے کی دھن پر دستانگ گا رہا ہے۔ یہ منظر دیکھنے والا ہنس کر آگے بڑھ جاتا ہے لیکن جس میں لوک شاعری اور موسیقی کا ذرا سا بھی ذوق ہے وہ اس کے فنی پہلو پر حیرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ شروع دنوں میں ہم بھی اسے اہمیت نہیں دیتے تھے مگر ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے ساتھ وابستگی کے بعد جب سنجیدگی سے غور کیا تو لوک شاعری میں غزل یا صوت کے بعد اس کے مضامین نے خاصا متاثر کیا۔ دستانگ کوہستانی گونج ہے۔ دو چرواہے اپنا اپنا ریوڑ کسی چراگاہ میں چھوڑ دیتے ہیں اور دل بہلانے نڑ یعنی نے کو پھونک کر اسے مسرت وشادمانی کا ذریعہ بناتے ہیں جیسے شاعری کی لاتعداد بحریں ہوتی ہیں، موسیقی کے بہت سے راگ۔ اسی طرح دستانگ کی بھی بہت سی دھنیں ملتی ہیں اور مضامین بھی غیر دلکش نہیں ہوتے جیسے ان دو شعروں کا ذائقہ۔

میری محبوبہ ایک البیلی نار جو دفاتر کے دیواروں کی زینت ہے۔
کوہ بخوں کی طرح اس حور کا چہرہ مہرہ آسمانوں کو سجا رہا ہے۔
اس کے ہاتھوں پیروں، قد وقامت کو دیکھ کر ہوش چھن جاتا ہے۔
وہ بالکل حسین ودلکش چمن ہے واہ واہ کیا کہنا!!

ایسے مضامین کا انتخاب فارسی زبان کی قصیدوں کی یاد دلاتی ہے۔ ایک ناخواندہ چرواہے یا دیہاتی سے ایسے افکار کا اظہار بلوچی زبان کی فکری بلندی کا پیمانہ ہے۔ ایک مکالماتی دستانگ سن کر اس صنف پر ڈرامے کا گمان ہوتا ہے۔ ایک میاں بیوی گھر گرہستی میں مشغول ہیں۔ باہر سے صدا آتی ہے کہ مہمان آ گئے۔ شوہر باہر جا کر معلوم کرتا ہے۔ بیوی کو تو پہلے سے معلوم ہے کہ مہمان کون ہے؟ تاہم وہ شک رفع

کرنے کے لیے شوہر سے پوچھتی ہے۔ یہ مکالمے دستانگ میں اس طرح شامل ہے:

دیدہ ور دوپٹہ سر پر اوڑھ کر پوچھتی ہے مہمان کون ہے؟
شوہر گردن اونچی رکھ کر کے غصیلی آواز میں "ناڑی اور سری ہیں"
"کب تک رہیں گے؟"
"آج رات ہمارے مہمان ہیں۔ کل مال خریدیں گے۔"
آگ اسی وقت شعلہ بار ہوئی توے کا سینہ گرم ہونے لگا
دیدہ ور بھیڑوں کی قطار میں ایک ایک بھیڑ کو آزما رہی ہے۔
میں اپنے جہیز میں دی گئی بھیڑ کو ذبح کر کے محبوب کی دعوت کروں گی۔
گوشت، گندم اور پلاؤ کے ڈھیر لگ گئے
مگر جو ہماری قسمت میں تھی وہ لڑکوں بھالوں کے نصیب ہوئی۔

اس آخری فقرے میں محبوب اور محبوبہ کی ناکامی کا دل دوز واقعہ استعارے کی شکل میں ساری بات بتا رہا ہے۔ غزل کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ اس میں ہر طرح کے مضامین کی گنجائش ہے۔ یہی حال دستانگ کا ہے۔ عشقیہ باتوں کو ایک طرف رکھیں۔ اخلاق، تصوف سے بھی دستانگ بھرپور ہیں۔

گزشتہ رات نیند کی آغوش میں، میں نے کئی ایک کرامات کا مشاہدہ کیا
روح میرے قالب سے الگ ہو کر کلمے کا ورد کرتی ہوئی چل دی
ایک طرف میں تو دوسری طرف سے پاکیزگی وحی بن کر مجھ پر چھا گئی
مجھے حقائق سے آشنائی بخشی۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق
کے ارشادات مبارک کا سبق دیا گیا۔

دستانگ میں مذہبی افکار بھی ملتے ہیں۔ تاجا کے دستانگ میں عبادات اور بھلائیوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

تاجا یہ دستانگ پیش کر رہا ہے۔
اے نیک اور اچھے مسلمانو! آپ کی توجہ درکار ہے۔
دین کے خواندہ اور علم سے بہرہ یاب
ہم پر نماز اور روزے فرض کیے گئے ہیں۔
یہ فرائض کسی پر معاف نہیں ہیں
کہ یہ آنے والی دنیا کے لیے یعنی توشہ آخرت ہیں۔
یہ اچھے کھیت کا حاصل ہے۔
اس گھڑی جب سورج سوا نیزے پہ ہوگا۔
باپ بیٹے سے بیٹا باپ سے یکسو ہوگا۔
جسم پسینے سے شرابور ہوگا۔

دستانگ میں عصری مشاہدات بھی ملتے ہیں جیسے ہمارے ملک کی سیاست کی صورتیں روز اخبارات میں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح دستانگ نے بھی ایسی سرگرمیوں کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔

قوم میں یہ شور پھیل گیا ہے۔
ایوب کو ایک خاتون جھکا رہی ہے۔
وہ خاتون فاطمہ خانم، جناح کی چھوٹی بہن ہے۔
خاتون نے اکثریت کے ووٹ حاصل کیے۔
جعفر خان جمالی خاتون کا حامی تھا
یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ جب کوئی بیمار ہوتا ہے
تو طبیب کو دکھانا لازمی ہے۔

کوئی گھومتا پھرتا کسی ریلوے اسٹیشن پر آیا۔ وہاں "ریل کار" دیکھی وہ اس کی شکل و شباہت، اہمیت، رفتار کو اس طرح دستانگ کا موضوع بناتا ہے۔

میں نے ایک نیا موضوع اختیار کیا ہے۔
ریل کار پر گیت موزوں کر رہا ہوں
جس کی بوگیاں تین ہیں۔
اسٹیشن پر جب آ کر ٹھہرتی ہے۔
جوان شوق کے مارے اس پہ چڑھتے ہیں۔
دروازے شیشوں سے سجے ہوئے ہیں۔
جو آئینوں کی طرح فروزاں ہیں
ریشمی نرم صوفے اور سرہانے ہیں۔
ایک سیٹ تین آدمیوں کے لیے مخصوص ہے۔
چوتھے کو اس پر بیٹھنے کی اجازت نہیں
بالکل لاری کی طرح لیکن یہ موٹر نہیں ہے۔
میں نے ریل کار کو تو دیکھا
مگر معلوم نہیں کس طرف کو جا رہی ہے۔

شاعری میں جیسے مزاح نگاری ہوتی ہے۔ دستانگ بھی اس سے ماوراء نہیں۔ ایک کوہستانی رہ نورد شہر کی طرف آ رہا ہے۔ راستے میں اس کا جوتا پھٹ جاتا ہے۔ وہ اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ جوتا اس قدر ساتھ دے کر وہ شہر تک پہنچ جائے۔ وہ اپنے جوتے سے یہ مکالمہ بازی کرتا ہے۔

بلوچستان کا ایک کسان کھیت میں کام کرتے ہوئے (فریدہ حفیظ)

کھڑاوٹ کی رہگذر سے گزرتے ہوئے
ہم نے بیل کی گوشت کے کباب کھائے۔
پاؤں کی جوتی پھسل کر پاؤں سے نکلی
اور خم ٹھونک کر بولی
میں تیری رفاقت میں نہیں آسکتی
تجھ میں بھلائی کی کوئی خو بو نہیں ہے۔
تجھے میراثیوں کی ہم نشینی نے گمراہ کر دیا ہے۔
میں نے بڑی منت اور خوشامد کی
اس طرح ناراضگی کا اظہار نہ کر
سالہا سال سے تو میری ساتھی رہی ہے۔
میں دل سے تجھے چاہتا ہوں
اگر تو میرا ساتھ دے۔ میں تجھے شال کے بازار گھماؤں
حسینائیں وہاں تیرا دیدار کریں گی۔
نغمہ گر تجھ سے ملیں گے
اچھا اگر نہیں آئے گی کھڑواٹ کے پتھروں کانٹوں
میں پڑی رہے گی۔
گیدڑ تیرے آس پاس گزریں گے کتے تجھے نوچ کر کھائیں گے۔

ساز ینے وآلات

دھمال: موسیقی کے ذریعے مست ہو کر کسی بیماری کا علاج یا چوری کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔ بلوچستان میں ساز و آواز کے اس اہتمام کو "دھمال" کہتے ہیں۔

شبک: دمال میں مست ہو کر سراغ لگانے والے۔

شئے پرجا: ایک قسم کا یک طرفہ لیکن بڑا ڈھول جسے زمین پر کھڑا کر کے بجایا جاتا ہے۔ شئے پر باجا بجانے کے ساتھ ساتھ اس کے اردگرد گھوما اور ناچا بھی جاتا ہے۔

سروز: ایک قسم کا بلوچی ساز جو سارنگی سے ملتا جلتا ہے اور بلوچی کلاسیکی موسیقی میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔

دنبورگ: یہ بلوچی قدیمی ساز جو شکل میں ستار سے ملتا جلتا ہے۔ یہ ساز ڈھولک اور طبلے کی جگہ لے کر لے کو برقرار رکھتا ہے۔ کلاسیکی موسیقی سروز اور دنبورگ کے بغیر پیش نہیں کی جاسکتی۔

چنگ: ایک بلوچستانی ساختہ ساز جس میں ایک تار لگا ہوتا ہے۔ قریباً چھ انچ لمبا ہے۔ دانتوں میں داب کر انگلیوں کی مدد سے بجایا جاتا ہے۔

نڑیا گرو: اردو میں اسے نے کہا جاتا ہے۔ بانسری سے بڑا، الغوزے سے ملتا جلتا۔ اس ساز کو بجانے کے لیے ایک اور فنکار کی ضرورت ہوتی ہے جو اس سے سرملا کر دستانگ گاتا ہے۔

دستانگ: دستانگ یا داستان۔ یہ مخصوص گیت جو سرملا کرنڑ کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ یہ گیت عموماً چرواہے بھیڑ بکریاں چراتے وقت گاتے ہیں۔ اس میں رزمیہ اور عشقیہ دونوں طرح کے مضامین ہوتے ہیں۔

پنج بڑی: یہ خوشی اور بہجت کے گیت ہیں جو دولہا اور دلہن کے جوڑے کی کاٹ اور ناپ کے وقت گائے جاتے ہیں۔

چوگان: بلوچستان کے ایک مذہبی فرقے "ذگری" کے مقبول دینی نغمے جو رقص اور تاڑی کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔

دولٹی: یہ رقص کے ساز ہیں۔ دو لکڑیوں کے ٹکڑے جو رقص کے دوران سر سے ٹکرائے جاتے ہیں۔

رباب: یہ ایک مشہور ساز ہے جو بلوچستان میں پشتون اور بلوچ یکساں استعمال کرتے ہیں۔

بنجو: یہ ہر چند کہ غیر ملکی ساز ہے لیکن بلوچستان میں بہت مقبول ہے۔

چینا: یہ لوہے سے بنے دو ٹکڑے ایک رسی میں پروئے ہوتے ہیں۔ عام طور پر رباب کے ساتھ ملا کر بجائے جاتے ہیں۔ جن میں بڑی جھنکار ہوتی ہے۔

امبا: امبا اور دو قسم کے رقص ہیں جو ساحلی علاقوں کے ماہی گیروں کی ثقافت کے مظہر ہیں۔

بچوں کے گیت: بچہ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی جب ذرا ہوش سنبھالتا ہے تو کھیل کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ کھیل بجائے خود ایسا مسرت افزا عمل ہے کہ اس میں شوق کے مارے طبیعت تخلیق کرنے، بنانے اور سنوارنے میں مشغول ہو جاتی ہے اور کھیل کے دوران منہ سے نکلنے والے الفاظ بعد میں گیتوں کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسے لفظ سننے میں آتے ہیں جن کے معنی ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتے۔ بلوچی میں لڑکوں اور لڑکیوں کے روزمرہ کے مشاغل اور آس پاس کے مشاہدے کے مطابق

گیت ملتے ہیں۔ بچے جب کھیل کود کے لیے میدان میں نکلتے ہیں۔ سنے ہوئے یا خود گھڑے ہوئے چنچل گیت سنائی دیتے ہیں۔ اب اتنا تو ہر کوئی جانتا ہے کہ کوئی دلیر ہے تو کوئی بزدل، کوئی تیز وطرار ہے تو کوئی سستی و نکبت کا مارا مگر جب کھیل کے میدان سے یہ صدا گونجتی ہے کہ کون دلیر ہے، کون نکمہ اور بزدل، تو گھر میں بچے کے لیے چھپ کر رہنا مشکل ہو جاتا ہے، ذرا اس گیت کے بول پر توجہ فرمائیں:

لڑکے بھالو کھیل-آؤ کھیلیں بازی
کوئی بنے گھوڑا کوئی بنے تازی
درخت کی ٹہنی کاٹیں
پھل درختوں کا بانٹیں
اچھوں کو بلائیں
بزدل کو جگائیں

اس اعلان کا یہ اثر ہوتا ہے کہ لڑکے کودتے پھاندتے کھلاڑیوں کی صف میں پہنچ جاتے ہیں اور کھیل کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اب مرحلہ آتا ہے ٹاس کا۔ اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہر ایک گروپ یہی چاہتا ہے کہ تیز وطرار لڑکا اس کے گروپ کو ملے۔ ہر ٹولی کا ایک سرکردہ ہوتا ہے۔ ٹاس کے موقع پر یہ بول گائے جاتے ہیں۔

ایک پکارے ڈرّے ڈرّے
ایک پکارے باراں سرّے
چاند کی چاہ ہے یا تارے کی
کپتان-لاؤ دیدو چاند

دو لڑکوں میں جنہوں نے چاند ستارے کے فرضی نام لے رکھے ہیں چاند نکل کر ایک ٹولے کے کپتان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح گیت گاتے، غل مچاتے، ہنستے گاتے دونوں گروپ کھیل کی ابتدا کرتے ہیں، بانٹنے کا ایک اور گیت اس طرح ہے۔ دونوں ٹیموں کے کپتان ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔

گربی ورے-دنبگ؟
پچ کنے-لوچ؟ گری،
چمکلی، دنبگ بھیڑ کی چکی،
پچ، لباس، لوچ، ننگا

ظاہر ہے کہ چمکلی پر دنبگ یعنی بھیڑ کی چکی کو ترجیح حاصل ہے۔ اس طرح اچھا کھلاڑی منتخب ہو جاتا ہے۔ بات جب چمکلی کی آئی تو اس کے ساتھ ایک حقیقی کہانی کی طرف خیال گھوم جاتا ہے۔

ایک دیہات میں ایک اکیلی گدان (بلوچ خیمہ) میں ایک گھریلو خاتون رہتی تھی۔ شوہر اپنی محنت مزدوری کرنے گیا ہوا تھا۔ گاؤں کے لڑکوں بھالو نے کہیں ایک چمکلی دیکھی وہ اس کو پکڑنے کے لیے دوڑنے لگے۔ چمکلی جان بچانے کے لیے اس گدان میں داخل ہو کر بچے کے پنگھوڑے کے نیچے چھپ گئی۔ شریر لڑکے گدان میں داخل ہوئے۔ چمکلی کو پکڑنے پر اصرار کرنے لگے۔ خاتون خانہ نے کہا۔ چمکلی نے ہمارے ہاں پناہ حاصل کی ہے اب اس پر ہاتھ اٹھانے کا کوئی جواز نہیں مگر لڑکے کب کسی کی بات مانتے ہیں۔ انہوں نے ایک نہ ایک طریقے سے چمکلی کو وہاں سے نکالا اور مار ڈالا۔ شام کو جب اس خاتون کا شوہر آیا تو بیوی نے رو رو کر اس سے یہ واقعہ بیان کیا کہ کس طرح لڑکوں نے ہمارے معاشرت اور ثقافت کی توہین کی ہے۔ وہ آدمی آتش بجاں ہوا اور گاؤں کے لڑکوں کو سزا دینے بڑھ گیا۔ لڑکوں کے والدین اور رشتہ دار سامنے آئے۔ بات جا کر خون ریز جنگ کی شکل اختیار کر گئی کہتے ہیں۔ اس چمکلی کے تنازعے پر پچاس آدمی ہلاک ہوئے۔

ایسے قصے کہانیاں موسم سرما کی راتوں میں آگ تاپتے ہوئے قصہ گو سناتا ہے تو جو بچے آس پاس بیٹھے ہوئے ہیں وہ قصہ گو کا حوصلہ بڑھانے اور قصے کی پسندیدگی کے لیے اس طرح ستائش کرتے ہیں:

جی، بھلے جی، میٹھا دودھ پی
نہ مرنہ ہو بوڑھا، صدا رہو تازہ
گاؤں سے گاؤں، کھیت سے کھیت
ملیں گے کھجوروں کے بیٹھ
مقدر کا مالک کہو تیز چالک
دو بھیڑیاں ہیں، گدھا کرو یا گھوڑا بنالو

بچے راتوں کو بیٹھ کر چلہ پونچ کرتے ہیں۔ ایک انگوٹھی اچھال کر اسے دونوں ہاتھوں میں سے کسی ایک ہاتھ میں چھپا لیتے ہیں اور دوسرے بچوں کو موقع دیتے ہیں کہ وہ بتائیں انگوٹھی کس ہاتھ میں ہے اگر جیت گئے تو انگوٹھی لے کر وہ اچھالیں اگر ہار گئے تو پھر سے وہی کھیل دوبارہ کھیلتے ہیں۔ اس موقع کے لیے یہ گیت دہراتے ہیں۔

اڑنجی، بڑنجی کابل اور کل
کل مہہ کلاں
چمرو چل، آہڑو باہڑو
پوست پڑکی، ڈایاں ڈس

بلوچستان میں ضلع چاغی میں چاروں جانب پہاڑ ہیں لیکن درمیان میں طویل اور خشک صحرا۔ جب ہلکی پھلکی بارشیں ہوتی ہیں تو ان صحراؤں میں جڑی بوٹیاں

اگتی ہیں۔ان جڑی بوٹیوں میں "ہینگ" بھی جھاڑی کی صورت میں مل جاتا ہے جو بچوں کی من پسند بوٹی ہے۔ بچے غول درغول "ہینگ" تلاش کرتے ہیں اور یہ گیت زور سے چیخ چیخ کر گاتے ہیں۔ ہینگ کو خمو کا نام دیتے ہیں۔

خمو، خمو چھپا ہے ریت میں تو
خمو، خمو روتا ہے کیوں
باہر نکل ہم کو بتا
خمو، خمو ناراض کیوں؟
کس نے تجھے مارا بتا
خمو، خمو، سچ سچ بتا
کیوں ہے چھپا باہر تو آ
خمو، خمو کیوں نیند میں ڈوبا ہوا
اس گرم جلتی ریت سے
باہر تو آ، کھیلیں ذرا

اس قسم کے بچگانہ گیت بہت ہیں۔ یہ ایک دوگانا ہے۔ عام طور پر گڑیوں کے کھیل میں لڑکیاں گاتی ہیں۔ ایک لڑکی مصرعہ چھیڑتی ہے، دوسری اس کا جواب دیتی ہے۔ آخر میں تمام لڑکیاں یک زبان ہو کر چیخ چیخ کر خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔

ایک: آقا کہاں ہے؟
دوسری: بمبئی کو گیا ہے۔
ایک: کیا لانے گیا ہے؟
دوسری: منکوں کے دانے
ایک: کس نے ہیں پرونے،
دوسری: شانک اور مانک
ایک: بچہ ہے لڑکا یا ایک لڑکی؟
دوسری: لڑکا ہے بانو!
ایک: کیا نام اس کا
دوسری: نام ہے غریب شاہ
سب مل کر: غریب شاہ - غریب شاہ چھگی داڑھی والا

لڑکیوں کا ایک اور گیت - یہ بھی دو آوازوں میں ہے۔

ایک: میری کتیا کاٹنے والی
دوسری: میری چکی باٹنے والی
ایک: میری گھوڑی کی رفتار
دوسری: میری اونٹنی کی مہار
ایک: میرے گھر میں بے شمار برتن
دوسری: میرا زردار دامن

بارش:

کالی کالی بدلیاں
سفید ژالہ کا گماں
ہوا کی نرم لہر ہے
فضا میں میٹھی لہر ہے
چلے ہیں کوہسار سے
رکیں گے یاں پیار سے
گرج ہے بادلوں کا شور
بھرے ہیں نالے اور ڈور
خوش اس سے تیرا آسمان
خوش اس سے اپنا آشیاں
چمک رہی ہیں بجلیاں
چلا ہے ایک کارواں
وہ آ کے پہنچے گا یہاں
زمیں بنے گی گلستان
مدے کی بکریاں چریں
یلی کی گھوڑیاں پلیں

جھولا:

ہلتا جائے، مچلتا جائے
خوشیوں سے دل کو بہلائے
درختوں میں باندھے ہیں جھولے
منزل اپنی ہم نہیں بھولے
منزل اپنی آسماں
یہ میرا جھولا شورہ مست
وہ تیرا جھولا ہے جو پست
ساتھ تمہارے لڑکیاں
ساتھ ہمارے لڑکیاں

مسرتوں کا ہے سماں
ہے کھیل اور چہل بھی
خوشی سے چیختے سبھی
درخت بھی ہیں جھومتے
ہے وقت بھی رواں دواں

جلال کا کھیت: جلال تیرے کھیت میں
مہک رہا ہے گوبیا
ہم آئے ہیں کہ جھولیاں
بھریں اور کھائیں لوبیا
جلال تیرے کھیت میں
بہار کا گزر رہوا
ہم آئے ہیں کہ چادریں
بھریں ملے جولوبیا
جلال دے اناراک
جلال دے کچاراک
جلال دے متاراک
اگر ہے کھیرا کو برا
جلال ہم ہیں منتظر
جلال ہم ہیں مضطرب
جلال تیرے کھیت کو
اجاڑ کیوں ہے کیا ہوا

لوک کھیل

یوں تو بلوچستان میں دور جدید کے تقاضوں کے تابع فٹ بال، والی بال، ہاکی اور کرکٹ وغیرہ کھیلے جاتے ہیں مگر بلوچستان میں مقامی کھیل بھی کھیلے جاتے ہیں جو شہروں میں کم دیہات میں زیادہ اب بھی نوجوانوں اور بچوں کے مشاغل ہیں۔ان کھیلوں میں چند ایک مشہور کھیل یہ ہیں۔

جی: یہ کبڈی جیسا کھیل ہے۔اس میں برابر تعداد کی دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔سو گز قطر کا ایک دائرہ زمین پر کھینچا جاتا ہے۔ایک ٹیم دائرے کے اندر رہ کر مدافعت کرتی ہے اور دوسری ٹیم باہر سے حملہ آور ہوتی ہے۔اندر کی ٹیم کو "مڈہ" یعنی پکڑنے والی ٹیم کہتے ہیں اور دوسری کو جو حملہ آور ہوتی ہے "رو" یعنی مار کر بھاگنے والی کا نام دیتے ہیں۔ حملہ آور مدافعت کرنے والوں کے اردگرد مگر دائرے میں دوڑتے رہتے ہیں۔جونہی موقع ملتا ہے تو مدافعت کرنے والوں میں سے کسی کو چھو کر "رو" کہتا ہے۔جس کو چھو لیا گیا ہے وہ جھپٹ کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے اور اس وقت تک اس پر جھپٹتا رہتا ہے جب تک کہ حملہ آور دائرے سے باہر نہیں نکل جاتا۔اگر دائرے کے اندر حملہ آور کو پکڑ کر گرا دیا جائے تو وہ کھیل سے باہر نکل کر بیٹھ جاتا ہے لیکن اگر پکڑنے والے نے جس کو چھوا گیا ہے روک کر نہ گرا سکے تو دائرے سے باہر نکل کر بیٹھ جاتا ہے۔اس طرح دائرے کے اندرونی اور بیرونی کھلاڑی گھٹتے رہتے ہیں۔یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ ایک ٹیم کے سارے کھلاڑی ختم ہو کر باہر نہ بیٹھ جائیں۔اب مدافعت کرنے والی ٹیم حملہ آور بن جاتی ہے۔

مل: اس کھیل کو ہم کشتی کہہ سکتے ہیں۔لیکن یہ اس کشتی کی طرح نہیں جو پنجاب میں یا بین الاقوامی طور پر لڑی جاتی ہے۔اس میں مقابلہ کرنے والے ایک دوسرے سے چھاتی ملا کر اور کمر پکڑ کر داؤ پیچ لگاتے ہیں۔سندھ، افغانستان اور ایران میں بھی قدیم زمانے سے کشتی کا یہی طریقہ رائج ہے۔سندھ میں اسے "ملاکڑو" کہا جاتا ہے۔

جُپّ: اس کے معنی ہیں چھلانگ لگانا، اس کی وہی دو قسمیں ہیں۔ایک لمبی چھلانگ، دوسری اونچی چھلانگ۔جیسا کہ قاعدہ ہے، لمبی چھلانگ کے لیے ہموار زمین پر ایک نشان لگا دیا جاتا ہے۔جہاں سے کودا جاتا ہے۔البتہ اونچی چھلانگ کے لیے دو آدمی کسی کی پگڑی یا رسی تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔کھلاڑی اس رسی پر سے کودتے ہیں اور اس تنی ہوئی پگڑی یا رسی کو بالترتیب بلند کیا جاتا ہے۔بسا اوقات اس کی بلندی سردست سے ایک ہاتھ اوپر ہوتی ہے۔یہ بلندی اندازاً آٹھ نو فٹ کو پہنچتی ہے۔نوجوان اس پر سے کود جایا کرتے ہیں۔

رم یا تگ: یہ دوڑ لگانے کا کھیل ہے جو ہر علاقے میں عام طریقے سے کھیلا جاتا ہے۔

گروہ تاچی: یہ گھوڑوں اور اُونٹوں کے دوڑانے کا کھیل ہے۔بلوچستان میں یہ خصوصاً سبی میلہ کے موقع پر کھیلا جاتا ہے۔اس کے لیے مویشی بان سال بھر محنت کرتے ہیں اور جانوروں کو تربیت دے کر انعام حاصل کرتے ہیں۔یوں تو یہ کھیل قدیم ترین ہے مگر اس کی ایک جھلک بلوچستان کی تاریخ میں نہایت واضح ہے۔سردار چاکر اور گہرام خان کا زمانہ تھا۔سردار گہرام خان لاشاری کا بیٹا رامین خان سبی میلہ دیکھنے

اپنے دوستوں کے ساتھ آیا تھا۔ اسے شہر میں ایک خیمہ نظر آیا جس میں ایک حسین خاتون بیٹھی تھی۔ رامین نے اس خاتون کو ہاتھ ڈالنا چاہا۔ اس موقع پر ریحان حسن رند نے اسے روکا اور حصول کے لیے گھڑ دوڑ کا چیلنج دیا۔ دونوں اپنے گھوڑوں کو لے کر دور تک گئے اور پھر دوڑ شروع کی۔ ایک نظم میں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ دونوں جوان مقابلے میں برابر برابر دوڑ لگاتے رہے مگر رامین ہار گیا۔ ریحان جیت گیا یہی مقابلہ بعد میں تیس سالہ خانہ جنگی کا سبب بنا تھا۔

لٹ وٹلی: یہ کھیل گلی ڈنڈے سے ملتا جلتا ہے۔ عام طور پر کمسن لڑکے ہی کھیلتے ہیں۔ ضلع چاغی میں اس کا نام "انڈا، انڈان" ہے۔ یہ دو کھلاڑیوں کے درمیان کھیلا جاتا ہے۔ کھلاڑی لکڑی کی بنی ہوئی گیند کو ایک نالی نما لکیر میں ڈال کر اس کھڈ سے جسے "ڈانگو" کہتے ہیں۔ دور دھکیل دیتا ہے۔ گیند جہاں پہنچتی ہے وہاں مٹی کا ایک چھوٹا سا ٹیلہ بنا کر گیند کو اس پر رکھتے ہیں۔ اب وہی کھلاڑی جس نے گیند کو دھکیلا تھا وہاں سے اپنی سوٹی پھینک کر گیند کو اس ٹیلے سے گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس نے گیند کو مار کر گرا دیا تب دوسرے کھلاڑی کی باری آتی ہے ورنہ پاس کھڑا کھلاڑی گیند کو ضرب لگا کر دور لے جاتا ہے۔ دوسرے کھلاڑی بھی مل کر گیند کو ضرب لگا کر بھگاتے لے جاتے ہیں۔ پہلا کھلاڑی جس نے گیند کو نالی نما لکیر سے دھکیل دیا تھا۔ ان کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گیند کو ضرب لگانے والے کھلاڑی سے اپنی سوٹی سے ٹھوکا لگا دیتا ہے یا پھر گیند کو ان سے چھین کر واپس اسی جگہ پہنچا دیتا ہے جہاں سے اس نے دھکیلا تھا۔ اب اس کھلاڑی کی باری آتی ہے جس کو اس نے اپنی سوٹی سے ٹھوکا پہنچا دیا تھا۔ اگر ٹھوکا نہ دے سکا ہو اور گیند کو چھین کر لایا ہو تب کسی اور کھلاڑی کی باری آتی ہے۔ اس کھیل میں ٹیمیں نہیں ہوتی ہیں۔ کھلاڑی انفرادی طور پر کھیلتے ہیں۔ اس کھیل کی مندرجہ ذیل شکلیں ہوتی ہیں۔

ڈانگوئی: لکڑی کے گیند کو ایک چھوٹے سے گول کھڈ میں جسے ڈانگو کہتے ہیں اور جو اسی غرض سے بنایا جاتا ہے، ڈال دیا جاتا ہے۔ کھلاڑی باری باری اپنی سوٹیوں کو اس انداز سے کھڈ میں مار کر گیند کو کھڈ سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کھلاڑی گیند کو کھڈ یا ڈانگو سے نکالنے میں کامیاب ہوتا ہے وہی اس پر پہلی ضرب لگاتا ہے اور پھر وہی، "انڈ، انڈان" کے طریقے پر کھیل جاری رہتا ہے۔

کسوکولی: کھیل شروع کرنے کے مقام سے تقریباً پانچ سو قدم کے فاصلے پر ایک لمبی لکیر کھینچ دی جاتی ہے۔ کھلاڑی اس مقام سے گیند کو اپنی سوٹی کے سرے پر رکھ کر اچھالتا ہے اور ضرب لگاتا ہے۔ اگر اس نے گیند کو اپنی سوٹی کے ضرب سے لکیر سے پار کر دیا تو اس کی ٹیم نے ایک نمبر حاصل کر لیا۔ اس کھیل میں برابر کی دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔ جس ٹیم نے زیادہ گیندیں لکیر کے پار کر دیں، وہ جیت گئی۔ اب زمین پر ایک دائرہ کھینچ دیا جاتا ہے۔ جیتی ہوئی ٹیم کے کھلاڑی باری باری اس دائرے کے اندر آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہاری ہوئی ٹیم کے ممبر گیند کو دائرے کے اندر ڈالنے کے لیے اُوپر پھینکتا ہے جبکہ جیتی ہوئی ٹیم گیند کو دائرے کے اندر گرنے نہیں دیتی اگر دائرے کا کھلاڑی ضرب نہ لگا سکا گیند دائرے میں گر گئی تو وہ کھلاڑی کھیل سے باہر ہوگا اور دوسرا کھلاڑی کھیلنا شروع کرے گا۔ دو کھلاڑی لائن مین کا کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ گیند لمبی لکیر سے گذری ہے کہ نہیں۔

ٹیپ ٹاپ۔ اللہ لولی: اس کھیل میں دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔ ہر ٹیم کا ایک کپتان ہوتا ہے۔ ٹاس کیا جاتا ہے۔ جس ٹیم نے جیتا اس کا کپتان ہاری ہوئی ٹیم کے کپتان کو لکیروں کے ایک دائرے میں کھڑا کر کے اس کی آنکھیں بند کرتے ہوئے اللہ لولی اللہ داد کا ورد کرتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھی جا کر کہیں چھپ جاتے ہیں۔ جب کپتان کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ساتھی پوری طرح چھپ گئے ہیں۔ وہ ہاری ہوئی ٹیم کے کپتان کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا دیتا ہے۔ ہاری ہوئی ٹیم کا کپتان دوسری ٹیم کے ساتھیوں کی تلاش کے لیے جاتا ہے۔ اگر اس نے چھپے ہوؤں کو پا لیا تو دوڑ کر دائرے میں پہنچ جاتا ہے اور دائرے کی حفاظت کرتا ہے۔ دوسری ٹیم کے کھلاڑی اس پر وار کرتے ہیں۔ اگر اسکا ہاتھ کسی کھلاڑی کو لگا وہ جیتا۔ اب دائرے میں دوسرا کھلاڑی آ جاتا ہے چھپے ہوئے کھلاڑیوں کی تلاش کرنے والے کے ساتھ دوسرا کپتان چلاتا ہوا اللہ لولی اللہ داد کا ورد کرتا رہتا ہے۔

پوسی مہاراجی: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ گنتی کا کھیل ہے جو عموماً ہندوؤں کا پیشہ ہوا کرتا ہے۔ براہوئی تین اور بلوچ بیس سے زیادہ گنتی نہیں جانتے تھے۔ گنتی کرنا ہندوؤں کا کام سمجھا جاتا تھا۔ بہر حال اس کھیل میں اگر ربڑ کا گیند ملے تو زیادہ اچھا ہے ورنہ لکڑی کے گیند سے کام چلایا جا سکتا ہے۔ برابر برابر کی دو ٹیمیں اس کھیل میں حصہ لیتی ہیں۔ تقریباً دو انچ چوڑے بلے پر گیند کو اچھال کر گنتی کی جاتی ہے جب گیند بلے سے نیچے گر جاتا ہے تو وہ کھلاڑی بیٹھ جاتا ہے اور اس کا ایک دوسرا ساتھی کھیلنے لگ جاتا ہے۔ اس طرح جو ٹیم زیادہ حساب بناتی ہے، وہ جیت جاتی ہے۔ اس کے بعد کھیل کا دوسرا دور دائرے کے اندر شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا بیان کشکولی اوڈک ڈالی میں پہلے کیا جا چکا ہے۔

بیڑی یا مجولی: تاش کی طرح اس کھیل کی کئی قسمیں ہیں۔ بھیڑ یا بکری کے گھٹنے کی ہڈی کو بیڑی یا مجول کہتے ہیں۔ یہ کھیل چونکہ ان ہڈیوں سے کھیلا جاتا ہے۔ طاق و جفت، ٹونگی اور سرو کے علاوہ اس کی اور بھی بہت سی قسمیں ہیں جیسا کہ: گوڑی، یہ کھیل پہلے سنگ مرمر کی گولیوں سے کھیلا جاتا تھا جو زیادہ تر ترکستان، افغانستان اور ایران سے آتی تھیں۔ وہاں پر بھی اس کھیل کا بہت رواج ہے۔ آج کل شیشے کی بنی ہوئی گولیاں عام ہو چکی ہے یہ کھیل بھی کئی طرح سے کھیلا جاتا ہے۔

ہوئی یا خانہ ڈکوئی: یہ نوجوانوں کا کھیل ہے جو راتوں کو کھیلا جاتا ہے۔ اس کی دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔ ایک ٹیم جا کر چھپ جاتی ہے اس کے لئے اسے مہلت دی جاتی ہے۔ جب وہ وقفہ پورا ہو جاتا ہے تو ٹیم کا کپتان ہُو کی ایک لمبی آواز نکالتا ہے۔ مطلب یہ کہ محفوظ رہو۔ اب دوسری ٹیم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ ان کو ڈھونڈ نکالے۔ اندھیری راتوں میں یہ ایک خطرناک کھیل ہے۔ چھپنے والی ٹیم کسی گھر میں، کسی ویران کھنڈر میں یا پہاڑوں کی کسی کوہ میں یا کسی ندی نالے میں جہاں وہ خود کو محفوظ سمجھے، چھپ جاتی ہے۔ ڈھونڈنے والی ٹیم پھیل کر مگر ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھ کر ان کو ڈھونڈ نکالتی ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سپیدہ سحر نمودار ہونے تک بھی چھپے ہوؤں کو ڈھونڈ کر نہیں لا سکتے اور چھپی ہوئی ٹیم جیت جاتی ہے۔ اگر ڈھونڈے پر مل جائے تو دوسری ٹیم کے چھپنے کی باری آتی ہے۔

ترپ چلی: یہ بھی نوجوانوں کا کھیل ہے جو چاندنی راتوں میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا بالکل رگبی (Rugbi) جیسا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ رگبی میں ایک خاص قسم کا گیند استعمال ہوتا ہے۔ اس کھیل میں بھیڑ کی ایک خاص ہڈی سے کام لیا جاتا ہے۔ اس میں برابر کی دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔ ایک جگہ مخصوص کرتے ہیں جہاں سے ایک منصف اس ہڈی کو جہاں تک ممکن ہو سکے میدان میں دور پھینک دیتا ہے۔ اب دونوں ٹیمیں اس ہڈی کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں جس کھلاڑی کو ہڈی ملے وہ بڑے زور سے "ترپ چلی" کی آواز نکالتا ہے اور اس طرف بھاگنے لگتا ہے جہاں سے ہڈی پھینکی گئی تھی۔ اب یہاں سے رگبی جیسی پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی ہے۔ ہڈی ایک کے ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ بالآخر جس ٹیم کا کھلاڑی ہڈی کو منصف تک پہنچاتا ہے، وہی ٹیم جیت جاتی ہے۔

ورندوئی (باڑی): ورندوئی کا کھیل مشرقی اور مغربی بلوچستان میں ایک مقبول کھیل ہے۔ اس کھیل کی خاصیت بھاگ دوڑ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا ہے۔ مکران میں اس کھیل کو ورندوئی کہتے ہیں۔ اس میں دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔ کم از کم دس کھلاڑی ہونے چاہئیں۔ اس کے کپتان کو "تیگان" کہتے ہیں۔ ٹاس کیا جاتا ہے جو ٹیم ٹاس جیت جائے وہ حملہ آور کا کردار ادا کرتی ہے۔ دوسری ٹیم دفاع کرتی ہے۔ میدان میں چونے سے لکیریں کھینچی جاتی ہیں۔ پانچ خانے بناتے ہیں۔ پہلے خانے میں دفاعی ٹیم کا کپتان اور باقی خانوں میں اس کی ٹیم کے ساتھی نہایت بیداری اور ذمہ داری سے کھڑے ہوتے ہیں۔ دوسری ٹیم کے کھلاڑی ایک ایک کر کے حملہ کرتے ہیں کہ بغیر چھوئے ان پانچوں خانوں سے گزریں اور پھر اسی تدبیر سے واپس آئیں کہ کوئی ان میں سے کسی کو بھی چھو نہ سکے۔ اگر وہ اس طرح کامیاب ہوئے تو دوسری بازی بھی ان کی ہے لیکن اگر دفاعی ٹیم کے کسی بھی حملہ آور ٹیم کے کھلاڑی کو چھو لیا تو حملہ آور ٹیم دفاعی پوزیشن میں جاتی ہے۔ رکھلاڑی اپنے خانہ میں حملہ آور ٹیم کا مقابلہ کرتا ہے۔ جبکہ بازار پورے کا پورا کپتان کے حوالہ ہوتا ہے وہ پوری لائین کا دفاع کرتا ہے۔

کپتان		
نمبر۱		
	با	نمبر۲
نمبر۳	ز	
	ا	نمبر۴
نمبر۵	ر	

لاٹوری: یہ بچوں کا کھیل ہے جو عموماً راتوں کو کھیلا جاتا ہے۔ اس میں دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔ ایک دائرہ کھینچ دیا جاتا ہے۔ ایک ٹیم ٹاس کرنے پر اگر جیت جائے حملہ آور ہوتی ہے۔ دوسری دفاع کرتی ہے مگر دائرے کے اندر کھیل شروع ہونے سے پہلے دفاعی کھلاڑی دائرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے کپتان کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی ہے۔ حملہ آور ٹیم کا کپتان زور سے آواز دیتا ہے۔ اس کے ساتھی آس پاس چھپ جاتے ہیں جونہی دفاعی ٹیم کا کپتان چھپے ہوؤں سے دور نکل جاتا ہے۔ چھپے ہوئے دوڑ کر دائرے میں بیٹھے ہوؤں کو پیٹنے لگتے ہیں۔ چیخ و پکار سے کپتان دوڑ کر آتا ہے۔ دائرے میں ایک رسی کو تھام کر وہ حملہ کرنے والوں کا مقابلہ کرتا ہے مگر اسے رسی چھوڑنے اور دائرے سے نکلنے کی اجازت نہیں۔ اس حالت میں اگر حملہ آور ٹیم کے کسی کھلاڑی کو ہاتھ لگا تو دائرے میں ان کی قید ختم ہو جاتی ہے اور دوسری ٹیم دائرے میں بیٹھ جاتی ہے۔

چلّہ پونچی: سردیوں کے موسم میں باہر جا کر کھیلنے کا جواز نہیں ہوتا۔ آگ کے اردگرد بیٹھ کر بچے ایک انگوٹھی سب کو دکھا کر چھپا لیتے ہیں۔ اب ہر ایک کو موقع دیا جاتا ہے کہ دونوں ہاتھوں میں چھپی ہوئی انگوٹھی کا سراغ لگائیں۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہتے ہیں: یہ ہے۔ اگر انگوٹھی ملی تو وہ جیت گیا ورنہ پھر سے کھیل دوبارہ شروع کرتے ہیں۔ اسکو چلّہ پونچی کہتے ہیں۔

نامے کئے: یہ بچوں کا کھیل ہے۔ اس میں ایک ٹیم اپنے لئے بھیڑ، بکری، اونٹ گھوڑے، بیل وغیرہ کے اعضاء سے متعلق ایک خفیہ نام تجویز کرتی ہے۔ پھر سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس طرح جانوروں کے تمام اعضاء کے نام دہرائے جاتے ہیں۔ تا آنکہ خفیہ تجویز کردہ نام دریافت ہو جاتا ہے۔ جو اس ٹیم نے اپنے لیے مقرر کیا تھا۔ اب دوسری ٹیم کی باری آتی ہے۔ وہ بھی اس طرح کوئی خفیہ نام تجویز کر لیتی ہے۔ اس کھیل سے مراد بچوں کا بھیڑوں، بکریوں، اونٹوں اور گھوڑوں وغیرہ کی اقسام اور ان کے اعضا جسمانی سے واقف ہونا ہے۔

برفی: برف باری کے موسم کا ایک شغل۔ اس میں ایک برتن میں برف بھرتے ہیں اور اس کے اندر کوئلے کا ایک ٹکڑا چھپا کر رکھتے ہیں۔ برتن کو اس طرح ڈھکا جاتا ہے کہ وہ ایک خاص تحفہ یا سوغات معلوم ہوتا ہے۔ پھر اسے مختلف دوستوں اور ہمسایوں کے گھروں کو بھیجا جاتا ہے۔ اگر ہمسائے یا دوست نے قبول کیا تو اسے بھیجنے والے کے پورے گھر کی دعوت کرنی پڑتی ہے اور اگر وہ اس بات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ قلعی کل جاتی ہے تب بھیجنے والے کے ذمے دعوت ہو جاتی ہے۔

گھر، گرہستی

لوگ: بلوچستان کی ایک خاص رہائش گاہ جس کی بنیاد تقریباً چھ فٹ تک مستطیل نما اور اس کے بعد سے چھت تک کا حصہ TANT جیسا ہوتا ہے۔ لوگ اینٹ یا مٹی سے نہیں بلکہ کھجور کے درخت کے مختلف حصوں جیسے کنٹ کرز اور پیش سے بنایا جاتا ہے۔

گزدپی: پہاڑی گنے کی خشک لٹوں، پیش اور کرز سے بنایا گیا ایک خاص طرز کا ایک پٹ والا دروازہ جو لوگ کے لیے مخصوص ہے۔

کل: لوگ سے ملتی جلتی ایک امیرانہ رہائش گاہ جس کے مستطیل نما چھ فٹ تک کچی مٹی یا اینٹوں کی مدد سے بنائی جاتی ہے اور اوپر کا حصہ چٹائی کرز کنٹ وغیرہ سے مکمل کیا جاتا ہے۔ کل میں گزدپی کی بجائے دروازے لکڑی کے لگا دیتے ہیں۔

برپشت: کھجور کی فصل "آمین" کے دوران فصل وغیرہ کی نگہداشت کے سلسلے میں ایک امیرانہ رہائش گاہ جو کہ نخلستان میں بناتے ہیں۔ برپشت لوگ سے چھوٹا ہوتا ہے۔

ٹبو: چٹائی کی بنی ہوئی ایک غریبانہ رہائش گاہ جس کی بنیاد مستطیل کی بجائے دائرہ نما ہوتی ہے۔

کڈک: ٹبو سے ملتی جلتی جھونپڑی پیش اور کرز سے بنائی ہوئی رہائش گاہ جو اکثر مال مویشیوں کے باڑہ کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

منک: وہ ستون جو لوگ یا کل کے بازوؤں کی طرف سے متوازی گاڑے جاتے ہیں۔ یہ تعداد میں دو ہوتے ہیں۔

تیر: وہ کنٹ جو منک کے اوپر زمین کے متوازی لگایا جاتا ہے۔

چک منک: وہ باریک لکڑیاں جو لوگ یا کل کے تنبو نما حصہ میں لگائی جاتی ہیں۔

دودپ: ٹبو پر پشت اور کڈک کی طرح تیر منک اور چک منک کی مدد کے بغیر بنائی جانے والی رہائشگاہ۔ دودپ چٹائی سے بنائی جاتی ہے۔ لیکن ٹبو کی طرح گول نہیں ہوتی اور اس کے دونوں بازو (عرض کی طرف کے حصے) بغیر دز بند یا گزدپی کے کھلے رہتے ہیں۔ ساخت کے اعتبار سے دودپ لوگ یا کل کا اوپری حصہ (مستطیل نما سے ملتی جلتی ہے)

کاپر: ایک چار پایہ سائبان جو کنٹ کرز سے بنایا جاتا ہے اور گھروں کے سامنے دیوان عام یا نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ کاپر کے اوپر کھجور پکنے یعنی آمین کے موسم میں کھجوروں کو خشک کرنے کے لیے بھی رکھا جاتا ہے۔

دوسرپ: آٹھ منگوں کی مدد سے بنایا جانے والا (ہشت پایہ) سائبان جو دو کاپروں کے برابر ہوتا ہے۔

گدان: دودپ سے ملتی جلتی مگر کمان نما لکڑیوں پر بکری کے بالوں سے بنی ہوئی خانہ بدوشانہ رہائش گاہ گدان کہلاتی ہے۔ اس کے پس منظر میں کچھ توہم پرستی بھی ملتی ہے۔ بلوچی معاشرت میں عام لوگوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ جہاں بکری کے بالوں کا استعمال ہوا ہے وہاں جن بھوت نہیں آ سکتے۔ باریک بینی سے اگر مشاہدہ کیا جائے تو بچے کے پنگھوڑے کے رسیوں، آٹے کی تھیلوں، دودھ کے مشکیزوں کے منہ جن رسیوں سے باندھے جاتے ہیں وہ بکری کے بالوں سے ہی بنائے جاتے ہیں۔

گندار: وہ کمان نما لکڑیاں جن پر گدان کو کھڑا کیا جاتا ہے۔

رسم ورواج

وش آ تک یا بیادرشات: بلوچ قبائل ہی نہیں شہری زندگی میں بھی یہ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ "خوش آمدید" کا ایک روائتی انداز ہے، جس میں مجلس کا بزرگ یا قبیلے کا سردار حاضرین کی باقاعدہ اجازت سے آنے والے کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اس کے بعد نووارد سے "حال" یا چہبر دریافت کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ بزرگ یا سردار اپنے علاقے کے حال سے نووارد کو باخبر کرتا ہے۔ یہ رسم اتنی اہم ہے کہ اگر نووارد سے حال نہ کیا جائے تو ایسے معیوب مقام یا علاقے سے مہمان دور بھاگتے ہیں۔

حال یا چہبر: وہ سفری سرگذشت یا آمد کی وجوہات، جو ملاقات کرنے والا نووارد وش آ تک یا بیادرشات کے دوران سردار یا میر مجلس کے دریافت کرنے پر بیان کرتا ہے۔ حال یا چہبر دینے والا خدا تعالیٰ کی بزرگی اور ایمان کی سلامتی سے ابتدا کرتا ہے اور بیان میں کسی قسم کی دروغگوئی یا مصلحت آمیزی کو معیوب، بزدلی، اور گناہ خیال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اگر اہل مجلس کے کسی عزیز کو قتل کرنے آیا ہے یا قتل کا ارادہ رکھتا ہے۔ چہبر دریافت کرنے پر وہ نہایت جرأت اور بے باکی سے اظہار حال کرتا ہے۔

چہبر کے لیے واقفیت ضروری نہیں، قبائلی حدود میں داخل ہونے والا یا سرراہ چلتے ہوئے کسی شخص سے بھی چہبر دریافت کیا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانے میں جبکہ اخبار، ریڈیو اور خبر رسانی کے ذرائع نہیں تھے۔ اس رسم سے ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقوں کے حالات سے باخبر ہوتے تھے اس لیے کہ نووارد سے حال چہبر کے بعد لازمی تھا کہ اپنے گاؤں یا علاقے کے حالات سے نووارد کو آگاہ کیا جاتا اب یہ نووارد جب کسی اور جگہ جا کر رکتا تو اس گاؤں کی صورتحال کو بھی اپنے حال یا چہبر میں سمو دیتا۔ اس طرح ایک مسافر کے ذریعے دور نزدیک کی صورتحال سے لوگ باخبر ہو جاتے۔

چوٹ ءِ بند: اس لفظ کے معنی ہیں جوتے کا بند۔ حال اور چہبر کی ایک قسم یہ ہے کہ نووارد اپنے گھر سے چلتے ہوئے یہاں تک پہنچنے میں کن کن مسائل سے دوچار ہوا۔ کیا دیکھا، کیا پایا، ان تمام باتوں کو تفصیل سے بیان کرے جن میں اہل مجلس کی دلچسپی بڑھتی رہتی ہے۔

دوپٹائی: ایسا بھی ہوتا ہے کہ نووارد عجلت میں ہو یا اہل مجلس کا میر دیوان مجلس برخاست کرنے والا ہو تو مختصر حال پر جسے دوپٹائی کہتے ہیں، انحصار کرنا پڑتا ہے۔ جو کم سے کم وقت میں بیان کی جاسکے۔

پلوشریک: وہ دو تین قبیلے جو ایک ہی علاقے میں آس پاس رہتے ہوں او ربوقت جنگ وجدال ایک دوسرے کی مل کر مدد کرتے ہوں، پلوشریک کہلاتے ہیں۔ قبائل کے اس عملی رسم کو پلوشریکی کہتے ہیں۔

میار: اگر معاشرت، تہذیب یا روائتی قدروں کے منافی کوئی عمل سرزد ہو جائے تو وہ عمل میار کہلاتا ہے۔ ایسا شخص میار بار ہوتا ہے۔ میار کا تعلق ایک فرد سے اور معاشرت سے یکساں ہوتا ہے یعنی فعل ایسے ہوتے ہیں جو ایک شخص کے نفع وضرر کے ساتھ ہی پورے معاشرے کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ سماجی اقدار سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً کسی کے گھر آ کر معافی مانگنا، دشمن کو معاف کر دینا (وہ قاتل بھی ہوسکتا ہے) ایک مقدس سماجی قدر اور تہذیب کا تقاضہ ہے۔ لیکن اسے معاف کرنا قتل کرنا میار کہلاتا ہے یعنی عیب یا عار یا شرم کی بات وغیرہ کے الفاظ۔ مختلف طرز اظہار سے ایسے موقع پر استعمال تو کئے جاسکتے ہیں لیکن ان سے کوئی روائتی یا سماجی پس منظر نہیں ابھرتا۔ میار کا مطلب پناہ میں آنیوالا بھی ہے اور اسے بچانے کی تدبیر کرنا یا اس کی حفاظت کرنا بھی میار کے مفہوم میں شامل ہے۔ جو کسی کو پناہ دیتا ہے وہ میار دار کہلاتا ہے۔ جو شخص میار کا پاس نہیں رکھتا بلوچ معاشرے میں اسے بے میار یعنی ذلیل، غیر مہذب تصور کیا جاتا ہے۔ میار بار- ملامتی کا مستحق۔

دیوان: قبائلی سرداروں یا دیگر معتبرین کی مجلس مشاورت دیوان کہلاتی ہے۔ دیوان میں شریک ہر شخص کو اس کی اہمیت کے پیش نظر ادب واحترام سے کام لینا پڑتا ہے۔

جرگہ: متنازعہ فریق کے سردار یا معتبرین کا (جو اپنے اپنے قبیلوں کی نمایندگی کرتے ہیں) دوسرے غیر جانبدار قبائلی سرداروں کے معیت میں متنازعہ فریقین کے درمیان فیصلہ صادر کرنے والا دیوان جرگہ کہلاتا ہے۔

لٹ و بیر: کسی قبیلے کے فرد یا افراد کو زدوکوب کئے جانے یا قتل ہو جانے کے انتقام کو لٹ وبیر کہا جاتا ہے۔ لٹ کی معنی ہیں لاٹھی، بیر کہتے ہیں بدلے کو۔

میل: حملہ آور دشمن کے خطرے کی مدافعت میں یا دشمن پر حملہ کرنے کی صورت میں مجتمع ہو کر مقابلے کے لیے بڑھنا یا رات بھر خطرے سے نپٹنے کی صورت میں جاگنا میل کہلاتا ہے۔

میل کشی: بڑی قبائلی لڑائیوں میں فریقین کی طرف سے مجتمع ہو کر نعرے لگانا، ڈھول بجانا، تلواروں کو بے نیام کرنا۔ کلہاڑے ہوا میں لہرانا، پگڑیاں اچھالنا اور آگے

ایک بلوچ اپنے اونٹوں کے ساتھ (تصویر: محسن خان)

خان آف قلات کا قلعہ جہاں قائداعظم نے قیام کیا تھا (تصویر: عرفان)

بڑھ کر دشمن سے مقابلے تک کو میل کشی کہا جاتا ہے۔ یہ میل کشی فریقین کے آمنے سامنے ہونے تک رہتی ہے۔

ہکل: قبائلی اقدار میں اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ ہکل کے معنی ہیں للکارنا، خواہ انفرادی معاملہ ہو یا کہ اجتماعی۔ دشمن کو للکار کر مقابلے کی دعوت دینا ہے۔ ہکل کی صورت میں دشمن کو یہاں تک موقع دیا جاتا ہے کہ اگر وہ نہتا ہے تو اپنے گھر یا آس پاس سے گاؤں جا کر خود کو مسلح کرے اور مقابلے کے لیے ہکل کی جگہ آ جائے۔

میڑھ: بڑی قبائلی لڑائیوں کو وقتی طور پر فرو کرنے کے لیے ذیل کے ذرائع کو بروئے کار لانا میڑھ کہلاتا ہے۔

۱) کوئی سید زادہ قرآن پاک لے کر عین لڑائی میں فریقین کے مابین آ جاتا ہے۔ قرآن پاک کے تقدس اور سید کے احترام میں جنگ روک دی جاتی ہے۔

۲) کوئی ایک یا چند بوڑھی عورتیں ننگے سر، چادر گلے میں ڈال کر جنگ کے دوران درمیان میں پڑ جائیں۔

۳) کسی ہندو کا ایک یا ایک سے زیادہ افراد عین لڑائی میں برسر پیکار فریقین کے درمیان پڑ جائیں تو جنگ رک جاتی ہے۔ یہ اقدام میڑھ کہلاتا ہے۔

میڑھ مرکہ: چند غیر جانبدار قبائل کے معتبرین جن میں متعلقہ علاقے کا کوئی سید زادہ بھی شامل ہو، قصوروار یا زیادتی کرنے والے قبیلے کے چند بزرگوں کو اپنے ہمراہ لے کر مدعی قبیلے کو باقاعدہ اطلاع دے کر ان کے ہاں جاتے ہیں اور صلح و صفائی کراتے ہیں (جس میں معافی مانگنا بھی شامل ہے) اسے میڑھ مرکہ کہتے ہیں۔

مٹ: جنگ آزما قبائل کے کسی ایک فریق کے مقتولین کے خون بہاء، زخمیوں کے عوضانے اور دیگر نقصانات یا دوسرے فریق قبیلے کے مقتولین کے خون بہا، زخمیوں کے عوضانے اندازہ لگا کر ان سب کے تناسب کو مٹ کہتے ہیں۔

ڈاہی: وہ غیر متعلقہ شخص جو چھپے ہوئے دشمن کو حملے کی تیاری کرتا دیکھ کر دوسرے قبیلے کو مطلع کرے یا کسی قتل یا موت کی خبر پہنچائے، ڈاہی کہلاتا ہے۔

ڈاہ نشان یا ڈاہ چیدہ: وہ نشانات جو خطرہ جنگ کی صورت میں اپنے قبیلے کے افراد کو مطلع کرنے کے لیے مخصوص اور متوقع آمد و رفت کے راستوں اور مقامات جیسے چشمے، کنوئیں کاریز وغیرہ میں لگائے جاتے ہیں۔ بعض قبیلوں کے اپنے مخصوص چیدہ یعنی نشانات بھی ہوتے ہیں۔ ایسے نشانات صرف اپنے قبیلے کے افراد کو معلوم ہوتے ہیں۔

بڈی یا پوڑی: جرگہ یا میڑھ مرکہ کی صورت میں کسی متنازعہ فریق کو عوضانہ یا جرمانہ یا شرمانہ کے طور پر جو عائد شدہ رقم دینی پڑتی ہے وہ اس قبیلے کے جملہ افراد میں (عورت اور بچوں کے علاوہ) برابر تقسیم کی جاتی ہے۔ اس طرح اس جمع شدہ اجتماعی جرمانہ کی رقم کو بڈی یا پوڑی کہتے ہیں۔

شرمانہ: کسی عورت کو کسی غیر مرد سے گزند پہنچنے یا اس کی توہین کئے جانے کو شرمانہ کہتے ہیں۔ یہ فیصلہ جرگہ کی طرف سے ملزم پر عائد ہوتا ہے۔ جرگہ اس رقم کی ادائیگی یا سزا دینے کا مختار ہے۔

حشر: کئی افراد کا مل کر کسی ایک شخص کے کام کی تکمیل کرنا یا مدد دینا حشر ہے۔ عموماً فصلوں کی کٹائی یا مکان بنانے، بھیڑ بکریوں کے بال کاٹنے یعنی جسمانی محنت سے متعلق ہے۔ اس میں مالی امداد شامل نہیں۔ حشر و مدد کرنے والے گروہ کے لیے جس شخص کی مدد کی جا رہی ہے ایک وقت کا کھانا اخلاقاً ذمے ہوتا ہے۔ ضلع چاغی میں اسے حشر و آواچک کہتے ہیں یہ امداد باہمی کا قبائلی انداز ہے۔

راجی زمین: قبائل میں زمین کی ملکیت دو طرح کی ہوتی ہے ایک انفرادی یا ذاتی اور دوسری قسم "راجی زمین" ہوتی ہے۔ یہ قبیلے کی مشترکہ میراث ہے۔ جس قبیلے کی یہ مشترکہ زمین ہے اسے سارے افراد مل کر زیر کاشت لاتے ہیں اور فصل کی آمدنی بھی قبیلے میں برابر تقسیم ہوتی ہے۔ اس زمین کی نگرانی قبیلے کے سردار کے ذمے ہوتی ہے۔

تلام: یہ رسم صرف مکران میں پائی جاتی ہے، جہاں نخلستان کی فراوانی ہے۔ بہت سے آدمیوں کا مل کر درختوں کے تنوں یا بہت سے کھجوروں کے "کنٹ" کو ایک خاص طریقے سے لانے کو "تلام" کہتے ہیں۔ اس رسم کے دوران ڈھول پیٹنے اور گانا گانے کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔

مرک و زند: یہ ایک ایسا عہد و پیمان ہے جو اعزا و اقربا یا دوستوں کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ ایک سماجی مقاطعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ "مرک و زند" کا عہد نبھانے والے نہ کسی کی خوشی میں شریک ہوتے ہیں نہ موت کے سوگ میں حصہ لیتے ہیں۔

مستاگی: یہ لفظ مژدہ سے مرکب ہے۔ بچے کی ولادت یا کسی دوست کی آمد یا کوئی انوکھا واقعہ جس سے صرف مستاگی دینے والا باخبر ہوتا ہے۔ وہ جب یہ خوشخبری سناتا ہے تو اس کا حق بنتا ہے کہ اسے اس کا صلہ رقم یا کپڑوں کی صورت میں دیا

جائے۔اس کو مستاگر کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

شیشگان: یہ ایک رسم میزبانی ہے جس کے تحت اگر مہمان کو پہلے دن دودھ یا گھی پیش کیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا مہمان مزید ایک دن قیام کرے۔لیکن اگر بکری یا بھیڑ ذبح کر کے مہمانی کی جائے تو یہ اشارہ ہے کہ ایک دن ٹھہرنے کے بعد مہمان رخصت ہو جائے۔

ونڈی: کچھ گاؤں ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں شہری سہولتیں موجود نہیں۔قصاب کے نہ ہونے کی صورت میں کوئی ایک شخص بھیڑ یا بکری خرید کر ذبح کرتا ہے پھر جتنے لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے اتنے حصے کر کے بانٹتے ہیں اور جانور کی قیمت اسی تقسیم کے طور پر جمع کی جاتی ہے۔ونڈ کے معنی ہیں "حصہ"۔

کوڑی: بہت سے لوگوں کا مل کر کسی ڈاکو کی تلاش میں نکلنا یا کسی جرائم پیشہ کو قابو کرنا۔اس اجتماعی عمل کو، کوڑی کہتے ہیں۔جبکہ ساحلی علاقوں میں ایسے اجتماع کو جو ماہی گیری کے لیے مہینے دو مہینے کے طویل دوروں پر ہو سنیگار کا نام دیا جاتا ہے۔

بازو: بیوہ عورت متوفی شوہر کے ورثا کا "بازو" کہلاتی ہے اور متوفی کے ورثا میں سے قریبی وارث مثلاً متوفی کا بھائی یا چچازاد بھائی یہ حق رکھتا ہے کہ اس بیوہ سے نکاح کرے۔

نیاڑی: بیٹی، بہن اور اس کے علاوہ اپنے خاندان کی دیگر عورتیں جن میں بیشتر سے مذہباً نکاح ناجائز ہے نیاڑی کہلاتی ہیں اور ان کا ہر طرح سے احترام اور ان سے ناجائز تعلقات حرام قرار دیئے گئے ہیں۔

سیہ سر: اپنی بیوی کے علاوہ دیگر تمام جوان عورتیں "سیہ سر" ہیں یعنی قابل احترام۔

برادری: بلوچی رواجی اصطلاح میں وہ افراد جو ایک ہی خاندان سے ہوں۔کوئی غیر قوم، غیر فرقہ، غیر علاقہ برادری میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

سیال: سیال وہ ہوتا ہے کہ قبائلی رسومات کے مطابق شادی غمی میں شریک ہو۔سیال ان تقریبات میں جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ اس کو پیش آنے والی صورتحال میں واپسی یا امانت ہیں۔

تقریبات

بوتن: بچے کے پیدا ہونے کی تقریب۔اگر لڑکی ہے تو ایک دن اور لڑکا ہے تو چھ دن تک خوشی مناتے ہیں۔خوشی کی اس رسم میں "سیالی" بھی دی جاتی ہے اور صفت خواتین دوہراتی ہیں۔

سپت: بوتن کے موقع پر خواتین زچہ کے ہاں راتوں کو جمع ہو کر سپت یا صفت گاتی ہیں۔صفت حمد و نعت، صوفیانہ کلام اور اولاد کی درازی عمر کے لیے دعائیں ہوتی ہیں۔

ششگ: بچے کے پیدا ہونے کے چھ دن تک خواتین صفت گاتی ہیں، چھٹے دن نام رکھنے کی تقریب ہوتی ہے جس میں برادری اور سیال لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے۔بچے کے کان میں اذان دی جاتی ہے۔دعوت طعام ہوتی ہے شیرینی بانٹی جاتی ہے۔

جھنڈ: بچے کی پیدائش کے چالیس دن بعد بچے کے بال منڈوانے کی تقریب ہوتی ہے۔اس موقع پر خیرات و نیاز دیتے ہیں۔کچھ لوگ بزرگوں کے مزارات پر جا کر بچے کے بال منڈواتے ہیں۔

تور: اگر بچہ لڑکا ہے تو اس کے ختنے کی تقریب منائی جاتی ہے جس کو تور کہتے ہیں۔اس موقع پر بھی خیرات کی جاتی ہے۔

گام بُری: بچے کے نئے نئے اٹھ کر چلنے کی تقریب میں بچے کے قدموں میں جائے نماز بچھا دی جاتی ہے اس پر مچکی لڑھکا کر بچے کو کئی بار چل کر روٹی اٹھانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔گام بُری کے بعد خیرات کی جاتی ہے۔

آش: یہ تقریب بچے کے پہلے دانت نکالنے کے موقع پر ہوتی ہے۔اس خوشی کی تقریب میں "ڈلگ" پکا کر بچے کو چٹاتے ہیں۔

شلوار: اس تقریب میں بچے کو شلوار پہناتے ہیں۔جس کے بعد اسے اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ وہ عملی زندگی میں شامل ہوتا ہے۔اس تقریب کے بعد بچے کو درسگاہ میں پہنچاتے ہیں۔

شادہ بیاہ کی رسمیں

خبر بندی: لڑکے کی طرف سے لڑکی کے گھر رشتے کی بات چیت ہوتی ہے۔

ربالو: رشتے کی بات چیت کے سلسلے میں لڑکے والوں کی طرف سے جانے والا پیغام رساں شخص یا عمر رسیدہ خاتون کو ربالو کہتے ہیں۔خاتون ربالو کی آمد کی خبر سن کر متعلقہ لڑکی اپنے آپ میار اچھا لیتی ہے اور سامنے آنے سے کتراتی ہے۔بسا اوقات لڑکی کی صورت اور سیرت سے باخبر ہونے کے لیے خاتون ربالو بے نام ہو کر جاتی ہے تا کہ لڑکی اس سے چھپ نہ سکے۔

سانگ: سانگ منگنی کو کہتے ہیں۔اس کے کئی ایک مرحلے ہیں۔سب سے پہلے ربالو لڑکی کے والدین اور رشتہ داروں سے مل کر رشتے کی تفصیلات طے کرتا ہے۔شرائط کیا ہیں، ولور کتنا

ہوگا۔ دولہا بننے کے لیے کب تک انتظار کرنا ہوگا۔ جب یہ ساری باتیں طے ہو جاتی ہیں تو عشاء کی نماز سے پہلے لڑکے کے والد، بھائی گاؤں کے دوسرے شرفا کے ساتھ لڑکی والوں کے گھر آتے ہیں۔ تمام طے شدہ باتوں کو دہرایا جاتا ہے تا کہ شرفا سب سن لیں۔ مولوی صاحب سے درخواست کی جاتی ہے۔ دعا کرنے کے بعد مٹھائی بانٹی جاتی ہے اور صبح لڑکے کی والدہ اور بہنیں لڑکی کے سر پر دوپٹہ ڈالنے اور انگوٹھی پہنانے آتے ہیں۔ اب منگنی مکمل ہے۔

لب: یہ زمین یا جائیداد جو لڑکے کی طرف شادی سے پہلے لڑکی کے نام کی جاتی ہے۔ بعض علاقوں میں زر نقد استعمال ہوتا ہے یہ رقم لڑکی والے لڑکی کو تحفے دینے کے لیے مقرر کرتے ہیں۔

پرداچ: وہ کپڑے اور زیورات جو شادی سے موقع پر لڑکے کی طرف سے لڑکی کو دیتے ہیں۔ پرداچ سانگ (منگنی) کے موقع پر خواتین مل کر طے کرتی ہیں۔

چٹ: وہ جوڑا یا زیور جو لڑکے کی طرف سے شادی کی بات طے ہو جانے کے بعد دیا جاتا ہے۔ چٹ بچے کی پیدائش کے فوراً بعد بھی دیا جا سکتا ہے۔ (باہمی رضامندی سے) چٹ دینے کے بعد لڑکی لڑکے کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔

کلہ: شادی کی تقریب شروع ہونے پر لڑکی کو "مایوں" بٹھایا جاتا ہے جس کے اندر وہ نکاح کی رات تک اور نکاح کے بعد تین دن تک لڑکی والوں کے گھر رہتی ہے۔ کلہ لوگ، کل کے کسی کونے میں اس صورت میں باندھا جاتا ہے کہ اس میں دلہن قبلہ رو ہو کر بیٹھ سکے۔ شادی سے متعلق تمام رسومات دلہن سے متعلق اسی کلہ میں ادا کی جاتی ہیں۔ کلہ میں ہر کس و ناکس کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ صرف دلہن کی سہیلیاں اس کے ساتھ بیٹھ سکتی ہیں۔

دان ڈلی: شادی کے سلسلے میں آٹا پیسنے کی ایک تقریب جس میں کئی عورتیں مل کر کئی چکیوں سے اناج پیستی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ خوشی اور مسرت کے گانے گاتی رہتی ہیں۔

دزکی حنی: نکاح سے دو راتیں پہلے ایک رات کو دولہا اور دلہن کو شادی کی مہندی لگاتے ہیں۔ دزکی کے معنی ہیں چھپکے سے، کسی پر اظہار کیے بغیر۔

حنی بند: دوسری رات کو مہندی لگانے کی کھلی رسم ہوتی ہے۔ مہندی لگانے کے لیے جس خاتون کا انتخاب ہوتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلی شادی والی ہو۔ دوسری شادی شدہ کو یہ کام نہیں سونپا جاتا۔ مہندی لگانے والی خاتون پہلے دلہن کے مہندی لگاتی ہے۔ جتنی دیر میں وہ مہندی لگاتی ہے عورتیں چاروں طرف جمع ہو کر خوشی کے گیت اور دف بجاتی ہیں۔ اس کے بعد دولہا کے مہندی لگانے کی رسم بھی یہی خاتون ادا کرتی ہے۔ دونوں تقریبوں میں دلہن اور دولہا کے سر پر چادریں تھانی جاتی ہیں۔ لوگ اس میں اپنی حیثیت کے مطابق روپے ڈالتے ہیں۔ بعد میں یہ روپے مہندی لگانے والی خاتون کو دیے جاتے ہیں۔ اس کو سرگشت کہتے ہیں۔

مشت بند: دلہن مہندی لگانے سے پہلے اپنی دونوں مٹھیاں مارے شرم کے بھینچ لیتی ہے۔ مہندی لگانے والی خاتون اس کے ہاتھ میں مٹھائی یا نقد رقم رکھ دیتی ہے۔ تب اسے مہندی لگتی ہے۔

سرگواپ: جس خاتون نے دلہن کے مہندی رچائی ہے وہ دلہن کو سنوارنے کا کام انجام دیتی ہے۔ اس دوران شادی بیاہ کے گانے ہوتے ہیں۔ دلہن کو سنوارنے پر سرگواپ (یعنی گیسو سنوارنے والی) کو مناسب معاوضہ دیا جاتا ہے۔ جب کہ دولہا کو اس کے دوست قریبی ندی پر لے جا کر نہلاتے ہیں جس کو "رگان" کی رسم کہتے ہیں۔ دولہا کو سنوارنے کے بعد گھوڑے پر بٹھا کر تخت پر پہنچاتے ہیں۔ اگر گھوڑا نہ ہو تو دوست یا بھائی دولہا کو کندھے پر بٹھا کر لاتا ہے۔

حنی لوجی: مہندی لگانے کی تقریب کے بعد لڑکیاں اور لڑکے مہندی کے پیڑے بنا کر ایک دوسرے پر ملتی ہیں اور خوب ہنسی خوشی ہوتی ہے۔

جن: برات کو کہتے ہیں جو شادی کے آخری دن ہر طرف سے سمٹ کر دلہن کے گھر پہنچتی ہے۔ اس میں گویا اور ڈھول بجانے والے میراثی بھی ہوتے ہیں۔

دیوان: جب دولہا کو سجا کر لاتے ہیں تو ایک سجی ہوئی چارپائی یا پلنگ پر بٹھاتے ہیں اور ایک تلوار اس کے سرہانے رکھتے ہیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر مہمانوں کی خاطر تواضع ہوتی ہے اور یہ ہنگامہ نکاح خوانی تک جاری رہتا ہے۔ نکاح کے موقع پر جو گواہ دلہن سے قبولیت لینے جاتے ہیں۔ خواتین شرارت کر کے ان کو بہت تنگ کرتی ہیں۔

گس دپی: یہ آخری رسم ہے جو دولہا دلہن کے قرب سے پہلے دلہن کی سہیلیاں کرتی ہیں۔ وہ دلہن کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرتی ہیں۔ ایک سہیلی دروازے کی باہر کھڑی رہتی ہے۔ سہیلیوں کے دولہا سے کچھ مطالبات ہوتے ہیں۔ ان کو پورا کرنے کے وعدے کے بعد دولہا اندر داخل ہو سکتا ہے۔

کشیدہ کاری

بلوچستان میں کشیدہ کاری پورے صوبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ مکران، چاغی، خاران، کچھی اور سبی کے مضافات میں ایسی خوبصورت کشیدہ کاری ملتی ہے جسے اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ممالک میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ذیل میں کشیدہ کاری کی مختلف اقسام کا ذکر ہے:

پشک: بلوچی میں پشک کے معنی ہیں قمیض یا کرتہ۔ خواتین کے پہناوے تو کشیدہ کاری کے بغیر

نہیں ہوتے۔ کچھ علاقوں میں مردوں کے کرتوں کے گریبان، کندھوں اور آستینوں پر کشیدہ کیا جاتا ہے۔

ذی یا جیگ: عورتوں کے پشک یعنی قمیض کا کشیدہ کردہ گریبان کا کشیدہ گردن سے سینے تک ہوتا ہے۔

پندول یا گمتان: خواتین کے قمیض کے جیگ سے لے کر دامن تک جیب ہوتا ہے۔ یہ پورے کا پورا کشیدہ سے سجایا جاتا ہے۔ اس جیب کی لمبائی تقریباً 1.5 فٹ اور 3/4 چوڑائی ہوتی ہے۔ اس کا نچلا حصہ مستطیل اور اوپر تکون تکونی حصہ دو طرف سے کھلا ہوتا ہے۔

بندوک یا ذی بند: ایک خوبصورت رنگین پھول دار دھاگہ ہوتا ہے جو عورتوں کے پشک کا گلہ باندھنے کے لیے مختلف رنگوں کو ملا کر بٹا جاتا ہے۔

دوچ: پشک کا بلوچی کشیدہ یا کشیدہ کا فن۔

برگیر: پشک کی ابتدائی کاٹ اور ناپ وغیرہ۔

اوتاگ: کپڑے کا وہ تار جسے کپڑے سے نکال کر کشیدے کے مختلف راستے بنائے جاتے ہیں اور ان راستوں پر کشیدہ ہوتا ہے تاکہ توازن قائم رہے۔

بغل گشاد: رنگین کپڑے کا ایک ٹکڑا جو پشک کی دو بغلوں میں سیا جاتا ہے۔

چکن: چمڑے کی کشیدہ کاری جو عام طور پر جوتوں پر کی جاتی ہے۔

لوپ: بلوچی ٹوپی کی ایک قسم جو کاٹ میں کنٹوپ سے ملتی جلتی ہے مگر کنٹوپ کی طرح اتنی لمبی نہیں ہوتی کہ کانوں تک آجائے۔ اس کے کشیدے میں شیشے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔

کشیدہ کاری کی اقسام کے نام:

گل وایر کش: یہ خاص قسم کی کشیدہ کاری ہے جو سرخ رنگ کے ریشم کے کپڑے پر کی جاتی ہے۔ اس قسم کے دوچ (کشیدہ) کی ہوئی پشک شادی کی رات دلہن کو پہنائی جاتی ہے۔ یہ سات رنگوں کی کشیدہ کاری ہے جس میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔

ٹال وٹک: آسمانی رنگ کے ریشمی کپڑے کے لیے دو رنگی کشیدہ کاری ہے۔ یہ پشک شادی کے تیسرے دن دلہن کا پہناوا ہوتا ہے۔

کنڈی گل: سات رنگی ایک اور کشیدہ کاری جو زرد رنگ کے ریشمی کپڑے پر کی جاتی ہے۔

پیت وٹک: ڈگار دوچ، چورا دوچ، دوسوتی، شیشگی، کانٹلو، موسم، مرگی پانچ، سئے کڈک، پنچ کڈکی، جالار مختلف قسم کے کشیدوں کے نام ہیں۔

کھجور کا درخت اور اسکے متعلقات

گش: نر کھجور کا درخت یا نر کھجور جو فصل کے لیے مادہ کھجور کے کچے خوشوں سے پیوند کیا جاتا ہے۔

پینگ: گش نہ کرنے کی صورت میں خراب و خستہ فصل کو پینگ کہتے ہیں جو عام مدت سے تقریباً ایک ماہ بعد پکتی ہے۔

پکم: گش کا گچھا اور ابتدائی فارم جو نرم اور میٹھا ہوتا ہے اور کھانے کے کام آتی ہے۔

کونش: کھجور کے درخت کی جڑ سے نکالی جاتی ہے جو برف کی طرح سفید اور شہد کی طرح میٹھی ہوتی ہے۔

پیش: کھجور کے پتے۔ ایک جھاڑی مرزی ہوتی ہے۔ اس کے پتوں کو بھی پیش کہا جاتا ہے۔

کرز: کھجور کی ٹہنی سکھا کر پتے جھاڑ کر گھروں کی تعمیر میں استعمال ہوتا ہے۔

کلم پوگ: کھجور کی ٹہنی کرز کو کاٹنے کے بعد اس کی خشک جڑ کو جس سے نئی ٹہنی پھوٹتی ہے، کلم پوگ کہتے ہیں۔

لمپش: پکی کھجور چننے کے بعد جو خشک خوشے جاتے ہیں لمپش کہلاتے ہیں

ہوش: پکی ہوئی کھجور کے گچھے۔

پپک: گش کرنے کے بعد خرما کی سب سے ابتدائی شکل۔

رنگ: کھجور کا دانہ ابتدا میں سبز ہوتا ہے۔ پکنے کے دوران اس پر رنگ آجاتے ہیں۔

کلونٹ: کچی کھجور کے دانے۔

ناء: تیار شدہ کھجور

سورا پگ: ایک غیر قدرتی طریقہ پخت سے پکائی گئی کھجور کلونٹ پر نمک اور پانی چھڑک کر اسے دیگچی میں چھان کر بند کر دیا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ نرم ہو کر لذیز بن جاتا ہے۔

پیش نا: سب سے پہلے پکنے والی کھجور

آمین: کھجور کے پکنے کا موسم

برادر: برپھل کو کہتے ہیں۔ وار کے معنی ہیں کھانے والا۔ وہ خانہ بدوش جو آمین کے دوران نخلستان میں آ کر اقامت کرتے ہیں، کھجوریں چنتے اور جمع کرتے ہیں۔ آمین ختم ہونے پر واپس چلے جاتے ہیں۔

پارنجی: ایک رسم میزبانی جس میں کھجور جمع کرتے وقت راہگیر یا مسافروں کو بلا کر کھجور پیش کرتے ہیں۔

کوت: کھجوروں کے مختلف اقسام کے ڈھیر۔

شگنز: ایک مخصوص قسم کا پاڑہ جو عارضی طور پر آمین دنوں میں لگایا جاتا ہے جس میں الگ الگ کھجور کے ڈھیر لگاتے ہیں۔ شگنز کھجوروں کے چوروں اور جانوروں سے محفوظ رکھنے کے لیے بناتے ہیں۔

کھجور کی اقسام: پیش نا، شکری، گونزلی، گوک نا، آپ دندان، سہریں آپ دندان، کلیرو، حسینی، وش کلونٹ، پل، روگنی، کوزنباد، دشتاری، موزاتی، سہر، ربئ، سبزو، کہربا، حسکینچ، بیگم جنگی، چپ شک، جلینی، لیش پاگ۔

کھجور سے بنی ہوئی غذائیں: چانگال، مدر، پنڈی، کپو، ہنبی، لڑ، پڑبند، مانریچ، دانگی، ککی، دزلگاش، کتل، سندپشت، موچ۔

دیگر غذائیں

خذیت یا تبائیگ: موسم سرما کی آمد پر پلی ہوئی بھیڑ یا بکری کو ذبح کرتے ہیں مگر کھال نہیں اتارتے بلکہ کھال کے بال صاف کرتے ہیں۔ پھر اسے تیز آگ پر گھماتے ہیں تاکہ اگر کوئی ہلکا بال رہ گیا ہو تو صاف ہو جائے۔ اب اس پر اندرون بیرون نمک مصالحہ چھڑک کر مکان کی چھت سے لٹکاتے ہیں جب یہ خشک ہو جائے تو اس کا گوشت کاٹ کاٹ کر پکاتے ہیں۔ یہ گوشت پورے موسم سرما میں خراب نہیں ہوتا۔ سرد ترین علاقوں میں اس کا بہت رواج ہے۔

غور مایا گرما: سالم بھیڑ کے گوشت کو پانی میں اس حد تک پکایا جاتا ہے کہ ہڈیاں الگ ہو جاتی ہیں۔ پھر اسے دودھ بلونے والے مشکیزہ میں ٹھونس دیتے ہیں۔ یہ گوشت بھی مدتوں تک خراب نہیں ہوتا۔ سفر کے دوران یا شدید سرد موسم میں استعمال کیا جاتا ہے۔

سبزک: کچے گندم کے دانوں کو بھون کر خشک کیا جاتا ہے اور پھر پیس کر گھی اور شکر ملا دیا جاتا ہے۔ یہ سفوف سبزک کہلاتا ہے۔ اسی طرح جو کے کچے خوشوں کو سکھا کر، پیس کر کھجور اور گھی ملا کر کھاتے ہیں۔ یہ "پشت" کہلاتا ہے۔

بیرہ: گندم کے دانوں کو صاف کر کے لسی میں ملا دیا جاتا ہے۔ کئی دنوں تک رکھنے سے غلہ لسی کو جذب کر لیتا ہے۔ بعد میں سکھا کر پیستے ہیں۔ مناسب مقدار میں گھی ڈال کر آمیزہ بناتے ہیں۔ یہ بھی کھجور کے ساتھ کھاتے ہیں۔

سوریں ماہیگ: مچھلی کو کھارہ اور نمک لگا کر کسی سرد جگہ لٹکاتے ہیں۔ جب یہ بالکل سوکھ جائے پھر اسے چھیل کر پکاتے ہیں۔

زرشود: مچھلی کو کاٹ کر دھویا جاتا ہے۔ اس میں نمک، گرم مصالحہ ڈال کر کئی دنوں تک دھوپ میں رکھ کر سکھاتے ہیں۔ حسب ضرورت اس کا سالن پکاتے ہیں۔ بہت لذیذ ہوتا ہے۔

بٹ ماہیگ: بلوچستان کے ساحلی علاقوں کی یہ ایک مشہور اور لذیذ غذا ہے، اکثر ساحل کے قریب ہوٹلوں میں یا عام ریڑھوں پر دستیاب ہے۔ مچھلی کی اس ذات کو جس میں کانٹے کم ہوں گھی میں بھون کر پکے ہوئے چاول کی دیگ میں رکھ کر دم کراتے ہیں۔ مچھلی کا ذائقہ چاول میں حلول کر جاتا ہے۔ ساحلی علاقوں میں یہی پلاؤ ہے۔ بیرزن، ایک قسم کا تندور ہوتا ہے جس کے اوپر لکڑیاں جمع کر کے جلاتے ہیں اور اس کے اندر خمیری روٹی رکھتے ہیں۔ یہ نرم اور لذیذ روٹی بنتی ہے۔ عام طور پر سفر میں اس کی اہمیت ہے۔

تینی: چاول کے آٹے کو پانی میں گھول کر پتلا کرتے ہیں۔ بڑے چمچے کی مدد سے گھما کر توے پر باریک روٹی بنا کر پکاتے ہیں جس میں بیشمار چھید ہوتے ہیں اور کئی سو کی تعداد میں پکاتے ہیں۔ ایک عام آدمی اس کی بیس تیس روٹیاں کھا سکتا ہے۔ تاہم اس کے پکانے میں بہت محنت اور فنی کمال کی ضرورت ہے۔

رشتی: دوران سفر آٹا گوند کر ذرا سا سخت کرتے ہیں پھر ایک جگہ آگ جلا کر ریت کو خوب سرخ کرتے ہیں پھر ریت کو کھود کر روٹی اس میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ روٹی بہترین خوراک ہے۔

کرنو: سفر کے دوران آٹا گوندھ کر گول پتھروں پر لپیٹ دیتے ہیں پھر آگ جلا کر ریت کو خوب گرم کرتے ہیں اور اس آٹا لپیٹے ہوئے پتھر کو ریت میں چھپا کر اوپر آگ جلاتے ہیں۔ اس روٹی کو کرنو کہا جاتا ہے۔

شیلانچ: لسی کو آگ پر جوش دیتے ہیں۔ جب اس کا پانی سوکھ جاتا ہے۔ ہلکا سا نمک

ڈال کر سکھاتے ہیں پھر اس کے پیڑے بناتے ہیں اور خشک کرتے ہیں ضرورت کے وقت اسے کوٹ پیس کر گھی ڈال کر شوربے کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اسے خرود یا نرخرود بھی کہتے ہیں۔ پشتون علاقوں میں ایک مقبول خوراک ہے۔ بلوچستان کے مالدار بھی بناتے ہیں۔

دیگر دستکاریاں

پیش کی بنی ہوئی اشیاء (پیش کھجور کے پتے یا مزری) نخلستان کی کثرت کے باعث کھجور اور اس سے متعلقہ دستکاری بلوچستان میں بہت زیادہ ہے۔

پات: پیش کا بنا ہوا ایک خاص قسم کا مستطیل نما تھیلا جس میں کھجور کو داب کر ڈالتے ہیں۔ یہ تھیلہ تقریباً تین ساڑھے تین فٹ لمبا اور ڈیڑھ فٹ چوڑا ہوتا ہے۔ اس قسم کے بڑے تھیلے بھی بنائے جاتے ہیں جن میں اناج بھرا جاتا ہے۔ پیش سے لاتعداد چیزیں بنتی ہے۔

گور پات: پیش سے بنائی گئی ایک گول سی چٹائی تقریباً 7 فٹ قطر کی ہوتی ہے۔ گور پات کے اوپر خرما مانا جاتا ہے جسے نرم کر کے "پاتوں" میں ڈالتے ہیں۔

پاچک: ڈیڑھ فٹ قطر کی ایک پیش کی گول تھیلی۔ اس میں مسافر سفر کے لیے جاتے وقت کھجور ڈالا کرتے ہیں۔

گرکو: گرک سے بنا ہوا، تقریباً ایک فٹ لمبا اور چار انچ چوڑا مستطیل نما تھیلہ۔

سند: پاچک سے ملتا جلتا پیش کا بنایا ہوا تھیلہ جس میں سیر بھر وزن کھجور ڈالتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دکاندار پہلے سے اس میں کھجور تول کر بند کرتے ہیں تاکہ خریداروں کے ہجوم کے باعث تولنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس تھیلے میں چھوٹے چھوٹے سراخ ہوتے ہیں تاکہ ہوا لگنے سے کھجور میں کیڑے مکوڑے نہ پڑیں۔

کنڈہ: مزری سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا کشتی نما گلاس تقریباً 3/4 فٹ لمبا جو سفر کے دوران پہاڑی علاقوں میں کارآمد ہوتا ہے۔ یہ عموماً ندی نالوں کے قریب ملتا ہے۔

کپات: کھجور چننے کے لیے ماہر کارکن کو درخت پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اس کی بغل میں 3/4 فٹ کا ایک پیش کا تھیلہ ہوتا ہے جس میں وہ چن چن کر پکی کھجوریں ڈالتا ہے۔

کٹور: چھ سے دس انچ کا ایک گول تھیلہ جس میں کشیدہ کاری کرنے والی خواتین کپڑے سمیٹ کر رکھتی ہیں۔

ملو: کٹور نما ایک نسبتاً بڑا تھیلہ جس کو پیش ہی کا ڈھکنا لگاتے ہیں یہ خواتین کے کپڑے اور سنگار کی چیزیں رکھنے کے کام آتا ہے۔

سواس: پیش یا مرزی سے بنائے ہوئے چپل۔ ان میں رسیاں ڈالی جاتی ہیں۔ گھر آنگن میں زیادہ تر انہیں کو پہنا جاتا ہے۔

توریا پربند: ایک خاص قسم کا مضبوط رسا جو کھجور کے درخت پر چڑھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ رسا کمر اور کندھوں سے لپیٹا جاتا ہے۔ کمر کی طرف کا حصہ پتلا اور کندھوں کی طرف موٹا ہوتا ہے۔ کلمپوگ پر پاؤں دھر کر رسی کو اوپر کی طرف ہلا ہلا کر درخت پر چڑھتے ہیں اس رسی کے استعمال سے گرنے کا خطرہ کم ہوتا ہے۔

سپت: پیش کا گول ٹوکرہ جس میں کھجور بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لاتے ہیں۔

بور: پیش کی بنی ہوئی گیند۔

کچ: ایک مستطیل نما بڑا تھیلہ جسے گدھے کی پیٹھ پر لاد کر اینٹیں یا مٹی وغیرہ ڈھوتے ہیں۔

تیچ: پیش کی ایک گول چپلی جس میں روٹی رکھ کر مہمانوں کے سامنے رکھی جاتی ہے۔

لچک: اناج محفوظ رکھنے کا پیش کا بڑا تھیلہ۔ ایک من وزن تک کا اناج رکھتے ہیں۔

روت: پیش کی بنی ہوئی باریک رسیاں جو چارپائی بننے کے کام آتی ہیں۔

سچکان: پیش کی دستکاری میں اعلیٰ ترین حسن و مہارت سے بنی ہوئی چٹائی جس میں پیش کے پتوں کو رنگ دے کر بنتے ہیں۔ اس میں نہ صرف رنگ کا اہتمام ہوتا ہے بلکہ یہ چٹائی خوبصورت نقش و نگار کی حامل ہوتی ہے۔

اُون کی بنی ہوئی چیزیں

جوال: اُون سے بُنا ہوا بہت بڑا بورہ جس میں تقریباً پانچ سے پندرہ من تک اناج بھر کر محفوظ کیا جاتا ہے۔

تکی یا چنتہ: اون سے بُنا ہوا صندوق نما تھیلہ جو عورتوں اور بچوں کے کپڑے وغیرہ رکھنے کے کام آتا ہے۔

خرجین یا خورجین: اون سے بنائے گئے تھیلے جو سفر کے لیے کارآمد ہوتے ہیں۔ خورجین کے دو حصے ہوتے ہیں جس میں زادِ راہ، نقدی، کپڑے وغیرہ رکھ کر بند کرتے ہیں۔ یہ گھوڑے پر اس طرح رکھا جاتا ہے کہ اس کے دونوں حصے گھوڑے کے دونوں طرف توازن سے آجاتے ہیں اور اس کے اوپر سواری کی جاتی ہے۔

کونٹ: اون سے بُنی ہوئی خاص قسم کی دری۔

شُفی: ایک رنگین دری نما، سرپوش جو گھر کی زینت کے لیے بنالیا جاتا ہے۔ لکڑی کے تختوں پر سجا کر اس کے اوپر بستر لحاف وغیرہ سنوار کر ترتیب سے رکھا جاتا ہے۔ اس کے تین طرف نیچے اور دونوں کونوں پر اون کے رنگین پھول اور گل کاری کی جاتی ہے۔ اون کا یہ سرپوش نہایت قیمتی ہوتا ہے۔ امیر گھرانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مُخ تف: ایک خوبصورت ازار بند جو کم از کم ڈیڑھ انچ موٹا ہوتا ہے۔ اس کے دونوں سروں پر پھول جوڑتے ہیں۔ یہ اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس سے جیب کا بھی کام لیا جاسکتا ہے جس میں نقدی وغیرہ رکھی جاتی ہے۔

شیکن یا بشینک: اُون سے بُنا ہوا ایک موٹا چادر نما جس میں گوندھا ہوا آٹا رکھتے ہیں اور اس پر پیڑے بھی بناتے ہیں۔

پرزونگ: اُون سے بنا ہوا ایک خوبصورت دسترخوان

نال دان: ایک تکون اونی تھیلہ جو رنگین اور پھولدار ہوتا ہے۔ یہ گھریلو سامان (سنگھار سے متعلق) یا نقدی وغیرہ محفوظ کرنے کے کام آتا ہے۔ امیر گھرانوں میں زیبائش کے لیے بھی رکھا جاتا ہے۔

پُٹر: اون سے بنا ہوا ایک رنگین بچھونا جو امیر گھرانوں میں قالین کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پُٹر کے لیے خام اون کو ایک خاص طریقے سے زمین پر بچھا کر اس پر پانی چھڑکاتے ہیں۔ یہ غدہ کی طرح بنتا ہے۔ پُٹر سے بنا ہوا کوٹ نما پہناوا جو سردیوں میں پہننے کے کام آتا ہے۔

گوچان: بکری کے بالوں سے بنا ہوا تھیلہ جو سفر کے دوران آٹا رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

گوالگ: بکری کے بالوں سے بُنا ہوا بورا جو اناج رکھنے کے کام آتا ہے۔

گدان: یہ ایک پہاڑی خیمہ ہوتا ہے۔ جو بکری کے بالوں سے بُنا جاتا ہے۔ اس کا دائرہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ گھر کا سامان، بستر وغیرہ رکھنے کے بعد بھی اس میں آدمیوں کے بیٹھنے سونے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس کی فنی اہمیت اور مہارت یہ ہے کہ بارش کو ٹپکنے نہیں دیتا بلکہ پانی اس کی سطح سے چاروں جانب بہہ جاتا ہے۔ گرمیوں میں گدان بہت موزوں ہے کہ ہوا کے رخ پر نصب کی جاتی ہے۔ گدان کے چاروں جانب چوڑ کے حلقے گھاڑے جاتے ہیں۔

زمین داری کے متعلقات

واہند یا واجہ، زمین کا مالک:

زمیندار: واہند سے خاص شرائط پر (جو ہر علاقے میں مختلف ہوتے ہیں)۔ زمین حاصل کی جاتی ہے۔ اپنی زیرنگرانی کاشت کروانے والا بلوچستان کے نظام کاشتکاری کے مطابق زمیندار کہلاتا ہے۔ جو واہند (مالک) کو پیداوار کا پانچواں حصہ فصل پر دیتا ہے۔ زمیندار کا یہ حق نگرانی اس کی وفات کے بعد اس کی اولاد کو خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔ گویا زمیندار مالک ایک شریک حصہ دار ہوتا ہے۔

بزگر: وہ مزارع ہوتا ہے۔ جو زمیندار کا شتکاری کے لیے متعین کرتا ہے۔ بزگر کو معاوضہ کے طور پر پیداوار کا ایک خاص حصہ یا مقررہ رقم دی جاتی ہے۔ جو رواجاً مقرر ہوتا ہے لیکن اس کا حق کاشتکاری نسلاً بعد نسل منتقل نہیں ہوتا۔

لٹھ بند: موروثی مزارع۔

شریک یا بڈی: وہ مزارع جس کا حق محنت اس کی منشاء کے مطابق طے کیا جاتا ہے۔ جو نقدی یا پیداوار دونوں صورتوں میں ممکن ہے۔ یہ ایک عام مزدور کی طرح ہوتا ہے جس کا حق محنت نسلاً طے شدہ نہیں۔

دہقان: تمام شریکوں کا نگران ہوتا ہے جس کے حقوق شریک کی طرح متعین کیے جاتے ہیں۔

مہہ تر: نائب دہقان۔

امبن: نائب مہہ تر۔

مہہ شرتی: وہ کھیت جس کی پیداوار دہقان کو حق محنت کے طور پر دی جاتی ہے۔ بیج دہقان کو مقرر کرنے والے کے ذمے ہوتا ہے۔ اور کھاد کی فراہمی دہقان کے ذمے ہوتی ہے۔

بڈ: دہقان کے شریک کا عوضانہ (نقد یا جنس)۔

زماندار: کھجور کی فصل کا ٹھیکہ لینے والا جو اپنے شریک اور دہقان لگا کر فصل اٹھاتا ہے۔

ہل چلانے اور بیج ڈالنے کے متعلقات

ڈھال: بارش کی آمد سے پہلے زمین پر ہل چلانے اور اسے ہموار کرنے کا عمل

جس کا مقصد یہ ہے کہ زمین میں بارش کا پانی جذب ہو جائے یا غیر ضروری گھاس پھونس اٹھالی جائے۔ اور بیج ڈالنے کے لیے زمین نرم ہو جائے۔

کیڑی: زمین پر عام ہل چلانے کا عمل زمین کو ہموار کرنے یا اس میں بیج ڈالنے کی غرض سے نہیں۔

سول: ہل چلانے کا وہ عمل جو آبپاشی کے بعد زمین میں لمبائی کی سمت کیا جاتا ہے اگر "سول" کے بعد پھر بارش ہو جائے تو "سول" کا عمل ایک مرتبہ پھر دہرایا جاتا ہے۔

لیٹ: سول کے بعد زمین میں چوڑائی کی سمت ہل چلانے کا عمل۔

بھاڑا: متوازی ہلوں کے ٹوٹ جانے کا عمل جو بعد میں درست کیا جاتا ہے۔

اوڑیاپل: ہل چلانے کے بعد پیدا ہونے والی گہری لکیریں۔

سدی: وہ بیج جو "سول" اور "لیٹ" کے بغیر بارش کے فوراً بعد بویا جاتا ہے۔

لڑ: تقریباً تین فٹ لمبی 3/4 انچ قطر کی کھوکھلی لکڑی جس کے ذریعے بیج ڈالتے ہیں۔

ٹوٹی: نئرنج، چٹ بج، ہڑ بج، موڑغ گدڑی لائی وغیرہ زراعت کی مختلف سرگرمیاں۔

چمڑے سے بنی ہوئی اشیاء

چوٹ: کچے چمڑے کے پاپوش جو میخ کے بغیر چمڑے ہی کے تسموں سے بنائے جاتے ہیں۔

کپ: چمڑے سے بنا ہوا چاقو پوش جو کمر بند کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔

امپان: چمڑے کی ساخت کی بوری (دنبے کی کھال سے) جو گھروں میں آٹا رکھنے اور سفر میں آٹا ڈال کر لے جایا جاتا ہے۔ آٹا اس میں پوری طرح محفوظ ہوتا ہے۔

کڑدم: لوہے کے باریک تاروں سے بنی ہوئی چھڑی جس پر چمڑے کا غلاف ہوتا ہے۔ اس کے ایک سرے پر گول موٹا سکہ لگا ہوتا ہے۔ اور دوسرا سرا بیضوی شکل میں مڑا ہوتا ہے۔ یہ ایک ہتھیار ہے جسے کمر سے باندھتے ہیں۔

ہنیزک: دنبے کی کھال سے بنایا جاتا ہے۔ یہ دودھ بلونے کے کام آتا ہے۔ دودھ اور مکھن بھی اس میں حفاظت سے رکھا جاتا ہے۔

زک: بکری کے چھوٹے سے بچے کی کھال سے بناتے ہیں۔ اس میں گھی رکھا جاتا ہے۔

کھلی: یہ بھی بکری کے بچے کی کھال سے بناتے ہیں۔ یہ پانی کا مشکیزہ ہے۔

پتھروں سے بنائی ہوئی اشیاء

تاپگ پتھر سے تراشا ہوا توا۔ لوہے کے توے کی بجائے اسے روٹی پکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے روٹی بہتر طور پر پکتی ہے۔

ڈلونک: ایک چکنی نما پتھر جو چاول کا چھلکہ صاف کرنے کے کام آتا ہے۔ ڈلونک کے اوپر کا پاٹ چھیدار ہوتا ہے جہاں سے پسانے کے دوران چھلکے نکلتے ہیں۔

وانک: وہ بڑا پتھر جو ندی کے کنارے رکھا جاتا ہے جو کپڑے دھونے پھٹکنے کے کام آتا ہے۔ ایک اور پتھر بھی وانک کہلاتا ہے یہ چپٹا ہوتا ہے۔ دوائیں پیستے ہیں۔

مشتک: ایک گول سا پتھر جو "وانک" پر رگڑنے اور دوائیں پیسنے کے کام آتا ہے۔

کتن دان: تین کھنگوں سے بنایا ہوا پہاڑی چولہا جس پر "تاپگ" رکھ کر روٹی پکاتے ہیں۔

اُون کے بُنے ہوئے بلوچی ساخت کے خاص کپڑے

شال یا ڈپئی: بلوچی ساخت کا ایک پہناوا جو عموماً بھورے یا سیاہ رنگ کے دنبے کی کھال اور اون سے بناتے ہیں۔ یہ کپڑا گون سے ملتا جلتا خاص قسم کا کوٹ ہے۔ جسے شال یا ڈپئی کہتے ہیں۔

پیلہہ: آسمانی رنگ کا ایک خاص ریشمی (بلوچی ساخت کا) دوپٹہ جو تقریباً 1-1/2 گز لمبا اور ایک گز چوڑا ہوتا ہے۔ جس کے کناروں پر سونے کے ٹک اور پتے لگائے جاتے ہیں۔ یہ دوپٹہ "پیلہ" شادی کی رات دلہن کو پہنایا جاتا ہے۔

مہنا: بلوچی ساخت کا ایک اور خاص قسم کا ریشمی دوپٹہ جو سبز رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ تقریباً چار گز لمبا اور ڈیڑھ گز چوڑا ہوتا ہے۔ یہ دوپٹہ دلہن کی شادی کے تیسرے دن اوڑھایا جاتا ہے۔

منابس: ایک اور بلوچی ساخت کی چادر جو ریشم کے سات رنگوں سے بنائی جاتی ہے۔ اور جملہ عروسی میں بچھا دی جاتی ہے یہ بھی چار گز لمبی ڈیڑھ گز چوڑی ہوتی ہے۔

ذخیرہ اور ناپ تول کے پیمانے

کوہلی: زمین کے سینے پر بنا ہوا ایک تندور نما گودام جو آٹھ فٹ لمبا بارہ فٹ بلند گول شکل کا ہوتا ہے۔ اناج بھر کر اسے اوپر سے بند کر دیا جاتا ہے۔ سطح زمین پر

بلوچ کسان کام کرتے ہوئے (تصویر: حسن سلطان)

میوہ فروش (تصویر: حسن سلطان)

ایک سوراخ بناتے ہیں۔ضرورت کے مطابق اناج نکالتے ہیں۔

کرم: اجناس کے لیے زمین دوز گودام جو تقریباً تین فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا ہوتا ہے۔

سرک: لکڑی کا بنایا ہوا ایک برتن جو اناج، گھی، تیل وغیرہ ناپنے کا پیمانہ ہوتا ہے۔ گندم کے لیے بائیس سرک تین من کے برابر ہوتے ہیں۔ اس طرح دیگر اشیاء خوردنی مصالحہ جات کے لیے الگ الگ سرک مقرر ہیں یہ زمینداری کا پیمانہ ہے۔ تاجروں کے استعمال کے لیے نہیں۔

چوتڑہ: سرک کا چوتھا حصہ۔

گوآز: دونوں بازوؤں کو پھیلانے کی لمبائی انگلی تک گوآز کہلاتی ہے۔

سومٹر: پاؤں سے لے کر سر تک کی لمبائی جو عام طور پر سوا پانچ فٹ کے برابر ہوتا ہے۔ ناپ کا یہ معیار عام طور پر کنوؤں کی پیمائش یا اونچی چیزوں کو ناپنے کے لیے ہوتا ہے۔

تیردور: عام بندوق کی گولی یا کمان کی پہنچ تک کا فاصلہ۔

تاس: عام معنی میں کٹورے کو کہتے ہیں لیکن یہ کاریزوں کے پانی کی تقسیم کا ایک خاص معیار ہے۔ تاس تانبے کا ایک چھوٹا سا برتن ہوتا ہے۔ جس کے اندر ایک ہلکا سا باریک چھید کرتے ہیں اور پانی کے ایک بھرے ہوئے برتن میں رکھتے ہیں۔ جتنے عرصے میں وہ پانی سے بھر جاتا ہے۔ ایک تاس کہلاتا ہے۔ پانی کا وہ حصہ جو کھیت کو کاریز کے پانی سے سیراب کرے ایک "تاساپ" کہلاتا ہے۔

تگار: مٹی سے بنایا ہوا ایک بڑا ظرف جس میں "تاس" کو رکھا جاتا ہے۔ یہ تگار کہلاتا ہے۔

پاد: تاس کا معیار صرف رات کی آبپاشی کے لیے مقرر ہے۔ دن کے وقت کاریز کے پانی کا تعین سائے اور اس کے ناپ سے کیا جاتا ہے۔ اس ناپ کا معیار "پاد" ہے۔ ایک پا دایک پاؤں کی لمبائی پنجے تک سردیوں کے دنوں میں دن کا یہ سایہ دو ہنگام یعنی 48 تاس کے برابر ہوتا ہے۔ گرمیوں میں دن کا سایہ ساڑھے تین ہنگام کی مدت تک رہتا ہے۔

ھبّہ: تین تاس کی مدت کا پانی

کنو: چھ تاس کی مدت کا پانی

نیم ھنگام: بارہ تاس کی مدت کا پانی

ھنگام: چوبیس تاس کی مدت کا پانی

کاریز: یہ بلوچستان کا ایک مشہور ذریعہ آبپاشی ہے جس سے سلسلہ در سلسلہ سرنگ دار کنوؤں کے ذریعے اونچی سطح کے حاصل کئے ہوئے پانی کو نچلی سطح کے کھیتوں تک لے جایا جاتا ہے۔

کہن: کاریزوں کے سرنگ دار کنوئیں۔

گمانہ: کاریز کا سب سے گہرا اور سب سے اونچی سطح کا کہن جو پہلا کنواں ہوتا ہے۔

ٹوپکی: کاریز کے وہ دوسرے کہن جن سے پانی پھوٹتا ہے۔

نمبور: کاریز کے کہن کو آپس میں ملانے والی سرنگ۔

روئینہ یا سرچاخ: کاریز کا وہ حصہ جو کنوئیں کی بجائے گہرے نالے کی شکل اختیار کرتا ہے اور کھیتوں تک جا پہنچتا ہے۔

شون یا تھڑ: سرچاخ یا روئینہ کا وہ حصہ جو کاریز کے درمیان بھی ہوسکتا ہے جس کے کنارے چڑھنے اترنے کا راستہ بنایا جاتا ہے۔ جس سے کاریز میں غسل کرتے یا کپڑے وغیرہ دھویا کرتے ہیں۔

کفات: کاریزوں کی صفائی کرنے والے پیشہ ور کارکن۔

مالداری اور گلہ بانی

رمگ: بکریوں کا ریوڑ

میگڑھ: بھیڑوں کا ریوڑ

زاغل: بکری کے بچوں کا ریوڑ

گورپڑ: بھیڑوں کے بچوں کا ریوڑ

بگ: اُونٹوں کا گلہ

ہرگل: اُونٹوں کے بچوں کا گلہ

گورم: گائے بیلوں کا گلہ

گابیڑ: گائے کے بچھڑوں کا گلہ

گلگ: گھوڑوں کا گلہ

باہر: گدھوں کا گلہ

رم یا ولر: پرندوں کا جھنڈ

جھار: پرندوں کا فصل پر بیٹھا ہوا جھنڈ

گلسگ: کتوں کا گلہ

لودھ: بھیڑیوں کا گلہ

شنک: بکری کا بچہ، عمر ۴ ماہ (نر مادہ)

ترستر: بکری کا بچہ چار ماہ سے دانت توڑنے تک

گتاچ: بکری کا مادہ بچہ چار ماہ سے دانت توڑنے تک

پاچن: بکرا

بز: بکری

گورک: بھیڑ کا بچہ عمر ۴ ماہ (نر مادہ)

گٹور: چاہ ماہ سے دانت توڑنے تک (نر)

پلاٹ: چار ماہ سے دانت توڑنے تک (مادہ)

گرانڈ: نر دنبہ

میش: مادہ بھیڑ

گوئسک: اندازاً چھ ماہ کی عمر گائے کا بچھڑہ (نر مادہ)

ٹاب: چھ ماہ سے دانت توڑنے تک کا نر بچھڑہ

پرآب: چھ ماہ سے دانت توڑنے تک کا مادہ بچھڑہ

کاریگر: جوان بیل

ڈگی/ گوک: جوان گائے

گھوڑے کے بچے

کترگ: چھ ماہ تک کا بچہ (نر مادہ)

کونڈ: چھ ماہ سے دانت توڑنے تک (نر)

بہان: چھ ماہ سے دانت توڑنے تک گھوڑی (مادہ)

نریان: گھوڑا

مادیان: گھوڑی

اونٹ کے بچے

جڑک: چار ماہ تک کی عمر کا بچہ (نر مادہ)

ہرک: تقریباً ایک سال کی عمر تک کا بچہ (نر مادہ)

کوانٹ: دانت توڑنے کی عمر تک کا بچہ (نر)

پرآپ: دانت توڑنے کی عمر تک کا بچہ (مادہ)

لیڑھ: جوان اونٹ نر

ڈاچھی: جوان اونٹنی مادہ

چوپایوں کے باندھنے کے لیے مخصوص مقامات

جھوک: اُونٹوں کے باندھنے کا مقام

جب: بھیڑ بکریوں کے لیے مخصوص جگہ (موسم سرما)

واڑ: بھیڑ بکریوں کے لیے مخصوص جگہ (موسم گرما)

کڑ: گائے بیل کے لیے

کڈی: مرغیوں کا ڈربہ

پاوڑ: اصطبل بغیر چاردیواری

جانوروں کے امراض

جوگیر: گھوڑوں کی ایک خاص بیماری گرمی میں زیادہ غلہ کھانے سے۔

چارو: چوپایوں کی وہ بیماری جس سے ان کے پیروں پر زخم پڑتا ہے۔یا کیڑا نکلتا ہے۔

رال: چوپایوں کے پیٹ میں کیڑا پڑنے کی بیماری۔

بی زارو: اس عارضہ میں مبتلا چوپایوں کی ناک جمتی ہے آنکھوں سے پانی بہتا ہے۔

ری: جانوروں کے دست آنے کی بیماری۔

ٹاک: چوپایوں کا ہیضہ۔

چیچڑ: گھوڑوں کے جسم میں کیڑا پیدا ہونے کی بیماری۔

ڈنگ: ایک موٹی سی مکھی جو گھوڑوں اور کتوں کو کاٹتی ہے۔اُردو میں" بک کہتے ہیں۔

زمین سے متعلق

ڈل: پہاڑ کا وہ نشیبی دامن جو ندی نالوں کے پانی سے محفوظ ہو۔

ڈال بار: وہ زمین جس کی سطح پر سیلاب کے جمع کئے ہوئے پتھر ہوں مگر اندرونی طور پر پتھریلی نہ ہو۔

مٹ بال: وہ زمین جس پر سیلابی مٹی کی تہیں جم گئی ہوں۔

ڈاک: سفید زمین جس پر روئیدگی نہ ہوسکتی ہو۔

مٹ ترک: وہ زمین جس پر سیلابی مٹی کی تہہ خشک ہو کر اکھڑ جاتی ہو۔

ڈڈگ: وہ زمین جس میں پانی جذب کرنے کی اہلیت نہ ہو۔

سورگ: وہ زمین جس میں پانی جذب کرنے کے بعد شورے کی پتلی سی تہہ اوپر کو اُبھرتی ہو لیکن اسی قسم کی زمین فصل دیتی ہے۔خصوصاً پیاز تمباکو اور سبزی کی عمدہ فصل۔

ریک مال: وہ زمین جس کی مٹی میں ریت کی ملاوٹ ہو۔

سک: وہ زمین جس میں بجری کی ملاوٹ ہو۔

سیہ زمین: وہ زمین جس کی رنگت ہلکی سیاہی مائل ہو۔

سہرزمین: وہ زمین جو ہلکی سرخی مائل ہو۔

کچ یا پشت: زمین کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا جو پہاڑی ندی نالوں کے کنارے اس طرح بنایا جاتا ہے کہ وہ سیلاب کے زور سے بھی محفوظ رہے اور اس کی چھوٹی چھوٹی نالیوں کے ذریعے آبپاشی بھی ہوسکے۔

لوپ: وہ زمین جس کے تین اطراف کو پہاڑیاں "نال" کی صورت میں پھیلی ہوئی ہوں۔

کورک: نرم اور خشک زمین کو کھودنے کے بعد جو چٹانیں نکلتی ہیں کورک کہلاتی ہے۔

شر: کاریز یا کنوؤں کے اندر کی سخت اور چٹانی زمین شر کہلاتی ہے۔

سرگہہ: کھیتوں کا وہ حصہ جو پہاڑ کی جانب ہو۔

بنگہ: کھیت یا بندات کا نشیبی حصہ۔

سر: کھیتوں کا وہ حصہ جو نسبتاً بلند ہو۔جہاں پانی مشکل سے پہنچ سکتا ہو۔

پائینہ: کھیتوں کا وہ حصہ جہاں پانی آسانی سے پہنچ سکتا ہو۔

شنز: ندی نالوں کے کنارے سبز رنگ کی مٹی۔

دوبا: نرمٹی کے بڑے بڑے پیڑے جو اُٹھانے کی سہولت کے لیے بنائے جاتے ہیں۔

مٹ: سخت مگر صاف زرد سفید رنگ کی مٹی جو بالوں کو دھونے کے کام آتی ہے اور صابن کی طرح جھاگ دیتی ہو۔

پل: زمین کے اندر وہ گہری لکیریں جو ہل چلانے سے پیدا ہوتی ہے جنہیں بیج ڈال کر مرزا جاتا ہے۔

ریج: وہ نمی جو زمین کو قابل کاشت بناتی ہے۔

پینٹ: زمین کا وہ حصہ جو اپنی ذرا سی اونچائی کی وجہ سے پانی کے بہاؤ سے محفوظ

رہے اور پانی کا بہاؤ اس کے دائیں بائیں سے گزر جائے۔

تلو: بارش کے پانی سے کمروں یا برآمدے کی طرف بہاؤ کو روکنے اور سردیوں میں دھوپ سینکنے کے لیے تقریباً 3/4 فٹ بلند ایک مستطیل نماز مینی فرش جو "تلو" کہلاتا ہے۔

جنپ: ہموار زمین کا کہیں کہیں ابھرا ہوا حصہ۔

دنب: کھنڈر جو آثار قدیمہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

پہاڑوں سے متعلق

گورغ: سفید یا سرخ رنگت کی پہاڑی۔

شیرو: پکی مٹی کی پہاڑی۔

تیہر: پہاڑوں کا پھیلا ہوا سلسلہ۔

ھشی: اونچا اور بلند پہاڑ۔

درنگ: پہاڑ کا وہ لمبا اور قدرتی چھجہ جس پر آسانی سے چڑھا اور اترا نہیں جا سکتا۔

کردو: درنگ سے نسبتاً چھوٹا اور غیر محفوظ۔

کنڈگ: پہاڑی چڑھائی۔

جڑو یا تلنب: پہاڑی کا ایسا حصہ جو آڑ کا کام دیتا ہو اور بارش وغیرہ سے محفوظ رہنے میں مدد دے۔ یہ درنگ سے چھوٹا ہوتا ہے۔

تلانگ یا تلا: وہ چٹان جس پر چڑھنے کا راستہ نہ ہو۔

کلٹ: چٹان کا دشوار گزار حصہ۔

رہ نغ: پہاڑی سلسلوں کے کنارے طویل اور خطرناک دشوار گزار راستہ۔

گر: پہاڑوں کے درمیان غیر مرتفع راستہ یا حصہ۔

تنک: درہ۔

تل: پہاڑوں کے درمیان مختصر زمین۔

موڑسنٹ: پہاڑی سلسلوں کا موڑ سنٹ کہلاتا ہے۔

گٹ: وہ پہاڑی جو دو پہاڑوں کے درمیان حائل ہو گٹ کہلاتی ہے۔

تگر: وہ چٹان جس سے پانی کی قدرتی تقسیم ہو۔

بوہنرو: وہ مقام جہاں پانی کو تقسیم کیا جاتا ہو۔

رود: انتہائی سخت چٹان۔

کشک: پہاڑوں کی ایسی پگڈنڈی جو کسی واضح منزل کی نشاندہی نہ کرتی ہو۔

رنگ راہ: پہاڑی شارٹ کٹ راستہ۔

گبر بند: بلوچستان میں آثار قدیمہ کے پہاڑی بند جو قبل از اسلام ایرانیوں کے نام سے منسوب ہیں۔

کور تگار: پہاڑوں میں جمع شدہ پانی کا ذخیرہ نکاسی کا چھوٹا راستہ۔

تگار: شانک، پانچ اور شیلہ بھی پہاڑوں سے متعلق ہیں۔

بادل اور بارش سے متعلق

رگام: بادلوں کا موسم۔

لبٹام: ساون بھادوں کا موسم اور بارش۔

سبخ: دھنک غروب آفتاب کے وقت سرخی مائل بادل۔

نود: ابر۔

کوہکر: وہ اٹھتے ہوئے سفید بادل جو بارش چھٹ جانے کے بعد پہاڑوں کی چوٹیوں پر نظر آتے ہیں اور دوبارہ بارش لانے کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

گیتلو: بادلوں کے ٹکڑے جو بارش کے بعد پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھپا دیتے ہیں۔ گیتلو میں کبھی کبھی پورا پہاڑ چھپ جاتا ہے۔

گاہر: دو گہرے اور تاریک بادل جو سمندر میں بارش کا طوفان لاتے ہیں۔

گوٹگ یا پٹہ: بادلوں کے زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔

شینک: ہلکے ہلکے اور پیلے بادل جو آسمان کے سامنے چادر بن کر چھا جاتے ہیں۔

پیاپ: بارش سے بھرے بادل۔

راستین: گھنگھور گھٹا۔

جڑ: وہ بادل جو ہوا کے جھونکوں سے پٹوں سے مجتمع ہوتے ہوں۔

جینہر: آبشار کی سی دھار رکھنے والی بارش۔

لسی: ہلکی، کم کم مگر متواتر کئی روز تک برسنے والی بارش۔

پڑا: ہلکی معمولی بوندا باندی۔

آب بند: سردیوں کا وہ خاص موسم جس میں پانی جم جانے کا امکان ہوتا ہے۔

جڑ سا: بادلوں کا سایہ۔

ڈنگا: گہرے بادلوں میں بارش کی وہ دھار جو دور سے نظر آتی ہے۔

لانٹ: دور سے نظر آتا ہوا آگ کا شعلہ۔ بادلوں کی بجلی۔

شمال: جلتی بجھتی روشنی۔

مرمرانک: جلتی بجھتی لو۔

لہک: خفیف سی چمک۔

جلشک: ستاروں کی چمک۔

چیلک: بجلی کی چمکتی لکیر۔

ترونگل: ژالہ۔

شہم: بجلی کی دبتی ابھرتی چمک۔

گروشک: آنکھوں کو چندھیانے والی چمک۔

ہوائیں اور موسم

روہو: سرد ہواؤں کی لہر۔

پالو: وہ سرد ہوا جس سے درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

ڈک: ہوا کے بغیر سردی کی لہر۔

تہار گوات: غبار آلود بھیگی ہوائیں جو بارش کا طوفان لاتی ہیں۔

لپسگ: چرک ہلکی سرد ہوا جو صبح کے وقت یا بارش کے بعد چلتی ہے۔

بند: ہر چلگ کو الگ خاصیتوں کی بنا پر تین بند میں تقسیم کیا جاتا ہے جو تیرہ تیرہ دنوں کا ہوتا ہے۔

چلگ: بلوچستان میں سال کو موسم کے لحاظ سے نو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر حصہ چالیس دنوں کا ہوتا ہے جو چلگ کہلاتا ہے جیسے خشک چلگ، چلگ تر اور چلگ سیاہ۔

نمبی: جنوبی ہوا جس سے بادل اٹھتے ہیں۔

گوریچ: شمالی سرد ہوا۔

مج: دھند۔

گرند: رعد۔

گرماگ: آدھڑ موسم گرما۔

تاکریچ: خزاں۔

ہتم: موسم بہار۔

گروک: آسمانی بجلی۔

جمر: بادل۔

شلگ: موسلا دھار بارش۔

برفاگ: برفباری۔

ہور: بارش۔

گوپش: کڑاکے کی سردی۔

پانی سے متعلق

آپ (آف): پانی۔

نوک آف: سیلاب کا تازہ پانی۔

چکل: پہاڑی چشمہ۔

سیہ آف: کاریز کا پانی۔

کہن: کنواں۔

کانی: پہاڑوں میں بنے ہوئے قدرتی گڑھے جن میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے جو مسافروں اور ریوڑ وغیرہ کے استعمال کے کام آتا ہے۔ ان گڑھوں کو کانی کہتے ہیں۔

گوٗرم یا کنب: پہاڑی نالوں سے بنی قدرتی جھیلیں۔

لیب شانک: وہ نشان یا لکیریں جو سیلاب کا پانی ندی کے کناروں پر بنا جاتا ہے۔

وشانک: ندی نالوں میں ٹھہرا ہوا پانی۔

پتار: وہ لکڑی یا کوڑا کرکٹ جو سیلاب کا پانی دریا کے کنارے چھوڑ جاتا ہے۔

تا آف: پانی کا خشک ہونا۔

ھوشام: نہ بجھنے والی پیاس جو ایک قسم کی بیماری ہوتی ہے۔

کورچات: گہرا کنواں جو بے آب ہو۔

کلچات: وہ کنواں جو منہدم ہو چکا ہو۔

چات: کنواں۔

کاناف: پانی کی وہ مقدار جو ایک ہی بار پیاس بجھانے کے لیے ہو۔

لوپی: بارش کے دوران بڑے بڑے پتھروں کے گڑھوں میں جمع شدہ پانی۔

سرگوار: بارش کا وہ پانی جو کھیتوں کو سیراب کرتا ہو۔ براہ راست ندی نالوں کا نہیں۔

ھوریا اور: خلیج۔

شیپ: پہاڑ کے دامن کا ڈھلوان نالہ۔

ھور: ساحل سمندر کا وہ حصہ جو مدوجزر سے متاثر ہوتا ہے۔

گوٗر: بارشوں کے زمانے میں پہاڑوں کے قریب چھوٹی چھوٹی جھیلوں سے پانی نکالنے کے لیے راستہ بنایا جاتا ہے۔

براہوی تاریخ وثقافت

تعارف: بلوچستان اپنی مخصوص جغرافیائی ساخت اور ثقافتی شناخت کے حوالے سے خطے میں ایک منفرد پہچان رکھتا ہے جو سندھ و پنجاب کے مغرب ایران کے مشرق افغانستان کے جنوب میں مجموعی طور پر تین لاکھ 47 ہزار کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ بلوچ براہوی اور پشتون قبائل کے علاوہ یہاں جاموٹ اور ہندو بھی آباد ہیں جو یہاں کے قدیم باشندے ہیں۔ محققین بتاتے ہیں کہ بعدازاں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ساتھ یہاں پنجابی، اُردو اور فارسی بولنے والے افراد زیادہ تر ملازمت اور تجارت کے سلسلے میں آئے اور پھر ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان تمام قبائل کی مستقل سکونت اور ثقافتی آمیزش نے اس سرزمین کو رنگارنگ ثقافت سے مزین کر دیا۔

براہوی قبائل کو اپنی مخصوص روایات رسم و رواج اور جداگانہ ثقافت کی بنیاد پر ہمیشہ انفرادیت حاصل رہی ہے۔ براہوی کو دراوڑی زبانوں کے قبیلے سے ملاتے ہوئے اسے خطے کی قدیم ترین زبان بھی کہا جاتا ہے۔ بقول پروفیسر انور رومان ''براہوی ہمارے ملک میں سب سے قدیم لسانی یادگار ہے۔'' بلکہ یہی وہ واحد ثقافتی عامل ہے جو انہیں ایک قوم کے طور پر ممیز کرتا ہے گو کہ اب ثقافتی اور طویل الموت جغرافیائی تعلق کے باعث وہ خود کو بلوچ ہی کہتے ہیں لیکن تاریخی طور پر وہ ایک جداگانہ نسلی شناخت اور ایک قومیت کے مالک رہے ہیں۔ انور رومان اپنی کتاب ''کوئٹہ قلات کے براہوی'' میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ قیاس کر لینا کہ براہوی بلوچ ہیں ایسے ہی غلط ہوگا کہ جیسے کہ کہنا کہ وہ عرب، افغان، یا ایرانی ہیں۔ یہ ان تمام نسلی اجزاء کا مغلوبہ ہیں..... ایک وقت براہوی (سوائے ژوب اور لورالائی اضلاع پر) سارے بلوچستان سندھ اور پنجاب کے ان حصوں پر جہاں اب تک بلوچ آبادی اکثریت میں ہے، حکومت کرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں براہویوں اور بلوچوں کے دستور وغیرہ میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ لیکن ان کے اختلافات اس مماثلت کے مقابلے میں گہرے اور بنیادی نوعیت کے ہیں۔ ان کی زبانوں میں اساس اور ساخت کے لحاظ سے فرق پایا جاتا ہے۔ سماجی اور سیاسی نظاموں میں بھی صوری و معنوی اختلاف موجود ہے۔''

جاوید اختر اس بات کو یوں آگے بڑھاتے ہیں کہ "براہوی تہذیب و ثقافت دراصل دراوڑ تہذیب و ثقافت کی ایک زندہ و مضبوط کڑی ہے۔ اور دراوڑ تہذیب و ثقافت سندھ و بلوچستان سمیت وسطی ایشیاء و جنوبی ایشیاء پر مشتمل خطے میں تقریباً چار ہزار قبل مسیح سے لے کر 1500 قبل مسیح یعنی آریاؤں کی اس خطے میں یلغار تک غالب حیثیت کی حامل رہی ہے اور اپنے فطری تاریخی ارتقاء کے مطابق قدیم اشتراکیت اور مدرسری نظام سے لے کر قدیم غلام داری اور پدرسری نظام کے تاریخی و سماجی مدارج تک ابھی محو سفر رہی تھی کہ آریائی اقوام کے ہاتھوں نیست و نابود ہو گئی۔"

اس دوران وہ جس واحد چیز کو زمانے کی دست برد سے بچا پائے وہ ان کی زبان تھی اور اس زبان کے ساتھ وابستہ ان کا کلچر جو وقت اور حالات کے ساتھ تغیر پذیر رہا ہے۔ چونکہ براہوی اس وقت نیم قبائلی اور نیم شہری سماج کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس لئے سماجی ارتقاء کے تحت قدیم ثقافت کے کئی رسم و رواج اب متروک ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قوم نے اب تک اپنی ثقافت کو سینے سے لگایا ہوا ہے۔ وہ اس پر فخر کرتے ہیں اور جدید سماج کا حصہ بننے کے باوجود اسے ترک کرنے کو تیار نہیں۔ یہ ان کی اپنے کلچر سے والہانہ محبت اور اس کا تنوع ہے جو اب تک اسے قائم و دائم رکھے ہوئے ہے۔

جغرافیہ: براہوی زبان کے نامور شاعر، ادیب اور محقق پروفیسر نادر قمبرانی خطے میں براہوی قبائل کا لسانی و ثقافتی محل وقوع کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''کوئٹہ سے جنوب کی طرف لسبیلہ تک یعنی ساراوان، جھالاوان (موجودہ کوئٹہ قلات اور خضدار کے علاقے) بمعہ بولان، مغرب میں نوشکی سب ڈویژن، جنوب مغربی افغانستان کے ریگستانی علاقے اور سندھ کے مغربی اضلاع میں لاکھوں کی تعداد میں براہوی بولنے والے آباد ہیں۔''

جبکہ اب براہوی بولنے والے قبائل کیت اور وسعت کے لحاظ سے خاصے پھیل چکے ہیں بالخصوص بلوچستان کا شاید ہی ایسا کوئی گوشہ ہو جہاں براہوی قبائل قابل ذکر تعداد میں آباد نہ ہوں گو کہ تاریخی حوالے سے ثقافتی سطح پر ان کی جغرافیائی حد بندی متعین شدہ ہے۔ جھالاوان اور ساراوان ان میں سرفہرست ہیں۔ وہ علاقے جہاں اب بھی براہوی ثقافت اپنے واضح خدوخال کے ساتھ نمایاں اثرات رکھتی ہے اور اپنی خالص شکل میں موجود ہے۔ ان میں قلات، خضدار، وڈھ، نال، مستونگ، کچھی اور بولان شامل ہیں لیکن جیسا کہ کہا گیا کہ چونکہ اب یہ ثقافتی پھیلاؤ خاصی وسعت اختیار کر چکا ہے۔ اس لئے اس کی مخصوص اور قطعی جغرافیائی حد بندی ممکن نہیں البتہ بلوچستان میں براہوی ثقافت کے زیر اثر علاقوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱) جھالاوان

۲) ساراوان

۳) کچھی اور نصیر آباد کے علاقے

ان میں سے جھالاوان تو براہویوں کا تاریخی ماخذ ہے۔ ان کی اولین آمد بھی اسی علاقے میں ہوئی اور خوانین کا سلسلہ بھی یہیں پروان چڑھا۔ چونکہ جھالاوان میں حکمران خاندان مستقل براہوی ہی رہا اس لئے اس علاقے پر براہوی ثقافت کے اثرات سب سے زیادہ اور نمایاں ہیں بعد ازاں خان قلات سے قربت رکھنے والے طائفہ رئیسانی کی بولان آمد کے بعد ساراوان ان کا دوسرا ٹھکانہ ٹھہرا جہاں بعد ازاں ان کے مستقل قیام کے بعد علاقے پر براہوی زبان کے اثرات نمایاں ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ تاریخی طور پر براہوی قوم کے اندر بیرونی لسانی و ثقافتی خصوصیات کو مدغم جذب کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اس لئے یہ لوگ جہاں کہیں بھی پہنچے انہوں نے نہ صرف دیگر ثقافتوں کو اپنے اندر جذب کیا بلکہ انہیں بھی متاثر کیا۔ ساراوان میں آمد کے بعد بعض قبائل سبی سے ہوتے ہوئے نصیر آباد اور اس کے گردونواح تک پھیل گئے جہاں جاٹ / جاموٹ قبائل کی اکثریت تھی۔ جو بنیادی طور پر سندھ سے آئے ہوئے تھے اور یہ علاقہ سندھ اور بلوچستان کی سرحدی پٹی پر بھی واقع تھا۔ اس لئے یہاں براہوی ثقافت کو سندھی ثقافت نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جاموٹ اور براہوی و بلوچ قبائل کے رسم و رواج کم و بیش ملتے جلتے ہیں۔ ان میں ثقافتی تفریق بمشکل پائی جاتی ہے۔ ماسوائے لسانی تفریق یا انفرادیت کے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جغرافیائی طور پر بلوچستان ہی براہویوں کا اصل وطن ہے۔

براہویوں کا ماخذ: تاریخی طور پر براہویوں کو اس خطے کے قدیم ترین باشندے کہا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قدیم ترین حوالوں کے باوجود محققین ان کے بارے میں کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہوسکے جسے مستند قرار دیا جاسکے۔ ان میں سے چند معروف تاریخی حوالے ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں۔

دسویں صدی کے مشہور مورخ ابن حوقل نے براہوی کو بلوچوں کے سو قبائل میں سے ایک بتایا ہے۔ جو صوبہ فارس کے گردونواح میں آباد تھے۔ انیسویں صدی کا سیاح چارلس منہن ''براہوی'' کو دو الفاظ یعنی ''با'' اور ''روہی'' کا مرکب بتاتا ہے جس کے معنی ہیں ''پہاڑی باشندے''۔

یہی بات جناب انور رومان کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں ''براہوی قدیم فارسی کا حصہ ہے جس کا مطلب پہاڑی آدمی ہے۔ پشتو میں ''روہ'' پہاڑ کو کہتے ہیں اور روہی کا مطلب پہاڑی خطوں میں رہنے والا۔ براہوی زبان میں پہاڑوں میں موجود گہری کھائیوں کو ''روہ'' کہتے ہیں۔ اس طرح بروہی کا مطلب بنتا ہے ''کھائیوں کے اوپر پہاڑوں میں بسنے والے لوگ''۔

بلوچستان کے معروف مورخین و محققین میر گل نصیر اور ملک محمد صالح لہڑی (جو اتفاق سے خود بھی براہوی ہیں) براہویوں کے ماخذ سے متعلق اپنی تصنیفات میں ایک متفقہ رائے رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق براہوی طائفہ اول ہیں جو دوسرے بلوچوں کی نسبت بہت پہلے عرب سے ہجرت کر گئے۔ ترک وطن کے بعد وہ البرز پہاڑ کے قرب و جوار میں آباد ہوگئے اور برزکوہ کی نسبت سے ''برزکوہی'' مشہور ہوئے جو بعد ازاں کثرت استعمال سے بروہی یا براہوی ہوگیا اپنے اس خیال کے درست ہونے کے لئے وہ دلیل کے طور پر فردوسی کے اشعار پیش کرتے ہیں

ز گفتار دہقان بر آشفتہ شاہ
بسوئے بلوچ رند آمد براہ
چو آمد بہ نزدیک آں برزکوہ
بگردید گرد اندرش با گروہ

براہویوں کی نسل سے متعلق بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ برائیم یا ابراہیم کی اولاد ہیں۔ ''امپریل گزیٹر آف انڈیا'' میں ان سے متعلق یہی خیال بیان کیا گیا ہے اور دلیل کے طور پر بلوچی شاعری دی گئی ہے جس میں براہوی کو ''براہو'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ مورخین کے ایک طبقے نے انہیں سندھی قبائل سے بھی موسوم کیا ہے۔

براہوی تاریخ اور ثقافت کے حوالے سے جناب نور محمد پروانہ کی رائے بڑی گہری اور جامع نظر آتی ہے وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں

الف): براہوی قبائل نسلاً داراوڑ ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ بات یقینی اور قطعی ہے کہ وہ اپنے دوسرے ہمسایہ اور ہم وطن بلوچ و پختون سے مختلف تھے۔

ب): براہوی قبائل السنہ دراوڑ کی ایک زبان براہوی بولتے ہیں گو کہ عصر جدید میں ان میں سے کچھ بالخصوص بلوچی زبان بولتے ہیں

ج): اس وقت کی (موجودہ) براہوی تہذیب ایک مرکب تہذیب ہے۔

جبکہ معروف مورخ اور ماہر لسانیات جناب قاضی عبدالحکیم اثر افغانی براہویوں سے متعلق یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں۔

''بلوچی، بروہی، مری ایک ہی نسل کے لوگ ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی زبانوں میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں تاریخ کے عمل اور ردعمل پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دو چیزیں ہیں ایک نسل ہے اور ایک زبان ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ نسل نہیں بدلتی اور

روایتی پہناوے میں بلوچ بچہ (تصویر: [illegible])

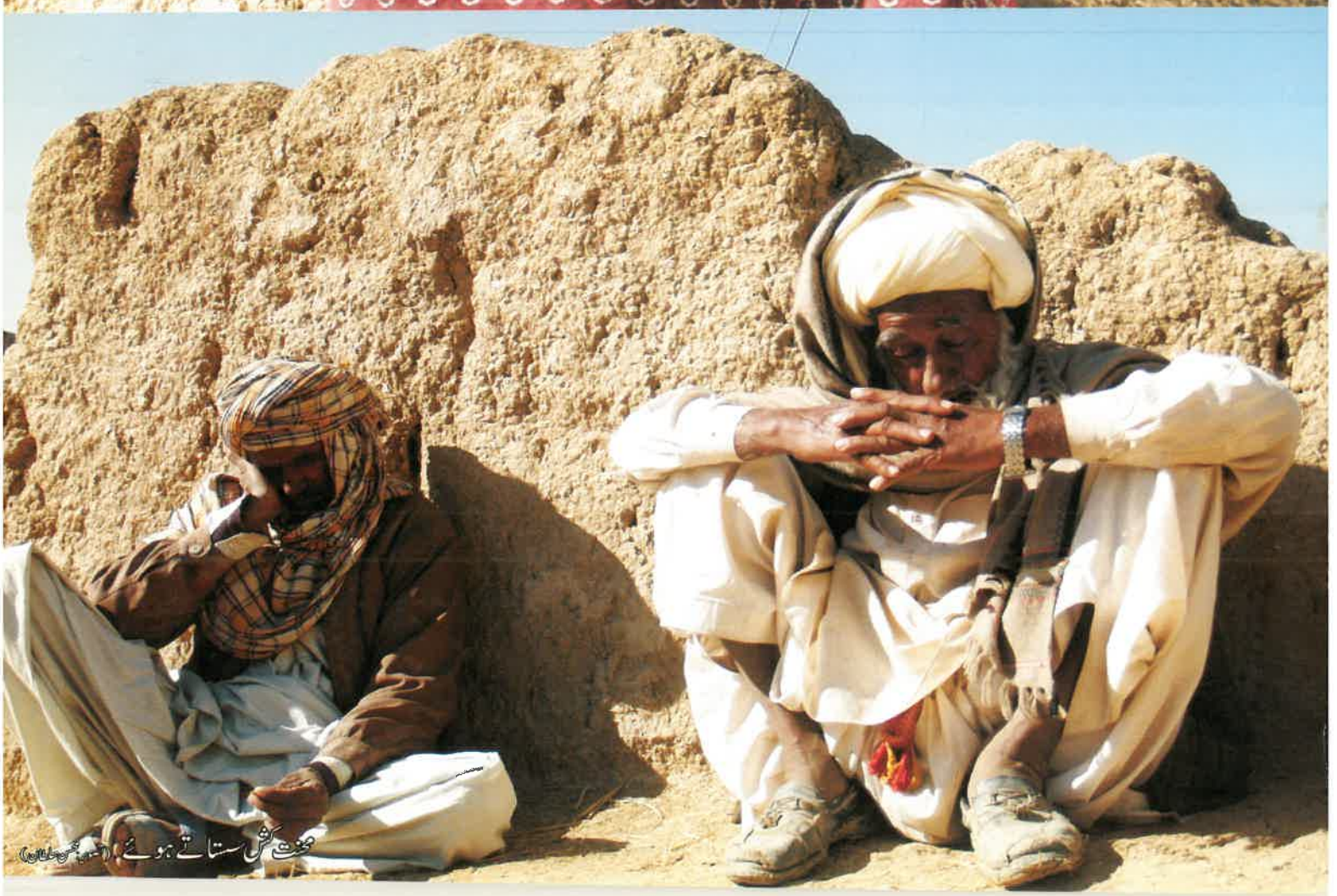

محنت کش ستاتے ہوئے (تصویر: [illegible])

ینٹ رہٹ بلوچستان (تصویر محسن سلطان)

کنواں (تصویر محسن سلطان)

زبانیں بدلتی جارہی ہیں۔ایک ہی نسل کے لوگ جب دو مختلف تاریخی عوامل کے ہاتھوں مختلف ممالک میں پس جاتے ہیں تو ان ممالک کی مقامی بولیاں بولنے لگتے ہیں۔''

ان مختصر حوالوں کے پس منظر میں جو بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ براہوی اس خطے کے قدیم باشندے ہیں۔ایک مختلف اور منفرد قدیم ثقافت کے مالک ہیں اور براہوی زبان خطے کی قدیم ترین زبان ہے۔

علامہ محمد فاضل درخانی، حاجی نبو جان، مولانا محمد عمر دین پوری، مائی تاج بانو، مولانا عبدالکریم مینگل وہ معروف ادبی شخصیات ہیں جنہوں نے براہوی ادب کے آغاز اور اس کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔جدید عہد میں نور محمد پروانہ، محمد موسیٰ طور، نادر قمبرانی، پیر محمد زبیرانی، عبدالرحمان کرد۔ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی اور دیگر نے اس تسلسل کو برقرار رکھا۔

میر احمد خان، میر نصیر خان اور میر محراب خان تاریخی شخصیات ہیں۔ بلوچستان کی سیاسی تاریخ میں آج بھی ان کا ذکر بڑے فخر اور احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔جبکہ میر نصیر خان نوری، میر احمد یار خان (خان قلات) اور میر غوث بخش بزنجو عہد جدید کی تاریخی شخصیات سمجھی جاتی ہیں۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی زبان اور بولی

براہوی زبان بولنے والی آبادی عموماً مختصر جغرافیائی تقسیم یوں کی جاتی ہے۔

۱) ساراوان

۲) جھالاوان

۳) بولان (میدانی علاقے)

اسی بنیاد پر براہوی زبان کے تین اہم لہجے بتائے جاتے ہیں۔

۱) ساراوانی

۲) جھالاوانی

۳) نوشکی اور ریگستانی علاقوں کا لہجہ

پروفیسر نادر قمبرانی براہوی بولنے والے قبائل کی تفصیل کچھ یوں بتاتے ہیں۔

۱) میروانی ۲) قمبرانی ۳) احمد زئی ۴) ایلتازئی ۵) گرگناڑی ۶) سالانی ۷) قلندرانی ۸) مینگل ۹) زہری ۱۰) محمد حسنی ۱۱) ساسولی ۱۲) ساجدی ۱۳) بیزنجو ۱۴) جتک ۱۵) موسیانی ۱۶) چنال ۱۷) رودینی ۱۸) شاہوانی ۱۹) رئیسانی ۲۰) لہڑی ۲۱) بنگلزئی ۲۲) محمد شہی ۲۳) کیازئی ۲۴) سرپرہ ۲۵) پرکانی ۲۶) لانگو

اس ضمن میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''ان قبائل سے میں بیشتر بیک وقت براہوی اور بلوچی دونوں زبانیں بولتے ہیں۔ان قبائل کے علاوہ جو ایرانی' افغانی قبائل ساروانی اور جھالاوان میں آباد ہو گئے ہیں۔وہ بھی اب براہوی زبان اور ثقافت کو اپنا چکے ہیں۔''

درحقیقت یہ براہوی ثقافت کا خاصہ ہے کہ وہ دیگر قبائل اور ثقافت کو باہم جذب کرنے کی فطری صلاحیت سے مالا مال ہے۔یہی وجہ ہے کہ غیر براہوی قبائل بڑی تیزی سے اس میں مدغم ہوئے اور رفتہ رفتہ انہوں نے اس قدر اکثریت حاصل کر لی کہ اصل براہوی قبائل کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔

پروفیسر انور رومان اپنی کتاب ''کوئٹہ قلات کے براہوی'' میں اس کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اساسی براہوی آبادی (جس نے سولہویں صدی کے اوائل میں میر عمر کی رہنمائی میں ریاست کی تعمیر کا تجربہ شروع کیا) تعداد میں دس ہزار سے زائد نہ ہوگی اور چند ہی قبائل (مثلاً قمبرانی، میروانی، سالانی، گرگناڑی اور قلندرانی) میں منقسم تھی۔(ان کو بہ ہیئت مجموعی خان کا اولس ''شاہی قبیلہ'' یعنی بنیادی مغزیہ کہتے تھے۔ان میں عرب اور منگول خون کی آمیزش تھی۔ان کی تعداد براہوی آبادی میں گیارہ فیصد بن جاتی ہے) ہوسکتا ہے براہوی اپنا تشخص ہی کھو بیٹھتے اگر انہوں نے آٹھویں صدی میں عربوں اور تیرہویں صدی تا پندرہویں صدی میں منگولوں کو اپنے میں جذب نہ کیا ہوتا جن سے انہیں نیا خون ملا اور وہی ان کا بازوئے شمشیر زن ہے۔جب یہ برادری (براہوی) قلات کی قدیم تہذیب کو جذب کر چکی، عربوں اور منگولوں کو اپنا چکی اور کامیابی سے بلوچوں، ارغوانوں اور مغلوں کے قتل و غارت کا مقابلہ کر چکی تو سترھویں صدی میں میر احمد خان اول کے تحت فاتحانہ انداز میں ابھری۔موجودہ غیر براہوی قبائل میں سے زیادہ تر جاٹوں نے اپنے آپ کو اس میں مدغم کر لیا اور ان کی آبادی میں اضافہ ہو گیا۔بعد ازاں کچھ پٹھان اور بلوچ قبیلے بھی ان کی سرزمین میں آباد ہو گئے اور انہی کی زبان و تہذیب کو اپنا لیا۔اس طریقے سے موجودہ براہوی آبادی کی ہیئت متعین ہو سکی۔اگر موجودہ براہوی آبادی کا نسل یا علم الانسان کے لحاظ سے تجزیہ کیا جائے تو اس امر کا انکشاف ہوگا کہ غیر براہوی (جو بعد میں براہوی بنے) غالب ہیں۔ تعداد کے اعتبار سے مینگل سرفہرست ہیں اور وہ منگول ہیں دوسرے نمبر پر زہری ہیں وہ ابتداً افغانستان سے منتقل ہو کر یہاں اقامت پذیر ہوئے۔تیسرے محمد حسنی ہیں انہوں نے ایران سے ہجرت کی اور وہ شیعہ تھے اور محمد حسینی یا محمد حسنی کہلاتے تھے۔ چوتھے بزنجو رند بلوچوں کی شاخ ہیں پانچویں شاہوانی ہیں جو شاہو بلوچ کی اولاد ہیں۔ان کے بعد لہڑی ہیں جو رند بلوچوں کی ایک شاخ ہیں۔رئیسانی قندھار سے منتقل ہوئے اور تورترین افغان قبیلہ سے متعلق ہیں۔کرد صریحاً کردستان سے آئے۔

بنگل زئی بھی رند بلوچ ہیں اسی طرح محمد شاہی ہیں لانگو بھی نسلاً بلوچ ہیں یوں براہوی آبادی کا نسبتاً زیادہ حصہ غیر براہوی ہے۔ لیکن صدیوں کے انضمام کے بعد اب وہ مکمل طور پر براہوی ثقافت کو اپنا چکے ہیں اور خالص براہوی قبائل کا حصہ ہیں۔

جغرافیائی طور پر براہوی آبادی کو جن تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ذیل میں ان کے اجزائے ترکیبی کا تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس علاقے میں کون سے قبائل آباد ہیں اور ان کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟

ساراوان: ساروان کے علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں میں بلوچی، براہوی، سندھی اور سرائیکی سرفہرست ہیں لیکن ان میں براہوی کو آج بھی فوقیت حاصل ہے، سرداری اور عددی قوت ان کے پاس ہونے کے باعث بھی براہوی ثقافت یہاں نہ صرف حاوی ہے بلکہ یہاں بولی جانے والی براہوی کو جھالاوانی لہجے کی نسبت زیادہ خالص سمجھی جاتی ہے۔ جس میں سندھی کے زیادہ الفاظ داخل ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود اس کا اصل لہجہ آج بھی محفوظ ہے۔ ڈینس برے نے بھی یہ اعتراف کیا تھا کہ ''براہوی زبان کا ماخذ وہی ہے جو دراوڈی السنہ کا ہے۔ اس نے نہایت بے تکلفی سے ایرانی، بلوچی، سندھی اور دیگر ہمسایہ زبانوں کی بے گانی فرہنگ جذب کی ہے۔ لیکن ان مداخلتوں کے باوجود اس کا قواعدی نظام زندہ و پائندہ رہا ہے۔''

ساراوان میں آج بھی براہوی قبائل کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصر تعارف دیا جاتا ہے۔

رئیسانی: رئیسانی ساراوان ڈویژن کی سربراہی کے باعث براہوی قبائل میں سب سے زیادہ با اثر ہیں۔ ان کے بڑے حصے سراج زئی، رستم زئی، راہو، سائیں زئی، عیسیانی، مہرانی اور پندرانی ہیں۔ ان کے مورث اعلیٰ رئیس کے چار بیٹے تھے۔ سراج، رستم، راہو سائیں اور سیاہی۔ پہلے تین بیٹوں پر مندرجہ بالا تین طائفوں کے نام پڑے اور چوتھے بیٹے کی اولاد سیاہی زئی کہلائی جو جھالاوان کے مینگل قبیلے سے جالی اور وڈھ میں آباد ہوئی۔ دیگر حصے بعد میں قبیلہ میں تو نو واردوں (بروک) کی حیثیت سے آملے۔ کہا جاتا ہے کہ رئیسانی براہویوں کے برسر اقتدار آنے سے پہلے پندرہویں صدی میں اس علاقہ میں پہنچ چکے تھے روایت کے مطابق انہوں نے دہواروں کے ساتھ مل کر قلات فتح کرنے میں براہویوں کی مدد کی۔ اس کے عوض قبیلے نے پہلے منگچر اور چھتر میں زمین حاصل کی بعد ازاں جب احمد زیوں نے خان قلات کی مسند سنبھالی تو انہیں کانک اور دلائی میں مالیہ معاف جاگیریں عطا کیں ان کیساتھ گہرے تعلقات کی وجہ سے رئیسانی، براہوی وفاق میں ہمیشہ اعلیٰ حیثیت کے حامل رہے۔ ان سے پہلے شاہوانی ساراوان کے براہویوں کے سردار تھے لیکن رئیسانیوں نے انہیں بے دخل کر دیا اور سرداری پگڑی اپنے سر لے لی۔ کچھی میں ان کی زمینیں بالا ناڑی، ڈھاڈر اور بھاگ کے قرب و جوار میں ہیں۔

رستم زئی: رئیسانیوں کا یہ حصہ ایک عرصے تک قبیلے کے ساتھ برسر پیکار رہنے کے بعد ایک آزاد قبیلہ بن گیا۔ ان کے بڑے حصوں میں گل محمد زئی، جوگیزئی، السیف خانوزئی، اختر زئی، گواہر یزئی اور شیکوزئی شامل ہیں۔ آخر الذکر کے علاوہ باقی تمام ایک ہی مورث کی اولاد ہیں جبکہ آخر الذکر کرشیکوزئی بلوچ ماغذ ہیں اور نو واردوں (بروک) کی حیثیت سے قبیلے میں داخل ہوئے۔

شیخ حسنی: یہ اصل میں جھالاوان کے محمد حسنی قبیلہ کے ہارونی حصہ کی ایک شاخ ہیں۔ لیکن ساراوان میں بس گئے اور رئیسانیوں سے قربت کے باعث انہی کا حصہ بن کر رہ گئے۔

شاہوانی: ان کے سات بڑے حصے ہیں رمضان زئی، علی زئی، محمد حسنی، سوری زئی کشانی، سیاہی زئی، اور غل۔ ان میں سے ہر ایک کی ذکر پھر الگ سے ذیلی شاخیں بھی ہیں رمضان زئی اور علی زئی بلوچ یا افغان ماخذ کے ہیں جبکہ ایک روایت کے مطابق وہ بحیرہ کیسپین کے پاس شروان سے آئے۔ دیگر حصے اصلاً بیگانے ہیں۔ سوری زئی نوشکی ذگر مینگلوں سے آئے ہیں۔ سیاہی زئی کولواہ کے میر واڑیوں سے اور غل جھالاوانی مینگلوں سے۔

عمرانی: یہ سارے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی نام کے طائفہ کی ایک شاخ جھالاوان میں مینگل قبیلہ کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ ان کے اہم حصے یہ ہیں شیر محمد زئی قیصر زئی، زہروزئی، بلوچ زئی اور غزین زئی۔

بنگلزئی: یہ آٹھ طائفوں میں تقسیم ہے، اس میں سید زئی، گہرام زئی، بجار زئی، دینار زئی، شوران زئی، بدوزئی، گرانی اور شاہوزئی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ذیلی طائفوں میں مندوانی، مغندوزئی، باران زئی، میزرانی، شادیانی، پڑ، پگ اور لانگو ہیں۔

قبیلہ زیادہ تر بیگانوں پر مشتمل ہے۔ مرکزہ گہرام زئیوں بجار زئیوں دینار زئیوں، شوران زئیوں اور شاہوزئی لوگوں سے مرتب ہوا ہے جو سب ایک مشترکہ مورث بنگل نامی رند بلوچ کی اولاد ہیں۔ سردار خیل سید زئی بھی بنگل کے وارث ہونے کے دعویدار ہیں لیکن ان کا ماخذ افغان نسل کا بتایا جاتا ہے۔ شاہرگ کے سارنگزئی کاکڑوں کے سید زئی حصے سے ماخوذ ہیں۔ بدوزئی نام کی بناء پر عرب کے بدوؤں سے اپنا رشتہ

جوڑتے ہیں۔ بارانزئی، جھالاوان کے بارانزئی مینگلوں کی ایک شاخ ہیں۔ جبکہ دیگر رند بلوچوں کی باقیادت ہیں جو پندرہویں صدی میں یہاں آکر آباد ہوئے۔

محمد شاہی: قبیلہ کے چھ اہم طائفے کچھ یوں ہیں سامے زئی یا سامکوئی، بمبکا زئی سوروزئی، خدارانی، دودازئی اور گواہرانی۔ سامے زئی کے مزید تین حصے احمد، حاجیزئی اور راحت زئی ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق محمد شاہی ضلع کے قدیم ترین باشندوں میں سے ہیں، قبیلہ کا مرکزہ سامے زئی سوروزئی اور بمبکا زئی حصوں پر مشتمل ہے جو ایک ہی مورث محمد شاہ کی اولاد ہیں۔ دیگر حصوں میں جھالاوانی چندرانیوں سے آئے جبکہ دودازئی اور گواہرانی بلوچ ماخذ ہیں۔

جھکو محمد شاہی: بولان میں یہ قبیلہ انتہائی کم تعداد میں پایا جاتا ہے۔ ان کی تین بڑی شاخیں شہالزئی شہدادزئی اور بہادرزئی ہیں۔

کرد: یہ قبیلہ 9 ٹھکروں پر مشتمل ہے۔ ان کے نام کچھ یوں ہیں۔ مرے زئی، زردارزئی، شدن زئی، شادیزئی، محمد زئی، پھلان زئی، مسعودانی اور گورگیزئی (مسعودانی کو دو طائفوں میں تقسیم کیا جاتا ہے) باغبانہ (جھالاوان) لس بیلہ اور ساراوانی کردوں میں کوئی چیز مشترک نہیں، یہ تنوع پذیر نظر آتے ہیں۔ کرد، کردستان (شمالی ایران) کے کردوں سے ہی ماخوذ ہیں۔ مقامی روایات کے مطابق وہ بلوچوں کے ساتھ بلوچستان آئے جن کی اب وہ ایک شاخ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے رندوں کو کچھی میں چھوڑ دیا۔ جب وہ پنجاب جارہے تھے۔ کچھی سے ان کی ایک شاخ ڈیرہ غازی خان ضلع میں مزاری قبیلہ سے جاملی۔ ان کا مرکزہ مرے زئیوں، زردار زئیوں، شدنزئیوں، شادیزئیوں، محمد زئیوں اور پھلان زئیوں پر مشتمل تھا۔ جوطوفو نامی مرے زئی کی زیر قیادت تھے۔

ساتکزئی: اس طائفہ کے پانچ حصے ہیں دریس زئی، رحمت زئی، باہدین زئی، احمدزئی اور خاکی زئی۔ پہلے دونوں مرکزہ ہیں اور سنزرخیل کاکڑوں کے میر زئی حصے میں سے ہیں۔ صدیوں پہلے وہ کژہ (مسلم باغ ژوب) سے سلطان ابن پشین ابن نقرہ دین کے تحت آئے جو دریس زئیوں کا مورث ہے اور ضلع کوئٹہ پشین میں گلزاری پیر کاسیوں سے لڑے۔ سلطان کے بیٹے کا نام ساتک تھا۔ اس سے قبیلے نے اپنا نام لیا دیگر حصے باہر سے ملائے گئے ہیں۔ باہدین زئی، ذگر مینگلوں اور جتوئیوں سے آئے۔ احمد زئی جھالاوانی مینگلوں سے اور خاکی زئی لانگو قبیلہ کا منسلکہ حصہ (بروک) ہیں۔

لہڑی: اس کے چھ حصے ہیں۔ براہیم زئی، حیدرزئی، زبیرانی، خلیچان، شادیانی، اور شنگرانی۔ پہلے والے دونوں قبیلہ کا مرکزہ ہیں اور ڈومبکی بلوچوں سے ماخوذ ہیں باقی تمام بیرونی ماخذ ہیں۔ زبیرانی پڑرند ہیں۔ خلیچانی بلوچ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ شادیانی ذگر مینگلوں سے برآمد ہوئے اور شنگرانی افغان ہیں۔

سرپرہ: یہ قبیلہ سات حصوں پر مشتمل ہے شمبادائی، سومارزئی، آدم زئی، توتکزئی، جارزئی، مرائی اور رودین زئی، آخر الذکر کو اکثر رودینیوں کے ساتھ خلط ملط کردیا جاتا ہے۔ قبیلہ جزواً بلوچ اور جزواً افغان ماخذ رکھتا ہے۔ قدیم ترین حصہ شمبادائی، شمبدا نامی ابن داؤد رند کی اولاد ہیں۔ سومارزئی اور جارزئی کئی نسلیں پہلے براستہ ژوب یہاں آئے اور یوسف زئی افغان ہیں۔ مرائی سات نسلیں پہلے جھالاوان کے لوٹانی زہریوں سے شادی خان کی قیادت میں آئے اور رودین زئی گیارہ نسلیں پہلے عمر نامی قائد کے تحت دومڑ کاکڑوں سے آئے۔ آدم زئی اور نوتکزئی کا مرکزہ بلوچ نسل کا ہے لیکن ان میں بھی پشین اور شوراک کے افغان آملے ہیں۔

رودینی: یہ بنیادی طور پر جھالاوانی قبیلہ ہے۔ براہویوں کے مشہور و معروف مورث اعلیٰ براہو کے سات بیٹوں میں سے ایک رودین کی اولاد ہیں۔ ساراوان میں اس کے پانچ طائفے آباد ہیں۔ دینارزئی، زہروزئی، شمال زئی، شاہکزئی اور پرکانی۔ آخر الذکر پرک کی اولاد بتائے جاتے ہیں جو نوشیروانیوں کا ایک غلام تھا۔

لانگو: قبیلے کے دو حصے ہیں علی زئی اور شادیزئی (یا شادی) اول الذکر کے ذیلی ۹ طائفے ہیں علم خانزئی، زہرازئی، گاہازئی، اللہ یارزئی، جمندزئی، سالازئی، سمائلزئی، برائے زئی اور شاہوزئی۔ جبکہ شادیزئی کے ذیلی طائفوں میں شائلی زئی، خطی زئی، ملنگ زئی، ذکرزئی، تلیکوزئی، عیسیٰ زئی اور نور محمد زئی شامل ہیں۔

قبیلہ کا مرکز حاجی کی اولاد ہے جو میرچاکر رند کا وفادار تھا اور نال کے قریب گریشہ میں رہتا تھا۔ حاجی کے دو بیٹے تھے عمر اور مندو اور ایک بیٹی تھی جو والئی قلات کے مرقیصر سے بیاہی گئی۔ مندو قلات کے قریب گیوان درغ میں رہتا تھا اور خان کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بیٹے اللہ یار کو باپ کے خون بہا میں منگچر میں زمین ملی۔ اس کی براہ راست اولاد علم خان زئی، گاہازئی، اللہ یار زئی اور جمند زئی (علی لانگوؤں میں) اور نور محمد زئی (شادیزئیوں میں) ہیں۔ موجودہ بڑا قبیلہ انہی کے گرد وجود میں آیا۔ اس میں بہت سے بروک (بیرونی گروہ) ہیں۔ علی لانگوؤں میں جب کے نوتانی، چھٹے، لس بیلہ کے غریا کاران کے رخشانی، قندہار کے افغان، جھالاوان

کے سناری و محمد حسنی اور ہندو پشین کے کاکڑ، کوئٹہ کے کاسی، کولواہ کے میرواڑی اور نوشکی کے ذگر مینگل بھی شامل ہیں۔ شادیزئیوں میں کچھی کے ڈومبکی، ہارونی، قلندرانی، مینگل، بنگلوئی، افغان، ذگر، مینگل اور رخشانی شامل ہیں۔ بلوچستان کے قبائل (ضلعی گزیٹیر سے انتخاب) حصہ اوّل، مترجم: پروفیسر ایم انور رومان، کوئٹہ، 87-1986 ص 350۔

کلوئی: ساراوان کے کلوئی کچھی کے کلوئی رندوں کی شاخ ہے جو کئی نسلیں پہلے منگچر میں آباد ہوگئے۔ ان کے بڑے طائفے موسیٰ، کریم زئی، سامیزئی، حسن زئی، حیروزئی اور جلال زئی ہیں۔ انہیں لانگو قبیلے کا ایک طائفہ ہونے کا دعویٰ کیا جاتا رہا ہے۔ جبکہ قبائلی معاملات میں رند قبیلہ کا ایک حصہ سمجھے جاتے ہیں اور شوران کے رند سردار کو اپنا سردار مانتے ہیں۔

دہوار: دہوار بے حد محنتی اور بے ضرر لوگ ہیں۔ دیہہ یعنی قصبے میں رہنے کی وجہ سے ان کا نام دہوار پڑا۔ قبیلہ کا مرکزہ تاجک ماخذ کا ہے اور انہی کی طرح وہ فارسی بھی بولتے ہیں۔ قبیلے کے دو حصے ہیں ایک قلاتی اور ملنگی۔ قلاتی دہوار کے پانچ ٹھکر (حصے) ہیں ڈوڈ کی رئیس طوقی، ٹونٹی، علیزئی اور مغل زئی۔

مستونگی دہوار اپنے اپنے علاقوں کے نام پر مشہور رہے ہیں جیسے مستنگی، پڑنگ آبادی اور تیرچی۔ یہ خواجہ، شیخ سارنگ، ہوتیزئی، سولائی، آبیزئی، زرخیل اور دادیزئی پر مشتمل ہیں۔ مستنگی دہواریوں میں دیگر چھوٹی چھوٹی اکائیاں قزی زئی، جولا، چمکازئی اور گوہرازئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ خواجہ خیل شیراز (ایران) سے آئے۔ شیخ ایک بڑا طائفہ ہیں اور دو بھائیوں شیخ تقی (تقی) اور شیخ علی کی اولاد ہیں۔ جو افغانستان کے علیزئی افغان تھے۔ اول الذکر کا مزار مستونگ کے قریب واقع ہے جہاں لوگ عقیدت سے جاتے ہیں۔ سارنگ افغانستان کے اسحاق زئی درانیوں کی ایک شاخ ہیں۔ ہوتیزئی کے دو حصے ہیں۔ ہوتیزئی اور رک اور دونوں دو موروثین ہوتان اور رند کی باقیادت ہیں اور رند بلوچ ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ آبیزئی مشمولہ بہ بادین زئی عرب ہونے کے دعویدار ہیں اور دو موروثین عابد خان اور بادین کی اولاد ہیں۔ زرخیل جھالاوان کے زرکزئی زہریوں کی مانند خود کو ترین افغانوں سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ وہ وادی مستونگ کے قدیم باشندے ہیں اور براہویوں کی ابتدائی تاریخ میں ان کا اہم کردار ہے۔ میر بجار میرواڑی جس نے جدگالوں کو نکال باہر کیا زرخیل ماں کے بطن سے تھا۔

پڑنگ آبادی دہواروں کے چار طائفے ہیں۔ یوسف زئی، بدازئی، طرہ زئی یا طبران زئی اور محمد زئی اور یہ سب افغان ماخذ کے ہیں۔ یوسف زئی اور بدازئی پشاور سے آمدہ بتائے جاتے ہیں۔ طرہ زئی ایران سے اور محمد زئی کابل سے آئے۔

تیرچی دہوار تیری میں رہتے ہیں اور پڑنگ آبادیوں کی طرح جداگانہ اکائی ہیں۔ ان میں سے اکثر تاجک النسل ہیں۔ ماضی میں افغان بلوچ اور براہوی بھی ان سے آملے ہیں۔ تیرچی کے بڑے طائفے انازئی، پیرولی زئی، موسیٰ خانزئی، امدونی، مہرعلیزئی، حسین خانزئی، مندوزئی، زکریازئی اور سنجرزئی ہیں۔ ایک چھوٹی سی شاخ کشمیرزئی بھی بتائی جاتی ہے۔ جو کشمیر سے آمدہ ہے۔

سادات: ساراوان میں سادات کی ایک بڑی تعداد آباد ہے اور ان میں سے اکثریت براہوی زبان اور ثقافت کو اپنائے ہوئے ہے۔ مستونگ اور قلات میں ان کی اکثریت ہے۔ کچھ تیری پڑنگ آباد اور منگچر میں بھی آباد ہیں۔ مستونگی سادات اپنے مورث خواجہ ابراہیم یک پاسی کی وجہ سے یک پاسی زئی کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کے توسط سے اللہ سے جو دعا مانگی جاتی ایک پاس (تین گھنٹے کے برابر) کے اندر اندر پوری ہو جاتی تھی۔ وہ کرانی اور ڈھاڈر کے سادات کے ہم جد ہیں۔ سب کی زمینیں ہیں اور لوگوں کی نذر نیاز (ٹھک) اور پیوند کاری (ٹھکا) سے بھی ان کی آمدن ہو جاتی ہے جس کے لئے آج بھی اکثر سادات دور دراز کے گاؤں میں جاتے ہیں۔

قلاتی سادات چینی اور گیلانی یا جیلانی ہیں۔ چشتیوں میں سرکردہ ہستی بی بی صاحب ہوا کرتی ہے۔ جسے نہایت محترم سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنے ایک خادم (خلیفہ) کے ہمراہ وسیع پیمانے پر پیوند کاری کرتی ہے۔ قلات کے چشتی مستونگ کے چشتیوں سے جدا ہیں۔ گیلانی جھالاوان اور سندھ میں نذر نیاز لینے جاتے ہیں۔ کانک اور تیری میں شادیزئی سادات کے جو گھرانے آباد ہیں وہ پشین کے شادیزئیوں کی شاخ ہیں۔ انہیں بھی سادات کہا جاتا ہے۔

جھالاوان: جھالاوان کے اہم قصبات درج ذیل ہیں:

سوراب، نچارہ، نورگاما، گھٹ، باغبانہ، خضدار، نال وڈھ اور گجر (مشکے)۔ بالائی اور وسطی جھالاوان کے لوگ درہ مولا اور گاجی لک کے راستے، کچھی اور گاجی یا سائیں لک کے راستے ضلع شکارپور یا کیرتھر کے دروں کے ذریعے جاتے ہیں۔ سارونہ اور خورانی کے علاقے کے لوگ سیہون اور زیریں جھالاوان کے میرواڑی کے باشندے عموماً لس بیلہ اور کراچی جاتے ہیں۔ اب انہوں نے ان علاقوں میں رشتے داریاں بھی کر لی ہیں۔

بیشتر آبادی براہوی زبان بولتی ہے۔ سندھ سے قربت اور آمد و رفت کے باعث یہاں کی براہوی پر سندھی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ البتہ یہاں کے

سندھی بھی براہوی ہی بولتے ہیں۔ اور علاقہ پر براہوی ثقافت کا مکمل غلبہ ہے۔ براہوی کے علاوہ بلوچی اور لاسی (سندھی سے ملتی جلتی زبانیں) بولی جاتی ہیں۔ بلوچی پر فارسی کا اثر زیادہ اور لاسی یہاں کے جاموٹ اور ہندو قبائل بولتے ہیں۔

جھالاوان کے اہم براہوی قبائل کا تعارف پیش ہے۔

زہری: زہری قبیلہ کئی بوقلموں عناصر پر مشتمل ہے اور اسی وادی کے نام پر مشہور ہے جو موروثی سردار کی رہائش گاہ ہے۔ سردار براہوی وفاق کے جھالاوانی دستے کا سربراہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے بڑے بڑے طائفے یہ ہیں زرکزئی، خدرانی، جنک، ساسولی، موسیانی، باجوئی، لوٹیانی زرکزئی قبیلے کا حکمران حصہ ہے۔ زہری وادی میں رہتا ہے اور مقامی روایت کے مطابق ایک ژڑخیل ترین افغان زرک کی اولاد ہے۔ جو افغانستان سے زہری کے علاقے میں آکر آباد ہوا ہے۔

خدرانی: یہ سات طائفوں پر مشتمل ہے۔ حکمران طبقہ شاہوزئی ہے جو میر زرک اور محمد (محمد زئی مینگلوں کا مورث اعلیٰ) کے ایک بھائی شاہو کی اولاد ہے۔ میاری اور علی مراد زئی جدگال ہیں۔ اول الذکر بھینس (براہوی میں میہی) رکھنے والے اور آخر الذکر سندھ کے ایک ماچھی (ماہی گیر) کی اولاد ہیں۔ دلو جان ایک نومسلم ہندو کی اولاد ہیں جبکہ گچکی زئی اور رہزن زئی بھی جدگال ماخذ ہیں۔

جنک: مقامی روایات کے مطابق جنک قبیلے کے چار بڑے طائفے ہیں۔ آدمانی، سمارانی، عمرانی اور جہانگیرانی۔ یہ آدم، سمار، عمر اور جہانگیر (علی رند کے چار بیٹے) کی اولاد ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ جبکہ سردار خیل بانزوزئی افغان گورنر کے ایک نائب بانزو کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔ جس نے طائفے کے سردار آدم کی بیٹی سے شادی کی تھی اور اس کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی لہٰذا سرداری بانزو کے بیٹے کو مل گئی۔

ساسولی: ساسولی دوسروں کی طرح ایک مخلوط طائفہ ہیں۔ سردار خیل ہوتمان زئی ہیں جو بلغت جدگالوں کی اولاد ہونے کے دعویدار ہیں اور سندھ کے وارد شدہ ہیں۔ دوسرا اہم حصہ شیخ ساسولی ہیں جو پیر عمر کی اولاد کہلاتے ہیں۔ اور جن کے مزار مختلف مقامات پر ہیں جیسے پنجگور کے قریب جہاں پیر موصوف قتل کر دیئے گئے اور خضدار کے قریب دریائے سمان پر جھالاوان سے کافی تعداد میں ساسولی ساراوان کو ہجرت کر گئے اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

موسیانی: موسیانی ایک رند بلوچ ماخذ کے دعویدار ہیں اور ان اولین نو واردوں میں سے بتائے جاتے ہیں۔ جنہوں نے جدگالوں کو علاقہ بدر کیا۔ موسیانی کا صدر مقام بلبل رہا ہے جو نمٹ کے قریب زہری میں واقع ہے۔

باجوئی: باجوئی تین قبیلہ طائفوں اور ہمسایوں پر مشتمل ہے۔ جن میں آدینہ زئی، بوہیر زئی، گورانجو اور رادھانی شامل ہیں۔ اس کا سردار خیل خانزئی طائفہ رند نسل کا دعویدار ہے جو باجکانی بلوچوں سے متعلق ہے۔ دیگر طائفے بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب رند کچھی کی طرف کوچ کر گئے تو وہ سواد اعظم کو چھوڑ کر پیچھے رہ گئے جس کی وجہ سے ان کا نام باجوئی پڑ گیا۔ یعنی سندھی بھاج سے (بمعنی فرار یا رفاقت شکنی)

لوٹیانی: یہ نو طائفوں پر مشتمل ہے۔ کاہنی طائفہ قدیم جدگال باشندوں کی باقیات بتایا جاتا ہے۔ بدوزئی ساراوان سے آئے ہیں۔ دوسرے طائفے زہری (زرک کا والد) کی اولاد ہیں اور موسیانیوں کے ہم جد ہیں۔ لوٹیانی زہریوں میں ایک بہادر طبقہ سمجھے جاتے ہیں۔ قبائلی جنگ وجدل میں یہ بھاری ہتھیار اٹھایا کرتے تھے۔

مینگل: بلوچستان میں اس نام کے تین براہوی قبائل ہیں۔ اول جھالاوان کے مینگل دوم بولان کے مینگل اور سوم نوشکی کے ذگر مینگل یہاں جھالاوانی مینگل کا ذکر مقصود ہے۔

جھالاوانی مینگل ماخذ کے لحاظ سے جدگال بتائے جاتے ہیں۔ قبیلہ اپنی موجودہ تشکیل میں مندرجہ ذیل طائفوں پر مشتمل ہے۔ شاہی، نک شاہی زئی، پہلوانزئی، شادمانزئی (جو سردار خیل ہیں) نک شاہی زئی اور پہلوانزئی ایرانی ماخذ کے دعویدار ہیں۔ اور محمد زئی وبارانزئی ترین افغان ماخذ کے ہیں۔ رئیسانی ساراوان رئیسانیوں کے ہم نسل ہیں۔ مردوئی بلغت جدگال ہیں جو کراچی کے تھانہ بولا خان کے پیرانی، جملانی، لوہارانی جوام کے مورث اعلیٰ جام اری کے چوتھے بیٹے جام بہاء الدین کی اولاد ہیں۔

شیخ ایک ولی علی، بے ذات یا علی نامی کی اولاد ہیں جس کا مزار نورگامہ کے شمال کی ریشک پہاڑیوں میں ہے۔ مقامی روایت کے مطابق میر نصیر خان اول کے ساتھ گئے جب اس نے اپنی سان (قبائلی فوج) عازم قندہار کی۔ ولی سے پوچھا گیا؛ وہ کون سے قبیلے سے ہیں؟ تو انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر خان پکارا ''علی بے ذات نہیں سان نہیں ساٹ'' یعنی علی کا کوئی قبیلہ نہیں لہٰذا مسلح سپاہی یا جزیہ واجب نہیں۔

سوراب کا اللہ سلیمان اور نک کا پیر فقیر و اور دیگر مشہور اولیا تھے۔ ماضی میں (کہیں کہیں اب بھی) ان اولیاء کے ورثاء میں سے بعض خاندان ارچینو اور ارزونان کی خشکابہ زمینوں کی پیداوار کا پچاسواں حصہ وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں جبکہ پلی زئی / پہلوان زئی مینگل شادیوں پر انہیں ایک ایک لیلا (بھیڑ) پیش کرتے

ہیں۔شیخ تعویذ گنڈے بیچتے ہیں۔بدارواح کو نکالتے ہیں اور بارش برسانے کی قوت کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔مینگل قبیلہ کا صدر مقام وڈھ ہے۔

محمد حسنی: محمد حسنی یا حسینی کو حرف عام میں "ماماسانی" کہا جاتا تھا ایک اہم قبیلہ ہیں۔ وہ سیستان، لورستان کی پہاڑیوں اور بلوچستان کی وادی مشکے میں رہتے ہیں۔وہ شورہ رود سے جنوب میں مالار اور مغرب میں پنجگور تک پورے مغربی بلوچستان میں پائے جاتے ہیں اور نوشکی، چاغی، سنجرانی علاقہ میں راسکوہ سے سیستان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ان کا نام کلاسیکی ہے اور ایک طاقتور قبیلہ ہے جس کا سکندر اعظم کو بالائی باختر میں مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ خارانی نوشیروانیوں کے رشتے دار بتائے جاتے ہیں اور دونوں لور کے ماما سانیوں کی اولاد ہونے کے دعویدار ہیں۔ ماماسانی بلوچستان کا بہادر ترین اور وحشی ترین قبیلہ اپنے ہمسایوں میں برے دوستوں اور سخت دشمنوں کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

جھالاوان میں یہ قبیلہ کئی طائفوں پر مشتمل ہے۔ان میں کرم علی زئی، مزار زئی، کیچی زئی، غازی خان زئی، شیروزئی، ہاروزئی، شاہدادزئی، سمالی، زنگیانی، یوسفی اور حسینی شامل ہیں۔اس کے علاوہ ذیلی شاخوں میں جونگوزئی اور دلشادزئی بنگلزئی (اکمانزئی شاخ کے علاوہ) نندوزئی، چاکرزئی، بجارزئی، چیزوانی، سوبھازئی، سیاہی زن، درک زئی، زیرکانی، شاہوزئی، کہرائی مندوزئی اور کلافانی شامل ہیں۔

ہارونی: ہارونی محمد حسنی کا ایک اہم طائفہ ہیں۔شیخ حسین کی اولاد ہیں۔شیخ حسینی ایک محترم طبقہ ہے۔شیخ صاحب کا مزار نوشکی کے قریب واقع ہے۔

بزنجو: میر واڑی روایت کے مطابق بزنجوؤں کا مورث اعلیٰ بیزنج میر واڑی، جانباز میر بجار کا خادم تھا۔رفتہ رفتہ "بست من جو" جو بزنجو میں بدل گیا۔لیکن بزنجو خود اپنا شجرہ نسب نوحانی رند بلوچ سے ملاتے ہیں۔ٹمپل کا خیال ہے کہ بیزن دور رستم کا ایک جانباز تھا جس کا ذکر شاہنامہ فردوسی میں موجود ہے۔لہٰذا بزنجو کیانی ایرانی ہیں۔ اس کے چار بڑے طائفے ہیں حملاڑی، تمبر اڑی، عمرانی اور سیاہ پاد۔ ہر طائفہ کا اپنا اپنا مقبرہ ہے۔جبکہ حملاڑی مقبرہ سردار قبیلہ ہے۔سردار خیل حملاڑی، فقیر محمد زئی دوست محمد زئی، گواران زئی، کمال خان زئی، بوئیرزئی، طائفے میں نددواری، بابرزئی ساسولی، شیخ احمدی، جرارزئی، شاہرستان زئی، درمان زئی، شاہ مرادانی، غبیزئی، ملک دادزئی، عیدوزئی، کرخیزئی، سفرزئی اور لانگو بھی شامل ہیں۔

تمبر اڑیوں کا مقام اورناچ ہے اور ان کے بڑے بڑے پاڑے ہیں۔ غازی زئی جس سے ان کا معتبر تعلق رہا ہے۔درویش زئی، فقیرزئی اور سوداوزئی، تمبر اڑی ماخذ کے لحاظ سے رخشانی بلوچ بتائے جاتے ہیں۔مقامی روایت کے مطابق جب میر واڑیوں نے جدگالوں سے علاقہ لے لیا تو سردار خاران ملک دوستین نے تمبر رخشانی کو وڈھ اور ڑاکالو پر قبضے کے لئے بھیجا۔بعد میں ان پر مینگل قابض ہو گئے۔ تمبر اڑی تمبر کی اولاد ہیں۔

عمرانی ایک رند بلوچ عمر کی اولاد ہونے کے دعویدار ہیں۔ان کا صدر مقام تغاپ (نال) ہے اور معتبر فقیرزئی پاڑے سے ہوتا ہے۔منیروزئی اور غیبی زئی پائے زہری بتائے جاتے ہیں۔عمرانی اب بلوچستان بھر میں پھیل چکے ہیں۔سیاہ پاد پرانے وقتوں میں سیاہ کمبلیں بوٹ پہنتے تھے۔اس لئے سیاہ پاد کہلائے، وہ بھی رند بلوچ بتائے جاتے ہیں۔ان کا صدر مقام خرماستان (نال) ہوا کرتا تھا اور معتبر مندوزئی پاڑے سے ہوتا ہے۔

میر واڑی: میر واڑی ایک اہم براہوی قبیلہ ہے۔جھالاوان میں اس کے ذیلی طائفے یہ ہیں۔گواہرامزئی، کرمشازئی، سماءزئی اور جیند اری۔یہ سب میرو سے اپنا شجرہ نسب ملاتے ہیں۔مغربی بلوچی بولتے ہیں اور اپنے آپ کو براہوی زبان کی بجائے بلوچ سمجھتے ہیں۔ان کے دوسرے مالی طور پر مستحکم پاڑوں میں حالد، کوتوال، گزبر، کلیچو، جلمباری، استماڑی، سلاحی، کنرزئی، کورک اور گجر ہیں۔

قمبر اڑی: قمبر اڑی (قمبرانی) قبیلہ سوبھازئی (سردارخیل)، بارانزئی اور خوشحال زئی طائفوں پر مشتمل ہیں۔اس کے علاوہ کیازئی اور شیخ احمدی بھی اس کا حصہ ہیں۔نورگامہ (زہری علاقہ) میں رہنے والے قمبر اڑی ایلتانزئی کہلاتے ہیں۔کیازئی خانہ بدوش طائفہ رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سوبھازئیوں کا مورث سوبھا بہت لالچی آدمی تھا اور قبائل کے گھر میں جو چیز اسے بھا جاتی وہاں سے اڑا لیتا تھا۔ایک دفعہ وہ حسن کیازئی کے گھر گیا جو شاہوانیوں کے ساتھ اسکل کو میں رہتا تھا۔اسے ایک بچھڑا ذبح کرنے کا حکم دیا اور تعمیل کی گئی۔اس کے بعد سوبھا گھر کی دیگر اشیاء پر ہاتھ صاف کرنے لگا جس پر حسن نے طیش میں آکر اسے مار ڈالا۔میر نصیر خان اول نے فیصلہ کیا کہ سات کیازئی خاندان سوبھا کے جانشینوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔جھالاوان کے کیازئی انہی سات خاندانوں کی اولاد ہیں۔

قمبر اڑیوں کے ماخذ سے متعلق مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔ایک مشہور روایت یہ ہے کہ وہ امام رہبر کے بیٹے قمبر کی اولاد ہیں۔میسن انہیں واڑیوں میں شمار کرتا ہے۔ایک اور روایت کے مطابق وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے غلام کی اولاد ہیں۔اور حبشی النسل ہیں لیکن عمومی خیال یہ پایا جاتا ہے کہ قنبر میر ابراہیم کے سات بیٹوں میں سے ایک تھا لہٰذا وہ احمدزئیوں اور میر واڑیوں کے ہم نسل ہیں۔

گرگناڑی: گرگناڑی لفظ گرگ (بمعنی بھیڑیا) سے مستعمل ہے اور وہ عربی النسل قریشی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ مقامی روایات کے مطابق وہ میرواڑیوں کے مورث میر کے بھائی میر گرگین کی اولاد ہیں۔ وہ شاہ بیگزئی، میرانزئی، ازغلوئی، محمودانی، یوسفاری، سیاہی زئی اور خدری طائفوں میں تقسیم ہیں۔ شاہ بیگ زئی ان میں سے سردار خیل ہیں۔

سمالاڑی: سمالاڑی یا سمالانی میر سمال کی اولاد ہیں جو میرواڑیوں کے مورث میرو کے بھائیوں میں سے ایک تھا۔ سمالاڑیوں کا ایک طائفہ سیدزئی مضبوط ترین طائفوں میں سے ہے۔ اور افغان ماخذ کا ہے۔ بڑے پاڑے یہ ہیں۔ ہوتمانزئی (سردار خیل) مریدزئی، محمودزئی، سخنکی، براقزئی، حسینی، بلوخانزئی، سیدزئی، گواہرام زئی، دادوزئی، لوکی یٹوری، سخینی اور رازان زئی۔

قلندرانی: میرواڑیوں کے مورث میرو کے بھائی قلندر کی اولاد ہیں۔ سردار خیل فیروز شاہی زئی ہیں۔ دیگر اہم پاڑوں میں بہاؤ الدین زئی، سنجرزئی، شاہدین زئی، ساہکوئی، لہری زئی، جلاب زئی، چندروری، خاری، خدرو بداجو، براقزئی، سمالزئی، سیاہی زئی، درویش زئی، لوٹاری اور سلاحی زئی شامل ہیں۔

رودینی: رودینی براہوی یا براہیم کے سات میں سے ایک بیٹے رودین کی اولاد ہیں۔ اکثر رودینی ساراوان میں رہتے ہیں۔ وہ درج ذیل پاڑوں پر مشتمل ہیں۔ یعقوب خانزئی، زہروزئی، جمالزئی، جیاندزئی اور بنگرزئی۔

ساجدی: بعض مصنفین ساجدیوں کو سیتھی مانند یعنی قدیم ساجتائی اور سکندر کے ساتھ شمال سے آنے والی فوج کے حصہ کی اولاد سمجھتے ہیں۔ جھالاوان میں ان کا ساکئی یا ساکازئی پاڑہ سیتھی ماخذ کا سمجھا جاتا ہے انگریز دور کے پولیٹیکل ایجنٹ قلات کیپٹن ٹمپل کا خیال تھا کہ ساجدی خالص بلوچ تھے لیکن باہمی رشتے داریوں سے بتدریج جھالاوانی براہویوں سے گڈمڈ ہو گئے۔ مقامی روایت کے مطابق ساجدی ابتداء میں شمال کی جانب سے آگئے اور پنجگور کے قریب وادی گچک میں متمکن ہو گئے جہاں ان کے قدیم دیہات ساکا قلات کے کھنڈرات اور ان کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔ اس کے اہم طائفوں میں گچکی زئی، محموداری، احمداری، سایاری اور سنگور شامل ہیں۔ گچکی زئی طائفہ ماکاری ساکازئی بیزناری، تیموراری، یوسفاری اور سندرواری میں تقسیم ہے، جبکہ بھائیٹ، احیبانی، گدوراور نوتانی غیر ہیں۔ ابتداء میں مالیہ ادا کرنے کی شرط پر قبیلے میں داخل کئے گئے اور پھر مستقلاً اسی کا حصہ ہو گئے۔ احمداری رند بلوچ بتائے جاتے ہیں جبکہ کئی دیگر جدگال نسل سے ہیں۔

نچاری: نچاری یا نیچاری قدیم قبیلہ ہے۔ مقامی روایات کے مطابق نچاری الیکوزئی افغان ہیں۔ ان کا مورث الیکو اپنے ریوڑوں سمیت افغانستان سے نچارہ علاقہ میں آیا جو اس وقت ایک جدگال ہمیر کے قبضے میں تھا اور وہ وادی ہمیر میں رہتا تھا۔ رند بلوچ موسیٰ اور بنگلزئی براہویوں کا مورث بنگل بعد میں نیچارہ آئے اور الیکو کے ساتھ مل کر ہمیر کو مار دیا۔ علاقے پر قبضہ کیا اور اسے آپس میں بانٹ لیا۔

نچاریوں کے بڑے بڑے طائفے بہادر خانزئی، بہاءالدین زئی، خوشداد زئی اور غلامزئی ہیں۔ ان میں رئیسانیوں کی ایک شاخ لہر کی اور لہڑی قبیلہ کا ایک پاڑہ براہیم زئی کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

پندرانی: ان کے مندرجہ ذیل پاڑے ہیں:

صمدزئی (غالب پاڑہ) موتانی، مضانزئی، جوگیزئی اور اکزئی۔ مرکزہ رند بلوچ تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ جوگیزئی غیر اور پست سمجھے جاتے ہیں۔

ریکی زئی: ماشکیل کے ریکی یا ریگی اپنا تعلق بلوچوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا مورث ریکی اپنے بھائی فقیرو کے ساتھ ماشکیل سے گدر ہجرت کر گیا۔ اس کی ایک حسین بیٹی تھی جو میر نصیر خان اول سے بیاہی گئی اور ایک بچے کی ماں بنی جو بعد میں میر محمود خان اول کے نام سے مشہور ہوا۔ ان دنوں خوانین کے دور میں ریکی زئیوں کو ان کی مہربانیوں سے پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ انہیں سوراب میں سرخ چشمہ دیا گیا۔ بعد میں انہوں نے گدر میں زمین لے لی۔ گدر میں ان کے اہم پاڑے خیرانزئی گواہرام زئی، افغان زئی اور لشکری زئی ہیں اور ان سے منسلک گروہ فقیروزئی، محمدزئی، جنگی زئی، سیاگازئی، سبزلی زئی، ملازئی، سرخی، بیگوزئی اور چونک ہیں۔

لوہڑی: لوہڑی کی آسان تشریح یہ ہے کہ براہویوں کا شودر طبقہ ہے گو کہ جدید سماج میں اب ان کے مقام و مرتبے میں خاصی حد تک بہتری آچکی ہے اور محض پیشے کی بنیاد پر اب انہیں تحقیر کا نشانہ نہیں بننا پڑتا لیکن یہ طبقہ کہیں کہیں آج بھی اپنی خالص بناوٹ کے ساتھ موجود نظر آتا ہے۔ اور ماضی میں براہوی ثقافت کا ایک لازمی جزو رہا ہے۔

ان کا نہ تو علاقہ مخصوص ہے اور نہ قبیلہ۔ جھالاوان میں یہ خود کو سرمستاڑی کہلواتے ہیں کیونکہ وہ سرمست کو اپنا مورث بتاتے ہیں جو ان کے بقول احمدزئی براہویوں کے مورث احمد کا بھائی تھا لیکن دیگر قبائل اس دعوے کو لغو قرار دیتے ہیں اور انہیں ''کمتر'' درجے کی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کے سماجی رتبے کا تعین قبیلے

یا نسل سے نہیں بلکہ ان کے پیشے سے ہوتا ہے۔ یہ لوہڑی یا دستکار ہیں جیسے ترکھان، لوہار اور سنار یا موسیقار اور گائیک ہیں جو سرکردہ قبائل کے خاندانوں میں شادی و مرگ پر منظوم قصے گاتے ہیں اور ان کے مہمان خانوں میں ضروری خدمات بھی بجا لاتے ہیں۔ وہ اپنے مربی قبیلوں اور طائفوں کی خصوصی حفاظت میں ہوتے ہیں۔ اور اپنی مراعات وحقوق کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔

لوہڑی چونکہ خانہ بدوش رہے ہیں اس لئے اب سارے بلوچستان میں چپے چپے پر موجود ہیں۔ مذکورہ بالا پیشوں کے علاوہ بازیگری بھی کرتے ہیں اور ان کی عورتیں ہاتھ دیکھنے اور قسمت کا حال بتانے میں ماہر سمجھی جاتی ہیں۔ لوہڑی غنڈے اور آوارہ گرد سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی چوریاں اور فریب کاریاں ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں۔

کمین: کمین جنہیں لانگو یا خانہ زاد کہا جاتا ہے۔ طبقاتی طور پر ان کی حیثیت بھی براہوی سماجی ڈھانچے میں وہی ہوا کرتی تھی جو لوہڑی کی تھی۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ زیادہ تر ان جنگی قیدیوں کی اولاد ہیں جو میر نصیر خان اول کے دور میں براہوی لشکری مکران سے لائے تھے۔ وہ معزز گھرانوں کے گھریلو کام اور زراعت کرتے تھے۔ ان کی خدمت کے پیش نظر ان سے اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ حالات کے ساتھ یہ قبیلہ ارتقاء پذیر رہا۔ لوہڑی اپنا پیشہ تبدیل نہ کر پانے کے باعث سماجی سطح پر آج بھی اسی سلوک کا شکار ہیں جبکہ لانگو نے شہری سماج کی طرف مراجعت کرتے ہوئے خود کو سماجی ضروریات کے مطابق تیار کیا اور یوں اس روایتی ڈھانچے سے نکل آیا جس کے خول میں وہ کمتر حیثیت میں بند تھا۔ آج اسے کوئی کمین نہیں کہتا۔ معاشرتی طور پر اس سے لوہڑی کی نسبت، براہوی، کا سلوک کیا جاتا ہے۔

ہندو: جھالاوان میں ہندو کثیر تعداد میں آباد ہیں اور انہیں جدگالوں کی طرح یہاں کے قدیم باشندے سمجھا جاتا ہے۔ درحقیقت ان میں اصل قدیم باشندوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کی اکثریت کچھی اور سندھ سے ہجرت کر کے آئی ہے۔ سوراب، نال، خضدار، مشکے اور وڈھ میں چھوٹے موٹے نجی کاروبار پر ان کی اجارہ داری ہے۔ یہ لوگ قیام پاکستان سے قبل یہاں آباد ہیں۔ انہیں کبھی مذہبی تعصب کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ خود انہوں نے بھی رواداری کا مظاہرہ کیا۔ یہ لوگ ذات پات کے سختی سے پابند نہیں اور مسلمانوں کے درمیان گھل مل کر رہنے کے عادی بن چکے ہیں۔ جھالاوان کے تمام ہندو سندھی اور براہوی زبانیں بولتے ہیں حتیٰ کہ ان کے گھروں میں بھی عمومی طور پر براہوی زبان استعمال ہوتی ہے۔ اور براہوی ثقافت کا بھی ان پر گہرا اثر ہوتا ہے علاقائی تہوار مل کر منائے جاتے ہیں۔ جھالاوان کی تاریخ میں کبھی مذہبی فساد کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔

خضدار کے قریب شوبرو میں ہندوؤں کا مقامی تیرتھ ہے جسے وہ ایسا پوری کہتے ہیں۔ وہاں پانی کا ایک چشمہ ہے۔ مقامی ہندو بیساکھ میں یہاں نوروز مناتے ہیں۔

البتہ ان کے مقامی رسم و رواج پر براہوی کے اثرات نہایت واضح اور گہرے ہیں۔ مذہبی رسومات کے علاوہ باقی تمام رسم ورواج پر براہوی ثقافت کا غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ جھالاوان کے اکثر ہندو خود کو نہ صرف براہوی سمجھتے ہیں بلکہ براہوی کہلواتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔

بولان: بولان کا علاقہ مچھ سے لے کر سبی، نصیر آباد اور جعفر آباد تک پھیلا ہوا ہے۔ جھالاوان اور ساراوان کی نسبت یہاں براہوی کے بجائے بلوچ قبائل کی اکثریت ہے اس لئے انہی کی زبان اور کلچر کو فوقیت حاصل ہے۔ براہوی کلچر دیگر ثقافتوں کو ضم کرنے اور جذب ہونے کی فطری خصوصیت کے تحت یہاں جاموٹ قبائل کی ثقافت کے زیر اثر نظر آتا ہے۔ یہاں آبادی کی اکثریت سندھی اور سرائیکی بولتی ہے اس لئے یہاں بسنے والے بلوچستان کے واحد براہوی قبائل ہیں جو یہ زبانیں بولتے اور سمجھتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی زبان اور ثقافت کو مکمل طور پر آج بھی نہیں چھوڑا۔ ان کے گھروں میں آج بھی براہوی ہی بولی جاتی ہے البتہ رسم ورواج پر علاقائی اور مقامی اثرات غالب نظر آتے ہیں۔

کچھی میں رئیسانی، شاہوانی، بنگلزئی، محمد شاہی، گرد، لہڑی اور لانگو براہوی قبائل زیادہ تعداد میں ہیں۔ ان کے علاوہ سبی اور نصیر آباد کے گرد ونواح میں آباد براہوی قبائل میں پندرانی، جتک، مینگل، ساسولی، زہری اور دیگر قبائل کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ نصیر آباد اور جعفر آباد کے گرد ونواح میں ان کے چھوٹے چھوٹے دیہات ہیں جہاں ان کا ذریعہ معاش زراعت ہے۔ خانہ بدوشی کی قدیم روایت کے باعث آج بھی براہوی بہت کم تعداد میں شہروں کی طرف منتقل ہو پائے ہیں۔ بڑے بوڑھے جدید سہولیات کے باوجود آج بھی دیہات میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈھاڈر سے لے کر سبی، اور نصیر آباد تک سارے بولان میں براہوی قبائل کی اکثریت دیہات میں ہی نظر آتی ہے۔

جاٹ یا جاموٹ: جاٹ جٹ یا جاموٹ قبائل کے ماخذ سے متعلق مورخین و محققین تذبذب کے عالم میں نظر آتے ہیں۔ اور کسی ایک نقطہ نظر پر متفق نظر نہیں آتے البتہ انہیں اس علاقے کے قدیم ترین باشندے ضرور سمجھا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ براہوی قبائل کی ان علاقوں میں ''آمد سے قبل یہاں موجود تھے'' اور

ستونگ میں سفید بلندی کے قدیم قلعے کے باقیات

دوالائی فورٹ سنڈیمن روڈ پر قدیم قلعے کے آثار

چند ایک قبائل بعد میں ہجرت کر کے آئے اور پھر مستقلاً یہیں آباد ہو گئے۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر میں ان کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ:

''جاٹ مسلمان قبائل کا ایک ایسا ملغوبہ ہیں جن کا کوئی مشترکہ ماخذ نہیں اور ممکن ہے ان میں سے بعض ان باشندوں کی اولاد ہوں جو فتح سندھ کے وقت مسلمان کئے گئے اور کچھی اس وقت لازماً سندھ کا حصہ تھا۔ بہت سے جاٹ جیسے کہ بھٹی، سیال، اعوان۔ جاٹ وغیرہ کوئی دو صدیاں پیشتر ملتان، ڈیرہ غازی خان اور بہاول پور (پنجاب) سے آئے۔ جب وہ صوبہ ایک سخت قحط کی لپیٹ میں تھا اور کچھ کو نصیر خان اول (۱۷۵۰ تا ۹۴۔۱۷۹۳ء) لایا تا کہ زراعت ترقی کر سکے۔''

البتہ اس خیال کا اظہار ضرور کیا گیا ہے کہ اس نسل کے پاڑے کا ہیوالی صوبے کی کوئی قدیم ترین نسل معلوم ہوتا ہے اور اغلب ہے کہ ان میں سے کچھ اصلی ہندو باشندوں کی اولاد ہوں جو اسلامی فتوحات کے وقت مشرف بہ اسلام ہوئے۔

بہر حال اس وقت وہ بولان سے لے کر کچھی، نصیر آباد، جعفر آباد تک اکثریت میں ہیں۔ اس لئے زبان اور ثقافت بھی انہی کی حاوی ہے گو کہ جاٹوں، (جو اب خود کو جاموٹ ہی کہتے ہیں) اور علاقہ کے بلوچ و براہوی رسم و رواج میں ثقافتی سطح پر ایسا کوئی خاص فرق موجود نہیں جس سے تفریق پیدا کی جا سکے کوئی عنصر اگر انہیں ثقافتی سطح پر الگ کرتا ہے تو وہ محض زبان ہے۔

جاموٹ قبائل میں دو زبانیں عمومی طور پر بولی جاتی ہیں۔ سرائیکی اور سندھی۔ خیال یہ ہے کہ جو قبائل سندھ سے ہجرت کر کے آئے وہ اپنے ساتھ سندھی زبان لائے جیسے کہ ابڑو وغیرہ اور وہ آج تک یہی زبان بولتے ہیں۔ اور جو اصلاً پنجاب سے آئے ہیں جیسے کہ اعوان اور رڈ وغیرہ وہ پنجابی اثرات کی حامل سرائیکی بولتے ہیں۔ جاموٹ قبائل کی اکثریت کے باعث ہی دونوں زبانیں عوامی سطح پر رابطے کی زبانیں بھی ہیں حتیٰ کہ علاقے کے اکثر بلوچ و براہوی قبائل گھروں میں بھی یہی دونوں زبانیں بولتے ہیں۔ بولان سے جعفر آباد تک آباد عددی اکثریت کے حامل جاموٹ قبائل درج ذیل ہیں۔

ابڑو، سومرو، ہانبھی، بوہڑ، ڈنڈور، کلہوڑہ، اثاریہ، میہا، ہارہ، دریغ، راہوجہ، پہنور، جکھرا، بھٹی، سیال، کھوکھر، آرائیں، جویار رڈ، گجر، اعوان، کالا، کھرل، رڈھیر، ڈندو، بھنگر، تنیہ، منجھو، پیچوہا، چاچڑ، ایری، ڈیتھا، سیاہ پوست، دھرپال، سپر، بریجا، پلال، جٹانی، ولہ، میمن، من، اوڑان، کوری، لیہی، گگرایا، (جمدار) سیانچ، اوڈھانا، کیہر، بھنڈ، دستی، گولا، میہسر، کیچی۔

ان میں سے بعض قبائل ایسے ہیں کہ جن کا ماخذ بلوچ بتایا جاتا اور وہ خود کو آج بھی فخریہ بلوچ کہتے ہیں لیکن زبانیں وہی بولتے ہیں جو جاموٹ قبائل میں بولی جاتی ہیں بلکہ رسم و رواج بھی جاموٹ قبائل سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ان میں کیسر بھنڈر، دستی، گولا، میہسر، کیچی، مستوئی اور ہڈکری شامل ہیں۔

جاموٹوں کے اکابرین ارباب یا رئیس کہلاتے ہیں یہ خطاب انہیں خان یا زمینداروں نے وقتاً فوقتاً دیئے ہیں تا کہ وہ عمال کو ممیز کر سکیں۔ یہ افراد کو ملتے ہیں اور اکثر موروثی ہوتے ہیں رئیس، کو ایک طرح سے سردار کی ایک قسم کہا جا سکتا ہے۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ سردار قوم میں ہوتا ہے اور رئیس یا ارباب قبیلہ کے لئے۔ باقی تمام اختیارات وہی ہوتے جو ایک سردار کے پاس ہوتے ہیں۔ قبیلے کے تمام سماجی و نجی مسائل اسی کی سرکردگی میں طے ہوتے ہیں۔ قبیلے میں اسے نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

بلوچ قبائل: بولان سے کچھی اور جعفر آباد تک بلوچ قبائل کی بھی ایک کثیر تعداد آباد ہے گو کہ ان کی زبان اور ثقافت پر بھی جاموٹ ثقافت کے اثرات حاوی ہیں اور ان کی بلوچی کا لب و لہجہ مکران کی بلوچی سے یکسر مختلف ہے لیکن آبادی کے اجزائے ترکیبی میں ایک اہم حصے کے طور پر انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ذیل میں اہم بلوچ قبائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بلیدی، چھلگری، مغیری، مگسی، مری، بگٹی، ڈومکی، رند، عمرانی، جمالی، کھوسہ، کہیری، جتوئی، دیناری، لاشاری۔ ان میں سے بعض قبائل کو اب جاموٹ کا حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن اپنے بلوچ ماخذ ہونے کے باعث وہ خود کو جاموٹ سے الگ کرتے ہیں حالانکہ اب ان کی زبان اور ثقافت صدیوں کے سنگم کے باعث جاموٹ قبائل کے ساتھ مدغم ہو چکی ہے۔ ان میں چھلگری، کہیری اور مغیری وغیرہ شامل ہیں۔

دیگر قبائل

شیخ: انہیں بھی جاموٹ ہی سمجھا جاتا ہے ان کے بڑے بڑے طبقوں میں قریشی، انصاری اور تھہیم شامل ہیں۔ یہ عربی النسل ہونے کے دعویدار ہیں۔ بھاگ کے شیخوں سے متعلق البتہ یہ روایت ہے کہ وہ دو ہندوؤں موتی رام اور مینگل داس کی اولاد ہیں۔ جو بھاگ قصبہ کے رہائشی تھے۔ اور تقریباً 200 سال پہلے مسلمان ہوئے۔

کوچک: کوچک کو ویسے رند بلوچوں کو ایک شاخ کہا جاتا ہے۔ مسٹر ایل ایل ڈیمز کے مطابق کوچک چوٹائی سیامپاد اور جلبانی حصوں پر مشتمل ہیں لیکن کیرتر والے نوگروہوں میں منقسم ہیں یعنی بنگلانی، جلبلانی، چوٹی، بولانی، حرانزی، کاٹیار، پگ، شادیزئی اور ماجوئی یا باجوئی ان میں سے تو کب کے ختم ہو چکے ہیں۔ کاٹیار مکسیوں میں ضم

ہوگئے۔ پگ اور شادیزئی کی اکثریت بنگلزئی براہویوں میں مل گئی۔اور باجوئی جھالاوانی براہویوں میں جذب ہوگئے۔بولانی بمعہ سیاہ پاداب جلبلانی کا حصہ ہیں۔

کھیتران: اس قبیلے کا تعلق بارکھان سے ہے لیکن اب ان کا کافی حصہ سبی اور کوہلو کے گرد ونواح میں مستقل سکونت اختیار کر چکا ہے۔ان میں سے بعض حسنی طائفہ کی اکثریت سبی جبکہ اس پان طائفے کے خاندان کوہلو میں آباد ہیں۔وہ زیادہ تر کاشت کار ہیں۔بہت کم تعداد میں کاروبار سے وابستہ ہیں۔یہ لوگ الگ زبان اور ثقافت کے حامل ہیں جسے وہ کھیترانی زبان کہتے ہیں جو بھاگ ناڑی کی سرائیکی سے کسی حد تک ملتی جلتی ہے اور رسم ورواج پر بھی جاموٹ ثقافت کے اثرات کے باوجود ان کی انفرادیت کو واضح طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔

میاں صاحب کا گھرانہ: میاں صاحب کا خاندان کٹ پار میں رہتا ہے جو سبی کی تحصیل لہڑی سے 8 میل جنوب میں ہے یہ چند خاندان ہیں جو کچھی اور سندھ میں بہت محترم سمجھتے جاتے ہیں اور ہر طبقے میں ان کے بہت سے مرید ہیں۔یہ میاں محمد کامل کی اولاد ہیں۔جو کئی پشت پہلے گھوٹکی (سندھ) سے یہاں آئے (اس لئے انہیں گھوٹیا بھی کہا جاتا ہے) خاندان کے سرکردہ معروف ناموں میں مولوی محمد حسین ابن میاں تاج محمد گھوٹیا، میاں محمد پناہ، میاں عزیز اللہ، میاں داد محمد ابن میاں غلام حیدر شامل ہیں۔اب ان میں سے اکثر خاندان شہروں کی طرف مراجعت کر چکے ہیں۔ اکثریت نصیر آباد، کچھی اور سبی میں آباد ہے۔ان کی زبان بھی سندھی ہے۔

تارن: تارن بخارا سے آنے والے سید ہیں۔ابوطاہر کی اولاد ہونے کے مدعی ہیں۔جو خوست میں آباد ہوا لیکن اپنا خاندان چھوڑ کر بخارا واپس چلا گیا۔وہ وہیں فوت ہوا اور اب بھی اس کا مقبرہ وہاں موجود ہے۔ابتداء میں وہ تحصیل شاہرگ کے مغربی اور شمالی حصوں میں رہتے تھے۔اب خاصی وسعت اختیار کر چکے ہیں۔

مودودی چشتی: یہ خواجہ مودود کی اولاد ہیں۔جو چشت (نواح ہرات) میں 1039ء میں پیدا ہوئے اور 1133ء میں وہیں فوت ہوئے۔خواجہ معین الدین (جو بارہویں صدی میں تھے اور جن کا مزار اجمیر میں ہے) چشتی ہے۔شروع میں وہ خیرات وصدقات پر گزارہ کرتے تھے۔بعد میں کچھ نے زمینیں آباد کرلیں اور کچھ نے کاروبار اختیار کرلیا۔

احمدونئی: احمدونئی سادات کا نام سید درجلال بخاری کے ایک وارث سید احمد سے ماخوذ ہے۔سید درجلال دور مغلیہ میں کاکڑ علاقے میں آئے تھے۔انہوں نے وال کی بیٹی سے شادی کی اور گاؤں احمدون بسایا۔جہاں ان کی اولاد اب بھی رہتی ہے۔وہ کاکڑوں سے منسلک ہیں۔انہی سے رشتے ناطے کرتے ہیں اور انہی کے رسم ورواج پر چلتے ہیں۔ان کا کچھ حصہ سبی کے گرد ونواح میں بھی آباد ہے۔

پچی: پچی سادات سید دلیل سے اپنا ماخذ بیان کرتے ہیں۔ان کا صدر مقام تحصیل سنجاوی میں وادی پوٹی رہا ہے۔کچھ حصہ شاہرگ کے مشرقی ومغربی حصوں میں بھی آباد ہے یہ لوگ اپنی زمینیں کاشت کرتے ہیں۔

بخاری: یہ سبی کے علاوہ بھاگ اور نصیر آباد میں آباد ہیں۔انہیں جلالی بھی کہا جاتا ہے۔کیونکہ ان کا موروث سید جلال تھا۔جو چودھویں صدی میں بخارا سے پشین آنے والے چار بھائیوں میں سے ایک تھا۔ان کی بڑی بستی میاں کچ ہے۔جو برے نامی (بریامعنی صحرانشین) نے بسائی جو تقریباً ساڑھے تین سو سال پہلے رچ سے یہاں آیا۔ترین اس کی بے حد عزت کرتے تھے اور اسے میاں صاحب کہہ کر پکارتے تھے اس لئے اس کی رہائش گاہ کو میاں کچ کہتے تھے۔یہ آہستہ آہستہ بلدالایمن بھی بن گیا اور ہمسایہ قبائل اسے جائے پناہ سمجھنے لگے۔ایسی جگہ کی سب کو ضرورت تھی۔

گیلانی سادات کی سبی میں زمینیں ہیں۔اور مرغزانیوں میں ان کے بے حد عقیدت مند پائے جاتے ہیں جو انہیں عشر بھی ادا کرتے ہیں۔غرشین سبی، کڑک، شاہرگ اور ڈرگی میں نہایت قلیل تعداد میں ہیں اور زمینیں کاشت کر کے گزارہ کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ فیض سلطان کا خاندان اوستہ محمد اور اس کے گرد ونواح میں آباد ہے۔ان کا قبیلہ اعوان ہے۔لیکن انہیں سلطان باہو سے فیض پانے کے باعث سادات جیسا ہی احترام دیا جاتا ہے۔اور علاقے میں ان کے ہزاروں عقیدت مند ہیں۔

پہاڑی سلسلے: براہوی ثقافت کے حامل علاقوں کی اکثریت چونکہ پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے اس لئے یہاں مقامات اور خصوصیات بھی پہاڑی پائی جاتی ہیں (ایک روایت کے مطابق بروہی لفظ کا ماخذ برز کوہی ہے جس کے معنی ہیں ''کوہ برز والے'') ذیل میں براہوی ثقافت کے حامل علاقوں (جھالاوان، ساراوان، بولان) کے چند معروف پہاڑی سلسلوں کا مختصر تعارف دیا جارہا ہے۔

☆ ان علاقوں کے پہاڑی سلسلے میں کوہ بروہی سب سے مشہور ہے۔اس کا سلسلہ ساراوان وجھالاوان کی جنوب مشرقی اور مشرقی سمت میں تقریباً شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔280 میل لمبا ہے۔بلوچستان کے معروف درے بولان اور مولا اسی پہاڑی سلسلے

میں واقع ہیں۔ زرغون، خلیفت، زرگٹ اور ماران اس کی بلند ترین چوٹیاں ہیں۔ ان میں سے زرغون سطح سمندر سے گیارہ ہزار سات سو اٹھاسی فٹ، خلفیت گیارہ ہزار چار سو فٹ، زرگٹ گیارہ ہزار دو سو انچاس فٹ، جبکہ ماران دس ہزار سات سو فٹ بلند ہے۔

☆ کیرتھر کا پہاڑی سلسلہ جو کرخ سے جنوب مشرقی سمت تک پھیلا ہوا ہے اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ جھالاوان اور سندھ کے درمیان حد بندی بھی قائم کرتا ہے۔ یہاں سے سائیں ناکھنڈ نامی درے سے دونوں اطراف کے لوگ آتے جاتے ہیں۔ اب اس پہاڑی سلسلے کو کاٹ کر پختہ سڑک بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جس کے بعد خضدار اور سندھ کے شہر شہداد کوٹ کے درمیان فاصلہ چند کلومیٹر تک رہ جائے گا۔ کوہ کیرتھر کی بلند ترین چوٹی زرک سات ہزار تین سو چالیس فٹ اونچی ہے۔

☆ کوہ پب کا 190 میل لمبا پہاڑی سلسلہ خضدار سے منگھو پیر (کراچی) کے قریب ساحل سمندر تک طول رکھتا ہے۔ یہ لمبائی زیرین جھالاوان اور لسبیلہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی سات ہزار سات سو انسٹھ فٹ سب سے اونچی چوٹی کو فراس کہا جاتا ہے۔

☆ راسکوہ یہاں کا معروف پہاڑی سلسلہ ہے۔ پاکستان کی طرف سے یہاں ایٹمی دھماکے کرنے کے بعد اس کا نام بین الاقوامی سطح پر سنا گیا۔ شعراء و ادباء نے اسے استعارے کے طور پر بھی استعمال کیا۔ یہ بلوچستان کے دو اہم اضلاع چاغی اور خاران کے مابین حد بندی کا تعین کرتا ہے۔ اس کی لمبائی 140 میل ہے۔ اس کی بلند ترین چوٹی راس کی اونچائی دس ہزار فٹ ہے۔

درّے

بلوچستان کے دروں کو اپنی مخصوص جغرافیائی اور تاریخی اہمیت کے باعث خاصی شہرت حاصل ہے۔ ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش ہے۔

درّہ مولہ: مولہ اس علاقے کا نام ہے جہاں یہ درہ واقع ہے۔ یہ علاقہ براہوی ثقافت کے حامل ضلع خضدار کا حصہ ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں سے دو راستے بیک وقت گزرتے ہیں جن میں سے ایک زہری اور دوسرا خضدار شہر کی طرف جاتا ہے۔

درّہ بولان: بولان کا درہ کولپور سے ڈھاڈر کے علاقے رندعلی تک 54 میل پھیلا ہوا ہے۔ یہ نہایت قدیمی درہ ہے۔ مقامی روایات کے مطابق اس کا نام ایک مری رہنما بولان کی نسبت سے درہ بولان پڑا۔

دریائی اور نہری سلسلے: بلوچستان کے پہاڑی سلسلوں میں بارش اور برفباری کا پانی چشموں اور ندی نالوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مقامی اصطلاح میں اس طرح کے بڑے نالے کو کور، ڈھور یا جھل کہتے ہیں۔ براہوی علاقوں کے چند معروف نہری سلسلے درج ذیل ہیں۔

☆ جھالاوان کے علاقے جیوا (مشکے) سے نکلنے والی ندی ہنگولی، جسے بلوچستان کی سب سے بڑی اور طویل ترین پہاڑی ندی بھی کہا جاتا ہے۔ ساڑھے تین سو میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی دوسری شاخ نخ براہوی ثقافت کے حامل علاقہ قلات کی جنوب مغربی پہاڑیوں سے ہوتی ہوئی آواران سے نکلنے والی شاخ سے جاملتی ہے اور پھر ماہو سے گزر کر ہنگول کے پہاڑ کے دامن میں بحیرۂ عرب میں جا گرتی ہے۔

☆ ناڑی ندی بڑی معروف ندی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بلوچ، پشتون اور براہوی تینوں قبائلی علاقوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ یہ لورالائی کے شمالی پہاڑوں سے نکل کر پشتون علاقہ سپیرارغہ سے بلوچ علاقہ سبی کے باہر کچ سے ہوتے ہوئے کسی حد تک براہوی ثقافت کے اثرات سے مزین علاقہ کچھی کے وسیع میدانوں کو سیراب کرنے کے بعد کیرتھر بیراج میں جا گرتی ہے۔ اس کا یہ سفر 300 میل پر مشتمل ہے۔

☆ بولان کی ندی کولپور سے شروع ہو کر بی بی نانی کے مقام پر مکمل طور پر عیاں ہو کر دریا کی سی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں سے نکل کر ڈھاڈر کو سرسبز بناتے ہوئے یہ اللہ یار شاہ بند میں جا گرتی ہے جس سے گردونواح کے قصبات مستفید ہوتے ہیں۔ یہاں تک اس کی لمبائی 80 میل بنتی ہے۔

☆ دریائے مولہ زہری، ساسولی اور کرخ کے تمام پہاڑی ندی نالوں سے گزر کر اور درہ مولہ سے ہوتا ہوا ضلع کچھی میں پنجک کے مقام پر پانچ حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور پھر آگے گنداواہ، گاجاں اور جھل مگسی کو سیراب کرتا ہے۔ یوں کل ملا کر اس کی لمبائی لگ بھگ 85 میل ہو جاتی ہے۔

☆ زادہ کے پہاڑی ندی نالے کا پانی جب خضدار اور زیری کے قرب میں یکجا ہوتا ہے تو ایک چھوٹے سے دریا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسے ''گاج کولاچی'' کہا جاتا ہے۔ یہاں سے یہ دریا گردونواح کے دیہات کو سیراب کرتے ہوئے کیرتھر سے گزر کر سندھ کے علاقے دادو کے قریب ایک سو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سندھ کی معروف منچھر جھیل میں جا گرتا ہے۔

☆ کوہ پب سے نکلنے والا دریائے ہب، سندھ اور بلوچستان سرحد کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کیپ منتری کے مقام پر بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔ کسی زمانے میں اس پر ایک بند باندھا گیا جسے بند مراد خان کا نام دیا گیا تھا۔ یہ بند اب موجود نہیں البتہ ہب ڈیم کو اس کی نئی شکل کہا جاتا ہے۔

☆ اسی طرح کا ایک چھوٹا سا دریا، دریائے پورالی کے نام سے پب اور ناچ کے پہاڑی سلسلے سے نکل کر لس بیلہ، بیل پٹ اور سنجری کے علاقے آباد کرتا ہوا ایک سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد درمیانی ہور کے مقام پر سمندر میں جا گرتا ہے۔

☆ دریائے لہڑی، مری بگٹی کے مغربی پہاڑوں سے نکل کر کچھی کے علاقہ لہڑی کو سیراب کرتا ہے۔

☆ دریائے بڈو خاران کے جنوب مشرقی پہاڑوں سے ہوتا ہوا خاران کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے وسیع علاقوں کو آباد کرتا ہے۔

جڑی بوٹیاں

پہاڑوں کو عموماً جڑی بوٹیوں کی پرورش گاہ کہا جاتا ہے اور چونکہ براہوی قبائل کی اکثریت پہاڑی علاقوں سے تعلق رکھتی ہے اور پہاڑوں کے دامن میں سکونت پذیر ہے۔ اس لئے جڑی بوٹیوں سے ان کی شناسائی بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنا ان کا اس سرزمین سے تعلق۔

بالخصوص پہاڑوں کے دامن میں رہائش پذیر قبائل نے اپنی سالہا سال کی محنت سے نہ صرف جڑی بوٹیوں سے معمولی بیماریوں کا فوری علاج ڈھونڈ نکالا بلکہ اپنی زبان میں ان جڑی بوٹیوں کے نام بھی دریافت کر لئے ان میں چند جڑی بوٹیاں یہ ہیں۔

کولمور اور خیسن جھر: ان جڑی بوٹیوں کو بچوں خواہ بڑوں کو قبض بادی اور اس قسم کے دوسرے امراض کی صورت میں کے علاج کے طور پر پانی میں ابال کر پلانا مفید سمجھا جاتا ہے۔

''ماٹھے'' ٹویک: ان جڑی بوٹیوں کو جگر کے امراض میں اکسیر سمجھا جاتا ہے۔

پہیں پھلی اور حسین بھوٹو: یہ پہاڑی پودے ہیں جنہیں ہر قسم کے بخار بالخصوص پرانے بخار کو بھگانے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں براہوی ثقافت جغرافیہ کے حامل علاقے موسم کے حوالے سے بھی انفرادیت رکھتے ہیں۔ اکثر یہاں کے باسیوں کو دو ہی موسم دیکھنا نصیب ہوتے ہیں۔ گرمی اور سردی۔ ان میں سے بھی چھ تا سات ماہ گرمی رہتی ہے۔ جبکہ باقی ماہ میں بھی خزاں اور بہار کا تھوڑا تھوڑا سا عرصہ شامل کر لینے کے بعد سردی بمشکل دو ماہ رہتی ہے۔ البتہ ان علاقوں میں یہ دونوں موسم اپنی بھرپور شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں یعنی سردیوں میں سخت سردی جبکہ گرمیوں میں سخت گرمی پڑتی ہے۔ اس کے باوجود یہ علاقے بلوچستان کی معیشت اور معاشرت میں ہمیشہ سے اہمیت کے حامل رہے ہیں۔

جھالاوان کی دلچسپ مقامی خصوصیات

براہوی ثقافت اور تاریخ کے حوالے سے جھالاوان کو مرکز کی اہمیت حاصل ہے۔ خالص براہوی ثقافت کے اجزاء نہ صرف یہیں پر پروان چڑھے بلکہ آج بھی ان کے اثرات کو یہاں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح خضدار شہر کو جھالاوان کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ جس کی لگ بھگ 99 فیصد آبادی براہوی ہے۔ اس لئے اسے خالص براہوی ثقافت کا علاقہ کہا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں (دسمبر 2006ء) سلطان احمد شاہواڑی نے براہوی زبان میں ''کنا خضدار'' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ جس میں خضدار سمیت جھالاوان کی مقامی تاریخی خصوصیات سے متعلق چند نئے گوشے پیش کئے گئے ہیں۔ ذیل میں اس کتاب سے فوک سے متعلق چند منتخب ابواب کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس سے جھالاوان کی تاریخی وثقافتی اہمیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

تاریخ خضدار کے بارے میں دلچسپ باتیں: خضدار شہر کا آباد ہونا، اس کی سرسبز زمین اور اس میں پیدا ہونے والے میووں کا ذکر تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جن کو سن کے انسان کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ ابوالحسن بن لطیف نے بھی خضدار کا تذکرہ کئی مقامات پر کیا ہے لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جنہیں تاریخ دانوں نے سیر وتفریح کے شوقین لوگوں یا شاعروں کے حوالے سے لکھا ہے۔ جن میں سے کچھ دلچسپ باتیں درج ذیل ہیں۔

خضدار شہر وقلعہ کی منظر کشی: جب عرب اور پرتگیز سیاح خضدار میں سیاحت کی غرض سے آئے تھے۔ انہوں نے خضدار شہر کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا کہ اس شہر کے بیچ میں ایک قلعہ واقع ہے جہاں شہر کا بازار اور کچھ گھر واقع ہیں۔ شہر میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو آبادی بھی موجود ہے۔ جنہیں اپنی عبادت اور عقیدے کی پوری آزادی ہے۔ اس مذہبی آزادی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ شہر کے بیچوں بیچ ایک بڑا مندر ہے۔ جس میں 60 بت ہیں۔ اس مندر میں ایک بڑی گھنٹی ہے۔ شام ہوتے ہی گھنٹی بجتی ہے اور شہر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ تمام دکانیں بند ہو جاتی ہیں اور جنگلی جانوروں کی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔

ان سیاحوں کی باتوں کی صداقت کا ثبوت آج بھی اس شہر سے ملتا ہے ہندو آبادی آج بھی اس شہر میں موجود ہے۔ بازار بھی شہر کے درمیان ہے۔ اسی طرح قلعہ بھی وہیں موجود ہے جہاں ان سیاحوں نے بتایا۔

جنگل بھی موجود ہے۔اور لوگوں کے مطابق وہ ایسا جنگل تھا جہاں صبح کے وقت بھی ڈر محسوس ہوتا۔ یہ جنگل اب تیزی سے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔اس جنگل کو روند کر آبادی کی جا رہی ہے لیکن پھر بھی اس کا بڑا حصہ موجود ہے۔آج سے 10 سال قبل تک یہاں جنگلی جانور موجود تھے۔جن کی آوازرات کو پورے شہر میں گونجتی۔

اس طرح مذہبی آزادی کا ثبوت آج بھی ملتا ہے جو کہ ہندو اور عیسائی آبادی کی شکل میں موجود ہے۔ جو آزادی سے عبادت کرتے ہیں۔تحریک آزادی کے وقت تمام برصغیر میں ہندو مسلم کش فسادات برپا ہوئے۔لیکن خضدار میں آج تک کبھی بھی کسی ہندو یا عیسائی کو بلاوجہ تنگ نہیں کیا گیا۔

خضدار کی سرزمین پر جھیل کی باتیں: تاریخ دانوں نے جہاں خضدار میں شفاف پانی اور چشموں کی بات کی ہے۔وہاں ایک خوبصورت جھیل کی بات بھی کی ہے یہ جھیل شہر سے تقریباً 15 میل دور قطب کے باغ میں ہے۔جسے ''کر'' کہتے ہیں۔یہ ایک لمبا سا میدان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ایک تھالی کی شکل میں بنایا ہے۔جب کبھی بارش ہوتی ہے یہ تھالی پانی سے بھر جاتی ہے اور اس جھیل پر طرح طرح کے پرندے آتے ہیں۔اور شکاری یہاں شکار کی غرض سے آتے ہیں۔ آخری بار جھیل 1995ء میں پانی سے بھر گئی۔اب اس میں ایک بند بھی لگایا گیا ہے۔

خضدار میں پتھر اور پہاڑوں پر کندہ الفاظ: پڑھنے والوں کیلئے یہ عجیب بات ہوگی کہ خضدار کی تاریخ کے بارے میں چٹانوں اور پہاڑوں پر کندہ الفاظ ملتے ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

لونڈو باغبانہ: خضدار شہر سے 20 کلومیٹر دور قطب کے باغ کے پاس ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے اس پہاڑ کے اس طرف کے علاقے کو لونڈو کہتے ہیں۔اس پہاڑ کے ایک چھوٹے سے حصے پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

شب تیرہ راہ دو و من لنگ

و از من تا تو ہزار فرسنگ

لاکھا مولہ کے مقام پر مقبرے پر لکھا ہوا پتھر:

مولہ ایک تاریخی جگہ ہے اور پیر لاکھا میں موجود امیر محمد معصوم کے مقبرے پر کندہ ہے۔جس کے الفاظ یہ ہیں۔

وقفہ و وقت از میان رفت

برخیز کہ کاروان رفت

یہ تحریر اسی ہاتھ کی ہے جس نے پہاڑ پر لکھا ہے۔اصل میں اس قبر میں دفن آدمی کو لاکھا کہتے ہیں۔ان کو ایک پیر کا درجہ حاصل ہے۔یہ مزار قدیم طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ لاکھا کوئی پیر نہیں بلکہ امیر محمد معصوم اور شہنشاہ اکبر کا خاص آدمی تھا لیکن مزار کی تعمیر اور گنبد سے یہ لگتا ہے کہ یہ کسی پیر کی قبر ہے۔1995ء کی بارش سے اس مزار کی چھت گر چکی ہے اور وہ تاریخی گنبد بھی گر گیا ہے جس پر تفصیل درج تھی۔اس قبر اور گنبد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کبھی یہاں آبادی ہوا کرتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیر لاکھا کا یہ پتھر ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن اکثر لوگ اس سے ناواقف ہیں۔

خضدار کے کچھ مصروف مقامات: خضدار شہر جہاں تاریخی اہمیت کا حامل ہے جہاں کے کچھ مقامات درج ذیل ہیں۔

پیر عمر: یہ جگہ خضدار شہر سے 25 کلومیٹر کے فاصلے پر جہاندم کے مقام پر موجود ہے۔اس جگہ کو پیر عمر اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہاں محمد عمر نامی ایک شخص آسودہ خاک ہے۔سڑک کے ساتھ ہی یہ قبر اور گنبد موجود ہے۔یہاں ایک چشمہ بھی بہتا ہوا نظر آتا ہے اور اس چشمہ کے ساتھ ایک شاندار ریسٹ ہاؤس بھی واقع ہے۔ریسٹ ہاؤس کی چار دیواری میں بھی پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے اور بڑے بڑے درخت بھی موجود ہیں۔ان درختوں میں انار کے درخت شامل ہیں۔

یہ جگہ سیاحوں کیلئے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ہر وقت یہاں سیر و تفریح کے شوقین لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔خاص کر چھٹی کے دن یہاں رش دکھائی دیتا ہے۔پیر عمر کے نزدیک چند مکانات بھی نظر آتے ہیں اور آس پاس سرسبز و شاداب باغات ہیں۔سرسبز زمین، بہتا ہوا پانی اور درختوں سے بھرا ہوا ریسٹ ہاؤس۔

سینگھاڑ: سینگھاڑ بھی خضدار شہر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جہاں جانے کیلئے سارونہ کی سڑک کا سہارا لینا پڑتا ہے۔یہاں بارش اور برف باری کثرت سے ہوتی ہے۔یہاں بہت سے درخت اور جڑی بوٹیاں اگی ہوئی ہیں۔مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہاں کے باشندے ان درختوں کو اپنی ضروریات کیلئے تیزی سے کاٹ رہے ہیں جس سے اس کی خوبصورتی میں کمی آئی ہے۔یہاں پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے اور پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیاں قدرت کی رعنائیوں کو عیاں کرتی ہیں۔یہاں شکاریوں کا ہجوم رہتا ہے۔سینگھاڑ کے پاس ایک جگہ ہے جسے انگوری کہتے ہیں۔انگوری سے ایک جھیل نکلتی ہے جو کہ آگے جا کے کولاچی سے مل جاتی ہے۔

کنجر ماڑی: کنجر اور ماڑی دو مختلف مقامات ہیں۔ مگر انتہائی نزدیک ہونے کی وجہ سے لوگ انہیں ایک خیال کرتے ہیں اور ان کا نام بھی اکھٹا لیا جاتا ہے۔ یہ خضدار سے آگے جھالاوان میں موجود ہیں۔ تمام جھالاوان میں صرف اس جگہ جن بھوتوں کی موجودگی کے آثار ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولہ کے علاقے کے بارے میں بھی لوگوں کا یہی خیال ہے۔ البتہ پندرہ بیس سال سے یہاں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا جس سے اس بات میں صداقت نظر آتی ہو۔ کنجر اور ماڑی کا سارا علاقہ تقریباً پہاڑوں اور میدانوں پر مشتمل ہے اور جنگلی جانوروں میں سے کئی کا بسیرا بھی ہے اور جو لوگ یہاں سے شام کے وقت یا رات کو گزرتے ہیں تو جنگلی جانوروں کی آواز سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں لیکن یہ باتیں ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔ یہاں پرانی تہذیبوں کے آثار بھی ملتے ہیں جن کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔

یہاں چند مکانات بھی نظر آتے ہیں لیکن یہ بہت کم تعداد میں ہیں۔ البتہ ایک ریسٹ ہاؤس اور ایک ہوٹل موجود ہے جو کہ سیاحوں کی سہولت کیلئے بنایا گیا ہے۔ خضدار شہر جھالاوان کا دل تصور کیا جاتا ہے اور سیر و تفریح کے شوقین لوگوں کو سیاحت کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہاں کے سرسبز باغات، شفاف جھیلیں، بڑے بڑے جنگلات اور مختلف جڑی بوٹیاں ہیں۔ ان سب کی خوبصورتی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

خضدار شہر کی آب و ہوا اور ماحول: خضدار کی خوبصورتی کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ جب کبھی بھی جھالاوان کے دوسرے علاقوں میں قحط سالی ہوئی ہے تو خضدار شہر نے اپنے ہمسایہ شہروں کی مدد کیلئے خوراک پیدا کی ہے اور اس بات کی سچائی کا ثبوت آج بھی ملتا ہے۔ یہاں بے شمار چشمے ہیں جو کہ پانی کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

خضدار شہر کا سب سے بڑا چشمہ قطب کی طرف سے سنی سے آتا ہے اور محکمہ آب پاشی کے ایک سروے کے مطابق یہاں کی زمین بھی پانی کے ذخیرے سے مالا مال ہے۔ اسی لئے یہاں بے شمار جنگلات اور باغات موجود ہیں۔ سنی کے نزدیک باز گیر کا علاقہ آتا ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا پرانا نام باز دیرتھا۔ جو یہاں موجود بے شمار چشموں کی وجہ سے رکھا گیا تھا۔ باز دیر براہوئی زبان میں زیادہ پانی کو کہا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ایک بڑا جنگل ہوا کرتا تھا جس کا بڑا حصہ آج بھی موجود ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ جنگل اتنا وسیع و عریض تھا کہ اس میں جو بھی جانور یا انسان ایک بار چلا جاتا تو اس کا ڈھونڈنا بہت مشکل ہو جاتا۔ اس جنگل میں طرح طرح کے پرندوں کا بھی بسیرا تھا۔ ان پرندوں میں کبوتر، چکور اور شاہین نمایاں ہیں۔

خضدار شہر کا دوسرا سب سے بڑا چشمہ کوشک کا ہے۔ یہ خضدار سے چند کلومیٹر آگے ہے جو کہ گزرتا ہوا تمام فصلوں کو سیر آب کرتا ہے۔ قحط سالی نے ان چشموں پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ ان کا پانی بہت کم ہو گیا ہے۔ یہاں بھی ایک بہت بڑا جنگل موجود ہے۔

چشموں کے خشک ہونے کی وجہ سے یہاں کے باغات، فصلیں اور جنگلات صرف بارش کے پانی کے مرہون منت رہ گئے ہیں۔

پانی کے خشک ہونے کی وجہ قحط سالی کے ساتھ ساتھ وہ مشینیں بھی ہیں جنہیں لوگ اپنی زمینیں سیر آب کرنے کیلئے لگاتے ہیں جس سے ان خوبصورت چشموں کی خوبصورتی ختم ہوتی جا رہی ہے۔

یہاں بے شمار قسم کے پھول اور پودے بھی پائے جاتے ہیں جن میں ''مکھی'' اور ''سورج مکھی'' نمایاں ہیں۔

جھالاوان کی دھرتی پر عجیب و غریب چیزیں

جھالاوان کی دھرتی پر بعض ایسی عجیب و غریب اشیاء کا وجود ہے جن کے بارے میں سن کر شاید ہی کوئی یقین کرے۔ ان میں سے کچھ چیزیں یہ ہیں۔

پانی کے اندر چمکتا ہوا کیڑا: وڈھ شہر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ''ہر'' کے علاقہ میں اس کیڑے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے عینی شاہدین بتاتے ہیں کہ یہ شفاف پانی کے اندر سبز رنگ کی روشنی کا تاثر دیتا ہے۔ یہ روشنی اندھیرے میں خوب چمکتی ہے لیکن اگر اسے پانی سے باہر نکال دیا جائے تو اس کی روشنی ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ مقامی لوگوں میں آج تک یہ روایت موجود ہے کہ یہ کیڑا انہایت نایاب ہے اور اس کے متعلق مشہور ہے کہ کسی عورت کے ہاں اگر نرینہ اولاد نہ ہوتی ہو اور وہ اس کیڑے کو کھالے تو اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو جاتا ہے۔

کیڑے مکوڑے کھانے والا پودا: ہر کے مقام پر ہی ایک تقریباً چار فٹ لمبا ایک ایسا پودا دیکھا گیا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کیڑے مکوڑے کھاتا ہے۔ اس کے اندر زرد رنگ کا ایک پھول آتا ہے جو کیڑے مکوڑوں اور یہاں آکر بیٹھنے والی مکھیوں کو جکڑ لیتا ہے۔ یہ کیڑے مکوڑے وہیں ختم ہو جاتے ہیں اور آخر میں ان کے جسم کے کچھ حصے وہاں باقی رہ جاتے ہیں۔

کمانڈو مچھلی: جھالاوان میں ایک علاقہ ہے ''بھٹ''۔ جہاں ایک جھیل ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہاں کمانڈو مچھلی پائی جاتی ہے۔ اس کے دانت بہت زہریلے ہوتے ہیں اور یہ مچھلی انسان کو بھی کھا سکتی ہے۔ شاید اسی لئے اسے ''کمانڈو'' کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے نام کی ایک وجہ تسمیہ اس کی رنگت بھی بتائی جاتی ہے۔ جو

ہو بہو فوجی وردی کی رنگت سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے جسم پر خاکی اور سبز رنگ کے بڑے بڑے دھبے ہوتے ہیں۔ اس کا منہ بہت بڑا ہوتا ہے اور اس کے دانت بے شمار ہوتے ہیں۔ اس لئے مچھلی کا شکار کرنے والے بھی اس کے شکار میں بہت احتیاط برتتے ہیں۔ اس کا شکار کرنے والے مقامی لوگوں کے بقول اس مچھلی کی دم کا آخری حصہ بہت موٹا ہوتا ہے اور اسی سے یہ مچھلی آسانی سے شکار ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی دم کو پکڑ لینے کے بعد یہ بھاگ نہیں سکتی اور نہ ہی کاٹ سکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مچھلی کے جسم میں کانٹے نہیں ہوتے بلکہ موٹی ہڈیاں ہوتی ہیں اور اس کا گوشت بہت سخت ہوتا ہے اسی وجہ سے یہ نہایت لذیذ بھی ہوتا ہے۔

جنگل میں سفید ہرن کے آثار: شکار سے دلچسپی رکھنے والے مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ "بھٹ" کے علاقے کے پہاڑ، جنہیں اب کیرتھر کے پہاڑ کہا جاتا ہے، سفید ہرن کے شکار کے لیے مشہور ہیں۔ کیرتھر پہاڑ کو سفید ہرنوں کی آماجگاہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ سفید ہرن کے متعلق عموماً یہ تاثر ہے کہ یہ اکثر ان علاقوں میں پایا جاتا ہے جہاں برف زیادہ پڑتی ہے۔ اس لئے جھالاوان کے گرم پہاڑوں میں اس کی موجودگی یقیناً حیران کن ہے۔ اور یہ چوکڑیاں بھرنے میں اس قدر ماہر ہے کہ ماہر شکاریوں کیلئے بھی اکثر اس کا شکار مشکل ثابت ہوتا ہے۔

براہوی علاقوں کی قدیمی و تاریخی اہمیت

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بلوچستان میں انسانی تہذیب و ثقافت کے جتنے بھی قدیم ترین ماخذات دریافت ہوئے ہیں، ان میں اکثریت براہوی علاقوں کی ہے۔ جن میں ساراوان، جھالاوان اور کچھی کے علاقے شامل ہیں۔ گویا بلوچستان کے براہوی جغرافیہ کو انسانی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان علاقوں میں دریافت ہونے والی چند اہم و قدیم تاریخی بستیوں اور ان میں نظر آنے والی ثقافتی جھلک کے چند پہلو ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

انجیرہ: یہ قدیم بستی اسی نام کی ندی کی دو شاخوں کے درمیان سوراب سے خضدار کی طرف جانے والی سڑک کے عین کنارے سوراب سے تقریباً 16 میل جنوب مشرق کی طرف واقع ہے۔ اسے مختلف شاہراہوں کا سنگم قرار دیا جاتا ہے۔ خضدار، زہری، پنجگور، کوئٹہ اور سندھ سے مختلف راستے یہاں آکر ملتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بستی زمانہ قدیم میں ایک منڈی کی حیثیت رکھتی تھی۔

انجیرہ کی بستی سے سب سے اہم دریافت حجری اوزاروں کی صنعت کے آثار ہیں جو زیادہ تر سوراخ کرنے، تراشنے اور چھیلنے کے اوزاروں پر مشتمل ہیں۔ ان میں چھوٹی قسم کے چاقوؤں، تیروں اور بھالوں کے پھل بھی شامل ہیں اور ہندسی اشکال میں صرف ایک ہلال نما اوزار شامل ہے اس قسم کے ہندسی اشکال کے اوزاروں کی قلت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا استعمال غالباً اس زمانے میں مسترد ہو گیا تھا اور ان کی جگہ تابند اور کانسی کے اوزاروں نے لے لی تھی۔

اس بستی کی بعض تہوں سے ماتا دیوی کی مورتیوں کے علاوہ کوہان والے بیل کے مجسمے بھی دریافت ہوئے ہیں، جن سے اس زمانہ کے لوگوں کے مذہبی معتقدات کی عکاسی ہوتی ہے۔

سیاہ دمب: یہ قدیم بستی سوراب کے گاؤں سے صرف 5 میل کے فاصلے پر واقع ہے جسے سوراب کی قدیم ترین بستی بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک ٹیلہ ہے جو ریج ندی کے کنارے ایک میدانی علاقے میں موجود ہے۔ جہاں زرخیز اراضیات کے وسیع رقبے واقع ہیں، سوراب سے پنجگور جانے والی سڑک اس کے قریب سے گزرتی ہے۔ اس قدیم بستی کو بھی مختلف راستوں کے مقام اتصال پر واقع ہونے کی وجہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انجیرہ کی طرح یہ بستی بھی ایک پہاڑی ٹیلہ کے اوپر بسائی گئی تھی اور اس کا رقبہ تقریباً 16000 مربع فٹ ہے۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس گاؤں کے اردگرد فصیل تعمیر کی گئی تھی جس کے آثار کھدائیوں کے دوران دریافت کئے گئے ہیں۔

یہ بستی اس زمانے میں بسائی گئی تھی جب کہ انجیرہ کے باشندے اپنی تہذیبی ترقی کے تیسرے دور میں داخل ہو گئے تھے۔ اس بستی کے لوگ ابتدائی زمانہ میں زیادہ تر وہ برتن استعمال کرتے تھے جو قصبہ گل محمد کے کلچر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس عہد میں وہ برتن بھی رائج تھے جو طوغو کے ظروف گلی کے نام سے موسوم ہیں۔ علاوہ ازیں برتنوں کا دوسرا نمونہ بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے جو آمری کیچی بیگ کے ظروف گلی کے نام سے موسوم ہے لیکن اس دور کے آخری مرحلے میں ان ظروف گلی کا دستور عمومی طور پر شروع ہوا جو نال کلچر سے متعلق خیال کئے جاتے ہیں۔

نال: یہ قدیم بستی خضدار سے جنوب مغرب کی طرف لگ بھگ تیس میل کے فاصلے پر ایک قدرتی چشمہ کے قریب واقع ہے جو ایک ہلال نما پہاڑی سے نکلتا ہے جس کی وجہ سے اس مقام کا نام نال مشہور ہوا۔ خضدار سے پنجگور جانے والی سڑک اس کے نزدیک سے گزرتی ہے اور یہ بزنجو قبیلے کے سردار کا صدر مقام ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں نال میں چشمے کا پانی بہت زیادہ تھا اور اس سے بڑے پیمانے پر

زراعت وآبپاشی کا کام لیا جاتا تھا۔ یہی مقامی باشندوں کا واحد ذریعہ معاش تھا لیکن بعدازاں چشمہ کا پانی کم ہوجانے کے بعد بستی کی اہمیت بھی کم ہوتی چلی گئی۔

تاریخی دور میں اس بستی کی بڑی اہمیت تھی۔ تاریخ افغانستان کے مولف کہ زاد نے اسے قدیم آریائی سلطنت آریانا کے بلوچی صوبہ کا صدر مقام قرار دیا ہے۔ عربوں کے دور حکومت میں بھی اس بستی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے (عربوں نے) توران، موجودہ جھالاوان میں بھی البیض کے نام سے ایک بستی بسائی تھی۔ بیض کے معنی ہیں روشنی۔ اسی نام کی مناسبت سے یہاں کے باشندے بیزن جو بزنجو کہلائے جو بیضہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ قبیلہ غالباً اس زراعت پیشہ ممتاز قوم سے نسلی تعلق رکھتا ہے۔ جس کو عرب "زط" کہہ کر پکارتے تھے اور اس کا عربی النسل ہونا بھی بعید از قیاس نہیں۔ موجودہ زمانہ میں بیزنجو ایک ممتاز براہوی قبیلہ سمجھا جاتا ہے جس کے سرداروں نے بلوچ براہوی نظام قوم داری کے زمانہ میں ایک اہم سیاسی کردار ادا کیا۔

نال کے قریب ایک قدیم ٹیلہ ہے جو سورومپ کہلاتا ہے جس کے معنی سرخ ٹیلہ ہیں۔ اس ٹیلہ کی کھدائی علم آثار کے ممتاز عالم مسٹر ہارگر نے کی تھی اور اس ٹیلہ کی اہم دریافت اس کا مدفن یا قبرستان ہے جو کھدائیوں کے دوران برآمد ہوا۔ بعض قبروں سے مٹی ہٹانے کے بعد معلوم ہوا کہ اس دور کے لوگ اپنے مردوں کی سالم لاش کو سپرد خاک کرتے تھے۔ ایک قبر میں کئی لاشیں دفن کرنے کا رواج بھی تھا اور کئی قبریں ایسی ملیں جن میں بڑوں کے ساتھ بچوں کی لاشیں بھی دفن کی گئی تھیں۔ گویا ایک خاندان کے لوگ ایک ہی قبر میں دفن کئے جاتے تھے۔ یہ لاشیں عام طور پر پہلو کے بل رکھی جاتی تھیں اور ان کو شرقاً غرباً رکھ کر اس طرح دفن کیا جاتا تھا کہ ان کے سر مشرق کی جانب اور پیر مغرب کی جانب ہوتے اور ان کا رخ بستی کی طرف ہوتا تھا۔ ان قبروں میں اثاثہ قبر کے طور پر مختلف قسم کے برتن بھی مردوں کے سر یا پیروں کے پاس رکھ کر دفن کئے جاتے تھے۔ ان برتنوں میں جن کو غالباً یہ مردے اپنی زندگی میں استعمال کرتے تھے بھیڑ بکریوں کی ہڈیوں زیورات اور منکے وغیرہ بھی ڈالے جاتے تھے۔ ان تمام امور سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس عہد کے لوگ حیات بعد ممات پر یقین رکھتے تھے۔ مدفن کے وقت برتنوں اور بعض دیگر باقیات وآثار وشواہد سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس بستی کے باشندے تہذیبی اعتبار سے بڑے ترقی یافتہ تھے۔ اس تہذیبی ترقی کے آثار اس کلچر کے ان مختلف قسم کے برتنوں کی بناوٹ، ساخت اور اسلوب نقاشی سے عیاں ہیں جن کے نمونے تانبہ اور کانسہ کے عہد کی تقریباً اور بستیوں سے برآمد کئے گئے ہیں اور اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ نال کلچر کا اثر ونفوذ کتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ وادی سندھ میں اس کے نمونے غازی شاہ اور آمری کے ٹیلوں کی ان تہوں سے برآمد کئے گئے ہیں جو ماقبل ہڑپہ کلچر سے تعلق رکھتے ہیں۔

نال کی تہذیب کا تعلق تانبہ اور کانسہ کے عہد سے بتایا جاتا ہے اور اس قسم کے آثار وشواہد دیکھے گئے جن سے اندازہ لگایا گیا کہ اس عہد میں اس بستی کے لوگ اس قسم کے مکانوں میں رہتے تھے۔ جن کی بنیاد میں خوبصورت پتھر استعمال کئے جاتے تھے۔ یہ لوگ زراعت، تجارت اور حیوانات کی پرورش میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس عہد کے لوگ تانبہ اور کانسہ کے برتن اور اسلحہ اوزار بھی استعمال کرتے تھے۔ سورومپ سے تانبہ کی بنی ہوئی تین چپٹی کلہاڑیاں، دو بسولیاں، نیزوں، تیر اور چاقو کے پھل اور مختلف قسم کے زیورات جن میں لاجورد، سنگ سلیماں، عقیق اور سنگ جراحت کے منکے قابل ذکر ہیں، بڑی تعداد میں دریافت ہوئے ہیں۔ یہاں سے سٹائیٹ کی بنی ہوئی منقوش مہریں بھی حاصل کی گئی ہیں

کلی اور میہی: کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں بستیاں علم الآثار کے نقطہ نگاہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ کلی کا ٹیلہ مکران کی تحصیل کولواہ میں ہے اور میہی کا ٹیلہ جھالاوان کے علاقہ مشکے میں واقع ہے۔ یہاں سے ظروف گلی کے جو نمونے اور دوسری باقیات دریافت ہوئی ہیں وہ ایک ہی کلچر کی پیداوار ہیں اور ان کا زمانہ بھی ایک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کے قدیم کلچر کیلئے میہی کلچر کا نام تجویز کیا گیا۔

ان دونوں بستیوں کا تعلق تانبہ اور کانسہ کے زمانے سے ہے۔ جبکہ اس عہد میں بلوچستان کی تہذیب کئی ایک ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد اپنے عروج کے دور میں داخل ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں عام لوگوں کو وہ تمام سہولیات اور آرام و آسائش حاصل تھا جو کہ ایک مہذب اور متمدن آبادی کا لازمہ ہوتا ہے۔

ان ٹیلوں کی ابتدائی تہوں سے اس قسم کے ظروف گلی کے مکمل اور غیر مکمل نمونے دریافت ہوئے ہیں جن کی نقاشی میں نال کلچر کے اسلوب نقاشی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان ابتدائی دور کے برتنوں میں بناوٹ اور نقاشی کی بناء پر کوئٹہ کلچر کے اثرات بھی نمایاں ہیں لیکن مابعد کی تہوں سے ظروف گلی اور برتنوں کے جو نمونے برآمد کئے گئے ہیں وہ کلیتاً کلی میہی کلچر کے پختہ دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

کلی میہی کلچر کے ظروف گلی ہڑپہ کلچر کے ظروف گلی سے مشابہت رکھتے ہیں۔ خصوصاً پیپل کے چوڑے پتوں کی نقاشی ہڑپہ کلچر کے ظروف گلی کو نقاشی کی بناء پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی قسم خالص ہندی اشکال پر مشتمل ہے اور دوسری قسم وہ ہے جس میں نباتاتی وحیوانی اشکال کی تصویر کشی مناظر قدرت کے پس منظر میں کی گئی ہے۔

ان بستیوں سے ماتا دیوی کی مورتیاں، کوہان والے بیلوں کے منقوش مجسمے، سفید پتھر کے چھوٹے چھوٹے برتن، کانسہ کے نہایت خوبصورت گول آئینے، بالوں میں لگانے والے پن، تانبہ کے ہار، تانبہ کا ایک خوبصورت برتن، ہڈیوں کے برتن پتھر کا بنا ہوا مکعب نما باٹ، ہٹی کی بنی ہوئی بچگانہ بیل گاڑیاں سونے کی پتریاں، سنگ جراحت کی خوبصورت پیالیاں، سنگ سلیمان، عقیق، لاجورد کے منکے اور تانبہ کا بھاری اسلحہ و بڑے اوزار بڑی تعداد میں دریافت ہوئے ہیں۔

ہڈت شہر: یہ بستی بیلہ سے تقریباً 9 میل کے فاصلے پر شمال کی طرف ولپٹ کے میدان کے شمال میں پورالی ندی کے دونوں طرف واقع ہے۔ یہ ٹیلہ پتھر کے بنے ہوئے عمارتی آثار کے ایک طویل سلسلہ پر مشتمل ہے۔ جو شمال کی طرف آٹھ میل کے رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض آثار کے اوپر گڑھوں کی موجودگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عمارتیں ایسے من سبی مقاصد کیلئے استعمال کی جاتی تھیں۔ جن میں ایک مخصوص مذہبی رسم ادا کی جاتی تھی۔ اس قسم کے آثار وادی کوئٹہ میں دمب، سادات اور افغانستان میں منڈی گک کے ٹیلہ پر بھی پائے گئے ہیں۔ یہاں بستی کے اس حصہ سے جو آثار دریافت ہوئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصبہ کا یہ حصہ لی کلچر کے لوگوں نے بسایا تھا اور وہی لوگ یہاں بود و باش رکھتے تھے۔

اس بستی کا دوسرا حصہ جو پہلے حصے کے بالکل قریب واقع ہے زیادہ تر پتھروں کے بنے ہوئے دائروں اور مختلف قسم کے طویل صندوق نما مستطیل ڈھانچوں کے آثار پر مشتمل ہے۔ ان آثار کے درمیان سے ظروف گلی کے جو نمونے دریافت ہوئے وہ زیادہ تر موٹے اور بناوٹ کے لحاظ سے بھدے برتنوں پر مشتمل ہیں، جن کے اوپر ایک فیتہ نما پٹی منقش کی گئی ہے۔ اس قسم کے ظروف گلی بلوچستان کے بعض ٹیلوں میں کھدائی کے دوران دریافت ہونے والے اسی قسم کے ظروف گلی کے ساتھ پائے گئے ہیں جن کو ایران کے لوندو کلچر سے متعلق بیان کیا گیا ہے۔

کولی کلچر کے ظروف گلی کا تعلق تانبہ اور کانسہ کے دور سے ہے۔ لیکن لوندو کلچر کے ظروف گلی کا تعلق اس زمانے سے ہے جبکہ لوہا دریافت ہو چکا تھا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ کانسہ اور تانبہ اور لوہے کے زمانہ کی آبادیوں کے اسی قسم کے آثار اور ناچ میں نندو دمب کی بستی میں بھی دریافت ہوئے ہیں جو اسی کولی اور لوندوف کے کلچر سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس بستی کے دونوں حصوں کے قریب آتشزدگی کے آثار بھی پائے گئے ہیں۔ ان آثار کے بل بوتے پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مابعد کی آبادی پر حملہ آور کی حیثیت سے یہاں وارد ہوئی اور انہوں نے اس بستی کے اصل باشندوں کو جو کولی کلچر کے علمبردار تھے یہاں سے نکال باہر کیا اور بستی پر قابض ہو گئے۔

بالاکوٹ: یہ ٹیلہ لسبیلہ میں سوغیانی بندر کے نزدیک حب ندی کے عین کنارے پر واقع ہے اور آثار و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بستی بھی وادی سندھ کے ہڑپہ کلچر کے لوگوں نے بسائی تھی۔ تجارت ہی ان لوگوں کا سب سے بڑا پیشہ تھا۔ لوگ ماہی گیری کے فن میں ماہر تھے۔ وادی سندھ، عراق اور ایران کی بندرگاہوں سے آنے والی مالی بردار کشتیاں یہاں بھی لنگر انداز ہوتی تھیں۔ یہاں سے زیادہ تر خشک مچھلی باہر جاتی تھی اور لوگ ماہی گیری کے علاوہ خشک اور تازہ مچھلی کی تجارت کرتے تھے۔

اس ٹیلہ کی گہری تہوں سے نال کلچر سے متعلق ظروف گلی کے اعلیٰ نمونے دریافت ہوئے ہیں جن کے اوپر ہی پل کے چوڑے پتوں اور مچھلی کے چھلکوں کی نقاشی زیادہ اہم ہے۔ یہاں سے مچھلی کی ہڈیوں کے علاوہ سیپ، گھونگے کے زیورات اور منکے بھی برآمد ہوئے ہیں۔

وسطی تہوں سے کلی کلچر سے متعلق اور سب سے اوپر کی تہوں سے ہڑپہ کلچر کے ظروف گلی اور دوسری باقیات دریافت ہوئی تھیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلی کلچر معدوم ہونے کے بعد ہی ہڑپہ کلچر کے علمبرداروں نے مکران کے ساحلی علاقے میں وارد ہو کر اپنی تہذیبی سرگرمیاں شروع کی تھیں۔

پٹانی دمب: یہ قدیم ٹیلہ گنداواہ کی جدید بستی سے قریباً سات میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے جنوب میں درہ مولہ کا دہانہ ہے اور یہ کئی ایک پہاڑی ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ اس ٹیلہ کے اوپر باقیاتی تفتیش کی گئی ہے جہاں پکی اینٹوں کے علاوہ ظروف گلی کے بہترین نمونے دستیاب ہوئے ہیں جس سے ہڑپہ کلچر کی عکاسی ہوتی ہے خیال ہے کہ زمانہ ماقبل تاریخ میں یہ بستی موہنجوڈرو اور ہڑپہ کی طرح بین الاقوامی حیثیت رکھتی تھی اور یہ وادی سندھ و بلوچستان کے مابین ایک سرحدی بستی ہونے کی وجہ سے تجارت کا ایک اہم مرکز تھی۔ جہاں مختلف سمتوں سے تجارتی کاروان آ کر فروکش ہوتے تھے۔ یہاں کے باشندے کاشت کاری کے علاوہ تجارت کا کاروبار بڑے پیمانے پر کیا کرتے تھے اور غالباً مویشی بھی جن میں زیادہ تر بیل گائے شامل ہیں، پالتے تھے۔ اس بستی کی سطح سے ظروف گلی کے ایسے نمونے بھی دریافت ہوئے جن سے کوئٹہ کلچر کے آخری دور کی عکاسی ہوتی ہے۔ جس کے دوران ایک نئی آبادی شمالی بلوچستان میں وارد ہوئی تھی اور انہوں نے اپنے اثر و نفوذ کا دائرہ کچھی کے سرحدی قصبوں تک پھیلایا تھا۔

مذہبی عمارات: ماہرین آثار قدیمہ نے نندودمب میں جو نندوانی اور مندوانی دمب بھی کہلاتا ہے، دو عظیم مذہبی عمارات کے آثار دریافت کئے ہیں۔ جن سے زمانہ قدیم کے باشندوں کے مذہبی معتقدات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ قدیم ٹیلہ جھالاوان کی اس سرسبز اور شاداب وادی میں واقع ہے جو اور ناچ کے نام سے مشہور چلی آتی ہے۔ یہ ٹیلہ ان قدیم ٹیلوں میں سب سے بڑا ہے جن کی کھدائی ہوئی ہے یا اب تک بلوچستان کے مختلف حصوں میں دریافت ہوئے ہیں۔ اس کی لمبائی ایک ہزار اور بارہ سو فٹ کے درمیان ہے۔ اور چوڑائی اس کی لمبائی کے مقابلہ میں نصف سے کچھ زیادہ ہے۔ اس ٹیلہ کا مرکزی حصہ ایک مستطیل ڈھلوان چبوترے پر مشتمل ہے جس کے اردگرد اہم عمارتی ڈھانچوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ بستی ندی کے کنارے سے شروع ہو کر مرکزی حصہ تک بتدریج بلند ہوتی چلی گئی ہے۔ اس کے اوپر پتھر کا ایک بڑا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔ ان میں کچھ پتھر اس قدر بڑے ہیں کہ ان کی لمبائی پانچ فٹ سے لے کر سات فٹ تک ہے اور وزن ایک ٹن سے بھی زیادہ۔ اس کی چوٹی ڈھلوان چبوترے کے عین وسط میں واقع ہے یہ چبوترہ 25 فٹ اونچا ہے اور سطح زمین سے اس کی اونچائی 75 فٹ کے قریب ہے اس کی سطح کے اوپر پتھر کی بنی ہوئی دیواروں کے آثار دور سے نظر آتے۔

یہ وہ تاریخی عمارات و مقامات ہیں جن کی بناء پر براہوی علاقوں کو قدیم تہذیب و ثقافت کا گہوارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ آثار ایک طرف جہاں یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان علاقوں کے باشندے قدیم ثقافت اور تہذیب و تمدن کے امین ہیں تو دوسری طرف یہ تاریخی تناظر ان کے موجودہ ثقافتی پس منظر کو سمجھنے میں بھی مدد فراہم کرتا ہے۔ براہوی اپنی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے آج بھی نہایت حساس ہیں اور شہری یا نیم شہری سماج کا حصہ بننے کے باوجود انہوں نے اپنی ثقافتی عناصر کو آج بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ ثقافت کی طرف ان کے اسی حساس پن کی وجہ سے صدیوں بعد بھی یہ عناصر زمانے کی دست برد سے محفوظ رہے ہیں اور آج بھی گو کہ قلیل تعداد میں مگر اپنی اصل شکل وصورت کے ساتھ موجود ہیں۔

درحقیقت براہویوں کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عقائد اور ثقافت کے معاملے میں وہ نہایت کٹر واقع ہوئے ہیں۔ کٹر ان معنوں میں کہ وہ ان دونوں معاملات پر سختی سے کاربند ہیں اور ان پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔ مذہبی و ثقافتی سطح پر بلاشبہ ان کی انفرادیت بھی ہے اور خوبی بھی۔

براہوئی علاقوں میں پائے جانے والے پرندے

جنگ ریف: ایک چھوٹا سا پرندہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ پرندہ کبھی انسان تھا۔ جس نے حضرت داؤدؑ کے شکاری کتے سے اس کا راستہ گم کر دیا تھا اور وہ کتا پیاس کی وجہ سے مر گیا تھا۔ اس پر حضرت داؤدؑ نے اس کو بددعا دی اور وہ پرندہ بن گیا۔ اب تک وہ اس کا شکاری کتے کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اس کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔

چکبر: زرد رنگ کا چھوٹا سا پرندہ ہے۔ سڑکوں کے کنارے جڑی بوٹیوں پر بیٹھتا ہے۔ بچے اسے پکڑنے کے لیے دوڑتے ہیں تو یہ اڑ کر کسی دوسری جھاڑی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح بچے میلوں اس کے تعاقب میں جاتے ہیں مگر اسے پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں اس کے پاس بدروحیں ہوتی ہیں۔

ککو: ایک پرندہ ہے جس کا رنگ الو کی طرح اور پنجے انسان کے پاؤں کی طرح ہوتے ہیں۔ آنکھیں گول، چونچ چھوٹی۔ جب آواز لگاتا ہے تو "ککو ککو" کہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ پرندہ بھی ایک انسان تھا جس کے پاس بہت سے مویشی تھے۔ ایک مرتبہ اپنے چرواہے کو اس کا زوبہ (جنس کی صورت میں معاوضہ) نہ دیا تو چرواہے نے بددعا کی اور یہ انسان سے پرندہ بن گیا۔ جب موسم بہار آتا ہے اور یہی وقت چرواہے کو "زوبہ" دینے کا ہوتا ہے تو یہ "ککو متو" کہتا ہے۔ یعنی آؤ میں تمہیں زوبہ دوں گا۔

بچیٹ: وہ جوان مرغی جو انڈا دینے کے قابل ہوا۔ ہل جھالاوان اسے بچاٹ کہتے ہیں۔

چوری: چوری سے مراد ہے پرندہ/مرغی کا بچہ۔

نوکک: اس جوان مرغی کو کہتے ہیں جس نے ابھی تک انڈا نہ دیا ہو۔

چیپل: مرغی کے چوزے کے جب پیدائشی پر گر جائیں اور اصل پر آجائیں تو اس وقت اسے چیپل کہتے ہیں۔

چوکی: کسی بھی قسم کے نوجوان پرندے کو کہتے ہیں۔

چورت: مرغیوں کی ایک بیماری ہے جس سے مرغیاں دست کرنے لگتی ہیں اور چند گھنٹوں میں مر جاتی ہیں۔

سکاوہ: مرغیوں کی ایک بیماری جس سے وہ کھانستی ہیں۔ اس مرض میں ان

کے پانی بہتا رہتا ہے۔

کونڈو: اسی طرح کونڈو مرغیوں کی ایک ایسی بیماری ہے جس کا اثر اس کی ٹانگوں پر ہوتا ہے۔

عورتوں اور مردوں کے نام

براہویوں اور بلوچوں میں عورتوں اور مردوں کے ناموں میں عموماً مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض نام جو اس علاقے کی علاقائی خصوصیت جیسے کہ جڑی بوٹیوں یا مقامات کو ظاہر کرتے ہوں، ان میں تو کچھ انفرادیت پائی جاتی ہے باقی تقریباً ایک جیسے نام ہی پائے جاتے ہیں۔ البتہ نام رکھنے کے معاملے میں چند باتوں کا نہایت خیال کیا جاتا ہے اور یہ بھی کم وبیش سارے بلوچستان میں ایک جیسی ہی ہیں۔ جیسے کہ حتی الوسعیٰ کوشش کی جاتی ہے کہ ایسا نام نہ رکھا جائے جو پہلے سے اڑوس پڑوس یا خاندان میں کسی دور قریب کے رشتے دار کے بچوں کا نام ہو۔ البتہ خاندان میں اگر ماضی قریب میں کسی بزرگ کی وفات ہوئی ہو تو بچے کا نام اس کے نام پر ضرور رکھا جاتا ہے۔ قصبات میں لوگ پیر و مرشد کے نام پر نام رکھنے میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں یا پھر زیادہ تر ایسے نام رکھ جاتے ہیں جن میں اللہ یا محمد کا سابقہ یا لاحقہ استعمال ہوتا ہو۔ بہر کیف براہوی علاقوں میں جن ناموں کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے، ذیل میں ان کا ذکر پیش ہے۔

عورتوں کے نام:

آگے جڑے ہوئے الفاظ والے نام:

گل: گل بانو، گل بانگ، گل خاتون، گل ملک

لال: لال بخت، لال نمر، لال زادی، لال بانک، لال خاتون، لال بی بی، لال پری، لال جاد، لال ملک

شاہ: شاہ زادی، شاہ بی بی، شاہ ناز، شاہ خاتون، شاہ پری، شاہ بانو، شاہ تاج

ماہ: ماہ ناز، ماہ بی بی، ماہ گل، ماہ پری، ماہ گنج، ماہ فری، ماہ دیم، ماہ نور، ماہ پل، ماہ جان، ماہتاب، ماہتا ملک، ماہی ملک، ماہان، ماھل، ماھین، ماہ بانو، ماھکان

بخت: بخت بی بی، بخت ناز، بخ (بخت) زادی، بخت آور

گراں: گراں ناز، گراں بخت

مہر: مہر زادی، مہر بی بی

مھر: مھر زادی، مہر بی بی

زر: زر بی بی، زر بخت، زر گل، زر ناز، زر خاتون،

دُر: در بی بی، در بخت، در خاتو، در ناز، در جان، در گوش، در گل، در جاد

گنج: گنج بی بی، گنج بخت، گنجا خاتون، گنج ملک

پری: پری ناز، پری خاتو، پری خاتون، پری

خان: خان بی بی، خان زادی، خان بو

زور: روز خاتون، روز بی بی

شر: شر خاتو، شر بی بی، شر بخت، شر ناز

صاحب: صاحب خاتو، صاحب بی بی، صاحب زادی

مراد: مراد بی بی، مراد جان، مراد خاتو، مراد بانک، مراد بخت

بی: بی بائی، بی گل، بی بو، بیو ناز

بی بی: بی بی ناز، بی بی گل، بی بی ہور، بی بی جان، بی بی

تاج: تاج خاتون، تاج بی بی، تاج ملک

جان: جان بی بی، جان بخت

نور: نور ملک، نور جان، نور جہان

بیگ: بیگ جان

پیچھے جڑے ہوئے الفاظ والے نام

زادی: جام زادی، نمر زادی، امان زادی، سیر زادی، نور زادی، صاحب زادی، ہیر زادی، پری زادی، خیر زادی، عالم زادی، خیال زادی، شاہ زادی، پیر زادی، میر زادی، لال زادی، انار زادی، میم زادی، حاکم زادی، گل زادی، نواب زادی، نظیر

زادی، غلام زادی، شریف زادی، سفر زادی۔

گل: بی گل، ہیڑت گل، درگل، زرگل، شاہ گل، باز گل۔

خاتو: قائم خاتو، گہنور خاتو، جہنور خاتو، نور خاتو، عزت خاتو، سنت خاتو، دولت خاتو، جنت خاتو، در خاتو، ولایت خاتو، حسن خاتو، صلے خاتو، آل خاتو، پری خاتو، خیر خاتو، روز خاتو، رحمت خاتو۔

ناز: ماہ ناز، گل ناز، شہناز، بس ناز، گم ناز، ملک ناز، سن ناز، بیوناز، نریاناز، شرناز، ہل ناز، خیرناز، بخت ناز، باں ناز، پری ناز، شرم ناز۔

بخت: گل بخت، در بخت، لال بخت، گراں بخت، تاج بخت، جاں بخت۔

بی بی: شاہ بی بی، مہر بی بی، ہزار بی بی، امیر بی بی، مختار بی بی، نور بی بی، شر بی بی، ہور بی بی، مراد بی بی، سردار بی بی، فیض بی بی، ہیر بی بی، جنت بی بی، رق بی بی، جاں بی بی، در بی بی، ناز بی بی، ماہ بی بی، خان بی بی، حیات بی بی، راج بی بی، بخت بی بی، بس بی بی، تاج بی بی، قدر بی بی، مور بی بی، آزاد بی بی، حیات بی بی، راج بی بی، رحم بی بی۔

پری: ماہ پری، گل پری، ہیراں پری

بائی: بی بائی، ست بائی، لال بائی

زادی: شاہ زادی، نور زادی، میر زادی، گل زادی، خان زادی، لال زادی

سابقہ یا لاحقہ کے بغیر نام: یہ ایسے نام ہیں جن کے ساتھ کچھ نہ ملایئے تب بھی وہ مکمل نام ہوتے ہیں ان کی تقسیم کچھ یوں ہے:

اصل نام: یہ بہت ہی مختصر اور ایک لفظ پر مشتمل نام ہوتے ہیں کچھ ناموں کے مطلب بھی کسی کو نہیں آتے نہ ہی ان کا منبع معلوم ہے۔ کچھ نام ایسے ہیں کہ ان کے معانی یا منابع تک پہنچا جا سکتا ہے۔

یہ نام درج ذیل ہیں:

شترک، زلیا، انک، پلان، تاجی، تلہیاتون، بامی، بانل، درین، زعفران، جانو، ساٹی، زرنی، بائی، گلک، بیوی (بی بی) پرک، چیغو، خیری، ہوری، گوھر، مرگی، ہیڑتو، راجی۔، زرین، زرگ، سازیں، نازو، تمئی، جتو، جتی، مراذو، یخو، آتلی، نازاں، وشی، لالی، سھیلو، بختی، لالین، نیامتی، گلی، لاڑکی، لالڑی، سہتی، گنجی، دھملو، بانڑی، بیزو، پاپی، گوری، ہمگی، حانی، محڑی، شلی، مباری، ہانو، حزنی، حالی، بسو، مڈی، ہجک، سیمک، رزو، اومیلی، تگی، بسی، شاری، جابی، ہزلو، مارہ، کاکو، مخو، چتی، خاتو، سبک، بھمبو، سنگو، موری، زیندو، جاوو، سمی، تالو، شلی، بانلی، شلو، ملی، مہین، مروارد، مولد، مرجان، مہیم، مہران، نازی، نازل، نازک، نازبو، نمرنوری، ہوری، ھانی، گلی، کالو، گہنوری، ماھین، مائخان، مہرک، بھمبی، شیرین، گوھر، ماہل، سنگین، بانکو، گنجل، سازنگ، نازین، پھلین، کتور، بانکی، جوانیں، گلیں، شرین، شاخل، ماہ رنگ، مسوری، سمو، شاتور، زیبل، بوبل، زباد، مسک، مہ لب، بسو، ملوک، مل نخل، شارو، زری، مہرین، جوری، گواڑخ، شدری، گنجک۔

اسلامی اور غیر ملکی نام

ایسے ناموں کا کچھ حصہ اسلامی یا عربی فارسی، ناموں کی صورت میں موجود ہے۔ انہیں ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

قدیم وقتوں سے مروج اسلامی نام: یہ نام کلچر میں اس قدر جذب ہیں کہ ان کو جدا کرنا بہت مشکل ہے یہ نام نیچرل انداز میں جاگزیں ہو گئے ہیں اور کسی صورت میں غیر ملکی نہیں لگتے مثلاً آشہ یا آشی (عائشہ)، پاتمہ یا پاتی (فاطمہ) حلیمہ، مکہ، ہوا، مرم، (مریم) خنجہ (خدیجہ) سلمہ، نور جان، حوری، لیلا، سارہ، ہاجرہ وغیرہ وغیرہ۔

حالیہ وقتوں میں رکھے گئے اسلامی نام: یہ وہ نام ہیں جو ابھی حال میں رواج پا گئے ہیں۔ یہ صرف اس لیے اسلامی نہیں ہیں کہ یہ اسلام بی بی یا اسلام خاتون ہیں بلکہ یہ پڑوس میں واقع تہذیب کی طرف آنے جانے سے ان کے ہاں آ گئے ہیں۔ یہ نام ان مرد حضرات نے شروع کیے ہیں جو کہ یا تو حج کی زیارت کر کے آئے ہیں۔ یہ لوگ اخباروں سے، ریڈیو، ٹی وی سے یا شہروں میں بنائے گئے نئے دوستوں سے بچیوں کے نئے نئے نام سیکھ لیتے ہیں اور واپس آ کر اپنے علاقوں میں اپنی بچیوں پر رکھوا لیتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ بے نظیر جیسی مشہور عورت کا نام اٹھا کر ایک بچی پر رکھ دیا۔ بہت بڑی تعداد محنت مزدوری کرنے سے دوسرے ممالک اور علاقوں کی طرف جاتی ہے اور وہاں سے اچھا لگنے والے نام ساتھ لاتی ہے۔ یہ نام مصنوعی بھی لگتے ہیں۔ اور ادائیگی میں مشکل بھی۔ گھرانے کے بوڑھے بوڑھیاں اس نام کے تلفظ بھی اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے اور دو تین دن کے اندر اندر اس نام کا حلیہ اچھی طرح بگاڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ لیکن پھر بھی روز بروز زیادہ سے زیادہ لوگ بچیوں کے ایسے نام رکھتے جا رہے ہیں۔

رخشندہ، سعیدہ، فہمیدہ، مہوش وغیرہ۔

پنجابی اور سرائیکی کے جو نام یہاں آ گئے ہیں اور وہ اس طرح ہیں:
سیانڑیں، بھاگ بھری، اچھی، نمو، جیونڑیں، بخت بھری، سکھی، جیونی، رانی وغیرہ۔
سندھی کے بہت سے نام ان علاقوں میں در آمد ہو چکے ہیں مثلاً گوری، ہاجراں، جانھو، سیانڑیں، نازل، زہراں، پٹھانڑیں، ماروی، زخیراں، دھانڑو، جیجل، مومل۔

جگہوں اور علاقوں کے نام

بہت سارے علاقوں اور جگہوں کی نسبت بھی رکھتے ہیں وہ علاقے بلاشبہ یا خوبصورت اور سرسبز ہوتے ہیں یا پھر امیر اور بیش بہا، مثلاً مہیری، پیرس خاتو، کشمیر خاتو، ولایت خاتو، لہڑی، کشمیر بی بی۔

اختیار، حکم: اختیار بی بی، مختیار بی بی، قدر بی بی، راج بی بی اختیاری، عزت خاتو، صاحوی رانڑیں۔

محبت: مہر خاتو، مہر بی بی، محبت خاتو، مہربانک، مہرزادی۔

خوبصورتی: لالو موتی دراصل دولت سے زیادہ حسن کی علامت ہے، خوبصورتی اور یکتائی کا نشاں ہے اور یہ نام بہت عام ہیں۔ مثلاً: دریں، گوہر، لالی، دردانہ، لالین، در خاتو، لال بخت، در بی بی، لال بی بی، لال پری، لال خاتو، ساٹی، لال زادی، لال نمر، لالڑی، درگل، در بخت، لالو، لال ناز، لال جاد، درجان۔

ماہ بھی خوبصورتی اور زیبائی کی علامت ہے۔ ماہیں، ماھل، ماہ ناز، ماہ بی بی، ماہ گل، ماہ پری، ماہ گنج، ماہ رنگ۔

اسی طرح پھول صرف حسن کا ہی سمبل نہیں بلکہ نرمی و نازکی کی صفت بھی ہے اور گل یہاں کے ناموں کے اندر بہت زیادہ شامل ہوتا ہے۔ بی گل، گل بی بی، ھیڑگل، ماہ گل، زرگل، درگل، گلی، گل پری، گل زادی، اور گل ناز اس کی چند امثالیں ہیں۔

شجر اور میوہ: سایہ دار درخت، خوشبودار پودے اور بیش بہا میوے ان ناموں کے اندر بہت خوب شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً نذغو، میوری، اناری، انارزادی، کٹاری۔

پرندے: کفوت، مرگی، مرگو، کہنی، مرگان اور اسطرح کے دیگر کئی نام حسن، چال اور نزاکت کی علامتیں ہیں۔

بخت و مراد: بختاور، سنت خاتو، بخت بی بی، بھاگ بھری، مراذ بانک، بختو، بختی، مراذو، گراں بخت، گل بخت، در بخت، زر بخت، لال بخت، ناز بخت، جاں بخت، تاج بخت، بخت خاتو، بخ ناز، (بخت ناز)۔

بہشت: بہشتی، جنت، جنت خاتو، جنت بی بی، جنتی، جنتو۔

نور: نورزادی، نوری، شمس خاتون، روژنا، نور جہاں، نور بانک، نور ناز، نور خاتو۔

مالکن: میم زادی، خان زادی، جام زادی، سید بی بی، تاج بخت، صاحبو، صاحب زادی، میرزادی، پیرزادی، تاج خاتو، میر بی بی، شاہ بی بی، تاج بی بی، شاہ پری، شاہ بانو۔

عصمت و عزت: حرمت خاتو، حجاب خاتو، عزت خاتو، ہتر بی بی۔

بارش: کچھ نام ایسے بھی ہیں جو علاقائی ضرورت کے ترجمان ہیں۔ اجتماعی زندگی کی آرزوؤں کا پرتو ہیں۔ بارش ان میں سے اہم ترین عنصر ہے۔ لہذا ہوری، ہوراں بی بی جیسے نام مقدس اور محبوب نام سمجھے جاتے ہیں۔

زر، سرمایہ، دولت: امیر بخت، امیر بی بی، زرگل، زرو، گنج بی بی، ذخیرہ، ساٹی، زرھاتو، زر بی بی، زری، زریں، صدی، صدو، دولت بی بی۔

نام کا نیم نام بنانا تو نفرت کی علامت ہوتی ہے یا پھر مہر اور دوستی کا نتیجہ۔ نام بگاڑ دیا جاتا ہے۔ اسے یا تو مختصر بنا دیا جاتا ہے یا پھر اسی نام جیسا دوسرا چھوٹا سا نام رکھ دیا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچی کا نام کچھ ہو مگر دوستی یا نفرت والا اس کا نام بالکل دوسرا ہو۔ یہ نام اس کی عادتوں کی بناء پر اس پہ پڑ جاتا ہے۔ یا اس کی توتلی باتوں کی وجہ سے۔ کبھی کبھی یہ نیم نام چلتے چلاتے اصل نام کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور شادی تک چلتا ہے۔ شادی کے بعد اصلی نام چلتا ہے۔ اگر ساس، سسر یا دیوروں نے اس کے اندر کوئی عیب یا بہت خوبی نہیں دیکھی تو وہ اس کے نام کو تبدیل نہیں کرتے وگرنہ وہ لوگ اس پہ یا تو اپنا گھڑا ہوا کوئی نام رکھ دیں گے یا پھر ماں باپ کے عطا کردہ نام کو دوبارہ زندہ کر دیں گے۔ نفرت والے نام بہت ہوتے ہیں۔ شپکا، سغو، کیتھی، ھگی، گرد، گھنی، گھارو وغیرہ مگر مہر، محبت اور دوستی کے نیم نام بہت میٹھے ہوتے ہیں اس نام سے وابستہ جذباتی بندھن بہت گہرے ہوتے ہیں۔

ناموں سے بنائے گئے نک نیم نام یہ ہیں: نمو (نمرزادی سے) ھاتو (حیات بی بی)، لابو (لال بی بی)، نازو (ناز بی بی) یا ناز بخت۔ پیرو (فیروز خاتو)، لالو (لال بی بی)، بیگو (بیگم سے)، لاخو (لال خاتو سے)، پاتو (فاطمہ)، تاجو (تاج بی بی)، زادو (زادی سے) مافیری (ماہ پری)، گنجو، مہراں، کہنی، بیغم، (بیگم سے)، عزو (عزت خاتو سے)، جنو

(جنت خاتو سے)، نہالو (نہال خاتو سے)، جانو (جان بخت یا جان بی بی) بختو (بخت بی بی) مراذو (مراد بی بی)، درخو (درخاتو) ہیراتو، بختاتی، نخو، (نیک بی بی) وغیرہ۔

مردوں کے نام: مردوں کے نام عموماً ایسے رکھے جاتے ہیں جن سے بہادری اور غیرت کا اظہار ہوتا ہو۔ آباؤاجداد کے نام رکھنے پہ بھی زور دیا جاتا ہے۔ براہویوں میں نام کے ساتھ قبیلے کے نام کا اضافہ لازمی ہوتا ہے گویا اس کے بغیر نام مکمل ہی نہیں ہوتا۔

بنیادی طور پر ان ناموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جن میں سابقے کا استعمال ہوتا ہے اور دوسرے وہ جن میں لاحقہ استعمال ہوتا ہے۔

اللہ: اللہ بخش، اللہ داد، اللہ ڈنہ، اللہ ورایہ، اللہ دتہ

محمد: محمد بخش، محمد خان، محمد علی، محمد حسن، محمد مراد، محمد حسین

علی: علی بخش، علی داد، علی جان، علی محمد، علی جان

گل: گل خان، گل محمد، گل ریز، گل بخت، گل جان

نور: نوراللہ، نور محمد، نور خان، نور جان، نور بخت، نور حسن

میر: میر جان، میر محمد، میر حسن، میر خان، (میر وخان) میر بخت

مہر: مہراللہ، مہر جان، مہر دین

شاہ: شاہزادہ، شاہ جہاں، شاہ محمد

پیر: پیر جان، پیر بخش، پیر محمد

غلام: غلام علی، غلام محمد، غلام دین، غلام جان

یہ وہ نام ہے جن کے سابقوں اور لاحقوں کو آگے پیچھے کر کے رکھا جاتا ہے۔ یہ بلوچ، جاموٹ اور براہوی علاقوں میں یکساں ہیں۔ بالخصوص ڈنہ، ڈتہ اور بخش کے سابقے اور لاحقے والے نام سندھی علاقوں سے متاثرہ ہیں سرائیکی اور سندھی میں اس کے معنی ہیں۔ "دینا" جیسے اللہ ڈنہ، اور اللہ ڈتہ کا مطلب ہے اللہ کا دیا ہوا۔ قلندر بخش یعنی جو قلندر نے بخشا ہو۔ خالص براہوی علاقوں میں ایسے ناموں کا رواج کم ہی پایا جاتا ہے۔ البتہ براہویوں میں ناموں کی جو خاصیت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے "جان" کے سابقے کا استعمال۔ عورت کا نام ہو یا مرد کا، کم و بیش ہر نام کے ساتھ جان کا سابقہ ضرور استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اکثر یہ نام کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔

علاوہ ازیں بہادری اور شجاعت کے اظہار کے طور پر کچھ نام رکھے جاتے ہیں جیسے کہ ہیبت خان، بہادر علی، دلیر خان، شیر خان وغیرہ۔

دیگر اسلامی نام جیسے کہ رازق، رزاق، رحیم، کریم، جبار، ستار وغیرہ عمومی نام ہیں جو اس سارے علاقے میں بلا تخصیص کثرت سے رکھے جاتے ہیں۔

نامور علمی و ثقافتی شخصیات

براہوی ایک مردم خیز قوم ہے اور براہوی ثقافت کے زیر اثر علاقہ جھالاوان و ساراوان ایک مردم خیز خطہ، جہاں براہوی قبائل کی ایسی شخصیات نے جنم لیا، جنہوں نے علمی، ادبی، سیاسی و ثقافتی سطح پر نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی پیمانے پر شہرت حاصل کی اور براہوی علم و ثقافت کے فروغ کا ذریعہ بنے۔

ملا محمد حسن براہوی: ملا محمد حسن براہوی نے ایک ایسے موقع پر جنم لیا جب برصغیر میں مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو رہی تھی۔ ملا محمد حسن براہوی بلوچستان میں ایرانی و افغانی تہذیب کے ساتھ برصغیر کے مرکزی فکری دائرے سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذہنی و جذباتی فکری و تہذیبی اظہار کے لیے صرف ایک زبان پر انحصار نہیں کیا۔ وہ بلوچی، فارسی، اردو اور براہوی میں یکساں قدرت کے ساتھ فکر کی ترسیل کرتے رہے۔ قلات و خضداریوں بھی وسطی ایشیا اور برصغیر کی تہذیبوں کا نقطہ اتصال رہا ہے۔ چنانچہ محمد حسن براہوی کی شاعری میں ہمیں فارسی، بلوچی اور براہوی ندرت فکر اور تہذیبی روایتوں کے ساتھ، ساتھ برصغیر کی متانت اور رنگینی جابجا ملتی ہے۔ کلیات محمد حسن براہوی، اردو کے کلاسیکی ادب میں 1837ء میں شامل ہوئی اگرچہ اس کی کتابی شکل بعد میں سامنے آئی لیکن یہ شاعری 1837ء میں مکمل ہو چکی تھی۔

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں تیرے نین، غزالاں سوں کہوں گا
تیرے لب پر جس نے لب رکھا، کہنے لگا
شہد ہے، شکر ہے، شیریں ہے شکر گفتار ہے

حاجی نبو جان: آپ نے نہ صرف ملک داد محمد کی کتاب "تحفۃ العجائب" کی ترتیب و تدوین فرمائی بلکہ اسی انداز کی دو کتابیں بنام "ناصح البلوچ" اور "تحفۃ الغرائب" منظوم کیں۔ براہوی زبان کی نشو و نما ارتقاء اور اس کی قدرتی صلاحیت کے اندازے کے لیے آپ کی کتاب سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ موضوع و مقاصد

کے اعتبار سے یہ دونوں کتابیں مذہبی تعلیمات کی تفہیم واشاعت پر مشتمل ہیں۔

سردار غوث بخش رئیسانی لکھتے ہیں۔

"مولانا فاضل محمد کے ہم عصروں میں نبو جان (متوفی 1325ء) بلند پایہ انشاء پرداز اور شاعر تھے۔ آپ نے اپنی تصنیفات کے ذریعے معاشرتی اصلاح میں اہم حصہ لیا"۔

براہوئی کلام: یارب رحیم ورحمان ترجمہ: اے رب تو رحیم ورحمان ہے

شیطان ناکرداکان	مجھے شیطان کے مکر سے امان دے
آسمان زمین نانا کان	آسمان اور زمین کے درمیان
بخش نن خدایا	اے خدا مجھے بخش دے

مولانا محمد عمر دین پوری: مولانا محمد دین پوری (متوفی 1365ء) کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن پاک کا براہوی میں ترجمہ ہے۔ آپ نے صاف وشستہ کلام پاک کا ترجمہ براہوی زبان میں کیا ہے جس نے ثابت کر دیا کہ براہوی زبان کی صلاحیت نمو عربی کے ہم پلہ ہے اور عہد حاضر کے تمام تقاضوں کو یہ زبان پورا کر سکتی ہے۔

مولانا دین پوری کے پیش نظر براہوی زبان کے دامن ندا کو طرح، طرح کے پھولوں سے بھرنا تھا۔ لہٰذا نہ صرف انہوں نے براہوی زبان میں اپنی قدرتی صلاحیتوں سے اضافہ کیا بلکہ فارسی اور عربی کے ذخیرہ الفاظ، تشبیہ واستعارات اور انداز بیان سے بھی براہوی زبان کے سرمایہ کو بڑھایا۔ مولانا دین پوری نے خالص براہوی زبان کے مزاج کی غزلیں بھی کہی ہیں۔

اے دوست کینا کرپاش نازک بدنی
اے نازک بدن دوست، میری طرف آجا
چاراہش کنا ویران اے آہو خنی
اے آہو چشم، تری وجہ سے میرے ہوش وحواس کھو گئے ہیں
زیب صورتناء حیران کہہ ہرنی صنم
اے صنم زیبائش وصورت نے مجھے حیران کر دیا ہے
چا و ھل ہیتیاں کربلبل شیرینی سخنی
میں جانتا ہوں کہ بلبل نے تجھ ہی سے شیرین بیانی سیکھی ہے

مائی تاج بانو: پہلی براہوی شاعرہ اور نثر نگار ہیں۔ جو اپنے جذبۂ خدمت کے پیش نظر اپنے والد بزرگوار مولانا محمد عمر دین کے نقش قدم چلتے ہوئے براہوی خواتین کے اصلاح احوال کے لیے عملاً کوشاں ہوئیں۔ آپ نے معاشرتی ومذہبی اصلاح کے لیے ایک کتاب "توبیخ النسوان" دو جلدوں میں تحریر فرمائی نیز قومی نظمیں، نعت سرائی اور طرہ تحریر فرمائیں۔

انہوں نے براہوی میں تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا اور براہوی خواتین میں اشاعت اسلام کے ساتھ اشاعت تعلیم کی بھی موجب ہوئیں عورتوں میں علمی وادبی ذوق پیدا کرنے باضابطہ درس وتدریس شروع کر دی۔ ان کی تصنیفات میں "توبیخ النساء" بہت مشہور ہے۔ یہ کتاب 1353ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔

ان کی معروف لوری کے بول یوں ہیں:

براہوئی: قربان مریوخن تانا ترجمہ:- میں تیری آنکھوں کے صدقے
نوراس خنتاک دردانا اے دردانہ تو میری آنکھوں کا نور ہے
رحمت نی بس اللہ نا خدا کے فضل سے تو یہاں آئی ہے
زیبل رب نے دراجنگا عمرے تے زیبل تجھے خدا عمر دراز عطا کرے

ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی، عبدالرحمان کرد، نور محمد پروانہ، گل خان نصیر، پروفیسر نادر قمبرانی ودیگر جدید عہد کی نمایاں شخصیات ہیں جنہوں نے براہوی زبان وادب کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

جبکہ اختر چنال، مراد پارکوئی اور عظیم جان نے موسیقی کے ذریعے براہوی ثقافت کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اپنے فن کے ذریعے براہوی ثقافت کو ملکی وبین الاقوامی سطح پر متعارف کروایا۔

ان کے علاوہ معروف سیاسی شخصیات میں میر احمد یار خان، میر غوث بخش، بزنجو، سردار دودا خان زرکزئی، سردار غوث بخش رئیسانی، سردار عطاء اللہ مینگل شامل ہیں۔

رسم ورواج

گو کہ صدیوں کے باہمی روابط اور مشترکہ رشتے داریوں کے باعث اب براہوی اور بلوچ رسم ورواج بڑی حد تک مشترکہ ہی ہو چکے ہیں۔ جو بنیادی فرق موجود ہے وہ ہے لسانی فرق۔ پیدائش سے موت تک کے رسم ورواج میں ہر رسم کے لئے براہوی میں الگ نام موجود ہے اور اب تک چند ایک رسمیں ایسی ہیں جن کے ناموں کے دراوڑی ماخذ سے ان کی قدامت وانفرادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ براہوی قبائل وعلاقوں میں موجود پیدائش سے موت تک کے ثقافتی رسم ورواج کا ذکر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

پیدائش (دروہڑ): عورت کے حمل ٹھہر جانے کے ابتدائی ایام کو دروہڑ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ ایام ہوتے ہیں جب عورت کھٹی چیزیں وافر مقدار میں استعمال کرنے لگتی ہے۔ ان ایام

میں براہویوں میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ گھر میں ایسی کوئی چیز نہ لائی جائے جو حاملہ عورت کے لئے مناسب نہ ہو یا جس سے نقص حمل کا احتمال ہو مثلاً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان ایام میں حمل والی عورت کی مشکیزہ یا رنگے ہوئے کپڑوں پر نظر نہ پڑے۔ براہوی سمجھتے ہیں کہ ان رنگوں پر توجہ مرکوز ہونے سے بچے کی جلد پر اس کا برا اثر پڑ سکتا ہے۔ درد ہڑ کے ایام عورت کے حمل ٹھہر جانے کے بعد انتہائی اہم تصور کئے جاتے ہیں۔

لڑکا یا لڑکی: حمل والی عورت کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی اور اب اس سلسلے کے قدیم طریقہ کار تقریباً متروک ہو چکے ہیں لیکن جدید سہولیات سے نابلد دیہات میں آج بھی ان طریقوں کو کارگر سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک معروف طریقہ یہ ہے کہ حاملہ عورت کے پستانوں میں جب دودھ اترنے لگے تو یہ تجربہ کیا جاتا ہے کہ دودھ پتلا ہے یا گاڑھا۔ اگر گاڑھا ہے تو لڑکی اور پتلا ہے تو لڑکا ہوگا۔ ڈینس برے نے ''براہوی رسم و رواج'' میں ایک دلچسپ طریقہ لکھا ہے جسے کامل القادری نے "مذاق" قرار دیا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ حاملہ عورت کا دودھ اُبال کر اس میں جوں چھوڑ دی جاتی ہے اگر جوں دودھ میں لت پت ہو کر رہ گئی تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ لڑکا ہونے والا ہے اور اگر کہیں جوں ہاتھ پاؤں مار کر باہر نکل آئی تو سمجھا جاتا ہے کہ لڑکی ہونے والی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر تین ماہ کی حاملہ عورت کا جسم بھرا مضبوط اور بھیٹنی (سرپستان) سرخ نظر آئے تو عورتیں اندازہ لگا لیتی ہیں کہ لڑکی ہونے والی ہے۔ لیکن اگر وہ کمزور اور دبلی پتلی نظر آنے لگی اور بھیٹنی ارغوانی یا کالی ہو جائے تو عورت جان لیتی ہے کہ لڑکا ہونے والا ہے۔

اس سلسلے میں براہویوں میں یہ توہمات بھی مشہور ہیں کہ اگر حاملہ عورت کسی کالے سانپ کا راستہ کاٹ لے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے اور حرکت کرنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ کالا سانپ عورت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر بچھو یا بھیڑ حاملہ عورت کو کاٹ لے تو پیدا ہونے والے بچے پر (خواہ لڑکا ہو یا لڑکی) عمر بھر بچھو یا بھیڑ کے کاٹنے کا اثر نہیں ہوتا۔

حمل کی توہمات: عورت کو جب تین ماہ کا حمل ٹھہر جائے تو اسے کسی قسم کی دوا پینے کو نہیں دی جاتی اور نہ باسی کھانا دیا جاتا ہے کہ کہیں پیدا ہونے والے بچے پر اس کا اثر نہ پڑے۔ اسے کسی کمرے میں تنہا بھی جانے نہیں دیا جاتا کہ کہیں اس پر سایہ (جن بھوت کا اثر) نہ پڑ جائے۔ رات دن اس کے کمرے میں رائی جلائی جاتی ہے اور اس کی دھونی دی جاتی ہے تا کہ وہ بدروحوں سے محفوظ رہے اور اس دوران اگر عزیز و اقارب ہمسائے یا گھر میں موت واقع ہو جائے تو اسے مردے کا چہرہ دیکھنے نہیں دیا جاتا اور نہ اس کمرے میں جانے دیا جاتا ہے جہاں جنازہ ہوتا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ مردے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کہیں پتھرا نہ جائیں اور بچے پر اس کا برا اثر نہ پڑے جیسے کہ وہ بیمار یا لاغر نہ ہو جائے۔ رحم مادر میں ہی فوت نہ ہو جائے یا پیدا ہونے کے بعد نہ مر جائے۔ ان توہمات سے محفوظ رکھنے کیلئے کفن سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر حاملہ عورت کے دامن سے باندھ دیا جاتا ہے۔ مردے کا چہرہ دیکھنے یا اس کے کمرے میں جانے سے جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں انہیں ''بادالو'' کہا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام احتیاط کے باوجود اگر کوئی بچہ ''بادالو'' کے زیر اثر پیدا ہو اور اس کی پیدائش کے بعد گھر میں کوئی اور موت واقع ہو تو بچے کے تحفظ کے لیے اس کے ناپ کا کپڑا جنازے کے ساتھ قبر میں رکھا جاتا ہے۔ اس حکمت عملی سے بچے کی صحت و تندرستی ٹھیک رہتی ہے اور وہ زندہ سلامت رہتا ہے۔

براہویوں کے ہاں حمل قرار پانے کے بعد ساتویں مہینے سے قبل اگر سرپستان سے دودھ گرنے لگے تو اسے علامت بد سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بچہ یا اس کی ماں کے لئے مرنے والا آنسو بہا رہا ہے۔ گویا ان (زچہ و بچہ) میں سے کوئی مرنے والا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں حاملہ اور بچہ دونوں کی صحت و سلامتی کی دعا مانگی جاتی ہے اور صدقہ اتارا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں ساتویں مہینے سے قبل اگر پیٹ نیچے کھسک جائے تو اسے بری علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت میں ملا سے رجوع کیا جاتا ہے اور دفاع اسقاط کے لئے تعویذ باندھا جاتا ہے۔ بد ارواح سے بچانے کیلئے حاملہ کے انگوٹھے اور پاؤں کے پنجے میں نیلے کپڑے کی دھجی باندھ دی جاتی ہے۔ اس دوران اسے گھر کے کام کاج کو ہاتھ لگانے نہیں دیا جاتا لیکن اسے مسلسل ایک جگہ بیٹھنے کی بھی ممانعت ہوتی ہے خیال کیا جاتا ہے کہ جم کر بیٹھے رہنے سے بچے کا منہ صحیح مقام سے پھر جاتا ہے اور پیدائش کے وقت مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

دردزہ: دردزہ کے آثار کے ساتھ ہی عورتیں حاملہ عورت کے بناؤ سنگھار میں لگ جاتی ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہیں اور ہونٹوں پر اخروٹ کے چھلکے تا کہ سرخ ہو جائیں۔ یہ احتیاط اس لئے کی جاتی ہے کہ کہیں اس کی آنکھوں پر کوئی برا اثر نہ پڑے اور دانت باہر نہ نکل آئیں۔ کسی کنواری لڑکی کو اب کمرے میں اندر آنے نہیں دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اس کی آواز سے وضع حمل کے لمحات میں اضافہ ہوتا ہے اور دردزہ میں شدت پیدا ہوتی ہے حتیٰ کہ گھر میں ''رال'' یعنی سلائی کا کام بھی نہیں کیا جاتا کہ کہیں بچے کی گردن رحم سے نہ سل جائے۔

اسقاط حمل سے بچنے کا ایک روایتی طریقہ: روایت ہے کہ اگر کسی عورت کا پہلے حمل مسلسل ضائع ہوتا رہا ہے اور اب وہ پھر امید سے ہے تو دردزہ اٹھتے

ہی بڑی بوڑھی عورتیں مل بیٹھتی ہیں اور آنے والے بچے کی زندگی بچانے کیلئے یہ صورت نکالتی ہیں کہ کسی درخت کی ایک سرسبز و شاداب شاخ کاٹ کر اس کے پہلو میں رکھ دیتی ہیں اور جیسے ہی بچہ پیدا ہوتا ہے وہ اس شاخ کو بچے کے قد کے برابر اس طرح تراش لیتی ہیں کہ نہ وہ لمبا ہو اور نہ چھوٹا اور پھر پکار پکار کر کہتی ہیں کہ بچہ مر گیا پھر وہ اس شاخ کو نہلا دھلا کر کفن پہناتی ہیں اور قبرستان میں جا کر دفن کرا دیتی ہیں۔ گویا انہوں نے مردہ بچے کو دفن کر دیا ہو۔ اس سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس طرح وہ بدروحوں کی آنکھ میں دھول جھونکنے میں کامیاب ہو گئی ہیں اور اب نوزائیدہ بچہ بد روحوں کے اثرات سے محفوظ رہے گا۔

بچے کی پیدائش کا اعلان: اگر بچہ پیدا ہو تو باپ تین گولیاں فائر کر کے اپنی خوشی کا اعلان کرتے ہیں۔ گولیوں کی تعداد تین سے زیادہ پانچ سات بھی ہو سکتی ہے اس کے لئے تعداد کی کوئی قید نہیں لیکن طاق ہونے کی شرط ہوتی ہے۔ بندوق کی آواز سے ہی قریبی عزیز و اقارب اور رشتے دار یہ سمجھ لیتے ہیں کہ نومولود لڑکا ہے اور پھر یہ خبر دوسرے قریبی رشتے داروں کو سنانے دوڑ پڑتے ہیں جو سب سے پہلے یہ خوشخبری پہنچاتا ہے اسے ''مستائی'' یعنی مٹھائی دی جاتی ہے۔

لڑکی کی پیدائش پر عموماً خوشی کا ایسا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اگر پہلی اولاد لڑکی پیدا ہو تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورت اپنے خاوند سے زیادہ قوی ہے اس سے مرد کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن روایتاً بعض علاقوں میں لڑکی کی پیدائش پر باپ کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور اسے سات جوتے لگائے جاتے ہیں۔ لڑکی کی پیدائش پر زچہ کو تازہ ذبح کردہ مرغی کی یخنی پلائی جاتی ہے جس میں گرم مصالحہ چینی اور سیاہ مرچ وغیرہ ڈالی جاتی ہے۔

آنول نال: عموماً دائی نوزائیدہ بچے کا آنول نال کاٹتی ہے۔ براہویوں میں اس سلسلے میں یہ احتیاط پائی جاتی ہے کہ خون کا ایک قطرہ بھی بچے پر نہ پڑنے پائے کیونکہ بڑی بوڑھیوں کا کہنا ہے کہ آنول نال میں خسرے اور چیچک کے جرثومے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نال کو عموماً زمین کھود کر ایسی جگہ دفن کرنا ہوتا ہے جہاں کتا منہ نہ مار سکے۔ کیونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر کتا یا کوئی اور جانور آنول نال کھا جائے تو اس کا اثر بچے پر بہت برا پڑتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ بے حد مضطرب و بے قرار رہتا ہے اور ہر وقت چیں چیں کرتا رہتا ہے۔

دیم دیداری: بچے کو ایک کپڑے میں اس طرح لپیٹ دیا جاتا ہے کہ صرف اس کا منہ کھلا رہے جس کے بعد منہ دکھائی ہوتی ہے۔ عموماً ہر کسی کو بچے کی منہ دکھائی میں کچھ نہ کچھ دینا ہوتا ہے۔ یا وہ اس کا وعدہ کرتا ہے۔ اس رسم کو ''دیم دیداری'' یا منہ دکھائی کہتے ہیں۔ دیم دیداری کے بعد ملا یا کسی بزرگ کو بچے کے کان میں اذان دینے کیلئے بلایا جاتا ہے۔ وہ بچے کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں تکبیر دیتا ہے۔

سرگشت: بچے کی خبر سنتے ہی عزیز و اقارب، قریبی دوست، ہمسائے مبارکباد دینے دوڑ پڑتے ہیں لیکن انہیں خالی ہاتھ نہیں آنا ہوتا۔ لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ مٹھائی کسی بھی شکل میں اور کچھ رقم ضرور لے جائیں۔ یہ تحفہ سرگشت کہلاتا ہے۔ بچے اور میراثی شیرینی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس کے بعد جو شیرینی اور رقم بچ جاتی ہے اسے چار برابر حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ایک حصہ دائی کا ہوتا ہے۔ دوسرا بچے کی کھلائی کا' تیسرا حصہ خادماؤں کا اور چوتھا غریب غرباء کیلئے رکھ دیا جاتا ہے۔

اس تقریب میں جو لوگ شیرینی کی طشتری لے کر آتے ہیں اور جو دوسرے لوگ پہلے سے موجود ہوتے ہیں' انہیں خالی ہاتھ گھر جانے نہیں دیا جاتا۔ ان میں سے ہر ایک کو ''چلا بوائی'' میں کچھ شیرینی اور رائی کا دانہ دیا جاتا ہے۔

بچہ اور دائرہ: رات کو بچے کے سر پر دودھ سے بھرا پیالہ رکھا جاتا ہے جس میں ہر عورت اپنی حیثیت کے مطابق کچھ پیسے ڈالتی ہے۔ اس پیالے پر دائی کا حق ہوتا ہے۔ اب عزیز و اقارب یا قریبی رشتے داروں میں سے سات سہاگنیں بچے کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھتی ہیں۔ اس حلقے میں بیوہ یا دوبارہ بیاہی ہوئی عورتوں کا بیٹھنا ممنوع ہے۔ خواہ وہ نیک بیویاں اور خود آل اولاد والی کیوں نہ ہوں۔ دائرہ کی شکل میں بیٹھی ہوئی سہاگنیں بچے کو باری باری کچھ دیر کیلئے گود میں لیتی ہیں اور درازی عمر اور صحت و سلامتی کی دعا کرتی ہیں۔ اس میں بچے کے ماں باپ کی صحت و خوشحالی کی دعا بھی کی جاتی ہے۔ جب حلقے میں بیٹھی ہوئی تمام عورتیں بچے کو گود میں لے چکی ہوتی ہیں تو بچے کو پھر ماں کی گود میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس دوران مرد لوگ باہر بیٹھے موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں یا خوش گپیاں کر رہے ہوتے ہیں۔

یہی رسم بلوچستان کے جاموٹ ثقافت کے اثرات کے حامل علاقوں میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی طرح موجود ہے مثلاً کچھی اور نصیر آباد کے علاقوں میں عزیز و اقارب میں عورتوں اور مردوں میں کوئی تفریق نہیں ہوتی سبھی ساتھ بیٹھتے ہیں۔ پیالے میں رقم ڈالنے اور بچے کو گود میں لینے کی رسم میں بھی سبھی بلاتفریق شریک ہوتے ہیں۔ دائرہ کی شرط بھی لازمی نہیں ہوتی جبکہ ان علاقوں میں اکثر یہ رسم چھٹی کے موقع پر ہی ادا کی جاتی ہے۔

شششہ: بچے کا نام رکھنے کی رسم یعنی چھٹی کو براہوی میں شششہ کہتے ہیں۔ عموماً آج بھی براہویوں میں دادا پردادا کے نام پر بچے کا نام رکھنے کا رواج عام ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ ایسا کوئی نام نہ رکھا جائے جو پہلے سے خاندان میں کسی قریبی عزیز کا نام ہو۔ اگر ایسا ہو بھی جائے تو اگلا فریق اس بات کا برا مانتا ہے۔ نام رکھنے کا فریضہ عموماً خاندان کے بزرگوں بالخصوص ننھیال سے نانا نانی یا ماموؤں کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ دیہات میں آج بھی عموماً جنگلی بوٹیوں یا تاریخی کرداروں کا نام رکھنے کا چلن عام ہے۔

پیدائش کے بعد بد روحوں سے احتیاط: روایت ہے کہ بچے کی پیدائش کے فوراً بعد زچہ و بچہ کے کمرے میں چاروں اطراف کی دیواروں پر رقم کا نشان بنا دیا جاتا ہے تاکہ زچہ و بچہ بد ارواح کی نظر سے محفوظ رہیں۔ بعض لوگ گھر کے قریب پیپل کے پتے بکھیر دیتے ہیں کیونکہ براہویوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ جہاں پیپل ہوتا ہے وہاں بد روح نہیں پھٹکتے۔ بچے کے سر سے ایک کھلا چاقو باندھ دیا جاتا ہے جس کی نوک زمین کی طرف جھکی ہوتی ہے اور اسے ''چلہ نہان'' تک یونہی بندھا رہنے دیا جاتا ہے اور اگر چلہ پورا ہونے سے پہلے زچہ کو اپنے کمرے سے باہر جانے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ بغیر چاقو یا چھرا لئے اپنے کمرے سے باہر قدم نہیں رکھتی کیونکہ خیال کیا جاتا ہے کہ بد روحیں ہر وقت وار کرنے کی تاک میں رہتی ہیں ان سے دفاع کے لیے تیز دھار والا چاقو تلوار کا پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

کچینگنگ: براہویوں میں ایک عجیب و غریب قدیم روایت پائی جاتی ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کی سختی سے نگرانی کی جاتی ہے۔ گھر کی بیش قیمت و متبرک اشیاء مثلاً مالا، تسبیح کا دانہ، ہیرے جواہرات، تعویذ وغیرہ کو پانی سے بھرے پیالے میں ڈبو کر محفوظ کر لیا جاتا ہے اور پانی کے قطرے بچے کے منہ میں ٹپکائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی تھکا ماندہ راہ گیر اتفاقاً ادھر سے گزرتا ہے یا مال سے لدا پھندا کارواں گزرتا ہے تو رہنما شتر کی نکیل کا سرا یا رومال سے بھرے صندوق کے تالے کو دھو کر اس کا پانی کٹورے میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور بچے کے حلق میں بوند بوند ٹپکایا جاتا ہے۔ اس کام کو انجام دینے کیلئے بڑے بوڑھے، دادا، نانا، چچا، ماموں چاک و چوبند اور مستعد رہتے ہیں کیونکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اس حکمت عملی پر عمل نہ کریں گے تو بچے کو ''کچینگنگ'' ہو جائے گا جس کے نتیجے میں وہ نیلا پڑ جائے گا اور مر جائے گا چاند رات میں بھی بچے کی اسی طرح نگرانی کی جاتی ہے اور اگر کوئی شخص سفر سے آتا ہے اور بچے کو دیکھنا چاہتا ہے تو پہلے اس کے لئے منہ ہاتھ دھونا ضروری ہوتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ راستے میں وہ کسی جنازے یا مردے کے قریب سے گزرا ہو، کیونکہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا شخص بچے کو منہ ہاتھ دھوئے بغیر دیکھے گا تو بچہ بیمار ہو جائے گا چنانچہ بچے کی دادی یا نانی پورے چودہ دن گزرے بغیر بچے کو دکھانے سے گریز کرتی ہیں۔

بچے کے سر کو گول بنانے کا عمل: روایتاً براہویوں میں بچوں کے لمبوترے سر کو انتہائی بھدا اور بدصورت خیال کیا جاتا ہے۔ اس لئے عورتیں بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اس کے سر کو گول بنانے کی ہر ممکن سعی کر لیتی ہیں۔ اس کے لئے بچے کی پیشانی پر ایک چوڑی پٹی باندھ دی جاتی ہے اور سر کے نیچے مٹر کی پھلی یا بجرا بھرا چھوٹا سا نرم تکیہ رکھ دیا جاتا ہے کیونکہ اگر تکیہ سخت ہوگا تو بچہ چت لیٹنے کی بجائے سر کو دائیں بائیں ہلائے گا جبکہ نرم تکیہ پر بچے کو چت لٹانے سے بتدریج سر گول ہو جاتا ہے۔ لڑکا چونکہ بہر حال رحمت ہوتا ہے اس لئے اس کا سر گول یا لمبا ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

لڑکیوں کا سر گول کرنے پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ اس کا ایک موثر طریقہ کان چھیدن ہے۔ لڑکیوں کے کان چھید دیئے جاتے ہیں۔ اس عمل کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ کان چھیدن کے بعد لڑکی سر کو دائیں بائیں نہیں رکھ سکتی اور وہ چت لیٹی رہتی ہے۔ اس کے بعد سر گول کرنے کی دوسری تدبیروں پر عمل کیا جاتا ہے۔ ابتدائی چالیس ایام کے اندر یہ عمل تکمیل پاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ مثل مشہور ہے کہ بچے کا سر اس وقت تک پختہ نہیں ہوتا جب تک وہ ''خل'' (یعنی پتھر) کا صاف تلفظ ادا نہیں کرنے لگتا۔

ناک نقشہ: براہوی مائیں بچے کے ناک نقشہ کی تشکیل پر خاص دھیان دیتی ہیں۔ دیم دیداری یعنی بچے کی منہ دکھائی کے وقت بچے کی باچھیں ناپی جاتی ہیں اور اگر وہ ایک انگلی کی پور سے بڑی ہوں تو عورتیں ایک انگوٹھی لے کر لبوں کو سکیڑ کر پہنا دیتی ہیں تاکہ باچھیں پھیلنے نہ پائیں بلکہ بچے کا دہن غنچے کی طرح بن جائے۔ بچے کے ہونٹوں کو باریک بنانے کیلئے عورتیں اسے رگڑتی ہیں اور ناک کا بانسہ چٹکی میں لے کر اوپر اٹھاتی ہیں تاکہ ناک ستواں ہو جائے کیونکہ پھیلی ہوئی باچھوں، موٹے ہونٹوں اور لمبی ناک کو بدصورتی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ براہوی بچے کے حسن کیلئے کہا جاتا ہے کہ نقش پا مثل گھوڑ کے بغل کے ہوں، ریچھ کی طرح چپٹا سپاٹ اور بدوضع نہ ہو۔ مثل مشہور ہے کہ ''سر بڑا سردار کا' پاؤں بڑا گنوار کا'' یعنی کمان نما پاؤں بدنما سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا بچوں کے دونوں پاؤں کو ملا کر باندھ دیا جاتا ہے اور درمیانی خلاء کی بھرائی کمبل لپیٹ کر کر دی جاتی ہے تاکہ پاؤں تیر کی طرح سیدھی نشو و نما پائے۔ اسی طرح ہاتھ بھی جسم سے ملا کر سیدھا باندھ دیا جاتا ہے۔ اس حالت میں بچہ چار ماہ سے زیادہ پرورش پاتا ہے۔ البتہ ان بندھنوں کو ہر روز صبح اور بعد دوپہر کھول

دیا جاتا ہے تا کہ بچہ ہاتھ پاؤں ہلا سکے۔

ان بندھنوں کو نہ صرف ہاتھ پاؤں اور پسلیوں کی صحت مند اور سڈول نشوونما کیلئے ضروری خیال کیا جاتا ہے بلکہ بھوت پریت، بد ارواح اور شیاطین کی جناتوں سے تحفظ کیلئے بھی احسن سمجھا جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر یہ بندھن نہ ہوں اور بچہ ڈر جائے تو اس کی پسلیاں پھڑک اٹھتی ہیں اور اپنی جگہ سے پھر جاتی ہیں جو پھر بٹھائے نہیں بیٹھتیں۔ پسلیوں کے باندھنے سے پھڑکن کی بیماری نہیں ہوتی لہٰذا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پرورش و پرداخت کی مصروفیتیں کس قدر زیادہ ہیں اور براہوی خواتین اس میں شب و روز مصروف رہتی ہیں۔

چلہ: بچہ جنم دینے والی عورت کیلئے یہ دن بڑا اہم اور یادگار ہوتا ہے۔ وضع حمل کے فوراً بعد زچہ کو ''گرمانہ'' دیا جاتا ہے۔ جوگھی، راب اور جڑی بوٹیوں کو باہم ابال کر بطور ناشتہ تیار کیا جاتا ہے۔ زچہ ابتدائی دنوں تک گندم کی روٹی اور گھی پر گزارہ کرتی ہے۔ پورے چودہ دنوں تک اسے زچہ خانہ میں لیٹا رہنا پڑتا ہے۔ کوئی نہ کوئی عورت ہر وقت اس کی نگرانی کے لئے موجود ہوتی ہے۔ روایت ہے کہ ایسا اس لئے لازمی ہوتا ہے کہ کہیں کوئی بد روح اس کا دل نہ چبا جائے۔ چودھویں دن وہ گرم پانی سے غسل کرتی ہے اور جب اس کا سر دھویا جاتا ہے تو وہ منہ میں لونگ رکھتی ہے تا کہ سردی نہ لگے۔ غسل کے بعد صاف ستھرے کپڑے پہنتی ہے اس کا اترن دایہ کو دے دیا جاتا ہے۔ ایک ہفتے بعد اسے پھر نہلایا جاتا ہے۔ اس نہانے کے بعد وہ گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ چالیس دن گزرنے کے بعد وہ چلہ نہاتی ہے۔ نجس مقامات کو صاف کرتی ہے۔ اب اسے دوبارہ اپنے شوہر سے ملنے کی اجازت ہوتی ہے۔

بچپن

دندان رودی: اگر کوئی دانت نکلا بچہ پیدا ہو تو اسے دندان رودی کہتے ہیں اور براہویوں میں اسے نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ایسے بچے کے والدین خیر خیرات کرتے ہیں۔ مزارات پر منتیں مانگتے ہیں اور اس کی درازی عمر کی دعائیں کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر چھ ماہ سے پہلے کسی بچے کے دانت نکلنے لگیں تو اسے بھی نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن اگر دانت مقررہ مدت کے بعد بھی نہ نکلیں تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بچہ کمزور ہے اور اس کی ہڈی ٹھنڈی ہے۔

دندان روڈی: بچے کا پہلا دانت پھوٹنے کو دندان روڈی کہتے ہیں۔ جھالاوان میں ایک قدیم روایت ہے کہ جس بچے کا پہلا دانت پھوٹتا، اس کے سر سے گردا ون کی پٹی باندھ کر ماں بچے کو ہمسائے کے دروازے پر فقیر بنا کے لے جاتی ہے۔ اس طرح کم از کم سات دروازوں پر ماں بچہ صدا لگاتے ہمسائے بھیک میں انہیں غلہ دیتے ہیں اور ساتھ ہی کچھ رقم بھی۔ بھیک میں ملے ہوئے غلے کو بغیر پیسے پکا کر خیرات کیا جاتا ہے اس پکی ہوئی غذا کو ''کوحل'' کہتے ہیں اور اس کھانے کو بھی ''کوحل'' کہا جاتا ہے جو بچے کی پیدائش سے پہلے بطور سوغات عزیز و اقارب اور احباب و ہمسایوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

گام بری: بچہ جب چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے لگتا ہے تو اس اعلان کیلئے خوشی میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسے گام بری کہتے ہیں۔ اس کیلئے ایک دن مقرر کیا جاتا ہے۔ اس دن خاندان اور برادری کی عورتوں کو بلایا جاتا ہے اور تقریب کیلئے مقررہ دن کو طفلی نان پکایا جاتا ہے۔ بچے کو بنا سنوار کر نیا لباس پہنا کر مہمانوں کی مجلس میں لایا جاتا ہے۔ بچے کو لا کر ماں کے قریب کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ عورتیں ''طفلی نان'' ادھر ادھر پھینکتی ہیں اور بچے کو اٹھا کر لانے کی ترغیب دیتی ہیں بچہ ''طفلی نان'' اٹھانے کیلئے اپنے ننھے منے پاؤں اٹھاتا ہے۔ سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ چلنے لگا ہے اس کے بعد طفلی نان کو توڑ کر ٹکڑے بنائے جاتے ہیں اور اس تقریب میں شریک لوگوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں اور اس کے بعد کھانے کیلئے دستر خوان کشادہ کیا جاتا ہے۔ عزیزوں اور رشتے داروں کے علاوہ اس نیک ساعت میں غریب و مساکین میں بھی حسب توفیق کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔

بچے کے دودھ چھڑانے کا روایتی طریقہ: روایتاً براہویوں میں لڑکے کو اٹھارہ ماہ اور لڑکی کو ایک سال تک دودھ پلانے کا رواج ہے۔ قدیم براہوی روایت کے مطابق دودھ پلانے کی مدت پوری ہونے کے بعد اگر ممکن ہو تو جمعہ کے دن سات کھجور کسی برتن میں رکھ دیئے جاتے ہیں اور بچے سے کہا جاتا ہے کہ وہ جتنا چاہے اس میں سے نکال کر کھائے۔ جتنے کھجور وہ برتن سے لیتا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ اتنے ہی دنوں تک ماں کو دودھ کیلئے تنگ کرے گا۔ ماں پھر ایک کڑوی دوا ''سبر'' میں کالا اون بھگو کر اپنے پستانوں پر باندھ لیتی ہے اور اگر بچہ دودھ کیلئے ضد کرتا ہے تو وہ اپنے پستانوں کو کھول کر اسے دکھاتی ہے اور کہتی ہے کہ بلی یا کتے نے اس کی بھٹنی (سرپستان) کو نوچ لیا ہے اور اب وہ اس کے لئے کسی کام کا نہیں رہا بچے کی پیاس بجھانے کیلئے ماں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اسے پانی پلاتی رہتی ہے اور گوشت کا ایک ٹکڑا بھون کر سرقہ میں ڈبو کر بچے کو کھانے کے لئے دیتی ہے تا کہ وہ اس سے اپنی بھوک پیاس مٹائے اسے ''کشکنگ'' یعنی دودھ چڑھانا کہتے ہیں۔

سرکٹی: براہویوں میں رسم ہے کہ دو سال تک بچے کے سر کے بال نہیں مونڈھے جاتے۔ بچہ دو سال کا ہو جائے تو باقاعدہ بال مونڈھنے کی رسم ہوتی ہے جسے ''سرکٹی'' کہتے ہیں۔ ''سرکٹی'' کے لئے مقررہ دن کی صبح کے وقت خاندان کا ایک فرد کسی نوکر یا ساتھی کو ساتھ لے کر تمام عزیز و اقارب، احباب اور ہمسایوں کے گھر نوتہ (بلاوا/دعوت) دینے جاتا ہے۔ بعد دوپہر مہمان آنا شروع ہوتے ہیں ساری رات خوشی منائی جاتی ہے۔

خام بندی: رات کے وقت کسی برتن میں مہندی رکھ کر مجلس میں لائی جاتی ہے۔ اس مہندی کو ''خام'' کہتے ہیں۔ بچے کے ہاتھ پاؤں پر مہندی لگائی جاتی ہے۔ لڑکی ہوتی ہے تو عورتوں کی مجلس میں مہندی لگانے کی رسم ہوتی ہے، عموماً دادی یا نانی کی گود میں لڑکی کو بٹھا کر مہندی لگانے کی رسم ادا کی جاتی ہے اور اگر بالفرض دادی نانی نہ ہوں تو کسی سید کی گود میں اسے بٹھا کر مہندی لگائی جاتی ہے۔ بچے کو مہندی لگانے کے بعد مہندی کا برتن اٹھا کر اس مجلس کی سب سے بزرگ و محترم خاتون کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ مہندی لگاتی ہے اور پھر مہندی کا طشت درجہ تمام عورتوں کے سامنے آتا ہے اور وہ مہندی لگاتی ہیں۔ لڑکا ہو تو اس کی مہندی مردانے میں ہوتی ہے۔ زنان خانہ سے مہندی بڑے بوڑھے اور مائیں بہ شکل جلوس لے کر مردانہ محفل میں آتی ہیں۔ ایک کنیز ریشمی رومال سے ڈھکا ہوا مہندی کا طشت اٹھائے ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں مشعل ہوتی ہے۔ سب گیت گا رہے ہوتے ہیں۔ مردانہ محفل کے بیچ میں لڑکا اپنے دادا یا باوا یا کسی عصمت مآب سید کی گود میں بٹھایا جاتا ہے جو اس کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگاتا ہے۔ بچے کو مہندی لگانے کے بعد مہندی کا برتن محفل کے بزرگ ترین شخص کے سامنے لایا جاتا ہے اور پھر اہل محفل درجہ بدرجہ رتبہ بہ رتبہ مہندی لگاتے ہیں۔ مہندی جب نوجوانوں کے پاس آتی ہے تو وہ ہاتھ بھر کے مہندی اٹھا لیتے ہیں اور پھر خوب چھین جھپٹ ہوتی ہے اور پھر وہ از راہ مذاق لڑکے کے باپ اور اگر دادا کی عمر اجازت دیتی ہو تو اس کی داڑھی میں بھی پکڑ دھکڑ کر مہندی لگا دیتے ہیں۔

بال اتارنے کی رسم: بچے کے سر کے بال اتروانے کے لئے اکثر کسی مخصوص پیر کے مزار پر ڈھول بجاتے جاتے ہیں۔ مزار پر پہنچ کر بچے کا سر منڈایا جاتا ہے۔ لوگ فاتحہ پڑھتے ہیں۔ دعا کرتے ہیں۔ مجاوروں کو شیرینی اور کچھ نقدی بھی دیتے ہیں لیکن اگر مزار بہت فاصلے پر واقع ہو اور وہاں جانا آسان نہ ہو تو اس صورت میں گھر پر ہی بچے کا سر مونڈا جاتا ہے اور تمام بالوں کو احتیاط سے جمع کر کے ایک تھیلی میں بھر کر مزار پر بھیج دیا جاتا ہے۔

ختنے کی رسم: ختنے کی رسم کی تقریب میں براہویوں میں کم و بیش شادی کی تقریب جیسا ہی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے بچے کی عمر کی کوئی خاص حد مقرر نہیں۔ عموماً چار سال سے دس سال کی عمر کے درمیان بچے کے ختنے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ آج کل شہروں میں تو اکثر ششہ (چھٹی) کے موقع پر ختنہ بھی کرا دیتے ہیں لیکن قصبوں اور دیہات میں یہ رسم اپنی مکمل روایت کے ساتھ موجود اور برقرار ہے۔

گڈبری: ختنے کو جو دن مقرر ہوتا ہے اس سے کچھ دن قبل عزیز و اقارب اور پاس پڑوس کی عورتوں کو ''گڈبری'' یعنی بچے کے کپڑے ناپنے، تراشنے اور سینے کی دعوت دی جاتی ہے۔ عورتیں جمع ہوتی ہیں۔ ڈھول بجاتی اور گیت گاتی ہیں۔ جیسے جیسے کپڑا تراشا جاتا ہے عورتیں اس پر شیرینی نچھاور کرتی ہیں۔ شیرینی کو شینکی کہا جاتا ہے۔ کپڑے کے مختلف حصے کئے جاتے ہیں اور عورتیں اس سلائی کا کوئی معاوضہ نہیں لیتیں۔ اس کے علاوہ بچے کا نیا گدا بھی بنایا جاتا ہے جسے ''توشک'' کہتے ہیں۔

وزی حنام: ختنے کی تقریب سے دو دن قبل خاندان کے افراد اور قریبی احباب کو دعوت دی جاتی ہے۔ شام کے وقت احباب جمع ہوتے ہیں۔ باپ بچے کو لے کر محفل میں آتا ہے اور کسی سید یا خاندان کے بال بچے دار شخص کے پاس بٹھا دیتا ہے۔ بچے کو جس گدے یا توشک پر بٹھایا جاتا ہے اسے ''تخت'' کہا جاتا ہے۔ ایک کم سن لڑکے کو شہ بالا بنایا جاتا ہے یعنی بادشاہ کا محافظ، جو اس کا سامان اٹھاتا ہے اور ہر جگہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔

تقریب میں چائے کا دور چلتا ہے۔ پھر ڈھول اور سرنا پر شادمانی کا گیت گایا جاتا ہے۔ ایک عورت گیت گاتی ہوئی مہندی محفل میں لے آتی ہے۔ اس مہندی کو وزی حنام کہتے ہیں۔ مہندی میں آنے کے بعد تمام اہل محفل ہاتھ اٹھا کر بچے اور ان کے والدین کی درازی عمر کیلئے دعا مانگتے ہیں۔ پھر اہل محفل میں سے بزرگ ترین شخص یا سید مہندی لیتا ہے اور بچے کے ہاتھ پاؤں پر لگاتا ہے۔ مہندی لگانے کی ابتداء دائیں ہاتھ سے ہوتی ہے اور اس بات کا بے حد خیال رکھا جاتا ہے کہ مہندی زمین پر گرنے نہ پائے۔ مہندی لگانے کے بعد بچے کے ہاتھ پاؤں پر سرخ کپڑا لپیٹ دیا جاتا ہے اور پھر مہندی اہل محفل میں سے سب سے بزرگ شخص کو پیش کی جاتی ہے۔ اور پھر درجہ بدرجہ رتبہ بہ رتبہ تمام لوگ شہادت کی انگلی یا کنگیا میں مہندی لگاتے ہیں پھر نوجوانوں کے ہالے میں مہندی آتی ہے اور وہ خود بھی مہندی لگاتے ہیں اور از راہ تفنن طبع لڑکے کے باپ دادا اور چچا وغیرہ کی داڑھی کو بھی تھوپ دیتے ہیں۔ نوجوان اس سلسلے میں عورتوں کو بھی مہندی لگانے سے نہیں چوکتے اور اس بات

کا بالکل بھی برا نہیں منایا جاتا ہے۔

چاپ: چاپ رقص کو کہتے ہیں۔ یہ قدیم زمانے سے آج تک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ عموماً خواتین اور مرد الگ الگ دائرے بنا کر چاپ کرتے ہیں جن کے بیچ میں لوڑی رمیراثی کھڑا ہوتا ہے۔ جو ڈھول بجاتا ہے۔ خوشی کے اس مبارک موقع پر بھی ڈھول وسرنا بجتے ہیں اور رات دیر گئے تک چاپ ہوتا ہے۔

خاشی حنام: دوسری صبح تک بھی گھر میں رونق رہتی ہے اور ہنگامہ گرم رہتا ہے۔ دو دن سے جس رسم کی تیاریاں ہو رہی ہوتی ہیں۔ اب اس کے انجام دینے کا وقت آجاتا ہے۔ چنانچہ بچے کو ایک بار پھر مہندی لگائی جاتی ہے۔ اس مہندی کو "خاشی حنام" کہتے ہیں۔ اب ختنے کی رسم قریب ہے۔

صلواۃ: بچے کو دوپہر کے کھانے کے بعد دولہا کی طرح بنا سنوار کر محفل میں لایا جاتا ہے۔ باپ اس موقع پر بیٹے کو ایک قطع اراضی، ایک گھوڑا، تلوار یا بندوق حسب استطاعت دینے کا اعلان کرتا ہے۔ باپ اگر زیادہ ضعیف العمر ہوتا ہے تو کڑسان میں کھڑے لڑکے کو بآواز بلند یہ کہنے کو کہا جاتا ہے (تاکہ لوگ سن سکیں) کہ "یہ باتیں سب سن لیں کہ فلاں فلاں گھوڑا یا تلوار یا بندوق یا قطعہ اراضی جو میرے باوا کا ہے آج سے میرا ہے" ختنہ کے موقع پر باپ کی طرف سے بیٹے کو دیئے جاتے ہیں۔ اس تحفہ کو "صلواۃ" کہتے ہیں اور یہ بچے کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ اس میں اس کے بھائی حصہ دار نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی شخص بہت غریب ہو اور اس قسم کا کوئی تحفہ بچے کو دینے کی حیثیت نہ رکھتا ہو تو "صلواۃ" کی رسم ادا نہیں ہوتی یوں بھی رسمیں اب تقریباً متروک ہوتی جا رہی ہیں۔

ختنہ: اب لڑکے کو "کڑسان" پر بٹھا دیا جاتا ہے اور اس کا منہ شمال کی جانب کر دیا جاتا ہے۔ اس کی پشت کی جانب شہ بالا خاندان کا کوئی قریبی فرد، دوست یا بڑا بھائی کھڑا ہوتا ہے۔ لوگ بچے کو آسمان کی جانب دیکھنے کو کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس سے کہا جاتا ہے کہ "وہ دیکھو آسمان پر طوطے اڑ رہے ہیں" لڑکا اوپر دیکھنے لگتا ہے۔ آسمان پر کوئی طوطا اڑتا نظر نہیں آتا اور اس اثناء میں حجام بڑی پھرتی سے اس کا ختنہ کر دیتا ہے۔

وہاں موجود افراد حجام سے مذاق کرتے ہیں۔ برا بھلا کہتے ہیں۔ یہ سب بچے کی توجہ ہٹانے کیلئے ہوتا ہے۔ حجام بھی ان خوش گپیوں میں شریک ہوتا ہے اور پھر وہ کٹے ہوئے اعضاء کو اٹھا لیتا ہے اور سرخ ڈور میں پرو کر لڑکے کے ٹخنے سے باندھ دیتا ہے جب تک زخم نہ سوکھ جائے۔ اس کے بعد کسی سرسبز و شاداب درخت کے نیچے اسے دفنا دیا جاتا ہے۔ ہرے بھرے درخت کے نیچے دفنانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لڑکا اس درخت کی طرح ثمر دار ہو۔ بعض لوگ قطع کردہ اعضاء کو ٹخنے میں نہیں باندھتے بلکہ نم زمین کھود کر اسے دفن کر دیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کی ٹھنڈک سے زمین کی تکلیف کم ہوگی۔

ماں کی دعا: جب ختنے کی رسم ہو رہی ہوتی ہے تو اس دوران ماں زنان خانہ میں عورتوں میں گھری ہوئی اضطراب و اضطرار میں کھڑی رہتی ہے۔ وہ اپنے سر پر پتھر چکی رکھتی ہے۔ اس کی بہنوں اور بیٹیوں میں سے کوئی اس کے سر پر قرآن شریف رکھ دیتی ہے۔ وہ قبلہ رو ہو کر بچے کی صحت و سلامتی کی دعا مانگتی ہے۔ جیسے ہی ختنہ ہو چکا ہوتا ہے اور چاروں اطراف سے مبارکباد کی صدا آنے لگتی ہیں۔ تو اس کے سر سے قرآن مجید اتارا جاتا ہے اور پھر ہتھ چکی اتاری جاتی ہے۔

سرگشت: لڑکے کو زنان خانہ میں لایا جاتا ہے۔ گھر کے اندر ایک کمرے میں اس کے لئے مخصوص جگہ پہلے سے تیار کی گئی ہوتی ہے جہاں عورتوں کا جمگھٹا ہوتا ہے۔ یہاں پھر تمام رشتے دار اسے سرگشت (تحفہ) دیتے ہیں جو کپڑوں، نقد رقم اور دیگر تحائف کی صورت میں ہوتا ہے۔ عموماً ان تحائف کا تعلق بچے کے والدین کے سماجی رتبے سے ہوتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دوسروں کے بچوں کے ختنے کے موقع پر اس باپ کو یہ سرگشت لوٹانا بھی ہوتا ہے۔ وہ بچے کے پاس کھڑا ہوتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ فلاں نے اتنا سرگشت دیا۔ اب تو یہ چیزیں لکھ لینے کا رواج ہے۔

سرگشت کے بعد شیرینی تقسیم ہوتی ہے اور یوں ختنے کی رسم اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

بچوں کا لباس: عموماً جب لڑکا تین سال کا ہو جائے تو اسے پہلی بار شلوار پہنائی جاتی ہے لیکن اگر وہ نہ بھی پہنے تو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ دانت نکلنے تک وہ بغیر شلوار کے چل پھر سکتا ہے لیکن لڑکیاں جونہی دو سال کی ہوتی ہیں انہیں شلوار پہنا دیا جاتا ہے اس کی زیادہ سے زیادہ حد چار سال ہے۔ لڑکے اور لڑکی کو مگر عموماً سفید شلوار پہننے نہیں دیا جاتا نہ ان کے قمیض کے دامن سلے ہوتے ہیں جب تک ان کے دانت نہ نکل آئیں۔ اس کے بعد لڑکے کے شلوار کا رنگ سفید یا نیلا ہوتا ہے۔ لڑکی کے شلوار کا رنگ سرخ یا زرد یا سبز ہوتا ہے۔ سفید اور نیلا رنگ مگر اس کے لئے ممنوع ہیں۔ اور لازم ہے کہ شلوار اور قمیض کا رنگ مختلف ہوگا اور دوپٹہ ان دونوں سے مختلف ہوگا اس لئے عورتیں عموماً مختلف اور انواع و اقسام کے رنگین کپڑے پہننا پسند کرتی ہیں۔

دانت گرنا: جب بچے کے (لڑکا ہو یا لڑکی) دودھ کے دانت گرنے لگتے ہیں تو کچھ نہ کچھ اہتمام لازم ہوتا ہے۔ بچے کی ماں اس کے لئے نئے جوڑوں کی سلائی کرتی ہے جیسے

ہی اس کا پہلا دانت گرتا ہے۔ وہ بچے کا منہ نمک اور کڑوے تیل سے دھوتی ہے تا کہ نئے نکلنے والے دانت سفید اور جڑے ہوئے ہوں پھر لڑکے کو ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے دانت لے کر لایا جاتا ہے اسے تین چھلانگ لگاتے ہوئے ان فقروں کو دہرانا ہوتا ہے۔

''اے کوا! تیرے دانت کالے دیکھ میرے دانت سفید ہیں''

''اے کوا! تیرے دانت ٹیڑے میڑھے ہیں دیکھ میرے سڈول ہیں''

''اے کوا! تیرے دانت گندے ہیں دیکھ میرے کتنے صاف ستھرے ہیں''

وہ تین مرتبہ چھلانگ لگاتا ہے اور ہر چھلانگ پر ایک بول بولتا ہے۔ اس کے بعد جھڑے ہوئے دانت کو کسی سرسبز و شاداب درخت کے نیچے دفنا دیتا ہے یا انہیں گھر میں بطور یادگار محفوظ رکھ لیا جاتا ہے۔

یہی رسم جاموٹ قبائل میں ذرا سے فرق کے ساتھ موجود ہے مثلاً بھاگ ناڑی اور جعفر آباد کے سندھی و سرائیکی قبائل میں بچے سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنا دانت کسی اونچی جگہ (جیسے کہ گھر کی چھت وغیرہ) پر پھینکے اور اسے اوپر پھینکتے ہوئے سورج کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا ہوتا ہے کہ

''اے سورج ماما! میرا پرانا دانت لے اور مجھے (اس کے بدلے میں) نیا دانت دے''۔

اکلی: دس سے بارہ برس کی عمر میں لڑکوں کو قرآن مجید سکھایا جاتا ہے۔ لڑکیاں سلائی کڑھائی شروع کر دیتی ہیں اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ بالائی جبڑے کے دائیں بائیں کے داڑھوں کو اکلی یعنی داڑھا یا عقل چر کہا جاتا ہے۔ عموماً یہ گیارہ برس کی عمر میں نکلتا ہے۔ اسے ''سن شعور'' کی علامت سمجھا جاتا ہے یعنی اب لڑکے کو ڈانٹ ڈپٹ کی جاسکتی ہے۔ اب وہ اچھے برے کی تمیز کر سکتا ہے۔

آمد شباب: براہوی مائیں بچیوں کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ جب لڑکی کا پستان ابھر کر گدرا ہو جائے تو ماں اسے دھوتی ہے تا کہ مدور ہو اور زیادہ پھول کر بدوضع نہ ہو جائے اور اگر اس میں دودھ ہوتا ہے تو وہ راکھ میں نمک ملا کر اس پر ملتی ہے۔ دو تین بار اس طریقے پر محتاط مائیں عمل کرتی ہیں۔ اس سے قبل کہ لڑکی پوری طرح جوان ہو جائے اور پہلی ماہواری کے بعد اس کا بچپن ختم ہو جائے۔ ماں کی ہدایت پر وہ اسے اپنی حالت سے مطلع کرتی رہتی ہے اور جب صورتحال نازک نقطہ پر پہنچ جائے تو سمجھدار ماں صبح کے وقت تین پتھر اس نمونے سے اٹھا کر رکھتی ہے اور لڑکی کو ان کے اوپر سے تین بار چھلانگ لگانے کیلئے کہتی ہے کیونکہ اگر اس ترکیب پر صحیح طریقے سے عمل کیا گیا تو اس کی ماہواری کی مدت تین دنوں سے زیادہ نہ بڑھنے پائے گی۔

درحقیقت یہ محض ایک خیال آرائی ہے اور ایک قدیم روایت ہونے کی وجہ سے فوک لور کا حصہ ہے۔ ورنہ جدید عہد میں اب یہ قدیم طریقہ کار تقریباً متروک ہو چکے ہیں۔

بچے کی پیدائش سے لے کر بچپن تک کی کم و بیش یہی رسومات تھوڑے فرق کے ساتھ کچھی، نصیر آباد اور جعفر آباد کے میدانی علاقوں میں بھی موجود ہیں۔ جیسا کہ شروع میں کہا گیا تھا کہ ان رسومات میں بنیادی فرق لسانی ہے نہ کہ ثقافتی۔ بلوچستان کے مذکورہ میدانی علاقے چونکہ سندھ کی سرحدی پٹی کے ساتھ واقع ہیں اور یہاں سندھی جاموٹ قبائل کی اکثریت ہے اس لئے سندھی ثقافت کے اثرات یہاں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ جن رسومات کا براہوی ثقافت کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے یہی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ان علاقوں میں پائی جاتی ہیں مگر مختلف ناموں کے ساتھ اور یہ نام اکثر سندھی یا سرائیکی زبان میں ہوتے ہیں۔ مثلاً....

عورت کو حمل ٹھہر جائے تو اس کیلئے ''گورھاری'' (گوہاری) کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے لفظی معنی ہیں ''بھاری ہونا''۔ عورت کھٹی چیزیں کھانے لگے تو اس کے لئے ''اڈریٹر'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو براہوی کے درو ہڑ کے ہی معنی دیتا ہے۔

ان ایام میں عورتیں سوندھی ہوئی مٹی بھی شوق سے کھاتی ہیں جسے مقامی طور پر ''میٹ'' کہا جاتا ہے۔ براہوی خواتین بھی کبھی اسے شوق سے استعمال کرتی تھیں۔ جدید غذاؤں کے بعد اب ان کا استعمال معدوم ہوتا جا رہا ہے۔

حمل سے متعلق توہمات براہوی کلچر کا خاصہ ہیں۔ میدانی علاقوں میں ان کی شکل مختلف ہوتی ہے۔ بچے کی پیدائش کا اعلان کم و بیش اسی طرح یعنی فائر کر کے کیا جاتا ہے۔ اگر فوری طور پر گھر میں بندوق موجود نہ ہو تو کوئی ایک گھڑا پھوڑ دیا جاتا ہے جس کی زوردار آواز خوشی کا والہانہ اظہار ہوتی ہے۔ چھٹی کی رسم میں کوئی خاص فرق نہیں۔ میدانی علاقوں میں البتہ آج بھی اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ نومولود کا نام حال ہی میں وفات پانے والے گھر کے کسی بزرگ کے نام پر رکھا جائے، اس سے یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ گویا اس نے گھر میں پھر جنم لے لیا ہے۔ ایسے بچے جن کا نام دادا، دادی کے نام پر رکھا گیا ہو گھروں میں انہیں اکثر نام کے بجائے دادی یا دادا کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہی نام ان کے اصل نام کی جگہ لے لیتا ہے۔

بچے کے پہلے اٹھانے اور سر منڈانے کی رسمیں پہاڑی علاقوں کے ساتھ ساتھ میدانی علاقوں میں بھی اب متروک ہوتی جا رہی ہیں حتیٰ کہ چھوٹے بڑے شہروں میں تو اب ختنے کے موقع پر بھی کسی بڑی تقریب کا اہتمام کرنے کی بجائے ڈاکٹر کے ہاں لے جا کر بڑی سادگی اور خاموشی کے ساتھ یہ رسم ادا کر دی جاتی ہے۔ آج بھی دیہات ان رسم و رواج اور ثقافت کے امین اور نگہبان ہیں جہاں یہ رسمیں قلیل مقدار میں سہی مگر اپنی اصل شکل کے ساتھ نظر آتی ہیں جو شہروں میں آ کر مسخ

ہو چکی ہیں۔ براہوی قبائل کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی ثقافت کو منفرد عناصر کے ساتھ قائم رکھا ہے۔

شادی بیاہ کی رسومات

براہویوں میں شادی بیاہ کی رسومات کم وبیش وہی ہیں جو اس خطے کی مشترکہ رسومات ہیں البتہ بعض چیزیں ایسی ہیں جو انہیں ثقافتی سطح پر انفرادیت بخشتی ہیں اور وہ قدیم زمانے سے ان میں چلی آرہی ہیں۔ ان میں سے بھی اکثر رسمیں اب متروک ہو چکی ہیں اور بعض اپنی اصل شکل وماہیت کھو بیٹھی ہیں لیکن چونکہ رسمیں ثقافتی انفرادیت واشتراک کا مظہر ہیں۔ اس لئے فوک لور میں انہیں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ذیل میں منگنی سے لے کر شادی تک طے پانے والے مراحل کا تذکرہ پیش ہے۔

منگنی اور شادی کی عمر: لڑکے لڑکیوں کی عموماً بچپن میں ہی شادی طے کر دی جاتی ہے جبکہ لڑکیوں کی شادی بالغ ہوتے ہی کر دی جاتی ہے۔ البتہ عمر کے معاملے میں لڑکوں کو کچھ رعایت حاصل ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی شادی عموماً 4 سے 16 سال کی عمر میں کر دی جاتی ہے جبکہ لڑکوں کے لئے عمر کی حد سولہ سے 20 برس کے درمیان ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بھی لازم ہوتا ہے کہ دلہن کو دولہے سے کم عمر ہی ہونا چاہئے۔ بالفرض اگر دلہن عمر میں بڑی ہو تو براہوی سوسائٹی میں ایسی جوڑی کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اکثر انہیں طنز وتضحیک کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

خاندان میں رشتے داری: براہوی کلچر میں خاندان میں شادی کو آج بھی فوقیت حاصل ہے۔ والدین کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ بچوں کو خاندان میں ہی بیاہا جائے۔ اس کے لئے چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد کو بہتر سمجھا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح سے نسل خالص رہتی ہے۔ گھر میں اگر دو بھائی ساتھ رہتے ہوں تو اپنے لڑکے لڑکیوں کی باہمی شادیاں کر دیا کرتے ہیں جیسے کہ ایک بھائی کے ہاں بیٹی ہوئی اور دوسرے کے ہاں بیٹا تو وہ بچپن میں ہی انہیں ایک دوسرے کے نام کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں عمر کی مخصوص رعایت حاصل ہوتی ہے یعنی اگر لڑکی دو ایک برس بڑی بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

پیدائش سے پہلے رشتہ طے پانا: بعض قبائل کے ہاں آج بھی رسم موجود ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ رشتہ طے پانے کے وقت "لب" (جہیز کی رقم) کے علاوہ ایک رشتہ بھی لکھوایا لیا جاتا ہے یا اس کی زبان دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر الف نے اپنی بیٹی کا رشتہ ب کے ساتھ طے کیا تو وہ یہ شرط رکھے گا کہ اس کے ہاں بیٹی کی جو پہلی اولاد ہوگی وہ الف کی ملکیت ہوگی اس کی مرضی ہے کہ وہ اسے اپنے پوتے، نواسے، بھانجے یا بھتیجے میں سے کسی کے ساتھ بھی بیاہے یا بعد ازاں اس رشتے کے عوض رقم لے لے۔ اس کا انحصار الف کی مرضی پر ہوگا۔ یوں بچی دنیا میں آنے سے پہلے کسی کے نام ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ رواج اصل براہوی قبائل میں کم ہی ہے۔ یہ رسم میدانی علاقوں کے جاموٹ قبائل میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ انہی کی ثقافت کے زیر اثر رہنے والے براہوی قبائل میں کسی حد تک اس کا رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن اب جدید عہد میں ماسوائے اندرون دیہات کے قریب قریب یہ رسم متروک ہو چکی ہے۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ اگر ایک گھر میں دو بھائی رہتے ہوں تو وہ باہمی طور پر طے کر لیتے ہیں کہ وہ آپس میں رشتے داری کریں گے جس کے ہاں بھی پہلی بیٹی ہوگی وہ دوسرے بھائی کے بیٹے سے بیاہی جائے گی۔ اس کے لئے کوئی خاص شرائط نہیں ہوتیں۔ مرحلہ نہایت خوش اسلوبی سے طے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ثقافتی رسم یہ ہے کہ لڑکی کی پیدائش کے چھٹے روز اس کے سر پر سرخ دوپٹہ ڈال دیا جاتا ہے، جو منگنی کی علامت ہوتا ہے۔

شلوار میں رشتہ: ایسے خاندان جن میں کئی نسلوں سے باہمی رشتے داری کا رواج ہو اسے شلوار کہا جاتا ہے گو کہ اب یہ رسم بھی کم ہی رہی ہے لیکن آج بھی جھالاوان اور ساراوان کے کئی بڑے قبائل آپس میں شلوار ہیں۔ اس کے لئے ہم نسل یا ہم قبیلہ ہونا لازمی نہیں لیکن قبائلی حیثیت اور قدیم تعلق کو مدنظر ضرور رکھا جاتا ہے اور جیسے کہ خان قلات جام آف لسبیلہ اور وڈھ کا مینگل قبیلہ آج بھی آپس میں باہم شلوار ہیں حالانکہ جام اور مینگل کا نسلی وقبائلی تعلق نہیں ہے لیکن ان کے ہاں باہمی رشتے داریاں برسوں سے چلی آرہی ہیں۔ بعض بڑے قبائل آج بھی خاندان کے بعد دوسری ترجیح شلوار کو ہی دیتے ہیں۔

دولہا اور دلہن کی صفتیں: رشتہ طے پانے سے قبل دونوں اطراف سے لڑکے اور لڑکی کو ٹھونک بجا کر جائزہ لیا جاتا ہے۔ براہوی ثقافت میں ایک اچھے اور قابل قبول دولہا اور دلہن کے لئے غیر تحریری ضابطہ اخلاق موجود ہے۔ اس کے مطابق دولہا میں درج ذیل اہم خصائص کا ہونا لازم ہے۔

۱) زیادہ بڑی عمر کا نہ ہو۔

۲) صحت مند توانا اور خوبصورت ہو۔

۳) محنتی اور خود کمانے والا ہو۔

۴) اچھے اخلاق اور اچھی شہرت کا مالک ہو۔

۵) بری صحبت اور نشے سے دور ہو۔

قدیم عہد میں لمبے بالوں، گھنی، داڑھی، نیزا بازی، گھڑ سواری، بندوق چلانا اور نشانہ بازی بھی اچھے دولہے کے لئے لازمی شرائط ہوا کرتی تھیں۔ وقت اور حالات کے ارتقائی عمل کے نتیجے میں اب ان میں بھی تبدیلیاں آچکی ہیں۔

علاوہ ازیں اچھی دلہن کی شرائط اس سے کہیں زیادہ کڑی ہیں۔ ان میں سے اکثر کو آج بھی لازمی ترین قرار دیا جاتا ہے۔

۱) عصمت مآب ہونا

۲) بہت زیادہ تیز طرار شوخ وشنگ، ضدی اور سبک سر نہ ہو۔

۳) باحیا اور باپردہ ہو۔

۴) گھومنے پھرنے اور سجنے سنورنے کی زیادہ شوقین نہ ہو۔

۵) گھر میں مردوں اور بڑوں کا احترام کرنا جانتی ہو۔

۶) سلائی کڑھائی میں مہارت رکھتی ہو، ہنر مند ہو۔

ان میں سے لازم ترین شرط عورت کی عصمت مآبی ہے۔ خدانخواستہ اگر شوہر کو یہ شک بھی گزرے کہ وہ شادی سے پہلے اپنی عصمت کھو چکی ہے تو ایسی عورت کو سہاگ رات کو ہی قتل کر دیا جاتا ہے یا پھر شوہر اسے طلاق دے دیتا ہے۔ اس لئے مائیں بچپن سے اس حوالے سے لڑکیوں کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ لڑکیاں دس برس کی ہو جائیں تو انہیں لڑکوں کے ساتھ کھیل کود سے منع کر دیا جاتا ہے نیز انہیں ایسے کھیلوں سے بھی روک دیا جاتا ہے جن میں اچھل کود چھلانگ لگانا یا چیخنا چلانا پڑتا ہے۔ دیہات میں پہلے دس برس کی عمر سے بڑی لڑکیوں کو صرف ششک کھیلنے کی اجازت ہوتی تھی۔ یہ مخصوص کھیل ہے جو چھ پتھروں سے لڑکیاں کھیلتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں گڈے گڑیا کا کھیل کھیلنے کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ یہ گڑیاں براہوی مائیں خود پرانے یا کپڑے کے تراشوں سے بناتی ہیں۔ یہ گڑیاں بڑی بڑی اور شاندار ہوتی ہیں۔ اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

ایک براہوی لڑکی کا رشتہ طے ہو جائے تو وہ مارے حیاء کے آئینہ میں اپنا چہرہ نہیں دیکھتی ہے نہ لبوں پر سرخی لگاتی ہے اور نہ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے بناؤ سنگھار سے دور رہتی ہے کیونکہ براہویوں میں مشہور ہے کہ ایک لڑکی کا حسن اپنے شوہر کی امانت ہوتا ہے۔

خاندان سے باہر شادی: براہویوں میں خاندان سے باہر شادی ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ بالخصوص لڑکی والوں کیلئے کیونکہ رشتہ ہمیشہ لڑکے والوں کو مانگنا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کسی والدین کی بیٹی کی عمر شادی کی ہو چکی ہو اور خاندان میں اس کے لئے کوئی مناسب رشتہ موجود نہ ہو تو ان کیلئے اول تو یہ تصور ہی سوہان روح بن جاتا ہے کہ انہیں اپنی بیٹی خاندان سے باہر بیاہنی پڑے گی۔ اور اس کیلئے ان کے پاس صبر علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں عزت و وقار کا اس قدر پاس رکھا جاتا ہے کہ اگر اشاروں، کنایوں میں لڑکی کے والدین سے کوئی بات بھی کرے تو اسے فوراً ہاں نہیں کرنی ہوتی۔ پہلے وہ اپنی رضامندی ظاہر کرے گی، پھر کچھ سوچنے اور اپنے میاں سے مشورہ کرنے کیلئے کچھ وقت مانگے گی اور دو چار چکر لگوانے کے بعد ہی کہیں جا کر رشتہ طے ہوگا۔

لڑکے کے والدین کے لیے یہ سہولت ہوتی ہے کہ وہ ہر محفل میں بیٹے کی تعریف کے ذریعے بالواسطہ طور پر یہ پیغام دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا بیٹا اب شادی کے قابل ہو گیا ہے اور وہ اس کیلئے کسی اچھے سے برے (رشتے) کی تلاش میں ہیں۔ کوئی ایسا گھر جس سے انہیں رشتے کی امید ہوگی۔ لڑکے کی ماں بہنیں بہانوں سے وہاں جا کر بیٹے کا ذکر چھیڑیں گی باتوں باتوں میں اس کی تعریفیں کریں گی۔ زیورات سے لد پھد کر جائیں گی تا کہ یہ احساس دلا سکیں کہ لڑکے کا خاندان کھاتا پیتا ہے۔ غریب عورت اچھے اوصاف کے بیان پر اکتفا کرے گی۔ یوں اگر لڑکی والوں کی طرف سے ذرا بھی رضامندی کا اشارہ پائے گی تو فوراً رشتے کی بات چھیڑے گی اور اگر اسے یہ احساس ہوا کہ لڑکی والے اس رشتے میں دلچسپی نہیں رکھتے تو فوراً اپنی آمد و رفت بند کر دے گی۔

پیغام اول: اشاروں کنایوں میں رضامندی ملنے کے بعد لڑکے کی ماں اپنے خاوند کو مذکورہ رشتے کے بارے میں آگاہ کرتی ہے۔ براہویوں کے ہاں رشتے کے معاملے میں آج بھی بیویاں خاوندوں کی نسبت دونوں طرف سے زیادہ پر اثر ہیں۔ ساری بات چیت اور انتخاب کے مراحل انہی کی طرف سے طے پاتے ہیں۔ مردوں نے فقط رسمی طور پر ملاقات کرنی ہوتی ہے۔ بہر حال باقاعدہ رشتہ مانگنے کے لئے خاندان کے چند بڑے بزرگوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر ایسے قریبی عزیز و اقارب بھی ثالثی کا کردار ادا کر سکتے ہیں جو دونوں خاندانوں کو جانتے ہوں یا ان سے قربت رکھتے ہوں۔ لڑکی والے پہلے پیغام پر کبھی بھی ہاں نہیں کرتے۔ سوچنے کے لئے وقت مانگا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ آپس میں مشورہ کریں گے اور انہوں نے جب باہمی مشورے سے کچھ طے کر لیا تو خود ہی لڑکے والوں کو مطلع کریں گے۔

لڑکی والوں کا باہمی مشورہ: اس کے بعد لڑکی کا باپ اپنے خاندان کے قریبی عزیز جیسے کہ بھائی، چچازاد یا بڑے بیٹے جو گھر میں ہوں، سے مشورہ کرے گا،

بلوچستان کی روایتی انداز میں بنی مسجد میں چند عبادت گزار

اکثر یہ کام بھی گھر کی بڑی بوڑھی عورتیں ہی طے کرتی ہیں۔ اب اگر لڑکی والے رضامند ہوں گے تو کسی قریبی عزیز و اقارب کے ذریعے اپنی رضامندی کا پیغام بھجوائیں گے یا گھر کی کوئی عورت جا کر لڑکے والوں کو بتائے گی کہ لڑکی والے رشتے پر راضی ہیں۔ لڑکے والے اب باضابطہ رشتہ مانگنے آسکتے ہیں۔ اور اگر بالخصوص لڑکی والے رضامند نہ ہوں تو خاموش ہو جاتے ہیں اور کوئی جواب نہیں دیتے۔ عموماً اس خاموشی کو انکار سمجھ لیا جاتا ہے اور لڑکے والے آئندہ پیش رفت نہیں کرتے۔

دوسرا پھیرا: رضامندی کا بالواسطہ پیغام ملنے کے بعد لڑکے والے باقاعدہ تیار ہو کر باضابطہ طور پر لڑکی کا ہاتھ مانگنے آتے ہیں۔ لڑکی والے ان کا پرتپاک استقبال کرتے ہیں۔ چائے یا شربت سے ان کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ روایتی حال احوال ہوتا ہے۔ اب رشتے کی شرائط کے مراحل طے ہوتے ہیں جسے دونوں خاندانوں کے بزرگ طے کرتے ہیں۔ لڑکی والوں کی طرف سے اکثر "لب" کے عوض بھاری رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے پھر اس میں یوں کمی ہونا شروع ہوتی ہے کہ کچھ رقم ''میڑھ'' کے نام پر چھوڑی جاتی ہے۔ کچھ رقم بعض بزرگ یا ساتھ جانے والے سید اپنے نام پر کم کرواتے ہیں۔ یوں ہوتے ہوتے رقم ایک معقول حد تک آپہنچتی ہے۔ جو دونوں فریقین کے لئے قابل قبول ہوتی ہے۔ اب لڑکی والے لڑکے والوں کو تاریخ دیتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو آکر آپ دعائے خیر پڑھ سکتے ہیں۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ اب لڑکی فلاں لڑکے کے نام ہو چکی۔

منگنی کی رسم: لڑکی والوں کی طرف سے ایک بار رضامندی کا مطلب منگنی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ منگنی طے پا چکی ہے لیکن منگنی کی باقاعدہ رسم الگ سے ہوتی ہے۔ اس موقع پر اتنی بڑی تقریب کا اہتمام ہوتا ہے کہ اسے آدھی شادی کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کیلئے انگوٹھی، ریشمی دوپٹہ، ایک عدد جوڑا اور ایک بھرپور ضیافت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دور دراز کے رشتے داروں کو بلایا جاتا ہے اور ایک بڑی تقریب منعقد ہوتی ہے۔ جس کے اہتمام کی تمام تر ذمہ داری لڑکے والوں پہ ہوتی ہے۔ البتہ لڑکی والوں کی طرف سے مقرر کردہ ایک فرد کو بلوایا جاتا ہے جو تمام اشیاء کی خرید و فروخت میں ساتھ رہتا ہے، اس کا کام دیکھنا ہوتا ہے۔ کہ تمام چیزیں اور انتظامات درست اور مکمل ہیں ایسے شخص کو ''کال خواہ'' کہتے ہیں۔

ایک اہم بات یہ کہ منگنی طے پا جانے کے بعد بعض تحائف کی ترسیل لڑکے والوں کے فرائض میں شامل ہو جاتی ہے جیسے کہ عیدین کے موقع پر لڑکی کے لئے نئے کپڑے، جوتے اور دیگر سامان آرائش وغیرہ۔ اگر لڑکے والے ایسا نہ کریں یا ان کی طرف سے کوئی کمی رہ جائے تو برادری میں انہیں طنز و تشنیع کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور سارے خاندان میں ان کی ہتک ہوتی ہے۔

لڑکے کی ماں کا تحفہ: منگنی کے لئے جب لوگ گھر میں آئیں تو لڑکی جا کر چھپ جاتی ہے اس کی ہم عمر سہیلیاں اسے گھیر لیتی ہیں اور چھیڑ خانی کر کے اسے خوب تنگ کرتی ہیں۔ لڑکے کی ماں بطور تحفہ کچھ مٹھائی، ریشمی دوپٹہ اور ایک انگشتری ساتھ لے آتی ہے۔ لڑکی والوں کے ہاں ان کا پرتپاک استقبال ہوتا ہے۔ لڑکے والوں کی طرف سے آنے والی خواتین لڑکی کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہیں۔ لڑکی کی ماں لڑکی کے پاس آتی ہے۔ لڑکے کی ماں بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ لڑکی نہایت شرما رہی ہوتی ہے۔ اس کے رخ پر دوپٹہ ڈال کر اسے جھرمٹ میں لایا جاتا ہے۔ جہاں لڑکے کی ماں آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے۔ اب عورتیں اس کی خوب تعریف کرتی ہیں اور دعائیں دیتی ہیں۔ لڑکی شرم سے دہری ہوئی جاتی ہے اور جب انگوٹھی پہنانے کیلئے اس سے ہاتھ آگے کرنے کو کہا جاتا ہے تو وہ بہت شرم اور جھجک کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بالآخر اس کی ماں اس کے ہاتھ سے پکڑ آگے بڑھاتی ہے۔ لڑکے کی ماں اس کی انگلی میں انگوٹھی پہناتی ہے۔ ہر طرف سے مبارکباد کی صدائیں آنے لگتی ہیں۔ دعائیں دی جاتی ہیں اور پھر خواتین شادی بیاہ کے مخصوص گیت گانے لگتی ہیں۔ لڑکے کی ماں اپنے ساتھ لائی ہوئی مٹھائی مہمانوں میں تقسیم کرتی ہے۔

پاوازی: اس رسم کو خالص براہویوں کی رسم نہیں مانا جاتا۔ خیال ہے کہ یہ رسم انہوں نے افغانوں سے لی لیکن اب تو یہ براہویوں میں بھی متروک ہو چکی ہے اس میں ہوتا یہ تھا کہ رشتہ طے پا جانے کے بعد لڑکی کی ماں ایک دن مقرر کر کے چند محدود مہمانوں کو بلواتی، شیرینی، اخروٹ، ناریل اور طرح کے پکوان تیار کرواتی اور پھر اپنے ہونے والے داماد کو پیغام بھجواتی کہ وہ اس سے ملنے آئے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ لڑکی والوں کے یہاں جاتا اور جب یہ تمام چیزیں اس کے سامنے پیش ہو چکی ہوتیں اور وہ انہیں کھا لیتا تو اسے لڑکی کی ماں تنہائی میں ملنے کو طلب کرتی۔ وہ اس کے سر اور ہاتھ کا بوسہ لیتی، لڑکا اپنی ہونے والی خوش دامن کا محض ہاتھ چومتا۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھتا۔ اور پھر دعائیں لے کر دوستوں کے ساتھ باہر آکر بیٹھتا جہاں گھر کا کوئی نوکر یا فرد ایک طشت میں کچھ مٹھائی لے کر حاضر ہوتا۔ لڑکے کے دوست مٹھائی اٹھا لیتے اور پھر اس کے عوض خالی طشت میں کچھ رقم رکھ دیتے۔ یہ لازم ہوتا تھا کہ رقم طشت پر رکھے ہوئے رومال کی قیمت سے زیادہ ہو یہ رقم مٹھائی لانے والے کا نذرانہ ہوتی۔ اس رومال کو کیسہ کہتے اور اس موقع پر جو رقم لڑکے والوں کی طرف سے

جورقم دی جاتی اسے دروئی کہا جاتا اور اس تقریب ملاقات کا نام پاوازی اس لئے پڑا کہ اس سے مراد پاؤں کھولنا ہے۔ کیونکہ اس تقریب کے بعد ہی لڑکے کو یہ اجازت ہوتی کہ وہ جب چاہے اپنی منگیتر کے گھر آسکتا ہے۔

منگیتر سے پردہ: یہ رسم آج بھی بلوچستان کے پورے سماج میں ثقافتی سطح پر موجود ہے۔ براہوی قبائل میں بھی اس پر سختی سے عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ رشتہ طے پانے اور منگنی ہوجانے کے بعد لڑکی کیلئے اپنے منگیتر سے پردہ بے حد لازمی ہوتا ہے۔ یہ اس کے ضابطہ اخلاق کا حصہ ہے۔ دیہات میں آج بھی لڑکیاں اپنے منگیتر کا نام محفل میں لئے جانے پر شرما جاتی ہیں لیکن پردے کا رواج شہروں کی حد تک بھی قائم ہے۔ لڑکا اگر ہونے والے سسرال کے گھر چلا جائے یا خاندان کی کسی تقریب میں آمنا سامنا ہو تو بھی لڑکی کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ ہر ممکن حد تک منگیتر سے پردہ کرنے کی کوشش کرے اگر بالفرض کہیں دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر پڑ بھی جائیں تو لڑکی کی ماں آنکھیں نکال کر اپنے غصے کا اظہار کرتی ہے۔ یہ اس بات کا پیغام ہوتا ہے کہ وہ (لڑکی) فوراً پردہ کرلے۔

پردے کی پاسداری لڑکے کیلئے بھی لازمی ہوتی ہے مگر وہ اپنی منگیتر کو دیکھنے کی خواہش ضرور رکھتا ہے اور چوری چھپے اس کی کوشش بھی کرتا ہے۔ لیکن بڑے بوڑھوں کی خفگی کا ڈر اس کی راہ میں حائل رہتا ہے۔

براہویوں میں جب کسی لڑکے کی ایک بار کسی لڑکی سے منگنی طے ہوجائے تو اسے ہر صورت میں اس کو نبھانا ہوتا ہے اس رسم کو ''پلفوٹ'' کہتے ہیں۔ اس کی ہر قیمت پر پاسداری کرنی ہوتی ہے۔

گو کہ وقت اور حالات نے اب ان میں سے کئی رسموں کو متروک کر ڈالا ہے۔ اور بعض کی ہیئت اب تبدیل ہوچکی ہے۔ اور وہ اپنی کلاسیکل ثقافتی شکل وصورت اور حیثیت کھو بیٹھی ہیں۔ لیکن آج بھی اگر آپ کو ان رسموں اور براہوی ثقافت کی اصل جھلک دیکھنی ہو تو جھالاوان کے دیہات میں چلے جائیں جہاں یہ ثقافتی عناصر اپنی مکمل شیرینی اور دلفریب آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔

شادی

گڈبری: شادی کی مقررہ تاریخ سے تقریباً ایک ماہ قبل ''گڈبری'' کی رسم ہوتی ہے۔ اس میں لڑکی اور لڑکے کے جہیز کے کپڑے سینے کیلئے دونوں کے عزیز واقارب اور اڑوس پڑوس کی عورتوں کو لڑکے کے گھر میں مدعو کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہفتہ اور منگل کا دن ناموزوں سمجھا جاتا ہے۔ عموماً چاند کی آخری تاریخوں میں سے کوئی مناسب دن رکھا جاتا ہے۔ اس تقریب میں شرکت کیلئے وہ آنے والی خواتین اپنے ساتھ مٹھائی لاتی ہیں۔ جب سب عورتیں جمع ہوجاتی ہیں تو ایک ایسی سہاگن جو متعدد بچوں کی ماں ہو، اُسے دُلہا دلہن کے جہیز کے کپڑے سینے کیلئے انہیں کاٹنے کی ابتداء کرنے کو کہا جاتا ہے، عموماً اس تقریب میں کسی بیوہ کو مدعو نہیں کیا جاتا' اس رسم کی ادائیگی کوئی سہاگن ہی کرتی ہے تاکہ دلہن کا سہاگ قائم رہے۔

نسبتاً بڑی عمر کی ایک سہاگن بسم اللہ کہہ کر پہلے دلہن کا کپڑا اٹھاتی ہے اور پھر دولہا کا۔ اس کے بعد ناپنے اور تراشنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کچھ عورتیں ڈھول بجاتی اور مخصوص ثقافتی گیت ''ہلوہالو، ہلوہالو'' گاتی رہتی ہیں۔ کپڑا تراشتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اس کے ایک تار کو بھی آگ نہ چھوئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے دولہا دلہن کی زندگی پر ناخوشگوار اثر پڑے گا۔ جب لباس تراشنے کا عمل مکمل ہوجاتا ہے تو قریبی رشتہ دار عورتیں ایک ایک جوڑا سلائی کے لئے اٹھالیتی ہیں اور اس وعدے کے ساتھ لے جاتی ہیں کہ وہ شادی کے دن اسے سی کر لائیں گی یہ کام وہ رضاکارانہ طور پر بلا معاوضہ سرانجام دیتی ہیں اور اگر اس کے بعد بھی کچھ کپڑا باقی بچ جائے تو اس کی سلائی دولہے کی ماں کو خود کرنی پڑتی ہے۔

اس دوران لڑکے کی ماں کے ساتھ خوب چھیڑ خانی کی جاتی ہے۔ آنے والی خواتین کے لئے ضیافت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور لڑکے کی ماں ان خوش گپیوں سے خوب لطف اندوز ہوتی ہے۔ اس مذاق کے دوران ہونے والی جملہ بازی نہایت دلچسپ ہوتی ہے۔

بہرام خواہنگ: لڑکی اگر بالغ ہوچکی ہو تو شادی میں تاخیر نہیں کی جاتی۔ ماسوائے اس کے کہ لڑکے یا لڑکی والوں کے ہاں مقررہ تاریخ سے قبل کوئی وفات پاجائے تو اس صورت میں کم از کم چالیسویں تک یا اس سے بھی زائد ایام تک شادی التوا میں پڑجاتی ہے۔

پھر جب تمام تیاریاں مکمل ہوچکی ہوتی ہیں تو لڑکے والے قریبی عزیز و اقارب کو گھر پر جمع کرتے ہیں۔ بالخصوص بڑے بوڑھوں اور سید خاندانوں کو بلایا جاتا ہے جنہیں لڑکی والوں کی طرف شادی کی تاریخ کی باضابطہ اجازت لینے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اس رسم کو ''بہرام خواہنگ'' کہتے ہیں۔

سید اور خاندان کے بزرگ افراد لڑکی والوں کے ہاں پہنچتے ہیں تو ان کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ خاطر تواضع کی جاتی ہے اور پھر سید لڑکی والوں کے بزرگوں یا لڑکی کے والد سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ فلاں اپنے بیٹے کی شادی کا آرزومند ہے۔ اس نے ہمیں اپنا وکیل یا ولی بنا کر بھیجا ہے۔ اب آپ کی کیا مرضی ہے؟ کیا

آپ کی رائے میں لڑکے کی شادی اس موسم میں کرنا مناسب ہوگی؟ اور شادی کے اخراجات کا آپ کی نظر میں تخمینہ کیا ہے؟ کیونکہ شادی کے تمام تر اخراجات کی ذمہ داری لڑکے والوں کے سر ہوتی ہے۔

لڑکی والوں کی طرف سے ان کا نمائندہ جواباً انہیں خوش آمدید کہتا ہے اور کہے گا کہ لڑکی تو اب آپ کی ہی ہے جب آپ مناسب سمجھیں بارات لے آئیں۔ اس موقع پر مشہور مثل کا حوالے دیا جاتا ہے کہ "غلہ آخر چکی میں جاتا ہے" اور پھر وہ شادی کے اخراجات کے حوالے سے کہتے ہیں کہ جیسے کہ لڑکی والوں کا خاندان بہت بڑا ہے سنگت ساتھی بھی دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے شادی میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ مگر لڑکے والے کہتے ہیں کہ پھر بھی مصارف کا ایک تخمینہ لگایا جائے تا کہ سہولت رہے اور پھر بعد بالآخر تھوڑے بہت بحث ومباحثے کے بعد وہ اخراجات کا تعین کر لیتے ہیں جو چیزیں لڑکی والوں کے ہاں لڑکے والوں کی طرف سے بھجوانی ہوتی ہیں، ان کا بھی تعین کر لیا جاتا ہے۔ یہ گویا شادی کی تقریبات کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔

بجار: ماضی میں یوں ہوتا تھا کہ شادی کی تاریخ اور مصارف کا تخمینہ طے پا جانے کے بعد لڑکے کا والد ان مصارف کے لئے درکار مطلوبہ رقم جمع کرنے میں لگ جاتا۔ کچھ غلہ اور رقم قرض لے لیتا۔ جھالاوان میں یہ رسم تھی کہ عزیز واقارب اور قبیلے کا فرد گھر گھر جا کر شادی کیلئے عطیہ کا مطالبہ کرتے۔ اس رسم کو "بجار" کہا جاتا۔ یہ بجار در اصل ایک طرح کا قرض ہوتا تھا کیونکہ ایک روز بجار دینے والے کو بھی بجار لینے کیلئے نکلنا پڑتا تھا۔ بجار میں ملنے والی رقم اسی مقدار میں یا اسے کچھ بڑھا کر واپس کی جاتی۔

بعض مورخ یہ کہتے ہیں کہ بجار محض شادی کے موقع پر امداد کے طور پر لی جانے والی رقم کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ فرد کبھی بھی متعدد تقریبات کے علاوہ محض ضرورت کے تحت بھی اپنے قبیلے سے بجار طلب کرتا تھا۔ یہ در اصل امداد باہمی کے طور پر کسی بھی مقصد کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے کا ایک روایتی طریقہ ہے۔

آرتی: لڑکے والے جب تمام مصارف کا اہتمام کر لیتے ہیں تو پھر ایک دن مقرر کر کے لڑکی والوں کی طرف جاتے ہیں۔ اس مرتبہ وہ جلوس کی صورت میں ڈھول بجاتے ہوئے لڑکی والوں کے ہاں جاتے ہیں۔ ماضی میں اس روانگی سے قبل بھیڑوں کا ایک غلہ لڑکی والوں کے ہاں بھیجا جاتا تھا جسے "جلب" کہتے تھے۔ جبکہ دوسرا سامان و اسباب اونٹ پر یا دوسری سواری پر لاد کر لے جاتے تھے۔ اس لدے ہوئے اسباب کو آرتی کہتے تھے۔ ماضی میں ایک اور رسم کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس کے مطابق نوجوان مٹھی بھر آٹا لے کر جلوس میں شامل لوگوں پر پھینکتے تھے۔ اسے "بکی" کا نام دیا جاتا تھا۔ بکی کا آٹا سات سہاگنیں مل کر پیستی تھیں اور یہ خود ایک تقریب ہوا کرتی تھی۔

جبکہ نصیر آباد اور سبی کے میدانی علاقوں میں بکی شادی سے قبل شادی کے سلسلے میں ہونے والی تقریب کو کہا جاتا ہے۔

گدا اور قلعہ پہنچانا: اسی رات لڑکے کی ماں کچھ عورتوں کو ساتھ لے کر لڑکی کے گھر جاتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک گدا (توشک) اور ایک لمبا سرخ کپڑا لے جاتی ہے جسے قلعہ کہتے ہیں۔ جب وہ لڑکی کے گھر پہنچتی ہے تو اندر سے دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ بڑی منت سماجت کے بعد کوئی شرط پوری کرنے کے عوض دروازہ کھولا جاتا ہے تو لڑکے کی ماں اور اس کے ساتھ آئی ہوئی عورتیں کمرے کے اندر ہلو ہالو گاتی ہوئی داخل ہوتی ہیں۔ کمرے میں تین چار سہیلیوں کے جھرمٹ میں دلہن بیٹھی ہوتی ہے۔ ان سہیلیوں کو "جانی" کہا جاتا ہے بعض علاقوں میں بلوچی لفظ "دست گہار" یعنی "دسی بہن" بھی بولتے ہیں۔ یہ "جانیاں" دلہن کو مانجھا میں بیٹھنے کے بعد سے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں۔ چھوڑتیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس طرح اس پر کسی بدروح یا جن کا سایہ نہ پڑ جائے۔ یوں لڑکے والیاں وہاں ایک پردہ لٹکا دیتی ہیں۔ اور گدے (توشک) پر لڑکی کو بٹھا دیتی ہیں۔ ماضی میں اس کے کھانے کے لئے خاص طور پر چینی اور گھی گندم کی روٹی میں ملا کر ایک غذا دی جاتی تھی (یہ چوری سے مشابہ ہوتی ہے)۔ براہوی میں اسے حالستہ (مالیدہ) کہتے ہیں۔ دولہا کو بھی یہی غذا دی جاتی۔ شادی کے دن سے قبل تک اسے گوشت کھانے نہیں۔ دیا جاتا بڑی بوڑھیوں کا خیال ہے کہ ان ایام میں گوشت کھانے سے دولہا دلہن کے مابین پھوٹ پڑتی ہے۔

دلہن کی مہندی: اگلی صبح دلہن کو مہندی لگانے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اسے دزی حنام کہتے ہیں۔ اس رسم میں خاندان کے افراد اور بہت قریبی احباب شرکت کرتے ہیں۔ دولہا کی ماں دلہن کے لئے پسی ہوئی مہندی لاتی ہے۔ اس کے ساتھ ڈومب ڈھول بجاتا ہوا اور عورتیں گیت گاتے ہوئے آتی ہیں۔ دلہن اس گدے پر بیٹھی ہوتی ہے جو گزشتہ شب دولہے کی ماں دے گئی ہوتی ہے۔ قلعہ کا پردہ گرا ہوتا ہے اور دلہن کی "جانیاں" اس کے پاس بیٹھی ہوتی ہیں۔ دولہے کی ماں مہندی لگانے کیلئے آگے بڑھتی ہے تو از راہ مذاق اسے تنگ کرنے کیلئے دلہن کی جانیاں اس کا راستہ روک لیتی ہیں اور مزاحمت کرتی ہیں۔ اس کھینچا تانی میں بالآخر وہ دلہن تک پہنچتی ہے۔ دلہن مہندی لگوانے میں شرم کا مظاہرہ کرتی ہے۔ لڑکے کی ماں اسے ترغیب دے کر مہندی لگوانے پر راضی کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اب کوئی سہاگن آگے بڑھ کر اسے مہندی لگاتی ہے۔ مہندی لگانے کا آغاز ہمیشہ دائیں ہاتھ سے کیا جاتا ہے

ر پاؤں پر ختم ہوتا ہے۔اس ترغیب کو بطور خاص ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔اس کے بعد ہندی کی طشتری دوسری عورتوں کو باری باری پیش کی جاتی ہے اور سب اپنے ہاتھوں پر ہندی لگاتی ہیں۔لیکن نوجوان لڑکیاں ڈھیر ساری مہندی اٹھالیتی ہیں۔اور ازراہ مذاق ر کے کی ماں اور بہنوں پر مزاحمت کے باوجود لگانے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔

دلہن کو چند گھنٹے مہندی لگائے رکھنی پڑتی ہے تاکہ ہتھیلی پر رنگ جم سکے۔ س دوران دلہن کی کوئی جانی یا خادمہ ہر وقت اس کے پاس رہتی ہے کہ کہیں۔کوئی عاسد اس کے ہاتھ یا پاؤں کی مہندی کا کوئی حصہ آگ میں ڈالنے کیلئے نکال نہ لے۔ کیونکہ یہ تو ہم پایا جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے دولہا اور دلہن کے درمیان محبت پروان ہیں۔چڑھتی اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔اور جب ہندی اتارنے کا وقت ہوتا ہے۔تو دلہن کے ہاتھ پاؤں سے مہندی احتیاط سے اتار کر جمع کرلی جاتی ہے اور پھر بہتے چشمے میں اسے بہادیا جاتا ہے۔

ولہا کی مہندی: اس کے بعد دلہن کی ماں کچھ عورتوں کے ساتھ مہندی لے کر لہا کے گھر جاتی ہے۔پردے کا رواج ہو تو وہ مردوں کی مجلس میں نہیں جاتی۔کوئی ڈومب خادمہ یا کوئی بوڑھی عورت مہندی لے کر مردوں کی مجلس میں جاتی ہے، جہاں دولہا تخت بیٹھا ہوتا ہے۔وہ قبلہ رو یا بطرف شمال منہ کر کے بیٹھتا ہے۔شمال کی طرف منہ کرنا بہتر ل کیا جاتا ہے۔مہندی آتے ہی اہل مجلس دعا کیلئے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں خدا دولہا دلہن کی جوڑی سلامت رکھے۔انہیں خوش رکھے۔ان کی عمر دراز ہو۔پھر ئی بخت آور اور بال بچہ دار بزرگ بسم اللہ کہہ کر دولہے کے ہاتھوں اور دونوں پاؤں تلوؤں پر مہندی لگاتا ہے اور نوشہ دلہن کی طرح مزاحمت نہیں کرتا اور بخوشی مہندی اتا ہے۔واضح رہے کہ اس دن سے شادی کے دن تک اسے بادشاہ کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد باری باری تمام لوگوں کے سامنے مہندی کا قاب لایا جاتا ہے جب قاب نوجوانوں کے قریب آتا ہے تو وہ ڈھیر ساری مہندی اٹھالیتے ہیں۔اور لہے کے والد بھائیوں اور چچاؤں کی داڑھیوں پر ان کی مزاحمت کے باوجود مہندی پینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔اور جب مہندی سب میں تقسیم ہوچکی ہوتی ہے تو ی کا برتن دلہن کی ماں کو کچھ رقم دے کر بھیج دیا جاتا ہے۔نوشہ کو کچھ گھنٹے تک مہندی ئے رکھنی پڑتی ہے۔یہاں بھی اس وہم کے تحت شہہ بالا (دولہا یعنی بادشاہ کا مقرر کردہ جو اس کا قریبی دوست یا عزیز ہوتا ہے) اور دوسرے لوگ نگرانی کے طور پر اس کے قریب درہتے ہیں۔اور پھر جب مہندی خشک ہوجاتی ہے تو اسے احتیاط سے اتار کر رواں میں بہادیا جاتا ہے اس اثناء میں مالستہ (مالیدہ) سے بھرا قاب دلہن والوں کی طرف سے آتا ہے اور نوشہ اپنے بعض دوستوں کے ساتھ اسے مزے لے لے کر کھاتا ہے اور پھر کچھ رقم اس میں ڈال کر لڑکی والوں کو لوٹا دیتا ہے۔یہ رقم دلہن کی ماں کی ہوتی ہے۔

دلہن کی سجاوٹ: بعد از ظہر لوڑی (ڈومب) ڈھول بجا کر یہ پیغام دیتا ہے کہ اب لڑکی کو مانجے سے اُٹھانے کا وقت ہوگیا ہے۔لڑکی کو مانجے سے اٹھا کر غسل کرایا جاتا ہے اور اس کے بعد اسے اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں عورتیں جمع ہوتی ہیں۔پھر اسے ''قلعہ'' میں بٹھادیا جاتا ہے۔پھر ڈومب عورت آگے بڑھتی ہے اور اس کے بال سنوارنا شروع کرتی ہے۔اس سجاوٹ میں دو چار گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔شام ڈھلتی ہے تو لوڑی ایک بار پھر شادمانی کا تال دیتا ہے جسے سنتے ہی کچھ سہاگنیں دلہن کو قلعہ سے نکالنے کے لیے جمع ہوتی ہیں۔ایسے میں بھولے سے بھی کسی بیوہ کو قریب آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔اس موقع پر دلہن کا لباس سرخ ہو تو اسے پسند کیا جاتا ہے۔کوئی اور رنگ بھی ہو تو قمیص کا دامن سلا ہوتا ہے اور شادی کے تیسرے دن تک اسے ان سلا ہی رکھا جاتا ہے۔کیونکہ خیال کیا جاتا ہے کہ سلا ہوا دامن دولہا کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔

دولہا کی سجاوٹ: دلہن کو سنوارنے کا کام مکمل ہوتا ہے تو پھر عورتیں دولہے کا شاہانہ لباس اور ایک طشتری میں میٹ (سوندھی مٹی) اور عطریات لے کر لڑکے والے کے گھر روانہ ہوتی ہیں۔وہ ''ہلوہالو'' گاتی ہوئی جاتی ہیں۔اس دوران ڈھول بجتا رہتا ہے۔ڈھول کی آواز سن کر نوشہ شہہ بالا اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ اٹھتے ہیں۔اسے ایک پتھر یا لکڑی کی پیڑھی پر بٹھادیا جاتا ہے۔کوئی بال بچے دار شخص جس کی ازدواجی زندگی بھی پرمسرت ہو، اسے لڑکے کو غسل دینے کیلئے کہا جاتا ہے۔وہ ڈومب کے ہاتھ سے میٹ کی طشتری لے کر نوشہ کے سامنے رکھتا ہے اور بسم اللہ کہتے ہوئے طشتری سے میٹ اٹھا کر نوشہ کے سر میں لگاتا ہے اور اسے مغرب کی جانب اچھال دیتا ہے۔اس طرح وہ چار مرتبہ میٹ لگا کر چاروں سمت میں پھینکتا ہے۔اس کے بعد وہ نوشہ کی لانبی زلفوں کو دھوتا ہے کیونکہ نوشہ کو اپنا سر کو دھونے نہیں دیا جاتا۔ جب سر دھو دیا جاتا ہے تو ہر محبت کرنے والا نوشہ کے بدن کو ہاتھ سے مل مل کر دھوتا ہے اور اسے غسل دیتا ہے۔جب غسل مکمل ہوتا ہے تو دلہن کی ماں اس کے لئے کپڑے لے کر آتی ہے۔پہلے اسے قمیص پہنائی جاتی ہے اور پھر شلوار۔اس کے بعد نوشہ سر جھکاتا ہے اور کوئی سید خاندان کا معزز شخص اسے پگڑی باندھتا ہے۔اس کے بعد اسے واسکٹ پہنائی جاتی ہے۔شانے پر لنگی (بڑا رومال) رکھا جاتا ہے پھر اس کا جوتہ لا کر اس کے سامنے رکھا جاتا ہے۔

ماضی میں نوشہ کا اترن براتیوں کے حصے میں آتا تھا بالخصوص یہ ڈھول

بجانے والا کڑوی کو دے دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد نوشہ کو لے جا کر ''تخت'' پر بٹھا دیا جاتا ہے کیونکہ اس گھڑی وہ بادشاہ ہوتا ہے۔

توہمات: ماضی میں ان مواقع پر بعض توہمات کو بطور خاص مدنظر رکھا جاتا جیسے کہ جب دولہے کو شلوار پہنائی جاتی تو بعض لوگ چیخ کر کہتے کہ اس کی شلوار کو ایک بار الٹا کر کے سیدھا کیا جائے اور پھر دولہے کو پہنائی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کرنے سے جادو ٹونے کا اثر زائل ہو جاتا ہے جو خصوصاً شب عروسی میں عملِ رجولیت سے قاصر رکھنے کے سحر کا خدشہ ہوتا ہے جو اس عمل سے زائل ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں بعض علاقوں میں یہ رسم تھی کہ جب دولہا جوتہ پہننے لگتا تو جوتے کے اندر تھوڑی سی جواری ڈال دی جاتی جسے وہ اسی طرح پہن لیتا تھا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ ٹوٹکا سے وہ دولت مند بھی ہوگا اور اسے اولاد بھی خوب ہوگی۔ روایت ہے کہ وہ جوتا پہننے کے بعد اسے اتارتا نہیں۔ خواہ قالین کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو وہ جوتہ پہنے اس پر چلتا اور گھر ''کوہ بر'' حجلہ عروسی میں پہنچ کر لیٹنے کے بعد جوتا اتارتا ہے جبکہ وہ تخلیہ میں دلہن کے ساتھ ہوتا ہے۔

شنگی و سرگشت: اس کے بعد نوشہ کو شادی گاہ میں لایا جاتا ہے اور اسے تخت پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ حسب معمول اس کی پشت پر شہہ بالا کھڑا ہوتا ہے اور پھر خاندان کا ہر فرد مٹھی بھر مٹھائی لے کر اس کے سر کے گرد وار کر کے لٹاتا ہے۔ اس رسم کو ''شنگی'' کہتے ہیں۔ پھر لوگ فرداً فرداً، باری باری آتے ہیں اور نوشہ کے سامنے کھڑے معتبر شخص کو کچھ رقم پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ رقم لے کر نوشہ کے سر کے گرد تین بار وار کر کے بہ آواز بلند کہتا ہے ''یہ روپے ہیں جو فلاں شخص نے دیئے ہیں۔'' اسے ''سرگشت'' کہتے ہیں۔ اور یہ رسم اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک تمام لوگ باری باری آ کر کچھ رقم دولہا پر نچھاور نہیں کرتے۔

دولہا کا بناؤ سنگھار: اس کے بعد کوئی ڈومب یا خادمہ آئینہ، تیل، سرمہ اور مزداک (اخروٹ کی چھال) ایک طشت میں لے کر آتی ہے اور نوشہ کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ نوشہ اپنی زلفوں اور داڑھی میں تیل لگاتا ہے۔ سرمہ سے آنکھوں کو آب دیتا ہے اور مزداک سے لبوں کو سرخ کرتا ہے۔ پھر آئینے میں اپنی صورت کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کا طشت کمرے میں موجود براتیوں کے سامنے باری باری رکھا جاتا ہے۔ اور ہر شخص اپنی زلفوں اور داڑھیوں کو تیل لگا کر تاب دار کرتا ہے۔ نوشہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ لیکن اس کے چاروں اطراف ہنسی مذاق، خوش گپیوں اور گانے بجانے کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے یار غار اس پر جملہ بازی کرتے اور اسے چھیڑتے رہتے ہیں۔

دلہن کا بناؤ سنگھار: زنان خانے میں بھی چہل پہل رہتی ہے۔ ڈومنی مختلف رنگوں سے دلہن کی پیشانی رنگنے میں مصروف رہتی ہے۔ وہ سرخ سبز اور زرد رنگوں کا استعمال کرتی ہے لیکن ہرگز ہرگز سیاہ رنگ استعمال نہیں کرتی۔ جب تک نوشہ کے حوالے نہیں کی جاتی۔ دلہن نہ آنکھ کھول سکتی ہے نہ کچھ بول سکتی ہے۔ وہ منہ کئے اور ایک رومال سے منہ چھپائے بیٹھی رہتی ہے۔ اس کی جانیاں اس کے گرد حلقہ بنائے بیٹھی رہتی ہیں۔ اس کی خدمت کرتی ہیں۔ ایک بوڑھی عورت اس کے قریب بیٹھی ہوئی اچھی اچھی باتوں اور نصیحتوں سے چپکے چپکے اسے تشفی و دلاسہ دیتی ہیں۔ وہ بالکل سرگوشیانہ لہجے میں دلہن کے کان میں کچھ پھونکتی رہتی ہے لیکن جیسے ہی دلہن کو زیور پہنایا جانے لگتا ہے بوڑھی عورت از راہ تفنن بہ آواز بلند بولنے لگتی ہے وہ پوچھتی ہے۔ یہ زیور اور وہ جواہر دولہا نے دیا ہے یا اس کے باوا (باپ) نے، اور پھر عورتوں میں مشورہ ہونے لگتا ہے کہ پہلے وہ دلہن کو سونے کی انگوٹھی پہنائیں یا کوئی اور نگینہ جڑی انگوٹھی تا کہ اس کا حسن دوبالا ہو جائے۔

اجابت کی گھڑی: جب دلہن کا بناؤ سنگھار ہو چکا ہو تو اسے ایک بڑے گدے پر بٹھا دیا جاتا ہے اور اس پر شنگی نچھاور کی جاتی ہے۔ سرگشت کی رسم بھی اسی طرح ادا ہوتی ہے جیسے کہ نوشہ کیلئے ہوتی ہے پھر ایسی تمام عورتیں جن کی لڑکیاں کنواری اور غیر شادی شدہ ہوتی ہیں۔ دلہن کی ٹک یعنی اس کی پیشانی پر لگی بندیا کو چھو کر دعا مانگتی ہیں۔ "اے خدا! جب تک ہم یہ بندیا اپنی پیشانی پر لگائے ہوئے ہیں۔ (یعنی سہاگن ہیں) ہمیں اتنی عمر عطا فرما کہ ہم اپنی لڑکیوں کو بھی شادی کی بندیا لگائے دیکھ سکیں"۔ عورتیں اس گھڑی کو اجابت کی گھڑی سمجھتی ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس وقت خدا سے جو بھی مراد مانگی جائے، پوری ہوگی۔

نکاح کے مراحل

دلہن کی اجازت و رضامندی: رات تقریباً دس بجے کے بعد دولہے والے بارات لے کر آتے ہیں۔ ان کے ساتھ نکاح خواں ملا بھی ہوتا ہے۔ نکاح کے وقت معتبرین و معززین میں سے کسی دو کو گواہ بنایا جاتا ہے۔ اور انہیں بطور قاصد زنان خانے میں بھیجا جاتا ہے۔ براہوی میں انہیں ''ربالو'' کہتے ہیں اس کام کیلئے عموماً ذرا چرب زبان قسم کے لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ انہیں اندر جا کر لڑکی سے یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ اس نے اپنا ''نیکا باوا'' (وارث یا مختار) کسے مقرر کیا ہے؟ ادھر

جب زنان خانے میں گواہوں کی آمد کی اطلاع ہوتی ہے۔ فوراً ہی زنان خانے کے دروازے اندر سے بند کر لئے جاتے ہیں۔ گواہ بیچارے باہر منت وسماجت کرتے رہ جاتے ہیں۔ لالچ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن دروازہ نہیں کھلتا اور عورتیں ان پر پھبتیاں کس کر انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ وہ شرمندہ شرمندہ سے مجلس میں واپس آتے ہیں۔ اور دبک کر کونے میں بیٹھ جاتے ہیں تا کہ کسی کی نظر نہ پڑے مگر ان کی تاک میں بیٹھے نوجوان فوراً انہیں جالیتے ہیں۔ اور پوچھتے ہیں۔ ''بولو! کیا پیغام لائے ہو؟'' وہ سر کھجائے ہوئے پشیمانی سے بتاتے ہیں کہ کس طرح ان پر پھبتیاں کسی گئیں لوگ یہ سن کر قہقہے لگا کر ہنستے ہیں اور پھر مذاق اور جملہ بازی ہوتی ہے۔ دونوں گواہ اپنی توہین محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور ایک بار پھر قسمت آزمائی کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر اس بار بھی دروازہ بند ملتا ہے۔ وہ پھر منت سماجت کرتے ہیں۔ اندر سے آواز آتی ہے۔ (جو اکثر لڑکی کی ماں کی ہوتی ہے) کہ.....

جاؤ جاؤ ابھی چمڑا نہیں رنگا گیا ہے۔ (یعنی لڑکی بالغ نہیں ہوئی ہے) اور نہ مزید دو سال تک رنگا جاسکے گا'' یہ جواب سن کر وہ پھر نامراد لوٹتے ہیں۔ ایک بار پھر انہیں حاضرین مجلس کی بزلہ سنجی اور پھبتیوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ بہر کیف وہ تیسری بار دروازے پر آتے ہیں۔ اب کی بار کچھ رعب اور کچھ لالچ سے وہ دروازہ کھلوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اندر داخل ہو کر بھی دونوں کو عورتوں کے مذاق کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ اور پھر آخر کار وہ لڑکی رضامندی جاننے کیلئے قلعہ کے قریب آتے ہیں۔

نیکانا باوا: گواہ قلعہ کے پردے کے قریب آکر عورت کو کلمہ شہادت پڑھنے کیلئے کہتے ہیں۔ وہ نہایت دھیمی آواز میں تعمیل کرتی ہے۔ اس لئے وہ اس سے دوبارہ کلمہ پڑھنے کو کہتے ہیں۔ وہ دوسری مرتبہ پڑھتی ہے۔ مگر گواہ شرارتاً کہتے ہیں کہ صحیح سنائی نہیں دیا پھر پڑھو لہٰذا وہ تیسری دفعہ قدرے بلند آواز میں کلمہ شہادت پڑھتی ہے۔ اور پھر وہ اس سے پوچھتے ہیں کہ ''اماں! تم نے اپنا نیکانا باوا' کسے مقرر کیا ہے؟'' دلہن جواب دیتی ہے۔ کہ اس نے فلاں کو اپنا نیکانا باوا مقرر کیا ہے۔ اکثر دلہن اپنے باپ کی بجائے خاندان کے کسی دوسرے بزرگ کا نام لیتی ہے۔ لیکن اب ایسا لازم نہیں رہا۔

رسوم میں تنوع: مختلف براہوی علاقوں میں یہ رسم تھوڑے بہت فرق کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ کہیں پہ گواہوں کو ذرا سی حیل وحجت کے بعد پہلی بار اندر آنے دیا جاتا ہے۔ کہیں دوسری بار وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ قلات میں پہلی ہی بار میں یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر بار گواہوں کو بہر حال مذاق اور پھبتیوں کا نشانہ ضرور بننا پڑتا ہے۔

گواہوں کی شہادت: گواہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد فوراً مجلس میں پہنچتے ہیں۔ اب کی بار ان کے چہروں پر کامیابی کی خوشی طاری ہوتی ہے۔ اس لئے اب وہ چپکے سے آکر کونے میں بیٹھنے کی بجائے ملا کے سامنے خوش وخرم آکر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ سلام اور مزاج پرسی سے فارغ ہوتے ہیں۔ تو ملا انہیں باری باری اپنی شہادت پیش کرنے کو کہتا ہے۔ پہلے تو وہ مولوی کے ساتھ خوب مذاق کرتے ہیں۔ اور اسے تنگ کرتے ہیں۔ پھر آخر ان میں سے ایک حسب معمول کہتا ہے ''میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام بزرگی خدا کیلئے ہے۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ فلاں فلاں بنت فلاں فلاں نے جس کی کوئی اور بیٹی اس نام کی نہیں ہے، نے فلاں فلاں شخص کو اپنا نیکانا باوا یعنی شادی کیلئے اپنا ولی مقرر کیا ہے۔ پہلا گواہ جب اپنی گواہی دے کر ملا کے پاس سے اٹھتا ہے۔ تو اس کی جگہ دوسرا گواہ لے لیتا ہے۔ وہ بھی انہی الفاظ میں گواہی دیتا ہے۔ اور پھر ملا کے سامنے سے اٹھ کر ایک طرف ہو بیٹھتا ہے۔

مہر کا تصفیہ: اب ''نیکانا باوا'' ملا کے سامنے آکر بیٹھتا ہے۔ اور ملا اس سے رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھتا ہے۔ "اچھا تو جناب اب آپ بتایئے کہ آپ اپنی لڑکی کا حق مہر کیا مقرر کرتے ہیں۔ اور جہیز میں کیا لیں گے؟" نیکانا باوا فخریہ انداز میں کہتا ہے: ''ایک لاکھ سرخ اشرفی اس سے ہرگز کم نہیں۔ اس کے بعد ملا دولہا کی جانب رخ کر کے پوچھتا ہے۔ جس کی نسبت اس کے دائیں پہلو میں ہوتی ہے کہ کیا وہ واقعی اس لڑکی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔ اور اگر جواب اثبات میں ہے۔ تو کیا وہ مطلوبہ مہر ادا کرنے کو تیار ہے۔ اب چونکہ رقم بڑی ہے۔ اس لئے دولہا اس بات کو سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ لہٰذا ملا دوبارہ سوال دہراتا ہے۔ اب کوئی چرب زبان دولہا کی جانب سے خود کو وکالت کیلئے پیش کرتا ہے۔ اور نیکانا باوا اور اس کے درمیان اچھی خاصی بحث وتمحیص شروع ہو جاتی ہے۔ اور وہ مردانہ وار وکالت کرتے ہوئے خدا کے نام پر مہر کی رقم کو کم کرنے کی نیکانا باوا سے التجا کرتا ہے۔ تب نیکانا باوا خدا کے نام پر مہر کی رقم سے نصف معاف کر دیتا ہے۔ تب دولہا کا وکیل محبت کرتا ہے کہ خدا کے نام پر نصف چھوڑا ہے۔ تو اس کے حبیب کے صدقے کیا تخفیف کرتے ہو؟ اور پھر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے نام پر کیا چھوڑتے ہو؟ لہٰذا نیکانا باوا مزید تخفیف کرتا ہے۔ اور یوں مہر کی رقم کم سے کم ہوتے ہوئے وہاں آکر ٹھہر جاتی ہے۔ جس کا عام طور پر رواج ہوتا لیکن گھنٹوں اس پر بحث ومباحثہ ہوتا ہے اور دعویٰ و جواب دعویٰ ہوتا رہتا ہے۔ معتبرین ومعززین جلد ہی اس معاملے میں پڑ کر معاملہ چکانے کی کوشش کرتے ہیں اور یوں فریقین مناسب ومروج مہر پر تصفیہ کر لیتے ہیں۔

نکاح: مہر کا تصفیہ ہونے کے بعد ملا نکاح پڑھاتا ہے۔ وہ تین مرتبہ دولہا سے پوچھتا ہے۔ کہ وہ فلاں بنت فلاں جس کی اس نام کی اور کوئی لڑکی نہیں ہے۔ کو اپنی حقیقی اور قانونی بیوی بعوض اتنے مہر کے قبول کرتا ہے؟ اور تین بار دولہا جواب دیتا ہے کہ ہاں میں قبول کرتا ہوں تب وہ خطبہ نیکا (نکاح) پڑھتا ہے۔ اور دولہا دلہن کے لیے دعا کرتا ہے۔ اس کے بعد تمام لوگ دولہا اور اس کے باوا کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد چھوہارا اور نقل یا کوئی مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ احباب رخصت ہوتے ہیں اور قریبی عزیز باقی رہ جاتے ہیں۔ شادی کے آرزومند نوجوان رخصت ہونے سے پہلے نوشہ کے سامنے قدرے جھک کر کہتے ہیں۔ ''اے نوشہ! خدا سے دعا کیجئے کہ ہماری شادی بھی جلد ہو جائے'' نوشہ مسکرا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ اور مراد پوری ہونے کیلئے دعا کرتا ہے۔ یہ عقیدہ عام ہے کہ خدا نوشہ کی دعا قبول کرتا ہے۔

نکاح کے دوران جملہ بازی: نکاح کی تقریب پر وقار اور سنجیدگی کے باوجود سپاٹ نہیں ہوتی۔ اس موقع پر بالخصوص نوجوان ملا کو بطور خاص مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔ فقرے چست کرتے ہیں۔ مثلاً ملا کہتا ہے کہ " کیا تم فلاں کو اپنی زوجیت میں قبول کرتے ہو؟" تو کوئی نوجوان آہستہ سے کہتا ہے "میرے والد بزرگوار نے پہلے سے کرلیا ہے۔ "اس پر کوئی نوجوان گرہ لگاتے ہوئے کہتا ہے۔ "تو کیا اس کے باوا پر اس کے حسن کا جادو چل چکا تھا" اور بعض منہ پھٹ ملا کے جواب میں بول پڑتے ہیں۔ ہاں قبول کرتا ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لئے کہ میں پاگلوں کی طرح اس کا دیوانہ ہو چکا تھا۔''

شیر شکل خوری: نکاح کی تکمیل کے بعد چند رشتے دار دولہا کو لے کر دلہن کے کوٹھو (حجلہ عروسی) کی چوکھٹ تک لے آتے ہیں۔ اندر سے ''کوٹھو'' کا دروازہ بند ہوتا ہے۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ میدانی علاقوں میں ایک اور رسم بھی ہے کہ دولہا جب دلہن کے کمرے کے دروازے کی چوکھٹ پر پہنچتا ہے۔ تو دہلیز پر ایک پرچ، پیالہ یا مٹی کا کوئی برتن رکھا جاتا ہے۔ جسے دولہا کو اپنے جوتے کی ٹھوکر سے پھوڑنا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد دولہا کی قوت مردانہ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اکثر دولہا سے شرارت کرنے کیلئے برتن کے نیچے مٹی چھپا دی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ با آسانی نہیں ٹوٹتا۔ یوں دولہا کی سبکی ہوتی ہے۔ اور اس پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ جبکہ جن علاقوں میں رسم ہے۔ وہاں بعض شادی شدہ قریبی احباب دولہا کو پہلے سے ترکیب بتا دیتے ہیں کہ وہ پہلے برتن کو جوتے کی نوک سے ذرا سا اوپر اٹھائے۔ اس طرح پتہ چل جائے گا کہ اگر اس کے نیچے مٹی وغیرہ ہے۔ تو وہ پیر سے ہی اسے دور کردے اور پھر ایڑی کے زور سے اس پر چوٹ لگائے اس طرح وہ برتن با آسانی ٹوٹ جاتا ہے۔

اب آگے کی رسمیں ایک جیسی ہی ہیں۔

دولہا چوکھٹ پر پہنچتا ہے۔ تو اندر سے دروازہ بند ہوتا ہے۔ دلہن کی ''جانیاں'' اور بالخصوص اس کے بہنیں دولہا سے اندر آنے کی عوض رقم طلب کرتی ہیں۔ جو پہلے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بالآخر منت سماجت کے بعد وہ ایک معقول معاوضہ کے عوض دروازہ کھول دیتی ہیں۔ دولہا اندر داخل ہوتا ہے۔ تو ساس اور سالیاں اس کا استقبال کرتی ہیں اور اس پر دعاؤں کی بوچھاڑ کردی جاتی ہے۔ دولہا تخت پر اپنی دلہن کے دائیں پہلو میں بیٹھتا ہے۔ اب ایک پیالہ دودھ کا لایا جاتا ہے۔ جس میں چینی گھول کر اسے میٹھا کیا جاتا ہے۔ اس لئے اسے ''شیر شکل'' (دودھ + شکر) کہا جاتا ہے۔ پہلے دلہن اس دودھ سے چند گھونٹ پیتی ہے۔ پھر پیالہ دولہا کی طرف بڑھایا جاتا ہے۔ دولہا چند گھونٹ پینے کے بعد پھر دلہن کی جانب بڑھاتا ہے۔ اور پھر دولہا بھی دوسری مرتبہ چند گھونٹ پی کر پیالہ بوڑھی عورت کی طرف بڑھا دیتی ہے۔ اور پھر یہ دودھ وہ کنوارے آپس میں بانٹ کر چند گھونٹ پیتے ہیں۔ جنہیں شادی کی آس ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ دولہا دلہن کا اس وقت کا جھوٹا دودھ پینے سے کنوارے اور کنواریوں کی مراد جلد بر آتی ہے۔

ڈک تنگ: اس کے بعد قرآن حکیم لایا جاتا ہے۔ دولہا دلہن آمنے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان رحل پر قرآن مجید رکھا جاتا ہے۔ اس کا پہلا صفحہ کھولا جاتا ہے۔ اور پھر دلہن کو پڑھنے کیلئے کہا جاتا ہے۔ دلہن جس نے مارے حیا کے آنکھوں پر رومال رکھا ہوتا ہے۔ آنکھ کھولتی ہے۔ سورہ فاتحہ پر نظر کرتی ہے۔ پھر اوپر نظر اٹھاتی ہے۔ اس اثناء میں ایک بڑا آئینہ ان دونوں کے درمیان یوں رکھا جاتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا عکس دیکھ سکیں۔ دلہن کو بہ اصرار چہرہ سے پردہ ہٹا کر آئینہ دیکھنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ ماں یا بڑی بوڑھی عورت کے بار بار کہنے کے بعد وہ آئینہ میں اپنا اور اپنے دولہے کا منہ دیکھتی ہے۔ جبکہ دولہا فقط اشارے کا منتظر ہوتا ہے۔ تب خاندان کی خوش نصیب بال بچے دار بڑی بوڑھیاں دولہا دلہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ تین بار ان کے سر کو باہم ٹکراتی ہیں۔ اسے ''ڈک تنگ'' کہا جاتا ہے۔ یہ مرحلہ طے پانے کے بعد اور ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ دولہا دلہن کو

حجلہ عروسی میں تخلیہ میں چھوڑ کر تمام لوگ باہر آجاتے ہیں۔

دولہا دلہن باری باری دو رکعت نفل ادا کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ اس موقع پر مانگی گئی دولہا دلہن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

شب عروسی: ماضی میں یہ ہوتا تھا کہ حجلہ عروسی کے باہر دولہا دلہن کی مائیں بوڑھی عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی نگرانی کرتی رہتی تھیں ان کا دھیان ہر پل حجلہ عروسی کی طرف رہتا کہ شاید ابھی انہیں مدد کیلئے پکارا جائے ذرا دیر ہو جاتی تو سمجھا جاتا کہ شاید ان پر جادو ٹونہ کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ فرض رجولیت ادا کرنے سے قاصر رہیں۔

اب گو کہ جادو ٹونے کی باتیں قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔ اب حجلہ عروسی میں دولہا دلہن کو چھوڑ آنے کے بعد باہر ڈھول اور گیت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ صبح کی اذان کے وقت دولہا باہر نکلتا ہے۔ اور فوراً غسل کی تیاری کرتا ہے۔ دلہن کی ماں اور بوڑھی عورتیں اس کے پاس جاتی ہیں۔ اور اس سے خیر خیریت دریافت کرتی ہیں۔ عورت کیلئے فوری غسل کے لوازمات ممکن نہ ہونے کے باعث اس کا غسل لازم نہیں ہوتا۔

دیدم دیداری (منہ دیکھائی): صبح دولہے کا باوا سب سے پہلے اسے مبارکباد پیش کرنے آتا ہے۔ لیکن دلہن اسے ایک جھلک بھی نہیں دکھاتی۔ جب تک کہ وہ اسے منہ دکھائی میں کوئی زیور نقدی یا کوئی تحفہ نہیں دے دیتا۔ یہ باقاعدہ رسم ہے۔ اسے دیم دیداری یعنی منہ دکھائی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دولہا کے چچا، بھائی، چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد بھائی بھی ''دیم دیداری'' کیلئے کوئی نہ کوئی تحفہ یا کچھ روپے نقد ضرور دیتے ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ دولہے کے والد کا تحفہ دوسروں سے ارزاں ہو خواہ وہ نقدی کی صورت میں ہو تب بھی دوسروں سے زیادہ ہو اس موقع پر مٹھائی کا تحفہ بھی بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اور عزیز و اقارب اکثر مٹھائی ہی تحفے میں لاتے ہیں۔

سسرال میں تین دن قیام: شادی کے بعد تین دن تک سسرال میں رہنا لازم ہوتا ہے۔ اب اس میں یہ تخفیف ہوگئی ہے کہ شادی کے فوراً بعد برات واپس آجاتی ہے۔ کچھ روز گھر پر گزار کر دولہا دلہن کو لے کر پھر سسرال جاتا ہے اور کم از کم تین یا سات دن وہاں قیام کرتا ہے۔ میدانی علاقوں میں اس رسم کو ''ستو واڑہ'' (سات روزہ) کہتے ہیں۔

براہویوں میں یہ رسم جاری ہے کہ اس دوران دولہا دلہن سے ملنے کیلئے آنے والے احباب کچھ سالم غلہ لے آتے ہیں اور اسے دولہا دلہن پر نچھاور کرتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں بارآور ہوں یعنی صاحب اولاد ہوں۔ دلہن اس کے جواب میں غلہ لانے والوں یا والیوں کو تیل سرمہ مسواک وغیرہ پیش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ماضی میں یہ بھی ہوتا کہ ثابت غلہ دولہا دلہن کو پینے کو کہا جاتا جسے پھر ان دونوں پر نچھاور کیا جاتا رسم کو ''پاٹو'' کہتے عورتیں اس استعمال شدہ غلے کو اٹھاتی اور اپنے پاس محفوظ کر لیتیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ یہ میعادی بخار کا تیر بہدف نسخہ ہے۔

اللہ ڈیر: اس کا مطلب ہے۔ ''خدا کی ڈھیری''۔ یہ رسم بھی اب تقریباً متروک ہو چکی ہے۔ اس میں ہوتا یہ کہ شادی کے تیسرے روز ڈومب معہ اپنی زنانی کے دلہن کے گھر آتا۔ وہ ڈھول پہ ''شادمانی'' کا تال بجاتا اور سرنا پھونکتا' ڈھول اور سرنے کی آواز سن کر تمام عزیز و اقارب اور پاس پڑوس کے لوگ دلہن کے ہاں جمع ہو جاتے عورتیں طشتری یا کسی برتن میں آٹا یا گندم لے آتیں اور اسے اس چادر پر رکھ دیتیں جو ڈومب نے سگائی کی بدھائی کیلئے پھیلا رکھی ہوتی جب سب عورتیں اپنے ساتھ لائی ہوئی گندم یا آٹا اس میں رکھ چکی ہوتیں تو ڈومب ان سب کو سمیٹ لیتا اسی کو ''اللہ ڈیر'' یعنی اللہ کی ڈھیری کہا جاتا۔

وڈام: ماضی میں جہیز کی نمائش شادی کے تیسرے روز رخصتی سے قبل ہوتی تھی دلہن کی ماں اپنے تمام عزیز و اقارب کو مدعو کرتی اور جہیز کے تمام زیورات، لباس، قالین، بستر، برتن گویا تمام اشیاء کو قرینے اور سلیقے سے سجا کر ایک کمرے میں الگ سے رکھا جاتا رشتے دار اور احباب باری باری جہیز کا سامان دیکھتے اور اس کی تعریف کرتے اسے ''وڈام'' کہتے ہیں۔ قدیم عہد میں عورت کی عصمت و عفت کی نشانی کے طور پر سرخ نشانات والا کپڑا بھی رکھا جاتا تھا' جس پر بے حد خوشی کا اظہار کیا جاتا اب ایسا کوئی سلسلہ نہیں رہا۔ جبکہ اب جہیز کی نمائش بھی نکاح سے قبل ہوتی ہے۔ عموماً نکاح کی رات یہ جہیز نمائش کیلئے پیش ہوتا ہے۔ ماضی قریب میں اس کا ایک طریقہ میدانی علاقوں میں یہ تھا کہ عورتوں کے ہجوم کے بیچوں بیچ یہ سامان رکھ جاتا اور ایک بوڑھی تجربہ کار عورت ایک ایک کر کے چیزوں کی نمائش کرتی۔ وہ ہر چیز کا تعارف کرواتی اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتی جاتی کہ یہ تحفہ کس کی طرف سے ہے۔ جہیز کا فلاں فلاں سامان کس کس نے دیا ہے۔ اب عمومی اور آسان طریقہ یہی ہے۔ کہ جہیز کا تمام تر سامان الگ کمرے میں سلیقے سے سجا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ جہاں پورا دن اس کی نمائش رہتی ہے۔ اور عزیز و اقارب ایک ایک کر کے دیکھتے ہیں۔

ارہ نا اُرا: ساس سے مراد ہے ''میاں کا گھر'' ماضی میں جب دلہن میاں کے گھر پہنچتی تو اس موقع پر ایک بڑی رسم کا اہتمام ہوتا عین دروازے کی چوکھٹ پر ایک

بھیڑ ذبح کی جاتی اور اس کا خون اس طرح دروازے کے راستے پر پھیلا دیا جاتا کہ دلہن جب اس راستے کو پاٹے تو خون پر دلہن کے پیر یا جوتے کا نشان بن جائے نیز بھیڑ کا تھوڑا سا خون ایک پیالے میں لے کر رکھا جاتا اور اس میں سبز گھاس کا پودا ڈال دیا جاتا جیسے ہی دلہن دہلیز پر قدم رکھتی دلہن کی ماں اس خون کا ٹیکہ اس کی پیشانی پر لگاتی اور پھر اس سبز گھاس کو مع خون کے بہتے چشمے میں بہا دیا جاتا اور اگر قرب و جوار میں کوئی رواں چشمہ نہ ہوتا تو پیالے کا خون اور گھاس کسی سرسبز و شاداب درخت کی جڑ میں ڈال دیا جاتا۔ بعض علاقوں میں مذہبی طور پر خون کا ٹیکہ لگانے کو بہتر خیال نہیں کیا جاتا تھا وہاں یہ رسم تھی کہ دولہا دلہن کی آمد پر دودھ سے بھرا پالہ جس میں سبز گھاس پڑی ہوتی تھی دلہن کو پیش کیا جاتا دلہن اس میں اپنی چھنگلی ڈال کر بھگوتی اور پھر نکال لیتی اور پھر دودھ مع گھاس بہتے چشمے یا کسی ہرے بھرے درخت کی جڑ ڈال دیا جاتا۔ دولہا کو ذبح کردہ بھیڑ کے خون یا دودھ سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد وہ ایک طرف ہو جاتا ہے۔ اس کی ماں بہنیں اور دوسری عورتیں دلہن کو گھیر لیتی ہیں۔ اس موقع پر ڈھول بجایا جاتا ہے۔ اور گیت گائے جاتے ہیں۔

میدانی علاقوں میں اب بھی یہ رسم ہے کہ میکے سے رخصتی اور سسرال آمد کے وقت دلہن کے سر پر قرآن مجید کا سایہ کیا جاتا ہے۔ اگر دولہا دلہن کے گھر نزدیک اور کم فاصلے پر ہوں تو دلہن کے گھر سے دولہا کے گھر تک مسلسل قرآن دونوں کے سروں پر رکھ کے لایا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ لی جاتی ہے۔ کہ عمر بھر دونوں پر قرآن کا سایہ رہے۔ اور دونوں کی مشکلات آسان ہوں اور زندگی کا سفر آسان ہو۔

دولہا کی مزار پر حاضری: یہ قدیم رسم ہے۔ اور بعض علاقوں میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ دولہے کے لئے لازم ہوتا ہے کہ گھر میں داخل ہونے سے قبل کسی بزرگ یا خاندانی پیر کے مقام پر فاتحہ پڑھنے کے لئے جاتا ہے۔ اور وہاں کے مجاوروں میں کچھ نقدی اور شیرینی تقسیم کرتا ہے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد اگر سسرال نزدیک ہو تو پہلے وہ سسرال جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا شہ بالا بھی ہوتا ہے۔ لڑکی کا باپ اسے شیرینی اور ایک بڑا سا رومال دیتا ہے۔ یہاں سے وہ اپنے کسی قریبی عزیز کے پاس جاتا ہے۔ وہاں بھی اسے رومال اور شیرینی کا تحفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ عزیز و اقارب اور احباب کے یہاں جاتا ہے۔ اس روز وہ جہاں بھی جاتا ہے۔ اسے رومال اور مٹھائی دی جاتی ہے۔ اس طرح بہت سے رومالوں اور ڈھیر سی شیرینی کے ساتھ وہ گھر لوٹتا ہے۔ شہہ بالا ایک رومال اور کچھ شرینی بطور حق خدمت لیتا ہے۔ یہ دن قریبی عزیز و اقارب کی دعوت پر تمام ہوتا ہے۔

پائے وازی: رخصتی کے بعد لڑکی اپنے باپ کے گھر یعنی میکے تب تک نہیں۔ جاتی جب تک ان کی طرف سے اسے اور اس کے خاوند کو باضابطہ طور پر مدعو نہ کیا جائے اور ان کے اعزاز میں شاندار دعوت کا اہتمام نہ کیا جائے لہٰذا ایک شاندار ضیافت ان کے اہتمام میں دی جاتی ہے۔ قریبی رشتے کی عورتیں اس میں مدعو ہوتی ہیں۔ ضیافت کے بعد دولہا دلہن تحائف سے لدے پھندے گھوکو لوٹتے ہیں اب دلہن جب چاہے، میکے آ جا سکتی ہے۔ کیونکہ رسم "پائے وازی" یعنی پاؤں کھولنے کی رسم ادا ہو چکی ہوتی ہے۔

یہ رسم بھی اب اپنی کلاسیکل شکل میں کم ہی علاقوں میں موجود ہے۔ اور اگر کہیں ہے بھی تو اس کی ہیئت علاقائی رسم و رواج کے اعتبار سے تبدیل ہو چکی ہے۔

رنڈوا کی شادی: رنڈوا کی دوسری شادی میں نہ تو کوئی تاخیر کی جاتی ہے۔ اور نہ ہی اعتراض بلکہ دوسری بار بھی حتی الوسعی کوشش کی جاتی ہے کہ خاندان سے ہی اس کے لئے مناسب رشتہ تلاش کیا جائے۔ جبکہ منگنی اور شادی کی تمام تر رسومات اسی طرح سے ادا کی جاتی ہیں۔ جیسے پہلی مرتبہ شادی کے وقت ادا کی جا چکی ہوتی ہیں۔ البتہ عموماً رنڈوا کی منگنی نہیں کی جاتی اور براہ راست شادی کی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔

بیوہ کی شادی: بیوہ کا معاملہ رنڈوا کے برعکس ہے۔ خاوند کی وفات کے بعد ایک سال وہ اپنے سسر یا اس کے بھائیوں کی سرپرستی میں بیوہ کی حیثیت سے سوگ مناتے بسر کرتی ہے۔ اور اگر وہ عمر رسیدہ ہے۔ اور اس کے بیٹے جوان ہیں۔ تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ اس کا کوئی جواز رہتا ہے۔ لیکن اگر بچے چھوٹے ہوں اور وہ شادی کرنا چاہتی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ایسے میں پہلے مرحوم خاوند کے چھوٹے یا بڑے بھائی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اگر وہ بھی راضی ہو تو چنداں مسئلہ نہیں ہوتا۔ بیوہ کے والدین کو مطلع کیا جاتا ہے اسے نیا لباس پہننے کو دیا جاتا ہے۔ چھوٹی سی ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔ پاس پڑوس اور خاندان کی عورتیں جمع ہوتی ہیں۔ اور بڑی سادگی سے نکاح پڑھ دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر بالخصوص مرحوم خاوند کا کوئی بھائی امیدوار نہ ہو یا بیوہ شادی پر رضامند نہ ہو تو وہ چپکے سے میکے چلی جاتی ہے۔ وہاں بھی اس کے خاوند کے ورثاء کا فرض ہوتا ہے۔ کہ اس کی خیال داری کریں گے اور گزر بسر کا خیال رکھیں اگر دودھ پیتا بچہ ہو تو اس کے ساتھ آئے گا لیکن اگر بچے بڑے ہوں تو وہ سسرال میں ہی رہتے ہیں۔ میکے میں وہ اس وقت تک رہتی ہے۔ جب تک اس کے لئے کوئی موزوں رشتہ نہیں آ جائے اور وہ اس پر رضامند نہ ہو کیونکہ براہویوں میں آج بھی بیوہ کی مرضی کے خلاف اس کی شادی نہیں۔

کی جاتی اور اگر وہ رضامند ہو۔ تو ''شربت خوری'' کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم میں قریبی رشتے دار شریک ہوتے ہیں۔ اور اس طرح منگنی قرار پا جاتی ہے۔ اس موقع پر منگنی کی دیگر رسوم ضیافت انگوٹھی پہنانا وغیرہ نہیں ہوتیں اور نہ شادی کی رسم طول کھینچتی ہیں۔ ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ سادگی سے یہ رسوم ادا ہوں اور جلد شادی طے پا جائے۔

طلاق: براہویوں میں آج بھی طلاق کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے۔ مرد کیونکہ عورت کو اپنی عزت اور ناموس سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ کسی بھی صورت اس چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ بالفرض محال اگر ایسی کوئی صورتحال پیدا ہو جائے تو خاندان کے بڑے بوڑھے مل بیٹھتے ہیں اور تصفیہ کے راستے ڈھونڈتے ہیں۔ اگر دونوں کا ساتھ رہنا محال بھی ہو جائے تو مرد طلاق نہیں دیتا۔ البتہ بیوی سے تعلقات منقطع کر لیتا ہے اور بیوی خاموشی سے اپنے میکے آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ البتہ اس دوران اس کے گزر بسر اور ضروریات کی ذمہ داری شوہر کے ذمہ ہوتی ہے۔ ایسا اکثر شوہر کی طرف سے پہلی بیوی سے اولاد نہ ہونے یا کسی ناچاقی کی بناء پر دوسری شادی کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ لیکن اس صورت میں خاندان اور قبیلہ طلاق سے بچے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اور فریقین کے مابین ایک مشروط تصفیہ طے پا جاتا ہے۔

موت کی رسمیں

وفات: براہویوں کے ہاں اگر کوئی وفات پا جائے تو جنازے کے کمرے سے تمام عورتوں بشمول متوفی کی بیوی اور ماں کے سب کو باہر نکال دیا جاتا ہے۔ ماسوائے قریبی مرد رشتے داروں کے جنازے کے پاس کسی کو رہنے نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح متوفی اگر عورت ہو تو تمام مردوں کو باہر نکال دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ شوہر کو بھی اپنی مردہ بیوی کا چہرہ دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی اور اگر کوئی بچہ فوت ہوتا ہے۔ تو اسے ماں کی گود سے علیحدہ کیا جاتا ہے۔ اسے بچے کو مردہ حالت میں دیکھنے نہیں دیا جاتا۔ حتیٰ کہ اسے گریہ کرنے سے بھی روک دیا جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ماں کے گرے ہوئے اشکوں سے ایک جوئے بار پھوٹ پڑتی ہے اور اس راستے کو روکتی ہے جس پہ اس کے ننھے بچے کو سفر کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے ماں ضبط کی حتی الوسعیٰ کوشش کرتی ہے۔

وفات کے فوراً بعد مرنے والے کی آنکھیں اس کے رشتے دار انگلیوں سے بند کر دیتے ہیں۔ اور ہر آنکھ پر روئی کا پھاہا رکھا جاتا ہے۔ کپڑے کی دھجی سے کنپٹیوں پر روئی رکھ کر سر باندھ دیتے ہیں۔ اور ٹھوڑی دبا کر منہ کو اچھی طرح بند کر دیتے ہیں۔ اور پھر سر اور ٹھوڑی کو ملا کر کپڑے کی دھجی سے باندھ دیتے ہیں۔ تا کہ منہ کھلنے نہ پائے۔ مرنے والے کا پاؤں کی انگلیوں کو ملا کر کپڑے کی دھجی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہاتھ یا پاؤں آلودہ ہوتے ہیں۔ تو انہیں بے تکلف دھو ڈالا جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کے ناخن تراشے جاتے ہیں۔ ان کے زیر ناف کے بال مونڈھے جاتے ہیں۔ کیونکہ جنازے کو پاک صاف کر کے اس کی تدفین کی جاتی ہے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ مرنے والے کا منہ کھلا نہ رہ جائے اور نہ اس کی آنکھیں کھلی ہوں۔

پانی اوندھنا: جب کوئی فوت ہو جاتا ہے۔ تو قریبی عزیز و اقارب اس کی آنکھیں منہ ہاتھ اور پاؤں وغیرہ درست کر لیتے ہیں اور ایک سفید چادر اس کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر ایک بزرگ غمناک آواز میں یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کا کام تمام ہوا۔ اس نے خود کو خدا کی مرضی کے سپرد کر دیا لیکن جب پڑوسیوں کو خبر ملتی ہے تو وہ توقف کرتے ہیں۔ اور ادھر ادھر نہیں دیکھتے کیونکہ خیال کیا جاتا ہے کہ جو کوئی بھی موت کی خبر سنتے ہی بول اٹھے گا اس پر کوئی نہ کوئی آفت نازل ہو کر رہے گی۔ اور جو گھر کسی مشکل میں مبتلا ہوتا ہے۔ یا اس کے ہاں کوئی بیمار ہوتا ہے۔ یا کوئی حاملہ یا زچہ و بچہ ہوتا ہے تو اس خدشے میں کہ موت کے فرشتے کی پرچھائیں نہ پڑے، یہ خبر سنتے ہی گھر کا پانی اوندھا دیا جاتا ہے۔ یہ خیال پایا جاتا ہے کہ فرشتہ اجل اپنے ہولناک کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنی مہلک تلوار کو ان کے گھروں کے قریب سے گزرتے ہوئے اس پانی سے دھوئے گا اور ان لوگوں پر مصیبت نازل کرے گا جو اس گھر کا پانی پئیں گے جہاں کوئی موت واقع ہوئی۔ پڑوسیوں میں سے کوئی اس وقت تک متوفی کے گھر کا رخ نہیں کرتا جب تک وہ چیخ و پکار کی آوازیں بار بار نہیں سنتا اور پھر لوگ اس کے ساتھ مل کر متوفی کے گھر جاتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل وہ متوفی کے دور دراز رہنے والوں کو اس حادثے کی اطلاع بھجواتے ہیں۔ کہ یہ کام ان کا ہوتا ہے نہ کہ غمزدہ خاندان کا۔ قاصد تمام لوگوں کے یہاں جاتا ہے۔ اور خاندان کے سربراہ کے کان میں سرگوشی کرتا ہے۔ ''اس نے خود کو خدا کی مرضی کے سپرد کر دیا ہے۔''

جدید عہد میں ذرائع مواصلات کی سہولت کے بعد گو کہ اب یہ طریقہ کار متروک ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن آج بھی دور دراز کے دیہات میں یہی کچھ ہوتا ہے۔

محفل احزاں: نزدو دور کے عزیز و اقارب اور احباب پاس پڑوس کے لوگ متوفی کے گھر آنا شروع ہوتے ہیں۔ خاموشی سے اشاروں کنایوں میں وہ علیک سلیک کرتے ہیں۔ متوفی کے وارث سے اظہار افسوس کرتے ہیں اور اگر بولتے ہیں تو محض سرگوشیانہ لہجے میں۔ عورتیں اور مرد الگ الگ بیٹھتے ہیں۔

قدیم زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ جب تک جنازہ دفنانے کیلئے قبرستان نہیں

لے جاتے تھے تب تک عورتیں نہ روتی تھیں اور نہ آہ وزاری کرتی تھیں۔

بھاری پتھر: مولوی جب تک آتا ہے۔ اتنی دیر میں کفن سل کر تیار ہو جاتا ہے۔ جنازے کو گھر سے غسل کی مقررہ جگہ پر لایا جاتا ہے۔ اسے تن شود کہتے ہیں۔ جس جگہ مردے کا سر رکھا جاتا ہے۔ اس جگہ ایک بھاری پتھر رکھ دیا جاتا ہے۔ تاکہ خدا متوفی کو قبول کر لے۔ البتہ نومولود بچوں کیلئے پتھر نہیں رکھا جاتا۔

غسل: روایت کے مطابق دیہات میں یہ ہوتا ہے کہ اگر قرب میں آب رواں کا کوئی چشمہ ہے۔ تو غسل کیلئے مردے کو وہاں لے جایا جاتا ہے۔ چشمہ کے کنارے پانی گرم کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مردے کو نہلانے کے لئے گرم پانی کا استعمال لازم ہوتا ہے۔ پانی میں بیری کی کچھ پتیاں اور خودرو آلوچہ کی کچھ پتیاں بھی ڈال دی جاتی ہیں۔ مردے کو لکڑی کے ایک تختے پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے چاروں جانب پردہ کیا جاتا ہے۔ اب اگر جنازہ مرد کا ہے تو ملا اور دو قریبی عزیزوں کے سوا کوئی نہلانے میں شریک نہیں ہوتا۔ ملا غسل کیلئے پانی کے تین جگ (اب اکثر تین بالٹی) استعمال کرتا ہے۔ سر کو صابن سے دھوتا ہے۔ بعد غسل عرق گلاب چھڑکتا ہے۔ یا دیگر عطریات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مولوی کفن پہنانے کے بعد اپنا کام ختم کر لیتا ہے۔ متوفی کے عزیز واقارب اس کے جسم کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر چارپائی پر رکھتے ہیں۔ جس پر ایک صاف توشک (گدا) بچھی ہوتی ہے۔ پہاڑوں کے قدیم باسی چارپائی کی سہولت نامیسر ہونے کے باعث سبز شاخوں کی بنی ہوئی تختی پر جس پر پتیاں بچھی ہوتی تھیں جنازے کو رکھتے تھے۔ اسے ''منجاؤ'' کہتے تھے۔

غسل زنانہ: متوفی اگر عورت ہو تو اس کے غسل کی ذمہ داری خواتین پر ہوتی ہے۔ مولوی کی بیوی نگرانی کرتی ہے۔ کہ غسل شریعت کے مطابق دیا جائے اس کے بجائے کوئی نیک بزرگ بوڑھی عورت بھی یہ خدمت سرانجام دے سکتی ہے۔ خاندان کی یا عزیز واقارب خواتین پانی لانے اور گرم کرنے کا اہتمام کرتی ہیں جب عورت کا جنازہ غسل کے لئے لایا جاتا ہے۔ تو پردے لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ ماسوا ان چند عورتوں کے جو ملا کی بیوی کی مدد کیلئے پردے کے اندر ہوتی ہیں۔ باقی سب عورتیں پردے باہر رہتی ہیں۔ وہ اس طریقے سے متوفی عورت کو غسل دیتی ہیں۔ جس طرح ملا مرد کو نہلاتا ہے۔ لیکن وہ سر کو اس پانی سے دھوتی ہیں۔ جس میں ''لاڑا'' یا سوڈا کے پودے کی پتیاں ڈال کر اسے ابالا جاتا ہے۔ سر کو بالوں کو گوندھا نہیں جاتا بلکہ سامنے پھیلا دیا جاتا ہے۔ تمام لباس وزیورات اتار لئے جاتے ہیں۔ ماضی میں کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ متوفی عورت کے کان میں محبت کی یادگار کے طور پر آویزہ لٹکا رہنے دیتے تھے اور اسی طرح زمین دفن کر دیتے تھے مگر اب ایسا کوئی رواج کم وبیش کہیں موجود نہیں۔

بچے کا غسل: جیسا کہ بیان ہوا کہ مرد کو مولوی اور عورت کو مولوی کی بیوی غسل دیتی ہے لیکن کم سن بچے کے غسل کا فرض اگر لڑکا ہو تو کوئی ضعیف العمر آدمی اور لڑکی ہو تو کوئی بڑھیا ادا کرتی ہے۔ اور اگر بالکل کم سن یا نومولود ہو تو اسے یونہی ہاتھوں پر اٹھا کر دفن کر دیا جاتا ہے۔ لیکن سات سال یا اس سے بڑی عمر کے لڑکے یا لڑکی کا پختہ عمر کے مرد یا عورت کی طرح باقاعدہ جنازہ نکلتا ہے۔

پدیکو دیدار: غسل کے بعد کفن پہنا کر خوشبو لگا دی جاتی ہے۔ تو جنازہ قبرستان لے جانے سے پہلے ''پدیکو دیدار'' یعنی الوداعی دیدار کی رسم ادا ہوتی ہے۔ متوفی کا چہرہ کھول دیا جاتا ہے۔ خاندان کے افراد رشتے دار دوست، احباب باری باری آکر مرنے والے کا دیدار کرتے ہیں۔ لیکن اگر جنازہ عورت کا ہو تو ماسوا بیٹے، باپ بھائی اور خونی رشتے داروں کے کسی غیر مرد کو چہرہ دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ خونی رشتے داروں سے مراد وہ احباب ہیں۔ جو شرعی طور پر دیکھنے کی اجازت کا حق رکھتے ہوں۔ اس رو سے شوہر پر بھی اکثر نامحرم قرار دیا جاتا ہے۔ اور اسے بھی اپنی بیوی کا آخری دیدار کرنے کی اجازت نہیں۔ ہوتی جو عورتیں پیٹ سے ہوں وہ بھی مرنے والے کا چہرہ نہیں دیکھتیں کہ مبادا بچے کو رحم مادر ہی میں یا تولد ہونے کے بعد ''بدالو'' ہو جائے اور اگر ماں آہ وزاری کرتی ہے۔ تو اسے حقوق بخشنے کی جانب متوجہ کیا جاتا ہے۔ وہ تین بار با آواز بلند کہتی ہے کہ میں نے دودھ بخشا اور ماں کے دیگر تمام حقوق بخشے جو بچے پر واجب ہوتے ہیں۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔ ''میں نے بہ رضا و رغبت تمام حقوق بخش دیئے'' یہ بات وہ تین بار دہراتی ہے۔ اور تین بار روتی ہے۔

تان شاغنگ: اس سے مراد ہے۔ چادر چڑھانا۔ پرانے زمانے میں یہ رسم ہوا کرتی تھی کہ عزیز واقارب اور معتبرین متوفی کے جنازے پر چادر چڑھایا کرتے تھے۔ جتنی چادریں زیادہ ہوتی تھیں' اتنی مرنے والے کی عزت افزائی ہوتی تھی۔ چادریں قبریں تک جنازے پر چڑھتی رہتیں اور پھر انہیں مولوی کو دے دیا جاتا۔ بعض علاقوں میں کسی حد تک یہ رسم آج بھی موجود ہے۔

انتظار: تدفین کا اہتمام مکمل ہو جانے کے بعد دور سے آنے والے عزیز واقارب کے انتظار کیلئے جنازے کو ایک طرف تیار کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ جو رات گئے یا صبح تک آپہنچتے ہیں۔ اگر وفات صبح کے وقت ہوئی ہو اور انتہائی قریبی رشتے داروں کو

دور سے پہنچنا ہو تو شام تک انتظار کرتے ہیں۔ کیونکہ رات کو تدفین کے وقت بہتر خیال نہیں کیا جاتا اور اگر زیادہ دیر ہو جائے تو پھر آئندہ صبح کو تدفین کی جاتی ہے۔ جب تک جنازہ وہاں رکھا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اس کی نگرانی کیلئے وہاں موجود رہتے ہیں اور اسے ایک لمحے کو بھی تنہا نہیں چھوڑتے کیونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر جنازے کو تنہا چھوڑ دیا گیا تو بدروح اس پر تصرف کرے گی بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ اس جگہ پر سایہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اکثر بچوں کو اور بعض دفعہ بڑوں کو بھی پھر اس جگہ آنے جانے سے روک دیا جاتا ہے۔

تدفین کے مراحل

قبر کی کھدائی: خاندان یا پڑوس کے مضبوط دل اور مضبوط بدن کے مالک افراد اس دوران قبرستان جا کر ایک جگہ کا انتخاب کرتے ہیں اور قبر کی کھدائی کا اہتمام کرتے ہیں عموماً ہر قبیلے کا اپنا قبرستان ہوتا ہے۔ جہاں وہ اپنے لوگوں کو سپرد خاک کرتے ہیں شہروں کے بڑے بڑے مشترکہ قبرستان میں بھی اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ خاندان یا قبیلے کے افراد کی قبریں ایک ساتھ نزدیکی مقامات پر بنائی جائیں کچھ لوگ عقیدت کے طور پر کسی بزرگ کے مزار کے قرب وجوار میں دفنانے کی وصیت کرتے ہیں۔

بچوں کی قبر: عموماً بچوں کو دو فٹ گہری قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔ البتہ عمر کے لحاظ سے قبر کو گہرا کیا جاسکتا ہے، براہویوں میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جنہوں نے بڑی عمر پائی ہے۔ اور گنہگار ہوتے ہیں۔ قبر ان کے لیے ہوتی ہے۔ ننھے منے معصوم بچوں کے لیے قبر کی ضرورت کیا ہے؟ وہ بہشتی ہیں اور بہشت ان کی قیام گاہ ہے۔ بلکہ یہ تو وہ لوگ ہیں۔ جو قیامت کے دن آزاد ہوں گے اور خداوند سے اپنے باپ کے گناہ بخشوانے کی سفارش کریں گے۔ ایک عقیدہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جس ماں کے بچے کی قبر گہری ہوگی اسے پھر بچہ نہ ہوگا۔

بڑی عمر کے لوگوں کی قبر: ایک پختہ عمر کے مرد کی قبر کو عموماً اس کی کمر تک گہرا کیا جاتا ہے اور عورت کی قبر اس کے سینے تک گہری ہوتی ہے۔ قبر کی کھدائی کے وقت اگر زمین ہلکی اور بھربھری ہو اور قبر کھودنے میں آسانی ہو تو اس بات کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کہ خدا متوفی سے خوش ہے۔ لیکن اگر زمین سخت اور پتھریلی ہو اور نیچے سے کوئی چٹان یا پتھر وغیرہ نکل آئے تو لوگ ڈر جاتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ مردہ بڑا گناہگار ہے۔ اور زمین مردے کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔

لحد: قبر شمالاً جنوباً کھودی جاتی ہے۔ مغرب کی سمت ایک اندرونی طاق بنایا جاتا ہے۔ یہ طاق مردے کی لمبائی سے قدرے بڑا ہوتا ہے۔ اس طاق میں مردے کو رکھا جاتا ہے۔ اسی کو لحد کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک بڑا سا پتھر تلاش کیا جاتا ہے۔ کہ لحد کا منہ بند کیا جائے اور قبر کے بالائی منہ کو ڈھانپا جاسکے۔

اب تو خیر قبروں کو باہر سے خوب نقش ونگار بھی کئے جاتے ہیں۔ لیکن دیہات میں آج بھی براہویوں کے ہاں قبر کو سادہ رکھنے کا رواج ہے۔ اور وہ قبر کو زیادہ منقش بنانے کو بہتر خیال نہیں کرتے۔

آخری سفر: تدفین کے تمام مراحل کی تکمیل کے بعد چار آدمی تابوت کو کندھے پر اٹھا کر قبرستان کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ شوہر اپنی بیوی کے جنازے کو کندھا نہیں دیتا۔ جنازے کو کندھا دینے کا روایتی طریقہ کار یہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ پروقار انداز میں تین قدم چلنے کے بعد تابوت کو لحہ بھر کیلئے زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ اور پھر اٹھا کر تین قدم کا فاصلہ طے کرتے ہیں۔ اور تابوت کو نیچے رکھ دیتے ہیں۔ ایک منٹ کے توقف کے بعد وہ پھر تابوت اٹھاتے ہیں۔ اور تین قدم کا فاصلہ طے کر کے تیسری بار تابوت کو نیچے رکھتے ہیں۔ اس کے بعد پھر اٹھاتے ہیں۔ اب اس کے بعد وہ کندھا بدلتے ہوئے قبرستان پہنچنے کے بعد ہی اسے کندھے سے نیچے اتارتے ہیں۔ جنازے میں شامل تمام لوگ باآواز بلند راستے بھر میں کلمہ پڑھتے ہیں۔ ہر شخص باری باری کندھا دیتا ہے۔ کندھا دینے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ پہلے دائیں جانب کے اگلے سرے کو کندھا دیا جاتا ہے اور پھر پچھلے سرے کو اور پھر بائیں جانب کے اگلے سرے کو کندھا دیا جاتا اور پھر پچھلے سرے کو۔ اس طرح ایک چکر پورا کرنے کے بعد ایک فرد دوسرے کو کندھا دینے کا موقع دیتا ہے۔ یہ بہت راسخ خیال ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ کندھا دیتا ہے، اسے اتنا ہی ثواب ملتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر جنازہ ہلکا ہو تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ متوفی نیک سیرت تھا۔ اور اگر خدانخواستہ جنازہ بھاری ہو تو اس کے وزن کو گناہوں کا بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر راستے میں تابوت کی پٹی نکل جائے یا ٹوٹ جائے تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا نے متوفی کے تمام گناہ بخش دئے ہیں۔

نماز جنازہ: نماز جنازہ عموماً قبرستان جانے سے قبل یا قبرستان پہنچ کر نزدیکی میدان میں ادا کی جاتی ہے۔ لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نماز جنازہ قبرستان کے احاطے سے باہر ادا کی جائے۔ اس طرح جب تک جنازہ کو دفنا نہیں دیا جاتا غمزدہ خاندان سے تعزیت نہیں کی جاسکتی۔

لحد میں اتارنا: عموماً خاندان کے دو یا تین قریبی افراد قبر میں اترتے ہیں اور جنازہ کو ہاتھوں سے لے کر قبر میں اتارتے ہیں۔ یہاں بھی شوہر کو اپنی بیوی کو قبر میں اتارنے حتیٰ کہ جنازے کو چھونے تک کی اجازت نہیں ہوتی۔ جنازے کو قبر میں اس طرح اتارا جاتا ہے۔ کہ اس کا سر شمال کی جانب اور پاؤں جنوب کی جانب ہو۔ چند پتھر بطور تکیہ رکھ دئے جاتے ہیں۔ اور چہرہ مغرب کی رخ کر دیا جاتا ہے۔ کہ اس طرح مردہ اپنی آخری آرامگاہ کو دیکھتا ہے۔ ایک عقیدہ یہ ہے کہ اس موقع پر ملا دو پتھر لے کر ان میں سے ایک پر نوکیلے پتھر سے کلمہ لکھتا ہے۔ اور جنازے کی آنکھوں کے سامنے اس پتھر کو گھماتا ہے تا کہ وہ پڑھ لے اور منکر نکیر جب اس سے سوال کرنے آئیں تو وہ انہیں آسانی سے جواب دے سکے۔ البتہ بچے کے لئے اس طریقے پر عمل نہیں کیا جاتا کیونکہ اس کے متعلق یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ معصوم فرشتہ ہوتا ہے۔ اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی جاتی۔

شکی: قبر کو ڈھانپنے کے بعد ایک ٹیلہ سا بنا دیا جاتا ہے۔ اور اس ٹیلے پر دو پتھر نصب کئے جاتے ہیں جنہیں شکی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک پتھر شمال کی جانب اور ایک جنوب کی جانب ہوتا ہے۔ عورت کی قبر پر ان پتھروں کے عین وسط میں ایک اور تیسرا پتھر بھی نصب کیا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے لوح مزار ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ پتھر متوفی کی سماجی حیثیت کو ظاہر کرتا تھا متوفی جتنی بڑی حیثیت کا ہوتا پتھر بھی اتنے بڑے سائز کا رکھا جاتا جبکہ بعض علاقوں میں پتھر کی بجائے کھجور کی شاخیں لگا دی جاتی ہیں۔ بہر کیف لوح مزار کی جدید تختیوں کے بعد اب قبروں پر پتھر اور کھجور نایاب ہی نظر آتے ہیں۔

قبر کا تحفظ: بعض علاقوں میں ایک عقیدے کے تحت قبر کے دو پتھروں کو کفن کی ایک دھجی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دھجی جیسے ہوا میں دائیں بائیں لہرائے گی خدا متوفی کے گناہوں کو بخشے گا اور اس کی عافیت کا خیال کرے گا۔ پہاڑوں کے دامن میں آباد براہوی قبروں پر چھوٹے چھوٹے پتھر چن دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے سنگریزے قبر کے اندر سونے والے پر بوجھ نہیں ہوتے کیونکہ ان سنگریزوں پر درود پڑھا جاتا ہے۔ اگر زمین نرم اور پوپلی ہوتی ہے تو قبر کے کناروں پر سبز جھاڑیوں سے حفاظتی باڑ لگا دی جاتی ہے۔ تا کہ مردہ خور جانور بالخصوص دیہات و قصبات کے گرد و نواح میں پائے جانے والے گور پٹ سے اس کی حفاظت ہو سکے جو قبروں کو کھود کر مردے کھانے کا شوقین ہوتا ہے۔ چالیس دن تک کم از کم جھاڑیوں کی یہ باڑ برقرار رہتی ہے۔ اس کے بعد اسے ہٹا دیا جاتا ہے۔

شہید کی تدفین: جو لوگ جنگ میں یا بے گناہ شہید ہو جائیں ان کی تدفین کی دیگر رسومات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ماسوائے اس کے کہ انہیں غسل نہیں دیا جاتا اور کفن بھی نہیں پہنایا جاتا بلکہ اپنے کپڑوں میں دفن کر دیا جاتا جن میں وہ شہید ہوئے ہوتے ہیں لیکن یہ رسم اپنی اصل ماہیت کے ساتھ اب شاذ ہی کہیں نظر آتی ہے۔

سیاہ کاری کے مجرموں کی تدفین: وہ مرد یا عورت جنہیں سیاہ کاری کے الزام کے تحت قتل کیا گیا ہو۔ ان کے جنازے پر کسی قسم کی رسم نہیں ہوتی نہ انہیں غسل دیا جاتا ہے۔ نہ لباس تبدیل کیا جاتا ہے۔ اور نہ ہی نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔ بلکہ صرف خندق کھود کر انہیں جانوروں کی طرح اس میں پھینک دیا جاتا ہے۔ نہ کوئی باقاعدہ قبر بنتی ہے اور نہ ہی کوئی ان کیلئے تعزیت یا فاتحہ کا ایک لفظ ادا کرتا ہے۔

سوگ اور ماتم

سرگوڑی اور بھتی: جس گھر میں فوتگی ہو جاتی ہے۔ اس گھر کا پانی لنڈھا دیا جاتا ہے۔ میت اٹھنے تک چولہا نہیں جلایا جاتا بلکہ تین دنوں تک سوگ میں چولہا ٹھنڈا رہتا ہے۔ اس موقع پر عزیز و اقارب یا احباب کے ہاں سے غمزدہ خاندان اور مہمانوں کے لئے کھانا آتا ہے۔ جسے ''بھتی'' کہتے ہیں۔ میت کی تدفین کے بعد اس کھانے میں غمزہ گھر کے افراد کے علاوہ وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔ جو میت کو دفنانے میں شریک رہے۔ البتہ خود متوفی کے گھر والے اس کھانے کا اہتمام نہیں کرتے اور جس کھانے کا اہتمام غمزدہ خاندان کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ اسے ''سرگوڑی'' کہتے ہیں۔

تعزیت: اب باقاعدہ تعزیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ غمزدہ خاندان کے گھر کا ایک کمرہ یا اطاق کو تعزیت وصول کرنے کیلئے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ تمام لوگ یہیں آ کر تعزیت کا اظہار کرتے ہیں اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ سوگوار خاندان کا بزرگ ایک کونے میں آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ تمام لوگ اس کے سامنے بیٹھتے ہیں۔ رسمی علیک سلیک ہوتی ہے۔ متوفی کے لئے دعائیں اور تعریفی کلمات ادا کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ اور پھر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ایک ایک کر کے تمام عزیز و اقارب و احباب رخصت ہوتے ہیں۔

مرد جب میت کو دفنا کر گھر آتے ہیں۔ تو عورتیں اس بات کا بغور جائزہ لیتی ہیں۔ کہ انہوں نے منہ ہاتھ دھویا ہے یا نہیں اور یہ بھی کہ انہوں نے اپنے جوتوں سے گرد و غبار کو اچھی طرح دھو لیا ہے یا نہیں اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا ہو تو وہ فوراً سختی سے ایسا کرنے پر مائل کرتی ہیں۔

کیونکہ عورتوں کا عقیدہ ہے کہ اگر بغیر ہاتھ منہ دھوئے اور جوتے کا گرد صاف

کیے بغیر کوئی گھر میں داخل ہوا تو گھر کا کوئی فرد فوت ہو جائے گا یا کوئی اور نقصان ضرور ہوگا۔

فاتحہ یا پتر: خاندان کا جو بزرگ فرد عزاء خانہ میں تعزیت لینے کیلئے بیٹھتا ہے، اسے ''فاتحہ خواجہ'' کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ خاندان کا کوئی اور ضعیف العمر دوست بھی اس کی مدد کیلئے بیٹھتا ہے۔ جھالاوان میں تعزیت داری یا فاتحہ خوانی کی اس رسم کو پتر کہتے ہیں۔ فاتحہ کیلئے آنے والا ہر نیا فرد سلام کہتا ہے۔ پھر فاتحہ پڑھتے اور مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ دعا کے بعد آنے والا سوگوار افراد کے خاندان کی خیریت دریافت کرتا ہے۔ اور جانے والے کے لئے افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ رسمی حال احوال کا سلسلہ چلتا ہے۔ اور پھر متوفی کے آخری لمحات سے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ وہ کس بیماری سے فوت ہوا؟ کس طرح سے اس کی موت واقع ہوئی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ بیان مختصر ہو اور پھر فوراً بات بدل دی جاتی ہے۔ کچھ دیر بیٹھ کر پھر اجازت طلب کرتے ہیں۔

کونٹ حرفنگ: تین دنوں تک مسلسل خاندان کے افراد و احباب اور پڑوس عزا خانے میں آکر بیٹھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے او فاتحہ خواجہ کی دلجوئی کرتے ہیں۔ لیکن ایسا بچہ جس کا پہلا دانت نہ پھوٹا ہو مردوں میں سوگ کے لئے ایک دن کافی سمجھا جاتا ہے۔ تیسرے دن بعد ظہر لوگ آخری مرتبہ تعزیت داری اور سوگ کی مجلس میں شریک ہوتے ہیں۔ اور وہ ''فاتحہ خواجہ'' کی تسلی و تشفی کی کوشش کرتے ہیں۔ فاتحہ خواجہ کی تشفی کے بعد لوگ وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ تب گھر کا کوئی فرد یا احباب اس فرش کو لپیٹ کر کونے میں رکھ دیتا ہے۔ جس پر لوگ آکر بیٹھتے ہیں۔ یہ سوگ کے ختم ہونے کی علامت ہوتی ہے۔ یعنی کہ ماتم گسار اب دنیاوی دھندے کی جانب توجہ دے سکتا ہے۔ اگر قبرستان قریب ہوتا ہے۔ تو فاتحہ خواجہ گھر کے دیگر افراد کے ساتھ مرنے والے کی قبر پر فاتحہ کیلئے جاتا ہے۔ دیگر ساتھ آنے والے احباب فاتحہ کے بعد اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔

پڑس: تین دن کے بعد سوگوار گھر میں دوبارہ چولہا جلتا اور کھانا پکتا ہے۔ اس دوران ان تین دنوں میں دوسرے گھر کے اقرباء و احباب کے گھر سے مرنے والے کے گھر کے لوگوں اور مہمانوں کے لئے کھانا آتا رہتا ہے۔ بلکہ تعزیت کے لئے جو کوئی بھی آتا ہے۔ اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور لاتا ہے۔ اب نقدی دینے کا رواج ہے۔ بلکہ شہروں میں تو یہ رواج بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ تعزیت کے طور پر دی جانے والی امداد کو پڑس کہا جاتا ہے۔ ماضی میں عزا خانہ میں ایک شخص ہر وقت اس ڈیوٹی پر محصور ہوتا تھا کہ وہ بغور جائزہ لیتا رہے کہ آنے والوں میں سے پڑس کے طور پر امداد میں کیا دے رہا ہے۔ تا کہ پھر کسی ایسے ہی موقع پر اس کا یہ احسان لوٹایا جا سکے۔ اس رسم کا بنیادی مقصد سوگوار خاندان کی فوری مالی امداد ہوتا ہے۔ دیہات اور قصبات میں آج بھی اس کا رواج ہے۔

مون شاغنگ: یہ خواتین کے ماتم کی رسم ہے۔ وہ بڑے پیمانے پر سوگ کی رسومات کا باقاعدہ اہتمام کرتی ہیں۔ جیسے ہی میت کو تدفین کے لیے قبرستان لے جایا جاتا ہے۔ ایک کمرے کو بطور عزا خانہ مقرر کر کے وہاں فرش بچھا دیا جاتا ہے۔ اس میں گھر کی غمزدہ خواتین بیٹھتی ہیں اور ان کے بیچ متوفی کے قریب ترین رشتے کی عورت کی بیٹھتی ہے۔ اسے ''ماتن گودی'' کہتے ہیں۔ پڑوس کی عورتیں جب سوگ منانے اور سوگوار کی تعزیت کے لیے آتی ہیں۔ تو مرنے والے کی رشتے دار عورت یعنی ماتن گودی ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے نہیں آتی۔ اور نہ ان سے علیک سلیک کرتی ہے۔ بلکہ اپنے دوپٹے سے منہ چھپا لیتی ہے۔ پڑوس کی عورتیں اس کے قریب بیٹھ جاتی ہیں اور اپنا چہرہ بھی اسی طرح دوپٹے سے چھپا کر آہ وزاری کرتی ہیں۔

نقاب کشائی: پھر کوئی عمر رسیدہ اور بڑی حیثیت ولی عورت ''ماتن گودی'' سے یوں التماس کرتی ہے۔ ''اے گودی! اب اپنے رخ سے نقاب ہٹا لو خدا مرنے والے کی مغفرت کرے اس بے وقت کی موت پر ہم سب سوگوار ہیں مگر سچ یہ ہے کہ جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں۔ آتے لہٰذا اب اپنے رخ سے نقاب ہٹا لو کیونکہ بہتر یہی ہے کہ خدا کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا جائے'' ماتن گودی فوراً نقاب نہیں ہٹاتی بلکہ جواب میں آہ وزاری کرتی ہے۔ تب عمرہ رسیدہ اور بڑی حیثیت والی عورت خود آگے بڑھ کر اسے تسلی دیتے ہوئے اس کے چہرے سے نقاب اٹھا دیتی ہے اور پھر کمرے میں موجود دیگر خواتین بھی اپنے چہرے سے دوپٹہ ہٹا لیتی ہیں۔

ماتم کی مدت: نقاب کشائی کے بعد ماتم کی مدت کا تعین لازمی ہوتا ہے۔ اب وہی عمر رسیدہ خاتون یا ماتن گودی کی کوئی ہم عمر قریبی سہیلی اس سے کہتی ہے۔ ''جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم مضبوط دل کے ساتھ اس کا سامنا کریں۔ سو اب تم ہمیں بتاؤ کہ تم نے ''ماتن'' یعنی مایم کیلئے کیا مدت مقرر کی ہے۔ اور ''سر دھونے'' کے لئے کون سا دن مقرر کرتی ہو؟" جواب میں ماتن گودی آہ وزاری کرتی ہے۔ اور متوفی سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتی ہے۔ پاس بیٹھی عورتیں اسے تسلی دیتی ہیں اور ماتم کی مدت مقرر کرنے پر اصرار کرتی ہیں۔ بالآخر وہ غمناک لہجے میں کہتی ہے "میری آنکھوں کا نور اور دل کا چین تو چھن چکا جس کے جی میں جو آئے کرے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ گیارہ دن تو

ضرور ماتم کریں....."یوں ماتم کی مدت کا تعین ہو جاتا ہے اور یہ کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ دو ہفتے ہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد عورتیں اپنے گھروں کو چلی جاتی ہیں۔ اور تمام لوگوں کو ماتم کی مدت کے بارے میں بتاتی رہتی ہیں۔

پرانے زمانے میں ماتم کے ایام مقرر ہوا کرتے تھے۔ گیارہ دن ایسے مرد کے لئے ماتم کیا جاتا جو بھری جوانی میں فوت ہوا ہو بڑی عمر کے مردوں کیلئے یہ مدت 9 دن اور عورتوں کیلئے 7 دن تھی اسی طرح بلوغت سے قبل اگر لڑکا فوت ہوا تو اس کے لئے 5 دن اور لڑکی کے لئے بھی 5 دن ماتم کیا جاتا جبکہ نوزائیدہ بچے کی وفات پر ماتم کا رواج نہیں۔ اب تو یہ رواج تقریباً متروک ہو چکے ہیں اور غیر اعلانیہ طور پر ماتم کی مدت تین روز ہی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد سر دھونے کی رسم ہوتی ہے۔

سر شوری: ماتم کے مقررہ ایام میں ماتن گودی اور اس کے ساتھ خاندان کے دیگر افراد نیز نزدیک و دور سے آئی ہوئی ماتم گسار عورتیں نہ ایام میں غسل کرتی ہیں، نہ سرمہ لگاتی ہیں اور نہ بناؤ سنگھار کرتی ہیں۔ پھر جب ماتم کے دن پورے ہونے لگتے ہیں۔ تو سر شوری یعنی سر دھونے کی رسم ہوتی ہے۔ اس روز کچھ عورتیں پانی گرم کرتی ہیں۔ بڑی بوڑھی عورت ماتن گودی کو ماتم ختم کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اور اس سے التجا کرتی ہے کہ اب سر دھونے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے بصد اصرار سر دھونے پر تیار ہوتی ہے۔ عورتیں اس کی کلائی تھام کر بڑی محبت سے آنگن میں لے آتی ہیں۔ اس کے بال کھولے جاتے ہیں۔ انہیں صابن سے دھویا جاتا ہے۔ اور پھر ان میں کنگھی کی جاتی ہے۔ قبیلے کے ہر خاندان سے کم از کم ایک عورت سر دھونے کی اس رسم میں ضرور شریک ہوتی ہے۔ اس کے لئے اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ عورتوں کی تعداد طاق ہو۔ پھر جب ماتن گودی کا بناؤ سنگھار مکمل ہو جاتا ہے۔ تو دیگر غمگسار عورتیں بھی اس کے بعد غسل کرتی ہیں لباس بدلتی ہیں اور بناؤ سنگھار کرتی ہیں اسے ''پریت کا آغاز'' کہتے ہیں۔

کاٹم گو افنگ: اس کے بعد تمام عورتیں کھانے پر مل بیٹھتی ہیں تو ایک بزرگ عورت ''کاٹم گوافنگ'' یعنی سر کے بال گوندھنے کے لیے ایک دن مقرر کرنے کی بات کرتی ہے۔ لہٰذا ایک ہفتہ یا دس روز اس مقصد کے لیے کوئی دن مقرر کر لیا جاتا ہے۔ اس دوران صابن سرمہ اور تیل وغیرہ جو عورتیں اپنے ساتھ لاتی ہے۔ خادماؤں یا پڑوس میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ماضی میں ابلی ہوئی کھجوریں تقسیم کرنے کا رواج بھی تھا جو اب تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

سگ: سگ وہ ماتمی لباس ہے۔ جسے ماتن گودی زیب تن کرتی ہے۔ اس کے لیے بھی باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ خواتین مل کر اس فریضے کو انجام دیتی ہیں۔ یہ بڑا غمگین اور اداس منظر ہوتا ہے۔ ماضی میں سگ کی بھی میعاد مقرر ہوتی تھی۔ ماضی قدیم میں یہ میعاد ایک برس تک بھی ہوتی تھی۔ اس دوران وہ اسی لباس کو بار بار دھو کر پہنتی اور کوئی لباس اسے پہننے کی اجازت نہ ہوتی۔ تمام بناؤ سنگھار بھی اس دوران موقوف ہوتا۔ بعد ازاں یہ مدت پانچ ہفتوں تک آ پہنچی۔ لیکن اب ماتم کی مدت کی طرح اس کی میعاد بھی محض تین دن تک رہ گئی ہے۔

ترک زیورات: اگر کوئی عورت بیوہ ہوتی ہے۔ تو وہ تمام تر زیورات و جواہرات پہننا ترک کر دیتی ہے۔ وہ تمام تر زیورات اتار دیتی ہے اور محض ناک میں پہننے کا چھلا اور نیڑا یعنی آویزہ پہنے رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں ماسوا دوسری شادی کی صورت میں بیوہ ایک بار جو زیور اتار دے پھر دوبارہ اسے کبھی نہیں پہنتی۔

سال تننگ: متوفی کی وفات کا دن بالخصوص یاد رکھا جاتا ہے اور پہلی برسی نہایت اہتمام کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ اس روز بڑی ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔ خاندان کے لوگ نزدیک و دور دراز کے رشتے داروں اور احباب کو دعوت طعام دیتے ہیں۔

بیوہ بالخصوص اس دن کو نہیں بھولتی۔ اس کے لئے یہ دن بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس دن کے بعد اب وہ جب چاہے دوسری شادی کر سکتی ہے۔ البتہ ماتم کی مدت جتنی طویل ہوتی ہے۔ عورت کے کے مان و مرتبے میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔

اولیکو عید: غمزدہ خاندان میں پہلی عید نہایت سادگی سے منائی جاتی ہے۔ خاندان کے قرب و جوار کے افراد گھر میں جمع ہوتے ہیں۔ اور ''فاتحہ خوانی'' کو ماتم موقوف کر کے عید منانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ بہر کیف جب تک وہ کپڑے نہیں بدلتا۔ خاندان کا کوئی دوسرا فرد بھی کپڑے نہیں بدلتا۔ بصد اصرار فاتحہ خوانی کو تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود متوفی کے گھر میں نہ تو خوشی کا کھانا پکتا ہے اور نہ کسی قسم کی تقریب ہوتی ہے۔ البتہ اس کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے کیلئے نماز عید کے بعد تمام احباب مل کر پہلے قبرستان جاتے ہیں۔ فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور پھر قبرستان میں یا پھر واپس گھر آ کر خیرات کا اہتمام کرتے ہیں۔

بعد از ماتم

متوفی کے کپڑوں اور سامان کا مصارف: متوفی کے کپڑوں اور

دیگر استعمال میں رہنے والی دیگر اشیاء کا پہلا حقدار مولوی ہوتا ہے۔ جو اسے غسل دیتا اور نماز جنازہ پڑھتا ہے۔ بصورت دیگر دیگر اضافی سامان کسی ضرورت مند کو دے دیا جاتا ہے۔ ماضی میں یہ ہوتا تھا کہ جس روز متوفی کو دفنایا جاتا اس شام ملا کو ایک کمرے میں بلایا جاتا اس کمرے میں ایسی خواتین ہوتیں جو پردہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ ملا کو وہ تمام کپڑے دے دیتیں جو متوفی کے استعمال میں رہ چکی ہوتیں نیز ایک نیا جوڑا اور پیالہ بھی ملا کو "غسل جنازہ" کے عوض دیا جاتا۔ ملا ان چیزوں کو لینے کے بعد متوفی کے لیے فاتحہ پڑھتا اور ایصال ثواب کیلئے دعا کرتا۔

فاتحہ نا ارغ: متوفی کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے کے لئے خاندان کے لوگ گوشت چاول اور شیرینی تیار کرتے ہیں۔ اور اسے اتنی مقدار میں ہر وقت گھر میں رکھتے ہیں۔ جتنی ایک شخص کی خوراک ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ کہیں مرنے والے کی روح یہ نہ سمجھے کہ اسے بھلا دیا گیا ہے۔ اسے "فاتحہ نا ارغ" کہا جاتا ہے۔ یہ مولوی کو بھجوادیا جاتا ہے۔ چالیس دنوں تک ہر روز یہ کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ اور شام کے وقت مولوی کو بھجوادیا جاتا ہے۔ اس کھانے سے فقیروں اور دیگر غرباء و مساکین کو بھی حصہ دیا جاتا ہے۔

خاتمہ یا ختم: متوفی کی وفات کے بعد سے سات ہفتے تک ہر جمعرات کو مولوی اور اس کے شاگردوں کو قرآن مجید کا ختم پڑھنے کے لئے متوفی کے خاندان والے بلاتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ متوفی کیلئے تین یا پانچ ختم تو کرانے چاہئیں مولوی اپنے شاگردوں کے ساتھ متوفی کے گھر تشریف لاتا ہے۔ جہاں وہ مل کر قرآن مجید کے تین سپاروں کا ختم پورا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے لئے طعام کا انتظام کیا جاتا ہے طعام سے قبل مولوی متوفی کی روح کے ایصال ثواب کیلئے دعا مانگتا ہے اور طعام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

موردیتا نان: ویسے تو عمومی طور پر دو عیدین کے علاوہ تمام تہواروں کے موقع پر مرنے والوں کی روحوں کو ایصال ثواب پہنچانے کے لئے خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ نیاز تقسیم ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں دسویں محرم یعنی "اماک" سب سے مقدس دن شمار ہوتا ہے۔ اس دن زردہ، چاول، گوشت حلوہ اور بہت کچھ پکایا جاتا ہے۔ اور بعد مغرب مولوی کو بلوایا جاتا ہے۔ خاندان کے تمام لوگ جمع ہوتے ہیں اور ہر پکی ہوئی چیز میں سے کچھ حصہ نکال کر رکابی میں رکھا جاتا ہے۔ مولوی تمام وفات پاجانے والوں کی روح کے نام فاتحہ پڑھتا ہے۔ اور نیاز تقسیم کرنے کی ابتداء کرتا ہے۔ براہویوں میں رواج ہے کہ میٹھے چاول اور گوشت کی نیاز کرتے ہیں۔ جبکہ بچوں کی روحوں کی نیاز دودھ پھل یا شیرینی پر کرتے ہیں۔ نیاز کے بعد پڑوسیوں، احباب، عزیز و اقارب میں نیاز کی چیزوں کا حصہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور اگر کہیں سے حصہ آیا تو اس کے بدلے میں حصہ بھیجنے والے گھر کو بھی حصہ بھیجا جاتا ہے۔

قبر کو تازہ کرنا: دسویں کی صبح کو گھر کا بزرگ خاندان کے ایک دو افراد کے ساتھ قبرستان جاتا ہے وہ اپنے ساتھ مسور کی کچھ دال اور ایک مرتبان میں گلاب کی پنکھڑیاں اور مورت کی پتیاں اور پانی ڈال کر لے جاتے ہیں اور اپنے مرنے والے کی قبر پر پہنچ کر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اور پھر سرہانے مسور کی دال مٹھی میں لے کر ڈال دیتے ہیں۔ اور پوری قبر پر پانی گلاب کی پنکھڑیاں اور مورت کی پنکھڑیاں چھڑکتے ہیں۔ اور اس طریق پر اپنے مرے والے کی دوسری قبر پر پہنچ کر عمل کرتے ہیں۔ اس طرح ان قبروں سے ملحقہ قبروں کو بھی اسی طرح سے تازہ کرتے ہیں۔ اور دوسروں کی قبروں پر مسور کی دال اور گلاب کی پنکھڑیاں مورت اور پانی چھڑکتے ہوئے یہ دعا کرتے ہیں۔ کہ "اے خدا! اپنے حبیب کے صدقے میرے اس عمل کے اجر میں میرے ان پیاروں کی قبر پر رحمت نازل فرما جو دور دراز علاقوں میں آسودہ خاک ہیں۔"

مرگ سے متعلق توہمات و متروک شدہ رسوم: براہویوں سے مرگ کے حوالے سے بعض ایسی رسومات و روایات وابستہ ہیں۔ جو اب عملی طور پر تو بالکل ہی معدوم ہو چکی ہیں۔ مگر روایتاً ان کا ذکر ہمیں قصے کہانیوں کے علاوہ زبانی بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں بعض ایسے توہمات بھی قابل ذکر ہیں۔ جن پہ اب اعتقاد تو نہیں کیا جاتا لیکن دلچسپ ہونے کے باوصف یہ براہوی ثقافت کا وہ انفرادی مظہر ہیں، جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ آج بھی اسی طرح منتقل ہوتے آرہے ہیں۔ ذیل میں چند اہم و دلچسپ توہمات و رسومات کا ذکر پیش ہے۔ جو اب روایات کا حصہ بن چکے ہیں۔

متوفی کی قسمت محفوظ کرنے کا طریقہ: قدیم زمانے میں اس طریقے پر باضابطہ طور پر عمل کیا جاتا تھا کہ لوگ اگر سمجھتے ہیں کہ مرنے والا اپنے ہم چشموں میں بخت آور ہے۔ تو اس کا دم رکتے ہی چاندی کا کوئی سکہ اس کی پیشانی سے رگڑ کر محفوظ کرلیا جاتا۔ یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ اس طرح اس کی بخت آوری سکے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اور جب تک یہ سکہ محفوظ رہتا ہے۔ اس کے بچے اور بچوں کے بچے بخت آور ہوتے ہیں۔

عورت کو زیور کے ساتھ دفن کرنا: ماضی میں یہ روایت تھی کہ اگر متوفی عورت سہاگن ہوتی تو اسے نفیس لباس پہنا کر زیورات پہنا دیئے جاتے جیسے کہ اس شادی کیلئے دلہن بنایا جارہا ہو بعض کھاتے پیتے گھرانے کے افراد اپنے سماجی مرتبے

کے اظہار کے طور پر بھی اپنی خواتین کو قیمتی زیورات کے ساتھ دفن کرتے تھے۔

مہندی رچانا: قدیم عہد میں جواں سالی میں فوت ہونے والوں کو خواہ وہ عورت ہوں یا مرد مہندی لگانے کا بھی رواج تھا یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ بھری جوانی میں فوت ہوئے اور اس کے باوجود دنیا کی مسرتوں سے ہمکنار ہو کر رخصت ہوئے۔

غسل و کفن کا خصوصی اہتمام: مولوی کے دیر سے آنے کی صورت میں متوفی کے پیٹ پر لوہے کی سلاخ رکھ دی جاتی تھی تا کہ پیٹ نہ پھولے اور چاول سے بھرا ہوا برتن یا اگر ضرورت ہوتی تو گندم اور دوسرے غلے رکھے جاتے تھے۔ یہ چاول سے بھرا برتن اور غلہ غسال کا ہوتا تھا۔ خواہ وہ عورت ہو یا مرد اس کے ساتھ ہی کفن لانے کیلئے موجود ایک آدمی کو گاؤں بھیجا جاتا خواہ کفن کیلئے نئے کپڑے کے تھان گھر میں ہی موجود کیوں نہ ہوں، کیونکہ یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو گھر کا کوئی اور فرد بھی فوت ہو جائے گا۔

قطب ستارہ: قدیم عہد میں جنازے کو گھر سے باہر نکالنے کا مسئلہ نہایت پریشان کن ہوتا تھا کیونکہ وہ ایسے ستارے کو نحس اور آفت میں مبتلا کرنے والا قرار دیتے جو دروازے کے سامنے رخ پر ہو۔ ایسے میں مردے کو دروازے سے باہر نکالنا خالی از علت نہیں گردانا جاتا تھا۔

حیرت انگیز طور پر جب کوئی شخص وفات پا جاتا تو انہیں یہ اندازہ لگانے میں ذرا وقت نہیں ہوتی کہ ستارے کا محل وقوع کیا ہے؟ اور اگر گھر کا دروازہ جنوب کی جانب کھلتا ہے اور اگر یہ چاند رات کی تیسری یا چوتھی تاریخ ہو تو یہ بات طے ہوتی کہ وہ جنوبی دروازے سے مردے کو باہر نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس لئے کہ دروازے کی طرح ستارہ بھی جنوب میں اس دن ہوتا لہٰذا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہتا کہ شمال سمت کی دیوار توڑ کر مردے کو گھر سے باہر نکالا جاتا اس سے بھی عجیب یہ رسم تھی کہ مردے کو چاند کی نویں انیسویں اور بیسویں تاریخوں میں دفنانے کی اجازت ہی نہ تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان دنوں ستارہ زیر زمین ہوتا ہے۔

سلام مون تننگ: اس کا مطلب ہے پہلے والوں کو سلام بھیجنا۔ ہوتا یہ تھا کہ جب جنازے کو قبرستان لایا جاتا تو لوگ سلام آخر پیش کرتے تھے اور اس کے ذریعے اپنے گزرے ہوئے یعنی وفات پا جانے والے لوگوں کو سلام بھیجتے۔ مثال کے طور پر کوئی ماں جس کا بیٹا بہت پہلے وفات پا چکا ہو وہ آگے بڑھ کر متوفی کے کان میں کہتی ''میرے پیارے! میرے پیارے بچے کو پیغام دینا کہ ہم اسے بہت دنوں تک یاد کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس کے پیچھے آئیں لہٰذا وہ خدا کے لئے ہماری اس دعا میں شریک ہو جائے بالخصوص عورتیں مرنے والوں کے ذریعے اس طرح کے پیغامات ضرور بھجواتیں۔

تدفین کے وقت سے متعلق توہمات: بعض براہوئیوں میں یہ راسخ عقیدہ تھا کہ مردے کو بہر صورت شام ہونے سے پہلے دفنا دینا چاہئے بالخصوص اس کے لئے صبح کا وقت نہایت بہتر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اندھیرے میں جنازہ اٹھانے سے مرنے والا بد دعا دیتا ہے۔ بعض کا خیال یہ تھا کہ رات کے وقت تدفین سے وہ لوگ جو پہلے سے قبرستان میں دفنائے گئے ہیں، ان کی نیند خراب ہوتی ہے۔ اور ایک نئے مردے کو رات کے وقت مردوں کی محفل میں لانے سے خدا بھی ناخوش ہوتا ہے۔ کوئی بوڑھی عورت کہتی کہ رات کے جنازہ لے جانے والوں کو جنات راستے میں گھیر لیتے ہیں۔ اور محض تفریح کے طور پر ان میں سے کسی کو دبوچ کر اس کا ہوش اڑا دیتے ہیں بلکہ ہلاک بھی کر دیتے ہیں۔

زر افشاں تننگ: اس سے مراد ہے۔ دولت نچھاور کرنا امراء اور بالخصوص خان قلات کے خاندان میں یہ رواج تھا کہ جب تابوت قبرستان لے جایا جاتا تو وہ چاندی اور سونے کے سکے راستے میں اس پر نچھاور کرتے۔ اسے ''بٹکی'' کہا جاتا تھا نچھاور کئے جانے والے یہ سکے بچے جمع کر لیتے تھے یا آخر میں فقیروں میں تقسیم کرتے تھے۔

ڈڈ تو ننگ: یہ ایک عجیب رواج ہے۔ جو بیسویں صدی کے وسط تک بھی امیر گھرانوں بالخصوص شاہی گھرانے میں مروج رہا۔ اس میں ہوتا یہ کہ جیسے ہی میت کو قبر میں اتارا جاتا ایک ڈومب کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے عورتوں کے اجتماع میں معہ ڈھول پہنچا دیا جاتا۔ جہاں ماتن گودی خاندان کی عورتوں سہیلیوں اور خادماؤں کے ساتھ آتی۔ یہ سب ننگے سر ہوتی تھیں اور ان کا دوپٹہ کمر سے بندھا ہوتا تھا وہ ڈومب یعنی ڈھول بجانے والے کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑی ہوتیں ڈھول بجانے والا عورتوں کے دائرے کے وسط میں کھڑا ڈھول پر غمناک تال بجانے لگتا اور غم کی علامت کے طور پر ڈھول نیلا رنگا ہوتا۔ اس لئے عورتوں میں کوسنے کے طور پر یہ محاورہ مشہور ہوا کہ ''خدا کرے تیرا ڈھول نیلا ہو جائے۔''

بہر کیف ہوتا یہ کہ جیسے ہی ڈھولک والا ڈھول پر رقت آمیز غمناک تال بجاتا۔ کوئی خادمہ یا کنیز اپنی آواز اٹھاتی اور متوفی کی توصیف میں مود (مرنے والے کا مرثیہ) گانے لگتی جب وہ ایک بول گاتی تو ماتن گودی اور دوسری عورتیں اسے کورس کی

صورت میں دہراتیں۔ ساتھ ہی روتیں، بلکتیں اور آہ وزاری کرتیں وہ اپنے ہاتھوں سے منہ کو پیٹتیں پھر رانوں کو پیٹتیں اور چکر لگاتیں ہر عورت کی پشت پر ایک کنیز کھڑی ہوتی جو اسے کمر سے پکڑے سہارا دیئے ہوتی کہ کہیں وہ مارے غم کے زمین پر ڈھیر نہ ہو جائے۔ تین دن تک ڈھول کی تال پر یونہی ماتم کیا جاتا تا آنکہ ماتن گودی بڑی بوڑھیوں کے اصرار پر ماتم ترک کرنے پر طوعاً و کرہاً رضامند نہ ہو جاتی۔ لوگ یہ کہتے کہ ''ماتم میں شدت نہ کرو، اس سے خدا خفا ہوتا ہے۔''

ماتمی لباس کی قسمیں: ماضی میں ماتمی لباس مخصوص قسم کے ہوا کرتے تھے جنہیں سوگ کی علامت کے طور پر خواتین زیب تن کرتی تھیں۔ جیسے کہ سارا وان کی صاحب حیثیت عورتیں سفید دوپٹہ اور قمیض پہنتی تھیں۔ لال رنگ کا ماتمی لباس ہرگز نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ شادی کا رنگ ہے۔ اور ایک بیوہ ماتم کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی اس رنگ کا لباس نہیں پہنتی۔ ماتمی قمیض پر سادہ کشیدہ کاری ہوتی تھی لیکن اس کے بہت سے نقاط نشانات اور نمونے درمیان میں ادھ سلے چھوڑ دیئے جاتے تھے لہٰذا یہ طے ہوتا تھا کہ ایک بار جس کا اکلوتا بچہ فوت ہوا ہوتا اس کی قمیض پر چٹ یا لڑ یا نیام ٹکر ہرگز نہ ہوتا۔ ایک بیوہ جس کا بڑا بیٹا فوت ہوا ہوتا سادہ دھاگہ کی کشیدہ کاری والی قمیض پہنتی لیکن ایک ایسی بیوہ جس کے بچے ہوتے اس کی قمیض میں ''نیام ٹک'' اور ''گل گل چک'' کاڑھی جاتی یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ وہ بیوہ ہونے کے باوجود چند بچوں کی ماں ہے۔ اگر وہ سادہ قمیض پہنتی تو لوگ یہ سمجھتے کہ وہ بے اولاد بیوہ ہے۔ جھالاوان میں غم کا علامتی رنگ سیاہ ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ وہاں عموماً عورتیں سیاہ رنگ کی براہوی قمیض شوق سے پہنتی تھیں۔ اس لئے یہ جاننے کیلئے کہ وہ سوگ میں ہے۔ یا نہیں، اس کی کشیدہ کاری کا جائزہ لیا جاتا۔

ملا تولیفنگ: اس میں یہ ہوتا تھا کہ متوفی کو دفنانے کے بعد تین دن تک یا اس سے کچھ زیادہ مدت کے لئے ایک مولوی کو قبر کی نگرانی کیلئے مقرر کیا جاتا۔ اس کے ساتھ عموماً اس کا کوئی شاگرد بھی ہوتا ان دونوں کی آرام و آسائش کا خیال متوفی کے گھر والے رکھتے وہ قبر کے پاس ان کیلئے خیمہ نصب کرتے اور ان کے لئے کھانے کا اہتمام کرتے نذرانہ اس کے علاوہ ہوا کرتا تھا۔ ملا اور اس شاگرد شب و روز قبر کی نگرانی کرتے اور قرآن حکیم کی تلاوت کرتے رہتے۔ یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ ان تین دنوں میں منکر نکیر متوفی کے پاس آتا ہے اور اس کے اعمال کا حساب لیتا ہے۔ ایسے نازک موقع پر غریب گنہگار شخص کو مولوی کی موجودگی اور قرآن حکیم کی تلاوت سے بڑی ڈھارس ہوتی ہے اور وہ منکر نکیر کے سوالوں کا جواب تسلی بخش طور پر دے سکتا ہے۔

تن شود کے مقام پر چراغاں: متوفی کو جس جگہ غسل دیا جاتا وہاں ہر شام ایک چراغ جلایا جاتا تھا اس روایت پر عمل کرنے والے براہویوں کا یہ عقیدہ تھا کہ متوفی کی روح اس جگہ آتی ہے۔ اور پھر اپنے خاندان کے افراد کو دیکھنے جاتی ہے۔ کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لہٰذا تین دنوں تک غسل کی جگہ ہر شام چراغ جلایا جاتا اور پھر چالیسویں تک ہر جمعرات کو تن شود کے مقام پر چراغ جلایا جاتا کیونکہ اس بات کو برا سمجھا جاتا تھا کہ متوفی کی روح جب گشت پر آئے تو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی پھرے۔ علاوہ ازیں اگر متوفی صاحب حیثیت ہوتا تو جہاں اسے غسل دیا جاتا تھا وہاں ایک دیوار کھڑی کر دی جاتی اور اسے پتھروں سے نشان زدہ کر دیا جاتا تا کہ ایسا نہ ہو کہ لوگ ادھر گھومتے پھریں اور بے خبری میں اس ''پاک جگہ'' پر قدم رکھیں۔

رات کے وقت گھنٹی بجانا: اگر کوئی بچہ دھات کا پیالہ رات کے وقت زمین پر پٹختا اور اسے زور سے بجاتا تو عورتیں اسے بے خیال شریر، کہہ کر سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے منع کرتیں کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ جب یہ آواز مردہ سنتا ہے۔ تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ حشر کا صور ہے۔ سو وہ قبر سے اٹھ کر آواز کی جانب دوڑ پڑتا ہے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ ابھی قیامت نہیں آئی اور دنیا حسب سابق قائم ہے۔ تو وہ گھنٹی بجانے والے کو بددعا دیتا ہے۔ کہ اس نے اس کے ساتھ مذاق کیا اور اسے گہری ابدی نیند سے خواہ مخواہ بیدار کر دیا۔

مرنے والوں کے نام نہ لینا: پرانے زمانے میں براہوی خواتین و حضرات مرنے والے کے نام کو زبان پر لانا انتہائی نامبارک تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ متوفی کا نام لینے سے کوئی نہ کوئی برائی یا نقصان ضرور ہوتا ہے۔ اکثر عورتوں کا یہ خیال تھا کہ سوئم کے طعام کے بعد بالخصوص مرنے والوں کا نام ہرگز ہرگز نہیں لینا چاہئے اور اگر ضروری ہو تو اشارتاً لینا چاہیے۔ اگر کوئی یونہی نام لے کر پکارتا تو لوگ اسے برا بھلا کہتے لیکن اگر کوئی نوجوان غروب آفتاب کے بعد مرنے والے کا نام لے تو اس پر آفت پڑنے کو یقینی سمجھا جاتا۔

خواب میں روحوں کا آنا: پچھلے زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ روحیں شریر ہوتی ہیں اور بالخصوص بڑے بوڑھے لوگوں کی روحیں سب سے زیادہ خطرناک ہوتی تھیں اور اگر گھر کے کسی بوڑھے شخص کی وفات کے بعد کوئی شخص بیمار ہوتا تو اس کی بیماری کی وجہ اس بوڑھے شخص کی روح کو سمجھا جاتا۔ مردوں کی روحوں کے منڈلانے سے تحفظ کا بہترین طریقہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ قبر کے چاروں کونوں پر لوہے کی کیل ایسے وقت میں ٹھونک دی جائے جب کوئی دوسرا دیکھنے والا

نہ ہو اور اگر اس کے باوجود مرنے والے کی روح منڈلائے تو ایک مرتبہ پھر اس عمل کو دہرایا جائے۔

کسی مرنے والے کی روح اگر خواب میں آجاتی تو کوئی بڑی بوڑھی سمجھدار عورت اسے بکرے یا بھیڑ کی قربانی دینے اور گھر کے پیر بزرگ کی نذر و نیاز کرنے کا حکم دیتی لیکن قربانی کرنے والے کے لئے لازم ہوتا کہ وہ کسی کو بھی قربانی کی اصل وجہ نہ بتائے اور صرف یہ کہہ دے کہ میں نے قربانی کی منت مانی تھی۔

روحوں کی آمد کو روکنے کے مختلف طریقے: اس کے باوجود بھی اگر روحیں خواب میں آنے سے نہ چوکتیں تو پھر جس کو وہ خواب میں نظر آتیں وہ ایک پیاز لیتا اور اسے سامنے رکھ کر ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگتا ''اے خدائے بزرگ و برتر فلاں کی روح جو فلاں کی بیٹی ہے۔ (ماں کا نام اس لئے لیا جاتا، تاکہ غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہ رہے) میں یہ پیاز اس کی نذر کرتا ہوں تاکہ وہ پھر خواب میں کبھی اپنا چہرہ نہ دکھائے۔ یہ بات اسے بتا دی جائے میں التجا کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد بھی اگر روح خواب میں آنا ترک نہ کرتی تو عموماً یہ روایتی طریقہ آزمایا جاتا کہ ایک بوڑھی عورت گھر سے باہر جا کر تنہائی میں ذرا سا ''گوبر'' اس کو کھلا دیتی جسے خواب میں روح نظر آتی۔ اسے عموماً کامیاب ٹوٹکا سمجھا جاتا۔

ماضی میں جب قبائل کی باہمی لڑائیاں معمول کا حصہ تھیں تب یہ رواج تھا کہ میدان جنگ میں کسی مردے کو پڑا رہنے دینا ہتک آمیز سمجھا جاتا تھا' خواہ وہ شخص دشمن ہی کیوں نہ۔ ہو فاتح سردار اپنے دشمن کے مردوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتے۔ وہ اپنے آدمیوں کو مردے کو اٹھا کر چارپائی پر رکھنے کا حکم دیتے اور اپنے سامنے لانے کو کہتے۔ پھر خلعت یعنی چادر ڈال کر اس کی عزت افزائی کرتے اور تمام تر رسومات کے ساتھ اسے اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کرواتے۔

اسی طرح اگر میدان جنگ میں کسی شخص کی انگلی، ہاتھ یا جسم کا کوئی عضو کٹ کر گر جاتا تو اسے بڑی بے عزتی سمجھا جاتا کہ وہ میدان جنگ میں اسی طرح پڑا رہے۔ اور چیل کوے اسے نوچ کر کھائیں لہٰذا چن کر جمع کیا جاتا اور باقاعدہ غسل کے بعد کفنا کر قبرستان میں دفنا دیا جاتا۔

اب یہ تمام رسوم و رواج متروک ہو کر روایت کا حصہ بن چکے ہیں۔ جبکہ جدید عہد میں اب توہمات کا کوئی جواز باقی نہیں رہا لیکن آج بھی ان ترک شدہ رسومات کے پس منظر میں براہوی ثقافت کی رنگارنگی کی جھلک واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

روایتی پکوان

ہر قوم جو ایک مخصوص جغرافیائی اور ثقافتی حدود میں مقیم ہو، مخصوص لباس اور بود و باش کی حامل بھی ہوتی ہے جو اس کی جغرافیائی و ثقافتی انفرادیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ براہوی چونکہ اکثر پہاڑوں کے دامن میں رہائش پذیر رہے ہیں اس لئے ان کی بود و باش بھی منفرد اور دلچسپ ہے۔ آج بھی براہویوں کے ہاں خوشی اور غمی کی تقریبات کے مواقع پر مخصوص قسم کے پکوان پکائے جاتے ہیں جو کسی بھی جگہ براہویوں کی جداگانہ شناخت کے مظاہر میں سے ایک ہیں۔

ذیل میں ایسے ہی چند اہم پکوانوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو ڈینس برے نے "براہوئی رسم و رواج" میں درج کئے ہیں۔

خوشی کے پکوان

کوحل کی تقسیم: چاند کے ساتویں مہینے کی پہلی تاریخ کو "کوحل" بانٹا جاتا ہے ساتواں مہینہ حمل کا ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے سات غلے جو، جوار، گندم، چاول، مڑ، باجرہ اور انواع و اقسام کی دال کو ملا کر ایک بڑی دیگ میں پکایا جاتا ہے۔ سات قسم کا غلہ ہونا ضروری ہے۔ اگر جوار نہ ہو تو اس کی جگہ کوئی اور غلہ ڈالا جاتا ہے۔ جب یہ پک کر تیار ہوتا ہے تو چھوٹی، چھوٹی طشتریوں میں اس ملغوبہ (جسے کوحل کہا جاتا ہے) کو نکال کر عزیز و اقارب اور احباب میں تقسیم کیا جاتا ہے کوحل کی تقسیم اس بات کے علامت ہے کہ بچہ ہونے والا ہے اور جس کے ہاں کوحل بھیجا جاتا ہے وہ خالی طشتری نہیں لوٹاتا بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق اس میں کچھ نہ کچھ... پوت، کوئی کپڑے کا ٹکڑا یا سکہ بطور بچے کی دید کے لیے رکھ کر لوٹاتا ہے۔

شنیکی: یہ خاص شیرینی "گڈبڑی" کے موقع پر تقسیم ہوتی ہے۔ بچے کے ختنے کا دن مقرر ہونے کے بعد اس سے چند روز قبل عزیز و اقارب یا پاس پڑوس کی خواتین اس تقریب میں شریک ہوتی ہیں اس موقع پر انہیں بچے کے کپڑے ناپنے تراشنے اور سینے کا نیوتہ دیا جاتا ہے اور جب عورتیں جمع ہوتی ہیں تو کنیز میں ڈھول بجاتی اور گیت گاتی ہیں۔ بچے کا کپڑا عورتوں کی محفل میں لایا جاتا ہے اور ناپنے و تراشنے کا عمل شروع ہوتا ہے وہ کپڑے پر کپڑے رکھ کر ناپتی اور تراشتی جاتی ہیں اور جیسے جیسے کپڑا تراشا جاتا ہے اس پر شیرینی نچھاور کرتی ہیں اس شیرینی کو شنیکی کہا جاتا ہے کنیزیں اور بچے شنیکی کو لوٹنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ بعد از تقریب ضیافت کے لیے گندم چھان پھٹک کر لہوانا کے

لیے چکی بھجوانا ہوتا ہے اور جب یہ سب کام انجام پا چکتا ہے تو بچے کا باپ اگر صاحب حیثیت ہوتا ہے تو ایک بھیڑ ذبح کرتا ہے اور اس کی بھنی بنا کر مہمانوں کی تواضع کرتا ہے۔

غمی کے پکوان

اول شام یا لنگڑی: جس گھر میں فوتگی ہو جائے روایت ہے کہ وہاں تین دن تک چولہا نہیں جلتا اور نہ ہی کچھ پکایا جاتا ہے۔ لہذا خاندان کے قریبی رشتے دار کے گھر سے کھانا پک کر سوگوار گھر کے لوگوں کے لیے آتا ہے۔ اس کھانے کو سارا وان کے براہوی "اول شام" اور جھالاوان کے لوگ "لنگڑی" کہتے ہیں اس کھانے میں زیادہ تکلف اور اہتمام نہیں کیا جاتا۔ متوفی خواہ عورت ہو یا مرد ایک بھیڑ یا بکری ذبح کی جاتی ہے لیکن اگر تعزیت داروں کی تعداد زیادہ ہو تو تین بھیڑ میں یا پانچ بکریاں ذبح کی جاتی ہیں۔ تعداد کی کوئی قید نہیں البتہ طاق ہونا چاہیے۔ جفت نہیں۔ اور ان بھیڑ بکریوں کو سوگوار گھر کے گلے سے بھی نہیں ہونا چاہیے۔

اب تو خیر یہ رواج متروک ہو چکا ہے یا کہیں دور دراز دیہات میں اتفاق سے موجود ہو وگرنہ پہلے ذبح ہونے والے ہر جانور کے ساتھ چالیس پونڈ گندم کے آٹے کی ایک "لٹی" بھی لازماً پکائی جاتی تھی، یہ ایک خاص قسم کی گول روٹی ہوتی ہے جو عموماً براہویوں ہی کے ہاں پکائی جاتی ہیں۔

روشیف کننگ: یہ خاص اصطلاح فاتح کے کھانے میں "فاتح خواجہ" کو شریک کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے، جو کھانے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ تب کوئی معتبر شخص اس کی کلائی پکڑ کر کہتا ہے کہ "اس پر پانی ڈالو" کیا یہ فاقے سے رہے گا۔ اور وہ خدا سے لڑے گا؟ لہذا ٹھنڈی سانس کھینچ کر فاتحہ خواجہ لوگوں کو اپنی ضد پوری کرنے دیتا ہے اور اس کے بعد تمام مہمان ہاتھ دھوتے ہیں اور پھر کھانا لایا جاتا ہے لیکن فاتحہ خواجہ کھانے کو نہ چھوتا ہے اور نہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے لہذا پھر معتبرین اس کا ہاتھ پکڑ کر رکابی لقمے آہ سرد کے ساتھ نگلتا ہے اور کمرے میں موجود تمام لوگ کھانے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس رسم کو "روشیف کننگ" کہا جاتا ہے۔

اول شام میں شرکت سے اغماض: قرب و جوار میں یہ عقیدہ بھی پایا جاتا ہے کہ "اول شام" کے کھانے میں آزادانہ شرکت نہیں کرنا چاہیے۔ یہ خالی از علت نہیں ہوتا۔ عورتوں کا خیال ہے کہ اس سے گھر کا کوئی فرد جلدی ہی مر جاتا ہے اور وہ لوگ جو بخار میں مبتلا ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی بہانے اس طعام میں شریک نہیں ہوتے مبادا ان کا بخار تیز ہو جائے یا وہ بخار خطرناک صورتحال اختیار کر لے لہذا چند اور وہ بھی خاندان کے خاص الخاص افراد اور محب صادق ہی "اول شام" کے طعام میں شرکت کیا کرتے ہیں۔

عمومی دسترخوان: براہویوں کا عمومی دسترخوان نہایت روایتی ہے اور یہ خاصا طویل ہوتا ہے کیونکہ براہویوں کے ہاں آج بھی قصبات سے لے کر شہروں تک مشترکہ خاندانی نظام رائج ہے اور گھر کے تمام افراد کے مل کر کھانے کا رواج ہے اس لئے گھروں میں بچھایا جانے والا عمومی دسترخوان بھی اچھا خاص طویل ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ سادگی اور حسن میں بھی اپنی مثال آپ ہوتا ہے براہوی خواتین دسترخوان کے لیے ایک کپڑے پر بڑی دلکش کشیدہ کاری کرتی ہیں اور اس پر بڑے سلیقے سے پکوان سجاتی ہیں۔ جہاں بچے، بڑے اور خواتین سمیت اکثر تمام اہل خانہ مل کر کھانا تناول کرتے ہیں۔

خصوصی دسترخوان: شادی وغمی کی تقریبات کے علاوہ مہمانوں کی آمد پر بھی خصوصی دسترخوان سجائے جاتے ہیں جیسا کہ مہمان نوازی بلوچ معاشرے کا قدیم رویتی وصف ہے۔ اس لئے مہمان کو خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ دیہات میں اگر مہمان آ جائے تو اس کی مدارات کیلئے گلے کا اہم ترین مویشی ذبح کرنے میں دیر نہیں لگائی جاتی اور اس کی خاطر مدارات میں ذرہ برابر تامل سے کام نہیں لیا جاتا۔ اس موقع پر خصوصی طعام بھی پکائے جاتے ہیں۔ دسترخوان گو کہ مختصر مگر نہایت پر تکلف ہوتا ہے۔

رشتے دار اگر قریبی یعنی خاندان میں سے ہے تو روایت وہی رہتی ہے یعنی تمام افراد ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں اور اگر مہمان دور کا رشتے دار یا دوست عزیز ہو تو اس موقع پر الگ دسترخوان سجایا جاتا ہے اور گو کے مرد و بزرگ افراد دسترخوان پر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ مرد اور خواتین کے لیے الگ، الگ دسترخوان لگائے جاتے ہیں۔

گھر، عمارات اور روزمرہ استعمال کی اشیاء

قدیم اور روایتی طرز رہائش: اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی نے اپنی کتاب "براہوی نامہ" میں خاصی تفصیل سے ذکر کیا ہے ذیل میں اہم اشیاء کا ذکر کیا جاتا ہے۔

گدان: بکری کے بالوں سے بنا ہوا کمان نما خیمہ، گدان کے سامنے کا پردہ "پژدر" کہلاتا ہے اور ارد گرد لگائی ہوئی جڑی بوٹیوں کو "پل" کہتے ہیں۔

چوڑی: گدان کو باندھنے کی رسی ان کی تعداد چھ ہوتی ہے۔ کمان نما لکڑیوں میں سے ہر ایک لکڑی جس پر گدان کو کھڑا کیا جاتا ہے "گندار" کہلاتی ہے۔

گیندار بندوک: یہ گیندار میں باندھنے کی ڈوری ہوتی ہے۔ اس ڈوری کو

پھول دار بناتے ہیں۔

منک / منج: گدان کو ذرا اونچا کھڑا کرنے کے لیے اندر کی جانب جو لکڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں، یہ ان کا مخصوص نام ہے۔

عمومی گھر

بروک / برونک: رضائی گدیلے جو ایک خاص ترتیب سے گدان یا گھر کے ایک کونے میں رکھے جاتے ہیں۔

بریالہ: کپڑے وغیرہ رکھنے کی الماری جو دیوار میں مٹی سے بنائی جاتی ہے۔ رضائی گدیلوں کو ترتیب سے رکھنے کا عمل "سورانگ" کہلاتا ہے۔ رضائی گدیلے جو خاص ترتیب سے چارپائی پر رکھے ہوں انہیں "منجو" کہتے ہیں۔

روایتی عمارات: وہ چمنی جو چھت میں دھواں نکلنے کے لیے بنائی جائے اسے "بخاری" کہتے ہیں۔

تمبہ: چھت کو سہارا دینے کے لیے لگائی ہوئی کھڑی لکڑی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح مٹی کا بنا ہوا چبوترا چوترو کہلاتا ہے۔

چھپر: کھیت میں بنایا ہوا جھونپڑا ہوتا ہے۔

ربل / رفل / رف: دیوار میں بنا ہوا چھجا جس پر برتن رکھے جاتے ہیں، کے مختلف نام ہیں۔ مٹی کی دیوار کی اونچائی اور لمبائی جو ایک دن میں تیار کی جائے اسے "زاؤ" کہتے ہیں۔ دروازے یا دیوار کے شگاف کو شم کہتے ہیں۔

غورہ گل: نئی عمارت پر لپائی سے پیشتر ڈالی ہوئی مٹی ہوتی ہے۔ غورہ گل ڈالنے کے بعد لپائی کی جاتی ہے۔

گیلی مٹی کی وہ مقدار جو ایک دفعہ بیلچہ میں آجائے "گچ" کہلاتی ہے۔ اس کو دیوار بناتے وقت استعمال کرتے ہیں۔

دو منزلہ پختہ عمارت کو "ماڑی" کہتے ہیں۔

چھوٹا سا کمرہ جو باورچی خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ "منہ" کہلاتا ہے۔

مازو / ترناوہ: چھتوں سے پانی کے نکاس کے لیے چھوٹی سی نالی کو کہتے ہیں۔

گھریلو استعمال کے برتن

ٹوٹی: لکڑی کا پیالہ ہوتا ہے۔

کڑسان: لکڑی کا برتن، مٹی کا بڑا پیالہ ہوتا ہے۔

کورو: لکڑی کا برتن ہے۔

کلک: مٹی کا چھوٹا سا برتن جس میں پیسے رکھے جاتے ہیں۔

گرٹو / گوٹو: نسوار رکھنے کی لکڑی سے تیار کی ہوئی ڈبیا ہوتی ہے۔

گوزی: دودھ دوہنے / ڈالنے کے لیے لکڑی کا پیالہ ہے۔

گھر کے جملہ برتن کو پٹل کہتے ہیں۔

لوہندہ: پتیل کی دیگچی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ڈاکو: کھانا لے جانے کے برتن یا ٹفن کیریئر کو کہا جاتا ہے۔

ایزک: بھیڑ بکری یا ان کے بچوں کی کمائی ہوئی کھال جس میں لسی بلوتے ہیں۔

دودھ بلونے کے لیے مٹی کا برتن، چائی "ماندازی" کہلاتی ہے۔

لکڑی، آگ: چند چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کو یکجا کر کے کسی دوسرے چولہے میں روشن آگ سے جلانا پھر ان سے چولہے میں آگ روشن کرنا، ان چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کو جب وہ جل رہی ہوں بن جلوک کہا جاتا ہے۔

پڑ: ماچس کی ڈبیا کا وہ حصہ ہے جس پر تیلی جلائی جاتی ہے۔

جمجلائی: کا مطلب ہے بھڑکتے ہوئے شعلے، بلند ہوتے ہوئے شعلے۔ وہ آگ جو خوشی کے موقع پر جلائی جائے۔

چمولی / چمولہ: یعنی لکڑی کے ٹکڑے جو میدان میں پڑے ہوئے ہوں۔

چنجک: سے مراد ہے لکڑیاں چیرنے کے بعد لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو زمین پر رہ جائیں۔

ژپ: کا مطلب ہے، آگ کا اچانک بھڑک اٹھنا۔

کٹینک: ایک طرف سے جلی ہوئی لکڑی ہوتی ہے۔

مکٹ: وہ لکڑی جو آگ میں مدہم جلے یا آگ کا مدہم مدہم جلنا۔

نکرو: وہ لکڑی جو نہ جلے۔

ڈارو: سے مراد ہے آگ کو مدہم کرنا۔ جبکہ مدہم آگ کو "چواب" کہتے ہیں۔

اگڑی: کپڑے کے پیوند کو کہتے ہیں۔

بڑ چکی: زنانہ قمیص جو دیسی طرز پر سلی ہوئی نہ ہو۔ کالر کی ڈوری "بندوک" کہلاتی ہے۔

بج بیلی: مرد کی قمیص کے اگلے اور پچھلے حصے پر کی گئی کشیدہ کاری کو کہتے ہیں۔

عورت کی شلوار کو پاجامہ کہتے ہیں جبکہ ٹوپ، شیشے اور کشیدہ کی بنی ہوئی ٹوپی ہوتی ہے۔

خیری: وہ کپڑا ہے جو کندھے پر ڈالا جاتا ہے۔ عورتوں کے اوڑھنے کی دوپٹ والی چادر "دوپٹ" کہلاتی ہے۔ اسی طرح زی عورت کی قمیص کا کشیدہ شدہ وہ حصہ ہے جو سینے سے گلے تک ہو۔

شتارک: کپڑے کا درمیان سے پھٹ جانا، اگڑی میں پھٹے ہوئے حصے پر دوسرا کپڑا رکھ کر سیتے ہیں لیکن شتارک میں پھٹے ہوئے حصے کو بغیر دوسرے کپڑے کے پیوند کے سیتے ہیں۔

کوک: لمبے لمبے ٹانکے جو کپڑا سیتے وقت عارضی طور پر لگائے جاتے ہیں۔

اسی طرح گڈر خانہ بدوش عورتوں کی قمیص کو کہتے ہیں جو عموماً سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔

آستین چڑھانے یا شلوار کو نیفے میں لگا کر اونچا کرنے کو "لانچنگ" کہتے ہیں۔

عورتوں کی ایک پٹ کی چادر "یک پڑ" کہلاتی ہے۔

جبکہ پست عورتوں کی لمبی جیب کو کہتے ہیں جو قمیص کے سامنے کی طرف ہوتی ہے۔

زیورات

اہم اور مخصوص زیورات درج ذیل ہیں:

بینہ: یہ چاندی یا سونے کا مخصوص زیور ہوتا ہے جسے عورتیں پیشانی پر لٹکاتی ہیں۔ یہ گول یا تکونی شکل کا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مچلیوں کا ایک گروپ ہوتا ہے۔

بول/پھلی: ناک کا زیور ہوتا ہے۔

تلمل: چاندی کا زیور ہے جسے عورتیں سر پر پہنتی ہیں۔

جالر/رقید: کان میں پہننے کا زیور ہے جس میں زنجیر لگی ہوتی ہے۔ بعض لوگ زنجیر کے بجائے دھاگہ استعمال کرتے ہیں۔

چمکلی: گلے میں پہننے کا مخصوص زیور ہوتا ہے۔

مچھلی: تکونی شکل کے چاندی کے مخصوص قسم کے زیور جو ایک زنجیر کی شکل میں ہوتے ہیں۔

چندن ہار: گلے میں پہننے کا خوبصورت ہار ہوتا ہے۔

چولک: سونے یا چاندی کا زیور ہے جسے عورتیں سر پر پہنتی ہیں۔

خوش بند: ایک تکونی زیور جو سر پر دائیں بائیں لگایا جاتا ہے۔ ان کے بیچ میں ڈوری ہوتی ہے۔

در: یہ کان میں پہننے کا زیور ہے۔

دڑی: چاندی کا مربع شکل کا زیور ہے جو پٹی میں لگایا جاتا ہے۔

دلک: اسے بھی کان میں پہنا جاتا ہے۔

دوخوار: یہ ہاتھ میں ڈالنے والی چاندی کی مخصوص چوڑیاں ہوتی ہے۔

کشیدہ کاری: کشیدہ کاری میں براہوی خواتین کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی کشیدہ کاری نہ صرف بیرون بلوچستان بلکہ بیرون ملک تک مشہور ہے۔ ان کی چند ایک مشہور کشیدہ کاریوں کا تعارف پیش ہے جس سے ان کے اس اعلیٰ ہنر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آلی: یہ سوزن کاری کی ایک قسم جو بڑی معروف ہے۔

اشنال: یہ قمیص پر کشیدہ کاری کی قسم ہے جس کا رواج عام ہے۔

بج بیلی: مرد کی قمیص کے اگلے اور پچھلے حصے کی کشیدہ کاری کو کہتے ہیں۔

بغدادی رڈکو: نامی کشیدہ کاری میں تین تین ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔

اسی طرح پرائیز کشیدہ کاری عموماً کپڑے سے بنے ہوئے سرمہ دان پر کی جاتی ہے۔

پڑی وار/روال: یہ بڑی عمدہ قسم کی کشیدہ کاری ہوتی ہے۔

پشت: یہ کشیدہ کاری کے کام کا استر ہے۔

جوک: چپی دانے سے متصل تکونی شکل میں بنائی ہوئی کشیدہ کی کاری ایک مخصوص قسم ہے۔

چارخنی: نامی کشیدہ کاری میں ایک بڑا خانہ بنایا جاتا ہے پھر اس میں چھوٹے چھوٹے خانے بنائے جاتے ہیں۔

چپی دانہ: کناروں پر لگائے گئے حاشیہ کو کہتے ہیں۔کشیدہ کا کام چغین کہلاتا ہے دوشیشوں کے درمیان جو کام کیا جائے اسے "چوڑ" کہتے ہیں۔جبکہ خام کار قمیص کے گریبان پر کی ہوئی کشیدہ کاری کی ایک خاص قسم کو کہتے ہیں۔

چین: کشیدہ کاری کی وہ مخصوص قسم ہے جس میں کپڑے میں سلوٹیں ڈال کر اس طرح سلائی کی جائے کہ سلوٹیں قائم رہیں۔

سورانی: قمیص پر کشیدہ کاری کی ایک خاص قسم کو کہا جاتا ہے۔

کوٹرو بھی قمیص پر کشیدہ کاری کی ایک مخصوص قسم کا نام ہے۔کوٹرو چکن کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کشیدہ کاری کی اس قسم کی ابتداء ضلع کچھی کے گاؤں کوٹروں سے ہوئی اسی لئے یہ قسم کوٹرو چکن کہلاتی ہے۔

کوک: کے معنی ہیں لمبے لمبے ٹانکے لگانا یعنی کچی سلائی کرنا۔

قمیض پر کشیدہ کاری کی ایک اور قسم "گل کپ" کہلاتی ہے۔

لوپو: کشیدہ کاری کی یہ قسم انجیر کی طرح ہوتی ہے۔

ماہی پشت وہ کشیدہ کاری ہوتی ہے جو آستین اور دامن پر کی جائے۔

موسم: نامی کشیدہ کاری کی خصوصیت یہ ہے کشیدہ کاری کی یہ قسم کپڑے کے الٹے رُخ سے شروع کی جاتی ہے اور سیدھا رخ اچھی طرح نکھر آتا ہے۔

وٹ: چپی دانے کی متوازی ایک اور سلائی ہوتی ہے ان دونوں کے بیچ میں جو کشیدہ کاری ہوتی ہے وہ وٹ کہلاتی ہے۔

یک خنی: کشیدہ کاری کی اس قسم میں بیضوی شکل کے ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔

اشیائے ساختہ

۱) اُون کی بنی ہوئی اشیا

۲) چمڑے کی بنی ہوئی اشیا

۳) پتھروں سے بنی ہوئی اشیا

۴) چکی

اُون بنی ہوئی اشیا:

آسیب: کاتی ہوئی اون کو کہتے ہیں۔

باسل: گفتہ کے سر پر بندھا اونی دھاگہ ہوتا ہے۔

بالاپوش بھی گفتہ کی طرح بنا جاتا ہے۔کناروں پر کوڑی اور لاڑو لگایا جاتا ہے۔اسے سرونک پر ڈالتے ہیں۔

بڑزی/ تکی: اونی دھاگے سے بنا ہوا وہ تھیلا ہوتا ہے جسے اونٹ کی "رخت" پر اس طرح رکھا جاتا ہے کہ دونوں جانب نکلے۔

بشینک: روٹیاں رکھنے کے لیے اونی دھاگہ سے تیار کیا ہوا دسترخوان ہے۔ آٹے کے پیڑے بھی اس میں رکھ کر بیلے جاتے ہیں۔

بیدان: یہ اون سے بنی ہوئی تھیلی ہوتی ہے جس میں نمک رکھا جاتا ہے۔

پرزونک: رنگدار اونی دسترخوان کو کہتے ہیں۔

تکی: یہ ایک قسم کی اونی تھیلی ہے جس پر کوڑیاں ٹانکی ہوتی ہیں۔

تنیستہ: یہ گفتہ کے دھاگوں میں سے ایک دھاگہ ہوتا ہے۔

تورہ: ڈیڑھ فٹ تک لمبا، وہ اونی تھیلا ہوتا ہے جس میں آٹا رکھا جاتا ہے۔اور اسے سفر میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

ٹاء: بکری کے بالوں سے بنی ہوئی ایک بوری کو کہتے ہیں جس میں اناج ڈالا جاتا ہے۔

ٹمز: یہ خام اون سے بنی ہوئی دری یا بغیر آستین کا اونی کوٹ ہوتا ہے۔

چنتہ: وہ اُونی تھیلا ہے جس میں کپڑے وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔

خرجین رخوتیز بھی ایک قسم کا اونی تھیلا ہے جو بار برداری کے جانور پر رکھا جاتا ہے۔

خوڑدہ دان: اُون سے بنی ہوئی وہ خاص تھیلی ہوتی ہے۔جس مین اولیائے کرام کے مزاروں کی مقدس مٹی ڈالتے ہیں۔

دزدان: یہ بھی ایک اور اُونی تھیلا ہے جس کا ایک سرا بند کرنے اور کھولنے کے

لیے استعمال ہوتا ہے۔اس میں کپڑے وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔اسے بروک پر رکھا جاتا ہے۔اس کا عرض ایک بالشت چار انگل ہوتا ہے۔کناروں پر اُونی دھاگوں سے بنے ہوئے پھول لگائے جاتے ہیں۔

ڈک: لوہے کا ایک کنگھا ہے جو کونٹ بننے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اس کا دستہ لکڑی کا بنا ہوتا ہے۔

زوڑ: کوٹ کی طرح بنا ہوا لباس ہوتا ہے۔

شال: آستین دار اونی کوٹ کو کہتے ہیں۔

شدبر: گفتہ بنانے کے لیے استعمال کیا گیا اُونی دھاگہ ہوتا ہے جسے پھیلا کر رکھا جاتا ہے۔

شفی: رنگدار اونی دھاگے سے بنی ہوئی وہ دری ہے جسے خوبصورتی کے لیے "پرونک" کے سامنے لٹکاتے ہیں۔

غنج: اس بڑی بوری کو کہتے ہیں جس میں گھاس وغیرہ رکھا جاتا ہے۔

کونٹ: رنگدار اونی دھاگوں سے بنائے ہوئے قالین کو کہتے ہیں۔
کونٹی سے مراد ہے پرانا کونٹ یا کونٹ کا ٹکڑا۔

گربند: رنگین اُونی دھاگے سے بنا ہوا ایک بڑا پھول ہے جسے "رخت" میں لگاتے ہیں۔گٹی بھی رنگین اُونی دھاگے سے بنا ہوا پھول ہے جو اونٹ کے گلے میں لٹکایا جاتا ہے۔

گرک: یہ وہ مخصوص کھردری دری ہے جو اون یا بکری کے بالوں سے تیار کی جاتی ہے۔گرک کا مطلب ہے کاتی ہوئی اون کا گولہ۔

گفتہ: وہ اُونی دھاگے ہیں جن کو پھیلا کر چاروں کونوں میں لکڑی لگا کر پھر ان میں مزید اُونی دھاگے ڈال کر بنتے ہیں۔اس طرح کونٹ تیار کیا جاتا ہے۔
گلہ کی تفہیم کچھ یوں ہے کہ گفتہ کے شدبروں میں دو لکڑیاں لگاتے ہیں پھر ایک لکڑی سے دوسرے شدبر کو ملاتے ہیں۔اس وقت کہتے ہیں کہ گفتہ کو گلہ کیا جا رہا ہے۔
گوالہ رجوال سے مراد ہے۔بکری کے بالوں سے بنی ہوئی بڑی بوری جس میں اناج رکھا جاتا ہے۔

لاڑو: رنگدار اونی دھاگوں سے بنا ہوا پھول رُبنے ہوئے پھول ہیں جو اونٹ کی زیبائش کے لیے اس پر رکھتے ہیں۔

لیت: وہ اونی دھاگہ ہے جو گفتہ بنانے کے کام آتا ہے۔

ماتی: پرانے نمدے کا وہ ٹکڑا جس پر نئے نمدے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

چمڑے کی بنی ہوئی اشیا

ایزک / ہیزک: بھیڑ بکریوں کی کمائی ہوئی وہ کھال ہے جو لسی بنانے اور رکھنے کے کام آتی ہے۔

بابیرہ: ہیزک، کلی، زک وغیرہ کے منہ باندھنے کی رسی کو کہتے ہیں۔

بانڈ پر: لکڑی کے اس سٹینڈ کو کہتے ہیں جس پر خوا اور گڑی کو رکھا جاتا ہے۔چار لکڑیوں کو نصب کر کے پھر ان کے اوپر اور لکڑیاں رکھ دی جاتی ہیں۔بانڈ پر کو کمرے کے اندر رکھا جاتا ہے۔جب اس پر خوا اور گڑی رکھتے ہیں تب ان کے اوپر ایک کپڑا بھی رکھا جاتا ہے تا کہ ٹھنڈا رہے۔

بور: پرانی ایزک کو کہا جاتا ہے۔

پتل: سے مراد ہے بکری کی وہ کھال جس میں پانی، دودھ یا گھی رکھا جاتا ہے۔

چوٹ: یعنی خام چمڑے سے بنی ہوئی مخصوص چپل۔
خودم کی تعریف یوں ہے کہ لوہے کی چند تاروں کو لے کر ان پر چمڑا چڑھایا جاتا ہے۔اس کو کمر پر باندھتے ہیں۔لڑائی کے وقت فوراً کمر سے نکالا جاتا ہے۔

خوا: بھیڑ بکریوں کی کمائی ہوئی اس کھال کو کہتے ہیں جس میں پانی بھرا جاتا ہے۔
یوغ سے مراد ہے خوا کا کارک۔

درل: چمڑے کی پٹی کو کہا جاتا ہے۔درنگ کی تعریف یہ ہے کہ جب ایزک لٹکی ہوئی ہو اور اس میں لسی بنائی گئی ہو تو اسے درنگ کہتے ہیں۔

زک: برہ یا میمنا کی کمائی ہوئی وہ کھال ہے جس میں گھی رکھا جاتا ہے۔

زک جل: زک پوش میں ایک حصہ کپڑے کا اور دوسرا حصہ بکری کے بنے ہوئے بالوں کا ہوتا ہے۔اس میں زک کو رکھا جاتا ہے تا کہ گھی خراب نہ ہو۔

کلی: وہ چھوٹی خوا ہوتی ہے جو برہ یا میمنا کی کمائی ہوئی کھال سے بنائی جاتی ہے۔

کیت: بھیڑ کی وہ کھال (جو کمائی ہوئی نہ ہو) جس میں آٹا یا روٹی رکھتے ہیں۔

روایتی طریقے سے پکانے کا ایک انداز (قصبہ حرجیان)

گڑی: یہ بھی کمائی ہوئی کھال ہی ہے جس میں مکھن رکھا جاتا ہے۔

پتھر سے بنی ہوئی اشیا

تافو: یہ تراشے ہوئی پتھر کا توا ہوتا ہے۔

جوغن نہ خل: پتھر کے بنے ہوئے ہاون دستہ کو کہتے ہیں۔

کنہ سے مراد ہے تین پتھروں میں سے ہر ایک پتھر جس پر توا، قافو یا دیگچی رکھی جاتی ہے اور نیچے آگ جلائی جاتی ہے۔

نسخل: ہاتھ کی چکی کو کہا جاتا ہے۔

پڑ/تا: چکی کے ایک پاٹ کو کہتے ہیں۔

چَشک/چشنک: چکی کے منہ میں لگی ہوئی وہ لکڑی ہوتی ہے جس کے بیچ سے کونی گزرتی ہے۔

کٹوری/ گرٹو: چھوٹی چکی کو کہتے ہیں۔

چکی: کے بیچ میں لگی ہوئی کیل کو "کونی" کہا جاتا ہے۔

گر: چکی کا اوپر کے کھلے حصہ کو کہتے ہیں جہاں سے اناج ڈالا جاتا ہے۔ یعنی چکی کا منہ۔

نسخل: ہاتھ کی چکی کو کہتے ہیں۔

اشیائے خوردونوش

اشیائے خوردونوش
روٹی کی قسمیں
دودھ، لسی

اشیائے خوردونوش:

بے سورہ/ دروغ بیدیر: اُبلے ہوئے نمکین پانی میں مرچ مصالحہ اور گھی ڈال کر تیار کئے ہوئے مخصوص قسم کے شوربہ کو کہتے ہیں۔

چمڑی: خشک کی ہوئی خوبانی کو کہا جاتا ہے۔

چوک: دنبے کی چکی کے وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جن کو کڑاہی میں گرم کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان سے گھی علیحدہ ہو جاتا ہے۔ ہر ٹکڑا چوک کہلاتا ہے۔

خدیت: موسم سرما کی آمد سے پیشتر دنبے یا بکری کو ذبح کر کے اس کی کھال، دل، جگر اور ہڈیاں وغیرہ کو الگ کر دیا جاتا ہے پھر گوشت پر نمک ہینگ چھڑک کر سرد جگہ میں رکھا جاتا ہے تا کہ سردی میں سوکھ جائے۔ سخت سردی میں اس گوشت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اہل جھالاوان اسے پٹو کہتے ہیں۔

تریت: اس سے مراد ہے شوربے، دودھ یا لسی میں روٹی کے ٹکڑے ڈالنا تا کہ نرم ہو جائیں اور بغیر تکلیف کے چبائے جا سکیں۔

کلک لار ایک مخصوص طریقہ ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ: روٹی کا ایک حصہ منہ میں چبا کر بھیڑ کے تھن سے ہاتھ کے زور سے منہ میں دودھ ڈالنا۔ یہ طریقہ عموماً چرواہوں میں رائج ہے۔

آٹا چھاننے کے بعد چھلنی میں چھلکے وغیرہ رہ جائیں کوچہ یا ڈلہ کہلاتے ہیں۔ گٹ گلم سے مراد ہے روٹی کے ہر نوالے کے ساتھ لسی یا دودھ کا ایک گھونٹ بھرنا۔

روٹی کی قسمیں:

بیڑ زنی: وہ روٹی جو بیڑن میں پکائی جائے۔ (دو فٹ اونچا اور سوا فٹ چوڑا روٹی پکانے کا چولھا ہوتا ہے۔ اس کے درمیان میں نو انچ کی اونچائی پر ایک مٹی کا توا ہوتا ہے۔ یہ تنور سے علیحدہ ہوتا ہے)۔

پوغ پچ: وہ روٹی جو کوئلوں پر پکائی جائے۔

ٹکی: چھوٹی روٹی جو مسجد کے مولوی کے لیے یا چھوٹے بچوں کے لیے پکائی جاتی ہے۔

ڈڈک/ڈڈکی/کلیچہ: موٹی روٹی جس میں گھی اور چینی ملا کر پکاتے ہیں۔ خوبصورتی کے لیے اس پر نقش و نگار بناتے ہیں۔ یہ روٹی تافو پر پکائی جاتی ہے۔

ڈوڈی: جوار کی روٹی۔

ڈکو: تافو پر پکائی ہوئی موٹی روٹی۔

سپورہ: بہت دیر تک پڑے رہنے کے بعد پیڑ سے پکائی جانے والی روٹی۔

شتی: گرم راکھ کی حدت پر پکائی ہوئی روٹی۔

شڑدی: آٹے میں معمول سے زیادہ پانی ملا کر اسے تانو پر پکاتے ہیں۔ اس طرح جو روٹی پک جائے وہ شڑدی کہلاتی ہے۔ بعد میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس میں گھی اور چینی ملا کر کھاتے ہیں۔ اس وقت یہ منجر کہلاتی ہے۔ نکاح خوانی سے پیشتر ساس، دلھا اور اس کے دوستوں کے لیے اس کا اہتمام کرتی ہے۔

غمل: موٹی روٹی۔

کاک رکرنو: گرم گول پتھر کے اردگرد آٹا لگا کر اسے گرم بھوبھل میں دبا دیتے ہیں۔ اس طرح پکی ہوئی روٹی۔

مالستہ: چینی اور گھی ملا کر پکائی ہوئی روٹی جس کو شادی شدہ جوڑے کو شادی سے پہلے کھلایا جاتا ہے۔

گرڑی: وہ روٹی جس میں گڑ ملا ہوا ہے۔

مچکی: مسافروں کے لیے پکائی ہوئی روٹی۔ اس میں چینی اور گھی ملایا جاتا ہے۔

چورک: روٹی کا چوتھائی حصہ۔

کپ رٹکر: روٹی کا ٹکڑا، روزی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

یک مونہ: اس سے مراد ہے روٹی کا ایک طرف سے اچھی طرح پکنا اور دوسری طرف سے اچھی طرح پکنا۔

دودھ، لسی

پروال: یعنی تازہ دوہا ہوا دودھ۔

چکا: لسی کو موٹے کپڑے میں ڈال کر لٹکایا جاتا ہے۔ اس طرح پانی رسنے کے بعد جو کچھ کپڑے میں رہ جائے وہ چکا کہلاتا ہے۔

خاسن: ایسی لسی جس میں مزید پانی ملایا گیا ہو۔

خرخرود: شیلانچ کے رسے ہوئے پانی کو جوش دے کر موٹے کپڑے میں ڈال کر لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس طرح پانی رسنے کے بعد جو بچ جاتا ہے اس سے گول گول چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائے جاتے ہیں۔

خرود: لسی کو جوش دے کر موٹے کپڑے میں ڈال کر لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس طرح پانی رسنے کے بعد جو کچھ کپڑے میں رہ جائے اس سے گول گول چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائے جاتے ہیں۔

دوغ رمدر: وہ آٹا جو مکھن کو گھی میں تبدیل کرنے کے لیے آنچ دیتے وقت برتن میں ڈالا جاتا ہے پھر اس کو دوغ گھی میں تلتے ہیں اور چینی ملاتے ہیں۔ تب یہ مدر کہلاتا ہے۔

ست: ایسی لسی جس میں حد سے زیادہ پانی ملایا گیا ہو۔

سمار رسمبار: ایسی لسی جس میں مویشی کے تھن سے دودھ ڈالا گیا ہو۔

سیل: جما ہوا دودھ جو شیر خوار بچے کے معدے میں پایا جاتا ہے اور دودھ جمانے یا پنیر بنانے کے کام آتا ہے۔

شیلانچ: چکا کی خشک گولیوں کو کہتے ہیں۔

کڑ رخروال: تازہ بیاہے ہوئے چوپائے کے تین دن تک کے دودھ کو کہتے ہیں۔

ماس: دہی بنانے کے لیے جو لسی دودھ میں ملائی جائے اسے ماس کہتے ہیں۔

مدر: مکھن سے بنائے ہوئے گھی کو دیگچی میں ڈال کر اس میں گندم کے آدھ پسے دانے ڈال کر خوب ہلاتے ہیں۔ جب پک کر چاولوں کے طرح ہو جائیں تو دیگچی کے اوپر گرم راکھ ڈال دی جاتی ہے۔ اس کو دب کرنا کہتے ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد مدر تیار ہو جاتا ہے۔

نرخورود: خرخرود کے رسے ہوئے پانی کو جوش دے کے موٹے کپڑے میں ڈال کر لٹکایا جاتا ہے۔ اس طرح پانی رسنے کے بعد جو کپڑے میں رہ جائے، اس کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائے جاتے ہیں۔

مرینکنک کا مطلب ہے دہی بنانا۔

خریش: یعنی دیسی گھی۔

توت: بیدانہ سے مراد ہے عمدہ قسم کا توت۔

شاہ توت: وہ توت جس کے دانے بڑے ہوتے ہیں۔ گہرے سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔

شوری: گھٹیا قسم کا توت جس کے کھانے سے پیٹ میں درد پیدا ہوتا ہے۔

خرتوت: سیاہ اور ترش قسم کا توت۔

کابلی: توت کی کابل سے لائی گئی ایک قسم جس کے دانے بڑے بڑے ہوتے ہیں۔

گنجشکی: اس عرصے کو کہتے ہیں جب توت کے دانے پکنے کے قریب ہوں۔

گون: ایک مخصوص پہاڑی درخت ہے جس کے پھل کا ذائقہ پستے کی طرح ہوتا ہے یعنی کہ جنگلی پستہ۔

کٹارک: یعنی گون کے وہ دانے جو سخت ہوں اور ان پر نرم چھلکا موجود نہ ہو۔

کچری کا طریقہ یوں ہے کہ گون کو کوٹ کر اس میں سے اس کا روغن ہاتھ کی مدد سے نکالا جاتا ہے پھر اس میں چھلکے ملا کر گرم پانی ڈال دیتے ہیں اور سالن تیار کرتے ہیں۔

پوش میں گون کو کوٹ کر کھجور میں ملایا جاتا ہے۔ بعض سردی (ایک قسم کی روٹی) میں بھی ملاتے ہیں۔

ٹینٹو: کی تعریف ہے گون کا اکیلا درخت (جس کے قرب و جوار میں دوسرے درخت نہ ہوں)۔

کھجور

پاچک: کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی وہ چھوٹی تھیلی ہوتی ہے جس میں کھجوریں رکھی جاتی ہیں۔

پیپو: ہلکے سرخ اور بھورے رنگ کی کھجور کو کہتے ہیں۔

پیش: کھجور کے پتوں کو کہتے ہیں نیز کھجور کا وہ درخت جس کا قد چھوٹا ہو۔ اسے بھی پیش کہا جاتا ہے۔

ربی: مجبور کی کھجور کی ایک مخصوص قسم کو کہتے ہیں۔

رر: سوکھی ہوئی کھجور کو کہتے ہیں۔

کرب: کھجوریں رکھنے کے ایک مخصوص تھیلے کو کہا جاتا ہے۔

کتل: کھجوروں کے تھیلے کو کہتے ہیں۔

پینک: اس کھجور کو کہتے ہیں جس میں گٹھلی نہ ہو۔

لوتاند: کھجوروں کا وہ شیرہ ہوتا ہے جو تھیلے میں سے خود بخود ٹپکتا ہے۔

شکار اور دیگر متعلقات

ترگ: گیدڑ کو پکڑنے کے مخصوص پھندے کو کہتے ہیں۔

جار: تیتر بٹیر وغیرہ کو پکڑنے کا وہ جال جو دھاگے کا ہوتا ہے۔

ڈب: سے مراد ہے پرندوں کو شکار کرنے کے لیے زمین میں کھودا ہوا ایک چھوٹا گڑھا۔

چڑک: پرندوں کو پکڑنے کے ایک قسم کے پھندے کو کہا جاتا ہے۔

کمک: یعنی پرندوں کو پکڑنے کے لیے جانوروں کے سینگ کا پھندا۔

گزک: سے مراد ہے پرندوں کو پکڑنے کے لیے ٹہنیوں کا پھندا۔

ہڑک: کا مطلب ہے جانوروں کو پکڑنے کے پھندے کا جبے کار ہونا۔

پاد: سے مراد ہے وہ جگہ جہاں شکار کے جانور چرنے آتے ہیں۔

لوک علاج، دم درود، ٹونے ٹوٹکے

علاج معالجہ: جناب نور محمد پروانہ براہویوں کے روایتی علاج معالجہ سے متعلق لکھتے ہیں:

مقولہ مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اس مقولہ کا اطلاق علاج معالجہ کے سلسلے میں براہوئی قبائل پر صد فیصد درست ہوتا ہے۔ بھلا اندازہ کیجئے کہ جو قبائل شہری زندگی سے سینکڑوں میل دور ایسے لق و دق صحرا چٹیل پہاڑ یا گھنے جنگلات میں زندگی کے ایام بسر کر رہے ہیں۔ ان قبائل میں اگر کوئی فرد بیمار ہو تو اس کو کن ذرائع کا سہارا تلاش کرنا پڑے گا ظاہر ہے کہ ایسے حالات اور مذکورہ میں قبائل کو ایسے ذرائع میسر نہیں ہو سکتے، جن کو سائنٹیفک طرز معالجہ کہا جاتا ہے۔

انسان کا مدافعانہ فطری جذبہ ملکی روح کے جذبہ کے تحت ایسے حالات میں بسر کرنے اور بود و باش رکھنے والے قبائل کو مقامی حالات کے مطابق وسائل تلاش کر کے یا پیدا کر کے ان کے مطابق زندگی کے مسائل یا پیش آمدہ علاج و معالجہ کی ضرورتوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق براہوی قبائل نے کافی حد تک اندرین بابت اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلہ میں مقامی حالات اور پیداوار سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً انہی محدود اور نامکمل ذرائع کی ناکامی کے بعد ان کو توہم پرستی کی طرف بھی دھکیل دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ براہوی قبائل نے اپنے

علاج معالجہ کے سلسلہ میں توہماتی طرز کو بھی کافی حد تک اپنایا ہے۔ اس طرح براہوئی قبائل میں ہم عام طور پر علاج معالجہ کے لئے تین طریقے مروج پاتے ہیں۔

الف) جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج معالجہ: یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ پہاڑ عام طور پر اچھی قسم کی اور قیمتی جڑی بوٹیوں کے مخزن مانے جاتے ہیں۔ سنیاسیوں کی متلاشی دو سے لے کر آج تک کے محققانہ اور ترقی یافتہ علاج معالجہ کے دور میں بھی پہاڑوں کی قیمتی جڑی بوٹیوں کی اہمیت کو صف اول نصیب ہوتی رہی ہے۔

جبکہ براہوئی قبائل کی بود و باش قبائلی دور میں اکثر پہاڑوں میں رہی ہے تو ظاہر ہے کہ انہوں نے طویل عرصہ کے تجربہ کے بعد کئی بوٹیوں کو مفید مطلب قرار دے کر اپنی زبان کے قواعد کی روشنی میں ان کے نام بھی مقرر کر دیئے ہیں۔ یہ ہے کہ ''کول مور اور خیسن جھر'' جن کو کہ بچوں اور بڑوں کی قبض بادی اور اسی قسم کے دوسرے امراض کیلئے پانی میں ابال کر پلایا جاتا ہے۔ یہ ہیں ''ماٹھے ٹو'' پر پک جو (کہودلوئی) یعنے زرد لوئی اور جگر کے دوسرے امراض کیلئے مفید مانے جاتے ہیں۔ اس طرح کچھ اور پہاڑی، جنگل، خواہ میدانی ادویات ہیں۔ جن کو کہ ''مہیہیں پھلی'' اور ''حسین بھوٹو'' کا نام دیا گیا ہے۔ جو ہر قسم کے بخار بالخصوص پرانے بخار کیلئے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی ادویات ہیں۔ جن کو پھکی کے طور پر یا پانی میں ابال کر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کئی بوٹیوں کو کوٹ کر بدن پر ملتے ہیں۔ سر پر باندھتے ہیں۔ سر آنکھ یا بدن کے کسی دوسرے حصہ کے چوٹ یا پھوڑے پھنسی پر باندھتے ہیں۔ جن سے کہ وقتی طور پر مناسب فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔

ب) توہم پرستی: پہاڑی زندگی بسر کرنے اور سادہ لوح ہونے کی وجہ سے براہوئی قبائل توہمات کی گرفت سے بھی نہیں بچ سکتے ہیں۔ بلکہ بعض مفاد پرست ماہروں نے تو ان کو اپنی شکم پروری کے لئے بڑے اہتمام کے ساتھ استعمال بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سادہ منش مگر پاک باز اور بہادر براہوئی بعض بیماریوں کے لئے جن بھوت کے اثرات کو تسلیم کرتے تھے اور آج بھی کئی ایسے ہیں۔ جو من و عن بڑوں کی راہ پر گامزن ہیں۔ اور ایسے توہماتی امراض کے دفیعہ کے لئے بھی اسی انداز کے علاج مفید مانتے تھے۔ اور آج بھی کئی جگہوں پر کئی قبائلی افراد اسی ڈگر پر سوچتے ہیں۔

تیسرا طریقہ علاج تجرباتی ہے۔ جس کے تصور سے ہی خوف آتا ہے۔ ذیل میں ان طریقہ علاج کی تفصیل دی جارہی ہے۔ جن میں سے بعض متروک ہو چکے ہیں۔ اور اکثر آج بھی قابل عمل ہیں۔ یہ طریقہ علاج مقامی بھی ہیں۔ اور مقامیت کا ثقافتی مظہر بھی۔ براہویوں کا اپنا علاج و معالجہ ہے۔ جس کا علم نسل در نسل منتقل ہوا ہے۔ ان کے اپنے طبیب ہیں۔ اور بہت سی بوڑھی دادی، نانی جڑی بوٹیوں اور نسخے کے استعمال میں بے حد ہوشیار ہیں۔ اور جہاں تک ٹیکہ، رد سحر اور تعویز گنڈے کا تعلق ہے۔ براہویوں میں سید ملا اور دوسرے عفت مآب لوگ ان کے ذریعہ علاج کرتے ہیں۔

بہر کیف ڈینس برے کا راوی اسے براہوی قبائل میں روایتی علاج معالجہ کے متعلق جو تفصیلات بتاتا ہے، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

علاج بذریعہ داغ: براہویوں کے ہاں معالجے میں مقدم بلکہ اولیت ''سل او داغ'' کو حاصل ہے۔ تمام علاقوں میں لوگوں کا جسم داغا جاتا ہے۔ اور بکثرت ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ کس نس کو داغا جاتا ہے۔ یہ بات تو وہی لوگ جانتے ہیں۔ جو اس طریق کار کے ماہر ہیں۔ اکثر پیٹ کے بائیں طرف جسم کے دوسرے حصوں سے زیادہ داغ لگائے جاتے ہیں۔ اور اس طرح داغ لگایا جاتا ہے کہ بیمار کو لٹا دیا جاتا ہے۔ اور داغ لگانے کی جگہ سیاہی مل دی جاتی ہے۔ اور اگر کوئی معالج دستیاب نہیں ہوتا ہے۔ تو پھر کوئی تجربہ کار بوڑھی عورت داغ لگاتی ہے۔ وہ کچھ نیلا چتھڑا لے کر جوڑا کی شکل میں گول بنا لیتی ہے۔ اور اس کی طرف کو جلا کر آہستہ آہستہ اس سے نس کو بار بار تھپ تھپاتی ہے۔ ہر چند مریض جلن کی ٹیس سے کراہتا اور ''ہائے ہائے'' کرتا ہے۔ لیکن تھپ تھپانے کا عمل اس کی آہ و زاری کے باوجود جاری رہتا ہے۔ تاکہ چمڑا جھلس نہ جائے اور گوشت نکل نہ آئے۔ گوشت نمودار ہوتے ہی تھپ تھپانے کا عمل روک دیا جاتا ہے۔ کیونکہ گوشت کا ظاہر ہونا اس بات کی علامت ہوتی ہے۔ کہ داغ ویسا ہی لگا جیسا ایک ''داغ'' کو ہونا چاہئے اور اسی حالت میں وہ (بوڑھی دادی نانی) چھوڑ دیتی ہیں۔ تاکہ وہ ورم نہ کر جائے اس کے بعد وہ سیندور، مردہ سنگ، موم اور گھی کو ملا کر ایک مرہم بناتی ہیں۔ اور ایک دھجی پر لگانے سے ہونے والے زخم پر لگا دیتی ہیں۔

علاج بذریعہ کھال: بے شمار لوگوں کو ''سل'' یا کھال میں ڈالنے کے طریق علاج سے شفا ملتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ صبح کے وقت ایک بھیڑ ذبح کر کے اس کی کھال کھینچ لی جاتی ہے۔ تب بیمار آدمی کو ہوا سے محفوظ کمرے میں لا کر اس کا لباس اتار کر کھال میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ جو اس وقت بھی تازہ کھینچی ہوئی ہونے کی وجہ سے گرم ہوتی ہے۔ اور اس کے اوپر کمبل اور نمدے ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ کھال اس کے جسم کی حرارت اور پسینہ کو جذب کر لے جبکہ وہ اس میں لپٹا پڑا سوتا ہے۔ لیکن جو جانور ذبح کیا جاتا ہے۔ اس کا گوشت پکایا جاتا ہے۔ اور اس کے خاندان، پڑوسیوں اور احباب میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نیز خود بیمار آدمی کو گوشت بھون کر کم از کم ایک لقمہ ضرور کھلایا جاتا ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو گوشت بد ذائقہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر دوپہر کے وقت اسے کھال سے باہر نکال کر بغیر نہائے دھوئے

کپڑے پہنا دیا جاتا ہے۔اور بغیر نہائے دھوئے اسے پورے تین دن رہنا پڑتا ہے۔

مختلف کھال: یہ وہ طریق علاج ہے۔ جسے ''سل'' کہا جاتا ہے۔ یہ نہایت تیر بہدف علاج ہے۔لیکن اس طریق علاج پر آنکھ بند کر کے عمل نہیں کیا جاتا بلکہ مریض کی جنس اور موسم کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔اگر مریض ایک مرد یا لڑکا ہے۔تو اس کے لئے ایک بکری یا بھیڑ کو ذبح کر کے اس کی کھال اتاری جاتی ہے۔لیکن عورتوں کے لئے بکرا یا مینڈھا کی کھال اتاری جاتی ہے۔پھر موسم سرما میں بھیڑ اور موسم گرما میں بکرا کی کھال لپیٹنا مفید ہوتا ہے۔کیونکہ بھیڑ اتنی ہی حرارت بخش ہے۔جتنی بکری ٹھنڈک پہنچانے والی ہوتی ہے۔اور بکریوں میں بھی ایسی بکری منتخب کی جاتی ہے جو وحشی ہو اور اس کی جلد مائل بہ نیلاہٹ ہو کیونکہ معالجے کے لحاظ سے یہ بہتر ہوتی ہے۔

خلیفنگ یا دہشت زدگی: وحشی لوگوں میں بلکہ دوسروں میں بھی' بعض اوقات امراض کا علاج محض خوف یا ڈراوا یا دہشت زدگی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بیچارا مریض بستر پر پڑا اپنی بیماری اور ابتری کے بارے میں سوچ رہا ہے کہ یکا یک کوئی خاندان کا فرد دوڑتا آتا ہے۔اور اس کا تعاقب کوئی دوسرا کرتا آتا ہے۔جس کے ہاتھ میں شمشیر آبدار ہوتی ہے۔اور چہرہ غصے میں لال بھبھوکا۔یا بندوق اس کے کان کے قریب سرکی جاتی ہے۔یا اچانک آتشزدگی کی پکار ''آگ آگ'' یا ''سانپ سانپ'' یا ''قتل'' کا شور وغوغا مچایا جاتا ہے۔یا بغیر کچھ کہے مریض کو اٹھا کر ٹھنڈے چشمہ رواں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ان ترکیبوں سے اسے دہشت زدہ کرنے سے وہ اپنے ہوش وحواس کھو کر پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے۔لیکن خدا کی مہربانی سے اس کا مرض جاتا رہتا ہے۔خواہ وہ بخار ہو یا فالج زدگی یا کوئی اور بیماری ہو۔

کچھوے کا انڈا زرتول: براہوی سرکک یعنی کچھوے سے بھی حرارت و توانائی حاصل کرتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ کچھوا انڈے جھاڑیوں میں دیتا ہے۔لیکن وہ بے حد خوش قسمت سمجھا جائے گا اگر وہ گدڑیا کی تیز آنکھوں سے انہیں چھپا سکے۔ کیونکہ گدڑیئے کچھوے کے انڈوں کو لالچ بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔اور انہیں اکٹھا کر کے لاتے اور گاؤں کے لوگوں میں فروخت کرتے ہیں۔اور یہ انڈے جھونپڑیوں کے پاس بیماری کے ایام کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں۔زرتول یعنی کچھوے کا انڈا جمع کرتے ہی پکالیا جاتا ہے۔تا کہ بچہ نہ ہونے پائے اور جب ضرورت ہوتی ہے۔تو اسے پیس کر سفوف بنا لیتے ہیں۔اور پسے ہوئے ''دل'' کی ایک چٹکی میں ایک چٹکی ملاتے ہیں۔پھر دن میں تین بار مریض کو پانی یا رقیق کردہ گھی کے ساتھ اسے کھلاتے ہیں۔اور آخری خوراک کے بعد پورے سات ''بیل'' اور دو بیل تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسے ماسوا نمک ملی روٹی گھی یا مکھن کے ساتھ کچھ نہ کھانا چاہئے کچھوے کا انڈا ان لوگوں میں قوت وحرارت پہنچاتا ہے۔جو کمزور ولاغر ہوتے ہیں۔اور یہ خود ایک قسم کی غذا ہے۔

تعویز گنڈا اور جادو ٹونہ: بہر کیف اگر جڑی بوٹیوں سے علاج کامیاب نہ ہو تو یہ لوگ ''حدا'' یا ''دم'' یا ''تعویز گنڈا'' یا ''بند'' یعنی پڑھے ہوئے دھاگے سے خود کو مسلح کرتے ہیں۔اور جسے وہ کسی بزرگ خدا رسیدہ سے حاصل کرتے ہیں۔جیسے ہی کوئی بیمار پڑتا ہے۔تو اس کے رشتے دار یہ خیال کرتے ہیں۔کہ ہو نہ ہو کسی دشمن نے اس پر سفلی عمل کر دیا ہے۔اور اس تحفظ کی بہترین صورت ''دم'' ہے۔کیوں کہ یہ سفلی عمل کی کاٹ کرتا ہے۔بہر کیف سفلی عمل کا علم اب ملک میں باقی نہیں رہا اور اسے سیکھنے کے شوقین بنگال کا سفر اختیار کرتا ہے۔لہٰذا اب ''علوی عمل'' کا رواج ہے۔اور یہ قرآن حکیم کی آیات پڑھ کر دم کر دینے سے عبارت ہے۔یا پھر کسی خدا رسیدہ بزرگ کی حدیث پڑھ کر دم کر دینے پر مشتمل ہے۔اگر کوئی بیمار ہوتا ہے تو کوئی خدا رسیدہ بزرگ اسے جھاڑ پھونک دیتا ہے۔اور گویا اس کی پھونک کے ساتھ تمام امراض رفع ہو جاتے ہیں۔لیکن اگر بیمار دور رہے تو بزرگ پانی دم کر کے دیتا ہے۔ جہاں تک تعویز کا تعلق ہے۔لکھا جاتا ہے۔اور کلائی گردن یا جسم کے کسی دوسرے حصے پر باندھا جاتا ہے۔لیکن بہت سے خدا رسیدہ لوگ جو نہ لکھنا جانتے ہیں۔اور نہ پڑھنا وہ یقین دلاتے ہیں کہ تعویز سے بہتر ''بند'' ہے۔لہٰذا وہ دھاگہ لیتے ہیں۔ خصوصاً نیلے دھاگے کو وہ اس کام کے لئے زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔اور کچھ پڑھ کر دھاگوں میں گرہ در گرہ لگاتے ہیں۔اور یہ گنڈا مریض کو دیا جاتا ہے۔تا کہ وہ اسے گردن کے گرد باندھ لے۔

خیرات وصدقہ: مزید برآں بیمار آدمی کا صدقہ نکالا جاتا ہے۔تا کہ وہ صحت یاب ہو۔

خاک شفا: مزید برآں خدا شفاعت کرنے والا ہے۔اور براہویوں کے ہاں خاندان یا قبیلے کا پیر یا فقیر بیمار و کالت کے لئے ہوتا ہے۔یہی نہیں بلکہ اکثر لوگ خداوند بزرگ وبرتر سے کہیں زیادہ پیر کی پرستش کرتے ہیں۔حتیٰ کہ کسی شخص کو خدا کی قسم کھانے کیلئے کہے وہ بلا چون وچرا قسم اٹھالے گا۔لیکن اگر اس شخص کو اپنے پیر کی قسم کھانے کیلئے کہہ کر دیکھئے وہ کانپ اٹھے گا اور بغیر اصرار شور وہنگامہ اس سے پیر کے نام پر قسم کھلانی ممکن نہیں لہٰذا اگر براہویوں میں کوئی بیمار پڑتا ہے۔تو وہ درویش سے رجوع کرتے ہیں۔ہر گھر کی عورتیں اپنے پاس ''خواڑو'' یا ''خوڑدہ'' یعنی خاک شفا رکھتی ہے۔جو کسی

پہنچے ہوئے فقیر کے مزار سے لی جاتی ہے۔ یہ فقیر عموماً خاندان کا پیر ہوتا ہے۔ اور وہ وقت ضرورت ان کے کام آتا ہے۔ پریشان گھر والی پہلا علاج تو یہی کرتی ہے۔ کہ وہ خاک شفا کی چٹکی یا مریض کو کھلاتی ہے۔ اور وہ اپنے خاندانی درویش کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر اس سے مدد کی التجا کرتی ہے۔ اور پھر یہ چیز اور وہ چیز بطور تصدق مزار پر چڑھانے کی منت کرتی ہے۔ اگر باپ کسی ایک درویش کو مانتا ہے۔ اور ماں کسی دوسرے درویش کو تو پھر دونوں اپنے اپنے درویش کی پرستش کرتے اور اس کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر دعا مانگتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان کے اخلاف سب سے پہلے اپنے باپ کے پیر یا درویش کا مان کریں اور بعد میں ماں کے پیر فقیر کی عزت و تکریم کریں لہٰذا پہلا سر منڈن باپ کے پیر کے مزار پر ہی ہوتا ہے۔ اور دوسری بار منڈن یا اس کا کوئی حصہ ماں کے پیر کے مزار پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بچہ علیل ہوتا ہے۔ اور باپ کے پیر سے مراد بر نہ آئی تو پھر ماں کے پیر سے رجوع کیا جاتا ہے۔ اور اگر بچہ اچھا ہو گیا تو پھر وہ پڑوسیوں کو سارا دن اپنے پیر کے کرامات کی حکایت سناتی رہے گی۔

قربانی

براہوی صرف دعا خیرات یا صدقہ دے کر مطمئن نہیں ہوتے۔ جیسے ہی گھر میں کوئی بیمار ہوتا ہے۔ یہ لوگ چھرے کو سان دیتے ہیں۔ اور اپنے گلے کے جانوروں میں سے ایک کی قربانی دے کر یوں بیمار کی بلا اتارتے ہیں۔ مزارات تمام علاقے میں نقطہ کی طرح پائے جاتے ہیں۔ اور ہر مزار کے ساتھ ''کوشش جاہی'' یعنی قربان گاہ بھی ہوتی ہے۔ جہاں جانوروں کی قربانی کی جاتی ہے اور مزار کے مجاور قربانی کی نگرانی کرتے ہیں۔ وہ کھال اتروانے اور فقراء مساکین میں گوشت تقسیم کرنے کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اور خود قربانی کا خاص حصہ لیتے ہیں۔ ایک دست، سینہ، پسلی کے گوشت کے ٹکڑوں کے علاوہ کھال بھی ان کے روایتی طور پر مقرر حصے میں سے ہے۔ اور ہر چند کہ وہ روپیہ پیسہ کا لالچی ہوتا ہے اور قربانی کرنے والوں کی پیش کردہ رقم سے زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے لیکن وہ اپنے مقرر قربانی کے حصے سے زیادہ گوشت کا طالب نہیں ہوتا اور باقی گوشت اتنے حصے بنائے جاتے ہیں۔ جتنے لوگ اس وقت مزار پر ہوتے ہیں۔ تمام حصے برابر ہوتے ہیں۔ اور پھر قرعہ کے ذریعہ ہر ایک کو حصہ دیا جاتا ہے۔ لیکن ڈھاڈر کے مقام پر پیر دو پاسی کے مزار کے مجاور نعرہ لگاتے ہیں۔ ''لٹ اے'' یعنی یہ لوٹ کا مال ہے۔ اور جیسے ہی وہ قربانی کے جانور کی کھال اتار کر ٹکڑے بنانے سے فارغ ہوتا ہے، موقع پر موجود لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور گوشت لوٹ لیتے ہیں۔

ٹال یا شنک: لیکن اگر بیمار قریب المرگ ہوتا ہے۔ تو جانور کی قربانی دینے میں عجلت سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ اضطراب و اضطرار کی حالت کے باوجود ہم سخن سنجی سے تہی نہیں ہوتے وہ خدا سے وعدہ کرتے ہیں۔ کہ اگر بیمار آدمی کو اس نے صحت بخشی تو ہم فلاں جانور کی قربانی خدا کے نام پر دیں گے خاندان کا کوئی فرد اپنے ہاتھ میں ایک ''ٹال'' یا ''شنک'' یعنی سبز جھنڈی یا ہری شاخ لے کر یہ کہتا ہوا جانور کو مارتا ہے۔ ''جس طرح میں تجھے مار رہا ہوں اسی طرح تجھے ہم یقیناً اللہ کے نام پر قربان کریں گے بیمار کو صحت یاب ہو لینے دے'' تین مرتبہ ہری شاخ کی چھڑی سے بکرے کو مارا جاتا ہے اور تین بار یہ وعدہ بآواز بلند دہرایا جاتا ہے۔ اور یہ بھیڑ یا بکرا جسے مارا گیا ہے۔ گلہ سے الگ رکھا جاتا ہے۔ لیکن بیل کے کان میں وہ دھاگہ باندھ دیتے ہیں۔ یہ اس بات کی نشانی ہوتی ہے کہ خدا کے نام پر اسے قربانی کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔

بیمار قربانی کا گوشت نہیں کھاتا: اگر دعائیں مستجاب ہوتی ہیں اور بیمار صحت مند ہو جاتا ہے۔ تو نشان زدہ جانور کی قربانی دی جاتی ہے۔ اور گوشت پڑوسیوں اور غریب غرباء میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ لیکن بیمار آدمی جو اب صحت یاب ہو چکا ہے۔ یا حال ہی میں بیماری سے اٹھا ہوا کوئی اور آدمی۔ اس قربانی (جو بطور صدقہ دی جاتی ہے) کا گوشت نہیں کھاتا ہے۔ مبادا وہ پھر بیمار پڑ جائے اور خاندان کے افراد کا بھی اس گوشت سے باز رہنا بہتر ہوتا ہے۔ مبادا جس بلا سے ابھی ابھی نجات ملی ہے۔ پھر اسی میں گرفتار ہو جائیں۔

جانوروں کا صدقہ: اگر خدا کے نام پر نشان زدہ جانوروں میں گھوڑا، اونٹ اور دوسرے بڑی قیمت کے جانور ہیں۔ تو ان کی قربانی نہیں دی جاتی بلکہ انہیں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اور فروخت سے حاصل ہونے والی رقم غرباء مساکین کو بطور خیرات دے دی جاتی ہے۔ ہاں منت مانے ہوئے جانوروں کو بیمار کے صحت یاب ہونے کے بعد یقیناً فروخت کرتے ہیں۔ لیکن اس کی قیمت فرضی ہوتی ہے۔ اور حقیقی جانوروں کی قیمت سے نہایت کم اور یہی رقم خیرات کی جاتی ہے۔ اور پھر اسی قیمت پر بیچے ہوئے جانور کو دوبارہ خرید لیا جاتا ہے۔

مہلک امراض: کچھ ایسی بیماریاں ہیں جو اگر کسی آدمی کو لگ جاتی ہیں تو بعد از علاج وہ اس سے نجات پاتا ہے۔ لیکن بعض امراض ایسے بھی ہیں۔ جن سے صحت یابی ممکن نہیں ہوتی اور ایسی بیماریوں کو براہوی ''ڈین'' کہتے ہیں۔ یہ ایسی مہلک بیماریاں ہیں۔ جو جلد یا بہ دیر انسان کو فنا کے گھاٹ اتار کر چھوڑتی ہیں۔ اور ان میں سب سے زیادہ خوف

ناک ماتا (چیچک) ہے یا اگر ان امراض سے کوئی زندہ بچ بھی جاتا ہے۔ تو عمر وہ اس کا داغ لئے پھرتا ہے۔ براہوی لوگوں کے ہاں یہ خیال ہے کہ یہ داغ جسم پر ہی نہیں ہوتا بلکہ اندرون جسم ہڈیوں پر بھی ہوتا ہے اور آدمی کے مر کر خاک ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

پٹ او ماتا: چیچک یا "ماتا" کے پڑوس میں پھیلتے ہی ماں کی روح بے قرار ہو جاتی ہے۔ اور اسے اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ اپنے بچوں کو کسی بزرگ درویش سے دم نہ کرالے۔ علاقے میں سید دورہ کرتے رہتے ہیں۔ اور جہاں جاتے ہیں وہاں دم بھی کرتے ہیں۔ اور "شاہی" یا "کھیری" نام کے لوگ ہیں۔ جو موسم گرما میں اس غرض سے علاقے کا دورہ کرتے ہیں۔ بعض علاقوں میں ایسے درویش اور پہنچے ہوئے لوگوں کو آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ اور انہیں مہلک امراض سے نجات دہندہ سمجھا جاتا ہے۔

ٹیکہ: قلات میں سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھنے والی ایک سیدانی بی بی ہوا کرتی تھیں ان کا ٹیکہ بے حد موثر سمجھا جاتا تھا اپنے خلیفہ سے وہ اپنی موجودگی میں عورتوں اور بچوں کو ٹیکہ لگواتیں اور خود سر پر ہاتھ رکھ کر دعا کرتیں۔ وہ پردہ نشین خاتون تھیں لہٰذا مردوں کو ٹیکہ لگا کر رخصت کر دیا جاتا اور وہ دست شفقت اور دعا سے محروم رہتے۔ ٹیکہ لگانے کا طریقہ ملاحظہ فرمائیے۔ خلیفہ دائیں کلائی میں شگاف لگا کر اس پر "پولور" یعنی چیچک کا چھلکا ڈال کر سفید پٹی باندھ دیتا ہے۔ اب یہ سوال کہ چیچک کے چھلکے کہاں سے دستیاب ہوئے دراصل یہ ٹیکہ لگانے والے خود لے کر آتے ہیں۔ نیز جب کوئی چیچک کا شکار ہوتا ہے۔ اور اس کا زخم سے اترنے والے چھلکے یا کھرنڈ جمع کر کے رکھ لئے جاتے ہیں۔ اس کا عام طور پر ذخیرہ لوگوں کے یہاں رہتا ہے۔ اور ٹیکہ لگانے کے کام آتا ہے۔

سید سلیم کا استرا: جھالاوان والے بے حد حیرت انگیز چیچک کے ٹیکہ والے استرے پر فخر کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں ایک اللہ والے بزرگ سید سلیم شاہ تھے۔ زوزانہ ان کے یہاں لوگوں کا جم غفیر آتا اور ان سے چیچک کا ٹیکہ لگانے کی درخواست کرتا۔ لوگوں کے بے حد اصرار پر ایک دن انہوں نے اپنے ایک خلیفہ کے ہاتھ میں استرا دیا اور کہا کہ جا کر وہ لوگوں کو ٹیکہ لگائے لیکن مار کے ڈر کے یا اعتقاد کی کمزوری کی وجہ سے وہ ٹیکہ لگانے کی جسارت نہ کر سکا لہٰذا سید سلیم شاہ نے استرے پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور دیکھئے اس پر چیچک کے داغ ابھر آئے اور پھر دوبارہ انہوں نے اسے کچھ پڑھ کر پھونکا اور استرا پہلے جیسا ہو گیا۔ بعد ازاں لوگ اس استرے سے ٹیکہ لگواتے ہیں۔

علاج و معالجہ: جیسے ہی کسی گھر میں ماتا کا ظہور ہوتا ہے۔ گھر کی ملکہ گاؤں کی دکان میں جا کر یہ اضطراب انگیز خبر عام کرتی ہے۔ اور ہندو کی عورتوں کو اپنے گھر آ کر مریض کو دیکھنے اور تشخیص کرنے کی درخواست کرتی ہے۔ ہندو عورتیں اس کی تشخیص اور علاج و معالجے میں ماہر ہوتی ہے۔ وہ آتی ہیں۔ اور مریض کا گرم ہاتھ سونگھتی ہیں۔ اور اگر انہیں ماتا کی بو ملتی ہے۔ تو وہ یقین کے ساتھ بتاتی ہیں۔ کہ یہ تپ ماتا کی ہے۔ وگرنہ نہیں اب اگر ماتا نکلنے والی ہوتی ہے۔ تو وہ فوراً مریض کے گرد "قلعہ" کے انداز میں چاروں طرف پردہ لٹکانے کے لئے کہتی ہیں۔ اور اب کمرے میں لوگوں کا آنا جانا منع ہو جاتا ہے۔ نیز یہاں کھانا پکانے کی بھی ممانعت ہوتی ہے۔ اور گھر کے لوگوں کا ہاتھ منہ دھونا اور لباس بدلنا بھی موقوف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہندو عورتیں جانتی ہیں کہ ان سے "ماتا دیوی" ناخوش ہوتی ہے۔

دوسری صبح وہ پھر آتی اور اگر وہ جسم پر دانہ دیکھتی ہیں۔ تو وہ گھر کی مالکہ کو بلا کر دکھاتی ہیں۔ اور انہیں احتیاط بتاتی ہیں۔ تاکہ وہ دل میں گرہ لگا لے اور اگر دانہ نہ ہو تو وہ مائل ہوتا ہے۔ تو وہ اسے خوش خبری سناتی ہیں۔ کیونکہ یہ مہلک زیادہ نہیں ہوتا اور جلد مرجھا جاتا ہے، داغ بھی جلد مٹ جانے والا ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ تو وہ افسوس سے سر کو جھکا دیتی ہیں کیوں کہ سیاہ ماتی رنگ ہے۔ اور موت کی علامت بھی، اب اگر یہ گودکا بچہ ہے۔ جو چیچک میں مبتلا ہوا ہے۔ تو اس کی ماں کو بکرے یا بھیڑ کا گوشت اور گرم غذائیں دی جاتی ہیں۔ کیونکہ چیچک کے مرض میں ہمہ اقسام کی ٹھنڈی غذا سے پرہیز لازم ہوتا ہے۔ اور بڑی عمر کے لوگوں کے لئے پنیر کے پھل کو ابال کر ادرک، لونگ، سیاہ مرچ اور چینی ملی گرم چائے کے گھونٹ کے ساتھ کھلانے سے بہتر کوئی دوا نہیں ہے۔ اب جبکہ ہندو عورتیں تیسری بار مرض کو دیکھنے آتی ہے۔ تو وہ اسے اپنے سامنے بٹھا کر "ماتا دیوی" اتارتی ہیں۔ اور اس کی تعریف میں بھجن پڑھتی ہیں۔ اور ساتویں دن مریض کے جسم پر گھن پوتی ہیں۔ اور اسے نیم گرم پانی سے نہلاتی ہیں۔ اور ان تمام کاموں کے دوران وہ "ماتا دیوی" کی شان میں منتر اور بھجن پڑھتی رہتی ہیں۔ اور اس دوران مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یہ تو گاؤں کی صورت حال ہے۔ لیکن وہ لوگ جو گاؤں میں نہیں رہتے اور جہاں نہ دکان ہوتی ہے۔ اور نہ ہندو عورتیں مدد کے لیے دستیاب ہوتی ہیں۔ ان کا علاج گھر کی بڑی بوڑھیاں کرتی ہیں۔ اور ماضی میں اگر کوئی مکران میں "گرم پک" یعنی چیچک کا شکار ہو جاتا تو اسے نہ صرف اپنے گھر سے بلکہ گاؤں سے نکال دیا جاتا اور اسے تنہا مرض سے لڑنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا اس کے قریب کوئی نہیں پھٹکتا تھا ماسوا ایسے لوگوں کے جنہیں چیچک نکل چکی ہو۔

ترینزکت خسرہ: اگر بچہ ہر وقت اپنی ناک نوچنے لگتا ہے۔ تو ایک ماں کے لئے یہ گھڑی پریشان کن ہوتی ہے کہ یہ یقینی علامت بیمار پڑنے کی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی

ناک کی لو کو سہلاتی ہے۔ اور اس کی دیواروں کو دباتی ہے۔ اور اگر اس سے افاقہ نہیں ہوتا تو جوتے کے تلے سے ناک کو سہلاتی ہے۔ لیکن اگر بچہ تین دنوں تک لگاتار بخار میں مبتلا رہتا ہے۔ اور زرد اور کمزور نظر آنے لگتا ہے۔ تو اسے خدشہ ہوتا ہے۔ کہ ہو نہ ہو یہ بڑی ماتا یا دوسری ہے۔ اگر یہ صرف ترینزک یعنی خسرہ ہوتا ہے۔ تو بہر کیف اس کی وحشت کم ہوتی ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ بچہ کو الگ رکھا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ چھوت کی بیماری ہے۔ اور کسی کو لگ جائے گی بلکہ اس لئے کہ کوئی ناپاک ونحس خسرے میں مبتلا بچے کی تکلیف میں مزید اضافہ نہ کرے۔ ایک بھیڑ ذبح کی جاتی ہے۔ اور دل جگر اور پھیپھڑے پکا کر بچے کو کھلائے جاتے ہیں۔ تاکہ خسرے کے دانے اچھی طرح سے ابھر آئیں اور اگر اس سے دانے نہیں ابھرتے تو بھیڑی کا دودھ گرم کر کے اس میں شکر ملا کر پلایا جاتا ہے۔ اور جب دانے اچھی طرح سے ابھر جاتے ہیں۔ تو پھر بچے کو ٹھنڈی غذائیں کھلائی جانے لگتی ہیں۔

سرخک، چھوٹی چیچک: لیکن اگر یہ بیچارا بچہ بخار میں مبتلا رہتا ہے۔ اور اس کی ناک سے پانی گرتا رہتا ہے اور پریشانی کے ساتھ کھانستا رہتا ہے۔ تو یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی ہے کہ وہ ''سرخک'' میں مبتلا رہتا ہے۔ جو بالکل جداگانہ مرض ہے۔ ایسی حالت میں مناسب یہی سمجھا جاتا ہے کہ ہندو عورت سے مشورہ کیا جائے اور اگر ساری دنیا کہے ''نہیں'' اور وہ تشخیص کرتی ہے کہ یہ سرخک یا سرکھک ہے۔ تو اس پر بے چوں چرا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اور اگر دانہ (بڑی سرخی مائل چیچک) ابھرا نہ ہو تو اسے ابھارنے کے لئے گرم غذا جو ترینزک میں کھلائی جاتی ہے۔ وہی کھلانی چاہئے لیکن اگر سرخ دانے آپ ہی ابھر آئیں تو یہ زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس کے بعد یعنی دانے ابھر آنے کے بعد ٹھنڈی غذا دینے کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر مریض کو پیاس لگتی ہو تو اسے بکری کا دودھ پینے کیلئے دیا جاتا ہے اور ساتویں دن اس کے جسم پر گھی ملایا جاتا ہے اور پھر نیم گرم پانی سے غسل دیا جاتا ہے اور بستر اور لباس کو بدل دیا جاتا ہے کہ یہ مرض متعدی ہوتا ہے۔ ہاں یہ بات پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ سرخک کو حرارت پہنچانے میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں دانہ جسم کو دریدہ نہ کرے لہٰذا بچہ کو تین دنوں تک ناشتے سے قبل بکری کی چربی میں لپیٹ کر سرمہ کھلانا مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ جسم کی دریدگی میں بھرت کرتا ہے اور ہر چند بچہ اب صحت یاب ہو گیا ہے۔ لیکن اسے چالیس دنوں تک محض دودھ بھات کھلایا جاتا ہے۔ ''سرخک'' سے اکثر و بیشتر دوبارہ زندگی پاتے ہیں۔ اور محض شیرینی اور دوسری میٹھی غذاؤں کے طفیل ہلاک ہوتے ہیں۔

خرٹیٹو، کالی کھانسی: امراض میں ایک عام مرض کھانسی ہے۔ جسے براہوی خر ٹیٹو کہتے ہیں۔ اسے خوش بخت سمجھا جاتا ہے۔ جسے یہ مرض بچپن میں لاحق نہ ہو۔ کیونکہ بڑی عمر میں یہ مرض زیادہ پریشان کن نہیں ہوتا لیکن لڑکپن میں یہ حشر اٹھاتا ہے۔ ابتداء میں کوئی دوا نہیں دی جاتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کھانسی رک کر پھیپھڑے کو صدمہ پہنچائے۔ بہر کیف کھانسی کے مریض کو الگ رکھا جاتا ہے۔ اس کا بستر اور کھانے پینے کا برتن سے بھی الگ کر دیا جاتا ہے۔ اسے ٹھنڈی غذاؤں یا چاول اور تیل کی چیزوں سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔ اور بیچارا بچہ کھنکھارتا ہے۔ اور کھانستا ہے۔ کھانستا ہے۔ اور کھنکھارتا ہے۔ اگر اس کے کھنکھارنے کا انداز زکوا کی کائیں کائیں سے ملتا جلتا ہے تو پھر ماں اس کی صحت یابی کی توقع رکھتی ہے۔ لیکن اگر وہ محسوس کرتی ہے۔ کہ کھنکھارنے کے درمیان لے ٹوٹتی ہے۔ اور ہوا گزرتی ہے۔ تو پھر وہ اسے پریشانی کی علامت سمجھتی ہے۔ ایسا تو نہیں کہ اسے بغیر دارو چھوڑ دیتے ہیں۔ دن میں ایک دو مرتبہ اخروٹ کی چھال کے عرق میں پانی ملا کر اسے گھونٹی دیتی ہیں۔ نیز ''خوشدار'' یعنی ماڑ (چاول ابالنے کے بعد جب وہ گل جاتا ہے۔ تو پانی پسایا جاتا ہے۔ اس پسے ہوئے پانی کو ''ماڑ'' کہتے ہیں۔ یعنی چاول کا عرق تاثیراً یہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔) دیتے ہیں۔ لیکن تیر بہدف نسخہ خرگوش کے خشک کئے ہوئے سر کا سفوف ہوتا ہے۔ ہر صبح تین دنوں تک دیا جاتا ہے۔

کزر، خناق: اکثر بچے کزر یعنی خناق کی آزمائش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کی ابتدا ہلکے بخار اور دست سے ہوتی ہے۔ ننھے منے کا جسم لاغر سے لاغر ہو جاتا ہے۔ لیکن سر کی لمبائی بڑھ جاتی ہے۔ اور اگر گردن کے پچھلے حصہ میں گڑھا پڑ جاتا ہے۔ تو کوئی بوڑھی دادی نانی اسے اڈی یعنی حلقوم گر جانے کی علامت سے تعبیر کرتی ہے۔ لہٰذا نمک اور خاک شہادت کی انگلی میں لگا کر بچے کے حلق میں ڈالتی ہے۔ اور حلقوم کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرتی ہے۔ تین بار یہ عمل کیا جاتا ہے۔ اور ہر بار صبح سویرے۔ اور اگر اس کے باوجود بخار نہیں اترتا تو بچہ کے خاندان کے لوگ ایک بیل یا بکری ذبح کرتے ہیں۔ اور پیٹ چیر کر اتڑی پچونی وغیرہ نکال لیتے ہیں۔ اور اس کے پیٹ میں ایک بڑا سوراخ کر کے بچے کو اس کے اندر گھسا دیتے ہیں۔ اور محض اس کا سر اور گردن باہر ہوتا ہے۔ بچہ اسی حالت میں چار گھنٹے یا زیادہ وقت تک رہتا ہے۔ اور پھر اسے نکال کر چیتھڑوں سے پونچھا جاتا ہے۔ اس کے بعد پورے تین دنوں تک غسل نہیں دیا جاتا اسے دائم یا تاثیراً سرد کوئی جڑی بوٹی کا عرق پلایا جاتا ہے۔ اور بچے کو نہار منہ پانی پلایا جاتا ہے۔ اور چودھویں دن اگر خدا چاہتا ہے وہ کزر کے مرض سے شفایاب ہو جاتا ہے۔ بہر کیف بیچارا بچہ بیماری کی وجہ سے بے حد لاغر اور کمزور ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے موٹا تازہ کرنے کیلئے کچھوے کے انڈے کا سفوف ''ڈل'' میں ملا کر

چپاتیاں پکانے کا ایک انداز (تصویر: محسن سلطان)

مل کر کھانا کھانے کا روایتی انداز (جنوبی وزیرستان)

کھلایا جاتا ہے۔لیکن اگر یہ دودھ پیتا بچہ ہے۔تو ماں نمک کھانے سے پورے پانچ دن پرہیز کرتی ہے۔اسکے بعد بچہ تندرست وتوانا ہوجاتا ہے۔اوراس کے بعد ہمیشہ کے لئے کزر کے مرض سے اسے نجات مل جاتی ہے۔

پوشٹر، نزلہ وزکام: خواہ شدید سرما کا موسم ہوخواہ موسم گرما کی ٹھنڈی رات ہو سال کے کسی وقت نزلہ زکام ہوسکتا ہے۔تین دن تک یہ رہتا ہے۔لیکن نزلہ زکام میں مبتلا تنہا کھاتا پیتا ہے۔اوراس کے برعکس بھی الگ کردیئے جاتے ہیں۔چوتھے دن وہ لیڈر یعنی کرڑمین (سبزگندم) کا دلیہ کھاتا ہے۔لیکن پانی نہیں پیتا اور خوش قسمتی سے اگر اسے گہری نیند آجاتی ہے۔تو پھر وہ بھلا چنگا ہوجاتا ہے۔دوسری تیر بہدف دوا ایک بوٹی گندریم سے تیار کی جاتی ہے۔جو تقریباً تمام دیہی اور پہاڑی لوگوں کے گھروں میں ذخیرہ کی جاتی ہے۔اس بوٹی کی تمام پتیاں پانی میں ابال کر مریض کو پلایا جاتا ہے۔اس کے پینے کے بعد آدمی کو گہری نیند آجاتی ہے۔اور خوب کھل کر پسینہ آتا ہے۔اور وہ صحت یاب ہوجاتا ہے۔لیکن آخری افغان جنگ کے بعد یہاں بہت سی جڑی بوٹیوں کی جگہ چائے نے لے لی۔کیونکہ ایک کاروان چائے کے بنڈلوں سے لدا پھندا درہ بولان میں لوٹا گیا تھا اور چائے دست بدست پورے ملک میں پھیل گئی اور پہاڑی لوگ آج کے دن تک اسے نزلہ زکام کے علاج کے طور پر پیتے ہیں۔لیکن گاؤں کے رہنے والے خصوصاً سراوان کے لوگ چائے کو مزے کے لئے پیتے ہیں۔اور بعض علاقے میں چائے دوا کے طور پر استعمال میں آتی ہے۔لہٰذا وہ ''برش'' استعمال کرتے ہیں۔جو افیون پیڑی ادرک، زعفران، سیاہ مرچ اور دیگر مسالوں سے تیار کی جاتی ہے۔اور اسے شہد اور سبز چائے کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔اور اکثر اود بلاؤ کے خصیہ کے سفوف کی ایک چٹکی بھی اس کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔ادویات ہر چند خوب ہیں۔لیکن بہت سے لوگوں کو تباہ کردیتی ہیں۔جوان کی تلاش میں ہوتے ہیں۔لہٰذا عام طور پر نزلہ زکام کے مارے لوگ اپنے روایتی علاج یعنی افیون سے نزلہ زکام کا مقابلہ کرتے ہیں۔

کلا، کھانسی: لیکن ایک آدمی نزلہ زکام کا اتنا علاج نہیں کراتا جتنا وہ کھانسی کا کرتا ہے۔اگر کسی شخص کو کھانسی ہوجاتی ہے تو وہ نہ بکرے کا گوشت کھائے گا اور نہ چاول کیوں کہ ان دونوں کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔تین رات گزرنے کے بعد اسے خوب اچھی طرح ابالے ہوئے ''چرمائنگ'' کا ایک گھونٹ پینے کیلئے دیا جاتا ہے۔''چرمائنگ'' کی جڑ ڈنھل اور پتیاں سب ایک ساتھ ابالی جاتی ہیں۔اور اگر اس سے شفا نہیں ہوتی تو پھر خوشدار کی جڑیں اور اخروٹ کی چھال ابال کر اور اس میں چینی ملا کر اس کی خوراک پلاتے ہیں۔اگر ایک خوراک سے شفا نہیں ہوتی تو دوسری خوراک ثمر ہندی (املی) اور سیاہ مرچ ملا کر پلاتے ہیں۔

خن بش منتگ، آنکھ آنا: ڈینس برے کاراوی مرزا شیر محمد اسے بتاتا ہے:

ملک کا کوئی بڑا بوڑھا آپ کو بتا سکتا ہے۔کہ آنکھ آنے کا علاج کیا ہے۔آپ خن چت یعنی گل کنجدے لیجئے اور کہئے ''اے خن چت میری آنکھیں اپنے میں ایک پورے سال کے لئے رکھ لو، میں یہ تم سے التجا کرتا ہوں'' اور یہ کہتے ہوئے پورا پھول نگل لو اور اس بات کی احتیاط رکھو کہ اسے دانت نہ چھونے پائے اور اس ترکیب سے جتنا پھول چاہو نگل لو جتنا پھول نگلو گے اتنے سال کے لئے آنکھوں کی اس بیماری سے محفوظ ہوجاؤ گے۔اب اگر ایک آنکھ متاثر ہوئی ہے۔تو لازم ہے۔کہ آئینہ نہ دیکھو کیونکہ بقول بوڑھی حاسد بیویاں سمجھتی ہیں کہ اگر ایسا کیا تو دوسری آنکھ بھی آجائے گی۔اگر تمہارے بھائی کی آنکھ آئی ہے۔تو اس کے ساتھ کھیل کود موقف کردو اور جب کبھی اس سے سامنا ہو تو یہ گنگنانا مت بھولو ''تمہاری آنکھ سونے کی ہے اور میری آنکھ اپلے کی'' اس طرح تم خرابی سے محفوظ رہو گے یہ تمام ادویات بہت سادہ ہیں۔

کاٹم ناخل: عورتیں عام طور پر دردسر میں مبتلا ہوتی ہیں۔اور بطور علاج وہ سر میں تیل لگاتی ہیں۔اسے کسی کپڑے سے باندھ دیتی ہیں۔ناس لیتی ہیں۔اور یوں دردسر جاتا رہتا ہے۔اور ان کی یہ ترکیبیں کارگر نہیں ہوتی ہیں۔تو کسی پیر فقیر کے پاس دم کرانے جاتی ہیں۔یا تعویز اور ٹوٹکا کے ذریعے علاج کراتی ہیں۔لیکن موسم سرما میں ایک ہٹا کٹا آدمی بھی سر کی درد سے بے چین ہوسکتا ہے۔اس کا تیر بہدف علاج یہ ہے کہ وہ ابھرتے سورج کی جانب رخ کرکے بیٹھ جائے۔گجفل کی چھال کے سفوف کا ناس لے۔اس سے سر کا درد جاتا رہتا ہے۔

دندان نسنگ، دانت بجنا: براہویوں میں ایک بچہ یا جوان جب دانت بجاتا ہے تو یہ ایک اچھی علامت ہوتی ہے۔یعنی وہ اپنے دشمن کا سر چبا ڈالے گا۔لیکن اگر لڑکی یا جوان عورت کے سوتے میں دانت بجتے ہیں تو اس کے معنی کچھ اور لئے جاتے ہیں۔اور مناسب یہی ہے کہ گھر کے لوگوں پر کوئی آفت ٹوٹ پڑنے سے پہلے اس کا علاج کرالیا جائے اس کا پہلا علاج یہ ہے کہ مریضہ کچھ دنوں تک ضبط نفس سے کام لے اور شعوری طور پر کوشش کرے کہ دانت نہ بجیں۔ماں رات کے وقت اس بات کی نگرانی کرتی ہے۔اور اگر دانت بجتے ہیں۔تو وہ منہ پر تھپڑ مار کر لڑکی کو بیدار اور ہوشیار کرتی ہے۔لیکن اگر اس سے شفا نہیں ہوتی تو پھر ٹونہ اور تعویز گنڈے کرنے والوں سے رجوع

کیا جاتا اور لڑکی کی گردن کے گرد ٹوٹے ہوئے رباب کا تار باندھنا بھی ایک علاج ہے۔ جس سے علاج عموماً رات کے وقت سوتے ہوئے دانت بجنا بند ہو جاتا ہے۔

کہو، ضعف معدہ: کہو کا مرض عام ہے۔ اس مرض میں شکم پر بوجھ پڑ جاتا ہے اور وہ نیچے کی جانب کھسکا محسوس کرتا ہے۔ اور اس میں شدید درد ہوتا ہے۔ بہت سے بچوں کو یہ مرض لاحق ہوتا ہے۔ اور بہت سی مائیں بچے کی تولید کے بعد اس مرض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اس کا ایک علاج ہے۔ جسے ''کہوی'' کہتے ہیں۔ ایک اونس کالی مرچ اور اس سے پانچ گنا گھی ملا کر کہوی تیار کی جاتی ہے۔ اور یہ مریض کو پلائی جاتی ہے۔ اس مرض کہو میں بڑی عمر کے آدمی بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر جب توت پکتا ہے۔ کیوں کہ یہ بڑی بوڑھیاں جانتی ہیں۔ کہ یہ مرض توت حلق تک ٹھونسنے کے بعد اوپر سے دودھ پی لینے سے ہوتا ہے۔ اور اگر درد شدید ہوتا ہے۔ اور کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا تو یہ مرض مہلک قولنج میں بدل جاتا ہے۔ جس کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے۔

خل، قولنج: اس مرض میں درد کی چمک اور لہر بے پناہ اٹھتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ خل میں مبتلا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ اسے مہلک قولنج ہو گیا ہے۔ یہ مرض اس قدر عام ہے کہ اس میں مبتلا شخص ''کہوی'' کی ایک خوراک کے لئے پکار اٹھتا ہے۔ اور وہ اپنے پاس کہوئی (کہوالی) کی خوراک رکھتا ہے۔ یہ ایک سفوف ہوتا ہے۔ جو پیون، چلی بوبے مادران، مارمونک، نوشادر، چشم، جوکر، زعفرانی اور مونو پل کو پیس کر بنایا جاتا ہے۔ ایک چرواہا ایسی دوا استعمال نہیں کرے گا۔ وہ جنگلی دائم کا پھول قریبی جھاڑی سے توڑ کر چباتا رہے گا تا آنکہ قولنج سے اسے نجات نہ مل جائے۔

خل اے اسی: تمام جڑی بوٹیوں اور علاج و معالجہ کے باوجود قولنج اور کہو سے شفا نہ ہوئی تو اس کا خدشہ ہوتا ہے کہ یہ کہیں خل اے اسی میں نہ بدل جائے یعنی اس مہلک قولنج میں جس میں ہاتھ پاؤں سرد پڑ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں خاندان کے افراد کو بے حد تشویش ہوتی ہے۔ بہر کیف اب وہ آرام سے نہیں بیٹھتے وہ قے کرانے کیلئے مریض کو ''گوچ'' کے سفوف کو پانی میں ملا کر پلاتے ہیں۔ اور اگر اس کا اثر نہیں ہوتا تو پھر وہ ایک پرندہ ذبح کرتے ہیں۔ اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے انتڑیوں اور پروں سمیت مریض کے پیٹ پر باندھ دیتے ہیں۔ لیکن اگر طبیب کی یہ تشخیص ہوتی ہے کہ یہ قولنج ہے۔ تو پھر اس طریق علاج پر عمل کیا جاتا ہے۔ پہلے ''کہہ دانارگ'' یعنی اس نس جو پیٹ کی دائیں جانب ہوتی ہے، کو ملا جاتا ہے۔ لیکن تیل نہیں لگایا جاتا کہ اس سے درد اور چمک میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ محض پانی سے لیکن اگر قے کرانے اور سہلا کر حرکت میں لانے کے باوجود افاقہ نہیں ہوتا تو پھر نس کو داغنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اب یہ وقت ہوتا ہے کہ بھیڑ یا بکری کی قربانی دی جائے اور مریض کا صدقہ نکالا جائے کیوں کہ اب مریض کی حالت ابتری کی آخری حد کو چھونے لگی ہے۔ لہٰذا یہ خداوند تعالیٰ سے رجوع کرنے اور دعا کرنے کا وقت ہوتا ہے۔

گول، مغزی کا حملہ: اگر کوئی شخص چاول یا تیل کے پکے ہوئے کھانے پانی کے گھونٹ کے ساتھ شکم میں اتار لیتا ہے۔ یا سبزی ترکاری سے پیٹ بھرتے کے بعد شیرینی کھاتا ہے۔ تو اسے ''گول'' ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ اور اگر یہ بیماری ہوئی تو اس کے مریض کا چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ بھوک مر جاتی ہے۔ اور اس پر غنودگی مستولی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس مریض کے لئے مناسب ہے۔ کہ وہ ''کوالی'' کی ایک چٹکی پانی میں ملا کر تین بار دن میں پیئے۔ ہر بار ''کڑکاوا'' کے عرق میں ذرا سی ''پنکی'' یعنی پھٹکڑی ملا کر پیتا بھی مفید ہوتا ہے۔ اور یہ دوا صبح کے وقت تین دنوں تک استعمال میں رکھی جانی چاہئے اگر اس سے افاقہ نہ ہو تو پھر کان کے پیچھے کی نس کو ہلکا سا داغ دینا چاہئے بعض لوگ پہورج ابھرنے کے وقت ایک برتن میں پانی اور تیل ملا کر مریض کے سر پر رکھتے ہیں۔ اور کسی ہرے پودے کی شاخ سے اسے حرکت دیتے رہتے ہیں۔ اور جب پانی اور تیل باہم دگر ہو جائے تو اسے چشمہ رواں میں اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد مریض کو آرام آ جاتا ہے۔

زردوئی یرقان: لیکن اگر کوئی علاج نہ کیا گیا اور بیماری نے طول کھینچا تو پھر اس کا ''زردوئی'' میں منتقل ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ جسم کا ہر حصہ زرد پڑ جاتا ہے۔ چہرہ، آنکھیں، بدن اور اس کا پیشاب خون کی طرح سرخ ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے۔ کہ مریض کی گردن میں ایک سرخ پیاز باندھ دیتے ہیں۔ اور وہ اس کے اچھا ہونے تک اس کی گردن میں بندھا ہوتا ہے۔ اور جب وہ خشک ہو کر زرد پڑ جاتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے۔ کہ بیماری کا پنجہ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور متضاد علاج آزماتے ہیں۔ وحشی لوگوں میں شہوت سے مست اونٹ کے پیشاب میں پھٹکڑی ملا کر نہار منہ پلایا جاتا ہے۔ بعض لوگ سرکا میں پانی ملا کر مریض کو صبح کے وقت پلاتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ جنہوں نے دنیا دیکھی ہے۔ وہ دو خشک انجیر کو سرکا میں رات کے وقت پھولنے کیلئے ڈال لیتے ہیں۔ اور نہار منہ مریض کو کھلاتے ہیں۔ دوسری صبح کو تین انجیر اسی طریقہ سے دیتے ہیں۔ اور چوتھے دن چار انجیر یہاں تک کہ انجیر کے خوراک نو انجیر تک پہنچ جائے اور پھر یہ ہر روز ایک کم کر کے دینا شروع کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کچھ باقی نہیں رہتا اور اگر اس سے بھی

مریض کو افاقہ نہیں ہوتا تو یہ بے حد حیرت کی بات ہوتی ہے۔

زردونہ خل: لیکن فوق الاثر دوا آخر میں دیتے ہیں۔ نومولود گدھ کا گھونسلہ تلاش کرتے ہیں۔ اور جیسے ہی نومولود گدھ کی ماں گھونسلے سے پشت موڑتی ہے۔ وہ نومولود کو ہلدی سے رنگ دیتے ہیں۔ اور جب ماں گھونسلے میں واپس اڑتی آتی ہے۔ اور اپنے بچے کو زرد دیکھتی ہے۔ تو وہ سمجھتی ہے کہ اسے ''زردوئی'' ہو گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا ایسا خیال کرنا حق بجانب ہوتا ہے۔ وہ جلدی سے اڑ کر ''زردونہ خل'' لانے جاتی ہے۔ جو ایک پتھر ہوتا ہے۔ اور جس کے بارے میں صرف وہی جانتی ہے۔ کہ کہاں ملتا ہے۔ اور وہ احمق گدھ پتھر لا کر اپنے گھونسلے میں ڈال دیتی ہے۔ اور پھر جیسے جیسے دن گزرتا جاتا ہے۔ نومولود گدھ کا زرد رنگ اترتا جاتا ہے۔ اور ہفتے کے بعد گاؤں کے لوگ آتے ہیں۔ اور اس پتھر کو اٹھا کر خوش و خرم لوٹ جاتے ہیں۔ اور وہ یرقان کے مریض کی گردن میں باندھ دیتے ہیں۔ اس سے اسے سکون ملتا ہے۔ اور جلد صحت یاب ہوتا ہے۔

دلوئی۔ طحال: اگر بروقت ''ازروئی'' پر قابو نہ پالیا جائے تو اس کے قدم بہ قدم ''دلوئی'' یعنی طحال نامی مرض آتا ہے۔ جس سے جسم لاغر ہو جاتا ہے۔ طحال کی وجہ سے چربی کی مقدار بڑھنے لگتی ہے۔ یہ مرض چاول کھانے والے لوگوں میں اس قدر عام ہے۔ جس قدر اونٹ کے دودھ پر گزر اوقات کرنے والوں میں شاذ ہے۔ لہٰذا طحال کے مریض کو چاول سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔ اور اس کے بجائے اونٹ کا دودھ دیا جاتا ہے۔ لیکن اونٹ کا دودھ دینے سے پہلے اس کی دم سے تین مرتبہ دودھ کو ہلکورے دلایا جاتا ہے۔ اس سے دوا میں ایک خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بیمار آدمی کو افاقہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی تندرست شخص بھی کسی اونٹ والے سے پینے کیلئے دودھ طلب کرتا ہے۔ تو آنکھیں کھول کے رکھئے۔ وہ دودھ کے برتن میں اونٹ کی دم ڈالنا ہرگز نہ بھولے گا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی علاج و معالجہ ہیں۔ بعض ''زردوئی'' کے علاج کی طرح سرکہ اور انجیر استعمال کراتے ہیں۔ اور بعض پکی ہوئی مولیوں کا بڑا سا مٹھا لیتے ہیں اور انہیں چھیل کاٹ اور چور کر نمک ملانے کے بعد الگ رکھتے ہیں۔ اور یہ برتن رات کے وقت گھر کی چھت پر رکھ دیتے ہیں۔ اور صبح کے وقت نہار منہ مریض کو اسے پورا کا پورا کھلا دیتے ہیں۔ ایک دن وقفہ کر کے دوسرے دن تین بار یہ مریض کو کھلایا جاتا ہے۔

طحال کاٹنے کا عمل: بہر کیف ان میں سے جو زیادہ عقل مند ہوتا ہے۔ وہ چشتی سید کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔ اور اس کے مقدس ہاتھوں میں وہ تیز دھار والی تلوار پکڑا دیتا ہے۔ اور وہ مریض کو اپنے سامنے لٹاتا اور پیٹ عریاں کرنے کے بعد تلوار کی دھار پر کچھ پڑھ کر دم کرتا ہے اور اسے پیٹ پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے دباتا ہے۔ بلکہ کچھ دیر اسی طرح دباتے رکھتا ہے۔ یہ عمل نہار منہ ہوتا ہے۔ اور تین یوم جاری رہتا ہے۔ اور اس عمل کے بعد مریض کچھ کھاتا پیتا ہے۔ بہر کیف اس طریق پر عمل کرنے سے اس کا طحال کٹ جاتا ہے۔ اور اس کے بعد بعض اوقات اس کے پیشاب میں خون آتا ہے۔ اور یہ سید کرامات اور روحانی قوت کا بدیہی ثبوت سمجھا جاتا ہے۔

امراض قلب: اگر خاندان کے افراد کو خدشہ ہوتا ہے۔ کہ مریض ضعف قلب میں مبتلا ہے۔ یا اتفاقاً سرے سے دل ہی کھو چکا ہے۔ تو وہ اسے لٹا دیتے ہیں۔ اور وہ ایک ایک پیالے میں پانی لے کر اس کے دائیں سینہ پر رکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سیسہ کی ایک گولی کو پگھلا کر پگھلے ہوئے سیسہ کو پیالے میں ڈالتے ہیں۔ اور وہ بڑی توجہ سے پانی میں سیسہ کو دیکھتے ہیں۔ اگر یہ سیسہ پانی میں بجھ کر دل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک آدمی کے دل کی شکل تو چنداں پریشانی کی بات نہیں ہوتی بصورت دیگر وہ اس طریق پر بار بار عمل کرتے ہیں۔ اور اگر اس کے باوجود وہ ناکام ہوتے ہیں۔ (یعنی پگھلا ہوا سیسہ پانی سے بجھ کر دل کی شکل اختیار نہیں کرتا) تو پھر وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس شخص کو سایہ ہو گیا ہے۔

ہل۔ بخار: دیہات میں براہویوں کے یہاں بخار اکثر و بیشتر مہمان رہتا ہے۔ لیکن موسم بہار اور سال کے آخری ایام میں سب سے برا ہوتا ہے۔ اور بعض علاقے جیسے خضدار باغوانہ اور زہری میں تو اس کا نام بدنام ہے۔ بخار ہر چند طرح طرح کا ہوتا ہے۔ لیکن تین دنوں تک ہر بخار کے مریض کا علاج نہیں کیا جاتا۔ اسے کوئی دوا نہیں دی جاتی ہے۔ نہ بیمار اپنے بستر پر کمبل کے اوپر کمبل اوڑھے لیٹا ہوتا ہے۔ تاکہ پسینہ آ جائے لیکن تین دنوں کے گزرتے ہی علاج و معالجہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ بخار کی ایک قسم ''پین پلی'' ہوتی ہے۔ یہ رات کے وقت حملہ آور ہوتی ہے۔ اور صبح کے وقت پانی کے ساتھ ایک خوراک دوا انے دی جاتی ہے اور وہ اس کے بعد ہر تین گھنٹے کے وقفے سے دوا پلائی جاتی ہے۔ اگر وہ سردی دے کر آنے والے بخار ''ہل لرزا'' میں مبتلا ہے۔ تو پانی کو پہلے ابال لیا جاتا ہے۔ دوا دینے کا عمومی طریقہ یہ ہے۔ کہ نیم گرم پانی کے ساتھ موسم سرما میں دوا پلائی جاتی ہے۔ اور ٹھنڈے پانی میں موسم گرما میں دوا کھلائی جاتی ہے۔ لیکن اگر اس سے افاقہ نہیں ہوتا تو دو برتن لیا جاتا ہے۔ ایک میں تھوڑا سا ''روش'' اور دوسرے میں پانی رکھا جاتا ہے۔ سات مرتبہ ایک برتن کا پانی دوسرے برتن (یعنی جس میں روش رکھا ہوا ہے) میں ڈالا جاتا

ہے۔ تا کہ روش صاف ہو جائے اور یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ برتن زمین پر نہ رکھا جائے کیونکہ اس سے ''روش'' کی تاثیر خاک میں مل جائے گی اور اس طرح سات مرتبہ روش کو بھگونے اور نچوڑنے کے بعد پانی کا برتن مریض کو دیا جاتا ہے۔ تا کہ وہ گھونٹ گھونٹ اسے پی لے اور اگر اس سے افاقہ نہیں ہوتا تو پھر گدنا اور داغ لگانے کے طریق کار کو اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں۔

کل تاپ: نزلہ زکام کے بعد آنے والے بخار ''کل تاپ'' کا ایک حیرت انگیز علاج ہے۔ خاندان کے لوگ آڑو اتنا بڑا سات پتھر لیتے ہیں۔ اور اسے آگ میں ڈال دیتے ہیں۔ اور آگ پر وہ پانی سے بھری کیتلی چڑھاتے ہیں۔ اور جب کیتلی کا پانی سنسنانے لگتا ہے۔ تو اس میں کچھ چورا کیا گھاس اور کچھ ''سموک'' ڈالا جاتا ہے۔ اور اسے اچھی طرح ابلنے دیا جاتا ہے۔ پھر مریض کو کمبل اوڑھا کر لگن کے سامنے بٹھایا جاتا ہے۔ اور پھر لگن میں ابلتا پانی ڈالا جاتا ہے۔ اور باری باری اس میں سرخ انگارہ پتھر ڈالا جاتا ہے۔ اور پانی بھاپ اور اس کی حرارت اس کے نتھنے میں داخل ہوتی ہے۔ اور اس طرح مریض کو بھپارا دینے کے بعد دوبارہ بستر پر لٹا دیا جاتا ہے۔ اور اسے کمبل اوڑھایا جاتا ہے اور اس پر نمد ڈال دیا جاتا ہے ہے۔ اور اگر اس طریق کار سے اسے خوب پسینہ آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں کا تلوا بھی نم ہو جاتا ہے۔ تو یہ صحت کی علامت ہوتی ہے۔ اور ایسی صورت میں خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

احتیاط: لیکن صحت ہونے کے بعد دو تین دنوں تک ہوا سے احتیاط لازم ہے۔ اور نہ نیا چاند نکلنے تک اسے گندم کی روٹی اور ابلا ہوا گوشت کا سالن کھانا چاہئے مبادا بخار دوبارہ عود کر آئے۔ تاہم بخار کے بعد لگنے والی شدید بھوک جسے ''چہ'' کہا جاتا ہے کہ تسکین کے لیے موسم گرما ہو تو بھیڑ اور موسم سرما ہو تو بکری ذبح کی جاتی ہے۔ اور اسے بھون کر کھلایا جاتا ہے۔ لیکن اگر صحت یاب ہونے کے بعد چودہ دنوں کے اندر اندر اگر کسی پرندے کا گوشت کھانے کے لیے دیا گیا تو ''سیستانی'' نامی بخار میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ یہ بخار میعادی ہوتا ہے۔ اور تیسرے دن آتا ہے۔

سیستانی یا سی تا کی: براہویوں کا خیال ہے کہ سیستانی کی تہہ میں جنوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ شائد ہی کوئی شخص اس میں شک و شبہ کر سکتا ہے لہٰذا دار و مدار کی زحمت کی بجائے کسی بزرگ پہنچے ہوئے فقیر کے پاس دم دعا تعویز کے لئے جایا جاتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو گھر میں ''پاٹو'' کا دانہ تو ہوتا ہے۔ اسی سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

یک تا کی: جہاں تک ایسے بخار کا ذکر ہے۔ جو ایک دن چھوڑ کر آتا ہے۔ اسے کسی دوسرے بخار کی مانند ابتداء میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اگر یہ کسی آدمی سے چمٹ کر رہ جاتا ہے۔ تو لوگ ایسے شخص کے پاس جاتے ہیں۔ جو جڑواں پیدا ہوا ہے۔ اور اسے نیلا دھاگہ دیتے ہیں۔ اور اسے پانچ یا سات جگہ گرہ لگانے کے لیے کہتے ہیں۔ اور یہ گرہ لگا دھاگہ بیمار آدمی کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ اس سے بخار اتر جاتا ہے۔ بہر کیف بعض لوگ ایک گڑیا بنانا مناسب سمجھتے ہیں۔ اور اسے رنگ برنگا لباس پہناتے ہیں۔ تا کہ دنیا میں وہ ایک معزز خاتون نظر آئے اور پھر بخار آنے والے دن کی صبح کو خاندان کا کوئی فرد مریض کو نیند سے بیدار کرتا ہے۔ اور اسے گڑیا اور کچھ بھونی گندم کے دانے ہاتھ میں لے کر کسی ایسے درخت کی جانب لے جایا جاتا ہے۔ جو تنہا ہوتا ہے۔ اور جہاں جاتے ہوئے اسے کوئی نہ دیکھ سکے وہاں لے جا کر اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مریض درخت کے نیچے گڑیا کو بٹھا دیتا ہے۔ اور اس کی گود میں بھونا ہوا گندم کا دانہ ڈالتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ ''بیچاری چیز میرا بخار تو لے لے میں تجھ سے یہ التجا کرتا ہوں'' اور یہ کہتے ہی وہ تیزی کے ساتھ گھر کی جانب لپکتا ہے۔ اور بھولے سے بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا ہے۔ کہ مبادا بخار اس کا تعاقب کرے۔

نن ناہل: نن ھل یا دزھل کے لئے تعویز تیر بہدف سمجھا جاتا ہے کہ یہ بخار چوروں کی طرح رات کے وقت آتا ہے۔ اور سورج نکلتے ہی جاتا رہتا ہے بہر کیف کوئی ماں اس کا علاج کئے بغیر نہیں رہتی۔ جب مریض بستر پر سویا رہتا ہے۔ تو چپکے سے کہ مریض کو معلوم نہ ہو اس کی ماں لکڑی کی ڈوئی بستر پر مریض کے پہلو میں رکھ دیتی ہے۔ اور خوش قسمتی سے بخار اتر جاتا ہے۔ اور خوشی کے ساتھ وہ زیادہ ہشیاری کے ساتھ اور بھی ٹوٹکا کرتی ہے۔ وہ کسی بدمزاج چڑچڑے پرانے پڑوسی کے گھر سے کوئی ننھی سی چیز چرا لیتی ہے۔ اور جب اسے یہ چیز غائب ملتی ہے۔ تو وہ غصے سے گرما کر چور کو گالیاں دینے لگتا ہے۔ اور گالیاں بخار کو دور رکھتی ہیں۔ لیکن بخار اتر جانے کے بعد وہ بہت شکریہ کے ساتھ وہ چیز اپنے پڑوسی کو لوٹا دیتی ہے۔ کبھی علاقہ قلات میں درویش ''بیلہ'' کے فقراء ہوتے تھے۔ وہ نن ناھل یعنی ''بخار شب'' کو اتارنے میں مشہور تھے۔ رات کے وقت ان میں سے ایک مریض کے بستر کے قرب ہاتھ میں ایک چھڑی لئے آتا اور بآواز بلند دھواری بولی میں چیختا۔

وہ شریر، وہ کمینہ
جس کے گدھے پلے بڑھے ہیں۔
جس کی بیوی ہندوستانی ہے۔
جس کا آقا خراسانی ہے۔

جورات کے وقت شرارتیں کرتا ہے۔

یہاں وہ نہیں آئے گا، نہیں آئے گا

بستر کی چاروں سمتوں میں وہ یہ منتر پڑھتا۔ پھر روٹی کی خیرات لے کر وہ سیدھا گھر جاتا اور منہ پھیر کر نہیں دیکھتا کہ مبادا اس کا ٹوٹکا بے اثر ہو جائے لیکن اگر ''بیدفقیر'' دستیاب نہ ہو تو گھر کا کوئی فرد جو اس ٹوٹکا کا عامل ہو اور اسے بھی اسی طرح روٹی کی خیرات دی جاتی ہے۔ جیسے کس بزرگ کو دی جایا کرتی ہے۔ تین متصل شب یہ عمل کیا جاتا ہے۔ تب جا کر اس کا اثر رونما ہوتا ہے۔

بلاھل: تمام اقسام بخار میں بلاھل یعنی بڑا بخار ٹائفس بے حد خطرناک اور مہلک ہوتا ہے۔ اسے نہایت مہلک بیماری بلکہ عذاب الٰہی سمجھا جاتا ہے۔ اور اس سے نجات کا واحد طریقہ یہ ہے کہ خدا کے حضور میں عفو کا انسان طالب ہو، بھیڑ بکریوں کا صدقہ نکالے اور سیدوں پہنچے ہوئے فقیروں اور عفت مآب بزرگوں کی دعا لی جائے۔ اس بخار کی علامتیں یہ ہیں۔ مریض بے چینی سے کروٹیں بدلتا ہے۔ بخار کا پارا اوپر چڑھا ہوتا ہے اس کی آنکھیں خونیں ہو جاتی ہیں۔ اور اس کی گفتگو بے مزہ اور بے ترتیب ہو جاتی ہے۔ ان علامتوں کے نمودار ہوتے ہی مریض کو ایک الگ کمرے میں رکھا جاتا ہے۔ جہاں ماسوا اس کے تیماردار کے کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ اور اگر ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تو کمرے میں پردوں کی اوٹ میں، ایک طرف اس کا بستر لگا دیا جاتا ہے۔ اور نہ صرف مریض کا بستر بلکہ گھر کے لوگ بلکہ گاؤں کے لوگ تک کسی دوسرے گاؤں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ یہ مرض درحقیقت متعدی ہے۔ اور بہ آسانی ایک آدمی سے دوسرے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ براہویوں کے ہاں دستور رہا ہے کہ تین دنوں تک کوئی علاج معالجہ نہیں کراتے تھے لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہ ہوتی اگر وہ ان ہی دنوں میں وفات پا جاتا کیونکہ بیماری کا حملہ اچانک اور تیز ہوتا لیکن دنوں کے گزرنے کے بعد اسے حرارت آور غذا اور دوائیں دی جاتیں اور ایک چربی چڑھی بھیڑ ذبح کی جاتی اور اس کا دل جگر اور پھیپھڑا ابال کر مریض کو کھلایا جاتا کیونکہ اگر یہ چیزیں مریض کو نہ کھلائی جائیں تو یہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مریض کو نمدے میں لپیٹ دیتے ہیں۔ تاکہ وہ سوئے اور اسے پسینہ آجائے اور شام کو اس کو پانی کا ایک گھونٹ پلاتے ہیں۔ جس میں ''جوبیر'' کا بیج پڑا پھولتا رہتا ہے۔ اس سے مزید پسینہ آتا ہے۔ اب اس مرض کی منزلیں ملاحظہ کیجئے تیسرے دن بخار مریض کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ساتویں دن تک وہ قوت وتوانائی ختم کر دیتا ہے۔ اور نویں دن اس کی شدت انتہائی نقطہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر مریض ان ایام میں اس کا مقابلہ کر لیتا ہے۔ تو یہ توقع ہوتی ہے۔ کہ وہ آخر تک اس کا مقابلہ کرے گا یعنی صحت یاب ہو جائے گا تاہم اس کے رشتے دار اس کی تیمارداری اور نگرانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے پندرھویں دن ٹائفس کا بخار شدت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اکیسویں دن وہ مریض کی جان نکالنے کی آخری کوشش کرتا ہے۔ اور اگر اس دن مریض موت کے جبڑے سے نکل آتا ہے۔ تو بھی اسے کئی ماہ کلی طور پر تندرست وتوانا ہونے میں لگتا ہے۔ اب خواہ وہ مر جائے یا زندہ رہے اس کے کپڑے برتن باسن وغیرہ کو گھر سے باہر نکال کر نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ بہرکیف بعض لوگ اس پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ محض برتنوں کو مانجنے اور مریض کے بستر ولباس کو گاؤں سے دور چشمہ رواں میں دھو لینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

مبارکی: یہ بخار ٹائفس سے قدرے کم مہلک ہوتا ہے۔ لیکن اسی قسم کا ایک بخار ہے۔ اور اسے ''مبارکی'' یعنی خوش بختی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ''مبارکی'' کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سرخ دوسرا زرد یعنی ایک میں آنکھ سرخ ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے میں زرد پڑ جاتی ہے۔ اس مرض کا دفاع بھی یہ لوگ حرارت وتوانائی بخش ادویات سے کرتے ہیں۔ اور ایسی ترکیب کرتے ہیں کہ مریض کو کھل کر پسینہ آجائے اور اگر یہ علاج کارگر ہوتا ہے تو سینے کاندھوں اور پیٹھ پر پسلک یعنی پھنسیاں ابھر آتی ہیں۔ اب مریض کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔ کہ کہیں اسے ''بدسر بخار'' نہ ہو جائے کیوں یہ بخار بہت دنوں تک عالم دیوانگی اس پر طاری کر دیتا ہے۔ اور دیوانگی کی اس قسم کو سرسام کہتے ہیں۔ اور اگر اس بیماری پر تین ہفتوں کے اندر اندر قابو نہ پالیا گیا یا چند اور دن اوپر تو پھر مریض ادویات کے استعمال اور پسینہ نکلنے کی وجہ سے اس قدر لاغر وکمزور ہو جاتا ہے کہ اس کا اچھا ہونا ممکن نہیں رہتا۔

تہوخلنگ: اگر کسی بخار میں مبتلا مریض کو پسینہ آیا ہوا ہو اور بداحتیاطی سے اسے اس حالت میں ہوا لگ جائے تو ایسی صورت میں اس کی پسلیوں میں ٹھنڈک سرایت کر جاتی ہے۔ اور اس کے جسم کے ایک طرف کا حصہ سوج جاتا ہے فالج زدہ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت کے پیدا ہوتے ہی مریض کو گرم بستر پر لٹا دیا جاتا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف ''قلعہ'' کی صورت میں پردہ لٹکا دیا جاتا ہے۔ اور اس کے کمرے سے تمام ایسی عورتوں کو چلے جانے کے لئے کہا جاتا ہے۔ جنہیں ''ماہواری'' آئی ہوتی ہے۔ یا کسی قسم کی ناپاکی اور نجاست میں وہ ہوتی ہیں اور خاندان کا ایک فرد فوراً ہی کبوتر کے شکار پر جاتا ہے۔ اور جس قدر وہ کبوتر شکار کر سکتا ہے۔ شکار کر کے لاتا ہے۔ کیونکہ جب تک بیمار بالکل صحت یاب نہ ہو جائے ایک کبوتر اسے روز بھون کر

تل کر یا پکا کر کھانے کو دیا جاتا ہے۔ کم از کم سات یوم تو بالضرور اسے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر ایسے شخص کو تلاش کر کے مریض کو دکھایا جاتا ہے۔ جو ہوا لگنے سے پیدا ہونے والے امراض کا ماہر ہوتا ہے۔ اور ایسا شخص اپنے فن میں یکتائے روزگار ہوتا ہے۔ اور سال میں اکثر آدمی ہوا لگنے سے بیمار پڑتے ہیں۔ اور در حقیقت اسے بد روحوں کا کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ اور ایک عورت زچگی کی حالت میں بستر سے اٹھتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک پاؤں سوج گیا ہے اور وہ لنگڑی ہو گئی ہے۔

ڈاکی یا دبایا ہوا: ڈاکی یا ہیضہ کبھی کبھی رونما کرتا ہے۔ اور تھوڑی مدت رہتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ براستہ سندھ اور ساحلی علاقہ آتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ عذاب الٰہی لوگوں کے شامت اعمال کی وجہ سے نازل ہوتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ پہنچے ہوئے درویشوں پیروں اور بزرگوں کی جانب سے اغماض کرنے کی وجہ سے یہ بلائے ناگہانی آسمان سے اترتی ہے۔ لیکن ہیضہ پھیلنے کی وجہ کچھ بھی ہو جب ہیضہ کی وبا آتی ہے تو لوگ گھر چھوڑ کر پہاڑ کے دامن میں آ کر پناہ لیتے ہیں۔ وہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہیں۔ گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ اور پہنچے ہوئے بزرگوں کے مزاروں پر بھیڑ بکریوں کا تصدق اتارتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو اس مرض میں مبتلا نہیں ہوتے صحت یاب ہوتے ہیں۔ محض تقدم کے طور پر اپنے گلے میں پیاز کی گانٹھ باندھے رکھتے ہیں۔ اور کچی پیاز روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اور وہ بیمار کو پیاز کا عرق سرکہ میں ملا کر پلاتے ہیں۔ اور جو لوگ ہیضہ میں وفات پاتے ہیں۔ انہیں ایک قسم کا شہید (قدرے کم درجہ) تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کا کفن دفن عام جنازے کے طریق پر عمل میں آتا ہے۔ لیکن اس مرض میں مبتلا ہو کر جو لوگ زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ ہیضہ مارے گاؤں میں دوبارہ آ کر آباد نہیں ہوتے۔ جو برا ہوئی گھروں میں ضرور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ خانہ بدوش براہوی بھی اس کا ذخیرہ ہوتا ہے اور وہ اس کے عمل استعمال سے واقف ہیں۔ وہ ہیضہ کے مریض کو پودینہ کا پانی پلاتے جس سے اس کی پیاس بھی بجھتی ہے۔ اور جسم کا پانی بھی مرنے سے محفوظ رہتا ہے۔

رنج، گھلا دینے والی تپ، سل: وہ گھر بے یار و مددگار ہوتا ہے۔ جس کے کسی فرد کو رنج یعنی تپ دق ہوتا ہے۔ اور یہ لفظ ''رنج'' ہی بھیانک مایوسی کی زندگی اور موت کی علامت بن کر آتا ہے۔ اور مریض اور اس کے سامنے لوگ مرض کا نام نہیں لیتے۔ اشارے کنائے میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ انسان کی قوت مدافعت ختم کر دیتا ہے۔ اور اس کی عمر کا پیالہ جلد ہی لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ مرض متعدی ہے۔ لوگ بیمار نے جو کپڑے زیور یا کوئی چیز ایک بار بھی پہنی ہوتی ہے۔ اس سے چمٹ جاتا ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا اسے پہنتا ہے۔ تو پھر اسے بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یوں مرض قرب و جوار میں پھیل جاتا ہے۔ یہ مرض نوجوانوں کو لاحق ہوتا ہے۔ خوش باش لڑکوں اور اعلیٰ خاندان کے لوگوں کو ہوتا ہے۔ اور ان لوگوں کو ہوتا ہے۔ جو زندگی کی لذتوں سے آزادانہ طور پر استفادہ کرتے ہیں۔ (یعنی عیاش ہوتے ہیں) البتہ چرواہے اور ہل چلانے والے اس سے محفوظ رہتے ہیں۔ عورتوں میں سل کی بیماری عموماً بچے کی ولادت کے بعد زچہ کو ہوتی ہے۔ اور ان نوجوان لڑکیوں پر تپ دق کا حملہ ہوتا جن کی شادی بڑی عمر تک نہیں ہوتی ہے۔

رنج کا علاج: تاہم اس کی آمد اسی قدر بے پاؤں اور چوری چھپے ہوتی ہے۔ کہ اس کا لوگوں کو پتہ نہیں چلتا کہ کب ''رنج'' لاحق ہوا لیکن جب ہلکا ہلکا بخار دن بدن رہنے لگتا ہے۔ اور گوشت گھل کر ہڈی کا ساتھ چھوڑنے لگتا ہے۔ تب خرابی کا علم ہوتا ہے۔ تپ دق کے مریض کو ایک الگ کمرے میں رکھا جاتا ہے۔ اور اس کے کھانے پینے کے برتن باہم علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ضعیف العمر لوگ ان کی مرض پرسی کیلئے آتے ہیں۔ تاکہ کہیں وہ حوصلہ نہ ہار بیٹھے اور مرض کا خوف اس کے دل میں نہ بیٹھ جائے اور ابتدائی ایام میں اسے کھونے کے انڈے کا سفوف اسی ترکیب سے دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی قوت و توانائی قائم رہے لیکن اگر اس کے باوجود وہ لاغر ہوتا جا رہا ہے۔ تو پھر اس کی غذا میں بغیر اس کے علم میں لائے ناپاک چیزیں شامل کی جاتی ہیں۔ مثلاً تین متصل دن صبح کے کھانے کے ساتھ اسے بھیڑیا کی آنتیں کھلائی جاتی ہیں۔ اور قوت و توانائی کی بحالی کے لئے یہ بے حد مفید غذا ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس سے بھی افاقہ نہیں ہوتا تو پھر اگلے تین متصل دنوں تک اسے شکک یعنی میگ پی کا گوشت کھلاتے ہیں۔ اور اگر یہ دونوں غذائیں قوت و توانائی برقرار رکھنے میں موثر ثابت نہیں ہوتیں تو ان پاس ایک اور علاج ہوتا ہے۔ مریض کو سیہ (خارپشت) کا گوشت کھلاتے ہیں۔ لیکن ان تمام مقوی غذاؤں کے باوجود مریض کا جسم گھلتا اور گھلتا رہتا ہے۔ اور گلوٹا لگانے اور داغنے کے عمل کے باوجود وہ صحت یاب نہیں ہوتا ہماری تمام کوششیں اکارت جاتی ہیں۔ تو پھر خدا سے دعا کی جاتی ہے یا پیر فقیر کی منت مانی جاتی ہے۔

بدروحیں

کیفیت: مندرجہ بالا تمام گویا عام طبی امراض ہیں۔ اور ان کا مقابلہ فن طبابت کے سے کیا جاتا ہے۔ لیکن بے شمار ایسی پراسرار بیماریاں اور حیرت انگیز اموات ہیں۔ جن کے اسباب کی سراغرسانی کرتے ہوئے انہیں جنات کا سایہ قرار دیا جاتا ہے۔

براہوئیوں کا آج بھی ان پر راسخ عقیدہ ہے۔

جن: براہوئیوں کا خیال ہے کہ درحقیقت جن ایک ایسی مخلوق ہے۔ جس کی گھٹی میں بدی، فتنہ پردازی اور خباثت پڑی ہوئی ہے۔ جن ہمہ وقت کسی نہ کسی بدی اور شرارت میں مصروف رہتا ہے۔ وہ بیری کی سب سے اونچی شاخ پر بسیرا کرنے کا شائق ہوتا ہے۔ لہٰذا درخت کے نیچے دیا جلا کر رکھنا اسے چھیڑنے کے مترادف ہوتا ہے۔ وہ گھوڑے کے ایال میں گانٹھ لگانے اور اسے پکڑ کر جھولنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ اور جب اس کے یہاں شادی کی تقریب ہوتی ہے۔ تو انسانوں کے گھروں کو بند (آتش کر کے خوش ہوتا ہے۔ اور یہ من بھاون شعلہ جنون کی تفریح طبع کا باعث ہوتا ہے۔ شب و روز وہ انسان کے خلاف کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کرتا رہتا ہے۔ اگر لوگ کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ نہیں پڑھتے تو بے تکلف ان کے کھانے میں شریک ہو جاتا ہے۔ اور اگر لوگ کہیں باہر جا رہے ہوتے ہیں۔ تو وہ راہ میں ان کی دلفریبی کے لئے طرح طرح کے سوانگ رچاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خواب میں بھی لوگوں کا پیچھا کرتا ہے۔ دوپہر اور غروب آفتاب سے طلوع ہونے تک کے اوقات میں وہ مصروف شور رہتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اس دوران لوگوں کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اور جھٹ پٹا سب سے خوفناک وقت ہوتا ہے۔ کوئی راہگیر اسی جھٹ پٹے کے وقت قبرستان ویران گھر قربان گاہ اور کسی سال خوردہ انجیر کے درخت یا کسی ناپاک مقام کی جانب گزر کرے گا کیونکہ یہ عقیدہ ہے کہ یقیناً جن بے خبری میں اس سے چمٹ جائے گا اور کوئی نہ کوئی بدی کر لے گا۔

سنگون اوساٹ: براہوئیوں کا عقیدہ ہے۔ کہ بچپن ہی سے ہر شخص کو جن سے ہوشیار رہنا چاہئے عقیقہ کے بعد شام کے بعد کسی بچے کو باہر تنہا نہیں نکلنا چاہئے اور اگر یہ بچہ بیمار پڑ جاتا ہے۔ تو تمام پڑوسی ماں کی لاپرواہی پر اسے نوچتے ہیں۔ کیا وہ بیچارے ننھے منے بچے پر نظر نہ رکھ سکتی تھی اسے باہر جانے دیا تاکہ جن کو شرارت کرنے کا موقع مل جائے۔ یہ بات قطعاً توجہ طلب نہیں ہوتی کہ ماں کیا جواب دیتی ہے۔ اور اپنی صفائی میں کیا قسم اٹھاتی ہے۔ یہ بات بجھانے کے پھل کی طرح صاف ہے کہ جن بچے کو تنہا پاتے ہی اس سے چمٹ گیا ہے۔ لہٰذا بالآخر ماں کو بیمار الزام اپنے سر لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ کوئی راہ فرار اس کے سوا نہیں ہوتی لہٰذا سب سے پہلے کوئی ایسے معاملات کا تجربہ رکھنے والی بڑی بھی بڑھیا اپنے ہاتھوں کو آزماتی ہے۔ تاکہ وہ یہ اندازہ لگا سکے کہ جن کی گرفت بچے پر کتنی ہے۔ بچے کو چھڑانے کے لئے وہ کیا کر سکتی ہے۔ لہٰذا سورج نکلتے ہی وہ بچہ اور اس کی ماں کو لے کر ایک تنہا مقام پر آتی ہے۔ اور سورج کی جانب منہ کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ اور اپنا پاؤں پسار کر بچے کو یوں اس پر لٹاتی رہتی ہے۔ کہ اس کا پاؤں اس کی جانب اور سر نیچے کی جانب ہوتا ہے۔ اور کچھ عجیب الفاظ منمناتے ہوئے وہ بچے کے چوتڑ کے دائیں بائیں جوتے سے ضرب لگاتی ہے۔ پھر وہ اسے اوپر اٹھاتی ہے۔ اور بچے کو دوبارہ یوں اپنے پیروں پر لٹاتی ہے کہ اس کا چہرہ آسمان کی جانب ہو اور پھر وہ منمنانے کے انداز میں چند الفاظ پڑھتی ہے۔ اور پھر بچے کو اسی انداز سے لٹا دیتی ہے۔ جیسا کہ پہلی مرتبہ لٹایا تھا اور اسے سر تو جوتے سے اسے دھپ دھپاتی ہے۔ یہ عمل وہ تین بار سورج ابھرنے کے وقت اور ڈوبنے کے وقت کرتی ہے۔ اور امید رکھتی ہے کہ اس کے اس عمل سے جن خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہو گا یہ جن اتارنے کا ایک طریقہ ہے۔ جسے براہوی سگون اوساٹ کہتے ہیں۔

دوسرا سگون: اگر کوئی بچہ رات کے وقت اپنے بستر پر سویا ہوا ڈر کر اچھل پڑتا ہے اور رونے لگتا ہے تو یہ بات صاف ہوتی ہے کہ اسے جن نے ڈرا دیا ہے۔ لہٰذا عورتیں اس کے گرد جمع ہو جاتی ہیں اور اسے دم دلاسا دے کر سلانے کی کوشش کرتی ہیں اور جب بچہ سو جاتا ہے۔ تو وہ کوئلہ کا تین انگارہ اور پانی سے بھرا ایک پیالہ اٹھا لاتی ہیں۔ اور ایک عورت پانی سے بھرا پیالہ بچے کے دل کے اوپر اٹھائے رکھتی ہے۔ اور دوسری عورت چیونٹے سے پکڑ کر انگارہ کو بچے کے سر سے وار کر یہ کہتی ہوئی پیالہ میں ڈالتی ہے۔ "ترسو! ترسو!! ترسو!!!" اس طرح وہ دوسرے تیسرے دو انگارے بھی پانی میں ڈالتی ہے۔ اور پھر اس پانی سے بھرے پیالے کو بچے کے سرہانے رکھ دیتی ہے۔ اور جب بچہ بیدار ہوتا ہے۔ تب یہ پیالہ بچے کے سرہانے سے اٹھایا جاتا ہے۔ اور پانی پھینک دیا جاتا ہے۔ اس طریق کار پر تین متصل یوم عمل کیا جاتا ہے۔ لفظ "ترسو" بلوچی لغات سے متعلق رکھتا ہے۔ اور اس کے معنی "خوف" ہیں۔ اور عورتیں خیال کرتی ہے۔ کہ اس حکمت سے وہ بچوں کے دل سے خوف نکال کر اسے انگارہ میں منتقل کر دیتی ہیں۔ اور جیسے وہ پانی میں ڈالنے سے ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اسی طرح بچے کے دل کا خوف بھی جاتا رہتا ہے۔

تعویز اور تصدق: لیکن اگر ان عملیات کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا پھر ماں کسی ملا کے پاس جاتی ہے۔ تاکہ وہ اسے کوئی تعویز گنڈا دے اور پہلے ملا پوچھتا ہے کہ کب کیسے اور کہاں بچے پر یہ آفت نازل ہوئی اور جب وہ اس قسم کے جہت سے سوالات کر چکتا ہے۔ تو پھر وہ اپنے سامنے رکھی کتاب پر تشویش سے نظر ڈالتا ہے۔ اور اکثر وہ اس تشویش کی کیفیت میں مبتلا ماں کو گھر جا کر کچھ چیزیں لانے کے لئے کہتا ہے۔ مثلاً سات قسم کا اناج کچھ بے پکا گوشت یا ایک مرغی جس کا رنگ سفید یا سیاہ ہو یا نقش

دار ہو لہٰذا ماں گھر جاتی ہے۔ اور ملا کی طلبیدہ چیزیں لے کر الٹے پاؤں آتی ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ یہ چیزیں ملا کے پاس لائے وہ تین بار بچے کے سر پر وار لیتی ہے۔ تا کہ آفت اس میں منتقل ہو جائے پھر وہ یہ چیزیں ملا کی خدمت میں نہایت ادب سے نذر کرتی ہے۔ لیکن وہ ایک لفظ بھی اپنے وارنے کے بارے میں نہیں کہتی اور ان چیزوں کو لینے کے بعد ملا اسے ایک تعویز دیتا ہے۔ اور مشورہ دیتا ہے۔ ''کہ وہ تین متصل راتوں بدھ جمعرات اور جمعہ کو کسی مسجد میں چراغ جلائے''

جن سے مقابلہ: ملا کے عمل سے بچہ فوت ہو جائے یا تندرست ہو عورتیں یہی یقین رکھتی ہیں کہ یہ فعل جن کا ہے۔ بالفرض بچہ تندرست و توانا ہو جاتا ہے۔ تو سڑی بھسی بوڑھی عورت اور ملا دونوں دون کی لیتے ہیں کہ ان کا اثر جنوں پر بھی ہے۔ اور اگر بچہ فوت ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنے سر کو ایسی عقل مندی کے ساتھ ہلاتے ہیں۔ کہ وہ یہ تو جانتے ہی تھے انہیں اپنی زندگی میں ایسے خوفناک جن سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ماں بھی کتنی لاپرواہ ہے کہ غریب بچے کو باہر جانے دیا اور وہاں اس بلا میں گرفتار ہو گیا۔ بہر کیف انہوں نے (ملا اور بوڑھی عورت مراد ہے) جن کا زبردست مقابلہ کیا قسمت کی بات ہے۔ اور عورتیں اس واقعے سے متاثر اور سراسیمہ اپنے گھر جاتی ہیں اور اس واقعے کے لب لباب کا ذکر کرتی رہتی ہے۔ مہینوں عورتیں کچھ نہیں بولتی ہیں۔ ماسوا اس واقعہ کے اور یہی ان کا دلچسپ موضوع گفتگو بنا رہتا ہے۔ کہ کیسے ننھے سے بچے کی جان گئی۔ جن کتنا قوی تھا۔ ملا کا وار بھی خالی گیا اس قسم کے واقعے کے بعد عورتیں اپنے بچوں کی نگرانی اور حفاظت میں پہلے سے زیادہ چوق و چوبند ہو جایا کرتیں۔

جب کسی عورت پر جن آتا ہے: یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ جن جس جگہ بسیرا کرنے کا اتنا شائق نہیں ہوتا جتنا اسے نوجوان عورت کے جسم پر بسیرا کرنے کا شوق ہے۔ اس طرح کی توہمات بہت پائی جاتی ہیں کہ مرد اپنی بیوی سے ملن مخصوص اس لئے کرنے سے قاصر رہے کہ وہ جن کے منظور نظر ہے اور وہ اس کے جائز شرعی شوہر کو اٹھا کر زمین پر دے مارتا ہے۔ جب کبھی بھی وہ اپنی بیوی کے قریب آتا ہے۔ پہاڑی لوگ اس قسم کے وحشیانہ واہمہ کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ عورتیں جن سے زیادہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں ڈرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں اپنے نازک ایام میں کہیں باہر نہیں جاتی ہیں۔ خصوصاً جب وہ امید سے ہوتی ہیں۔ یا جب ان کی گود بھری ہوتی ہے۔ مبادا کوئی بدروح بے خبری میں ان پر اپنا پرچھاواں (سایہ) ڈال دے۔ جیسے ہی جن کسی عورت میں حلول کرتا ہے۔ وہ زمین پر گر جاتی ہے۔ بالکل غشی کی حالت اس پر طاری ہوتی ہے۔ اس کے جسم میں کپکپی اور تھرکن ہوتی ہے۔ آنکھ بالکل بند ہو جاتی ہے۔ دانت ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں ادھر ادھر وہ ٹپکنے لگتی ہے اور ایک گھنٹہ یا اس سے زیادہ وقت تک وہ بالکل اسی حالت میں رہتی ہے۔ لیکن ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتی اور نہ وہ اپنے رشتہ داروں کی آہ و بکا اور غمناک آوازیں اور پکار ہی سن سکتی ہے۔ ان علامات سے لوگ جان جاتے ہیں کہ جن اس پر سوار ہو گیا ہے۔ اور وہ یہی سوچتے ہیں کہ کسی برگزیدہ بزرگ کو بلائیں تا کہ وہ جن اتارنے کا عمل پڑھے۔

دوڈی: لہٰذا ملا یا سید تیزی سے آتا ہے۔ پہلے وہ قرآن مجید پڑھتا ہے (عموماً سورہ جن پڑھی جاتی ہے) اور دعا کرتا ہے کہ غریب عورت کو اللہ اس مصیبت اور عذاب سے چھٹکارا دے لیکن اگر اس کے باوجود اس عورت کی زبان نہیں کھلتی تو وہ اپنی عملیات کی کتاب کھول کر کوئی عمل پڑھتا ہے۔ یا کوئی افسوں کرتا ہے۔ جسے ''دوڈی'' یا دھواں والا افسوں کہتے ہیں۔ اس عمل میں وہ مشعل لے کر جن والی عورت (جس پر جن آیا ہو) کے چہرے کے سامنے رکھتا ہے۔ تا کہ اس کا دھواں اس کے نتھنے سے گزرے۔ اس ترکیب سے اس کی زبان ڈھیلی پڑتی ہے۔ اور وہ بڑبڑانے لگتی ہے۔ تب (ملا یا سید یا عامل) وہ جن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ ''حضور والا! آپ نے اس بیچاری عورت کو کہاں سے پکڑا ہے؟'' میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بولیے وگرنہ میں آپ کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔'' اور اس عمل سے بے بس ہو کر عورت کی زبان سے جن جواب دیتا ہے'' اس نے ہمارا بے حد نقصان کیا ہے۔ وہ آج شام میرے بچے کو کچلتی ہوئی گزری ہے۔ لہٰذا اب میں نے یہاں اس کے اوپر بسیرا کیا ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ ہرگز نہیں! اور میں اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک مجھے خون نہ دیا جائے۔'' یا وہ اپنا لہجہ بدل کر اس عورت سے اپنی بے پناہ عشق کا ذکر کرے گا لیکن کچھ اس لب و لہجہ میں کہ ''کہاں ایسے مڑکے دودانے ہوتے ہیں۔ جیسے میری بیوی مرحومہ اور یہ ہے کہ میں نے جس وقت اسے چشمہ پر نہاتے دیکھا ہے۔ اسی وقت سے اس پر فریفتہ ہو گیا ہوں'' اب خواہ جن جو کچھ کہے یہ بات یا وہ بات جب بحث و مباحثہ تمام ہوتا ہے۔ تو ''خون'' ہی ایک ایسی چیز رہ جاتی جس کا وہ مطالبہ کرتا ہے۔

جن اُتارنا: لہٰذا فوراً ہی رشتہ دار ایک میمنا یا بکری کا بچہ بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ اور ایک پیالہ میں خون بھر کر جن کے زیر نظر عورت سے قدرے فاصلے پر رکھ دیتے ہیں۔ اور پھر ملا جن کو خون پینے کی دعوت دیتا ہے۔ خون پیو چلے جاؤ اور اپنے جانے کی علامت چھوڑتے جاؤ۔ اگر خدا نے چاہا تو پھر جن عورت کو چھوڑ کر چیختا چلاتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جانے سے قبل وہ اپنے جانے کی شرائط بتاتا ہے۔ ''وہ مہینہ میں ایک مرتبہ عورت کے پاس آئے گا یا ایک سال بعد آئے گا یا اسے گائے اور پرندوں کا

بلوچستان کے ایک گاؤں کا منظر (سرجیانی)

بابا خرواری کا مزار، زیارت

گوشت نہ کھانے دو۔ حضرت سلیمانؑ کی قسم وہ پھر کبھی نہ آئے گا۔'' لہٰذا بالآخرہ وہ رخصت ہوتا ہے۔ اور جاتے ہوئے وہ خون کے پیالے کو ٹھوکر لگا کر اپنے جانے کی نشانی بتا دیتا ہے۔ اور جن کے زیر اثر عورت اس سے چھٹکارا پا کر گہری نیند سو جاتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ بیدار ہوتی ہے۔ آنکھ کھولتی ہے۔ اور اپنے گرد مضطرب لوگوں کا مجمع دیکھ کر حیران ہوتی ہے۔ اسے صرف اتنا یاد رہتا ہے۔ کہ اچانک کسی مہیب عجیب الخلقت مخلوق نے اسے پکڑ لیا تھا اور یہ کہ وہ گھر کی جانب خوفزدہ نیم مردہ حالت میں دوڑ پڑی تھی اور بس' اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا اسے کوئی علم نہیں۔

شیخ: ملا یا سید کے افسوں جھاڑ پھونک اور تعویز کے اثر کا تعلق درحقیقت لوگوں کی خوش اعتقادی نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن پرانے طرز کے لوگ ملا یا سید سے کہیں زیادہ اعتقاد شیخ اور اس کے رقص و وجد پر رکھتے ہیں۔ شیخ کسی قبیلے یا نسلی گروہ میں سے نہیں ہوتا خالی پیالہ دے کر لوگوں کو دکھاتا ہے۔ اور پھر اسے زور سے ہاتھ میں لے کر لہراتا ہے۔ اور پھر جو لوگوں کو دکھاتا تو ارے یہ تو خون سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ اور اکثر و بیشتر وہ مجمع سے دور جا کر بلند آواز میں گفتگو کرنے لگتا ہے۔ گویا وہ اجنہ سے محو کلام ہو۔

ذبیحہ: اور پھر شیخ مجمع کی جانب آتا ہے اور ایک ایسے شخص کی طرح کلام کرتا ہے۔ جو گویا نیند میں ہو وہ بتاتا کہ کیسے اس نے ''تیرگی بردار ارواح'' سے مردانہ وار مقابلہ کیا اور ممکن ہے کہ وہ یہ بھی نیم خوابیدگی کے لب و لہجہ میں کہے کہ جن اس وقت چین لینے دے گا جبکہ ایک بکری یا بھیڑ بھینٹ چڑھائی جائے جو اس رنگ اور اس رنگ کی ہو یا وہ یہ بھی کہے گا کہ اس کا مداوا ''الیچ'' کے ماسوا کچھ نہیں ہے۔ ''الیچ'' ایک قسم کی قربانی ہے۔ جو اس طرح ادا کی جاتی ہے۔ جانور جن کے زیر اثر عورت کی نظروں کے سامنے ذبح کیا جاتا ہے۔ اور اس کے خون میں تھوڑی سی روئی بھگو لی جاتی ہے۔ اور اس سے جن زدہ عورت نہ کے ہاتھ پاؤں اور پیشانی کو رنگا جاتا ہے۔ لیکن گوشت پکا کر مجمع کو کھلا دیا جاتا ہے۔ اور خدا نے چاہا تو پھر جن اتر جائے گا اور عورت ہوش میں آجائے گی۔

لیکن بہت دن نہیں گزرے ہیں کہ پھر اس عورت پر جن آجاتا ہے۔ کیونکہ بعض عورتیں جن سے مستقلاً نجات نہیں پاتیں اور جب جن زدہ ہوتی ہیں۔ تو وہ غصہ میں پھاڑ کھانے کو دوڑتی ہیں۔ اپنے چہرے کو پیٹتی ہیں۔ اور اپنے بال نوچتی ہیں۔ ان جن زدہ عورتوں کو کوئی چیز اس قدر آپے سے باہر نہیں کرتی جتنی گوشت بھوننے کی خوشبو کر دیتی ہے۔ لہٰذا جب کہیں کوئی زان بھونی جا رہی ہو تو کسی شخص کو تعجب نہیں ہوگا کہ کوئی جن زدہ عورت کے لئے تھوڑا سا بھونا ہوا گوشت مانگنے آئے۔

جن آنے اور جن کھیلنے کے متعدد اور بھی اسباب ہیں۔ جن میں سرفہرست بعض نسوانی امراض ہیں۔ جیسے ''لکوریا'' نیز ''رحم'' کی بعض بیماریاں جس سے سراسامی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ رحم کا الٹ جانا اولاد کی آرزومندی اور بانجھ پن وغیرہ لیکن جیسے جیسے طبی امداد اور سائنسی شعور بلوچستان کے طول عرض میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ ویسے ویسے نہ صرف اجنہ کا کھیل کم ہو گیا ہے۔ بلکہ ملا اور سید کا اثر بھی زائل ہو گیا ہے۔ نیز ''شیخ'' تو شاذ کہیں نظر آجاتے ہیں۔ پھر جہاں تک اجنہ خبیث ارواح بھوت پریت اور ان سے وابستہ توہمات کا تعلق ہے۔ وہ براہوئی قبائل سے مختص نہیں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے معاشرتی رسوم اور رجحانات پر نظر کرنے سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ ہر جگہ ماحولیاتی اختلاف کے باوجود یہ ناری مخلوق اور ان کی کارستانی کا لوگوں کو تجربہ ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح سحر، جادو، ٹونہ، ٹوٹکا، تعویز گنڈا قربانی بھینٹ تصدق صدقہ شگون وغیرہ بھی محض براہوئی قبائل سے مختص نہیں بلکہ ہندی مزاج مسلمانوں کے کلچر کا جزو لاینفک ہے۔ اور بعض رسوم اور ان کا ماخذ ہندو معاشرہ ہے۔ جیسے موتیا ستیلا کا تصور ماتا دیوی کا تصور چڑھاوا بھینٹ بھدرا، رائی کے دانے کا ٹوٹکا وغیرہ۔

جانوروں کے امراض اور ان کے علاج

اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوی درجہ ذیل براہوی کی طرف نشاندہی کرتے ہیں:

بُزمرک / پفک: بکریوں کا ایک ایسا مرض ہے جس میں مبتلا ہو کر وہ کھانستی رہتی ہیں۔ اس سے ان کے پھیپھڑے کمزور ہو جاتے ہیں۔

پاس: جانوروں کو لگنے والی گرکی وہ بیماری جس میں ان کے جسم پر گرم راکھ یا گندھک اور تیل لگایا جاتا ہے۔

جّولو: بھیڑوں کی ایک مخصوص بیماری ہے جس میں مبتلا ہو کر وہ کھانستی رہتی ہیں۔

چالڑی: اس بیماری سے بھیڑ بکریاں لنگڑانے لگتی ہے اور ان کے کھر خراب ہو جاتے ہیں۔ اس بیماری کا علاج اس طرح کیا جاتا ہے کہ مویشیوں کی راہ میں توے کو گرم کر کے رکھا جاتا ہے تا کہ مویشی اس کے اوپر سے گزریں۔ اور ان کے کھروں کو حرارت پہنچ جائے۔ اس وقت "تپخ تپخ" کہتے ہیں۔

ڈھارخلنگ: یہ بھیڑ بکریوں کی ایک بیماری ہے جس سے جانور کانپتا ہے اور آخر گر کر مر جاتا ہے۔

رڈ: کتوں اور بلیوں کی ایک بیماری ہے۔ اس میں جانور قے کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب جانور کو لوہے کی سلاخ سے مارا جاتا ہے تو یہ مرض لاحق ہوتا ہے۔ جب جانور کو لوہے کے برتن میں کھانا دیا جائے تو اس سے یہ مرض دور ہوتا ہے۔

ریخ: ریخ سے مراد ہے جانوروں میں اسہال کی بیماری۔

سیڈائی: جانوروں میں پیچش کی بیماری کو کہتے ہیں۔

کلوک: اونٹ کی بیماری کو کہا جاتا ہے۔

گُر: جلد کی بیماری ہے جو اون دار جانوروں کو ایک طفیلی کیڑے سے لگ جاتی ہے۔ اس سے جانور کے جسم کے بال گر جاتے ہیں۔ پھر جانور ہر چیز سے اپنے کو کجلاتا ہے اور زخمی ہو جاتا ہے۔ جو آدمی اس کا دودھ پی لے۔ اس کو بھی یہ بیماری لگ جاتی ہے۔ اس کا علاج اس طرح کیا جاتا ہے کہ ایک کڑھائی میں چکتی کا روغن ڈال کر اس میں چند زندہ سانپ ڈال دیتے ہیں۔ گرم ہونے کی وجہ سے سانپ روغن میں مر جاتے ہیں اور اس کے بعد بیمار جانور کی دم کو ذرا سا تراش کر کے اس میں ڈبو دیتے ہیں۔ اس طرح بیماری ختم ہو جاتی ہے۔

گیڑو: جب گرد و غبار زیادہ ہو تو اس وجہ سے مویشی دودھ کم دیتے ہیں۔ اس وقت کہتے ہیں کہ مویشی کو گیڑو نے مارا ہے۔ اس وقت کو بھی گیڑو کہتے ہیں۔

گیڑوی: جس جانور کو گیڑو ہو گیا ہے، اسے گیڑوی کہتے ہیں۔

مزبری: ایک کیڑا ہے جو لاغر جانوروں کی جلد میں جاتا ہے۔

پیروں فقیروں کے مزارات، عرس اور میلے

بلوچستان میں مذہبی بنیاد پرستی کا وجود کبھی بھی نہیں رہا۔ اس کا ایک سبب جہاں مقامی افراد کی فراخ دلی، قدیم ثقافتی رنگا رنگی اور ان کا جبلی خلوص ہے، وہیں دوسری طرف اس سرزمین پر جنم لینے والے صوفیائے کرام کی رواداری اور مہر و وفا کی تعلیمات بھی اس میں شامل ہیں۔ اس لئے بلوچستان میں پیری فقیری کا سلسلہ نہایت قدیم اور مستحکم ہے۔

بلوچستان میں پیروں فقیروں کے مزار تو ہر جگہ موجود ہیں ہر گاؤں کے قبرستان میں ایک ایسے پیر کا مقبرہ ضرور ہے جس کو لوگ احتراماً یاد کرتے ہیں۔ ایسا شخص (اہم صوفیائے کرام کو مستثنیٰ قرار دے کر) اپنے دور حیات میں یا تو امام مسجد ہوتا ہے یا واعظ یا اپنے قبیلے میں معمر ترین شخص جسے لوگ لازماً روحانی قوتوں کا مالک سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر قبیلہ چاہے "لوڑیوں" ہی کا کیوں نہ ہو، ایک پیر یا صوفی کو "نگران فرشتہ" کے طور پر اپنا سرپرست ضرور بناتا ہے۔

پیری فقیری کا سلسلہ پورے برصغیر کی طرح بلوچستان میں بھی موروثی ہے۔ قبائلی سردار اور لوگ برابر پیر کے اہل خاندان کو فصل کی کٹائی کے موقع پر گندم کے دانوں کا ایک بھرا ہوا کاسہ (ایک کاسہ پانچ کے برابر ہوتا ہے) یا پھر بھیڑ بکریوں کے گلے سے ایک بھیڑ یا بکری سالانہ نذرانے کے طور پر دیتے رہتے ہیں۔

بلوچستان میں جو قدیم مزار ملتے ہیں وہ عموماً چھوٹے بڑے پتھروں کے ہلکے سے ڈھیر ہوتے ہیں۔ بعض وقت وہ کھردری مٹی ہی کے بنے ہوتے ہیں۔ ان کے اردگرد کچھ ستون سے گاڑ دیتے ہیں جو حصار کا کام دیتے ہیں۔ ان ستونوں سے چیتھڑے، سینگ یا دھات کے باب، استعمال شدہ کارتوس اور کوڑھیاں بندھی رہتی ہیں۔ ایسے مزار بھی ہیں جو اینٹوں اور باقاعدہ پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور بڑے خوبصورت اور باوقار دکھائی دیتے ہیں۔

درویشوں کی تدفین: پہنچے ہوئے فقراء کی تدفین عام جنازوں کی طرح ہی ہوتی ہے۔ ماسوا ایسی صورت میں کہ کوئی درویش اپنی تدفین کے بارے میں کوئی وصیت چھوڑ جائے کہ اسے اس کے کپڑوں سمیت دفنایا جائے یا فلاں فلاں اسے غسل دے یا اس کی فلاں جگہ بنائی جائے۔ ایسی صورت میں اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ لوک روایت میں موجود ہے کہ باغوانہ کے مقدس درویش عبداللہ شاہ (متوفی 1904ء) شہداء پور میں فوت ہوئے اور وفات سے قبل انہوں نے اپنے مریدوں کو وصیت کی کہ غسل کے بعد کفن پہنا کر ان کے جنازے کو اونٹ کی پیٹھ پر لاد دیا جائے اور اونٹ جدھر رخ کرے اسے آزادانہ دیا جائے اور جہاں پہلی مرتبہ بیٹھے وہیں انہیں دفنا دیا جائے۔ درویش کی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا۔ اونٹ جنازہ لے کر چلا۔ کیرتھر کے سلسلہ کوہ سے گزرا دو دنوں تک وہ کہیں نہیں ٹھہرا۔ چلتا رہا تا آنکہ فیروز آباد پہنچا۔ اسے درویش کا معجزہ تصور کیا گیا۔ کیونکہ شہداء پور سے فیروز پورا سی میل دور ہے۔ بہرکیف درویش عبداللہ شاہ کو فیروز آباد میں دفن کر دیا گیا۔

درویشوں کے مزار: درویشوں کی قبر بھی عام لوگوں کی قبر کی طرح ہوتی ہے البتہ یہ قدرے اونچی بنائی جاتی ہے اور مٹی سے پوت دی جاتی ہے اور اگر اسے کھلا رکھا جائے (یعنی مقبرہ نہیں دیا جاتا) تو اس کے چاروں طرف دیوار کی فصیل تعمیر کر دی جاتی ہے لیکن اگر درویش بہت مشہور ہے اور اس کے مریدوں کی تعداد زیادہ ہے تو

جب پل تعمیر کرنے کی کوشش کی تو ناکامی ہوئی مگر آپ کا مزار محفوظ رہا۔ اس لئے انگریز بھی تعظیم کیا کرتے تھے۔ آپ کے روضہ مبارک سے بہت سی کرامتیں منسوب ہیں۔

کوچک لوگ اپنی فصل میں سے گندم کا ایک مخصوص حصہ (ایک تیر پھینکنے تک کی زمین سے تقریباً ۸ کاسہ) بی بی نانی کے مزار کے لئے مخصوص کر دیا کرتے تھے اور یوں جو وصولی ہوتی اس سے بھیڑیں خریدی جاتی تھیں جنہیں اُس وقت ذبح کیا جاتا جب کاشتکاروں کا ایک گروہ پہاڑی نالے کی مرمت کے لئے روانہ ہوتا تھا۔ تقریباً ۱۸۹۵ء سے یہ قربانی ختم کر دی گئی۔ وہی لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسی کے نتیجے میں بی بی نانی کے نالے میں پانی کی کمی واقع ہوئی ہے۔

بی بی نیک زن: ان کا مزار قلات میں ہے۔ ان کے حالات کوئی نہیں جانتا البتہ کہا جاتا ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب نہ آمد و رفت کے ذرائع تھے نہ مسافروں کی جان و عزت محفوظ تھی۔ آپ اپنی صدی کی معروف عابدہ خاتون تھیں مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ قلات ہی کی اصل باشندہ تھیں۔ بی بی صاحبہ کے مزار پر جا کر دعا مانگنا باولے کتے کے کاٹے کیلئے اکسیر ہے اور کوئی مریض نامراد نہیں لوٹتا۔

روایت ہے کہ ایک دفعہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ قلات شہر کی طرف جا رہی تھیں۔ اچانک چند مشرک ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے خدا سے التجا کی کہ "میں ضعیفہ گنہگار لیکن امت محمدی میں سے ہوں۔ الٰہی میری عزت و ناموس کا تو ہی محافظ ہے۔ حضرت محمدؐ کے طفیل ہمیں ان مشرکوں کے ہاتھوں قید بدنامی اور اذیت سے بچا۔" دعا مستجاب ہوئی اور میاں بیوی زمین میں اتر گئے۔ وہیں لوگوں نے ان کا مزار تعمیر کیا۔

بی بی نازو: ان کا مزار جوہان میں اس مقام پر ہے جہاں غسل دیا گیا۔ آپ سیدہ تھیں۔ آپ کا تعلق مستونگ سے تھا۔ باولے کتوں کے کاٹے ہوئے جوق در جوق خانقاہ پر آتے ہیں۔

پیر پنجہ: کوئٹہ سے سبی جاتے ہوئے تینتیسویں میل پر ایک چٹان واقع ہے جو خنجک (شینے) کے درخت سے متصل ہے۔ اس چٹان کے ایک پتھر پر دو پاؤں کے نشان ہیں اور ایک پتھر میں سوراخ ہے جو نیزے کا بتاتے ہیں۔ ساتھ ہی گھوڑے کے سموں کے نشان بھی ہیں۔

پیر گدر: مزار گدرلس بیلہ میں ہے۔ ہر سال جمادی الثانی کے مہینے میں عرس ہوتا ہے۔

پیر میران: آپ ویندرلس بیلہ میں دفن ہیں۔ ہر سال جمادی الثانی میں یہاں میلہ لگتا ہے۔

حضرت پھل چوٹو: آپ کے حالات زندگی صوفیا کے تذکروں میں مندرج نہیں۔ آپ حضرت شیخ حسین رحمت اللہ علیہ کے جلیل القدر، صاحب کشف و کرامات، فرزند عالی مرتبت تھے۔ آپ کا مزار لوڑی بھٹ میں ہے۔

ایک انگریز سیاح جو نوشکی سے گزرا تھا، کی روایت ہے کہ حضرت پھل چوٹو کے دور میں ایک دیو قامت گاؤ کوہ (پہاڑی بیل) چاغی کے علاقے میں گھس آیا۔ وہ انسانوں کو جان سے مار دیتا تھا۔ آپ مطلع ہوئے تو آپ نے اپنے والد محترم سے گاؤ کوہ سے مقابلہ کرنے کی اجازت اور تقسیم جائیداد چاہی۔ اجازت ملنے پر آپ نے بسم اللہ الرحمان الرحیم پڑھ کر پہاڑ کا ایک حصہ اٹھایا اور لوڑی بھٹ کے نواحی علاقے میں پہنچے۔ وہاں وہ پہاڑی بیل آپ کو گھومتا دکھائی دیا۔ آپ نے اسے للکارا۔ بیل نے مڑ کر دیکھا تو وہیں پتھر کا مجسمہ بن کر رہ گیا اور اب تک وہیں موجود ہے۔ اس کی دم اور سینگ بھی اب تک سلامت ہیں۔ اس بیل نے تقریباً دو فرلانگ زمین گھیر رکھی ہے۔ نزدیک سے دیکھیں تو پتھر کی چٹان ہے مگر دور سے یہ بیل ہی دکھائی دیتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ علاقہ ڈاک نوشکی کے بے برگ و گیاہ ہونے کا سبب اس بیل کا وہاں سے گزرنا ہے۔

آپ کے مزار کے پاس ایک پہاڑ کے غار سے پانی ٹپک ٹپک کر جمع ہوتا ہے۔ جسے کونڈی کہتے ہیں۔ جمع ہونے والی جگہ میں یہ پانی سرخی مائل ہے مگر برتن یا ہتھیلی میں لیں تو بالکل صاف شفاف دکھائی دیتا ہے۔

حضرت میاں تاج محمد: آپ حضرت میاں محمد حسن کے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں جب ابھی رسالہ "نام حق" پڑھتے تھے۔ ایک روز اونٹ پر سوار ہوئے اور اس کو دوڑانے لگے۔ اس اثناء میں آپ کے والد بزرگوار کی نظر آپ پر پڑی۔ تنبیہہ کی اور فرمایا "پی نہ ماری تکلی پٹ تیر انداز" (باپ نے چڑیا نہیں ماری اور بیٹا تیر انداز) بعد میں مشورہ کر کے آپ کو علم دین کے حصول کے لئے کنڈہ بھیج دیا۔ وہاں بارہ سال رہے۔ علم دین کو شوق اور محنت سے حاصل کیا۔ کنڈہ شہر میں قیام کے دوران آپ کے سارے اخراجات نائب محمد حسن اور نائب محمد امین جو میاں صاحب کلاں کے مرید تھے، کے ذمے تھے۔

آپ علوم مروجہ درسیہ سے بہرہ ور ہو کر گھر لوٹے۔ چند سال تک انہماک اور اشتیاق کے ساتھ تدریس میں مصروف رہے۔ رات کے وقت اپنے والد محترم سے فیوض باطنی حاصل کرتے تھے۔ تمام منازل فقر طے کیں۔ آپ زمینداری کے کام میں بھی خوب دلچسپی لیتے تھے۔

آپ نے تلاوت قرآن مجید، درود اور دلائل الخیرات کا مطالعہ اپنا معمول بنائے رکھا۔ آپ منازل فقر اور مقامات سلوک میں اس قدر کامل تھے کہ آپ کے بڑے بھائی میاں غلام حیدر صاحب نے کئی دفعہ مریدان خاص کی محفل میں کہا تھا کہ

میاں تاج محمد نقشبر کے درجات و مقامات میں مجھ سے پیش پیش ہیں۔ اسی لئے میاں غلام حیدر کی زندگی میں تمام سردار، زمیندار اور عام مرید آپ کی اسی طرح تعظیم و تکریم کرتے تھے جیسے میاں غلام حیدر کے لئے ملحوظ رکھتے تھے۔ میاں غلام حیدر صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں اپنے کاروبار اور تمام امور آپ کے سپرد کر دیئے تھے۔

آپ کی وفات کے بعد ایک دن میر عبدالکریم خان رئیسانی تعزیت کیلئے کٹبار شریف پہنچا۔ دعا اور فاتحہ کے لئے خانقاہ میں گیا۔ آپ کی تربت سے ذکر اور ہو کی آواز چند دفعہ آئی۔ تربت جنبش میں آئی اور سب لوگوں پر وجد و مستی کی حالت طاری ہوگئی۔

میاں تاج محمد نے اپنی قوم کے میاں محمد عالم ساکن گھوٹکی کی دختر سے پہلی شادی کی تھی جس کے بطن سے صاحبزادہ مولوی میاں محمد حسن اور میاں محمد پناہ پیدا ہوئے۔ دوسری شادی اپنے عم زادہ میاں غلام محمد کی لڑکی سے کی جس کے بطن سے میاں شریف پیدا ہوئے۔

تیار غازی: آپ کا اصلی نام اسرائیل الدین تھا۔ ۳۰۰ سال پہلے آپ اوچ شریف سے بھاگ نیابت تشریف لائے تھے۔ لفظ ''تیار'' چونکہ ہر وقت آپ کی زبان پر رہتا تھا۔ اس لئے تیار غازی کہلائے۔

چٹان پیر: قلات کے مقامی سید ہیں اور یہیں دفن ہیں، جس مقام پر آپ نے اپنی کرامت سے چشمہ جاری کیا تھا۔ وہ آج بھی چشمہ کہلاتا ہے۔

چاندرام پیر: آپ کا مزار جھالاوان میں چھاٹی کے قریب چھاپار کے مقام پر ہے۔

حسین باری: ساراوان میں چاکو کے قریب وارو ما میں دفن ہیں۔

حکیم: آپ کا نام محمد عبداللہ اور تخلص حکیم تھا۔ آپ عشق و عرفان میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کلام سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔ کانڈل تحصیل ہری پور ضلع ہزارہ (حدود چھاؤنی ایبٹ آباد) میں رہتے تھے۔ عرب، حبش، سوڈان، یمن اور ہندوستان کی سیاحت کے بعد بلوچستان آکر مستونگ میں مقیم ہوئے۔

آپ نے حج بیت اللہ سے مشرف ہونے اور تین سال تک عرب میں رہنے کے بعد ایک رسالہ "گلدستہ" حکیم عرف "سفر حجاز" لکھا جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں شیخ الٰہی بخش و محمد جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار نے مطبع عزیزی لاہور سے طبع کرایا۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ میں سن بلوغت میں پہنچنے سے پہلے ہی روضہ رسول کریم کی زیارت کا شوق رکھتا تھا۔ جب زیارت سے بہرہ یاب ہوئے تو عمر سولہ سال کی تھی۔

حاجی حمل: آپ کا مزار سبی میں قلعہ کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ حضرت میاں محمد حسن (المتوفی ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء) فرماتے تھے کہ کامل اولیائے اللہ میں سے چار علاقہ سبی میں ہیں۔ ان میں سرفہرست حاجی حمل کا نام ہے جو منصب شاہی پر فائز ہیں۔ منقول ہے کہ جس وقت ملا محمد خان رئیسانی اپنے اہل و عیال کے ہمراہ خان صاحب کے خوف سے کڑک شہر میں اقامت پذیر تھا' انہی دنوں وہ میاں غلام حیدر خلف حضرت میاں محمد حسن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے حاجی حمل کی قبر پر جا کر دعا پڑھی۔ بعد میں مذکورہ سردار سے کہنے لگے انشاءاللہ تعالیٰ امسال تمہارا کام خوب چمکے گا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی سال انگریز سرکار اپنی فوجیں بلوچستان میں لے آئی۔ سردار موصوف کی عزت و توقیر ہوئی اور اس کا دل خان صاحب کے خوف سے مطمئن ہوا۔

رابعہ دختر کعب: مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اپنے تذکرہ نفحات الانس میں رابعہ کا ذکر ان مستورات میں کیا ہے جو معرفت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کعب کی دختر نیک اطوار بلوچستان کے ایک قدیم شہر قزدار یا قصدار یا خضدار کی رہنے والی تھی، جس کے بارے میں بلاذری نے ایک عربی شاعر کے کلمات درج کیے ہیں۔ جو قزدار کے بارے میں الہانہ انداز میں یوں گویا ہے۔

"خضدار کتنا خوش نما شہر ہے اور اس کے مکین کتنے ممتاز ہیں'' رابعہ کا والد خراسان کے تاریخی حادثہ میں ابومسلم مرزوی کا رفیق کار اور سجستان طوران اور قزدار (خضدار) کا حاکم تھا۔ رابعہ فارسی شاعری کے ابوالآبا رودکی (المتوفی ۳۲۹ھ/ ۹۴۱ء) کی ہم عصر تھی۔ آج بھی اس کے عارفانہ کلام کی صدائے بازگشت وادی خضدار میں سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے رابعہ بنت کعب کا ذکر ''سرمد و منصور کی حریف" کے تحت کیا ہے۔

پروفیسر انور رومان اپنے ایک انگریزی تحقیقی مضمون ''بلوچستان کی تاریخی اہمیت'' میں لکھتے ہیں ''نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) میں جب ابھی محمود ہندوستانی اسٹیج پر نمودار نہیں ہوا تھا۔ اور جب صرف بلوچستان اور سندھ ہی اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے تھے۔ بلوچستان محض ایک فوجی علاقہ نہ تھا بلکہ ایک اہم تہذیبی خطہ بھی تھا جہاں فارسی ادبی اظہار کا ذریعہ تھی۔ قلات کے جنوب خضدار شہر میں رابعہ چہچہاتی تھی۔ فارسی کی عظیم شاعرہ، بلوچستان کی قرۃ العین۔''

سید راجن شاہ جیلانی: سید راجن شاہ لاڑکانہ کے علاقہ میں نارہ کے کنارے سکونت پذیر تھے۔ کچھی (بلوچستان) کے علاقے میں بھی ان کے بہت سے مرید اور خادم

تھے۔ان کو اپنے عزیزوں میں سے ایک کا ناحق خون بہانے پر ایسا صدمہ پہنچا کہ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے پریشان و سرگردان رہنے لگے حتیٰ کہ مریضوں کی طرح رات بھر تکلیف سے دوچار رہتے۔ گہری بھی حقیقی معانی پہننے کے لئے خاصا وقت لیں گی۔ ان کا مزار زن کے سلسلوں میں ہے۔ جو بالکل ایک عام قبر یا پتھروں کے ڈھیر کے مانند ہے۔ یہ سوئی گیس کمپنی کے کھودے ہوئے پہلے کنوؤں کے قریب واقع ہے۔

تین سو سال بیشتر پیر رضائی نے اسی جگہ ایک پتھر رکھ کر بتایا تھا کہ یہاں دولت ہے بالکل اس پتھر کے نیچے۔ اس وقت عام لوگ سوچتے تھے کہ پیر صاحب کا اشارہ سونے کی طرف ہے دولت کا مطلب ان کے ذہنوں میں اس زمانے میں سونا یا کسی بادشاہ کا پوشیدہ خزانہ ہوتا تھا لیکن آج کل سب کو یہ یقین ہوگیا ہے کہ پیر کا مطلب دولت سے تیل یا قدرتی گیس کے ذخائر ہی تھے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے انگریزوں کے ذریعے اس علاقے کے مفتوح ہونے کی پیش گوئی کی تھی اور اس کے بعد بلوچستان کے لوگوں کے اچھے دنوں کی یہ پیش گوئی بھی پوری ہوگئی ہے۔

میاں رکھیل شاہ: میاں رکھیل شاہ فتح پور (گنداواہ بلوچستان) میں مقیم رہے۔ آپ کا تعلق میراں پور شریف والے سلسلے سے ہے۔ آپ مخدوم خواجہ عبدالستار صوفی القادری کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ نے ایک دیوان ''بحر العشق'' یادگار چھوڑا ہے جو لاہور میں طبع ہوا۔ یہ ۳۸۸ کافیوں اور ۱۷۳ ابیات (سی حرفی) پر مشتمل ہے۔ کافیاں اور ۱۳۸ ابیات سندھی زبان میں ہیں۔ باقی ابیات پنجابی میں ہیں۔ صفحات کی تعداد ۲۱۳ ہے۔ شروع میں فقیر فیض محمد صوفی القادری بلوچستانی کا فارسی میں لکھا ہوا دیباچہ بھی موجود ہے۔

حضرت سخی تنگو: سخی تنگو کا مقبرہ تحصیل ڈھاڈر علاقہ خان پور نفر میں موضع کوٹ مینگل نوشہرہ شاہوانی اور مہر گڑھ رئیسانی براہوی کے قریب ہے۔ آپ بنگلانی بلوچ قبیلہ کے بزرگ تھے۔ آپ کے اعزہ واقارب کو لچک بنگلانی کہا جاتا ہے۔ آپ کی اولاد تا حال اپنی قدیم قیام گاہ کرتہ میں مقیم ہے اور اپنی جائیدادوں کا ایک معقول حصہ زائرین کی خورد و نوش کے لئے لنگر کے مجاوروں کو دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ آپ کا پیشہ چوبانی تھا۔ اپنی آمدنی سے غریبوں اور مسکینوں کی معاونت فرماتے تھے جو بھی حاجت مند اپنی ضرورت لے کر حاضر ہوتا تھا اس کی حاجت روائی فرماتے۔ اسی لئے آپ کو سخی کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

جن دنوں بلوچستان میں رند و لاشار قبائل ذاتی عداوتوں کی بناء پر آپس میں دست و گریباں تھے تو آپ نے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کئے رکھا مگر کسی خدا ناترس نے آپ کا سر تن سے جدا کر دیا۔ روایت یوں ہے کہ جب آپ کا سر تن سے جدا ہوا تو آپ اسے اپنی ہتھیلی پر لے کر اڑنے لگے۔ ڈھاڈر کے مضافات میں کسی نے آپ کو اس حالت میں دیکھا تو مبہوت ہو کر چلانے لگا کہ دیکھو یہ اپنا سر ہتھیلی پر لئے اڑا جا رہا ہے۔ اتنا کہنے کے ساتھ ہی آپ وہیں رکے اور مردے کی طرح سیدھے دراز ہوگئے۔ لوگوں نے آپ کو دیکھا تو رونے لگے۔ قبر کھودی گئی تو آپ کا جسد قبر سے لمبا نکلا مزید وسعت دی گئی تب بھی جسد لمبا ہی تھا۔ لحد کو اور بڑھایا گیا تو آپ کا جسد اور طویل ہوگیا۔ نماز عشا کا وقت ہوا تو آپ کی والدہ آپ کے قریب آکر کہنے لگیں کہ ''بیٹا دوستوں کو تکلیف نہ دے۔ صبح سے یہ قبر کھود رہے ہیں۔ انہوں نے تیری خاطر بچوں کی خور و نوش کا بندوبست اور اپنا آرام چھوڑ دیا ہے۔ اگر تو نے کرامت دکھانی ہے تو بعد میں دکھا دینا۔'' اس کے بعد انہوں نے لوگوں سے کہا ''کہ اسے سپرد خاک کر دو'' اور پھر یوں ہوا کہ قبر میں آپ کا جسد پورا آ گیا۔ روایت ہے کہ اس وقت سے ہر سال آپ کا مزار مٹھی برابر بڑھتا رہتا ہے اور بڑھتا ہی رہے گا۔

اگر کوئی مزار پر نفل ادا کر کے سو جائے تو اپنے کام سے متعلق خواب میں اسے اس کا انجام دکھائی دے گا۔ اگر بفرض محال اسے دکھائی نہ دے تو مجاور پر اس کا انکشاف ضرور ہوا ہوگا۔''

سخی فتح خان: آپ سخی پیتان کے نام سے مشہور ہیں اور سید زئی کے موروثوں میں سے تھے۔ سید زئی بلوچستان کے معروف قبیلہ بنگل زئی کے سردار کا قبیلہ ہے۔ آپ بچپن ہی سے ناداروں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ بڑے ہو کر بیواؤں، یتیموں اور غریبوں کی امداد کو اپنا فرض سمجھنے لگے۔ رات کو مسافر آتے تو انہیں خود کھانا کھلاتے۔ اور یوں آپ اسلام کی سچی تعلیمات کا عملی ثبوت بہم پہنچاتے رفتہ رفتہ آپ اپنی سخاوت کے باعث سخی مشہور ہوگئے۔

آپ حد درجہ متقی، پرہیز گار اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ جب آپ کی نیکی کا چرچا عام ہوا تو آپ کے چند حاسدوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور آپ کے گھر میں اپنے گھوڑوں سمیت مہمان بن کر جانے کا فیصلہ کیا۔ دل میں سوچا اتنے لوگوں کا انتظام نہ ہو سکنے پر آپ شرمسار ہوں گے۔ وہ لوگ جب اپنے گھوڑوں کے ہمراہ آپ کے ہاں وارد ہوئے تو اتفاق سے آپ کے یہاں کچھ نہ تھا۔ آپ نے گھبرانے کی بجائے اپنی زوجہ بی بی لعلین سے فرمایا "یہ لوگ ہمیں آزمانے آئے ہیں۔ آپ روٹی کا بندوبست کریں۔ میں سالن کا" یہ کہہ کر آپ گھر سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک آدمی ایک دنبہ لا رہا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ " کہاں لے جا رہے ہو "اس نے کہا کہ " آپ کے لئے لایا ہوں"۔ آپ نے وہ دنبہ ذبح کیا۔

روٹیوں کا انتظام بی بی محترمہ کے ذمہ تھا۔ وہ بھی خدا ترس اور نیک بخت خاتون ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ہاتھ کی چکی پر چادر ڈال کر اسے چلانا شروع کیا۔ ایک ساعت کے بعد اس میں سے کافی آٹا نکلا اور یوں ان حاسدوں کو کھانا دیا گیا۔

اب ان لوگوں نے سخی سے کہا کہ ہمارے گھوڑے بھی بھوکے ہیں۔ ان کے لئے بھی کچھ بندوبست کر دیجئے۔ آپ نے اللہ کا نام لے کر گھوڑوں کے تھیلوں میں کنکر بھر کر ان کے سامنے رکھ دئے جنہیں گھوڑے بڑے شوق سے کھانے لگے۔ جب وہ لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ تھیلوں میں کنکر نہیں بلکہ کشمش اور دیگر میوہ جات ہیں۔ جاتے وقت حاسدوں نے سخی پیتان کا شکریہ ادا کیا لیکن آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ کس نیت سے آئے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار آپ اور آپ کے معتقدین کی زہری قبیلہ کے سردار میر زرک، زرک زئی سے لڑائی ہوئی۔ ناکامی کے بعد آپ نے بددعا دی کہ سردار کے جانشینوں کا ایک سے زیادہ بیٹا نہیں ہوگا۔

آپ کا مزار قلات ڈویژن میں جوہان کے نزدیک قیصر میں ہے۔ یوں تو سب قبائل آپ کی عزت و توقیر کرتے ہیں لیکن بنگل زئی قبیلہ بہت زیادہ احترام کرتا ہے یہاں تک کہ بنگل زئی آپ کے نام کی قسم اٹھاتے ہیں۔

آپ کی زوجہ محترمہ بی بی لعلین اسلیجی میں دفن ہیں۔

حضرت سلطان باہوؒ کا بلوچستان میں سلسلہ طریقت

پاکستان کے معروف بزرگ سلطان العارفین حضرت محمد سلطان باہوؒ (۳۹-۱۰۳۸ھ/۲۹-۱۶۲۸ء تا ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۰ء) کے سلسلہ طریقت کے باعث قریباً تین سو سال سے بلوچستان میں اسلامی تصوف کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ آپ کی اولاد اور خلفاء میں صوفیانہ اور درویشانہ رنگ ملتا ہے۔ آپ کی اولاد اور خلفاء اب بھی بلوچستان میں بسنے والے لوگوں کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ ان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

اولاد

سلطان صالح محمدؒ (وفات تقریباً ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء):

آپ نے قلات کے بیشتر علاقوں میں تبلیغ فرمائی۔

سلطان نور احمد (وفات تقریباً ۱۳۲۶ تا ۱۹۰۸ء):

آپ نے کوئٹہ کے گرد و نواح اور قلات میں لوگوں کو روح تصوف سے آگاہ کیا۔

شاہوانی پیر: اصل نام محمد بخش تھا۔ آپ کا تعلق غل شاہوانی قبیلے سے تھا۔ ولادت کھڈ کوچہ (نزد مستونگ) میں ہوئی۔ مدفن ضلع جھنگ میں دربار سلطان محمد نواز دربار حضرت سلطان باہو کے نزدیک ہے۔ آپ نے سلطان محمد نواز (المتوفی ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء) ابن سلطان نور محمد سے بیعت کی اور انہی سے خلافت و دستار حاصل کی۔ مرشد سے بیعت کرنے کے بعد قرآن حکیم کی تعلیم حاصل کی۔ پھر بلوچوں اور براہویوں کو رشد و ہدایت کا سبق دینا شروع کر دیا۔ اکثر شاہوانی ان کے مرید ہوئے۔

مائی فاطمہ مستوئن: حضرت سلطان باہو نے (صاحب مناقب سلطانی کے بیان کے مطابق) مائی فاطمہ مستوئن قصبہ فتح خان ڈیرہ غازی خان کو پنگھوڑے جھلاتے ہوئے فیض عطا کر دیا تھا۔

اسی صاحب حال مائی مستوئن سے مہیسر (ضلع سکھر) کے مخدوم نے فیض حاصل کیا۔ مہیسر کے مخدوم اصل میں سیہڑ یا ذات یا قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور پھر مخدوم کہلائے۔ سندھ اور بلوچستان میں اسی مہیسر کے مخدوم صاحب کے فیض سے کئی گدیاں قائم ہیں۔ مثلاً

۱) کٹبار شریف (بیل پٹ ضلع کچھی بلوچستان)

۲) لانڈھی (نزد نوتال بلوچستان)

لانڈھی کے فقیر محمود کا وہاں مزار ہے۔ آج بھی وہاں کے درویش صاحب حال ہیں۔ فقیر محمود کے فرزند فقیر سلطان اور فقیر عبدالغفور تھے۔ فقیر سلطان کا ایک فرزند مولوی عبدالحئ اور فقیر عبدالغفور کا بیٹا فقیر عبدالرشید تھا۔ لانڈھی والے فقیر محمود سے سبی کے فقیر جان محمد مرغزانی نے فیض حاصل کیا اور صاحب ذوق و شوق درویش ہوئے۔ فقیر جان محمد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضوری حاصل تھی۔ اکثر دربار حضرت سلطان باہوؒ زیارت کیلئے جاتے تھے۔ ان کے فرزند فقیر گل محمد، فقیر غلام محمد اور فقیر داد محمد ہیں۔ فقیر جان محمد کا مزار سبی میں بمقام مرغزانی موجود ہے۔

عبدو ملنگ بروہی: علاقہ مستونگ کے رہنے والے تھے۔ ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء میں فوت ہوئے۔

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو قدس اللہ سرہ کے خاندان کے مریدوں میں سے تھے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ بیعت کس سے کی البتہ حضرت سلطان نواز ابن حضرت سلطان نور محمد کی صحبت میں کافی وقت گزارا۔ مجذوب الحال تھے۔ انہوں نے براہوی زبان میں حضرت سلطان العارفین کی مدح و عشق میں بیسیوں شعر کہے۔ وہ خود تو دیوانگی کی

حالت میں رہتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا کلام کسی اور شخص نے بھی محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے چند برا ہوئی اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

ٹکٹ کر کے راستیسٹ گوڑا سوار ماں ب ندار یل ٹی

(اے بندے پہلے ٹکٹ خرید لے پھر ریل میں سوار ہو)

بے ٹکٹ نماں سوار فیس ایڑے دھڑنگ خوار مفیس

(ٹکٹ کے بغیر سوار مت ہونا وہاں اتر کر خوار نہ ہونا)

فقیر اللہ ورایا: قوم بھنگر، علاقہ مندر مراد واہ تحصیل لہڑی کے رہنے والے تھے۔ آپ کا مدفن مراد واہ میں ہے۔

آپ نے سلطان نور محمد ابن سلطان غلام رسول جو جو حضرت سلطان العارفین سلطان باہو کی ششم پشت میں سے تھے کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ پچپن سال کی عمر پائی۔ اپنے مرشد سلطان نور محمد کی وفات سے تین سال بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔

ابتداء میں جب دربار شریف (جھنگ، پنجاب) پر پہنچے تو چھ ماہ تک کچھ کھایا نہ پیا۔ بات چیت بھی بہت کم کیا کرتے۔ لوگ دیکھنے آتے تو اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیتے۔ اس کے بعد مرشد کامل کی توجہ سے اصل حالت میں آئے۔ خورونوش کا خیال کرنے لگے اور بات بھی کرتے۔ تاہم بقیہ تمام زندگی فقیرانہ گمنامی میں گزاری۔

فقیر اللہ ورایا کہا کرتے تھے ''میں کسی کو عشق کیا سکھاؤں۔ یہ بھی کوئی سکھانے کی چیز ہے''

خلیفہ عبدالعزیز یوسف زئی: آپ کی ولادت قلعہ کانسی کوئٹہ شہر میں ہوئی۔ جمعرات ۱۵ شعبان ۱۳۲۴ھ/۱۹۱۵ء کو وفات پائی اور کچی بیگ (سرآب کوئٹہ) کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ نے علاقہ سرآب کلی کچی بیگ کے شاہوانی قبیلہ سے زیادہ انس ہونے کے باعث کچی بیگ میں سکونت اختیار کی۔

حضرت سلطان باہو قدس اللہ سرہ کی اولاد میں سے پانچویں پشت میں ایک بزرگ سلطان صالح محمد ابن سلطان غلام باہو سے فیض معرفت حاصل کیا۔ اکثر وجد و سرمستی کے عالم میں رہتے تھے۔ متشرع اور پاکباز تھے۔ انہوں نے حضرت سلطان العارفین کے سلسلہ طریقت کو سندھ اور ناڑی (ضلع کچہری) کے علاقوں میں پھیلانے میں کافی سرگرمی سے کام کیا۔ چنانچہ سندھ اور بھاگ ناڑی کے علاقوں میں ہزاروں لوگ خلیفہ صاحب موصوف کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ علوم دینی اور صفائے باطن کے باعث علاقہ سرآب میں سب سے زیادہ معزز شخصیت مانے جاتے تھے زبان میں تاثیر تھی۔ جو بات کہتے پوری ہو جاتی۔ ان سے متعلق کئی کرامات ان کے مریدوں میں مشہور ہیں۔

سلطان عارفی: آپ کا مقبرہ سارا وان میں نورگاز اہری کے مقام پر ہے۔

سید نوروز: آپ کا مزار جھالاوان میں منگوچر کے مقام پر ہے۔

شاہ بلاول: آپ کا مزار شاہ بلاول گاؤں کے پاس اور پب ندی (ضلع لس بیلہ) کے مغرب کی جانب ہے۔ آپ سندھ کے ایک سید تھے اور ۹۰۰ ہجری کے لگ بھگ ''لاہوت لامکان'' میں مقیم ہوئے۔ جہاں سے موجودہ مقام پر منتقل ہوئے۔

وہاں پہلے ایک باغ تھا جس کا مالک گوکل نامی ایک ہندو تھا۔ ہندو اپنے بچوں کو جنیئو پہنانے سے قبل ان کے بال اتروانے کی رسم یہیں ادا کیا کرتے تھے۔

یہ مقبرہ پب پہاڑیوں کے درمیان ایک تنگ وادی میں واقع ہے جو عمدہ دوامی چشمہ سے سیراب ہوتی ہے۔ یہ جگہ زرخیز ہے اور املی (تمر ہندی)، آم اور جان کے درخت یہاں کی اہم پیداوار ہیں۔ مقبرہ سے ملحق ایک مسجد اور قبرستان بھی ہے۔

شاہ بلاول میں ہر سال ۱۱ رمضان المبارک کو میلہ لگتا ہے جس میں دور و نزدیک کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔

شاہ عبداللہ: آپ شاہ جعفر کے فرزند ارجمند تھے جو بی بی نانی (جن کا مزار بولان میں ہے) اور پیر غائب (جن کا مزار کھجوری میں ہے) کے بھائی تھے۔ ان کا مزار رودبار میں ہے۔ کہتے ہیں کہ رودبار میں ایک اژدہا تھا جو لوگوں کی بھیڑ بکریوں کا صفایا کیا کرتا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے ختم کر دے۔ کئی منصوبے تیار کئے گئے لیکن عملی طور پر سب ناکام رہے۔ مویشیوں کے علاوہ جب لوگوں کو اپنی جان کا خطرہ بھی لاحق ہوا تو انہوں نے حضرت شاہ جعفر کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ آپ نے اس اژدہا کو مار ڈالا جس کے باعث لوگ مسرت و طمانیت سے جھوم اٹھے۔ رودبار کے ایک معزز شخص نے اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کر دی جس کے بطن سے شاہ عبداللہ پیدا ہوئے۔

آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے والد بزرگوار کی نگرانی میں ہوئی اور ان سے فیض یاب ہو کر آپ نے ساری زندگی اسلام کے لئے وقف کر دی۔ آپ کی متعدد کرامات مشہور ہیں۔ آپ کا وصال قلات ڈویژن میں درنگ کے مقام پر ہوا جو نرمک میں واقع ہے۔

لہڑی قبیلہ میں جس کے ہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک تکہ یا دنبہ مزار پر لے جا کر ذبح کرتے ہیں۔ سردار کے خاندان کے لوگ بکرے یا دنبے کی بجائے ایک بیل قربان کرتے ہیں۔ نرمک کا ہر کاشتکار اپنے گندم کا ایک حصہ نک کے طور پر مزار شریف میں پہنچا دیتا ہے۔

شاہ مردان: آپ کا مزار کشن اور جوہان کے وسط میں قلات بولان روڈ پر واقع ہے۔ اسے شاہوانی قبیلہ کے علاقہ میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور "شاہ مردان نا زیارت" کے نام سے موسوم ہے۔ آپ کا اسم مبارک علی تھا لیکن عرف عام میں شاہ مردان مشہور ہوئے۔

آپ کا مزار پہاڑی کے دامن میں پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ براہوئی عزت و توقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہر سال لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں اور جانور قربان کئے جاتے ہیں۔

شے ڈاھی: قلات ڈویژن کا ایک مشہور گیت ہے "زیبو ننے دیرایتے"

کوہک کا علاقہ (قلات ڈویژن) مقابلتاً زیادہ بنجر ہے۔ اس سارے علاقے میں پینے کے پانی کیلئے کنواں تک موجود نہیں ہے۔ یہ "ننے دیرایتے" جیسی تاریخی ترکیب کا عملی نمونہ پیش کرتا ہے۔ لوگ صبح سویرے پانی لینے کی خاطر روانہ ہوتے ہیں اور مشکل سے عصر کے وقت واپس آتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس پانی کی کمی ہو تو وہ پڑوسیوں سے ادھار لیتا ہے۔ جسے اسی صورت میں لوٹانا پڑتا ہے۔ اسی بے آب و گیاہ خطے کو اللہ کے ایک برگزیدہ بندے (شے ڈاھی) نے اپنا مسکن بنایا۔ شے "شیخ" کا مخفف ہے۔ اور ڈاہی بلوچی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی خبر دینے والے کے ہیں۔

یہ نام خانہ بدوش بلوچوں میں مستعمل ہے۔ آپ کا اصل نام پردہ اخفاء میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ لوگوں کو ان کے دل کی باتیں بتاتے ہوں اور یوں ڈاہی مشہور ہوگئے ہوں۔ یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ آپ نے کس سلسلہ میں بیعت کی تھی اور کوہک باہر سے یہاں پہنچے تھے یا یہیں کے مکین تھے۔ اس علاقے کے لوگوں میں آپ کی کرامات مشہور ہیں۔

آپ کوہک ہی میں اللہ کو پیارے ہوئے اور وہیں مزار بھی ہے۔ آپ نے وصال کے وقت یہ وصیت کی تھی کہ میرے بعد اس مقام پر مسافروں کے لئے ایک سبیل بنا دینا اور اگر اس پر عمل نہ کیا گیا تو اس علاقے میں قحط رہے گا اور بارش نہیں ہوگی۔ لوگوں نے آپ کی وصیت کو نظر انداز کر دیا نتیجتاً کوہک کا علاقہ خشک ہے۔ نہریں جو کبھی بہتی تھیں سوکھ چکی ہیں۔

آپ کے مزار کے نزدیک لال رنگ کے سانپ ملتے ہیں جو کسی کو ڈستے نہیں۔ وہاں کے لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ سانپ رات کو اکثر ان کے بستروں میں گھس جاتے ہیں مگر کسی کو ضرر نہیں پہنچاتے۔

آپ کی اونی ٹوپی ایک مدت تک مایوس العلاج لوگوں کے کام آتی رہی۔ ٹوپی کا ایک حصہ پانی میں ڈبو کر مریض کو پلا دیتے تھے جس سے مریض صحت یاب ہو جاتا تھا۔

حضرت شے رجب: آپ سندھ کے بریجاہ تھے۔ نقل مکانی کر کے نیمرغ (قلات ڈویژن) پہنچے۔ وہیں سید کلان کی بیٹی سے شادی کی سید کلان کی اولاد آج کل سید کلانی کہلاتی ہے اور شمرود کے علاوہ افغانستان کی سرحد سے متصل سرلٹھ پہاڑوں میں بھی اقامت گزین ہے۔ آپ صاحب حال بزرگ تھے۔ وفات کے بعد نیمرغ میں ہی دفن ہوئے۔ شے (شیخ) کا مقبرہ مربی ساروان، جھالاوان اور شمرود کے لوگوں کی زیارت گاہ ہے۔ ہر سال فصل کی کٹائی کے بعد میلے کے لئے ایک تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ دور و نزدیک سے معتقدین جمع ہوتے ہیں۔ بھیڑ اور بکریوں کے نذرانے پیش کئے جاتے ہیں جو ذبح ہونے کے بعد لوگوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ نیمرغ کے لوگ اپنی زمینوں کی آمدنی کا چالیسواں حصہ "ٹک" کے طور پر ادا کرتے ہیں اور یوں زائرین کے لئے کھانے کا بندوبست ہو جاتا ہے۔

شہ کھٹے (شیخ کھٹے): آپ قبیلہ کہیری سے تعلق رکھتے تھے۔ صاحب حال تھے۔ پندرہویں صدی کے اواخر میں ہوگزرے ہیں۔ آپ امیر چاکر سردار اعظم رند بلوچ (۱۴۵۷ء۔۱۵۵۵) کے مرشد تھے۔

آپ ایک دن اپنے محافظ کے ہمراہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک پگڈنڈی سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے میر چاکر کے بہنوئی اور نامور بہادر میر بابر خان رند آ گئے۔ آپ کے محافظوں نے مطالبہ کیا کہ وہ شاہ صاحب کے لئے راستہ چھوڑ دیں لیکن بابر رند نے انکار کر دیا۔ محافظوں نے برافروختہ ہو کر تیر چلائے ورا سے ہلاک کر دیا۔ اس انکار کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک دفعہ چاکر اعظم کے بھرے دربار میں میر بابر خان نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ کسی راستے پر چل پڑے تو پھر کوئی اس کا راستہ نہیں روک سکے گا۔ خواہ اسے جان ہی قربان کرنا پڑے۔

شین حاجی: آپ کا مزار جھالاوان میں منگوچر کے مقام پر ہے۔

شیخ ماندہ: جھالاوان میں شیخ واصل ہی کے مقام پر دفن ہیں۔

شاہ جمال: ان کا مزار میانی لسبیلہ میں ہے۔ ہر سال جمادی الثانی میں میلہ لگتا ہے۔

صابر شاہ: آپ پنجاب سے بھاگ تشریف لائے تھے۔ پیر روشن ضمیر کے نام سے بھی معروف ہیں۔

پیر عمر: آپ کا مزار دریائے سین کے کناروں پر خضدار اور واہر کے مابین واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ آج سے کئی سو سال پیشتر جب منگولوں نے بلوچستان پر ہلہ بولا اور

منگول فوج نے پنجگور میں داخل ہو کر قتل و غارت شروع کیا تو لوگ ان کے مقابلے کی تاب نہ لا کر پیر عمر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورت حال بیان کی۔

پہلے تو آپ ذرا خاموش رہے پھر بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا کر دعا کی کہ ''الٰہی یہ ظالم تیرے محبوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ تو ہی ان کا مناسب تدارک فرما'' کہتے ہیں کہ دعا باری تعالیٰ کے ہاں مستجاب ہوئی اور منگول شکست کھا گئے۔ اور یوں پنجگور کے لوگ مزید ستم سے بچ گئے۔

پیر عمر کا وصال پنجگور ہی میں ہوا۔ جہاں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ وہیں ایک تالاب ہے جس میں مچھلیاں ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں اس تالاب میں مشتبہ مجرموں کا امتحان لیا جاتا تھا۔

پیر عزت شاہ: یہ بزرگ والیان سندھ کلہوڑا خاندان کے زمانہ میں سندھ سے یہاں آ کر آباد ہوئے۔ ان کا مزار مٹھڑی اسٹیشن کے قریب درختوں کے جھنڈ میں واقع ہے۔

میاں غلام حیدر: آپ حضرت میاں محمد حسن کے فرزند اکبر تھے۔ میاں محمد اکرم کی وفات کے بعد سجادہ نشین بنے۔ آپ ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ بی بی عالم خاتون گنداواہ کے قاضی رحمت اللہ قوم گھوئیہ کی پوتی اور میاں پیر محمد کی بیٹی تھی۔ آپ نے پہلے اپنے تایا میاں محمد حیات کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ پھر کنڈہ شہر میں مولوی نور محمد صاحب سے تحصیل علم میں مصروف رہے۔ اپنے والد بزرگوار سے فیضان طریقت حاصل کیا۔ ریاضت و مجاہدہ میں اس حد تک محو ہوئے کہ تین دن تک لگاتار روزہ جو طریقہ قادریہ کا معمول ہے، رکھنے کی بجائے سات روز تک لگاتار روزہ رکھتے تھے۔ مولود یا کافی سن کر بہت روتے تھے۔ بلکہ اکثر اوقات انہیں حال آجاتا اور وجد و رقص کرنے لگتے۔ کبھی خود مولود و کافی کہتے۔ انہیں فنافی الرسول کا مرتبہ حاصل تھا۔ اکثر آنحضرت صلعم کے اشتیاق میں گریاں رہتے تھے۔ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء اور ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء میں ایسا صبر و سکوت اختیار کیا کہ اکثر گھر سے باہر ہی تشریف نہیں لاتے تھے۔ اس کے بعد پھر حضرت حبیب عربی کے اشتیاق میں گریہ وزاری کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر یہ خوش طبعی عمل میں نہ آئے تو میرا سینہ اشتیاق محمدی کی آگ سے جل جائے۔

آپ نے پہلے میاں محمد اکرم کی بیٹی مسماۃ ناز بی بی سے شادی کی۔ اس کے بطن سے مائی گنج بی بی پیدا ہوئی۔

دوسری شادی مائی خاتون سے کی جو قوم لغاری سے تھی۔ اس کے بعد بطن سے میاں عزیز اللہ اور میاں داد محمد اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

سید غلام حیدر شاہ حنفی: بلوچستان نے میدان فقیری و درویشی میں ایسے نامور فقراء و مشائخ پیدا کئے جن کا سروکار رضائے الٰہی سے تھا۔ ایسے ہی خدا ترس، دین دار، زاہد اشخاص میں سے سید غلام حیدر شاہ حنفی بھی تھے۔ خاندان سادات چشتیہ کے باوقار بزرگ سید محمد زمان شاہ کے ہاں تیری مستونگ روڈ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں دینی مدارس سے مذہبی تعلیم کی تحصیل کا آغاز کیا اور متعدد علماء سے فیضیاب ہوئے اور بعد میں بڑے بڑے عالم ان کے علم سے متاثر ہوئے۔ آپ کے حلقہ ارادت میں امراء، حاکم، سردار، دہقان، ہندو، عیسائی غرض کہ سبھی تھے۔

صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ صبح و شام تلاوت کلام پاک، وظائف و اوراد اور شب بیداری ان کا شیوہ تھا۔ بسا اوقات ذکر خداوندی میں گریہ وزاری سے بے ہوش ہو جاتے۔ دنیاوی کاروبار سے بڑی حد تک کنارہ کش تھے۔ عموماً جمعہ کو منبر پر کھڑے ہو کر حضور ﷺ پر نور کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے۔ آواز میں بلا کا سوز تھا۔ اردو، فارسی، عربی پر دسترس کے علاوہ، بلوچی، پشتو، سندھی اور براہوی سے بھی کما حقہ واقف تھے۔ انگریزی بھی روانی سے بول سکتے تھے۔

گھر میں چھوٹا سا مطب تھا۔ جس سے غریب مستفیض ہوتے تھے۔ عدالتوں میں سائلوں کے کام آتے۔ بڑے مہمان نواز تھے۔ امراء، سردار اور مخیر حضرات سے نذرانہ پاتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں بیمار ہوئے اور ممبئی میں جمعہ کے دن ۱۳ رجب ۱۳۷۱ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۹۵۱ء کو وفات پائی۔

حضرت خواجہ میاں غلام صدیق: خواجہ میاں محمد صدیق بن میاں غلام صدیق بن میاں نور محمد بن میاں غلام محمد بن محمد توکل فاروق خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے بزرگ تبلیغ کی غرض سے عربستان، عراق اور وہاں سے پنجاب آئے۔ سماسٹہ کے راستے بلوچستان گئے۔

آپ کے دادا میاں غلام محمد نے حضرت میاں نور احمد (محمد پور والا) کے ہاتھ پر بیعت کی اور یوں سلسلہ عالیہ قادریہ سے وابستہ ہوئے۔ آپ کے والد خواجہ میاں نور محمد ریاست قلات کے قاضی القضات تھے لیکن کسی مسئلے پر اختلاف رائے کی بنا پر قلات سے شہداد کوٹ (سندھ) چلے آئے۔

حضرت خواجہ میاں نور محمد صاحب کے تین بیٹے تھے۔ خواجہ گل محمد جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور استاذ العلماء سندھ و بلوچستان تھے۔ (۲) خواجہ میاں غلام صدیق جو کہ بلند مرتبہ عارف اور عاشق رسول اللہ تھے اور جن کے نام سے

درگاہ شریف صدیقیہ منسوب ہے (۳) خواجہ غلام عمر جو جوانی ہی میں فوت ہوگئے۔

قطب الارشاد میاں غلام صدیق ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں موضع کنڈہ کچھی (بلوچستان) میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید اور ابتدائی تعلیم اپنے والد خواجہ میاں نور محمد سے حاصل کی۔ اس کے بعد درس نظامی تک کی کتب احادیث وفقہ واصول ومنطق اپنے بڑے بھائی خواجہ میاں گل محمد سے پڑھیں۔

حضرت خواجہ میاں غلام صدیق نہایت متقی اور پرہیز گار تھے۔ ہمیشہ باوضو رہتے تھے۔ عام مٹکے وغیرہ کا پانی استعمال نہیں کرتے تھے۔ کھانا پکانے کیلئے پیر محمد باورچی مقرر تھا جو سفر میں یا لنگر خانہ میں باوضو ہو کر طعام تیار کرتا تھا۔ اگر طبیعت ناساز ہوتی اور کوئی گولی استعمال کرنا پڑتی تو اوپر کے انگریزی حروف مٹا کر استعمال کرتے۔ بیت الخلاء کے لئے چادر اور جوتے علیحدہ تھے اور عبادت کے لئے سادہ اور پاکیزہ لباس علیحدہ تھا۔

تاریخ وفات ۱۳ ربیع الاول ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء ہے۔ وصال کے وقت دربار شریف سے فارغ التحصیل متعلموں کی تعداد ۶۸۴ تھی۔

حضرت میاں غلام صدیق کے دو فرزند تھے۔ میاں عبدالوہاب اور میاں غلام دستگیر۔ دونوں صاحبزادے بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ حضرت میاں غلام صدیق نے اپنے بھانجے میاں نصیر الدین کی پرورش کی اور اپنا بیٹا اور اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

میاں نصیر الدین ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ حضرت صاحب کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ حضرت میاں نصیر الدین کے درس مبارک سے چھپن علمائے کرام فارغ التحصیل ہوئے اور پانچ بزرگ خلعت خلافت سے مستفیض ہو کر تبلیغ دین متین میں مصروف ہوئے۔

۱۵ محرم ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

سید غلام محی الدین شاہ: آپ کے والد بزرگوار کا نام سید حاجی عبداللہ شاہ تھا۔ آپ قادری حسینی سید تھے۔ آپ کا وطن بغداد تھا۔ چھٹی پشت سے آپ کا خاندان باغبانہ تحصیل خضدار میں اقامت پذیر ہے۔ آپ صاحب کرامت بزرگ تھے۔

محبوب علی خاں مگسی اور نواب زادہ میر سیف اللہ خاں مگسی مرحوم نے شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ کو ان دونوں مریدوں سے بہت لگاؤ تھا۔ آپ اکثر جھل مگسی تشریف لایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کا وصال بھی ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ بمطابق ۹ فروری ۱۹۵۶ء میں جمعرات کے دن ۲ بجے بعد از ظہر جھل مگسی میں ہوا۔

آپ کے سجادہ نشین حاجی سید گل محمد شاہ ہیں۔ ان کی سجادہ نشینی کی تاریخ ۲۸ جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ ہے۔

نواب محبوب علی خان مگسی اور نوابزادہ میر سیف اللہ خاں مگسی مرحوم کو اپنے مرشد سے بے حد عقیدت اور انسیت تھی۔ اسی لئے آپ کے سالانہ عرس کا انتظام خاص اہتمام سے کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ تین دن تک رہتا ہے۔ علمائے کرام اور صوفیائے عظام باہر سے تشریف لاتے ہیں۔ دن رات کھانا پکتا ہے اور غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

غلام محمد میاں: روہڑی کے رہنے والے تھے۔ بھاگ نیابت میں ان کی خانقاہ ہے جو خانقاہ شہیداں کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے ایک شاگرد حافظ عبدالرحیم کو کسی افغان باشندہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ جادوگر تھا۔

فقیر ہوتک: آپ کا تعلق بلوچستان کے مشہور قبیلہ سالانی سے تھا۔ آپ ضلع چاغی کے معروف صاحب کرامت بزرگ حضرت شیخ حسین کے خدمت گزاروں میں سے تھے۔ اپنے مرشد سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے اور کبھی ان سے جدا نہ ہوئے تھے۔ لگاؤ کی وجہ سے مرشد کے وصال کے بعد آپ نے باقی عمر وہیں گزار دی۔

حضرت شیخ حسین نے ایک روز خوش ہو کر آپ کے لئے بارگاہ ایزدی میں دعا کی جس کے نتیجہ میں سانپ اور بچھو آپ کے تابع ہوگئے۔ بلوچستان کی سرزمین طویل فاصلوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں کے بیشتر حصوں میں پرانے وقتوں سے باؤلے کتے، سانپ، بچھو اور دوسرے زہریلے حشرات کے کاٹے کا علاج دم اور صوفیائے کرام کے مزارات کی مٹی سے کیا جاتا ہے۔ یہ مٹی "خوردہ" کہلاتی ہے۔

جب کسی کو باؤلا کتا کاٹتا ہے۔ تو وہ حضرت سید کریم، حضرت سید مورث شاہ یا حضرت آموآغا میں سے کسی ایک کے مزار پر جا کر وہاں کی مٹی زخم پر لگا دیتا ہے تو اسے بفضل ایزدی شفا ہو جاتی ہے۔

سانپ کے کاٹے کا علاج فقیر ہوتک کے مزار کی مٹی سے کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ کے مزار کی مٹی میں ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اگر یہ خاک کسی گھر میں ہو تو وہاں سے سانپ اور بچھو بھاگ جاتے ہیں یا کم از کم وہاں کے مکینوں کو کوئی گزند نہیں پہنچاتے۔ اسی لئے خانہ بدوش ہر وقت یہ خوردہ اپنے پاس رکھتے ہیں کیونکہ ان کے پاس چارپائیاں تو ہوتی نہیں اور انہیں زمین پر ہی سونا پڑتا ہے۔ اس لئے انہیں سانپ اور بچھو کا خطرہ بھی زیادہ ہی ہوتا ہے۔ آپ کا مزار کردگاب (قلات ڈویژن) میں مرجع خلائق ہے۔

صوفی فیض محمد فیضل: آپ گاجان شہر کے قبیلہ لاشار میں ربیع الآخر ۱۳۰۱ھ

۱۸۸۳ء میں جمعرات کے دن پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خان محمد تھا۔ سات آٹھ برس کی عمر کو پہنچے تو عام دستور کے مطابق اپنے بیلوں کو چرانے کے لئے جانے لگے۔ دس برس کی عمر تک کھیل کود ہی میں مصروف رہے۔

پھر آپ کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا اور آپ دل لگا کر تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ والدین کو بتائے بغیر آپ ایک مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں بھی علوم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مولوی صاحب نے آپ کا شوق اور رجحان دیکھ کر پڑھانا شروع کیا۔ جب آپ نے قرآن شریف ختم کرلیا تو دستور کے مطابق مولوی صاحب نے ان کے ہاتھ تسبیح سے باندھے اور چند طالب علموں کے ہمراہ انہیں ان کے گھر بھیج دیا۔ والدین نے حقیقت دریافت کی تو طالب علموں نے بتایا کہ انہوں نے قرآن مجید ختم کرلیا ہے اس لئے استاد نے ان کے ہاتھ تسبیح سے باندھ دیئے ہیں اور آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ ختم قرآن مجید کی مٹھائی دیں۔ اس پر فیصل کے والدین بے حد خوش ہوئے اور فی الفور مولوی صاحب کی خدمت میں بچھڑا بھجوادیا۔

اب آپ فارسی و عربی کتب پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ پہلے تو تعلیم کی رفتار سست ہی رہی کیونکہ اکیس سال کی عمر میں سکندر نامہ سے فارغ ہوئے بہر حال تعلیم ظاہری سے فراغت پاکر آپ تعلیم باطنی کی جانب متوجہ ہوئے اور مرشد کامل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ فتح پور (علاقہ گنداوا، ضلع کچھی) پہنچ کر حضرت سید رکھیل شاہ صاحب کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئے۔ وہاں پہلے طلبہ کو درس دینے میں مصروف رہے۔ پھر حضرت صاحب کے ارشاد کے مطابق پرانی مسجد میں بیٹھ گئے اور چلہ کشی شروع کی۔

چلہ کھینچنے کا طریقہ یہ ہے کہ چلہ کھینچنے والا ایک کوزہ پانی کا اور چند کھجوریں اپنے پاس رکھتا ہے اور ان میں سے چند دانے کھاتا رہتا ہے اور چالیس روز تک ذکر الٰہی میں مشغول رہ کر ایک چلہ پورا کرتا ہے۔

فیصل نے بھی اسی دستور العمل پر عمل کیا مگر آپ یاد الٰہی میں اتنے منہمک ہوگئے کہ کھانے پینے کا خیال تک نہ رہا۔ چالیس دن گزرنے کے بعد دوسرے لوگ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ آپ نڈھال پڑے ہیں۔ سانس بھی مشکل سے آرہی ہے۔ انہوں نے منہ میں شربت ٹپکایا تو سانس آئی اور یوں آپ اس اولیں منزل کو بخیر و خوبی طے کر کے آگے بڑھے۔

آپ کئی سال تک فتح پور میں مرشد کی خدمت میں رہے اور پیر کامل کی رہنمائی میں طریقت کی منازل طے کیں۔

آخری وقت بھی نماز قضا نہ ہوئی۔ صبح کی نماز کے وقت اپنے فرزند سے کہا کہ تیمم کے لئے اینٹ لاؤ۔ وہ اینٹ لے آیا۔ آپ نے تیمم کیا اور لیٹے لیٹے نماز پڑھنی شروع کی اور اسی حالت میں آپ کا وصال ہوا۔

تاریخ وفات ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ (بمطابق ۸ نومبر ۱۹۵۷ء) ہے۔

آپ فارسی، اردو، بلوچی، سندھی، سرائیکی اور براہوئی زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اسی کے ذریعے علم دین کی خدمت کی۔ آپ کی شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ آپ کے دیوان آپ کے جانشین حاجی محرم فقیر کے پاس محفوظ ہیں۔

فدا حسین: مزار اوتھل شہر لس بیلہ میں ہے۔ یہاں جمادی الثانی میں میلہ لگتا ہے۔

مولوی قادر بخش خان گولہ: آپ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی بنگل خان تھا جو جیکب آباد کے معزز زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ بچپن ہی میں والدین کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگئے تھے مگر تحصیل علم سے محروم نہ رہے۔ تعلیم نے آپ کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ علم ظاہری کے ساتھ آپ کو علم باطنی سندھ کے مشہور شیخ کاپاری کی سالہا سال کی صحبت سے حاصل ہوا۔ دس سال کی عمر تک آپ نے ابتداء تعلیم اپنے گاؤں کے ملا سے حاصل کی۔ اس کے بعد ضلع سکھر کے قصبہ رستم کے مولوی محمد عبدالستار صاحب کے مدرسہ میں داخل ہوکر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذوق معرفت نے روز ازل سے آپ کے دل میں گھر کر رکھا تھا۔ اسی لئے شریعت کی مکمل تعلیم کے بعد آپ طریقت کی طرف مائل ہوگئے۔

دوران تعلیم اپنے مکان پر اکتارے کی دھن میں محو ہوجایا کرتے اور اسی سوز و ساز میں کھو جاتے۔ شفیق استاد تنبیہہ کیا کرتے تھے "اے قادرو کوری یہ شغل چھوڑ دو ورنہ کبھی ماروں گا"۔ مگر انہوں نے کتابوں کو تو ترک کرنا شروع کردیا مگر اکتارے اور سارنگی کو نہ چھوڑا۔ تمام ہم مکتب کہتے تھے کہ قادر بخش کبھی مولوی نہ بن سکے گا۔

مولوی صاحب لاولد فوت ہوئے۔ پچاسی سال عمر پائی۔ ان کا وصال ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء میں ہوا۔ آپ کا مزار گوٹھ عاشق آباد نزد صحبت پور میں ہے۔ آپ کا عرس ہر سال ۲۵ تا ۲۷ ذوالحجہ کو ہوتا ہے۔

گنران محمد پیر: آپ منگوچر (جھالاوان) میں دفن ہیں۔

پیر لاکھا: سہون (سندھ) کے لال شہباز قلندر کے زمانے میں بلوچستان کے علاقہ جھل مگسی میں ایک ہندو رہتا تھا۔ شادی کے کئی سال بعد تک اس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ آیورویدک علاج اور پنڈتوں کے ٹوٹکوں سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر مایوس ہوکر علاج کرانا چھوڑ دیا۔ انہی دنوں لال شہباز قلندر کا شہرہ عام ہوا۔ اس کے ایک مسلمان

دوست نے مجبور کر کے اسے لال شہباز کی خدمت میں بھجوادیا۔ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنی بیوی کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مدعا بیان کیا۔

لال شہباز قلندر مراقبے میں گئے۔ دربار خداوندی میں دعا کی اور انہیں خوشخبری سنا کر جانے کی اجازت دے دی۔

اللہ نے انہیں ایک خوبصورت لڑکا عطا کیا۔ خوبصورتی کی وجہ سے اس کے ہونٹ سرخ رنگ کے تھے۔ ہونٹوں کی سرخی کی وجہ سے والدین نے اس کا نام "لاکھا" رکھا۔

لاکھا ہندی لفظ ہے اور پانی کے اس سرخ رنگ کو کہتے ہیں جو عورتیں خوبصورتی کی خاطر ہونٹوں پر جماتی ہیں۔

جب یہ لڑکا عنفوان شباب کی منزل طے کر رہا تھا، عین اس وقت حسن اتفاق سے لال شہباز قلندر بلوچستان تشریف لائے اور جھل مگسی سے گزرے۔ لاکھا کے والدین آپ کی آمد کی خبر سن کر حاضر خدمت ہوئے۔ لاکھا بھی ہمراہ تھا۔ اس کے والدین نے سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے لڑکے کو سینے سے لگایا۔ اسی لمحے کفر کی ظلمت اس کے دل سے دور ہوگئی اور وہ مسلمان ہو کر ایمان کی نعمت سے مالا مال ہوگیا۔ آپ کی تربیت سے صاحب کرامت بنا۔

لاکھا نے آگ کے پتوں کو ہاتھ میں لیا تو وہ روٹی بن گئے۔ لوگوں نے کھا کر دیکھا تو اصلی روٹیاں تھیں۔ ان میں ذرہ بھر بھی آگ کے زہر کا اثر نہ تھا۔

بلوچستان میں پانی کی قلت ہے اس لئے زیادہ تر زمینیں بے آباد اور بنجر پڑی ہوئی ہیں۔ لوگوں نے پیر لاکھا سے پانی کیلئے درخواست کی۔ آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر اپنے دونوں پاؤں زمین پر مارے تو زمین سے پانی بہنے لگا۔ اس کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ سندھ کا کچھ حصہ بھی زیر آب آگیا۔ لال شہباز قلندر نے اس سے کہا کہ "دنیا میں تباہی نہ مچاؤ۔ لوگ پریشان ہوگئے ہیں" اس پر پانی کم ہونا شروع ہوگیا۔ آج کل اس جگہ پانی کے تالاب ہیں جن میں مچھلیاں بھی ہیں۔ اس پانی کی یہ عجیب خاصیت ہے کہ اگر جلدی امراض کے مریض اس پانی سے غسل کریں تو وہ شفایاب ہو جاتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دور دراز سے لوگ آتے ہیں اور صحت یاب ہو کر چلے جاتے ہیں۔

جب آپ کے وصال کا وقت آیا تو آپ نے وصیت کی کہ "مجھے جھل مگسی میں اس مقام پر دفن کیا جائے جہاں میں اور لال شہباز قلندر ملے تھے" چنانچہ اس پر عمل کیا گیا اور آپ کا مزار بلوچستان کے درہ مولا میں جھل مگسی سے بیس میل دور جنوب مغرب کی جانب واقع ہے۔ ہر سال جیٹھ کے مہینے کے ابتدائی تین دنوں میں یہاں ایک میلا لگتا ہے اور عقیدت مند دور و نزدیک سے شرکت کے لئے آتے ہیں۔ بلوچستان کے باقی حصوں کی نسبت ضلع کچھی اور سندھ سے لوگ زیادہ تعداد میں آتے ہیں۔

ایک دفعہ پیر لاکھا بلوچستان کے ضلع لورالائی کی تحصیل بارکھان کے مقام لغاری کوٹ تشریف لے گئے۔ جہاں کرامت کے ذریعے تین چشمے پھوٹ نکلے۔ وہاں بھی آپ کی یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ متصل زمین (تقریباً نو ایکڑ) بھی آپ کے نام پر وقف ہوئی۔

پیر لعل شاہ: آپ کا نام عبدالرحمان تھا۔ غلجی افغان تھے۔ شہید پکارے جاتے ہیں۔ کٹبار شریف سے مغرب کی جانب سوا کوس کے فاصلہ پر دفن ہیں۔ حضرت میاں محمد کامل (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۳ء) جب پہلے پہل یہاں وارد ہوئے تو تین ماہ تک متواتر رات کے وقت آپ کی قبر پر حاضری دیتے رہے۔

لالہ سلیمان: سوراب ساروان میں پیدا ہوئے۔

حضرت محمد صدیق نقشبندی مستونگی: آپ طائفہ محمد حسنی قوم بلوچ سے متعلق تھے۔ جائے پیدائش قندھار تھی۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل میاں ولی محمد صاحب کے درس سے ہوئی۔

مستونگ میں آپ کی آمد سے پیشتر اہل مستونگ اور گردونواح کے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود بعض ایسی رسوم میں مبتلا تھے جو آئین شرع کے خلاف تھیں مثلاً عورتوں کی مردوں پر نوحہ خوانی، عشرہ محرم میں بالوں کی نوچنا اور سینہ کوبی کرنا، تابوت بنانا اور دفنانا، ان اجتماعات میں عورتوں اور لڑکیوں کا شامل ہونا، شادی کے وقت ڈھولک بجانا اور عورتوں کا مردوں کے ساتھ رقص کرنا جسے "چاپ" کہتے تھے، قبروں پر سجدہ کرنا، حاجت روائی اور حصول اولاد کیلئے پیر کے نام پر بھیڑ بکری اور گائے کا نذرانہ دینا، بچوں کے سر کے بالوں کو دو تین جگہ پر چھوڑ دینا جسے "چھنڈ" کہتے تھے، پھر منت ماننا کہ جب بچے کی عمر اتنے سال ہوگی تو اسے پیر کی قبر پر لے جا کر بال تراشیں گے اور نذر پیش کریں گے، بلند چوٹیوں پر ایک لکڑی کو گاڑ کر اس پر پیر کے نام کا رومال باندھنا اور اس مقام کو "مکان پیر" کے نام سے مشہور کر دینا پھر اسی لکڑی کو پیر سمجھ کر بوسہ دینا، انتقام جوئی میں دائرہ شرع سے تجاوز کرنا، بھیڑوں کا تازہ خون پینا، بیٹوں کو ورثے سے محروم کرنا، اپنے جھگڑوں میں شرع کی بجائے جرگہ کی جانب سے رجوع کرنا وغیرہ۔ اس کے علاوہ وہ لوگ قرآن مجید کو سمجھنے کی بجائے فقط ناظرہ پڑھنے ہی کو کافی سمجھتے تھے۔ امامت کے لئے جو ملا مقرر کئے جاتے وہ کم علم اور غیر تربیت یافتہ ہوتے تھے۔

حضرت محمد صدیق کی روز و شب کی تعلیم و تربیت کے باعث متذکرہ خرابیوں کی اصلاح ہونے لگی۔ آپ کے قندھار تشریف لے جانے کے جلد بعد

آخر کار گھر سے دور رہ کر تعلیم حاصل کرنے کی اجازت مل گئی۔ اور آپ اپنی والدہ کی نیک دعاؤں کے ساتھ مزید حصول تعلیم کی غرض سے روانہ ہوئے شکار پور پہنچ کر ایک دینی مدرسے میں داخل ہو گئے اس مدرسے میں سندھ کے ایک بڑے زمیندار کا لڑکا بھی زیر تعلیم تھا۔ جواب تک " کریما" ہی پڑھ رہا تھا۔ آپ کے استاد نے آپ سے اس طالب علم کو اس کے والدین نے خوش ہو کر آپ کے لیے باقاعدہ عمدہ کھانا بھجوانا شروع کیا مگر آپ کو یہ بات پسند نہ آئی۔

پہلے آپ نے استاد صاحب کی خدمت میں عرض کرنے کا ارادہ کیا کہ میں اس طالب علم کو درس نہیں دے سکتا پھر استاد کے احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے خاموش رہے اور اس مدرسہ ہی کو خیر باد کہہ کر سکھر کے گاؤں "ہنگ" چلے گئے وہاں مولانا نذر محمد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ یہ آخری مرحلہ تھا۔ آپ کے ساتھ سات دوسرے طالب علم بھی اسی منزل میں تھے۔

آپ یہاں دو سال تک رہے اور (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) میں فارغ التحصیل ہوئے اس مدرسے میں کھانے پینے کا معقول بندوبست نہ تھا ہر طالب علم کے حصہ میں جوار کی چوتھائی روٹی آتی تھی۔ شکار پور اپ نے لذیز کھانوں کی وجہ سے چھوڑا تھا یہاں قدرت نے جوار مہیا کی۔ آپ اسی حال میں خوش رہے اور اپنے در مقصود کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔

آپ نے ڈھاڈر میں دینی مدرسہ بھی قائم کیا جس سے اس علاقے کی معزز ہستیاں بہرہ ور ہوئی ہیں۔ ان میں سے سید اورنگ شاہ اور سید عبدالمجید شاہ زیادہ معروف ہیں۔

گرمیوں میں آپ سریاب (کوئٹہ) تشریف لاتے، کیونکہ ڈھاڈر کی گرمی ناقابل برداشت ہوتی ہے جس کے بارے ایک شاعر نے کہا ہے:

سبی و دھادر ساختی
دوزخ چرا پرداختی

سریاب میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ منقطع نہ ہوتا تھا۔ آپ فتوی بھی لکھ کر دیتے تھے۔ اپنے علمی تبحر کے باعث ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء سے ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ تک سابقہ ریاست قلات کے قاضی القضاہ رہے آپ نے حضرت قطب عصر خواجہ محمد عمر چشموی (۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء-۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت سے سرفراز ہو گئے۔ آپ ایک خوش گو شاعر بھی تھے۔ مرشد کے ارشاد پر نقشبندی مجددی سلسلہ کا منظوم شجرہ بھی تیار کیا جو آپ کی قادر الکلامی کا مظہر ہے۔

حضرت میاں محمد کامل: آپ کا حسب و نسب یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ''میاں محمد کامل ابن محمد جام ابن سلیمان ابن محمد جام ابن لعلو'' (کہ جدکلاں ہیں) طائفہ لعلو میں خوب پھلا پھولا۔ ان میں سے بعض چھتر اور لہڑی میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء اور ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء کے مابین پیدا ہوئے اور ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء میں وفات پائی۔ آپ کی والدہ کا نام باقر بی اور اہلیہ کا نام بی بی حرمت خاتون تھا۔ آپ خلیفہ صاحبڈ نہ قوم لنجار جو آپ کے عم مولوی محمد شریف کے شاگرد تھے اور مخدوم میاں محمد صدیق (گہڑ واری شریف والے) کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ خلیفہ صاحب سے علوم ظاہریہ سے شرح ملا جامی اور ہدایہ فقر کی تعلیم حاصل کی۔

قوم چھپڑ کے ملائے ہراتی نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ وہ صالح شخص تھا۔ اس کے بیٹے ملا فتح محمد اور ملا احمد بھی مرید بنے۔ اب تک ان کی اولاد مرید درگاہ اور خدمت گزار صادق ہے۔

آپ کے دوسرے مریدوں میں سے ملا منگھ قوم براہوئی گرانی کا مقام خاصا بلند تھا۔ وہ صاحب صفا و صائم الدہر تھے۔ ہمیشہ تین ون کا روزہ طیب جو فقیران قادریہ کے طائفہ میں مشہور ہے رکھتے تھے۔ ان کا بیٹا ولی محمد نامی صاحب کا مرید صادق تھا۔ میاں صاحب اسے ولی اللہ کہتے تھے۔ اس کی اولاد موجود ہے۔ اور وہ مرید درگاہ ہے۔

موسم بہار میں میاں صاحب پرانے عارضہ درد گردہ میں مبتلا ہوئے۔ تکلیف بڑھتی گئی۔ چار پانچ روز کے بعد ۶ رجب المرجب ۱۲۳۹ھ روز دوشنبہ وقت چاشت کبریٰ وصیت کرتے ہوئے اور باری تعالیٰ کا ذکر کرتے کرتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

آپ کے تین بیٹے میاں محمد جام، میاں محمد حیات، میاں محمد حسن اور تین بیٹیاں بی بی مائی، آمنہ مائی، خدیجہ بی بی غلام فاطمہ تھیں۔ میاں محمد جام، مائی آمنہ اور مائی خدیجہ کا مولد گھوٹکی اور میاں محمد حسن اور مائی غلام فاطمہ کا مولد کٹبار (کٹک ہال) شریف یعنی گودہ تھا۔ میاں صاحب کی وفات کے بعد ان کے دوسرے بیٹے میاں محمد حیات سجادہ نشین ہوئے۔

میاں محمد حیات: آپ حضرت میاں محمد کامل کے فرزند دوم اور سجادہ نشین تھے۔ کٹبار شریف (گودہ) میں پیدا ہوئے۔ نامور عالم، خوش الحان، قاری اسناد حدیث میں فائق اور عارف کامل تھے۔ مولوی عبدالحلیم کے ساتھ ہی ہم درس رہے۔ مولوی محمود بہاگی اور مولوی نور محمد پنجابی جو مولوی محمود کی وفات کے بعد اپنے استاد کی جگہ پر بھاگ کے مدرس بنے، سے علم حاصل کیا۔

آپ کا جسم درازی قد کی طرف مائل تھا۔ سر کے بال دراز اور کندھوں پر لٹکتے تھے۔ داڑھی سینہ تک تھی۔ بدن کا رنگ گندمی جو سبزی کی طرف مائل تھا۔ آنکھیں کناروں سے سیاہ اور درمیان سے زیادہ سرخ۔ ناک بڑی۔ لباس والد بزرگوار کے مانند ماسوائے اس کے کہ ہمیشہ پگڑی باندھتے تھے۔ اگر پیراہن کہیں سے پھٹ جاتا تو پیوند لگواتے۔ کئی بار لوگوں نے التماس کی کہ نئی قمیض پہنیے لیکن لوگوں کی بات پر عمل کرنے کی بجائے کہتے تھے کہ پیوند والا پیراہن پہننا سنت ہے اور میں سنت ترک نہیں کروں گا۔

میاں محمد اکرم: حضرت میاں محمد کامل کے پوتے اور اپنے والد حضرت میاں محمد حیات کی وفات کے بعد کٹبار شریف میں مسند نشین ہوئے۔ پرہیزگار اور متقی تھے۔ زمینداری کے سب کام کاج آپ ہی کے سپرد تھے۔ موٹے تازے گھوڑے رکھنے کے شوقین تھے۔ کبھی کبھار شکار سے بھی دل بہلاتے تھے۔ این ہمہ دینی امور جن میں صبح کے وقت قرآن پاک کی تلاوت اور دلائل الخیرات کا مطالعہ جوان کے خاندان کے بزرگوں کا معمول تھا، میں کسی قسم کی سستی روا نہ رکھتے تھے۔ اپنی مسجد میں امامت کے فرائض خود انجام دیتے تھے۔ پرہیزگاری اس حد تک تھی کہ نماز کے لئے جدا کپڑے مقرر کر رکھے تھے جو بوقت نماز ہی زیب تن کرتے۔

آپ نے ۲۱ شعبان ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء کو وفات پائی۔ آپ کے بعد آپ کے چچیرے بھائی غلام حیدر سجادہ نشین ہوئے۔

مائی خدیجہ: آپ بڑے میاں صاحب حضرت میاں محمد کامل کی بیٹی تھیں۔ جب میاں صاحب کا قیام گھوٹکی میں تھا، انہی دنوں پیدا ہوئیں، آپ کی شادی مائی نہال خاتون جو حضرت مخدوم کی عقیدت مند اور پارسا خاتون تھی، کے بیٹے سے ہوئی۔ ایک سال کے بعد شوہر فوت ہو گیا اور یہ والد صاحب کے پاس آ گئیں۔

آپ نے طریقہ قادریہ کو اپنایا اور اپنی والدہ ماجدہ کی صحبت میں رہ کر تکمیل سلوک کی اور حالات و مقامات کی والی بنیں۔ عبادت گزار اور تقویٰ شعار خاتون تھیں۔

آپ کے بھائی میاں محمد حیات جس کام کی ابتداء کرنا چاہتے پہلے آپ سے مشورہ کرتے۔ اکثر اوقات مریدوں کو بھی تلقین کرنے کے سلسلے میں بی بی صاحبہ سے مدد مانگتے اور کہتے "فیض تمہاری جانب سے ہے"۔

بی بی صاحبہ نے فرمایا تھا کہ جو کوئی عشاء کی نماز کے وتروں اور سنتوں کے مابین پانچ سو بار پڑھے گا۔

یا اللہ یا رب یا رحمان یا رحیم یا حی یا قیوم و برحمتک استغیث یا اللہ

اس کے دل پر بہت سی باتوں کا انکشاف ہوگا۔ پڑھتے ہوئے آسمان سے ندا اور فرشتہ غیبی کی آواز آئے گی۔ اس کے علاوہ وہ معاش کے سلسلے میں تنگی اور پریشانی نہیں دیکھے گا۔

بی بی صاحبہ کی وفات کے بعد جناب میاں محمد حسن اور دوسرے صاحبزادگان ہر مشکل کے وقت مزار شریف پر جا کر دعا کرتے تھے۔ یہ فیض اب تک جاری ہے۔

حضرت میاں محمد حسن: آپ حضرت میاں محمد کامل کے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء میں کٹبار شریف (گودہ) میں پیدا ہوئے۔ بچپن کی بات ہے کہ ایک روز آپ زرد رنگ کی لنگی پہنے گھر میں بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کے والد تشریف لے آئے۔ آپ کا یہ حال دیکھ کر جلال میں آ گئے۔ آپ کو اپنے پاس بلایا اور عصا اٹھا کر غصے کا اظہار فرمایا کر کہنے لگے کہ میں تو اس خیال میں تھا کہ اپنی گدڑی (یعنی فقر) تیرے کندھوں پر رکھوں اور تو لنگی باندھنے لگا ہے۔ اس روز سے میاں محمد حسن نے لنگی باندھنا چھوڑ دیا۔ پہلے سفید پگڑی کو پسند فرمایا پھر ٹوپی پہننے لگے۔

آپ نے علوم ظاہری کے سلسلہ میں فارسی کی تمام درسی کتب اور فقہ کے بعض رسائل پڑھے۔ مثنوی شریف، دیوان خواجہ حافظ اور بوستان سعدی کے داستانیں یاد تھیں جنہیں آپ گاہے بگاہے خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔

آپ اپنے والد بزرگوار اور اپنے بھائی میاں محمد حیات کی زندگی میں اپنے خادموں کے ہمراہ کھیتی باڑی کے کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ عبادت اور ریاضت میں بھی سرگرم عمل تھے۔ آپ اپنے والد بزرگوار کی طرح پورے تین ماہ تک پیر معز الدین شاہ (شہر لہڑی) کے مزار پر اپنی باطنی ترقی اور درجات کی بلندی کے لیے دعا مانگتے رہے۔

آپ کی عادت تھی کہ شکر و مستی کی حالت، کثرت وظائف اور کلمہ لا الہ لا اللہ کی ضرب لگاتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے تھے مثلاً اگر گھر میں ہوتے تو مسجد میں آ جاتے۔ اس کیفیت کے دوران میں آپ کے ہاتھ میں عصا ہوتا تھا۔ لوگ عصا کے ڈر سے ادھر ادھر ہو جاتے۔ آپ کہتے کہ اس حالت میں جس کسی کو ہمارا عصا لگ جائے اسے یقیناً صفائی قلب حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ چند صاحبان اسی سے صاحب صفا بنے۔ کبھی مستی کی حالت میں آپ کی زبان مبارک بند رہتی۔ نماز اور ذکر کے کام جاری رہتے لیکن گفتگو بالکل نہ ہوتی۔ کبھی حالت مستی میں پہلے لفظ "عالم الغیب" "واجب الوجود" کہتے پھر دوسرے الفاظ زبان پر لاتے جو علماء و فضلا کے فہم میں نہ آتے۔ "واہ جی، واہ جی" بہت کہتے تھے۔ اللہ کے نام کی ضرب اونچی آواز سے لگاتے تھے۔ بڑھاپے میں خود مولود اور کافی پڑھنے کے دوران وجد و مستی میں ڈوب جاتے۔ اکثر راتوں کو حاضرین مجلس پر روشنی کی کرنیں بکھر جاتیں اور دیواریں روشن ہو جاتی تھیں۔

ماہ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں بندش بول کا عارضہ ہوا۔ علاج کرتے

تھے اور یہ کافی پڑھتے تھے:

اھنج اوکھیوں عاشقن دی محبّ مہمانیوں مکا
سور سختیوں سالکن دی محبّ مہمانیوں مکا

اس بیماری میں دو تین دن گزر گئے۔ ایک رات جب تکلیف نے شدت اختیار کی تو صاحب زادوں نے مولوی نور محمد اور دوسرے مخلص احباب کو اندر بلایا مولوی صاحب کو دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ یہ صاحب زادے آپ کے شاگرد ہیں، اب آپ کے سپرد ہیں۔ مولوی صاحب کہنے لگے۔ "جناب مجھے ان کے سپرد کیجئے۔" جواب دیا" آپ کو کسی کے سپرد کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ خود ان کے استاد ہیں" پھر فرمانے لگے "الحمدللہ فرزندانم قابل و در تمامی حقائق معارف و دقائق عوارف ماہر اند" بعد ازاں آپ کا چھوٹا بیٹا اپنی جگہ سے اٹھا اور پائے مبارک سر پر رکھ کر التماس کی کہ میں بہت عاجز ہوں۔ وفات کے بعد بھی میرے مددگار رہیے۔ میاں صاحب نے دلداری فرماتے ہوئے کہا" اگر خدا تعالیٰ نے مجھے توفیق دی تو انشاءاللہ تعالیٰ تمہارا مددگار رہوں گا۔" یہ کہہ کر وصیت فرمائی کہ "میری وفات کے بعد میرے چہرے کو لوگوں کے سامنے نہ کھولنا کیونکہ خداوند پاک میت کے حال سے آگاہ ہے مبادا حالت دگرگوں ہو، اس لیے اخفا بہتر ہے۔ نیز اس سیاہ چادر کو میرے سر پر ڈال دینا جو بھاگ شہر سے نیا رنگ ہو کر آئی ہے تا کہ اس دنیا سے سیاہ رو جاؤں"۔ بعد وعظ و نصیحت کرتے اور باری تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے دوشنبہ ۲۷ ذیعقدہ ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء کو وفات پا گئے آپ کی عمر ۷۶ سال تھی۔

مولوی میاں محمد حسن: آپ میاں تاج محمد کے فرزند اکبر تھے اور اپنے والد بزرگوار کی رحلت کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ آپ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔

آپ نے قرآن مجید کی تعلیم طاہڑہ کٹبار سے حاصل کی۔ فارسی کی درسی کتب اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ تین ماہ تک مٹھڑی میں مولوی گل محمد شہداد پوری سے جو سردار محمد اسداللہ خاں رئیسانی کے پاس عہدہ قضا پر متعین تھے، استفادہ کیا۔ صرف شرح ملا جامی و ملا عبدالغفور حافظ علی مراد سے پڑھیں۔ حافظ صاحب نابینا ہونے کے باوجود درسی کتب میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ منتہی درجے کی کتب مولوی محمد ہاشم ساکن گڑھی یاسین سے زیر مطالعہ آئیں۔ انہی کے ہاتھوں آپ کی دستار بندی ہوئی۔

آپ روحانی فیوض کے علاوہ دینوی امور میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ اچھی خواک اور اچھی پوشاک سے رغبت تھی۔ مہمان نوازی کے لئے مشہور تھے۔ ان کا کمرہ ہمیشہ مہمانوں سے پر رہتا تھا۔ کٹبار کی بڑی مسجد جس کی نظیر لہڑی اور ناڑی کے علاقوں میں نہیں ملتی، اپنی کوشش سے بنوائی۔ لہڑی کے قریب رفاہ عام کی غرض سے اپنی جیب خاص سے ہزاروں روپے خرچ کر کے بند بنوایا تا کہ لوگ اپنی زمینوں کو آباد کر سکیں۔

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

آپ کو طب یونانی سے پوری واقفیت تھی اور اس فن میں کامل تھے۔ جس سے خلق خدا مستفید ہوتی رہتی تھی آپ نے علم فقہ سے متعلق چند رسائل بھی تصنیف کئے عنفوان شباب میں کچھ عرصہ تک درس و تدریس میں بھی مصروف رہے جو حضرات آپ سے مستفیض ہوئے ان میں مولانا حاجی عبدالستار اور مولوی خدا بخش لہائی زیادہ مشہور ہیں۔ کچھی و سندھ کے آس پاس کے لوگ آپ کے سرمایہ علمی سے بالواسطہ اور بلاواسطہ بہرہ یاب ہوتے رہتے ہیں۔

آپ نے چہار شنبہ ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء کو دار فانی سے اقلیم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔

میاں محمد پناہ: آپ میاں تاج محمد کے فرزند خردمند تھے۔ آپ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے آپ نے فارسی کی درسی کتب مولوی خدا بخش لہائی سے پڑھیں اور باقی تعلیم صرف بہائی سے توضیحات تک مولانا حاجی عبدالستار قوم بغداد ساکن عمر پور سے حاصل۔ کتب شرعیہ کا بھی خاصا مطالعہ کیا۔ منقول و معقول خاص کر علم تصوف میں درجہ کمال تک پہنچے۔ صاحب ذوق و شوق اور مرجع خواص و عام تھے۔ بحر عشق محمدی میں سر سے پاؤں تک غرق رہے۔

آپ نے اپنے بیٹوں حاجی میاں تاج محمد اور میاں احمد شاہ مٹھڑی کو اشارہ کے ذریعے اپنی وفات کے بارے میں بتا دیا تھا۔ دس روز تک بیمار رہے۔ اسی دوران میں اپنے فرزند اکبر کو وصیت کی تھی کہ میری نیت تھی کہ میں حج کرنے جاؤں مگر اب تک یہ نیت پوری نہیں ہوئی۔ یوں تو حیات و ممات اللہ تعالیٰ کے بس میں ہے، ویسے میرے بعد حج خیر کرا دینا۔ حج خیر فقہاء کرام کے نزدیک جائز ہے۔ چند باتیں خانگی امور کے بارے میں بھی کہیں۔ آپ کی رحلت کے بعد حاجی عبدالغنی پسر حاجی غلام محمد کھوسہ ساکن شاہی واہ کے ذریعے سے ادا ہوا۔

وفا سے چار پانچ روز پیشتر آپ نے دو تین گائیں اور دو بھیڑیں فی سبیل اللہ ذبح کرائیں ایک بکرا بھی ذبح کرایا۔ اس کا گوشت اسی طرح رکھوا دیا کہا اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔ عشاء کی نماز کے بعد سردار بہادر نواب میر محمد اسداللہ خان اپنے دوسرے افراد خاندان یعنی میر تاج محمد خان، میر محمد بخش خان، میر محمد اکبر

خان اور قاضی یار محمد کے ہمراہ آپ کی زیارت اور مزاج پرسی کے لیے آئے۔ اس وقت آپ نے اس گوشت کو پکانے کا ارشاد فرمایا۔ ملاقات کے بعد نواب رئیسانی اور قاضی صاحب کی جانب متوجہ ہو کر کہا "آپ تشریف لائے بہت اچھا کیا۔ میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ شاید یہ وقت اخیر ہو۔"

محمد اللہ پیر: آپ کا مقبرہ بھاگ سے ۱۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ دو صدی قبل پنجاب سے تشریف لائے تھے۔

موج دین پیر: حضرت غوث بہاء الحق کے نسب کے سلسلے سے ہیں۔ بھاگ میں مزار ہے۔

موسیٰ شیخ: شاہرگ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر آپ کا مقبرہ ہے۔ شاہرگ کی زمینوں کو سیراب کرنے والا چشمہ آپ کی کرامت سے پھوٹا تھا۔

نانی کا مقبرہ: ہنگلاج جو دریائے ہنگول کے کناروں پر واقع ہے۔ میں ایک زیارت گاہ ہے جس کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وہ پاروتی یعنی کالی دیوی یا ماتا دیوی کا مزار ہے۔ مسلمان بھی اس کو صدیوں سے متبرک سمجھتے ہیں، دونوں مذاہب کے پیرو۔

جسمانی کھیل تماشے

لڑکوں کے کھیل: ذیل میں لڑکوں کے بعض معروف و مخصوص کھیلوں کا تعارف دیا جاتا ہے جو ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوی نے اپنی تصنیف "براہوی نامہ" میں بیان کئے ہیں۔

اشٹاپو: اس کھیل میں زمین پر مستطیل بنا کر اسے کئی خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پھر کھلاڑی کسی خانے میں ٹھیکری پھینک دیتا ہے۔ پھر ایک پاؤں کو اوپر کر کے دوسرے پاؤں کی ٹھوکر سے ٹھیکری کو مارتا رہتا ہے۔ اس طرح ٹھیکری کو خانوں سے باہر نکالتا ہے۔

برف گوازی: یہ کھیل موسم سرما میں اس وقت کھیلا جاتا ہے جب برف پڑتی ہے۔ برف پڑتے ہی بچے جوان گھروں سے باہر نکل آتے ہیں اور برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے پر پھینکتے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کو بھی نشانہ بنایا جاتا ہے۔ خوب ہنسی مذاق ہوتا ہے۔

پیرامپ گوازی: فلاخن کا یہ کھیل نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ بچے میدان میں جمع ہو کر نشانہ کی طرف فلاخن سے پتھر پھینکتے رہتے ہیں۔ یہ شغل کافی دیر تک جاری رہتا ہے۔

پومپ گوازی: کپڑے کو گول بنا کر گیند بنایا جاتا ہے۔ اسے پوتہ بھی کہتے ہیں۔ بچے اس پومپ (پوتہ) کو پاؤں سے ایک دوسرے کی طرف پھینکتے رہتے ہیں۔ اس میں گول نہیں ہوتا ہے۔

خایہ جنگ تنگ: یہ کھیل تہواروں کے موقع پر کھیلا جاتا ہے۔ انڈوں کو مختلف قسم کا رنگ دیا جاتا ہے پھر ان انڈوں کے سروں کو آہستہ آہستہ مارا جاتا ہے۔ جس کا انڈا ٹوٹ جائے وہ ہار جاتا ہے اور اس انڈے کو جیتنے والے کے حوالے دیتا ہے۔

کھڈک: یہ کھیل براہوی بچوں کا پسندیدہ کھیل شروع ہونے سے پہلے بارہ چھوٹے چھوٹے گڑھے بنائے جاتے ہیں۔ لنڈی نام کے کھڈوں میں بھیڑ یا بکری کی ایک ایک مینگنی، ڈائنٹیر میں دس دس اور باقی چار کھڈوں میں پانچ پانچ مینگیاں ڈالی جاتی ہیں اس کھیل میں تین چار بچے حصہ لیتے ہیں۔ اگر کبھی دو بچے ہوں تو لنڈی والا خانہ نہیں بناتے ہیں۔ اگر چار بچے ہوں تو لنڈی والے خانے کو بناتے ہیں۔ اور اگر تین بچے ہوں، تو لنڈی کا ایک خانہ بنایا جاتا ہے۔ کھیل کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے کہ ایک فریق اپنی طرف کے ڈائنٹیر نامی کھڈے سے کھیل کا آغاز کرتا ہے اور اس میں سے مینگیاں اٹھا کر اگلی سمت کے ہر ایک کھڈے میں ایک ایک دانہ ڈالتا ہے۔ اس کھیل میں جیت اس کی ہوتی ہے جو زیادہ مینگیاں جیتے۔

مینگنی کے دانے اس طرح جیتے جاتے ہیں کہ مینگنی کے دانے ڈالتے وقت اگر یہ دانے اس کھڈے پر جا کر ختم ہوں جس سے اگلا کھڈا بالکل خالی ہو تو کھیلنے والے بچے اس خالی کھڈے میں انگلی مار کر اگلے کھڈے کے تمام دانے اٹھا لیتا ہے۔ یہ اس کے جیتے ہوئے دانے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا کھلاڑی کھیل کھیلتا ہے۔ اگر کھیل کے دوران کھلاڑی کے سامنے متواتر دو خالی کھڈے آ جائیں تو یہ بازی خالی جاتی ہے۔ پھر دوسرا کھلاڑی کھیل شروع کرتا ہے۔ اس کھیل کے لیے یہ شرط لازمی ہے کہ کھلاڑی اس کھیل کے تمام اصولوں سے واقف ہو۔ نہیں تو اسے کھیلنے نہیں دیا جاتا ہے۔

اس کھیل کے چند ایک اہم اصول اور بھی ہیں۔ مثلاً کھیل کے دوران خالی شدہ کھڈے میں دوبارہ مینگنیاں پڑ جائیں اور وہ چار ہو جائیں، تو اس کو اس کھیل کی اصطلاح میں "ہینوک" کہا جاتا ہے۔ اور چاروں مینگنیاں اس کا مالک اٹھائے گا۔ نیز اگر کھیل کے دوران لنڈی کے کھڈے میں سے دانے اٹھانے پڑیں تو باقیوں کو چھوڑ کر وہی نشان کردہ دانہ اٹھایا جائے گا۔ اور اگلے کھڈے میں بحیثیت ایک دانہ کے رکھا جائے گا۔ اس طرح جب کھیل ختم ہوگا، تو جس کے حصے میں وہ نشان شدہ دانہ آئے گا اس کو اس کا مالک عام قسم کی دس مینگنیاں دے کر واپس

حاصل کرے گا۔

اگر کھیل کے دوران کسی کھلاڑی کے پاس مینگنیاں کم رہ جائیں تو اس کی طرف کے کھڈوں میں سے اتنے کو مٹی ڈال کر بند کر دیتے ہیں۔ البتہ اگلے کھیل میں اگر اس کے جیتے ہوئے دانے زیادہ ہو جائیں تو اس حساب سے وہ اپنی طرف سے کھڈوں میں سے اتنے ہی کھڈے کھول سکتا ہے۔ اس کھیل میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ اگر کسی کھیلنے والے کے پاس دانے کم رہ جائیں تو وہ دوسروں سے اتنے دانے بطور اشتراک لے کر اس کھڈے کے دانوں کو حساب کر کے آپس میں اسی تناسب سے بانٹ لیتے ہیں۔ جس تناسب سے کہ ہر ایک کھلاڑی نے دانے ڈالے تھے۔ اس طرح یہ کھیل چلتا رہتا ہے۔ جب دونوں فریق میں سے (لنڈی والے کھلاڑی فریق شمار نہیں ہوتے اور نہ ان کو کھیلنے کا حق ہوتا ہے۔ وہ صرف ہار جیت میں حصہ دار ہوتے ہیں) ایک بالکل ہار جائے۔ اس کے پاس اپنے ایک کھڈے میں بھی ڈالنیکے لیے دانہ نہ بچیں تو کھیل ختم تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ مشترکہ کھڈے کے گرد لکیر کھینچ کر نشان بنا دیا جاتا ہے۔ اس کے دانے بھی کھیل کے دوران کوئی نہیں اٹھا سکتا۔

اس کا نقشہ کچھ یوں بنتا ہے۔

		ڈاہنٹر		فریق دوم	
	۱۰	۵	۵	۵	۵
لنڈی					لنڈی
ا					
	۵	۵	۵	۵	۱۰
	فریق اول	ڈاہنٹر			

"ہرف" (اٹھا) "گچیں لر" (انتخاب کر) پس جس انگلی پر جس بڑے ساتھی نے ہاتھ رکھا، اسی کو اپنایا ہوا کھلاڑی لڑکا اس کی طرف کا ہوگا۔ اسی طرح باری باری ہر بڑا لڑکا ان میں سے ایک کا انتخاب کر لیتا ہے۔ جب اس طرح تمام کھیلنے والے ساتھیوں کا انتخاب مکمل کر لیا جاتا ہے تو اس کے بعد کھیل شروع کیا جاتا ہے۔ اگر کھیل کھیلنے کے لیے آئے ہوئے ساتھیوں میں سے ایک رہ جائے، اور اس کا کوئی جوڑ باقی نہ رہے تو اس کو "ہرواری" کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ ایک ایک کھیل ہر پارٹی کی طرف سے کھیلتا ہے مگر اس کے لئے عام طور پر یہ لازم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک طرف کا انتخاب کرے یعنی باہر رہ کر کھیلے یا اندر کے گروپ میں رہ کر کھیلے۔

اس کھیل کے کھیلنے کا طریقہ یہ ہے کہ کھیلنے والوں میں سے فیصلہ کے مطابق جو عموماً ٹاس (تیر) کی صورت میں کیا جاتا ہے ایک گروپ باہر سے کھیلنے لگتا ہے۔ اور دوسرا گروپ مجمع بنا کر کھڑا رہتا ہے۔ باہر والوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مجمع کئے ہوئے کھلاڑیوں میں سے صرف ایک کو ناگمان یا زبردستی ہاتھ لگا کر بھاگ جائیں اور مجمع کئے ہوئے کھلاڑیوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ باہر سے کھیلنے والے ساتھیوں میں سے صرف ایک کو ہاتھ مارنے کے لیے حملہ آور ہوتے وقت یا کسی اور حالت میں جبکہ وہ کھیل رہا ہو پکڑ لیا جائے۔ اسطرح جو بھی اپنے ارادہ میں کامیاب ہو اس کی جیت تصور کی جائے گی اور مخالف گروپ کا کھلاڑی شکست خوردہ قرار دے کر بٹھا دیا جاتا ہے۔

چونکہ باہر سے گھومنے والا اکثر چوری چھپے مجمع بنائے ہوئے کھلاڑیوں میں سے کسی ایک کو مار کر بھاگنے میں کامیاب ہوتا ہے تو اس لئے یہ لازمی ہے کہ اپنی کامیابی کی خوشی میں اور کھیلنے والوں کی آگاہی کے لیے زور زور سے "واری، واری" کا نعرہ لگاتا ہوا اس خیال سے دور تک بھاگتا جاتا ہے کہ مبادا پیچھے سے مخالف گروپ کا کوئی کھلاڑی آ کر اس کو پکڑ لے۔ کیونکہ اس طرح پکڑے جانے کی صورت میں پکڑنے والا مخالف سمت والوں میں چاہے کوئی بھی ہو اس کی اپنی کامیابی تو ختم ہو جاتی ہے الٹا وہ مغلوب قرار دے کر بٹھا دیا جاتا ہے۔

اس طرح باہر کا فریق یہی کوشش جاری رکھتا ہے کہ مجمع بنائے ہوئے کھلاڑیوں میں سے ہر ایک کو ہاتھ مار کر باری باری بٹھا دیا جاتا ہے۔ اور ان کے برخلاف مجمع کئے ہوئے (موڑی تفوک آ) گروپ کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ باہر والوں (چھڑ موڑی آتہ) کو ایک ایک کر کے باری باری پکڑ کے بٹھا دیا جائے، تاکہ کامیابی ہماری ہو۔ جس فریق نے دوسرے فریق کے کھلاڑیوں کو شکست دے کر بٹھا دیا، جیت اس کی شمار ہوگی۔ اس کھیل میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کھیل کے دوران ایک فریق کا اگر کوئی کھلاڑی پکڑ کر یا ہاتھ مار کر شکست خوردہ قرار دیا گیا، تو مخالف فریق کے ہار کر بیٹھے ہوئے کھلاڑی کے تبادلہ میں دوبارہ کھیلے گا۔ یعنی اس شکست کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تو کھیلتا رہے گا۔ البتہ مخالف گروپ کا ایک شکست خوردہ ساتھی جس کا ہارے ہوئے فریق میں پہلا نمبر ہو۔ اٹھ کر کھیلنے لگ جائے۔

الغرض اس کھیل میں اس گروپ کے کھلاڑی بٹھا دیئے جاتے ہیں جس کے پاس اپنا بانس یعنی اپنے سے مخالف گروپ میں سے شکست دادہ افراد نہ ہوں۔ جن کو انہوں نے شکست دی ہوتی ہے۔ اس طرح ہار جیت کے کئی کھیل ہوں گے اور تین چار گھنٹے تک "واری واری" کا یہ کھیل جاری رہ کر بعد میں ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد "بھلا جفت" آپس میں حساب کرتے ہیں کہ جیت کس پارٹی کی ہوئی۔ ظاہر ہے کہ جس پارٹی نے زیادہ کھیل جیتے ہیں، جیت اس کی ہوتی ہے۔ اس "ہو" یا "واری واری" کھیل کے میچ

بھی ہوتے ہیں جن کا دائرہ گوٹھ قبیلہ یا علاقوں تک پھیلا دیا جاتا ہے۔ ایسے کھیلوں کے لیے عام طور پر جمعہ کا دن اور شام کو ٹائم مقرر ہوتا ہے جس میں علاقہ کے معتبر (سردار) قبیلہ کے معتبر (نکری) اور گوٹھ کے مقدم تک بطور تماش بین اور منصف کے حصے لیتے ہیں۔ لکیر کھینچ کر نشان بنایا جاتا ہے۔ اس کے دانے بھی کھیل کے دوران کوئی نہیں اٹھا سکتا ہے۔

لیک لیک باران: اس کھیل میں دونوں ٹیموں کے کھلاڑی ایک دوسرے سے آنکھ بچا کر کوئلے یا کسی اور چیز سے دیواروں، دروازوں، کھڑکیوں وغیرہ پر لکیریں کھینچتے ہیں۔ جس ٹیم کے کھلاڑی دوسری ٹیم کی زیادہ لکیریں دریافت کریں تو وہ جیت جاتے ہیں۔

ترنگ/ڈی تول/ریک ٹانگی: اس کھیل میں ایک کھلاڑی پاؤں کے بل کھڑا ہو کر پاؤں کے انگوٹھے کو ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے مدمقابل پر وار کر کے اسے پچھاڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ دوسرا کھلاڑی بھی اس طرح ایک پاؤں کے بل کھڑا ہو کر مقابلہ کرتا ہے۔

خن توری/مڑ چک بڑ چک: یہ ایک مشہور کھیل ہے جسے نہ صرف براہوئی بچے کھیلتے ہیں بلکہ دوسرے بچے بھی کھیلتے ہیں۔ اردو میں اسے آنکھ مچولی کہتے ہیں۔

گرگٹ: کھجور کی گٹھلیوں کا کھیل۔ اس کھیل میں گٹھلیوں کو ایک قطار میں رکھ دیا جاتا ہے اور مخالف کھلاڑی ایک دوسری گٹھلی کو انگلی سے مار کر قطار میں سے گٹھلیوں کو جدا کرتا ہے۔ جس قدر گٹھلیوں کو جدا کر سکے ان کو جیت جاتا ہے۔

میل بھٹکو: یہ کھیل چاندنی راتوں میں کھیلا جاتا ہے۔ پہلے چند بچے جمع ہو کر نرم اور ریتلی زمین پر ہاتھ کی ہتھیلی سے مٹی کے نشانات بناتے جاتے ہیں۔ ان کو بھٹکو یعنی چھوٹا ٹیلا کہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بھٹکو (چھوٹا ٹیلا) کو میل (بھیڑ) فرض کر لیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کو خاص اہمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے اور ان پر نشان لگائے جاتے ہیں اور ان کے نام بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ بھیڑ فلاں نسل کی، اور ان خوبیوں سے متصف ہے۔ خوب صورت برہ ہے جسے گش کہتے ہیں۔ جو بڑا ہو کر نامور مینڈھ بن جائیگا۔ اس کے بعد ان بچوں میں سے کچھ تو مالک قرار پاتے ہیں۔ کچھ محافظ اور چند ایک ہمسایہ۔ دوسرے فریق کی طرف سے چند ایک بھیڑیئے، گیدڑ یا چور قرار دیئے جاتے ہیں۔ اس تقسیم کے بعد کھیل کی ابتداء ہوتی ہے۔ ہر بچہ اپنے فرائض کی تکمیل میں بھرپور کوشش کرتا ہے چنانچہ کافی رات گئے تک یہ کھیل جاری رہتا ہے۔

گورہلمہ: بچوں کی دوڑ کو براہوئی میں گورہلمہ کہتے ہیں۔ بچے ایک جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور اشارہ ملتے ہی دوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ تیسرے نمبر تک آنے والا جیت جاتا ہے۔ باقی ہار جاتے ہیں۔

الہ لولی الہ داد: اس کھیل میں دو گروپ ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد معین نہیں ہوتی ہے۔ دونوں کے پاس ایسے رسے اور کپڑے کی چادریں ہوتی ہیں جن کے سروں کو گرہ دیا ہوتا ہے۔ کھیل شروع کرنے سے پیشتر ٹاس ڈالا جاتا ہے۔ جیتنے والی پارٹی کا لیڈر دوسری پارٹی کے لیڈر کی آنکھوں کو اپنی ہتھیلیوں سے بند کر کے اپنی پارٹی سے چھپ جانے کو کہتا ہے۔ جب اس کے ساتھی چھپ جاتے ہیں تو دوسری پارٹی کا لیڈر اپنے ساتھیوں کو اس طرح دائرے میں بٹھاتا ہے کہ ان کے بیچ میں کوئی دوسرا نہ بیٹھ سکے۔ اب یہ لیڈر پہلی پارٹی کے لیڈر کے ہمراہ چھپے کی تلاش میں جاتا ہے۔ اگر اس نے ان کو دیکھ لیا تو بھاگتا ہوا اپنی پارٹی کی طرف آتا ہے اور اگر کہیں اور نکل گیا تو دوسری پارٹی والے پہنچ کر اس کی پارٹی کے لوگوں کو رسوں اور چادروں سے مارنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ لوگ زور زور سے الہ لولی الہ داد پکارتے رہتے ہیں۔ یہ آواز سن کر ان کا لیڈر فوراً پہنچ جاتا ہے اور ایک رسے کو جس کا ایک سرا اس کی پارٹی والوں کے پاس ہوتا ہے پکڑ کر ان کے اردگرد گھومتا رہتا ہے تاکہ حملہ آور پارٹی کا وار رد کیا جائے۔ اس دوران اگر اس کا پاؤں حملہ آوروں میں سے کسی کو لگ جائے تو ان کو اس طرح بیٹھنا ہوگا اور پھر اس طرح کھیل کا آغاز ہوگا۔

ٹیلو: اس کھیل میں دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔ کھلاڑیوں کی کوئی خاص تعداد مقرر نہیں ہوتی ہے۔ ٹاس ڈال کر کھیل کا آغاز کیا جاتا ہے، جیتنے والی ٹیم ہارنے والی ٹیم سے کہتی ہے کہ فلاں درخت مثلاً انگور، انار، سیب، شفتالو وغیرہ کا پتہ لے آؤ۔ وہ ٹیم پتہ لینے کے لیے جاتی ہے اور یہ لوگ چھپ جاتے ہیں۔ جب پتہ توڑ کر وہ آجاتے ہیں تو ان کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی نظر آجائے تو اس کو پکڑ کر ٹیلو ٹیلو پکارتے ہیں۔ یہ آواز سن کر اس کے چھپے ہوئے ساتھی آکر پتہ دیکھتے ہیں کہ واقعی اس درخت کا پتہ ہے جس کے لیے ہم نے کہا تھا۔ اب ان کی باری ہوتی ہے کہ کوئی پتہ لائیں۔ یہ کھیل رات کے وقت کھیلا جاتا ہے۔

اشیاء کھیل

بجل یا بیڈی: چوپایوں کے گھٹنے یا ٹخنے کی ہڈی:

ارغند/اینٹ: وہ بجل جس سے کھلاڑی دوسرے بجلوں کو مارتا ہے۔

بد/خر: بجل کا سیدھا حصہ اسپ کہلاتا ہے لیکن الٹے حصے کو خر کہتے ہیں۔ اس کو

بد بھی کہتے ہیں۔

بیٹ: اس کھیل میں ایک دائرہ کھینچا جاتا ہے۔ ایک کھلاڑی بیڈیوں کو ہاتھ میں لے کر پھینکتا ہے۔ اس میں سے اگر ایک "اسپ" آ جائے تو تمام چک والی بجلوں کو جیت لیتا ہے۔ اگر خر آ جائے تو تمام پک شکل والی بجلوں کو جیت لیتا ہے۔ چک پوزیشن والی بیڈیوں کو نشانہ بنا کر دائرے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب ایک ایک آ جائے اور باقی سب چک آ جائیں تو پک کا کھلاڑی دوسری بیڈیوں کو نشانہ بنا کر دائرہ سے باہر نکالنے کی کوشش کرے گا اگر دو خر یا دو اسپ آ جائیں اور خر آ جائیں تو پھر دوبارہ بجلوں کو کھیل کے میدان میں پھینکا جاتا ہے۔ اگر تین پک اور ایک چک آ جائیں تو پھر چک کی پوزیشن مضبوط ہے اور اس کا کھلاڑی نشانہ بنا کر دوسری بجلوں کو دائرے سے باہر نکال دیتا ہے۔ اس طرح وہ جیت جاتا ہے۔ اگر باہر نہ نکال سکا تو وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ اگر مارتے وقت دائرے کے اندر کسی چک کو پک کرے تو پھر جیت جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کو دائرے سے باہر نکال دے۔ اگر خر آ جائے تو پک شکل اختیار کرنے والوں کو جیت جاتا ہے۔ اگر اسپ آ جائے تو چک شکل اختیار کرنیوالوں کو جیت جاتا ہے۔ جب کھلاڑی بیڈی کو مار کر دائرے سے نکال دیتا ہے۔ کھلاڑی جیت جاتا ہے بشرطیکہ دونوں بیڈیاں دائرے سے باہر نکل آئیں۔

پک: بجل کا وہ حصہ جس میں اس کی سینگیں آسمان کی طرف ہوں۔ پک کہلاتا ہے۔

چک: بجل کا وہ حصہ جب اس کی سینگیں زمین کی طرف ہوں۔

چور: جب بجل کا کھیل کھیلا جا رہا ہو۔ اور اس وقت کوئی "چور" کہہ کر کھلاڑیوں کے دائرے سے جس قدر بجل اٹھائے وہ اس سے واپسی کا تقاضا نہیں کرتے ہیں۔ اگر کھلاڑیوں نے دیکھا کہ کوئی چوری کرنے آ رہا ہے، تو وہ پہلے ہی سے چور کہہ دیتے ہیں۔ اس طرح نیا آنے والا پھر چور نہیں کہہ سکتا ہے۔

چیت: جب بجل کو اینٹ پتھر وغیرہ سے رگڑ کر ہموار سا کر دیا جاتا ہے تو پھر وہ چیت کہلاتا ہے اور یہ عمل چیت کننگ (کرنا) کہلایا جاتا ہے۔ وہ بیڈی جس کو رگڑ رگڑ کر ایسا پھسلن بنا دیا ہے۔

ختک: جب بجل زمین پر گرا ہو اور اگر کھلاڑی بڑی انگلی کے اشارے سے اس کو اٹھانے کی کوشش کرے تو وہ ختک کہلاتا ہے۔

خراچ: بجلوں کے اس کھیل میں کھلاڑی اپنے اپنے بجلوں کو میدان میں پھینک دیتے ہیں۔ ان میں سے جس کا بجل "اسپ" کی شکل میں آ جائے تو اس کی پہلی پوزیشن "خر" والے کی دوسری، پک تیسری اور چک کی چوتھی پوزیشن ہوگی۔ مقررہ جگہ سے "اسپ" والا دائرے کے اندر موجود بجلوں کو مارتا ہے اور جتنے بجلوں کو گرا دیتا ہے اس میں سے "ارغند" جس شکل میں ہو۔ اس شکل میں ہونے والے دوسرے بجلوں کو جیت لیتا ہے۔ اگر مارتے وقت "ارغند" خر کی شکل اختیار کرے، تو سب بجلوں کو سوائے "اسپ" شکل کے جیت جاتا ہے۔

خیر شیر: اگر مارتے وقت دو ہڑ دو ہوں اور بیٹ کے اندر تین بیڈیاں ہوں، تو خیر شیر کہلاتا ہے۔ اگر بیٹ میں چار بیڈیاں ہوں ان میں سے تین چک اور ایک پک ہو، تو پک والا اس بیڈی کو نشانہ بنائے گا۔ جو اس کے نزدیک ہو، اور دونوں بیٹ سے نکل جائیں تو بیٹ سے باہر نکلی ہوئی بیڈیوں کو اندر والی بیڈیوں کے مالک برابر بانٹ دیں گے۔

دوسر: یہ جوئے کا کھیل ہے۔ اس میں ایک بجل کو رنگ دیتے ہیں۔ یہ رنگدار بجل "دوسر" کہلاتا ہے۔ اس کھیل میں کل چار بجل استعمال کئے جاتے ہیں۔ بجل پھینکتے وقت اگر "دوسر" اسپ یا خر آ جائے تو اس کی پوزیشن دگنی ہو جاتی ہے۔ اگر چک یا پک آ جائے تو اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ہے۔

بڑ دور مون پسے اڑ دو: اگر کھلاڑی نے مون پسے (روپے) اڑ دو کہا تو کسی بھی بیڈی کو نشانہ بنا سکتا ہے۔

سلی: کھیل شروع کرنے سے پہلے کھلاڑی چند بیڈیوں کو ایک قطار میں رکھ دیتے ہیں اور درمیان والی بیڈی کے اوپر ایک اور بیڈی رکھ دیتے ہیں۔ یہ بیڈی سلی کہلاتی ہے۔ اس مناسبت سے اس کھیل کا نام سلی رکھا گیا ہے۔ اب کھلاڑی ارغند سے سلی کو مارتا ہے۔ اگر اس نے اس کو دائرے سے باہر نکال دیا تو کھیل جیت گیا۔ اور تمام بجل اس کے ہو گئے۔ اگر سلی نہ نکلے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا بجل نکلے، تو وہ لگاتار اس وقت تک مارتا رہے گا۔ جب تک وہ نکالتا رہے۔

سبرو: لکیروں سے ایک مستطیل شکل بنائی جاتی ہے۔ اس مستطیل کے درمیان میں بیڈیوں کو رکھا جاتا ہے۔ پھر مقررہ جگہ سے کھلاڑی ارغند سے ان کو مارتا ہے۔ اگر مستطیل سے ایک یا زیادہ بجلوں کو باہر نکالا تو ان کو جیت لیا۔ اب اینٹ (اینٹی/ارغند) جہاں گری ہے کھلاڑی وہاں سے پھر مستطیل میں رکھے ہوئے بجلوں کو مارتا رہتا ہے۔ جب تک مستطیل سے بجلوں کو مار کر باہر نکالتا رہتا ہے۔ اس وقت

تک اسے کھیلنے کی اجازت ہے۔ جب بجلوں کو دائرے سے باہر نہ کر سکے تو وہ ہار جاتا ہے اور دوسرا کھلاڑی میدان سنبھال لیتا ہے۔

سے سر / سے سے: اگر تین بجل اسپ یا خر آ جائیں، تو سے سر کہلاتے ہیں۔ اگر دو سر اور دوسری بجل اسپ یا خر آ جائیں تو بھی سے سر کہلاتا ہے۔ دو سر اسپ یا خر آ جائے اور دو بجل مخالف آ جائیں تو قیمت (value) کم ہو جاتی ہے۔

شک: سلی میں جب "ارغند" خر یا اسپ کی شکلیں اختیار کرے، تو اس کھلاڑی کی باری ہوتی ہے اور کھیل کی ابتداء کرتا ہے۔ اگر خر ہو پک اور اگر اسپ ہو تو چک پوزیشن والی بیڈیوں کو جیت لیتا ہے۔

شنک: بیڈی کے کونے شنک کہلاتے ہیں۔

شیت / چیت کرنا: بیڈی کو پتھر یا اینٹ پر گھسانا۔

اسپ / گل: بجل کا اوپر کھڑا ہوا (آسمان کی طرف) حصہ اسپ کہلاتا ہے۔ "دو سر" کے کھیل میں اس حصے کو "گل" کہتے ہیں۔

مٹ جلنگ: اگر بیڈی کو مارتے وقت اپنی بیڈی کو ہاتھ کی تھیلی میں پکڑے تو یہ مٹ جلنگ کہلاتا ہے۔

ہٹ: جب کھلاڑی بیڈی کو نشانہ نہ کر سکے تو ہٹ کہلاتا ہے۔

یک سر: اگر دو سر اسپ اور دوسری ایک بجل خر آ جائے تو یک سر کہلاتا ہے۔

بچوں کے کھیلنے کی گولی:

اُلٹ پلٹ: جس کھلاڑی نے گدنہ کیا ہو۔ اور دوسرا کھلاڑی جس نے گد کیا ہو، اس گولی کو نشانہ بنائے تو وہ کھلاڑی اپنی ایڑیوں کو ملا کر پنجوں کو کھلا چھوڑتا ہے اور کینچے کو بیچ میں رکھتا ہے۔ اس طرح دوسرا کھلاڑی نشانہ بناتا ہے۔ اور جب گولیاں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں۔ تو پاؤں کے حلقے سے باہر نہیں جا سکتی ہیں۔ بلکہ ایڑیوں سے ٹکرا جاتی ہے۔

اَینٹ: بڑی انگلی جس کے ذریعے گولی کو پھینکا جاتا ہے۔

اَینٹ کا بند ہونا: جب کھلاڑی اپنی انگلی سے دوسرے کینچوں کو نہیں مار سکتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میری اینٹ بند ہے۔

اینٹی: وہ گولی جس سے کھلاڑی کھیلتا ہے۔ اس گولی کو کسی حالت میں فروخت نہیں کرتا ہے۔

آنا جانا: جب ایک کھلاڑی دوسرے کھلاڑی کے کینچے کو گد میں مارتا ہے بشرطیکہ دونوں میں سے ایک پکا ہوا اور ایک کچا ہو۔ پکا کھلاڑی وہ کہلاتا ہے جو گد کر چکا ہو، اب دوسرے کھلاڑی کے کینچے کو نشانہ بنانا چاہتا ہے وہ دوسرا کچا کھلاڑی جس نے گد نہ کیا ہو، تو وہ پکے کھلاڑی کے کینچے کو پاؤں کے ایڑیوں کو ملا کر روکنا چاہتا ہے۔ تو اسی وقت دونوں کھلاڑیوں میں سے ایک آنا جانا کا لفظ استعمال کرتا ہے، تو اسی صورت میں اگر کینچے کو کھلاڑی نے نشانہ نہ بنایا تو وہ گولی واپس آ کر کچا کھلاڑی کے کینچے سے ٹچ ہو گیا تو وہ اس کو کتی مار کر دور بھگا دیتا ہے۔ اور خود گد پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بلور: بالکل نیا کینچے جس پر داغ نہ ہو۔

پلا اور گولی: جب ایک کھلاڑی دوسرے کھلاڑی کو گد کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی گولی کو کتی لگانے کی بھی کوشش کرتا ہے تو اسی وقت وہ پلا اور گولی کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اگر کتی لگ گیا تو وہ گد کرتا ہے۔ اور دوسرے کھلاڑی کو جیت لیتا ہے۔

پتو: گد میں گوڑی کا چلا جانا۔

تنگا: کینچے کا کھیل جو بڑی انگلی سے کھیلا جائے۔

پنو: اس کھیل میں اگر کینچے پھینکتے وقت ایک کینچہ گد میں جائے تو کھلاڑی سب کینچوں کو جیت لیتا ہے۔ اس کھیل میں کینچوں کو ہاتھ کی ہتھیلی میں رکھ کر اس طرح پھینکتے ہیں کہ وہ زمین کو چھوتے ہوئے گد کی طرف جائیں۔ اگر ایک سے زیادہ کینچے گد میں جائیں تو پھر دوسرے کھلاڑی کی باری آتی ہے اور اگر گد میں کوئی کینچہ نہ جائے تو پھر پینڈے سے کھلاڑی اپنی اینٹی کو زمین پر اس طرح پھینکتا ہے کہ وہ زمین کو چھوتا ہوا جائے۔ اور اگر کسی کینچے کو لگ جائے تو پھر کھلاڑی جیت جاتا ہے۔ اگر کسی کینچے کو لگ نہ جائے تو پھر تیسرے کھلاڑی کی باری آ جاتی ہے۔ ہذا القیاس کھلاڑی باری باری آتے ہیں۔

پینڈہ: گد سے فاصلہ جہاں سے کھلاڑی کینچہ پھینکتے ہیں۔

پہل دوج تیج / میری، دولی، تیلی: کھیل شروع کرنے سے پہلے کھلاڑی پہل، دوج، تیج بولتے ہیں۔ جب کھیل شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے تیج اس کے بعد دوج اور آخر میں پہل کینچہ پھینکتا ہے۔ اب جس کا کینچہ گد سے جس قدر نزدیک ہوگا، یا کینچہ گد کے اندر ہوگا۔ تو وہ میری۔ اس کے بعد جس کا کینچہ نزدیک

ہوگا وہ دولی اور اس کے بعد والا کھلاڑی تیلی کہلاتا ہے۔ کھیل کی ابتدا سب سے پہلے میری کریگا۔ یہ سب کچھ پنو اور گچی کے کھیلوں میں ہوتا ہے۔

پینچ: جس کھلاڑی نے سب سے پہلے کینچہ پھینکا ہو وہ کہتا ہے کہ میں پینچ جاؤں گا یعنی وہ اپنی باری سب سے آخر میں استعمال کرے گا۔ پینچ کھلاڑی نئے کھیل میں سب سے پہلے کینچہ پھینکتے ہیں۔

تیج: دوج کے بعد تیج کی باری آتی ہے۔

ٹوٹا/ٹوٹل: داغ دار کینچہ۔ ایسا کینچہ جس کا کچھ حصہ ٹوٹ چکا ہو۔

چور: جب کھلاڑیاں میدان میں کھیل رہے ہوں تو کوئی بھی نووارد چور کہہ کر گولیوں کو اُٹھا سکتا ہے۔ اگر کھلاڑیوں نے پہلے ہی چور کہا تو نووارد ایک گولی بھی نہیں اٹھا سکتا۔

چوری پوری: جب کھلاڑی دیکھتا ہے کہ نشانہ لگاتے وقت وہ کینچے کو اچھی طرح نہیں مار سکتا ہے تو وہ "چوری پوری" کہہ کر پھونک سے مٹی کو صاف کرتا ہے۔ اگر اس دوران کینچہ ہلے تو پروا نہیں یا پھر نشانہ بناتے وقت اگر وہ کینچہ معمولی سا ہل جائے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کو نشانہ لگ چکا ہے۔ چاہے اس کو زور سے نہ لگے اور وہ صرف معمولی سا ہل جائے۔

دوج: میری کے بعد دوج کی باری ہوتی ہے۔

سچ/ گدپلا: کوڑ گد کے بعد جب دوبارہ گولی کو گد میں پھینکا جاتا ہے تو وہ سچ گد یا سچ پلا کہلاتا ہے۔

ساڑا: پنو کے کھیل میں جب ایک سے زیادہ گولیاں گچی میں آجائیں تو ساڑا کہلاتا ہے اور کھلاڑی کھیل ہار جاتا ہے۔ ننگا کے کھیل میں جب کھلاڑی نے ایک دفعہ گد کیا اور کھیل میں غلطی سے دوبارہ اس کی گولی گد میں چلی گئی یا وہ کسی گولی کو مارنے اور اینٹی اس سے ٹکرا کر دوبارہ گد میں جائے تو ساڑا ہو جاتا ہے۔

ساڑا بیڑا: اگر کھیل کھیلتے وقت کھلاڑی نے ساڑا بیڑا کہا تو اگر اس کی گولی دوبارہ گد میں جائے یا کسی گولی سے ٹکرا کر گد میں جائے تو ساڑا نہیں ہوتا ہے۔ اور کھلاڑی ہارتا نہیں ہے۔

کوڑ گد: جب گولی کو بطور مشق پھینکا جائے اور وہ گد میں چلا جائے تو کوڑ گد شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

کی لینا: کی لینا اس طرح ہوتا ہے کہ ایک کھلاڑی کا کینچہ دوسرے کھلاڑی کے کینچے کے قریب ہوتا ہے وہ اسکو اس طریقے سے نشانہ باندھتا ہے کہ اس کا کینچہ خود بخود گد کی طرف پہنچ جائے۔ یعنی اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس انداز سے کی لے کہ اس کا کینچہ جلدی گد میں جائے۔ یا اگر اس نے پہلے ہی گد کیا ہو تو وہ دوسرے کھلاڑیوں کے کینچوں کی طرف کی لے کر پہنچنے کی کوشش کرے۔

گچ/ گد/ پلا: چھوٹا سا گول گڑھا جس میں گولی کو پھینکا جاتا ہے۔

گچ بند/ اینٹ بند: پنو اور گچی کے کھیل میں جب کھلاڑی کہتا ہے کہ گچ بند ہے۔ اگر وہ کینچہ پھینکے اور گچ میں چلا جائے تو وہ جیت نہیں لیتا ہے اور اگر "اینٹ بند" کہے تو پھر وہ اینٹ کا نشانہ نہیں بنا سکتا ہے۔

گچی: اس کھیل میں کینچوں کو ہاتھ کی ہتھیلی میں رکھ کر پینڈہ سے گد کی طرف پھینکتے ہیں۔ جس قدر کینچے گد میں جائیں وہ اس کھلاڑی کے ہیں جس نے کینچے پھینکے ہیں، جب کینچے گد میں چلے جائیں تو کھلاڑیوں میں سے ایک کھلاڑی اس سے کہتا ہے فلاں کینچے کو نشانہ بناؤ اگر اس کا نشانہ ٹھیک نشانے پر لگا۔ تو گد کے کینچے اس کی ملکیت ہوں گے ورنہ بصورت دیگر دوسرا کھلاڑی میدان میں آتا ہے اور پہلے کھلاڑی کو گد کے کینچے نہ ملیں گے۔

گوڑی/ چدو/ کینچہ: بچوں کے کھیلنے کی گولی۔

میر دول: گولیاں پھینکتے وقت جس کی گولی سب سے زیادہ گد سے نزدیک ہوگی، وہ کھلاڑی میر دول کہلاتا ہے اور اب دوسرے کا کینچہ میری کے کینچے سے ٹکرا جائے تو اب دوسرا کھلاڑی میر دول ہوگا۔ اور پہلا کھلاڑی دولی کہلائے گا۔ اور اگر اس کے بعد دوسرا کینچہ ٹکرا جائے تو پھر ساڑا ہو جائیگا۔

میری: گولیاں پھینکتے وقت جس کی گولی سب سے زیادہ گد سے نزدیک ہوگی وہ کھلاڑی میری کہلائے گا۔ اب گد میں گولی پھینکتے وقت میری کو اولیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی گولی پھینکے۔

وت: گد سے ایک قدم کے فاصلے پر ایک گول سا گڑھا بنایا جاتا ہے جو کھلاڑی گد کرتا ہے یعنی گد میں پھینکتا ہے تو پھر وہ وت میں چلا جاتا ہے، جہاں اس کی پوزیشن مضبوط ہو جاتی ہے جب تک کوئی کھلاڑی گد نہ کرے۔ وت میں نہیں جا سکتا ہے۔

بلس: سکے کو اس طرح پھینکنا کہ زمین پر گرے ہوئے سکے سے صرف ایک بالشت

کا فاصلہ رہ جائے۔اس طرح کھلاڑی کھیل جیت جاتا ہے۔

ٹڑنگور گڑونج: سکوں کو الٹے یا سیدھے رخ رکھتے ہیں جس کی باری آتی ہے وہ ایک سکہ پھینک کر اسکا رخ معلوم کرتا ہے۔

گلی ڈنڈا

اچی بچی: ڈنڈے سے ٹلی (گلی) کو لگاتار اس طرح مارنا کہ اوپر جا کر پھر ڈنڈے میں لگے۔

اشنگ: جب مخالف کھلاڑی گلی کو پھینکے اور وہ راب پر رکھے ہوئے ڈنڈے سے ٹکرا جائے تو مخالف کھلاڑی جیت جاتا ہے۔یہ عمل اشنگ کہلاتا ہے اور وہ پھر میدان میں آ کر کھیل کی ابتداء کرتا ہے۔

انجل: جب گلی کسی ایسی جگہ پر گرے کہ اس کا کونہ اوپر نہ ہو، اور ٹل اچھی طرح سے نہ مارا جا سکے تو کھلاڑی انجل کہہ کر نیچے سے مٹی پھونک دیتا ہے۔تا کہ گلی کا کنارہ اس طرح ہو جائے کہ اسے ڈنڈے سے مارا جا سکے۔پھونک مارتے وقت اگر گلی ہلے تو پروا نہیں کیونکہ کھلاڑی نے انجل کیا ہے۔

دارہ ناگوازی: اس کھیل میں ایک دائرہ بنایا جاتا ہے سب سے پہلے ٹل مارا جاتا ہے جو کھلاڑی سب سے زیادہ ٹل مارے وہ کھیل کی ابتدا کرتا ہے اور دائرے کے اندر کھڑا ہوتا ہے۔اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا ہوتا ہے۔مخالفت میں دوسرا کھلاڑی جو دائرے کے باہر ہوتا ہے ٹلی کو اس کے ڈنڈے کی طرف پھینکتا ہے۔یہ دائرے کے اندر سے ٹلی کو مارتا ہے اور ٹل لگاتا ہے۔اس میں جیا پہلے سے طے کیا جاتا ہے یعنی اتنے ٹل مارنے پر جیا ہوگا۔یعنی دس یا بیس فٹ دائرے سے باہر کھڑا ہوا مخالف کھلاڑی اس کو ڈنڈے سے نہ مار سکے اور اگر وہ دائرے کے اندر یا لکیر پر گر جائے، تو اس کی باری ختم ہوتی ہے۔اور دوسرا مخالف کھیل شروع کرتا ہے۔

بکٹ لین: ٹلی کے کھیل میں جیا بنانے کا یہ ایک دوسرا طریقہ ہوتا ہے اس میں ٹلی (گلی) کو پہلی دفعہ مٹھی میں رکھا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں ڈنڈے کو پکڑتے ہیں۔اب ٹلی کو اچھال کر اوپر کی طرف پھینکا جاتا ہے۔جب ٹلی نیچے آنے لگتی ہے تو ڈنڈے سے اس کو مارتے ہیں۔جتنی دور جا کر وہ گر جائے اس جگہ سے ڈنڈے کے ساتھ راب تک فاصلے کو ناپتے ہیں۔ڈنڈے کی لمبائی کے ہر فاصلے کا الگ الگ نام رکھا گیا ہے۔پہلی دفعہ کے فاصلے کو "بکٹ" دوسرے کو "لین" تیسرے کو "مون" چوتھی کو "نار" پانچویں کو "حقی" چھٹی کو "بانگو" اور ساتویں کو "جگ" کہتے ہیں۔

جب دوسرے ٹل کی باری ہوتی ہے تو اس دفعہ ٹل کو ناک پر رکھ کر اچھالتے ہیں اور پھر ڈنڈے سے مارتے ہیں اور اس طرح ڈنڈے سے فاصلے تک کو ناپتے ہیں۔تیسری دفعہ پاؤں کے نیچے رکھ کر اچھالتے ہیں اور پھر اس طرح ڈنڈے سے مارتے ہیں۔واضح رہے کہ اس کھیل میں یہ پہلے سے طے کیا جاتا ہے کہ دس جگ یا بیس جگ پر "جی آ" ہوگا۔جب گنتی پر اتنے جگ بن جائیں تو پھر جی آ بن جاتا ہے۔اگر ٹلی اس قدر نزدیک ہو کہ فاصلہ ناپتے وقت آخری وقت لفظ جگ تک پورا نہ ہو۔یعنی فاصلہ جگ والے لفظ تک پورا نہ ہو۔دوسرے الفاظ میں ساتویں دفعہ تک نہ پہنچ سکے تو اس کھلاڑی کی باری ختم ہو جاتی ہے۔

بین ٹل: اگر گلی کو مارتے وقت ڈنڈا زمین سے چھو جائے تو دوسرے ٹل کو اس طرح مارتے ہیں کہ ڈنڈے کو ٹانگ کے نیچے لے جا کر ایک اور ٹل مارتے ہیں۔اگر کھلاڑی پہلی دفعہ نہ مار سکا۔تو دوسری اور پھر تیسری دفعہ کوشش کرتا ہے۔اگر تیسری دفعہ بھی وہ نہ مار سکا تو پھر اس کو مزید ٹل مارنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔

پچک: پچک گلی ڈنڈے کے کھیل کا باقاعدہ کھلاڑی نہیں ہوتا ہے بلکہ جس طرف کے کھلاڑیوں کی تعداد کم ہوتی ہے تو وہ ایک کھلاڑی اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں اس طرح تعداد میں برابر ہو جاتی ہے۔

تو تا: اگر کھلاڑی نے گلی پھینکتے وقت تو تا کان مان کہا اور گلی دور نہ جا سکے بلکہ نزدیک گر جائے تو وہ اس کو دوبارہ اٹھا کر دور پھینک سکتا ہے۔

ٹل: ٹل (گلی) کے دونوں تراشیدہ اطراف ٹل کہلاتے ہیں۔

تل مارنا: ڈنڈے سے گلی کو مارنا۔

جیا: کھیل میں پہلے سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ اس قدر ٹل پر "جی آ" بن جاتا ہے ایک جیا بنانے سے اسے کھیلنے کا ایک اور موقع مل جاتا ہے۔جتنے جیا بنائے گا کھیلنے کے اتنے اور مواقع ہاتھ آئیں گے یعنی جتنے جیا بن جائیں کھلاڑی اتنی دفعہ نئے کھیل کھیل سکتا ہے۔جیا کسی دوسرے شخص کو بھی بخشا جا سکتا ہے۔اس طرح وہ میدان میں آ کر کھیل میں حصہ لے سکتا ہے۔

جمنگ: بمعنی پکڑنا، اگر مخالف پارٹی گلی کو ہاتھ سے پکڑے تو مخالف پارٹی جیت جاتی ہے اور کھیل کھیلنے والی پارٹی ہار جاتی ہے۔

جلنگ / جلفنگ: جب کھلاڑی ڈنڈے سے گلی کو دور تک پھینک دے او روہاں سے مخالف پارٹی اس کو راب تک نہ پھینک سکے تو یہ عمل جلفنگ کہلاتا ہے۔

جیا پکا کرنا: طے شدہ ٹل جب پورے ہو جائیں تو پھر اس کے لیے مزید ایک ٹل مار کر پکا کیا جاتا ہے مثلاً دس پر جیا بنانا طے ہے تو گیارہ مارنے پر جیا پکا ہو جاتا ہے۔ اگر دس ٹل بنانے کے بعد مخالف کھلاڑی گلی سے ڈنڈے کو مارے تو جیا نہیں بن سکتا ہے۔

راب: وہ چھوٹا سا گڑھا جس میں ٹلی کو رکھ کر پھینکتے ہیں۔

غلام روٹی: ٹل مارتے وقت اگر اگلی دور گر جائے تو دوسرا ٹل نہیں مارتے ہیں اس کو معاف کرتے ہیں اور اسے غلام روٹی کہتے ہیں۔

غول دینا: ٹلی کو ڈنڈے سے اس قدر زور سے مارنا کہ ٹلی بہت دور گر جائے۔

لڑکیوں کے کھیل

کوش: لڑکیوں کے اس کھیل میں دو دو لڑکیاں حصہ لیتی ہیں۔ ہر ٹولی کی لڑکیاں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی ہو کر اپنی مد مقابل کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اور پاؤں سے پاؤں ملا کر لٹو کی طرح گھومتی رہتی ہیں۔ بسا اوقات ان کے سر چکرا جاتے ہیں اور وہ زمین پر گر جاتی ہیں۔ پنجاب میں اسے ککلی کہا جاتا ہے۔

ششک: اس کھیل میں بیک وقت دو لڑکیاں حصہ لیتی ہیں۔ ہر ایک کے پاس چھ چھ کنکریاں ہوتی ہیں۔ کھیل شروع کرنے سے پیشتر ایک لڑکی کنکریوں کو بیٹھے بیٹھے ذرا اوپر کی طرف پھینکتی ہیں اور فوراً ہاتھوں کو اس طرح ملاتی ہے کہ ہتھیلیاں زمین کی جانب ہوں، اس طرح تین چار کنکریاں وہاں رہ جاتی ہیں۔ اور باقی زمین پر گر جاتی ہیں اب وہ لڑکی ان کنکریوں میں سے ایک کو اٹھا کر اوپر پھینکتی ہے اور فوراً واپس پکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر اس نے پکڑ لیا تو وہ ایک کنکری زمین سے اٹھاتی ہے اس طرح وہ جیت جاتی ہے۔ اگر وہ پکڑ نہ سکے تو دوسری کی باری آتی ہے۔

پلکو: اس کھیل میں ہاتھ سے مٹی کے دو چھوٹے چھوٹے ٹیلے بنائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک میں پیسہ یا موتی رکھا جاتا ہے اور کھیل میں حصہ لینے والی لڑکی دونوں ہتھیلیوں کو گول بنا کر ان پر رکھ کر ٹیلوں کو ادھر اُدھر کرتی اور پھر دوسری لڑکیوں سے پوچھتی ہے کہ بتاؤ کہ پیسہ یا موتی کس ٹیلے میں ہے۔ اگر وہ جان لیتی ہے تو اسے جیت جاتی ہے، ورنہ دوبارہ پھر کھیل شروع کیا جاتا ہے۔

دتک برام سانگ: براہوئی بچیاں گڑیوں کی منگنی اور شادی اس طرح رچاتی ہیں جیسے عام لوگوں کی شادی بیاہ ہوتی ہے۔ یعنی پہلے ان کی منگنی کی جاتی ہے۔ پھر شادی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ برات جاتی ہے۔ کھانا وغیرہ پکایا جاتا ہے۔

مردوں کے کھیل

ہو / جو / جی / واری واری: یہ کھیل مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ چاندنی راتوں میں گاؤں کے نوجوان اور ادھیڑ عمر کے افراد ایک کھلے میدان میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلے جو گھر سے نکل کر اس کھیل کے لیے بلاتا ہے یا کھیل کے میدان میں پہنچ جاتا ہے، تو وہ ہاتھ کی پشت کو منہ پر رکھ کر زور سے ایک خاص قسم کی آواز نکالتا ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس کی تکرار کرتا ہے۔ دوسرے کھلاڑی یا تماشابین جب اس آواز کو سنتے ہیں تو جواب دیتے ہیں کہ ہم پہنچ گئے۔ اس طرح تقریباً آدھ گھنٹے تک اس قسم کی آواز کی گونج رہتی ہے۔ اس دوران تمام کھلاڑی تماشابین میدان میں پہنچ جاتے ہیں اور کھلاڑیوں میں جو سب سے بڑے اور طاقتور شمار کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جن کو "بھلا جفت" یا "سراڑی" یعنی بڑا جوڑا کہا جاتا ہے۔ باقی کھلاڑی دو دو کے جوڑے میں ایک دوسرے کے مقابلے کے جوڑے بنا کر اپنے طور پر تھوڑے سے فاصلے پر جا کر خفیہ طریقے سے ان دو ساتھیوں میں سے ایک کے ہاتھ کی انگلیوں میں سے ایک پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہے "یہ میرا ہے" واپس بڑے جوڑے یعنی سراڑیوں کے پاس آ جاتے ہیں اور مقررہ دو انگلیاں کھڑی کر کے کہتے ہیں کہ "ہرف" (یعنی اٹھاؤ) گچین کر (یعنی انتخاب کرنا) پس جس انگلی پر جس بڑے ساتھی نے ہاتھ رکھا، اس کو اپنایا ہوا کھلاڑی اس کی طرف ہوگا۔ اس طرح باری باری ہر بڑا کھلاڑی ان میں سے ایک کا انتخاب کر لیتا ہے اس طرح تمام کھیلنے والوں کا انتخاب مکمل ہو جاتا ہے۔

اگر کسی کھلاڑی کا جوڑا باقی نہ رہے تو اس کو "ہرواری" کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ ہر پارٹی کی طرف سے کھیل کھیلتا ہے۔ مگر اس لیے عام طور پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف کا انتخاب کرے۔ یعنی باہر رہ کر کھیلے یا اندر کے گروپ میں رہ کر کھیلے۔

اس کھیل کے کھیلنے کا طریقہ اس طرح ہوتا ہے کہ کھیلنے والوں میں سے ایک گروپ باہر سے کھیلنے لگتا ہے اور دوسرا گروپ مجمع بنا کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا فیصلہ ٹاس کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

باہر والے کھلاڑیوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جمع کیے ہوئے کھلاڑیوں میں سے صرف ایک کو اچانک یا زبردستی ہاتھ لگا کر بھاگ جائیں اور مجمع کیے ہوئے کھلاڑیوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ باہر سے کھیلنے والے ساتھیوں میں سے صرف ایک کو ہاتھ مارنے کے لیے حملہ آور ہوتے وقت یا کسی اور حالت میں جب وہ کھیل رہا ہو، پکڑ لیا جائے۔ اس طرح جو بھی اپنے ارادے میں کامیاب ہو جائے اس کی جیت ہوتی ہے اور مخالف گروپ کا کھلاڑی شکست خوردہ قرار دے کر بٹھایا جاتا ہے۔

چونکہ باہر کے کھلاڑی اکثر چوری چھپے مجمع بناتے ہوئے کھلاڑیوں میں سے کسی ایک کو ہاتھ لگا کر بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس لیے یہ لازمی ہے کہ اپنی کامیابی کی خوشی میں اور کھیلنے والوں کی آگاہی کے لیے زور زور سے "واری واری" کہہ کر دور تک بھاگتا جاتا ہے کہ مبادا عقب سے مخالف گروپ کا کوئی کھلاڑی آ کر اس کو پکڑ لے۔ کیونکہ اس طرح پکڑے جانے کی صورت میں پکڑنے والا مخالف گروپ والوں میں چاہے کوئی بھی ہو اس کی یہ اپنی کامیابی ختم ہو جاتی ہے الٹا وہ مغلوب قرار دے کر بٹھا دیا جاتا ہے۔

اس طرح باہر کے کھلاڑی یہی کوشش جاری رکھتے ہیں کہ مجمع بنائے ہوئے کھلاڑیوں میں سے ہر ایک کو ہاتھ مار کر باری باری بٹھا دیا جائے۔ اور انکے برخلاف مجمع کیے ہوئے (موڑی تفوکا) گروپ کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ باہر والوں کو ایک ایک کر کے باری باری پکڑ کے بٹھا دیا جائے تا کہ کامیابی ہماری ہو۔ جس فریق نے مخالف فریق کے کھلاڑیوں کو شکست دے کر بٹھا دیا، جیت اس کی ہوگی۔

اس کھیل میں ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کھیل کے دوران ایک فریق کا کوئی کھلاڑی پکڑ کر یا ہاتھ مار کر شکست خوردہ قرار دیا گیا ہو، تو مخالف فریق کے ہار کر بیٹھے ہوئے کھلاڑی کے تبادلے میں دوبارہ کھیل سکے گا۔ یعنی اس شکست کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تو کھیلتا رہے گا۔ البتہ مخالف گروپ کا ایک شکست خوردہ ساتھی کہ جس کا ہارے ہوئے فریق میں اول نمبر ہو اٹھ کر کھیلنے لگ جائے گا۔

الغرض اس کھیل میں اس گروپ کے کھلاڑی بٹھا دیے جاتے ہیں، جس کے پاس اپنے سے مخالف گروپ میں شکست خوردہ افراد نہ ہوں۔ جن کو کہ انہوں نے شکست دی ہو۔ اس طرح ہار جیت کے کئی کھیل ہوتے ہیں اور تین چار گھنٹوں تک یہ کھیل جاری رہتا ہے اسکے بعد "بھلا جفت" (سراڑی) آپس میں حساب کرتے ہیں کہ جیت کس کی ہوئی۔

اس کھیل کے مقابلے (میچ) بھی ہوتے ہیں جن کا دائرہ دور دور تک پھیلا دیا جاتا ہے۔ ایسے کھیلوں کے لیے عام طور پر جمعہ کا دن اور شام کا وقت مقرر کیا جاتا ہے جس میں مختلف گاؤں کے معتبرین بطور تماشابین اور منصف حصہ لیتے ہیں۔

مل: کشتی کو مل کہتے ہیں۔ عام کھیل ہے ہر ملک و قوم کے باشندے یہ کھیل کھیلتے ہیں۔

خل خلنگ: اس کھیل میں صرف دو کھلاڑی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے پھینکے ہوئے پتھر کو نشانہ بناتے رہتے ہیں جس کا پتھر نشانے پر لگے وہ جیت جاتا ہے۔

برف گوازی: دیکھیے لڑکوں کا کھیل

خایہ جنگ تنگ: دیکھیے لڑکوں کا کھیل

خل خسنگ: اس میں کئی کھلاڑی حصہ لے سکتے ہیں۔ وزنی پتھر اٹھا کر دور پھینکتے ہیں جو پتھر کو زیادہ دور پھینک سکے، وہ جیت جاتا ہے۔

لوک روایات، گیت اور کہانیاں: براہویوں میں لوک روایات، گیت اور کہانیاں مقداری لحاظ سے گو کہ انتہائی قلیل تعداد میں موجود ہیں لیکن یہ انتہائی قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت دلچسپ بھی ہیں جو ان کے حسن ظن اور اعلیٰ تخیل پردازی کا مظہر ہیں ہم یہاں فرداً فرداً لوک روایات، گیت اور کہانیوں کا ذکر کریں گے۔

لوک روایات: براہویوں میں عموماً دوسری شادی کو بغیر کسی اہم وجہ کے اچھا نہیں سمجھا جاتا، البتہ عورت کے بانجھ ہونے اور اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں یہ لازمی بن جاتا ہے کہ مرد دوسری عورت بیاہ کر گھر میں لائے۔ اس صورت میں کسی بھی عورت کے لیے زندگی کا عظیم ترین غم سوکن کی آمد کا دھڑکا ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے متعلق دلچسپ روایات ہیں۔ ڈینس برے نے ان کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔

براہوی میں سوکن کے لیے "اپوک" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عورتوں کے لیے اس لفظ کا صوتی ترنم ہی سوہان روح اور اس قدر گھناؤنا ہوتا ہے کہ اگر چولہے میں پھونکنے مارنے کے باوجود آگ نہ جل رہی ہو تو چولہا جلانے والی، یا ماں کی شہہ پا کر کوئی بچہ شرارتاً گنگناتے ہوئے کہے گا۔ جلتی ہے یا لاؤں تجھ پر سوکن! اور روایت کے مطابق یہ دھمکی کارگر ثابت ہوتی ہے اور آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور اگر اس دھمکی کے باوجود نہیں جلتی تو پھر پڑوس کے ہاں سے لکڑی لا کر اسے جلایا جاتا ہے اور اس وقت خوشی اور حیرت کا اظہار کیا جاتا ہے جب جلتی لکڑی آگ دکھانے سے پہلے بجھ جاتی ہے اسے اس بات کا غماز سمجھا جاتا ہے کہ لکڑی بھی یہ دعا کر رہی ہے کہ اہم سب کو سوکن سے محفوظ رکھے۔ یہ ماں کی نیک دعا ہوتی ہے۔

ایک عورت کو ایسی صورت میں بھی سوکن کی آمد کا دھڑکا لگا رہتا ہے جبکہ اس

کے گرد لمبے تڑنگے جوان اور کڑیل بیٹے موجود ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکے گپ شپ کرتے ہوئے اکثر مذاقاً کہتے ہیں "اپنے خاوند کے لیے دو بیٹے پیدا کرو وہ تم سے محبت کرتا رہے گا۔ چار بیٹے پیدا کرو تو وہ تمہیں ماں کی طرح چاہے گا۔ لیکن پانچ بیٹے پیدا کرو وہ تمہیں دادی کہہ کر پکارے گا۔ اور کسی اور کو اپنی ہم صحبت کے لیے بیاہ کر لائے گا۔"

عورتیں جب آپس میں مجلس کے لیے جمع ہوتی ہیں اور گپ شپ کرتی ہیں تو گھر کی خادمائیں یا جوان لڑکیاں مل کر ایک گیت گاتی ہیں جسے سن کر جوان عورتیں تو بے حد خوش ہوتی ہیں۔ بڑی بوڑھی عورتوں کی پیشانیوں پر البتہ بل پڑ جاتے ہیں کیونکہ گیت میں اصل ہدف وہی ہوتی ہیں۔ گیت کے بول یوں ہوتے ہیں:

تیس کی ہوئی
تو بیوی ایک سرزنش بنی
اب اس سے پیچھا چھڑانا ہی بہتر ہے
تاکہ اس کے اگڑے، جھگڑے سے ہی نجات مل جائے
دس سال اور بڑھی
وہ پہلے سے بھی بری ہوئی
کوئی قبر بھی اب اسے قبول نہیں کرے گی
گودوزخ اس سے بھی بڑی عمر کو قبول کر لیتی ہے
دس سال عمر اور بڑھی! ایک دن کم ہوئے
اب تو شیطان ہی اس کا محافظ ہے
کیونکہ اب وہ شیطان کو بھی
ناکوں چنے چبوائے گی، خدا کی پناہ!

چھوٹی اور چہیتی بیوی کو "رودار" اور بڑی بیگم کو "بیر" کہا جاتا ہے۔ اکثر چھوٹی بیگم ہی تمام تر مراعات کی حقدار ٹھہرتی ہے۔ ایک روایت یہ پائی جاتی ہے کہ حکمران نے اپنے درباری مسخرے کو شادی کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے بڑی دلچسپی کی بات کہی۔ اس نے جواب دیا: "بیویاں کم از کم چار ہوں۔ ایک ہم بستری کے لیے، دوسری گندگی کی ڈھیر کے لیے، تیسری ساتھ ساتھ پھرانے کے لیے اور چوتھی گھر کی ملکہ بننے کے لیے۔ افسوس کہ آخر الذکر سینکڑوں میں ایک ہوتی ہے لہذا میں مجرد رہنا ہی پسند کروں گا۔ آپ کے مشورے کا شکریہ۔"

روایتاً ان کی تفہیم اس طرح کی جاتی ہے کہ اول الذکر ماسوائے بستر کے اور کسی کام کی نہیں۔ وہ بستر سے اٹھتی ہے تو پھر کام کی نہیں رہتی۔ وہ نہ اپنے شوہر کی کوئی پرواہ کرتی ہے اور نہ گھر گرہستی سے کسی قسم کی رغبت رکھتی ہے۔ دوسری والی بھی گھر گرہستی سے قطعاً تعلق نہیں رکھتی۔ پورے گھر میں ابتری ہو، اس کی بلا جانے اس کا معقولہ ہوتا ہے کہ جہاں جو چیز پڑی ہے۔ اسے پڑا رہنے دیا جائے۔ لیکن تیسری یعنی ساتھ ساتھ پھرانے والی بیوی ان دونوں سے اسی قدر مختلف ہوتی ہے جتنا اسے ہونا چاہیے۔ وہ اضطراری حرکت میں ہر وقت مبتلا رہتی ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ مصروف نظر آتی ہے۔ مگر کام کچھ نہیں کرتی۔ ادھر ادھر دوڑتی پھرے گی۔ گپ شپ مارے گی۔ گھومنے پھرنے اور تقریبات میں شرکت کی بے حد شوقین ہوگی۔ آخری یعنی "ملکہ عورت" سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی درست تعریف وہی کر سکتا ہے جو ایسی عورت کا شوہر ہو۔ اور اسے خوش نصیب انسان سمجھا جاتا ہے۔ جو ایسی بیوی پانے میں کامیاب ہو جائے۔

روایات کے مطابق ایک ہی خاندان سے سوکن لانا نہایت برا سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر بالفرض محال ایسی شادی ہو بھی جائے تو خاندان برادری کے افراد "چاپ" میں حصہ نہیں لیتے۔

سوتیلی ماں اور سوکن: "اپوک" کی طرح "ماتونہ" یعنی سوتیلی ماں سے متعلق بھی دلچسپ روایات پائی جاتی ہیں۔ اسے نہایت ظالم اور بدتر سمجھا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق جب موسم سرما میں آگ کے گرد ہو بیٹھتے اور ماں سے کہانی سننے کی فرمائش کرتے تو وہ بہت سی کہانیاں سوکن کی مکاریوں اور سوتیلی ماں کی زیادتیوں کے بارے میں سناتی۔ یہ رویہ بچوں میں اس قدر پروان چڑھایا جاتا ہے کہ جب ننھے منے بچے گڑیاں کا کھیل کھیلتے ہیں وہ تو گڑیا کی شادی یا غمی کا کھیل کھیلنے سے تھک کر سوتیلی ماں کا کردار کسی گڑیا سے ادا کرواتے ہیں اور گڑیا کے بچوں کے منہ سے یہ کہلواتے ہیں کہ "سوتیلی ماں چڑچڑی ہے۔ سوکھی روٹی دیتی ہے" اس پر وہ خوب ہنستے بھی ہیں۔ انہیں یہ باور کروایا جاتا ہے کہ سوتیلی ماں بہت سخت گیر ہوتی ہے اور جب غصے کی حالت میں ہو تو کہتی ہے۔ "اے میرے سوت کے بچو!" وہ ان سے اچھا سلوک نہیں کرتی وغیرہ۔

دو عورتیں اگر کسی وجہ سے آپس میں لڑ پڑتی ہیں تو ایک دوسرے پر وہ اس طرح کے طنز کرتی ہیں "اچھا! میں نہیں، تم ہی میری سوکن ہوگی۔ میرے شوہر کی بیوی، تبھی تو تم میری اتنی مخالفت کر رہی ہو۔ ایسی برائی کا انداز کوئی اور اختیار کر ہی نہیں سکتا۔" کسی عورت کے لیے یہ سب سے زیادہ دل چھلنی کرنے والے الفاظ ہوتے ہیں۔

مقولے: اس بارے میں بعض دلچسپ مقولے روایت میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مرد کے لیے کہا جاتا ہے کہ:

دو سے شادی کرو، اپنی خوشی اور شادمانی کے لیے
اور اپنے آرام کے اوقات بسر کرو
اور تیسری کو اپنے بستر کے لیے بیاہ لاؤ
تمہارے سر پر سینگ نکل آئیں گے
لیکن اگر چوتھی بیوی لاؤ گے
تو تم بے حد مطعون کیے جاؤ گے۔

دوسری شادی کو براہوی میں کتنا برا اور خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس روایتی مقولے سے لگایا جاسکتا ہے۔

آہا! زندگی بھی کیسی جنت ہے
اگر کوئی صرف ایک ہی عورت سے شادی کرے
اور سوکن سے کتنی جلن اور کیسا حسد محسوس کیا جاتا ہے۔ یہ مقولہ سنیئے۔
اپوک پل پل ارے (سوکن مرچ دانی ہوتی ہے)

سلام مون تیتنگ: یہ روایت گو کہ اب مکمل طور پر متروک ہو چکی ہے لیکن ماضی میں یہ ایک مضبوط لوک روایت کے طور پر موجود رہی ہے۔ اس کے مطابق جب کسی جنازے کو قبرستان میں لایا جاتا ہے تو آخری لمحات میں ایک ایسا شخص جس کا پہلے کوئی رشتے دار وفات پا چکا ہو، آگے بڑھ کر متوفی کے کان میں سرگوشی کر کے کہتا ہے: "ہمارے پیارے عزیز کو پیغام دینا کہ ہم اس سے بہت پیار کرتے ہیں اور اب بھی اسے یاد کرتے ہیں اور اس کے حق میں دعا کرتے ہیں۔" یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرنے والا ان کے عزیزوں سے جا کر ملے گا اور ان تک پیغام پہنچائے گا۔

لوری: ڈینس برے لکھتا ہے: ایک شخص جو کسی قوم کی روح کو دریافت کرنے کا شائق ہے۔ وہ ہجر نما وسیع داستانوں سے کہیں زیادہ ان لوریوں میں سے کسی ایک سے استفادہ کر سکتا ہے۔ جنہیں مائیں بچوں کو سلانے اور بہلانے کے لیے گاتی ہیں۔ یہ بات کس حد تک درست ہے۔ اس کا اندازہ ان لوریوں سے ہی لگایا جاسکتا ہے جو براہوی ماؤں نے اپنے بچوں کے لیے تخلیق کی ہیں۔ لوک گیتوں کی طرح ان کے اصل خالق نامعلوم ہیں۔ البتہ یہ طے ہے کہ ان کی خالق براہوی مائیں ہی ہیں جنہوں نے روتے بچوں کو سلانے کے لیے مخصوص لے اور ترنم کے ساتھ یہ بول گنگنائے اور یہ فوک لور کا قیمتی سرمایہ بن چکے ہیں۔ گیتوں کی گہرائی میں آپ کو بلاشبہ براہوی قوم کی روح نظر آئے گی۔

ایک لوری کے بول ملاحظہ کریں یہ لوری ایک براہوی ماں اپنی بیٹی کو دے رہی ہے۔ اس لوری میں ہر چند کہ بیٹی کی عطا پر خداوند تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیٹے کی آرزومندی چھپائے نہیں چھپتی۔ اس لوری میں خواب دیکھنے والی ماں، ہر ماں کی طرح اپنی بیٹی کے سہانے مستقبل کا خواب دیکھتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میری بیٹی بھیڑ بکری کے گلوں والی ہے۔ وہ حسین و زیبا ہے۔ اس کے سر کے بال لانبے اور ریشم کی طرح چمکدار ہیں۔ اس کا دسترخوان کشادہ ہے اور اس پر انواع و اقسام کی نعمتیں چنی ہیں۔ اس کے رشتہ کے لیے بڑے بڑے دولت مند لوگ پیغام بھیج رہے ہیں۔ لوری کے بول ہیں۔

سوجا، سوجا، سوجا
میری مہ لقا، سوجا
خدا نے (تجھے) مجھے عطا کیا ہے
وہ خدا جو بخشش کرنے والا ہے
خدا کرے اس کا عطیہ ہمیشہ، ہمیشہ میرے پاس رہے
سوجا، سوجا، سوجا
میری مہ لقا، سوجا
بیٹے اور بچھڑے خدا کے اختیار میں ہیں
خدا ہی انہیں رکھتا ہے، خدا ہی انہیں دنیا میں بھیجتا ہے
اگر یہ چیزیں بازار میں ملتیں
تو شاہزادے سب کے سب خرید لیا کرتے
غریب غرباء کے حصے میں کچھ نہ آتا
سوجا، سوجا، سوجا
میری مہ لقا، سوجا
تم تمام عذراؤں کی ایک عذرا ہو
تم بھیڑ بکری کے میناؤں کی آقا ہو
تم موٹی تازی گائیوں اور اونٹوں کی مختار ہو
سوجا، سوجا، سوجا
میری مہ لقا، سوجا
تم اپنی بہنوں میں ملکہ ہو
جیسے چاند، تاروں کی جھرمٹ میں۔
سوجا، سوجا، سوجا
میری مہ لقا، سوجا
میری بی بی کی چوٹی گندھی ہوئی ہے

جیسے اونٹ کی موٹی نکیل کی ڈوری
سوجا، سوجا، سوجا
میری مہ لقا، سوجا
میری بی بی کا خیمہ اونچا اور کشادہ ہے
اور تیس قدم لمبا اس کا بیرونی حصہ ہے
یہ تمام خیام میں سب سے نمایاں اور فاصلے پر ہے
اور مہمان بھاگ اور قندہار سے آئے ہیں
سوجا، سوجا، سوجا
میری مہ لقا، سوجا
اس کا آقا بھیڑ بکریوں اور گاؤئیوں کا مالک ہے، جو پھل
پھول رہے ہیں
کیچ کا قابل فخر مالک ہے یا قبیلے کا سردار ہے
تین متصل سال سے وہ شادی کا پیغام لے کر آ رہا ہے
اے! تین مرتبہ اس کا جوتا گھس چکا ہے

لوک گیت

براہوی زبان میں لوک ادب کم و بیش نایاب ہے۔ اس لئے لوک روایات، لوک کہانیاں اور لوک گیت نہایت قلیل تعداد میں میسر ہیں۔ البتہ اس حوالے سے جو سرمایہ موجود ہے، اسے بلا شبہ براہوی ثقافت کا انمول ورثہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں براہوی ثقافت کے خدو خال، ان کے سماجی رویوں اور اخلاقی اقدار کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان لوک گیتوں کی کمیابی اور نایابی کا ایک اہم سبب براہوی زبان کا تحریری صورت میں دیر تک وجود نہ پانا ہے۔ نامعلوم چرواہوں اور تخلیق کاروں کے تخلیق کردہ یہ گیت سینہ بہ سینہ صدیوں سے منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں کچھ کے آثار مٹ گئے، کچھ کی شکلیں بگڑ گئیں اور بہت کم باقی رہ گئے ہیں اور یہ وہی ہیں جو تحریری صورت میں محفوظ ہو پائے۔

ننے دیرایتے (مجھے پانی دے دو) براہوی زبان کا ایسا ہی ایک مقبول ترین لوک گیت ہے۔ جو شادی بیاہ کی تقریبات سے لے کر موسیقی کی ہر محفل میں آج بھی لازماً اور شوق سے گایا جاتا ہے اس گیت کے بول، براہوی سماج کی اقتصادی و سماجی پرتوں کے اظہار کا آئندہ ہیں جو واضح طور پر بتاتے ہیں کہ یہ گیت کس کا تخلیق کردہ ہے۔ اسے تخلیق کرنے والے کا علاقہ کونسا ہو سکتا ہے؟ اور اس کی اخلاقی اقدار کیسی ہو سکتی ہیں؟ گیت کے بول ملاحظہ ہوں:

ننے دیرایتے، ننے دیرایتے	مجھے (تھوڑا) پانی دے دو، مجھے پانی دے دو
اوزیبو، ننے دیرایتے	اے حسینہ! مجھے تھوڑا پانی دے دو
نادوک ہنے نو، ننے دیرایتے	تیر ہاتھوں کا پانی شیرین ہے، مجھے پانی دے دو
گودی گدانا، ننے دیرایتے	اے میرے خیمہ دل کی ملکہ، مجھے پانی دے دو
نادوک پھدے نو، ننے دیرایتے	تیرے ہاتھوں کا پانی خنک ہے، مجھے پانی دے دو
ننے دیرایتے، ننے دیرایتے	مجھے پانی دے دو، مجھے (تھوڑا) پانی دے دو

یہ دوسرا گیت، ایک عاشق کے دلی جذبات کا والہانہ اظہار ہے۔ یہ بھی شادی بیاہ کے مفروضہ گیتوں میں سے ہے۔ ان مواقع پر مرد حلقہ بگوش ہو کر بیٹھتے ہیں تو ان میں سے ایک خوش گلو مرد، باقی دوستوں کی فرمائش پر رومانوی گیت گاتا ہے۔ مندرجہ ذیل گیت انہی گیتوں کا حصہ ہے۔ اس کے بول پیش ہیں:

شوخ شرابی مستس دلبر ہمیا شکر باردانگی
اے شوخ شرابی مست دلبر، مت جاؤ، اے شکر بار یہاں آؤ!
بے آرامن نن، بے نین ہمیا شکر باردانگی
ہم تیرے بغیر بے آرام ہیں، مت جاؤ اے شکر بار یہاں آؤ!
بوف پلنگے لئیک تنو دوہن کہ بارامی سانگی
بستر پہ گدا ہے، لیٹ جاؤ، جیسے شادی شدہ جوڑا
دشمن نامون ہنے، ایہ پارانا کل پغلو
دشمن کا منہ کالا ہے، اس طرف کے لوگ سراپا چغل خور ہیں
حضرت پارے خسا اوتا، نو بد شغلو
حضرت نے فرمایا، انہیں نکال دو، یہ ہمارے لئے بدشگون ہیں۔
شوخ شرابی مستس دلبر، ہمیا شکر باردانگی
اے شوخ شرابی مست دلبر مت جاؤ! اے شکر بار یہاں آؤ۔

ذیل میں چند دیگر معروف لوک گیتوں کے بول دیئے جاتے ہیں جنہیں پروفیسر انور رومان نے اپنی کتاب "براہوی لوک گیت" میں محفوظ کیا ہے:

گھوری مریوا، اومورا و لعل	اے طاؤس حسن، اے لعل ناب! میں تیرے قربان
پاسہ بافیسہ اومورا و لعل	اے طاؤس، اے لعل تو آنے کا جھوٹا وعدہ کرتی ہے
تیسیا تفیسہ او چھنکا ورنا	اے دوشیزہ، تو دعوت نظارہ دے کر چھپ جاتی ہے۔
بام بہ آئے سلے پہ او گل لالہ	اے گل لالہ: بام پر مت آ
رنڈی او.... چھنکا ورنا	اے دوشیزہ برنا کٹنی تجھے دیکھ لے گی

تینا کروایئے گل سوسن	اے گل سوسن! وہ تجھے ہتھیا لے گی

گھوری مریوا، اومورا لعل اے طاؤس حسن، اے لعل نایاب میں تیرے قربان

برنازنا، برنازنا	(اے محبوب) تو ناز و ادا کے ساتھ آجا
استے درنیابازنا	تو نے بہتوں کا دل لے لیا ہے
برنازنا، برنازنا	اے محبوب نازنیں اب تو آجا
تہیس کرک نی رازنا	میرے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کر
برنازنا، برنازنا	اے محبوب نازنیں اب تو آجا
زیبا گچین چاوہ ای	کوئی تیرا ثانی نہیں میں جانتا ہوں
گٹ نا مثالث سازنا	تیری آواز ساز کی مانند ہے
برنازنا، برنازنا	اے محبوب تو ناز و ادا کے ساتھ آجا

یہ آخری گیت براہوی خواتین میں مقبول ہے۔ شادی بیاہ اور دیگر مواقع پر خواتین آج بھی شوق سے اسے گنگناتی ہیں۔ یہ ایک نوخیز دوشیزہ کے دلی جذبات کا مرقع ہے۔ گیت کے بول اسطرح ہیں:

گھوری مریوائی	جان من، میں تم پہ قربان
بالس خلیوائی	میں تمہاری طرف اڑی جارہی ہوں
نے تو بریوائی	کیا میں تمہارے پاس آجاؤں
گھوری مریوائی	جان من، میں تم پہ قربان
نے کن زھیرٹ	میں تمہارے لئے بے قرار ہوں
خن تیاں کورٹ	میری آنکھیں کور ہوگئی ہیں
جانان بے زورٹ	میرا جسم تاب و طاقت کھو چکا ہے
گھوری مریوائی	(جان من، تم نے مجھے مار ڈالا) میں تم پہ قربان
اقرار کریس نی	تم نے اقرار کیا تھا
استاں دریس نی	اب تو بھلا دیا
داانت کریس نی	یہ تم نے کیا کیا؟
گھوری مریوائی	(جان من، تم نے مجھے مار ڈالا) میں تم پہ قربان

علاوہ ازیں ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوی نے براہویوں کے ہاں مختلف مواقع پر گائے جانے والے چند اور معروف لوک گیتوں کا ذکر کیا ہے ان کا تعارف درج ذیل ہے:

بجلی: اس لوک گیت میں محبوبہ کو آتش خو، برق اور صاعقہ کہا گیا ہے جو ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہے اور عاشق نامراد اس کی جھلک دیکھنے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپتا ہے۔

پھلنگارانڑی: محبوبہ سلطنت قلب کی رانی ہے، پھول کی طرح خوب صورت اور نازک ہے اس لیے اس لوک گیت میں اسے "پھلنگارانڑی" پھول کی طرح خوبصورت حسین و نازک رانی کہتے ہیں۔

تاجلو: شادی بیاہ کا گیت ہے۔

جی جی کیوہ: محبوبہ جب مخاطب ہوتی ہے تو عاشق اس کے روبرو جی جی کہتا ہے۔ اس جی میں عاشق کی چاہت اور تابعداری مضمر ہوتی ہے۔ براہوئی کے اس لوک گیت میں اس کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔

زار کیوہ ظالم: ایک فراقیہ لوک گیت ہے۔ عاشق سے محبوبہ اقرار وصل کرے مگر وعدہ فراموشی کرتے ہوئے حسب معمول ایسا نہ کرے۔ اس کے ہر مصرعے میں عاشق کی زار کو یہ ظالم کی کیوہ ہوتی ہے۔

سوزو: چھوٹی بحر میں یہ نہایت ہی دل آویز گیت ہے۔ اس کے ہر مصرعے میں سوزو کی تکرار ہوتی ہے۔ سوزو کی معنی سانولی سلونی کے ہیں۔

سومری: سومری براہوئی لوک گیت کی مثالی ہیروئن ہے اس لیے یہ لوک گیت سومری کے نام سے مشہور ہے۔

شکر بردانگی: اس لوک گیت میں معشوق کو شکر لب کہا گیا ہے۔ ہر مصرعے میں شکر بردانگی کی تکرار ہوتی ہے۔

کیلو ہڑہ: اس لوک گیت میں کیلو ہڑہ کی تکرار ہوتی ہے۔

لاڈے لے لڈے: شادی بیاہ کے موقع پر گائے جانیوالا لوک گیت۔

لعل نہ دانہ: اس لوک گیت میں لعل نہ دانہ کی تکرار ہوتی ہے۔ اس لوک گیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگرچہ پتھر بیشمار ہیں لیکن ان میں لعل نہایت قیمتی، بے بہا اور انمول ہے۔ اس طرح حسین و جمیل دوشیزائیں بہت ہیں لیکن محبوبہ ان میں لعل کی طرح درخشاں ہے۔

لیلڑی: یہ گیت براہوئی اور بلوچی دونوں زبانوں میں مستعمل ہے۔ اس کے ہر مصرعے کے اختتام پر لیلڑی ءلا کی تکرار ہوتی ہے۔ یہ ایک طربیہ گیت ہے۔ جب گانے والا لیلڑی ءلا کہتا ہے تو فرط مسرت سے اپنے ہاتھوں کو اس طرح جنبش دیتا ہے جیسے وہ محو رقص ہو۔

سکرانی ڈھول نواز اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں

سکرانی ڈھول نواز اور ڈانس پارٹی اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں

بلوچی موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں

بلوچستان، خوشی کے اظہار کا ایک انداز

جہاں مینگل قبیلہ آباد ہے۔اس میں حصہ لینے والے اپنے کندھوں کو ملا کر تال کے ساتھ ساتھ زور زور سے آواز لگاتے اور ہاتھوں کو اس طرح ہلاتے ہیں جیسے کہ لڑ رہے ہیں۔

چپی راستی: اس چاپ میں حصہ لینے والے دائیں بائیں مڑتے رہتے ہیں۔

شل: اس چاپ میں لنگڑایا جاتا ہے اور حصہ لینے والے ایک پاؤں پر اس طرح زور دیتے ہیں جیسے کوئی لنگڑا چلتے ہوئے زور دیتا ہو۔

لوک ساز

بینا: بانسری کی طرح کا ساز ہے۔اس کو بجانے والا گانا بھی گاتا رہتا ہے۔

چنگ: نامی ساز میں صرف ایک تار لگا ہوتا ہے۔منہ میں رکھ کر شہادت کی انگلی سے بجایا جاتا ہے۔

دمبورہ: ایک کلاسیکل ساز، جو ستار کی مانند ہے۔اس میں دو یا تین تاریں ہوتی ہیں۔

سرونر: ایک قسم کا ساز ہے، جو سارنگی کی مانند ہوتا ہے۔

نل رگرو: بانسری سے بڑا اور الغوزہ سے ملتا جلتا ایک مخصوص ساز ہے۔

شول: مٹی کا بنا ہوا وہ ساز جسے آگ میں پکا کر سخت کیا جاتا ہے۔اس کی آواز سیٹی کی طرح ہوتی ہے۔

محمود خانی لارہ: بلوچستان میں رباب نے گزشتہ صدی کی ابتداء میں بے حد ترقی کی۔خان قلات میر محمود خان دوم نے اس کی سرپرستی کی۔ان کے نام سے یہ مسحور کن ساز مشہور ہے۔سننے والا وجد میں آتا ہے۔

پونزک: یہ قلم کے برابر ہوتا ہے۔اس میں سے آواز بین کی طرح نکلتی ہے لیکن یہ آواز پرکشش ہوتی ہے۔

براہوی کہاوتیں

براہوی گو کہ اس خطے کی قدیم ترین زبان ہے لیکن اس کی بدقسمتی کہیے کہ اس کی تحریری شکل اور بالخصوص اس کے ادب کی عمر چند برسوں پر مشتمل ہے جس کے باعث اس کا اعلیٰ فوک لور اب تک مکمل طور پر دریافت نہیں ہو سکا۔یہی وجہ ہے کہ براہوی لوک گیت اور کہانیوں کی طرح براہوی کہاوتوں کی تعداد بھی محدود ہے۔فارسی سے براہ راست متاثر ہونے کے باعث اکثر کہاوتوں پر فارسی ماخذ کا گمان گزرتا ہے جبکہ بیشتر کہاوتیں اور ضرب الامثال براہ راست فارسی یا اردو سے براہوی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔لیکن اس کے باوجود یہ اس کے قدیم فوک لور ہی کی دین ہے کہ ایسی کہاوتیں، محاورے اور ضرب الامثال محدود تعداد میں محفوظ رہیں جو خالصتاً براہوی خطے کی ثقافت کی مظہر ہیں۔پہلی بار ان کہاوتوں کو کتابی شکل میں محفوظ کرنے کا کام کامل القادری صاحب نے کیا۔

انہی کا کہنا ہے:

"براہوی زبان کے محاورات اور ضرب الامثال براہوی تہذیب و تمدن کے آئینہ دار ہیں۔ان میں سادگی و پرکاری کا گنگا جمنی رنگ ہے۔صباحت و ملاحت کا حسین امتزاج ہے۔"

اس ضمن میں ذیل میں ایسی ہی چند منتخب کہاوتوں کا مرقع پیش کیا جا رہا ہے جو نہ صرف خالصتاً براہوی لب و لہجے کی دین ہیں بلکہ اس خطے کے ثقافتی و سماجی پہلوؤں کا عکس بھی آپ کو ان میں نمایاں طور پر نظر آئے گا۔

"بج" خالص دراوڑی ماخذ کا لفظ ہے براہوی میں اس کے معنی پیٹھ کے ہیں۔اس سے متعلقہ کہاوتیں سنیے:

ای تینا مارے دو نو پرس تنوٹ

کہ او نا بجے دشمنک خنر

یعنی میں نے اپنے بیٹے کو ایسا دودھ نہیں پلایا کہ اس کا دشمن کبھی اس کی پیٹھ دیکھ سکے۔

ہراتہو کشے بندنے حقے کہ بجے ایتے

یعنی، ہر شخص ہوا کا رخ دیکھ کر اپنی پیٹھ پھیر لیتا ہے۔معنی ہیں چڑھتے سورج کو پوجنا۔

اوا بج محکم اے

لفظی معنی ہیں اس کی پیٹھ مضبوط ہے۔یعنی اس کی حمایت محکم ہے۔

او کنا بجان بس، کنے و کہ تیں

یعنی، پیچھے سے آیا اور مجھے دھکا دیا۔(بج خلنگ، کا مطلب ہے کہ پر اعتبار کرنا)

ای نے مردس خناٹ، نیٹی بج خلکٹ

یعنی، میں نے تمہیں مرد سمجھ کر تمہیں اپنا سہارا (پشت) سمجھا تمہارے ہاں پناہ لی۔

"بج" کا استعمال پیٹھ موڑنے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

کہاوت ہے:

دشمنے بج متنگ، لغورنا کاریم اے

مارءُ لعل: اس گیت میں الھڑ دوشیزہ اور نوجوان عاشق سوختہ اپنے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

ماہ لنج/ مہلنج: اس لوک گیت میں محبوبہ کو ماہ جبیں یا قمر پیکر کے بجائے مہلنج کہا گیا ہے۔ جس کے معنی اپنے حسن ورعنائی کی وجہ سے مہتاب کو شرما دینے والی محبوبہ کے ہیں اس میں ماہ لنج کی برابر تکرار ہوتی ہے۔

مودہ: کسی کی موت پر گائے جانے والا گیت۔

مومِلا مودی: مومل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کی خوبصورت ترین دوشیزہ تھی۔ اس کا مسکن لدھانہ میں دریائے کاک کے کنارے تھا۔ براہوئی لوک گیتوں میں محبوبہ کے لیے مومل کا لفظ عام مستعمل ہے۔

نازل: اس لوک گیت میں محبوبہ کو ناز وادا کا پیکر بیان کیا گیا ہے۔ جس کے فراق میں عاشق زار تڑپ تڑپ کر دم دے رہا ہے لیکن محبوبہ اپنی اداؤں سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔

ہلو ہالو: ایک طربیہ گیت ہے۔ اس میں شادی بیاہ کے علاوہ مختلف قسم کے دلچسپ مضامین باندھے جاتے ہیں۔

لوک ناچ

چاپ: براہویوں کا مخصوص لوک رقص "چاپ" کہلاتا ہے۔ دیگر کھیلوں کی طرح اس میں بھی سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں حصہ لینا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ چاپ میں پوری پھرتی کے ساتھ تمام جسم کو حرکت دینا اور ٹانگوں کو جسم کی حرکت کے ساتھ ہلانا، ڈھول کی تال پر قدموں کا آگے پیچھے ہونا، دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ملا کر تالی بجانا ہوتا ہے۔ اس میں مرد اور عورتیں الگ الگ حصہ لیتی ہیں یعنی مردوں کا چاپ الگ اور عورتوں کا الگ ہوتا ہے۔ یہ رقص خوشی کی تقریبات، مثلاً شادی بیاہ، بچے کے نام رکھنے کی رسم وغیرہ کے موقع پر پیش کیا جاتا ہے۔ جب عورتیں چاپ کے لیے آتی ہیں تو ڈھول بجانے والے کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی ہے تاکہ وہ عورتوں کو نہ دیکھ سکے۔

ڈھول بجانے والا میدان میں کھڑا ہو کر ڈھول بجانا شروع کر دیتا ہے تو اس کے ساتھ سرنا بجانے والا سرنے پر لوک گیت گاتا ہے۔ ڈھول عموماً اس کے گلے میں ہوتا ہے اور جب جوش وخروش زیادہ ہوتا ہے تو وہ ڈھول کو سر پر رکھ کر بجاتا ہے۔ چاپی (چاپ میں حصہ لینے والے) اس کے اردگرد دائرہ کی شکل میں جمع ہو جاتے ہیں اور ڈھول کی تال پر قدم آگے پیچھے اٹھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یک چاپی (ایک قدمی)، دوچاپی (دوقدمی)، سہ چاپی (سہ قدمی) وغیرہ چاپ قابل ذکر ہیں۔ قدموں کی رفتار ڈھول کی تال کے ساتھ ساتھ آہستہ اور تیز ہوتی جاتی ہے۔ جب چاپ کا اختتام ہوتا ہے تو ڈھول کی آواز میں بڑی تیزی اور روانی پیدا کی جاتی ہے۔ چاپی بھی پھرتی دکھاتے ہیں اور اسی تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتے رہتے ہیں۔

پرکاڑی: اس چاپ میں حصہ لینے والے نیم دائرہ کی شکل بناتے ہیں۔ ڈھول بجانے والا آہستہ آہستہ آگے جاتا رہتا ہے اور یہ اس کے ساتھ چلتے رہتے ہیں پھر وہاں سے واپس ہوتے ہیں اور ڈھول بجانے والا پہلے ان کے آگے تھا اب ان کے پیچھے پیچھے ڈھول بجاتا ہوا آتا ہے۔

لٹکی: اس چاپ میں حصہ لینے والے ایک ہاتھ سے ایک دوسرے کا دامن پکڑتے ہیں اور سیدھی قطار بناتے ہیں اور ایک ہاتھ کو ہلاتے رہتے ہیں۔

تولوک: اس چاپ میں حصہ لینے والے زمین پر بیٹھ کر اپنا رقص دکھاتے ہیں اور دونوں ہاتھوں کو ہلاتے رہتے ہیں۔

لیٹوک: اس چاپ میں حصہ لینے والے لیٹے رہتے ہیں اور کروٹیں بدل بدل کر آگے جاتے ہیں اور پھر پیچھے آتے ہیں۔

ڈولو: اس چاپ میں حصہ لینے والے کمر جھکائے ہوئے ہوتے ہیں اور اسی حالت میں ہاتھوں کو ہلاتے رہتے ہیں۔

زغمی: اس چاپ میں حصہ لینے والے تلواریں اٹھا کر ان کو ہوا میں لہراتے اور اپنے سروں پر گھماتے رہتے ہیں۔ چاپی (چاپ میں حصہ لینے والے) دائرے کی شکل میں ہوتے ہیں اور ڈھول بجانے والا درمیان میں ہوتا ہے۔

ڈوکو: اس چاپ میں حصہ لینے والے تلواروں کے بجائے چھوٹے چھوٹے ڈنڈے اٹھا کر ایک دوسرے سے اس طرح ٹکراتے ہیں جیسے کہ تلوار بازی ہو رہی ہو۔ اس کو لٹکی بھی کہتے ہیں۔

مینگلی: یہ چاپ نوشکی ضلع چاغی اور جھالاوان کے ان علاقوں میں پیش کیا جاتا ہے

یعنی، بزدل کا کام ہے کہ دشمن کو (جب مقابلہ ہو) پیٹھ دکھائے۔

"بامُس" براہوی میں ناک کو کہتے ہیں۔ اس سے متعلق کہاوت ہے۔

نے آن تے بامس کان اسینگامنٹ

یعنی، میں تمہارے ہاتھوں ناک تک آ گیا ہوں محاورتاً اس وقت بولا جاتا ہے جب ایک شخص کسی سے حد درجہ بیزار ہو چکا۔

ہند نو ہتیں کنے پاریس

کہ کنا بامسے تھڑلیس

لفظی معنی ہوئے کہ تم نے مجھ سے ایسی بات کہی گویا میری ناک کاٹ دی ہو یعنی تم نے مجھے ہر ایک کی نگاہ سے گرا دیا، بے عزت کر دیا۔

پنڈو کانا پھڑ پھر، بامس جھر

یعنی، بھکاری کا پیٹ بھرا مگر ناک کٹی۔ مراد یہ ہے مانگنے والے کی عزت جاتی رہتی ہے۔

"بے" نمک کو کہتے ہیں، کہاوتیں ہے۔

سورنگا دیرٹی، بے شائنگ ٹی ء

یعنی، وہ کھارے پانی میں نمک ڈال رہا ہے۔

اودے بے آف

لفظی معنی ہیں اس میں نمک نہیں۔ اس سے مراد اس میں اخلاق نہیں، شرم وحیا نہیں۔

چل یا جھل سے مراد ہے دوڑنا تیز چلنا۔

براہوی میں محاورتاً کہتے ہیں:

ہنگ تے چل اے

کنگ تے پھل اے

یعنی اگر کہیں جانا ہو تو بھاگ کر جاؤ اور کھانا ہو تو یوں کھاؤ جیسے لوٹ مار مچائی جاتی ہو۔

"دز" کے معنی گرد وغبار کے ہیں۔

کہاوت ہے:

اسہ سوارے دز اف

لفظی معنی اس کے ہیں کہ ایک سوار سے گرد نہیں اڑتی۔ یعنی اکیلا آدمی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

"گزگی" براہوی میں مشرقی ہوا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

کامل القادری اس کے ماخذ سے متعلق لکھتے ہیں:

"چونکہ قلات کے مشرق میں ایک گاؤں گزگ ہے۔ لہٰذا یائے نسبتی لگا کر گزگی بنا لیا گیا اور اس سے مراد مشرقی ہوا لیا جانے لگا۔

کہاوت ہے:

گزگی پھر نالمہ!

لفظی معنی ہوئے مشرقی ہوا بارش کی مار ہے۔

دراصل جب مشرقی ہوا چلتی ہے تو بارش ہوتی ہے اور بلوچستان میں مون سون ہوائیں بھی مشرقی سمت سے آتی ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں "گرویچ" یعنی شمالی یا مغربی ہوا جب چلتی ہے تو سردی کا موسم شروع ہو جاتا ہے اور دوسری بڑھ جاتی ہے۔

"غلہ" براہوی میں بھی اردو ہی کی طرح اناج کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے معروف مثل ہے:

نشہ غلہ ٹی اے، ڈوہ بھنگ ٹی اے

یعنی نشہ تو اناج میں ہے اور نام بدنام بھنگ کا ہے اس سے مراد ہے کسی کا گناہ کسی کے سر۔

خن آنکھ کو کہتے ہیں براہوی میں کہاوت ہے:

بادشاہ تہ خن اف، خف ارے

یعنی، بادشاہ آنکھیں نہیں رکھتا، کان رکھتا ہے۔

ایک اور دلچسپ کہاوت یوں ہے:

ککڑ خایہ اس اپتک جہانے خبر کیک

او صرف مرواری خینک تواره کیک

یعنی، مرغی انڈہ دیتی ہے اور دنیا کو سناتی ہے لیکن صدف سے مروارید (موتی) پیدا ہوتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

براہوی لفظ "خارشت" فارسی کے "خارش" سے بنا ہے یعنی کھجلی پیدا ہونا یا کھجلانا۔ براہوی کی ایک دلچسپ کہاوت ہے:

ہیٹ نہ پنڈو کہ خارشت کنیک

شوان نا ارغ اے کنیک

یعنی بکری کو جب مار کھانے کے لیے کھجلی ہوتی ہے تو وہ چرواہے کو غذا سے محروم کر دیتی ہے یا دودھ نہیں دیتی۔

"غنج" فارسی کے لفظ گنج سے لیا گیا ہے جس کے معنی بڑے بورے کے ہوتے ہیں۔ براہویوں کے ہاں لانگو قبائل کے بورے بہت بڑے ہوتے ہیں اور عمومی طور پر ان کی مثال دی جاتی ہے۔ براہوی کی یہ مثل اسی سے بنی ہے:

سیر کپسیہ زہرہ زئی ناغنج مس

لفظی معنی اس کے یوں بنتے ہیں کہ تم تو سیر، ہی نہیں ہوتے جیسے کہ تم زہرہ زئی (لانگو) کے بورے ہو۔عموماً پیٹو افراد کے لئے یہ مثل بولی جاتی ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہوا براہوی ثقافت حامل علاقوں میں ہندو بھی بڑی تعداد میں رہائش پذیر ہیں۔ان کی اکثریت براہوی رسم ورواج میں رنگی ہوئی ہے اور وہ براہوی زبان ہی بولتے ہیں۔اس کا اندازہ اس طرح کی ضرب الامثال سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

براہوی علاقوں میں بولی جانے والی ایک مثل کچھ یوں ہے:

ہولی ہول کرے

منگلی پھل کرے

سیسو زڑ کرے

یعنی کہ ہولی آ گئی ہے۔منگلی (ایک خودرو جھاڑی) کھل گیا ہے۔سیسی دوڑنے لگی ہے۔

یعنی کہ بہار آ گئی ہے یہ تینوں علامتیں بہار کی ہیں۔

خوراک یا ہورک کے معنی ہیں خالی یا خالی (چیز) کی کیا اوقات؟ براہوی میں کہتے ہیں:

خورکنگا تو فکان ارابندغ خلیرہ

یعنی خالی بندوق نے دو آدمیوں کو خوفزدہ کر دیا۔

دو آدمیوں سے مراد ہے ایک دشمن جو بندوق کو دیکھ کر ڈر گیا اور دوسرا وہ شخص جس کے ہاتھ میں بندوق ہے۔اس کے خوف کا باعث اس کی یہ آگہی ہے کہ بندوق خالی ہے اور کہیں دشمن کو یہ خبر نہ ہو جائے۔

"خشکابہ" بلوچستان میں عام ہے۔اس سے مراد وہ قطعہ زمین ہے جس کی سیرابی کا دارومدار بارش پر ہوتا ہے۔براہوی میں اس کا تلفظ "خشکاوہ" ہے۔ کہاوت ہے:

خشکاوہ گوار نا شکار اے

اس کا مطلب ہے کہ خشک آبہ کی کاشت اتنی بری ہے جیسے کہ جنگلی گدھے گورخر کا شکار کرنا۔

"ملیخ" بیٹے کی بیوی یعنی بہو کہتے ہیں براہوی میں اس سے متعلق کہاوت یوں ہے:

"ملیخ ارانا چاری اے"

اس کا مطلب ہے، دلہن (یا بہو) گھر کی جاسوسہ ہوتی ہے۔

مسٹر بیٹی کو کہتے ہیں اور اس کے لیے کہاوت ہے:

"مسٹر پین نا بھاجی اے"

یعنی بیٹی اوروں کے لیے ہوتی ہے اس سے مراد بیٹی کا اصل گھر سسرال ہوتا ہے۔

"پین" براہوی کا کثیر المعنی لفظ ہے۔اس کے معنی ہیں دوسرا، دیگر، اور، مزید، اور بھی، دوسرے لوگ، اور لوگ، فلاں کا سا، مختلف وغیرہ ہے۔ براہوی میں کہاوت ہے:

پین، نا ملک نا بادشاہ تینا

ملک، نا پنڈنگ جوان اے

یعنی گھر کا دال دلیہ، دوسرے ملک، کی بادشاہت سے بہتر ہے۔

(یہ کہاوت گھر کی مرغی دال برابر کے نہ صرف الٹ ہے بلکہ اس بات کی غماز ہے کہ یہاں کے لوگ اپنے خشک پہاڑوں اور بنجر زمینوں والی دھرتی سے بھی کس قدر انیست رکھتے ہیں۔)

"سالم" کا لفظ داماد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

براہوی کی معروف مثل ہے:

"سالمے کہ بیڑس گڑانیتو، جوان مریک"

لفظی مطلب ہے اپنے داماد کو خشک نچوڑ لو، وہ سیدھا رہے گا۔اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ داماد سے اچھی رقم وصول نہیں کی گئی تو بیوی کی قدر نہیں کریگا۔

"وانڈی" کے معنی ہیں گھر سے دور غربت میں مارے، مارے پھرنا یہ لفظ ان چرواہوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو مال مویشی کی چرائی کے لیے جنگلوں، پہاڑوں اور میدانوں میں اکیلے لے جاتے ہیں۔

براہوی میں کہاوت ہے:

گروتیج وانڈی تا قصاب اے

یعنی جنوبی ہوا وانڈیوں کے لیے قصاب ہے۔(اس سے مراد ان جوانوں کے لیے بھی ہے جو بے گھر ہوں، وانڈی کے ایک معنی خانماں برباد کے بھی ہیں۔)

"ورنا" براہوی میں نوجوان کو کہتے ہیں مثل ہے:

"ورنائی ناھار، بندغ تا ایلم اے"

یعنی کسی کی جوانی کا بیٹا اس کا دوسرا بھائی (دست و بازو) ہوتا ہے۔اس سے مراد ہے کہ چھوٹی عمر میں شادی کر لینی چاہیے تاکہ بڑھاپا آنے سے پہلے اولاد جوان ہو کر سہارا بن سکے۔

ان کے علاوہ بعض معروف کہاوتیں یوں ہیں:

ویل بادشاہ تے کن اے

غریب ہر وخت ویل ٹی اے

یعنی بدقسمتی یا نقصان بادشاہ کی منتظر ہوتی ہے لیکن غریبوں کے ہاں تو ہر وقت اس کا بسیرا ہوتا ہے۔

"بادشاہ گندہ مرے، ولے وزیر تدا گہ جوان مرے، ملکے توریک"

یعنی بادشاہ اس وقت تک خراب نہیں ہوسکتا جب تک اس کا وزراء اچھے ہوں تو وہ ملک کو محفوظ رکھے گا۔

شرح بولو ہم دو سنئے

یعنی شرم بھولو (بندر) میں بھی ہوتی ہے۔

"خاخو پاٹا سوارا ے"

یعنی کوا شاخ پہ بیٹھا ہے۔ اس سے مراد بچے بھی کان رکھتے ہیں۔ یہ کہاوت ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جب کسی کی غیر موجودگی میں کوئی بات کی جاری ہو اور کوئی اس پر کان دھرنے کی کوشش کرے تو بات بدلنے کے لیے اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔

مسٹر باوہ ء پارے کہ ای لگڑ اٹ

با وہ تہ پارے، بش مہ کہ ہرو نے

یعنی لڑکی نے باپ سے کہا کہ میں برہنہ ہوں باپ نے کہا کھڑی ہو جاؤ تا کہ میں دیکھ لوں (مجھے یقین کیسے آئے؟) یہ مثل بچوں کی طرف سے لاپرواہ برتنے والے والدین کے لیے بول جاتی ہے۔

جوانو کسب گیرس اے

ہر ہور تہ اسہ ہنرس اے

لفظی معنی ہیں کہ وہ اچھا دست کار ہے اس کی ہر انگلی میں ایک ہنر ہے۔

کسی کی تعریف کرنی ہو تو یہ مثل بولی جاتی ہے۔

"باوہ اس، ہم بزغر اس"

لفظی معنی ہیں تم میرے باپ ہی سہی مگر یاد رکھو میرے بزگر (نوکر) بھی ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم مجھ پہ اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتے یا من مانی نہیں کر سکتے۔

لوک کہانیاں

براہوی میں لکھی ہوئی کہانیوں کی تعداد محض پانچ ہے جو تحریری طور پر موجود ہیں۔ چاروں کہانیوں کا موضوع مختلف ہے۔ مگر چاروں انتہائی سبق آموز اور تخیل پردازی کا شاہکار ہیں۔ لوک کہانیوں کی روایت چونکہ اس پورے خطے میں موجود رہی ہے اس لئے کسی بھی کہانی کو کسی مخصوص علاقے یا قبائل سے منسلک نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے یہی کہانیاں سیاق و سباق کے معمولی فرق کے ساتھ دیگر علاقوں اور قبائل میں مختلف زبانوں میں پائی جاتی ہوں۔ یہ کہانیاں علاقہ در علاقہ سفر کرتی تھیں البتہ ہر علاقے کے قبائل نے انہیں مقامی رنگ دینے کی کوشش کی جس سے کہانی مقامی معلوم ہونے لگتی ہے۔

مثال کے طور پر براہوی کی پہلی لوک کہانی "جگ بیتی" سیاق و سباق کی تبدیلی کے ساتھ بلوچی میں بھی موجود ہے۔ بلوچی زبان میں جو کہانی بیان کی جاتی ہے، اس میں ایک کردار کم ہے اور اس کا اختتامیہ یا انجام یکسر تبدیل ہے۔ سیاق و سباق کی یہ تبدیلی قبائل کی سماجی و فکری سطح کی بھی غماز ہے۔ اس طرح ممکن ہے کہ دیگر کہانیاں بھی اور علاقوں یا مختلف زبانوں میں پائی جاتی ہوں۔ لیکن وہاں ان کا مقامی رنگ یقیناً مختلف ہوگا۔

پروفیسر انور رومان نے پہلی بار ان کہانیوں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر محفوظ کیا آئندہ باب میں ان کہانیوں کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

پہلی کہانی:

جگ بیتی

خلاصہ: یہ کہانی ٹریجڈی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ ایک بڑھئی یا بت تراش، صراف، درزی اور ایک درویش کی کہانی ہے۔ جو ایک رات میں مل کر ایک عورت کا بت تراشتے اور اس کی آرائش کرتے ہیں۔ عورت کے بت میں جب جان پڑ جاتی ہے تو اس کی ملکیت پر چاروں میں جھگڑا ہو جاتا ہے ہوتے ہوتے مقدمہ کوتوال اور پھر ملک کے بادشاہ کے پاس پہنچتا ہے۔

ساری کہانی دراصل طاقت کے اختیارات کے استعمال کے گرد گھومتی ہے اور زر، زن اور زمین کی روایت میں سے "زن" اسکا بنیادی موضوع یا کردار ہے۔ جو اس کہانی کی بنیاد بنتی ہے۔ اور اسے آگے لے چلتی ہے۔ بادشاہ کا فیصلہ دراصل اس سماج میں، اس کے کردار اور عدل و انصاف کا ایک آئینہ ہے۔ جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ معاملہ جب زر، زن اور زمین میں سے کسی ایک کا ہو تو انصاف کا ترازو کیسے ہل کر رہ جاتا ہے۔

یہ بات یقیناً قابل حیرت بھی ہے اور قابل داد بھی کہ انسان نے کیسے محض اپنے تخیل کی بناء پر ہزاروں برس قبل بھی سماجی رویوں کی نفسیاتی بنیاد ڈھونڈنے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ صرف فوک لور کا ورثہ ہی نہیں۔ اس کی عظمت کی دلیل بھی ہے۔

متن: چار افراد کسی سفر پر جارہے تھے کہ انہیں راستے میں رات پڑ گئی۔ تعارف ہوا تو ان میں سے ایک بت تراش، دوسرا صراف، تیسرا درزی اور چوتھا درویش نکلا۔ اول الذکر تینوں اپنے پیشے کے لحاظ سے مکمل ساز و سامان سمیت سفر پہ روانہ تھے۔ چاروں کا ٹھکانہ ایک بیابان میں ہوا۔ جہاں ڈاکوؤں اور لٹیروں کا شدید خطرہ تھا۔ کسی بھی وقت کوئی

چور چکا آ کر انہیں لوٹ سکتا تھا۔ اس لئے چاروں نے مل کر طے کیا کہ باری باری پہرہ دیا جائے۔ طے ہوا کہ پہلے حصے میں بت تراش، دوسرے میں صراف، پھر درزی اور آخر میں درویش پہرہ دے گا۔ جب پہلے کی باری ختم ہو جائے گی وہ دوسرے کو جگا کہ خود سو جائے گا۔ رات کو ان چار پہروں میں تقسیم کر کے صراف، درزی اور درویش سو گئے او رتر کھان اس خیمہ سے باہر پہرہ دینے لگا جو انہوں نے مل کر رات گذارنے کے لیے بنا لیا تھا۔

رات کا پورا ایک پہر تھا اور بیابان کی تاریکی ماسوائے چاند کی چھن چھن کرتی چاندنی کے اور کچھ ایسا نہ تھا جس سے دل بہلا لیا جائے۔ بت تراش نے سوچا جاگے رہنے کے لیے تو کوئی مصروفیت ضروری ہے۔ اتنا وقت کیسے جاگ کر کٹے گا۔ وہ سوچنے لگا اور تخیل میں ایک محبوبہ کا خواب دیکھنے لگا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کیوں نہ آج اپنے ہنر کو آزماتے ہوئے اس تخیلاتی محبوبہ کا بت تراش لیا جائے۔ یہ خیال آتے ہی وہ خیمے کے اندر گیا۔ اس نے اپنے ساز و سامان کی پوٹلی اٹھائی اور خیمے سے باہر آ کر بت تراشنے لگا جس کا خاکہ یا تصور برسوں سے اس کے ذہن کے کسی گوشے میں جاگزین تھا۔ اس نے اپنے فن کا خوب ماہرانہ استعمال کیا اور ایک نوجوان عورت کا خوبصورت، دلکش، بت تراش لیا۔ جب اس کا کام مکمل ہو چکا تو رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس پہرے کی باری مکمل ہو چکی ہے۔ سو اپنا سامان اٹھا کر وہ اندر گیا اور جا کر صراف کو جگایا کہ جاؤ اب پہرے کی تمہاری باری ہے۔

صراف بادل نخواستہ اٹھا۔ مشکیزے سے پانی کے چند قطرے منہ پر ڈالے اور خیمے سے باہر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس تنہائی اور بیابان میں کیسے وقت گزارا جائے؟ اچانک اس کی نظر سامنے کھڑے عورت کے مجسمے پر پڑی، وہ ایک لمحے کو ٹھٹھک گیا۔ قریب جا کر دیکھا تو نہایت حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ ایسا خوبصورت اور حسین بت تراش بیابان میں کہاں سے آ گیا۔ وہ اس کے حسن میں اور بت تراش کی کاریگری میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اس خوبصورت مجسمے کے لیے حسین زیورات تراشے، یہ بت زیورات سے مزین ہو کر یقیناً مزید دلکش ہو جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے اپنا ساز و سامان جمع کیا اور باہر آ کر زیورات بنانے لگا۔ رات کا دوسرا پہر گزرنے تک وہ مختلف قسم کے حسین اور خوبصورت زیورات تراش چکا تھا۔ اس نے وہ تمام زیورات نوجوان عورت کے بت پر جا کر سجائے۔ دل ہی دل میں اپنے ہنر کی خود کو داد دی اور سوچنے لگا ان زیورات کے بغیر یہ بت کس قدر بھدا رہ جاتا۔ بہر کیف اس کے پہرے کا وقت تب تک پورا ہو چکا تھا۔ سو اس نے اندر جا کر درزی کو پہرے کے لیے جگایا اور خود جا کر سو گیا۔

درزی جب پہرے کے لیے خیمے سے نکل کر باہر آیا تو رات کے دو پہر گزر چکے تھے۔ اس لئے رات کی وحشت میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ درزی کیلئے کے لیے وقت گزارنا اور مشکل تھا۔ اس نے خیمے سے نکل کر جونہی نظریں دوڑائیں اسے سامنے وہی بت نظر آیا۔ قریب آ کر اس نے بت کا جائزہ لیا اور قریب ہی پڑے لکڑی کے ٹکڑوں اور زیوارت کے بچے کچے سامان سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ یہ کاریگری بت تراش اور صراف نے دکھائی ہے اور اس طرح انہوں نے جاگتے رہنے کے لیے اپنی مصروفیت کا سامان پیدا کر کے اپنی پہرے کی باری مکمل کی۔ درزی نے سوچا کیوں نہ وہ بھی اپنی کاریگری دکھائے۔ اس نے سوچا اگر اس بت کو کپڑے پہنا دیئے جائیں تو نہ صرف اس کی ستر پوشی ہو جائے گی بلکہ یہ ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے گا۔ اور اس کا حسن دو چند ہو جائے گا۔ زیورات کی دلکشی بھی واضح ہو جائے گی۔ سو یہ سوچ کر اس نے اپنا سامان اٹھایا اور نوجوان عورت کے حسین بت کے لیے کپڑے سینے لگا۔ اس نے اس بت کے لیے ثقافتی براہوی گج کے خوبصورت کپڑے سی کر اپنے پہرے کی باری مکمل کی اور پھر وہ کپڑے اس بت کو پہنا دیئے۔ اب یہ بت ہر طرح سے مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سامان اٹھایا اور خیمے میں جا کر درویش کو اٹھایا کہ اب پہرے کی باری اس کی تھی۔

بوڑھے درویش نے تسبیح ہاتھ میں لی اور اللہ اکبر، اللہ اکبر پڑھتا ہوا خیمے سے باہر آیا۔ رات کا آخری پہر تھا اور چاند اپنے جوبن پر تھا۔ چاندنی درختوں سے چھن چھن کر خیمے سے باہر ایک عجیب پر کیف سماں پیدا کر رہی تھی۔ خیمے سے باہر نکلتے ہی درویش کی پہلی نظر اس خوبصورت مجسمے پر پڑی۔ پہلے تو وہ ٹھٹھک کر رک گیا کہ اس بیابان میں ایسی حسین و جمیل عورت کہاں سے آ گئی جو اس قدر خوبصورت لباس اور قیمتی زیورات زیب تن کئے ہوئے ہے۔ لیکن جب چند لمحوں تک اس نے عورت میں کوئی جنبش نہ پائی تو آہستہ آہستہ اس کے قریب آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ تو ایک بت ہے۔ مگر اس قدر خوبصورت اور دلکش کہ بالکل جیتی جاگتی عورت کا گماں ہونے لگے۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر واقعی اس میں جان پڑ جائے اور یہ بولنے لگ جائے تو اس کے آواز کیسی شیریں ہوگی؟ یہ سراپا اگر حرکت کرنے لگ جائے تو کتنوں کے دل حرکت کرنا چھوڑ دیں گے؟ یہ خیال پا کر درویش نے اپنا مصلیٰ اٹھایا اور بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہوا کہ "یا الٰہی، یا پروردگار! تو نے آدم کے جسم خاکی میں جان ڈالی تو چاہے تو پتھروں میں بھی جان ڈال سکتا ہے۔ آج میں تجھ سے ملتجی ہوں کہ میری عمر بھر کی عبادت و ریاضت کے صدقے اس بت میں جان ڈال دے کہ یہ چلنے پھرنے لگے۔ بے شک تو اس پر قادر ہے۔"

درویش رات کے آخری پہر تک عبادت میں پڑا رہا۔ روایت کے مطابق بارگاہ ایزدی میں اس کی دعا قبول ہوئی اور صبح کاذب کے وقت اس نے سجدے سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ بت میں جان پڑ چکی تھی اور خوبصورت لباس میں ملبوس، قیمتی زیورات سے آراستہ ایک نہایت حسین و جمیل نوجوان عورت خیمے کے سامنے موجود تھی۔

درویش اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔ اتنے میں صبح کے آثار دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر اس کے باقی دوست بھی خیمے سے نکل آئے۔ انہوں نے جب بت کی جگہ سانس لیتی ہوئی زندہ عورت دیکھی تو مبہوت ہو گئے۔ درویش نے ان سے کہا کہ میں نے عبادت و ریاضت کے بدلے خدا سے دعا مانگ کر اس میں روح ڈال دی ہے۔ اب یہ میری ہے۔ یہ سن کر بت تراش نے کہا: "یہ تمہاری کیسے ہو سکتی ہے اس کو تو اشا میں نے ہے اس لئے یہ میری ہے۔" اتنے میں صراف چلا اٹھا "اس کے لیے قیمتی زیور میں نے بنائے ہیں۔ اس لئے اس پر میرا حق ہے۔" درزی کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دعویٰ کیا کہ "اسے کپڑے میں نے پہنائے ہیں۔ اس لئے کوئی اور اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے" چاروں میں جھگڑا ہو گیا۔ آخر طے پایا کہ کسی غیر جانبدار ثالث سے فیصلہ کرا لیتے ہیں اور جو راہ گیر گزرے گا، وہی ثالث ہو گا۔ چاروں نے اس پر اتفاق کیا۔ صبح ہو چکی تھی اتنے میں ایک راہ گیر کا وہاں سے گزر ہوا۔ چاروں نے اسے روک کر سارا ماجرا سنایا اور گزارش کی کہ وہ غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے انصاف پر مبنی رائے دے کہ اب اس عورت پر کس کا حق بنتا ہے؟ راہ گیر نے چاروں کو انصاف کا یقین دلایا لیکن جیسے ہی اس نے عورت کو دیکھا ششدر رہ گیا۔ اس کی نیت بدل گئی اس نے چاروں سے کہا "تم سب جھوٹے ہو یہ میری بیوی ہے جو میرا بچہ لے کر بھاگ گئی تھی۔" اور پھر تحکمانہ انداز میں عورت سے کہنے لگا "اے عورت بول میرا بچہ کہاں ہے۔" عورت تو سہمی سہمی سے خاموش رہی مگر ان چاروں نے اسے پکڑ لیا اور زدکوب کیا۔ لیکن وہ اپنے دعوے پر اڑا رہا۔ بات بڑھ گئی تو پانچوں نے فیصلہ کیا کہ شہر جا کر کوتوال سے فیصلہ کروایا جائے۔

پانچوں عورت کو لے کر کوتوال شہر کے پاس پہنچے۔ سارا ماجرا اس کے گوش گزار کیا اور درخواست کی کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ کوتوال نے عورت کو پیش کرنے کا حکم دیا تا کہ اس کا موقف بھی سن لیا جائے۔ عورت پیش ہوئی۔ اسے بولنے کو کہا گیا اس نے کہا کہ بت تراش نے اسے تراشا، صراف نے زیور بنائے، درزی نے کپڑے پہنائے اور درویش کی دعا سے خدا نے اس میں روح پھونکی۔ چاروں اس پر اپنی ملکیت جتانا چاہ رہے ہیں اور راہ گیر بھی اس دعوی میں شامل ہو گیا۔ مگر درحقیقت وہ ان میں سے کسی کی ملکیت نہیں۔ عورت نے جیسے ہی اپنی بات مکمل کی، اچانک کوتوال چلا اٹھا "بالکل وہی آواز۔ اب میں نے پہچان لیا، یہ تو میرے بھائی کی بیوی ہے۔ وہ دونوں ایک بزرگ کے مزار پر گئے تھے، پھر واپس نہیں آئے۔ شکر ہے یہ زندہ ہے مگر لگتا ہے میرے بھائی کو تم پانچوں نے مل کر مار ڈالا ہے۔ بتاؤ میرے بھائی کی لاش کہاں ہے؟"

پانچوں بڑے سٹپٹائے کہ اب کیا کہیں؟ کوتوال نے عورت کو اپنے پاس رکھ لیا اور انہیں لے کر بادشاہ کے دربار میں پیش ہوا۔ کوتوال نے اپنا قصہ سنایا۔ بادشاہ نے ان سے صفائی میں بولنے کو کہا تو پانچوں نے اصل بات بتائی اور فریاد کی کہ کوتوال اس عورت کو ہتھیانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ بادشاہ نے کوتوال کو عورت پیش کرنے کو کہا۔ کوتوال عورت کو بادشاہ کے حضور لے آیا۔ بادشاہ نے جیسے ہی عورت کو دیکھا۔ اس کے حسن سے متاثر ہو کر اس پر فریفتہ ہو گیا۔ سو اس نے فیصلہ یہ سنایا کہ بت تراش، درزی اور صراف نے اپنا اپنا ہنر دکھایا، درویش نے صرف دعا کی۔ راہ گیر تو ایسے ہی بیچ میں آ گیا اور کوتوال جھوٹا ہے اس لئے تم میں سے کوئی بھی اس عورت کا حق دار نہیں، میں چونکہ بادشاہ ہوں اور اس سرزمین کا مالک ہوں۔ اس لئے یہ عورت بھی میری ملکیت ہے۔

اس طرح بادشاہ نے عورت کو اپنے حرم میں رکھ لیا۔ اور ان سب کو زندان میں ڈال دیا۔

دوسری کہانی:

انتقام

خلاصہ: بنیادی طور پر یہ ایک اخلاقی کہانی ہے جو اخلاقی اقدار اور روایت کے گرد گھومتی ہے۔ منصور اور شف چراغ اس کے مرکزی کردار ہیں جو نوجوان میاں بیوی ہیں۔ باقی کرداروں میں وزیر، وکیل اور قاضی شامل ہیں۔ شف چراغ نہایت حسین و جمیل ہے۔ اس قدر کہ بادشاہ سے لے کر قاضی اور وکیل تک سبھی اس کے نام دوستی کا پیغام بھجواتے ہیں۔ شف چراغ بجائے شوہر سے اس کی شکایت کرنے کے ان سے بڑی عقلمندی اور ہوشیاری کے ساتھ کچھ اس طرح نمٹتی ہے کہ نہ تو اس کی عزت پر حرف آتا ہے اور نہ ہی کوئی تنازعہ کھڑا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا بنیادی مرکزی کردار شف چراغ کا ہی ہے جس کے ذریعے برا ہوی عورت کی استقامت، جرأت اور عقلمندی کو تحریری طور پر عکس بند کیا گیا ہے۔ اس لئے کہانی کا عنوان اس کے مرکزی خیال سے ہم آہنگ نظر نہیں آتا۔ البتہ کہانی کو دلچسپ بنانے کے لیے اس میں مزاح کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کے باعث واقعات میں ذومعنویت کے ساتھ ساتھ قاری کی دلچسپی بھی نہ صرف برقرار رہتی ہے بلکہ اسکے تجسس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

متن: منصور کے والدین بچپن میں ہی وفات پا چکے تھے۔ اس لئے اس کی پرورش کی ذمہ داری اس کے چچا پر عائد تھی۔ چچا لڑکپن تک اس کی تمام ضروریات پوری کرتا رہا مگر وہ جیسے ہی جوان ہوا اسے خود کفیل بنانے اور اپنے پیروں پر کھڑا

کرنے کے لیے قاضی صاحب کے ہاں ملازمت کے لیے بھجوادیا۔ اس کے چچا کی سفارش پر قاضی نے اسے اپنے اصطبل میں جانوروں کی دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی کے لیے ملازم رکھ لیا۔ مگر قاضی طبعاً نہایت سخت مزاج واقع ہوا تھا۔ وہ منصور سے بہت زیادہ کام لیتا اور سختی سے پیش آتا۔

ایک روز منصور کی طبیعت سخت ناساز تھی جس کے باعث وہ کام کاج نہ کرسکا۔ قاضی اصطبل کی نگرانی کے لیے آیا تو وہاں صفائی نہ دیکھ کر نہایت سیخ پا ہوا۔ اس نے منصور کو بلا کر کام نہ کرنے کی وجہ پوچھی منصور نے اپنی طبیعت کی ناسازی کا بتایا مگر قاضی کا دل ذرہ برابر نہ پسیجا۔ بجائے اس نے اظہار ہمدردی کرنے کے اسے کوڑوں سے سزا دی اور خوب مارا پیٹا۔ منصور کو اس روز قاضی پر سخت غصہ آیا۔ اس نے ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور تہیہ کرلیا کہ یہاں سے دور کہیں چلا جائے گا خوب محنت کر کے دولت اور طاقت جمع کرے گا اور ایک روز ضرور واپس آئے گا اور آ کر قاضی سے اپنی اس ذلت کا انتقام ضرور لے گا۔ یہ سوچ کر منصور وہاں سے چوری چھپے بھاگ نکلا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک بیابان میں آ نکلا۔ مسلسل بھاگنے کی وجہ سے پیر سوج گئے اور گلا سوکھ کر کانٹا بن گیا۔ ایسے میں اس کی ملاقات ایک عمر رسیدہ چرواہے سے ہوئی۔ چرواہے کو اس کی حالت پر رحم آیا۔ اس نے اپنے مشکیزے سے اسے پانی پلایا اور قریب ہی واقع اپنے خیمے میں لے آیا۔ جہاں اس کی نوجوان بیٹی شف چراغ اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے بیٹی سے کہا کہ وہ منصور کے پیروں کے زخموں کے لیے جڑی بوٹیوں کا مرہم تیار کردے۔ اور منصور کو آرام کرنے کے لیے کہا۔

بعدازاں منصور کی کہانی سن کر چرواہے نے اس سے کہا کہ وہ یہاں اس خیمے میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی بیوی بیٹی کو جنم دیتے ہی چل بسی تھی۔ اب وہ سن رسیدہ بھی ہوگیا ہے اس لئے اگر وہ چاہے تو اس کا بیٹا بن کر ان کے ساتھ اس خیمے میں رہ سکتا ہے اور اس کے ریوڑ کو چرا کر انہی سے گزر بسر بھی کرسکتا ہے۔ منصور کا وہاں دل لگ گیا تھا۔ وہ بوڑھے چرواہے اور اس کی نوجوان بیٹی کے خلوص اور محبت سے متاثر ہوا تھا۔ اس لئے اس نے وہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ بوڑھا چرواہا اب دن بھر خیمے میں آرام کرتا۔ شف چراغ اور منصور ریوڑ چراتے اور اس کی خدمت کرتے۔ اسی دوران دونوں نے ایک دوسرے میں دلچسپی لی اور پھر شف چراغ نے باپ سے مطالبہ کردیا کہ وہ اگر شادی کرے گی تو اسی لڑکے سے، ورنہ نہیں کرے گی۔ چرواہے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ دستور کے مطابق وہ برداری سے باہر اس کا رشتہ نہیں کرسکتا مگر شف چراغ اٹل رہی۔ اس نے باپ سے کہہ دیا کہ اس کے نزدیک اس کی زندگی اہم ہے یا دستور؟ باپ شش و پنج میں پڑ گیا۔ ایک طرف برادری تھی۔ برادری کا دستور تھا اور دوسری طرف بیٹی جو نہ صرف اسے بے حد عزیز تھی بلکہ اکلوتی بھی۔ اس نے سوچا وہ ایسے دستور کا کیا کرے گا جو اس کی بیٹی کو خوشیاں نہ دے سکے اور پھر زندگی تو اسی کی ہے۔ اسی نے گزارنی ہے۔ اس لئے اس پر اختیار بھی اسی کا ہونا چاہیے سو اگلے روز اس نے مولوی کو بلوایا اور بڑی سادگی سے دونوں کا نکاح پڑھوادیا۔

شف چراغ منصور کو پا کر نہایت خوش تھی کہ اس نے جسے چاہا وہی اب اس کا زندگی بھر کا ساتھی تھا۔ منصور بھی مسرور تھا کہ شف چراغ نے اس کے لیے برادری کے دستور سے بغاوت کی تھی اور وہ بھی ایک عورت ہو کر۔ اس لئے وہ اس پر دل و جان سے فدا رہتا۔ وقت گزرتا رہا۔ اس دوران ان کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی جس کا نام انہوں نے زیغم رکھا۔ منصور کو اب اپنے شہر کی یاد ستانے لگی۔ اس نے اپنے سسر سے گزارش کی کہ وہ اسے اپنے شہر جانے کی اجازت دے۔ اس کے بوڑھے سسر نے کہا کہ اس کی زندگی کے ویسے ہی آخری دن ہیں۔ اس لئے وہ اس کی پرواہ نہ کریں۔ وہ دونوں جہاں چاہیں زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس نے انہیں ریوڑ اور بہت سارا مال دے کر رخصت کیا۔ منصور نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے شہر پہنچ کر اپنے لئے کسی اچھی سی ملازمت کا اہتمام کرتے ہی اسے بھی وہیں بلوائے گا۔ بہرکیف دونوں میاں بیوی منصور کے شہر کو روانہ ہوئے۔ شہر پہنچ کر اس نے ایک مکان لیا۔ بیوی بچے کو وہیں رکھا۔ خود ملازمت کی تلاش میں نکلا۔ لوگوں نے اسے پہچان لیا۔ انہی کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ اس کا چچا فوت ہو چکا تھا۔ البتہ لوگوں نے اسے شادی اور بچے کی مبارک باد دی۔ اسی روز پن چکی میں اسے ملازمت بھی مل گئی۔

شہر کی عورتیں شف چراغ سے ملنے آتی رہیں۔ اس کے حسن کے چرچے چار سو پھیل گئے۔ ایک روز ایک ملازمہ اس کے لیے بادشاہ کا پیغام دوستی لے کر آئی۔ اسی شام وزیر، قاضی اور وکیل کی طرف سے بھی اس کے لیے پیغامات آئے۔ اس نے ملازمہ کے ہاتھوں چاروں کے لیے الگ الگ مگر ایک ہی وقت آنے کے پیغامات بھجوائے۔ رات کو اس نے اپنے شوہر کو سارا قضیہ سنایا۔ منصور کے بدن میں یہ سنتے ہی آگ بھڑک اٹھی۔ بالخصوص قاضی سے تو اس نے اپنی ذلت کا انتقام لینا

روایتی ناچ کا ایک انداز (مرد)

تھا۔لیکن بیوی نے اسے سمجھایا کہ سانپ بغیر لاٹھی کے مر سکتا ہے تو لاٹھی توڑنے کی کیا ضرورت ہے۔اس لئے وہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لے۔بہر حال شف چراغ نے اسے سارا منصوبہ بتا دیا۔اگلے روز مقررہ وقت سے تھوڑی دیر پہلے منصور جا کر تخت پر سو گیا۔سب سے پہلے قاضی صاحب تشریف لائے۔ابھی وہ اندر آئے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔سٹپٹائے کہ اس وقت کون آ گیا؟ شف چراغ دروازے تک ہو آئی اور آ کر بتایا کہ بادشاہ سلامت تشریف لائے ہیں۔اب تو قاضی صاحب کی وہ حالت ہوئی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔شف چراغ نے انہیں چکی پر جا کر بٹھا دیا اور اوپر چادر ڈال دی۔اتنے میں بادشاہ سلامت تشریف لے آئے۔شف چراغ نے انہیں تخت کی دوسری جانب بٹھایا۔انہوں نے شف چراغ کے سامنے دو ہزار اشرفیوں کی پوٹلی رکھتے ہوئے کہا "یہ تمہارے حسن کے نام ہمارا پہلا نذرانہ ہے۔" پھر انہوں نے چکی کی آواز سن کر کہا "یہ کون ہے؟" شف چراغ نے انہیں بتایا کہ محلے کی عورت ہے، گندم پیسنے کے لیے آئی ہوئی ہے۔بادشاہ کو اس کی موجودگی نہایت ناگوار گزری۔

ابھی گفتگو جاری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔شف چراغ بادشاہ سے اجازت لے کر دروازے پر آئی۔وزیر موصوف دروازے پر موجود تھے۔شف چراغ نے انہیں اندر بلایا اور بتایا کہ بادشاہ سلامت اندر تشریف رکھتے ہیں۔وزیر کے پیروں سے زمین کھسکنے لگی۔بدن پر کپکپی طاری ہوگئی۔شف چراغ نے ان سے کہا کہ مایوس نہ ہوں۔میں اس کا حل نکالتی ہوں۔وہ اندر گئی اور بڑا سا ٹوکرا لے آئی۔وزیر کو اس میں بٹھا کر ڈھکنا اوپر دیا۔اور اسے گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی۔جب بادشاہ نے پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ شف چراغ نے کہا حضور غلہ ہے۔ہمسائی دے کر گئی ہے۔ابھی آپ کے خدمت میں چاول پیش کرتی ہوں۔خیر ابھی وہ ٹوکرا رکھ آئی کہ پھر دستک ہوئی۔وہ سمجھ گئی کہ اب وکیل کی باری ہے۔بادشاہ نے غصے سے کہا "یہ کون ہمارے درمیان مخل ہو رہا ہے؟" شف چراغ نے جان بوجھ کر بلند آواز سے کہا "بادشاہ سلامت لگتا ہے آپ کے وکیل صاحب نہیں۔میں ابھی انہیں سمجھا کر آتی ہوں" وہ دروازے پر آئی تو وکیل کو ہونکوں کی طرح حیرت زدہ اور خوفزدہ کھڑا پایا۔اس نے وکیل کے ہاتھ میں دیگ کا بڑا چمچ پکڑاتے ہوئے کہا "پریشان نہ ہو، اس چمچ کو دم بنا لے اور چوپایوں کی طرح رینگتا ہوا اصطبل میں چلا جا۔رات ہے اور تاریکی بھی، بادشاہ سلامت پہچان نہیں پائیں گے۔" وکیل کو بادل نخواستہ یہی کرنا پڑا۔

شف چراغ اس سے فرصت پا کر، بادشاہ کو وہیں چھوڑ کر تخت کے دوسری طرف آ کر اپنے شوہر کے ساتھ لیٹ گئی۔کچھ وقت گزرا تو بادشاہ سلامت کو کوفت ہونے لگی۔انہوں نے چکی پیسنے والی قاضی سے مخاطب ہو کر کہا "اے لڑکی، ہمیں پانی پلاؤ" قاضی صاحب نہ ہل سکتے تھے نہ بول سکتے تھے خوف کے مارے چپ رہے۔بادشاہ نے جب غصے سے حکم دہرایا تو مجبوراً قاضی صاحب کو اپنا چہرہ ان کی طرف کرنا پڑا۔بادشاہ نے قاضی کو دیکھا تو غصے سے لال پیلا ہو کر رہ گئے۔قاضی کو خوب ڈانٹ پلائی مگر دونوں سمجھ چکے تھے کہ عورت نے انہیں بڑی چالاکی سے چکمہ دے دیا تھا۔بادشاہ نے جب اس کی عقل مندی کی تعریف کی تو شف چراغ تخت کی دوسری طرف سے اپنے شوہر کے ساتھ ظاہر ہوئی اور بادشاہ سے کہا کہ اس نے سب اپنی پاکدامنی بچانے کے لیے کیا ہے کیونکہ اس نے اپنے شوہر کے لیے دستور ٹھکرائے تھے۔اس کے لیے بادشاہ کا لالچ کچھ نہیں اور اس کا شوہر اس سے بے حد پیار کرتا ہے۔اس لئے اسکی گستاخی معاف کی جائے۔

اس نے ٹوکرے سے ڈھکنا اٹھایا۔وزیر موصوف وہاں سے ہانپتے کانپتے نکلے اور پھر انہوں نے جا کر اصطبل سے جانور بنے بیٹھے وکیل کو بھی باہر نکالا۔چاروں بڑے شرمندہ ہوئے۔شف چراغ نے بادشاہ کو اشرفیوں کی پوٹلی لوٹاتے ہوئے کہا کہ اس سے آپ ملکہ کے لیے زیورات بنوا لیجئے گا۔بادشاہ یہ سن کر اور شرمندہ ہوا۔اس نے اشرفیاں شف چراغ کے ہاتھ دیتے ہوئے کہا "آج سے تم میری بہن ہو۔اسے ایک بھائی کا تحفہ سمجھ کر رکھ لو" اور پھر چاروں بادشاہ، وکیل، وزیر اور قاضی سر جھکائے وہاں سے نکل آئے۔فنی طور پر کہانی یہاں ختم ہو سکتی تھی مگر اسے داستان گو کی داستان طرازی کہئے کہ اس نے بڑی خوبصورتی سے اس میں ایسا اضافہ کیا ہے جو کہیں سے بھی اضافی معلوم نہیں ہوتا یہ دوسرا حصہ مختصر مگر نہایت بامعنی اور پر مزاح ہے۔

روایت ہے کہ شف چراغ اور منصور کا بیٹا ذرا بڑا ہوا تو انہوں نے اسے تعلیم دلوانے کے لیے قاضی کے مکتب میں داخل کروا دیا۔ایک روز شف چراغ نے اس سے کہا کہ قاضی صاحب کو سلام کہنا۔چنانچہ اس نے سلام پہنچایا تو قاضی صاحب کو فوراً چکی پیسنے کا واقعہ یاد آیا۔سوچنے لگے " کیا گھر میں پھر آٹا ختم ہو گیا ہے؟ "بہر کیف قاضی نے اس سے شہہ پا کر پھر سلام دوستی بھجوایا۔شف چراغ نے منصور کو بتایا تو وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔لیکن بیوی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "قاضی جی کے سر پر واقعی قضا منڈلا رہی ہے۔اس بار انہیں سبق سکھانا ہی پڑے گا۔میں نے انہیں شام کو بلا بھیجا ہے۔تم یہ گھنٹیاں لے کر چبوترے پر لیٹ جانا اور قاضی کی آمد کے ذرا دیر بعد انہیں زور سے ہلا دینا۔آگے میرا کام ہے۔" سو شام کو اس نے بیٹے کو کھانا کھلا کر سلا دیا اور منصور کو گھنٹیاں دے کر چبوترے پر بٹھا دیا۔

اتنے میں قاضی جی تشریف لائے۔

شف چراغ انہیں اندر لے آئی۔

گفتگو کا آغاز ہوا۔ ابھی قاضی کی طبیعت میں روانی آنے لگی تھی کہ اچانک گھنٹیاں بجنے لگیں اور بجتی چلی گئیں۔ قاضی پریشان کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

شف چراغ نے اچانک رونا شروع کر دیا کہ اب اس کا شوہر آ جائیگا اور قاضی کے ساتھ دیکھ کر اس کا منہ کالا کر دے گا۔ وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔ قاضی صاحب پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں؟ شف چراغ کو دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھ کر دلاسہ دیتے ہوئے کہا کہ تم گھبراؤ نہیں۔

اگر تمہارے شوہر نے تمہیں طلاق دے دی تو میں تمہیں اپنے گھر کی ملکہ بناؤ گا۔ مگر شف چراغ یہ رونا رو رہی تھی کہ ابھی کیا کیا جائے۔

قاضی جی نے بڑا صندوق دیکھا اور شف چراغ سے کہا کہ فی الحال تم مجھے اس میں بند کر دو۔ تمہارا شوہر جب سو جائے تو مجھے اس سے نکال دینا۔

چنانچہ شف چراغ نے انہیں صندوق میں بند کیا اور باہر سے تالا لگا کر اپنے شوہر کے ساتھ آ کر سو گئی۔

صبح ہوئی تو شف چراغ نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ محلے والے جمع ہو گئے تو اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کی ماں بیمار تھی۔ اس کا شوہر انہیں دیکھنے گیا تھا اور واپسی پر صندوق میں ان کی لاش لایا ہے اور پھر وہ جھوٹ موٹ کی آہ و زاری کرنے لگی "ہائے اللہ میں تباہ ہو گئی، برباد ہو گئی"۔ محلے والوں نے اس سے اظہار ہمدردی کیا اور کہا کہ اچھا اب صندوق کی چابی لاؤ تا کہ متوفی کو غسل دیا جا سکے۔ مگر وہ رو رو کر کہنے لگی کہ اس صندوق کی چابی نہیں ہے۔ اب اس کو ایسے ہی دفنانا پڑے گا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے جا کر قبرستان میں قبر کھودی اور صندوق کو دفنانے کی تیاری ہونے لگی۔

اتنے میں وہاں سے بادشاہ کا گزر ہوا۔ اس نے اس آہ و زاری کا سبب پوچھا تو کسی نے بتایا کہ شف چراغ کی والدہ وفات پا گئی ہیں اور ان کی لاش صندوق میں ہے۔ بادشاہ یہ سن کر مکان میں داخل ہوا اور اس نے چابی کا تقاضا کیا۔ بالآخر شف چراغ نے روتے ہوئے چابی دے دی صندوق کو کھولا گیا تو اس میں سے قاضی جی نکل آئے۔ بادشاہ نے اسے خوب مطعون کیا اور کہا "اے بدبخت قاضی جو عورت اپنے شوہر کے لیے ملک کے بادشاہ کو ٹھکرا سکتی ہے "اس کے سامنے تم کیا حیثیت رکھتے ہو۔ تم نے مگر سبق حاصل نہیں کیا اور اس کے دامن کو داغدار کرنے کی کوشش کی اس لئے ہم تمہیں عہدہ قضا سے برخاست کرتے ہیں اور تمہاری سب جائیداد ضبط کرتے ہیں۔"

بادشاہ سلامت یہ کہہ کر بگھی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ تب سب نے قاضی پر لاتوں اور مکوں کی بارش شروع کر دی۔ منصور نے اپنا چابک اٹھایا اور اس پر برسانا شروع کر دیا۔ اس کے لیے اپنی پرانی ذلت کا انتقام لینے کا اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا سو اس نے خوب جی بھر کر چابک برسائے حتیٰ کہ قاضی جی سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ نکلنے پر مجبور ہوئے۔ یوں کہتے ہیں کہ قاضی اپنی ناعاقبت اندیشی سے دین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا اور دنیا سے بھی۔

تیسری کہانی:

آپ بیتی

خلاصہ: یہ ایک سر پھری شہزادی کی کہانی ہے جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ نہایت سبک سر ہے۔ اسے غریب اور غلیظ لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ لیکن ایک روز وہ ایسے ہی ایک غریب اور عام نوجوان کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے اور بادشاہ سے چھپ کر اس سے ملاقاتیں کرنے لگتی ہے۔ یہیں سے کہانی کا تانا بانا بنتا ہے۔

بنیادی طور پر یہ کہانی معاشرے کے طبقاتی تضاد پر نہایت گہری چوٹ ہے۔ یہ اس خیال کے گرد گھومتی ہے کہ زندگی میں ہر شخص کی ایک کہانی ہوتی ہے لیکن وہ سوال جس پر کبھی کسی نے غور نہیں کیا وہ یہ ہے کہ یہ کہانی بناتا کون ہے؟ یا کہانی بنتا کون ہے؟ کہانی کی رگوں میں کسی کا لہو دوڑ رہا ہوتا ہے؟ ایک طبقہ وہ بھی ہے جس کی کوئی کہانی نہیں ہوتی مگر وہ دوسروں کی کہانیاں بناتا ہے اور خود ایک کہانی ہوتا ہے۔ یہ کہانی بنیادی طور پر اسی طبقے کی کہانی ہے۔

متن: ایک روز شہزادی جھروکے میں کھڑی ہو کر ندی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ بہار کے موسم میں پہاڑوں پر برف پگھلتی تھی اور ندی کا پاٹ پھیل جاتا تھا۔ اس کا پانی اتنا خنک ہوتا تھا کہ اچھے اچھے گبھرو جوان بھی اسے پار کرتے وقت ٹھٹھرنے لگتے تھے۔ گو اس کے پانی کو صاف رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا پھر بھی ندی بلوریں معلوم ہوتی تھی۔ شہزادی اسی ندی کے بلوریں اور برفیلے پانی سے بے تحاشا گزرتے ہوئے قافلے کو دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد شہر کو جانے والوں کا قافلہ ٹوٹ گیا۔ صرف تین آدمی ادھر سے ندی کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان میں سے دو جوان تھے اور ایک بوڑھا۔ ندی کے اس کنارے پر آ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ ان کی حرکات و

سکنات سے یوں ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ندی پار کرنے سے یا تو ہچکچا رہے ہیں یا کسی بہت اہم مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں۔ ندی خصوصاً چڑھی ہوئی ندی کو عبور کرتے وقت بپھرے ہوئے پانی کو پچھاڑنا پڑتا ہے اور پیراک کو بات کی فرصت ہی نہیں ہوسکتی۔ وہ کافی دیر تک ایک دوسرے سے مصروف گفتگو رہے۔ سلسلہ کلام تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ بالآخر جب آدمی نے دونوں جوانوں کو اپنے کندھوں پر بٹھایا تو شہزادی ہمہ تن استعجاب بن کر رہ گئی لیکن اس کی حیرت بہت جلد غصے میں بدل گئی۔ بوڑھے آدمی نے ان دونوں کو اٹھا کر ندی کو پار کرنا شروع کیا۔ شہزادی بہت برہم ہوئی اور ان کو دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی رہی۔ یہ کوئی انسانیت ہے کہ ایک ضعیف آدمی دو جوانوں کو کندھوں پر اٹھا کر اس موسم میں سرکش ندی پار کرے۔ یہاں تو بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ شرم نہیں آتی ان جوانوں کو جو اس بوڑھے کو گھوڑا بنا کر ندی پار کر رہے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ اس بوڑھے کو سہارا دیتے۔ لعنت ہے ان جوانوں پر جو اس بوڑھے کا سہارا لے رہے ہیں! نفرین ہے ایسی جوانی پر جو بڑھاپے سے بھی گئی گزری ہو! پھر اس نے اپنی خادمہ زندما سے، جو اس عرصے میں ایک ممیائی ہوئی لاش کی طرح شہزادی کے پہلو میں نصب تھی، حکم دیا کہ تیزی سے جاؤ اور ان تینوں کو ہمارے حضور میں پیش کرو۔ زندما میں جیسے خون کی رکی ہوئی گردش یک لخت عود کر آئی۔ وہ بھاگتے ہوئے محل سے باہر نکل گئی شہزادی غصے میں پھنکارتی ہوئی دوربین اتار کر کمرے میں تیز تیز ٹہلتی رہی اور جب زندما انہیں ساتھ لے کر واپس آ رہی تھی تو وہ انصاف گاہ میں براجمان تھی۔

زندما ان تینوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی۔ تینوں نے ایک نظر کمرے پر ڈالی جس کی دیواروں پر مختلف آلات جنگ آویزاں تھے۔ صندلی کے عین پچھلی دیوار پر دروازے کے بالکل مقابل ترازو بنی ہوئی تھی۔ پھر ان تینوں کی نظر ایک حوروش عورت پر پڑی جس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور بھویں تنی ہوئی تھی۔ تینوں بہت سہمے ہوئے تھے انہوں نے آداب کیا تو شہزادی کہنے لگی:

"نفرین ہے تم دونوں جوانوں پر جنہوں نے اس بوڑھے (بوڑھے کی طرف دیکھ کر) کے دوش پر بیٹھ کر ندی پار کی اور (بوڑھے کے طرف متوجہ ہو کر) آفرین ہے اس بوڑھے پر جس نے دو جوانوں کو اٹھاتے ہوئے ندی عبور کر لی! اے مرد ضعیف یہ دونوں جوان اس دھرتی پر ایک بوجھ ہیں۔ تمہارا بڑھاپا باعث رحمت ہے۔ ایسے باہمت بڑھاپے پر صدہا جوانیاں نثار! لیکن (جوانوں سے مخاطب ہو کر) تمہیں بتانا ہوگا کہ تم نے اس پیر مرد کو زیر بار کرنے کی گستاخی کیوں کی؟ اگر اس کا پاؤں پھسل جاتا اور ڈوب جاتا تو؟" تینوں سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔

شہزادی نے گرج کر کہا: "جواب دو! جلدی جواب دو"

تینوں نے کچھ کھسر پھسر کر اور بوڑھا گویا ہوا "جناب ہم میں ایک شرط لگی تھی۔ وہ شرط یہ جیت گئے اور میں ہار گیا۔"

شہزادی نے پوچھا "کیا تھی وہ شرط؟ شرم نہیں آتی تم دونوں کو ایک بوڑھے سے شرط لگاتے ہوئے؟ زمین میں کیوں نہیں گڑ جاتے؟"

بوڑھے نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "جناب! شرط یہ تھی کہ ہم تینوں میں سے ہر ایک اپنی کوئی سرگذشت سنائے اور جو نہ سنا سکے وہ دوسرے دونوں کو کندھے پر اٹھا کر ندی عبور کرے۔ ان دونوں نے تو اپنی اپنی سرگذشت سنا دی۔ لیکن میں نہ سنا سکا۔"

شہزادی پھر جوانوں پر برسنے لگی۔ "نفرین ہے تم دونوں پر! ایک بوڑھا آدمی جس کی یادداشت مضمحل ہو گئی ہو، جس کا حافظہ غائب ہو گیا ہو۔ اس سے یہ شرط لگائی؟" بوڑھے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "جناب! گستاخی معاف! میرا حافظہ صحیح سالم ہے، سولہ آنے ٹھیک ہے!"، "تو پھر تم نے کوئی سرگذشت کیوں نہ سنا دی؟" شہزادی نے پوچھا۔

"جناب میں نے حافظے پر پورا زور دیا لیکن جب دیگ ہی خالی تھی تو چمچے میں کیا آتا؟" بوڑھے نے اتنے یقین سے کہا جیسے وہ کوئی ابدی صداقت بیان کر رہا تھا۔ لیکن شہزادی کو اس بات پر یقین نہیں آیا اور اس نے کہا "معمر انسان! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمہارا حافظہ بھی ٹھیک ہو اور تمہاری ساری عمر کسی قصے سے بھی خالی ہو۔"

بوڑھے نے پھر سے برخود صحیح انداز میں کہا "جناب بالکل یہی بات ہے! میری زندگی بالکل سپاٹ رہی ہے" شہزادی صندلی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی اور اونچے لہجے میں بڑبڑانے لگی "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان اس دنیا میں جنم لے اور.... اور.... وہ ہوا کی گرگراہٹ سے بچ سکے؟ اور امنگوں کے لمس سے محفوظ رہ سکے؟ اس کرہ ارض پر کون ہے جو طوفان سے نہ ٹکرایا ہو؟... (بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ ناممکن ہے معزز انسان! تمہارا حافظہ غائب ہے!"

بوڑھے نے اسے سمجھاتے ہوئے جواب دیا "جناب! میرا حافظہ ٹھیک ہے۔ بس میری زندگی ہموار رہی ہے۔ میں ایک مزدور کے گھر پیدا ہوا اور ساری عمر مزدوری کرتا رہا۔" شہزادی نے پھر اس سے سوال پوچھا "بزرگ انسان! کیا تم خواب وخیال کی دولت سے بھی محروم تھے؟"

بوڑھے نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "جناب! میں دولت سے محروم تھا اور میرے خواب وخیال میں بھی نہ آسکتے تھے۔ میں تو ایک بیل کی طرح جیتا ہوں اور وہ بھی کولھو کے بیل کی طرح جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہو!" شہزادی پھر صندلی پر جا

بیٹھی اور بڑبڑانے لگی۔ "افسوس صد افسوس! ایک زندگی رائیگاں گزر گئی... (بوڑھے کو دیکھتے ہوئے) کیا رات کے وقت کبھی تمہیں چاند ستاروں نے کچھ نہیں کہا؟ کیا اس ندی نے کبھی تمہارے کانوں میں سرگوشی نہ کی؟ کیا تم نے کسی دل کی دھڑکن نہ سنی؟"

بوڑھے نے کہا "جناب! میرے اردگرد زندگی کی برف افقوں تک پھیلی ہوئی تھی اور میں ننگے پاؤں اس پر چلتے ہوئے اپنے کو بچانے کی کوشش کرتا رہا" شہزادی نے اپنا سوال پھر دھرایا" کیا تمہیں اس زندگی میں کوئی ساتھی نہیں ملا؟" بوڑھے نے اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا "جناب میری شادی ہی نہیں ہوئی اور کیسے ہوتی؟ ساری عمر اپنی ہونے والی گمنام بیوی کے لیے پیسے جمع کرتا رہا، نہ پیسے جمع ہوئے نہ شادی کی نوبت آئی!"۔ شہزادی نے مایوس ہو کر پھر تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا "تو کیا تمہیں اپنے گھر کے پاس، کسی درے میں، کسی راستے پر، کسی شہر میں کوئی ایسی ہستی نظر نہ آئی جس کو تم اپنا راز دار بنا سکتے؟" بوڑھے نے غبارے کی طرح پھٹتے ہوئے کہا "جناب میں خود کسی کا راز دار بننے کا اہل ہی نہیں تھا۔ میں وہ خس و خاشاک ہوں جو پاؤں تلے مسل دیا جاتا ہے۔ وہ برف ریزہ جو ہر قدم سے چمٹنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ وہ غبار جو گھوڑوں کی سموں کے ساتھ اڑتا ہے لیکن بادِ پیما سوار آگے نکل جاتے ہیں اور وہ دھرتی کے سینے سے چپک جاتا ہے"۔ شہزادی صندلی پر جا بیٹھی اور بڑبڑانے لگی "صد افسوس! ہزار افسوس... بوڑھے تم نے اپنی زندگی ایک مرغ قفس کی طرح گزار دی اور آب و دانہ ہی تمہارا مقصد بن کر رہ گیا۔ حالانکہ آب و دانہ سے بہت ارفع چیزوں تک بھی تمہاری رسائی ہو سکتی تھی۔"

پھر شہزادی صندلی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی اور بوڑھے کے پاس آ کھڑی ہوئی اور اس سے مخاطب ہوئی "بوڑھے! نظر اٹھا کے دیکھو، یہ کائنات کتنی حسین ہے! آؤ اس دریچے کے پاس آ! (بوڑھا اس کے پیچھے دریچے کے پاس چلا گیا)... یہ بے پایاں افلاک یہ نکلتی ہوئی یہ جوئے سیم، یہ بادلوں کے پراں دوپٹے۔ ان تمام چیزوں کا حسن بہت شہ زور ہے۔ بوڑھے! لیکن جب یہ سارا حسن ایک عورت کے جسم میں مرتکز ہو جائے تو آفاق اسی میں گم ہو جائیں!... حیف ہے اس زندگی پر جو اتنی محدود اور مقفل تھی کہ حسن کی ایک کرن بھی اس میں نہ اتر سکی اور عشق کی ایک ٹیس بھی اس میں نہ اٹھ سکی! بوڑھے! تم ساری عمر ایک مہمل فلسفی کی طرح ایک پتھر پر سر جھکا کر بیٹھے رہے ہو۔ حالانکہ یہ ساری کائنات خود تمہارے پاؤں کی چاپ کے لیے دم بخود اور مواقبہ نشین تھی!"

" کھوسٹ انسان! تمہیں اس کائنات کے برق رفتار حسن کا شکار کرنا تھا لیکن افسوس! تم خود موت کا شکار بننے کے منتظر رہے! تم نے زندگی کے طویل ساٹھ سال رائیگاں ہی گزار دیئے"۔ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ رندھے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "جناب یہ ساٹھ سال رائیگاں نہیں تھے! میں نے خود ان ساٹھ سالوں کی پرورش کی ہے۔ میرے لئے ساٹھ سال تک زندہ رہنا ہی معجزہ ہے ورنہ بدبختی تو شاید چھ دن میں میرا گلہ گھونٹ دیتی۔ میں ساٹھ سال اس سیاہ بختی سے لڑا ہوں میں نے اسے مستقل پچھاڑا ہے۔ میں نے اسے پیچھے دھکیلا ہے اور اب بھی جب میری شریانوں کا خون سرد ہو رہا ہے، سیاہ بختی پر میری اتنی ہیبت طاری ہے کہ وہ مجھے دبوچنا چاہتی ہے لیکن دبوچ نہیں سکتی"۔ شہزادی نے جیسے یہ سب کچھ بے تاثر ہو کر سنا کہنے لگی "لیکن کیا فائدہ ہے، اس زندگی کا جب حسن سے مڈبھیڑ ہی نہ ہوئی؟ مجھے دیکھو! میں تمہارے مقابلے میں کتنی کم سن ہوں لیکن اس کم سنی کے باوجود میری بھی ایک کہانی ہے؟

اور وہ یوں کہ ایک جوان! بالکل ایسا ہی جیسے یہ دو جوان کھڑے ہیں اس ندی میں گزر کر شہر جایا کرتا تھا۔ وہ ایک دن پشت پر شہر سے ایک بوری اٹھائے چلا آ رہا تھا کہ میں نے اسے بلایا! اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ بے آب تھا اور اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔ وہ ہانپ رہا تھا! میں نے اس سے کہا "ہم تمہیں اپنی تنہائیوں کا رفیق بناتے ہیں۔ منظور ہے؟ اس نے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر اس لٹکے ہوئے خنجر کی طرح پیوست کر دیں ہم دونوں دوست ہو گئے"۔

" کیا تم سن رہے ہو بوڑھے انسا؟ "

"جی ہاں" بوڑھے نے کہا۔

شہزادی پھر گویا ہوئی

"وہ ان پڑھ تھا جاہل، غلیظ، گنوار لیکن آہستہ آہستہ اس کے کپڑے نکھرتے گئے۔ اس کا جسم سنورتا گیا۔ اس کی زبان دھلتی گئی! اور پھر وہ مجھ سے ایسے گفتگو کرنے لگا جیسے وہ محلات کا ہی پروردہ ہو! دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ وہم ہمجولیوں کی طرح گھل مل گئے۔ وہ عموماً رات کو میرے پاس آتا تھا اور ہم دونوں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ لیکن کسی طرح بادشاہ سلامت کے کانوں میں اس کی بھنک پڑ گئی... سو تو نہیں گئے بوڑھے؟"

"جی نہیں! بالکل چاق و چوند ہوں" بوڑھے نے کہا۔

"وہ رات، وہ خونیں رات، جب حسن اور عشق ایسے مل جاتے جیسے یہ ندی سمندر میں۔ بادشاہ سلامت محل میں تشریف لے آئے مجھے پتہ چل گیا اور میں نے اسے جلدی سے (اشارہ کرتے ہوئے) اس صندوق میں بند کر دیا۔ بادشاہ سلامت کمرے میں داخل ہوئے۔ میں تسلیمات بجالائی۔ وہ اسی صندلی پر بیٹھ گئے اور میں خود اس صندوق پر جا بیٹھی۔ وہ ساری رات اسی صندلی پر بیٹھے مجھے کہتے رہے۔ "بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے اور شہزادی آسمان کی بیٹی ہے اور اس کے لطیف

ہاتھوں میں رخش مستقبل کی باگ ہے؟ ایک انبوہ کثیر اسے دیکھنے کے لیے دیوانہ وار چلا آتا ہے لیکن وہ خود اس انبوہ کثیر میں سے نہیں؟ اور شہزادی یہ ہے اور شہزادی وہ ہے .... جب سورج نکلا تو بادشاہ سلامت اٹھ کر محل سے باہر گئے! میں نے جلدی جلدی صندوق کھولا تا کہ میں عاشق زار کو باہر نکال کر اس کے پاؤں پر اپنا سر رکھ کر معافی مانگوں؟ لیکن... لیکن، بوڑھے! میرے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے اپنی زندگی کا مہیب ترین منظر دیکھا! میرے عاشق زار کا جسم ٹھنڈا تھا۔ اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ وہ مجھے اتنا خوفناک معلوم ہوا کہ میں نے اپنی زوردار خادمہ زندما سے اس کی لاش اس جوئے رواں میں پھینکوادی!

بزدل وہ میرے لئے ایک رات بھی انتظار نہ کر سکا... لیکن اب کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کے شیریں مکالمے میری تنہائیوں کو منور اور معطر رکھتے ہیں؟ بوڑھے حیرت ہے کہ تمہاری کبرسنی کے باوجود تمہاری آپ بیتی سپاٹ ہے؟

"بوڑھے نے آنکھیں پھاڑ کر شہزادی کی طرف ایسے دیکھتے ہوئے جیسے ایک شکستہ پجاری سنگین مورتی کو دیکھتا ہے، کہا: "شہزادی یہ سرگزشت جو کہ آپ شاہی پیرہن کا ایک تکمہ زریں ہے خود ہمارے ہی خون کی مرہون منت ہے۔ وہ بیکار خون جو ایک شہزادی کے چونچلوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ ہم وہ پیاسے مسافر ہیں جو چشمے پر پہنچتے ہیں تو وہ سراب میں بدل جاتا ہے وہ سیاہ بخت جن کی منزل ان کے پاؤں کے نیچے سے سرک جاتی ہے اور بے جان حقیر مٹی کے دیئے جو پتھر کی مورتیوں کے اردگرد رات بھر جلتے ہیں" شہزادی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے اس نے جلدی جلدی اپنے گلے کا ہار اتار کر بوڑھے کو دیا اور انہیں اشارے سے رخصت کرنے کے بعد خود صندلی پر بیٹھ کے ہچکیاں لینے لگی۔

چوتھی کہانی:

واپسی

خلاصہ: یہ کہانی دراصل براہوی مرد کی بہادری اور جرأت کی آئینہ دار ہے۔ حالانکہ اس کا مرکزی کردار لکمیر ایک ایسا نوجوان ہے، جس کا پیشہ راہزنی ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک چور اور لیٹرا ہے مگر ایک خوبرو حسینہ کے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد اس پر قسمت کی یاوری ہوتی ہے اور ایک ملک کا بادشاہ اس کی ہمت اور جرأت سے متاثر ہو کر اسے اپنی اکلوتی شہزادی سے بیاہ دیتا ہے مگر لکمیر تمام تر سہولیات اور محلات کو چھوڑ کر اپنی غریب اور خوبرو محبوبہ کے پاس لوٹ آتا ہے۔ اتنے بڑے محل سے صرف کپڑوں کے چند جوڑے لاتا ہے جس کی اس کی محبوبہ کو شدید ضرورت ہے۔ براہوی سماج کی بنیادی اخلاقی اقدار کا عکس اس کہانی کے آئینے میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

متن: نامحرم تمہارے اٹھے ہوئے قدم وہیں رک جائیں "ایک نسوانی آواز درے کی سنسان فضا میں گونج اٹھی۔ لکمیر کے اٹھے ہوئے قدم واقعی رک گئے۔ اس نے اپنی تفنگ کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لی اور چاروں طرف پہاڑوں پر تیزی سے نظر ڈالی۔ اس کے بائیں جانب صرف بکریوں اور بھیڑوں کا ریوڑ چر رہا تھا۔ اس سے کوئی دس بارہ گز کے فاصلے پر ایک عمودی مرمریں سل ایسے کھڑی تھی جیسے کسی تحریر کا منظر ہو۔ لیکن اس گونج میں گم ہو جانے والی آواز نے اس عمودی سل کو اس کے لیے کچہریوں کا نوٹس بورڈ بنا دیا۔ اس نے تفنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"میرے قدم رک جائیں، لیکن کیوں؟"

"بہتر تو یہ ہے کہ تم یہاں سے واپس چلے جاؤ" نسوانی آواز عمودی سل کے عقب سے پھر لہرائی۔

"لیکن کیوں، میں حکم سے ہمیشہ باغی رہا ہوں"۔ لکمیر نے بندوق اوپر اٹھائے ہوئے کہا۔

"یہ پہاڑ میرے ہیں، میرے قبیلے کے ہیں، یہ میرا لبادہ ہیں" نسوانی آواز نے کہا۔

"میں ان پہاڑوں پر قبضہ کرنے نہیں آیا اور نہ ان میں غالباً کوئی ایسی بیش بہا چیز ہے جس پر قبضہ کیا جا سکے"۔ لکمیر نے طنزاً ہنس کر کہا۔

"لیکن تم ہو کون؟" نسوانی آواز نے تیزی سے پوچھا۔

"میں کوئی بھی ہوں۔ مجھے صرف اس درے سے گزرنا ہے تا کہ میں پہاڑ کے پار چلا جاؤں۔"

لکمیر نے اپنی تفنگ پھر لہرائی لیکن اس نے دیکھا کہ عمودی سل کے پیچھے سے بھی ایک تفنگ بلند ہوئی۔ "بہتر یہ ہے کہ تم واپس چلے جاؤ" نسوانی آواز نے اصرار کیا۔

"آخر تم ہو کون میرا راستہ روکنے والی۔ میں چڑیلوں اور چھلاؤں کا قائل نہیں" لکمیر نے کہا۔

"انسانوں کا راستہ انسان روکتے ہیں چھلاوے نہیں اور یہ پہاڑ میرے ہیں۔ میرا پیرہن ہیں، میرا ستر ہیں" نسوانی آواز نے کہا۔

"اوہ! تو کیا تم برہنہ ہو" لکمیر نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں میں ان پہاڑوں کو پہنے ہوئے ہوں۔ اوڑھے ہوئے ہوں" نسوانی آواز شاخ کی طرح ٹوٹنے لگی۔

"اتنے بڑے ریوڑ کی مالک ہوتے ہوئے پوشاک نہیں؟" لکمیر نے دوگونہ حیرت سے پوچھا۔

"یہ ریوڑ میرا نہیں کسی اور کا ہے" نسوانی آواز نے ایسے کہا جیسے ٹوٹی ہوئی شاخ زمین پر گر گئی۔

"اور یہ تفنگ؟"

"یہ میری ہے۔ اس کرہ ارض پر صرف یہی ایک چیز میری ہے لیکن تم ہو کون؟" نسوانی آواز نے پھر پوچھا؟

"ایک چور لٹیرا، ڈاکو، قزاق، سفاک خونی، میرے بازوؤں میں بجلی ہے۔ میری آنکھوں میں قیامت ہے اور میری تفنگ سے موت نکلتی ہے" لکمیر نے تفنگ لہراتے ہوئے گانے کے انداز میں کہا۔

عمودی سل کے پیچھے تفنگ چٹاخ سے پتھر پر گر گئی چند لمحے خاموشی رہی۔

لکمیر آگے بڑھا، خاتون نے جلدی سے تفنگ سنبھال کر پھر کہا "رک جاؤ موت میری تفنگ سے بھی نکلتی ہے۔"

لکمیر قہقہہ مار کر ہنسا "غلط! اگر تمہاری تفنگ سے موت نکلتی ہوتی تو تم آج برہنہ نہ ہوتیں"۔

سل کے پیچھے تفنگ پھر گر گئی۔ لکمیر ہنسنے لگا۔

خاتون نے سل کے پیچھے سے جھانکا۔ وہ ایک نوخیز لڑکی تھی۔ اس کے سر کے بال بکھرے اور الجھے ہوئے تھے اور اس کے چہرے کی صبیح بشاشت خوفزدگی سے دب گئی تھی۔ لکمیر کے سامنے ایک ملگجی خواب لہرا گیا اور وہ کہنے لگا "میں یہاں سے واپس چلا جاتا ہوں۔ وہیں پایہ تخت میں، جہاں سے میں آیا تھا۔ وہاں میرے اور بھی ساتھی ہیں۔ جب میں واپس آؤں گا تو تمہارے لئے بہت سے جھوڑے لیتا آؤں گا۔"

"کب تک آؤ گے؟" لڑکی نے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"بس سمجھو کہ گیا اور آیا۔ میرے خوف سے محل کانپتے ہیں اور اپنے خزانے اگل دیتے ہیں لیکن تم مجھے اپنی بندوق دے دو" لکمیر نے کہا۔

"میں اپنی تفنگ کا سودا تو اپنی زندگی سے ہی کر سکتی ہوں اور پھر سورج نکلنے سے پہلے مجھے یہاں آنا ہوتا ہے اور سورج چھپنے کے بعد جانا ہوتا ہے" لڑکی نے کہا۔

لکمیر واپس ہوا۔ وہ تیز تیز چلنے لگا حتی کہ درے کے موڑ پر اس نے پیچھے دیکھا۔ لڑکی اس طرح ہی جھانک رہی تھی۔ اس نے تفنگ ہوا میں لہرائی اور وہ دیوانہ وار دوڑنے لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ایک ساعت کے اندر اندر سارے بازاروں کا کپڑا لا کر اس لڑکی کے قدموں پر رکھ دے۔

وہ بے تحاشا دوڑتا رہا۔ حتی کہ وہ پہاڑوں سے باہر نکل آیا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا لیکن اس کے پاؤں تھے کہ بھاگے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکی اس کے پہلو میں بھاگ رہی تھی۔ وہ دونوں بھاگ رہے تھے۔ بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ ایک ایسی منزل کی طرف جہاں کپڑے کی بڑی بڑی دکانیں تھیں۔

جب وہ شہر کے قریب آیا تو اندھیرا ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ حتی کہ ایک شاہراہ جو شہر کے چاروں طرف ایک دائرہ بناتی تھی، پہنچ گیا۔ وہ نہایت چوکنا ہو کر اس سڑک پر چلتا رہا اور جوں ہی درختوں کا ایک جھنڈ آیا، وہ اس کی واٹ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ عرصہ فضاؤں میں گھومتا رہا اور پھر آنکھیں ادھر موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے وہ بھاگا ہوا آیا۔ اگر کوئی اسے دوڑتے ہوئے دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ کسی جن سے ڈر کر وہ حواس باختہ ہو کر بھاگا جا رہا ہے لیکن بھوتوں پریتوں کا تو وہ قائل ہی نہ تھا یہ بات ضرور تھی کہ اس جھانکتی ہوئی لڑکی نے اس کے جسم میں بجلیاں پھیر دی تھیں۔ گو اندھیرا گھٹاٹوپ تھا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ تاہم اسے ایسا محسوس ہوا کہ عمودی سل اس کے سامنے کھڑی ہے اور اسکے عقب سے وہ معصوم لڑکی جھانک رہی ہے۔ سڑک بالکل سنسان تھی درختوں پر کبھی پرندے پھڑ پھڑاتے تھے تو اسے زندگی کا احساس ہوتا تھا۔ جھانکتی ہوئی معصوم لڑکی پھر اس کے دردل پر دستک دیتی۔ پھر وہی اندھیرا وہی معصوم بشاشت، یکبارگی اس کے دماغ میں ہزاروں خیالات رینگ جاتے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کسی کے گانے کی آواز اس کے کانوں کو چھونے لگی۔ وہ ایسے دم بخود ہو کر کھڑا ہو گیا جیسے ایک بلی چوہے کا شکار کرتے وقت۔ گانے والا قریب آیا تو لکمیر یک لخت جھنڈ سے لپک کر سڑک پر آ گیا اور راستہ روک کر کہنے لگا۔ ٹھہرو۔ تم کون ہو اور تمہارے پاس کیا ہے؟" اس نے کہا "میں ایک بقال ہوں اور میرے ساتھ ایک لدا ہوا گدھا ہے میرے یار بے شک یہ خریطہ لے لو"۔

لکمیر کو جیسے اسے روک کر شرمساری ہوئی۔ اس نے دھیمے سے کہا "اپنا راستہ لو۔"

بقال نے کہا "تم نے پہلے مجھے کیوں پکارا تھا؟"

لکمیر نے کہا" تم نے مجھے یار کہہ دیا۔ یار معنی بھائی، میں ڈاکو سہی لیکن میں بھائی کو نہیں لوٹ سکتا۔"

بقال ایک بے یقینی کے عالم میں کھی کھی کرنے لگا۔ اگر تم مجھے بھائی بنالو، تو میں تمہیں گھر لے چلوں اور تمہاری خاطر تواضع کروں اور اگر نہیں تو یہ خریطہ اور گدھا دونوں حاضر ہیں۔

لکمیر نے بے نیازی سے کہا" تم خود ہی مجھے یار کہہ دیا۔ اب میں تم پر ہاتھ کیسے اٹھاوں"۔

بقال: "تم ڈاکو ہو"۔

لکمیر: "کہہ جو دیا کہ میں ڈاکو ہوں، دیکھتے نہیں یہ بندوق"

بقال: "تو یہ خریطہ، گدھا اور میں خود سب حاضر ہیں"

لکمیر: "بے وقوف! جب بھائی کہہ دیا تو اس بندوق کی گولی تم پر حرام ہوگئی"

بقال: "جناب ڈاکو صاحب میرا جیون تو پہلے ہی مجھ پر حرام ہے۔"

لکمیر: "تم نرے گاؤدی ہو میں کچھ کہتا ہوں تم کچھ سمجھتے ہوں"

بقال: "مہاراج میری جان حاضر ہے"

لکمیر: "میری بندوق کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ میں اس سے تمہاری جان لے لوں"

بقال: "تو پھر آپ کیا لیں گے ان داتا۔ خریطہ منظور نہیں، گدھا منظور نہیں میں منظور نہیں، آپ کو کیا چاہیے، وہی حاضر کر دیتا ہوں"

لکمیر: "الو! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

بقال: "لیکن جناب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کو کچھ بھی نہیں چاہیے۔"

لکمیر: "بکواس بند کرو اور اپنا راستہ ناپو۔"

بقال: "یہ کیسے ہوسکتا ہے جناب مجھے آپ کا اعتبار نہیں، میں چلوں اور آپ پیچھے سے حملہ کر دیں۔"

لکمیر نے اندھیرے میں پہاڑوں کو گھورتے ہوئے ایک لمبا سانس بھرا اور کہنے لگا" میں تمہارا بھائی ہوں، چلو میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں۔"

دونوں چل پڑے کچھ لمحے تک خاموشی رہی، پھر لکمیر نے پوچھا" تم مجھے یہ بتا دو کہ اس شہر میں کون سے امیر آدمی کے پاس سے زیادہ جواہرات اور پارچات ہیں؟"

بقال: "جناب میں تو اتنا امیر آدمی نہیں"

لکمیر: "ابے الو تو کوئی قاعدے کی بات کرے گا یا نہیں، ابھی بندوق کا دستہ مار کر تیرا بھیجا نکال دوں گا تو تو بالکل دمڑی کا آدمی ہے۔"

بقال: "جی ہاں جناب، میں بھی تو یہی عرض کر رہا تھا"

لکمیر: "اچھا اچھا میرے سوال کا جواب دو"

بقال: "جناب سیٹھ لشمن داس امیر آدمی تو ہے۔ اس کے پاس ہیرے جواہرات تو ہیں لیکن پارچات نہیں اور... اور... سیٹھ دھنامل کے پاس پارچات تو ہیں لیکن ہیرے جواہرات نہیں ہیں اور... اور... سیٹھ گربھ چند نرا امیر آدمی ہے۔ ہیرے جواہرات اور پارچات کچھ بھی نہیں صرف دو سو بیگھے زمین میں چودہ پندرہ محل بنائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کا کام نہیں۔ سب دمڑی کے آدمی ہیں۔"

لکمیر: "اے گاؤدی (ٹھوکر مارتے ہوئے) میرے سوال کا جواب دو۔"

بقال: "جناب اب میرے دیدے کھلے، سمجھ میں آ گیا، بادشاہ سب سے امیر انسان ہے۔ بس وہی ہے۔ وہ امیر بھی ہے اس کے پاس ہیرے جواہرات بھی ہیں اور پارچات بھی۔ اور یہ سب اس کے سونے کے کمرے کے پاس والے کمرے میں ہیں۔"

لکمیر جیسے اس جواب پر مطمئن ہوگیا۔ وہ خاموشی سے چلتا رہا کچھ دور جا کر بقال نے کہا" جناب میں بیت الخلا ہو آؤں۔"

لکمیر ہنسنے لگا" ہاں! ہاں! جاؤ، میں تمہارے گدھے کے پاس کھڑا ہوں۔"

بقال اندھیرے میں گم ہوگیا۔ لکمیر پھر پہاڑوں کو گھورنے لگا۔ عمودی سل کے پیچھے سے لڑکی کی تفنگ ابھری اور جھانکنے لگی۔

اتنے میں قریب کے درخت سے چغل بولا۔ لکمیر کچھ سوچنے لگا۔ جب بقال واپس آیا تو اس نے کہا۔

"تم نے روپے کیوں دبا دیئے نکال لاؤ"

بقال پر جیسے بجلی گری۔ چند لمحے تو وہ بالکل بے ہوش ہو کر کھڑا رہا۔ پھر کہنے لگا" لیکن جناب آپ کو کیسے پتہ چلا۔؟"

لکمیر نے کہا" میں پرندوں کی بولی سمجھتا ہوں۔"

بقال چلا گیا اور روپے نکال کر واپس آ گیا۔ دونوں چلتے رہے حتی کہ بقال کا گھر آ گیا۔ اس نے لکمیر کی خوب خاطر تواضع کی اور جب وہ اونگھنے لگا تو بقال چپکے سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا شاہی محل کی طرف لپکا۔ باب والی کے چوکیدار نے اسے اندر گزار دیا۔ بادشاہ سلامت ابھی خواب گاہ میں ٹہل رہے تھے۔ بقال نے فرشی سلام کیا اور کہنے لگا:

"ان داتا، آج جال میں ایک نہنگ پھنسا ہوا ہے۔ ایک ڈاکو! وہ میرے گھر میں ہے، وہ ضرور ڈاکہ مارے گا۔ اگر کوئی واردات ہوگئی تو میں ذمہ دار نہیں۔ بڑے دل گردے کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ پرندوں کی آواز پہچانتا ہے۔ ولی اللہ ہے۔ آپ ہوشیار رہیں۔" بادشاہ سلامت نے بقال کو ایسے دیکھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں... "اچھا جاؤ۔"

بقال جب واپس آیا تو لکمیر بمعہ بندوق غائب تھا۔ اس نے گھر کی ایک ایک چیز دیکھی۔ لیکن سب کچھ اپنی اپنی جگہ پر تھا۔ وہ سوچنے لگا یہ تو واقعی کوئی ولی اللہ ڈاکو ہے۔ اس نے میرے گھر کی ایک سوئی تک نہیں چھوئی، پھر وہ دروازے بند کر کے لیٹ رہا لیکن اس کے کان ہر لحہ دستک یا گولی کا انتظار کرتے رہے۔ لکمیر بازار میں نکلا تو اس کے تین ساتھی مل گئے۔ وہ کہنے لگے آج آسامی تلاش ہی نہیں ہو رہی۔ سیٹھ لشمن داس، دھنال اور گربھ چند سب چوکنے ہوگئے ہیں۔ لکمیر نے رازدارانہ لہجے میں ان سے کچھ کہا اور وہ تینوں خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ جب وہ شاہی محل کے پاس پہنچے تو ایک ساتھی نے کہا "لکمیر یہاں؟" لکمیر نے کہا: "ہاں" دوسرے ساتھی نے کہا "لیکن یہاں چوب دار ہیں۔ بڑے بڑے پلے ہوئے شاہی کتے ہیں"۔ تیسرے ساتھی نے کہا: "یہاں اگر پکڑے گئے تو صبح تک سر تختہ دار پر لٹک جائینگے اور پھر بادشاہ خود ساری رات نہیں سوتا" لکمیر نے انہیں حوصلہ دیا اور کہنے لگا۔ "بادشاہ صرف اپنے مستقبل سے خائف ہے۔ اس بیچارے کو تو آٹھوں پہر ایک ولی عہد کی تلاش ہے۔ اسے ہماری موجودگی کا احساس بھی نہ ہو سکے گا اور پھر نیم شب کا عالم ہے۔ اس وقت تو ولی اللہ بھی اونگھ جاتے ہیں"

چنانچہ وہ چاروں ایک تناور درخت پر چڑھے اور وہاں سے انہوں نے محل کی عقبی دیوار پھاندی اور دبے پاؤں خوابگاہ کے ساتھ کے کمرے میں آ گئے۔ خوابگاہ میں مشعل جل رہی تھی۔ بادشاہ جاگ رہا تھا۔ لیکن اس نے مصنوعی خراٹے بھرنے شروع کر دیئے۔ لکمیر نے سب صندوقچیوں کو کھول کر دیکھا اور پھر اس نے ایک صندوقچے کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ اسے اٹھالیں۔ جواہرات کی صندوقچی اس نے خود اٹھالی۔ ابھی وہ ایک دو قدم ہی چلے تھے کہ بادشاہ آ گیا۔ لکمیر کے ساتھی صندوقچہ رکھ کر رفو چکر ہو گئے لیکن لکمیر اس صندوقچی کو اٹھائے ویسا ہی کھڑا رہا۔ بادشاہ نے اس سے کہا: "میں تمہاری بہادری کی داد دیتا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟۔"

"لکمیر"

بادشاہ "گویا درہ لک کے میر ہو۔"

لکمیر "نہیں یہ نام تو میرے والدین نے خواہ مخواہ رکھ دیا، ورنہ میری وزیری سے میرا کیا واسطہ، ہاں البتہ میں اپنے ملک کے دروں کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی میری آہٹ کو پہنچانتے ہیں۔"

بادشاہ "آؤ خواب گاہ میں"

دونوں خوابگاہ میں چلے گئے۔

بادشاہ نے کہا: "چاہتا ہوں کہ تمہیں بہت سا انعام دوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں تمہیں اپنی ملازمت میں لے لوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بہت قریب آؤ، حتی کہ میری سلطنت کے رازداں بن جاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اس مملکت کے تمام راز تمہارے کانوں میں کہہ دوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے اندوختہ، خزانے، میرے موروثی زر و جواہر لوگوں پر خرچ کر دو۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ دولت جو صدیوں سے شاہی خزانے میں جمع ہو رہی ہے اس کو میری رعایا پر صرف کر دو۔ میرے امراء، وزراء، ارکان دولت اور اعیان سلطنت تو اپنی تجوریاں بھرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس دولت کی صحیح تقسیم کے لیے مجھے تم جیسے انسان کا سارے دور حکومت میں انتظار رہا ہے۔ چلو، آؤ میں تمہیں خزانے کی چابیاں دیتا ہوں۔"

بادشاہ نے چابیوں کا گچا اٹھایا اور خوابگاہ سے نکل کر خزانے کے کمرے میں آیا۔ اس کا دروازہ کھولا۔ خزانہ کافی وسیع تھا۔ اس کے اندر کوئی دریچہ نہ تھا لیکن مشعل جل رہی تھی۔ لکمیر نے ادھر ادھر دیکھا تو اسے جواہرات کے انبار نظر آئے۔ بادشاہ نے کہا یہ سب تمہارے ہیں۔ پھر بادشاہ باہر نکلا اور وہ دونوں ایک اور کمرے میں آئے جہاں مشعل جل رہی تھی اور مسہری پر شہزادی سو رہی تھی۔ بادشاہ نے کہا "یہ میرا گوہر نایاب ہے اور یہ بھی تمہارا ہے" یہ کہہ کر اس نے شہزادی کو جگایا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لکمیر کو دیکھنے لگی۔ بادشاہ نے اس سے کہا: "یہ ہے میرا ولی عہد!"

بادشاہ: "ہاں ہاں یہی ہے میرا ولی عہد۔ شہزادی یہی ہے تمہارا رفیق حیات۔"

لکمیر: "یہ کیسے ہو سکتا ہے بادشاہ سلامت، ایک ڈاکو کو محل کی مسہری سے کیا مطلب"۔

بادشاہ: "بس یہ ہو گیا"

لکمیر: "لیکن وہ لڑکی۔"

بادشاہ: "اونہہ کون سی لڑکی"

لکمیر: "وہی جو عمودی سل کے پیچھے کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ دیکھئے اس کی بندوق لہرائی۔ وہ دیکھئے وہ مجھے جھانک رہی ہے۔"

بادشاہ: "شہزادی، اس نے کوئی خواب دیکھا ہے اسے عالم بیداری میں لاؤ۔"

بادشاہ سلامت یہ کہہ کر باہر چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ شہزادی کمرے کی فضا میں ہی کھوئی رہی اور لکمیر دریچے سے باہر اندھیرے میں پہاڑوں کو گھورتا رہا۔ شہزادی نے دل میں سوچا یہ عجیب انسان ہے اسے میری موجودگی کا احساس ہی نہیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے کہہ دے کہ تو ایک کور چشم اور بدذوق انسان ہے لیکن اس نے یہ کہنے کی بجائے اس سے سوال پوچھا۔ "وہ لڑکی کہاں ہے؟"۔

لکمیر اسی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ معمولی سی جنبش بھی اس کے جسم میں نہ ہوئی اور اس کی پھٹی ہوئی نظریں اسی طرح گڑی رہیں۔ دور پہاڑوں پر چند لمحے بعد اس نے شہزادی سے کہا: "یہاں آؤ"۔ شہزادی لپک کر اس کے پاس بالکل پاس آ کر کھڑی ہوگئی اور اس کے لمبے لمبے سنہری بال لکمیر کے جسم کو چھونے لگے۔ لکمیر نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہاں درے کے اندر ایک عمودی سل کے پیچھے وہ کھڑی ہوئی مجھے جھانک رہی ہے۔" پھر جیسے اسے احساس ہوا کہ اس پہاڑ اور اس کمرے کے درمیان اتنا فاصلہ تھا اور پہاڑ اور فاصلہ اس طرح اندھیرے میں ملفوف تھے کہ شہزادی تو کجا خود لکمیر کو بھی کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ تو اب صرف اس لڑکی کے نقش کو ان پہاڑوں پر دیکھ رہا تھا جو اس کے ذہن پر مرتسم ہو چکا تھا۔ اس نے کہا "اس کمرے سے باہر خلا میں، پہاڑوں میں صرف اندھیرا ہے اور وہ لڑکی وہیں کہیں ہے۔" اس نے یہ کہہ کر اپنی خوفناک سی آنکھیں شہزادی کے حسین چہرے پر گاڑ دیں۔ شہزادی نے پھر اس سے پوچھا "وہ لڑکی کون ہے؟"

لکمیر نے پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "بس وہ ایک لڑکی ہے۔ معصوم، بشاش، خنداں، بے چاری مجھے دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی۔ لیکن مجھے اس نے ڈاکو سے انسان بنا دیا۔"

شہزادی ہنسنے لگی اور اس کی ہنسی کی لہریں لکمیر کے گالوں کو چھونے لگی۔ "تو تم ڈاکو مارنے گئے تھے اور لٹ کے آ گئے۔ صیاد نخچیر بن گیا۔ دیکھا عورت کا معجزہ۔"

لکمیر اس کے سراپا کو گھورنے لگا۔ تو شہزادی نے پوچھا۔ "اب تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"بس وہی لڑکی میری سب سے بڑی سوچ ہے۔" لکمیر نے کہا۔

"آخر کیوں؟ کیا تم نے اس کو دغدار کیا؟" شہزادی نے پوچھا

"نہیں تو" لکمیر نے جلدی سے کہا۔

"پھر کاہے کی سوچ ہے؟"

"وہ برہنہ تھی، بالکل برہنہ۔ بیچاری سل کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔"

"لیکن اسے کس نے برہنہ کیا؟"

"ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے"

"تو کیا تم نے ان کے خلاف اس کی مدد نہ کی؟"

"میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، مجھے اس کے لیے کپڑے لے جانے ہیں۔"

شہزادی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ "یہ سب خزانے بادشاہ سلامت نے تمہیں دیئے ہیں، ہم اسے یہاں بلائیں گے اور مالا مال کر دیں گے۔"

"نہیں وہ کپڑے پھر اس سے چھین لئے جائیں گے۔"

"تو ہم اسے یہاں لے آئیں گے۔ وہ ہماری خادمہ بنے گی۔" شہزادی نے چہک کر کہا۔

اب کے لکمیر کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا۔ "وہ یہاں نہیں آئے گی، صحرا بھلا محل میں کیسے سما سکتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"میں اس کے لیے کپڑے لے کر جاؤں گا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں ایک کانٹا چبھا ہوا ہے۔ اگر آپ کی عنایت ہو تو آپ اس خلش کو دور کر سکتی ہیں۔ ویسے بھی میرے اور آپ کے ملاپ سے پہلے ایک ننگی عورت کا نظر آنا ہم دونوں کے مستقبل کے لیے نیک شگون نہیں ہے۔" لکمیر نے شہزادی کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔

"تو لے جاؤ جتنے جوڑے چاہئیں۔ لے جاؤ۔"

"بہتر یہ ہے آپ خود نکال دیں۔"

شہزادی نے اپنا صندوق کھول کر ایک ایک کر کے پورے دس جوڑے نکال دیئے اور لکمیر کو دے کر کہا "یہ تم اسے دے آؤ۔ لیکن تمہاری واپسی کب ہوگی؟"

"واپسی کا وہاں سے کیا سوال ہے جہاں میں پیدا ہوا ہوں۔ واپسی کا تو یہاں سے سوال ہے جہاں اجنبی ہوں۔" لکمیر نے وارفتگی سے کہا۔

"تو پھر تم مت جاؤ۔" شہزادی جیسے بھانپ گئی۔

"میرا مطلب صرف یہ ہے کہ میرا فرض صرف یہی نہیں کہ میں اسے کپڑے دے دوں، بلکہ یہ بھی ہے کہ کوئی اس سے یہ کپڑے نہ چھینے اور جو کوئی ایسی

حرکت کرے گا میں اسے شہزادی کی عدالت عالیہ میں پیش کردوں گا۔"

"تو گویا تم اس وقت آؤ گے جب وہ انہیں پہن کر پھاڑ لے گی"

"ہاں، میرا مطلب یہ ہے کہ شہزادی پر قدرت کا فیض بے حد ہے۔ جب اس کے یہ کپڑے پھٹ جائیں گے تو میں حضور سے ملتجی ہوں گا کہ اپنے معمور خزانے سے اس غریب کے لیے کچھ اور جوڑے دے دیئے جائیں"

"تو تم تھوڑے کپڑے لے جاؤ کہ جلدی واپس آسکو" شہزادی نے کہا۔

"میں جلدی ہی واپس آجاؤنگا۔ جب دیر کے بعد بارش ہوتی ہے تو پیاسی زمین اسے فوراً جذب کر لیتی ہے۔ اس بچاری کو یہ کپڑے پہلی دفعہ ملے ہیں وہ انہیں جلدی جلدی بدلا کریگی اور پہاڑوں میں مال چرائی کی وجہ سے یہ چند دنوں میں ہی پھٹ جائیں گے۔" لکمیر نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"تو کب تک آؤ گے؟"

"بس بہت جلدی، یوں سمجھئے کو جونہی آپ کی ان خوبصورت آنکھوں میں سرمے کی لکیر ذرا مدہم ہوگی اور آپ کے رخساروں کا غازہ ہلکا سا دھیما پڑے گا۔ بس میں اسی وقت آجاؤں گا۔" لکمیر نے ذہن نشین کراتے ہوئے کہا۔

وہ پارچات اٹھا کر چلا تو شہزادی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ دروازے پر آکر شہزادی نے کہا: "یہ نہ بھولنا کہ اس سلطنت کا تاج تمہارا منتظر ہے اور میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔" شہزادی کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔

لکمیر نے کہا "جونہی اس کانٹے کی خلش دور ہوگئی میں آجاؤں گا۔ اس وقت تک آپ میرا ویسے ہی انتظار کریں جیسے سمندر کی لہریں چاند کا انتظار کرتی ہیں۔" اور وہ محل سے باہر نکل گیا۔ شہزادی اندھیرے میں خلاؤں کو گھورتی رہی۔ لیکن ہر صبح کاذب کے بعد اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا وہ اسی اندھیرے میں آنکھیں کر کے ریت کے ٹیلے کی طرح بیٹھی پہاڑوں کو دیکھتی رہی۔

پانچویں کہانی:

بہادر خان کی سرگزشت

خلاصہ: یہ کہانی براہوی کامیڈی کا شاہکار ہے۔ براہوی غریب اور مزدور لوگ ہیں لہٰذا ان میں ایک بنیادی کرب پایا جاتا ہے۔ وہ اس کرب کو دباتے ہیں اسے بہلاتے اور پھسلاتے ہیں لیکن یہ کرب ازلی، یہ درد ناگزیر اور یہ غم بسیط ان کی زندگی پر محیط ہے اور اسی سے ان کے قہقہوں کا ساز بجتا ہے اور ان کی کامیڈی ابلتی ہے۔ غم اصل میں خلوص کا خالق اور براہویوں کی فراوانی غم ان کے خلوص بے کراں کا ثبوت ہے۔ یہ غم اتنا دور رسیدہ او رہمہ گرفتہ ہے کہ ان کے قہقہے بھی اسی غم میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ان کی مجنونانہ حرکات بھی ان کے ناظرین اور ان کے ادب کے قارئین کو ہنسانے کے باوجود ان پر غم کا ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ فن جب تک غم کی بھٹی میں نہیں جلتا زندگی کی صداقت اور اس صداقت کی ابدیت سے بے بہرہ رہتا ہے، تو یہ ماننا پڑے گا کہ براہوی کی فنی تخلیقات خلوص سے لبریز ہیں۔ آپ ان کی خندہ آور حرکات پر ہنستے تو ضرور ہیں لیکن آپ کا دل ان کی رہ رہ کر ڈسنے والی مایوسی پر کڑھتا ہے اور دبے پاؤں چھا جانے والی محرومی پر روتا ہے۔ یہ کہانی طربیہ ہے لیکن اس میں بے پناہ سوز و گداز اور بے انتہا رقت انگیزی موجود ہے۔ کہانی میں براہویوں کے توہمات بھی جھلک رہے ہیں وہ انسانی نسل کا ایک پس ماندہ حصہ ہیں۔ تہذیب انسان کا خاموش اور بے حس و حرکت پانی، لہٰذا وہ بہت سے توہمات میں مبتلا ہیں اور مانتے ہیں کہ جادو کے ذریعے ایک مردے کو زندہ کیا جاسکتا ہے۔ جادوگر کا کردار ایسا ہی ہے لیکن بہادر خان خود ایک مافوق الفطری انسان بن جاتا ہے۔ جو ہان کے جلنے سے اس کی بیوی کو یہ یقین ہے کہ بہادر خان بھی جل گیا اور اس غلط فہمی کی وجہ سے وہ اسے زندہ دیکھ کر یہ سمجھتی ہے بلکہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ وہ قبرستان سے زندہ ہو کر آ گیا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے سماج کے لیے ایک ماورائی چیز بن جاتا ہے اور جب جادوگر ملا کو زندہ کر کے اس کے ساتھ ننھی کر دیتا ہے تو گویا بہادر خان کی ماورائیت دوگونہ اور ناقابل انکار حقیقت بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس غلط فہمی کے ازالہ کے بعد بہادر خان کو تو اس کا معاشرہ اپنے بھائی اور شہری کی حیثیت سے واپس لے لیتا ہے لیکن جادوگر کا کردار اپنی جگہ پر اٹل ہے اور شروع سے آخر تک فوق البشری ہے۔

براہوی ہمیشہ سے مذہبی خبط اور جنون سے معرا ہیں۔ ان کے معاشرے میں ملا کا وجود ضروری ہے۔ وہ اس کی عزت و توقیر بھی کرتے ہیں۔ شادی بیاہ اور موت و پیدائش کے مواقع اسی کی قیادت میں گزارتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں بھی یہ ملا ان کے بچوں کی درس و تدریس کا اہم فرض ادا کرتے ہیں اور اساتذہ کی حیثیت سے وہ براہوی زبان اور اس کے ادب کے بھی ناشر و خالق ہیں۔ چنانچہ کئی براہوی کہانیاں اور گیت انہی لوگوں کی ذہنی کاوش کا نتیجہ سمجھی جاتی ہیں۔ براہویوں کو خاص طور پر روایتی ملا سے بڑی نفرت ہے۔ وہ ان کے تہذیبی کام کو تو مانتے ہیں لیکن انہیں کبھی سیاست یا ذہنی زندگی کے قائد نہیں سمجھتے چنانچہ اس کہانی میں روایتی ملا براہویوں کی اس عام نفرت کا تختہ مشق ہے۔ کہانی بہادر خان کے لیے تو رحم کے جذبات پیدا کرتی ہے لیکن روایتی ملا کے لیے غصے اور انتقام کے۔

کہانی کا متن: بہادر خان ایک کھاتا پیتا کسان تھا۔ بارش نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ کاریز کے پانی کی مدد سے اپنے کھیتوں میں اتنی سیرابی کر لیتا تھا کہ نہ صرف اپنے لئے سال بھر کے غلے کا خرچ پورا کر لیتا بلکہ اپنے ہمسایوں اور غریب وغربا کی مدد بھی کر دیتا۔ جب کاریزوں میں پانی تھوڑا ہوتا تو بھی اس کو کسی دوسرے زمیندار کی مدارعت نہ کرنا پڑتی تھی۔ اس کی اس معاشی آزادی کی وجہ سے اس میں کافی خودداری تھی اور اس کی بانٹ چونٹ کر کھانے کی عادت نے اردگرد میں اسے کافی نیک نامی دے رکھی تھی۔ لہٰذا اس کی شادی نہایت آسانی اور دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی سے پہلے وہ اپنے کھیتوں اور فصلوں کی پرورش میں بے حد پیش بینی اور محنت کرتا تھا۔ گندم کے خوشوں کے لیے وہ ایک حریص باپ سے کم نہ تھا۔ وہ ایک ایک خوشے کو گنتا تھا۔ اس کے لیے دعا مانگتا تھا اور اسے جانتا تھا اور جب سبز خوشے اناج سے بھر کر سنہری ہو جاتے تھے اور اپنے سر ایک طرف کو جھکا لیتے تھے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا "ان خوشوں کو اپنے وجود کا احساس ہے۔ یہ اپنے مالک کو جانتے اور پہچانتے ہیں ان میں زندگی کی مسرتیں اور قہقہے محفوظ ہیں اور جوان سے پیار کرتا ہے یہ اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں اور ایک ایک کی جگہ دو دو پھوٹتے ہیں۔"

شادی کے بعد اس کے معمول میں تھوڑا سا فرق آنا لازمی تھا، شادی سے پہلے وہ پسند نہ کرتا تھا کہ کوئی اور اس کے کھیتوں کے ان خوشوں کو چھو بھی لے! ان سے اس کی محبت اتنی خودغرض، والہانہ اور حاسدانہ تھی! لیکن جب شادی ہوگئی تو وہ سوچنے لگا۔ ہر انسان کے دل میں محبت کی ایک قدرتی اور دائمی کاریز موجزن ہے اور وہ اس سے دنیا کی ہر چیز اور اپنی ہر مقبوضہ شے کو سیراب کرتا رہتا ہے۔ اسے اپنے مکان سے محبت ہے۔ اپنے بیلوں سے محبت ہے۔ اپنے کھیتوں سے محبت ہے۔ سبز خوشوں سے محبت ہے۔ لیکن اس محبت کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب ایک عورت اس کی زندگی میں داخل ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے۔ لہٰذا جب اس کی محبت کا بیشتر حصہ اس کی بیوی پر خرچ ہونے لگا تو بادل ناخواستہ اس بات پر تیار ہوگیا کہ بونے کاٹنے کے لیے ایک نوکر رکھ لے۔ یہ نوکر بھی اسے اس کی منشا کے مطابق مل گیا۔ وہ ہر وقت کھیتوں سے فالتو گھاس، کائی وغیرہ صاف کرتا۔ وقت پر پانی دیتا۔ بیلوں کو چارہ ڈالتا اور فصلوں کی خاطر تواضع میں لگا رہتا تھا۔ بس تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد وہ حقہ کے چارکش لگا تا تھا۔ یہی اس کی عیاشی تھی اور پھر جن کی طرح کام کرتا تھا۔ خدا کے فضل سے ان دنوں بارش خوب ہوئی اور بہادر خان کے بنجر کھیت پانی سے بھر گئے۔ نوکر نے ان کھیتوں میں گندم بوئی، جو چند ماہ بعد پک کر تیار ہوگئی۔ بہادر خان نے جب پوری گندم کو کٹوایا اور خاردار جھاڑیوں کے پاس جوہان (کھلیان) لگوا دیا تو گاؤں کے سب لوگ، راہگیر اور اردگرد کے دیہات کے باشندے اسے دیکھتے آتے اور اسے کہتے "بہادر خان! تو بہت اونچے ستارے والا ہے۔ تیری بیوی سونے پر سہاگہ ہے اور تیرا نوکر بھی اچھے شگون والا ہے" وہ خود اس وسیع انبار کو آنکھ بھر کر دیکھتا تو سر سے پیر تک ایک خاموش قہقہہ بن جاتا لیکن کچھ خوف، کچھ نامعلوم ڈر، کچھ بے نام سے شکوک اس کے دل و دماغ میں رینگتے! وہ سوچتا جب غریب آدمی باسی ٹکڑوں کو ترستا ہے تو وہ کسی کے لیے خطرہ نہیں ہوتا لیکن جونہی اسے دو وقت کی روٹی میسر آنے لگتی ہے، وہ خطرناک بن جاتا ہے اور جب اس کا گھر بھر جائے تو پھر زمین اور آسمان کی ساری طاقتیں اس کے درپے ہو جاتی ہیں اور وہ آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہتا "خدایا! یہ سب تیری دین ہے"۔

چنانچہ اس نے بیوی سے کہا کہ وہ خود بھی نوکر کے ہمراہ جوہان کے پاس ٹھہرا کرے گا۔ مبادا نوکر کی نیت خراب ہو جائے، یا قزاق ہی اسے لوٹ لیں۔ بیوی نے اس سے اتفاق کیا۔ بہادر خان اور نوکر وہیں رہنے لگے۔ بیوی صبح اور شام ان کا کھانا وہاں دے آتی۔ اس طرح کئی روز گزر گئے حتی کہ ایک شام جب اس کی بیوی آندھی چلنے کی باوجود کھانا وقت سے پہلے دے کر جا چکی تھی اس کا ایک دور کا سیال (رشتہ دار) وہیں کھیت میں اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس کے چچازاد بھائی لشکران کی شادی تھی جس پر وہ بلاوا لے کر آیا تھا۔ بہادر خان نے سوچا کہ ایسے مواقع بار بار تھوڑا ہی آتے ہیں، چنانچہ اس نے اس بلاوے پر جانا منظور کر لیا۔ اس کی جیب میں سو روپیہ تھا جو شادی کے لیے کافی تھا، اس نے نوکر کو سمجھا دیا کہ وہ انبار کی حفاظت کرتا رہے اور اس کے جانے کی بابت کسی سے ذکر نہ کرے مبادا چور اچکے اسے تنہا سمجھ کر اس پر پل نہ پڑیں اور گھر سے جو روٹی آئے وہ کھا لیا کرے۔ اس کے بعد بہادر خان اپنے سیال کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

نوکر ایک زبردست چلم کشوک تھا اور خصوصاً فرصت کے اوقات میں تو وہ اپنے حقے سے ایک لمحہ بھی جدا نہ ہوتا تھا، اس نے ادھر ادھر سے خس وخاشاک جمع کر کے آگ جلائی گو وہ کافی فاصلے پر جھاڑیوں کے وسط میں بیٹھا تھا، تاہم ایک غضب ناک بگولے نے اس آگ کے کچھ انگارے اٹھا کر جوہان میں پھینک دیئے۔ جوہان کو آناً فاناً آگ لگ گئی تو نوکر گندم کو بچانے کے لیے دوڑا لیکن وہ خود بھی اس کی بل کھاتی ہوئی لپٹوں کی نذر ہوگیا۔ اگلی صبح بہادر خان کی بیوی روٹی لیکر جو آئی تو اس نے دیکھا کہ بہادر خان جوہان سمیت جل گیا تھا۔ وہ روتی پیٹتی واپس آ گئی۔ اور اپنے سیالوں کو بتایا۔ وہ جلے ہوئے نوکر کو بہادر خان سمجھ کر کھاٹ پر اٹھا کر لے گئے اور ایک قبرستان میں دفن کر آئے۔

کچھ دن بعد بہادر خان اپنی سیال داریوں سے خلاصی پا کر اپنے گھر کو واپس ہوا اور نیم شب کے قریب پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کی بیوی ماتم کر رہی ہے اور رو رہی ہے۔ بیوی نے اسے دیکھ لیا اور سمجھی کہ اس کا شوہر مردوں سے

زندہ ہو کر واپس آیا ہے تا کہ اسے بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ پس اس نے ایک چیخ ماری اور سارے تومان (قبیلہ) کو بتانے کے لیے باہر بھاگی۔ ہر شخص کو اپنی زندگی کا کھٹکا پڑ گیا۔ بہت سے پہاڑوں میں چھپ گئے۔ کچھ نے کندھوں پر اپنی اپنی بندوق رکھ لی۔ کچھ نے بغلوں میں تلواریں لٹکا لیں اور سینوں پہ ڈھال جما لئے او بہت سوں نے ڈنڈے سنبھال لئے اور "جوانو۔ پکڑو، جانے نہ پائے" کہہ کر بے چارے بہادر خان کا تعاقب کرنے لگے۔ بہادر خان چار و ناچار بھوکا اور پیاسا ایک قبرستان میں شب بسری کے لیے چھپ گیا اور تارے گن گن کر صبح کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر لوگوں نے اسے جن پریت کیوں سمجھا۔ شاید اس لئے کہ وہ رات کے وقت اپنے گھر پہنچا تھا۔ بہر حال اسے یقین تھا کہ اس کے لوگ صبح کو اسے پہچان لیں گے۔ اسی امید پر اس نے رات مردوں کے قریب گزار دی۔

صبح صبح وہ زور کی بھوک کے مارے اپنے گاؤں میں پھر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا مولوی مسجد میں اذان کہنے کے لیے اپنے ہاتھ کانوں تک اٹھائے ہوئے تھا۔ بہادر خان نے کہا، "اے ملا میں بھوکا ہوں" ملا نے اپنا منہ اس کی طرف موڑا اور بہادر خان کو دیکھ کر اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور زمین پر لوٹ کر مر گیا اور لوگ یہ دیکھ کر اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے۔ بہادر خان کو اس سبب پھر قبرستان میں لوٹنا پڑا۔ تھوڑے عرصے بعد لوگ ملا کو قبرستان لائے اور اسے دفن کر دیا۔ ان کے پاس آپس میں تقسیم کرنے کے لیے کھجوریں تھیں۔ ملا کے باپ نے پوچھا "انہیں کتنے آدمیوں میں تقسیم کرنا ہے؟" کسی نے جواب دیا "سو آدمیوں میں" عین اس وقت بہادر خان نے بھوک سے بے تاب ہو کر ایک قبر کے عقب سے نعرہ لگایا۔ "سو آدمیوں کو دے دو لیکن پہلے میرا حصہ دو" بہادر خان کی آواز سن کر لوگوں نے کھجوریں اور کھاٹ تو وہیں چھوڑے بلکہ بہت سوں کی جوتیاں بھی رہ گئیں اور وہ سر توڑ بھاگے۔ کچھ چیختے چلاتے اور پیچھے دیکھتے جاتے تھے۔ بہادر خان کے خوف کی وجہ سے وہ گھروں میں پہنچ گئے اور توبہ کی کہ وہ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلیں گے۔ بہادر خان نے سب لوگوں کو بھاگتے دیکھ کر مونچھوں کو تاؤ دیا اور کھجوریں کھانے لگا۔ اس نے دل میں کہا "میرے خدا میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ میرے گاؤں کے لوگ مجھے مردہ سمجھتے ہیں اور مجھ سے روپوشی اختیار کرتے ہیں۔ میری بیوی میرے سائے سے بھی گریز کرتی ہے"۔

آدھی رات کے قریب جبکہ بہادر خان ایک قبر کے عقب میں بیٹھا قسمت کو کوستے اونگھ رہا تھا۔ ایک سیاہ پوش خوفناک سا انسان قبرستان میں داخل ہوا۔ اور سیدھا ملا کی قبر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے کچھ پڑھا۔ قبر شق ہو گئی اور ملا کی لاش گھٹنوں تک باہر آ گئی۔ بہادر خان سمجھ گیا یہ کوئی جادوگر ہے جو تازہ لاشوں پر اپنے جادو کے تجربے کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ وہ جادوگر کو پکڑ کر اس سے جادو سیکھ لے۔ اس خیال سے وہ مکڑے مکڑے (چپکے چپکے) جادوگر کے پیچھے آیا اور پھر یکبارگی لپک کر اس نے اسے قابو کر لیا۔ جادوگر چلایا "مجھے چھوڑ دو" بہادر خان نے کہا "مجھے اپنا عجیب و غریب سحر سکھاؤ تو چھوڑوں گا" جادوگر نے کہا "مجھے چھوڑ دو میں سکھا دوں گا۔" آخر کار بہادر خان نے لیت و لعل کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ جادوگر نے فوراً کوئی منتر پھونکا کہ بہادر خان جدھر جائے ملا بھی اس کے پیچھے ادھر ہی جائے۔ جادوگر تو اس کے بعد غائب ہو گیا لیکن ملا سائے کی طرح بہادر خان کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ وہ جدھر جاتا، ملا بھی اس کے پیچھے پیچھے جاتا۔ بہادر خان نے سوچا "میں نے اپنے اوپر ایک اور قہر طاری کر لیا کہ میں جدھر جاتا ہوں ملا بھی ادھر جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں اور ڈر رہے ہیں کہ میں نے مردہ ملا کو زندہ کر دیا ہے۔"

ایک دفعہ بہادر خان بھوکا تھا۔ اس نے سوچا کہ میں فلاں فلاں پالیز (باغ) میں چلتا ہوں، جو قریب ہے وہاں سے کچھ خربوزے اور تربوزے چرا کر کھاتا ہوں۔ چنانچہ وہ روانہ ہوا لیکن اس نے دیکھا کہ ملا بھی آ رہا ہے۔ اس نے کہا "او ملا، خدا سے ڈرو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔ لوگ تو مجھ سے پہلے ہی بھاگتے ہیں، تمہیں دیکھ کر اور بھی خوفزدہ ہو جائیں گے"۔ ملا یہ سن کر تھوڑا سا ٹھٹھکا۔ لیکن جونہی بہادر خان چلنے لگا۔ ملا بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ بہادر خان نے ملا کی خوب مرمت کی۔ لیکن اس کے باوجود ملا بہادر خان کے پیچھے لگا رہا۔ بہادر خان نے دوسری دفعہ، تیسری دفعہ اسے خوب زدوکوب کیا۔ لیکن کوئی اثر نہ ہوا پھر غصے سے بے تاب ہو کر اس نے ملا کو گھسیٹنا شروع کیا اور قبرستان میں واپس لا کر اس کھاٹ سے باندھ دیا۔ جس پر ملا کی لاش آئی تھی اور کہنے لگا۔ "اب ہلو تو میں تمہیں دیکھوں گا۔" اس کے بعد وہ روانہ ہوا۔

ملا نے جب دیکھا کہ بہادر خان جا رہا ہے تو اس نے زور لگایا اور ایک جھٹکے سے کھاٹ سمیت کھٹ کھٹ کرتا ہوا بہادر خان کے پیچھے چلا۔ بہادر خان نے دیکھا کہ ملا بہت تیزی سے اس کے تعاقب میں آ رہا ہے تو اس نے بہت پیچ و تاب کھایا اور خوب مارا لیکن سخت جان ملا پر مار کٹائی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بہادر خان ناچار کھیت میں گیا۔ جہاں پانی دینے کے لئے ایک بڑا آبی چرخہ نصب تھا۔ وہاں ملا کو کھاٹ سمیت کھڑا کر کے اس نے کہا یہاں ذرا ٹھہرو۔ میں کچھ خربوزے اور تربوز چرا لاؤں۔ میں تمہیں بھی دوں گا۔ اور کچھ میں بھی کھاؤں گا۔ وہ چلا لیکن ملا بھی حرکت میں آ گیا۔ بہادر خان نے جوش میں آ کر اسے پھر مارنا شروع کیا۔ لیکن ملا ڈھٹائی سے کھڑا رہا۔ آخر بہادر خان نے کھاٹ سمیت ملا کو چرخے سے مضبوط طریقے سے باندھ دیا اور خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے پالیز میں داخل ہو گیا۔ ملا نے بہادر خان کو جاتے دیکھ کر زور مارا اور ایک زبردست جھٹکا دے کر چرخہ اور

کھاٹ سمیت گڑگڑ کرتا ہوا اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ بہادر خان نے دیکھا تو اس سے کہا "تیرا خانہ خراب میرا پیچھا چھوڑ دے، خدا سے ڈرو۔" یہ کہہ کر اس نے ملا کو خوب مارا اور آگے چلا۔ ملا بھی پیچھے پیچھے چلا۔ بہادر خان نے کہا "بد بخت میں بھوکا ہوں مجھے ذرا تنہا چھوڑ دے۔ میں کچھ خربوزے اور تربوز چرا لاؤں اور ہم دونوں کھائیں گے۔ یہیں کھڑا رہ" لیکن ملا کو کہاں سکون تھا۔ وہ آسیب کی طرح اس کے پیچھے رہا۔ بہادر خان نے پھر اسے مارا اور پھر جھاڑیوں میں چھپتا ہوا پالیز میں پہنچا۔ ملا بھی گڑگ گڑگ کرتا ہوا پیچھے آیا۔ بہادر خان نے جلدی جلدی کچھ خربوزے توڑے۔ پالیزدان (مالی) نے دیکھا کہ بہادر خان اور ملا گڑگ گڑگ کرتے ہوئے خربوزے توڑ رہے ہیں۔ تو وہ چیختا ہوا بھاگا اور لوگوں کو بتانے لگا کہ بہادر خان اور ملا ہر طرف دندناتے پھر رہے ہیں۔ شہریوں اور غریبوں کا مال زور سے قبضا رہے ہیں۔ لوگ اور بھی خوفزدہ ہو گئے۔

ایک دن بہادر خان نے دور سے دیکھا کہ ایک آدمی بیل پر بیٹھا ہوا روٹی کھاتا آرہا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی طرف گامزن ہوا۔ اور اس سے کہا "بندہ خدا مجھے روٹی دو۔ میں بھوکا ہوں" بیل سوار نے بہادر خان اور ملا کو دیکھا تو وہ وحشت زدہ ہو کر بیل سے گرا اور تڑپ کر مر گیا۔ بہادر خان نے روٹی لے لی اور دونوں اسے کھاتے ہوئے واپس قبرستان آ گئے۔

کچھ دن بعد گاؤں کے رئیس کی پوشاک غلیظ ہوئی تو اس نے اپنے دھوبی سے کہا "میرے کپڑے ندی پر لے جاؤ اور صاف کر لاؤ" دھوبی نے کہا۔ "حضور بہادر خان بمعہ ملا زندہ ہو گیا ہے اور چرخہ وکھاٹ سمیت ادھر ادھر دندناتے پھرتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے ندی پر دیکھ نہ لیں اور پکڑ کر مار نہ دیں۔ اس لئے میں نہیں جاؤں گا۔ رئیس نے کہا "میں تمہاری حفاظت کے لیے تین سوار بھیج دیتا ہوں" اس پر دھوبی رضامند ہو گیا۔ اس نے کپڑے لئے اور سواروں کی معیت میں اپنے گدھے پر بیٹھ کر ندی پر آیا۔ سواروں نے اپنے گھوڑے رسیوں سے مضبوط باندھ دیئے اور دھوبی کی پہرہ داری کرتے رہے۔ دریں اثناء بہادر خان کو پیاس لگی اور وہ ندی کی طرف چلا۔ اس کے پیچھے پیچھے ملا بھی گڑگ گڑگ کرنے لگا۔ بہادر خان نے کہا "اے ملا کیوں ظلم کرتے ہو؟ خدا سے ڈرو۔ یہیں ٹھہرو تا کہ میں پانی پی آؤں۔ میں ابھی تمہارے پاس لوٹ آؤں گا" لیکن کم بخت ملا تو بے دھڑک تھا۔ اس کے قدم کہاں رکتے تھے؟ آخر کار بہادر خان نے استرا نکال کر ملا کے بال صاف کر دیئے۔ اس کے بعد وہ ندی پر آیا اور جھک کر پانی پینے لگا۔ ملا بھی گڑگ گڑگ کرتا ہوا وہیں آدھمکا۔ دھوبی کی نگاہ جو اس پر پڑی وہ چلایا "سپاہیوں! بہادر خان معہ ملا آ گیا ہے" سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ بے لگام گھوڑوں پر چڑھے۔ دھوبی نے کپڑے وہیں چھوڑ دیئے اور گدھے پر بیٹھ کر لٹھ مار مار کر اسے گاؤں کی طرف ہانکنے لگا۔ تا کہ گاؤں والوں کو خبردار کرے سواروں نے گھوڑوں کے یکے بعد دیگرے چابک مارے۔ انہوں نے گردن کے رسے تو کھول دیئے تھے لیکن ایڑیوں کے رسے گھبراہٹ میں بھول گئے تھے۔ اس وجہ سے گھوڑے اب رسوں اور میخوں کی وجہ سے دوڑتے دوڑتے گر گئے۔ سپاہی انہیں مار رہے تھے اور اس بھاگڑ میں میخیں اکھڑ اکھڑ کر ان کے چہروں پر لگ رہی تھیں حتی کہ ان کے چہرے، سر اور کان لہولہان ہو گئے اسی طرح ہوتے ہوتے ان میں دو مر گئے اور صرف ایک زندہ واپس آیا۔ رئیس کو اپنی کہانی سنائی اور زخم دکھائے۔ دھوبی نے توبہ کی کہ وہ پھر کبھی باہر نہ جائے گا۔

بہادر خان نے یہ سب کچھ دیکھا اور سوچنے لگا "خدایا؟ میں کیا کروں؟ میں ڈوب مروں یا پتھروں سے اپنا سر پھوڑوں؟ میں اپنے عزیز و اقارب کے لیے بیگانہ ہو گیا ہوں۔ میرے اپنے تمن (قبیلہ) کے لوگ مجھ سے گریزاں ہیں اور یہ ملا کمبخت ایک آسیب کی طرح چمٹ کر رہ گیا ہے" وہ سوچتے سوچتے قبرستان واپس گیا۔ اس کے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک پہاڑ بن گیا۔ اس کے دماغ میں رینگتا ہوا ہر خیال اس کی رگوں میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ آخر اس نے کونسا گناہ کیا تھا۔ جس کی پاداش میں وہ اس مصیبت میں پھنس گیا اور مصیبت جب شروع ہوئی تو اس کی کوئی انتہا ہی نظر نہ آتی تھی۔ نہ جانے وہ اسی طرح کب تک اور کیا سوچتا رہا۔ آدھی رات کے وقت جادوگر پھر قبرستان میں آیا۔ وہ اسے پکڑنے کے لیے روانہ ہوا۔ ملا بھی اس کے پیچھے چلا۔ بہادر خان نے کہا "او شوم ذرا صبر کرو" اور وہ مداں مداں جادوگر کے پیچھے پہنچا اور لپک کر اسے پکڑ لیا اور کہنے لگا "میں تمہیں ہرگز زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اگر تم نے ملا کو مجھ سے علیحدہ نہ کیا" جادوگر نے بہت لیت ولعل کیا۔ لیکن بہادر خان ڈٹا رہا اور کہنے لگا "اس دفعہ کوئی رعایت نہ ہوگی۔ ملا کو فوراً قبر میں واپس کر دو" چنانچہ جادوگر نے دوبارہ ملا کو اس قبر میں ڈال دیا اور خود قبرستان سے چلا گیا۔

بہادر خان اپنے سیالوں کی طرف چلا جن کی شادی میں وہ گیا تھا۔ اس نے ان سے سب کچھ کہا اور درخواست کی "میرے گاؤں والے مجھے مردہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے میرے ساتھ چلو اور انہیں بتا دو کہ میں تمہاری شادی میں آیا تھا" چنانچہ وہ اسے لیکر بہادر خان کے گاؤں آئے۔ لوگ اسے دیکھنے کے بعد باہر نکلے۔ اس کے سیال نے رئیس، بہادر خان کی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کو بلایا اور سمجھایا کہ جسے تم مردہ سمجھتے ہو وہ تو اس کا نوکر تھا۔ بہادر خان تو ان دنوں شادی میں گیا ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھا کر واپس چلا گیا۔ لوگ بہادر خان سے خوش ہو گئے اور وفور مسرت سے ناچ ناچ کر پکارنے لگے۔ "نن کھٹان، چھٹان، ناسلامابسون" "ہم نے حاصل کر لیا۔ ہم آزاد ہو گئے۔ ہم تمہیں سلام کرتے ہیں۔

پشتون

بلوچستان کا مکمل رقبہ ۳۴۷۱۹۰ مربع کلومیٹر ہے۔ سال ۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۶۵۶۵۸۸۵ ہے جبکہ اس کی ثقافتی تقسیم (زبانوں کی اساس پر) یوں ہے:

پشتو	۱۹۴۵۸۷۸	(%۲۹.۶۴)
بلوچی+براہوی	۳۳۹۵۶۰۸	(%۵۱.۷۶)
پنجابی	۱۶۵۲۳۵	(%۲.۵۲)
سندھی	۳۴۴۲۴۴	(%۵.۵۸)
سرائیکی	۱۵۸۶۶۴	(%۲.۴۲)
اُردو	۶۴۰۱۸	(%۰.۹۸)
باقی زبانیں	۲۷۰۲۳۸	(%۴.۱۲)

اس فہرست میں فارسی (ہزارگی) زبان بولنے والوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے جو شاید تخمیناً "باقی زبانیں" والے کالم کا احاطہ کرتے ہیں۔

بلوچستان جو کثیر اللسانی صوبہ ہے اس کی اکثریتی آبادی پشتون بلوچ اور براہوی کی ہے۔ جبکہ بلوچ اور براہوی اس وقت ایک نام یعنی ''بلوچ'' سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کا رہائشی علاقہ بھی ایک ساتھ ہے۔ جس کو ہم عام اصطلاح میں بلوچ علاقہ کہتے ہیں یہ صوبہ آخری تقسیم بندی کے مطابق 29 اضلاع پر مشتمل ہے۔ جن میں پشتونوں کے اکثریتی اضلاع مندرجہ ذیل ہیں۔

لورالائی، ژوب، قلعہ سیف اللہ، موسیٰ خیل، قلعہ عبداللہ، پشین اور زیارت کے علاوہ سبی اور کوئٹہ بھی ایسے اضلاع ہیں جہاں پشتون اکثریت سے ہیں۔ ۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے مطابق بلوچستان کی کل آبادی میں ۱۹۴۵۸۷۸ پشتون ہیں۔ ویسے تو پورے صوبے میں پشتون ضرور موجود ہیں' لیکن اکثریتی علاقوں کی اصل آبادی میں سے پشتونوں کی تعداد اسی مردم شماری کے مطابق حکومتی ریکارڈ میں کچھ اس طرح محفوظ ہے۔

ضلع	پشتون آبادی	فیصدی
لورالائی	۲۷۳۸۹۹	۹۲.۰۵
ژوب	۲۶۶۳۹۸	۹۶.۸۲
پشین	۳۲۴۲۶۳	۹۸.۳۸
قلعہ عبداللہ	۳۶۰۸۱۶	۹۷.۴۵
قلعہ سیف اللہ	۱۹۲۰۲۵	۹۹.۲۱
زیارت	۳۳۱۸۲	۹۹.۵۳
موسیٰ خیل	۱۰۵۷۹۵	۷۸.۹۲
شیرانی	۸۳۷۷۱	۹۹.۹۵
سبی	۷۹۶۶۰	۴۴.۳۲
کوئٹہ	۲۲۷۷۷۱	۲۹.۹۷

جہاں تک پشتونوں کی اصلیت کا تعلق ہے تو کچھ پشتون محققین کا دعویٰ ہے کہ پشتون ایک قدیم ترین نسل ہے لیکن ان کی اصلیت کے لئے اسناد میسر نہیں۔ ان کے حوالے سے جو معروف نظریے پیش کئے جا چکے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱) پشتون نسلاً بنی اسرائیل ہیں۔
۲) پشتون اصلاً یونانی ہیں۔
۳) پشتون سیتھین نسل سے ہیں۔
۴) پشتون آریائی نسل سے ہیں۔

جو نظریہ زیادہ معروف ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں میں سے بارہ قبیلے نکلتے ہیں۔ جن میں ایک پشتون یا پٹھان ہے۔ ان کے بیٹوں میں سے ایک کا نام کا قیس تھا۔ اس کا بیٹا طالوت کے نام سے مشہور ہوا اور یہی طالوت پشتونوں کا جد امجد ہے۔ جبکہ پشتونوں کا پہلا مورث اعلیٰ افضہ بن ارمیا بن طالوت ہے۔ جبکہ پشتو زبان بھی عبرانی کی منقلب شدہ شکل ہے جو حضرت سلیمان نے جنات کو سکھائی تھی اور اس زبان میں حضرت سلیمان آصف و افضہ کے ساتھ راز کی باتیں کرتے تھے۔ بخت نصر کے بیت المقدس پر حملے کے بعد افضہ کی اولاد نے ایران اور افغانستان میں رہائش اختیار کی۔ حضرت محمدؐ نے مدینہ منورہ ہجرت کی تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ، جو بہتر افراد پر مشتمل تھا، اپنے سردار قیس کی سربراہی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور سب مشرف بہ اسلام ہوئے اور قیس کا نام عبدالرشید سے بدل دیا گیا۔ ساتھ ہی حضور نے اسے ''بطان'' کا خطاب بھی عطا کیا۔ جو عربی میں کشتی یا

بحری جہاز کے ستون کو کہتے ہیں یعنی تو میرے دین کا ''بطان'' ہے' یوں ہوتے ہوتے یہ لفظ پٹھان میں تبدیل ہوگیا۔ قیس کی وفات کے بعد ان کے تین بیٹے سٹربن، غور غشت اور بیٹن سے تمام پشتون کی نسل کو فروغ ملا۔ ان کے یونانی ہونے پر پشتو کے معروف شاعر عبدالغنی خان نے اپنی کتاب "دی پٹھان" میں زور دیتے ہوئے یونانیوں اور پشتونوں کے رسوم و رواج کی مشابہت اور دیگر دلائل کی بناء پر یونانی النسل کہا ہے۔ تیسرے نظریئے کے مطابق پشتونوں کا تعلق سیتھین کے خانہ بدوش قبائل سے ہے جو ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ وسط ایشیاء میں موجود تھے۔

جبکہ چوتھے نظریئے کے مطابق پشتون آریائی نسل سے ہیں جو مغلستان کے علاقوں سے چراگاہوں کی کمی اور زرد پوستوں کی اذیتوں کے ہاتھوں ہجرت کر کے آئے تھے اور ان آریائی قبائل میں ایک قبیلہ پکھت کا تھا جو بعد میں بدل کر پشتون ہوگیا ہے۔ پشتونوں کے نسلی مباحث کے حوالے سے اس اجمالی نظر کے بعد اسی طرح اس زبان پر بھی ایک نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

اس زبان کی اساس پر بھی اس طرح کے مختلف نظریات ملتے ہیں جن میں کہیں اسے دراوڑی زبانوں کی باقیات کہا گیا ہے کہیں سنسکرت سے متعلق اور کہیں سنسکرت کی بھی ماں کہا گیا ہے۔ جبکہ اس زبان کو ایرانی زبانوں میں بھی شامل کیا جاتا ہے جس کے تحت فارسی، بلوچی اور کردی وغیرہ کے علاوہ یہ زبان بھی اسی خاندان کی زبانوں میں سے ایک ہے۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کہ ''پشتو'' یا ''پشتون'' لفظ صرف زبان کا نہیں بلکہ پشتون قبائل میں ایک اقدار کے مجموعے کا نام بھی ہے یعنی اگر کوئی شخص بد عہدی کرے تو اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ ''اس شخص کی کوئی پشتو نہیں'' یا یہ کہ ''اس کی پشتو کا اعتبار نہیں'' یا اگر کوئی شخص مردانگی اور جوانمردی کا مظاہرہ کرے تو اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ ''فلاں بڑا پشتون آدمی ہے'' یا ''فلاں نے بڑی پشتونیت دکھائی'' وغیرہ۔ یعنی شاید یہ واحد ایسی قوم یا زبان ہو کہ اپنی زبان کے نام کو اقدار کے معنوں میں بھی استعمال کرتی ہے۔

کوئٹہ: کوئٹہ جس کی مجموعی آبادی ۷۵۹۹۴۱ ہے (اگرچہ اب اس سے بہت زیادہ ہوچکی ہے) بلوچستان کا دارالخلافہ اور ایک کثیر اللسانی شہر ہے۔ اس کا ابتدائی نام ''شال'' تھا جبکہ اس کا نام کب سے شال ہے اس کی قطعی دلیل تو ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن ایک روایت کے مطابق ظفر اللہ خان نے ماہنامہ ''اولس'' کے ۱۹۶۴ء کے سالنامے میں لکھا ہے کہ کوئٹہ کا یہ علاقہ پشتون سپہ سالار اور اپنے وقت کے اہم بادشاہ احمد شاہ ابدالی نے اس وقت کے خان آف قلات کی والدہ کو بطور چادر پیش کیا تھا۔ شال پشتو میں خواتین کی بڑی چادر کو کہتے ہیں اور پشتون ثقافت میں ماؤں بہنوں کیلئے اہم ترین تحفہ چادر ہی ہے، جبکہ ان کے خیال میں کوٹ بمعنی قلعہ ہے اور اسی علاقے میں پشتون قبیلے کاسی (جنہیں کانسی بھی کہا جاتا ہے) کا ایک قلعہ بھی تھا جس کی وجہ سے یہ ''شالکوٹ'' بھی کہلانے لگا تھا اور پھر یہ کوٹ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا ہوا کوئٹہ ہوگیا۔ اسی مناسبت سے اس کے نام شال' شالکوٹ اور پھر کوئٹہ ہو چکے ہیں۔ لیکن عبداللہ جان نوروزی جو کوئٹہ کے مورخ ہیں کہتے ہیں کہ ''اس کا نام ''شالکوٹ'' بتایا جاتا ہے جبکہ ''کوئٹہ'' نام انگریزوں کی آمد کے ساتھ اس پر رکھا گیا۔ کوئٹہ کی وجہ تسمیہ کیا ہے کتاب ''دکوٹی تاریخ'' کے مطابق پشتو زبان میں ''کوٹہ'' یا ''کوٹ'' مٹی کے ڈھیر یا ٹیلے کو کہتے ہیں تو یہ لفظ بھی اسی سے اخذ شدہ لگتا ہے۔ مصنف کے نکتہ نظر کے مطابق ''شالکوٹ'' بھی اس شہر کا نام ''کوٹ'' یا کوئٹہ ہونے کے بعد دونوں ناموں کو ملا کر رکھا گیا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق کوئٹہ کی تاریخی قدامت ۵۰۰۰ سال ہے۔ اس علاقے کو تقریباً تاریخ نے بڑے نشیب و فراز سے گزارا ہے یعنی یہاں پر یونانیوں سے لے کر ساک سیتھیوں فارسوں، ہفتالیوں اور پھر غزنویوں، سفاریوں، غوریوں، تیموریوں، مغلوں اور افغانوں وغیرہ کے علاوہ انگریزوں تک سب کی حکومتیں قائم رہی ہیں۔ کوئٹہ آج جس شکل و ترتیب میں ہے یا اس میں جو اہم و تاریخی آثار ہیں وہ تقریباً انگریز دور حکومت کی مرہون منت ہیں۔ کیونکہ یہ ان کی فوجی چھاؤنی رہی اس لئے اس کو کافی حد تک توجہ بھی ملی اور ہوتے ہوتے یہ شہر بلوچستان کے دیگر شہروں سے بازی لے گیا۔ حتی یہ شہر عرف عام میں چھوٹا لندن کہلانے لگا لیکن ایک ایسی رات بھی اس شہر کو نصیب ہوئی جس میں اس کا یہ چھوٹا سا بڑا پن خاک میں مل گیا۔ وہ تھی ۳۱ مئی ۱۹۳۵ کی رات جس میں یہ شہر قیامت خیز زلزلے سے لرز اٹھا۔ اس ۴۵ سیکنڈ کی آفت نے اس شہر کی سالہا سال کی رعنائی کو ویرانی میں بدل ڈالا یعنی اس زلزلے نے چھاؤنی اور شہر کے درمیانی ''حبیب نالے'' کو حد فاصل مقرر کرتے ہوئے شہر کی جانب کے علاقے کو یا تو مسمار کیا یا پھر جو بچا کچا تھا وہ کسی قابل نہیں رہا۔ کوئٹہ کی تعمیر نو نے اس شہر کا حلیہ بھی بدل ڈالا۔ بلند و بالا عمارت کی جگہ ٹین اور سرکنڈوں سے بنے جھونپڑی نما گھروں نے لے لی اور اس کے بعد ٹین والے گھر جن کو ''سیون ٹائپ'' کہتے ہیں، رواج پا گئے اور آج تک کوئٹہ شہر کے پرانے محلات میں ایسے گھروں کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے' لیکن اس شہر پر ایک ''شہر آشوب'' اور بھی گزرا اور وہ تھا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کا واقعہ جس میں یہ شہر ملک خداداد پاکستان کے حصے میں آگیا اور یہاں سے جانے والوں نے جاتے جاتے جو قتل عام کیا اس کا درد بھی اس مٹی کے سینے میں دفن ہے لیکن اس کے بعد کوئٹہ

کی اہمیت میں ایک بار پھر روز بروز اضافہ ہونے لگا اور صوبہ بلوچستان کی تشکیل پر اسے دارالخلافہ قرار دیا گیا۔ اس شہر میں جیسا کہ ذکر ہوا مختلف قبائل وقومیں اور مذاہب آباد ہیں۔ جن میں پشتون، بلوچ، براہوی، سندھی، سرائیکی، پنجابی، ہزارہ، فارسی اور ایرانی کے علاوہ شمالی علاقہ جات کے گلگتی، بلتی، چترالی وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ افغان انقلاب کے بعد افغانستان سے پشتو، فارسی، ہزارگی، تاجکی، وزبکی زبانیں بولنے والی قومیں بھی بکثرت یہاں آکر آباد ہوئی ہیں جن کے رہن سہن اور زبان وثقافت نے یہاں کی زبان وثقافت کو بھی متاثر کر دیا ہے۔

کوئٹہ کا تاریخی قلعہ: ڈاکٹر انعام الحق کوثر کوئٹہ مری کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

کوئٹہ یا کواٹہ کوٹ (قلعہ) کی ہی ایک اور صورت ہے اور اس کا نام وزنی جواز تھا۔ اس کو شال کوٹ بھی کہا جاتا ہے اس زمانے میں جب افغانستان برصغیر پاک وہند کا ایک صوبہ تھا۔ یا ایران کے زیر نگین تھا۔ کوئٹہ کی بڑی اہمیت تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلا یورپین سیاح جو یہاں وارد ہوا میسن تھا۔ یہ 1828ء کا ذکر ہے جب برصغیر میں کمپنی کا عمل دخل تھا۔ اور دلی کے تخت پر آخری مغل بادشاہ یا مغولان صغیر براجمان تھے۔ میسن نے اپنی روئداد میں لکھا ہے کہ 1828ء کے قریب کوئٹہ شہر میری کے اردگرد آباد تھا۔

میری مٹی کا وہی ٹیلہ ہے جو چھاؤنی میں واقع ہے اور جنگ کے دوران آرسنل کے طور پر استعمال ہوا تا تھا۔ اس قلعہ نما ٹیلے کے چاروں طرف خندق کھودی ہوئی تھی اور خندق کے قریب ہی پانی ناتھ کا مندر تھا۔ یہ مندر اس امر کا انکشاف کرتا ہے کہ مسلمان حکمران اپنے دور حکومت میں غیر مسلم رعایا کے مذہبی احساسات اور جذبات کا کس حد تک احترام کرتے تھے۔ اس زمانے میں شہر تین سو کے لگ بھگ مکانات پر مشتمل تھا۔ ایک اچھا خاصا بازار ضروریات کی بہم رسائی کیلئے موجود تھا۔ جسے صوبائی شہر کی حیثیت کے مطابق فروتر سمجھا نہیں جاسکتا۔ اس کے گیارہ سال بعد جب انگریزی حکومت کی منظم کردہ انڈس آرمی کوئٹہ پہنچی تو یہ خطہ پولیٹیکل ایجنٹ کا صدر مقام بن گیا۔ اور اکتوبر 1942ء تک اس کی یہی حیثیت برقرار رہی۔ مقامی قبیلے اس پر کئی بار حملہ آور ہوئے۔ 23 جون 1840ء کا حملہ بڑا شدید تھا جس میں حملہ کرنے والا لشکر قریباً آٹھ سو افراد پر مبنی تھا لیکن اسے تین گھنٹوں میں پسپا کر دیا گیا۔ اور انگریزوں کی طرف سے صرف دو گن چلانے والے بلوچ مارے گئے۔ اور ایک سپاہی زخمی ہوا۔ حملہ آوروں میں سے بائیس قتل، تین قیدی اور بہت سے زخمی ہوئے۔ جب 1876ء میں اس پر دوبارہ قبضہ کیا گیا۔ اس زمانے میں میری میں خان قلات کے سپاہیوں کی ایک مختصر محافظ فوج متعین تھی جس میں بندوقچیوں کی ایک ٹولی، پیادہ فوج کی ایک کمپنی اور 20 گھڑ سوار شامل تھے۔ لیکن 1877ء میں المناک واقعات رونما ہوئے جس کے باعث لیفٹیننٹ ہیوسن مارا گیا۔ لیفٹیننٹ کن ہارڈ اور کپتان سکاٹ زخمی ہوئے ان حالات کے تحت انگریزوں نے میری کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ بعد ازاں میری کے آس پاس کے شہر کو موجودہ مقام پر منتقل کیا گیا۔ اور میری کو اسلحہ خانہ میں تبدیل کر دیا گیا ہیوگز نے لکھا ہے کہ شہر کے اردگرد مٹی کی ایک دیوار تھی۔ مشرقی اور جنوبی جانب دو بڑے بڑے دروازے تھے۔ جنوبی دروازے کو شکارپوری گیٹ کہا جاتا تھا۔ شہر کے وسط میں ایک مصنوعی ٹیلے پر میری یا قلعہ تھا۔ جہاں حاکم وقت اقامت پذیر ہوتا۔ یہیں سے گردونواح کی وادی کا دلکش اور جامع منظر دل و دماغ کو فرحت بخشتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قلعہ میں صرف ایک ہی توپ تھی۔

ڈاکٹر بیلیو کا کہنا ہے کہ 1872ء میں اس قلعہ کا محافظ دستہ ۱۰۰ پیادہ (جن میں زیادہ تر افغان تھے) ۴۰ گھڑ سواروں اور چند ایک توپچیوں پر مشتمل تھا۔ وہی مصنف تحریر کرتا ہے کہ 30 جنوری 1872ء کو سات بجے صبح درجہ حرارت 18 درجے تھا۔ موسم گرما میں یہاں کی آب وہوا خوشگوار سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ چاروں اطراف سے چلنے والی ٹھنڈی ہواؤں سے گرمی اعتدال پر رہتی۔ اس وادی کے قرب وجوار میں کئی میوہ دار باغ اور باغیچے تھے پانی کی کمی نہ تھی۔

1876ء میں انگریزوں کے قبضہ سے پیشتر کوئٹہ شہر میری کے آس پاس آباد تھا جس میں قریباً چار ہزار لوگ بستے تھے۔ 1876ء اور 1891ء کے مابین جب پہلی مردم شماری ہوئی۔ تو آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو چکا تھا۔ 1891ء میں آبادی 18,802 ہوگئی۔ جس میں سے 7,500 افراد چھاؤنی میں 11,302 سول لائنز اور ریلوے حدود میں سکونت پذیر تھے۔ 1901ء میں کل گھروں کی تعداد 6925 ہوگئی۔ جس میں 24,582 افراد موجود تھے۔ اس زمانے میں عمارتیں زیادہ تر گارے مٹی اور کچی اینٹوں سے بنائی جاتی تھی۔ حتی کہ ریزیڈنسی کی عمارت بھی کچی تھی۔ عمارتی لکڑی کی کمی تھی۔ ٹین کی چادروں کا رواج نہ تھا۔ اس لئے چھتیں لال کھپریل کی مخروطی شکل کی بنتی تھیں۔ شہر کے جس حصے میں بعد میں ریزیڈنسی روڈ بنی وہاں نہ درخت تھے اور نہ ہی سبزے کا نشان ملتا تھا۔ چنار کے سایہ دار درخت بھی 1877ء کے بعد لگوائے گئے۔

کوئٹہ میری کی لمبائی بیضوی انداز میں چھ سو فٹ، چوڑائی چار سو فٹ اور سطح زمین سے بلندی 60 فٹ ہے میجر جے۔ ایف گارڈنے 1887ء میں اس میری کے بارے میں لکھا ہے تھا: کہ کوئٹہ میری سخت مٹی کا ایک ڈھیر ہے۔ جس کی بلندی پر چند گھر تھے۔ جو غالباً گاؤں یا شال کوٹ کے مختصر شہر کے سرداروں کے قبضہ میں تھے۔ دیگر مقامات میری کے سایہ میں ایک دوسرے سے ملحق تھے۔ 1883ء میں اس

ٹیلے کی بنیادی تہہ کو اسلحہ خانہ بنانے کے لیے توڑا گیا۔ اس سے قبل اس ٹیلہ میں چند سرنگیں بھی جاتی تھیں۔ لیکن زیادہ اہم قسم کی اشیاء ہاتھ نہیں لگیں۔ ورنہ ان کا کہیں نہ کہیں ضرور تذکرہ مل جاتا۔ چند ہڈیاں دستیاب ہوئیں جن میں کچھ انسانی تھی۔ گاروڈ مزید لکھتا ہے کہ تقریباً ایک سال پیشتر میں نے میری کی چوٹی کو چند عمارات کی تعمیر کی خاطر صاف کروانا شروع کیا۔ اس ٹیلہ کی بلندی کو 5 فٹ تک کھودا گیا جو کھدائی کے مقامات کے مقابلہ میں تقریباً 15 فٹ زیادہ ہی تھا۔ گویا یوں سمجھے کہ قریباً 20 فٹ تک کھدائی ہوئی۔ اس کھدائی کے دوران عجیب مواد سے دوچار ہونا پڑا جس سے ٹیلہ کو بنایا گیا ہوگا۔ ہر طرف زمین ہڈیوں مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں، راکھ اور جلی ہوئی لکڑی یا لکڑی کے کوئلہ سے پٹی پڑی تھی۔ ہڈیوں کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ پالتو جانوروں کی ہیں۔ لیکن کونسے جانوروں کی اس کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا۔ اس لئے اس کے نمونے کلکتہ میں تحقیق کے لیے بھیج دیئے گئے۔ گہرائی کی زیادتی کے مطابق ان میں بھی کمی ضرور ہوئی لیکن پھر بھی تعداد خاصی ہی رہی، چوٹی کے قریب اکثر بڑے بڑے گھڑے ہاتھ لگے، ان دنوں ویسے برتن اس ضلع میں بنائے نہیں جاتے تھے۔ وہ لوگ جو مٹی کو ہٹانے کے وقت مستقل طور پر وہاں موجود رہے ان کا عام تاثر یہ تھا کہ یہ آثار لازمی طور پر زیادہ قدیم وقتوں کے نہیں ہیں اور اس ٹیلہ پر یقیناً غیر محدود عرصے کے لیے ایک نسل کے بعد دوسری نسل مقیم رہی ہے۔ گاروڈ آگے چل کر کہتا ہے کہ میں ابھی تک شش و پنج میں ہوں کہ خاص گہرائی پر بنی ہوئی لکڑی کے ڈھیروں کا ذکر کرتا ہوں جن میں زیادہ تر بالکل تازہ تھے اور لکڑی کی اندرونی دھاریوں تک کو ظاہر کرتے تھے۔ سر آلیور سینٹ جاں نے قلعہ عبداللہ کے ٹیلہ کے بارے میں بھی ایسی ہی عجیب باتوں کا انکشاف کیا۔

لکڑی کا کوئلہ جو مقابلتاً بہت دیرپا ہوتا ہے کسی بھی زمانے کا ہوسکتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اس کی کثرت ضرور حیران کن ہے۔ میں یہ خیال نہیں کرتا کہ اس زمانے میں عمارتیں معیاری طور پر آگ سے تباہ برباد کی جاتی ہوں گی۔ جیسا کہ اس کا ثبوت چند قدیم یونانی شہروں میں ملتا ہے۔ میری ذاتی رائے ضرور ہے کہ جلی ہوئی لکڑی کے ڈھیر اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان سے کام لیا جاتا ہوگا۔ کوئٹہ میری میں سے جو چند دلچسپی کی چیزیں برآمد ہوئیں انہیں کلکتہ عجائب گھر میں بھیج دیا گیا ان میں کچھ برتن ایک نگینہ اور زرد، سرخ بادامی رنگ کا اناج پیسنے والا پتھر تھا۔ عجائب گھر والوں کا خیال ہے کہ یہ غالباً زمانہ قبل از تاریخ سے متعلق ہیں یہ چیزیں نچلی سطح سے ہاتھ آئیں۔ لیکن یہ یونانی مجسمے کے اور پرتھیں اور اس سے نیچے کانسی کا برتن بھی ملا جو یونانی ہوسکتا ہے ٹیلے کے مرکز میں سے ہرکولیس کی ڈیک مورتی دستیاب ہوئی جو سوا دو فٹ اونچی تھی اور اس نے الٹے ہاتھ میں شیر کی کھال پکڑی ہوئی تھی۔ مورتی کو زیادہ تر گھن نے کھالیا تھا۔ لیکن پھر بھی قریباً مکمل تھی۔ اور سخت مٹی میں پیوست کی ہوئی پائی گئی۔ اس مورتی کے آس پاس اور نیچے کی زمین کو نہایت احتیاط سے کئی فٹ تک کھودا گیا لیکن سوائے جانوروں کی چند ہڈیوں کے اور کچھ ہاتھ نہ لگا۔ درمیانی سطح پر ایک چھوٹا سا عام مٹی کا گملہ ملا جس پر تنگ حصہ کے نیچے گملہ کے پھیلاؤ کے اردگرد زاویہ دار روغنی نشانات ملتے ہیں میجر شیفرڈ کو بھی اسی قسم کے برتن ملے تھے۔

کوئٹہ میری کی کھدائی صرف بیس فٹ ہوسکی اور یہ صرف اس کھدائی کے نتائج تھے۔ جو بیان کئے گئے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ اس ٹیلہ کی بلندی 80 فٹ ہے۔ گویا ابھی تین حصے کام باقی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی سے اس میری کے چاروں طرف کوئٹہ آرسنل کی عمارتیں تعمیر کی گئی۔ جو زلزلے میں گر گئیں۔ زلزلے کے بعد دوبارہ اس مقام پر آرسنل کے گودام، ورکشاپ اور فوجی دفاتر کی عارضی عمارتیں تعمیر کی گئیں لیکن اب ان عمارتوں سے کوئی کام نہیں لیا جاتا کیونکہ آرسنل کی نئی عمارتیں چھاؤنی میں منتقل ہوچکی ہیں۔ میری کے گرد جو سرخ رنگ کا جنگلہ نظر آتا ہے وہ انگریزوں کے دور میں لگوایا گیا۔ انگریزوں سے قبل صرف خندق ہی کھدی ہوئی تھی۔ ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ مٹی کا ٹیلہ قدرتی نہیں بلکہ احمد شاہ ابدالی کی فوج کے ساتھ جو لوگ درہ بولان کی راہ سے ہندوستان گئے تھے وہ اپنے ہمراہ گھوڑوں کے توبڑوں میں مٹی بھر کر لائے تھے اور نشان راہ کے طور پر مٹی یہاں جمع کرلی تھی۔ جب یہ سپاہی ہندوستان سے واپس آئے تو کئی سپاہی اپنی مٹی کا حصہ اپنے ہمراہ افغانستان لے گئے۔ اس واقعہ کی تاریخی طور پر کوئی تصدیق نہیں ہوتی۔ میری کے نام سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اسے خوانین قلات نے قلعے کی شکل دی تھی۔ ممکن ہے کہ مٹی کا ٹیلہ پہلے سے قدرتی طور پر موجود ہو۔

پہاڑ: جغرافیائی حوالے سے کوئٹہ بلوچستان کے پہاڑی سلسلوں کے درمیان گھری ہوئی ایک وادی ہے، جس کو کوہ چلتن نے مغربی سمت سے گھیرا ہوا ہے اور چلتن کی وجہ تسمیہ وہی فارسی کا ''چہل تن'' بتایا جاتا ہے۔ چلتن کے قریب جنوبی سمت کوہ مسلخ موجود ہے۔ مشرقی سمت کوہ ''مُھر دار'' یا ''مہردار'' یا عام اصطلاح میں ''مردار'' ہے مھر دار کی وجہ تسمیہ یہ ہے اس پہاڑ میں کبھی ''مہردار'' پائے جاتے تھے جو ایک پہاڑی بھیڑ ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ شمال کو پہنچ کر کوہ زرغون سے جاملتا ہے ''زرغون'' پشتو میں سرسبز کو کہتے ہیں۔ اسی طرح مہردار کا سنگم کوہ تکتو سے جاملتا ہے۔ کوئٹہ کا وجود ان پانچ پہاڑی سلسلوں میں ایک کٹورے کی طرح ہوجاتا ہے۔ کوئٹہ میں آبسنے والا تمام عمر

کے لیے اسی کٹورے میں ایک چیونٹی کی مانند ایسا اسیر ہو جاتا ہے کہ نکلنے کی راہ ہی نہیں پاتا۔ اگرچہ خوشحال خان خٹک نے تو کہا تھا کہ:

جہان یو کٹورے دے زہ پہ مثل دمیوی یم
حیران پکشی جارو زم لاس و پشے پکشی و ہمہ

کہ یہ جہان ایک کٹورے کی مانند ہے اور میں اس میں حیران و سرگرداں ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔

کہتے ہیں کہ ان پانچ پہاڑوں میں مختلف قسم کے جانوروں کے علاوہ ہرن اور پہاڑی بھیڑیں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اب خشک سالی نے ان امکانات کو بہت ہی کم کر کے رکھ دیا ہے۔

کوہ مہردار پر ایک جگہ حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ہے جس کے حوالے سے روایت ہے کہ یہاں حضرت علی کے پنجے کا نشان ہے جس پر اکثر اوقات مومنین چراغ روشن کئے رکھتے ہیں بالخصوص یوم غدیر، حضرت علی کی ولادت اور شعبان کی پندرہویں تاریخ کو حضرت امام زمانہ علیہ السلام کی ولادت پر یہاں چراغوں سے اسی رات کی مناسبت سے یا علی یا مہدی وغیرہ لکھ لیا جاتا ہے جو کہ تمام شہر کے باسیوں کو رات بھر نظر آتا ہے یہاں سے مرادیں بھی حاصل کی جاتی ہے۔

کاریزات: کاریزات کا سلسلہ کسی عہد میں بلوچستان کی آبی زندگی کی ضمانت کہلاتا تھا۔ اب وہ نہیں رہا لیکن جہاں تک کوئٹہ کاریزات کا تعلق ہے تو ان میں سور کی کاریز جو موجودہ سرکی روڈ کے علاقے میں موجود تھا اس کے علاوہ طوغی کاریز جو کہ پشتون قبائل یاسین زیوں کا اور کاکڑوں کا تھا جبکہ آج بھی طوغی روڈ میں موجود ہے، مشہور ہیں۔ اسی طرح کوئٹہ میں ایک اور کاریز تازی کے نام سے موسوم کوہ مہردار سے نکلتے ہوئے کاسی قلعہ تک رسائی رکھتی ہے۔ اور سپین (سفید) کاریز تو اب تک زندہ دلوں کے لیے ایک تفریحی مقام کی حیثیت رکھتا ہے جو چھاؤنی کے اس پار ہنہ سے آگے موجود ہے۔

آب و ہوا: کوئٹہ کی آب و ہوا اب وہ نہیں رہی جو کبھی تھی۔ یعنی سرد ترین موسم اور برفانی ماحول کے گرد اور دھویں سے پاک شہر۔ کوئٹہ کے درجہ حرارت کی سطح اب شہر کی گنجائش سے زیادہ آبادی کی وجہ سے بہت اوپر جا چکی ہے۔ اس شہر کی زمستانیں ہمیشہ برف پوش ہوتیں لیکن اب تو بارش کو بھی یہ وادی ترستی ہے۔ یہاں اب تقریباً نومبر سے معمولی سردی کا آغاز ہوتا ہے اور دسمبر جنوری میں زور دکھا کر زیادہ تر ہو تو منفی دس بارہ ہو جاتا ہے جبکہ مارچ تک دوبارہ معتدل ہو جاتا ہے۔ بہار کی آمد کے ساتھ ہی مٹی میں گرمی کا آغاز ہوتا ہے جو ستمبر اکتوبر تک پاؤں پھیلا جاتا ہے۔

پھل اور سبزیاں: کوئٹہ شہر کا شکاروں کے حوالے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن مضافات میں باغات اور کھیتوں کے لہلہاتے سلسلوں سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو خنکی کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ گزشتہ چند سالوں کی خشک سالی نے ان رنگینیوں کو بھی بدحالی کے روبرو کیا ہے لیکن یہاں کے باغات کی شکل و شباہت، ان کے گرد پھیری گئی مٹی کی کچی دیواروں سے شروع ہوتے ہوئے ان کے ساتھ لگے ہوئے توت اور خوبانی وغیرہ کے بڑے درختوں تک پہنچتی ہیں۔ ان درختوں اور دیواروں کا مقصد اصل درختوں اور سبزی جات کا دسترس حیوانات اور موسم کو سختی سے بچانا ہوتا ہے۔

ان باغات میں سیب، انار، آڑو، بادام، انگور وغیرہ مہیا ہیں۔ جبکہ کھیتوں میں کدو، بھنڈی، بھینگن، آلو، پیاز، گوبھی، شلجم، ٹماٹر اور کھیرا، خربوزہ، تربوز وغیرہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام کے باوجود کوئٹہ، مضافات کے شہروں کے پھل اور سبزیوں کا مرہون منت رہتا ہے۔

تجارتی حوالے سے بلوچستان کا اہم ترین مرکز ہونے کے علاوہ یہ شہر ایران، افغانستان، ترکمانستان اور تاجکستان سے پاکستان کے تجارتی روابط کا بھی اہم مرکز کہلاتا ہے۔ اور اس علاقے کے لوگ ایران اور افغانستان کے علاوہ چین اور جاپان و دیگر یورپی ممالک سے اپنے تجارتی روابط قائم رکھے ہوئے ہیں۔ کوئٹہ شہر کے تجارتی مراکز میں اکثر باہر سے درآمد کی ہوئی اشیاء فروخت ہوتی نظر آتی ہیں۔ جن میں خصوصاً ایرانی اور چینی سامان زیادہ ہے۔ اسی لئے بھی کوئٹہ کی ثقافتی فضا پہلے کے مقابلے میں بہت مختلف ہو گئی ہے اور باہر کی ان چیزوں کے استعمال کے ساتھ لوگوں کی طرز زندگی میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔ بازاروں کی مروجہ زبانیں پشتو اور فارسی ہیں جبکہ اردو سے بھی کسی حد تک مدد لی جاتی ہے۔ کاروبار کا تقریباً اکثریتی حصہ پشتونوں کے ہاتھوں میں ہے، لیکن کوئٹہ میں اکثر تاجر بلوچستان کے دیگر شہروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عید کے ایام میں یہ شہر بالکل خالی ہو جاتا ہے۔

سیر گاہیں: اس چھاؤنی سے مشرق کی جانب آگے نکل کر ایک خوبصورت وادی ''ہنہ'' آتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک قصبہ ''اوڑک'' کے نام سے معروف ہے، جس کی بناء پر اس علاقے کو ''ہنہ اوڑک'' کہتے ہیں اور ہنہ کوئٹہ کا وہ واحد تفریحی مقام ہے جہاں ہمیشہ ہجوم رہتا ہے اور باہر سے آنے والے لوگ اس علاقے کی سیر کئے بغیر نہیں لوٹتے۔ اس علاقے میں باغات پانی اور سبزے کی کثرت ہے۔ اگرچہ گزشتہ چند سالوں کی خشک سالی کی وجہ سے اب وہ بات نہیں رہی۔ یہاں کا ایک قابل ذکر مقام وہ جگہ ہے جس کو ''ہنہ جھیل'' کہا جاتا ہے۔ جس میں فوج کے زیر

اہتمام تفریح کا بہترین انتظام رہتا ہے۔

کوئٹہ شہر میں ایک بہت بڑا پارک "عسکری پارک" کے نام سے موجود ہے جو ایئر پورٹ روڈ پر واقع ہے۔ اس کے علاوہ ایک چھاؤنی کی حدود میں واقع "شہباز پارک" اور دوسرا شہر میں "لیاقت پارک" کے نام سے منسوب ہے۔

ہزار گنجی نیشنل پارک: یہ ایک بہت بڑا پارک ہے۔ ہزار گنجی چلتن نیشنل پارک، کوئٹہ سے جنوب مغربی سمت پر تقریباً 20 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اسے 1980ء میں نیشنل پارک کا درجہ دیا گیا تا کہ اس میں موجودہ کمیاب اور نایاب چلتن بکری، جیسے عرف عام میں چلتن مارخور سمجھا جاتا ہے اور اس کے مساکن کے تحفظ کے لئے تشکیل دیا گیا۔ ہزار گنجی ایک فارسی لفظ ہے جسے براہوی اور بلوچی زبان میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب ہزار خزانے ہیں جب کہ چلتن کے معنی چالیس افراد یا 40 قبور کے ہیں اور بعض روایات کے مطابق یہاں پر 40 افراد کی قبور ہیں جن میں مشہور ترین قبر چلتن بابا سے منسوب ہے اسی تعلق کی وجہ سے نیشنل پارک کی سب سے بڑی چوٹی کو چلتن کی چوٹی کہا جاتا ہے اس چوٹی کی اونچائی 3313 میٹر پر مشتمل ہے۔ نیشنل پارک سے ملحق علاقوں میں کئی قبائل آباد ہیں جن میں اہم ترین کرانی کے سادات میاں غنڈی کے شہوانیز اور سمالانیز جبکہ مغربی علاقے میں رئیسانی محمد حسنی وغیرہ قابل ذکر ہیں نیشنل پارک صوبائی محکمہ جنگلات کا ایک بڑا قیمتی اثاثہ ہے جس کا کل رقبہ 27421 ایکڑ پر مشتمل ہے پارک کا زیادہ تر علاقہ ضلع مستونگ جبکہ کچھ علاقہ ضلع کوئٹہ کے حدود پر واقع ہے پارک میں پائے جانیوالے اہم جانوروں میں سانپ، گیدڑ، بھیڑیے، لومڑی، جنگلی بلی، افغانی کھچوے، عقاب، چلتن بکری وغیرہ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں جبکہ دیگر اہم پرندوں میں چکور، سیسی وغیرہ اہمیت کے حاصل ہیں۔ اس نیشنل پارک کی ترقی میں محکمہ جنگلات کی کاوشوں کے ساتھ نواب غوث بخش رئیسانی مرحوم کی کاوشیں قابل تعریف ہیں۔ ہزار گنجی کا مغربی حصہ نواب رئیسانی کی ذاتی شکارگاہ تھا جو انہوں نے جنگلی حیات کی ترویج و ترقی کے لئے محکمہ کے حوالے کر دی 1980ء میں یہاں چلتن بکریوں کی تعداد محظ 50 تھی جبکہ 1997ء کے سروے کے مطابق 806 جانوروں پر مشتمل تھیں۔ 1992ء میں ہزار گنجی پارک کے آس پاس کچھ قبائل کے آباد ہونے سے وہاں کی جنگلی حیات اور موجودہ درختوں پر منفی اثرات مرتب ہوئے ان قبائل نے ایندھن کے حصول کے لئے نہ صرف بڑی تعداد میں جنگلات کو کاٹا بلکہ اس سے جنگلی حیات بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ یہ پارک بلاشبہ بلوچستان کے لیے ایک اہم اثاثہ ہے یہاں پائی جانے والی چلتن بکریاں دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں ملتیں۔ اس جانور کے بارے میں بھی مختلف کہانیاں مشہور ہیں کہ یہ اپنی خوراک کیلئے سانپ کا استعمال کرتی ہے جو کہ سراسر غلط ہے اس کے نام کے حوالے سے موجود دوسرے موقف زیادہ منقحی اور قابل اعتبار تصور کیا جاتا ہے جس میں اس کے سینگوں میں سانپ کی طرح بل موجود ہونے کی وجہ سے انہیں سانپوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے اس پارک میں تین راستوں، ہزار گنجی گیٹ، کرخسہ گیٹ اور چلتن گیٹ کے ذریعے داخلہ ممکن ہے۔ ہزار گنجی نیشنل پارک میں تین ریسٹ ہاؤس بھی موجود ہیں اور ایک میوزیم ہے جبکہ حال ہی میں محکمہ جنگلات میں ہزار گنجی پارک کے ساتھ میاں غنڈی کی تفریحی پارک کا اضافہ کیا گیا ہے جو کہ ایک اچھی اور قابل ستائش کاوش ہے ہزار گنجی نیشنل پارک جہاں ملک میں موجود قیمتی نسلوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے وہاں عوام الناس کو ایک پرکشش سیاحتی مقام بھی میسر ہے۔

لائبریریاں: اس شہر میں سب سے بڑی لائبریری صوبائی لائبریری ہے جو ادارہ ثقافت میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ بلوچستان یونیورسٹی کی لائبریری ہے اور کالجوں میں بھی لائبریریاں موجود ہیں۔ اسٹاف کالج کی لائبریری بھی اپنی نوعیت کی اچھی لائبریری ہے۔ اسٹیٹ بنک کی لائبریری کے بارے میں بھی مثبت رائے موجود ہے جہاں ہر عام و خاص کیلئے مطالعے کا راستہ کھلا ہے۔ جبکہ کوئٹہ میں ایرانی کلچر سینٹر میں بھی "علامہ اقبال لائبریری" کے نام سے ایک اچھی لائبریری موجود ہے جس کی بڑی خصوصیت فارسی کتب کی دستیابی ہے۔ جبکہ آئی ڈی ایس پی، جو بظاہر ایک این جی او ہے، کی لائبریری بھی قابل تعریف ہے۔ ایک لائبریری میونسپل کارپوریشن کی ہے جو اب صرف ایک ڈھانچے کی حد تک رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ صادق شہید لائبریری ہے۔ اس شہر میں شاید دو دہائی قبل ''آنہ لائبریری'' کے نام سے گلی کوچوں میں لائبریریاں موجود تھیں جو کہ مختلف افراد کی انفرادی کاوش کا نتیجہ تھیں وہ کتابیں کرائے پر دیتے تھے اور اس طرح محلے کو فکری بانجھ پن سے بچایا جاتا تھا۔

بلوچستان یونیورسٹی کی لائبریری بھی قابل ذکر ہے، جبکہ شہر میں موجود تعلیمی اداروں میں روایتی طور پر لائبریریاں موجود ہیں۔

تعلیمی ادارے: جہاں تک تعلیمی اداروں کا ذکر ہے تو اس وقت اس شہر میں سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ بلوچستان کے قبائلی کلچر کو مدنظر رکھتے ہوئے خواتین کیلئے بھی ایک الگ (بہادر خان ویمن) یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بلوچستان یونیورسٹی اولین

یونیورسٹی کی حیثیت سے قائم ہے۔ اب جدید ٹیکنالوجی سے متوصل کرنے کی غرض سے ایک سرکاری اور دیگر کئی غیر سرکاری یا نیم سرکاری یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ کوئٹہ شہر میں اس وقت صوبے کا اولین کالج ''گورنمنٹ کالج'' کے علاوہ گرلز کالج، جیسے دو بڑے اداروں کے ساتھ ایک سائنس کالج شہر کے وسط میں واقع ہے۔ موسیٰ خان انٹر کالج، کے علاوہ چار دیگر گرلز کالجز، جناح ٹاؤن، کواری روڈ اور بروری روڈ اور حسن موسیٰ کالج ہیں۔ ایک میڈیکل کالج بھی بولان کے نام سے اور ایک زرعی کالج بھی کوئٹہ کے تعلیمی اداروں میں نمایاں ہیں۔

اکادمیاں اور ثقافتی ادارے: کوئٹہ کو مرکزی شہر کی حیثیت سے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ صوبے کے کئی ایسے ادارے جو تنہا صوبائی نمائندگی کرتے ہیں، یہیں واقع ہیں اور اپنی سعی کے مطابق بلوچستانی اقدار و روایات کی ترویج میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ جن میں سرفہرست اکادمیاں اور ثقافتی مراکز ہیں۔ سب سے قدیمی ادارہ ادارہ ثقافت بلوچستان ہے جس کا قیام 1972ء میں عمل آیا۔ اپنے قیام سے اب تک یہ ادارہ مکمل طور پر فعال ہے۔ اس ادارے کو بلوچستان کی معروف علمی و ادبی شخصیات کے علاوہ فنون و ثقافت سے وابستہ دیگر کئی شخصیات کا تعاون حاصل ہے۔ یہ ادارہ صوبے کے تمام ثقافتی اور ادبی تقاریب کا مرکز ہے۔

اس کے علاوہ اکادمی ادبیات پاکستان، پشتو اکادمی، بلوچی اکادمی، براہوی اکادمی، جاپانی ثقافتی ادارہ اور ایرانی ثقافتی مرکز علم و ادب، فنون اور ثقافت کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

روایتی پکوان

کوئٹہ میں غذاؤں کے حوالے سے بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ جن قبائل کے خاندان یہاں آباد ہیں وہ اپنی ہی ثقافت کے مطابق غذا کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ لیکن شہر کے ہوٹلوں میں ان تمام کھانوں کا ایک مشترکہ کلچر نظر آتا ہے۔ جن میں تمام قسم کے کھانے شامل ہوتے ہیں جبکہ کوئٹہ کے ہوٹلوں کی بھی اقسام ہیں۔

چائنکی: یہ ہوٹل یہاں کی اصل ثقافت کی شناخت ہیں جو بلوچ پشتون مشترکہ میراث ہیں۔ چائنک دراصل چھوٹی سی کیتلی کو کہتے ہیں جس میں تقریباً ایک کپ چائے آتی ہے۔ اس کو دراصل انگاروں پر رکھ کر چائے بنائی جاتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ انگاروں کی جگہ گیس لے رہی ہے۔ ان کے ساتھ اپنی مخصوص چھوٹی چھوٹی پیالیاں بھی ہوتی ہیں۔ چائے کا اپنا خاص ذائقہ ہوتا ہے۔ ان ہوٹلوں میں مطبخ پیچھے کہیں پوشیدہ مقام پر نہیں ہوتا بلکہ ہوٹل کے داخلی دروازے میں ہی چولہے لگے ہوتے ہیں جن پر چائے کے علاوہ کئی قسم کے کھانوں کی دیگیں بھی قطار میں پڑی ہوتی ہیں جن میں سبزی، دالیں اور گوشت وغیرہ پکتا ہے۔ گاہکوں کے لیے میز کرسی کے علاوہ فرشی نشستوں کا اہتمام بھی ہوتا ہے اب اس کا رواج نسبتاً کم ہو گیا ہے۔ ورنہ پہلے ایک چھٹائی بچھی رہتی تھی اور وہی سب کے استعمال میں آتی تھی۔ عموماً کاؤنٹر بھی اس چولہے ہی کے پاس ہوتا ہے اور باورچی بھی اکثر ہوٹل کا مالک ہی ہوا کرتا ہے جو کاؤنٹر کا کام بھی انجام دیتا ہے۔

کابلی ہوٹل: یہ ہوٹل افغانیوں کی کوئٹہ آمد کے بعد کی اختراع ہیں۔ ان ہوٹلوں کا سارا نظام، ماحول اور طریقہ کار پاکستانی ہوٹلوں سے مختلف ہے۔ یہ عموماً کھلے اور بڑے ہوتے ہیں۔ دیواروں پر چاروں جانب سے قالین ٹھونکے جاتے ہیں۔ نشستیں اکثر زمینی ہوتی ہیں اگرچہ اب کرسیوں اور صوفوں کا اہتمام بھی ہو چکا ہے۔ زمینی نشست میں بھی قالین اور گدے بچھائے جاتے ہیں اور چھوٹے سے میز نما طویل تختے رکھے جاتے ہیں۔ جن پر کھانا سجایا جاتا ہے۔ ان کے کھانوں میں خصوصاً قابلی قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ دیگر افغانی کھانوں کے علاوہ مقامی اور مروجہ غذائیں بھی ان کے ہاں تجارتی نکتہ نظر کے تحت دستیاب ہوتی ہے۔

کبابی ہوٹل: یہ ہوٹل بھی افغانیوں کی آمد کے بعد قائم ہوئے ہیں۔ جو تقریباً صرف فارسی اور ہزارہ برادری کے اکثریتی علاقوں میں ملتے ہیں۔ ان ہوٹلوں میں سبز اور سیاہ (قہوہ) چائے (عموماً تلخ) ملتی ہے۔ اس کے علاوہ کھانے میں سیخ کباب (قیمہ اور تکہ) ملتے ہیں۔ جن کے ساتھ روٹی کے علاوہ تقریباً پیاز کے بڑے بڑے ٹکڑے بطور سلاد اور سادہ سی چٹنی رکھی جاتی ہے۔

یہاں کچھ خاص قسم کی غذاؤں کا ذکر بھی کیے دیتے ہیں جو گوشت سے بنتی ہیں۔

کڑاھی: اگرچہ یہ غذا ملک کے دیگر شہروں میں بھی دستیاب ہے مگر کوئٹہ میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ بکری اور مرغی کے گوشت سے بنتی ہے۔ لیکن بکری کے گوشت کی کڑاہی زیادہ پسندیدہ ہے اور اس حوالے سے میر افضل کڑاہی اہم ترین مرکز ہے۔

روش: یہ لفظ وہی روسٹ ہے جو پشتونوں کی پسندیدہ غذا ہے۔ اس میں دو قسمیں ہیں۔ نمکین اور سادہ۔ جو چھوٹے گوشت سے بنتا ہے۔ یعنی گوشت کی ایک اچھی خاصی بڑی بوٹی ہوتی ہے۔ جو پانی میں ابالی گئی ہوتی ہے۔ اس کی پلیٹ میں بوٹی کے علاوہ دیگر گھی شامل ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں سبزی یا دال وغیرہ بھی ساتھ ہی پلیٹ کے ایک

گوشے میں ڈالتے ہیں۔ کوئٹہ میں اس کھانے کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔

کڈھی کباب: یہ کباب بھی کوئٹہ سے مخصوص ہے۔

دلکشا کباب: یہ کوئٹہ کا ایک قدیم کبابی مرکز ہے، جہاں ہمیشہ شائقین کا ہجوم رہتا ہے۔ اس کباب کی خصوصیت اس کا ذائقہ ہے جس کی وجہ سے شہر بھر کے لوگ ادھر کا رخ کرتے ہیں، اگرچہ یہ ایک پرانے سے ہوٹل میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ لال کباب بھی کوئٹہ کی غذائی ثقافت کا اہم مرکز رہا ہے، جواب مفقود ہو چکا ہے۔

چائے: یہاں چائے پینے کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ شہر میں مہمان نوازی کا اہم ترین (کسی زمانے میں واحد) وسیلہ چائے ہی ہے۔ دودھ والی چائے کے علاوہ یہاں سبز چائے اور قہوہ (جس کو سلیمانی چائے بھی کہتے ہیں) کو زیادہ شوق سے پیتے ہیں جبکہ سبز و قہوہ بغیر چینی کے تلخ یا پھر قند وغیرہ کے ساتھ پی جاتی ہے ویسے بھی دودھ والی چائے یہاں کی بنیادی ثقافت میں شامل نہیں ہے۔

روٹی: کوئٹہ میں تقریباً پاکستان کی تمام اقسام کی روٹیاں دستیاب ہیں۔ لیکن جس روٹی کو خاص اہمیت حاصل ہے وہ تندوری روٹی ہے جو خوش ذائقہ ہونے کے علاوہ خوبصورت بھی ہوتی ہے۔ ان روٹیوں کا رجحان یہاں پر افغانستان کے فارسی کلچر سے وارد ہوا ہے۔ جس کو پکاتے ہوئے اس پر نقش و نگار ڈالے جاتے ہیں۔ ویسے تو تندوری روٹی کی قیمت چار روپے ہے لیکن اس قسم کی روٹیاں جو بڑی ہوتی ہیں آٹھ روپے سے سولہ روپے تک کی ہوتی ہیں جو خوش خوری کی وجہ سے بغیر سالن وغیرہ کے بھی کھائی جا سکتی ہیں۔

لسی: لسی بلوچستان کے کلچر کا ایک مشترک عنصر ہے۔ جو بلا تفریق ہر قبیلے میں پائی جاتی ہے۔ سرما کے موسم میں ہوٹلوں میں کھانے کے ساتھ لسی بھی ملتی ہے جبکہ اس کے علاوہ بھی لسی پینے کا رجحان بحیثیت مشروب رائج ہے لیکن یہاں کی لسی کھٹی ہوتی ہے میٹھی لسی کا رجحان یہاں نہیں ہے۔

پشتون روایتی غذائیں اور مشروبات: پشتون قبائل کی غذائیں اور مشروبات متنوع ہیں۔ جن میں اکثر جغرافیائی حالات اور پیشوں اور خطوں کی افادیت کی مناسبت سے رائج ہوئے ہیں۔ یعنی سرد مقام کے لیے گرم اثر، گرم مقامات کے لیے سرد اثر کھانے و مشروبات پھر محنت کش و جفاکش افراد کے لیے توانائی رکھنے والی غذائیں اور یہ ایک فطری عمل ہے کہ انسان خود بخود اپنے مصروفیات کی روشنی میں اپنا لباس، خوراک اور رہن سہن کا سامان مہیا کرتا ہے، جبکہ فطرت بھی ان کا ساتھ دیتے ہوئے ان علاقوں میں موسمی ضروریات کے مطابق سبزی اور پھل وغیرہ اگاتی ہے۔

ڈوڈی: روٹی کو ڈوڈی کہتے ہیں، بلوچستان کے پشتون علاقوں میں ڈوڈی یا تو توے پر بنتی ہے یا پھر تندوری ہوتی ہے لیکن توے کی روٹیاں بہت بڑی یعنی تقریباً ڈیڑھ فٹ کی ہوتی ہیں اور انتہائی نازک، جس کو ہم کاغذی روٹی کہہ سکتے ہیں۔ چھوٹی روٹیاں بنانے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے توے کی اس روٹی کو کچھ لوگ پاستے کہتے ہیں جبکہ تندوری روٹی موٹی اور نرم ہوتی ہے۔ گھروں کے صحن بڑے ہوتے ہیں اور کسی ایک گوشے میں تندور لگایا جاتا ہے جس کو خشک گوبر اور گھاس پھوس سے گرم کیا جاتا ہے، تندوری روٹی میٹھی اور خوش خوراک ہوتی ہے۔

کاک: یہ ایک خاص قسم کی روٹی ہے جس کا استعمال عام نہیں ہے۔ بلکہ چرواہوں کی خوراک ہے لیکن اس سے صحرائی اور پہاڑی لوگ بھی سفر پر جاتے ہوئے استفادہ کرتے ہیں۔ اسے آٹا گوندھ کر مناسبت سائز کے نسبتاً گول پتھر پر چاروں طرف سے لگایا جاتا ہے اور انگاروں میں رکھ کر پکاتے ہیں یا پھر ویسے ہی آٹے کے گولے بنا کر پکائے جاتے ہیں۔

ٹکئی: یہ بھی خاص مناسبات سے تعلق رکھنے والی ورٹی ہے نسبتاً آٹا گوندھ کر اس کی بہت موٹی روٹی بنائی جاتی ہے جس کی موٹائی تقریباً ایک انچ کے لگ بھگ ہوتی ہے اسے توے پر پکا کر گرم خاکستر میں ڈھانپ دیا جاتا ہے جہاں وہ سخت اور سرخ ہو جاتی ہے۔ یہ بھی سفری خوراک کا ایک حصہ ہے جو کئی کئی روز خشک ہوتی ہے اور نہ ہی خراب ہوتی ہے۔

وڑہ مڑی: اس کو کوٹ روٹی کہہ سکتے ہیں جس کی مختلف قسمیں ہیں۔ سب سے اہم اور اعلیٰ قسم جو اپنے کسی بہت عزیز دوست یا مہمان کیلئے بنائی جاتی ہے وہ ہے گھی اور دودھ کی روٹی یعنی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے بڑی تھالی میں ڈال کر اس پر گھی اور دودھ ڈالا جاتا ہے اور پھر اچھی طرح چنگالا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کے اوپر چینی بھی ڈالتے ہیں۔

اس کی دوسری قسم نسبتاً فقیرانہ غذا کی ہے جس میں روٹی کے چھوٹے ٹکڑے کر کے ان پر لسی ڈالا جاتا ہے، جو کہ تقریباً گرمیوں کی غذا ہے کچھ لوگ اس پر پیاز یا کھیرا وغیرہ بھی کاٹ کر ڈالتے ہیں۔

شکنہ: یہ بھی کوٹ روٹی کی ایک قسم ہے، لیکن بہت مختلف۔ اس غذا کو بھی یا تو غربت یا پھر فوراً تیار ہونے کی غرض سے استعمال کرتے ہیں۔ پانی میں پیاز ڈال کر خوب ابال لیتے ہیں اور روٹی توڑ کر تھالیوں میں ڈالتے ہیں اور اس ابلے ہوئے شوربے کو اس کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔ کبھی کبھار اس میں ایک آدھ انڈا بھی گھول دیا

جاتا ہے، جس سے ذائقہ زرا بہتر ہو جاتا ہے۔

شوروا: شوروا ایک ہر دل عزیز غذا ہے۔ جو عام طور پر کھانے کی اصطلاح بھی بن چکی ہے یعنی جب کوئی کسی سے دعوت کا تقاضا کرتا ہے تو کہتا ہے کہ: ہاں بھئی شوروا کب کھلانے کا ارادہ ہے، یا یہ کہ عرصہ ہوا کہ آپ نے شوروا نہیں کھلائی۔ اس کیلئے عموماً گائے کا گوشت کا شوربا بناتے ہیں۔ کبھی کبھار آلو بھی ڈال دیتے ہیں اسکو روٹی کے چھوٹے کئے ہوئے ٹکڑوں پر جو عموماً بڑی تھالیوں میں ہوتے ہیں۔ پر ڈالتے ہیں روٹی کے اس نرم شدہ مواد کو الگ سے کھایا جاتا ہے جس کے ساتھ سبز پیاز کو سلاد کے طور پر بڑا پسند کرتے ہیں اس کے بعد گوشت پر نمک چھڑک کر روٹی کے نوالے میں لپیٹ لپیٹ کر کھاتے ہیں اس کا استعمال شادی بیاہ کی تقاریب، مہمانی اور دیگر دعوتوں میں بھی عام ہے۔

غوڑہ مڑئی: یہ غذا ہمارے ہاں سینڈوچ کے طور پر کھائی جاتی ہے، یعنی ایمرجنسی یا ہلکی غذا کے شوق کی تسکین کے لیے اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ گرم گرم روٹی جب توے سے اتاری جاتی ہے تو اس پر گھی لگایا جاتا ہے اور اس پر چینی چھڑکا جاتا ہے جس کو گول کر کے بچے کھاتے ہیں، بڑے بھی اس کے نوالے بنا کر چائے کے ساتھ کھاتے ہیں۔

خاگینہ: یہ انڈے سے بننے والی عام سی غذا ہے، جو کہ تقریباً آملیٹ کی طرح ہے جسے ناشتے میں تو نہیں لیکن عام طور پر ہلکی پھلکی غذا کے طور پر کھاتے ہیں۔

لاندی: یہ ایک مقبول اور اعلیٰ قسم کی غذا ہے جو کہ صرف سرما کے موسم میں استعمال کی جاسکتی ہے اور اس کا رجحان بھی سرد اور برفانی علاقوں میں پیدا ہو چکا ہے۔ یعنی اس کے اثر کی گرمی کی وجہ سے سرد موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے کھائی جاتی ہے۔ ویسے یہ خوراک ہر کسی کے بس کی بات نہیں بلکہ زرا صاحب ثروت ہونا پڑتا ہے لیکن سرد اور دور دراز کے علاقوں میں تقریباً ہر گھر میں اس کا انتظام ہوتا ہے۔ اس کے لیے موسم گرما میں ہی دنبے خرید کر انکو اچھی طرح پالا جاتا ہے اور سردیوں کے آغاز سے کوئی ایک ماہ قبل ان کو ذبح کرتے ہیں۔ ذبح کرنے کے بعد اس کے ٹکڑے کر کے نمک چھڑک کر سائے میں لٹکایا جاتا ہے۔ لیکن اس کی کھال نہیں اُتاری جاتی، بلکہ جونہی ذبح کرتے ہیں تو اس کے بال نوچے جاتے ہیں اور پھر کو جڑی بوٹیوں کو جلا کر آگ پر بھونا جاتا ہے اس لیے کہ اس کے باقی بچے ہوئے بال بھی جل کر راکھ ہو جائیں کیونکہ کھال بھی گوشت کے ساتھ چپکے ہوئے رہتا ہے اور ھانڈی میں گوشت کے ساتھ پکتی ہے۔

اس کے مہینوں قبل خرید کر پالنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بھیڑ اچھی طرح فربہ ہو جائے اور اس کے بدن پر چربی چڑھ جائے کیونکہ اس غذا میں اکثر لوگ چربی کھانا پسند کرتے ہیں۔ چونکہ محنت و مشقت کا جسمانی کام کرنا پڑتا ہے اس لئے چربی ان کے بدن کو توانائی بخشتی ہے۔

اس کھانے کے پکانے کا بھی مخصوص طریقہ ہوتا ہے یعنی مٹی کی ھانڈی میں اس کو خشک گوشت کے ٹکڑے لیکن بڑے بڑے ٹکڑے ڈال کر پکایا جاتا ہے۔ اور پھر روٹی کے چھوٹے ٹکڑے کر کے ان پر اس کا شوربہ ڈالتے ہیں۔ جو بذات خود بہت ہی خوش ذائقہ ہوتا ہے اس کے بعد گوشت پوست اور چربی کو روٹی کے نوالوں میں لپیٹ لپیٹ کر نوش جان کیا جاتا ہے۔ لیکن آج کل اس کی ھانڈی بدل گئی ہے شہری یا شہر کے نزدیک علاقوں سے عام ھانڈی میں پکاتے ہیں۔

چکئی: اس بھیڑ کی چکی، جو کہ مکمل چربی ہوتی ہے، کو الگ سے مختلف طریقوں سے کھانے میں استعمال کرتے ہیں، خصوصاً صبح کے ناشتے یا دن کو دوپہر سے پہلے ناشتے کی شکل میں گرم روٹی پر اس چربی کو مل کر روٹی کو کھاتے ہیں۔ جبکہ اسی چربی کے ٹکڑے کر کے اس کو اچھی طرح ابالا بھی جاتا ہے جس سے گھی نکلتا ہے جس کو عام اصطلاح میں دیسی گھی کہتے ہیں۔ اس دیسی گھی کا استعمال بھی مختلف طرح کی غذاؤں میں ہوتا ہے۔

انڈر: لاندی کے سیاہ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ذبح شدہ جانور کی آنت میں بھرتے ہیں اور اس کو بھی خشک لیتے ہیں۔ اس کو بھی بعد میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا کر اس کو پکایا جاتا ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک خوش ذائقہ غذا ہے۔

ترکاری: ترکاری وہی سالن ہے جو کہ سبزی وغیرہ کا ہوتا ہے۔ ویسے پشتون قبائل میں گوشت کا استعمال موسم اور پیشوں کے پیش نظر سب سے زیادہ رہا ہے لیکن آج کل شہری اثرات کے طفیل سبزی جات کے علاوہ دالوں کا استعمال بھی نظر آتا ہے حالانکہ پشتون ثقافت میں کبھی دال کھانا طعنہ بن جاتا تھا۔ سو ترکاری ہر اس سالن کا نام ہے جو گوشت، سبزی یا دالوں سے بنتا ہے۔

وریزی: وریزی در اصل چاولوں کو کہتے ہیں بلوچستان کے پشتون قبائل میں چاول کا استعمال بہت کم ہے۔ چاول صرف کسی خیر و خیرات یا شادی بیاہ کے موقع پر بنائے جاتے ہیں، جبکہ مہمانی کی دعوت میں بھی عزت بڑھانے کے طور پر چاول پکائے جاتے ہیں۔ چاولوں کو سفید اور سادہ پانی میں ابال کر بھی پکایا جاتا ہے جو کہ اکثر اوقات کسی بیمار کے لیے، بالخصوص پیٹ کی بیماری میں مبتلا مریض کے لیے ہوتا ہے اس کے علاوہ پلاؤ بھی بنایا جاتا ہے، لیکن ایک قسم کا چاول جو یہاں عام ہے پیاز

کے ساتھ بننے والے چاول ہیں۔ یعنی چاولوں کے ساتھ پیاز کے لمبے لمبے ٹکڑے بھی ابال دیئے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ چاولوں پر چینی بھی ڈال کر کھاتے ہیں۔

پیاز مڑئ: عام طور پر پیاز کاٹ کر اسکو روٹی کے نوالے میں لپیٹ کر بھی بڑے مزے سے کھایا جاتا ہے یہ کوئی باقاعدہ غذا نہیں لیکن بے وقت بھوک لگنے یا دو چار نوالوں کے اشتہا کیلئے ہے۔ اس غذا کے حوالے سے تو محاورے تک بولے جاتے ہیں یعنی جب کسی سے پوچھا جائے کہ روزگار کیسا ہے تو جواب میں کہتا ہے، کہ بس پیاز روٹی کا گزارہ ہو جاتا ہے۔ یا پھر کہتے ہیں کہ: "پیاز دی وی پہ نیاز دی وی"

یعنی پیاز ہو مگر خلوص کے ساتھ۔ یہ وہاں بولتے ہیں جب دعوت کا ذکر چل نکلے اور اس میں شامل کرنے والے خوراکوں کی حکایت آ جائے، تو مہمان بننے والا یہ جملہ کہہ دیتا ہے۔ یا پھر یوں بھی کہتے ہیں کہ:

"پیاز پہ گنڈہ یہ مڑئ پسے گرزم" پیاز نیفے میں لئے روٹی کی تلاش میں ہوں۔ اس محاورے میں اپنی غربت اور مفلسی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

شڑ وبے: یہ بلوچستان کے پشتون قبائل کا سب سے زیادہ ہر دل عزیز مشروب ہے، جو خصوصاً گرمیوں کے موسم میں ہر امیر غریب گھرانے کے دستر خوان کی زینت بنتا ہے یہ وہی لسی ہے، جس کو ان قبائل میں زیادہ اہمیت حاصل ہے اس کا مصرف دوپہر کے کھانے میں لازمی ہوتا ہے بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوپہر کو بغیر کسی سبزی وغیرہ کے صرف لسی کے ساتھ روٹی کھائی جاتی ہے، لسی میں کبھی کبھار کھیرے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے، پودینہ کے ذرات کے ساتھ ڈال دیا جاتا ہے۔ رات کے کھانے میں سالن کے ساتھ پی جاتی ہے۔ لیکن پشتونوں کی لسی میں ذائقہ اور ترشی زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ یہ لسی دھی کو صرف باریک کر کے نہیں بنتی بلکہ دھی کو مشکیزے میں ڈال کر خوب ہلایا جاتا ہے اور یہ عمل ایک سے ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہتا ہے۔

اس مشک کے ہلانے کے عمل سے جو لسی بنتی ہے وہ دراصل شڑ وبے ہے۔ رواداری کی روایت کے مطابق علاقے کے جن گھروں میں گائے وغیرہ نہیں ہوتی تو وہ آس پاس کے ہمسایوں کے ہاں سے لسی حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے لیے باقاعدہ بچا کر رکھی جاتی ہے کیونکہ لسی کے بغیر گرمی کے موسم میں پشتون گھر کے کھانے کا تصور ہی ادھورا ہوتا ہے۔

کووچ: یہ وہی مکھن ہے جو لسی بنانے کے عمل کے دوران دھی کی چربی کی شکل میں الگ ہو جاتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں لسی کے اوپر تیرنے لگتے ہیں جن کو اکٹھی کر کے کسی ٹھنڈی جگہ رکھا جاتا ہے، دیہاتوں میں عموماً فریج کا اہتمام نہیں ہوتا تو مکھن کو ٹھنڈے پانی کے رکھے گئے مٹکوں کے نیچے نمناک جگہ پر رکھتے ہیں۔ اس پر چینی ڈال کر روٹی کے ساتھ کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔

کورت: یہ بھی دودھ سے بننے والی غذاؤں میں سے ایک ہے جس کے بنانے کا طریقہ سادہ ہے یعنی دھی میں نمک ملا کر اسکو عموماً سفید رنگ کے کپڑے کے تھیلے میں ڈال کر خشک ہونے کے لیے لٹکایا جاتا ہے۔ اس تھیلے میں سے دھی کا پانی ٹپکتے ٹپکتے خشک ہو جاتا ہے۔ اور وہ آخر میں نسبتاً سخت قسم کے خمیر میں بدل جاتا ہے جس کے مختلف قسم کی پیڑے بنا کر خشک کر دیتے جاتے ہیں۔ اس کا استعمال مختلف قسم کے کھانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ حتی کچھ بیماریوں کے علاج کے لیے بھی اس سے استفادہ ہوتا ہے۔

کورت غوڑی: یہ بھی کوٹ روٹی کے غذائی کی ایک قسم ہے اس میں روٹی کے ٹکڑوں پر گرم گرم گھی ڈال دیا جاتا ہے اور اس پر کورت کا لعاب بنا کر ڈالا جاتا ہے یہ غذا بھی پشتونوں کی بڑی پسندیدہ ہے۔

دگوڑی شربت: گوڑہ "گڑ" کو کہا جاتا ہے، گڑ کا استعمال ہمارے پشتون قبائل میں عام ہے۔ چائے کے ساتھ استفادہ کے علاوہ گڑ مختلف اشیاء کو میٹھا کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ گڑ کا شربت گرمی میں خنکی کا احساس دیتا ہے اب چینی کے عام ہونے کے ساتھ گڑ کی جگہ چینی لیتی جا رہی ہے۔

کوہلی: یہ گندم سے بننے والی غذا ہے جو مختلف ایام میں پکائی جاتی ہے بالخصوص بچے کے خسرے کی بیماری سے شفا کے بعد گندم کو پانی میں ابال کر اس میں زرا سا نمک وغیرہ ملا کر ہمسایوں میں بانٹتے ہیں ویسے بھی اس کو کھایا جاتا ہے۔ بلکہ بچے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

سواری: کوئٹہ شہر بہت زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا اس لئے شہر سے باہر یا دور جانے کی غرض سے بس ٹیکسی وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ گزشتہ چند سالوں تک تانگوں کا استعمال بھی تھا لیکن اب ختم ہو چکا ہے۔ عام طور پر سائیکل اور موٹر سائیکل کا استعمال زیادہ ہے۔

رکشہ: کوئٹہ میں جو شے سواری کے حوالے سے انتہائی منفرد ہے، وہ ہے یہاں کا رکشہ۔ کوئٹہ کے رکشے ملک بھر کے رکشوں کے مقابلہ میں ممتاز ہیں۔ ایک تو ان کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں جبکہ یہاں کے رکشے بہت خوبصورت اور منقش بھی ہوتے ہیں جبکہ سواری کی سہولت کے لیے بھی سردی کی وجہ سے چار دروازے لگائے جاتے ہیں اور

سیٹوں کو بھی آرام دہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوئٹہ میں ایسے بھی رکشے موجود ہیں جن کو اسی دلیل کی بناء پر کہ دن میں گرد زیادہ ہوتی ہے اور دھوپ بھی اس کے رنگ کو متاثر کر سکتی ہے، صرف رات کو چلایا جاتا ہے۔ لیکن حال ہی میں سی این جی رکشے رائج ہوئے ہیں جن کی آمد سے شاید رفتہ رفتہ ان کی قیمتوں اور اہمیت میں کمی آئے۔ شاید انہی خصوصیات کے باعث کوئٹہ میں رکشے کا کرایہ بھی ملک کے دیگر شہروں سے زیادہ ہوتا ہے۔

کوئٹہ کی زبان: کوئٹہ ایک کثیر اللسانی شہر ہے۔ یہاں تقریباً ملک میں بولی جانے والی تمام زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان سب کے پہلو میں اردو بھی ایک قومی زبان کی حیثیت سے برقرار ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کوئٹہ کی اردو پورے ملک کی اردو سے مختلف ہے۔ جس کی وجہ شاید یہاں کی مختلف زبانوں اور لہجوں کا اثر ہو۔ ویسے تو ہر صوبے کا باشندہ اپنے انداز میں اردو بولتا ہے لیکن کوئٹہ کی اردو میں نہ صرف لہجے کی تبدیلی ہے بلکہ الفاظ و محاورات میں بھی بڑا تغیر نظر آتا ہے اور کچھ مقامی الفاظ اب اردو میں بطور ایک اصطلاح کے شامل ہو چکے ہیں مثلاً پشتو کا لفظ ''زوی'' بیٹے کے معنوں میں ہے لیکن کوئٹہ کا تقریباً ہر شخص اس کو استعمال کرتا ہے۔ اسے یا تو بے تکلف دوست استعمال کرتے ہیں یا پھر کسی برخوردار کو مخاطب کرنے کے لیے اس لفظ کو استعمال میں لاتے ہیں۔ اسی طرح کے دوسرے الفاظ جیسے پشتو کا ''مڑہ'' ایک تکیہ کلام ہے یا بلوچی کا ''ماما'' جو کسی کے بھی نام کا متبادل ہو سکتا ہے۔ یعنی آپ جناب کی بجائے ''ماما'' کہنا ہی کافی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تذکیر و تانیث کا خیال بھی نہیں رکھتے اور تراکیب بھی کافی مختلف نظر آتی ہیں۔ جبکہ مقامی الفاظ کا استعمال بھی عام ہے۔ یہاں کوئٹہ کی اردو میں ایک عبارت ملاحظہ ہو۔

''ہم کل آئے گا اور تم کو وہ سارا چیزیں بھی پہنچائے گا خو اللہ گروہ ایک چوٹ (جوتا) تم کو دے وے۔ تمہارا گاڈی بہت اچھا ہے لیکن وہ ہمارا پاس امانت ہے۔ آخرت کا دن تک ہم اس کا ذمہ وار ہے''۔ بلوچستان کے معروف اردو شاعر پروفیسر ڈاکٹر آغا محمد ناصر نے کوئٹہ کے لہجے میں غزلیں بھی کہی ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو:

تمہارے پاس خالی ایک لیٹریچر ہے کلچر ہے
ہمارے گھر میں سو دانہ کلاشنکوف، لانچر ہے

==

اگر تم سوچتا ہے چُرت ہم بھی مار سکتا ہے
مگر ہر ایک کا بابو جدا اپنا مقدر ہے

==

گریزی سے غریبوں کا گزارہ ہونے دو صاحب
لغڑ تو بی سے آسودہ ہمارا چار سو گھر ہے

==

تمہارا چھالیہ ہے پان کے اندر اگر بابو
شنے کا سارا سبزہ اس کے اپنے چھالیے پر ہے

==

دڑی کا پوچھ کر جب پاؤ ہم سے مانگتا ہے وہ
تو صدری میں رکھا ہم نے بھی اپنا کلکو لیٹر ہے

==

بنائے گا کسی دن ہم بھی شادی خیر سے ناصر
کہ اس ظالم کا بابا مانگتا چھ لاکھ "ولور" ہے

اس غزل میں جملوں کی تراکیب اور تذکرہ و تانیث کے انوکھے پن کے علاوہ کچھ مقامی اصطلاحات بھی شامل ہیں، جیسے "چُرت" (سوچنا) "گریزی" (سمگلنگ) "لغڑ تو بی" (سمگلروں کا اصطلاحی نام)، "شنے" (ایک خشک پھل)، "دڑی" (پانچ کلو)، "ولور" (پشتون قبائل میں لڑکی کی قیمت)۔

کوئٹہ کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی اپنی کوئی ثقافت زبان یا اقدار اور مستقل رسم و رواج نہیں بلکہ یہ بلوچستان بھر میں آباد قومیتوں کا مجموعی گہوارہ ہے جہاں سب کی پرورش ہوتی ہے۔ بلکہ کئی ایسی قومیں اور ثقافتیں بھی ادھر پل رہی ہیں جو ہمسایہ ممالک سے ہجرت کر کے آئی ہیں اور اب یہ کوئٹہ کا حصہ بن چکی ہیں یہاں کی رسومات کو نبھاتے یا دیکھتے ہوئے کوئٹہ کے لوگ اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ جس نے کوئٹہ کے لوگوں کو کثیر اللسان و وسیع الثقافت بنا کر رکھ دیا ہے۔ کوئٹہ میں آباد پشتون اور بلوچ قبائل تقریباً تمام کے تمام بلوچستان کے دیگر شہروں سے یہاں آ کر بس چکے ہیں لہٰذا ان کی زبان و ثقافت اور رہن سہن کے حوالے سے انہی علاقوں کا ذکر آنے پر بحث ہوگی۔

کوئٹہ کے قبائل: جہاں تک پشتونوں کی بحث ہے تو کاسی وہ قبیلہ ہے جو کوئٹہ شہر کا امین اور وارث کہلاتا ہے۔ یعنی یہ وہ قدیم قبیلہ ہے جو اس شہر میں سکونت پذیر ہوا۔

کانسی: کاسی تاریخی حوالے سے ایک قدیم نسل کہلاتی ہے جن کے ڈانڈے ۴۰۰۰ قبل مسیح سے ملائے جاتے ہیں اور ان کی ایران اور بابل وغیرہ میں موجودگی کے بھی تاریخی حوالے ملتے ہیں، لیکن کوئٹہ میں یہ قبیلہ قدیم الایام میں آباد ہوا ہے۔ عبداللہ خان

ایک خانہ بدوش بزرگ خاتون کڑھائی کرتے ہوئے (فیلڈ ورک)

نورزئی کے مطابق کاسی ایران سے ژوب ہجرت کرتے ہوئے کوئٹہ میں آکر بس گئے ان کے خیال میں کوئٹہ کے یہ کاسی ایرانی النسل ہیں اور ان کی ذیلی شاخوں میں شینواری، اکازئی، کیتر، بڈازئی، احمد خانزئی، میرزئی، سملی، نورزئی، سین گل یا سمنگل، پائیدزئی اور اچوزئی شامل ہیں جو کوئٹہ اور اس کے مضافات میں آباد ہیں۔

اس قبیلے کی طویل شہری زندگی نے انہیں مختلف ثقافتوں کے قریب کر دیا ہے لیکن ان کے ہاں اب بھی وہی رسم و رواج اور طریقہ رہن سہن رائج ہے جو دیگر پشتون قبائل کا ہے۔ ان کی زندگی اکثر شہر سے وابستہ رہی ہے اور حکومتی عہدوں کے علاوہ ان کے زیادہ تر افراد سرمایہ دار ہیں اور جائیدادوں کے مالک ہیں۔ اس قبیلے میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی پیدا ہوئے ہیں۔ یہ مجموعی طور پر پُر امن، مہذب اور نرم خو، شکل و شباہت میں خوبصورت گوری رنگت اور اچھا قد و قامت رکھتے ہیں۔ یہ قبیلہ کاسی کے علاوہ ''کانسی'' کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے ''ایمل کاسی'' جسے امریکا نے شہید کر دیا تھا اسی قبیلے کا فرد تھا۔

درانی: اس کے علاوہ درانی کے نام سے معروف قبیلہ بھی پشتون ہے۔ اگرچہ پشتون اوپر کی سطح کی غلجی (غلزئی/غلجی) اور درانی کی دو بڑی شاخوں میں تقسیم ہوئے ہیں۔ باقی تمام قبائل انہی سے ماخوذ ہیں لیکن کوئٹہ میں پشتونوں کی کچھ شاخیں اس نام سے اس طرح معروف ہوئی ہیں جن کو ایک الگ قبیلے کے طور پہچانا جاتا ہے۔ انہیں احمد شاہ ابدالی ''درانی'' کی نسل سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کی وجہ تسمیہ وہی ''در'' یعنی موتی یا گوہر ہے۔ درانیوں کی کوئٹہ آمد کا زمانہ بھی احمد شاہ ابدالی کے دور اقتدار سے ملتا ہے۔ یہ مجموعی طور پر اعلیٰ اقدار و روایات کا پابند پایا گیا ہے۔ اس وقت ان کی ان تمام علاقوں پر حکومت رہی اور اپنے عہد حکومت میں دیگر لوگوں سے اچھا رویہ روا رکھا۔ ان کے تعارف کے لیے ان کا نام ہی کافی ہے۔ یعنی لفظ درانی کے ساتھ خود بخود ایک لکھا پڑھا اور سلجھا ہوا شخص ذہن کے پردے پر ابھر آتا ہے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کوئٹہ کے درانیوں میں پشتو کے علاوہ فارسی زبان بولنے والے بھی شامل ہیں جو پشتو نسل ہونے کے باوجود فارسی زبان بولتے ہیں بلکہ ان میں ایسے خاندان بھی ہیں، جو پشتو سے مجموعی طور پر نا آشنا ہیں، جن کی ہجرت کا حوالہ ہرات سے ملتا ہے۔ پشتو زبان درانیوں کے مقابلے میں، فارسی زبان درانیوں کے رہن سہن اور رسم و رواج میں نسبتاً تنوع ہے۔ اگرچہ بلوچستان کے پشتون قبائل تمام کے تمام سنی العقیدہ ہیں لیکن درانی قبیلے (خصوصاً فارسی زبان) میں شیعہ العقیدہ خاندان بھی موجود ہیں جو پشتونوں کی نسبت اپنے رہن سہن اور رسم و رواج کے حوالے سے کوئٹہ کے فارسی زبانوں کے زیادہ قریب ہیں جس کی وجہ شاید مذہبی روایات و رسومات کا اشتراک ہو۔

برٹ پیچ: ان کے علاوہ برٹ پیچ وہ قبیلہ ہے جو کوئٹہ ہی میں بڑی تعداد میں آباد ہے لیکن ان کا کوئٹہ سے تعلق بہت پرانا نہیں ہے۔ بلکہ ان کا تعلق، افغانستان کے علاقے ''شوراوک'' سے ہے اور وہاں سے یہاں آکر آباد ہوئے ہیں۔ ان کا زیادہ رجحان کاروبار اور تجارت کی جانب ہے اور اس وقت کوئٹہ کے کاروباری مراکز میں اچھی حیثیت کے مالک بھی ہیں۔ یہ ایک محنت کش اور سخت گیر قوم ہے جس میں پشتونوں کی پرانی خاصیتیں زیادہ نمایاں ہیں۔ کوئٹہ کی چند بڑی آبادیاں ان پر مشتمل ہیں اور ایک معروف کاروباری مرکز ''برٹ پیچ مارکیٹ'' کے نام سے بھی یہاں موجود ہے۔

ان کے علاوہ پشتونوں کے دیگر تمام ایسے قبائل، جو بلوچستان کے پشتون علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، کوئٹہ میں کسی نہ کسی حوالے سے آباد ہیں۔ جبکہ بلوچوں اور براہویوں کے قبیلے بھی کوئٹہ میں سریاب روڈ، ہدہ، بروری اور دیگر علاقوں میں آباد ہیں۔ لیکن بلوچ کی نسبت براہوی کی آبادی کوئٹہ میں زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ پنجابی، ہندوستانی (مہاجر) سندھی، سرائیکی بھی ملک کے دیگر صوبوں سے یہاں آکر آباد ہوئے ہیں۔

کوئٹہ کی آبادی کا ایک بڑا حصہ فارسی بانوں اور ہزارہ قبائل کا ہے جن کے رسم و رواج اور ثقافتی اقدار پر اسی باب میں نگاہ ڈالی جائے گی کیونکہ ان کی اکثریت اسی شہر سے منسوب ہے اور کوئٹہ کی ثقافتی اور لسانی زندگی میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

جبکہ پشتون قبائل، ان کی روایات اور ان کے رسم و رواج اور دیگر خصوصیات کا ذکر یکجا کیا جائے گا۔ لہٰذا یہاں کوئٹہ میں آباد ان قبائل کی تفصیل میں جاتے ہیں جن کی تفصیل دیگر مقامات میں نہیں آسکے گی۔ جہاں تک پنجابیوں اور سرائیکیوں کی بات ہے تو ان میں اکثر قیام پاکستان سے قبل یا اب سے بہت پہلے یہاں آکر بس چکے ہیں۔ نہ صرف کوئٹہ بلکہ پورے بلوچستان کی یہی صورتحال ہے۔ ان کے رسم و رواج وہی ہیں جو پنجاب میں ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں سے رشتوں اور روابط کی بناء پر یہاں کی رسموں کو بھی اپنا چکے ہیں بلکہ کئی تو یہاں کے مقامی لباس پہن کر بلوچ یا پشتون لگتے ہیں۔ لیکن جو خاندان عارضی طور پر ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں وہ اپنی اصل صورت میں موجود ہیں۔ اسی طرح یہاں آباد قدیمی ہندو مذہب کے لوگ اپنے مذہبی رسومات اور عقائد پر مضبوطی سے قائم ہیں اور زیادہ تر پرچون فروشی کا کام کرتے ہیں حتیٰ کہ ان کا لباس اور رہن سہن بھی نہیں بدلا ہے۔ صرف بلوچ علاقوں کے ہندوؤں میں کچھ نے اپنا طریق زندگی بدل کر مقامی افراد کے نزدیک کر دیا ہے۔

بہائی اور پارسی: کوئٹہ میں ایک مختصر آبادی بہائی مسلک کے پیروکاروں کی بھی

ہے جو کوئٹہ شہر میں کسی بھی حوالے سے منفرد نہیں لگتے بلکہ یہیں کے مقامی افراد سی مشابہ ہیں۔ یہ سرکاری ملازمتوں اور مختلف کاروباری سلسلوں میں مشغول ہیں اور معاشی طور پر مستحکم لوگ ہیں۔ پرامن اور بے غرض لوگ ہیں ان کا بنیادی تعلق ایران سے رہا ہے۔ اور اس مذہب کا آغاز بھی وہیں سے ہوا ہے لیکن کوئٹہ میں طویل عرصے سے سکونت پذیر ہیں۔ ان کی ایک عبادت گاہ پٹیل روڈ پر واقع ہے جس کو ''خطیرۃ القدس'' کہتے ہیں۔ ان کی تمام تر رسومات وہیں انجام پاتی ہیں۔ ان رسومات میں یہ صاف ستھرا لباس پہن کر آتے ہیں جبکہ تقاریب کے اجراء کا سلسلہ بیشتر خواتین نبھاتی ہیں۔ محبتوں کے پیغام کے داعی ہونے کے باوجود ان کی تعداد بڑھ نہیں سکی ہے ویسے بھی یہ برادری زیادہ تر اپنوں ہی تک محدود رہتی ہے۔ ان کے علاوہ پارسی بھی ایک قلیل تعداد میں آباد ہیں جن کی انفرادی پہچان تقریباً بہت کم رہی ہے۔ یہ مقامی لوگوں میں گھل مل چکے ہیں۔

کوئٹہ میں پشتون اور بلوچ کے بعد جس قبیلے کی آبادی زیادہ ہے، ہزارہ قبیلہ ہے جن کا اصل تعلق افغانستان سے ہے لیکن ۱۸۹۱ء میں افغانستان کے امیر عبدالرحمان اور اس قبیلے کے درمیان جنگ اور اس کے ظلم و تشدد کی وجہ سے یہ ہجرت پر مجبور ہوئے اور برصغیر (بالخصوص پاکستان) کے دیگر شہروں کے علاوہ کوئٹہ میں بھی آ کر بس چکے۔ ہزارہ در اصل مغل نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی زبان یعنی ہزارگی فارسی کی ایک ذیلی بولی ہے۔

لفظ ہزارہ کی کئی طرح کی وضاحتیں کی گئی ہیں چند دلیلیں تو ''ہزار'' کی تعداد سے منسلک ہیں جیسے ان کے علاقے میں ہزار چشموں یا ہزار دروں کا ہونا ہے جبکہ کچھ اسے لفظ ''خزری'' کی بگڑی ہوئی شکل کہتے ہیں اور علامہ حبیبی کے خیال میں یہ ''ہو + زالہ'' کا مرکب، ہزالہ سے ہوتے ہوئے ہزارہ ہو چکا ہے، قبیلے کے لوگوں کی شکل و شباہت منگولوں سے ملتی ہے یعنی اس وقت بھی اگر کوئٹہ میں ان کے علاقوں میں جایا جائے، تو یوں محسوس ہوگا جیسے چین یا جاپان کے کسی محلے میں داخل ہوئے ہیں۔ یہ بڑے محنتی اور صفائی پسند لوگ ہیں۔ ان کے مرد محنت میں اور خواتین گھر کی دیکھ بال میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیتے۔ غریب ترین ہزارہ کے گھر میں بھی آپ کو بے ترتیبی یا گندگی نہیں ملے گی۔ ان کی خواتین کچے گھروں کو بھی ایسا صاف ستھرا رکھتی ہیں جو اکثر پکے گھروں سے زیادہ دلکش لگتے ہیں، صبح سویرے ان کی خواتین اور بچیاں گھر کے صحن وغیرہ میں جھاڑو لگانے کے بعد اپنی گلی میں بھی باقاعدہ جھاڑو لگائیں گی۔ اس قبیلے کے مرد اکثر جوتے بنانے یا چمڑہ فروشی کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چائے فروشی میں بھی ان کا رجحان زیادہ ہے۔ لیکن اس وقت انہوں نے دیگر پیشوں اور شعبوں میں بھی مہارت حاصل کی ہے۔ جبکہ اچھی تعلیم حاصل کرنے کے سبب بہت سے اعلیٰ حکومتی عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ ان کے جواں کھیلوں میں خاصی مہارت رکھتے ہیں اور فوج میں بھی اس قبیلے کے جوان اچھے انتظامی عہدوں تک پہنچ چکے ہیں۔ جن میں سب سے بڑی مثال جنرل محمد موسیٰ خان کی ہے۔ اس قبیلے کو جنرل موسیٰ ہی کی کوششوں سے ۱۹۵۶ء میں بلوچستان کے لوکل کی حیثیت دے دی گئی (بلوچستان میں مقامی افراد سرکاری طور پر لوکل سرٹیفکیٹ اور دیگر صوبوں سے ہجرت کرنے والے ڈومیسائل رکھتے ہیں)۔ یہ الگ بحث ہے کہ اب افغان مہاجروں کی بڑی تعداد نے بھی لوکل حاصل کئے ہیں۔ یہ لوگ بلوچستان کے دیگر قبائل کی طرح مشترکہ خاندانی نظام پر یقین رکھتے ہیں۔ ہزارہ قبیلے کے لوگ کوئٹہ کے علاوہ بلوچستان کے دیگر شہروں میں بھی آباد ہیں لیکن معمولی تعداد میں۔ کوئٹہ میں ان کی آبادی دو پہاڑوں مہردار اور چلتن کے دامن میں ہے۔ یہ شہر کے کسی دیگر علاقے میں گھر پسند نہیں کرتے بلکہ اپنے قبیلے کے افراد میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ محنتی ہونے کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے میں آگے نظر آتے ہیں۔ ان کی اپنے علاقے میں اکثریت کی وجہ سے ان سے متعلقہ حلقے کے صوبائی اسمبلی کی نشست پر تقریباً ہمیشہ انکا ہی امیدوار کامیاب ہوتا ہے۔ فوج میں بھی اہم عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ وطن کے شہداء میں اس قبیلے کے جوانوں کا اہم حصہ ہے۔ کھیل کے میدان میں بھی اس قبیلے کے نوجوان بڑا نام کما چکے ہیں۔ جبکہ ادب کی جانب بھی ان کے لڑکے لڑکیوں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ان کی زبان ''ہزارگی'' ہے جو فارسی کی ایک ذیلی بولی ہے۔ جبکہ کچھ ہزارے اس امر کی مخالفت کرتے ہوئے اسے الگ زبان مانتے ہیں۔ عقیدے کے لحاظ سے یہ قبیلہ شیعہ ہے اور تقریباً کوئٹہ شہر کی اکثر امام بارگاہیں ان ہی کے علاقوں میں قائم ہیں۔ حتیٰ دیگر قبیلوں کے لوگوں کی امام بارگاہیں بھی انہی کے علاقے میں ہیں، جیسے پنجابی امام بارگاہ، گلگتی امام بارگاہ پلستانی امام بارگاہ، قندھاری امام بارگاہ، بنگشی امام بارگاہ، طوری امام بارگاہ وغیرہ یہ تمام علمدار روڈ پر واقع ہیں۔ جو میزان چوک سے نکلتی ہوئی مری آباد (کوہ مہردار کے دامن) تک جاتی ہے۔ اس روڈ کا پرانا نام ''بارنس'' تھا۔ لیکن اہل تشیع اور امام بارگاہوں کی اکثریت کی وجہ سے اس کا نام حضرت عباسؑ کے لقب سے منسوب ہوتے ہوئے علمدار روڈ رکھا گیا۔ ان کی خواتین میں بھی تعلیم کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے جبکہ زندگی کے دیگر شعبوں یعنی ملازمتوں میں اشتراک رکھنے کے علاوہ بازار سے گھر کا سودا سلف لانے کے کام میں بھی ان کی خواتین کا زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ علاقے کے دیگر قبیلوں سے رشتہ داری کرنے کی وجہ سے ہزاروں کی گوری رنگت اور دوسرے کے نمایاں خدوخال کی وجہ سے ان کی نئی نسل میں خوبصورتی اور کشش پیدا ہو چکی ہے۔

ہزارکو "آزرہ" بھی کہتے ہیں میری نظر میں اگر آزرہ کی وجہ تسمیہ تلاش کی

جائے تو ان کی مغل یعنی ترک نسل ہونے کی دلیل کے طور پر شاید یہ لفظ "آزرہ" سے منسوب ہو جو کہ ترک نسل ہے اور ترکی زبان کا ایک بڑا لہجہ آزری ہے بلکہ ترکی زبان کے لیے بھی یہ اصطلاح استعمال ہوتی نظر آتی ہے۔

شخصیات: اس قبیلے کی اہم شخصیات میں سرفہرست جنرل محمد موسیٰ خان ہیں۔ ان کے علاوہ فوج میں خدمات انجام دینے والے شہدا میں سے کیپٹن صمد علی، فلائٹ لیفٹیننٹ صمد علی (ستارہ جرأت) غلام عباس، کارگل کے شہداء، میجر محمد علی اور کیپٹن ذوالفقار علی شامل ہیں جبکہ کھیلوں کی دنیا میں باکسنگ کے سید ابرار حسین، اصغر علی چنگیزی اور حیدر علی چنگیزی جبکہ فٹبال میں قیوم چنگیزی قابل ذکر ہیں۔

شعر و موسیقی: ہزارگی شعر و موسیقی اگرچہ فارسی شعر و موسیقی ہی کی مرہون منت ہے لیکن کچھ اصناف شعری اور آلات موسیقی ایسے ہیں جو اسی قبیلے سے مخصوص ہیں۔ شاعری میں فارسی کی دو بیتی کے علاوہ چار بیتی کا رواج بھی ہے جبکہ ان کی خاص اصناف ''دی دو'' اور ''مختہ'' ہیں۔ دو بیتی و چار بیتی میں عشقیہ مضامین کو لایا جاتا ہے جبکہ مختہ مرثیے کی قریب صنف ہے جس میں قوم کے قہرمانوں کی یاد میں غم آمیز شعر کہے جاتے ہیں جبکہ ''دی دو'' ایک ایسی ہزارگی فولکلوری صنف ہے جس کو پہاڑوں میں چرواہے مویشی چراتے ہوئے گایا کرتے ہیں۔ لیکن اب انہیں باقاعدہ اصناف کے طور پر گلوکار گاتے ہیں۔ ان کی موسیقی ایک مختصر قسم کے آلے پر منحصر ہے جس کو ''دمبورہ'' کہتے ہیں جو ''تمبورہ'' ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ دو تین تاروں پر مشتمل چھوٹا سا صوتی آلہ ہے۔ جس کو مختلف محافل میں بجاتے ہوئے انکے ساتھ مقامی شاعری گائی جاتی ہے۔ ان کے گانے کے انداز میں بین کرنے کی سی کیفیت ہوتی ہے اور اکثر دو افراد مل کر باری باری اپنی آواز کھینچتے ہوئے گاتے ہیں۔ بلوچستان میں ان کے معروف گلوکاروں میں صفدر علی توکلی، سرور سرخوش اور داؤد سرخوش وغیرہ شامل ہیں۔

فنون و دستکاریاں

جیسا کہ ذکر ہوا کہ اس قبیلے کے افراد محنتی ہیں اور ہر حالت میں کسب معاش کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دستکاریاں بھی قابل ذکر ہیں اور ان کا تعلق ان کے عہد قدیم سے جڑتا ہے۔ کیونکہ یہ پہاڑی علاقوں میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے مال مویشی ہی تک محدود تھے تو مویشیوں کی کھال اور ان کے بالوں کو یہ کسی نہ کسی مصرف میں لانے کی کوشش میں کھالوں کو تو چمڑے میں بدلنے کے مصنوعی مراحل سے گزار کر ان سے جوتے، بیلٹ، بندوق کے غلاف وغیرہ بناتے رہے ہیں جبکہ ان کے بالوں سے چند قابل ذکر اشیاء میں یہ قبیلہ مہارت رکھتا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

لباس: یہاں بلوچی، پشتون، سندھی، پنجابی لباس پہنتے وغیرہ کے علاوہ پینٹ شرٹ وغیرہ کا رجحان بھی موجود ہے۔ خواتین اور مرد دونوں ان لباسوں سے استفادہ کرتے ہیں لیکن مقامی، ثقافتی اور اسلامی اقدار کے اثرات کی وجہ سے پردے کا بڑی حد تک خیال رکھا جاتا ہے۔ یعنی یہاں دوپٹہ اوڑھنا ایک ایسا کلچر ہے کہ کبھی کبھار تو اس حقیقت سے لاتعلق یا آزاد مسلک کی خواتین کو بھی اوڑھنا پڑتا ہے۔ یہاں پر کپڑے کی مارکیٹ اکثر بیرونی ممالک کے کپڑوں سے بھری رہتی ہے۔ جن کی خریداری کو صوبے سے باہر حتیٰ ملک سے باہر کے لوگ بھی ترجیح دیتے ہیں۔

جوتے: اگرچہ چائنا نے دنیا بھر میں کئی دیگر اشیاء کی طرح جوتوں کی مارکیٹ کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے لیکن کوئٹہ میں روایتی جوتوں کی دکانیں اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ جن کی دو قسمیں ہیں، ایک تو بلوچی جوتے ہیں۔ جو بلوچ کاریگر مخصوص انداز میں بناتے ہیں لیکن ان کو بشمول بلوچ کے تمام لوگ پہنتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہزارہ برادری بہت خوبصورت اور پائیدار جوتے بناتی ہے۔ یہ جوتے تقریباً بلوچستان ہی کا حصہ ہیں جن کو کاریگر بڑے ہنرمندی اور سلیقے سے بناتا ہے۔ ان جوتوں کی قسموں میں شکاری، چائنا، ڈارمی، کریپ سول، سنگل سول، ٹاکی دار چوٹی دار کے علاوہ کئی اور قسمیں شامل ہیں جن میں اب کچھ قسمیں متروک ہو چکی ہیں۔ آج کل عصری تقاضوں کے مطابق یہی کاریگر بہت خوبصورت بوٹ بھی بناتے ہیں جو کسی بھی حوالے سے سروس اور باٹا وغیرہ سے کم نہیں ہوتے۔ عید کے ایام کی مناسبت سے یہ جوتے آرڈر پر بنائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں روز و شب ایک کر کے کام کرنا پڑتا ہے۔

واسکٹ (سدری): یہ بھی کوئٹہ کے لباس کا ایک اہم جزو ہے۔ جس کو بلاتفریق تمام لوگ پہننا پسند کرتے ہیں۔ جو شلوار قمیض کے ساتھ پہنی جاتی ہے۔ واسکٹ بھی جو نسبتاً سردی سے بچنے کی بھی ایک ابتدائی کوشش ہے لیکن یہاں کے لوگ گرمی سردی ہر موسم میں اس کا استعمال کرتے ہیں اور درزیوں کو اس کے بنانے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ اگرچہ یہ بلوچ اور پشتو ثقافت میں اپنی اپنی مختلف شکلیں رکھتا ہے لیکن شہری زندگی میں ایک ہی طرز کی واسکٹیں پہنی جاتی ہیں۔ اس کو پشتو میں سدری بھی کہتے ہیں۔

ٹوپی: جس کو پشتو میں ''خولئی'' بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی یہاں کی بلوچ پشتو ثقافت میں مشترکہ حیثیت رکھتا ہے۔ اور کوئٹہ میں آباد نسبتاً اپنی روایات کے پاسدار افراد اب بھی پہنتے ہیں۔ لیکن یہ بھی مختلف ثقافتوں کے اشتراک کی وجہ سے کئی قسموں کی ہوتی

ہیں۔ جبکہ معروف بلوچی ٹوپیاں ہی ہوتی ہیں یعنی پشتونوں میں بھی اس کو اسی نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سندھی، سواتی یا چترالی ٹوپی وغیرہ کا استعمال بھی عام ہے۔ قرہ قولی ابھی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اگرچہ چند سال قبل شہر میں قرہ قولی فروشی کی خصوصی دکانیں نظر آتی تھیں جس کے اپنے خاص شوقین قسم کے پہننے والے ہوتے تھے اور یہ ٹوپی بڑی گرامہا ہوتی تھی جو تقریباً وہی جناح کیپ ہی ہے۔

پٹو: یہ ایک ایسی چادر ہے جس کو مرد حضرات اوڑھتے ہیں۔ پشتونوں میں پٹو کا مصرف بہت زیادہ ہے۔ جو کہ بذات خود ایک کثیر الاستعمال شے ہے۔ اس کو کاندھوں پر تہہ کر کے ڈالا جاتا ہے اور عید پر دیگر لوازمات کے ساتھ یہ بھی لباس کا جزو ہوتا ہے۔ کوئٹہ کے ماحول میں یہ بھی تمام شہریوں کی مشترکہ میراث ہے۔ لیکن یہاں آپ کو پٹو کے علاوہ رومال کی طرح کی چھوٹی چادریں بھی ملیں گی جن کو اکثر مدرسوں کے طالب علم پہنتے ہیں۔ سندھی اجرک کا استعمال بھی یہاں عام ہے۔ کچھ قبائل تو کپڑوں کے ہر جوڑے کے ساتھ اسی رنگ کا پٹو اور سدری بھی بناتے ہیں، جس کے بغیر شلوار قمیض نامکمل محسوس کی جاتی ہے۔

نمد: یہ بکری کے بالوں سے بننے والی سخت و کرخت قسم کی شے ہے۔ جس کو بچھانے کے علاوہ تھیلوں اور نخچیر وغیرہ کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

بیرک برئی: برہ میمنے کو کہتے ہیں۔ اس کے بالوں سے ایک نرم و ملائم سا بچھونا بنایا جاتا ہے جس کی اس قبیلے سے باہر بھی مقبولیت رہی ہے۔ لیکن کوئی تجارتی شہرت حاصل نہ ہو سکی۔

بیرک شتری: ''شتر'' یا ''اشتر'' فارسی میں اونٹ کو کہتے ہیں۔ یہ بیرک اونٹ کے بالوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بھیڑ بکری کے بالوں سے یہ سخت برفانی موسم سے بچنے کے لئے گرم لباس بھی بناتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ صنعتیں اب روز بروز نابود ہوتی جا رہی ہیں۔ بالخصوص بلوچستان میں تو یہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

گلیم: قالین کی ایک ابتدائی شکل ہے جو کہ بھیڑ بکریوں کے بالوں کو رنگ کر بنائے جاتے ہیں۔ یہ اب بھی عام گھروں میں روزمرہ کے استعمال میں آتے ہیں اور اس فن کے تو کاریگر باقاعدہ شہر شہر گاؤں گاؤں پھرتے ہیں اور لوگوں کی فرمائش پر بناتے ہیں۔ جبکہ گلیم ایک اصطلاح بھی ہے مثلاً جب کوئی کسی کے گھر جا کر رشتہ طلب کرتا ہے تو "کسی کو گلیم سے ناامید اٹھانا قبیلے کے اقدار کے خلاف ہے"۔ کی طرح کے جملے ادا کئے جاتے ہیں۔

مٹی کے برتن: ہزارہ خواتین بغیر کسی چاک کے مٹی کے برتن بنانے میں مہارت رکھتی ہیں، یہ ہنر بھی وقت کی ضرورت کے تحت اس قبیلے میں رائج ہو گیا۔ کیونکہ دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے افراد کا شہروں سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے اشیائے ضرورت کا اپنے طور پر اہتمام کرنا فطری امر ہے۔ اب یہ ہنر بھی شہری سہولیات کی وجہ سے نابود ہوتا جا رہا ہے۔

لباس: ہزارہ ویسے تو شلوار قمیض ہی پہنتا ہے۔ لیکن خواتین کا لباس نسبتاً دیگر قبائل سے مختلف اور دلچسپ ہوتا ہے۔ جس میں کھلی شلوار کے ساتھ کھلی چنٹ والی قمیض پہنتی ہیں جن پر ہاتھ سے سلائی کھڑائی کا کام کیا جاتا ہے۔ یہ بھی یہ عورتیں خود کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی واسکٹ بھی پہنتے ہیں جو قمیض کے کپڑے اور کڑھائی سے مشابہہ ہوتا ہے جس کے بٹن سینے کے نیچے پیٹ پر مضبوطی سے بند کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کی ایک ٹوپی بھی سر پر پہنتی ہیں جس کو ارخچین کہتے ہیں جبکہ مرد شلوار قمیض کے ساتھ سروں پر پگڑی پہنتے ہیں۔

ہزارہ کے علاوہ فارس بھی وہ لوگ ہیں جو کہ شیعہ عقائد رکھتے ہیں جن میں درانی، تاجک، قزلباش اور یوسفزئی وغیرہ شامل ہیں لیکن ان سب کو ''قندہاری'' کے مشترکہ نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس طرح ان مختلف قبائل کے افراد صرف فارسی زبان اور شیعہ مذہب کے اساس پر ایک قوم کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اور کوئٹہ کی ایک خاص آبادی ان پر مشتمل ہے۔ صوبے کے دیگر مقامات میں ان کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ جہاں وہ مقامی ثقافتی زندگی میں گھل مل چکے ہیں۔ مقامی اصطلاح میں انہیں "فارسی بان" کہتے ہیں جو مجموعی طور پر نرم خو، ملنسار اور باوضع لوگ ہیں۔ یہ بھی کوئٹہ میں قیام پاکستان سے قبل آباد ہوئے ہیں جبکہ اس کے بعد بھی افغانستان یا دیگر علاقوں سے خال خال ہجرت ہوتی رہی۔ یہ لوگ کسی مخصوص پیشے سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کا حصہ شامل ہے۔ ویسے ان کی بھاری اکثریت سنار کا کام کرتی ہے۔ جبکہ سرکاری ملازمتوں میں بھی یہ لوگ نظر آتے ہیں۔ لیکن نسبتاً کاروبار کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے رسم و رواج ہزاروں اور پشتونوں سے ملتے ہیں جبکہ بلوچوں کی کچھ رسمیں بھی ان میں سرایت کر گئی ہیں۔ اس طرح یہ برادری کوئٹہ میں ایک نئی ثقافت کو متعارف کر چکی ہے۔ لیکن ان کا زیادہ تر ثقافتی اشتراک ہزاروں کے ساتھ ہے کیونکہ بنیادی طور پر ایک ثقافت اور مسلک سے منسلک ہیں اور کوئٹہ میں ان کے رہائشی علاقے بھی ایک ہیں۔ یعنی وہی علمدار روڈ اور بروری کا علاقہ۔ لیکن ان کی اکثریت علمدار روڈ پر ہی بستی ہے۔ ان میں بھی تعلیم کا رجحان عام ہو گیا ہے اور جوان اکثر تن سازی (باڈی بلڈنگ) میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ نسبتاً خوش باش

اور خوش گزران لوگ ہیں جبکہ قطعی طور پر امن پسند اور متواضع۔

شخصیات: اس قبیلے کی معروف شخصیات یہ ہیں: فضل احمد غازی تحریک پاکستان کے سرگرم رکن اور اہل قلم تھے جنہوں نے پشتو اور فارسی کی ثقافت و ادب کی ترویج میں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر اکبر خان تحریک پاکستان کے کارکن ہونے کے علاوہ سیکرٹری صحت بھی رہے ہیں۔ ان کے علاوہ طاہر محمد خان ایڈووکیٹ بھی اس برادری کی اہم ترین شخصیت ہیں۔ آپ معروف وکیل اہل قلم ہیں اور کتابوں کے مصنف ہیں۔

رہن سہن: اس حوالے سے یہ برادری ہزارہ برادری سے مختلف اور جدیدیت کی جانب زیادہ رجحان رکھتی ہے۔ یہ اکثر مشترکہ خاندانی نظام کے تحت رہنا پسند کرتے ہیں۔

لباس: ان کے لباس کی کوئی خاص جداگانہ شکل نہیں ہے وہی مقامی افراد کی طرح شلوار قمیض اور جوانوں میں پینٹ شرٹ کا رجحان ہے۔ یعنی یہ لباس کے حوالے سے نئے نئے رجحانات کو جلد قبول کرتے ہیں، ان کی خواتین میں لباس، آرائش اور بناؤ سنگھار پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اس لئے ان کے علاقوں میں بیوٹی پارلر زیادہ نظر آتے ہیں۔

غذائیں: ان کے اور ہزاروں کے روایتی کھانوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اگر کہیں فرق بھی نظر آتا ہے تو نام کی حد تک۔ ایک آدھ ایسی چیزیں ہیں جو ہزارہ قبیلے سے مخصوص ہیں سو یہاں پہلے ان کھانوں کا ذکر کرتے چلیں جو صرف ہزارہ قبیلہ کے لئے مخصوص ہیں۔

نان تر: یہ یخنی سے ملتی جلتی سادہ سی غذا ہے۔ گوشت کو پانی میں ابال کر اس کے شوربے میں روٹی توڑ کر کھاتے ہیں۔ جبکہ پیاز کے علاوہ مصالحہ جات کا استعمال نہیں ہوتا۔ آج کل مصالحہ جات کا رجحان بھی کم کم شامل ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ آلو وغیرہ کو بھی ابال کر اسی عمل سے گزارا جاتا ہے۔ فارسی بانوں میں بھی یہ غذا پائی جاتی ہے اس کو اردو میں "کٹ روٹی" بھی کہتے ہیں۔

اوگرہ: "جسے اوگرے آجئ" یعنی دادی یا نانی کا اوگرہ کہتے ہیں۔ اس کا استعمال زیادہ تر بوڑھے بوڑھیوں کے لیے ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک نرم غذا ہے۔ یہ آٹے کو گھی میں ملا کر پکایا جاتا ہے جو نرم اور لیس دار سے مادے میں تبدیل ہوتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی پرہیزانہ اور کسی حد تک فقیرانہ غذا ہے۔

منتو: یہ بھی ایک خاص قسم کی ہزارگی غذا ہے جس کے لئے آٹا گوندھ کر پیڑے بنائے جاتے ہیں اور بند دیگچی میں پانی میں ابالتے ہیں اور پھر ہر ایک میں آلو قیمہ و سلاد وغیرہ ڈال کر دوبارہ گرم بھاپ میں پکایا جاتا ہے۔ یہ ایک خوش ذائقہ غذا ہے۔ منتو پر دہی ڈال کر کھاتے ہیں۔

نان بوٹہ: یہ وہ موٹی روٹی ہے جس کو تندور یا انگاروں پر پکاتے ہیں۔ جسے نمکین یا میٹھا کرتے ہیں۔ اس کی بہتر قسم وہ ہے جس کے آٹے میں ذرا سا گھی ملایا جاتا ہے۔ دراصل یہ اس وقت کی غذا ہے جب دور دراز کے سفر پر نکلنے کیلئے راستے میں کسی قسم کی غذا کے امکانات نہیں ہوتے تھے۔ یہ کئی کئی دنوں تک خراب نہیں ہوتا جبکہ اس کی چوری بھی بناتے ہیں۔ یہ خوراک مختلف ناموں یا ذرا سی مختلف شکلوں کے ساتھ پاکستان کے پشتون اور دیگر پہاڑی علاقوں کے قبائل میں موجود ہے۔

قدید: یہ خشک گوشت کی وہ غذا ہے جو پشتون قبائل میں بھی بہت مقبول ہے اور وہاں لاندی کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ سردیوں سے کچھ عرصہ قبل دنبے کو ذبح کر کے اس کے گوشت کو سایے میں نمک وغیرہ چھڑک کر خشک کر کے بنائی جاتی ہے۔ اور سردی کے دنوں میں اس کو مٹی کی مخصوص ہانڈی میں پکایا جاتا ہے۔ اس کے شوربے میں روٹی توڑ کر نرم کر کے کھائی جاتی ہے۔ یہ سرد علاقوں کی غذا ہے جس کا اثر بہت گرم اور معقول ہے۔ اب مٹی کی ھانڈی کا استعمال ک ہو رہا ہے جس سے اس کا ذائقہ بھی متاثر ہو رہا ہے اور اب کچھ دوسری غذائیں جو ہزارہ اور قندھاری دونوں قبیلوں میں مشترک ہیں۔

آش: آش ایک بہت ہی معروف غذا ہے بلکہ اپنی مقبولیت کی وجہ سے ایک اہم ثقافتی علامت بن چکا ہے۔ مثلاً کسی سے دعوت کی درخواست کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ بھئی کبھی آش کی زحمت کرو یا آپ سے آش کب کھائیں گے، اور یہ بھی کہ باورچی خانے کو فارسی میں "آشپز خانہ" کہتے ہیں۔ یہ لفظ "آش" اور "پز" کا مرکب ہے پز فارسی کے مصدر "پختن" کے حال کا فعل ہے۔ پختن کے معنی ہے پکانا اور آش پز خانہ یعنی آش پکائی جانے والی جگہ۔ جبکہ باورچی کو اسی مناسبت سے آشپز کہتے ہیں آش پکانے والا۔ یہ ایک سادہ سی غذا ہے جو آٹے سے بنتی ہے یعنی آٹے کو گوندھ کر بیلا جاتا ہے اور اس سے سویوں کی طرح موٹے موٹے تسمے بنائے جاتے ہیں۔ پھر پانی ابال کر ان کو اس میں ڈال کر جوش دیتے ہیں۔ اس کے بعد گرم گرم تھالیوں میں بھر کر اس پر ذرا سا، پکا ہوا قیمہ، سبزی یا لوبیا وغیرہ ڈالتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی لازمی اجزا نہیں ہیں۔ اس کا اہم جز زاینۃ نما لعاب ہے جو اس کے اوپر ڈال کر گرم گرم کھایا جاتا ہے۔ یہ لعاب ''قوروت'' سے بناتے ہیں۔ قوروت کے نہ ہونے کی صورت میں دہی استعمال کرتے ہیں۔ حتیٰ ضرب الامثال میں آش کے نام سے استفادہ ہوتا ہے۔ جیسے ''کاسہء گرم تر

از آش''، یعنی آش سے تالی گرم ہے۔ جو تقریباً اردو میں ضرب المثل "مدعی سست گواہ چست" کا متبادل ہے۔ آش افغانستان اور ایران اور تاجکستان وغیرہ میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ ایران میں مذہبی تقاریب میں اکثر آش کھلائی جاتی ہے۔

آشک: یہ آش کی ذرا سی مختلف قسم ہے اس میں آٹے کی بہت چھوٹے سموسے نما ٹکیاں بنائی جاتی ہیں اور ان میں ابلی ہوئی سبزی بھرتے ہیں۔ اس کے بعد اسے ابال کر طشتری یا پلیٹوں میں پھیلا کر ان پر دہی رایتہ نما لعاب یا قیمہ وغیرہ کا سالن ڈال کر کھاتے ہیں۔

دلدہ: یہ ایسی غذا ہے جو شاذ و نادر ہی کھانا نصیب ہوتی ہے۔ گندم کو مخصوص انداز مین پکایا جاتا ہے۔ اس کے لئے ایسا گندم استعمال ہوتا ہے جس کے ریشے ہوتے ہیں۔ اس کو پکانے کے بعد ایک تھال یا بڑی تھالی میں سجایا جاتا ہے اور درمیان میں دائرہ نما خالی جگہ چھوڑی جاتی ہے جس میں گھی ابال کر ڈالا جاتا ہے۔ یہ مخصوص ایام کی غذا ہے جیسے چہار شنبہ سروری یا شادی کے دوسرے روز کی مہمانی وغیرہ۔ لیکن لوگ عام طور پر بھی کبھی کبھار اس کا شوق فرماتے ہیں۔

قابلی: یہ پلاؤ کی ایک قسم ہے۔ یعنی گاجر کے لمبے ریشے کر کے کشمش کے ساتھ ابال کر پلاؤ کے اوپر سجاتے ہیں۔ جس سے پلاؤ کا مزا دوبالا ہوتا ہے۔ اس کی مقبولیت کی وجہ سے اب کوئٹہ شہر کے کابلی ہوٹلوں میں عام فروخت ہوتی ہے اور تمام لوگ اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

حلوہ سمنک: یہ بھی رسومات کیلئے مخصوص ہیں۔ جیسے رسم قل و چہلم، نوروز بالخصوص چہار شنبہ سروری کے لئے لیکن شاذ و نادر بغیر کسی تقریب کے بھی بنتا ہے۔ دراصل اس کے بنانے میں بڑی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ اس کے لئے ریشہ دار گندم استعمال کرتے ہیں اور وہی سمنک (ایرانی میں سمنو) ہے۔ پہلے گندم کو برتن وغیرہ میں اگایا جاتا ہے معمولی ریشے نکلنے پر اس گندم کو دوبارہ خشک کرتے ہیں اور اس کے ساتھ آٹا، گھی، چینی وغیرہ ملا کر گوندھا جاتا ہے اور پھر کڑاہی میں ڈال کر گھی میں پکاتے ہیں لیکن کئی گھنٹے مواتر چمچہ ہلانے کا عمل جاری رہتا ہے اور نیچے آنچ ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ایک بہت ہی مضبوط قسم کی لیس دار نسواری رنگ کے مادے میں تبدیل ہوتا ہے۔ جس کو گھی میں بھگو کر پکایا جاتا ہے۔ زیادہ تر لیس دار ہونے کی وجہ سے اس کا چبانا مشکل ہوتا ہے۔

شلئہ گوشتی: یہ بھی تقریباً قندھاری کی مخصوص غذا ہے۔ اس کو خصوصاً محرم الحرام میں نذر و نیاز کے طور پر پکاتے ہیں۔ جس میں دال، لوبیا، چنے اور چاولوں کا لعاب بنا کر گائے کے گوشت کو گھلا کر ریشوں میں تبدیل کر کے ڈالا جاتا ہے اور اس طرح ان کے ملاپ سے ایک گاڑھا حلیم نما کھانا تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی مشقت یہ ہے کہ رات سے صبح یا صبح سے رات تک اس میں چمچہ چلانا پڑتا ہے۔ لفظ شلہ ''شُل'' سے لیا گیا ہے جس کے معنی نرم یا ڈھیلے کے ہیں۔

شلہ ءزرد: یہ بھی محرم کے نذر و نیاز کی مخصوص غذا ہے جو کھیر سے ملتی جلتی ہے لیکن اس میں کھیر کے برعکس دودھ نہیں ہوتا بلکہ چاول اور شکر کا استعمال ہوتا ہے۔ عرق گلاب، بادام، پستہ یا اخروٹ بھی ممکن ہے ملا ہو۔ جبکہ اس کے رنگ میں زردی ضرور شامل رکھتے ہیں۔ یہ زردی دراصل زعفران کی ہوتی ہے لیکن زعفران کی کم یابی کی وجہ سے زردے کا رنگ ملاتے ہیں۔

کوچہ: یہ غذا دراصل اس وقت بنائی جاتی تھی جب بچوں پر خسرہ وغیرہ کے دانے نکل آتے اور اختتامی حالت کو پہنچتے ہیں تو یہ پکا کر ہمسایوں اور رشتہ داروں میں بانٹتے ہیں۔ لیکن اب یہ عام غذا میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بلکہ ہزارہ آبادی والے علاقوں میں اسے چھولے کی طرح پکا کر ریڑھیوں میں بیچا جاتا ہے۔ یہ گندم کو پانی میں ابال کر اس میں گوشت کا، بالخصوص پائے کا لیس دار شوربہ ملاتے ہیں۔ ویسے نذر کرتے وقت صرف ابلے ہوئے گندم کے دانوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

اومارج: یہ غذا نزلہ زکام کی حالت میں خواتین استعمال کرتی ہیں۔ اس میں آٹے کو پانی میں ابال کر ماش کے بغیر چھلکے کی دال ملاتے ہیں۔ اس کا اہم ترین عنصر شلجم ہوتا ہے۔

آرد بریان: آرد یعنی آٹا بریان یعنی بھنا ہوا۔ اس میں آٹے کو بھون کر چینی اور گھی ڈالتے ہیں اور یہ خصوصاً زچہ کے لئے بناتے ہیں۔ جبکہ اس کو ویسے بھی شوق سے کھایا جاتا ہے۔

تافہ یا شکنہ: تافہ بہت ہی فقیرانہ اور سادہ غذا ہے۔ پیاز کو ابال کر اس کے پانی میں روٹی کے ٹکڑے کر کے کھاتے ہیں یا پھر اس شوربے میں ایک آدھ انڈا بھی ملا دیتے ہیں۔ اسے قندھار اور پشتو میں شکنہ کہتے ہیں۔

قوروت: یہ ایک خشک غذا ہے جو دہی سے بنتی ہے اور پشتون، قندھاری اور ہزارہ سب میں یکساں مقبول ہے۔ کپڑے کے عموماً سفید رنگ کے تھیلے میں نمک ملے دہی کو ڈال کر لٹکایا جاتا ہے تاکہ اس کا پانی نکل جائے پانی نکل جانے کے بعد باقی مواد کے گولے بنا کر خشک کر دیئے جاتے ہیں اور ان کو مختلف غذاؤں میں

استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ اسے یونہی خشک بھی چبایا جاتا ہے۔ قندھاری چونکہ "ق" کو "غ" میں بدلتے ہیں تو وہ اس کو غوروت کہتے ہیں۔

قورتی: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ قوروت ہی سے بننے والی شے ہے۔ اسی میں قوروت کو پیس کر اس کا لعاب بناتے ہیں اور پیاز کو تل کر اس پر ڈالتے ہیں اور پھر روٹی کے ٹکڑے کر کے اس لعاب میں ڈال دیتے ہیں جو نرم ہو کر کھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

شیر روغن: دودھ اور گھی کو گرم کر کے روٹی کے ٹکڑوں کو اس میں بھگوتے ہیں۔ یہ غذا دیہاتوں میں زیادہ تر عزیز دوست اور مہمان کے لیے تیار کرتے ہیں جس سے اس کی قدر و قیمت اور عزیزی کا اظہار ہوتا ہے۔

شلہ اولبہ: اولبہ میتھی کے دانوں کو کہتے ہیں۔ یہ غذا زچہ کے لیے پکائی جاتی ہے جس کے اشیائے ترکیبی میں چاول اور میتھی کے دانے، چینی اور الائچی شامل ہیں۔ جبکہ زچہ کے علاوہ اسے عام طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

بوسراغ: یہ آٹے کی مختلف شکلوں میں بنی ہوئی ہتھیلی کے برابر بسکٹ نما موٹی ٹکیاں ہوتی ہیں۔ لیکن ان کو مختلف شکلوں میں لپیٹ کر بنایا جاتا ہے اور پھر گھی میں تلتے ہیں۔ آٹے کو گوندھتے ہوئے وقت اس میں چینی بھی ملاتے ہیں۔

خورما: یہ بھی بوسراغ ہی ہیں۔ لیکن ان سے چھوٹے سائز میں ہیں، جو آٹے کے علاوہ میدے سے بھی بنائی جاتی ہیں اور متعلقہ علاقے کی بیکریوں میں فروخت بھی ہوتی ہیں۔

کلچہ یا کلوچہ: یہ بھی بوسراغ سے ملتی جلتی ہتھیلی کے برابر یا اس سے بڑی گول ٹکیاں ہوتی ہیں۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ذائقے کے حوالے سے نمکین اور میٹھے ہوتے ہیں۔ یہ آٹے اور میدے دونوں سے بنتے ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یوں ہیں۔ برنجی، روغنی، ختائی اور شکری وغیرہ۔ یہ بسکٹ کی جگہ چائے کے ساتھ مہمانوں کو پیش کیے جاتے ہیں اگرچہ بسکٹ نے کافی حد تک اس کی جگہ لے لی ہے۔ لیکن اب تک یہ قندھاری برادری میں مقبول ہیں اور باقاعدہ بازار میں فروخت ہوتے ہیں۔

قند: یہ چینی سے بنی ہوئی مینار نما وزنی شے ہے جس کو زری یا نقرئی رنگ کے کاغذ میں خوبصورتی سے لپیٹا گیا ہوتا ہے۔ اسے شادی منگنی کی مبارکباد کے طور پر ایک دوسرے کے گھر لے جاتے تھے جبکہ منگنی کے وقت بھی دلہن کے سر پر چادر تان کر اس کے اوپر اس کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑتے ہیں یا کوئی اور بزرگ ہتھوڑے سے توڑتا ہے۔ اگرچہ اب اس کا یہ استعمال شہری زندگی میں تقریباً متروک ہو چکا ہے لیکن اس کا وجود اب تک نابود نہیں۔ پہلے جب یہ مبارکبادی کے طور پر کسی کے گھر لے جائے جاتے تو انگھیٹی پر گلدان یا ڈیکوریشن پیس کی طرح سجائے جاتے تھے۔ جبکہ قند چینی کی بنی ہوئی سفید رنگ کی چوکور ٹیکیا کو بھی کہتے ہیں جس کو یہ قبیلے تلخ چائے کے ساتھ کھاتے ہیں۔

نُقل: یہ بھی سفید رنگ کی گول میٹھی شے ہے جس میں چھوٹے بڑے سائز ہوتے ہیں۔ ان کے اندر بناتے وقت بادام، مونگ پلی یا چنے کا دانہ بھر دیا جاتا ہے۔ اس کو بھی چائے پیتے وقت شکر کے طور پر پہلے سے منہ میں ڈال کر چائے کا گھونٹ لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس کا استعمال ہر خوشی کے موقع پر بھی ہوتا ہے۔ منگنی یا شادی کی رسم میں ختنہ وغیرہ کے موقع پر دلہا، دلہن اور بچے کے سر پر ڈالتے ہیں جو بذات خود صدقے کی ایک شکل ہے۔

بولانی یا پورکی: یہ سموسے نما شے ہے جس کے لیے آٹے کی چھوٹی چھوٹی روٹیاں بنا کر ان کے اندر ساگھ یا پالک وغیرہ بھر کر گھی میں ابالی جاتی ہے۔ گھروں میں استعمال کے لیے یہ بڑے سائز میں یعنی مکمل روٹی کو تہہ کر کے بنائی جاتی ہے۔ جبکہ اب تو بازار میں غذا کے طور پر سموسے کے سائز میں ریڑھیوں میں فروخت ہوتی ہے۔

شیر یخ: یہ ایک قسم کی دیسی آئس کریم ہے لیکن بہت ہی خوش ذائقہ ہے۔ اس کا بنانا مشقت طلب کام ہے۔ لکڑی کا ایک گول ڈرم نما ڈبہ لے کر اس کے اندر اس سے نسبتاً کافی کم چوڑا کم لمبا سلینڈر نما ٹین کا ڈرم رکھتے ہیں اس ڈرم کے چاروں طرف برف کے ٹکڑے ڈال کر ان پر نمک چھڑکا جاتا ہے اور اندرونی ڈرم میں پکا ہوا دودھ چینی کے شیرے کے ساتھ ڈال کر متواتر دائیں بائیں برف پر ہلایا اور گھمایا جاتا ہے۔ اس طرح ہوتے ہوتے وہ دودھ اور شیرہ جم جاتا ہے اور آئس کریم کی شکل اختیار کر لیتا ہے، یہ کوئٹہ میں اس قدر مقبول ہے کہ شہر بھر میں جوس وغیرہ کی دکانوں میں عام فروخت ہوتا ہے۔ جسے تمام لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔

آب کشتہ: پہلے خوبانی کے بیج نکال کر اس کو خشک کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کو پانی میں ابال کر گاڑھا لعاب بناتے ہیں۔ اس لعاب میں چینی ملا کر اسے شربت کے طور پر پیا جاتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں اسے گرمی کی کمی کیلئے پیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا اثر خنک ہے اور گرمی کی شدت کو گھٹاتا ہے۔ یہ مشروب بھی کوئٹہ میں سرعام فروخت ہونے لگا ہے۔

شیر برنج: شیر یعنی دودھ، اور برنج یعنی چاول۔ یہ کھیر ہی کا فارسی نام ہے جس کا استعمال عام طور پر کم، اور نذر و نیاز یا محرم کے ایام میں زیادہ ہوتا ہے۔

چنگالی: اس میں گھی ملی ہوئی ٹکیاں پکا کر اس کو چورے کی شکل میں چھوٹا کر کے چینی ملا کر کھاتے ہیں۔ چنگالی غالباً لفظ ''چنگل'' سے لیا گیا ہے کیونکہ اس کو چورہ کرنے کے لیے چنگالا جاتا ہے۔

مکرونی: یہ ایک قسم کی ایرانی اور جدید غذا ہے جس کو ہم سپیگیتی کہتے ہیں لیکن فارسی ثقافت میں یہ مختلف شکلوں میں بنائی جاتی ہے۔ جو سیپی اور دیگر چھوٹے چھوٹے پھولوں کی شکل میں ہوتی ہیں جبکہ سویوں کی طرح لمبی لمبی بھی ہوتی ہیں جو کارخانے سے بن کر آتی ہیں اس کو پانی میں ابال کر اس کے پانی کو مکمل طور پر چھان کر ابلی ہوئی مکرونی کو دوبارہ تلا جاتا ہے اس میں عموماً قیمہ ملا کر کھاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں ملانے کی مناسب شے مشروم سے بننے والی ''گوشت گیاہی'' ہے۔ ایرانی اس کو ماکارونی کہتے ہیں۔ اس کے اوپر عموماً ٹماٹر کا لعاب ڈال کر کھایا جاتا ہے۔

گندم بریان: گندم کے دانوں کو دیگچی میں بھون کر ان پر گھڑیا چینی ڈال کر کھایا جاتا ہے۔ اس کا مصرف سردی کے دنوں میں بارش میں بچوں کو سردی سے بچانے کی غرض سے ہوتا ہے تاکہ بچے اس کے کھانے میں مصروف ہوں اور باہر نکل کر سردی کا شکار نہ ہوں۔ جبکہ اس کے اثر کو بھی گرم بتایا جاتا ہے۔

دوغ: لسی کو فارسی میں دوغ کہتے ہیں۔ گرما کے موسم میں یہ دوپہر کے دسترخوان کا ایک اہم جزو ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھار تو دسترخوان پر صرف دوغ اور روٹی ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ماست: دہی کو ماست کہتے ہیں جس کا مصرف ملک کے دیگر صوبوں کی طرح اس علاقے میں بھی ہے۔

اسماعیلی: یہ ایک مخصوص غذا ہے، جو کہ عورت کی حاملہ ہونے کے ساتویں ماہ کی تقریب میں بنتی ہے۔ توے کی گرم روٹی پر گھی ڈال کر اس پر شکر ڈالتے ہیں۔ یا پھر شکر کی بجائے شکر کا شیرہ بنا کر ڈالتے ہیں اور پھر اس روٹی کو تہہ کر کے چھری سے اس کے ٹکڑے کئے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس طرح کے ہر بار کاٹنے کا ثواب ایک دنبے کے ذبح کے برابر ثواب ہے۔ اس روٹی کو ہمسایوں اور اقارب میں بانٹتے ہیں۔ اسماعیلی کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں شاید حضرت اسماعیل کی قربانی سے کوئی نکتہ لیا گیا ہو، کیونکہ دنبے کے ذبح کرنے کے ثواب کا ذکر بھی اس کے ساتھ موجود ہے۔

عورتوں اور مردوں کے نام: ناموں کے حوالے سے ہزارہ قبیلے اور قندھاریوں میں زیادہ تنوع نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق عمروں سے شیعہ مسلک سے ہونے کی وجہ سے خانوادہ اہل بیت سے عقیدت کی نسبت انہی کے نام رکھنے کا رجحان زیادہ ہے۔ لیکن کچھ ایسے نام ہیں جو ہزاروں میں زیادہ رائج ہیں جیسے مردوں میں عیوض، قربان، خادم، عبدالحسین، عبدالحسن، عبدالرحیم، جمعہ، صفدر، رمضان، صفر، برکت، عاشق، نادر، امین، نوروز، صادق، ظاہر، قلبی، زوار، قنبر اور ان کے علاوہ دوسرے رائج ناموں میں محمد علی، محمد حسن، محمد حسین، محمد خان، عبداللہ، اسحاق، حسین علی، غلام علی، رضا، تقی، نقی، باقر، حسین، حسن، سلمان، کاظم، شبیر، عباس، اصغر، اکبر، محسن، لیکن آج کل نئے رجحانات کے تحت عرف عام ہیں جدید نام جیسے نوید، اشرف، جاوید، عابد، شاہد، ساجد، جیسے ناموں کا رجحان ہے لیکن نئی نسل میں میثم، کمیل، عمار، جیسے اسلامی ناموں کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔ جبکہ قندھاری برادری میں اگر ذرا پیچھے جھانکا جائے تو وہاں پشتون کلچر کے نام زیادہ ملیں گے لیکن یہاں بھی وہی تشیع کی مناسبت سے خانوادہ اہل بیت کے نام اور آج کل کے حوالے سے عرف عام میں وہی جدید نام نظر آئیں گے ان کے ہاں گل محمد، قدرت اللہ، جان محمد، بسم اللہ، غلام رسول، زلمئے، بریالے، عبدالرحیم، عبدالکریم، وغیرہ رائج نام ہیں ان کے علاوہ مسلک کے حوالے سے علی، محمد، حسن، حسین، رضا وغیرہ سے منسوب مرکب ناموں کا رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن اب ان کے ناموں میں جدیدیت کے خیال سے تنوع نظر آئے گا جہاں عامر، یاسر، ساجد وغیرہ جیسے نام ملیں گے۔

خواتین میں بھی دونوں قبیلوں میں زیادہ تر وہی خانوادہ اہل بیت سے متعلق نام ملیں گے جیسے فاطمہ، زہرا، خدیجہ، کبریٰ، صغریٰ، سکینہ، رقیہ، فضہ، وغیرہ ان کے علاوہ مریم، سلمیٰ، سارہ، صالحہ، مہ لقا، ثریا، آمنہ، شازیہ، گل جمعہ، حمیدہ، فیروزہ، شائستہ، کلثوم (جس کو گلثوم تلفظ کیا جاتا ہے) شہلا، منیجہ (جس کا اصل منیرہ ہے) حسینہ، یاقوت، زمرد، جیسے نام رائج ہیں۔ آج کل پاکستانی گلوکاروں اور فلموں کے زیر اثر (زیادہ تر قندھاریوں میں) اداکاراؤں اور کرداروں کے ناموں کا رجحان ملتا ہے جیسے فرح ناز، مدیحہ، سویرا وغیرہ کا رجحان عام ہو چکا ہے۔

شادی، بیاہ کی رسمیں: ہر قبیلے کی طرح ان قبیلوں میں بھی شادی کی کچھ مخصوص رسمیں ہیں اور کچھ ایسی جو دوسرے (خصوصاً پشتون) قبائل سے اشتراک رکھتی ہیں۔ قندھاریوں میں عام طور پر جلدی شادی کروانے کا رجحان ہے یعنی لڑکا اٹھارہ کا ہو جائے اور لڑکی سولہ سے گزرے تو ان کی شادی کی فکر ان کے والدین کو لاحق ہوتی ہے۔ جبکہ یہی صورتحال ہزارہ قبیلہ میں بھی نظر آتی ہے لیکن نسبتاً کم۔ اگرچہ آج کل کے حالات کی مناسبت سے تعلیم و روزگار کی مشکلات کے سبب عموماً دیر ہو جاتی ہے اور ترجیحاً اپنے خاندان سے لڑکوں اور لڑکیوں کی تلاش کی جاتی ہے۔ لیکن اب لکھے پڑھے

افراد میں کزن میرج کے طبی نقصانات کی وجہ سے احتیاط کی جارہی ہے۔ان قبیلوں میں بھی کئی دیگر قبیلوں کی طرح لڑکے اور لڑکی (بالخصوص لڑکیوں) کو ان کے رشتے کے معاملات میں شامل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ والدین اور خاندان کے بزرگ فیصلہ کرتے ہیں۔ بہرحال اب حالات کچھ مختلف ہیں۔عمومی طور پر خواتین ہی لڑکی تلاش کرتی ہیں بلکہ کچھ پیشہ ور خواتین بھی ہیں جنہیں ہم چلتا پھرتا میرج بیورو کہہ سکتے ہیں۔

لڑکی کی تلاش کے بعد اس کے خاندان کو کسی کے ذریعے سے رشتے کا پیغام بھجوایا جاتا ہے۔وہ صلاح مشورے کی مہلت مانگتے ہیں اور پھر مثبت رائے بننے کے بعد لڑکے والوں کو خبر کی جاتی ہے کہ وہ آئیں۔اس طرح یہ سلسلہ چل نکلتا ہے اور سب سے پہلے لڑکے والوں کی جانب سے چند بزرگ خواتین چلی جاتی ہیں اور وہ باقاعدہ معاملات کرکے آجاتی ہیں جن میں دیگر اشیاء کے علاوہ حق مہر اور زیورات سرفہرست ہیں اور یہ خواتین لڑکی کے گھر سے باقاعدہ مٹھائی بھی لے آتی ہیں۔جس کو شیرینی کہتے ہیں۔اس عمل کو خواستگاری کہتے ہیں۔اب خواستگاری کا دوسرا مرحلہ آجاتا ہے۔اس میں چند روز بعد لڑکے والوں کے گھر کے مرد، رشتہ لینے چلے جاتے ہیں۔کہیں جب لڑکی والے لڑکے کے گھر کے حوالے سے معلومات نہ رکھتے ہوں تو ان کی خواتین کے بعد مردوں سے پہلے لڑکی کے گھر سے بھی خواتین لڑکے کے گھر آجاتی ہیں تاکہ ان کے رہن سہن کے معیار کا اندازہ لگالیں اور کبھی کبھار لڑکے کو دیکھنے کا مطالبہ بھی کیا جاتا ہے۔ویسے لڑکے کی تصویر پر ہی اکتفا کی جاتی ہے۔لڑکے والے جاتے ہیں تو باوجود شرکائے محفل کی معاملے سے آگاہی کے، بزرگ ترین شخصیت ایک رسمی انداز میں بات کا آغاز کرتا ہے اور رشتہ مانگتے ہوئے لڑکی کے والد یا بزرگ کو کہتا ہے کہ ''ہم اپنے بیٹے کو آپ کی فرزندی/غلامی میں پیش کرنے کیلئے آئے ہیں'' اس کے ساتھ اسکے کچھ اوصاف بھی بیان کردیتا ہے اس کے بعد گفت و شنید کا سلسلہ جاری ہوتا ہے اور جہیز وغیرہ کے معاملات کو باقاعدہ طور پر زیر بحث لاکر ایک نتیجے پر پہنچا جاتا ہے۔اس کے بعد ایک بڑے سے طشت میں شیرینی لائی جاتی ہے جس میں چاکلیٹ کے علاوہ نقل وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔وہ تمام شرکائے محفل میں بانٹی جاتی ہے۔اور بقیہ لڑکے والوں کے حوالے کی جاتی ہے جسے وہ اپنے ساتھ گھر لاتے ہیں اور پھر قریبی رشتہ داروں میں بانٹتے ہیں۔

اس کے بعد دونوں خاندانوں میں رابطہ قائم ہوجاتا ہے اور وہ مزید معاملات کی تاریخیں وغیرہ خود طے کرتے ہیں۔لیکن یہاں رشتہ مانگنے (خواستگاری) کے وقت جو شرائط طے پاتی ہیں۔ان کا اجمالی ذکر کرتے چلیں گے۔

حق مہر: حق مہر میں عموماً نقد رقم رکھی جاتی ہے جو تقریباً ''عندہ طلب'' ہوتی ہے یعنی جب دلہن چاہے گی یہ حق مانگ لے گی لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بیوی نے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے حق مہر کی رقم طلب کی ہو۔اس کے علاوہ سونا بھی رکھا جاتا ہے۔آج کل رائج حق مہر تقریباً دو سے پانچ لاکھ ہے۔شاذونادر اس سے زیادہ یا پھر کم ہوجاتا ہے۔

طلا: طلا وہی سونا ہے، جس میں زیورات شامل ہوتے ہیں۔یہ معاملہ خواتین کے درمیان طے پاتا ہے کہ لڑکے والے لڑکی کو کتنا زیور دیں گے بلکہ منگنی میں کتنا دیں گے اور شادی کے لیے کتنا ہوگا؟ یہ سارے معاملات بڑے بحث ومباحثوں کے بعد طے پاتے ہیں جس میں باقاعدہ ''چنہ بازی'' کی رسہ کشی ہوتی ہے۔ان زیورات کی پسندیدگی کے لیے لڑکی والی خواتین بھی ساتھ چلتی ہیں۔بلکہ اب تو کہیں کہیں لڑکی خود بھی چل کر زیورات اور کپڑے وغیرہ پسند کرتی ہے۔

دلہن کا سامان: دلہن کے لباس میں اس کے کپڑے، جوتے اور آرائش کا سامان وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔یہ بھی لڑکی والوں کے ساتھ پہلے سے طے کیا جاتا ہے کہ وہ لڑکی کو کتنے جوڑے اور کس قسم کے جوڑے، کتنے جوتے اور کتنا آرائش کا سامان مہیا کریں گے۔ان اشیاء کے انتخاب میں بھی عموماً لڑکی اور لڑکے اکھٹے بازار جاتے ہیں۔جہاں دونوں گروہوں کے درمیان مسائل قابل دید ہوتے ہیں یعنی لڑکے والے سستے میں جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ لڑکی والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ خوب سے خوب اور مہنگی سے مہنگی اشیاء خرید کرلائیں۔بہرحال معاملات کا انحصار عموماً دونوں خاندانوں کی معاشی حالت، باہمی تعلقات اور خلوص پر ہوتا ہے۔

خلعتی: یہ وہ لباس ہے جو لڑکی والوں کی جانب سے لڑکے والوں پر عائد ہوتا ہے۔اس کا انحصار لڑکی کے خاندان پر ہوتا ہے کہ وہ بڑا ہے یا چھوٹا۔یعنی لڑکی والے اپنے قریبی رشتہ داروں (خصوصاً خواتین) کی تعداد کے مطابق لڑکے والوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اتنے سوٹ چاہیے ہیں۔اس میں زنانہ لباس شامل ہوتا ہے اور کہیں کہیں مردانہ سوٹ بھی ہوتا ہے۔اس معاملے میں اچھے خاصے مباحثے ہوتے ہیں۔لڑکی والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ لباس زیادہ اور معیاری ہوں کیونکہ وہ یہ سوٹ خاندان کے افراد میں بانٹتے ہیں۔جو ان کی ناک کا مسئلہ بن سکتے ہیں۔یہ لباس خریدنے کی غرض سے بھی اکثر لڑکی والی خواتین ساتھ چلتی ہیں۔

سراوجاغی یا گلہ: ''اوجاق'' دراصل چولہے کو کہتے ہیں جو عمومی طور پر ''اوجاغ''

تلفظ ہوتا ہے "اوجاق" ان قبائل میں بڑی اہمیت اور تقدس کے قابل جگہ ہے جس کے ریشے شاید زرتشتی آئین میں آگ کے تقدس سے ملتے ہوں۔ بلکہ یہ ایک اصطلاح ہے۔ کسی خاندان کی عزت کی علامت ہے جس کی وجہ تسمیہ شاید ہانڈی پکنے کی جگہ یعنی رزق کی علامت یا پھر آگ کے تقدس کا کوئی حوالہ قدیم ادیان جیسے "زرتشت" آئین سے تعلق رکھتا ہو۔ بہرحال یہ رسم تقریباً ہزارہ برادری میں رائج ہے۔ سراوجاغی پشتونوں کے "ولور" کی طرح ایک رقم ہے۔ یعنی لڑکے والے لڑکی والوں کو شادی کے اخراجات کی غرض سے ایک مخصوص رقم پیش کرتے ہیں جس کو "سراوجاغی" کہتے ہیں۔ یہ رقم اگرچہ بظاہر کمک کی رضاکارانہ رقم ہے لیکن اب اس کو بھی پہلے سے طے کرتے ہیں کہ آپ نے اتنی رقم سراوچاغی میں ادا کرنی ہوگی۔ یہ معاملہ بھی کبھی بحث ومباحثے کی شکل اختیار کرتا ہے۔

تاریخ طے کرنا: منگنی یا شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے دونوں خاندان کے مسائل کو مدنظر رکھنے کے علاوہ ایام کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی باقاعدہ سعد ونحس ایام کو دیکھا جاتا ہے۔ اور زیادہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسلامی حوالے سے کسی مبارک دن کا انتخاب کیا جائے، بالخصوص خانوادہ اہل بیت سے متعلق خوشی کے ایام کو چنا جاتا ہے۔ جیسے عید غدیر، عید مباہلہ، یا حضرت زہرا یا بارہ اماموں کا یوم ولادت وغیرہ۔

دو عیدوں کے درمیان نکاح: کچھ لوگ دو عیدوں یعنی عیدالاضحیٰ وعیدالفطر کے درمیان نکاح سے گریز کرتے ہیں۔ خیال ہے کہ اس دوران کے نکاح کو دوام حاصل نہیں ہوتا اور جلد جوڑے میں ناچاقی آجاتی ہے۔

نیولی: اس تقریب کے شرکاء کو بذریعہ کارڈ (آج کل زیادہ تر) یا زبانی خبر کی جاتی ہے۔ چند سال قبل تک ایک بہت اچھی رسم تھی جواب تقریباً نابود ہے۔ اس کو "نیولی" کہتے ہیں۔ یعنی لڑکے والوں کی طرف سے ایک نسبتاً درمیانی عمر کی خاتون کے ساتھ چند لڑکیاں نکل جاتیں اور شرکاء کی فہرست لے کر ہر ہر گھر میں الگ الگ بتانے چلی جاتیں۔ وہ گھر والے ان کو کچھ کھلانے پلانے کے ساتھ ایک معمولی سی رقم بھی دے دیتے، یعنی بیس، پچاس روپے۔ یہ رقم یہ لڑکیاں اکٹھا کرتیں اور آخر میں آپس میں بانٹتیں۔ نیولی ایک ایسا سلسلہ تھا جس میں شرکت کی ہر لڑکی کو خواہش ہوتی۔ کیونکہ گھر گھر جاکر عزت اور کھانے پینے کو ملنے کے علاوہ نقدی بھی مل جاتی ہے۔ جبکہ کچھ خواتین اس کام میں شہرت حاصل کر جاتیں اور وہ اپنوں غیروں تمام کی ٹولیوں میں سربراہ گروہ کے طور پر شریک ہوتیں کیونکہ خبر سنانے کا بھی ایک خاص انداز ہوتا۔

شوینی خوری: اس کے بعد کا معاملہ "شرینی خوری" یعنی منگنی ہے جس کی تاریخ دونوں خاندانوں میں طے پاتی ہے اور پھر دیگر قبائل کی طرح ایک پروگرام ترتیب دے کر عزیز واقارب کو دعوت دی جاتی ہے۔ اس تقریب کے مہمانوں کی تعداد کا انحصار طرفین کی مالی حالت اور روابط پر ہوتا ہے۔ جبکہ شیرینی خوری چائے وغیرہ پر بھی انجام پاتی ہے اور لڑکے والوں کی توفیق یا لڑکی والوں کے مطالبے پر کھانا بھی کھلایا جاتا ہے۔ اس تقریب کے تمام اخراجات لڑکے والوں کے ذمے ہوتے ہیں۔

اس تقریب میں انگوٹھی پہنانے کی رسم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں لڑکے کو گھڑی بھی پہنائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ اس دوران نکاح بھی کر لیتے ہیں۔ اس تقریب کے مدعوین میں مرد، خواتین اور بچے سب شامل ہوتے ہیں۔ یہ تقریب لڑکی کے گھر میں انجام پاتی ہے۔

اگر نکاح بھی منگنی کے دوران ہی ہو تو کھانا تقریباً لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ جس میں لڑکی سفید لباس پہنتی ہے اور لڑکی کا لباس وغیرہ لڑکے والوں کے ذمے جبکہ لڑکے کا لباس لڑکی والوں کے ذمے ہوتا ہے جس میں کسی مولوی یا نکاح خوان کو بلا کر اس سے نکاح پڑھوایا جاتا ہے۔ نکاح کا خطبہ پڑھتے وقت محفل کے تمام شرکاء کو دونوں ہاتھ کھلے رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے جو نیک شگونی کے زمرے میں آتا ہے۔ نکاح میں لڑکی اور لڑکا اکٹھے نہیں ہوتے بلکہ مولوی پہلے لڑکے سے اور اس کے بعد لڑکی کے کسی بزرگ کے ساتھ خواتین کے حصے میں جاکر لڑکی سے نکاح کی قبولیت کا اقرار لیتا ہے۔ مولوی کو تقریب کے بعد ایک رومال میں کچھ شیرینی یعنی نقل اور چاکلیٹ وغیرہ کے ساتھ کچھ پیسے بھی دیئے جاتے ہیں۔

رخت بُرانی: شیرینی خوری کے روز ایک رسم اور بھی ہے جس کو "رخت برانی" کہتے ہیں۔ "رخت" یعنی "لباس" برانی شاید مصدر "بریدن" یعنی کاٹنے سے لیا گیا ہے۔ جس میں لڑکی کے لیے لڑکے والوں کی جانب سے دیئے گئے کپڑوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ یعنی اصطلاحاً دلہن کے لئے کاٹے گئے کپڑوں کی نمائش یا اس اصطلاح کو "برانی" کے حوالے سے "بیرون کردن" کے مفہوم میں بھی لیا جاسکتا ہے کہ کپڑوں کا باہر لانا، یعنی نمائش کروانا۔ بہرحال جو بھی ہو، یہ رسم آج کل تقریباً مفقود ہے۔

منگنی کی اس رسم میں بلند آواز سے موسیقی بجائی جاتی ہے جس میں شوخ فارسی، پشتو اور فلمی گیتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات خواتین "دریہ" بجاتی اور ناچتی گاتی ہیں۔ وہ گیت، شادی بیاہ سے متعلق ہوتے ہیں جبکہ کہیں کہیں مرد بھی ڈھول کی تاپ پر رقص کرتے ہیں۔

شال: یہ ایک بڑی چادر ہوتی ہے جسے منگنی کے روز لڑکے کا والد یا کوئی بزرگ

لڑکے کے سر پر ڈالتا ہے۔ یہ شال عموماً سبز رنگ کا ہوتا ہے جبکہ منگنی کا لباس بھی سبز ہوا کرتا ہے۔ لیکن اب میڈیا کے اثر نے اس روایت کا رنگ تبدیل کر دیا ہے۔ اب دلہن اپنی مرضی سے کسی بھی رنگ کا لباس پہن لیتی ہے۔ حتیٰ اب اس شال کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ اگرچہ شال ڈالنے کے پیچھے ایک روایت اور قدر پوشیدہ ہے۔ یعنی یہ اس بات کی علامت ہے کہ اب یہ لڑکی شال ڈالنے والوں کے گھر کی عزت ہے کیونکہ شال یا چادر مجموعی طور پر عورت کیلئے احترام اور عزت کی علامت ہے۔

دلہن کی عیدی: دلہن دونوں عیدوں کے موقع کے علاوہ نوروز کی مناسبت سے نوروزی، شب برات کی مناسبت سے براتی، لے جائی جاتی ہے جس میں جوڑہ، مٹھایاں اور پھل وغیرہ کے علاوہ کبھی کبھار نقدی شامل ہوتی ہے۔ اس طرح رمضان کے مہینے میں افطاری کا اہتمام بھی کر کے دولہا کے گھر سے دلہن کے گھر لے جاتی ہے۔

یاد بودی: مندرجہ بالا مواقعوں کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں بالخصوص بہار کے ایام میں بھی دلہن کے لیے جوڑہ وغیرہ لے جاتے ہیں۔ حتیٰ محرم الحرام کے ایام میں دلہن کے لیے محرمی کے عنوان سے سبز جوڑہ بھی لے جایا جاتا ہے یہی رسمیں بعض میں دلہن والوں کی طرف سے دولہا کے لیے بھی نبھائی جاتی ہے۔ لیکن اس کا رجحان پہلے کے مقابلے میں کم ہے۔

شادی: منگنی کے بعد شادی کے لیے کوئی معینہ مدت نہیں ہوتی۔ زود یا بدیر، یہ رسم دونوں خاندانوں کے معاملات کی روشنی میں طے پاتی ہے۔ شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے عموماً لڑکی والوں کے گھر جانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد مرحلہ وار چند رسمیں طے پاتی ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:

جہیز لے جانا: لڑکی کے لیے لڑکے والوں کی جانب سے جو جہیز وغیرہ خریدا گیا ہوتا ہے وہ بھی ایک اہتمام کے ساتھ اس کے گھر لے جاتے ہیں۔ یہ کام خواتین انجام دیتی ہیں، جس میں دونوں جانب سے خواتین شریک ہوتی ہیں اور ایک جشن کا سماں باندھا جاتا ہے۔ اس تقریب میں بھی کھانے پینے کے اہتمام کے علاوہ دف بجانے گانے اور ناچنے کا سلسلہ ہوتا ہے۔ جہیز کو جہیزی یا جہازی کہتے ہیں لیکن اس میں صرف کپڑے زیور اور دیگر اشیائے ضرورت شامل ہوتی ہیں۔

لباس داماد: جس کو ہزارے "کالائے داماذ" کہتے ہیں۔ یہ شادی کے لیے لڑکے کی پوشاک کے لوازمات پر مشتمل ہے یعنی جس طرح لڑکی کے لیے چھوٹے سے بڑا لباس یعنی جوراب اور رومال وغیرہ تک لڑکے والوں کے ذمہ ہے اسی طرح لڑکے کا تمام لباس یعنی ازار بند سے لے کر کوٹ وغیرہ تک تمام لڑکی والوں کی جانب سے ہے۔ اس میں دولہا، جسے داماد کہتے ہیں، اس کے لئے عموماً سفید رنگ کی شلوار قمیض لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ واسکٹ یا کوٹ وغیرہ بھی ہوتا ہے جبکہ آج کل تھری پیس کا رواج بھی چل نکلا ہے۔ اس کے علاوہ جوتے بھی لڑکی والے ہی دولہا کو دے دیتے ہیں لیکن اکثر یہ لباس دولہا دلہن ہی کے گھر میں جا کر پہنتا ہے یعنی دولہا اپنے گھر سے بھی نیا سفید جوڑا پہن کر جاتا ہے لیکن دلہن کے گھر پہنچ کر لباس بدل دیتا ہے۔ اور ان کی جانب سے تیار شدہ لباس پہن لیتا ہے۔

حنا بندان: وہی رسم حنا ہے جو شادی سے ایک رات قبل منائی جاتی ہے۔ اس میں لڑکے کے گھر اس کے رشتہ دار اکھٹے ہو جاتے ہیں جہاں طشتریوں میں مہندی سجائی جاتی ہے۔ اس پر شمعیں روشن کی جاتی ہیں اور چاندی کے ورق اور "نقل" سجا کر لڑکیاں سروں پر رکھ لیتی ہیں اور پھر یہ سب لوگ گاتے بجاتے دلہن کے گھر پہنچ جاتی ہیں۔ وہاں لڑکی والیاں بھی موجود ہوتی ہیں اور نئے سرے سے ایک جشن برپا ہوتا ہے۔ جس میں دونوں فریق ایک دوسرے کے جواب میں شادی بیاہ کے گیت گاتی ہیں۔ لیکن اب اردو اور فلمی گیتوں پر بیشتر انحصار کیا جاتا ہے۔ یہ بہت ہی پر رونق محفل ہوتی ہے۔ رات گئے تک ناچ گانے کی محفل جاری رہتی ہے اور دلہن کے ہاتھ پاؤں مہندی سے رنگے جاتے ہیں۔ اس رات بھی کھانے اور مشروبات وغیرہ کے تمام اخراجات لڑکے کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ لڑکے والوں کے ساتھ لڑکا یعنی دولہا بھی شریک ہوتا ہے جب وہ دلہن کے گھر کے دروازے پر پہنچتے ہیں تو دلہن والے گھر کا دروازہ بند کر کے دولہا سے رقم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس طرح ایک طویل بحث و مباحثہ چل نکلتا ہے جس میں کبھی کبھار دروازے کے باہر دولہا والوں کو طویل انتظار بھی کرنا پڑتا ہے اور کچھ بے حوصلہ لوگ تو ناراض تک ہو جاتے ہیں۔ واپس لوٹنے کی دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں۔ تقریباً پانچ چھ ہزار روپوں سے دس ہزار تک کا مطالبہ ہوتا ہے۔ جس پر چانہ بازی ہوتی رہتی ہے۔ ہزارہ قبیلہ کی عورتیں دریہ کے ساتھ یہ گیت گاتی ہیں۔

شال میدوم شملہ میدوم
دختر سربستہ میدوم
درگے بیری را واز کو

ترجمہ: شال (چادر) دوں گی، پگڑی دوں گی، باحیا باکرہ لڑکی دوں گی دلہن کا دروازہ کھول دو۔

اس دوران اندر سے دولہا والوں پر پانی وغیرہ بھی پھینکتے ہیں۔ چونکہ رات ہوتی ہے تو کوئی باہر کی بتی بجھا تا ہے۔ باہر والے گھنٹی بجا بجا کر ان کی ناک میں

دم کردیتے ہیں۔ بالآخر بڑوں کے بیچ بچاؤ کے بعد کسی رقم پر متفق ہو جاتے ہیں اور جب تک دروازے کے کسی گوشے سے رقم اندر نہ پہنچے، دروازہ نہیں کھلتا۔

رسم حنا بڑی بھرپور رسم ہوتی ہے۔ اس میں دولہا پہنچتا ہے تو بڑی تسلی کے بعد دلہن کو بھی لایا جاتا ہے اور ان کے لئے زمین پر گدے بچھائے گئے ہوتے ہیں جس پر انہیں پہلو بہ پہلو بٹھاتے ہیں۔ (یاد رہے کہ اس سے قبل اگر منگنی کے وقت نکاح نہ ہوا تو اسی روز شام کو یا ایک روز پہلے نکاح کر چکتے ہیں) دلہن کو لاتے ہوئے اس کے خاندان کی خواتین اس کے لئے مختلف گیت گاتی ہیں مثلاً یہ گیت کہ

آہستہ برو شاہ زنان آہستہ برو

جبکہ دولہن کے قریب دلہا کو لاتے وقت یہی گیت ذرا بدل کر لڑکے والیاں گاتی ہیں کہ

پس شید کہ داماد آمد

یہاں مثال کے طور پر ایک آدھ شادی کے گیت ملاحظہ ہوں جو ابتدائی جملوں کے بعد دولہا، دولہن دونوں کے لیے خواتین گاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

آہستہ برو شاہ زنان آہستہ برو
آہستہ برو ماہ تابان آہستہ برو

=

جانانہء من قدت بہ گل می ماند
راہ رفت داغی بہ دل می ماند
ہر کس کہ بہ بالین تو سر می ماند
با نازو کرشمدی در می ماند

=

بیا برویم ازین ولایت من و تو
تو دست من بگیر من دامن تو
جائی بریم کہ ہر دو بیمار شویم
تو از غم بے کسی و من ا زغم تو

ترجمہ:

آہستہ چلو خواتین کی ملکہ آہستہ چلو
آہستہ چلو روشن چاند آہستہ چلو

=

میری جان تیرا قد پھولوں سے مشابہ ہے
تیرا خرام دل پر داغ رکھتا ہے
ہر وہ جو تیرے سرہانے سوئے گا
وہ تیرے ناز اور کرشموں سے تعجب میں پڑے گا

=

آؤ کہ میں او رتم اس وطن سے چلے جائیں
تم میرا ہاتھ تھامو او رمیں تیرا دامن پکڑ لوں گا
ایسی جگہ جائیں جہاں دونوں بیمار پڑھ جائیں
تو بے کسی کے غم سے اور میں تیرے غم سے

دولہا کے اس جملے کے ساتھ استقبال کرتے ہیں کہ:

پس شید کہ داماد آماد
قربان جان داماد
پس شید کہ داماد آمد
دسمال بہ جیب داماد
پس شید کہ داماد آمد

ترجمہ:

ھٹو (راستہ دو) کہ دولہا آ گیا
دولہا کے قربان جاؤں
ھٹو (راستہ دو) کہ دولہا آ گیا
دولہا کے جیب میں رومال ہے
ھٹو (راستہ دو) کہ دولہا آ گیا

ایک آدھ بند اور بھی ملاحظہ ہو۔

جانانہ ء من بیا بامن یاری کن
مارا می برد تو گریہ و زاری کن
ما رامی برند از شہر شما می فروشند
گر زر داری بندہ خریداری کن

=

در باغ شما گل سفیدی دیدم
رفتم بکنم از باغبان ترسیدم
نرمک نرمک ز باغبان پرسیدم

گفت گرد سرت باغ را بہ تو بخشیدم

=

خواہران و برادران مرا یاد کنید
تابوت مرا ز چوب شمشاد کنید
تابوت مرا قدم قدم بردارید
با خاک سیاہ بالین و فریاد کنید

ترجمہ:

میری جان آؤ اور مجھ سے محبت کرو
مجھے لے جاتے ہیں تو گریہ و زاری کر
مجھے آپ کے شہر سے بیچنے کو لے جاتے ہیں
اگر زر دار ہو تو بندہ (غلام) خرید لو

=

آپ کے باغ میں، میں نے سفید پھول دیکھا
توڑنے کے لیے بڑھا/بڑھی تو باغبان لیس ڈر لگا
آہستہ اور دھیمے باغبان سے پوچھا
اس نے کہا تیرے صدقے باغ تیرے نثار

=

بہنو، بھائیو! مجھے یاد رکھنا
میرے تابوت کو شمشاد کی لکڑی سے بنانا
میرے تابوت کو قدم قدم رکھ کر اٹھانا
سیاہ مٹی میں دفن کر کے فریاد کرنا

اس کے بعد دونوں کو برابر کھڑا کیا جاتا ہے اور انہیں بیٹھنے کو کہا جاتا ہے۔ لیکن دونوں فریق کی خواتین زور دیتی ہیں کہ ان کا بندہ نہ بیٹھے یعنی دلہن چاہتے ہیں کہ دولہا اول بیٹھے اور دولہا والے چاہتے ہیں کہ دلہن۔ اس کے بارے میں خیال ہے کہ جو پہلے بیٹھے گا یا بیٹھے گی وہ کمزور ثابت ہوگا یا ہوگی۔ بہر حال اس معاملے میں بھی بڑا وقت لگتا ہے۔ آدھا جھک کر دوبارہ ایک کھڑا ہو جاتا ہے تو دوسرا بھی یہ عمل انجام دیتا ہے۔ جبکہ حمایتوں کی طرف سے چیخ، پکار کے ساتھ مخالف سمت کے کاندھوں پر بوجھ بھی ڈالا جاتا ہے کہ وہ بیٹھے۔ اس طرح کرتے کرتے تقریباً ایک ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی پہلے بیٹھ جاتا ہے جس پر دوسرا فریق پر زور تالیاں بجا کر فتح کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد دولہا کو دلہن کی بائیں سمت بٹھایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے کنوارے دوستوں کو بٹھایا جاتا ہے اور دلہن والوں کی دو تین خواتین مہندی کا طشت لے کر آجاتی ہیں اور اس کے ساتھ خوبصورت کپڑے کی بنی ہوئی پٹیاں جن کو ''حنا بند'' کہتے ہیں، بھی لاتی ہیں۔ کچھ لوگ آسانی کیلئے رومال لاتے ہیں۔ یہ خواتین دولہا کے ہاتھ پر مہندی لگاتی ہیں اور دولہا انہیں رقم دے دیتا ہے۔ لیکن یہ رقم وہ آسانی سے نہیں دیتا بلکہ اس کو اپنی مٹھی میں مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہے۔ وہ خواتین وہ رقم اس کی مٹھی سے زور لگا کر نکالتی ہیں اور پھر مہندی لگاتی ہیں۔ عموماً ہزار روپے ہوتے ہیں یا اس سے زیادہ۔ پھر یہی عمل اس کے دوستوں کے ساتھ دہرایا جاتا ہے۔ وہ بھی مہندی لگوا کر کچھ رقم سو دو سو روپے سے پانچ سو روپے تک دیتے ہیں لیکن اس دوران وہ شغل کرنے کے لیے کبھی ہاتھ میں کوئی سکہ رکھتے ہیں۔ کبھی جعلی نوٹ (کہیں سے ڈھونڈ کر اس موقع کے لیے لاتے ہیں) دیتے ہیں۔ یہ مہندی ان کی ہتھیلی اور چھوٹی انگلی پر لگائی جاتی ہے، جس کو شادی ہونے کا شگون سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار بہت قریبی شادی شدہ بھی اس صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح نوجوان دوست دولہا کے قمیض کے بٹن بھی کھول دیتے ہیں اور یہ بھی شادی کی راہ کھلنے کی ایک رسم ہے۔ اس کے بعد ناچ گانا چلتا ہے۔ خواتین گاتی ہیں۔ ان گیتوں میں شادی بیاہ کے گیت ہوتے ہیں۔ ہزارے خواتین وہی فارسی اور اردو گیت گاتی ہیں لیکن قندھاری پشتو کے گیت بھی گاتی ہیں ان گیتوں کے کچھ بندوں کا یہاں ذکر کر چکے۔

حمام: یہ بھی شادی کی ایک رسم ہے جو کہ نکاح اور مہندی کی رات سے پہلے دن کو نبھائی جاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہر گھر میں حمام نہیں ہوتے تھے اور قدیم فارسی کلچر میں مشترکہ حمام اور مردانہ اور زنانہ کا رواج تھا تو دلہن کو بھی حمام لے جاتے تھے۔ ویسے اب تک یہ حمام موجود ہیں۔ کوئٹہ میں بھی مردانہ اور زنانہ دونوں قسم کے حمام موجود ہیں۔ اس سلسلے میں دلہن، خاندان کی چند خواتین کے ساتھ حمام بھیجی جاتی ہے اور حمام کا سارا خرچہ دولہا کے ذمے ہوتا ہے۔ دلہن کے حمام کے کپڑے الگ ہوتے ہیں اور اسے خواتین حمام لے جا کر اچھی طرح نہلاتی ہیں جبکہ پانی کے علاوہ دودھ سے بھی نہلایا جاتا ہے لیکن اس پانی کو نالی میں بہنے نہیں دیتے بلکہ دلہن کے پیروں کے نیچے ٹب رکھ کر نہلاتی ہیں۔ اس کے علاوہ دلہن کے حمام کے لوازمات جسے، رشوہ، لیف، کیسہ سب مہیا کئے جاتے ہیں اور پھر ''نان حمام'' کی اصطلاح سے دوپہر کا کھانا بھی دولہا کے گھر سے دلہن اور ان خواتین کے لیے جاتا ہے۔ یہ رشوہ، کیسہ اور لیف فارسی ثقافت میں عام طور پر بھی حمام یا غسل خانے کی لوازمات لازم ہیں۔

لیف: یہ ایک قسم کا ہتھیلی کے برابر تھیلا ہوتا ہے جسے ''کریشہ'' سے بنایا جاتا ہے اور اس کو صابن لگا کر بدن کا میل صاف کیا جاتا ہے۔

کیسہ: یہ بھی ایک قسم کا درشت اور کھردرا کپڑا ہوتا ہے جو کبھی کبھار میل کی زیادتی ہونے کی صورت میں بدن پر رگڑا جاتا ہے لیکن اس کو صابن نہیں لگاتے کیونکہ اس طرح اس کا کھردرا پن ختم ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی ایک ڈیڑھ فٹ لمبا اور تین چار انچ چوڑا ہوتا ہے۔

رشوہ: یہ ایک خاص قسم کی مٹی ہے جس کے چھوٹے چھوٹے گولے بنائے جاتے ہیں۔ اس مٹی کو بدن پر مل کر ہر قسم کی میل کو صاف کیا جا سکتا ہے۔ اس کا استعمال بھی کبھی کبھار ہوتا ہے۔

ان اشیاء کا استعمال یا یہ رسم نسبتاً قندھاریوں میں مقبول ہے۔ اور آج کل گھروں میں ہر سہولت ہونے کے باوجود اس کو کچھ لوگ بطور رسم مناتے ہیں۔

نخہ وابرو: یہ لفظ 'نخ'' سے لیا گیا ہے جس کے معنی دھاگے کے ہیں۔ یعنی خواتین دلہن کے چہرے کے بالوں کو دھاگے سے ایک خاص مہارت سے صاف کرتے ہیں جو آج کل تھریڈنگ (Threading) کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بھنوؤں کو بھی سنوارا جاتا ہے۔ کیونکہ رسماً شادی سے قبل بھنوؤں کو سنوارنے یا چہرے کے بال صاف کرنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اب ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اس کام کے لیے دلہن کو بڑے اہتمام سے گدے پر بٹھایا جاتا ہے اور کسی نسبتاً خوش بخت خاتون سے یہ کام کروایا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ بذات خود ایک شغل اور خوشی کا سماں باندھتا ہے۔

سہ بافی: یہ رسم اب تقریباً نہیں رہی۔ اس میں بھی دلہن کے لیے ایک اہتمام سے خواتین اکٹھی ہو جاتیں اور اس کے بالوں کی چھوٹی کی جاتی۔ جس کے لیے خاص قسم کی کنگھی خریدی جاتی جس میں نگ وغیرہ سجے ہوتے اور چاندی وغیرہ کا دستہ ہوتا۔ اس کے علاوہ مانگ نکالنے کے لیے الگ آلہ استعمال ہوتا۔ لیکن اب چونکہ دلہن بیوٹی پارلر جاتی ہے تو یہ باتیں بے وقعت ہو کر رہ گئی ہیں۔

بارات اور ولیمہ: شادی کے کلیدی اجزاء میں، جو تقریباً تمام قوموں اور قبائل میں موجود ہیں۔ یہاں بھی دن میں یا پھر رات کیلئے دعوت ولیمہ کا اہتمام ہوتا ہے اور شادی کی خبر دینے کے لیے بھی پہلے وہی ''نیوتی'' کا سلسلہ تھا لیکن اب کارڈ چھپتے ہیں۔ جو اکثر اردو زبان میں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی سے مرعوب یا مصنوعی جدت کے شکار لوگ انگریزی میں بھی چھاپتے ہیں جبکہ یہ کارڈ فارسی یا ہزارگی میں بھی نظر آتے ہیں بلکہ اب تو خوش آئند بات یہ ہے کہ اس طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

ولیمہ کا اہتمام دولہا کی جانب سے ہوتا ہے اور شادی کا اہتمام دولہا کے گھر یا محلے میں ہوتا ہے لیکن اب زیادہ تر شادی ہال استعمال کیا جاتا ہے۔

دلہن کو لینے بارات جاتی ہے تو رخصتی سے پہلے دلہن کا والد یا کوئی بزرگ اس کی کمر ایک چادر سے باندھتا ہے اور اس کے بعد اسے رخصت کرتے ہیں۔ جس کو دولہا کے گھر پہنچ کر اس کا کوئی بزرگ کھول دیتا ہے اور دلہن کو کچھ رقم پکڑاتا ہے۔ پہلے ولیمہ کا اہتمام بھی دلہن کے گھر کیا جاتا اور وہیں سے کھانے اور رخصتی کا عمل انجام پاتا۔ مگر اب دلہن کو سیدھا گھر لاتے ہیں اور پھر شادی ہال لے جاتے ہیں یا پھر پہلے شادی ہال اور وہاں سے تمام رسموں کی تکمیل کے بعد اسے گھر لایا جاتا ہے۔

دلہن کی آمد: دلہن کے ساتھ عموماً اس کی والدہ اور ایک آدھ قریبی رشتہ دار، دولہا کے گھر آتی ہیں اور گھر سے نکلتے ہوئے اسے قرآن کے نیچے سے گزارا جاتا ہے اور اس کے پیچھے پانی پھینکا جاتا ہے اور جب دولہا کے گھر پہنچتی ہے تو دروازے ہی پہ اس کے پاؤں کے آگے پانی کا گلاس یا برتن رکھتے ہیں جسے وہ لات مار کر گراتی ہے۔ پانی کو روشنی کی علامت اور نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے قدموں کے آگے دنبہ وغیرہ بھی بطور صدقہ ذبح کرتے ہیں اور اس کا تھوڑا سا خون دلہن کے پاؤں بلکہ جوتے پر لگاتے ہیں۔ اس کے بعد اسے گھر میں داخل کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سارے عمل کے دوران ہر مل سے اس کی اور دیگر شرکاء کی نظر اتاری جاتی ہے۔ گھر میں بیٹھنے کے بعد دلہن کے پاؤں دھونا بھی ایک شگون کہلاتا ہے۔ سو اس عمل کو بھی انجام دیتے ہیں۔ اس کے بعد آج کل کی لوازمات کے سبب اسے وہاں سے بیوٹی پارلر لے جاتے ہیں جہاں چند گھنٹوں کی کی مشقت سے اس کی آرائش ہوتی ہے اور وہاں سے اسے شادی ہال لایا جاتا ہے۔ وہاں بھی کبھی کبھار ایک آدھ رسم نبھائی جاتی ہے۔ لیکن اکثر گانے بجانے اور ناچنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ مرد ڈھول پر باہر رقص کرتے ہیں۔ عموماً وہی پشتو کا معروف رقص ''اتن'' کرتے ہیں۔

کھانے کے سلسلے کے بعد دلہا دلہن کے قریبی رشتہ دار دولہا کے گھر آجاتے ہیں اور وہاں پھر رسموں کا ایک سلسلہ چل نکلتا ہے لیکن ان تمام کے ساتھ گانے بجانے اور ناچنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ بالخصوص قندھاریوں میں اس پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے بلکہ کچھ تو باقاعدہ گانے بجانے والوں کو لاتے ہیں اور وہ رات بھر گاتے ہیں۔ کچھ صاحب ثروت تو ہفتہ بھر رتجگا کرتے ہین اور ان کی اصطلاح میں ''سازندوں'' کو بلاتے ہیں۔ دلہا دلہن کے لئے ایک خاص سٹیج سجاتے ہیں اور انہیں وہاں بٹھایا جاتا ہے۔ اگر سٹیج نہ ہو تو چند صوفے رکھتے ہیں تاکہ ان کے آس پاس عزیز و اقارب بیٹھ کر تصاویر اور ویڈیو کیمرے کی

آنکھ میں ان یادگار لمحوں میں خود کو محفوظ کرا سکیں۔ ان رسموں میں ایک آئینہ مصحف ہے۔

آئینہ مصحف: یہ بھی ایک مقبول رسم ہے آئینہ یعنی ''آئینہ'' اور ''مصحف'' یعنی قرآن۔ عام طور پر اس کا تلفظ آئینہ مصف ہوتا ہے۔ یعنی دونوں کے اوپر ایک چادر بچھائی جاتی ہے اور اس کے نیچے آئینہ اور قرآن لے آتے ہیں۔ دونوں اس آئینے میں چہرہ دیکھتے ہیں اور قرآن کے چند کلمات پڑھتے ہیں۔ قرآن برکت کی علامت ہے اور آئینہ سچائی اور صفا کی علامت ہے۔ یعنی آغاز ہی ان اہم نکات سے کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ شربت بھی لاتے ہیں اور دولہا دلہن ایک دوسرے کو اپنے ہاتھوں شربت پلاتے ہیں، ہزارہ رسم میں اس کے علاوہ چنگالی یا روٹی بھی رکھی جاتی تھی جسے دولہا دلہن ایک دوسرے کو کھلاتے تھے لیکن اب اس کی جگہ کیک نے لے لی ہے۔ کیک بھی رکھا جاتا ہے۔ جس کے ٹکڑے چمچوں میں لے کر دونوں ایک دوسرے کے منہ میں ٹھونستے ہیں۔ شربت خصوصاً مصری سے بنایا جاتا تھا جو زندگی میں شیرینی گھولنے کی علامت ہوتا تھا یا پھر چینی کا بنایا جاتا تھا۔ اب روح افزا وغیرہ سے بھی استفادہ کم ہوا۔ بس دو بوتل لے آتے ہیں یعنی کوکا کولا یہاں تک بھی سرایت کر چکا ہے۔

دلہن کا کمرہ: دولہا دلہن کے کمرے کو مصنوعی پھولوں سے سجایا جاتا ہے جبکہ سیج کے لیے تقریباً تازہ پھولوں کی لڑیوں اور پتیوں سے استفادہ ہوتا ہے۔ یہ کمرہ سامان سے مکمل طور پر بھرا ہوتا ہے۔ اور تمام تر سامان لڑکی والوں کی طرف سے آتا ہے۔ پلنگ، بستر سے لے کر سوئی دھاگے تک اس کا جہیز ہوتا ہے۔ اس کمرے کو لڑکی والے خود ہی ترتیب دیتے ہیں۔ تمام سامان ترتیب سے رکھتے ہیں اور چند خواتین ان کا بستر بچھاتی ہیں۔

سہاگ رات: یہ وہ معنوی رات ہے جس کے لیے یہ تمام اہتمام ہوتا ہے۔ تمام رسوم اور شغل کے بعد رات گئے انہیں کمرے میں جانے کی فرصت ملتی ہے۔ کمرہ میں پہنچ کر سب سے پہلے دونوں دو رکعت شکرانے کی نماز ادا کرتے ہیں۔ عموماً دولہا، دلہن کی چادر پر نماز پڑھتا ہے۔ اس کے بعد منہ دکھائی والا مرحلہ ہوتا ہے جس میں دولہا دلہن کو کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرتا ہے۔

سہاگ رات کی صبح ایک قبیح رسم کو بھی انجام دیا جاتا ہے یعنی ان کے بستر پر سفید رنگ کا کپڑا بھی رکھا جاتا ہے جس پر دلہن سے بہنے والا خون لگایا جاتا ہے جس کو صبح دلہن والے گھر کی خواتین دولہا کی خواتین کو دکھاتی ہیں جو لڑکی کے باکرہ پن کیلئے علامت یا دلیل ہوتا ہے۔ رات کو دولہا بستر کے نیچے کچھ رقم بھی رکھتا ہے جو اس بستر بچھانے والی خواتین کے لیے ہوتا ہے۔ صبح وہ بستر اٹھاتے ہوئے وہ رقم بھی اٹھا لیتی ہیں۔

ناشتائی: ناشتائی سے مراد وہی ناشتہ ہے جو قندھاری برادری میں زیادہ مقبول ہے۔ دلہن والے ایک بہت بڑی لکڑی کی طشتری کلچہ فروشوں سے کرائے پر لاتے ہیں جس میں ناشتے کی مختلف لوازمات کو سجایا جاتا ہے۔ جس میں بیکری کی چند قسمیں، جیسے کیک، پیسٹری، بسکٹ وغیرہ کے علاوہ انڈے کی کئی قسمیں اور خشک میوہ جات اور مربہ وغیرہ سجاتے ہیں اور دولہا کے قریبی رشتہ داروں کو بلایا جاتا ہے وہ تمام وہیں بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہیں اور چند روز میں دولہا والے اس طشتری کو لوٹاتے ہیں تو اس میں کچھ رقم یا پھر کپڑے وغیرہ رکھ کر چند خواتین کے توسط سے لوٹاتے ہیں۔

رسم دلدہ: شادی کے دوسرے دن دلہا کے گھر میں دونوں فریقوں کے رشتہ داروں کو دوپہر کے کھانے پر بلایا جاتا ہے اگرچہ ضروری نہیں کہ دلدہ ہی کھلائیں لیکن عنوان سے لگتا ہے کہ یہ دلدہ کھلانے کی ہی رسم تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں صرف شادی شدہ عورتوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ ہزارہ قبیلہ کی رسم ہے۔

گرداوجاغی: تیسرے روز دولہا اور دلہن کے لیے سوجی حلوا پکاتے ہیں جسے کمرے کے درمیان رکھ کر سبز پتے اور گندم لا کر رکھتے ہیں اور دعا پڑھتے ہوئے ایک دوسرے کو حلوہ کھلایا جاتا ہے اور پھر ان کے گرد تین چکر بھی لگاتے ہیں جسے نیک شگون تصویر کیا جاتا ہے سبز پتوں گودھری ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے اور گندم رزق میں اضافے کی علامت ہے۔

ہفتہ شوران: یہ دلہن کی ساتویں پر شکرانے کی نذر کی ایک رسم ہے جس میں دونوں فریق کی خواتین کو دعوت دی جاتی ہے۔ اس میں باقاعدہ شمعیں جلائی جاتی ہیں اور ''چنگالی'' کی نذر دی جاتی ہے اور دلہن کو باورچی خانے لے جایا جاتا ہے یعنی اس کے کام کا آغاز ہو جاتا ہے یا یوں کہ اس کے آنے سے رزق میں برکت پیدا ہو جاتی ہے۔

پائے وازی: شادی کے کچھ روز بعد دولہا کو اس کے سسرال میں بلایا جاتا ہے جو شام کی چائے یا کھانے پر ہو سکتا ہے۔ اس وقت دولہا اپنے گھر والوں اور قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کو لے کر وہاں جاتا ہے۔ اور سسرالیوں کی جانب سے تمام مہمانوں کو ایک ایک جوڑہ لباس دیتے ہیں جن کے بدلے میں ہر ایک کچھ نہ کچھ رقم، جو تقریباً پانچ سو سے ہزار تک ہوتی ہے، وہیں رکھتا ہے۔

پیدائش کی رسمیں

شکم مالی: جب خاتون حاملہ ہوتی ہے تو اس کے ساتویں مہینے کے دوران ایک محفل سجائی جاتی ہے جو دراصل نذر کرنے کی ایک شکل ہے۔ اس میں خواتین کو بلایا جاتا ہے اور نذر و نیاز کر کے شکم مالی کی رسم نبھائی جاتی ہے یعنی اس میں ایک خاص قسم کی روٹی جس کو ''اسماعیلی'' کہتے ہیں پکا کر بانٹی جاتی ہے۔

نذر بی بی: یہ نذر پہلی بار حاملہ ہونے پر بچے کی پیدائش کے قریبی ایام، یعنی حاملہ عورت کے آخری ایام میں عزیز و اقارب خواتین کو بلا کر طعام کی شکل میں دی جاتی ہے۔ جسے حضرت زینب کے نام سے منسوب کیا ہے۔

تولد کے بعد: بچے کے تولد کے بعد بھی مختلف رسوم ہیں جن میں بتدریج کمی آرہی ہے، پہلے گھروں میں بچے جنے جاتے تھے تو اس کے لیے خاص شرائط تھی۔ اب جبکہ ہسپتالوں میں یہ سلسلہ انجام پاتا ہے، پیدائش سے قبل اس کے لئے کپڑے اور دیگر ضروری اشیاء کی تیاری شروع ہوتی ہے جس میں کپڑے ایسے بنائے جاتے ہیں کہ وہ لڑکا لڑکی دونوں کے لیے قابل استعمال ہوں۔ چاہے لڑکا پیدا ہو چاہے لڑکی (لیکن آج کل تو الٹرا ساؤنڈ پہلے ہی سے راز فارش کر دیتا ہے)۔ بچے یا بچی کی پیدائش پر کپڑوں کے علاوہ چند دوسری چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں۔

بند و سارغ: سارغ کپڑوں کے چوکور ٹکڑے ہوتے ہیں جن میں بچے کو لپیٹ کر باندھا جاتا ہے لیکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ کپڑا نرم اور نسبتاً گرم ہو، کچھ لوگ پرانے مردانہ کپڑوں کو ہی اس استعمال میں لاتے ہیں لیکن اکثر کی کوشش ہوتی ہے کہ نیا کپڑا ہو۔ بند کوئی ڈھائی تین گز کے کپڑے کی تقریباً دو انچ چوڑی پٹی ہوتی ہے جسے باقاعدہ سیا جاتا ہے اور اس کے اوپر خوبصورت پھول وغیرہ کاڑھے جاتے ہیں یا پھر زری قسم کے فیتے لگائے جاتے ہیں۔ سارغ میں لپیٹنے کے بعد بچے کو اس کے ذریعے مخصوص انداز میں باندھا جاتا ہے۔ سینے سے شروع کر کے پیروں پر لا کر گانٹھ لگائی جاتی ہے۔ لیکن طریقہ ایسا ہوتا ہے کہ بچے کے ہاتھ پیر سیدھے بندھ جائیں۔ عام لوگوں میں اس باندھنے کا ایک غلط تصور عام ہو چکا ہے کہ اگر بچے کو باندھا نہ جائے تو اس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو جائیں گے اگرچہ ایسا نہیں بلکہ اس طرح وہ آرام سے سو سکتا ہے اور یہ عمل تقریباً سال بھر جاری رہتا ہے جبکہ اس ''بند'' کے درمیان میں فیروزہ یا پھر کوئی دوسرا نیلا پتھر وغیرہ ٹانکا جاتا ہے۔ ایک تو وہ مرکزے کے تعین میں مدد گار ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے اس کو نظر بد سے بچنے کا ایک شگون بھی سمجھا جاتا ہے۔

پیشانی بند: یہ بھی ایک ڈیڑھ دو انچ کی کپڑے کی خوبصورت سلی ہوئی پٹی ہے جس سے بچے کی پیشانی کو باندھا جاتا ہے۔ عام طور پر تو کہتے ہیں کہ اس طرح بچے یا بچی کی پیشانی سیدھی رہتی ہے لیکن دراصل کیا حکمت ہے اس کا علم نہیں، ہاں دوسری صورت اس کی پیشانی کو گرم رکھنے کی بھی ہو سکتی ہے۔

جہیزی: یہ پہلے بچے کی پیدائش پر دیتے ہیں یعنی پہلی اولاد کے تمام لوازمات کپڑے، بستر، جھولا، دھونے کا سامان، کمبل، سرہانہ، چوسنی وغیرہ تمام کی تمام اس کی نانی کے ذمے ہوتے ہیں۔

مبارکبادی: بچے کی پیدائش کے بعد قریبی رشتہ دار اور اقارب مبارکباد کے لیے آتے ہیں۔ لیکن اگر لڑکی ہو تو پھر کم دھیان دیا جاتا ہے۔ مبارکباد دینے والے ساتھ پہلے ''قند'' لاتے تھے مگر اب سوٹ یا کوئی اور لوازمات جو بچے کے استعمال میں آسکیں، ساتھ لاتے ہیں یا تو پھر نقد رقم بچے کی والدہ کو دیتے ہیں۔ لیکن ایسی عورت جس کا بچہ مر گیا ہو وہ بچے کے چالیسویں کے بعد آتی ہے۔ اس کا آنا بدشگونی کی علامت ہے اور اس کی وجہ سے بچہ مر سکتا ہے۔ اس کی تفصیل توہمات کے حصے میں بیان ہوگی۔

اذان و اقامت: بچے کی پیدائش کے پہلے سے تیسرے روز تک اس کے نہلانے کے بعد علاقے کی کوئی بزرگ ہستی یا گھر کا بڑا اس کے ایک کان میں اذان دیتا ہے اور دوسرے کان میں اقامت پڑھتا ہے۔ اس کے لئے محترم و معتبر شخص کا انتخاب اس لئے ہوتا ہے اس کی سیرت کا اثر بچے پر ہوگا۔

دہن شیرینی: بچے کا منہ میٹھا کرنے کی ایک رسم ہے جو انہی ابتدائی دنوں میں کسی فیاض اور مہربان شخص کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ کیونکہ خیال ہے کہ جس خصلت کا شخص بچے کا منہ میٹھا کرے گا۔ بچہ انہی خوبیوں کا مالک ہوگا، اس لئے عام طور پر جب کوئی شخص خسیس ہوتا ہے، کنجوسی دکھاتا ہے تو اس کو کہا جاتا ہے کہ ''کس سے تیرا منہ میٹھا کروایا گیا تھا؟''

شب بخت: شب بخت بچے کے چھ روز پورے ہونے کے بعد ساتویں رات کو کہتے ہیں۔ سات کا تصور ویسے بھی کائنات میں انسانی زندگی سے کئی حوالوں سے مربوط ہے۔ اور ''چھٹی کا دودھ یاد آنا'' محاورہ بھی اسی سے شائد کوئی مناسبت رکھتا ہے۔

شوشینی: "شو"یعنی"شب"اور"شینی"یعنی"نشستن"(بیٹھنا)۔یعنی رات کو بیٹھنا۔ اصطلاحاً ''شب بیداری'' کے معنوں میں ہے۔اس رات کو دوست واقارب کو دعوت دی جاتی ہے اور رات بھر خوشی کی محفل سجائی جاتی ہے۔لیکن یہاں ذکر کرنا ضروری ہے کہ شوشینی صرف لڑکے کی پیدائش پر ہوتی ہے۔تقریباً ہر آنے والا اپنے ساتھ کچھ پھل یا بسکٹ وغیرہ لے کر آتا ہے اور رات بھر موسیقی سننے کے ساتھ تاش، کیرم بورڈ وغیرہ کھیلا جاتا ہے۔اس کے علاوہ دیگر کئی کھیل بھی کھیلے جاتے ہیں۔اس دوران وقفے وقفے سے چائے، بسکٹ اور پھل وغیرہ سے مہمانوں کی تواضع ہوتی ہے۔یہ رسم بھی اب اپنی مقبولیت کھو چکی ہے۔جبکہ ساتویں کے علاوہ یہ محفل کسی بھی مناسب رات کو سجائی جاسکتی ہے۔

سنتی (ختنہ): بچے کے ختنے کا اہتمام بھی تقریباً اسی شب بخت، یعنی ساتویں دن کیا جاتا ہے جس میں بچے کے ختنے کے ساتھ اسی شام کو دعوت ہوتی ہے اور خواتین گاتی ناچتی ہیں۔ادھر وہ بیچارہ بے حال پڑا ہوتا ہے۔ادھر دھنگا مشتی ہوتی ہے۔ختنہ ساتویں کے علاوہ کسی بھی دوسرے روز ہوسکتا ہے جبکہ کچھ عرصہ قبل ختنے کی رات اس بچے کیلئے مہندی کی رسم بھی منائی جاتی تھی یعنی اس کے ہاتھ پیر پر مہندی لگائی جاتی تھی یعنی وہ ایک طرح دولہا بن جاتا لیکن یہ عموماً ان بچوں کا کیا جانا ممکن تھا جن کا ختنہ دیر سے ہوا کرتا تھا۔ویسے بھی قندھاری برادری کے اکثر خاندانوں میں سات سال کی عمر سے پہلے ختنہ کو اچھا نہیں سمجھا جاتا' یہ بھی ایک بدشگونی کی علامت ہے۔لہٰذا سات سال کے بچے کیلئے مہندی کی رسم کا اجراء بھی آسان ہوتا ہے۔جبکہ ختنے میں بچے سے الگ کیا ہوا گوشت یا پوست کو محفوظ کیا جاتا ہے یا پھر دفنا دیا جاتا ہے۔

سرکلی: یہ عمل بھی ساتویں ہی کو انجام دیا جاتا ہے یعنی سر منڈوانا، اس رسم کے ساتھ عزیز واقارب میں مٹھائی بھی تقسیم کی جاتی ہے اور بچے کے سر منڈوانے کی رسم ادا کی جاتی ہے اور ان بالوں کو پھینکا نہیں جاتا بلکہ محفوظ کرتے ہیں یا دفناتے ہیں۔

نام رکھنا: نام کے لیے عموماً خاندان میں سب اپنے اپنے پسند کے نام پیش کرتے ہیں جن میں بزرگ کسی ایک کو انتخاب کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی علاقے کے کسی بزرگ کو نام رکھنے کی دعوت دی جاتی ہے اور وہ اپنی مرضی سے نام رکھتا ہے یا پھر قرآن سے نام لینے کے لیے فال دیکھتے ہیں یعنی کسی مولوی وغیرہ سے یہ کام کرواتے ہیں۔وہ قرآن کا کوئی صفحہ نکال کر دیکھتا ہے۔اور اسی سے نام کا انتخاب کیا جاتا ہے، جبکہ نام رکھنے کے لیے بھی ساتواں دن مناسب سمجھا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے آس پاس کے گھروں اور رشتہ داروں میں مٹھائی بانٹی جاتی ہے اور وہ اس پلیٹ یا برتن میں کچھ ڈال کر دے دیتے ہیں یا پھر کچھ رقم رکھتے ہیں یعنی برتن خالی نہیں لوٹاتے۔

دھم: دہم یعنی دسویں کو زچہ کو شرعی طور پر بھی غسل کرنے کا حکم ہے۔اس روز ماں خود بھی غسل کرتی ہے۔جس کے بعد اس کو نماز شروع کرنا پڑتی ہے جبکہ بچے کو بھی اس روز دھویا جاتا ہے۔غسل دینے کا یہ عمل تقریباً دائی کے ذمے ہوتا ہے۔دسویں کے غسل کے بعد زچہ نماز کے ساتھ گھر کے کاموں میں بھی باقاعدہ طور پر شریک ہوجاتی ہے۔اس روز رشتہ دار خواتین کو بلایا جاتا ہے اور دعوت طعام کا اہتمام ہوتا ہے۔

گرداوجاغی: یہ رسم بنیادی طور پر میں رائج ہے یعنی دسویں روز زچہ کو بچے کے ساتھ اوجاق' یعنی چولہے کے گرد تین چکر کاٹنے ہوتے ہیں اور اس دوران اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تھوڑا تھوڑا گھی چولہے پر ڈالتی جائے جس کو مردگان کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ اس سے مردوں کی روحیں شاد ہوجاتی ہیں چکر کاٹنے والے یہ سلسلے غالباً ہندوازم سے مستعار ہیں۔

چلہ بری: ''چلہ'' یعنی ''چالیسواں'' اور ''بری'' یعنی ''نکالنا'' یا پھر شاید مصدر ''بریدن'' سے کاٹ ڈالنے کے معنوں میں لیا گیا ہو۔عموماً چالیس دن تک زچہ اور بچہ کو کہیں نکلنے نہیں دیتے اور دوسری خواتین بھی زیادہ رفت وآمد سے گریز کرتی ہیں کہ خدانخواستہ اگر کل کچھ ہوگیا تو تہمت ہمارے سر پڑے گی۔چالیسویں کو بھی زچہ غسل وغیرہ کرتی ہے اور اس کے بعد وہ نسبتاً آزاد ہوجاتی ہے۔ویسے یہ خیال عام ہے کہ چالیس روز تک زچہ کے لیے قبر کا منہ کھلا رہتا ہے۔اس روز چلہ بری کی رسم میں گندم کے چالیس دانوں اور کلیجی کے چالیس ٹکڑوں کو بڑی بوڑھیاں ساتھ پروکر اس دھاگے میں سے بچے کو کہتے ہوئے کہ ''چلے تو بورشد'' (تیرا چلہ نکل گیا) نکالتے ہیں جو اس نیک شگون کی علامت ہے کہ اب اس بچے پر کسی قسم کی (انہی کی اصطلاح میں) ناپاک عورت کا اثر نہیں ہوتا۔اس رسم کو کچھ لوگ دسویں روز ہی منا لیتے ہیں۔

موت کی رسمیں

موت کی رسومات اکثر تو وہی اسلامی عقائد واحکام سے متعلق ہیں۔ یہاں کچھ روایتی نکتوں کا ذکر کرتے چلیں گے۔آغاز میں وہی موت کی خبر بذریعہ قاصد یا اعلان کے، پہنچانے کو عمل انجام پاتا ہے لیکن ایک روایت برادری یا ہزارگی اصطلاح میں ''آغلی'' کی ہے کہ محلے یا علاقے یا قبیلے کی اس شاخ کے لوگ آپس میں چندہ اکٹھا کرتے ہیں اور ایک مخصوص رقم مرحوم کے لواحقین کو دے دیتے ہیں جو ایک چھوٹی سی کمک ہوتی ہے۔غسل وکفن اور آخری دیدار کے معاملات طے پانے

کے بعد جنازہ اٹھایا جاتا ہے اور رستے میں درود یا اللہ اکبر کا ورد کرتے ہوئے قبرستان جاتے ہیں۔ جبکہ قبرستان کی حدود میں جنازے کو تین یا سات مرتبہ اس تصور سے زمین پر رکھتے بھی ہیں کہ مرحوم پہلی مرتبہ آخرت کے سفر کی جانب بڑھ رہا ہے سو اس کو تیار کرنے یا ستانے کیلئے مہلت دی جاتی ہے۔

سبز شاخیں: مردے کے کفن میں اس خیال سے تین چار سبز شاخیں بھی رکھی جاتی ہیں کہ جب تک یہ ہری ہیں اس پر قبر کا عذاب نازل نہیں ہوگا لیکن اس رسم میں کوئی باقاعدگی یا مقبولیت نہیں ہے۔

اسپند کردن: اسپند یا سپند ہرمل کو کہتے ہیں۔ قبرستان سے لوٹنے پر میت کے گھر یا مقام فاتحہ کے دروازے پر چند لڑ کے ہرمل انگاروں پر ڈالتے ہیں اور ہر ہر فرد کو اس دھویں میں سے گزارا جاتا ہے جو غالباً رد بلا کی ایک رسم ہے اور فاتحہ خوانی عموماً میت کے گھر میں یا پھر قریبی یا اس کی برادری کی امام بارگاہ میں کی جاتی ہے۔

تابوت: تابوت کو مرحوم کے گھر کے باہر تین دن تک رکھا جاتا ہے جو شاید بے خبر افراد کیلئے ایک عندیہ بھی ہوتا ہے تاکہ وہ گزرتے ہوئے تابوت دیکھ کر سوگوار خاندان کے غم میں شریک ہوں اور فاتحہ وغیرہ میں شرکت کر سکیں۔

گلیم فاتحہ: گلیم کا تعارف پہلے آیا لیکن یہاں گلیم اصطلاحی معنوں میں ہے۔ یعنی فاتحہ کی محفل یا فاتحہ کی نشست۔ دراصل گلیم بچھانے کی معروف شے ہے اس لئے فاتحہ کی محفل کو ہی اس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عموماً تین دن تک بیٹھتے ہیں۔ اس گلیم پر گھر کے بزرگوں کی موجودگی لازم ہے۔ اس کے علاوہ فاتحہ پڑھنے یا تلاوت قرآن کے لیے کسی ایک مولوی یا قاری کو بھی بٹھایا جاتا ہے۔ خواتین کی گلیم سات دن تک بھی بچھی ہوتی ہے۔ دوسرے روز تدفین و تلقین کرنے والا مولوی آتا ہے اور سوگوار خاندان کے ہمراہ قبر پر جاتا ہے اور وہاں فاتحہ خوانی وغیرہ ہوتی ہے۔ تیسرے روز نذر یا خیرات ہوتی ہے۔ جس میں قرآن خوانی بھی کی جاتی ہے۔

شال ڈالنا: مرحوم یا مرحومہ کے عزیز و اقارب، متعلقین اور دوست احباب مردے کی تدفین کیلئے جاتے ہیں تو ہر ایک اپنے ساتھ ایک شال یا چادر خرید کر لے جاتا ہے۔ اوڑھ شال میت پر بچھایا جاتا ہے۔ میت کو دفنانے سے بعد یہ شال مولوی اور غرباء میں تقسیم کئے جاتے ہیں جو صدقہ خیرات کی ایک شکل ہوتی ہے۔

شب جمعہ: فوتگی کے بعد ہر شب جمعہ کو مرحوم کے اپنے گھر کے علاوہ کوئی نہ کوئی رشتہ دار قرآن خوانی کرتا ہے جس میں نزدیکی رشتہ داروں اور دوستوں کو ہی بلاتے ہیں۔ قرآن خوانی کے بعد طعام کا اہتمام کیا جاتا ہے کہیں رشتہ داروں کے علاوہ قریبی مدرسے کے طالب علموں کو بھی قرآن خوانی کے لیے بلاتے ہیں اور یہ سلسلہ چالیسویں تک جاری رہتا ہے۔

مجالس عزا: قرآن خوانی کی مجالس کے علاوہ مجالس عزا کا اہتمام بھی ہوتا ہے جس میں مرد و خواتین الگ الگ کربلا کے شہداء پر روتے ہیں اور اس مجلس کا ثواب مرحومین کی نذر کرتے ہیں۔ دوسری جانب ان مجالس کا یہ بھی مقصد ہوتا ہے کہ غم اہل بیت کی یاد میں اپنا ذاتی غم بھول جائیں کیونکہ اصل اور بڑا غم حسین کا ہے۔

چہلم: یہ بہت ضروری ہے ہوتا ہے کہ مردے کے چالیسویں پر بڑی سطح پر قرآن خوانی کی جائے جس میں نذر و خیرات کے طور پر کھانا بھی کھلایا جاتا ہے۔

چولہا جلانا: میت کے گھر میں تین دن تک چولہا نہیں جلتا یعنی ان کے ہاں ہانڈی نہیں پکتی اور ان تین دنوں میں عزیز و اقارب ان کے کھانے کا انتظام کرتے ہیں جو کہ بذات خود سوگواروں کی کمک اور دلجوئی کی ایک شکل ہے۔

سفر کی رسمیں

سفر پر جانے کے لئے مخصوص ایام کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ ان ایام کا تعلق اکثر دینی عقائد سے ہوتا ہے اور باقاعدہ نحس و سعد ایام کو دیکھا جاتا ہے جبکہ جانے والے کو امام ضامن باندھا جاتا ہے۔

امام ضامن: یہ دراصل حضرت امام رضاؑ کے آہو کے بچے کی ضمانت سے متعلق ہے۔ روایت ہے کہ ایک ہرنی کو شکاری پکڑ لیتا ہے۔ تو وہ ہرنی شکاری سے التجا کرتی ہے کہ اس کا بچہ بھوکا ہے وہ اسے اتنی فرصت دے کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلا کر لوٹے لیکن شکاری اس کا بھروسہ نہیں کرتا۔ اس دوران ہرنی حضرت امام رضاؑ کو ضامن بناتی ہے اور امام شکاری سے فرماتے ہیں کہ ہرنی کو جانے دو میں اس کی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ لوٹے اور ہرنی جا کر بچے کو دودھ پلا کر لوٹ آتی ہے۔

سو اس روایت سے متعلق مسافروں کے بازو پر امام ضامن باندھا جاتا ہے یعنی سبز یا سیاہ یا کسی دوسرے رنگ کے کپڑے میں کچھ رقم رکھ کر مسافر کے بازو پر باندھا جاتا ہے۔ وہ مسافر اپنی منزل پر پہنچ کر اس رقم کو صدقہ کر دیتا ہے۔

قرآن، پانی اور ہرمل: مسافروں کو جاتے وقت قرآن کے نیچے سے گزارتے ہیں۔ جبکہ اس کے لئے ہرمل بھی جلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مسافر کے

گھر سے نکل جانے پر اس کے پیچھے پانی بھی پھینکتے ہیں جو خیر اور روشنی کی علامت ہے۔ کچھ لوگ شام کے وقت گرم روٹی بھی خیرات کرتے ہیں۔

مسافر کی آمد: دور دراز سفر سے مسافر کے لوٹنے پر بھی صدقہ و خیرات کرتے ہیں جو ان کی سلامتی سے لوٹنے کے لیے اظہار تشکر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے عزیز و اقارب باقاعدہ ''چشم روشنی'' کے لیے آتے ہیں اور کچھ رقم مسافر کے اہل خانہ کو صدقہ کے لیے دیتے ہیں۔ دراصل اس رقم کو سیال داری کہتے ہیں۔

مسافر کی آمد پر اہل خانہ کو مخصوص جملہ ''چشم شما روشن'' کہا جاتا ہے۔ اس کے جواب میں عموماً ''دل دوستاں روشن'' کہتے ہیں لیکن اس کے علاوہ دیگر جملوں کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔

جبکہ مسافر بھی اپنے ساتھ تحفے اور تحائف لاتا ہے جو ان ''چشم روشنی'' کیلئے آنے والوں کو دیئے جاتے ہیں۔ اس عمل میں زیادہ تر خواتین پیش پیش ہوتی ہیں۔

سفر حج: خانہ کعبہ کی زیارت کو جانے والا شخص تمام عزیز و اقارب کے پاس جاتا ہے۔ ان سے اجازت و رخصتی اور ہر طرح کی کوتاہیوں کی معذرت خواہی کرتا ہے جبکہ کچھ لوگ اس کی دعوت بھی کرتے ہیں۔ حاجی کو عزیز و اقارب باجماعت رخصت کرتے ہیں۔ حاجی کے لوٹنے پر وہی عام روایت یعنی لوگ ان کی مبارکباد کو آتے ہیں۔ مبارکباد دینے والوں کی آب زمزم اور خورما سے تواضع کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ حاجی عام لوگوں کے لیے تسبیح کا تحفہ لاتا ہے جبکہ قریبی دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے جانماز، گھڑی اور دیگر تحائف وغیرہ لاتا ہے۔ یہاں بھی مبارکباد دینے والے حاجی کے لیے لباس لاتے ہیں یا پھر مٹھائی لائی جاتی ہے۔ جبکہ حاجی کی آمد پر اس کے استقبال کے لیے گھر کو سجاتے ہیں اور خصوصاً صنوبر کے درخت کی شاخیں اور پتے گھر پر سجائے جاتے ہیں۔ ان کے داخلے پر ان کے اوپر ''نقل اور چاکلیٹ'' وغیرہ پھینکے جاتے ہیں جبکہ اس کے قدموں میں عموماً دنبہ بھی ذبح کیا جاتا ہے۔ اس کو صدقہ کہتے ہیں جس کا گوشت حاجی اور اس کے اہل خانہ نہیں کھاتے جبکہ اس کے علاوہ حاجی کی جانب سے ایک ولیمہ کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔

خلعتی: ایک خلعتی تو شادی بیاہ کی رسموں میں سے ہے لیکن یہ خلعتی مردوں کیلئے ہوتی ہے۔ یعنی حاجی جب حج سے لوٹتا ہے تو وہاں سے قرآنی آیات و دعاؤں سے متبرک شدہ کفن اپنے بہت ہی قریبی افراد کے لیے لاتا ہے۔ عموماً حاجی اپنے لئے بھی یہ کفن لاتے ہیں۔ اس کو بھی خلعتی کہا جاتا ہے۔ ویسے بھی ''خلعت'' عربی کا لفظ ہے جس کے معنی لباس کے ہیں۔ یہ کفن مختلف زیارات، خصوصاً کربلا سے واپسی پر بھی ''کربلائی'' لاتے ہیں۔

زیارات پر آمد و رفت: حج کی طرح ہزارہ اور قندھاری شیعہ عقائد رکھنے کے ناطے کربلا، نجف، شام اور مشہد کی زیارت کو بھی بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ یعنی ہر شیعہ کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ان زیارات پہ جانے کا شرف حاصل کرے، بلکہ حج پر جانے کیلئے خاص شرائط ہوتی ہیں لیکن زیارات پر تھوڑی سی رقم اکھٹی کرنے کے بعد چلے جاتے ہیں۔

زیارات پر جانے کے وقت بھی جاتے ہوئے وہی پانی پھینکنے اور صدقہ وغیرہ کی رسمیں نبھائی جاتی ہیں جبکہ قریبی اقارب آکر اس سے دعاؤں کی درخواست کرتے ہیں اور رد بلا کے لیے گرم روٹی بانٹنے کو کچھ رقم بھی دیتے ہیں۔

کربلا سے واپسی پر بالخصوص سوغات کے طور پر کربلائی (کربلا کی زیارت کرنے والے کو کربلائی کہتے ہیں) اپنے ساتھ دیگر تحائف کے ساتھ ''سجدہ گاہ'' (جس کو ''مہر'' یا ''خاک شفا'' بھی کہتے ہیں) لاتے ہیں۔ جس کو اہل تشیع نماز پڑھتے وقت سجدہ کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاہ کربلا کی مٹی کی بنی ہوئی تسبیحیں بھی لائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں سے کھجور وغیرہ بھی لاتے ہیں۔ ان کی مبارکباد کو باقاعدہ برادری اور احباب و اقارب آتے ہیں اور یہ سوغات لے جاتے ہیں، بلکہ کچھ لوگ کربلا سے آنے پر بھی ولیمہ کا اہتمام کرتے ہیں کربلا جانے والے عموماً نجف اور شام کی زیارات سے بھی مشرف ہو کر آتے ہیں لیکن وہ کہلاتے کربلائی ہی ہیں۔

زیارات اہل قبور: تشیع عقیدہ کے مطابق اہل قبور کو فراموش کرنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ اس لئے دیگر ایام کے علاوہ شب جمعہ لازمی قبرستان جایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے ساتھ کھجور، حلوہ یا دوسری شے پکا کر وہاں موجود غرباء میں تقسیم کرتے ہیں۔ قبر پر جا کر فاتحہ و دیگر قرآنی سورتیں پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان قبروں پر اگربتی اور شمعیں بھی روشن کی جاتی ہیں۔ قبور کو عموماً سمنٹ سے پختہ کرنے کا رجحان ہے اور قبر کی درمیانی جگہ کو چھوڑ کر اس میں سبزہ اگاتے ہیں اور جبکہ ان کے پانی کا انتظام وہاں پر ہمیشہ موجود غریب بچوں کے روزگار کی شکل میں ہوتا ہے یعنی وہ بچے بوتلوں میں پانی لے کر پھرتے ہیں اور مرحومین کے لواحقین انہیں پانی ڈالنے کو کہہ کر کچھ روپے دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہاں بوڑھے اور بے کس لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جو پیسے لے کر مرحومین کیلئے قرآن پڑھتے ہیں۔ جبکہ ان لوگوں میں قبرستان میں سبزہ درخت اور پھول اگانے کی رسم بھی موجود ہے۔ لہٰذا اکثر لوگ اپنے عزیزوں کی قبروں کے قریب درخت اور گل وغیرہ کاشت کرتے ہیں۔

مذہبی تہوار

محرم: ماہ محرم کو شیعہ کمیونٹی کی مذہبی اور غیر مذہبی تہواروں میں اولیت حاصل ہے۔ جو ان کے عقیدے کا بنیادی جزو ہے۔ ماہ محرم کا بنیادی تعلق کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت کی یاد اور یزیدیت کے خلاف ایک احتجاجی آواز سے ہے۔

عزاداری کا سلسلہ محرم سے چند روز پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جس کے حوالے سے موسیقی سننا، خوشی کی تقاریب، کسی بھی حوالے سے مبارکباد دینا ممنوع ہو جاتا ہے کچھ لوگ گھروں پر علم لگاتے ہیں جبکہ اکثریت اس دوران سیاہ لباس پہنتی ہے۔

سیاہ پوشی: خواتین تو تقریباً باقاعدہ اہتمام کے ساتھ سیاہ جوڑے سلواتی ہیں۔ جسے ''محرمی لباس'' یا ''کالائے محرمی'' کہتے ہیں۔ بچوں کے لیے بھی اکثر سبز و سیاہ لباس سلوایا جاتا ہے۔

ننگے پیر رہنا: کچھ لوگ ان ایام میں جوتے نہیں پہنتے جو ایک طرح کی عزا اور احتجاج کے اظہار کے علاوہ سختی سہتے ہوئے اہل کربلا سے یکجہتی کا اظہار ہے۔

زنجیر اور حلقہ پہننا: کچھ لوگ گلے میں باریک زنجیر پہنتے ہیں اس میں عموماً پنجتن کے ناموں علاوہ ان کے جداگانہ ناموں کے لاکٹ سے بھی ڈالے جاتے ہیں یا سیاہ دھاگہ گلے میں پہنتے ہیں۔ زنجیر کو اسیران کی زنجیروں سے نسبت دی جاتی ہے جبکہ ہاتھ یا پاؤں میں حلقہ یا کڑہ پہننا اسیروں کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی علامت ہے۔

سر پر خاکستر اور بھوسہ: کچھ لوگ سروں پر خاک یا خاکستر، بھوسہ ڈالتے ہیں جو بذات خود ستم زدگی کا اظہار ہے جبکہ روز عاشورا تو یہ عمل اکثر جلوسوں میں باقاعدگی سے انجام دیا جاتا ہے۔

لعنت بر یزید: اگر اتفاق سے ان ایام میں کسی کے ہاں کوئی خوش کن خبر پہنچتی ہے یعنی بیٹا وغیرہ پیدا ہوتا ہے یا کوئی اور ایسا واقعہ جس کے برابر مبارکباد دینے کی نوبت آئے تو مبارکباد نہیں دی جاتی بلکہ ''لعنت بر یزید'' کہا جاتا ہے۔

موسیقی کا متبادل: اس مہینے میں بلکہ محرم اور صفر دو ماہ کے دوران موسیقی وغیرہ بھی نہیں سنی جاتی ہے، یہ ایک انتہائی قبیح فعل گردانا جاتا ہے۔ اسی طرح میوزک سینٹر اور دکانوں میں لگی ہوئی گائیک مرد و خواتین اور دیگر تصاویر کو الٹا لگایا جاتا ہے تاکہ سڑک اور گلی میں گزرتے ہوئے عزاداروں کی نگاہ نہ پڑے۔

مجلس عزا: عزا کی مجالس میں شرکت بھی ایک ضروری جزو ہے، یعنی بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی خاندان رات کو مجلس عزا میں شریک نہ ہو۔ ان مجالس میں مرد عورت اور بچے سب شریک ہوتے ہیں یعنی یہ مذہبی ثقافت کا اہم حصہ ہے جس سے دوری معاشرے سے کٹنے کے مترادف ہے۔ خواتین کی مجالس عموماً شام کو ہوتی ہیں۔ جن میں مجلس پڑھنے والی خواتین ہی ہوتی ہیں۔

علم و گہوارہ: ساتویں محرم سے گہوارہ اور علم وغیرہ نکالنے کی رسمیں شروع ہوتی ہیں۔ علم کربلا میں حضرت عباس کے علم سے منسوب، اس علم کی یاد یا روایت کو دہرانے کا عمل ہے۔ اسی تعلق سے امام بارگاہ پر علم لہرانا لازمی ہوتا ہے جبکہ کچھ گھروں پر بھی علم نصب نظر آتے ہیں لیکن نذر کے حوالے سے بھی ''علم نکالنے کی اصطلاح'' رائج ہے یعنی جب کوئی گھرانہ یا شخص کوئی مراد مانگتا ہے اور وہ پوری ہو جاتی ہے تو اسے ہر سال ایک علم نکالنا ہوتا ہے۔ علم نکالنے کے لیے متعلقہ گھر میں امام بارگاہ سے علم لے جایا جاتا ہے جس کے لئے ایک طے شدہ رقم جو چند سو روپے ہوتے ہیں، ادا کرنے پڑتے ہیں اسی روز شام یا اگلے روز عزاداروں کا دستہ سینہ زنی اور نوحہ خوانی کرتا ہے۔ ان گھروں میں جاتے ہیں اور وہاں سے علم نکالتے ہیں۔ اس دستے کیلئے اہل خانہ نیاز پکاتے ہیں جو چاول چھولے، پلاؤ، بریانی، کھیر، دودھ کا شربت حلیم وغیرہ کی صورت میں ہوتی ہے۔

کچھ گھر علم کی بجائے گہوارہ بھی لے جاتے ہیں جو حضرت علی اصغرؑ کی یاد دلاتا ہے۔ اس گھر کے افراد یا دوسرے اقرباء گہوارہ اور علم سے مراد لیتے ہیں۔ علم اور گہواروں کا یہ سلسلہ دسویں محرم تک جاری رہتا ہے جبکہ عزادار دستے بھی کئی ہوتے ہیں جو ان علموں اور گہواروں کو ماتم و نوحہ خوانی کرتے ہوئے امام بارگاہ تک لاتے ہیں اور مخصوص قسم کے نوحے اس موقع پر پڑھے جاتے ہیں۔

نویں اور دسویں محرم کو نذر و نیاز بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جس میں مندرجہ بالا غذاؤں کے علاوہ ''شلہ گوشتی'' زیادہ پسندیدہ غذا ہوتی ہے جو قندھاری برادری کے ہاں زیادہ تر بنائی جاتی ہے۔

عزاداری: شب دہم رات بھر شب بیداری ہوتی ہے جس میں اس شب کی مخصوص عبادات کے علاوہ نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ امام بارگاہوں میں عزاداروں اور مجالس عزا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ عاشورا کے روز ہر امام بارگاہ سے دستے برآمد ہوتے ہیں اور وہ دستے علم اور تعزیے اٹھاتے ہوئے کوئٹہ کے علمدار روڈ پر روانہ ہوتے ہیں۔

اس طرح ایک دوسرے کے پیچھے تمام دستے روانہ ہوجاتے ہیں۔ ہر دستہ اپنی زبان میں نوحہ خوانی اور اپنے انداز میں سینہ کوبی کرتا ہے۔ کوئٹہ میں تقریباً قندھاری، ہزارہ، افغانی، بنگشی، طوری، گلگتی، بلتستانی، ہندوستانی، پنجابی ثقافتوں اور زبانوں کے کئی دستے برآمد ہوتے ہیں جو اپنی زبانوں کے علاوہ اردو میں بھی نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ اس طرح ان تمام دستوں کو ایک دوسرے کے پیچھے لگا کر جلوس کی شکل دی جاتی ہے جو شہر کے مخصوص راستوں سے ہوتے ہوئے اپنے اپنے امام بارگاہوں میں داخل ہوجاتے ہیں۔ امام بارگاہ کے دروازے پر انہیں ہرمل کے دھویں سے گزارا جاتا ہے۔

عزا کی قسمیں: کوئٹہ میں مختلف اقوام کی موجودگی کی وجہ سے تقریباً پاکستان بھر میں ہونے والی ہر قسم کی عزاداری رائج ہے۔ مذکورہ دستوں میں ان کے اپنے انداز کی عزاداری ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر ماتم میں یک زربہ (ایک وار والا)، سہ زربہ (تین وار والا) کے علاوہ بیٹھ کر بھی اور اکثر کھڑے ہوکر سینہ کوبی کرتے ہیں جبکہ زنجیر زنی بھی ہوتی ہے جس میں لکڑی کے دستے کے ساتھ زنجیر کے حلقوں کا ایک گچھا لگا ہوتا ہے اس کو بھی مختلف طریقوں سے پشت پر مارا جاتا ہے جبکہ اس کے علاوہ کاردی زنی بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح کے لکڑی کے دستے کے ساتھ زنجیروں کے گچھے ہوتے ہیں۔ اور ہر زنجیر کے سرے پر ایک دونوں طرف سے تیز چھری لگی ہوتی ہے۔ اس کو بھی پیٹھ پر مارا جاتا ہے کاردی لفظ کارد سے لیا گیا ہے جس کے معنی چھری کے ہیں۔

عاشورا کے روز مجموعی طور پر کاروبار بند کردیا جاتا ہے جبکہ کچھ لوگ تو اس سے چند روز قبل ہی محنت مزدوری اور روزگار سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ ۱۳ محرم کو سوم امام منایا جاتا ہے۔ اس کی شب کو بھی مجالس اور نذر و نیاز کا سلسلہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد چہلم تک بلکہ صفر کا مہینہ بھی مجالس اور عزا کیلئے وقف ہوتا ہے۔ عاشورا کے بعد اکثر مجالس گھروں میں ہوتی ہیں اور خواتین کی مجالس تو تقریباً روز ہوا کرتی ہیں۔

چہلم: چہلم کو بھی کوئٹہ میں جلوس امام حسینؑ برآمد کیا جاتا ہے۔ اس روز بھی تمام دستے ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے عزاداری کرتے ہیں اور جلوس میں وہی نوحہ خوانی، ماتم، سینہ کوبی، زنجر زنی اور کاردی زنی ہوتی ہے۔ یہ جلوس مخصوص راستوں سے ہوتا ہوا قبرستان پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس روز بھی امام بارگاہوں اور گھروں میں نذر و نیاز کا اہتمام ہوتا ہے۔

محرم سے متعلق عقائد

خانوادہ اہل بیت سے حاجات طلب کرنے کا عقیدہ دنیا بھر میں شیعہ کے علاوہ سنی اور دیگر کئی مذاہب کے افراد میں رائج ہے۔ کوئٹہ میں بھی محرم کے ایام امام میں بارگاہ اور علم وغیرہ کے توسط سے، خانوادہ اہل بیت سے حاجات طلب کی جاتی ہیں جن میں سے کچھ یوں ہیں۔

نذری اولاد: جب کسی کے ہاں متواتر لڑکیوں کی پیدائش ہو یا اولاد پیدا ہوکر مرجاتی ہو یا پھر کوئی اولاد نہ رکھتا ہو تو وہ امام سے اپنی مشکل کے حل کے سلسلے میں رجوع کرتا ہے۔ نذر لینے کے بھی کئی راستے ہیں۔ کوئی گہوارے سے نذر لیتا ہے، کوئی علم سے، کوئی ویسے دل میں کوئی نہ کوئی منت مان لیتا ہے جس کے پورے ہوجانے پر وہ اسے ادا کرتا ہے۔ نذر سے مراد وہی منت ہے۔

کچھ بچوں کو باقاعدہ نذری کہا جاتا ہے اور ان کے کان میں سونے وغیرہ کا حلقہ ڈالا جاتا ہے جس کا سات سال کی عمر تک رہنا لازمی ہوتا ہے اور ہر سال اس کی نذر بھی دی جاتی ہے۔ جبکہ کچھ بچوں کا تعلق کسی ایک امام سے ہوتا ہے اور اس کی مناسبت سے اس کا نام بھی رکھتے ہیں۔ حسن، حسین، رضا وغیرہ یا پھر غلام رضا، غلام حسین یا کنیز زہرا کنیز رضا وغیرہ۔

کچھ نذری بچوں کو وہ حلقہ اسی امام کی زیارت پر جاکر اتارنا ہوتا ہے جبکہ ان نذری بچوں کو محرم میں ضرور سبز لباس پہنایا جاتا ہے۔

منت مانگنا: اولاد کے علاوہ دیگر مسائل اور مشکلات کے حل و رفع کیلئے بھی لوگ اس درگاہ سے نذر و نیاز مانگتے ہیں۔ اس منت کے لیے بھی تمام عقائد کے لوگ آتے ہیں اور منت پوری ہونے پر اگلے سال نذر دی جاتی ہے۔ خصوصاً شب دہم امام بارگاہ میں چائے کی پیالی، نقل اور چنے وغیرہ بطور نذر دیئے جاتے ہیں، اگلے سال ایک درجن پیالے اور کچھ نقل اور چنے وغیرہ اس سائل کو لانے ہوتے ہیں جبکہ علم و گہوارہ نکلوانے کی بنیاد بھی اسی طرح کی کسی مراد سے بنتی ہے۔ اس کے علاوہ علم پر چادریں بندھوانے کا سلسلہ بھی منت کی ایک قسم ہے یعنی بازار سے کوئی بھی کپڑا یا چادر خرید کر علم پر لاکر باندھا جاتا ہے۔

نذروں کو مختلف عنوانات سے موسوم کیا گیا ہے مثلاً سفرہ (دسترخوان) حضرت عباس، سفرہ حضرت زہرا یا آش حضرت عباس وغیرہ یہ۔ وہ ہستیاں ہیں جنہیں باب الحوائج (حاجتوں کر برلانے والے) کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

امام بیمار کا حلقہ: کچھ لوگ امام حضرت زین العابدین علی ابن حسینؑ کی نذر کے طور پر ہاتھ پاؤں میں بیڑی یا ہتھکڑیوں کے طور پر حلقہ پہنتے ہیں جو بذات خود کسی منت

کی پوری کروانے کی غرض سے ہوتا ہے۔اسی طرح زنجیر بھی گلے میں پہنی جاتی ہے۔

سبیل لگانا: یہ رسم بھی تقریباً شیعہ سنی سب برابر نبھاتے ہیں یعنی عاشورا کے روز سبیلیں لگا کر عزاداروں کو شربت اور پانی پلاتے ہیں جو بذات خود کسی نہ کسی حاجت کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

دیگر نذر و نیاز

چہار شنبہ سروری: محرم کے علاوہ صفر کا مہینہ بھی گو کہ محرم کے تسلسل میں چلا جاتا ہے۔لیکن اس ماہ میں ایک خاص قسم کی نذر دی جاتی ہے جس کو چہار شنبہ سروری کہتے ہیں۔یہ نذر ماہ صفر کے ہر چہار شنبہ (بدھ) کو دی جاتی ہے اور مختلف گھروں میں مختلف اشیاء پکائی جاتی ہیں جیسے دلدہ، حلوای سمنک، چاول چھولے، بریانی اور شیر برنج (کھیر) وغیرہ۔اس نذر کو حضرت محمدؐ کی خوشنودی یا حضرت فاطمہؑ کی نذر کا عنوان دیا جاتا ہے۔اس روز تمام لوگ دعوت اور بغیر کسی دعوت کے بھی مختلف گھروں میں جاتے ہیں اور نیاز کھا کر نکلتے ہیں یعنی ایک گھر میں کھا کر دوسرے گھر کی جانب چل پڑتے ہیں۔اس نیاز کا وقت دوپہر اور شام دونوں میں ہوتا ہے یعنی کچھ لوگ دوپہر اور کچھ لوگ شام میں رکھتے ہیں۔لیکن اکثر نیاز دینے والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کو اسی گھر میں کھا کر جایا جائے۔حتیٰ کہ ہاتھ بھی وہیں دھو کر جانا چاہئے لیکن کہیں یہ پابندی نہیں ہوتی۔اس کو نذر کا آزاد کرنا کہتے ہیں۔

جبکہ پہلے اس کے کھانے کی شرط یہ تھی کہ اسی دیگ کے اندر سے چمچ (جسے کف گیر کہتے ہیں) سے نکال کر کھائی جائے اور ہاتھ اسی گھر میں دھو کر جایا جائے۔جبکہ اس دیگ کے دھونے کا پانی اور ہاتھوں کے دھونے میں استعمال ہونے والے پانی کو بھی نالی وغیرہ میں نہیں بہاتے بلکہ اسے گھر کی کیاروں یا موجودہ درخت وغیرہ کی جڑوں میں بہایا جاتا ہے اس نذر کو قندھاری ''نذر دیگچہ'' بھی کہتے ہیں۔

نذر کنڈہ: ماہ صفر میں چونکہ زیادہ تر آئمہ کی ولادتیں اور شہادتیں ہوئی ہیں اس لئے یہ مہینہ بہت معتبر اور محترم گردانا جاتا ہے۔اس نذر کو نذر امام جعفر صادقؑ بھی کہتے ہیں جبکہ اس نذر کا رجحان اہل سنت میں بھی ہے۔نذر کنڈہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ پہلے اس کو مٹی کے مخصوص برتن جس کو کنڈہ کہتے ہیں، میں ڈالا جاتا تھا، اس نذر میں دراصل گھی میں تلی ہوئی آٹے کی ٹکیاں اور حلوہ پوری شامل ہوتے ہیں لیکن ان کے علاوہ دیگر غذائیں بھی شامل ہوتی ہیں، اس نذر میں بھی وہی گھر سے باہر نہ نکالنے اور ہاتھ وغیرہ وہیں دھونے کی شرائط عائد ہوتی ہیں۔

نیمۂ شعبان: نیمۂ شعبان یعنی شعبان کی نصف (پندرہ شعبان) حضرت امام مہدیؑ کی ولادت سے منسوب ہے۔جو کہ شب برات بھی ہے۔شب برات کے حوالے سے پٹاخوں، بے مقصد و بامصرف کلچر یہاں بھی ہے جبکہ نیمۂ شعبان کی مناسبت سے بھی نذر و نیاز کرتے ہیں اور کچھ لوگ ان ایام میں اقارب و احباب کی دعوت بھی ایک شب عید کے تصور سے کرتے ہیں اس کے علاوہ اس شب سے منسوب نماز و دعائیں اوراد کی پیروی بھی ہوتی ہے۔

بی بی کی کہانی: بی بی کی کہانی کی یہ روایت عموماً پاکستان کے اکثر قبائل میں مشترک ہے۔جو حضرت فاطمہ الزہرہؑ سے منسوب کی جاتی ہے۔یہ اس وقت پڑھی جاتی ہے جب کسی پر کوئی مشکل گھڑی آجائے۔اس کی منت مانی جاتی ہے اور اس مشکل کے حل ہونے کے بعد ایک کہانی جو بی بی کے معجزات کے ذکر پر مبنی ہے، پڑھی جاتی ہے۔یہ کہانی کچھ خواتین کو بلا کر خواتین یا اہل خانہ پڑھ کر سنائی جاتی ہے اور مجلس میں تمام شریک خواتین اس کو غور سے سنتی ہیں آخر میں شیرینی وغیرہ تقسیم کرتے ہیں۔

مشکل کشائی کی کہانی: یہ کہانی حضرت علیؑ سے منسوب ہے۔اس کا مصرف بھی بالکل اسی طرح ہے کہ کسی مشکل میں حل کی طلب کے لیے پڑھی جاتی ہے اور شیرینی تقسیم کی جاتی ہے۔

دس بیبیوں کی کہانی: یہ کہانی بھی کسی مشکل میں مشکل کشائی کے لیے پڑھی جاتی ہے جو کہ دس بیبیوں یعنی حضرت مریمؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت سارہؑ، حضرت آسیہؑ، حضرت ام کلثومؑ، حضرت ہاجرہؑ، حضرت زینبؑ، حضرت فاطمہ کبریٰؑ، حضرت فاطمہ صغریٰؑ اور حضرت سکینہؑ سے منسوب ہے۔اس کہانی کو بطور نمونہ یہاں ملاحظہ فرمائیں:

دو بھائی ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔بڑا بھائی بہت امیر اور چھوٹا بھائی بہت نادار اور مفلس تھا۔چھوٹا بھائی اپنی ناداری سے بہت عاجز ہو گیا تھا۔اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ یہاں پر ہم کب تک فقر و فاقہ کی مصیبت سہیں گے اب میں پردیس جاتا ہوں شاید کہیں نوکری مل جائے اور یہ مصیبت کے دن کٹ جائیں یہ کہہ کر وہ شخص اپنی بیوی سے رخصت ہو کر دوسرے شہر میں روزگار کی تلاش میں چلا گیا۔اب یہاں اس کی بیوی بہت پریشان تھی۔دل میں کہنے لگی۔اے پالنے والے تو رازق ہے اب تو میرا شوہر بھی چلا گیا اب میرا کوئی سہارا نہیں رہا۔سوائے تیری ذات پاک کے یہ مومنہ جب بہت مجبور ہو گئی تو اپنے شوہر کے بڑے بھائی کے گھر گئی اور اپنے سب حالات بیان کئے تمام حالات سن کر اس شخص نے بیوی سے کہا یہ میری بھاوج

سے تم اس سے گھر کا کام کراؤ۔ یہ تمہاری اور تمہارے بچوں کی خدمت کرے گی تم جو کچھ اپنے کھانے سے بچے دے دیا کرو غرضیکہ وہ مومنہ اپنے شوہر کے بھائی کے گھر کام کرتی اور سارا دن بچوں کی خدمت کرتی۔ اس پر بھی وہ رئیس عورت اسے طعنہ دیتی اور اپنے آگے کا بچا ہوا کھانا اس غریب کو دیتی اسی طرح ایک مدت گزر گئی۔ ہر رات یہ مصیبت زدہ مومنہ اپنے شوہر کی واپسی کی دعا مانگتی تھی۔ اس حالت میں ایک شب یہ مومنہ روتے روتے سوگئی۔ خواب میں دیکھا کہ ایک بی بی نقاب پوش تشریف لائیں اور فرمایا کہ اے مومنہ اپنے شوہر کے لئے اس طرح پریشان نہ ہو، انشاء اللہ تیرا شوہر صحیح وسلامت تجھ سے آکر ملے گا۔ تو جمعرات کے دن دس بیبیوں کی کہانی سن۔ اور جب تیرا شوہر آجائے تو میٹھی روٹی کا ملیدہ بنا کر اس کے دس لڈو بنانا اور اس پر دس بیبیوں کی نیاز دینا۔ اس عورت نے سوال کیا کہ آپ کون ہیں اور آپ کا نام کیا ہے اور ان بیبیوں کے نام کیا ہیں جن کی نیاز دلاؤں۔ تب جناب سیدہ نے فرمایا کہ میرا نام جناب فاطمہ ہے اور ان بیبیوں کے نام یہ ہیں۔ حضرت مریم، حضرت زینب، حضرت ام کلثوم، حضرت ہاجرہ، حضرت جناب فاطمہ صغری اور جناب سکینہ جنہیں کربلا سے لے کر شام تک مصیبت اٹھانا پڑی اور ان بیبیوں نے صبر کیا۔ قید کی مصیبت سہی، تازیانے کھائے جو شخص ان کے مصائب کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی حاجت طلب کریگا۔ خداوند عالم اس کی حاجت پوری کرے گا اور دسویں دن اس کی مراد پوری ہوگی، جب مومنہ خواب سے بیدار ہوئی تو وہ جمعرات کا تھا۔ وہ اپنے محلے میں گئی اور کہنے لگی کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے تم لوگ پاس بیٹھ کر جناب سیدہ کی کہانی سن لیا کرو محلے کی سب عورتیں اس کے پاس جمع ہوگئیں۔ تب اس مومنہ نے دس بیبیوں کی کہانی پڑھنا شروع کی۔ نو دن گزر گئے جب دسواں دن آیا تو یہ مومنہ کیا دیکھتی ہے کہ اس کا شوہر صحیح وسالم مال وزر کے ساتھ اس کے دروازے پر آیا ہے وہ بہت خوش ہوئی اور فوراً میٹھی روٹی کا ملیدہ بنایا اور اس کے دس لڈو بنا کر دس بیبیوں کی نیاز دلوائی اور محلّہ والوں کو تقسیم کیے انہوں نے بہت احترام سے لڈو لیے۔ اس کے بعد وہ مومنہ اپنے شوہر کی بھاوج کے پاس نذر کے وہ لڈو لے گئی اس پر مغرور عورت نے یہ کہہ کے لڈو واپس کر دیئے کہ ہم ایسے اینٹ اور پتھر کی چیزیں نہیں کھاتے ہیں ہمارے گھر سے یہ لڈو لے جاؤ وہ بیچاری لڈو لے کر واپس آ گئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اب اس مغرور عورت کا حال سنیے، رات کو وہ عورت سوگئی صبح کو کیا دیکھتی ہے کہ بچے اس کے مر گئے اور سب سامان غائب ہوگیا ہے یہ دیکھ کر اس کے حواس جاتے ہیں دونوں میاں بیوی روتے رہے جب بھوک سے برا حال ہوا تو گھر میں گیہوں کی بھوسی ملی۔ دل میں سوچا کہ اس کو پکا کر کھالے جیسے ہی بھوسی کو ہاتھ لگایا، اس میں برابر کے کیڑے نظر آئے جب اس کے شوہر نے یہ ماجرا دیکھا تو کہنے لگا میری بہن کے گھر چلو وہاں روٹی تو ملے گی۔ گھر بند کر کے دونوں میاں بیوی پیدل چلنے لگے۔ چلتے چلتے ان کے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ راستے میں ان کو چنے کا ہرا کھیت نظر آیا، شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم یہاں ٹھہر جاؤ، میں چنے کی تھوڑی سے بالیں توڑ لاؤں تا کہ ان کو کھا کر جسم میں کچھ طاقت آجائے یہ کہہ کر وہ بہت سی چنے کی بالیں توڑ لایا مگر جیسے ہی اس کی بیوی نے چنے کی بالوں کو ہاتھ لگایا۔ وہ سوکھ کر گھاس بن گئیں۔ دونوں گھاس کو پھینک کر آگے چلے۔ راستے میں بہت بڑا گنے کا کھیت نظر آیا میاں بیوی دونوں بھوک اور پیاس سے بیتاب تھے۔ گنے کو دیکھ کے بے قرار ہو گئے شوہر بہت سے گنے توڑ کر لایا اور بیوی کے ہاتھ میں دیئے تو وہ ایندھن بن گئے وہ دونوں بہت گھبرائے اور ایندھن پھینک کر آگے چل دیئے۔ بمشکل یہ شخص اپنی بیوی کے ہمراہ اپنی بہن کے گھر پہنچا بہن نے ان کے لیے بچھونا بچھا دیا۔ دونوں نے جب آرام کیا تو بہن نے آکر کھانا دیا یہ لوگ کئی دن سے بھوکے تھے کھانا دیکھ کر بہت خوش ہوئے جیسے ہی اس کی بیوی نے روٹی کا ٹکڑا توڑا، کیا دیکھتی ہے کہ کھانے میں سخت بدبو آرہی ہے اور کھانا سڑ گیا ہے عورت اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی اللہ اب ہم کب تک بھوکے رہیں گے۔ ہماری جان نکلی جارہی ہے اس کی بیوی نے کھانے کو دفن کر دیا اور دونوں سو گئے رات اسی طرح گزری صبح ہوئی تو شوہر نے بیوی سے کہا یہاں پر بادشاہ میرا دوست ہے چلو اس کے یہاں چلیں اس مصیبت کے عالم میں وہ ہماری مدد کرتا ہے دونوں بادشاہ کے پاس گئے وہ بادشاہ کے حضور پہنچے تو بادشاہ نے ان دونوں کا پہچان لیا۔ ان کو الگ کمرہ دیا اور کہا کہ تم دونوں غسل کر کے آرام کرو بادشاہ نے حکم دیا کہ ہمارے مہمانوں کو سات رنگ کا کھانا بھیجو حکم کے مطابق سات قسم کے کھانے ان دونوں کیلئے آئے۔ دونوں نے کھانا دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آ بیٹھے۔ وہ عورت جس کھانے کو چھوتی کھانا سڑ جاتا۔ غرضیکہ تمام کھانا سڑ گیا اور کیڑے دکھائی دینے لگے۔ اس کا شوہر حیران ہوگیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اگر ہم بادشاہ سے شکایت کر دیں گے تو بادشاہ ناراض ہوگا کھانا تازہ بھیجا اور تم بدنام کرتے ہو۔ وہ بہت گھبرایا اور بیوی سے کہنے لگا کہ اب میں کیا کروں دونوں کھانا لے کر باہر گئے اور زمین میں دفن کر دیا اور باہر صحن میں بیٹھ گئے۔ اس عرصے میں بادشاہ کی لڑکی اور بیوی غسل کرنے جارہی تھیں۔ دونوں نے اپنے گلے سے چندن ہار اتار کر کھونٹی پر ٹانک دیئے جونہی ہار ٹانکے فوراً کھونٹی نے ہار نگل لیے یہ ماجرا دیکھ کر بادشاہ کی بیوی اور بیٹی کو سخت تعجب ہوا۔ وہ عورت بیٹی دیکھ رہی تھی گھبرا کر اپنے شوہر کے پاس گئی اور کہنے لگی، خدا خیر کرے اس کے شوہر نے پوچھا کیوں کیا ہوا۔ تب اس نے چندن ہار کا واقعہ سنایا

اور کہا کہ یہاں سے جلدی چلو ایسا نہ ہو کہ بادشاہ ہم کو قید کرے اور قتل کروادے، دونوں بغیر اطلاع کیے بادشاہ کے یہاں سے چل دیئے چلتے چلتے وہ دریا کے کنارے پہنچے۔ وہاں جا کر دونوں میاں بیوی بیٹھ گئے، شوہر نے بیوی سے کہا کہ نہیں معلوم ہم سے کیا خطا ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم پر اتنا عذاب نازل ہوا ہے بیوی نے کہا کہ مجھ سے ایک خطا ضرور ہوئی ہے وہ یہ کہ جب تمہارا بھائی ملازمت کرنے پردیس گیا تھا کافی عرصے تک وہ لاپتہ رہا جس کی وجہ سے تمہاری بھاوج بہت پریشان رہتی تھی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک نقاب پوش بی بی تشریف لائی ہیں اور انہوں نے فرمایا کہ دس بیبیوں کی کہانی سن۔ دسویں دن تیرا شوہر آجائے گا۔ اس پر تمہاری بھاوج نے عمل کیا سچ مچ تمہارا بھائی مال وزر کے ساتھ واپس آ گیا تمہاری بھاوج نے دس لڈو بنائے اور دس بیبیوں کی نذر دلوائی اور لڈو تقسیم کئے اور وہ ایک لڈو میرے حصہ کا لے کر آئی تو میں نے وہ لڈو نہیں لیا اور یہ کہہ کر واپس کر دیا میں ایسے اینٹ اور پتھر کھانے والی نہیں ہوں۔ جب سے ہم پر یہ مصیبت نازل ہوئی ہے۔ شوہر نے کہا کہ کم بخت تو نے ایسے غرور اور تکبر کے الفاظ کہے تو جلد توبہ کر اور معافی مانگ تا کہ ہم کو مصیبت سے نجات ملے۔ اس عورت نے وضو کیا نماز پڑھی اور رو رو کر دعا کی، اے بنت رسول اس مصیبت کے عالم میں میری مدد کیجئے۔ اس کے بعد اس نے نہر سے ریت لے کر لڈو بنائے اور اس پر بیبیوں کی نذر دی۔ باعجاز جناب سیدہ زینب وام کلثوم لڈو موتی چور ہو گئے یہ دیکھ کر دونوں نے درود پڑھا پانچ لڈو بیوی نے کھائے اور پانچ شوہر نے کھائے اور پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا جب وہ گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا مکان اپنی اصلی حالت پر تھا۔ سب بچے زندہ ہو گئے اور نوکر چاکر اپنے کام کاج میں مشغول تھے غلہ وغیرہ سب بھرا ہوا تھا۔ اور بچے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے ماں باپ کو دیکھ کر بچے بہت خوش ہوئے اور وہ بھی اپنے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

اے میری بیبیوں جس طرح تم نے اس عورت کی خطا معاف کی اس طرح کل مومنوں کی خطائیں معاف ہوں ان کی دلی مرادیں پوری ہوں اور بے اولاد کو اولاد دے۔ قرضداروں کو قرض سے خلاصی عطا فرمائے اور ہر مصیبت زدہ کی مصیبت دور کرے۔ آمین ثم آمین

نذر شمع: شمعیں جلانے کی یہ نذر یا منت بھی کسی حاجت یا مشکل کے حل کیلئے ہوتی ہے اور شمع بی بی یا شمع امام زمانہؑ سے منسوب شمعیں جلائی جاتی ہیں یعنی جس امام یا بی بی سے مراد مانگی ہو انہی کے نام کی شمعیں جلائی جاتی ہیں۔ یہ شمعیں ہر شب جمعہ یا شب چہار شنبہ امام بارگاہ کے علاوہ گھروں میں بھی جلائی جاسکتی ہیں۔ یہ شمعیں سات ہفتوں تک جلائی جاتی ہیں۔ شمع کے آخر تک جلنے کو مراد پوری ہونے کا سندیسہ سمجھا جاتا ہے۔ مراد پوری ہو جانے پر اسی امام یا بی بی کے نام پر نذر و نیاز بانٹی جاتی ہے یا پھر کھانا وغیرہ پکا کر نذر کیا جاتا ہے۔

نذر قدم خیری: بالخصوص کسی بچے کے خسرہ کے دانوں کے ٹھیک ہونے کی صورت میں دی جانے والی ''کوچے'' کی مخصوص نذر کو نذر قدم خیری کہتے ہیں۔ یعنی بچے کے ٹھیک ہونے پر کوچے بنا کر خیرات کئے جاتے ہیں جبکہ اس کے علاوہ بھی شب جمعہ اموات کی ارواح کیلئے روٹی یا حلوہ وغیرہ تقسیم کرتے ہیں۔ کسی بیماری سے جان چھوٹنے یا کسی خطرے کے ٹل جانے کی صورت میں نذر و خیرات کرنے کا یہ عمل قدم خیری کہلاتا ہے۔

خوشی کے تہوار

اس حوالے سے اکثر تہوار اسلامی ہیں جو کہ تمام مسلمانوں میں یکساں مقبول ہیں۔ لیکن کچھ روایتی بھی ہیں۔ جبکہ ان معروف اسلامی تہواروں کے منانے کے مختلف انداز ہی ان کے قبائل میں تنوع اور ایک دوسرے سے برابر الگ پہچان بناتے ہیں۔

نوروز: نوروز ہجری شمسی سال کا پہلا دن ہے یعنی اس دن بہار کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اور اس دن کو بطور عید کے مناتے ہیں۔ یہ شمسی حوالے سے سال کا تحویل دن ہوتا ہے۔ جس کا باقاعدہ دعا کے ساتھ استقبال کیا جاتا ہے جس کی مختصر شکل یوں ہے۔

یا مقلب القلوب والابصار
یا مدبر اللیل و النہار
یا محول و الاحوال
حول حالنا الیٰ احسن الحال

اس روز کی باقاعدہ نماز و دعائیں ہیں اور عقیدہ ہے کہ ان کو پڑھنے سے زندگی اور شادابی آتی ہے۔ عام طور پر اس کو ایک عید کی طرح منایا جاتا ہے۔ اس روز نئے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارکباد دی جاتی ہے کچھ لوگ ایک دوسرے کے پاس ملنے کے لیے جاتے ہیں۔ بلکہ پکنک وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہے اور ایک دوسرے پر پانی پھینکا جاتا ہے، جس کو اصحاب کہف کی سنت کی پیروی کا نام دیا جاتا ہے کہ ان کی بوسیدگی کے بعد پانی کے چھڑکاؤ سے ان میں دوبارہ جان آئی تھی۔ نوروز سے کچھ لوگ نو دنوں کا مفہوم اخذ کرتے ہیں جبکہ یہ دراصل ''نو'' نیا ''روز'' (دن) کا مرکب ہے یعنی "نیا دن"۔

عید غدیر: یہ ۱۸ ذالحجہ کو باقاعدہ ایک عید کی طرح منایا جاتا ہے۔ اکثر لوگ اسی

دن شادی، منگنی یا نکاح کا اہتمام کرتے ہیں۔اس کی مناسبت سے رشتہ بابرکت ثابت ہو۔یہ دراصل حجۃ الوداع کے خطبے کا دن ہے جو مقام غدیر پر دیا گیا تھا۔اس روز بھی نئے لباس پہننے کو ترجیح دی جاتی ہے اور سیدوں سے باقاعدہ عیدی لی جاتی ہے اور عوام۔کے علاوہ انہیں خصوصی طور پر مبارکباد دی جاتی ہے۔

عید مردہ: یہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ دونوں سے چند روز پہلے منائی جاتی ہے۔اس کے منانے کا سادہ طریقہ ہے یعنی اس تصور سے کہ ہم چونکہ چند روز میں عید منائیں گے سو اس سے قبل مردوں کی ارواحوں کو خوش کرنے کی غرض سے کوئی کھانا وغیرہ پکا کر خیرات کرتے ہیں۔اس طرح ان کی یاد منا کر عید مردہ منائی جاتی ہے۔لیکن یہ بہت عام نہیں ہے۔

دیگر عیدیں: عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی رات خواتین اور بچوں کے ہاتھوں میں مہندی لگائی جاتی ہے جبکہ صبح سویرے نماز فجر کے بعد اکثر لوگ قبرستان جاتے ہیں۔ قبرستان میں بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ ہر گھرانہ اپنے مرحومین کی قبروں پر شمعیں اور اگر بتیاں جلا کر ان سے اظہار عقیدت کرتا ہے۔اس کے علاوہ عید کی نماز قربانی اور معانقہ کرتے ہوئے عید کی مبارکباد کہنے کا وہی روایتی انداز ہے جو پورے ملک میں رائج ہے۔لیکن ایک خاص بات اور یہ ہے کہ نماز عید کے بعد سب سے پہلے ان گھروں کی طرف جایا جاتا ہے جہاں گزشتہ عید کے بعد اور اس عید سے پہلے کوئی فوتگی ہو چکی ہو۔وہاں فاتحہ دے کر پھر عزیز و اقارب کے ہاں جایا جاتا ہے۔

سیبتی: یہ ایک قسم کی خوشخبری یا کوئی بھی نوید سنانے سے متعلق ہوتی ہے۔مثلاً جب کسی کا مسافر آتا ہے۔اس کی خبر دی جاتی ہے یا کسی کو بیٹے کی پیدائش کی خبر دینا اس خبر کو ''سیبتی'' کہتے ہیں جس کے بدلے میں خبر پانے والے شخص کو خبر لانے والے کو کچھ نہ کچھ دینا ہوتا ہے۔

میل جول کے آداب

معانقہ کرنا: مذکورہ قبیلوں میں ملنے جلنے کی عادات میں ہاتھ ملانے اور گلے ملنے کی رسم بہت ہی عام ہے۔یعنی ممکن ہے کہ کسی دو اشخاص کی ملاقات دن میں چار پانچ مرتبہ ہو۔تب بھی سلام کہتے ہوئے وہ ہاتھ ضرور ملائیں گے جبکہ ایک دن بعد کی ملاقات پر بھی معانقہ کیا جاتا ہے۔ویسے یہ کوئٹہ کا مجموعی کلچر بن چکا ہے۔ان قبیلوں میں گلے ملنے کے علاوہ ایک دوسرے کے گالوں پر دو تین مرتبہ بوسہ دینا یا ہاتھ ملا کر گال سے گال ملانے کی رسم بھی ہے جبکہ خواتین میں ہاتھ ملانے کے علاوہ معانقہ کی بجائے گالوں کا بوسہ لیا جاتا ہے۔

مہمان کا استقبال: جب کوئی کسی کے گھر جاتا ہے تو دروازے پر دستک ضرور دیتا ہے۔اگر محرم ہو تو اندر سے انہیں آواز دی جاتی ہے کہ ''تشریف لائیے'' اور وہ ''یا اللہ یا اللہ'' کا ورد کرتے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے کہ اگر کوئی خاتون وغیرہ یا کوئی اور فرد بے خیالی میں بیٹھا ہو تو باخبر ہو جائے جبکہ دروازے پر مہمان کا استقبال کیا جاتا ہے۔گھر میں پردہ کروا کر اسے اندر لایا جاتا ہے۔جبکہ اکثر گھروں میں مہمان خانہ (بیٹھک) جدا ہوتا ہے۔مہمان کیلئے گدہ اور تکیہ رکھنا لازمی جزو ہے جبکہ واپسی پر مہمان کے جوتے اس کے پاؤں کے آگے درست کرنے کی رسم ہے۔جبکہ بچے مہمان سے ملتے وقت اس کا ہاتھ چومتے ہیں۔

چھوٹوں کا رویہ: ان قبائل میں چھوٹوں پر عموماً بڑوں کا احترام واجب گردانا جاتا ہے۔اگر کوئی بڑا بھی باہر سے گھر میں داخل ہو تو اس کی بجائے گھر میں موجود چھوٹے (خصوصاً بچے) اس کو سلام کریں گے جبکہ خواتین بھی آگے بڑھ کر سلام کریں گی۔کسی محفل میں کوئی بڑا یا بزرگ داخل ہو تو چھوٹے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جبکہ اس لئے اپنی نشست بھی خالی کی جاتی ہے۔گھر کے کام کاج اور سودا سلف کی ذمہ داری بھی نسبتاً گھر کے چھوٹے پر ہوتی ہے۔جبکہ مشترکہ خاندانی نظام میں زیادہ کمانے والے افراد کی اور کم کمانے والوں کے درمیان اسی حوالے سے کوئی تمیز روا نہیں رکھا جاتا ہے۔

سید کا احترام: ان قبائل میں حضرت محمدؐ کی اولاد یا پھر حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی نسبت سے سید کا زیادہ احترام ہوتا ہے۔یعنی سید سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ چومتے ہیں جبکہ کسی محفل میں بیٹھتے وقت سید کو بہتر جگہ پر بٹھاتے ہیں اور دعائے خیر وغیرہ میں بھی سید کو اولیت دی جاتی ہے۔سیدوں کو ''آغا'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ اگرچہ یہ لفظ احترام کے لئے جناب اور صاحب کے معنوں میں عموماً استعمال ہوتا ہے لیکن سید کے نام کی بجائے اسے ''آغا'' ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔کسی کام کا آغاز یا افتتاح کرنا ہو تو بھی سید کے ہاتھوں سے کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔جبکہ سید زادیوں کو عام افراد بہو بنانے سے کتراتے ہیں کہ کہیں ان کے حق میں گھر کے ماحول میں بے احترامی کا موقع نہ آئے جبکہ سید بھی اکثر اپنی بیٹیاں عام مرد سے بیاہنے سے پرہیز کرتے ہیں لیکن عام گھر کی بیٹی کو سید بہو بناتے ہیں کیونکہ ایک عام شخص اپنی بیٹی کو سید کی بہو بنانے پر فخر محسوس کرتا ہے۔

عیادت: یہ بلوچستان کا مجموعی کلچر ہے کہ بیمار کی عیادت ضرور کرتے ہیں۔کسی کی

خوشحالی کی تقریب میں شریک ہوں نہ ہوں لیکن غم و بیماری میں ضرور حاضری دینا چاہیں گے۔ بیمار کے ہاں جاتے ہوئے پھل وغیرہ لے جایا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں، خالی ہاتھ بھی جایا جاسکتا ہے اور پوچھتے ہوئے اس جملے سے آغاز کریں گے کہ ''نصیب دشمناں'' کیا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔

سرراہ: سرراہ عموماً سلام کیا جاتا ہے اور احوال لیتے ہیں لیکن اگر دونوں جانب میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی خاتون جارہی ہو تو خاموشی سے گزریں گے۔ چاہے جتنی آشنائی ہو، راستے میں احوال نہیں کریں گے۔

تعویذ گنڈے: ہزارہ اور قندھاری قبائل میں تعویذ گنڈوں پر زیادہ اعتقاد ہے۔ خصوصاً خواتین اس حوالے سے زیادہ فعال نظر آتی ہیں۔ مثلاً بے اولادی، گھریلو ناچاقی اور بیماری، تلاش رشتہ، بے روزگاری، اولاد کی گمراہی، گمشدگی، ساس بہو کا جھگڑا، شوہر کی بداخلاقی وغیرہ وغیرہ، ہر معاملے تعویذ گنڈوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے اکثر سید افراد ہی تعویذ گنڈوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ ان افراد کا نذرانہ نقد رقم کے علاوہ اناج (جو کہ آج کل تقریباً متروک ہے)، زیور، مرغی، دنبہ وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے۔

اکثر مسائل کے لیے تو تعویذ دیتے ہیں لیکن کہیں کہیں ہڈی پر دم پڑھ کر دیتے ہیں کبھی سوئی دم کرتے ہیں اور کسی مسئلے کے لیے کوئلہ پر پھونک مار کر دیا جاتا ہے۔

تلاش گمشدہ: گمشدگی کے لیے کسی نابالغ بچے کو بٹھا کر اس کے سر پر چادر ڈال کر اس سے مولوی کہتا ہے کہ اپنے انگوٹھے میں دیکھ کیا نظر آرہا ہے؟ اور وہ بچہ مولوی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے چور کا حلیہ، رنگ، قد، جنس وغیرہ سب بتاتا جاتا ہے اور اس طرح متاثرہ شخص کو وہ عامل چور کا ایک خاکہ دے دیتا ہے۔ جس پر کوئی بھی شخص اس کے عتاب کا شکار ہوسکتا ہے۔

معجزہ: ان قبائل کے عزاداری کلچر میں بھی توہمات نے جگہ بنالی ہے۔ جن میں ایک معجزہ ہے۔ یہاں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اس وقت بھی آئمہ معجزات دکھاتے ہیں اور ہر سال کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں کسی معجزے کا اعلان ہوجاتا ہے۔ یعنی کہیں علم لرزنے لگتا ہے، کہیں نور کی جھلک نظر آتی ہے۔ کہیں خون ٹپکتا نظر آجاتا ہے۔ یہ تمام کسی امام بارگاہ کے علاوہ کسی ایسے گھر میں بھی رونما ہوسکتا ہے جہاں مجلس عزا برپا ہوگی اور وہ جگہ بذات خود مرادیں دینے کا ایک مرکز بن جاتی ہے جہاں خواتین اپنی ہر طرح کی مراد لے کر جاتی ہیں۔ اس حوالے سے کوئٹہ کی شیعہ آبادی میں کئی ایسے مقامات ہیں جہاں معجزے کے نام پر زیارت گاہیں بنی ہوئی ہیں۔

نظر اتارنا: نظر لگنے کی روایتیں کم وبیش تمام قبائل میں موجود ہے۔ بچہ بیمار ہو تو اس کو نظر بد کا نتیجہ تصور کیا جاتا ہے۔ کھیلتے ہوئے گر پڑے تو نظر بد، کاروبار خراب ہو تو نظر بد، رشتہ خراب ہو تو نظر بد، جانور دودھ دینا کم کردے تو نظر بد، یعنی زندگی میں کوئی بھی کمی یا مسئلہ پیدا ہو تو نظر بد ہوسکتی ہے۔ نظر بد اتارنے کے بھی مختلف طریقے ہیں جن میں ایک پھٹکڑی کا استعمال ہے۔ یعنی جو بچہ بیمار ہوجاتا ہے تو پھٹکڑی کو اسکے بدن پر مل کر آگ پر پگھلایا جاتا ہے۔ جب پھٹکڑی آنکھ شکل اختیار کرلے تو ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ نظر بد کا نتیجہ ہے۔ اور اس پھٹکڑی کے اندر سوئی چبھو کر اسے چار راہ پر پھینک دیا جاتا ہے لیکن پھینکنے والا اس کو چوک پر پھینک کر پہلے تو اپنے پاؤں سے مسل دے اور اس کے بعد گھر آتے ہوئے پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ جبکہ نظر لگ جانے کی صورت میں ہرمل کے دھوئیں سے بھی نظر اتاری جاتی ہے اور جس شخص پر شبہ ہو کہ اس کی نظر لگ گئی ہے یا گھر کا کوئی ایسا فرد جس کی نظر لگتی ہو، اس کے ازار بند کا دھاگہ بھی ان انگاروں پر ہرمل کے ساتھ ڈالا جاتا ہے۔

جب کوئی بچہ بیمار پڑ جائے اور اس کی بیماری ٹھیک نہ ہو تو بھی نظر بد کا نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اس کا نام بدل لیتے ہیں۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نام اس بچے پر بھاری ہے۔ اس لئے اس کا نام بدل دینا چاہئے۔

جھاڑو دینا: جھاڑو سے مختلف قبائل میں مختلف توہمات وابستہ ہوتے ہیں۔ ان قبائل میں جھاڑو دینے کا عمل مغرب کی اذان کے بعد نیستی کی علامت سمجھا جاتا ہے جبکہ جس صبح مسافر گھر سے نکلتا ہے اس روز بھی گھر میں جھاڑو نہیں دی جاتی ہے۔

جن چڑھنا: کسی بچے کو اگر مرگی یا کوئی اور سمجھ میں نہ آنے والی بیماری ہو تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو جن چڑھ گیا ہے اور مولوی یا عامل سے علاج کرواتے ہیں۔ وہ اس بچے کو باندھ کر خوب مارتا پیٹتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس کا جن نکال رہا ہوں۔ جبکہ یہ بھی خیال ہے کہ نیک جن جس کو چڑھ جائے وہ چاہے ان پڑھ بھی ہو تو قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ جبکہ برا جن جس کو چڑھا ہو وہ شخص تخریب کاری کرے گا۔ برتن وغیرہ توڑے گا۔ لہٰذا اس جن کا علاج بھی تعویذ گنڈوں سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ کچھ لوگ بچے کی پیدائش پر کچھ کھانا وغیرہ گھر کے باہر رکھ لیتے ہیں تاکہ جن کو کھانا ملے اور وہ اس بچے کو نقصان پہنچانے کے درپے نہ ہو۔

مختلف توہمات:

جو شخص بلی کو مار ڈالے اس پر سات سیدوں کے قتل کا عذاب نازل ہوگا۔

کالی بلی جادوئی طاقت رکھتی ہے۔

جس گھر میں کتا ہو وہاں فرشتے نہیں آتے۔

اگر کوئی شخص سخت بیمار ہو اور آدھی رات کو کتا بھونکے تو یہ اس شخص کی موت کی خبر ہوتی ہے۔

کبوتر کے ہوتے ہوئے بدروحیں کسی گھر میں داخل نہیں ہوتیں۔

کھٹل جس گھر میں موجود ہو وہاں غربت آئے گی۔

بچے کی پیدائش پر ماں کا مرنا بدروحوں کی کارستانی ہے۔

اگر کسی مسافر کا راستہ کالی بلی کاٹے تو وہ بدشگونی کی علامت کہلاتی ہے اور اسے واپس لوٹنا چاہئے۔

سبز آنکھوں والے شخص کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔

رات کو سبز درخت کے نیچے سے گزرنا خطرناک ہوتا ہے۔

بدھ کے روز سفر پر نکلنے والے کو کسی حادثے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کمرے کے اندر ناخن کاٹنا نیستی کی علامت ہے۔

جمعہ کی رات فوت ہونے والا نیک شخص تصور ہوتا ہے۔

بادل گرجتے وقت پشت کو تھپکاتے ہوئے ''برکت برکت'' کہا جائے تو وہ شخص امیر ہو جائے گا۔

اگر ہتھیلی میں کھجلی ہو تو رقم آنے کی نوید ہے۔

اگر جوتا دوسرے جوتے پر سوار ہو تو سفر درپیش ہوگا۔

آنکھ پھڑکنے لگے تو اچھی خبر کی توقع رکھنی چاہئے۔

متواتر ہچکی آرہی ہو تو کہا جاتا ہے کہ کوئی یاد کر رہا ہے۔

چکور جس گھر میں ہو وہ گھر جادو کے اثر سے محفوظ رہے گا اور اگر اثر ہو بھی جائے تو پہلے چکور پر ہوگا اور وہ مرے گا۔

اگر کوئی بچہ سر نیچے کر کے دونوں پاؤں کے درمیان میں سے پیچھے کو دیکھے تو اسے کسی مہمان کی راہ دیکھنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہفتے کے ایام: ہفتہ کے ایام کے حوالے سے بھی مختلف تصورات موجود ہیں جیسے جمعہ کے دن دوپہر کے بعد سفر کرنا بہتر ہے۔ اس دن نئے کپڑے پہننا نیک شگون ہے۔

سوموار جمعرات اور ہفتے کے دن سفر کے لیے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔

بدھ کا دن سفر کے لیے بدترین دن ہے۔

ہفتے کا دن نئے کپڑے پہننے شادی کرنے اور مکان خریدنے کے لیے بہتر ہے۔

بدھ کی رات وفات پانے والا شخص منحوس تصور کیا جاتا ہے۔

بدھ کے دن غسل کرنے والا بیمار ہو جائے گا۔

بدھ کے روز کسی کی عیادت کو کبھی نہیں جانا چاہئے۔

اتوار کے روز نئے کپڑے کاٹنا برا شگون رکھتا ہے۔

سوموار نئے کپڑوں کے پہننے کے لیے بہتر دن کہلاتا ہے۔

کھیل و مشاغل

ویسے تو آج کل کے ماحول میں تقریباً اکثریت رواج پانے والے کھیلوں کسے کرکٹ، فٹ بال، ہاکی وغیرہ کی طرف دھیان دینے لگے ہیں اور مقامی کھیل اور مشاغل رفتہ رفتہ ماند پڑ رہے ہیں لیکن یہاں چند ایک ایسے مشاغل کا ذکر کرتے چلیں جو ہزارہ اور قندھاری برادری میں رواج رکھتے ہیں۔ خواتین کی مصروفیات عموماً باہمی رفت و آمد اور قریبی زیارت پر جا کر گپیں ھانکنا ہوتا ہے۔ اگر قدیم دور میں شاید کچھ ایسی مشاغل تھے جو ان قبایل کی خواتین کی وقت گزاری کا سامان بھی بنتے لیکن اب گھر میں کیبل کی آمد نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے، تقریباً ہر گھر میں اس وقت کیبل کی دم پہنچی ہوئی اور جس کے گرد خواتین (بالخصوص) اور بچے یا فارغ مرد اکھٹے ہوئے ہیں اس طرح آہستہ آہستہ تمام ثقافتی اور روایتی مشاغل دم توڑتے جا رہے ہیں۔ ویسے بھی مرکزی شہر ہونے کی وجہ سے یہاں جدید رجحانات کے اثرات زیادہ تیزی سے سرایت کر رہے ہیں یہ نسبت بلوچستان کے دیگر شہروں کے بلوچستان کے دیگر شہروں میں ابھی یہ روایتیں زندہ ہیں لیکن چونکہ ہزارہ اور قندہاری برادری تمام شہر نشین ہیں اس لیے ان کے ہاں اب یہ چیزیں دم توڑتی نظر آرہی ہیں۔ بہرحال چند ایک کا یہاں ذکر کرتے چلیں۔

بزکشی: مقامی کھیلوں میں ی یہ ایک ایسا کھیل ہے جو عالمی شہرت رکھتا ہے جبکہ افغانستان میں تو بڑے پیمانے پر یہ کھیل کھیلا جاتا ہے اور شمالی علاقہ جات میں بھی یہ موجود ہے۔ لیکن یہاں شاذ و نادر اس کا مظاہرہ ہو جاتا ہے تاریخ و ثقافت ہزارہ کے مولف کوثر علی کوثر کے مطابق اس کھیل کا آغاز وسطی اشیا میں صدیوں سے پھیلا ہوا ہے لیکن افغان قبایل میں بھی اس کو مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔

اس کھیل میں گھوڑے اور بکری کا استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ آج کل بکری کی بجائے بھیڑ سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔

یہ کھیل کھلے میدان میں کھیلا جاتا ہے جس میں عموماً بارہ بارہ افراد کی ٹیمیں

ہوتی ہیں، دونوں ٹیمیں اپنی مکمل تیاری کے ساتھ قطاروں میں کھڑی ہوتی ہیں۔ اور ذبح شدہ بکری کو میدان کے وسط میں ایک کھڈے میں رکھا جاتا ہے اور سیٹھی کے بجنے پر تمام اس بکری کی طرف بڑھتے ہیں، اس کھیل میں عموماً مشاق اور تنومند گھوڑے شامل ہوتے ہیں کیونکہ دیگر گھڑ سواروں کے ہجوم میں پھرتی سے بکری پر لپکنا اور اسے اٹھا کر منزل مقصود کی جانب یوں دوڑنا کہ مخالف کی گرفت سے بھی بچا جائے عام آدمی کے بس کی بات نہیں، کیونکہ یہ ایک ایسی چھینا جھپٹی کی حالت ہوتی ہے جیسے جنگل میں چند بھیڑیئے کسی ایک جانور کی کھینچا تھانی میں لگے ہوتے ہیں۔ اس کھیل کو کوئٹہ میں دوبارہ زندہ کرنے کے لیے باقاعدہ کوششیں ہو رہی ہیں جو ایک خوش آئند اقدام ہے بزکشی فارسی کے دو الفاظ کا مرکب ہے۔ "بز" بکری کو کہتے ہیں جبکہ "کشی" کا مصدر "کشیدن" ہے جس کے معنی کھینچنا ہے۔

تیر اندازی: تیراندازی بھی ایک قدیم روایتی مشغلہ ہے جس کا مقصد جوانوں کو شکار اور جنگ کیلئے تربیت دینا تھا۔ لیکن اب یہ محض مشغلہ ہو کر رہ گیا ہے جبکہ کہا جا سکتا ہے کہ اسی تیراندازی کی جدید شکل نشانہ بازی ہے، جس میں تیر کی بجائے بندوق کی گولی کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جدید فارسی میں بندوق کی گولی کو بھی کہتے ہیں۔ اس میں ایک خاص نشانے پر تیر یا گولیاں برسائی جاتی ہے اور باقاعدہ ٹیموں کی شکل میں کسی شرط وغیرہ کے اساس پر یہ مقابلہ ہوتا ہے ویسے تیراندازی جو کہ مقبول اور بین الاقوامی مشغلہ ہے اس کی تفصیل بیان کرنا یہاں اس لئے بے جا ہوگا کہ اس کی شرائط اور ضوابط کا سب کو علم ہے۔

توپ چو: "توپ" گیند کو کہتے ہیں اور "چو" فارسی کے "چوب" کی ہزارگی شکل ہے یعنی گیند اور لکڑی کا کھیل یہ کرکٹ یا بیس بال کے قریب کھیل ہے جس میں دو ٹیموں کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے ایک دائرے درمیان میں کھینچ کر اس سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر دو لکیریں بھی کھینچی جاتی ہیں، باری حاصل کرنے والی ٹیم اس گیند کو ایک لکڑی پر رکھ کر دوسرے سے یوں مارتی ہے کہ وہ دور جا گرتا ہے۔ اسی دوران اس ٹیم کا کھلاڑی دائرے سے اپنی لکیر تک دوڑتا ہے اور دوسرے گروہ کا فرد گیند پکڑ کر اس کو اس سے مارنے کی کوشش کرتا ہے۔

گلی ڈنڈا: یہ بھی شاید پاکستان بھر میں مقبول کھیل ہو لیکن یہاں جوانوں اور بچوں سب میں یکساں مقبول ہے۔ اس میں ایک لکڑی کا ڈنڈا اور ایک لکڑی ہی کا چھوٹا ٹکڑا جو تقریباً چار پانچ انچ کی لمبائی کا ہوتا ہے استعمال ہوتے ہیں۔ چھوٹی لکڑی کے دونوں سرے تراشے جاتے ہیں۔ تاکہ جب زمین پر اسے رکھا جائے تو وہ سر سے زمین کی سطح سے اوپر ہوں۔ اس کو گلی کہتے ہیں جبکہ ایک چھوٹا سے گھڑا بھی گھودتے ہیں جس کو پل کہتے ہیں، گلی کو اس کے کنارے رکھ کر ڈنڈے سے اس کے سرے کو آہستہ مارتے ہیں جب وہ گلی اچھل جاتی ہے تو اسی ڈنڈے سے اسے بڑی پھرتی سے مار کر دور پھینکتا جاتا ہے اس کھیل کے مختلف مراحل ہیں اور مختلف طریقوں سے بھی کھیلا جاتا ہے اس کھیل میں میں کرکٹ کی طرح گلی کو کھینچ کرنا ہی مخالف کو شکست دینا ہے۔

پٹوگرم: کھیل بھی بچے اور نسبتاً نوجوان لڑکے سب کھیلتے ہیں اس میں چند پتھروں یا ٹھیکروں کو گول کر کے ایک دوسرے کے اوپر مینار کی شکل میں رکھا جاتا ہے اور ایک گروہ اس مینار کو مقررہ فاصلے سے گیند سے مار کر گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ پتھر بکھر جاتے ہیں تو دوسرا گروہ اس کو فوراً دوبارہ کھڑا کرنے لگتا ہے اس دوران اگر وہ کامیاب ہوا تو جیت جائے گا اور اگر اس مینار کو کھڑا کرنے کی حالت میں مخالف گروہ فرد گیند پکڑ کر اسے مارے تو اسکو شکست ہوگی۔ اور اس مینار کو کھڑا کرنے کے عمل کی تکمیل کو پٹوگرم کہتے ہیں یعنی جونہی وہ مینار کھڑا کر دیا جاتا ہے تو وہ اور اسکے ساتھی بلند آواز میں کہہ اٹھتے ہیں کہ "پٹوگرم"۔

بغل کشی: بغل کشی وہی کشتی ہے جس کو ان قبایل بالخصوص ہزارہ قبیلہ پسند کرتے ہیں اس میں وہی کشتی کے لوازمات اور شرائط وغیرہ کارفرما ہوتے ہیں یعنی دو مرد میدان میں نکل کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوں کر ایک دوسرے کی پیٹ زمین تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح یہ مقابلہ کبھی کبھی طویل دورانئے تک طول کھینچتا ہے اس کھیل کیلئے بھی قوی ہیکل جوانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

سنگ پرانی: یہ کھیل اب بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس کو ہم گولہ پھینکنا کہتے ہیں۔ ان قبایل میں گولی پتھر کو کسی کھلے میدان میں دور پھینک کر جوانوں کے زور اور طاقت کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ سنگ تو وہی پتھر ہے جبکہ پرانی کا مصدر "پراندن" یعنی پھینکنا ہے۔

بوجل بازی: اس کو "بیڈی" بھی کہتے ہیں یہ بھیڑ، بکری کے گھٹنے کی خاص شکل میں بنی ہوئی ہڈی ہوتی ہے جو بلوچستان کے تقریباً تمام قبائل میں عام ہیں۔ اس مشغلہ کے عمر کی حد جوانوں سے لے کر چھوٹے بچوں تک ہے بوجل ہزارگی کا لفظ ہے جبکہ عام طور پر اس کو بیڈی کہتے ہیں اسکی تفصیل پشتون قبائل کے کھیلوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

تہہ جلی: اس کھیل کو "تہ کمبلی" بھی کہتے ہیں۔ "جل" کپڑوں سے بنے ہوئے

لحاف نما اوڑھنی کو کہتے ہیں جسے ہزارہ خواتین پرانے کپڑوں کو ترتیب سے ایک دوسرے پر بچھا کر ان کو سی لیتی ہیں۔ تہ جلی میں ایک بندے کو کمبل یا جل کے نیچے لٹا کر دوسرے قطار میں بیٹھ جاتے ہیں ایک اٹھ چادر رکھ کے لیٹے ہوئے رسی نما کوڑے سے اس کو مارتا ہے اور پھر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کس نے تجھے مارا، اگر وہ صحیح بتادے تو پھر اس شخص کو اس کمبل کے نیچے جانا پڑتا ہے ورنہ جب تک نہ بتا سکے اسے کوڑوں کے وار سہنے ہونگے۔

برفی شدن: یہ کھیل صرف برفباری کے موسم میں کھیلا جا سکتا ہے جبکہ کبھی کبھار بہار میں بھی اس کھیل کو کھیلتے ہیں یعنی کوئی شخص کچھ برف اکٹھی کر کے کسی کپڑے سے یا کاغذ وغیرہ میں ایسے تہہ کر دیتا ہے کہ وہ اوپر سے کوئی تحفہ محسوس ہو، اور کسی بچے کے ہاتھ کسی دوست یا عزیز کو بھجواتا ہے کہ یہ آپ کے لئے تحفہ بھیجا گیا ہے۔ اگر وہ وصول کرے تو اس کو "برفی شدن" کہتے ہیں اور پھر اسے دعوت کھلانی پڑتی ہے۔ یا اسے بھی برفی کرنا ہوگا، اور اگر یہ تحفہ لانے والا اسی وقت رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو وہاں موجود سب لوگ اسے مارتے ہیں خصوصاً اس کا منہ کالا کیا جاتا ہے۔

سنگ گیرگ: یہ مشغلہ بھی نسبتاً بڑوں کے درمیان انجام پاتا ہے ایک پتھر کسی پکڑنڈی سی جگہ پر رکھ کر اس سے بیس تیس میٹر کے فاصلے پر دو ٹیمیں کھڑی ہوتیں ہیں ہر ٹیم سے باری باری ایک کھلاڑی اس پتھر کو نشانہ بناتا ہے جو جتنی بار اس پتھر کو نشانہ بنائیں ان کے پوائنٹ بڑھ جائیں گے اس شکل میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اور پہلے سے کوئی شرط طے پاتی ہے اکثر دعوت یا پھل وغیرہ کھلانے کی شرط رکھی جاتی ہے۔

کولہ پرتاؤ: یہ مروجہ کھیل "مارکٹائی" کا تبادل ہے جس میں ایک دائرے میں بچے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک شخص ان کے گرد چکر کاٹتے ہوئے آہستہ سے بیٹھے ہوؤں میں سے کسی ایک کے پیچھے ٹوپی گراتا ہے اگر اس نے بروقت بتادیا کہ "ٹوپی میرے" پیچھے ہے تو درست ورنہ اس کو پکڑ کر پیٹا جائے گا۔

سنگ گل: یہ کھیل بچیوں کے درمیان انجام پاتا ہے، جو ایک گیند اور چند پتھروں پر مشتمل ہوتا ہے، پتھر زمین پر رکھ کر ایک بچی گیند کو ٹپکا دے کر ایک پتھر اٹھاتی ہے پھر دوسرا ٹپکا دے کر دوسرا پتھر اٹھاتی ہے اس طرح اسے پتھر اُٹھانے ہوں گے اگر کہیں کسی ایک بھی ٹپکے میں وہ پتھر نہ اٹھا سکے تو اس کی باری نکل جائے گی اور دوسری بچی اس کھیل کو نئے سرے سے جاری رکھے گی۔

پادشاہ وزیر: اس کو وزدو بادشاہ بھی کہتے ہیں اس میں عموماً چہار افراد ہوتے ہیں یہ بیڈی یا آجکل عام طور پر ماچس کی ڈبیہ پر کھیلا جاتا ہے ماچس کی ڈبیا کی چار سمتوں کو بادشاہ، وزیر، سپاہی اور چور اور اس طرح ایک اس ماچس کو اُچھال کر زمین پر گراتا ہے جس بھی سمت پر ماچس کی ڈبیا کھڑی ہوگی وہ بچہ وہی ہوگا۔ یعنی بادشاہ، یا وزیر یا سپاہی جب ان تمام یعنی چاروں کا تعین ہو جائے تب چور کا ہاتھ پکڑ کر سپاہی اس کو بادشاہ کے پاس لے آئے گا، بادشاہ سپاہی کا بیان سن کر اس چور کو سزا دے گا اور پھر وزیر کو اسے کوڑے مارنے کا حکم دے گا۔ کوڑے وہ دو انگلیوں سے چور کی کلائی پر مارے گا۔ ان کے علاوہ بچیوں میں گڑیوں کا کھیل سب سے زیادہ مقبول ہے۔

جبکہ یہ گڑیاں ان کی مائیں کپڑے میں روئی بھر کر بنایا کرتی تھیں اور رنگین دھاگوں سے گڑیا کے خدوخال بنالیتی تھیں مگر اب یہ رجحان ختم ہونے کو پہنچا ہے۔ لڑکیوں میں اسٹاپو اور رسی ٹپان کے کھیل بھی زیادہ مقبول ہے۔ جبکہ پتنگ بازی کا رجحان ملک کے دیگر شہروں کی طرح کوئٹہ میں بھی اپنے موسم میں عروج پر پڑتا ہے۔ ان کے علاوہ باڑی وغیرہ بھی لڑکوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔

پوٹلی بازی: یہ وہی "کینچے" ہیں جس کو یہاں عام طور پر بنٹے بھی کہتے ہیں اس کھیل کے ساتھ بھی بچوں کی دلچسپی بہت زیادہ ہے اور گلی کوچوں میں کھیلتے رہتے ہیں یہ شیشے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں ہوتی ہیں، جن کے ذریعے کئی قسم کے کھیل کھیلے جاتے ہیں اسکی تفصیل اس لئے بیجا ہوگی کہ یہ تقریباً ملک بھر کے بچوں میں مقبول ہے اور ایک عام کھیل ہے۔

لوک قصے کہانیاں

دادیوں اور نانیوں کے قصے اور کہانیاں کس قبیلے میں نہیں ہوتیں، ان کے بغیر تو زندگی میں رنگ ہی نہیں رہتا بلکہ آج جو کہانی کو عالمی ادب میں ایک اہم صنف کا مقام حاصل ہوا ہے ان کی اصل محرک تو یہی نانیاں اور دادیاں ہیں۔

ان قبائل میں عموماً جن، بھوت، پری، وغیرہ کی کہانیوں کے علاوہ پیغمبروں اور آئمہ طاہرین کے قصے بھی شوق سے سنے جاتے ہیں جبکہ زرا پڑھے لکھے بزرگ تو شاہنامہ فردوسی وغیرہ کے رستم وسہراب وغیرہ کی کہانیوں سے بھی محافل کو رونق بخشتے ہیں جبکہ منظوم جنگی کہانی حملہ حیدری اس سلسلے کا مقبول قصہ کہلاتا تھا۔

کہانی سننے کا انداز عموماً سرد موسم کی وجہ سے لحاف یا کمبل کے نیچے دائرے کی شکل میں دیواروں سے ٹیک لگا کر آدھے لیٹے آدھے بیٹھے ہوئے حال میں ہوتا تھا۔ ان کہانیوں میں کچھ تو ایسی ہوتی ہیں جو سرحدوں اور قبائل کی حدود سے بالاتر

تمام انسانوں میں میراث مشترک کی حیثیت سے رائج ہوتی ہیں، جبکہ کچھ میں مقامی رنگ ہوتا ہے۔ یہاں کی معروف کہانیوں میں درجہ ذیل معروف ہیں:

گل پری، سزای ناسپاسی، برادران ہم دل، بخت بیدار، شاہ مہرہ، عقل خفتہ، خارکن وخشت ہای طلا، قنوز آچہ، روزی دہندہ کیست؟ قسمت، رفیق نااہل وغیرہ۔

یہاں ایک کہانی کا خلاصہ بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جس کا عنوان ہے "خارکن وخشت ہای طلا" یعنی لکڑھارا اور سونے کی اینٹ۔

لکڑھارا اور سونے کی اینٹ: ایک لکڑھارا جس کی سات بیٹیاں ہیں وہ لکڑیاں توڑ کر اپنا گزر اوقات کرتا ہے۔ ایک روز وہ لکڑیاں اکھٹی کر کے اٹھانے لگتا ہے۔ تو بھاری گھڑی کو محسوس کرتا ہے۔ وہ گھڑی کو ہلکا کرنے کے لیے کھولتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس میں سونے کی ایک اینٹ پڑی ہوئی ہے وہ اینٹ کو خوشی خوشی اٹھا کر گھر لے جاتا ہے، بیٹیاں بھی خوش ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح ان کی تنگ دستی کم ہو جاتی ہے دوسرے روز پھر جاتا ہے لکڑیاں اکھٹی کر کے جب گھڑی اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اسے وزنی لگتی ہے آج بھی جب وہ گھڑی کھول کر اس کو ہلکا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ پھر ایک سونے کی اینٹ اس میں پڑی ہوئی ہے۔ اسے بھی وہ خوشی خوشی گھر لے آتا ہے وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں، بیٹیوں کو اپنی خواہشات کی تکمیل کی امیدیں بیدار ہوتی نظر آتی ہیں۔ لکڑھارا بھی ان کی خانہ آبادی کا سوچتا ہے۔ تیسرے روز وہ اس خیال سے کہ آج پھر سونے کی اینٹ لے آئے گا۔ صبح سویرے نکل جاتا ہے لکڑیاں اکھٹی کرتا ہے تو ایک بار پھر اس کو وزنی محسوس ہوتی ہیں اور وہ اسے ہلکا کرنے کے خیال سے زیادہ، سونے کی اینٹ کی لالچ میں گھڑی کو کھولنے لگا۔ گھڑی کھولتے ہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگنے لگا۔ کیونکہ آج اس کی گھڑی میں سونے کی اینٹ کی بجائے ایک بڑا سانپ تھا، سانپ نے اس کا راستہ روک کر کہا کہ کہاں جا رہے ہو میرے سونے کے اینٹ لے گئے ہو اور اب بھاگ رہے ہو۔ وہ تو میں نے تمہاری بیٹی کا معاوضہ تم کو ادا کیا تھا۔ اب تمہیں اپنی ایک بیٹی کو مجھ سے بیاھنا ہوگا۔ لکڑھارا پریشان ہو کر کہتا ہے کہ ٹھیک ہے میں اپنی بیٹیوں سے مشورہ کر کے کل آ کر تم کو بتاؤں گا۔ گھر آ کر کر پریشان ہوتا ہے تو بڑی بیٹی پوچھتی ہے کہ بابا کیا بات ہے؟ اب تو ہم امیر بھی ہو گئے ہیں، ہماری تنگ دستی اور پریشانی بھی دور ہو گئی تو یہ غمگین ہونا کیسے؟ لکڑھارا ساری کہانی بیٹی کو سناتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ تم کو سانپ سے شادی کرنی ہوگی۔ وہ سنتے ہی چیخ اٹھتی ہے اور کہتی ہے کہ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے بھی کئے جائیں۔ خلاصہ یہ ماجرا وہ ایک ایک کر کے اپنی چھ بیٹیوں کو سناتا ہے اور ان میں سے ہر ایک سانپ سے شادی کرنے سے انکار کرتا ہے یہ سب سن کر اس کی چھوٹی بیٹی کہہ اٹھتی ہے کہ بابا تم فکر نہ کرو میں سانپ سے شادی کرونگی، کل جا کر اسے کہہ دو کہ وہ اپنی تیاری کرے میں اس کی بیوی ہونگی۔ لکڑھارا نے کل صبح سانپ کو جا کر بتا دیا کہ اس کی چھوٹی بیٹی سے آ کر بیاہ کرے۔ ابھی لکڑھارا واپس گھر پہنچا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ صحرا کی جانب سے سانپوں کا ایک لشکر اس کے گھر کی جانب چلا آ رہا ہے۔ بالآخرہ سانپوں کی بارات پہنچ گئی اور لڑکی کو ایک بڑے سانپ کی پیٹھ پر سوار کر کے روانہ ہو گئے۔ لڑکی مصیبت کے مارے بے ہوش ہو گئی۔ سانپوں کا قافلہ بڑھتا گیا بالآخرہ وہ اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ اسی دوران لڑکی کو بھی ہوش آ گیا۔ اس نے کیا دیکھا کہ ایک عظیم شان محل ہے جس کی دیواریں تمام کی تمام سونے کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں، جہاں بھر کی نعمتیں وہاں موجود ہیں وہ بے ہوش ہوئی اس نے اپنی زندگی میں اسطرح کا محل نہ دیکھا اور نہ ہی سنا تھا۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد دولہا سانپ اس کے قریب آیا اور کہا۔ بیگم صاحبہ مبارک ہو، یہ گھر بار اور اس میں جو موجود سب کچھ تمہارے لئے ہیں وہ بہت خوش ہوئی اور تھوڑی دیر میں دیکھا کہ دولہا سانپ نے خود کو تھوڑی سی حرکت دی کچھ دیر میں اس کے جسم سے سانپ کی کھال اتر گئی وہ ایک خوبصورت نوجوان میں بدل گیا۔ لڑکی کی خوشی کی انتہا نہ رہی کچھ ہی دیر میں محل میں موجود دوسرے سانپوں نے بھی کھال اتار دینے اور سب کے سب انسانوں میں بدل گئے۔ اب یہ جوڑا ہنسی خوشی رہنے لگا۔ لیکن یہ سب دیکھ کر دلہن کی ساس کو تکلیف ہونے لگی اور اس نے اس کو تنگ کرنا شروع کیا اس پر روز کسی نہ کسی طرح کا ظلم کرتی اور وہ بے چاری سہتی رہتی۔ ایک روز جب اسکا شوہر باہر چلا گیا تو اس نے اسے ایک سیاہ رنگ کی دری دی اور کہا کہ اس کو دریا کے کنارے اتنا دھوڈالو کہ سفید ہو جائے۔ وہ بیچاری ناچار جا کر اسی کام میں مصروف ہو گئی لیکن ایسا کہاں ممکن تھا۔ یہ کرتے کرتے اس پر شام ہو گئی۔ شام کو اس کا شوہر گھر کی جانب آتے ہوئے اس سے روبرو ہوا، تو ماجرا پوچھا لڑکی نے جب ماجرا سنایا تو لڑکے نے اپنے ہاتھ کی چھڑی کو اس دری پر دے مارا اور اسی لمحے دری کا رنگ سیاہ سے سفید ہو گیا وہ خوشی خوشی گھر پہنچ گئی لیکن ساس نے اس کو جانچ لیا کہ یہ سب اس کے بیٹے کا کام ہے۔ اگلے روز اس نے اسے سفید رنگ کی دری دے کر کہا کہ جاؤ اس کو اتنا دھولو کہ یہ تمام کی تمام سیاہ ہو جائے۔ وہ بیچاری پھر مجبور ہو کر چلی گئی اس مرتبہ پھر شام کو شوہر سے سامنا ہوا اور اس کو آج کا ماجرا بھی سنایا تو شوہر نے کہا کہ اب یہاں ہمارے لئے رہنا مشکل ہو چکا ہے۔ اور کنگھی، آئینہ اور نمک اپنی بیوی کو دے کر کہا کہ تم چلی جاؤ اور جہاں بھی پہنچ

جاؤ گی میں تمہارے پاس پہنچ جاؤنگا۔ دلہن چل پڑی یہاں اس کی ساس انتظار کرتی رہی لیکن دلہن کی کوئی خبر ہی نہیں آئی وہ خود اس کے پیچھے چل پڑی اور کرتے کرتے دلہن تک پہنچ گئی قریب ہوئی تو دلہن نے فوراً کنگھی پیچھے کو پھینک دی اور وہ ایک بے سروپا خارستان میں بدل گئی۔

ساس نے یہ دیکھ کر پوچھا کہ اے لڑکی! تم اس جان لہوا خارستان کو کیسے عبور کیا۔

اس نے کہا کہ دانتوں سے کانٹے کانٹے ہوئے یہ سن پر اس کی ساس نے اپنی ایک خاص دانت کو تیز کیا۔ اور بہت جلد اس عذاب کو رد کر کے چلی گئی اور ایک بار پھر بہو تک پہنچ گئی۔ اس مرتبہ اس نے ساس کو نزدیک پہنچتے ہوئے پایا تو فوراً نمک کو پیچھے پھینک دیا۔ اور وہ نمک ایک بڑے پہاڑ میں بدل گیا۔

اس نے بہو سے پوچھا کہ تم نے اس پہاڑ کو کیسے پار کیا۔

اس نے کہا کہ چاٹ چاٹ کر سوراخ کر دیا اور پھر نکل آئی، ساس نے بھی یہی کچھ کیا اور بہو کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو فوراً آئینے کو پیچھے کی جانب پھینک کر آگے بڑھی۔ اس طرح وہ آئینہ پانی میں تبدیل ہوا اور ساس کے راستے میں ایک بڑا سمندر حائل ہو گیا۔

اس نے پوچھا کہ تم نے اس کو کیسے پار کیا تھا۔

لڑکی نے کہا کہ: میں نے چکی کے بڑے پاٹ پاؤں پر باندھ کر اس دریا کو پار کیا تھا۔

ساس نے یہی کچھ کیا تو پتھروں کے وزن نے اس کو ڈبو دیا۔

اس کے بعد وہ کسی دوسرے شہر میں پہنچ گئی اور کچھ دنوں میں سے اس کا شوہر بھی پہنچ گیا اور دونوں خوشی خوشی زندگی گزارنے لگے۔

کوئٹہ اور اس کے مضافات کے مزارات

میاں الٰہی بخش: آپ کا اسم گرامی الٰہی بخش تھا۔ چونکہ عبادت گزار اور متقی تھے، اس لئے لوگ آپ کو مولوی صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ آپ کا آبائی وطن لالہ پنڈی ہے جو ضلع گجرات (پنجاب) کا ایک قصبہ ہے۔ آپ کے خاندان کا پیشہ کاشتکاری تھا۔ آپ کو بچپن ہی سے تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ شروع میں آپ اپنے بھائیوں کے ساتھ کاشتکاری کرتے تھے۔ پھر ذوق تعلیم سے مجبور ہو کر آپ نے کاشتکاری چھوڑ دی اور بہاولپور میں تعلیم حاصل کی۔

آپ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں بلوچستان چلے آئے۔ پہلے سبی اور پھر براستہ ہرنائی و بوستان کوئٹہ وارد ہوئے۔ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں پولیس میں محرر کانسٹیبل بھرتی ہوئے۔ ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں مسٹر بیٹی انسپکٹر پولیس کی سفارش پر سکول ماسٹر مقرر ہوئے۔ اور آٹھ برس تک محکمہ تعلیم میں ملازمت کی بارنس سکول سبی میں سیکنڈ ماسٹر مقرر رہے۔

آپ کرکٹ کے زبردست کھلاڑی تھے۔ اس دوران مسٹر بیٹی ترقی پا کر سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو گئے۔ چونکہ مسٹر بیٹی کو بھی کرکٹ سے شغف تھا اس لیے وہ میاں صاحب کو بہت پسند کرتا تھا اور اسی کے اصرار پر آپ محکمہ پولیس میں واپس آ گئے اور ہیڈ کانسٹیبل کے عہدے پر تعینات ہوئے اور بعد میں آپ سارجنٹ فرسٹ گریڈ مقرر کیے گئے۔ ۱۳۴۷ھ/۱۸۲۸ء میں جب آپ سب انسپکٹر سبی پولیس تھے، آپ نے وفات پائی اور کاسی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ایک علیحدہ احاطے میں آپ کی پختہ قبر آج بھی موجود ہے۔

میاں صاحب نے بلیلی سے کچھ آگے کلی مہترزئی میں ایک معزز پختون خاندان میں شادی کی۔ آپ کی اہلیہ ملک عبداللطیف کی صاحبزادی تھیں۔ جنہوں نے آپ کی زندگی میں وفات پائی۔

میاں صاحب بڑے عابد اور زاہد تھے۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکے کہ آپ نے کس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ قیاس ہے کہ اویسی طریقہ رکھتے ہوں گے۔ آپ جذب وفنا کے مقامات سے گزر کر مقام عبودیت پر فائز ہو گئے تھے۔ اس لیے آپ صحو پر قائم رہے۔ اور عمر بھر شریعت کی نہایت سختی سے پابندی کرتے رہ۔ صدق مقال اور اکل حلال میں مشہور تھے۔ سرکاری اور دنیوی کام کاج کے ساتھ ہمہ وقت ذکر الٰہی میں محو رہتے۔ اور آپ کا عمل "دست بہ کار و دل بہ یار" کے مصداق تھا۔ تپ محرقہ اور ڈبل نمونیہ کے عوارض میں آپ کی وفات ہوئی۔ انتہائی تکلیف کے باوجود آپ کی استقامت کا یہ عالم تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی کی طرح آپ کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ تہجد اور وظائف ایام صحت کی طرح بدستور ادا کرتے رہے۔ آپ نے جمعہ کے دن وفات پائی اور نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد آپ نے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ آخر تک ہوش وحواس قائم رہے۔ میاں صاحب چونکہ انگریزی دور تسلط کے اوائل میں بلوچستان آئے تھے اس لئے پشتو، بلوچی، براہوئی اور فارسی اس قدر روانی سے بولتے تھے کہ ان پر اہل زبان ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ معاشرتی اور ثقافتی اعتبار سے انہوں نے خود کو پشتونوں میں ڈھال لیا تھا۔ طبیعت میں غصہ بہت تھا۔ جب غصے میں ہوتے تو پشتو بولنے لگتے۔ غصہ اس وقت کرتے جب کسی کو برائی کرتے یا غلط کام کرتے دیکھتے اگر ان کا آفیسر بھی جھوٹ بولتا یا غلط کام کرتا تو ضبط نہیں کر سکتے تھے۔ طبیعت جلالی پائی تھی۔ ایک دفعہ کوئٹہ میں کشتیاں ہوئیں۔ جن میں باہر کے نامی گرامی پہلوانوں نے حصہ لیا۔ بڑا جوڑ ایک مسلمان اور سکھ کا تھا۔ اتفاق سے سکھ

پہلوان نے مسلمان پہلوان کو گرالیا۔ آپ بھی دوسرے افسروں کے ساتھ بیٹھے کشتی دیکھ رہے تھے۔ جب مسلمان پہلوان پچھڑ گیا تو آپ کو بڑا جلال آیا اور حسب عادت پشتو میں فرمایا۔ حیف ہے مسلمان ہو کر کافر سے گر گیا۔ ساتھی ہی ایک سکھ افسر بیٹھا تھا۔ اس نے ازراہ طنز کہا۔ مولوی صاحب پھر آپ خود کشتی لڑ کر دیکھ لیں۔ بس پھر کیا تھا۔ آپ نے کھڑے ہو کر سکھ پہلوان کو چیلنج کیا لوگ ہنسنے لگے۔ لیکن ان کے اصرار پر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اجازت دے دی۔ تیسرے دن باقاعدہ کشتی ہوئی۔ آپ اوائل عمر میں ورزش وغیرہ کرتے رہتے تھے اور کشتی بھی لڑتے رہے تھے اس لیے داؤ پیچ سے بخوبی واقف تھے۔ پھر بھی سکھ باقاعدہ پہلوان اور بڑا گرانڈیل تھا۔ لیکن آپ نے اکھاڑے میں ہاتھ ملاتے ہی اس کو چند سیکنڈ میں چاروں شانے چت کرالیا۔ سکھ پہلوان بڑا حیران ہوا۔ اس نے دوبارہ کشتی لڑنے کی درخواست کی۔ آپ نے پھر کشتی لڑی اور ایک ہی منٹ میں پھر گرالیا۔ آپ نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور اس سے کہا کہ پہلوان تو ہم ہی ہو، میں نے صرف قوت ایمانی کی ہلکی سی جھلک دکھائی ہے۔

پیر سید گلاب شاہ مشہدی نقشبندی القادری: آپ ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء میں موضع فقیر محمد سیداں (صوبہ سرحد) میں پیدا ہوئے آپ کے دادا حضرت سید نادر علی شاہ مشہدی اپنے دور کے مقتدر عارف تھے، جن کا شجرہ نسب ایک طرف حضرت ابوالقاسم حسین مشہدی سے اور دوسری طرف حضرت سید وجیہ الدین مشہدی سے ملتا ہے جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے خسر تھے۔ آپ کے آباواجداد قدیم صوبہ خراسان کے شہر مشہد سے ہجرت کر کے بلوچستان کے راستے صوبہ سرحد پہنچے تھے۔

گاؤں میں ابتدائی تعلیم کی تحصیل کے بعد آپ اکوڑہ خٹک، کوہاٹ اور ڈیرہ اسماعیل خان سے ہوتے ہوئے مدرسہ مظاہر العلوم سہارن میں زیر تعلیم رہے۔ پھر دہلی دارالندوۃ میں داخلہ لینے تشریف لے گئے۔ وہاں ایک مجذوب عارف سے ملاقات ہوئی جو یہ شعر پڑھتا جارہا تھا:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

اس کے سنتے ہی آپ کی ذہنی وقلبی کیفیت بدل گئی اور آپ اس مجذوب کے ہمسفر ہو گئے مقامات مقدسہ کی سیاحت کے دوران حصول فیض کے لیے کوشاں رہے، کبھی کی زیارت کرتے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے درعرفان پر حاضر ہوتے، کبھی خواجہ نظام الدین اولیا کے آستانہ فیض سے روحانی پیاس بجھانے کے لیے دہلی تشریف لے جاتے۔ ایک دفعہ قطب مینار کی سیر کو جی چاہا، روایت ہے کہ جب آپ مینار کی بالائی منزل پر سستا رہے تھے تو السلام علیکم کی آواز تین بار آئی۔ آپ تجسس میں نیچے اترے تو پشتو زبان میں کسی نے کہا کہ " کوٹے تہز" (کوئٹہ جاؤ) آپ کوشش کے باوجود کسی کو نہ دیکھ سکے۔ وہاں سے نماز جمعہ کے لیے جامع مسجد پہنچے۔ اس کے بعد آپ کبھی پیدل کبھی سوار سفر کرتے ہوئے ۲۵ جنوری ۱۹۲۷ء کو کوئٹہ پہنچے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ کے والد محترم آپ کو لینے کے لیے آئے مگر آپ ان کے ساتھ نہ گئے انہوں نے کابل، مزار شریف اور ایران جانے کے لیے کہا مگر آپ یہیں ٹھہرنے پر مصر رہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے کوئٹہ پر قہر خداوندی کے نزول کا ادراک ہوا ہے مگر آپ نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ۱۹۳۵ء میں اپنے آبائی گاؤں گئے۔ وہاں سے مویڑہ شریف مری بل پہنچے اور حضرت خواجہ محمد قاسم نقشبندی کے ہاتھ پر بیعت کر کے واپس کوئٹہ تشریف لائے یہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہزاروں افراد آپ کے حلقہ ناارادت میں شامل ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کے دیگر مقامات مقدسہ کی زیارت کی اور خواجہ معین الدین چشتی کے مرقد مطہر سے ملحقہ مسجد اولیا میں چلہ کاٹا اور اکتساب فیض کیا۔ اس طرح آپ سلسلہ نقشبندیہ، چشتیہ اور قادریہ سے فیض یاب ہوئے۔ اس سیاحت کے دوران جب آپ رکی کیش، بردوار اور ڈیرہ دون گئے تو ہندو رشیوں سے طویل مناظرہ ہوا اور بہت سے رشیوں نے اسلام قبول کیا جن میں سے ایک کا نام ہدایت اللہ رکھا گیا جو بعد میں سلوک وطریقت کے اعلیٰ مقام تک پہنچا۔ حیدر آباد دکن میں حضرت ابراہیم رشید المکی نواب محی الدین صادق علی کے علاوہ ہزاروں افراد آپ کے مرید ہوئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں کوئٹہ واپس آئے تو دربار حسینیہ کے نام سے اپنا آستانہ تعمیر کروایا جس میں ایک مسجد اور طلبہ وفقراء کیلئے رہائشی کمرے بنوائے۔ آپ موجودہ زمانے کے متقضیات کے مطابق علوم جدیدہ دینیہ کی تدوین اور کوئٹہ میں جامعہ اسلامیہ کی تشکیل چاہتے تھے۔ آپ کے حلقہ ادارت میں مسلمان کے علاوہ عیسائی، سکھ اور ہندو بھی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔

حضرت شیخ محمد عمر: آپ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں شیخ فرید کے ساتھ کوئٹہ آئے اور ہدہ میں سکونت اختیار کی۔ کہتے ہیں کہ آپ دونوں کی آمد تک اس علاقے میں پانی نہ تھا اور کانٹے اس قدر تھے کہ انہیں دور کرنا انسان کے لیے ناممکن تھا، شیخ فرید نے دعا کی تو کانٹے (کاٹار) جل گئے اور آج تک یہاں کاٹار نہیں آگئے۔ شیخ محمد عمر نے اس کے بعد اپنا نیزہ زمیں گاڑا تو وافر مقدار میں پانی بہنے لگا۔ ایک روایت کے مطابق اتنا پانی تھا کہ بچھڑے کو بہالے جاسکتا۔ آپ دونوں کو یہاں کے باشندوں نے کچھ زمین اور پانی نذرانے کے طور پر دیا، جسے آپ کا مستونگی خلیفہ

کاشت کیا کرتا تھا۔ آپ کا مزار ہدہ ڈسٹرکٹ جیل کوئٹہ کے مغربی ٹیلے پر واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ اس مزار پر چھت ٹھہرتی، اس ٹیلے پر آپ کا مراقبہ فرمایا کرتے تھے۔

روایت ہے کہ ایک بار آپ کا خلیفہ پانی کا رخ اپنی زمینوں کی طرف پھیر رہا تھا کہ ایک صاحب جاہ وحشمت نے ممانعت کردی۔ خلیفہ نے آپ سے گزارش کی، آپ نے تین بار اس امیر شخص کو۔ اس اقدام سے باز رہنے کی تلقین کی، گروہ نہ مانا۔ آپ جلال میں آ گئے۔ پانی کو اپنے منبع کی طرف لوٹ جانے کا حکم دیا۔ اور ہاں (حال کوئٹہ ریلوے اسٹیشن) پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔ کسی کو آپ سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اتفاقاً احمد شاہ ابدالی کا گزر تادیبی مہم کے سلسلے میں مشہد کی طرف سے کوئٹہ میں ہوا۔ لوگ فریادی بن کر ان کے پاس گئے۔ ابدالی نے شیخ عمر کو مہمان کی حیثیت سے تشریف آوری کی زحمت دی تا کہ اس سلسلے میں گفتگو ہو سکے۔ حضرت نے جواب دیا۔ ہم مہمان کی عزت اور قدر کرتے ہیں لیکن امراء کی دریوزہ گری ہمارا معمول نہیں۔ چونکہ احمد شاہ ہمارا مہمان ہے، اس لیے آدھے راستے تک وہ آئے، آدھے راستے تک میں چلا آؤں گا۔ دونوں مرکزی مقام (حال ایوب سٹیڈیم) پر ملے۔ شاہ زمینداروں کی جانب سے معافی کا خواستگار ہوا۔ پہلے تو آپ نہیں مانے، آخر میں چھ حصے پانی کی بندش کو برقرار رکھا، ایک حصہ پانی دے دیا، یہ پانی آج بھی اپنی اصلی رخ پر بہہ رہا ہے۔

حضرت خواجہ محمد عمر جان چشموی: آپ کی ولادت صفر ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے اور وصال یکم ذی الحجہ ہے آپ نے علوم ظاہری اپنے والد حضرت فیض الحق (المتوفی ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) اور اپنے چچا ملا احمد اخوند سے حاصل کیے۔ طریقت وسلوک میں خلعت خلافت اپنے والد ہی سے پائی اور ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ خواجہ میاں روح اللہ (المتوفی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۶ء) سے بھی فیضیاب ہوئے کی سال تک دورس وتدریس میں مصروف رہے اور بہت سے علماء آپ سے فیض یاب ہو کر دوسروں کو مستفیض کر رہے ہیں۔ علوم ظاہری میں مشغول رہنے کے ساتھ ساتھ سلوک وطریقت میں بھی کمال حاصل کیا۔

مولوی محمد عظیم کا کہنا ہے کہ اس نے چھ سال تک آپ کا مرید بننے کی کوشش کی۔ لیکن یہی جواب ملتا رہا کہ اب تک آپ کو مرید بنانے پر مامور نہیں ہوں۔ علوم ظاہری کی تکمیل کیجیے۔ ایک روز صاحب گڑھی خیر محمد کریٹہ میں تشریف لائے تو مولوی محمد عظیم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ اب آپ کو مرید بنانے پر مامور ہوا ہوں۔ کل صبح آ کر بیعت کرلو۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضور آپ کے سلسلہ عالیہ یں نماز تہجد شرط ہے میں مدرس ہوں رات کو دیر تک مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں تہجد کیلئے بیدار نہیں ہو سکتا ہوں۔ حضرت صاحب فرمانے لگے کہ تہجد کیلئے ضرور جاگنا پڑے گا۔ جب دست بیعت کا شرف حاصل ہوا تو تہجد کے وقت حضرت صاحب کی آواز آتی تھی برخیز تہجد بخوان آج تک یہی حالت ہے۔

ایک رات حضرت صاحب شہر لاکھ کے نزدیک حاجی مٹھل لاکھ کی دعوت پر تشریف لے گئے مولوی محمد عظیم اپنے ایک دوست کے ہمراہ جو مرید ہونا چاہتا تھا تانگے میں روانہ ہوئے۔ راستہ میں تانگہ الٹ گیا۔ رات اندھیری تھی، ان صاحبان کو خاصی چوٹیں آئیں۔ یہاں تک کہ تانگہ بھی سیدھا کرنے کی سکت نہ رہی۔ اتنے میں اچانک ایک روشنی نظر آئی۔ دیکھا کہ چند آدمی آرہے ہیں۔ انہوں نے آ کر ان کو اٹھایا اور تانگہ سیدھا کر کے کہنے لگے کہ ہمیں حضرت صاحب نے بھیجا ہے فرماتے تھے کہ فلاں مولوی صاحب اور ان کے رفقاء کا تانگہ الٹ گیا ہے انہیں اٹھا کر لے آؤ۔

حضرت خواجہ معین الدین جان چشموی: آپ حضرت خواجہ عبدالحی جان کے بڑے بیٹے اور خلیفہ اول تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت (۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء) پر آپ کے جدامجد حضرت خواجہ محمد عمر نے تحریر فرمایا تھا۔ کہ فرزند جگر بندار جمند کلاں آغا عبدالحی جان کے گھر میں ایک لڑکا باکمال تولد ہوا ہے اس کا نام ہندوستان کے مشہور ولی خواجہ معین الدین اجمیری کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ایک اور صاحب (غلام رسول ولد مولوی جان محمد) کا بیان ہے کہ میں نے ایک وقت خواب میں دیکھا کہ حضرت صاحب محمد عمر جان قدس سرہ اپنے دست مبارک سے خواجہ معین الدین جان۔ کے سینہ مبارک پر اسم ذات کا نقشہ لکھ رہے ہیں۔

ان حالات سے معلوم ہوا کہ ان کی ولایت وہبی ہے جس سے اللہ تعالی نے انہیں بچپن ہی میں نوازا۔ انہیں فیض ولایت بظاہر اگرچہ ان کے والد ماجد حضرت خواجہ آغا عبدالحی جان سے ہوا مگر درحقیقت ان کے جدامجد سے ہوا ہے۔

حضرت امیر محمد کے فرزند حاجی عبدالقیوم نے آپ سے متعلق دو خواب بیان کیے ہیں جو نہایت ایمان افروز ہیں:

یہاں خواب آپ کے حین حیات ت ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء میں دیکھا کہ رات کا آخری حصہ ہے ایک بڑا شہر ہے اور اس میں ایک بڑی جامع مسجد ہے جس میں اولیاء کا جم بیٹھا ہوا ہے۔ حتی کہ حضرت قبلہ گاہی چشموی مدظلہ العالی (ان دنوں آپ بقید حیات تھے) بھی اس میں جلوہ افروز ہیں اور اس مجمع کے وسط میں حضور پرنور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ حضرت محترم آغا معین الدین جان قدس سرہ اس مجمع کو پانی پلا رہے ہیں۔ اس دوران میں حضرت صلعم نے فرمایا: یا

معین الدین قدس پانی پلانا۔ آپ نے ایک گلاس حضور صلعم کی خدمت اقدس میں پیش کر دیا۔ وہ گلاس سے مجمع کو پلایا۔ حتی کہ آخر میں ایک گھونٹ احقر کو بھی عنایت فرمایا۔ خدا کی قسم پانی نہایت خوشبودار اور میٹھا تھا۔

"اسی اثنا میں خواب سے بیدار ہوا۔ تمام جسم پسینہ میں شرابور تھا۔ اس خواب کے بعد تقریباً ایک ہفتہ تک میں سوتے میں ڈرتا تھا۔ میں نے ایک عریضہ حضرت عبدالحی جان میں بھیجا اور اس خواب کا تذکرہ کیا۔ آپ نے اپنے شفقت نامہ میں احقر کو مبارک باد لکھی تھی۔ اس کے بعد احقر آرام سے سویا۔ اس خواب کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ آغا معین الدین ایک ولی کامل اور باکمال انسان ہیں۔"

آپ کا وصال ۱۶، ۱۷ ستمبر (۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء) کی درمیانی شب کو سول ہسپتال کوئٹہ میں پیٹ کے آپریشن سے ہوا۔

حضرت خواجہ ولی بابا: آپ کا سلسلہ نسب ساتویں پشت میں حضرت خواجہ قطب الدین محمد سلطان مودودی چشتی سے، اٹھائیسویں پشت میں حضرت امام حسین علیہ السلام سے اور انتیسویں پشت میں حضرت علی علیہ السلام سے ملتا ہے۔ آپ کو چشتی و مودودی کے لقب سے اس لیے یاد کیا جاتا ہے کہ آپ کی ولادت چشت (افغانستان) میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت خواجہ فقیر الدین نے آپ کو تعلیم دلائی۔ تحصیل علم کے بعد ہندوستان اور پھر وہاں سے کوئٹہ، کوہ خواجہ عمران کے دامن میں کلی کران میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ نے یہاں کانسی قبیلے میں شادی کی۔ آپ کا عرس ہر سال کلی کرانی میں شان و شوکت سے منایا جاتا ہے۔ کرانی کے سادات آپ کی اولاد ہیں۔ اب سے تقریباً چار سو سال پیشتر جب آپ کوئٹہ تشریف لائے تو اس وقت کانسی قوم کی خاصی آبادی کے علاوہ خانہ بدوشوں کے چند گھر تھے۔ کوئٹہ کی حیثیت ایک گاؤں کی سی تھی اور یہاں کے لوگ جاہل اور مذہب سے ناآشنا تھے۔ آپ نے سب سے پہلے یہاں تبلیغ دین کی، آداب و اخلاق سکھائے اور لوگوں کی بھرپور خدمت کی۔ آپ کی کوششوں سے مری، لہڑی، بروزئی، براہوئی اور کرد قبائل کی دیرینہ باہمی عداوتیں ختم ہوگئیں۔ آپ کی ولایت و کرامت کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی اور لوگ دور دراز سے عقیدت کے لیے حاضر ہونے لگے۔ اکثر لوگ آپ کی بابرکت ذات سے قربت کی خاطر وہیں آباد ہو گئے۔

آپ کی بہت سے کرامتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص سے آپ کی ملاقات ہوئی وہ درحقیقت خود بھی ولی تھے۔ آپ نے انہیں پہچان لیا۔ ان کی خوب خاطر تواضع کی اور انہیں آئندہ کیلئے پھر مدعو کیا۔ انہوں نے دعوت قبول کی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد پھر آئے۔ ان کے ساتھ ایک بڑا سانپ بھی تھا۔ آپ نے اسے ساتھ لانے کی ضرورت کا استفسار کیا تو بزرگ نے کہا: کہ آپ میرے سانپ کی خوراک ہی کا پیٹ بھر انتظام نہیں کر سکتے، مجھے کیا کھلائیں گے۔ یہ ایک وقت میں دو بیل کھا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب مسکرائے اور دونوں کے طعام کا انتظام فرمایا۔ ایک کمرے میں سانپ کے ساتھ دونوں بیل بند کر دیے۔ صبح جب دروازہ کھولا تو بیل سلامت کھڑے تھے اور سانپ غائب تھا۔ بزرگ حیران تھے۔ آپ نے انہیں تسلی دی، بیل کے سینگ کو جھٹکا دیا تو سانپ زمین پر گر پڑا۔ بعد میں اس بزرگ کی وصیت کے مطابق خواجہ ولی صاحب کی درگاہ میں اسے دفنایا گیا۔

ایک دفعہ ایک قبیلے نے آپ کو آزمانے کیلئے آپ کو دعوت دی، دوسرے کھانوں کی علاوہ ایک دیگچی الگ پکائی گئی تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ آپ کو اس کا اندازہ ہوتا ہے یا نہیں۔ نماز عشاء سے فارغ ہو کر آپ نے میزبان کو طلب فرمایا اور اس مخصوص دیگچی کو منگوایا۔ یہ حکم سنتے ہی اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آپ نے اسے تسلی دی اور کہا کہ جاؤ دیگچی لے آؤ۔ وہ جب دیگچی لے کر حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا کہ گوشت گل چکا ہے یا نہیں؟ میزبان بولا کہ بالکل تیار ہے حضور۔ آپ نے ڈھکن اٹھایا تو اس میں زندہ بلی لیٹی ہوئی تھی۔ سب لوگ یہ تماشا دیکھ کر ششدر رہ گئے اور میزبان اسی وقت آپ سے معافی کا خواستگار ہوا۔

خواجہ ولی بابا کے وصال کے بعد جہاں آپ کی لاش کو غسل دیا گیا وہاں ایک باغ تھا جو باغ رسول بخش کہلاتا تھا وہاں جو پانی تھا وہ متعدد متعدد امراض کا علاج سمجھا جاتا تھا۔

سید یوسف شاہ غازی: آپ کا سلسلہ نسب بارہویں پشت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے۔ آپ کے ایک بزرگ حضرت خواجہ پیر مہر علی شاہ تبلیغ اور اشاعت اسلام کی غرض سے صوبہ سرحد آئے۔ بعد میں اس مشن کو سید خواجہ پیر بزرگ شاہ نے جاری رکھا۔ جو سید یوسف شاہ غازی کے والد تھے۔

پیر سید بزرگ شاہ اپنے وقت کے جلیل القدر باشرع مجذوب تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نعرہ اللہ ہُو سے بڑے بڑے تالے کھول دیتے تھے حتی کہ ان کے نعرے سے دلوں پر پڑے ہوئے تالے بھی چشم زدن میں کھل جاتے تھے۔ ان کی تعلیمات سے لوگ دین برحق کی طرف رجوع کرنے لگے اور راہ راست پر آئے۔

سید یوسف شاہ ستائیسویں رمضان المبارک کو بلہ شریف (صوبہ سرحد) میں پیدا ہوئے۔ ابھی ایک ہی سال کے تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بچپن ہی میں حضرت شاہ سلطان پور شریف سے ظاہری و باطنی علوم کا فیض حاصل کیا۔

خداداد ذہانت و قابلیت سے آپ نے بہت تھوڑے وقت میں عملی زندگی کے آغاز کیلئے تحصیل استناد کی۔ ۱۹۳۰ء میں طوغی روڈ کوئٹہ آئے۔ ۱۹۳۶ء میں جیل روڈ ہدہ کی غیر آباد فضا میں ایک جھونپڑی بنائی اور اس میں ریاضت کرتے ہوئے بڑے حلیم، سادہ مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ آپ کی ولایت کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ ۲۷ اپریل ۱۹۵۲ء کو وفات پائی ہدے ہی میں آپ کا مزار ہے۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کے بڑے بھائی پیر مسکین شاہ سجادہ نشین ہوئے مگر ۱۷ اپریل ۱۹۶۳ء کو وہ بھی مرزا ضلع کیمبل پور میں وفات پا گئے۔ ان کے بعد یوسف شاہ غازی کے صاحبزادے شہزادہ پیر سید نور نبی شاہ نے سجادہ نشینی سنبھالی۔

آپ نے ولایت کی تحصیل کیلئے توغی روڈ کی عیدگاہ کے پاس والے تالاب میں سخت سردیوں میں چلہ کشی کی۔ جس کا پتا ان کے چچازاد بھائی سید انور شاہ کو اس وقت چلا جب وہ اپنے بستر پر نہیں تھے۔ بعد میں مسلسل تین سال تک وہ کوہ مردار کے دامن میں چلہ کشی کرتے رہے۔ ان کی کرامتوں کے بارے میں بھی چند ایک روایات ملتی ہیں کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی جھونپڑی پر ایک جھنڈا گاڑا تھا۔ ایک بار ایک سفید ریش بزرگ آئے انہوں نے جھنڈا اُکھاڑنے کا ارادہ کیا۔ ان کے مرید سائیں گلاب نے انہیں حضرت غازی کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے آنے کا سبب پوچھا تو اس بزرگ نے کہا کہ میں اس علاقے کا ابدال ہوں اور جھنڈا اتارنے کی غرض سے آیا ہوں۔ یوسف غازی نے مسکرا کر اس کی اجازت دے دی۔ جونہی نووارد بزرگ نے جھنڈے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا وہ زمین میں دھنسنا شروع ہو گیا۔ حضرت نے اپنے خادم سے کہا کہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر زمین سے باہر نکالو۔ خادم سائیں گلاب نے جواباً عرض کیا کہ انہیں زمیں کھود کر نکالنا پڑے گا۔ آپ نے برجستہ فرمایا کہ انہیں زمین کھود کر تو نہیں گاڑا گیا تھا۔ نعرہ اللہ ہُو سے انہیں زمین سے نکال دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بزرگ نے قدم بوسی کی، معافی کا خواستگار رہا، بیعت کر کے غزنی چلا گیا۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ کوہ مردار کے ایک غار میں بہت عرصے تک قیام پذیر رہا۔

حضرت خواجہ عبدالحی جان چشموی: آپ حضرت خواجہ محمد عمر جان چشموی (المتوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) کے بڑے صاحبزادے، سجادہ نشین اور خلیفہ اعظم تھے۔ اس کے علاوہ اسرار ربانی سے واقف، صاحب کرامت تھے۔ آخر بیٹا اپنے والد کا نمونہ ہوتا ہے۔

آپ کا وصال ۱۳ نومبر ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء کو ہوا۔ حضرت خواجہ محمد عمر نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا کہ جب میرے والد بزرگوار حضرت خواجہ فیض الحق جان کا انتقال ہوا تو مجھ پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میں نہایت منقبض اور پریشان رہتا تھا۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ بادشاہ ہمارا مہمان ہے۔ پریشان ہوا کہ بادشاہ کی ضیافت کیلئے کیا انتظام کیا جائے اسی اثنا میں بیدار ہوا۔ صبح ہوتے ہی خواجہ آغا عبدالحی جان کی ولادت با سعادت ہوئی۔ ان کے دیکھنے سے انقباض اور پریشانی دور ہوئی اور دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

خواجہ حافظ عبدالمجید: خواجہ حافظ عبدالمجید، حضرت خواجہ فیض الحق جان چشموی (۱۳۵۵ھ/۱۸۳۹ء-۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) کے جدامجد تھے۔ بے نظیر قاری، عالم اور صاحب حال بزرگ تھے۔ آپ میاں نور محمد صاحب قندہاری کے خلیفہ تھے جو حضرت میاں عبدالحکیم نانا صاحب (المتوفی ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء) کے خلیفہ مقرر ہوئے تھے۔

خواجہ صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ جب آپ کسی ندی کے کنارے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو بہتا پانی رک جاتا۔ اسی زمانے میں عرب سے ایک قاری آپ کی ملاقات کی خاطر آیا۔ جب اس نے آپ سے قرأت سنی تو آپ کے کمال سے بے حد متاثر ہوا۔

آپ سے متعلق یہ واقعہ بھی بہت مشہور ہے کہ آپ کے پاس جو طالب علم فیضیاب ہوئے تھے۔ ان میں انسان بھی تھے اور جنات بھی۔ ایک مرتبہ جاڑے کے موسم میں برف باری کے باعث سخت سردی پڑی۔ طالب علموں نے آپ سے درخواست کی کہ ہمیں توت کھلائیں حافظ نے ان طلبہ کو بہت سمجھایا اور نصیحتیں کیں لیکن وہ طالب علم کسی طرح بھی راضی نہ ہوئے اور توت کھانے پر مصر ہوئے۔ آخر حافظ صاحب موصوف جب تنگ آ گئے تو انہوں نے کہا کہ اچھا سب طالب علم اپنی اپنی چادریں لیں اور کسی باغ میں چلیں۔ باغ میں پہنچ کر آپ نے ایک طالب علم سے کہا کہ وہ توت کے درخت پر چڑھ کر اسے جھنجھوڑے۔ باقی طالب علموں سے کہا کہ وہ چادریں پھیلائیں۔ چنانچہ ان چادروں میں بے اندازہ تازہ توت گرے جو سب نے جی بھر کر کھائے۔

حضرت خواجہ فیض الحق جان چشموی: آپ کی ولادت ۲۷ رجب ۱۲۵۵ھ/۱۹۳۹ء کو ہوئی اور وصال ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء کو اتوار کے دن ظہر کی نماز کے بعد ہوا۔ مزار قریہ چشمہ اچوزئی میں ہے جو کوئٹہ کے نواح میں واقع ہے۔ جب آپ کے والد بزرگوار حضرت میاں عبدالعزیز کا انتقال ہوا تو آپ کمسن تھے۔ ان کے والد کی وصیت کے مطابق انہیں دوسرے دو بھائیوں کے ہمراہ صالح محمد اخوند جو اپنے زمانے کے بلند پایہ عالم تھے کی خدمت میں قندہار بھیج دیا گیا۔ خواجہ صاحب وہیں سے فارغ التحصیل ہو کر بلوچستان واپس آئے۔ کچھ عرصہ درس و تدریس

میں گزار کر فقیری کی جانب متوجہ ہوئے۔ وظائف اور اوراد میں زیادہ وقت بسر کرنے لگے۔ ایک مرتبہ ایسے بیمار ہوئے کہ معمول میں فرق آ گیا۔ دل میں ٹھان لی کا گر اب کے خدا نے صحت بخشی تو اس چیز کو حاصل کرنے کی سعی کروں گا جو ہمیشہ ساتھ دے۔

چنانچہ صحت یاب ہوتے ہی پیر کامل کی تلاش میں نکلے۔ اور دور دراز تک کے سفر کیا۔ قندھار سے پنجاب تک کے علاقے میں گھومے۔ آخر جناب روح اللہ گانگزئی سے ملاقات ہوئی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت کرنے کے بعد سلوک و ریاضت میں اس قدر منہمک ہوئے کہ چار پانچ سال کے مختصر عرصے میں خلعت خلافت سے سرفراز ہو گئے۔ حضرت میاں آپ کی ظاہری شکل و شباہت اور وضع قطع صحابہ کرام کی مثل سادہ تھی۔ آپ کا طعام، کلام اور منام بہت کم ہوئی تھی۔ آپ کی مجلس کا ایک ایک لمحہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے خالی نہ تھا۔ آپ مولانا تاج محمد امروئی کے خاص ہمراز تھے اور نہایت متواضع اور شب خیز تھے۔ صاحب کشف کرامات ہونے کے باعث اگر ان کی کرامات کو تحریر میں لایا جائے تو کتاب درکار ہوگی۔

حاجی محمد عوض گلزاری: آپ صاحب ذکر تھے آپ کے متعدد مرید ذکر و شغل میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت خواجہ محمد عمر چشموی (۱۲۸۸ھ/۱۸۱۷ء - ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) اکثر اپنے مریدوں کو آپ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے اور حاجی صاحب ان پر خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ آپ اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ گردونواح کے تمام لوگ ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ کرامات اور مکاشفات کے مالک تھے۔

ایک بار حاجی محمد عوض اور حضرت خواجہ محمد عمر چند دوسرے صوفیائے کرام سبی میں حاجی حمل صاحب کے مزار پر تشریف لے گئے۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص لعل محمد نامی نے اپنی گردن میں رسی ڈالی ہوئی ہے اور اپنے آپ کو باندھ رکھا ہے ان دونوں بزرگ نے مراقبہ کیا اور باہر تشریف لائے۔

حاجی صاحب موصوف نے اس شخص سے پوچھا کہ تم نے اپنے آپ کو یہاں کیوں باندھ رکھا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میرا بھائی گم ہو گیا ہے۔ تلاش کے باوجود کہیں نہیں ملا اور نہ کچھ علم ہوا کہ کہاں ہے۔ اب میں نے یہاں اپنے کو باندھ رکھا ہے کہ شاید یہی اس کے ملنے کا ذریعہ بن جائے۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ اپنے آپ کو کھولو اور کل گاڑی کے وقت اسٹیشن پہنچ جاؤ۔ تمہارا بھائی اسی گاڑی میں آئے گا۔ لعل محمد اگلے روز حاجی صاحب کے ارشاد کے مطابق اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی آئی اور اسی سے اس کا بھائی اترا۔

اس سے دریافت کیا کہ تم کہاں سے آ رہے ہو کہنے لگا کہ میں کل کراچی میں تھا میری ایسی حالت ہوئی کہ میں جس جانب بھی منہ کرتا تھا کوئی شخص مجھے تھپڑ مارتا تھا۔ البتہ میں اسٹیشن کی جانب رخ کرتا تھا تو پھر کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے مجبوراً کراچی اسٹیشن پر پہنچا اور گاڑی میں سوار ہو کر آ رہا ہوں۔

اخوند محمد امین ترخوی: آپ ذکر و شغل اوراد کے ساتھ ساتھ درس بھی دیتے رہتے تھے۔ آپ کے مرید بھی ذکر میں مشغول ہوتے تھے۔ آس پاس کے تمام لوگ آپ کے معتقد تھے۔ آپ کا دسترخوان بہت کشادہ تھا۔ بڑے اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ بادشاہوں جیسی طبیعت پائی جاتی تھی۔

سید محمد اشرف کرانوی: آپ کرانی (کوئٹہ کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے) کے سید خاندان سے تھے۔ آپ کی مالی حالت بھی اچھی تھی۔ مرید ہونے کے بعد زیادہ وقت ذکر و فکر میں بسر کرتے تھے اور ذکر میں زیادہ ہی سرگرم عمل ہوتے۔ اسی لیے تھوڑی مدت میں خلافت سے سرفراز ہوئے۔ آپ سے اچھے خاصے لوگ فیض یاب گئے۔ آپ اکثر طالبعلموں اور غریبوں کی خدمت کیا کرتے تھے اور یتیموں کی زیادہ خبر گیری فرماتے۔ یتیموں کیلئے کپڑے بنواتے اور ان میں تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ اخلاق حسنہ کے زیور سے آراستہ تھے۔ آپ دسترخوان بھی کافی کشادہ تھا۔ جوانی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

ملا احمد صاحب کلی شیخاں: آپ ہر وقت حضرت خواجہ فیض الحق کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ اکثر رات کو مزاروں پر جب خواجہ صاحب تشریف لے جاتے تو آپ کے ہمراہ ہوتے تھے۔ ہر وقت ذکر شغل میں مشغول رہنے کے باوجود درس سے بھی لوگوں کو مستفید فرماتے تھے۔

خلیفہ درمحمد مستونگی: آپ عالم شباب میں بہت سرکش تھے۔ لوگوں کے ساتھ بدخلقی سے پیش آتے تھے۔ لیکن جب خواجہ فیض الحق کے مرید ہوئے تو تمام برے افعال و اعمال سے تائب ہو کر صالح انسان بن گئے اور بنی نوع انسان کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔

ذکر و فکر میں بھی مصروف رہتے تھے۔ ایک دفعہ آپ بھاگ ناڑی میں ایک بستی سے گدھے پر سوار گزر رہے تھے کہ ایک شخص سامنے آیا اور عرض کیا کہ میں بھی آپ کے طریقے میں داخل ہو چکا ہوں مگر ابھی تک ذکر جاری نہیں ہوا۔

آپ نے اسی کیفیت میں اس شخص سے کہا کہ آنکھیں بند کر لو اور اپنے دل کی طرف دھیان دو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد خلیفہ صاحب نے اس پر توجہ کی وہ شخص بے ہوش ہو گیا اور بے خود پڑا رہا۔ قریباً ایک گھنٹے کے بعد جب ہوش آیا تو ذکر جاری ہو چکا تھا۔

حضرت بھر چونڈی شریف: حضرت شیخ المشائخ عبدالرحمٰن کا روحانی اثر بلوچستان میں بھی ہوا۔ آپ کا آستانہ مبارک میکانگی روڈ کوئٹہ پر موجود ہے۔

چلتن بابا: چلتن بابا کے حالات زندگی یکسر مفقود ہیں۔ ہزاروں قبائلی ہر سال منت مانتے ہیں اور چلتن بابا کی خانقاہ کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور خیرات کر کے حصول مراد کے لیے دعا کرتے ہیں آپ کی خانقاہ چلتن پہاڑ میں اور مزار کوئٹہ چھاؤنی میں ہے۔

روایت ہے کہ چلتن کا آتش فشاں پہاڑ وقتاً فوقتاً بھڑک کر ادھر اُدھر پھیل گیا۔ جب یہ سالم تھا تو اس کے طرفین خوب شاداب اور زرخیز تھے۔ اس علاقے میں ایک درویش بھی رہتا تھا ایک رات اسے کشف کے ذریعے معلوم ہوا کہ اس شہر پر آفت نازل ہونے والی ہے۔ وہ اپنے خاندان کے چالیس افراد کو لے کے اس پہاڑ کی طرف چلا گیا۔ جب یہ بات عام ہوئی تو حاکم کو غصہ آیا اور اس درویش کو واپس لانے کا حکم صادر کیا۔ درویش کو پتہ چلا کہ تو اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو اپنی چادر میں ڈال دیا اور پیٹھ پر اٹھا کر چل دیا۔ جب سپاہیوں نے اسے گھیرے میں لے کر استفسار کیا تو درویش نے کہا کہ میں اکیلا ہوں، میرے ساتھ اور کوئی نہیں۔ سارا پہاڑ چھان مارا، کوئی دوسرا فرد نہ ملا۔ درویش کی ولایت کا ان کو علم تھا ہی، کہا کہ چادر میں آپ نے آدمی چھپائے ہیں۔ درویش نے ایک غار کے سامنے بیٹھ کر چادر پھیلا دی اس میں تربوز تھے۔ درویش نے وہ سارے تربوز غار میں پھینک دئے۔ اور خود بھی غار میں روپوش ہو گیا۔ بادشاہ کی فوج ناکام لوٹی۔ شہر پر آفت نازل ہوئی۔ بادشاہ بھی اس کا شکار ہوا، لیکن درویش آج بھی اپنے خاندان کے چالیس افراد سمیت اسی پہاڑ میں موجود ہے۔ اسی لئے اس کا نام چہل تن (چلتن) پڑ گیا۔

حضرت سید پیر بلو: آپ افغانستان کے رہنے والے تھے۔ انہیں علوم شرع پر پورا عبور تھا۔ وہ صاحب کشف و کرامات تھے۔ بچپن ہی سے عبادت گزار اور ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔ آپ کے والدین کی خواہش تھی کہ ان کا فرزند دین کے بجائے دنیاوی امور کی طرف متوجہ ہوں۔ چنانچہ وہ آپ کی عبادت میں مخل ہونے لگے۔

مجبوراً آپ کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ آپ کوئٹہ پہنچ کر سریاب روڈ کے کنارے بیٹھ گئے اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے آپ کے پاس بڑی تعداد میں لوگ آنے لگے اور فیض حاصل کرنے لگے۔

روایت ہے کہ افغانستان کے چند تاجر برصغیر پاک و ہند سے واپس اپنے وطن جا رہے تھے انہوں نے وادی شال (کوئٹہ کا قدیم نام) میں پہنچ کر سید پیر بلو کے فیضان کا شہرہ سنا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک تاجر نے آپ کو پہچان لیا اور آپ کے والدین کو اطلاع دے دی۔

آپ کے والد جو بہت ضعیف ہو چکے تھے، اپنے بیٹے کے پاس آئے اور انہیں گھر چلنے پر مجبور کرنے لگے حضرت پیر سید بلو چونکہ دنیاوی کاموں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے ایک دم غائب ہو گئے۔ سریاب روڈ پر واقع آپ کی خانقاہ پر آج بھی لوگ بڑی تعداد میں حاضری دیتے ہیں۔

پہلوان بابا: پہلوان بابا شریعت کے پابند اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ ریس کورس (بدھ) کوئٹہ کے قریب ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ جہاں ان کی وفات پر ان کا مزار بنایا گیا۔ بے شمار لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ فرمایا کرتے تھے "ہمیشہ دوست سے مانگو جو دیتے ہوئے تھکتا نہیں"۔

پہلوان ان کا وصفی نام ہے۔ وہ اس طرح پڑا کہ ایک بار انہوں نے ایک بہت بڑی دیگ اٹھالی جس کی وجہ سے لوگ انہیں پہلوان کہنے لگے۔ ان کا مزار کوئٹہ کے سپینی روڈ پر ہے۔ لیکن ان کی مناسبت سے اسے پہلوان بابا روڈ بھی کہتے ہیں۔ (باحوالہ "صوفیائے بلوچستان" از ڈاکٹر انعام الحق کوثر)

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب صوفیائے بلوچستان سے کوئٹہ اور مضافات میں موجود مزارات کا ذکر کرتے ہیں۔

سید شیر جان آغا: ایک اور سید جن کا سالانہ عرس اور میلہ لگتا ہے۔ اور پشتونوں کے علاوہ دیگر قبائل بھی فیض پاتے ہیں۔ وہ ہیں۔ حضرت شیر جان آغا قلندر گلنگوری جن کے بارے میں ڈاکٹر کوثر لکھتے ہیں کہ آپ کا مقبرہ نوشکی روڈ کے قریب کشگور میں واقع ہے۔ آپ خرکاری کرتے تھے ایک روز حضرت پیر عبدالسلام نے جو پیران پیر میں سے تھے آپ کو دیکھا تو فی الفور آپ کی روحانی رغبت کا اندازہ لگا لیا انہوں نے آپ کو ہدایت کی کہ آپ کسی جگہ بیٹھ کر تبلیغ اسلام کا مقدس فریضہ ادا کریں لہٰذا آپ سے بہت سے لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ آج بھی آپ کے معتقدین بھاری تعداد میں موجود ہیں۔

آپ کا ایک معروف واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں نے ریلوے لائن بچھانے کے لیے جو نقشہ تیار کیا تھا اس کے مطابق لائن آپ کے مزار کے قریب سے گزرتی تھی آپ نے اس لائن کے بچھانے والے انجینئر کو تین بار خواب میں کہا کہ لائن ہٹا کر بچھاؤ مگر انجینئر نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور لائن اپنے نقشے کے مطابق بچھا دی۔ اس لائن پر جب تجرباتی ٹرین چلائی گئی تو وہ ٹرین آپ کے خانقاہ کے نزدیک پہنچ کر الٹ گئی۔

پھر بھی مذکورہ انگریز انجینئر اپنے ارادے سے باز نہ آیا اور لائن دوبارہ بنا دی۔ اس کے اگلے روز ہی انگریز انجینئر کی لاش ایک درخت پر لٹکی ہوئی پائی گئی مجبوراً انگریزوں کو لائن بچھانے کا نقشہ تبدیل کرنا پڑا۔

آپ سید پشتون تھے آپ کے مزار پر انوار پر ہر سال عرس باقاعدگی سے منایا جاتا ہے۔

آپ کے بارے میں عوامی اصناف شعر میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ جس سے آپ کی ہر دلعزیزی اور لوگوں میں مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شیخ آتو: پیر کبار سید شیخ عطاء اللہ المعروف شیخ اتو (ابن سید ابی سعید ابن سید اسحاق) حضرت مودود چشتی ہراتی کے خلیفہ اور ماذون تھے اپنے پیر کی وفات کے بعد بھی آپ پانچ سال تک ہرات میں رہے۔ ۵۳۲ھ/۱۱۳۷ء میں اپنے وطن علاقہ شیرانی لوٹ آئے۔ آپ کے چار بھائی کرنی، اکو، پیری اور توری تھے۔ آپ کے چھ بیٹے تھے۔ خواجہ ثناء اللہ عارف اللہ خواجہ محمد، خواجہ شہاب الدین، خواجہ ابراہیم اور خواجہ عیسیٰ خیل ''تذکرہ صوفیائے پنجاب'' کے مولف اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں کہ پیر کبار اتو بن شورہ بن خویشگی افغان قوم سے تھے چشت میں جا کر مودود چشتی کے مرید ہوئے چالیس برس تک اپنے مرشد کی خدمت میں رہے وفات سے قبل حضرت خواجہ مودود چشتی نے آپ کو خرقہ خلافت سے ممتاز فرما کر وطن کی طرف رخصت کیا لیکن وہ اپنے شیخ کے روضہ مبارک کی جاروب کشی میں مصروف رہے آخر اپنے شیخ کے اشارہ روحانی کی بناء پر مجبوراً اپنے وطن واپس ہوئے اور رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے شیخ کبار نے ۵۵۰ھ/۱۱۵۵ء میں وفات پائی۔

شیخ اتو کے صاحبزادے عارف اللہ کے خاندان میں احمد جوانمرد گذرے ہیں۔

اچک نیکہ: آپ پٹھانوں کے معروف قبیلہ اچکزئی کے جد امجد ہیں۔ اچکزئی چمن میں اکثریت سے ہیں۔ جبکہ نیکہ پشتو میں دادا یا نانا کو کہتے ہیں۔ لیکن یہاں بزرگ کے معنوں میں بھی ہے۔ آپ بڑے عالم، فاضل زاہد عابد اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے آپ کا نام اچک تھا آپ کا مزار دوبندی سے ۲۴ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ اپنی پرہیزگاری کی وجہ سے مشہور ہوئے اسی سبب سے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد آپ کی زندگی میں حاضر خدمت ہو کر بہرہ یاب ہوتی رہی۔ آپ اپنا زیادہ وقت عبادت الٰہی میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی کئی کرامات مشہور ہیں۔

احمد جوانمرد: روایت ہے کہ سید احمد جوانمرد اپنے والد محترم سید موسیٰ کے ایام زندگی اور لڑکپن میں علاقہ شیرانی کے پہاڑوں میں مویشی چراتے تھے۔ ایک دن اتفاق سے چرانے والی بھیڑوں کی تعداد بھی چالیس تھی آپ کے پاس ابدال کے مراتب کے چالیس ہی بزرگ آئے اور انہوں نے آپ سے کہا کہ ہم آپ کے مہمان ہیں۔ گو کہ لڑکپن کے دن تھے۔ مگر آپ نے خندہ پیشانی سے انہیں خوش آمدید کہا اور چالیس کی چالیس بھیڑیں ذبح کر کے کباب کر دیں۔ مہمان بہت خوش ہوئے آپ کو احمد جوانمرد کے خطاب سے نوازا اور ولایت دی۔ بعد میں آپ ملتان گئے اور خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے ہاتھ بیعت کی۔ درجہ کمال تک پہنچے۔ آپ کے تین لڑکے تھے۔ سعد ین المعروف سدو، محمود اور خواجہ سلیمان دانا۔

شیخ اسماعیل سڑبنی: آپ شیخ بیٹ نیکہ کے لخت جگر تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بیٹ نیکہ کے بھائی سڑبن نیکہ کے کوئی اولاد نہ تھی ایک دن وہ اپنے بھائی بیٹ کے پاس آئے اور کہا کہ میں غریب ہوں اور اولاد کی نعمت سے بھی محروم ہوں۔ آپ میرے حق میں دعا کیجئے۔ چنانچہ بیٹ نیکہ نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی اور دعا کے بعد اپنے بیٹے اسماعیل کو سڑبن کے حوالے کر کے کہا کہ یہ آپ کا بیٹا ہے۔ انشاء اللہ آپ کی مراد پوری ہوگی۔

سڑبن اپنے بھتیجے کو گھر لے گئے اور اپنی اولاد کی طرح ان کی پرورش کی۔ وہ اسی کے باعث سڑبنی کہلائے۔ ویسے اللہ نے سڑبن کو اولاد کی نعمت بھی عطا کی اور مال و دولت سے بھی نوازا۔

آپ زاہد، عابد اور عارف تھے۔ آپ کا مزار کوہ سلیمان میں خواجہ خضر کے مقام اور نوازی خواہ نامی جگہ پر ہے۔ وہیں کے ایک مرید شیخ احمد ابن موسیٰ کا مزار بھی ہے جو ایک بہت بڑے بزرگ تھے۔ انہوں نے روبستان میں بھی رشد و ہدایت اور تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ آپ کے مزار پر ایک خوبصورت گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ آپ کی اولاد آج کل مختلف پشتون قبائل ہیں۔

سلیمان ماکو نے تذکرہ اولیاء میں لکھا ہے کہ اسماعیل بھی اپنے باپ بیٹ بابا کی طرح اپنے عہد کے بہت بڑے ولی تھے۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کیلئے ہندوستان، افغانستان، بلخ اور بخارا تک سے عقیدت مند چلے آئے تھے۔ آپ شعر بھی کہتے تھے۔

قاضی نور الحق نے لکھا ہے کہ بیٹ بابا کی مناجات ہو یا اسماعیل سڑبنی کا کلام وہ کسی مرحلے میں مقصدیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کی شاعری اس دور کے اخلاقی، مذہبی عقیدوں اور معاشرتی حالات کی آئینہ دار بھی ہے۔ ان کی

غزلوں اور نظموں میں کہیں بھی تنگ نظری، نسلی تعصب اور قبائلی مفاد کی جھلک نظر نہیں آتی۔ ان کے بعد کے غر کے علاقے کے شمس الدین کاکڑ اور پیر محمد کاکڑ نے اسی نظریہ کا پرچار کیا جو بیٹ بابا اور ان کے نامور فرزند اسماعیل سڑبنی کا طرہ امتیاز ہے۔

اسماعیل نیکہ: آپ کیدانی سید تھے۔ آپ کی جائے رہائش کھوسٹ ضلع سبی میں تھی۔ ان دنوں کھوسٹ میں پانی کی بے حد قلت تھی۔ اس لئے ایک مرتبہ آپ کے مریدوں نے آپ سے درخواست کی کہ ہمارے پینے کے لیے پانی کی ضرورت ہے۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ اس طرف توجہ فرمایئے۔ آپ نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی جو مستجاب ہوئی اور پانی کا ایک چشمہ پھوٹا جس سے لوگوں کی تکالیف دور ہوگئیں آپ کھوسٹ ہی میں فوت ہوئے وہیں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

خرواری بابا: ایک ایسی شخصیت جس کے مزار پر تقریباً عقیدت مندوں کے علاوہ غیر عقیدت مند بھی جاتے ہیں۔ وہ بابا خرواری ہیں۔ کیونکہ آپ بلوچستان کی پُرفضا وادی زیارت میں دفن ہیں۔ اور زیارت کی وادی کی سیر کرنے والے آپ کے مزار پر بھی ضرور جاتے ہیں۔

آپ کا اصلی نام ملا طاہر تھا اور آپ سارنگ زئی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے حضرت میاں عبدالحکیم نانا صاحب کے مریدوں میں آپ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

ایک مرتبہ حضرت میاں عبدالحکیم نانا صاحب گوشکی یا غوشکی آئے اور ملا طاہر کے ہاں قیام فرمایا ایک رات جب نانا صاحب عبادت میں مصروف تھے انہیں پیاس لگی آپ نے ملا طاہر سے پانی مانگا۔ جب وہ پانی لائے تو دیکھا کہ نانا صاحب اس انہماک کے ساتھ عبادت میں مگن ہیں کہ انہیں گردوپیش کا خیال تک نہیں ملا طاہر ہاتھ میں پانی لئے ان کے نزدیک کھڑے رہے۔ سردی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی پانی یخ ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد نانا صاحب نے اس جانب توجہ فرمائی تو ملا طاہر نے پانی والا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور جونہی نانا صاحب نے پانی کا کٹورہ اٹھایا تو آپ کے ہاتھ کی جلد جو اس شدید سردی کی وجہ سے کٹورے کے ساتھ جم چکی تھی۔ ہاتھ سے الگ ہوکر کٹورے کے ساتھ ہی کھنچ آئی۔ اس پر نانا صاحب نے فرمایا، اوروں کو تو میں نے معمولی سی بزرگی دی لیکن تمہیں خرواروں (چار بوری گندم کو خروار کہتے ہیں۔ یہ بلوچی اور پشتو لفظ ہے) کے حساب سے بزرگی دیتا ہوں۔ اس واقعہ کے باعث ملا طاہر بابا ''خرواری'' کے نام سے مشہور ہوگئے۔

انگریزوں نے ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء میں گوشکی کو بلوچستان کے گرمائی صدر مقام اور سینی ٹوریم کے لئے منتخب کیا۔ اور ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء میں جناب ملا طاہر بابا خرواری کے مزار کی وجہ سے گوشکی کو ''زیارت'' (مقامی زبان میں مزار کو اسی نام سے پکارتے ہیں) کا نام دیا گیا ہے۔ سارنگ زئی کے قبائل میں ابھی تک زیارت کا پرانا نام ہی چلتا ہے۔

بابا خرواری صاحب کشف و کرامات تھے۔ تبلیغ اسلام کے لئے آپ نے غیر معمولی کام کیا۔ آپ کا مزار زیارت سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ زیارت کے باشندے بابا خرواری کے مزار کو بہت بابرکت خیال کرتے ہیں۔ چھٹی کے روز اکثر لوگ مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ اکثر لوگ وہاں دنبے ذبح کرتے ہیں۔ عید کے روز سارنگ زئی قبیلہ کے لوگ یہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ نشانہ بازی کے مقابلوں کے علاوہ کشتیاں لڑی جاتی ہیں۔ شام کو دنبے کا بُھنا ہوا گوشت کھا کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ راستے میں ایک جگہ پتھروں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ جو ظاہراً کسی چھوٹی سی عمارت کے کھنڈر معلوم ہوتے ہیں۔ مقامی روایت کے بموجب یہ پتھروں کا ڈھیر حضرت طاہر خرواری بابا کی مسجد کے آثار ہیں۔ جس میں آپ عبادت کیا کرتے تھے۔

بابک صاحب: آپ کا اسم گرامی سید محمد صدیق جان تھا۔ لوگ آپ کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے باعث آپ کو بابک صاحب کہنے لگے۔ چنانچہ اصل نام کی بجائے یہی نام مشہور ہوگیا۔ آپ نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ گلستان کی کلی عبدالرحمٰن میں گزارا۔ آپ کا تعلق شادیزئی سید قبیلے سے ہے۔ افغانستان کے علاقہ کدنی کے مشہور پیر اور روحانی پیشوا حضرت عبدالغنی جان آغا بھی آپ کے خاندان سے تھے۔ جو ظاہری اور باطنی علوم اور عبادت گزاری کے باعث افغانستان اور پاکستان میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بابک صاحب کا مزار عنایت اللہ کاریز (گلستان) سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر جنوب کی جانب خوژک نامی پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ چاروں طرف سے مزار تک پہنچنے کے لئے راستے ہیں۔ آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ مزار سے جنوب کی جانب ''چینہ غونڈی'' پہاڑی پر ندی کے کنارے آپ کا حجرہ ہے۔ جو ایک چٹان میں بنا ہوا ہے۔ آپ اکثر ریاضت اور عبادت کے لیے وہاں تشریف لے جاتے تھے۔

بابک صاحب کی قبر کے اردگرد صرف چار دیواری ہے۔ اس کے اوپر کوئی گنبد یا چھت موجود نہیں قبر کے سرہانے ایک مستطیل پتھر نصب ہے۔ جس پر چند اشعار اور مختصر حالات زندگی کندہ ہیں۔

باقر نیکہ: ضلع ژوب کی تحصیل قلعہ سیف اللہ میں سب سے زیادہ مشہور مزار آپ ہی کا ہے۔ جو قلعہ سیف اللہ سے شمال کی جانب تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر سپین تنگی میں

واقع ہے۔ آپ جوگیزئی خاندان کے بانیوں میں سے ہیں۔ آپ کے دور میں جوگیزیوں کا اثر اور اقتدار عروج پر تھا۔ آپ صاحب حال بزرگ تھے۔ ایک بار احمد شاہ ابدالی نے آپ کو قندھار طلب کیا اور آپ کو اپنے قبیلے کا مالیہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ اس بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ جس پر باقر نیکہ کو ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیا گیا مگر آپ معجزانہ طور پر زندہ و سلامت باہر نکل آئے احمد شاہ ابدالی آپ کی روحانی قوت کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور آپ کو مالیہ سے مستثنیٰ قرار دینے کے لیے سند جاری کر دی۔

سنز رخیل کثیر تعداد میں آپ کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

بی بی ہروانا: تصوف و عرفان کی تاریخ میں اگرچہ خواتین کا حصہ کم ہے۔ لیکن کچھ بہت اہم خواتین موجود ہیں۔ جن میں سب سے بڑھ کر حضرت رابعہ عدویہ بصریؒ ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر نام بھی نظر آتے ہیں۔ جن میں بلوچستان کے حوالے سے بی بی ھروانا کا نام بھی معروف ہے۔ ''آنا'' نانی یا دادی کو کہتے ہیں۔ جبکہ یہ لفظ بزرگی اور عظمت کی علامت بھی ہے۔

یہ خاتون عمر بھر کنواری رہیں تمام عمر طاعت و زہد میں گزری۔ ہر وقت ذکر الٰہی میں مگن رہتیں ان سے کئی ایک کرامتیں منسوب ہیں۔ کربی کچھ میں ونڑ پچی قبیلے نے انہیں کچھ زمینیں بطور عقیدت دی تھیں جو آج تک باروانا کے اپنے قبیلے تہانری کے قبضے میں ہیں۔ انہوں نے موت کے وقت یہ وصیت فرمائی تھی کہ مجھے کسی ایسی جگہ دفن کیا جائے جہاں سے ونڑ پچیوں کے دشمنوں کا گزر رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنی قوم کو یقین دلایا کہ تمہارے دشمن وہاں سے پھر نہیں آسکیں گے اور اگر آئے بھی تو نقصان اٹھا کر لوٹیں گے چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق آپ کو چوتیر ضلع لورالائی سے چار میل دور وانی کے مغربی کنارے پر سپرد خاک کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ آج سے ایک صدی پہلے ڈیڑھ ہزار دومڑوں (سنجاوی کے باشندے) نے ونڑ پچیوں پر حملہ کیا اور ان کے مویشی لے کر فرار ہو گئے۔ دو سو ونڑ پچیوں نے ان کا تعاقب کیا وانی (جواب ہروانا پیرئے کہلاتا ہے) پہنچے ان کے مزار پر حاضری دی۔ کامرانی کی دعا کی اس کے بعد وہ اپنے مویشی لے کر واپس آنے میں کامیاب ہوئے اور دشمن ان کو نقصان نہ پہنچا سکے اور آج تک یہ روایت مشہور ہے کہ ونڑ پچی دومڑ پر طاقت میں فوقیت رکھتے ہیں۔

ایک اور روایت مشہور ہے کہ ونڑ پچی اور دومڑ نبرد آزما تھے۔ دومڑ باروانا کی ولایت کے منکر تھے انہوں نے آپ کو برا بھلا کہا اور ان کی بزرگی کو جھٹلایا انہوں نے کبوتر کی شکل اختیار کی اور فضا میں پرواز کر کے دومڑوں کے سر پر منڈلانے لگیں تین ونڑ پچی چرواہوں نے ان دومڑیوں سے لڑائی کی اور انہیں مار ڈالا کہتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد دومڑ قبیلہ بھی ان کی ولایت کا اقرار کر گیا۔ جبکہ اس واقعہ کی دوسری شکل میں بھی ذکر ملتا ہے کہ ایک مرتبہ چار اشخاص مال اسباب کے ساتھ ندی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف جا رہے تھے کہ ایک لشکر ان پر حملہ آور ہوا اس چار افراد نے اپنی تلواریں نیام سے نکالیں اور کچھ ہی دیر میں انہیں اپنے سروں کے اوپر ایک کبوتر اڑتا دکھائی دیا اور اس کے بعد ان کو اپنے بازوؤں میں ایک عجیب طاقت محسوس ہوئی اور بالآخر اس لشکر کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے ان کا کہنا تھا کہ جب وہ چل پڑے تو وہ کبوتر ان کے سر پر اسی طرح منڈلاتے ہوئے ان کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور ہروانا کے مقبرے تک آکر غائب ہو گیا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس جگہ وہ دفن ہیں وہ جگہ ان کی اپنی وصیت کے مطابق ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ مجھے فلاں جگہ دفن کریں کیونکہ اس طرف سے آپ پر دشمن حملہ آور ہو سکتے ہیں۔

ملا خدر نیکہ: گمان یہ ہے۔ کہ آپ کا صحیح نام ملا خضر تھا۔ جو بعد میں ملا خدر ہو گیا۔ آپ اتمان خیل کاکڑ کی شاخ عمر زئی شیخ سے تھے۔ لورالائی سے چھ میل کے فاصلے پر مغرب کی سمت ژڑکاریز میں آپ کا مسکن تھا آپ کا مزار اور الائی شہر سے ایک میل مغرب کی جانب رودلین گاؤں کے اربوسین قبرستان میں ہے۔ روایت ہے کہ آپ ژڑکاریز کے پہاڑ کے دامن میں بیٹھے یونہی وقت گزاری کے لیے پتھر اکٹھے کر رہے تھے اس اثناء میں ایک آدمی آیا اور اس نے آپ سے کہا کہ انہیں آپ حکم دے کر کیوں یک جا نہیں کر لیتے؟ آپ نے منکسر المزاجی سے کام لیتے ہوئے فرمایا: ''یہ میرے بس کی بات نہیں ہے'' یہ سن کر اس آدمی نے پتھروں کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کا پھر انہیں پہاڑ کی شکل اختیار کرنے اور مابعد آگے سرکنے کا حکم دیا جب یہ سب کچھ وہ کر بیٹھا تو ملا خدر نے اس سے کہا کہ اب اسے واپس اپنی پہلی حالت میں لے آؤ اس آدمی نے اظہار عجز کیا آپ نے پہاڑ کو اپنی طرف بلایا۔ پھر اسے مختلف پتھروں کی شکل میں پہلے جیسے ایک ہی جگہ الگ ہونے کا حکم دیا اور مابعد ہر پتھر کو اپنے اپنے مقام پر جانے کا حکم دیا۔ بالکل ایسا ہی ہوا اور وہ شخص خود صاحب ولایت ہونے کے باوجود آپ کے حلقہ ارادت میں آگیا۔

ایک اور روایت کے مطابق تحصیل پشین کے کسی گاؤں میں ایک چڑیل آگئی جو قتل و غارت کیا کرتی تھی پشین سے علماء و فضلاء کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ان کے ساتھ چلے گئے مقررہ مقام پر پہنچ کر آپ نے خود ایک بیوہ کے ہاں

ٹھہرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ شام کو جب آپ اس بیوہ کے گھر پہنچے تو وہ روٹی پکا رہی تھی آپ کو دیکھتے ہی وہ اُڑ گئی آپ بھی اس کے تعاقب میں اُڑے کہتے ہیں کہ ساری رات ان کی کشمکش چلتی رہی راستے میں اس عورت (چڑیل) نے دو قتل کئے اور گندم کے ایک کھیت کو آگ لگا دی۔ کھیت جلاتے وقت آپ نے اسے بالوں سے پکڑا اور زبردستی اس سے کلمہ طیبہ پڑھوایا۔ بعد میں اس عورت نے قتل و غارت ترک کر دیا۔

خلیزی نیکہ: آپ چشتیوں کی ایک شاخ بیدار سید کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ روایت ہے کہ ژوب میں موت سے قبل آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری میت اونٹ پر رکھ دینا جہاں اُونٹ رُکے وہیں مجھے دفن کر دینا۔ مریدوں نے وصیت کے مطابق ایسا ہی کیا۔ اُونٹ لورالائی شہر سے تین میل کے فاصلے پر مغرب کی سمت سیلی گاؤں کے قریب بیٹھ گیا پانی کا نام و نشان تک نہ ہونے کے سبب مرشد مشوش ہوئے مگر تکمیل وصیت پیش نظر تھی۔ اس لئے قبر کی کھدائی شروع کی۔ کھودتے کھودتے اچانک وہاں سے چشمہ پھوٹ پڑا۔ کہتے ہیں کہ درگئی کدیزئی جانے والا نالہ اسی چشمے کے پانی سے بہتا ہے۔

آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ مرگی دق اور فالج کے مریضوں کو یہاں بفضل ربی شفا ملتی ہے۔

دو تین سال قبل کسی آدمی کو آپ خواب میں نظر آئے تھے اس نے بطور عقیدت آپ کے مزار پر تقریباً ایک لاکھ روپے کی لاگت سے گنبد تعمیر کرایا ہے۔

خنائی بابا: آپ کا نام ملا فاضل اور عرف خنائی بابا ہے۔ آپ کی خانقاہ خنائی میں واقع ہے۔ اسی کی مناسبت سے آپ ''خنائی بابا'' کہلائے۔ یہ مقام کوئٹہ سے لورالائی، ژوب کے راستے پر تیس میل کے فاصلے پر ہے۔

آپ بڑے جید بزرگ تھے۔ آپ نے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ آپ نے اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لئے خنائی میں ایک مدرسہ قائم کیا جو آج بھی موجود ہے۔ اور لوگ وہاں دینی تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

ملا خوشحال آخوند: آپ کی تاریخ ولادت و وفات معلوم نہیں اندازاً آپ کا زمانہ ۱۸۰۰ء سے پہلے کا متعین کیا جا سکتا ہے، آپ کا وطن مالوف غیو (توبہ کاکڑی، پشین) ہے۔ آپ صاحبزادہ خیل، حسن زئی، احمد خیل، ترغری کاکڑ تھے۔ آپ کا مزار غیو سے دو میل جنوب کی جانب ایک پہاڑی کے اوپر ایک بڑے اور پرانے قبرستان میں واقع ہے۔ جس پر انہیں کی نسل کے ایک فرد محمد عیسیٰ نامی نے خام گنبد تعمیر کیا۔ مزار کے پاس ہی ایک کنواں اور ایک کمرہ زائرین کے لئے موجود ہے۔ یہی ملا محمد عیسیٰ مرحوم مزار کا مجاور بھی رہا۔

صاحبزادہ خیل اپنے قبیلے حسن زئیوں کے پیر اور بزرگ چلے آتے ہیں۔ یہ دونوں ذیلی شاخ توبہ کاکڑ کے گاؤں غیو میں یک جا سکونت پذیر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ''غیو'' میں ایک حسن زئی کی کاریز تھی۔ اس حسن زئی کا رویہ اخوند صاحب کے ساتھ معاندانہ تھا۔ ایک دفعہ اخوند صاحب نے ایک شخص سے کہا کہ جاؤ اور اس کاریز میں ہاتھ دھو آؤ جونہی اس آدمی نے کاریز میں ہاتھ دھوئے اس کا پانی خشک ہو گیا اور اب تک وہ خشک پڑی ہوئی ہے۔

جب اخوند واصل بحق ہوئے تو ان کا جنازہ ''پڑانگ'' نامی مرتفع پر سے اوپر نہ لے جایا جا سکا۔ یہ چڑھائی آپ کے مزار سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ جس وقت لوگ جنازے کو پہاڑ کے اوپر لے جانے سے عاجز آ گئے تو اسی وقت ایک چیتا نمودار ہوا۔ لوگ اسے دیکھ کر خوف کے مارے بھاگ گئے اس کے بعد تین اور چیتے ظاہر ہوئے اور چاروں نے مل کر اخوند صاحب کے جنازے کو موجودہ جگہ تک پہنچایا اور پھر واپس چلے گئے۔

لوگوں نے جو دور سے یہ حیران کن منظر دیکھ رہے تھے واپس آ کر اخوند صاحب کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کی تدفین سے پیشتر یہ چیتے زور سے چنگھاڑے۔ یہ گویا اخوند صاحب کی موت پر ان کا اظہار غم تھا۔ اس واقعے کے بعد اس چڑھائی کا نام ''پڑانگہ'' یعنی چیتوں کی چڑھائی پڑ گیا۔

خواجہ روح اللہ صاحب اخوندزادہ گانگلزئی: خواجہ میاں روح اللہ تحصیل پشین سے آٹھ میل کے فاصلے پر مشرق کی طرف خداداد زئی گاؤں میں ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء میں پیدا ہوئے آپ تورترین قبیلے سے تھے۔ آپ کی پیدائش سے چند مہینے پہلے آپ کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ سات سال سے بیس سال کی عمر تک آپ اپنے دادا ملا نیک محمد اخوند سے باقاعدہ تحصیل علم کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ قندھار روانہ ہوئے۔ وہاں آپ نے اس وقت کے جید عالم ملا محمد نور پوپلزئی سے فقہ، نحو، تفسیر، حدیث اور دوسرے علوم میں پورا استفادہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ کلی حاجزی تحصیل پشین تشریف لائے اور یہاں امامت اختیار کی گانگلزئی (پشین سے شمال کی طرف ۱۴ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں) کے اکابر آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے کئی بار آپ سے گانگلزئی میں امامت اختیار کرنے کی استدعا کی۔ چنانچہ آپ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں گانگلزئی تشریف لے گئے۔

روایت کے مطابق آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ مگر ''تفسیر جلالین'' کا حاشیہ جو ''ترویح الارواح'' کے نام سے آج بھی پاکستان، افغانستان اور ہندوستان میں مشہور ہے، آپ کی بلند پایہ تصنیف ہے۔ اسی کتاب کے پیش نظر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی بلوچستان کے طالب علموں سے کہتے تھے۔ کہ آپ نے ''ترویح الارواح'' کے مصنف کی زیارت کی ہے۔ جس کا جواب اثبات میں ہوتا تو آپ پوچھتے کہ ''پھر تم عالم کیسے نہیں ہوئے؟'' آپ کے بارے میں آپ کے مرشد کا کہنا ہے کہ ''شہباز چڑیا کے دام میں آ گیا ہے۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ اتنی عظیم شخصیت میرے حلقہ ارادت میں ہے۔''

آپ جب کچی سے پشین لوٹے تو ہزاروں افراد نے آپ کی مریدی اختیار کی اور علمی اور روحانی بصیرت حاصل کی۔

سنزرنیکہ: آپ فورٹ سنڈیمن سے ۳۷ میل کے فاصلے پر علاقہ کبزئی میں کوٹ قبول زئی کے مقام پر گوسہ میں دفن ہوئے۔ آپ کے مزار کی نسبت سے کوٹ قبول زئی کو ''زیارت سنزرنیکہ'' بھی کہا جاتا ہے بے شمار لوگ عقیدت واحترام کے ساتھ مزار کی زیارت کرنے جاتے ہیں۔ سنزرنیکہ سنزرخیل کاکڑ کے جد امجد ہیں۔ سنزرخیل کاکڑ کی دس شاخیں ہیں۔

علی زئی، عبداللہ زئی، کبزئی، حمزہ زئی، ہیسی، جرمزئی، کدے زئی، عربی خیل، تمینی

پڑزون: سنزرنیکہ کے والد محترم کا اسم گرامی کاک تھا۔ آپ کے چار بھائی سنیڑا، ترغری، سرگڑنی اور حسینٹر تھے۔ آپ کی والدہ سیدہ تھی۔

آپ کی ذات گرامی کا تذکرہ، لوک گیت اور عوامی اصناف شعر میں کہیں کہیں ملتا ہے۔ سنزرنیکہ کے مزار پر گنبد موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں ایک اور بزرگ کا مزار بھی ہے۔ جو روایات کے مطابق حضرت سید گڑے نیکہ ہیں۔ جن کا تعلق سادات کے مشہور قبیلہ ''تارن'' سے ہے۔ وہ بزرگ بھی ولی اللہ تھے۔ کہتے ہیں کہ آن کی اور سنزرنیکہ کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ عوام میں دونوں کی بہت سی کرامات مشہور ہیں۔

سنزرنیکہ کے مزار پر مجاور موجود ہے۔ اور لنگر کا انتظام بھی ہے۔ سنزرنیکہ کے بارہ بیٹوں کے مزار حلقہ گوسہ ہی میں علاقہ کبزئی کے ''لواڑگ'' (جسے بعض اوقات لواڑے بھی کہا جاتا ہے) کے مقام پر ایک ہی حد میں ہیں۔ جن کے باعث اب اس علاقے کو پشتو میں ''دوولسو زیارت'' (یعنی بارہ بزرگوں کے مزارات) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان مزارات کے اردگرد چاروں اطراف ایک دیوار بنائی گئی ہے۔ یہ تمام اولیاء اللہ تھے۔ ان مزارات سے قریباً تین چار فرلانگ کے فاصلے پر سنزرنیکہ کی بیٹی اور ان کی بہن کے مزار ہیں۔ یہ دونوں بھی بڑی نیک اور پارسا تھیں۔

حضرت سید دربلبل: کہا جاتا ہے کہ آپ چار بھائی تھے۔ چاروں سب تحصیل سنجاوی (ضلع لورالائی) کے علاقہ پوئی میں آئے تھے۔ آپ کا نام سید دربلال تھا۔ بعض تاریخوں میں سید دربلبل درج ہے۔

جب آپ اس علاقہ میں آئے تو ان دنوں پوئی نامی کلی کا نام جلال آباد تھا۔ یہاں کے لوگوں نے آپ کو آزمانے کے لیے کہا کہ اگر واقعی پیر اور سید ہیں۔ تو اس بہتے ہوئے پانی کو دودھ میں بدل دیں۔ روایت ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کیا اور دعا کی کہ اے میرے مولا یہ پانی دودھ بن جائے۔ چنانچہ آپ کی دعا قبول ہوئی اور بہتا ہوا پانی دودھ میں بدل گیا۔

کچھ عرصے کے بعد جب لوگوں کا جی دودھ سے بھر گیا۔ تو انہوں نے پھر آپ سے درخواست کی کہ ہمیں دودھ کے بجائے پانی ہی چاہیئے۔ آپ نے پھر بارگاہ ایزدی میں دعا کی جو منظور ہوئی اور دودھ دوبارہ پانی بن گیا۔ اس وقت سے جلال آباد کا نام پوئی پڑ گیا۔ پوئی پشتو زبان کے لفظ پئی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس کے معنی دودھ کے ہیں۔ انگریزوں نے ''پئی'' کے بجائے پوئی لکھنا شروع کیا۔ مقامی پشتو میں اسے اب بھی پوئی کی بجائے پئی کہتے ہیں کہ البتہ اب کوئی شخص بھی اسے جلال آباد کے نام سے نہیں پکارتا۔

کلی پوئی کے جس مقام پر آپ کا مزار ہے۔ وہ میر کی کہلاتا ہے۔ مزار بہت خوبصورت اور مرجع خلائق ہے۔ وہاں باقاعدہ مجاور رہتا ہے۔

حضرت ملا محمد عظیم صاحب زادہ: آپ کے والد کا نام ملا رحمت اللہ اخوند اور دادا کا اسم گرامی ملا خوشحال اخوند ہے۔ اندازے سے ان کا سن ولادت ۱۲۵۰۔۵۵ھ۔ ۱۸۳۴۔۳۹ء اور سال وفات ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء مقرر ہے۔ چونکہ ان کے والد قندھار میں سکونت پذیر تھے اس لئے انہوں نے علوم عربی کی تکمیل بھی وہیں کی ہوگی تکمیل علم کے بعد ممدوح پشین آئے۔ یہاں ان کی شادی برشور کے مکین محمد عالم کی ہمشیرہ سے ہوئی آپ نے سلیمان زئی نامی گاؤں میں امامت اختیار کی۔ آپ صحیح معنوں میں نمونہ اسلاف تھے۔ تکلف اور نام ونمود سے نفرت تھی۔ بڑے سادگی پسند تھے۔ گھر میں برتن اور اوڑھنے بچھونے کا سامان بس واجبی سا تھا۔ ایک پوستین تھی جسے رات کو سوتے وقت رضائی کی طرح اوڑھتے اور دن کو چوغے کی طرح پہنتے۔ گھر اور مسجد آتے جاتے منہ کو ڈھانپے رکھتے تاکہ کسی نامحرم عورت کی نظر

پڑے۔ ایک مرتبہ کسی ہندو لڑکی پر نظر جا پڑی تو کئی دن روتے رہے۔ آپ کے احترام کا یہ عالم تھا کہ ایک رشتہ دار عورت روز اس کوچے میں جھاڑو دیتی تھی جہاں سے آپ کا مسجد آتے ہوئے گزر ہوتا تھا۔

آپ کا مزار شہر پشین سے مغرب کی جانب ۹ میل کے فاصلے پر سادات کے ایک گاؤں سلیمان زئی کے مشرق کی طرف واقع ہے۔ قبر کچی ہے۔ جس کے چاروں طرف ایک چھوٹی سی چار دیواری ہے، وہ بھی کچی ہے۔ ساتھ ہی ایک کچا کنواں بھی ہے۔ آپ کے والد کی قبر قندھار میں اور دادا کا مزار تحصیل پشین کے غیبو نامی گاؤں میں ہے۔

آپ کے صاحبزادے عبدالرحمان جان آغا ابھی چھ ماہ ہی کے تھے کہ آپ کا انتقال ہوا عبدالرحمان کے علاوہ ایک بیٹی بھی تھی۔ اگر یہ اولاد پہلی بیوی ہی سے تھی تو اغلب گمان یہ ہے کہ آپ جوانی ہی میں وفات پا گئے ہوں گے مگر عبدالرحمان آغا کے گھر میں موجود آپ کا منقش بلند عصا اور سادہ نوکدار کپڑے کی ٹوپی آپ کے بڑھاپے کا پتہ دیتے ہے۔

برشور کے محمد حسن کی روایت کے مطابق ہرنائی میں تعلیم دین کی تحصیل کے دوران ان کو وہاں کے ایک جید اور بزرگ عالم دین نے کہا تھا کہ کیا تم پشین کے رہنے والے ہو انہوں نے جواب دیا تو اس بزرگ عالم نے فرمایا کہ پشین میں پہاڑ گر گیا ہے۔ پشین میں آنے پر محمد حسن کو معلوم ہوا کہ حضرت محمد عظیم صاحب زادہ وفات پا گئے ہیں۔

ملک یار غرشین: ایک قیاس کے مطابق آپ فورٹ سنڈیمن سے مغربی قطب کی جانب ۸۰۰۰ فٹ اونچے پہاڑ غرشین میں رہتے تھے جہاں اب بھی حریف آل عارف آل ہری پال سادات رہتے ہیں۔ دوسری روایت کے مطابق آپ پشین یا راڑہ شم کے غرشین سید تھے جو سڑ بن کی شاخ ہے۔ پشتون مورخین نے آپ کو ولی اللہ کہا ہے۔ آپ شیخ اسماعیل سڑ بنی کے مزار پر ہمیشہ مصروف عبادت رہتے۔ ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۵ء میں جب سلطان شہاب الدین غوری نے پہلی بار ملتان پر حملہ کیا تو آپ بقید حیات تھے وہاں سے آپ دہلی تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی جبکہ خان جہاں لودھی نے لکھا ہے کہ آپ کا انتقال ملتان ہی میں ہوا تھا۔

حضرت سید در جمال بخاری: آپ پشین (ضلع پشین) کے بخاری سادات کے جد اعلیٰ ہیں۔ مشہور تاریخی کتابوں جیسے ''مخزن افغانی'' اور ''خورشید جہان'' وغیرہ میں ذکر ملتا ہے کہ پشین میں ایک نیک شخص ہارون ترین رہتا تھا۔ اس کی بیوی بڑی نیک خاتون تھی ہارون نے ایک بکری پالی ہوئی تھی؛ ہارون کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ جس کا گوشت کھا کر گزارہ کرتا تھا۔ ہارون شکار کھیلنے کے لیے صبح گھر سے نکلتا اور شام کو واپس لوٹتا۔

ایک دن ہارون ترین حسب معمول شکار کے لیے گیا ہوا تھا کہ پیچھے گھر میں مہمان آ گئے۔ جو چار بھائی سید در جمال سید در بلا سید در کمال اور سید در جلال تھے ہارون ترین کی نیک سیرت بیوی نے ان مہمانوں کی خاطر مدارت کیلئے وہ بکری ذبح کر دی جو ان کے گزارے کا ایک ذریعہ تھی کیونکہ گھر میں شکار کا گوشت نہیں تھا۔ اس طرح اس نیک سیرت خاتون نے مہمانوں کو کھانا کھلایا۔

شام کو ہارون ترین گھر لوٹا تو مہمانوں کو دیکھ کر خوش ہوا۔ انہوں نے مہمان نوازی کی تعریف کی۔ ہارون ترین نے ان چار بھائیوں کو کچھ مزید وقت کے لئے اپنے پاس ٹھہرنے کو کہا۔ جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ہارون ترین نے اپنی بیٹی کی شادی سید در جمال سے کروا دی۔

سید در جمال کی اولاد پشین کے بخاری سادات ہیں۔ جن میں مشہور قبیلے ہیں۔ شادی زئی، اسماعیل زئی، درمزئی، گانگلزئی، یاسین زئی وغیرہ۔

صوبہ سرحد کے قطب الاقطاب حضرت شیخ رحمکار عرف کاکا صاحب کا تعلق پشین کے بخاری سادات سے ہے۔ شیخ رحمکار (رحم کرنے والا) کاکا (چچا) اصطلاحی طور پر بزرگوں اور عالموں کے لیے استعمال ہوتا ہے صاحب کا اصل نام کستیر گل (۹۸۴ھ/ ۱۰۶۳-۱۵۷۵ھ/ ۱۶۵۲ء) تھا۔

کلی احمدون جسے امندون بھی کہا جاتا ہے کہ احمدونی سادات کا تعلق بھی ان بخاری سادات سے ہے جو احمدون میں رہتے ہیں۔

سید نور احمد شاہ بخاری: آپ کا مزار لورالائی چھاؤنی میں ہے اور سنگ مزار پر یہ اشار کندہ ہیں:

کرد تکمیل این خانقاہ نورانی
شاہ بخاری ولی یزدانی
شوق وسعی و بلیغ ہمت خود
سیزدہ صد و پانزدہ سنہ بود
بست و پنجم جمادی الثانی

بڑے برگزیدہ بزرگ متصور ہوتے ہیں۔ شعائر اسلام کے سخت پابند تھے۔ حلال و حرام کی بہت زیادہ تمیز کرتے تھے۔ آپ کا مقبرہ مرجع خلائق عام ہے۔ جبکہ آپ کے مزار کے احاطے ہی میں مجاور کا خاندان بھی پلتا ہے۔

غرشین نیکہ: آپ بلوچستان کے مشہور سید قبیلہ غرشین کے جد امجد اور ولی اللہ

تھے۔آپ کا اصل نام معلوم نہیں، غرشین ان کا لقب ہے۔انہیں غرشین اس لئے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ لوگوں نے آزمانے کے لیے آپ سے کہا تھا کہ اگر آپ واقعی سید ہیں اور ولی ہیں۔تو اس خشک پہاڑ کو ''شین'' یعنی سرسبز و شاداب بنا دیجئے۔آپ نے بارگاہ ایزدی میں دعا مانگی۔اللہ کے حکم سے مذکورہ پہاڑ ''شین'' یعنی سرسبز و شاداب بن گیا اسی لئے آپ ''غرشین نیکہ'' یعنی ''پہاڑ کو سرسبز و شاداب کرنے والا بزرگ'' مشہور ہو گئے۔آپ کی اولاد کو غرشین سادات کہا جاتا ہے۔

بابا فرید اللہ شاہ: آپ نے پشین میں ایک جید عالم دین کی حیثیت سے شہرت پائی۔اور ایک صدی قبل تبلیغ اسلام کے سلسلے میں بہت مشہور ہوئے دور دور سے لوگ فیض یاب ہونے کیلئے حاضر ہوا کرتے تھے۔آپ نے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی خاطر بہت کام کیا۔آپ جلالی بزرگ تھے۔بابا فرید کا مزار پشین شہر سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔اور ہر جمعرات کو بھاری تعداد میں لوگ مزار پر حاضری دیتے ہیں۔مزار کے احاطہ میں بابا فرید کے علاوہ ان کے قریبی رشتہ داروں کی نو قبریں بھی موجود ہیں۔پشین کے لوگ آپ سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔

فیضو بابا: آپ کا مزار کانسی قبرستان (کوئٹہ میں واقع ہے)۔آپ صاحب کشف و کرامات تھے۔آپ کا زمانہ انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت کا زمانہ ہے۔آپ ہمیشہ انگریزوں کے خلاف رہے۔حق بات کہنے میں انہیں کوئی تامل نہ تھا۔آپ ایک وقت کئی جگہ نظر آتے تھے۔آپ کو اکثر زداب (زاہدان) اور کوئٹہ میں بیک وقت دیکھا گیا۔آپ کو انگریزوں نے متعدد بار گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا مگر آپ حوالات سے اس طرح غائب ہو جاتے تھے کہ حوالات کے تالے لگے ہی رہ جاتے تھے۔

فقیر ہوتک: آپ کا تعلق بلوچستان کے مشہور قبیلہ سمالانی سے تھا آپ ضلع چاغی کے معروف صاحب کرامت بزرگ شیخ حسین کے خدمت گاروں میں سے تھے۔اپنے مرشد سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔اور کبھی ان سے جدا نہ ہوئے تھے۔لگاؤ کی وجہ سے مرشد کے وصال کے بعد آپ نے باقی عمر وہیں گزار دی۔

معصوم بابا: آپ کا مزار پشین شہر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔انہیں غائب باب اور شیخ بابا بھی کہا جاتا ہے۔

روایت ہے کہ معصوم بابا کی پیدائش معجزانہ طور پر ہوئی تھی۔ان کی عمر صرف پانچ دن تھی۔معجزانہ پیدائش کی بناء پر انہیں غائب بابا اور معصومیت میں رحلت فرمانے پر معصوم بابا کہا جاتا ہے۔دانت کے درد کی صورت میں لوگ معصوم بابا کے مزار پر جاتے ہیں۔اور مزار کی چوکھٹ کی دہلیز میں میخ (کیل) ٹھونکتے ہیں۔جس سے دانت کا درد جاتا رہتا ہے۔دوستی سے متعلق معاملے کے سلسلے میں میخ چوکھٹ کی دائیں کڑی میں اور دشمنی سے متعلق بائیں کڑی میں لگائی جاتی ہے۔مزار کی چوکھٹ پر بے شمار کیلیں نظر آتی ہیں اسی نسبت سے آپ کو میخ بابا بھی کہتے ہیں۔پرانے لوگوں کا کہنا ہے کہ انگریز اپنے زمانہ حکومت میں معصوم بابا کے مزار پر ضرور حاضری دیا کرتے تھے۔اب بھی کثیر تعداد میں لوگ مزار پر جا کر فاتحہ پڑھتے ہیں۔

ملا کمال اخوند: ملا کمال اخوند مہترزئی کا مزار خلگی (ضلع ژوب) میں ہے آپ ایک عالم و فاضل بزرگ تھے۔آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب میرا وصال ہوگا تو اس روز فرنگی ہندو باغ (موجودہ مسلم باغ) پر قبضہ کرے گا۔چنانچہ آپ کی وفات اکتوبر ۱۸۹۰ء میں ہوئی اور اسی روز انگریزوں نے ہندو باغ پر اپنا تصرف جمایا۔

پیر حیدر نیکہ: تحصیل پشین ضلع کوئٹہ پشین بند میں خوشدل خان سے تقریباً دو میل دور آپ کی خانقاہ ہے۔آپ قادری سلسلے کے بزرگ جید عالم اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔آپ کا فیضان آج بھی جاری ہے۔

حسین نیکہ: آپ مچن خیل فقیروں میں سے تھے۔مزار ژوب میں دریائے قندھار کے کنارے واقع ہے۔جس کے اوپر تقریباً بیس گز لمبا بارہ گز چوڑا اور تین گز اونچا جھونپڑا ہے۔اس کے نزدیک بہت سے اور مزار بھی ہیں۔اسی جگہ ایک کتا بھی دفن ہے۔جو آپ کا کتا ہے۔مقامی لوگوں کے بیان کے مطابق جب لوگ آپ سے ملنے آتے تھے تو یہ کتا بھونکتا تھا اور اس کے بھونکنے سے ان کی تعداد ظاہر ہوتی تھی۔یعنی ایک آدمی آتا تو وہ ایک بار بھونکتا اور دو آتے تو دو مرتبہ بھونکتا۔

ایک دفعہ کتا تین بار بھونکا اور اسی کے مطابق تین آدمیوں کے لئے کھانا تیار کیا گیا۔لیکن آدمی چار نکلے اس پر آپ ناراض ہوئے اور اسے مار ڈالا۔بعد میں معلوم ہوا کہ چار مسافروں میں سے تین مسلمان تھے۔اور ایک ہندو جس نے فریب دہی کے لئے اپنے آپ کو معتقد بنا لیا تھا۔چنانچہ آپ نے کتے کو دفن کر دیا۔

دیگر پاؤندوں کے علاوہ سلیمان خیل آپ کے مزار کی بڑی توقیر کرتے ہیں۔اس خاندان کے دوسرے لوگ قریباً پانچ میل کے فاصلے پر انصار میں مقیم ہیں۔اور باری باری مزار کے مجاور کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔انہیں ۱۱۶۶ ایکڑ زمین ملی ہوئی ہے۔جس کا مالیہ معاف ہے۔

مقامی آبادی میں ان کی چند کرامتیں مشہور ہیں۔مثلاً دیگ جس میں نذر کا

گوشت پکایا جاتا ہے۔ کبھی نہیں بھرتی یعنی گوشت جتنا بھی ہو اس میں پک سکتا ہے۔

سید برات بابا: آپ ایک جید عالم اور صوفی تھے آپ کا مزار قلعہ عبداللہ کے قریب پہاڑ پر واقع ہے۔ آپ نے اسلامی تعلیمات کی توسیع و ترویج کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ جو آج تک جاری ہے۔ آپ صاحب کشف و کرامت تھے۔

حضرت حریف: شین غر کوئٹہ ڈویژن میں فورٹ سنڈیمن کا بہت مشہور علاقہ ہے۔ یہ فورٹ سنڈیمن شہر کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے اسے ایک ۳۲ میل لمبی سڑک کے ذریعے سے شہر سے ملایا گیا ہے جو اونچے اونچے پہاڑوں کی چٹانوں کے سینوں کو چیرتی، دلکش ندی نالوں کو عبور کرتی اور زیتون، خنجک اور چلغوزے کے گھنے جنگلوں سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے۔

یہاں کے معروف قبائل شیرانی اور حریف آل ہیں۔ موخر الذکر بخارا سے آ کر یہاں اقامت پذیر ہوئے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ علاقہ پہلے شیرانیوں کی جاگیر تھا۔ لیکن طوائف الملوکی کے باعث حالات دگرگوں ہو رہے تھے کہ قدرت نے ایک فرشتہ خصلت انسان حریف نامی کو یہاں بھجوایا۔ وہ بخارا سے افغانستان کے راستے اپنی آل و اولاد کے ہمراہ فقط ایک خچر لیے اس جگہ وارد ہوئے یہ حضرت سید خانوادے کے فرد تھے۔ یاد الٰہی میں مگن رہنے کے سوا ان کا کوئی اور شغل نہ تھا۔ رفتہ رفتہ گرد و پیش کے لوگ ان کے زہد و تقوی سے متاثر ہوئے اور آپ کے مرید بن گئے۔ یوں ان لوگوں میں ذہنی و روحانی انقلاب برپا ہوا۔ لوٹ مار، قتل و غارت اور باہمی آویزش کی جگہ الفت و اخوت اور اتحاد و تنظیم کا دور دورہ ہوا۔

شیرانیوں کے بڑے بڑے سرداروں سے حضرت حریف کی اولاد کے رہنے سہنے کے لیے زمین کے بارے میں بات ہوئی۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ وہ اپنے خچر پر بیٹھ کر ایک دن جتنا فاصلہ طے کر لیں اتنی ہی زمین انہیں بخش دی جائے۔ آپ نے خچر جیسی سست رفتار سواری پر سوار ہو کر اپنے قبیلے کے لیے راہ استوار کی۔ آج تک وہی زمین حریف آل کی جاگیر ہے۔ جو دو ہزار کے قریب گھروں پر مبنی آبادی کے رزق کی کفیل ہے۔

حضرت مندو نیکہ: آپ پشتونوں کے مشہور قبیلہ مندوخیل کے جد اعلیٰ ہیں۔ مندوخیل قبیلہ پنی قبیلے کی ایک مشہور شاخ ہے۔ آپ کی شہرت بحیثیت ولی اللہ کے ہے۔ آپ کا مزار فورٹ سنڈیمن سے ۳۵ میل کے فاصلے پر کاڑ داؤ کے مقام پر ہے۔ گاڑ داؤ کو وزیر باغ بھی کہا جاتا ہے۔ قبر پر کمرہ اور گنبد بہت لوگ بڑی تعداد میں زیارت کے لئے آتے ہیں۔

شیخ ماندہ بابا: پشین روڈ پر کوئٹہ کے قریب شارع عام کے کنارے پر شیخ ماندہ بابا کا مزار ہے۔ قریبی ریلوے سٹیشن اسی نام سے منسوب ہے۔ عیدوں کے تہوار پر یہاں میلہ لگتا ہے۔

حضرت غرغشت نیکہ: آپ حضرت قیس عبدالرشید کے دوسرے بیٹے تھے۔ آپ کا پورا نام غرغشت عباس تھا۔ آپ ایک بلند پایہ ولی تھے۔ آپ کی اولاد میں دانی بابی اور مندو کے قبیلے آتے ہیں۔

آپ کے فرزند اکبر دانی نیکہ بھی اونچے درجے کے بزرگ تھے۔ ان کی اولاد میں کاکڑ پنی داوی ناغر قبائل آتے ہیں۔ ژوب کا پرانا نام ''دانستان'' آپ ہی کے نام پر رکھا گیا تھا۔

شیخ غلام رحیم بابا: آپ کا مزار ریلوے قبرستان کوئٹہ میں واقع ہے۔ آپ بہت بڑے عالم فاضل بزرگ تھے۔ آپ کا تعلق خاندان سے تھا۔ کوئٹہ کا محلہ شیخان آپ ہی کے نام سے موسوم ہے۔

آپ کے مزار کے نزدیک ایک قدرتی چشمہ ہے۔ جس کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے زمین پر نیزہ مارا تھا۔ جس سے یہ چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔

شامو نیکہ: آپ شامزئی کیجزئی سنزرخیل کاکڑ کے جد اعلیٰ ہیں۔ اپنے دور کے بزرگ تے۔ علاقے میں ان کی کئی کرامتیں مشہور ہیں۔ آپ نے سنزرنیلہ سید خوستی نیکہ سید کڑے نیکہ سید چرمی نیکہ اور محمد اسماعیل نیکہ کے ساتھ مل کر کفار کے مقابلے میں جہاد کیا اور شہید ہوئے شامو نیکہ اور سید خوستی نیکہ کے واقعات زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان کے مزار لواڑگی علاقہ عبداللہ زئی ضلع ژوب میں مرجع خلائق ہیں۔ مجاور موجود ہے۔ اور لنگر کا انتظام بھی ہے۔

پیر شاہ محمود: آپ اچ شریف کے شیخ تھے۔ آپ کے دو مزارات ایک جغدران پہاڑیوں میں چوتی اور دوسرا بارکھان میں دھتی کے مقام پر واقع ہے۔ (قیاس ہے کہ ان میں سے ایک مزار یادگاری ہوگا) آپ بھیڑ کے دودھ پر گزر اوقات کرتے تھے۔

کوہلو کے زرغون کھیتران اور دکی (لورالائی) کے لسونی آپ کے مزار کی بہت توقیر کرتے ہیں۔ لسونی ہر سال بھیڑوں کے ایک گلے سے ایک بھیڑ آپ کی اولاد کو پیش کرتے ہیں۔ جبکہ نندہ ناہار اپنی زمین کی پیداوار کا سولہواں حصہ دیتے ہیں۔ مزار کے متصل تقریباً تیس ایکڑ زمین بھی جس کا مالیہ معاف ہے۔

پیر پنجہ: کوئٹہ سے سبی جاتے ہوئے تیسویں میل پر ایک چٹان واقع ہے۔ جو

خنجک (شینے) کے درخت سے متصل ہے۔ اس چٹان کے ایک پتھر پر دو پاؤں کے نشان ہیں اور ایک پتھر میں سوراخ ہے جو نیزے کا بتایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی گھوڑے کے سموں کے نشان ہیں۔

ان نشانات کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ براہوئی اپنی وقتاً فوقتاً نقل مکانی کے وقت اس یادگار پر جانوروں کی قربانی دیتے ہیں۔ دوسرے مزاروں کی طرح یہاں بھی مجاور موجود ہے۔

لورالائی: لورالائی کے بارے میں سید فتح محمد شاہ عارف لکھتا ہے کہ لورالائی کے تہذیبی اثرات چھ ہزار سال قبل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لورالائی عظیم تاریخی روایات کا حامل شہر ہے۔ ضلع لورالائی جو 9830 مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے، کی آبادی 1998ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق 297560 نفوس پر مشتمل ہے۔

ضلع لورالائی کے قبائل میں کاکڑ، ترین، لونی، زخیلی، ناصر، پچی سید، غلزئی، سلمان خیل، بلوچ اور مری قبائل قابل ذکر ہیں۔ پورے ضلع میں ماسوائے بلوچ اور مری کے جو بلوچی بولتے ہیں، باقی تمام قبائل پشتو بولتے ہیں۔ لورالائی بلوچستان میں کوئٹہ کے بعد شاید واحد ضلع ہے جس میں اقلیتی برادری کی ایک وسیع متعداد آباد ہے۔ جس میں ہندو اور عیسائی قابل ذکر ہیں۔ سرائیکی اور پنجابی بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد بھی لورالائی میں آباد ہے۔

ضلع لورالائی کے جنوب میں ضلع سبی، زیارت، شمال میں ضلع ژوب اور ڈیرہ اسماعیل خان، جنوب میں ضلع کوہلو اور راجن پور کے اضلاع واقع ہیں۔ مشرق میں ڈیرہ غازی خان واقع ہے۔ ضلع کا صدر مقام لورالائی ہے۔ لورالائی صوبہ بلوچستان کو صوبہ پنجاب سے ملاتا ہے اور پورے صوبہ کی ٹریفک یہاں سے گزرتی ہے۔

ضلع لورالائی پہلے پانچ تحصیلوں پر مشتمل تھا جن میں تحصیل بوری، تحصیل دکی، تحصیل موسیٰ خیل، تحصیل بارکھان اور تحصیل سنجاوی شامل تھیں۔ اب چونکہ تحصیل موسیٰ خیل اور تحصیل بارکھان کو نئے اضلاع کا درجہ دیا گیا ہے اور تحصیل سنجاوی کو ضلع زیارت میں شامل کیا گیا ہے اسلئے اب ان تین تحصیلوں کے انتظامی امور ضلع لورالائی کی بجائے ان کے متعلق اضلاع میں نمٹائے جا رہے ہیں۔ اب بوری کے علاوہ تحصیل دکی اور میختر اسکا حصہ ہیں۔

بوری کو اب لورالائی کے نام سے شہرت ملی لیکن بوری کا ذکر یہاں کی پشتو لوک شاعری میں کئی جگہوں پر ملتا ہے۔ بوری لورالائی میں کیسے تبدیل ہوا۔ اس کیلئے یہاں دو روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ لورالائی کے شمال میں ایک ندی واقع ہے جس کا نام "لوڑالئے" ہے۔ لوڑالئے کو انگریزوں نے Loralai لکھا۔ اس کی وجہ سے بعد میں یہ لورالائی کے نام سے مشہور ہوا۔ جبکہ دوسری روایت یہ ہے کہ انگریزوں نے جس مقام پر چھاؤنی بنائی تھی اس کے جنوب مشرقی علاقے کا نام لوڑالئے ہے۔ جس میں مہول، پونگہ، سگھ اور شیخان کے گاؤں شامل ہیں۔ لہذا امکان یہی ہے کہ اس علاقے کے مغربی کنارے پر جو شہر آباد ہوا اس کا نام لورالائی رکھا گیا۔ لورالائی کو تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت حاصل ہے جس کے تہذیبی اثرات چھ ہزار سال تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان اثرات کا پتہ درگئی کدیزئی کے قریب واقع رانا غنڈی سے چلتا ہے جس کے بارے میں آثار قدیمہ کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہاں ہڑپہ دور کی طرح پانچ مرتبہ مختلف لوگ آباد ہوئے ہیں۔ ان کے آباد ہونے اور آباد ہونے کے اثرات کھدائی سے واضح ہوئے۔ علاوہ ازیں کھدائی سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ یہاں کے رہنے والے تہذیبی ترقی کے ابتدائی دور میں تھے اور وہ قبائلی حالت میں زندگی گزارتے تھے۔ یہاں کے دوسرے دور کی آبادی نے مکانات کی بنیادوں میں پتھر استعمال کئے ہیں جس سے ان کی تہذیبی ترقی کے ابتدائی دور کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں برتنوں کے جو ٹکڑے ملے ہیں ان پر مختلف ہندسوں کے علاوہ بیلوں کی تصاویر بھی بنائی گئی ہیں جن سے ان کی تہذیبی ترقی کا پتہ چلتا ہے اسی طرح "سورزنگل" (سورخ جنگل) کے مقام پر کھدائی سے جو آثار ملے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں دس مرتبہ مختلف قبائل آباد ہوئے ہیں۔ یعنی یہاں بھی آبادی کے دس ادوار مختلف وقتوں میں گزرے ہیں۔

ان دو جگہوں کے علاوہ بھی کئی مقامات پر تاریخی آثار پائے گئے ہیں جو کہ مختلف تہذیبوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان تاریخی مقامات میں درج بالا کے علاوہ ڈبرکوٹ تحصیل دکی میں ہے۔ دلپیر یا نانوغنڈی اور دہارہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تمام آثار سے لورالائی کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ ضلع لورالائی میں آثار قدیمہ کے ماہرین کے غیر متعین کردہ ادوار سے لے کر لورالائی کا ضلع ہونے تک بھی قبیلے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی بہادری اور شجاعت کے نقوش چھوڑے ہیں۔

پہاڑ

تورغر (سیاہ پہاڑ): یہ پہاڑ موسیٰ خیل سے لونی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس پہاڑ کی ایک خصوصیت اس میں انار، خوبانی اور ریتوں کے درختوں کا ہونا ہے جبکہ دوسری جانب کچھ پتھروں پر تصاویر بھی کندہ ہیں جو ابھی تشنہ تحقیق ہیں۔

سورغر: (سرخ پہاڑ) یہ ضلع لورالائی کے جنوبی سمت میں واقع ہے جو موسیٰ خیل اور اپوزئی کے درمیان پڑتا ہے۔ اب تو ضلع موسیٰ خیل سے زیادہ منسلک ہے۔

بوج غر: یہ بھی موسیٰ خیل کے حدود کو چھوتا ہوا لونی کی ندیوں تک پہنچتا ہے۔

چور غر: یہ پہاڑ ضلع قلعہ سیف اللہ اور تحصیل بوری کی حد بندی کرتا ہے اور نسبتاً سرسبز پہاڑ ہے۔

گڈ پیر غر: یہ ایک بڑا پہاڑ ہے جس میں سبزہ زیادہ ہے جہاں پہاڑی دنبے اور مارخور بھی موجود ہیں۔ یہ پہاڑ تحصیل بوری اور تحصیل دکی کے درمیان حد فاصل کا کام بھی دیتا ہے۔

قرہ قولی غر: یہ قرہ قولی کی طرح کا مستطیل نما پہاڑ ہے جو لورالائی شہر سے ۳۶ کلو میٹر پر کلی درگی اور کلی زخیل کے علاقے میں ہے۔ اس پہاڑ کے اوپر میدان نما بڑی جگہ ہے۔ مقامی لوگوں کے مطابق پہاڑی بدھ مت تہذیب آباد رہی ہے اور پہاڑ کے اندر ہال نما غار کو وہ و مذہبی رسومات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

دیگر پہاڑ: تقریباً صوبے ترین پہاڑ اس علاقے میں واقع ہیں اور یہ پہاڑ ملک بھر کے پہاڑوں کے مقابلے میں اسلئے بھی منفرد ہیں کہ صنوبر یا جونیپر جنہیں مقامی لوگ ورشتی کہتے ہیں، یہاں موجود ہیں۔ اس ضلع کے شمال میں کوہ زرگٹ اور سپین سفیرہ واقع ہیں۔ جنوب کی جانب سے اس ضلع کو کوہ خلیف نے گھیرا ہوا ہے۔ جبکہ مغرب کی جانب زرغون اپنے وجود کا اثبات کرتا نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ صنوبر کے درخت ان پہاڑوں کی خوبصورتی اور زیارت کی دلکش کا اصل محور ہیں۔ ان درختوں کو دنیا کی قدیم ترین درختوں میں شمار کیا جاتا ہے اور ان درختوں کی عمریں بڑی طویل بتائی جاتی ہیں جبکہ ان پہاڑوں میں دلچسپ اور شفاف چشمے بھی موجود ہیں۔ دریاؤں کے حوالے سے یہاں کوئی قابل ذکر دریا نہیں ہے لیکن مختلف ندی نالے اس شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہوئے سیاحوں کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔

ندیاں

لوڑی: یہ ضلع لورالائی کی سب سے بڑی ندی یا دریا ہے جو سپیرہ راغہ سے ہوتا ہوا بوری، دکی اور مری کے علاقوں میں جا نکلتا ہے جو مختلف مقامات پر مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

وڑنی: یہ زیارت کی طرف سے ہوتی ہوئی تحصیل دکی میں تھل کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

زراعت: لورالائی کے مضافاتی علاقے کاریزوں اور چشموں کی وجہ سے زرخیز ہیں جبکہ اکثر لوگ بارانی پانیوں اور مالداری پر گذارہ کرتے ہیں۔ دکی میں گندم کی کاشت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کے تربوز اور خربوزہ خاصے پسندیدہ ہیں۔ مجموعی طور پر یہاں سیب، آڑو، خوبانی، چیری اور بالخصوص بادام کی فصلیں ہوتی ہیں جبکہ ضرورت کی سبزیاں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔

مقامی صنعتیں: مقامی صنعتوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی ہے لیکن لوگ اپنے روزگار کیلئے قالین بافی (مقامی انداز میں) کرتے ہیں اونی کمبل اور بچھونے بنائے جاتے ہیں جبکہ چٹائی وغیرہ کا کام بھی ہوتا ہے۔

معدنیات: معدنیات میں سنگِ مرمر اور دیگر عمارتی پتھر پائے جاتے ہیں۔

کوئلہ: اس شہر کی اہم ترین خصوصیت اسکا کوئلہ ہے جو ۱۹۶۱ء میں دریافت ہوا، جو آج اس شہر کے لوگوں کا اہم ترین اور معتبر ترین ذریعہ معاش ہے، اس سے قبل اس علاقے کے لوگوں کا معاش صرف کھیتی باڑی پر منحصر تھا، اس شہر کے کوئلہ سے تقریباً ملک بھر میں استفادہ کیا جاتا ہے۔

پرندے: لورالائی کے پہاڑی اور میدانی علاقوں میں جنگلی پرندوں کا بہتات ہے۔

ان کے علاوہ پالتو پرندے جیسے، تیتر سیسی، بٹیر اور چکور وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں جنکے پکڑنے کے لیے باقاعدہ شکاری گروہ نکلتے ہیں اور چکور تو بہت مہنگے داموں فروخت ہوتے ہیں۔ کیونکہ چکور بازوں کے درمیان چکور لڑانے کے مقابلے بہت بھاری شرطوں پر رکھے جاتے ہیں جبکہ شکار کے حوالے سے مچھلی کے شکار کا رجحان بھی زیادہ ہے اور مچھلی کے شکار کے باقاعدہ مستقل گروہ تشکیل پاتے ہیں۔ جو شہر کے مضافاتی ندیوں سے مچھلی کا شکار کرتے ہیں لیکن صرف ذاتی استعمال اور تفریح طبع کے لیے نہ کہ فروخت اور کاروبار کے لیے۔

عقائد: لورالائی کے پشتون سنی العقیدہ ہیں جو حنفی مسلک کے مطابق بریلوی رجحان کو اپنائے ہوئے ہیں جبکہ وہاں پر موجود ہزارہ قبیلہ شیعہ مسلک کے پیرو ہیں جن کی ایک امامبارگاہ بھی ہے جہاں ہر سال محرم الحرام میں عزاداری برپا ہوتی ہے۔ جس میں پنجاب، سرحد اور سندھ کے مختلف حوالوں سے موجود اہل تشیع بھی شریک ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی بان افغانی بھی مختصر سی تعداد میں موجود ہیں جو شیعہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ انہیں مقامی طور پر قندھاری کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ لورالائی

میں قدیم الایام سے ہندو برادری بھی وجود رکھتی ہے جن کی اکثریت پرچون فروش ہے اور مندر ہی کے قرب وجوار میں تنگ گلی کوچوں میں سکونت رکھتی ہیں۔

ہزارہ قبیلہ جو قیام پاکستان سے پہلے سے آباد ہے ہزارہ محلہ اور نیو ہزارہ محلہ میں آباد ہیں انکا اکثریتی پیشہ موچی اور چمڑے کا کاروبار ہے۔ پنجاب کے لوگ اکثر ٹیچر، کلرک ہوتے ہیں یا پھر مکینک اور نائی کا کام کرتے ہیں۔

علم وادب

علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے حوالے سے لورالائی کو ہمیشہ ایک اہم حیثیت حاصل رہی ہے اس شہر میں ہمیشہ ایک علمی وثقافتی فضا قائم رہی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل بھی یہاں پر سٹیج پروگرام اور مشاعرے ہوا کرتے تھے جبکہ 1903 میں یہاں سے باقاعدہ ادبی مجلہ "قندیل خیال" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ جبکہ ڈرامیٹک سوسائٹیوں اور ادبی تنظیموں کا عمل تو ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا ادبی تنظیموں میں ادبی تنظیم پشتو ادبی ملگری نے ایک طویل مدت تک اہم کردار ادا کیا اور باقاعدہ پشتو سیمینار اور اردو پشتو مشاعرے منعقد کرتی رہی۔

ثقافت: لورالائی میں ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز پبلک لائبریری لورالائی بھی ہے جس کا قیام معروف افسانہ نگار مسعود مفتی کی دلچسپی سے ہوا جس کے اولین لائبریرین معروف ادیب اور شاعر پروفیسر ربنواز مایل تھے۔ اس لائبریری کے ساتھ ہی ایک مرکز عبدالرحیم خان کلب کے نام سے بھی موجود ہے جس میں شام کے وقت شہر کے لکھے پڑے افراد آکر تفریح طبع کے لیے مختلف سرگرمیوں اور کھیلوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس ادارے کا باقاعدہ انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں علمی وثقافتی تقاریب بھی ہوا کرتی ہیں۔

تحصیل دکی: لورالائی اس وقت دو تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ ایک بوری جس کا ذکر ہو چکا اور دوسری تحصیل دکی ہے۔ اس علاقے کو بھی تاریخی قدامت حاصل ہے کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کا نام پہلی مرتبہ بابر کی تزک میں آیا تھا۔ جبکہ عام روایت کے مطابق او، ٹی، ڈیوک کے اس کی نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس نے اس علاقے کے مورخ کے طور پر تحقیقی کتاب لکھی لیکن ان کی کتاب میں دکی لفظ پہلے سے موجود ہے۔ دکی میں آثار قدیمہ کی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں بالخصوص "مغل قلعہ"۔ اس شہر میں ترین کے علاوہ لونی، ناصر اور بلوچ قبیلہ مری آباد ہیں۔

یہ تحصیل لورالائی کے جنوب میں ۲۵ کلومیٹر جبکہ سڑک کے راستے ۶۵ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

موسیٰ خیل: یہ ضلع پہلے ضلع لورالائی کا ایک تحصیل تھا، لیکن اب اس کو ضلع کی حیثیت دی گئی ہے جو اکثریتی پشتون آبادی پر مشتمل ضلع ہے، لیکن اس کے علاوہ دیگر قبائل جیسے جعفر اور کھیتران اور غرشین سید بھی یہاں سے متعلق ہیں۔ اس علاقے میں ابھی قدیم پشتو رسوم نسبتاً زیادہ اصلی صورت میں رائج ہیں۔ شاید اس علاقے کو مرکزیت حاصل نہ ہونے کی صورت میں تعلیم اور جدیدیت کے رجحانات کو کم راہ ملی ہے اگرچہ اب یہاں دیگر سکول کی سطح کے تعلیمی اداروں کے علاوہ ایک کالج بھی موجود ہے۔ اس ضلع کی ایک تحصیل کنگری کے نام سے معروف ہیں جبکہ دیگر مراکز میں خان محمد کوٹ اور نوی سر قابل ذکر ہیں۔ یہاں کے پشتون نسبتاً سخت گیر تند مزاج ہیں۔

موسیٰ خیل کی اکثر آبادی خانہ گزیں ہے لیکن کچھ حصوں میں قبائل کے خانہ بدوشانہ اطوار، آب وہوائی تغیرات اور وقتاً فوقتاً قلت وقحط سالی کے دور دورہ کی وجہ سے ہجرت کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور لوگ آسائشی علاقوں کا رخ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان تحصیلوں میں بہت سے کاشتکار اپریل سے ستمبر تک پہلے خیموں یا چٹائی کے چھپروں (تاوری) میں رہتے تھے لیکن اب مستقل طور پر مکانات تعمیر کئے جا چکے ہیں۔ جن میں اکثر مٹی گارے اور پتھر نصب کر کے گھر بنائے جاتے ہیں جبکہ اینٹوں اور سیمنٹ کا استعمال بھی اب نظر آتا ہے۔

بارکھان: گیزیٹر کہتا ہے کہ یہ ایک یقینی امر ہے کہ ضلع کے موجودہ باشندے نسبتاً بعد میں آئے لیکن ان کے پیشرو کون تھے؟ یہ جاننے کے لیے کوئی شہادت یا دستاویز میسر نہیں۔ کھیتران علاقے کی روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اولین باشندے غیر مسلم تھے۔ ان کے مطابق حضرت علی مٹ میں چشمہ کیوان کے نزدیک کفار سے لڑے جہاں سیاہی مائل پتھروں کے ادھر ادھر بکھرے ہوئے ڈھیر آج بھی ان کفار کے مدافن کے مظہر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قتل عام اتنا ہوا کہ حضرت علی کی شہرہ آفاق گھوڑی کو انسانی خون کی ندی کو تیر کر پار کرنا پڑا۔ اسی علاقے کی دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ایک جاٹ ہندو بستی تھی جس کے بعد لٹھ افغان آئے۔ ضلع کے مرکزی اور مغربی حصوں اور بارکھان میں مغل قلعوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔

رسم ورواج

شادی کی رسومات: اس علاقے میں پشتو قبائل کی رسومات کا یکجا ذکر کیا گیا ہے لیکن کھیتران چونکہ مختلف رسوم رکھتے ہیں اس لئے اس پر جداگانہ نگاہ ڈالی جائے

گی۔ کھیتران کی رسوم قدرے مختلف ہیں۔ کھیتران دولہا شادی کے روز عموماً سرخ شلوار پہنتا ہے اور پگ طائفہ میں تو ابھی حال تک دولہا کو ٹکٹ (تاج) پہننا اور جنڈی کی ایک شاخ کو کاٹنا پڑتا تھا جو ہندو رسم و رواج کے آثار و شواہد ہیں۔ جب ہونے والے دولہا کے ماں باپ کو لڑکی اپنے بیٹے کیلئے موزوں معلوم ہو اور وہ اسے پسند کر لیں تو ایک کمین جیسے جولاہا یا موچی گویا لڑکی کے والدین یا سرپرست کے پاس مشورے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ وہ اگر قائل ہوں تو لڑکے کا باپ چند رشتہ داروں اور ایک خاتون خانہ کے ہمراہ لڑکی کے ماں باپ سے ملتا ہے اور شرائط طے کرتا ہے۔ اہم قابل غور شرائط میں ولور کی رقم ہوتی ہے اور یہ کہ آیا شادی سریور ہوگی یعنی بیوگی کی صورت میں لڑکی اپنے میکے لوٹ جائے گی۔ حاضرین میں مٹھائی تقسیم ہوتی ہے اور ایک بندوق چلائی جاتی ہے۔ لڑکے کا باپ دلہن کو ایک ٹوپی یا لبادہ پیش کرتا ہے اور ایک روپیہ بھی جسے وہ ماتھے کا جھومر بنا لیتی ہے۔ امیر لوگ ٹوپی کے علاوہ ایک روپے کی بجائے سونے کی ایک مہر دیتے ہیں۔ لڑکی کا باپ دولہا کی طرف سے آئی ہوئی خاتون کو ایک ٹوپی دیتا ہے۔ مقرر کردہ ولور کا ایک حصہ بھی ادا کر دیا جاتا ہے۔ یہ رسومات منگنی کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اس کے ہفتہ عشرہ بعد دلہن کے والدین ایک بدنی (ریشم میں کشیدہ کردہ بھیڑ کی کھال) اور سونے یا چاندی کی انگوٹھی دولہا کے لئے بھیجتے ہیں۔

نکاح دلہن کے گھر پر ہوتا ہے اور جب وہ سسرال لائی جاتی ہے تو ایک بھیڑ ذبح کی جاتی ہے۔ بھیڑ کا دل پکایا جاتا ہے اور ایک ملا سے دم درود کرا کے اسے دولہا دلہن میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ باقی گوشت پکا کر سات عورتوں کو بلایا جاتا ہے جو صرف ایک دفعہ بیاہی گئی ہوں اور جن کے شوہر زندہ و سلامت ہوں۔ وہ کھانے میں شریک ہوتی ہیں اور دولہا دلہن ایک ہی پلیٹ میں کھاتے ہیں۔ دولہا دولہن کو رسم کے مطابق ایک دوسرے کی دید و ملاقات کی اجازت نہیں تاوقتیکہ شادی نہ ہو جائے۔

اس رسم کے پس منظر میں جو قبائلی جذبہ موجزن ہے وہ قبرستان کے متعلق کھیتران روایت سے آشکار ہوتا ہے۔ "کفیان والا قبرستان" جو وٹاکری میں ہے، کہا جاتا ہے کہ ماضی میں کچھ نوجوان لڑکیاں زمین پر کھیل رہی تھی کہ ان کے منگیتر وہاں آنکلے چھپنے کی جگہ نہ پا کر لڑکیوں نے خدا سے دعا کی کہ وہ انہیں نظر سے بچالے۔ زمین شق ہوئی اور وہ سب اس میں زندہ دفن ہوگئیں۔ لوگوں کا وہم ہے وہ اب بھی جمعرات کی رات کو ناچنے گانے کے لیے قبروں سے نکلتی ہیں۔

ولور: خوشحال غرشین سادات کے سوا جو صرف اپنے حلقے میں شادیاں کرتے ہیں اور ولور کا مطالبہ نہیں کرتے، ولور کی رقم اور اس کی ادائیگی تمام ازدواجی انتظامات میں اہم ترین نکتہ ہے۔ انگریزی دور سے پہلے روپیہ کمیاب تھا اور ولور کم تھا۔ یعنی ایک کنواری کے لیے ۲۵ تا ۱۰۰ روپے ہوتا تھا۔ اور زیوارات کے لیے مطلوب تھوڑی سی رقم کے سوا یہ عموماً بھیڑوں، بکریوں، اونٹوں، مویشیوں، اناج اور کبھی کبھار زمین اور پانی کی صورت میں ادا کر دیا جاتا تھا۔ لیکن رقم کا انحصار دلہن کے خاندان کی حیثیت، اس کی ذاتی صفات اور سائل کی استطاعت، عمر اور سماجی مقام پر ہوتا تھا۔

مزرانی کھیتران میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن میں بڑی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ایک آدمی اپنے سے بالا طبقے میں شادی کرنا چاہے یا ایک معمر آدمی نوجوان لڑکی سے شادی رچائے تو اسے غیر معمولی قیمت دینا پڑتی ہے۔ بیوہ یا مطلقہ کا ولور دوشیزہ کے مقابلے میں عموماً نصف ہوتا ہے لیکن مستثنیات میں، جب بیوہ جوان و دلکش ہو تو یہ زیادہ ہوتا ہے۔ حق مہر (جسے بعض قبائل کا دین کہتے ہیں) نظری طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور قبائل میں اس کی رقم مختلف ہے۔ اگر لڑکی نکاح سے پہلے فوت ہو جائے تو ادا کردہ حصہ ولور واپس نہیں کیا جاتا۔

ادلا بدلا: ادلے بدلے کا طریقہ (وٹا یا وٹا ندرا) بھی قابل ذکر ہے جو تمام قبائل میں رائج ہے۔ اس کے تحت اگر تبادلے کی لڑکیوں میں عمروں کا فرق ہو یعنی ایک قابل شادی ہو اور دوسری نہ ہو تو چھوٹی کے والدین نقد اضافی رقم ادا کرتے ہیں یا وہ نابالغ لڑکیاں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح اگر ایک بیوہ کا تبادلہ دوشیزہ سے کیا جائے تو اول الذکر کے سرپرست بطور معاوضہ اضافی رقم ادا کرتے ہیں۔

کھیتران میں ایک اور طریقہ بھی رائج ہے جسے مقامی طور پر سریور کہتے ہیں۔ اس کے تحت عورت بیوہ ہونے کی صورت میں میکے چلی جاتی ہے اور اپنے ساتھ وہ تحائف بھی لے جاتی ہے جو اسے شادی پر والدین نے دیئے تھے۔ اس قبیلہ میں ادلے بدلے کی صورت میں نابالغ لڑکی کے سرپرست عہد کرتے ہیں کہ اس کے بعد بڑی لڑکی سے پیدا ہونے والی بیٹی بھی دے دیں گے۔ اسے ارجئ دوستی کہتے ہیں۔

شادی کے اخراجات و تحائف: ولور کے علاوہ شادی کے اخراجات کا بیشتر حصہ بھی دولہا والوں پر عائد ہوتا ہے جو طرفین کی حیثیت کے مطابق ہو سکتا ہے۔ دلہن کے والدین عموماً اسے پوشاک، سونے، چاندی کے چند زیورات، بستر اور گھریلو ساز و سامان پیش کرتے ہیں۔ دولہا کو بھی ایک جوڑا دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کی قیمت ولور سے منہا کر دی جائے تو پھر والدین تحائف نہیں دیتے۔ امیر خاندان دلہن کو ایک سے زیادہ جوڑے، بہتر زیورات و سامان اور کبھی کبھار چند جانور بھی دیتے ہیں۔ یہ رواج مزرانی کھیتران میں بالخصوص عام ہے۔

طلاق: اس حوالے سے تقریباً تمام مسائل میں طلاق کی عام وجوہات عورت کی بدصورتی یا بدمزاجی، بدکرداری یا مشکوک کردار یا گاہے گاہے بیماری ہیں۔ کاکڑوں میں اگر کوئی عورت کام سے انکار کرے یا اپنے گونا گوں فرائض ادا کرنے کی اہل نہ ہو تو اسے بھی طلاق دی جاسکتی ہے۔ طلاق کا طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں عورت کے پیچھے تین پتھر یا ڈھیلے پھینک دیئے جائیں۔ مطلقہ ایک بیوہ کا درجہ رکھتی ہے اور اپنے قبیلہ میں دوبارہ شادی کرسکتی ہے۔ لیکن اگر بدکرداری طلاق کا موجب ہو تو بعض قبائل میں وہ اپنی پسند کے شخص سے شادی کرسکتی ہے۔ کچھ قبائل میں اگر یہ ثابت ہوجائے کہ شوہر مردانہ اوصاف کا حامل نہیں تو عورت کو طلاق کا حق حاصل ہے۔ اس کے لیے بیوی کے والدین قبائلی اکابرین کے ذریعے شوہر پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ بہت سے قبائل میں اگر عورت کو اس کے اپنے قصور پر طلاق دی جائے تو شوہر، مطلقہ کے دوسرے شوہر سے معاوضہ (خلع) طلب کرتا ہے جو پہلی شادی پر ادا کردہ ولور کے نصف سے زیادہ نہیں ہوتا۔

زنا کاری کی سزائیں: انگریزی دور سے پہلے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی بے وفا بیوی کی سزا موت تھی۔ لہرزئی موسیٰ خیل عورت کی ناک کاٹ دیتے تھے اور اس کے آشنا کی پیشانی اور کلائیوں کو داغ دیتے تھے۔ دومڑ خپیل اور وینچی زنا کار کی ناک اور کان کاٹ دیتے تھے۔ اور بیل خیل موسیٰ خیل اور اسوٹ عورت کی ناک اور مرد کا پاؤں کاٹتے تھے۔ نظری طور پر سزائے موت اب بھی برقرار ہے لیکن عملی طور پر مجروح شوہر لڑکیوں، روپیہ، مویشی زمین وغیرہ کا معاوضہ لے کر اپنا ضمیر مطمئن کرنے پر تیار ہوجاتا ہے۔ معاوضے کی رقم قبائل میں مختلف ہے۔ اگر زانی اور زانیہ دونوں مارے جائیں تو کوئی معاوضہ واجب نہیں۔ اگر دونوں بچ نکلتے ہیں تو کھیتران اور غرشین سادات کے سوا عورت اپنے آشنا سے شادی کرسکتی ہے بشرطیکہ مجروح شوہر کو معاوضہ ادا کردیا جائے۔ لیکن اب تقریباً ایسے حالات میں قتل کردیئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ عدالت کے فیصلے کے باوجود لڑکی کا بھائی یا کوئی اور قریبی رشتہ دار اس طرح کے دوہرے قتل کا مرتکب ہوجاتا ہے۔

عورت کا درجہ اور حق جائیداد: گزیٹر کے مطابق مزارانی کھیتران، شادوزئیوں، لونیوں، بخاری سادات اور ترینوں کے خوشحال گھرانوں کے سوا عورت کی حیثیت بیحد پست ہے۔ جونہی لڑکی کام کرنے کے لائق ہوتی ہے تو اسکے والدین روزمرہ کے گھریلو کاموں کے علاوہ اسے مویشی چرانے بھیجتے ہیں۔ ولور کے طریقہ رائج ہونے کی وجہ سے اسے شادی کی عمر میں پہنچتے ہی عملی طور پر بڑھ کر بولی دینے والے کے حوالے کردیا جاتا ہے اس کا والد حجروں وغیرہ میں اس کے حسن و جمال یا سلیقہ شعاری کے گن گاتا ہے اور خواہشمند حضرات کو پیشکش کی دعوت دیتا ہے۔ امیر اور معزز افغان بھی اپنے اس سامان تجارت کی تعریف و توصیف سے بالا نہیں بلکہ دلہن کا خاندان جتنا امیر اور بااثر ہو اس کی تعریف اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

بیوی نہ صرف پانی لاتی ہے، کھانا پکاتی ہے اور دیگر روزمرہ فرائض جیسے اناج پیسنا، ایندھن لانا، سینا پرونا، کپڑے دھونا اور اون کاتنا وغیرہ انجام دیتی ہے بلکہ وہ ریوڑ چرانے، شوہر کا گھوڑا سنبھالنے اور کاشت کاری میں ہاتھ بٹانے کی ذمہ داریاں بھی پوری کرتی ہے۔ بعد میں مذکورہ چند مستثنیات کے سوا اسے جائیداد پر بلکہ تحائف شادی پر بھی کوئی حق نہیں اور طلاق ہونے کی صورت میں تو وہ صرف اپنے جسم کے کپڑے ہی اپنے ساتھ لے جاسکتی ہے۔ بیوہ کی حیثیت سے بھی اسے اپنے مرحوم شوہر کی زمین سے صرف گزارہ الاؤنس کا حق ہے۔

میراث: اکثر قبائل میں بشمول پیچی، غرشین اور دیگر سادات مستورات کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملتا لیکن پسین اور تورترین، استرانا اور زرکون باشندگان دکی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ شریعت پر عمل کرتے ہیں اور عورتوں کو شریعت کے مطابق حصہ دیتے ہیں۔ وہ یہ حصہ بیچ سکتی ہیں اور شادی پر اپنے ساتھ لے جاسکتی ہیں لیکن زرکون عورت کو منتقلی کا حق نہیں اور اس کی شادی پر جائیداد اس کے والدین کو واپس مل جاتی ہے۔

سنزرخیلوں میں ایک بیوہ دوسری شادی تک اپنے مرحوم شوہر کی منقولہ جائیداد کے برابر حصہ پر حق رکھتی ہے۔ جعفروں میں ایک بیوہ کو دوسری شادی پر اپنے والدین سے ملنے والے تحائف ساتھ لے جانے کا حق ہے۔ کھیتران رسمی وصیت ناموں کو مانتی ہے جن کے تحت عورتوں کو غیر منقولہ جائیداد کا حصہ دے دیا جاتا ہے۔ اور ایسے معاملات میں عورتوں کو وصیت شدہ جائیداد پر مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔

مردوں میں وراثت کا فیصلہ قبائلی رسم کے مطابق ہوتا ہے لیکن یہ رسم شریعت کے عام اصولوں پر ہی مبنی ہے۔

کھیترانی: کھیترانی کو برازئی اور جعفر کی بھی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گریئرسن نے اسے لہذا کی ایک بولی قرار دیا ہے اور اسے بارکھان کے کھیتران اور سکونت پذیر ہندو اور موسیٰ خیل کے غرشین اور جعفر بولتے ہیں۔ یہ ضلع ڈیرہ غازی خان میں بولی جانے والی جٹکی سے بہت ملتی جلتی ہے لیکن اس کی اصطلاحات بھی ہیں۔

ژوب: پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ اپنی کتاب "پشتو نیات" میں لکھتے ہیں کہ:

ژوب ایک شہر، ایک ضلع، ایک دریا اور ایک ڈویژن کا نام ہے۔ اس شہر

کا نام فورٹ سنڈیمن تھا۔ جو 1972ء میں بدل کر ژوب کر دیا گیا۔ کوئٹہ کے بعد پھیلاؤ اور آبادی کے لحاظ سے ژوب دوسرا بڑا شہر ہے۔ 1878ء میں جب امیر کابل شیر علی خان کی شکست کے بعد اس کے لڑکے، امیر یعقوب خان کو شکست ہوئی اور 25 مئی 1879ء کو معاہدہ گنڈمک طے پایا تو اس کی رو سے پشین، سبی، دکی اور بولان وشوادرو کے علاقے انگریزوں کو مل گئے۔ 1888ء سر رابرٹ سنڈیمن کے حفاظتی دستے نے ژوب کے علاقے پر قبضہ کیا۔ جو اس سے پہلے آزاد قبائلی علاقہ تھا۔ اور برائے نام افغانستان کے ماتحت تھا۔ جہاں لوئر (Lower) ژوب یا قلعہ سیف اللہ کے علاقے کے سردار، سردار دوست محمد خان جوگیزئی جو سردار ہنگل خان کے والد تھے۔ سردار شاہ جہاں جوگیزئی جو کہ موجودہ سردار محمد عثمان جوگیزئی کے پردادا تھے۔ اسی طرح عبداللہ زئی (سنزرخیل) شاخ کے عمر خان بھی بڑے سردار تھے۔

بقول انگریز مورخ 1887ء میں دوست محمد خان نے مینا Mena مقام کے کاکڑوں اور اپوزئی گاؤں کے مندوخیل قبائل پر ڈاکہ زنی کی غرض سے حملہ کیا۔ انہوں نے عبداللہ زئی کاکڑوں کے سردار عمر خان سے مدد طلب کی۔ جس نے پنجیزی شاخ کے کاکڑوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ دوست محمد کو جو کہ قلعہ سیف اللہ کا رہنے والا تھا، اپنے علاقے سے نکال باہر کرے۔ بقول انگریز مورخ ژوب کے سردار سڑک اور ریلوے تعمیر کرنے والے مزدوروں پر حملے کرتے تھے مگر اس میں ژوب کے مجاہدین حق بجانب تھے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک غیر ملکی استعماری اور غیر مسلم قوت ان کے علاقے پر قبضہ کرے۔

موجودہ ژوب جو کوئٹہ سے بجانب شمال مشرق 206 میل کے فاصلے پر واقع ہے، ایک بڑا شہر ہے جو ژوب ضلع کا صدر مقام ہے۔ جنوب کی طرف کے پتھریلے پہاڑ نزدیک کھڑے ہیں جیسے، "تورغر" اور بابر پہاڑ۔ باقی تین اطراف میں چھ سے آٹھ میل کے فاصلے پر پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ دریائے ژوب مغرب کی طرف بارہ میل کے فاصلے پر بہتا ہوا گومل سے جا ملتا ہے۔ شرقاً غرباً شہر تین میل اور شمالاً جنوباً دو میل کے فاصلے تک پھیلا ہوا ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ دو بلند پہاڑیاں ہیں جو اسے دو حصوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ جنوب کی طرف شہر کے بازار اور مکانات ہیں اور شمال کی طرف چھاؤنی ہے۔ انہی پہاڑیوں کی وجہ سے ژوب بلوچستان کے تمام شہروں سے ممتاز ہے۔ دوسری پہاڑی جو اس سے بھی اونچی ہے کوئی ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر شمال کی طرف واقع ہے۔ مشرق کی طرف ایک نسبتاً کم اونچی پہاڑی ہے جو دراصل وائرو کس والی لمبی پہاڑی کا ہی حصہ ہے۔ مغرب کی طرف جہاں لمبی پہاڑی کے دامن میں سڑک گزرتی ہے ایک خوبصورت جرگہ ہال ہے جہاں وکٹورین زمانے کا فرنیچر اور ایک آرکسٹرا پڑا ہوا ہے۔ یہاں ایک بڑی اچھی لائبریری تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اس میں اُردو کی کتب بھی شامل کی گئیں۔ بعد میں یہ لائبریری اٹھا کر ژوب ملیشیاء میں رکھ دی گئی۔ جرگہ ہال ژوب کے سیاسی، ادبی اور سماجی اجتماع کا مرکز ہے۔

پہاڑیوں کے مغرب میں واقع چھاؤنی بہت خوبصورت ہے۔ ایک فٹبال گراؤنڈ ہے۔ رسل (Russel) روڈ جو شرقاً غرباً واقع ہے۔ شہر کے چار بازار ہیں۔ دو بڑے دو چھوٹے، بڑا بازار قندھاری بازار اور دوسرا مارکیٹ روڈ کہلاتا ہے۔ چھوٹے بازار تھانہ روڈ اور تحصیل روڈ ہیں بازار تنگ ہیں۔ برآمدے نہیں ہیں۔ دو منزلہ عمارتیں کم ہیں۔ ڈگری کالج، گرلز کالج اور ہائی سکول، مردانہ ہائی سکول زنانہ بھی موجود ہیں شہر شاگرد اگرد اونچے پختہ مورچے پہاڑیوں پر بنے ہوئے ہیں۔ قلعہ سیف اللہ میں بھی ایسا ہی ایک مورچہ مشرق کی طرف پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ یہ انگریزی دور کی یادگار ہیں۔ دو باغ یا پارک بھی ہیں۔ ایک "شنہ باغ" اور دوسرا "کمپنی باغ" ہوائی اڈہ بھی موجود ہے۔

آب و ہوا: گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں خشک سردی ہوتی ہے۔ بچھو اور سانپ بہت پائے جاتے ہیں۔ بارش گرمیوں میں بھی اور سردیوں میں بھی ہوتی ہے۔ بادام اور زردآلو یہاں کے پھل ہیں۔ سیب نہیں پایا جاتا۔ کھجور کے درخت بھی شہر میں نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی درجہ حرارت 140 یا ڈیڑھ سو ڈگری فارن ہائیٹ تک بھی گرمیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ شہر سے مشرق کی طرف سلیازہ اور بارہ میل مغرب کی طرف دیالہ اکرم تفریحی مقامات ہیں۔ 18 میل کے فاصلے پر شین غزلیت سرسبز اور اونچا پہاڑ (8000 فٹ) اور تفریحی مقام ہے۔ مشہور زمانہ کوہ سلیمان 11000 فٹ بھی تقریباً 35 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں سے ایک سڑک لورالائی کو جاتی ہے جو 115 میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک سڑک ڈیرہ اسماعیل خان کو جاتی ہے جو 145 میل کے فاصلے پر ہے۔ اب یہ سڑک کوہ سلیمان کو کاٹ کر پختہ کی جا رہی ہے جو دہنہ سر کہلاتی ہے۔ ایک سڑک براستہ سمبازہ وانا وزیرستان اور پھر بنوں کو جاتی ہے۔

شہر میں پشتون اور غیر پشتون دونوں رہتے ہیں۔ غیر پشتونوں میں ڈیرہ اسماعیل خان سے آ کر بسے ہوئے لوگ بہت ہیں۔ کچھ گھرانے ہزارہ ہیں۔ جن کا امام باڑہ بھی ہے۔ کچھ پنجابی بھی ہیں۔ پشتونوں میں مندوخیل، شیرانی بابڑ وغیرہ رہتے ہیں اور ایک بڑی آبادی مشرق کی طرف ناصر اور خروٹی قبائل کی ہے جو اصل میں غلزئی ہیں اور بعد میں آ کر ایوب خان کے زمانے میں بس گئے ہیں۔ شہر کے تین طرف مندوخیل قبائل آباد ہیں جو دراصل پنی PANNI ہیں جو کاکڑ کا بھائی تھا۔ ایک

طرف کو بابڑ کا چھوٹا سا قبیلہ آباد ہے۔ جو شیرانی کے شامل حال ہے۔ شیرانی بڑا قبیلہ ہے جو سڑ بنی پشتون ہیں اور آدھے ڈیرہ اسماعیل خان میں اور آدھے ژوب اور کوہ سلیمان میں رہتے ہیں جبکہ کاکڑ مندوخیل غرشتنی پشتون ہیں۔ لوون ایسوٹ وغیرہ بھی پنی پشتون ہیں اور ژوب میں آباد ہیں۔ شہر سے جنوب کی طرف کاکڑ قبیلہ آباد ہے۔ ژوب میں کاکڑ قبیلہ کی سنزرخیل شاخ کی عبداللہ زئی، شابزئی، علی خانزئی، جلال زئی وغیرہ آباد ہیں۔ جبکہ مندوخیل اکثریت میں ہے۔

ژوب زرخیز علاقہ نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بند باندھ کر سیلابی پانی اکٹھا کیا جاتا ہے۔ مندوخیل زیادہ تر کاروباری اور زمینوں کے مالک ہیں۔ اکثر ٹھیکیداری کا کام کرتے ہیں۔ ژوب کے باشندے مالی لحاظ سے مختلف حصوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ خشکابہ زمینوں کے مالک ہیں۔ جنگلاتی لکڑی اور لیویز کی ملازمت پر گزارہ کرنے والے۔ کوئی خاص صنعت یا کارخانہ نہیں ہے۔ ژوب سے پچاس میل دور شغالو ایک مقام ہے جہاں بہت موٹے اور میٹھے انگور ہوتے ہیں ایک اور مقام خیارہ کے انگور بھی مشہور ہیں۔

ژوب میں آج بھی ہزار سال قدیم تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مردوں اور عورتوں کا لباس وہی قدیم ہے۔ یہی حال زیورات کا ہے۔ شیرانی عموماً ملیشیا کے خاکی کپڑے پہنتے ہیں اور ننگے سر پر کالی پگڑی باندھتے ہیں۔ لورالائی کی طرح یہاں کے افراد بھی دراز قد اور لاغر اندام ہیں۔ عام نوجوان سواتی یا چترالی ٹوپی پہنتے ہیں۔ بڑی عمر کے لوگ پگڑی باندھتے ہیں۔ ان کی پشتو بھی قدیم اور اصلی ہے جبکہ لہجہ کچھ کرخت سا ہے۔

کوہ سلیمان: کوہ سلیمان بلوچستان کا وہ مشہور و معروف پہاڑ ہے جو صوبے کے شمال مشرقی ژوب کو صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب سے جدا کرتا ہے۔ نظر بظاہر یہ صرف ایک پہاڑ ہے جس کی بلند ترین چوٹی 11300 فٹ یعنی 3374 میٹر بلند ہے مگر در حقیقت یہ ایک تاریخ اور تاریخی روایات کا امین ہے۔ یہ پشتونوں کے مورث اعلیٰ اور جد امجد حضرت قیس عبدالرشید رحمہ اللہ علیہ کا مسکن و مدفن ہے جو عام سینہ بہ سینہ روایات کے مطابق ایک صحابی اور بقول بعض تابعی تھے۔ اس ہموار چوٹی کی بلندی 11070 فٹ ہے۔ اپنے جد امجد کی زیارت کو آنے والے پشتون چوٹی سے پندرہ بیس فٹ نیچے کی طرف واقع زیارتگاہ تک صرف دو تین پگڑیوں کو باندھ کر یا کسی رسی کے ذریعے رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور فاتحہ خوانی سے فارغ ہونے کے بعد زائر کو اپنی پگڑی یا رسیوں کے ذریعے اوپر کی طرف کھینچ لیا جاتا ہے کیونکہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اسی پہاڑ میں پشتونوں کی تاریخ بنی۔ یہیں سے وہ تاریخ کے مختلف ادوار میں بلوچستان، سرحد اور افغانستان کے مختلف علاقوں میں پھیلے۔ اس ڈھائی سو میل لمبے پہاڑ کے شمال میں دریائے گومل اور جنوب میں دریائے سندھ دائمی مدہم موسیقی کی تانیں اڑاتے ہوئے رواں دواں ہیں۔ اس کا چپ چاپ سناٹا زبان بے زبانی میں بہت کچھ بتانے کو آمادہ ہے۔ اسی پہاڑ میں حضرت عبدالرشید کے تیسرے بیٹے عارف ربانی شیخ بیٹؒ (جن کا ذکر صوفیا میں آیا ہے) کی وہ مشہور عالم مناجات کی تانیں گونجیں جس میں انہوں نے اپنی نسل کی شادابی کی دعا مانگی تھی۔

پشتون اس پہاڑ کو "قیسہ غر" یا کسے غر یعنی قیس کا پہاڑ کہتے ہیں۔ جو ان کے جد امجد کے نام پر ہے۔ مگر کوہ سلیمان کا نام اس سے بھی قدیم ہے۔ روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت جسے ہوا اڑاتی تھی، اس ہموار سطح مرتفع پر آ کر ٹھہرا تھا۔ جب سے اب تک اسے تخت سلیمان اور اس پہاڑ کو کوہ سلیمان کہتے ہیں۔ مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ جب 1322ء میں کابل پہنچا تو اپنے سفرنامے میں یوں لکھتا ہے کہ یہاں ایرانی لوگ آباد ہیں جن کو افغانی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ بہت قوی اور باشوکوہ ہیں۔ ان کے پہاڑ کا نام سلیمان ہے جہاں ان کا ملک رہتا ہے۔

کوہ سلیمان جو سرسبز و شاداب اور چلغوزے کے جنگل سے اٹا ہوا ہے انگریزوں کی دسترس سے بھی نہ بچ سکا اور ان کی تیغ ستم کے وار بھی اپنے سینے پر سہے جس کی گواہی یہاں کا پتھر اور ہر چٹان دیتی ہے۔ انگریزوں کا مقابلہ شیرانی قبائل نے جان توڑ کر کیا۔ وہی لوگ آج بھی اس پہاڑ کی وادیوں میں مقیم ہیں۔ شیرانی سڑ بن کی اولاد میں سے ہیں۔ انہوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کئے۔ بالآخر نیم آزادی اور اندرونی خودمختاری کی شرط پر انہیں برطانوی استعمار سے مصالحت کرنی پڑی۔

شیرانی: ضلع شیرانی تاریخی اہمیت کا حامل ضلع ہے اس کا کل رقبہ 4800 مربع کلومیٹر ہے 1998ء کی مردم شماری کے مطابق 83,7,71 افراد پر مشتمل آبادی ہے جن میں مرد 44,4,55 اور خواتین 39,316 ایک سروے کے مطابق 11,500 سے زائد گھرانے موجود ہیں ضلع شیرانی جو ژوب کی تحصیل رہا اور اسے سب ڈویژن کا درجہ بھی حاصل رہا حال ہی میں اسے ضلع کا درجہ دیا گیا۔ ضلع شیرانی دو اقوام شیرانی اور حریفال پر مشتمل ہے۔ اس کی سرحدیں ایک جانب ٹانک (صوبہ سرحد) سے ملتی ہیں تو دوسری جانب گل کچھ، سمبازہ (افغانستان کے سرحدی علاقوں) سے جا کر ملتی ہیں کوہ سلیمان اور کے غر سے ملحقہ علاقے ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان سے ملتے ہیں جبکہ موسیٰ خیل، لورالائی سے بھی اس کی سرحدیں ملتی ہیں اپنے محل وقوع اور جغرافیائی اعتبار سے یہ صوبہ بلوچستان کا اہم اور جنگلات کی دولت سے مالا مال علاقہ ہے۔

پشین: اس علاقے کے حوالے سے اسی سرزمین کے مصنف پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ لکھتے ہیں کہ:

پشین جو کہ کبھی ضلع کوئٹہ پشین کی سب سے بڑی تحصیل اور اسکا صدر مقام بھی تھا۔ زمانہ قدیم سے مشہور و معروف علاقہ چلا آتا ہے۔ یہ شہر کوئٹہ سے ۳۱ میل شمال کی جانب واقع ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اس کا ذکر آتش پرستوں کی مقدس کتاب "اوستا" Avesta میں ملتا ہے۔ جس میں اسے "پشینا نہا" Pishinanna کہا گیا ہے۔ اسے ایک مرتفع علاقے میں واقع بتایا گیا ہے۔ غالباً یونانی جرنیل کوئیروس جب سکندر اعظم کی فوج سے علیحدہ ہو کر ایران کی طرف چلا گیا تو کوئٹہ سے گذر کر وادی ہلمند کی راہ ایران پہنچا تھا۔ تب سے تیرہویں صدی عیسوی تک کوئٹہ اور پشین کی تاریخ پر تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ چودھویں اور پندرہویں صدی کے دوران پشین اور کوئٹہ کے علاقے مکوک کرت کے قبضے میں رہے۔ تیمور اور شاہ بیگ نے یہاں حکومت کی۔ شاہ بیگ خان کو 1517ء میں بابر نے شال (کوئٹہ) اور پشین سے نکال باہر کیا۔

1543ء میں ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران کی سمت پسپا ہوتا ہوا کوئٹہ پہنچا اور اپنے بھائی عسکری کی آمد پر نوشکی گرم سیل گیا اور وہاں سے ہرات چلا گیا۔ ہمایوں نے دوبارہ بادشاہ ہند بننے پر شال اور مستونگ کے علاقے لونگ خان بلوچ کو بخشش دیئے۔ لونگ کے بارے میں تاریخ خاموش ہے البتہ یہ امر تاریخی دلچسپی کا موجب ہے کہ پہلی دفعہ جنوب نے شمال کے علاقے میں مداخلت کی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک جبکہ کوئٹہ کا علاقہ قلات کے خوانین کے قبضے میں آیا۔ لورالائی سبی اور ژوب کے ساتھ ساتھ کوئٹہ اور پشین کا علاقہ صوبہ قندھار کا ایک جزو تھا مغلوں اور ایرانیوں کے درمیان قندھار کے حصول کیلئے کشمکش کے دوران پشین بھی انہی مرحلوں سے گزرتا رہا۔

ضلع پشین ایک ہموار وادی ہے جس کی لمبائی شمالاً جنوباً کوئٹہ تا برشور 50 میل ہے۔ اس کی چوڑائی 5 میل سے لے کر 15 میل تک ہے۔ بعض جگہ واری کے مختلف حصوں کو چھوٹی چھوٹی سرخ اور خاکی پہاڑیوں نے جدا کر دیا ہے۔ جنوب کی طرف یہ وادی کوئٹہ میں کھل جاتی ہے۔ شمال کی طرف مغرب کی طرف مڑ جاتی ہے۔ وسطی پہاڑیوں کے مغرب میں گلستان کا علاقہ واقع ہے۔ وادی پشین کو سینکڑوں ٹیوب ویل اور بیسیوں کاریزیں سیراب کرتی ہیں پھر بھی اکثر زمین خشکابہ ہے جس کی شادابی کا انحصار بارش پر ہے وادی پشین میں گندم، جو، تمباکو، آلو وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے بادام، انگور، زرد آلو، شفتالو اور سیب وغیرہ پھلوں کے باغات جابجا ملتے ہیں۔ علاقہ پشین کے بڑے بڑے گاؤں حیدرزئی، یارو، عبدالرحمن زئی، گلستان، عنایت اللہ وغیرہ ہیں۔ پشین کا علاقہ بڑا مردم خیز ہے۔ کئی نامور لوگ مثلاً حاجی خان کاکڑ، عبدالعلی آخوندزادہ، عبدالسلام اشیزئی، آغا صاحب گانگلزئی، مولوی محمد یعقوب لاجوری، قاضی محمد عیسی، خان عبدالصمد خان سب اسی جگہ سے اٹھے ہیں۔ پشین کے سرخ قلعہ کے کھنڈرات شہر سے چار میل کے فاصلے پر موجود ہیں۔ یہ قلعہ مغلوں کے دور سے چلا آرہا ہے۔ غالباً انگریزوں نے اسے ڈھا کہ چھاؤنی بنائی تھی۔

پشین سے دو میل دور شمال کی جانب "سرہ کلا" لال قلعہ واقع ہے جو گذشتہ ساڑھے تین سو سال سے موجود رہا ہے۔ اب کھنڈر ہے۔ انگریزوں نے یہاں کافی کھدائی کی۔ اسے خونی قلعہ بھی کہتے ہیں۔ بازار کہنہ سے تین میل شمال کی جانب "شیران قلعہ" واقع تھا۔ اب کھنڈر ہے۔ نئے بازار کے پاس پائندخان کا بنا یا ہوا قلعہ تھا۔ حاجی خان احمد خیل کاکڑ نے تین قلعے بنوائے تھے۔ ایک قلعہ اسکان خان پشین کے قریب ایک برشور میں اور تیسرا توبہ کاکڑ سرگڑی گاؤں کے پاس۔ موخر الذکر مضبوط اور مشہور قلعہ تھا۔ 1839 میں انگریز جنرل ولشائر نے اسے سر کیا تھا۔

بند خوشدل خان پشین سے آٹھ میل کے فاصلے پر اور سرخاب مشرق میں آٹھ میل پر پُر فضا جگہیں ہیں جو شکار اور تفریح کیلئے موزوں ہیں۔ بند خوشدل خان میں ایک بڑا عمدہ بنگلہ اور لان وغیرہ حالیہ برسوں میں تیار ہوئے ہیں۔ کشتی رانی بھی ہوتی ہے۔ توبہ کاکڑی میں کوہسفید اور شاہ بلوط کی قسم کے درختوں کا جنگل ہے جس کا میوہ "شنے" کہلاتا ہے جسے سردیوں میں لوگ چاؤ سے کھاتے ہیں۔

چمن: چمن جو پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر واقع ہے اور کوئٹہ سے شمال کی طرف قریباً 78 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کوژک یعنی پر پیچ پہاڑ کے شمالی دامن میں ایک نشیبی زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ چھوٹا دلچسپ شہر ہے اور گو پانی بہت نیچا ہے اور سبزے اور اشجار کی کمی ہے پھر بھی غیر ملکی سامان خصوصاً برتنوں اور کپڑوں کی مشہور منڈی ہے۔ یہاں سے افغان سرحد صرف دو میل کے فاصلے پر ہے اور افغانستان کا پہلا سرحدی قصبہ سپین بولدک چھ میل چمن سے دور ہے۔ چمن سے سات میل جنوب مشرق کوژک پہاڑ کی تلہ ٹی میں پرانا چمن واقع ہے جہاں پہاڑی چشمے کا پانی قلیل مقدار میں بہتا ہے۔ انگریزوں نے کوژک کو 1839 میں عبور کرنے کے بعد سب سے پہلے یہاں چھاونی قائم کی اور ڈیرہ جما لیا تھا۔ اس علاقے میں روغانی اور رابتو نام کی دو کاریزیں واقع ہیں جو بالترتیب چمن سے گیارہ اور اٹھارہ میل دور ہیں شمال مشرق کی طرف توبہ اچکزئی کا سردار پہاڑی علاقہ واقع ہے جس کی سطح سمندر سے بلندی 8100 فٹ

ہے۔ یہ ایک سطح مرتفع ہے جس میں فراخی اور تنیبہ کے میدانی علاقے واقع ہیں۔ آریہ سماجیوں کا ایک خوبصورت ساتن دھرم بھی موجود ہے جس میں بیرونی دروازے پر بڑی خوبصورت بچی کاری کی گئی ہے۔ سب سے مشہور بازار ٹرانچ روڈ ہے جو شرقاً غرباً ہے۔ اس کے متوازی تاج روڈ اور بجلی گھر روڈ میں بھی اہم بازار درمیانی دو تین گلیاں بھی بازار میں ہیں جو زیادہ تر ہندوؤں کے نام پر ہیں جسے جوگی رام اسٹریٹ، سناتن بازار وغیرہ۔ کئی دو منزلہ عمارات کچی پکی بھی پائی جاتی ہیں۔ مکانات اکثر باہر سے پکے ہیں۔ گلیاں اکثر پکی ہیں۔ جبکہ چمن شہر کا نام بھی کسی "چمن لال" کے نام سے منسوب ہے۔ چمن کی اکثر آبادی اچکزئی قبائل پر مشتمل ہے۔

کوژک کا پہاڑ: جس کا دوسرا نام خواجہ عمران یا توبہ کا پہاڑ بھی ہے، چمن کے جنوب مشرق میں ۲۵ میل کی لمبائی ایک دیوار کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ چمن کے لئے پینے کا پانی توبہ ہی کے پہاڑی سلسلے بوغرہ سے آتا ہے۔ خواجہ عمران اس سلسلہ کوہ کی سب سے بلندی چوٹی ہے جو پشین سے مغرب کی طرف واقع ہے اور جو سردیوں میں چند دنوں کے لئے برف سے ڈھک جاتی ہے۔ یہ چوٹی اب تو کاریز سے قریب تر ہے۔ یہاں ایک تاجک بزرگ دفن ہیں جن کی بہن نانگی کا مزار ریگستان میں واقع ہے۔ خواجہ عمران کے مزار تک مختلف راستوں سے پہنچا جاسکتا ہے۔ مشرق کی طرف سے براستہ خوژگی یا خوگی ۵ میل۔ مغرب کی طرف براستہ چمن ۸ میل۔ اور شیرو باغ ساڑھے تین میل۔ مزار کے قریب اچکزئی قبیلے کے عثمان زئی قبائل سکونت پذیر ہیں، جو مزار کی پرداخت کرتے ہیں۔ قبر کی لمبائی ۱۸ گز اور چوڑائی ۱۰ گز ہے۔ قبر کے چاروں طرف پتھروں کی ایک دیوار ہے۔ خواجہ عمران کی چوٹی سمندر سے 8864 فٹ بلند ہے۔

درے کوژک پہاڑ کا یہ نام کوژک Kozak یا Ghwaza درے سے ماخوذ ہے جس میں سے سڑک گزرتی ہے جو 1839 میں پہلی افغان جنگ کے موقع پر انگریزوں نے بنائی تھی اور ریلوے لائن بھی اسی درے سے گزرتی ہے جو 1888ء میں انگریزوں نے بنائی تھی۔ براعظم کی مشہور سرنگ جس کی لمبائی ڈھائی میل ہے اسی پہاڑ میں واقع ہے۔ خوجک یا کوژک کے درے کے علاوہ اس پہاڑ میں اور بھی درے ہیں۔ سنزلہ، باغنک، روغانی، تورتنگی، کردرگی، اب توسکام کان، وچہ درہ بھی ہیں۔ کوژک سرنگ کے جنوبی سرے پر شیلہ باغ اور شمال سرے پر سنزلہ کا سٹیشن ہے شیلہ باغ میں پشین سکاؤٹس پوسٹ بھی قائم ہے۔

کوژک درے کی سب سے اونچی چوٹی 7457 فٹ سطح سمندر سے بلند ہے۔ یہاں سے ریت کے سمندر میں رنگ، لشکر ڈنڈ، میان بولاک، کونچائی اور آخر میں بمبول پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ بمبول پہاڑیوں کے پیچھے ہی قندھار واقع ہے جو درے کی چوٹی سے نظر آتا ہے البتہ سنا گیا ہے کہ خواجہ عمران کی زیارت گاہ والی چوٹی سے قندھار نظر آجاتا ہے جو کہ چمن سے تقریباً ۶۵ میل دور ہے۔

کوژک یا خواجہ عمران کے اس پہاڑ کے شمال مشرق میں کوہ توبہ کاکڑی کے پہاڑ میں توبہ اچکزئی بڑا اور توبہ کاکڑی چھوٹا ہے۔ احمد شاہ ابدالی بھی کبھی کبھار توبہ اچکزئی آتے تھے۔ اور انہوں نے یہیں 1773ء میں تین ماہ گزارے تھے۔

زیارت: زیارت بلوچستان کی پرفضا ترین وادی ہے۔ جہاں ملک بھر سے شائقین تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ 1986ء تک زیارت ضلع سبی کی ایک تحصیل تھی۔ اس کے بعد اسکو ضلع کا درجہ دیا گیا۔ جبکہ لورالائی کی تحصیل سنجاوی کو بھی وہاں سے الگ کر کے اس ضلع میں شامل کر دیا گیا۔ زیارت کے اہم علاقے کو سنجاوی، چوتیر، کواس، زڑگی کیچ اور زرندہ شامل ہیں۔

اس ضلع کے شمال میں پشین، جنوب میں سبی واقع ہے۔ جبکہ مشرق میں لورالائی اور مغرب میں کوئٹہ ہے۔

زیارت کے پہاڑ برف سے ڈھکے رہتے ہیں سال بھر برف کا پانی ندی نالوں میں بہتا ہے جبکہ برسات کا موسم بھی ان کی زندگی کا باعث بنتا ہے۔ ان ندیوں میں، سپیرہ راغہ، کو اس ندی مشہور ہیں۔ موسم کے حوالے سے یہ علاقہ بلوچستان کا سرد ترین علاقہ ہے جس میں تقریباً پانچ مہینے نومبر تا مارچ باقاعدہ سردی ہوتی ہے۔ ان ایام میں ندی نالوں اور چشموں کا پانی بھی جم جاتا ہے۔

تفریحی مقامات: زیارت اگرچہ تمام کا تمام تفریحی خطہ ہے لیکن چند مقامات جہاں سیاح باقاعدہ جاتے ہیں۔ ان میں خرواری بابا، مخمل تنگی، سنڈیمن تنگی وغیرہ شامل ہیں۔

خرواری بابا کا تفصیلی تعارف صوفیاء کے حصے میں شامل ہے، ان کی زیارت کے آس پاس کی فضا تفریحی ہے اور اس شہر کا نام زیارت کی وجہ تسمیہ بھی خرواری بابا کی زیارت ہے۔ جبکہ مخمل تنگی ایک ایسی جگہ ہے جس کی خوبصورتی کا باعث ایک بڑے چشمے پر پہاڑ کے سینے کا کمرہ نما محدود غار ہے جس کے اوپر، یعنی چھت سے ہر وقت شفاف پانی ٹپکتا رہتا ہے اور اس کی اندرونی سطح تازہ کائی سے ڈھکی ہوتی ہے اور لگتا ہے جیسے کوئی مخملین تہہ چڑھائی جا چکی ہو۔

اس کے علاوہ سنڈیمن تنگی میں بھی پہاڑ کے اندر کے ایک چھوٹے غار کے اوپر سے انتہائی سرد اور شفاف پانی بہتا ہے۔ جبکہ سردیوں کے موسم میں یہاں برف جم

جاتی ہے اور برف کا یہ دیوہیکل ٹکڑا اس وقت ٹوٹ جاتا ہے جب سردیوں کا موسم تمام ہوتا ہے مقامی لوگوں کے مطابق یہ سردی کے ختم ہونے کی نوید سناتا ہے، یعنی سردی کے موسم کے اختتام پر یہ اتنے دھماکے سے ٹوٹ جاتا ہے کہ دور دور تک کے دیہاتوں اور وادیوں میں اس کی آواز سنائی دیتی ہے اور اہل زیارت جان جاتے ہیں کہ یہ سنڈیمن تنگی کے برف کے ٹوٹنے کی صدا ہے یا یوں کہ سردی کے موسم کو الوداع کرنے کی صدا۔ اس کی وادیوں میں زیارت کے علاوہ کو اس کی وادی کو بھی اہمیت حاصل ہے جہاں کے باغات اور ندیاں زیارت کے حسن میں اضافے کا باعث ہیں۔ یہاں ایک ایسا مرتب شدہ مقام موجود ہے، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاید عارضی قیام کے لیے بنایا تھا۔

قائداعظم ریذیڈینسی: زیارت میں سب سے اہم اور قابل احترام تاریخی مقام قائداعظم ریذیڈینسی ہے، جہاں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کئے تھے۔ اس جگہ قائد کا کمرہ، کرسی، اور دیگر اشیائے استعمال اب بھی موجود ہیں اور سیاحوں کے دیدنی مقامات میں سے ایک مقام یہ بھی ہے، ریذیڈینسی کو اب بھی بڑے سلیقے سے صاف ستھرا اور سرسبز رکھا جاتا ہے۔

پھل اور سبزیاں: وادی زیارت سرسبز مقام ہونے کی وجہ سے باغات سے بھی بھری پڑی ہے۔ اس کے سیب بہت ہی اعلیٰ اور معروف ہیں جبکہ اس کے علاوہ چیری بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ خوبانی، انار، آڑو وغیرہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے دیگر پھلوں کے درخت اور پیوند کاری کے ذریعے علاقے کے باغبان زیارت میں پھلوں کی اقسام میں اضافہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ان کے علاوہ پہاڑی جنگلات میں قدرتی پھل جیسے، شنے جسے خنجک بھی کہتے ہیں اور زیتوں کی ایک مختلف قسم جو نسبتاً چھوٹے سیاہ دانوں کی شکل میں ہیں، پیدا ہوتے ہیں۔ اس زیتون کو مقامی زبان میں "شینینے" کہتے ہیں۔

زیارت کی سبزیوں میں آلو، پیاز، لہسن، بھنڈی، بینگن، شلجم، گوبھی، پالک اور ٹماٹر وغیرہ شامل ہیں۔ زیارت میں پشتون قبائل آباد ہیں جن میں کاکڑ، دوتانی، سارنگزئی، عیسی خیل، رئیسانی اور ترین وغیرہ شامل ہیں۔

قلعہ سیف اللہ: یہ علاقہ اس سے قبل ژوب کی ایک تحصیل کے طور پر متعارف تھا، جس کی تاریخی حیثیت بہت قدیم اور اہم ہے کہ ژوب کی تاریخی تفصیل میں قلعہ سیف اللہ شامل ہے۔ یہ کاکڑ اکثریتی علاقہ ہے اور پشتونوں کا نواب قبیلہ جوگیزئی بھی یہاں اکثریت میں ہے۔ اس کی تحصیلوں میں مسلم باغ اور لوی بند شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اہم مقامات مسافر پور، شنکی، مرغہ فقیرزئی، شین شوب اور حیدرزئی ہیں۔

قلعہ عبداللہ: قلعہ عبداللہ جو کہ ضلع قلعہ عبداللہ کا ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے۔ صوبائی دارالحکومت کوئٹہ کے شمال میں تقریباً 80 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور مشہور غازی عبداللہ خان کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ملک کا آخری سرحدی ضلع ہے اور افغانستان کے ساتھ شمالاً اور غرباً طویل سرحد رکھتا ہے جبکہ اندرون ملک اس کی سرحدیں ضلع پشین اور نوشکی سے ملتی ہیں۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع قلعہ عبداللہ کی آبادی تقریباً تین لاکھ ستر ہزار 370000 نفوس پر مشتمل ہے یہاں مختلف آبادی ہے۔ جن میں اچکزئی، کاکڑ، سید، ترین اور نورزئی شامل ہیں۔ جبکہ مجموعی طور پر اچکزئی قبائل ضلع کی بڑی آبادی ہے۔ مختلف قبائل کی آپسی دشمنیوں کی وجہ سے یہ ملک کا حساس ترین ضلع بھی جانا جاتا ہے۔ اور ضلع قلعہ عبداللہ کا کل رقبہ تین ہزار دوسو تراانوے سکوائر کلومیٹر ہے۔ ضلع قلعہ عبداللہ کی چار تحصیلیں ہیں جن میں تحصیل قلعہ عبداللہ، تحصیل گلستان، تحصیل چمن اور تحصیل دوبندی شامل ہے۔ قلعہ عبداللہ کو تقریباً دس سال قبل ضلع کا درجہ دیا گیا۔ حالیہ انتخابات میں قلعہ عبداللہ کو ایک قومی اور تین صوبائی اسمبلی کی نشستیں دی گئی جبکہ اس سے پہلے قلعہ عبداللہ اور پشین سے صرف ایک ممبر اسمبلی منتخب ہوا کرتا تھا۔

پشتون قبائل کی تشکیل: افغانوں میں یہاں قبیلہ کی تشکیل اور بلوچستان کے قبائل کے بارے میں پروفیسر انور رومان کی کتاب پر تکیہ کرتے ہیں۔ اور قبائل کے ذکر سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ قبیلہ ہے کیا؟ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ افغان قبیلہ بعض کوائف میں براہوئی یا بلوچ قبیلہ سے واضح طور پر مختلف ہے۔

نظری طور پر ایک افغان قبیلہ یک جدی عزیز واقارب کے کئی گروہوں سے مل کر بنتا ہے۔ نسل باپ کے توسط سے چلتی ہے اور بیٹا باپ کے خون کا حامل ہوتا ہے۔ قبیلے کے گروہ بہت سے حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں جن کا سراغ لگانا محال ہے لیکن عملاً چار رائج العام ہیں قوم یعنی من حیثیت الکل، خیل یا زئی یعنی پارہ قبیلہ جو مشترکہ علاقہ میں مقیم ہے، جو ایک دوسرے کے قریب رہتا ہے اور غالباً مشترک الجائداد ہوتا ہے اور آخر میں کہول یعنی ایک خاندانی گروہ جو رشتہ داریوں سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔

لیکن اکثر قبائل کے ساتھ بعض غیر نسلی گروہ بھی منسلک ہوتے ہیں جنہیں مندون یا ہمسایہ کہتے ہیں جبکہ ہرنائی میں انہیں خمیس کہا جاتا ہے۔ ان سے رشتہ داری کی شرط نہیں اور ایسے گروہ یا خاندان یا افراد مشترکہ دکھ سکھ کے حوالے سے قبیلے سے مربوط ہوجاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مشترکہ خونی عداوت، اتحاد قبیلہ کا بنیادی

اصول ہے لیکن یہ تصور مشترک خون یعنی رشتہ خون کے مفروضہ کا روپ دھار لیتا ہے۔

گیز ئیٹر کے مطابق پشتون ایک قبائلی سردار کے تحت منظم نہیں ہیں جیسا کہ بلوچی یا براہوئی قبائل میں ہے۔ جن کے ہاں قبائلی وڈیرہ وغیرہ سردار کے ماتحت ہیں بلکہ ان کا جمہوری مزاج ہر چھوٹے سے گروہ میں اپنا معتبر چنتا ہے۔ بلوچوں میں توارث ہمیشہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن افغانوں میں اکثر ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ کمزور مضبوط سے دبتے چلے جاتے ہیں اور کور ذہن ذکی الفہم سے۔ لہذا اردگرد کی نسلوں کے مقابلے پر افغانوں میں انفرادیت کے پنپنے کے بہت امکانات ہیں۔

کاکڑ: کاکڑ غورغشت افغان ہیں اور ان کا مورث اعلی کاک یا کاکڑ دانی ابن غورغشت ابن قیس عبدالرشید کا بیٹا تھا۔ یہ مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم ہیں جن کا باہمی تعلق اتنا خفیف ہے کہ ہر ایک کو قریباً علیحدہ علیحدہ قبیلہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ان میں داوی بھی قدرے شامل ہیں جو داوی برادر کاکڑ کی اولاد ہیں۔ ایک گروہ لمر بھی ان میں پیوست ہے جس کا ماخذ مشتبہ ہے۔

سنزرخیل: سنزرخیل یا سنجر ابن سغرک کاکڑ کی اولاد ہیں اور بیرونی دنیا بطور سران یا ژوبی انہیں جانتی ہے۔ سنزرنیکہ ایک ولی سمجھے جاتے تھے اور ان کے کرامات کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق سنزر سغرک کی بیوی (جو سید تھی) سے سغرک کی وفات کے بعد پیدا ہوا۔ جب بیوی اپنے میکے (لونی علاقہ) کو واپس لوٹ گئی تھی۔ جب وہ جوان ہوا تو اس کے ہجولی اس کے نامعلوم باپ کی وجہ سے طعنے دینے لگے۔ اس پر اس کی ماں نے اسے باپ کی مہر دار انگوٹھی دی اور اس کے کوائف اسے بتائے۔ اس کے بعد سنزر ہندوباغ آ گیا جہاں مغل صوبیدار میرو نے اسے مارنے کی سازش کی لیکن سنزر معجزانہ طور پر بچ گیا۔ خان کا قلعہ تباہ کیا اور میرو کی بیٹی سے شادی کی۔ جس سے بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ کچھ دیگر گروہ بھی ملائے ہیں۔ جنہیں وصلی کہتے ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

۱) سبزئی، جواب اختر زئی کی شاخ ہیں اور قلعہ سیف اللہ میں ہیں۔ اصلاً ہوتک غلزئی تھے۔

۲) ادوزئی (جو سلیمان کبزئیوں میں شامل ہیں) ایک بیوہ (ماخذ نامعلوم) کی اولاد ہیں۔ جسے قندھاری سوداگر سلیمان نے اغوا کر لیا تھا۔ بعدازاں سلیمان گوسہ آ گیا اور زمین خرید کر آباد ہو گیا۔

۳) یاسین زئی عبداللہ زئیوں میں شامل ہیں اور ولد الزنا معلوم کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔

سنزرخیلوں کے بڑے طائفے سنزر کے بارہ بیٹوں کے نام سے موسوم ہیں جیسے علیزئی، عبداللہ زئی، ہرمزئی، اتمان خیل، برات خیل، نس خیل، عرب خیل، پریزون، تیمانی، نسائی اور ہندو سنزرخیل۔ ان میں سے پریزون پشین کو ہجرت کر گئے۔ ہندو سنزرخیل شکارپور (سندھ) میں ہیں۔ اتمان خیل اور عرب خیل زیادہ تر ضلع لورالائی کی تحصیل بوری میں ہیں اور تیمانی علاقہ ہرات کے کوہ سیاہ بند میں رہتے ہیں۔ جہاں وہ چار قبیلوں میں ضم ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ہر طائفہ بہت سے حصوں میں تقسیم ہے۔

سنزرخیلوں کا اہم ترین گروہ جوگیزئی ہے جو جلالزئی، شادوزئی، علیزئی کا ایک حصہ ہے۔ اس گروہ کا مورث اعلی جوگی سنزر سے گیارہویں پشت میں تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے، بوستان اور مٹھا۔ بوستان کے پڑپوتے بیکر نیکہ کے بیٹے محکم کے دو بیٹے تھے اسحٰق اور نواب جن کے ناموں پر دو مخالف گروہ اسحٰق کھول اور نواب کھول موسوم ہوئے۔ قبائلیوں کی نگاہوں میں جوگیزئی ایک مذہبی تقدس کے حامل ہیں اور جوگی کی اولاد میں سے ہی ایک یعنی بیکر نیکہ کو احمد شاہ ابدالی نے حکمران ژوب کا لقب دیا۔ جوگیزئی خاندان کے اکابرین کے کارنامے ہی زیادہ تر ژوب ڈویژن کی تاریخ ہیں۔ نواب کھول کے دیگر اکابرین سید خان، ایوب خان، ناری خان، میر حاجی، شادی گل، محمد صادق، لاجور خان، محمد افضل خان اور کالا خان ہیں۔ اسحٰق کھول کے کبائر ظریف خان ابن سردار بہادر، بنگل خان مرحوم، زرغون خان ابن سردار شہباز خان، لونی خان، دیوانہ خان، تاج الدین، رحمان جان، جمال خان، اما خان، شیر خان، باز خان اور بیل خان ہیں۔ ان میں سے اکثر معافی زمینوں کے مالک اور مویشی ٹیکس سے مبرا تھے اور چند لیوی سروس سے تنخواہ بھی لیتے ہیں۔

علیزئیوں کے حصہ میرزئیوں کا پارہ ملیزئی واجب الاحترام یعنی پیر خانہ سمجھا جاتا ہے۔ سنزرخیل کی اکثریت کاشت کار ہے لیکن بعض کاشت کاری کے ساتھ ساتھ ریوڑ پال بھی ہیں۔ جلال زئی اور مردان زئی زیادہ تر اپنے ریوڑوں کی پیداوار پر ہی گزر اوقات کرتے ہیں۔ گھوڑے زئی، باٹوزئی اور اسماعیل زئی بھی ریوڑ پالتے ہیں اور علیزئی، دولت زئی، میرزئی اور جلال زئی شتر پال ہیں۔ ملیزئی، اسماعیل زئی تجارت کرتے رہے ہیں لیکن اب ان کے مشاغل میں تنوع آ گیا ہے۔

سناٹیہ: گزیٹر میں درج ہے کہ سناٹیہ کاکڑ کے چھ بیٹوں میں سے ایک جدرم کا پوتا اور حسین کا بیٹا تھا۔ ان کی دو بڑی شاخیں ہارون خیل اور عیسی خیل ہیں۔ بڑے بڑے طائفے عیسی خیل، مہترزئی، سارنگزئی، بازئی، ملازئی اور ابراہیم زئی ہیں۔ یہ کاشت کار ہیں لیکن بعض کے پاس ریوڑ بھی ہیں۔ عیسی خیلوں کے پاس زمین کم ہے اور وہ

اپنی روزی محنت مزدوری اور ایندھن فروشی سے کماتے ہیں۔لیکن آج ان کا ذریعہ معاش بہت ہی مختلف ہوگیا ہے۔

سرغڑہ طائفہ (سرگڑھ): سرغڑہ کاکڑ کے بیٹے سرغڑے کی اولاد ہیں اوران کے تین بڑے حصے سام خیل، منڈازئی، اور ہارون ہیں۔پشین میں بھی آباد ہیں۔یہ ژوب، قلعہ سیف اللہ اور کچلاک وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں مسلم باغ میں آباد ہیں۔وہاں تینوں موجود ہیں لیکن عددی لحاظ سے ہارون زئی مضبوط ترین ہیں۔ان کے بعد سام خیل آتے ہیں اور پھر منڈازئی ہے۔زیادہ تر سرغڑے کاشت کار ہیں اور کنڈا اور سام خیل کاریز میں زمینوں کے مالک ہیں۔کاکڑ مجموعی طور پر خوش اطوار اور امن پسند لوگ ہیں۔

شیرانی قبیلہ: شیرانی شرف الدین المعروف بہ شرجون ابن سڑبن کی اولاد ہیں۔جغرافیائی لحاظ سے وہ دو گروہوں میں منقسم ہیں۔یعنی کوہ سلیمان کے مشرق میں رہنے والے لرغا شیرانی اور مغرب والے برغہ شیرانی۔دیگر افغان قبائل کی طرح وہ بھی وقتاً فوقتاً ادھر ادھر پھیلے ہیں مثلاً ان میں سے کچھ شوراوک میں ہیں اور کچھ مری بلوچ کے طائفہ لوہارانی شیرانی کی وجہ تسمیہ بنے ہیں۔1890ء کی خدرزئی مہم (جس کا تذکرہ تاریخ کے تحت ہوا ہے) کے بعد قبیلہ کو تقسیم کردیا گیا۔برغہ شیرانی ژوب پولیٹیکل کے تحت رہے اور لرغا شیرانی صوبہ سرحد کے ڈیرہ اسماعیل خان ضلع میں شامل کردیئے گئے۔

مقامی روایات کے مطابق کوئی چار سو سال پہلے شیرانیوں اور بھٹانیوں میں متواتر جنگ وجدل ہوتی رہی۔شیرانیوں کے رہنما کو ایک یتیم قریشی لڑکا مل گیا جس کی معجزانہ مدد سے شیرانی بھٹانیوں پر غالب آگئے۔لڑکے کا نام دارے خان رکھا گیا۔اس کی شادی ایک شیرانی عورت سے کردی گئی اور شیرانی معتبرین نے فیصلہ کیا کہ ایک قبائلی لشکر اس کی زیر قیادت بھیجا جائے تاکہ برغہ زمینات پر قبضہ کیا جائے جو زیروں کے خوف سے بیکار پڑی تھیں۔یہی برغہ شاخ کا ماخذ بتایا جاتا ہے۔ایک مقامی روایت کے مطابق برغہ زمینات اس سے پہلے ہزاروں کے قبضہ میں تھیں جنہوں نے یہ علاقہ چھوڑ دیا اور شمال میں روزگان منتقل ہوگئے۔

ژوب میں شیرانیوں کے بڑے بڑے گاؤں قریہ وسطی کرم غزلاور اور شارغلائی ہیں۔ہری پالوں کے ابراہیم خیل اور الگدا جبکہ بابر زیادہ تر گردابابر، الگدا بابر اور ابراہیم خیل میں پائے جاتے ہیں۔گزیٹر مزید کہتا ہے کہ شیرانی کاشت کار ہیں اور ریوڑ بھی پالتے ہیں لیکن ان کا مرہیل طائفہ تقریباً کلیتاً خانہ بدوش ہے۔

پنی قبیلہ: گزیٹر کے مطابق پانڑی یا پانی اصل میں غورغشت افغانوں کا ایک خانہ بدوش قبیلہ تھا، اور اس کی شاخ صافی اب بھی غزنی کے نواحیات میں کثیر تعداد میں موجود ہے۔ایک اور بڑا حصہ گدون ضلع پشاور میں علاقہ یوسفزئی کے شرق میں آباد ہے۔پانیوں کی ایک شاخ مغرب سے کوہ سلیمان کی طرف آمدہ معلوم ہوتی ہے اور وہاں سے بتدریج جنوب کی طرف پھیلتی ہے۔ضلع لورالائی کے موسی خیل اور اسوٹ پانی ہیں۔ایک اور حصہ درہ بولان ہے۔سانگان پہنچا اور آہستہ آہستہ بادرہ، کواٹ منڈائی اور سبی پر چھا گیا۔آخر کار وہ قابض ہا شاید حکمران قندھار کی نامزدگی کی بدولت بارکھان اور موجودہ مری سرزمین پر حکومت کرنے لگے۔پانیوں کے انباؤ اخلاف جنوبی ہند میں بھی پائے جاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً تاریخ ہند میں نمایاں ہوئے ہیں۔

لوانہ طائفہ: لوانہ یا نوانڑ پانی کے چھ بیٹوں میں سے ایک لوانڑ کی اولاد ہیں۔لہذا وہ موسی خیل، اسوٹ باروزئی وغیرہ کے رشتہ دار ہیں۔1890 میں ان کی دو آبادیاں تھیں۔ا) جنوبی تروہ اور دریائے کندر پر، کندر نگانگی اور ناخیل کے درمیان اور ۲) ضلع سبی میں بمقام سانگان مردم شماری کے کاغذات میں ان کے بڑے بڑے حصے مندرزئی، اسماعیل زئی، اور حسین خیل ہیں۔انگریزی قبضہ سے پہلے لوانہ جوگیزئیوں کے تابع تھے اور تھوڑی سی رقم ادا کرتے تھے۔لوانہ کاشت کار بھی ہیں اور گلہ بان بھی، لیکن ان کا بڑا ذریعہ معاش ان کے ریوڑوں کی پیداوار ہے۔وہ زمینی نمک بھی پیدا کرتے ہیں۔ان قبائل کا ذریعہ معاش آج مختلف ہوگیا ہے۔

مندوخیل طائفہ: مقامی روایت کے مطابق مندوخیل (غورغشت افغان) نارو (خراسان) سے آئے ہیں اور موسی خیلوں اور سنزرخیل کاکڑوں کے ساتھ مل کر انہوں نے مغلوں کو اس علاقہ سے نکالا اور قابض ہوگئے۔وہ دو شاخوں میں منقسم ہیں یعنی ہادی زئی یا شیخ اور حیدر خیل۔ان میں سے کریہ زئی سردار خیل سمجھے جاتے ہیں۔مندوخیل فورٹ سنڈیمن کے گردونواح میں رہتے ہیں اور ان کے اہم گاؤں اپوزئی کم کستوئی اور برنج ہیں۔ان کا بڑا پیشہ زراعت ہے۔لیکن سلیمانزئی کا بیشتر حصہ گلہ بان ہے۔مندوخیل جوگیزئی سرداروں کے تابع تھے۔لیکن ہمیشہ اپنا معتبر مقام رکھتے تھے۔اس قبیلے کا رجحان اب تعلیم کی طرف زیادہ ہے اور اکثر ٹھیکہ داری وغیرہ کرتے ہیں۔

صافی قبیلہ: گزیٹر کے مطابق صافی پانیوں کا ایک طائفہ ہیں۔لیکن ضلع ژوب کے صافی، ضلع سبی کے ہم نسلوں سے تعلق سے منکر ہیں۔ان کا دعوی ہے کہ وہ غلزئی ہیں اور افغانستان سے آئے ہیں۔ترمن خیل اور جانی خیل کی اکثریت خانہ بدوش ہے لیکن بعض

نے زمینیں خرید لی ہیں اور دریائے ژوب کے کنارے واقع صافی کوٹ میں مقیم ہیں۔

دومڑ: گو دومڑ سنزر خیلوں میں شامل ہیں تاہم ان کا براہ راست توارث متنازعہ فیہ ہے۔ کچھ سنزر خیل کہتے ہیں کہ دوم (دومڑوں کا مورث) سنزر کا ایک غلام تھا لیکن خود دومڑوں کا کہنا ہے کہ دوم سنزر کی اک شیرانی بیوہ کا لڑکا ہے۔ وہ بوری، سنجاوی اور دکی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے حصے شبوزئی، نتھوزئی، عمرزئی اور زخ پیل ہیں۔

زخیل: زخ پیل دومڑوں سے منسلک ہیں لیکن ان سے براہ راست توارث سے انکاری ہیں اور سید الاصل ہونیکا دعوی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق وہ سید مزو کی اولاد ہیں انہیں شیخ کہا جاتا ہے اور ان کا قبلیچہ پیکائی اپنے تعویذوں گنڈوں کی تاثیر کی بدولت بہت محترم سمجھا جاتا ہے۔

شادوزئی: تحصیل دکی کے شادوزئی اصل میں کبزئی کا کڑ ہیں لیکن اب ان سے کوئی عملی تعلق نہیں رکھتے بلکہ ترینوں کے رسم ورواج پر چلتے ہیں جن میں وہ رہتے ہیں۔ ان کا مورث شادو اپنی والدہ اور ایک کمسن بھائی کے ساتھ ژوب سے تھل آیا اور لاسیانی ترین خاندان کا چرواہا بن گیا۔ جب پیر عبدالحکیم عرف نانا صاحب ترینوں سے ناراض ہوئے تو شادو نے بڑھ چڑھ کر ان کی خدمت کی جس پر اس نے دعا دی اور شادو کی اولاد پھلی پھولی۔ شادو نے ایک ترین عورت سے شادی کی اور اس کے چار بیٹے ہوئے۔ شیر خان، کرم خان، حاجی خان اور نصیر خان دوسری بیوی سے بھی چار بیٹے ہوئے۔

ترین: ترین سڑ بن افغان ہیلی اور ترین ابن شرف الدین ابن ابراہیم ابن قیس عبدالرشید کی اولاد ہیں۔ روایات کے مطابق ترین کے چار بیٹے تھے۔ سپین ترین، تورترین، ژڑترین، اور بورترین کی بجائے اصطلاح ابدال، بتدریج رائج العام ہوگئی اور احمد شاہ ابدالی المعروف بہ درانی کی جنگ آزمائی کے ساتھ خصوصی اہمیت اختیار کر گئی۔ یہ اب بھی کبھی کبھی اچکزئیوں کیلئے استعمال ہوتی ہے۔

سپین ترین: سپین ترین اصل میں پشین میں آباد تھے لیکن گھروں کو خیرباد کہہ کہ وہ جنوب میں ضلع سبی کی تحصیل شاہرگ اور ضلع لورالائی کی سنجاوی اور دکی تحصیلوں میں ہجرت کر گئے۔ تحصیل سنجاوی میں اہم طائفے دنیچی ہیں جو وانی، چوتیر اور شیریں وادیوں میں آباد ہیں۔ یہ تحصیل دکی میں بھی ہیں۔ جہاں انہوں نے زمین بھی حاصل کرلی ہے۔ تحصیل دکی میں ان کے بڑے بڑے حصے لاسیانی، مرپانی، سیمانی، اڈوانی اور سام ہیں۔ وہ تھل میں خشکابہ زمینوں کے مالک ہیں۔ لسیانی کی بریمانی، شاخ اور موسیانی کی اڈوانی شاخ سردار خیل سمجھے جاتے ہیں برطانوی دور سے پہلے اپنے علاقے میں تجارت کرنے والے ہندوؤں پر کچھ درآمدی محصول لگاتے تھے۔ مقامی روایت کے مطابق ترین رئیس کی اولاد ہیں جو ریسانیوں کا مورث اعلی تھا۔ کوہ سلیمان میں اپنے وطن سے وہ مستونگ آئے۔ پھر وادی کو اس میں اور وہاں سے دنیچی لسیانی، اور موسیانی اپنے ریوڑوں کو چرانے کے لیے سالن اور تھل میں پھیل گئے۔ اس گروہ کے رہنما جودکی آئے لیاس، موسی اور جام تھے۔ انہوں نے اس بنجر علاقے کو قرعہ اندازی سے آپس میں تقسیم کرلیا۔ تھل ندی لسیانی، اور موسیانی کے حصے میں آئی، دکی نسائی کو ملا، انمبار، کولاکان، اور چوٹیالی، جامانی، کو اور لسیانی، دکی اور چوٹیالی کے گاؤں بسائے گئے۔ احمد شاہ ابدالی کے وقت آبپاشی کی زمینوں پر لگان بہت زیادہ تھا۔ لہذا ترینوں نے تھل ندی شادو کبزئی کے ایک بیٹے شہباز خان اور چوٹیالی کے ترینوں نے انمبار کے پانی کے کچھ حصص علی خان ابن شادو خان کے بیٹے شیر خان کے ہاتھ فروخت کردیئے۔

تورترین: مقامی روایت کے مطابق تورترین کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا بابو، جس کے دو بیٹے ہوئے علی اور ہارون، علی کی اولاد علیزئی کہلاتی ہیں۔ ہارون کی اولاد پانچ بڑے حصوں میں تقسیم ہے۔ پشین میں آباد ہے۔ افغانوں کے تحت پشین کی موروثی صوبیداری مدتوں تک ہارون زئی کے ذیلی حصہ ابوبکر کی شاخ بٹے زئی کے پاس رہی۔ لہذا پشین کے بٹے زئی اپنے ہم نسلوں میں کچھ احساس تفوق رکھتے ہیں۔ مقامی بیانات کے مطابق عمرزئی ترین پشین سے سالن میں آگئے جہاں ونچیوں نے انہیں شن لیز زمینیں دے دیں۔ وہ سپین ترینوں کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکے اور دکی کی طرف چلے جسے انہوں نے نسائی سپین ترین سے بزور شمشیر لے لیا۔ نسائی کو چوٹیالی بھاگنا پڑا۔ وہ 1125ء میں دکی میں تھا۔

گزیٹر کے مطابق 1901ء میں ضلع بھر میں تورترین 556 تھے، مرد 282 اور عورتیں 274 اور یہ 540 علی زئیوں اور 16 کھیانیوں پر مشتمل تھے۔ یہ سب تحصیل دکی بالخصوص دکی اور حبیب قلعہ دیہات میں تھے۔ دکی میں علی زئیوں کے نمائندے عمرزئی جو چار شاخوں میں منقسم ہیں۔ ملے زئی، محمد زئی، بہلول زئی، اور ہنزرزئی اور ان کے ساتھ اسوٹوں کی ایک شاخ گلفرض یا بلفرض ضم ہیں۔ دکی میں آمد کے ابتدائی ایام میں معتبر ملے زئیوں کی شاخ شیروزئی سے ہوتا تھا۔ لیکن انگریزی قبضہ سے چند سال پہلے کمال خان ہنزرزئی اثر واقتدار میں بازی لے گیا۔ اور اسے ملک میں تسلیم کرلیا گیا۔

اچکزئی: افغانستان کے حکمران خاندان سے خونی رشتہ، ضلعی سرحد کے آر پار

قیام ومقام کی حیثیت سے اچکزئی اہم ترین قبائل میں سے ایک ہیں۔ حیات خان کی تاریخ افغانستان کی رو سے ان کے مورث اعلیٰ بورترین الملقب بہ ابدال سے دو بڑے حصے زرک اور پنچپائی ماخوذ ہیں۔ زرک میں پوپلزئی، بارکزئی اور الکوزئی شامل ہیں اور پنچپائی نورزئی، علیزئی، اسحٰق زئی، خاکوانی اور مکو پر مشتمل ہیں۔ اچکزئی اصلاً بارکزئی کی شاخ ہیں لیکن احمد شاہ درانی (جو خود بھی ابدال تھا) نے بارکزئیوں کی روز افزون تعداد سے ڈر کر انہیں سواد اعظم سے الگ کر لیا اور اس وقت سے وہ ایک جداگانہ تنظیم کے مالک ہیں۔ افغانستان کے محمد زئی امراء ان کے ہم جد ہیں اور عمر خانزئی کے ذریعے ایک اور شاخ سے مشترکہ بارکزئی مورث کی اولاد ہیں۔

قبیلہ کے دو اہم طائفے ہیں۔ بادین زئی اور گجن زئی۔ قبیلہ توبہ اچکزئی کے مغربی حصہ اور چمن میں خواجہ عمران میں مقیم ہے۔ اس کے علاوہ پشین میں ارمی کاکوزئی، پیر علیزئی، جنگل پیر علیزئی، قلعہ عبداللہ، گلستان اور عنایت اللہ کاریز اس کے مسکن ومامن ہیں۔ بلکہ مرغہ چمن سے مادرانارین کی پہاڑیوں اور قندھار کے شمال تک پھیلا ہوا ہے اور جنوب مین شوراوک میں برپچ سے ملا ہوا ہے۔ کوئٹہ پشین کے علاقوں میں بادین زئی اسکام کان، ارمی، چنار اور توبہ کی وادی گوال میں رہائش پذیر ہیں۔ عشے زئی صحرا کے کچھ حصہ، سپشیں لون اور تنبیہ میں، حمید زئی تاشروبات اور ملحقہ وادیوں میں، نصرت زئی فراخی میں اور عثمان زئی درہ غواز کے قرب وجوار میں۔

لونی: لونی ضلع لورالائی کے تحصیل دکی میں ہیں۔ زیادہ تر لونی اور لاکھی حلقوں میں اور باقی بوری، موسیٰ خیل اور بارکھان تحصیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ قبیلہ کے اہم حصے درگ زئی پلاؤ اور رکھن دال ہیں۔ لونی میانی کی اولاد ہیں لہذا تحصیل موسیٰ خیل کے جعفروں کے اقارب ہیں۔ وہ اپنے آپ کو درانی کہلاتے ہیں کیونکہ میانی درانیوں کے اب وجد ترین کا بھائی تھا۔ بلوچوں کے قریب رہنے اور ان سے مسلسل تصادم کی وجہ سے لونیوں نے اپنے اجزائے ترکیبی کو بلوچوں کی مانند بڑے بڑے طائفوں میں منقسم کرنا شروع کر دیا۔ لہذا قبیلہ کے تین بڑے طائفے تھے۔ درگزئی، پلاؤ اور رکھن دال، پٹوزئی کاکڑ اور لونی کے ایک اور بھائی لتز کی اولاد لتھ غیر ملکی ہیں۔ ان کے علاوہ غورانی اور شودیانی بھی وصل ہیں جبکہ میر زئی درگزئی سید ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور لونیوں کے نزدیک محترم ہیں۔

مقامی بیانات کے مطابق لون درانی کی اولاد ہیں۔ وہ اصل میں گلہ بان تھے اور خراسان سے بغاؤ، رڑکن، کنگری وغیرہ میں ریوڑ چرانے آتے تھے اور گرمی کے موسم میں خراسان لوٹ جاتے تھے۔ لون کا سب سے بڑا بیٹا شمے تھا جس سے شمے زئی برآمد ہوئے اور سردار خیل ہیں۔ شمے کے بعد قبیلہ کے سردار بالترتیب ابا بکر، ہانگ اور حیدر ہوئے۔ غازی خان ابن حیدر کے وقت چند لونی رڑکن میں رہ گئے اور اس کے بیٹے اور جانشین محمد خان کے وقت خراسان کو واپسی بالکل بند ہو گئی۔ محمد خان نے کنگری میں کوٹ خان محمد کی بنیاد ڈالی۔ محمد خان کے سات بیٹے تھے جن میں سے دوست محمد ڈیرہ غازی خان ہجرت کر گیا اور پیر اگ خان نے رڑکن، راڑہ شم وغیرہ میں کاشت کاری شروع کی۔ دریائے لونی پر لونیوں کا موسیٰ خیل سے ہزار گٹ کے مقام پر ٹکراؤ ہوا اور ایک معرکے میں 400 لونی مارے گئے اور باقی چمالنگ او رنتھ کی چپ میں چلے گئے۔ پیر اگ خان کے دو بیٹے تھے جلال خان اور پائند خان۔ اول الذکر کی وفات پر پائند خان سردار بنا کیونکہ سمندر خان ابن جلال خان کمزور آدمی تھا۔ پائند خان نے 800 کا ایک لشکر جمع کیا اور کچھ مریوں پر حملہ کیا جو کھیتران کے ساتھ رہتے تھے۔ بابل خان کھیتران نے لوٹی ہوئی جائیداد کی بحال کا مطالبہ کیا لیکن لونی نہیں مانے۔ لڑائی شروع ہو گئی جس میں پہلے لونی کامیاب رہے لیکن کھیتران اور مریوں نے اتنی جمعیت کھڑی کی کہ لونیوں کو لاکھی کی طرف پسپا ہونا پڑا۔

پائند خان کے بعد سمندر خان سردار بنا اور 1893ء میں اس کی وفات کے بعد سردار نواب خان جسے 1900ء میں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ اس نے دیوانہ شہر (یا سمندر خان شہر) چھوڑ کر ڈھاکی میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ لاکھی میں اس کی زمینیں تاحیات مالیہ معاف ہیں اور اسے اور اس کے بھائی میر خان کو 1050 من اناج بطور سالانہ الاؤنس ملتا ہے جسے اپریل 1900ء میں نقد 2625 روپے میں بدل دیا گیا۔ لونیوں میں دوسرا اہم آدمی مکھو خان شمے زئی ہے۔ لونیوں نے املاک خرید خرید کر بڑھالی ہیں اور اب وہ لونی اور لاکھی حلقوں میں متعدد علاقوں کے مالک ہیں۔

اسوٹ: اسوٹ افغانوں کے غورغشت حصہ سے ہیں اور ان کا مشترکہ اب وجد اسوٹ پنی برادر کاکڑ کا ایک بتایا جاتا ہے۔ 1901ء میں لورالائی کی موسیٰ خیل تحصیل میں ان کی تعداد 1941 تھی، وہ نو طائفوں میں تقسیم ہیں۔ نوح زئی، محمد زئی، بلفرز، مورے زئی، عیسیٰ زئی، عمر زئی، غائب زئی، خضر زئی اور نیک نامی زئی۔ وہ پنجاب کی سرحد کے ساتھ ملحق تحصیل کے مشرق کے پہاڑی علاقہ میں آباد ہیں انہوں نے کبزئیوں کے خلاف موسیٰ خیل کی مدد کے معاوضے میں زور زبردستی زمینیں حاصل کیں۔ دو طائفے یعنی بلفرز اور نیک نام زئی ان کے خونی رشتہ دار نہیں بتائے جاتے لیکن وہ دکھ سکھ میں شریک ہیں۔ بلفرز کو مقامی طور پر غواطئی کہتے ہیں اور وہ سڑ بن

افغان میانی کی اولاد ہیں۔ جبکہ نیکنام زئی غالباً دادی ولی موسومہ بہ نیکنام کے اخلاف ہیں۔ چند بلفرز خاندان ہجرت کر کے دکی میں بس گئے ہیں۔ جہاں وہ گلفرض کہلاتے ہیں اور عمر زئی ترینوں سے منسلک ہیں۔

اسوٹ بنیادی طور پر خانہ بدوش تھے۔ یہ پرامن اور بے ضرر ہیں۔ یہ بلوچی انداز کے لباس پہنتے ہیں۔ مرد ہمیشہ سفید پوش اور عورتیں سیاہ پوش ہیں۔

زرکون: 1901ء کی مردم شماری میں مسٹر ہیوگز بلر نے لکھا: زرکون پنیوں سے رشتہ کا دعوی کرتے ہیں لیکن ان کا ماخذ مشکوک ہے۔ بلوچوں کی قربت اور ان کے حملوں کی مسلسل زد میں رہنے کی وجہ سے اغلب ہے کہ ان کے ہیولی نے بلوچوں کی تقلید کی اور بہت سے بیگانہ عناصر کو اپنے سے منسلک کر لیا۔ اس طرح چند نجک (نجو پنی ہیں) غنجی طائفہ میں موجود ہے اور ایک اور طائفہ کا نام شرون اس بات کا غماز ہے کہ اس کا ہیولی سڑبن افغان تھے۔ ایک افغان سڑبن کا تلفظ آسانی سے شرون کر سکتا ہے۔ یہ بارکھان اور تحصیل دکی میں ہیں۔ مردم شماری کے کاغذات کے مطابق ان کے دس حصے ہیں اور مضبوط ترین پیروزانی اور غنجی ہیں۔ تحصیل دکی کے زرکونوں کو کڑکنی (کوہلو کے زرکونوں سے ممیز کرنے کے لیے) کہا جاتا ہے اور یہ زیادہ تر تروار یزئی، ہوسری، پلوس خلیل چینا اور سناڑ میں پائے جاتے ہیں چند خاندانوں نے دکی اور حبیب قلعہ میں زمینیں بھی حاصل کر لی ہیں۔

جعفر: ماہرین انساب کے متعلق جعفر کا ہیولی کی اولاد ہے جو ترین شیرانی اور بڑیچ کا بھائی تھا۔ اب بھی میانی یا میانائی قندھار سے کوہاٹ تک بکھرا ہوا ایک بڑا قبیلہ ہے۔ لیکن جعفروں نے کئی غیر عناصر اپنے میں ضم کر لئے ہیں جیسا کہ ان کے طائفوں کا بلوچ لاحقہ آنی ظاہر کرتا ہے۔

ڈیرہ غازی خان کی سرحد کے قریب درگ، زارنی، سرادرگا، کرکنا، کیارہ، گبرگر گوگی، اور نتھ میں ان کی زمینیں ہیں۔ چند جعفر خاندان دکی تحصیل کے شادوزئی دیہات میں آباد ہیں جہاں وہ شکون کہلاتے ہیں لیکن وہ شادوزئیوں میں ضم ہو گئے ہیں۔ جعفر کمزور اور بے ضرر لوگ ہیں اور اپنے طاقتور ہمسایوں پر چوٹ نہیں لگا سکتے۔ وہ بزداروں سے محفوظ رہے ہیں کیونکہ درگاہ تونسہ شریف کے بانی مبانی (جن کے معتقدین میں با اثر بزداروں کی کثرت ہیں) جعفر الاصل تھے۔ مسٹر (سرفریڈ) فرائر ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خان نے 1876ء میں لکھا: جعفر محنتی اور خوش کردار ہونے کے ساتھ ساتھ بے روح اور غیر جنگجو لوگ ہیں۔ سابقہ ایام میں جعفر اپنی فراخ دلانہ مہمان نوازی کی وجہ سے مشہور تھے جس کی تعریف ایک مقامی کہاوت میں اس طرح کی گئی ہے کہ قیامت اس وقت آئے گی جب مہمان نوازی ترک کر دیں گے۔

استرانا: گزیٹر کے مطابق یہ دکی موسی خیل اور بارکھان تحصیل میں رہتے ہیں۔ آخر الذکر میں زیادہ تر خانہ بدوش ہیں۔ ان کے کئی حصے ہیں اور مسے زئی عددی لحاظ سے مضبوط ترین ہے۔ کوئی پانچ پشت پہلے جب شیر خان شادوزئی نے انمبار پر ایک گاؤں آباد کیا تو اس نے ژوب سے آنیوالے چند استرانوں کو اس میں آباد کیا اور حق ٹوپہ ادا کرنے کے بدلے ان کو خشک زمینیں دیں۔ بعد میں انہوں نے شہباز چینا، سدو چینا، ساور چینا، غازی چینا، پلوس خورد، پلیانی، حبیب قلعہ اور دکی میں بھی زمینیں اور پانی حاصل کر لئے۔ وہ پٹھانوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن سید ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ میسن کے مطابق وہ ایک سید محمد گسیو دراز کی اولاد ہیں جو شیرانی افغانوں میں آباد ہوا اور شیرانی عورت سے شادی کی۔ وہ نفیس بہادر، مضبوط، سخت جان، خوش اطوار، امن پسند اور اچھے شمشیر باز بھی ہیں اور کاشتکار بھی۔ استرانا دکی تحصیل کے بہترین کاشت کاروں میں شامل ہیں۔ مسے زئی اور ڈبزئی کپڑے اور جوتے کی تجارت کرتے تھے اور عمر خیل سندھ سے مویشی درآمد کرتے تھے۔

زمرے: زمرے (جنہیں ان کے بلوچ ہمسائے مزری کہتے ہیں) میانی کی اولاد ہیں۔ لہذا لونیوں اور جعفروں سے رشتہ رکھتے ہیں۔ چند مزریوں کے نام سبی کے پنیوں میں بھی پائے جاتے ہیں ان کی ایک عجیب وغریب روایت کے مطابق ان کی مورث اعلی نے ایک دفعہ عارضی طور پر زمرے (پشتو میں شیر ببر) کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لہذا ان کا نام پڑ گیا۔ وہ ایک محدود قبیلہ ہیں لیکن بہادری میں مشہور ہیں۔ وہ استرانوں کی طرح طاقتور نہیں جن کے ساتھ ان کی لڑائیاں ہوئیں۔ یہ زیادہ تر موسی خیل میں ہیں۔ ان کے دو حصے ہیں۔ اسماعیل خیل اور محمد خیل۔ رمک، رغزی اور گزی زمرے میں ان کی زمینیں ہیں۔

غلزئی: ان کے طائفوں کی تفصیل درج ذیل ہیں: ناصر، خروٹ، ملاخیل، ترک، سلیمان خیل، شنوار، ہوتک، انڈر اور توخی۔ غلزئی ایک مقامی قبیلہ نہیں ہیں لیکن ان میں سے چند ضلع میں مستقلاً آباد ہو گئے ہیں اور جائیداد غیر منقولہ حاصل کر لی ہے۔ ان میں افغان مہاجر بھی شامل ہیں۔ ناصر آباد کاربوری، تحصیل میں کیچ سردار، چیلی اور ڈبری اور سنجاوی تحصیل میں تورواام اور ژڑ قلعہ کے مقامات پر بھی ملتے ہیں۔ 1896ء میں خادم خروٹ نے بنہار زمین شمے زئی لونیوں سے ایک ہزار روپے کی عوض خرید لی۔ کچھ دیگر تلاؤ دامان، بیزاور، سعادت شہر دکی میں بھی آباد ہیں۔ بقایا غلزئی خانہ بدوش ہیں جو وقتاً فوقتاً ضلع میں ریوڑ چرانے اور حمل ونقل کا کاروبار کرنے کیلئے

آتے ہیں یا مزدوروں اور کاریزکنوں کی حیثیت سے سردی میں آتے ہیں اور بہار میں افغانی پہاڑوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ ملاخیل، شنوار، خروٹ اور گلہ بان ناصر نومبر میں مراتنگی تورغیزی کوہار اور پنجن کے راستے بوری تحصیل میں آتے تھے۔ ان میں سے کچھ موسی خیل میں کنگری اور کھجوری چلے جاتے اور کچھ دکی، یہاں وہ ریوڑ چراتے اور اون، گھی اور خشک میوہ کا کاروبار کرتے اور مارچ میں خراسان کو واپس چلے جاتے۔ کچھ خروٹ جو تورغیزی میں رہتے ہیں۔ ایندھن بیچتے۔ کمال خیل، یاخیل، مسے زئی، ملے زئی، سلاکزئی، بوری خیل، سورنسا، اور بنوخیل اپریل میں ڈیرہ غازی خان کے دامان سے واپس آتے یاخیل اور بوری خیل تحصیل پشین کو چلے جاتے۔ ملے زئی اور سلاکزئی لورالائی میں ایندھن اور دودھ بیچتے ہیں جبکہ دوسرے وادی بوری میں شرن علیزئی سفری، شاہ کاریز، ماہوال کٹوئی اور ڈبری کے مقامات پر خیمے لگاتے۔ اون کی تجارت کرتے، اور لورالائی، فورٹ سنڈیمن، قلعہ سیف اللہ، ہرنائی، دکی، بارکھان اور سبین تنگی کے درمیان رسل ورسائل کے کاروبار میں حصہ لیتے۔ وہ چوبی طشتریاں، کاسے اور سستے جستی زیورات بھی تھوک پر بیچتے، جو وہ ڈیرہ غازی خان سے لاتے اور اون اور انار باہر بھیجتے ہیں ان قبائل میں اب بھی یہ سلسلہ پایا جاتا ہے اگرچہ اکثریت مستقل ہو چکی ہیں۔

غلزئی خانہ بدوش ضلع میں خیمہ گزینی کے دوران عموماً علیحدہ بستیوں (کری) میں رہتے۔ لیکن کبھی کبھار مقامی افغانوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی پیدا کرتے۔ جس کی وجہ سے انہیں اب مقامی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

خروٹ: خروٹوں کے کندخیل اور بارے زئی حصوں کے غریب تر لوگ سانگ غر اور سلیزا میں ہی رہ جاتے ہیں اور ایندھن بیچ کر گزارہ کرتے ہیں جبکہ شتربان گومل کے راستے آتے ہیں اور براستہ غوائے لیاء دامان کو چلے جاتے ہیں۔ لیکن آجکل خروٹ مستقل طور پر بلوچستان میں بس چکے ہیں اور کوئٹہ میں ایک وسیع علاقہ خروٹ آباد کہلاتا ہے۔

ناصر: ناصر پوندے جو وقتاً فوقتاً آتے تھے مندرجہ ذیل طائفوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱) کمال خیل، ۲) ملے زئی، ۳) پانڈی خیل، ۴) ترک خیل، ۵) یاخیل، ۶) نیامت خیل، ۷) بہار خیل، ۸) زنگی خیل، ۹) تلاک خیل، ۱۰) بنوخیل، ۱۱) اش خیل، ۱۲) جلال خیل اور مسے زئی۔ ان میں سے پہلے چھ ماہ دسمبر تا مارچ اضلاع ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے دامان میں رہتے تھے۔ اور اپریل تا نومبر بلوچستان کی تحصیلات دکی، بوری اور قلعہ سیف اللہ میں۔ کمال خیل اور ملے زئی ژوب، لورالائی، شاہرگ اور کوہلو سے اون خریدتے ہیں اور کراچی بھیجتے ہیں۔ ان کے اور بہار خیل کے کچھ افراد کاکڑ خراسان سے اون خریدتے تھے اور تحصیل پشین میں واقع یارو کاریز ریلوے اسٹیشن سے بذریعہ ریل کراچی روانہ کرتے تھے۔ بڑے سوداگر اون کٹائی سے پہلے ہی گلہ بانوں کو بیانے دے دیتے تھے جبکہ دیگر اپنے دلالوں کے ذریعے خریداری کرتے ہیں۔ دامان سے واپس آتے ہوئے ان تمام حصوں کے افراد کاسے، تل، سلک، سوئیاں، دھاگہ، انگوٹھیاں، منکے، اور کانچ کی چوڑیاں لاتے ہیں اور ژوب اور بوری کے دیہاتوں کے پاس بیج دیتے ملے زئی، زنگی خیل، تلاک خیل اور بنوخیل ناصر بھیڑوں کے ریوڑوں کے مالک ہیں۔ جبکہ اش خیل، جلال خیل، نیامت خیل، مسے زئی، اور بہادر خیل زیادہ تر شتربان ہیں۔ موخرالذکر طائفے بادام کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور کوساکا، کندیل، اور گومل کے راستے اکتوبر میں ڈیرہ جات کو جاتے ہیں اور اپریل میں اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ آج کل بھی ایسا ہے لیکن بہت کم اور یہ قبیلہ لورالائی، ژوب کوئٹہ کے علاوہ تقریباً اکثر پشتون علاقوں میں مستقل طور پر بس چکے ہیں۔

کھیتران: 1901ء کی مردم شماری رپورٹ میں آر. ہیوگز بلر نے کھیتران کے متعلق مندرجہ ذیل دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ کھیتران کو بعض لوگ افغانوں کے قبیلہ کانسی کی شاخ بتاتے ہیں گویا خیرالدین عرف خرشبون ابن سڑبن (جو افغانوں کے مورث اعلیٰ قیس عبدالرشید کے تین بیٹوں میں سے ایک تھا) کی اولاد ہیں۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو کھیتران کوئٹہ کے کانسیوں سے متعلق ہیں۔ دیگر انہیں بلوچ بتاتے ہیں اور 1901ء کی مردم شماری کے دستاویزات میں انہیں بلوچ ہی گردانا گیا۔ لیکن ان کا علاقہ دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں افغانوں یا بلوچوں سے علیحدہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بناء پر امپیریل جدول نمبر تیرہ میں جگہ دی جائے۔

ماخذ: کھیتران مخلوط النسل لوگ ہیں اور افغان و بلوچ کے علاوہ میدانہائے پنجاب کے جاٹ عناصر پر بھی محیط ہیں۔ ان کے تین بڑے طائفے ہیں۔ دھارا، اسپانی، اور پھلیات۔ آخری دونوں کو مقامی طور پر گنجورا کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبیلے کی ان تین حصوں میں تقسیم فوجی مہمات اور مال غنیمت اور بدرقی (علاقے سے گزرنے والے سامان پر ٹیکس یا حفاظتانہ) کی بٹائی میں آسانی کے لیے کی گئی ہے۔ اسی قسم کی مفید مطلب تقسیم بلوچ اور براہوئی قبائل نے بھی اختیار کی ہے۔ دھارا کئی حصوں میں منقسم ہیں اور بڑے بڑے حصے پچ اور حسنی ہیں۔ اسپانی طائفہ میں مزرانی اور ناہر قابل ذکر ہیں جبکہ پھلیات (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) کئی پاروں کا مجموعہ ہے اور اس کی تشکیل دھارا اور اسپانی غیر مشمولہ گروہوں سے ہوئی۔

چاچا: کھیتران کے ہیولی میں پچ شامل ہیں اور یہ وہووا (پنجاب) سے آیا۔ کہا

جاتا ہے کہ ان نوواردوں نے لٹھ افغانوں کو نکال باہر کیا اور ان میں سے چند اب ہمسایہ قبیلہ لونی میں پائے جاتے ہیں۔ یہ کہ چچ کسی وقت ایک زبردست قبیلہ تھا۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب میسرز سٹیل اور کراؤتھر 15-1614ء میں اجمیر سے اصفہان جاتے ہوئے درہ سن غر کے راستے بلوچستان سے گزر رہے تھے تو ان کے کاروان کو پنجاب میں لکہ کے مقام پر دس روز کے لئے ٹھہرنا پڑا تا کہ وہ چنزا پہنچنے کے لیے ایک محافظ دستہ حاصل کر سکیں۔ بعد میں چچ کے ساتھ مزرانی بھی شامل ہو گئے۔ موخرالذکر افغان ماخذ کا دعوی کرتے ہیں لیکن ان کے نام کا لاحقہ بلوچ ماخذ کا غماز ہے۔ اسی نام کا ایک طائفہ مریوں میں ہے لیکن یہ کہنا ناممکن ہے کہ آیا مری مزرانی کھیتران سے برآمد ہوئے یا کھیتر ان مزرانی مریوں سے کھیتران سردار اور اس کا خاندان مزرانی گروہ سے ہے مزرانی اور چچ کی باہمی چقلپش میں مزرانی جیت گئے اور انگریزی دور سے پہلے مزرانی اسی فوقیت کی بناء پر دوتہائی یغما کے مالک ہوتے تھے جبکہ چچ ایک تہائی کے۔ بعد میں حسنی بھی چچ اور مزرانی سے آملے جو ایک طاقتور قبیلہ تھے اور موجودہ مری علاقے کے مشرقی حصہ پر قابض تھے لیکن مریوں نے انہیں نکال باہر کیا۔ حسنی غالباً بلوچ نسل کے ہیں لیکن ان میں سلاچ بھی گڈمڈ ہیں جو میانی طائفہ کے سڑ بن افغان ہیں اور جعفروں اور لونیوں سے متعلق ہیں۔ حسینوں کی آمد پر چچ کا حصہ یغما چچ اور حسینوں میں نصفانصف بانٹ دیا گیا۔

اسپانی: اہرا اسپانی طائفہ میں شامل ہیں اور ناغر افغانوں کے باقیات ہیں۔ ذانی ابن غورغشت کے چار بیٹوں میں سے ایک تھا اور اس طرح کاکڑ کا بھائی تھا۔ ناغر مشرق اور جنوب کی طرف وادی سندھ میں پھیل گئے اور دور اکبری میں سلطان محمد بھکری نے ست پور میں ناغروں کے خان کے خلاف فوج کشی کی۔ ست پور صوبہ ملتان کے ضلع بیرون پنجند کی سترہ محالات میں سے ایک تھا۔ آئین اکبری میں یہ بھی مذکور ہے کہ ضلع کے باشندے افغان تھے۔ اس وقت سے ناغر جنوب اور مغرب سے آنیوالے نوداروں کے سامنے پسپا ہوتے گئے اور بلوچستانی پہاڑوں میں اب رہنے والے ناہروں کا ناغر ماخذ کافی حد تک یقینی ہے۔ اسپانی کا ایک اور حصہ قاسمانی ہے جس کا ہیولی بگٹی بلوچوں کا ایک گروہ بتایا جاتا ہے۔

پھلیات: اس طائفہ میں روڑ جاٹ ہیں جو کافی تعداد میں پنجاب اور میدان کچھی میں موجود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مزید تحقیقات دیگر بہت سے طائفوں اور حصوں کے بیرونی ماخذ پر منتج ہونگی۔ مسٹر ہیوگز بلر اپنی تحریر کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے۔ کھیتران کی تشکیل بیان کرنے میں میرا اہم مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ انہیں بلوچ یا افغان نہیں کہا جا سکتا اور عین اغلب ہے کہ ان کا ہیولی بلوچ یا افغان نہ تھا بلکہ جاٹ نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے گرد و پیش کے اکثر قبائل کی طرح کھیتران بھی مختلف ماخذ کے متفرق گروہوں پر مشتمل ہیں جو خونی رشتہ کی بجائے مشترکہ دکھ سکھ اور علاقہ سکونت کی وجہ سے باہمی طور پر مربوط مضبوط ہیں۔ مذکورہ کوائف کی تشریح میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مزید تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ کھیتران مختلف گروہوں کا ملغوبہ ہیں اور یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ان کا ہیولی ایک ہندو جاٹ خاندان تھا اور عسکری مقاصد کے تحت ان کی تین ڈھاکوں یا طائفوں میں تقسیم محمد خان نے کی اور ہر طائفہ میں متعدد گروہ شامل تھے۔ یعنی اسپانی میں آٹھ اور دھڑا پھلیات میں چھ چھ ہیں۔

مقامی روایات کے مطابق وادی میں کھیتر انوں کے ورود کے ابتدائی ایام میں لٹھ افغانوں نے انہیں بہت تنگ کیا۔ ایک دن لٹھوں نے عمر شیخ (عمریانی شیخ کا مورث اعلی) کے ایک چرواہے کو زدوکوب کیا جس پر شیخ نے بددعا دی اور لٹھ کلیتاً لونی علاقہ میں سنگوری منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد کھیتر انوں نے یہ علاقہ آپس میں تقسیم کر لیا۔ شیخ نے حلقہ بغاؤ میں دس جوڑے زمین قبا میں منتخب کر لی اور دیگر کھیتر انوں (گنجورا) نے اس کی اولاد کو اپنی پیداوار کا 1/60 دینا منظور کر لیا۔ یہ عمریانی اب پھلیات کے اسپانی گروہ میں شامل ہیں۔

ایک اور شیخ طویا (طحہٰ) عمر کا ساتھی تھا اور حسینوں کے سوا پھلیات نے اس کی اولاد کو 1/60 دینا منظور کر لیا اور اب وہ طویانی کہلاتے ہیں۔ ان کے چند خاندان ونچی سپین ترین کے ساتھ رہتے ہیں اور تہانڑی کہلاتے ہیں۔ لٹھ کے کچھ باقیات موسومہ بہ برتھیانی بزانی پھلیات میں شامل ہیں اور فاضل خان گاؤں میں رہتے ہیں۔ مٹھ بھی لٹھوں کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔ دیگر بیگانے گروہ قاسمانی (قاسو کی اولاد جو ایک راہبچہ بگٹی تھا) جہاندون ناہر (مسمی بکے کی اولاد، مبینہ طور پر سنزرخیل کاکڑ) پھڈل (ترین افغان) لہمہ کھیتران جو ملاؤں کا طبقہ ہے بوری، کے ماہوزئی سنزرخیل، اسحانی، عرب خیل، کبزئی (موسی خیل سے بارکھان آنے والے اولیاء کی اولاد) اور دامانیوں میں کشیلا ہیں جو کچھی کے جاٹ ہیں۔

مختصر تاریخ اور سردار خیل: علاقہ کھیتران سیوستان اور ٹھٹھہ کے صوبہ ہند کا ضلع تھا۔ دور اکبری میں اسے جنجاہ کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ڈیوک کے مطابق یہاں ہندو جاٹ آباد تھے۔ جو محمد خان کے تحت وہوما سے آنے والے ایک چھوٹے سے پٹھان قبیلہ میں ضم ہو گئے۔ جس نے اپنے آپ کو کھیتران یا کاشت کار نام دیا تھا۔ بارکھان کھیتر انوں کی طویل وادی کے بالائی حصہ کا نام ہے اور یہ اس وقت پنیوں کے باروزئی خاندان کے

بلوچ لوک موسیقار

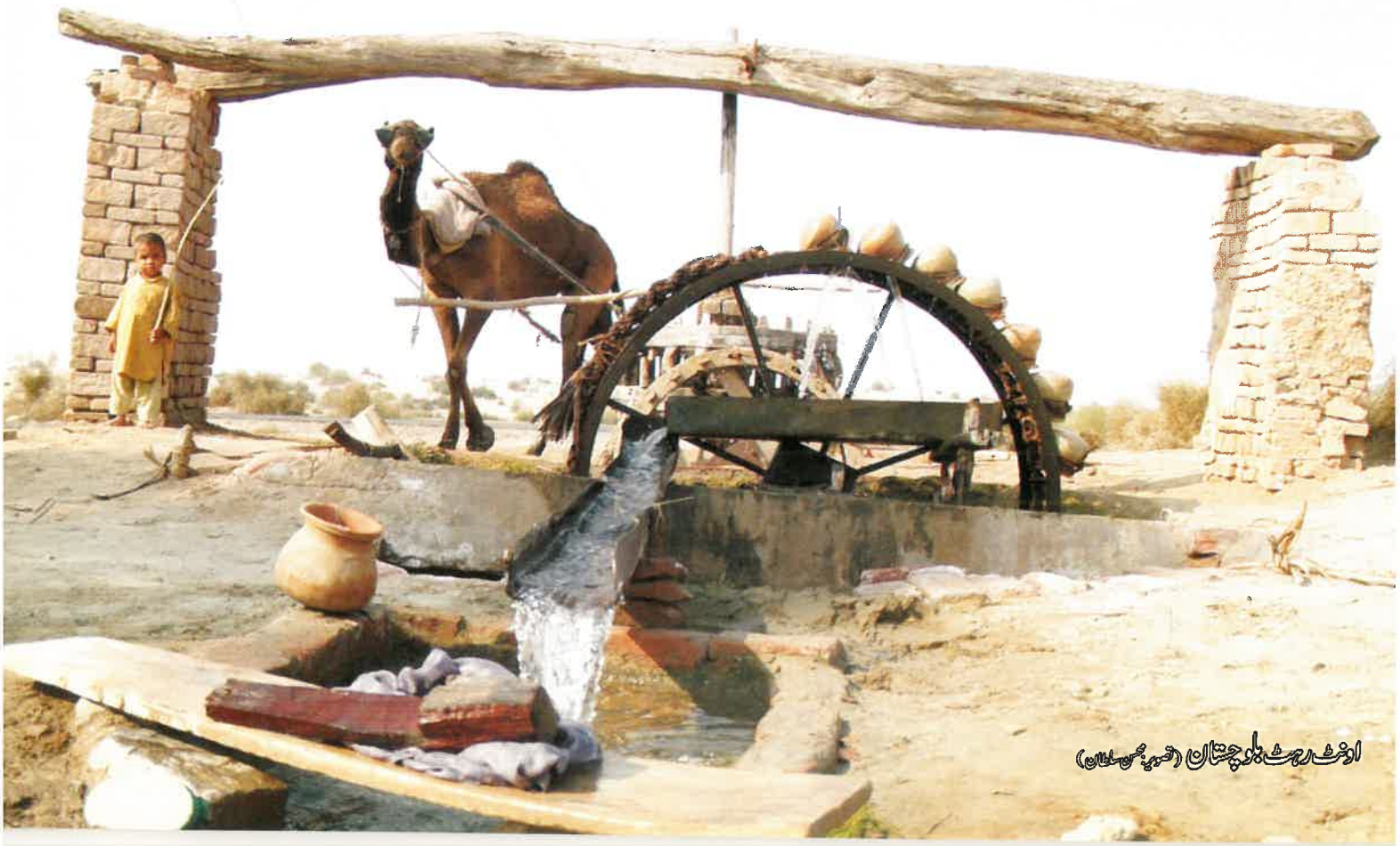

اونٹ ریہٹ بلوچستان (تصویر محسن سلطان)

ہے۔ بلکہ یہ ایک قابل فخر بات بھی ہے۔ اس فخریہ پیغام کو دوسروں تک پہنچانا لازمی ہوتا ہے۔ اور یہ پیغام دوسروں تک مختلف طریقوں سے پہنچایا جاتا ہے۔

لڑکے کی پیدائش پر ایک عمر رسیدہ یا پختہ سال خاتون بلند آواز میں پکارتی ہے۔

''سنو! سننے والو۔ ایک خوش خبری سنو

خدا کی دین اور مُردوں کی دعا سے فلاں کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے''

پیدائش سے قبل: بچے کی پیدائش کے موقع پر بعض دیہی علاقوں میں اب بھی یہ رسم ہے کہ وہ زچہ کے پیٹ پر نیل کے ساتھ سیواستی کا نشان ضرور بناتے ہیں۔ بعض علاقوں میں یہ نشان زچہ کے کمرے کی دیواروں اور دروازوں پر بھی بنایا جاتا ہے۔ غالباً یہ نشان خوش قسمتی اور نیک شگون کے طور پر لگایا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک عام تصور ہے کہ اس نشان سے بدروحیں اور بیماریاں زچہ و بچہ سے دور رہتی ہیں۔ بچے کی پیشانی پر سبز مہرہ لٹکایا جاتا ہے۔ تاکہ اسے کسی کی نظر بد نہ لگے زچہ کے پاؤں پر سبز دھاگہ باندھ دیا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ ایک پیسے کا سکہ بھی باندھا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح زچہ و بچہ کی کمر میں بھی زبد دھاگہ باندھ دیا جاتا ہے۔ بچے کے گلے میں دھاگے سے ادرک کا ٹکڑا باندھ کر لٹکایا جاتا ہے۔ اور بچہ کو مختلف بیماریوں اور بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے کئے جاتے ہیں۔

زچگی کی پابندیاں: زچہ کو چالیس دن تک کمرے میں اکیلا نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ہر وقت کمرے میں ہر بل کی دھونی دی جاتی ہے۔ چالیس روز تک زچہ کو اس خیال سے اکیلا نہیں چھوڑا جاتا کہ زچہ کی زندگی چالیس دن تک خطرے میں رہتی ہے۔ اگر زچہ ان دنوں کبھی اکیلی کمرے میں رہ جائے تو اس پر بدروح کے حملہ کرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ جس سے زچہ و بچہ دونوں یا ان میں سے کسی ایک کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

زچہ دسویں دن پہلا غسل کرتی ہے۔ اور دوسرا غسل چالیسویں دن کرتی ہے۔ چالیس دن گزرنے اور غسل کرنے کے بعد زچہ کمرے سے باہر نکل سکتی ہے۔ اس سے پہلے زچہ کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی اور نہ ہی کسی ایسی خاتون کو جو پیدائش کے وقت وہاں موجود نہ تھی اس کے پاس آنے دیا جاتا ہے۔ ایسی عورتیں جن کے بارے میں یہ شک ہو کہ وہ ''ناپاک'' ہیں یعنی ان پر کسی بدروح کا اثر ہے۔ انہیں کمرے میں آنے نہیں دیا جاتا بلکہ ان کی آواز تک کو زچہ و بچہ تک پہنچنے نہیں دیا جاتا ایسی عورتوں کو مکان کے دروازے سے ہی لوٹا دیا جاتا ہے۔ چونکہ محلے اور گاؤں کی خواتین کو اس رسم کا علم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ خود بھی ایسے گھروں میں نہیں جاتیں۔ دیہی معاشرے میں جہاں قربتوں کے رشتے ابھی تک اسی طرح مضبوط ہیں جہاں لوگ نہ صرف ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں بلکہ گھروں کی معمولی باتوں کا بھی ایک دوسرے کو علم ہوتا ہے۔ اور جہاں معمولی بات بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ بچے کی پیدائش سے بھلا کون بے خبر رہ سکتا ہے۔ بات بڑی بوڑھیوں سے ہو کر جوانوں تک پہنچ چکی ہوتی ہے۔ سب پہلے ہی سے خوشخبری کے لئے گوش برآواز ہوتے ہیں۔ اور پیدائش کی گھڑی قریب آنے پر تمام قریبی عزیز و اقارب اور دوستوں کو باخبر رکھا جاتا ہے۔ قریبی بوڑھی خواتین کو اس موقع پر گھر آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ تاکہ یوں نہ ہو کہ بعد میں وہ نہ صرف گلہ کریں بلکہ اس موقع پر موجود نہ ہونے پر ناراض ہوں۔ ویسے خواتین کو چالیس دن تک زچہ و بچہ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اب جس معاشرے کا یہ عالم ہو ایسے معاشرے میں بھلا لڑکے کی پیدائش کی خوش خبری کیسے پوشیدہ رہ سکتی ہے۔ ذرا سی دیر میں تمام گاؤں میں آناً فاناً بات پھیل جاتی ہے۔ کہ خدا نے فلاں کو اولاد نرینہ سے نوازا ہے۔ فلاں بن فلاں فلاں ابن فلاں کے گھر لڑکا تولد ہوا ہے۔

بندوق کا فائر: لڑکے کی پیدائش کے موقع پر نعرہ لگانے کا رواج اب روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس کا اعلان اب بندوقوں سے فائر کر کے کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں سب سے پہلے نعرہ لگانے والی عورت کو تحفوں سے نوازا جاتا تھا۔ لیکن بندوق ایجاد ہونے کے بعد اس رسم کی ادائیگی خواتین سے ہٹ کر مردوں کے حصے میں آچکی ہے۔ اب بچے کا کوئی قریبی عزیز لڑکے کی پیدائش کی خبر سنتے ہی بندوقوں سے ہوائی فائر کرتا ہے۔ فائر کرتے وقت یہ خیال ضرور رکھا جاتا ہے کہ طاق فائر کئے جائیں۔ ایسے فائر عموماً تین پانچ یا سات ہوتے ہیں فائر کرنے والے کو بھی تحفے دیئے جاتے ہیں اور ایک ریشمی رومال جس میں مٹھائی یا کوئی اور شیرینی ہوتی ہے۔ بندوق سے باندھ دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے نعرہ لگانے والے یا بندوق سے ائر کرنے والے کو خالی ہاتھ جانے دینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ایسے موقعوں پر زیادہ سے زیادہ تحائف دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بانجھ خواتین کو کسی طور بھی چالیسویں تک زچہ و بچہ کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہوتی کہتے ہیں کہ اگر وہ عورتیں اس بچہ پر اپنی جھولی جھاڑ دے تو وہ بچہ مرجائے گا۔ جبکہ وہ بانجھ عورت حاملہ ہوگی۔

نشرح: لڑکے کی پیدائش کی تیسرے دن ''نشرح'' کی تقریب منعقد ہوتی ہے۔ اس موقع پر لڑکے کے قریبی رشتہ داروں کے علاوہ گاؤں کے بزرگ مرد اور خواتین کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔ گاؤں کی مسجد کا مولوی اپنے زیر تعلیم طلباء کو لے کر آتا ہے۔ بچے کے کان میں بلند آواز سے اذان دی جاتی ہے۔ بچے کا نام رکھا جاتا ہے۔

اذان کے بعد مولوی فارسی زبان میں شیخ سعدی کی لکھی ہوئی مناجات پڑھتا ہے۔ اب پشتو میں بھی نشرح لکھے گئے ہیں۔ نشرح پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مولوی زور زور سے مناجات کے تین مصرعے پڑھتا ہے۔ جس کے بعد بچے زور سے "سبحان من یرانی" دہراتے ہیں۔ مناجات کے چند مصرعے نمونے کے طور پر دیئے جاتے ہیں۔

موسیٰ کہ زد عصارا
بر سنگ سخت خارا
میخواند ایں دعا را
سبحان من یرانی

اس کے پڑھنے کا ایک اور طریقہ یہ بھی ہے۔ کہ مولوی مصرعے خود آواز سے پڑھتا ہے اور جوں ہی وہ سبحان من یرانی دہراتا ہے تو تمام بچے "اللہ امین" کا نعرہ بلند کرتے ہیں جو گاؤں بھر میں سنائی دیتا ہے۔ نشرح کے ختم ہونے پر مولوی بچے کے باپ یا دادا سے بچے کا نام پوچھتا ہے۔ جس کے بعد بچے کی تندرستی اور درازی عمر اور نیک و صالح ہونے کی دعا مانگی جاتی ہے۔ اس دوران مٹھائیوں سے بھرے ہوئے تھال لائے جاتے ہیں جس کی تقسیم بچے کے والدین کی مالی حیثیت کے مطابق کی جاتی ہے۔ متمول افراد ایسے موقعوں پر حاضرین میں مٹھائیوں کے ساتھ ریشمی رومال اور قند بھی تقسیم کرتے ہیں مولوی اور طالبوں کو شیرینی کے ساتھ نقد پیسے بھی دیئے جاتے ہیں۔ جس کے بعد سب لڑکے نومولود کے عزیز و اقارب کو مبارکباد دیتے ہیں۔

نام رکھنا: لڑکے کا نام رکھنے کی مٹھائی اپنوں اور ہمسایوں کے گھروں میں بھی تقسیم کی جاتی ہے۔ جس برتن میں یہ مٹھائی گھروں میں بھیجی جاتی ہے۔ اسے خالی نہیں لوٹایا جاتا بلکہ ایسے برتن میں حسب توفیق کوئی چیز یا رقم ڈال کر واپس کیا جاتا ہے۔ اگر اس وقت کوئی چیز گھر میں موجود نہ ہو تو خالی برتن رکھ لیا جاتا ہے۔ اور بعد میں اس میں کوئی چیز ڈال کر لوٹایا جاتا ہے۔ غریب اور نادار افراد برتن میں سبز پتے ڈال کر اسے واپس کرتے ہیں۔

نام: نام کی اہمیت اور حیثیت اقوام و قبائل میں مسلم ہے دوسرے دیگر ثقافتی اور تاریخی حوالوں کے علاوہ نام بھی ثقافتی حوالے سے کسی قبیلے یا قوم کی پہچان بن جاتے ہیں، بلوچستان میں پشتون ایک تو مذہبی حوالے سے نام رکھتے ہیں، جن میں مقدس ہستیوں اور مقامات کی مناسبت کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے، لیکن "خان" اور کسی حد تک "جان" ایسے نام ہیں جو زیادہ تر ناموں کے لاحقے کہیں کہیں سابقے بھی ہوتے ہیں۔ مذہبی تعلق کے ناموں میں: محمد خان، محمد گل، علی خان، عبداللہ، عبدالعلی، محمد عیسی، موسی خان وغیرہ شامل ہوتے ہیں لیکن دیگر اسباب و اشیاء زندگی کے علاوہ حیوانات کے ناموں سے بھی متعلق نام ہوتے ہیں مثلاً بہادری کیلئے شیر وغیرہ کے ناموں سے استفادہ کرنا، جیسے شیر خان، زمرے (شیر)، پڑانگ (چیتا) وغیرہ اسی طرح شہروں اور قبیلوں کے نام سے منسوب نام بھی ملتے ہیں جیسے، ملتان خان، یا خواتین میں کراچئی، پنجابئ... اسی طرح خواتین کے ناموں میں عام طور پر، گل بی بی، گل غوٹی، شایستہ، پلوشہ، سپوژمئی، ملالئ، پشتنہ، جیسے خالصتاً پشتو نام ملتے ہیں، ان کے علاوہ اسلامی حوالے سے فاطمہ، عائشہ، زینب، سکینہ، مریم وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کی مناسبت سے بھی خواتین کے نام رکھے جاتے ہیں۔ جیسے ھوسی (ہرنی)، زرکہ (چکور)، کوترہ (کبوتر) وغیرہ، جبکہ پھولوں کے حوالے سے مرد و زن میں بہت زیادہ نام رائج ہیں، بالخصوص لفظ "گل" یا "گلہ" کا استعمال کو مرد عورت دونوں کے ناموں سے لاحقہ یا سابقہ کے طور پر عموماً نظر آتا ہے جیسے، شین گل (سبز پھول)، سرگل (سرخ پھول)، بادام گل، خان گل، گل محمد، انار گل یا بی بی گلہ، شائستہ گلہ، گل پانہ (پھول کی پتی)، خاٹول (لالہ)، غوٹئی (کلی) وغیرہ۔ مردوں میں حشرات کے ناموں کا استعمال بھی ملتا ہے غنڈک (زہریلی مکڑی) لڑم (بچھو) وغیرہ۔

اسی طرح جدید دور کے اثرات کے مطابق نئے ناموں کا رجحان بھی عام ہو گیا ہے۔ جیسے سلیم، ندیم، اشرف، محمود، حامد، ساجد، تنویر یا سلمی، زرینہ، میمونہ، ماریہ وغیرہ۔

یہاں پشتون قبائل میں مروجہ کچھ ناموں کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں جیسے مردوں میں: بنگل خان، چارگل، (نت) زرک، شیرک، میرک، شریف، حنیف، رازق، رزاق، صمد، طیب، عجب، طالب، صالح، سخی، کبیر، صغیر، منیر، نظیر، جانان، باچا (بادشاہ) رؤف، رحیم، کریم، خلیل وغیرہ۔

خواتین میں گل سانگہ (شاخ گل) زرسانگہ (سونے کی ڈالی) صالحہ، سائرہ، سعیدہ، خالدہ، صدیقہ، معصومہ، مرجانہ، نورجانہ، سعدیہ وغیرہ۔

دانت نکلنے کی تقریب: لڑکے کے پہلے دانت کے نمایاں ہوتے ہی، ماں بچے کے دانت نکلنے کی خوشی میں "کوچہ" پکانے کی تقریب کرتی ہے۔ "کوچہ" پشتون قبائل میں ایک قسم کی خوراک ہے جو گندم اور دیگر دالوں کو ملا کر پکائی جاتی ہے اس میں اجوائن، ہلدی اور کالی مرچ بھی ڈالی جاتی ہے ان تمام چیزوں کو ملا کر پکانے کے بعد اس میں "کروت" کو بھی برتن میں ہاتھ سے رگڑ رگڑ کر اس کا لیس دار مائع بنا کر اس میں شامل کیا جاتا ہے۔ کروت کی تیاری بھی اپنی جگہ ایک محفل ہوتی ہے۔ گاؤں کی نوجوان لڑکیاں اس کی تیاری کے لیے جمع ہوتی ہیں۔ مٹی کے تھال میں کروت ڈال کر اس پر گرم پانی ڈالا جاتا ہے اور پھر ہاتھ کی ہتھیلیوں کے نیچے "کروت" کی ڈلیوں کو رکھ کر برتن

کے پیندے پر رگڑا جاتا ہے۔اس طرح ضرورت کے مطابق " کروت "تیار کی جاتی ہے۔" کوچہ "کے تیار ہونے پر موجود خواتین تو وہیں کھالیتی ہیں باقی گھروں میں تقسیم کردیا جاتا ہے واپسی پر برتن خالی نہیں لوٹایا جاتا بلکہ اس میں کچھ ضرور ڈالا جاتا ہے جس میں تازہ پھل یا خشک میوہ (موسم کے مطابق) شامل ہوتے ہیں اگر گھر میں اس وقت کچھ نہ ہو تو برتن میں نمک یا پانی ڈالا جاتا ہے۔مطلب یہ کہ برتن خالی نہ لوٹایا جائے۔ کیونکہ خالی برتن لوٹانا پشتونوں میں معیوب اور منحوس سمجھا جاتا ہے۔

اس موقع پر گندم کے تین دانے دھاگے میں پروئے جاتے ہیں اور ان سے تین ہار تیار کر کے ان میں ایک پھندنا بھی لگا دیا جاتا ہے اور لڑکے کے دامن کے ساتھ سوئی سے مضبوطی سے ٹانک دیا جاتا ہے۔" کوچہ " کرنے کی تقریب ایک طرح کی خیرات ہے اور اس کا مقصد جہاں لڑکے کو نظر بد سے بچانا ہے وہاں اس کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ بچے کے باقی دانت بھی اس طرح آسانی سے نکل آئیں۔

کان چھدوانا: ژوب اور لورالائی کے علاقوں میں بچوں کے کان چھیدنے کا رواج بھی ہے۔کان میں سونے یا چاندی کی بالی ڈالی جاتی ہے۔ جب لڑکا سات سال کا ہو جاتا ہے تو اس بالی کو فروخت کر کے اس کے پیسوں سے ایسی چیز لی جاتی ہے جو غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کی جاسکے۔

کچکول: اگر کسی کا بیٹا زندہ نہ بچتا ہو تو وہ نو پیدا لڑکے کے لیے چاندی کا چھوٹا سا کشکول (پشتو میں کچکول) بناتے ہیں۔ جب لڑکا سات سال کا ہو جاتا ہے تو اسے یہ کشکول پہنا کر سات گھروں پر بھیک مانگنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ بھیک میں اسے جو کچھ ملتا ہے لڑکے کی ماں اسے پکا کر خیرات کر دیتی ہے۔ عام عقدہ یہ ہے کہ کہ ایسا کرنے سے لڑکا بچ جاتا ہے۔بعض لوگ لوہے کا کڑا بنا کر لڑکے کو پہناتے ہیں لڑکا یہ کڑا سات سال کی عمر تک پہنے رکھتا ہے سات سال تک اس لڑکے کو سفید رنگ کے کپڑے نہیں پہنائے جاتے۔ سات سال مکمل ہونے پر کوئی قریبی رشتہ دار لڑکے کے لیے نئے کپڑے سلوا کر اسے گھر سے باہر پہناتا ہے۔ جبکہ خود والدین کو بھی اس کی اجازت نہیں ہے کہ اس کے لئے کپڑے بنائیں یا پہنائیں۔

خونئے: تیسرے دن "نشرح" کے موقع پر موجود خواتین لڑکے کی ماں کو تحفے کے طور پر کچھ نہ کچھ رقم ضرور دیتی ہیں۔اس رقم کو "خونئے" کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ لڑکے کے عزیز اور رشتہ دار اس کے لئے کپڑے بھی لاتے ہیں۔ جس میں ٹوپی جسے "شوکولہ" کہتے ہیں گردنئ آشخورہ اور سر پہ باندھنے کا رومال وغیرہ شامل ہوتے ہیں لڑکے کی دادی پہلے ہی سے اس کے لئے بستر کا سامان اور دیسی دواؤں کا بندوبست کر چکی ہوتی ہے۔

ناخن تراشنا: بچہ جب چالیس دن کا ہو جاتا ہے۔تو اسے نہلایا جاتا ہے۔اس کے ناخن کاٹے جاتے ہیں جن لوگوں کی مالی حالت اچھی ہوتی ہے۔ وہ اس موقع پر رشتہ دار خواتین کو دعوت دیتے ہیں جس کے ہاں پہلی اولاد ہوتی ہے۔ وہ اس موقع پر بھی خوشی کا اہتمام کرتا ہے۔ پہلے زمانے میں لڑکے کے ناخن کاٹنے والے نائی یا جس شخص نے اس کے ناخن کاٹے ہوں اسے ناخنوں کے وزن کے برابر سونا دینے کا رواج تھا۔ جو کہ اب سونے کی قیمت میں اضافے کے ساتھ بہت کم ہو گیا ہے۔ ناخنوں کو بعد میں ایک صاف ستھرے کپڑے میں باندھ کر کسی صاف جگہ زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

سر کلئے: سر منڈوانے کیلئے چھ سات ماہ بعد بڑی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس تقریب کو جس میں لڑکے کے سر کے بال پہلی دفعہ منڈوائے جاتے ہیں "سر کلئے" یعنی عقیقہ کہا جاتا ہے۔عقیقہ بذات خود ایک اسلامی امر بھی ہے۔ یہ تقریب نسبتاً پہلی والی تقریبوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہے۔ کئی دن پہلے سے اس تقریب کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں سودا سلف کا حساب لگایا جاتا ہے۔تقریب میں شریک ہونے والے لوگوں کی فہرست تیار کی جاتی ہے۔ ویسے دیہی علاقوں میں گاؤں کے لوگوں کو کسی تقریب میں خاص طور پر دعوت دینے کا رواج ہوتا ہے۔ گاؤں کا ہر فرد ایک ہی گھرانے کا فرد تصور کیا جاتا ہے۔اس لئے اس کی شرکت لازمی ہوتی ہے۔البتہ قریبی گاؤں کو ایسے موقعوں پر مدعو کیا جاتا ہے جس کے لئے خواتین اور مرد بھیجے جاتے ہیں سر کلئے کی تقریب میں قبائلی رقص و سرود کی محفلیں بھی جمتی ہیں۔صبح ہی سے سرنا "بین" پہ قبائلی رقص کی دھن اور ڈھول پر تھاپ کی آوازیں گاؤں کی فضاء میں پھیل جاتی ہیں۔ دنبے ذبح کئے جاتے ہیں مردانے اور زنانے سے گیتوں کی آوازیں ابھرتی ہیں خواتین اور مرد الگ الگ ڈھول اور سرنا کی دھن پر قبائلی رقص کرتے ہیں۔اگر ڈھول بجانے والا بوڑھا ہو تو اسے زنانے میں جا کر ڈھول بجانے کی اجازت ہوتی ہے۔اور اگر جوان ہو تو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔لیکن عموماً عورتیں خود ہی دف جسے دریہ کہتے ہیں بجاتی ہیں جس کے ساتھ عورتیں قبائلی رقص کرتی ہیں۔ موقع کی مناسبت سے لڑکے اور اس کی والدہ کے بارے میں گیت گائے جاتے ہیں رقص و سرور اور خورد و نوش کی یہ محفل رات بھر جمی رہتی ہے۔ رات بھر الاؤ کے گرد گاؤں کے جوان رقص میں منہمک رہتے ہیں ڈھول کی آواز کے ساتھ سرنا کی سریلی آواز گونجتی رہتی ہے۔ بوڑھے ارد گرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ سبز جائے اور چلم

(حقہ) کا دور چلتا ہے۔ کبھی کوئی منچلا نوجوان کسی زندہ دل بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی رقص کے دائرے میں شامل کر لیتا ہے۔ دو تین چکر لگاتے ہی اس کی سانس پھولنے لگتی ہے۔ اور وہ دائرے سے نکل کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ پھر بیٹھ جاتا ہے۔ قہقہے ابھرتے ہیں جوانی کی داستانیں سنائی جاتی ہیں اور اس طرح ہنسی خوشی رات بیت جاتی ہے۔ صبح ہوتے ہی کسی قریبی زیارات پر جانے کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ راستے بھر یہ پر مسرست قافلہ خوشیاں مناتا منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ زیارت پر پہنچ کر لڑکے کے سر کے بال منڈوائے جاتے ہیں مگر سر کے بیچوں بیچ ایک چوٹی رہنے دی جاتی ہے۔ تابوں کا سر کے بیچوں بیچ یہ گچھا برہمنوں کی چوٹی سے ملتا جلتا ہے۔ بعض قبائل میں سر کے دونوں جانب دائیں بائیں کان کے اوپر بالوں کے گچھے چھوڑ دیئے جاتے ہیں ان بالوں میں سبز موتی اور چاندی کے تعویذ بھی لگائے جاتے ہیں جن کا مقصد بچے کو نظر بد سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ لڑکے کے منڈوائے ہوئے بال سونے یا چاندی کے برابر تولے جاتے ہیں اور یہ رقم ''دلاک'' یعنی بال منڈنے والے نائی کو دی جاتی ہے۔ بالوں کو کسی صاف کپڑے کے ٹکڑے میں باندھ کر مزار کے جھنڈے یا قریب کے کسی درخت کی شاخوں سے لٹکایا جاتا ہے۔ اس موقع پر مٹھائی بھی تقسیم ہوتی ہے۔ اور تحفے تحائف بھی دیئے جاتے ہیں اور اس طرح ''سر کلئے'' یا عقیقے کی یہ رسم اختتام کو پہنچتی ہے۔

ختنہ: ختنہ کی کوئی خاص مدت نہیں ہوتی لیکن کم لوگ جلد ختنہ کرتے ہیں یعنی چند ماہ بعد بلکہ کچھ تو سات سال تک بغیر ختنے کے رہنے دیتے ہیں بچے کے ختنے کی رسم سادہ ہوتی ہے۔ اب تو ہسپتالوں میں یہ کام انجام پاتا ہے۔ پہلے یہ کام نائی کرتے تھے جبکہ اب بھی دور دراز کے علاقوں میں یہ کام انہی کا ہے۔ بچے کے ختنے پر خوشی منائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ خیرات بھی کرتے ہیں دعوت بھی کرتے ہیں۔

پشتونوں میں چاندی اور فیروز کا زخم کے اندمال میں اہم کردار ہوتا ہے۔ اس لئے بچے کے گلے میں عموماً چاندی کے سکے لٹکائے جاتے ہیں یا اس کے کاندھے پر فیروزہ فیروزہ کی انگوٹھی لٹکائی جاتی ہے۔

سن بلوغت: قبائلی علاقوں میں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ لڑکا سن بلوغت کو پہنچ چکا ہے۔ مختلف قسم کی رسمیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ بعض علاقوں میں لڑکا سات سال کی عمر تک ایک لمبی قمیض پہنتا ہے۔ اور سات سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد شلوار پہنتا ہے۔ اس سے کم عمر کے لڑکے صرف پنڈلیوں تک لمبی قمیض پہنتے ہیں ژوب اور لورالائی کے دیہی علاقوں میں یہ رواج زیادہ تر دیکھنے میں آتا ہے۔ ان علاقوں میں شلوار بلوغت کی نشانی تصور کی جاتی ہے۔ جب تک لڑکا اس قسم کی لمبی قمیض پہنے ہوئے ہوتا ہے۔ تو یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ وہ ابھی تک سن بلوغت کو نہیں پہنچا کچھ علاقوں میں لمبی قمیض کے پچھے دامن میں کسی اور رنگ کے کپڑے کا پیوند بھی لگایا جاتا ہے۔ پیوند شدہ لمبی قمیض پہننے والا نوجوان خواہ کتنا ہی تن آور کیوں نہ ہو وہ نابالغ ہی تصور کیا جاتا ہے۔ اسے معاشرے میں ابھی تک وہ حقوق نہیں ملے ہوتے جو ایک نابالغ کو حاصل ہوتے ہیں۔ نہ صرف اسے حقوق حاصل نہیں ہوتے بلکہ دوسروں کو بھی اس کے خلاف اپنے حقوق استعمال کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا یہ نابالغ نوجوان معاشرے میں ہر طرح کا باہمی سمجھوتہ ہے۔ جس نے سالہا سال گزرنے پر اب ایک معاشرتی قانون کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ کہ نابالغ اولاد نرینہ کو معاشرے میں ہر طرح کی حفاظت حاصل ہوگی۔ یہاں تک کہ قتل کا بدلہ لینا پشتون معاشرے میں ایک طرح کا فرض اولین سمجھا جاتا ہے۔ مقتول کے قریبی رشتہ دار اگر دیدہ و دانستہ قتل کا بدلہ نہ لیں تو انہیں بہت ہی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن قتل کا بدلہ تک بھی کسی ایسے نابالغ فرد سے نہیں لیا جاتا پشتون اس فعل کو اپنی شان کے خلاف تصور کرتا ہے۔ کہ وہ قاتل کے گھر کے کسی نابالغ فرد کو قتل کر کے انتقام لے۔ یہاں ایک مسئلہ یہ آن پڑتا ہے۔ کہ آخر بالغ اور نابالغ کی پہچان کیوں کر ہو۔ ظاہری طور پر دیکھنے سے کیسے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ قاتل کے قبیلے کا کوئی خاص بالغ ہے۔ ابھی تک سن بلوغت میں مسلمان خواتین جو لباس پہنتی تھیں یا اسلام نے جس قوم کے لباس کے پہننے کا حکم دیا ہے۔ یہ لباس اس کے عین مطابق تھا۔ بہر حال ان باتوں کا تذکرہ کرنے سے مقصد یہ ہے۔ کہ پشتونوں کا لباس جہاں اسلامی شرعی اصولوں کے مطابق ہے۔ وہاں یہ لباس جغرافیائی اور موسمی ضروریات پر بھی پورا اترتا ہے۔

لباس

شلوار: پشتون مردوں کا لباس پانچ چیزوں پر مشتمل ہے۔ شلوار یہ تمام پشتون قبائل میں یکساں رائج ہے۔ البتہ اس کے گھیر میں فرق ہوتا ہے۔ بعض قبائل جیسے اچکزئی بڑیچ پندرہ گز سے لے کر چالیس گز تک کپڑے کی شلوار بناتے ہیں۔ ان دنوں اس کے کپڑے میں کچھ کمی آ گئی ہے۔ یہاں تک کہ ساڑھے چار اور پانچ گز کی شلوار بھی پہنی جاتی ہے۔ اچکزئی اور بڑیچ قبائل کے لوگ پانچے بڑے رکھتے ہیں۔ اور دیگر قبائل کے پائنچے چھ سے لے کر آٹھ انچ تک کے ہوتے ہیں مثلاً ژوب کے قبائلی تنگ منہ والے پائنچے پہننا پسند کرتے ہیں شلوار میں یوں تو سفید لٹھا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ تر خاکی رنگ کی شلوار پسند کی جاتی ہے۔ اس رنگ کا انتخاب ضرورت کے مطابق کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کے روزمرہ کا کام ایسا ہوتا ہے۔ جس میں کپڑوں کے جلدی میلے ہونے

کا اندیشہ ہو مثلاً محنت مزدوری وہ عموماً خاکی رنگ کا لباس پہنتے ہیں۔ امیر گھرانے اور سردار خیلوں میں سفید لٹھا زیادہ پہنا جاتا ہے۔ ویسے خاص تقریبات عید اور تہواروں پر سفید کپڑے کا لباس پہنا جاتا ہے۔ شلوار میں بکری کے بالوں کا بنا ہوا آزار بند استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ پشتون قبائل کے علاقوں میں بکریاں بکثرت پالی جاتی ہیں۔ اور گھریلو استعمال کی مختلف چیزیں بکری ہی کے بالوں سے بنائی جاتی ہیں جن میں دریاں خیمے رسیاں وغیرہ شامل ہیں دوسری وجہ یہ کہ دوسروں چیزوں کی نسبت یہ زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے۔ کہ کشتی لڑتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ شلوار میں آزار بند بکری کے بالوں کا بنا ہوا ہو پشتونوں میں کشتی لڑتے وقت دونوں فریق ایک دوسرے کے نیفے سے پکڑتے ہیں۔ اسی لئے نیفے میں استعمال ہونے والے آزار بند کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔

قمیض: قمیض کو پشتون لباس میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قمیض بنانے کے لئے کافی اہتمام کیا جاتا ہے۔ پشتونوں کی قمیض شرعی احکام کے مطابق بنائی جاتی ہے۔ عام قمیضوں کی طرح ان قمیضوں میں گریبان سامنے نہیں رکھا جاتا بلکہ پہلے کے قریب رکھا جاتا ہے۔ گریبان میں بٹن کا استعمال بہت کم اور وہ بھی جدید دور کے ساتھ ہونے لگا ہے۔ ورنہ عام طور سے اس مقصد کے لیے دھاگے کی ڈوری کا استعمال کیا جاتا ہے۔ قمیض میں گلے کے نیچے سینے پر بہت محنت سے ''خامک'' کا خوبصورت ریشمی کام کیا جاتا ہے۔ قمیض کی لمبائی عام شہری علاقوں میں پہنے جانے والی قمیضوں سے زیادہ رکھی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی عموماً ٹخنوں تک ہوتی ہے۔ آستینوں میں بٹن کا استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ یہ کھلے چھوڑے جاتے ہیں۔ اس کو قندھاری قمیض کہتے ہیں جس کو اب تقریباً اچکزئی قبائل استعمال کرتے ہیں باقی پشتون درمیان بٹن والے گریبان کی قمیض استعمال کرتے ہیں۔

پگڑی اور لنگی: لباس میں تیسری اہم چیز پگڑی ہے۔ پگڑی کا کپڑا عام طور پر سے سیاہ یا سفید ہوتا ہے۔ لنگی اور ''کلاہ'' کا رواج بھی ہے۔ کلاہ صرف صاحب حیثیت لوگ ہی استعمال کرتے ہیں۔ اور لنگی کا رواج نوجوان طبقے میں زیادہ ہے۔ پشتون قبائل میں پگڑی کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس سے جہاں سر ڈھانپنے کا کام لیا جاتا ہے وہاں پگڑی عزت اور حیثیت کی علامت بھی سمجھی جاتی ہے۔ صاحب حیثیت لوگ اس میں قیمتی سے قیمتی کپڑا استعمال کرتے ہیں جس میں سونے اور چاندی کے تار بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح جو لوگ کلاہ کا استعمال کرتے ہیں وہ قیمتی سے قیمتی کلاہ پہنتے ہیں۔ جس کا نہ صرف کپڑا مخمل کا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا بالائی حصہ مکمل طور پر سونے یا چاندی کے تاروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ سونے یا چاندی کے تاروں کے بغیر پگڑی کا استعمال پشتون قبائل میں عام ہے۔ البتہ مختلف قبائل میں اس کے باندھنے کا طریقہ کچھ مختلف ہوتا ہے۔ کاکڑ قبائل کے لوگ پگڑی کا نچلا شملہ اتنا لمبا رکھتے ہیں کہ وہ کمر تک پہنچتا ہے۔

ژوب کے شیرانی اور مرانی اور لورالائی اور موسیٰ خیل کے قبائل شملے کا دوسرا سرا اتنا لمبا رکھتے ہیں کہ اس سے منہ چھپانے کا کام لیا جاسکے۔ اسی طرح ژندران، منگل اور سلیمان خیل مولی اس طرح سے باندھتے ہیں۔ کہ ان کی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ اور باقی چہرہ چھپا ہوا ہے۔

جوتے: جوتوں میں ''شئی پنڑے'' یا ''منوچنڑی'' یا ''سپلی'' شامل ہیں جسے عام بول چال میں چپلی کہتے ہیں گرمیوں کے موسم میں ''چپلی'' یا ''چوٹ'' پہنی جاتی ہے۔ جبکہ سردیوں میں ''موچنڑی'' یا موچڑی استعمال ہوتی ہے۔ آج کل بوٹ کا استعمال عام ہوگیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ''چپلی'' اور موچڑی عام استعمال ہوتی ہے۔ چپلی یا چوٹ کی بناوٹ بھی مختلف علاقوں میں مختلف ہوتی ہے۔ اس کی شکل بھی بدلتی رہتی ہے۔ چوٹ میں عام طور پر تلے میں ٹائر کے ربڑ کا سول زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ٹائر کے ربڑ سے ایک تو پتھریلے علاقوں میں چلنا دوسرے خاص طور پر پہاڑوں پر چڑھنا آسان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پانی اور کیچڑ سے جلدی خراب ہوتا ہے۔

موچڑی بھی ایک خاص قسم کی جوتی ہوتی ہے۔ جو سادہ بھی بنائی جاتی ہے۔ اور اس پر زری کام بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں پیچھے کا حصہ مکمل ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔

کپئی: یہ ایک قسم کا جوتا ہے جو نسبتاً کاکڑ قبائل میں زیادہ ہوتا ہے یہ مردوں اور خواتین میں یکساں مقبول ہے اور اس دایاں، بایاں پاؤں معلوم نہیں ہوتا۔ مکمل طور پر چمڑے سے بننے والے اس جوتے پر زری کا کام کیا جاتا ہے، یہ پنجابی ثقافت کے "گھسے" سے ملتی جلتی شے ہیں۔

سدری: سدری عموماً مخمل کے کپڑے کی بنائی جاتی ہے۔ جس میں گہرے سرخ رنگ کا کپڑا زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ اس کپڑے پر گلابتوں اور ''چرمے'' کا خاص کام کیا جاتا ہے۔ سرخ کپڑے پر گلابتوں اور چرمے کی کشیدہ کاری والی سدری کو ''سیخنہ سدری'' یعنی ''خنک سدری'' کہا جاتا ہے۔ یہاں خنک کے معنی سرد اور سردی کے نہیں بلکہ یہ اس مخصوص کشیدہ کاری کی قسم ہے۔ جو کہ سدری پر کی جاتی ہے۔

پٹو: ان کے علاوہ اور بھی بہت چیزیں لباس کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں جن میں موسم کے مطابق نماز پڑھنے کی چادر پٹو کوسے پوستین، پوستینچہ وغیرہ شامل ہیں۔

پٹو یا چادر کو بھی پشتون مردوں کے لباس میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عام طور پر یہ چادر مرد اپنے کاندھوں پر ڈالتے ہیں۔ چادر کو تہہ کر کے اسے دائیں کاندھے پر اس طرح ڈالتے ہیں کہ اس کا کچھ حصہ پیچھے اور باقی حصہ آگے لٹک رہا ہو۔ اس چادر کو ان کی روزمرہ زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ چادر زمین پر بچھا کر بیٹھنے اور نماز پڑھنے کے کام آتی ہے۔ سوتے ہوئے اوڑھنے کے کام آتی ہے۔ تیز دھوپ، دھول اور سردی سے بچاؤ کرتی ہے۔ سر کے نیچے رکھ کر سرہانے کے کام آتی ہے۔ اور سودا سلف خرید کر گٹھڑی باندھنے کے کام آتی ہے۔ غرضیکہ ایک عام دیہی پشتون کی روزمرہ زندگی کی اکثر ضروریات اس چادر سے پوری ہوتی ہیں۔ دیہی علاقوں میں بغیر پٹو کے ہونا آج بھی بڑا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

خولئی: خولئی ٹوپی کا پشتو نام ہے۔ جس کی مختلف قسمیں ہیں اکثر لوگ ریشم یا زری سے آراستہ ٹوپیاں جس میں آئینے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نصب ہوتے ہیں، پہنتے ہیں۔ اس کو عموماً بلوچی ٹوپی کہتے ہیں اس کے علاوہ پگڑی وغیرہ باندھنے کیلئے سر پر سادہ سفید ٹوپیاں بھی جو عموماً نماز کے لیے استعمال ہوتی ہیں، پہنی جاتی ہیں۔ بزرگوں میں زیادہ تر گول قسم کی ٹوپی کا استعمال عام ہے، جس کو سواتی ٹوپی کہتے ہیں جبکہ اس ٹوپی کی ایک قسم چترالی بھی کہلاتی ہے۔

خواتین کا لباس: خواتین کے لباس میں خصوصیت سے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے۔ کہ ان سے شرعی احکام بھی پورے ہوں اور انہیں دن بھر کے کام کاج میں بھی آسانی ہو۔ پشتون معاشرے میں خواتین جہاں گھر کا کام کرتی ہیں وہاں وہ گھر سے باہر بھی کام کرتی ہیں خواتین عموماً مشکیزوں میں قریبی ندی کنویں یا چشموں سے پینے کا پانی لاتی ہیں میدانوں اور قریب کے پہاڑ سے جھاڑیاں وغیرہ کاٹ کر جلانے کی لکڑی جمع کرتی ہیں غرضیکہ خواتین کے کام کاج کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے لباس کا تعین کیا گیا ہے۔ خواتین کا لباس عموماً ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے۔ جس سے ان کے جسم کا کوئی حصہ نمایاں نہیں ہوتا۔ یہ ڈھیلا لباس جہاں آسانی سے چلنے پھرنے میں رکاوٹ نہیں بنتا وہاں شدید موسم میں سردی سے بچاؤ کا کام بھی کرتا ہے۔

پڑونے: پڑونے یعنی دوپٹے یا چادر کو پشتون خواتین میں بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ خاتون کی سر کی چادر کو پشتون قبائل میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کسی کی چادر کی حفاظت اس کی عزت کی حفاظت سمجھی جاتی ہے۔ جسے پشتون قبائل کا ہر فرد اپنا اولین فرض سمجھتا ہے۔ اور اس پر بجا طور پر فخر کرتا ہے۔ کسی پشتون خاتون کی چادر پر ہاتھ ڈالنا بہت بڑی بے عزتی سمجھی جاتی ہے۔ اور پشتون قبائل میں اس کا بدلہ قتل ہے۔

پشتون خواتین اتنی بڑی چادر پہنتی ہیں۔ جس سے پورا بدن ڈھانپا جاسکے۔ چادر کی لمبائی کم سے کم ڈھائی گز اور چوڑائی دو گز ہوتی ہے۔ چادر ہی سے دیہات میں خواتین پردے کا کام بھی لیتی ہیں۔ چادر کیلئے عموماً تین رنگ کا کپڑا پسند کیا جاتا ہے۔ یعنی سب سے زیادہ کالا اس کے دوسرے سفید اور تیسرے درجے سرخ رنگ کی چادر استعمال ہوتی ہے۔ سرخ اور کالا رنگ زیادہ عام ہے۔

پڑونے پشتون میں خواتین کی چادر کو کہتے ہیں پشتون خواتین عموماً بڑی چادریں (شال) استعمال کرتی ہیں جن کی ساخت مختلف قبائل میں مختلف ہوتی ہے۔ ناصر قبائل کی خواتین کمبل نما چادریں اوڑھتی ہیں جبکہ کاکڑ وغیرہ کی خواتین کی چادریں نسبتاً ہلکی ہوتی ہیں لیکن شرط یہ ہے۔ کہ عورت کو سر تا پا ڈھک لے ان چادروں پر ہاتھ سے کڑائی وغیرہ کی جاتی ہے۔ اور آئینہ کاری بھی ہوتی ہے۔ جبکہ شہر سے مشین کی کڑھائی شدہ چادروں کا رجحان بھی ہے۔ دیہاتوں میں تقریباً برقعے کا رواج نہیں ہے۔ بلکہ ان کے برقعے یہی چادریں ہوتی ہیں جس کو یوں اوڑھا جاتا ہے۔ ان چادروں کے کناروں پر کبھی کبھار پیسوں کے سکے بھی ٹانکے جاتے ہیں۔ جن سے چلتے پھرتے آوازیں اٹھتی ہیں۔ عورتوں کی چادر دیکھنے میں تو کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے۔ لیکن پشتون معاشرے میں چادر خواتین کی عزت کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ کسی خاتون کے سر پر سے چادر گرا دینا ایک ایسا فعل تصور کیا جاتا ہے۔ جس کی سزا کم از کم موت ہے۔ پشتونوں کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ مردوں میں جو حیثیت پگڑی یا سر کی ٹوپی کو حاصل ہے۔ وہ حیثیت بلکہ اس سے بھی بڑھ کر چادر کی ہے۔ بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کرنے پر کسی کے آگے چادر پھیلائی جائے تو اس کیلئے سوائے معافی کے اور کوئی راستہ نہیں رہتا یہی عالم پگڑی کا ہے۔ پشتون معاشرے میں پگڑی جسے پٹکئی کہتے ہیں چادر یا پڑونی اور دامن یا لمن بہت اہم ہیں۔ ان تینوں کو ننگ و ناموس اور عزت و وقار کی نشانی تصور کیا جاتا ہے۔

سنگین سے سنگین قبائلی جھگڑے ان تین چیزوں کے ذریعے حل ہو جاتے ہیں وہ کون سا پشتون ہوگا جس کے پاس کوئی اپنے دامن کا واسطہ لے کر آئے اور وہ اس کی بات ٹال دے۔ کوئی اپنی پگڑی اتار کر کسی کے قدموں میں رکھ دے اور وہ اس کی خطا سے درگزر نہ کرے۔ کوئی خاتون سر کی چادر پھیلائے اور کوئی اس کا احترام نہ کرے؟ اگر کوئی ان روایات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی ضد پر قائم رہے تو ایسے فرد کو پشتون معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ اپنے آپ کو معاشرے میں بالکل اکیلا پائے گا۔ الغرض پگڑی چادر اور دامن کے لئے پشتونوں میں بہت عزت و احترام کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

زیورات: زیور کا استعمال جہاں حسن وخوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ وہاں خاندانی دولت وثروت کی نشانی بھی سمجھا جاتا ہے۔ پشتون قبائل میں زیور کو جہاں ایک طرف آرائش کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ وہاں اسے مصیبت کے دنوں میں کام آنے کا ایک اندوختہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ زیور پر رقم لگاتے ہوئے اکثر یہ سننے میں آتا ہے کہ اچھا ہے۔ رقم ضائع نہیں ہوگی اور کسی وقت کام آجائے گی۔'' پشتون قبائل کی خواتین کے زیورات بھی روزمرہ کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائے گئے ہیں۔ ان زیورات میں شہروں کی خواتین کے زیورات کی سی نازکی اور نفاست نہیں پائی جاتی بلکہ زیورات کی ساخت کچھ یوں کی جاتی ہے کہ اس کا استعمال روزمرہ کے گھریلو اور گھر سے باہر کے کاموں میں اپنی بناوٹ کی وجہ سے رکاوٹ نہ بنے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ زیورات فن کارانہ حسن ونفاست سے عاری ہوتے ہیں گلے میں استعمال ہونے والے یا کلائیوں میں پہنے جانے والے تمام زیورات کی ساخت ایک مخصوص فن کاری کی نشاندہی کرتی ہے۔ ایسی فن کاری صرف فن برائے فن کا نمونہ ہی نہیں بلکہ فن برائے زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ فن ضرورت اور زندگی کے مطابق۔

وڑئی: پشتون خواتین کے زیورات میں ہار گلے میں پہننے کا زیور جسے ''وڑئی'' کہتے ہیں کانوں میں پہننے کی بالیاں، پیروان، نتھ ٹیکہ، کڑے، کانچ کی چوڑیاں، کنگن، پازیب، نکلس، انگوٹھی، بازو بند، کمر بند، وغیرہ شامل ہیں لیکن بعض علاقوں میں جدید تہذیب کی وجہ سے ان زیوارت میں سے بہت سے اب استعمال نہیں ہوتے زیور عموماً سونے اور چاندی کے بنائے جاتے ہیں۔ زیورات کے استعمال میں کمی ضروریات زندگی میں اضافے اور اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔

زیورات جن میں بازو بند، نکلس، کمر بند، ہار وغیرہ شامل ہیں اب بالکل متروک ہو چکے ہیں چند قبائل ہیں جن میں ان ان میں سے کچھ زیور اب بھی بنائے جاتے ہیں بیشتر چاندی کے ہوتے ہیں پازیب کا رواج بھی اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ان دنوں دلہن کے زیورات میں پیروان اور نتھ کا استعمال بھی بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض جگہوں میں میچک یعنی ناک میں پہننے کا چھوٹا زیور اب بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ بھاری بھر کم زیورات کے استعمال میں کمی کی بڑی وجہ سونے اور چاندی کی قیمت میں اضافہ ہے۔ ضروریات زندگی کی قیمتوں میں اضافہ اور محدود ذرائع آمدن کی وجہ سے اکثر زیورات اب دیکھنے میں نہیں آتے شہروں میں جدید فیشن نے پرانی طرز کے زیورات کی جگہ لے لی ہے۔ دیہی آبادی میں جہاں جدید فیشن ابھی تک نہیں پہنچا پرانے طرز کے زیورات ہی استعمال ہوتے ہیں لیکن یہاں بھی اکثر زیورات پہلے سونے کے بنائے جاتے تھے اب چاندی کے بنائے جاتے ہیں آج کل دلہن کے لئے جو زیورات بنائے جاتے ہیں۔ ان میں ناک میں پہننے کا زیور جسے ''نتھ'' اور ''پیزوان'' کہتے ہیں بھی کم دیکھنے میں آتا ہے۔

زیورات کا ہدف: قدوس درانی کے مطابق پشتون قبائل میں لباس اور زیورات کی اپنی اپنی مخصوص ضروریات اور مقاصد ہیں۔ زیور بناتے وقت بچت سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے۔ پشتونوں میں یہ ایک عام نظریہ ہے کہ زیور ضروریات کے وقت کا سرمایہ ہے۔ زیور پر جتنی بھی زیادہ رقم لگائی جائے وہ ضائع نہیں جاتی بلکہ یہ رقم تنگدستی اور ضرورت میں کام آتی ہے۔ ایسے دور دراز علاقوں میں جہاں موجودہ دور کی سہولتیں بچت کے جدید طریقے اور بنکاری کی آسانیاں ابھی تک دستیاب نہیں ہیں ان میں بچت کا یہ مفید اور کارآمد طریقہ صدیوں سے رائج ہے۔ کہا جاتا ہے۔ زیورات میں رقم لگانے کے دو بڑے فائدے ہیں ایک یہ کہ زیورات پر لگائی ہوئی رقم ضائع نہیں ہوتی اور وقت ضرورت اسے فروخت کر کے یا رہن رکھ کر رقم حاصل کی جاتی سکتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے۔ کہ یہ رقم اپنے پاس جمع ہونے کے باوجود بڑھتی رہتی ہے۔ کیونکہ سونے اور چاندی کی قیمتوں میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح آج کی لگائی ہوئی رقم آگے چل کر دو چند بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھ سکتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا کہ پشتون قبائل میں زیورات صرف اور صرف بچت کے نظریئے کو مدنظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر زیور بنانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سونے اور چاندی کی سلاخیں بھی بچت کا کام دے سکتی تھیں۔ زیور بنانے کا اولین مقصد زیبائش وآرائش ہے۔ اور اگر اس زیبائش وآرائش کے ساتھ جسے عموماً فضل خرچی تصور کیا جاتا ہے۔ بچت بھی ہو اور فائدہ بھی تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لباس کی قدریں: لباس کے مختلف حصوں کے ساتھ مختلف روایات منسلک ہیں نام ونگ، عزت، بے عزتی، شرمندگی، بہادری وشجاعت۔ غرضیکہ بہت سی ایسی باتیں اور خصوصیات ہیں جن کا تعلق لباس کے مختلف حصوں کے ساتھ ہیں۔ سر پر بندھی ہوئی پگڑی عزت ووقار کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ ایک وہ بھی وقت تھا کہ جس کے سر پر بندھی ہوئی پگڑی کا طرہ سب سے اونچا اور کلف دار ہوتا تھا وہ شخص معاشرے میں اتنا ہی باوقار سمجھا جاتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ پگڑی کے طرہ کی لمبائی عزت ووقار کی پیائش کا پیمانہ ہوا کرتا تھا۔ جس طرح تاریخ کے ایک دور میں مونچھوں کی لمبائی اور رخ سے کسی کی بڑائی کا اندازہ لگایا جاتا تھا اور کمزور کو طاقتور کے سامنے مونچھیں اونچی کرنے کی اجازت نہیں تھی بالکل یہی حیثیت ایک دور میں پگڑی کے شملہ کو حاصل تھی۔

وادہ (شادی بیاہ): پشتونوں میں شادی والدین کی مرضی سے ہوتی ہے۔ والدین جس لڑکی کا انتخاب کر لیں لڑکا اس سے انکار کی جرات نہیں کر سکتا۔ شادی کیلئے شریک حیات کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا عام طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ لڑکی اسی قبیلے سے تعلق رکھتی ہو جس قبیلے سے لڑکے کا تعلق ہے۔ اکثر شادیاں قریبی رشتہ داریوں اور عزیزوں میں ہی ہوتی ہیں سادات عموماً غیر سید گھرانوں میں شادی نہیں کرتے۔ جبکہ اب تعلیم عام ہونے کے ساتھ شہری پشتونوں میں اس حوالے سے کچھ تبدیلی آچکی ہے۔ کم از کم مرد کو کسی حد تک حق انتخاب دیا جاتا ہے۔

ھوکڑہ: شادی کی ابتداء اپنی پسند کی لڑکی تلاش کرنے سے ہوتی ہے۔ لڑکے والے قریبی عزیز و اقارب کے بعد گاؤں اور قبیلے کی لڑکیوں میں سے کسی ایک لڑکی کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ لڑکی پسند کر لینے کے بعد لڑکی کے والدین کو راضی کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ ایسے موقعوں پر لڑکے کی والدہ لڑکی والوں کے گھر جاتی ہے۔ اگر لڑکی کی والدہ ہو تو اس سے ورنہ کسی قریبی رشتہ دار سے باتوں باتوں میں اس کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خیالات معلوم کرنے کیلئے لڑکے کی والدہ کی بجائے کوئی قریبی عزیز، بڑی بہن، پھوپھی، خالہ وغیرہ بھی لڑکی والوں کے گھر جاتی ہیں لڑکی والوں کے خیالات اور رائے معلوم کرنے کے بعد جب یہ فیصلہ کر لیا جاتا ہے۔ کہ لڑکی پسند ہے۔ تو اس کے بعد لڑکی مانگنے کا مرحلہ آتا ہے۔ لڑکے کا والد لڑکی والوں کے گھر اپنے آنے کی اطلاع دے دیتا ہے۔ لڑکے کا والد چار پانچ قریبی بزرگوں اور رشتہ داروں کو لے کر لڑکی کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ لڑکی کے والد سے تفصیلی گفتگو ہوتی ہے۔ اور اگر اس بات چیت میں لڑکی کا والد اپنی لڑکی کا رشتہ دینے پر راضی ہو جائے تو اس تقریب کو ''ھوکڑہ'' یعنی ''راضی ہونا'' یا ''ہاں کر دینا'' کہتے ہیں۔

ولور: لڑکی والوں کے راضی ہونے کے بعد ''ہاں کہہ دینے'' پر وہیں باقی معاملات گفتگو کے ذریعہ طے پاتے ہیں۔ ''ولور'' یا ''حق مہر'' کا فیصلہ اسی موقع پر کیا جاتا ہے۔ ولور کی رسم پشتون قبائل میں زمانہ قدیم سے چلی آتی ہے۔ جس طرح پاکستان کے دیگر علاقوں میں ''جہیز'' کی رسم ہے۔ اسی طرح پشتون قبائل میں ''ولور'' لینے کی رسم قائم ہے ''جہیز'' اور ''ولور'' میں فرق اتنا ہے کہ ''جہیز'' میں جو کچھ طے پاتا ہے وہ لڑکی والے ادا کرتے ہیں جبکہ ولور میں بوجھ لڑکے والوں کو اُٹھانا پڑتا ہے۔

قدوس درانی کہتے ہیں: ولور کا اپنا ایک خاص مقصد اور ثقافتی پس منظر ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں جبکہ تعلیم کی وجہ سے جدید خیالات عام ہو چکے ہیں ولور کی رسم کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا شہروں میں تو یہ رسم بہت کم ہو چکی ہے۔ لیکن دیہاتوں اور دور دراز کے علاقوں میں اب بھی ولور وصول کیا جاتا ہے۔ ولور کے پس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوگا کہ یہ رسم قدیم معاشرے کے مخصوص حالات کی پیدا کی ہوئی ہے۔ لڑکی کے والدین بچپن سے لے کر جوانی تک اپنی بچی پرورش کے اخراجات برداشت کرتے ہیں لڑکی کی شادی کے اخراجات چونکہ بہت زیادہ ہوتے ہیں اور قبائلی رسم و رواج کے مطابق شادیوں کے لئے کافی رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے ان اخراجات میں لڑکے والوں کی شرکت بھی لازمی ہوتی تھی اور غالباً لڑکی والوں کی مدد کرنے کے لیے ولور لینے کی رسم کا آغاز ہوا تھا ولور لینے کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے۔ کہ عموماً لڑکی کے والدین کی ولور کی تمام رقم لڑکی کے لیے زیورات کپڑے وغیرہ کی تیاری پر صرف کرتے ہیں اس طرح جو رقم لڑکی والوں کو ملتی ہے۔ وہ رقم پھر کسی نہ کسی صورت میں واپس لڑکے والوں کے گھر چلی جاتی ہے۔ جہاں تک ولور لینے کے ان مقاصد کا تعلق ہے۔ ابتداء میں یقیناً بڑے نیک رہے ہوں گے۔ لیکن بعد میں اس رسم نے بالکل سودابازی کی شکل اختیار کر لی اور ولور لینے اور لڑکی دینے کی رسم نے ایک معاشرتی ضرورت اور امداد کی بجائے تکلیف دہ صورت اختیار کر لی ہے۔ ولور کی صورت میں بھاری سے بھاری رقم وصول کی جاتی ہے اور اس طرح لڑکی کا ولور جتنا زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے والدین اتنا ہی فخر کرتے ہیں ولور کی رقم زیادہ رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لڑکے والوں کو اکثر قرض لے کر اس رسم کی ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ معاشرے میں نام و نمود اور جھوٹی شان و شوکت کی نمائش کے لئے لڑکے والے ''ولور'' میں بھاری رقم دیتے ہیں لیکن بعد میں میاں بیوی زندگی بھر مالی مصیبتوں میں پریشان رہتے ہیں۔

ولور میں طے کی گئی رقم کی ادائیگی میں کافی وقت لگتا ہے۔ اس کا ایک اور منفی اثر یہ ہوا کہ اکثر جوان ولور نہ ہونے کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے، جبکہ لڑکیاں موزوں ''ولور نہ ملنے کی وجہ سے جوانی ڈھلنے تک گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں،'' ولور نے ان منفی اثرات کو دیکھتے ہوئے اب تعلیم یافتہ گھرانوں میں یہ رسم برائے نام رہ گئی ہے، دیہی علاقوں میں بھی روز بروز ولور کی رسم کم ہو رہی ہے، ہوکڑا، یعنی اقرار کر لینے اور لڑکی کے والدین کی رضامندی کے بعد ولور اور حق مہر کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس موقع پر عموماً یہ ہوتا ہے۔ کہ لڑکی والے مہر میں بہت بڑی رقم کا مطالبہ کرتے ہیں، مثلاً شروع میں لڑکی کے حق مہر یا ولور، کی رقم ایک لاکھ رکھی جاتی ہے، اس کے بعد لڑکے کا والد اس رقم کو کم کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ اس موقع پر عموماً یہ ہوتا ہے۔ کہ لڑکے کا والد خدا کا واسطہ دیتے ہوئے کہتا ہے، خدا کے واسطے اس رقم میں کچھ بھی کر دیں''۔

بھاری رقم رکھنا اور رقم میں کمی کے لئے لڑکے والوں کی درخواست بالکل رسماً ہوتی ہیں اس میں مقصد بھاری رقم رصول کرنا یا لڑکے والوں کے بے عزتی کرنا نہیں بلکہ یہ ایک طرح کی رسم ہے۔ لڑکے کے والد کے کہنے پر رقم میں کمی کی جاتی ہے، اس کے بعد دوبارہ لڑکے کا والد درخواست کرتا ہے، پیغمبر خدا کی پاک روح کے ثواب میں اس قسم میں مزید کمی کردیں، چنانچہ اس موقع پر دوبارہ لڑکی والے رقم میں کمی کرتے ہیں، پھر لڑکے والے اپنے اور ان کے بزرگوں کی روح کا واسطہ دیکر ان سے رقم میں مزید کمی کی درخواست کرتے ہیں اور اس طرح ہوتے ہوئے بات مقررہ حق مہر یا دلور کی طے شدہ رقم تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد تمام مہمانوں کو شربت پلایا جاتا ہے۔ اس موقع پر دولہا کی شربت کے برتن میں کچھ رقم بھی ڈالتے ہیں اس رسم کے بعد سوئی دھاگہ منگوایا جاتا ہے، سوئی میں دھاگہ ڈال کر سوئی دولہا کے بھائی یا کسی اور موجود قریبی رشتہ دار کی پگڑی سے لٹکا دی جاتی ہے۔ اس تقریب کے مکمل ہونے پر دولہا والوں کی جانب سے بندوق یا پستول سے ہوائی فائر کئے جاتے ہیں جس سے تمام گاؤں والوں کو خبر ہو جاتی ہے۔ کہ رشتہ بہ خیر وخوبی طے پا گیا ہے۔ رشتہ مانگنے یعنی ''ہوکڑہ'' کی یہ رسم عموماً مغرب کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ جس کے بعد بندوق سے فائر کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ صبح بندوق سے فائر کرنے کا مطلب گھر میں اولاد نرینہ کی پیدائش ہوتا ہے۔ لیکن دوپہر یا مغرب کے وقت بندوق کی آواز ''ہوکڑہ'' کی تقریب کے اختتام پذیر ہونے کا اعلان ہوتا ہے ''ہوکڑہ'' ہی کے موقع ''نکاح'' کی تاریخ بھی مقرر کی جاتی ہے۔ ''ہوکڑہ'' کے لیے یعنی رشتہ مانگنے کیلئے لڑکی والوں کے ہاں جانے کو ''مرکہ'' کہا جاتا ہے۔

کوزدہ (منگنی): منگنی کیلئے بدھ، جمعرات، سوموار یا منگل کے دنوں میں سے کوئی ایک مقرر کیا جاتا ہے۔ ہفتے کے باقی دو دنوں میں منگنی کی رسم عموماً ادا نہیں کی جاتی منگنی سے پہلے دلہن کے لئے کپڑوں کا مکمل جوڑا پہلے ہی اس کے گھر پہنچایا جاتا ہے۔ یہ کپڑے اکثر لڑکے کی بہن یا والدہ اور دوسری بہت ہی قریبی رشتہ دار خواتین لے کر جاتی ہیں اس لباس کو منگنی کا جوڑا کہا جاتا ہے۔ لباس کے ساتھ زیوارات نہیں ہوتے صرف سونے کی ایک انگوٹھی دلہن کے لیے کپڑوں کے جوڑے کے ساتھ بھیجی جاتی ہے۔ کپڑے جس بڑی طشتری میں بھیجے جاتے ہیں اس میں مٹھائی اور چاکلیٹ وغیرہ بھی رکھی جاتی ہیں۔

منگنی کی تقریب میں دولہا اور دلہن والوں کی جانب سے اپنے اپنے عزیز رشتہ دار اور دوستوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ پہلے منگنی کی تقریب پر دوپہر کے کھانے کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا لیکن اب یہ رسم متروک ہو چکی ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد پہلے مرد شرکاء کو ایک ایک لنگی اور قند تحفے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات روغنی (گھی میں تلی میٹھی روٹی) بھی دی جاتی ہے۔ اب اکثر جگہ ریشمی رومال جس میں مٹھائیاں ٹافی اور ٹکیاں بندھی ہوتی ہے۔ شرکاء کو پیش کئے جاتے ہیں شہروں میں اس تقریب پر لوگوں کو چائے بسکٹ پیش کئے جاتے ہیں۔

منگنی کے موقع پر نکاح خوانی کا رواج بھی اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن نکاح اس موقع پر لازمی نہیں بعض لوگ اس موقع پر صرف منگنی کی رسم ادا کرتے ہیں نکاح شادی کے موقع پر ہی پڑھایا جاتا ہے۔

پشتہ خلاصول: کچھ گھرانے یہ چاہتے ہیں کہ منگنی کے بعد دولہا اپنے سسرال میں آمدورفت جاری رکھے چونکہ بات پکی ہونے اور منگنی کے بعد عموماً دولہا کا دلہن کے گھر آمدورفت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اس لئے منگنی کے موقع پر ہی نکاح پڑھ لینے کے بعد دولہا پر پابندی نہیں رہتی یہ رسم بہت ہی قریبی رشتہ دار گھرانوں میں عام ہے۔ اس رسم کو پشتو میں ''پشہ خلاصول'' یعنی آمدورفت رکھنا کہتے ہیں۔ نکاح کے بعد دولہا کو اتنی آزادی ضرور ہوتی ہے کہ وہ سسرال آتا جاتا رہے۔ لیکن اسے یہ آزادی نہیں حاصل ہوتی کہ وہ شادی سے پہلے اپنی دلہن سے گفتگو کرے۔ اس کی بات چیت دلہن کی بہنوں، والدین اور دیگر رشتہ داروں تک ہی محدود رہتی ہے۔ دلہن اس تمام عرصے میں دولہا سے پردہ کرتی ہے۔

نکاح کی رسم ادا ہو یا نہ ہو منگنی کی تقریب کے ختم ہوتے ہی دلہن والوں کی طرف سے ایک قیمتی رومال جس کے ساتھ نقرئی دھاگے میں پروئی ہوئی سنہری سوئی بھی ہوتی ہے لایا جاتا ہے۔ یہ سوئی دولہا کے بھائی یا کسی قریبی رشتہ دار کی پگڑی سے لٹکائی جاتی ہے اور رومال اس کے کاندھے پر ڈالا جاتا ہے۔ اس رسم کے بعد بندوق سے فائر کر کے منگنی کی تقریب کے مکمل ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اور دولہا کے گھر سے آئے ہوئے لوگ واپس لوٹ جاتے ہیں رات کو دولہا کے گھر میں عورتیں اکٹھی ہوتی ہیں۔ اور رات گئے تک لوک گیت گاتی رہتی ہیں لوگوں کو رات کا کھانا کھلایا جاتا ہے۔

نکریزی (مہندی): شام کو خواتین دلہن کے گھر مہندی لے کر جاتی ہیں۔ مہندی ایک بڑی طشتری میں رکھی جاتی ہے۔ جس میں موم بتیاں جلائی جاتی ہیں۔ مٹھائیاں اور قند رکھے جاتے ہیں۔ مہندی لے جا کر دلہن کے ہاتھوں پر لگائی جاتی ہے۔ اس موقع پر دلہن پر پیسے اور مٹھائیاں نچھاور کی جاتی ہیں۔ کچھ دیر اتنڑ یعنی قبائلی رقص کی محفل جمتی ہے اور پھر عورتیں دولہا کے گھر لوٹ آتی ہیں۔

دلہن کے گھر مہندی لے جانے اور وہاں مختصر تقریب کے بعد دولہا کے گھر میں مہندی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ یہ رسم دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں دولہا

اور اس کے دوستوں سے قریبی عزیز رشتہ دار خواتین کی چھیڑ خانی دولہا اور اس کے دوستوں سے مختلف بہانوں سے شیرینی کے طور پر نقدی کی صورت میں انعام لینے اور خوشی و مسرت کے اظہار کے مختلف طریقے دیکھنے میں آتے ہیں۔

اندھیرا پڑتے ہی دولہا کے گھر میں مہندی کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ صحن میں کسی کھلی جگہ دولہا کیلئے ایک اونچا تخت لگایا جاتا ہے۔ اس تخت پر دولہا اور اس کے قریبی دوستوں اور بھائیوں کو لا کر بٹھایا جاتا ہے۔ پھر گھرانے ہی سے کسی خاتون کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جو دولہا کی چھوٹی انگلی کو مہندی لگائے۔ اس خاتون کے انتخاب کیلئے عموماً کوئی ایسی عورت تلاش کی جاتی ہے۔ جو گھرانے میں سب سے زیادہ معزز ہو۔ دولہا کی قریبی رشتہ دار ہو اور اس کی زندگی بھی خوشیوں اور مسرتوں سے بھری ہوئی ہو۔ اس موقع پر مہندی لگانے کیلئے منتخب ہونے کو بہت ہی قابل فخر سمجھا جاتا ہے۔ کبھی تو ایک ہی خاتون دولہا اور اس کے چند دوستوں یا بھائیوں کی ایک ایک انگلی پر مہندی لگاتی ہے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ دولہا اور اس کے مختلف دوسرے ساتھیوں کیلئے مختلف خواتین کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ دولہا کی انگلی پر مہندی لگانے کے بعد اس کی انگلی سبز ریشمی کپڑے کے ٹکڑے سے باندھی جاتی ہے۔ جو خاص طور پر اس موقع کیلئے پہلے ہی سے بنایا جاتا ہے۔ مہندی لگانے کی رسم کے بعد دولہا مہندی کے برتن میں تحفے کے طور پر کچھ نہ کچھ ڈال دیتا ہے۔ اکثر یہ رقم کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور یہ رقم مہندی لگانے والی خاتون کو ہی دی جاتی ہے۔ منگنی کے روز ہی دولہا کا باپ دلہن کے باپ یا سرپرست کو ولور کی رقم کا ایک حصہ ادا کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ اس رقم سے شادی کی ضروریات کا بندوبست کر سکے۔

شادی: شادی کے موقع پر خوشی و مسرت کے اظہار کے لیے جو کچھ کیا جاتا ہے۔ اس کا دارومدار فریقین، خاص طور پر دولہا والوں کی مالی حالت پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کے لیے کوئی خاص شرائط اور پابندی نہیں اگر دولہا کے گھر والے صاحب حیثیت ہیں تو شادی کی تقریب پر دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے۔ شادی خواہ کیسی بھی ہو اس میں شرکت کرنے والے خواتین اور مردوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اور اگر اس دوران چائے کا وقت آجائے تو چائے بھی پلائی جاتی ہے۔ ویسے عام رسم یہ ہے کہ دونوں گھرانوں میں سے چند نوجوان خواتین کسی عمر رسیدہ خاتون کی سرکردگی میں یہ کام انجام دیتی ہیں یہ خواتین گھر گھر جاتی ہیں اور شرکت کرنے والوں کو دولہا کے والدین کی طرف سے شرکت کی دعوت دیتی ہیں جس گھر میں یہ خواتین آپس میں تقسیم کر لیتی ہیں شہروں میں صرف وہی افراد شادی میں شرکت کرتے ہیں جن کو دعوت دی جاتی ہے۔ لیکن گاؤں میں تمام کا تمام گاؤں شریک ہوتا ہے۔ خواہ انہیں دعوت دی گئی ہو یا نہ دی گئی ہو وہ شادی اور موت میں شرکت کو ایک فرض سمجھتے ہیں اور کسی رسمی دعوت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

شادی کے موقع پر کھانا دلہن کے گھر میں ہی پکایا جاتا ہے۔ اس کے لئے تمام سامان ایک دن پہلے ہی دولہا کے گھر سے دلہن کے گھر پہنچایا جاتا ہے۔ کھانے کے سامان جس میں کھانے پینے کی تمام چیزیں سے لے کر پکانے کے برتن اور کھانا پکانے والے تک باقاعدہ ڈھول اور سرنا کے ساتھ دلہن کے گھر لے جائے جاتے ہیں اس موقع پر گاؤں کے نوجوان بھی تمام کاموں میں ہاتھ بٹھاتے ہیں۔

شادی سے ایک روز پہلے دلہن کے گھر آنے والی خواتین کے لئے کھانے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ اس طرح دولہا دلہن والے گھر میں آنے والی خواتین کے لیے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں اس رات بھی خواتین دولہا کے گھر جاتی ہیں اور اسے مہندی لگاتی ہیں دولہا کے گھر سے بھی خواتین مہندی لگانے کے لیے دلہن کے گھر جاتی ہیں۔

رقص و موسیقی: شادی کے دن کھانے میں شرکت کرنے والے صبح سے آنا شروع کرتے ہیں اور یہ سلسلہ دوپہر تک جاری رہتا ہے۔ دولہا والوں کی طرف سے مدعو کیے جانے والے لوگ عموماً دولہا کے گھر میں ہی جمع ہوتے ہیں جہاں سے وہ بارات کی صورت میں چلتے ہیں راستے میں ڈھول اور سرنا بجتا رہتا ہے۔ بندوقوں اور پستولوں سے ہوائی فائر کیے جاتے ہیں جب بارات دلہن کے گھر پہنچتی ہے تو ان کے لیے گھر کا دروازہ نہیں کھولا جاتا، دروازہ کھلنے پر دولہا پر پانی پھینکا جاتا ہے۔ بارات کے گھر میں داخل ہونے پر نوجوان لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر قبائلی رقص کرتی ہیں جسے ''شلا'' کہا جاتا ہے۔ بڑی عمر کی خواتین ایک بڑے دائرے کی صورت میں اتن کرتی ہیں اس موقع پر شادی کے وقت گائے جانے والا مشہور گیت ''بابولالہ'' عموماً دلہن کی رخصتی کے وقت گایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے کوئی خاص موقع نہیں ہے۔ اس گیت میں ''لالہ'' ''بابولالہ'' کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں اس گیت کے مصرعوں میں والدین سے جدائی، گھر، سہیلیوں سے دوری دولہا دلہن کی تعریف اور اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس گیت کی دھن بہت ہی غمگین ہے۔ جس کے سنتے ہی دلہن کی والدہ بہنیں اور ہمجولیاں رو پڑتی ہیں۔

نوجوان گھر سے باہر قبائلی رقص میں مصروف رہتے ہیں ڈھول پر ہاتھ تیز سے تیز پڑنے لگتے ہیں سرنا ایک دھن کے بعد دوسری دھن بجاتا ہے۔ قبائلی رقص کے علاوہ جوان آپس میں روایتی کشتی بھی لڑتے ہیں جسے ''غیڑ'' کہا جاتا ہے۔

کشتی اور نشانہ بازی: بعض قبائل میں نشانہ بازی کے مقابلے بھی ہوتے

ہیں اچکزئی قبائل میں کشتی لڑنے کی رسم عام ہے۔ پہلے جب تک دولہا والے دلہن والوں سے کشتی کا مقابلہ جیت نہ لیں، انہیں دلہن لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

ژوب کے قبائل میں جب تک بندوق سے نشانہ بازی کا مقابلہ جیت نہ لیا جاتا دلہن کی رخصتی نہیں ہوا کرتی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اب یہ رسمیں تقریباً متروک ہو چکی ہیں اور بہت کم نظر آتی ہیں۔

کور: دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد خواتین میں دلہن کے زیورات اور دیگر اشیاء کی نمائش کی جاتی ہے۔ اس موقع پر دلہن کا تمام سامان کسی کھلی جگہ رکھ دیا جاتا ہے۔ دلہن والوں کی طرف سے کوئی خاتون ایک ایک سامان اٹھائی جاتی ہے۔ اور خواتین کو دکھا کر ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہ فلاں رشتہ دار کی طرف سے دیا گیا ہے۔ یہ اعلان عموماً کپڑوں سے شروع کیا جاتا ہے۔ بعد میں زیورات اور گھریلو استعمال کی تمام چیزیں ایک ایک کر کے دکھائی جاتی ہیں دلہن کی سہیلیوں کی طرف سے دیئے گئے تحفے بھی نام لے کر دکھائے جاتے ہیں ہیں دلہن کو جہیز میں دیئے گئے سامان میں ''جھاڑو'' کے علاوہ تمام ضرورت کی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ان اشیاء کو " کور" کہتے ہیں جس کے معنی ہیں گھر یعنی دلہن کے گھر کا سامان۔

جھاڑو: چونکہ بدشگونی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ جہیز میں نہیں دیا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ پشتونوں میں ''جھاڑو'' سے متعلق جو محاورے مستعمل ہیں وہ سب اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتے (مثلاً عورتیں آپس میں جھگڑے کے وقت ایک دوسرے کو بددعا دیتے ہوئے کہتی ہیں ''کوردی جاڑوسہ'' ہے۔ یعنی تیرے گھر میں جھاڑو پھرے یعنی ہر چیز کا صفایا ہو جائے اور گھر بار اجڑ جائے۔)

بارات: باراتی جب چلتے ہیں تو بجاتے اور گاتے ہوتے ہیں اور جوں ہی دلہن کے گھر پہنچ جاتے ہیں تو ایک گیت جسے ''بابولالہ'' کہتے ہیں گانا شروع کرتے ہیں وہ اس میں دولہا کے اوصاف بیان کرتے ہیں جبکہ ان کے جواب میں لڑکی والی خواتین بھی ''بابولالہ'' گانا شروع کرتی ہیں اور وہ دلہن کے اوصاف بیان کرتی ہیں۔ کچھ قبائلی میں باراتی خواتین پر رنگ پاشی کا رواج بھی ہے۔ لیکن سب میں نہیں ہے۔ اس دوران دلہن پانی کے ایک لگن میں جس میں سبز گھاس بھی ہوتی ہے۔ ننگے پاؤں کھڑی ہوتی ہے اور ایک دوشیزہ کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہوتی ہے۔ جس میں دنبے کے دل کو پھر دیا گیا ہوتا ہے اور نوک پر پیاز اٹکایا گیا ہوتا ہے۔ باراتیوں کو شربت پلایا جاتا ہے اور ہرمل کی دھونی دی جاتی ہے۔ اور وہ برتن میں رقم رکھتے ہیں کچھ قبائل میں باراتیوں کے لئے جو کھانا لایا جاتا ہے۔ باراتی وہ کھانا نہیں کھاتے زیادہ سے زیادہ کوئی ایک نوالہ اٹھالے یہ کھانا کھانا پڑا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ باراتیوں کو واپسی پر لڑکے والے کھانا کھلاتے ہیں۔

دلہن کی فریاد: اس دوران دلہن کچھ شرط شوروئے ہوئے پڑھتی ہے۔ اور اس کو ''سوت'' کہتے ہیں جس میں وہ اپنے ''ماں باپ'' وغیرہ کی جدائی کے ذکر کے علاوہ اپنے مرحومین کا ذکر بھی کرتی ہے۔ ان اشعار میں اتنا سوز ہوتا ہے۔ کہ موجود خواتین رو پڑتی ہیں ایسا نہ کرنا دلہن کیلئے معیوب ہوتا ہے۔ ایک اور قسم کی شاعری بھی دلہن کرتی ہے۔ جس کو کاکڑی علاقوں میں چغیان کہتے ہیں اس میں اس کی فی البدیہہ اشعار بھی شامل ہوتے ہیں جس میں وہ اپنے گھر کے افراد کی جدائی کے علاوہ ان کی جانب سے اپنے حق میں کوتاہیوں کا ذکر بھی شامل ہوتا ہے۔

رخصتی: اس موقع پر دلہن کے لیے بیٹھنے کی جگہ کو اچھی طرح سجایا جاتا ہے۔ جسے تخت کہتے ہیں اور دلہن کو قیمتی کپڑے پہنائے جاتے ہیں اس موقع پر دلہن کا لباس عموماً اطلس یا کمخواب کا ہوتا ہے اور زری بنارسی چادر ہوتی ہے۔ دلہن کے ارد گرد چھوٹے بڑے سب جمع ہوتے ہیں دلہن کی کوئی قریبی رشتہ دار خاتون اس کے بال بناتی ہے۔ سر کے بیچ سے مانگ نکالی جاتی ہے۔ اور دائیں بائیں چوٹیاں رکھی جاتی ہیں۔ مانگ عموماً دلہن کا بھائی نکالتا ہے۔ اور مانگ نکالنے کے بعد مانگ میں سیندور ڈالی جاتی ہے۔ اس تمام عرصے میں دلہن برابر روتی رہتی ہے۔ اس کی سہیلیاں اور بہنیں بھی روتی جارہی ہیں۔ دلہن کی کمر کو اس کا باپ یا کوئی بزرگ ریشمی رومال یا چادر سے باندھتا ہے۔

دلہن کی تیاری کے بعد دولہا کے کپڑے کسی بڑی طشتری میں لاکر اسے دیئے جاتے ہیں۔ دولہا دوسرے کمرے میں جا کر شادی کے کپڑے پہنتا ہے۔ اور طشتری میں کچھ رقم رکھ دیتا ہے۔ دولہا کے اتارے ہوئے کپڑے کسی ضرورت مند غریب کو دیئے جاتے ہیں بعد میں دولہا کا سسر ریشمی چادر سے اس کی کمر باندھتا ہے۔ دولہا کو لاکر مہمانوں کے بیچوں بیچ بٹھایا جاتا ہے۔ اگر نکاح ہو چکا ہو تو اس موقع پر صرف دعا کر کے دلہن کی رخصتی کی تیاری کی جاتی ہے۔ شہری علاقوں میں یا جن جگہوں میں موڑ وغیرہ ہیں وہاں دلہن موٹر میں لے جائی جاتی ہے۔ اس مقصد کیلئے موٹر اچھی طرح سے سجائی جاتی ہے۔ اس پر بنارسی چادر ڈالی جاتی ہے۔ دلہن کو رخصتی کے وقت بنارسی چادر پہنائی جاتی ہے۔ اس چادر کے اوپر سفید ململ کی ایک اور چادر اوڑھائی جاتی ہے۔ جس کے چاروں گوشوں کو زعفران سے رنگا جاتا ہے۔ رخصتی کے وقت دلہن کے سر پر قرآن شریف پکڑا جاتا ہے۔ ایک بازو والد اور دوسرا بھائی پکڑے ہوئے ہوتا ہے۔ اس طرح دلہن آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی موٹر تک پہنچتی ہے۔ گھر سے رخصتی کے وقت دلہن کی سہیلیاں والدین اور بہنیں زور زور سے روتی ہیں موٹر

میں دلہن کے ساتھ اس کی ماں پھوپھی اور سسرال والے بھی ہوتے ہیں شہروں میں دولہا بھی اسی موٹر میں بیٹھتا ہے۔ لیکن دیہاتی علاقوں میں دولہا دوسری گاڑی میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ دور دراز علاقوں میں سجے ہوئے اونٹ یا گھوڑے پر دلہن کو لے جایا جاتا ہے۔ بارات کے روانہ ہوتے ہی ہوائی فائرنگ سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ بارات کے ساتھ ڈھول، سرنا والے ہوتے ہیں اور قبائلی رقص کرتے آگے آگے چلتے ہیں جس وقت بارات گاؤں سے باہر نکلنے والی ہوتی ہے۔ تو گاؤں کے لوگ جس میں اکثر نوجوان ہوتے ہیں بارات کے راستے میں رسی باندھ کر راستہ روک لیتے ہیں اور جب تک دولہا راستہ روکنے والوں کو شیرینی کے طور پر کچھ دے نہ دے، بارات کو راستہ نہیں دیا جاتا۔

دلہن کا استقبال: دلہن کے سسرال پہنچنے پر نیک شگون کے طور پر اس پر پانی چھڑکا جاتا ہے۔ دلہن کو آہستہ آہستہ گھر میں لایا جاتا ہے۔ اس کے گھر میں داخل ہوتے وقت دروازے کے اوپر ایک پاک صاف چادر میں قرآن شریف پکڑا جاتا ہے۔ اس قرآن شریف کے نیچے سے گزر کر گھر میں داخل ہو گھر میں قدم رکھتے وقت دلہن پہلے دایاں قدم رکھتی ہے۔ جو خوش قسمتی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ پہلے ہی کمرہ خوبصورتی سے سجایا جاتا ہے۔ کمرے کے عین وسط میں دلہن کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی جاتی ہے۔ اس جگہ مخمل کے قیمتی کپڑوں سے بنے ہوئے گدے اور تکیہ سے تخت نما جگہ بنائی جاتی ہے۔ دلہن کمرے میں داخل ہو کر اس جگہ بیٹھتی نہیں بلکہ کھڑی رہتی ہے۔ بعض قبائل میں جب دلہن اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہے تو ایک لگن نما برتن میں پانی رکھا ہوا ہوتا ہے۔ جس میں سبز گھاس بھی ہوتی ہے۔ دلہن نیک شگون کے لئے چند لمحوں کے لیے اس پانی میں ننگے ہاؤں کھڑی رہتی ہے۔ اس کے بعد اسے اپنی جگہ پر لے جایا جاتا ہے۔ یہاں کوشش کے باوجود دلہن نہیں بیٹھتی اس موقع پر دولہا کا بھائی یا والد دلہن کو تحفے کے طور پر کوئی زیور دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ جس کے بعد دلہن بیٹھ جاتی ہے۔ دلہن کے بیٹھ جانے پر دولہا کو کمرے میں لایا جاتا ہے اور دلہن کے ساتھ بٹھا دیا جاتا ہے۔ دلہن کے بیٹھنے پر اس کی گود میں کسی بچے کو بٹھایا جاتا ہے تا کہ وہ بانجھ نہ رہے لیکن اکثر خواتین اپنا بچہ نہیں دیتیں ان کے خیال میں بچے کو نقصان ہوتا ہے۔ بچہ نہ ملنے کی صورت میں اس کی جھولی میں بندوق رکھتے ہیں۔ بعد میں کوئی عمر رسیدہ خاتون یا دلہن کی والدہ قرآن شریف اور آئینہ لے کر آتی ہے۔ پہلے دونوں قرآن شریف پر نظر ڈالتے ہیں اور بعد میں آئینہ میں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے کی اس رسم کو ''آئینہ مصحف'' کہا جاتا ہے۔ آئینہ دیکھنے کی تقریب کے بعد اکثر خواتین کمرے سے نکل جاتی ہیں صرف قریبی عزیز اور رشتہ دار ہی کمرے میں رہتے ہیں رات کا کھانا دولہا اور دلہن ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے ہیں کھانا کھانے کے بعد دولہا اٹھ کر مہمان خانے میں چلا جاتا ہے۔ جہاں نوجوانوں کی مجلس جمی ہوئی ہوتی ہے۔ پہلے وقتوں میں اس موقع پر شہروں میں پیشہ ور گانے اور ناچنے والوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اب یہ رسم بالکل متروک ہو چکی ہے۔ گاؤں میں اس موقع پر گاؤں کے نوجوان رقص و سرود کی محفل جماتے ہیں قبائلی رقص ہوتا ہے۔ اور روایتی گانے کی محفل جسے بھنڈار کہتے ہیں منعقد ہوتی ہے۔ خوشی و مسرت کی اس محفل میں دولہا بھی شامل ہوتا ہے۔

سہاگ رات: پشتونوں کے اکثر قبائل میں دولہا شادی سے پہلے گھر سے بھاگ نکلتا ہے۔ اس طرح وہ کسی قریبی دوست کے گھر یا کسی گاؤں میں پناہ لے لیتا ہے اور باقی سب اس کو تلاش کرتے ہیں کئی کئی راتوں تک بھی دولہا غائب رہتا ہے۔ بالآخرہ ہمراز دوست کی مدد سے اسے تلاش کیا جاتا ہے۔ اس طرح سہاگ رات بھی پہلی رات سے تیسری چوتھی تک پہنچ جاتی ہے۔

رسم نکاح: جبکہ نکاح کے دوران بھی کاکڑ اور کچھ دوسرے قبائل میں دولہا ہاں نہیں کرتا جس کی وجہ سے نکاح کی یہ محفل رات سے صبح تک بھی چلی جاتی ہے۔ یا پھر کئی گھنٹوں طول پکڑتی ہے۔ اس دوران بھی ایک شغل کا سماں ہوتا ہے۔ دولہا کے دوست مذاق کرتے ہیں جملے کستے ہیں بلکہ مولوی تک کو ستایا جاتا ہے۔ دولہا کا باپ اور بڑے دولہا تو سمجھاتے اور ڈانٹتے ہیں اس طرح کے شغل اور ذہنی کوفت کے بعد جا کر نکاح کا عمل انجام پاتا ہے۔

دولہا کا ناشتہ: شادی کے دوسرے دن دلہن کے گھر والوں کی طرف سے ناشتہ جاتا ہے۔ اس ناشتے میں بہت ہی اہتمام کیا جاتا ہے۔ دیہی اور قبائلی علاقوں میں اس موقع کے لئے دنبہ ذبح کیا جاتا ہے۔ دنبے کا گوشت پکا کر ایک بڑے مشکیزے میں ڈلا جاتا ہے۔ مشکیزے میں گوشت کے اوپر مٹھائی جس میں نقل اور بتاتے ہوتے ہیں بھر دی جاتی ہے۔ مشکیزے کا منہ کس کر دولہا کے گھر بھیجا جاتا ہے۔ ناشتہ میں شریک عورتیں ہوتی ہیں شہروں میں ناشتہ بڑی دیگوں میں پکا کر بھیجا جاتا ہے۔ ناشتہ کرنے کے بعد دلہن کو کمرے سے باہر لایا جاتا ہے۔ اور سب سے پہلے پانی کے قریب لایا جاتا ہے۔ بعد میں آتشدان یعنی دولہا اور پھر گھر میں رکھے ہوئے آٹے کے پاس لایا جاتا ہے۔ دلہن ان تمام چیزوں سے کچھ نہ کچھ اٹھا لیتی ہے۔ ویسے پانی اور آگ کا تقدس شاید زرتشتی آئین کے قدیم اثرات کی وجہ سے ہوں۔

اس رسم کا مقصد دلہن کو گھر کے کھانے پینے میں شریک کرنا ہے۔ اس

تقریب کی ادائیگی میں دلہن کو بتایا جاتا ہے کہ اب یہ اس کا گھر ہے۔ وہ اس گھر کے کھانے پینے میں شریک ہوگئی ہے۔ گویا دلہن اس دن سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ اس رسم کے ختم ہونے پر دلہن اپنے کمرے میں بیٹھ جاتی ہے اور پھر گاؤں کی خواتین دلہن کو دیکھنے کے لیے آتی ہیں۔ اس موقع پر ہر خاتون دلہن کو نقدی کی صورت میں یا کوئی چیز منہ دکھائی کے طور پر تحفے میں دیتی ہے۔ رقم کے بدلے رقم اور چیزوں کے بدلے میں ویسی ہی اور اس سے بڑھ کر چیز دی جاتی ہے۔ دلہن دولہا کے قریبی رشتہ داروں پر مختلف قسم کے نام رکھتی ہے۔ ناموں کے سلسلے میں دلہن گھر کے بزرگوں کو احترام کے ناموں سے پکارے لیکن دولہا نہ تو اپنے اصل نام سے پکارا جاتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے نام سے۔ بیوی کے لیے شوہر ''وہ'' ہو کر رہ جاتا ہے۔ البتہ شوہر بیوی کو اس کے اپنے نام سے مخاطب کر سکتا ہے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد ایک دوسرے کو بچے کے نام کی مناسبت سے فلاں کے باپ اور فلاں کی ماں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

زیارت کرنا: شادی کے دسویں دن دلہن کو گھر سے باہر کسی بزرگ کے مزار پر لے جایا جاتا ہے۔ زیارت پر نذرانے کے طور پر کچھ نہ کچھ پکایا جاتا ہے۔ جسے سب مل کر کھاتے ہیں اور خیرات بھی کرتے ہیں۔ اس کے بعد دلہن کے والدین اپنی لڑکی کے سسرال والوں کی دعوت کرتے ہیں۔ رات کے کھانے میں دلہن بمعہ دولہا اور اس کے رشتہ داروں کے شرکت تو کرتی ہے لیکن دلہن رات وہاں نہیں گزارتی بلکہ سسرال والوں کے ساتھ اپنے گھر لوٹ آتی ہے۔ اس موقع پر دلہن کی گود میں کوئی خوبصورت بچہ نیک شگون کے طور پر دیا جاتا ہے۔ تاکہ خدا اسے بھی ایسا ہی خوبصورت اور تندرست بچہ عطا کرے۔

شادی بیاہ کی جن رسموں کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ سب بعینہ تمام قبائل میں یکساں مروج نہیں ہیں ان میں سے بعض رسمیں ایسی ہیں جو چند مخصوص قبائل میں رائج ہیں مثلاً آئینہ مصحف ولور یا مہر کی رقم کا خدا اور رسول کے واسطے سے کم کر دینا برتن میں پانی ڈال کر دلہن کر اس کو اس میں کھڑا کرنا یہ ایسی رسمیں ہیں جو کہ چند قبائل میں تو ہیں لیکن تمام پشتون قبائل میں مروج نہیں ہیں۔

قدوس درانی کا خیال ہے کہ: شادی بیاہ کی ان رسموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور رہا ہوگا جبکہ تمام رسمیں قبائل میں عام ہوں گی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقتصادی ضروریات اور شہری زندگی نے ان میں سے بہت سی رسموں کا خاتمہ کر دیا۔ ان رسومات سے پشتون قبائل کی ثقافتی زندگی اور روایات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پشتون قبائل زمانہ قدیم سے ایسے خطوں میں آباد رہے ہیں جہاں زندگی مسلسل تگ و دو اور جدوجہد کا نام ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ان قبائل کا ہر فرد شب و روز محنت میں لگا رہتا ہے۔ چونکہ ان قبائل کی زندگی کا زیادہ تر دارومدار زراعت اور مال مویشی پالنے پر ہے۔ اس لئے مختلف رسومات اور توہمات میں رد مشکلات اور ایک خوش آئند مستقبل کا تصور کیا جاتا ہے۔ ایک خاتون کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو اسے اچھا شوہر اور خوشحال گھر کا ملنا ہے۔ جہاں تنگدستی اور غربت کی مشکلیں نہ ہوں۔ شادی بیاہ کی تمام رسموں میں بار بار پانی کا چھڑکنا پانی کے برتن میں جس میں سبز گھاس رکھی ہو پیر رکھنا اور دلہن کا کھانے پینے کی جگہوں کا چکر لگانا اس کی گود میں تندرست بچہ دینا یہ سب رسمیں ان ہی احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ شادی بیاہ اور پیدائش کے موقع پر جتنی بھی رسمیں رائج ہیں ان سے قدیم پشتو ثقافت اور تمدن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً اگر ہم دلہن کی مانگ نکالنے اور اس میں سیندور بھرنے کی رسم کو دیکھیں یا بچے کی پیدائش پر دیوار یا دروازے پر سواستیکہ کا الٹا نشان نیلے رنگ سے بنانے کی رسم کو دیکھیں تو اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ پشتونوں کا تعلق زمانہ قدیم میں بت پرستوں سے نہیں رہا ہے۔ بلکہ وہ ایسے قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کا مذہب آریاؤں کا مذہب تھا۔ آریاؤں کے مذاہب میں وہ عقیدے پائے جاتے تھے۔ پہلا عقیدہ سورج کی پرستش کرنے کا تھا۔ اور دوسرا مذہب زرتشت یا زردشت تھا۔ زرتشت مذہب کے بارے میں تقریباً تمام محققین متفق ہیں کہ اس کے پیروکار بت پرستی اور شرک کے خلاف تھے۔ اس مذہب کے پیروکار توحید یعنی خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں پشتونوں کی ثقافت اور روایات میں چند ایسی روایات بھی دیکھنے میں آتی ہیں جن کا تعلق ہندومت اور بدھ مت کے مذاہب سے ہے۔ ان میں کچھ توہمات بھی شامل ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ پشتون تاریخ کے کسی دور میں ان بت پرستانہ مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے ہندومت اور بدھ مت کے پیرو پشتونوں کے علاقے کے مشرقی اور جنوبی حصوں کے پڑوس میں آباد تھے۔ باہمی میل جول کے نتیجے میں ان قبائل میں چند رسومات پشتونوں میں بھی مروج ہوئیں مثلاً پشتونوں کے بعض قبائل میں بچوں کا سر منڈوانے اور دو چوٹیوں کا رہنے دینا۔ پاؤں میں کڑے ڈالنا یا کانوں میں دھاگہ ڈالنا ایسی رسمیں ہیں جن کا تعلق ہندومت اور بدھ مت کے پیروکاروں کی ثقافت سے ہے۔ اسی طرح شمال اور مغربی علاقوں کے پشتونوں میں زرتشتی مذہب کی رسمیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان چند رسومات کے علاوہ پشتونوں کی ثقافت میں ایسی کوئی رسم دیکھنے میں نہیں آتی جو آریائی مذہب کے علاوہ کسی اور بیرونی مذہب سے تعلق رکھتی ہو۔ بہر حال آگے چل کر جب پشتونوں کی باقی رسومات ذکر آئے گا تو اس سے اس بات کا مزید ثبوت مل سکے گا۔ اور یہ بھی واضح ہوگا کہ کون سی رسم کا تعلق کس مذہب سے ہے۔

لوبی (کھیل)

پشتون قبائل کے کھیل ان کی ثقافتی زندگی اور جغرافیائی حالات کی عکاسی کرتے ہیں پشتون قبائل میں خوسی، اینڈہ، یا ہنڈہ، پٹ پٹانڑے (آنکھ مچولی)، غیبو (کشتی) اللہ دادا اور تور پٹانڑی زمانہ قدیم سے مقبول کھیل رہے ہیں ان کھیلوں میں سے بعض کھیل دوسرے قبائل میں بھی کھیلے جاتے ہیں مثلاً خوسئ کھیل اگرچہ عام طور پر پشتون قبائل ہی مقبول ہے لیکن افغانستان کے ان قبائل میں بھی جن کی زبان فارسی ہے۔ یہ کھیل دیکھنے میں آتے ہیں اسی طرح کا ایک اور مقبول کھیل "ہینڈہ" ہے۔ یہ کھیل بھی افغانستان کے فارسی بولنے والوں میں مقبول ہے۔ فارسی میں اس کھیل کا نام "خربہ خرگردان" رکھا گیا ہے۔ ویسے کھیلنے کا طریقہ اور کھیل کے اصول بالکل ایک جیسے ہیں بچوں میں کھیلے جانے والا بہت ہی مقبول کھیل پٹ پٹانڑے آنکھ مچولی کے نام سے برصغیر کے تقریباً تمام علاقوں میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ کھیل چشم پوشانک کے نام سے فارسی بولنے والے قبائل میں بھی مقبول ہے۔ کشتی یوں تو تقریباً تمام علاقوں میں لڑی جاتی ہے۔ لیکن پشتون قبائل میں پشتونوں کی کشتی اس لحاظ سے دوسروں سے مختلف ہے کہ اس میں ایک دوسرے کو نیفے سے پکڑ کر گرایا جاتا ہے۔ سندھ میں اس قسم کی کشتی کو ملی یا ملا کھڑا کہا جاتا ہے۔

غیبو: میلوں تہواروں اور خاص موقعوں پر قبائلی کشتوں کے باقاعدہ مقابلے ہوتے ہیں ان مقابلوں میں شرکت کیلئے دور دراز کے علاقوں سے پہلوان آتے ہیں اکثر علاقوں میں کشتی کے بڑے مقابلے عید کے موقع پر ہوتے ہیں اس موقع پر کشتی پر سب کو شکست دینے والا ہر سال بھر کے لئے تمام علاقے کا پہلوان قرار دیا جاتا ہے۔

ڈبرہ: ڈبرہ پتھر کو کہتے ہیں کشتی کے علاوہ دیہات میں پتھر پھینکنا بھی مقبول کھیل ہے۔ اس میں بھاری پتھر زیادہ سے زیادہ فاصلے تک پھینک کر طاقت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اکثر علاقوں میں پتھر اٹھانے کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ بھاری پتھر اٹھانے والا علاقے بھر میں طاقتور ترین شخص سمجھا جاتا ہے۔ گھڑ دوڑ اور نیزہ بازی کے مقابلے بھی تہوار اور میلوں کے موقع پر منعقد ہوتے ہیں۔

چناغ: ایک اور مقبول کھیل جو اکثر دعوتوں کے موقع پر کھیلا جاتا ہے۔ "چناغ ماتول" اس میں دعوت پکی ہوئی مرغی کی ٹھوڑی کو جو دو شاخہ کی شکل میں ہوتی ہے۔ شرط باندھ کر دو اشخاص دونوں جانب انگلیوں سے پکڑ کر توڑنے کی کوشش کرتے ہیں جس شخص کی طرف کی شاخ ٹوٹ جائے وہ شرط ہار جاتا ہے۔ چونکہ یہ مقابلہ اکثر دعوتوں کے موقع پر ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں شرط بھی دعوت کی ہی لگائی جاتی ہے۔ ہارنے والے شخص پر دعوت میں موجود تمام افراد کی دعوت لازم ہو جاتی ہے۔ یہ مقابلہ نہ صرف پاکستان کے پشتونوں میں عام ہے بلکہ افغانستان اور ایران کے علاقوں میں بھی بہت مقبول ہے۔

منگئ مات غوڑی توی اور پٹ پٹانی یعنی آنکھ مچولی لڑکیوں کے مقبول کھیل ہیں۔ آنکھ مچولی اللہ داد عموماً چاندنی راتوں میں کھیلے جاتے ہیں۔ ان کھیلوں میں پٹی کودئی اور نور پتانی ایسے کھیل ہیں جو صرف ژوب کے علاقے میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ "سپین ژریک" یعنی سفید داڑھی والا اور "لاڈو" دو ایسے کھیل ہیں جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ بلوچستان کے تمام پشتون قبائل میں کھیلے جاتے ہیں۔ ان دونوں کھیلوں کو ہم عام کھیل نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ دونوں کھیل اس وقت کھیلے جاتے ہیں جب علاقے میں خشک سالی کا خطرہ ہو۔ بارش نہ ہو رہی ہو اور کاشت کا موسم گزرنے کا خدشہ ہو جس علاقے میں آبادی کی اکثریت کا دارومدار زراعت اور مالداری پر ہو اور زراعت کے لئے پانی اور مالداری کے لئے چارے کا تمام دارومدار بارش کے پانی پر ہو تو ایسے علاقے میں وقت پر بارش کے نہ ہونے اور خشک سالی کے خطرے کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں کھیل اگرچہ اپنے کھیلے جانے کے انداز سے کھیلوں میں شمار ہو سکتے ہیں لیکن ان میں توہمات کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ ان دونوں کھیلوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ "سپین ژریک" لڑکے کھیلتے ہیں اور "لاڈو" لڑکیوں کے لیے مخصوص ہے۔ ان کھیلوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ عراق میں بھی مروج ہیں لیکن بلوچستان میں بولان کے علاقے میں آباد کرد قبائل میں یہ کھیل دیکھنے میں نہیں آتا البتہ تاریخ سے ہمیں اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح میں کرد قبائل اور پشتون قبائل ایک طویل عرصے تک بابل پر قابض رہے۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ سترہ سو سال قبل مسیح میں ان دونوں قبائل نے بابل سے کوچ کیا اور فلسطین، خلیج فارس سے ہوتے ہوئے ایران پہنچے ایران سے انکا ایک حصہ بلوچستان میں آباد ہوا۔ بہر حال سپین ژریک اور لاڈو کا کھیل ایران اور افغانستان میں اس وقت بھی موجود ہے۔ مختلف علاقوں میں اس میں الفاظ کی کچھ تبدیلی ضرور ہوئی ہے۔

سپین ژریک: اس میں ایک لڑکا سفید داڑھی لگا کر بوڑھا بنتا ہے۔ اور چہرے پر آٹا مل کر سفید کر لیتا ہے۔ ایک اور لڑکا شیطان بن کر لمبی ٹوپی پہن لیتا ہے۔ اور چہرے پر کالک لگا لیتا ہے۔ یہ دونوں سہ پہر کے وقت نکلتے ہیں ان کے پیچھے گاؤں کے لڑکے بھی ہوتے ہیں جو گھر گھر جاتے ہیں اور ہر گھر کے باہر ان میں سے ایک لڑکا زور سے پکارتا ہے۔

صد صدرہ دین صدر راولے پہ دین
چہ پرمخ یے خواجہ خضر ورسرہ موسیٰ کلیم

اس کے جواب میں باقی لڑکے زور سے اللہ آمین پکارتے ہیں۔

پہلا لڑکا پھر پکارتا ہے۔

خدایاور کرے دومرہ وزے لکہ شکر لکہ نیزے

خدایاور کڑے دومرہ غوا لکہ شکر لکہ ہوا

اس کے جواب میں پھر باقی لڑکے اللہ آمین کہتے ہیں۔

ان جملوں کو اگر معنی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کوئی خاص مطلب نہیں ادا کرتے بلکہ بالکل عام مہمل سی باتیں ہیں۔ یہ باتیں کیسے مروج ہوئیں اور ان سے بارش ہونے کا کیا تعلق ہے؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ان جملوں سے البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعائیہ جملے ہیں لیکن ان دعاؤں میں بھی کسی خاص بات کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اور نہ ہی ان میں کوئی ایسی بات پائی جاتی ہے۔ جس سے بارش کے لئے خواہش کا اظہار پایا جائے ان جملوں میں موسیٰ کلیم اللہ اور حضرت خضر کے ناموں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آغاز میں یہ دعائیہ جملے کسی اورنگ میں رہے ہوں اور بعد میں ان میں ان ناموں کا اضافہ کر دیا گیا ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ کہ ان قبائل نے سترھویں قبل مسیح میں بابل کا علاقہ چھوڑ دیا تھا۔ جبکہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے زمانے کا تعلق سولہویں صدی قبل مسیح ہے۔ جس زمانے میں یہ قبائل بابل سے فلسطین میں جا کر آباد ہوئے۔ اس کے تقریباً سوا ڈیڑھ سو سال بعد حضرت موسیٰ کی تعلیمات عام ہوئیں ممکن ہے۔ ان لوگوں پر ان کی تعلیمات کے اثرات ہوئے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان وجوہات کی بناء پر بعض مورخین ان قبائل کو یہودی قرار دیتے ہیں۔ بات سپین ژریک کی ہو رہی تھی غرض لڑکوں کا یہ گروہ سپین ژریک اور شیطان کے ساتھ مختلف گھروں پر پہنچتا ہے۔ گاؤں میں لوگ پہلے ہی سے سپین ژریک اور اس کی پارٹی کے نکلنے کی خبر پا چکے ہوتے ہیں جوں ہی پارٹی گھر کے دروازے پر آ کر اپنے مخصوص جملے ادا کرتی ہے۔ گھر کے لوگ جو کہ پہلے ہی سے تیار بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں کسی برتن میں پانی ڈال کر چپکے سے ان پر پھینکتے ہیں ان میں سے کوئی باہر نکلتے ہی پہلے تو سپین ژریک کی سفید نقلی داڑھی نوچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈاڑھی پر حملہ کرنے سے پہلے گھر کا مالک باہر آ کر سپین ژریک پر پانی پھینکتا ہے۔ اس تمام عرصے میں باقی لڑکے جو کہ سپین ژریک کے ساتھ آئے ہوئے ہوتے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

گھر کا مالک ڈاڑھی نوچنے میں ناکام ہونے پر تمام لڑکوں کو گھر میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ لڑکے اندر جا کر بیٹھ جاتے ہیں گھر والا بھی آ کر بیٹھتا ہے اور سپین ژریک سے روغمبڑ یعنی اس کی خیریت دریافت کرتا ہے۔ بات چیت کے دوران سپین ژریک سے اس کے بچوں کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ جس میں وہ بے شمار بچوں کا ذکر کرتا ہے اور چند بچوں کے نام بھی ویسے ہی بتا دیتا ہے۔ بوڑھا بنا ہوا بچہ اپنی پیٹھ پر کپڑا باندھ کر جھوٹ موٹ کا کبڑہ بھی بن جاتا ہے۔ خیریت کے دوران گھر کا مالک اس سے پوچھتا ہے کہ اس نے اپنی پیٹھ پر کیا چیز باندھ رکھی ہے۔ اس کے جواب میں سپین ژریک کہتا ہے کہ اس کی پیٹھ بچہ ہوا بادل اور بارش بندھی ہوئی ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر تم نے ہمیں کچھ دے دیا اور ہماری خدمت کی تو ہم تمہارے لئے بارش لے آئیں گے اس کے بعد گھر والے اسے نقدی یا آٹا چینی اور جلانے والے کی لکڑی دے دیتے ہیں۔ یہ چیزیں لینے کے بعد بچے اسی طرح باری باری دوسرے گھروں پر جاتے ہیں اور یہ اشیاء جمع کرتے ہیں۔ تین دن تک جو کچھ جمع ہوتا ہے۔ اس کی دیگیں پکا کر خیرات کر دی جاتی ہیں۔

بارش کے لیے سپین ژریک جہاں لڑکوں کا کھیل ہے۔ وہاں بارش کے لئے لڑکیوں کی طرف سے کھیلے جانے والے کھیل یا رسم کو لاڈو کہتے ہیں مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی خشک سالی سے نجات اور بارش کیلئے دعا۔

لاڈو: کپڑے کی ایک گڑیا بنائی جاتی ہے۔ جسے دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔ اس گڑیا کو "لاڈو" کہا جاتا ہے۔ سپین ژریک کا کھیل یا رسم سہ پہر کو شروع ہوتی ہے۔ اور اندھیرا ہو جانے تک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لاڈو میں چونکہ لڑکیاں شامل ہوتی ہیں اس لئے یہ کھیل دن کے وقت کھیلا جاتا ہے۔ کپڑے کی گڑیا جسے لاڈو کہتے ہیں اس کو دلہن کی طرح سجانے کپڑے اور زیور پہنانے کے بعد ایک لڑکی اسے گود میں اٹھا لیتی ہے۔ اور گاؤں کی دوسری لڑکیاں اس کے پیچھے ہو لیتی ہیں یہ تمام لڑکیاں گاؤں میں کسی ایک گھر کے باہر جا کر رک جاتی ہیں وہ لڑکی جو لاڈو میں اٹھائے ہوتی ہے۔ زور سے پکارتی ہے۔

لاڈو "لاڈو نگہ سہ غواڑی

ترجمہ: لاڈو لاڈو نگہ کیا مانگ رہی ہے۔

اس کے جواب میں باقی تمام لڑکیاں کہتی ہیں

لاڈو کنڈہ دہ میڑہ غواڑی

ترجمہ: لاڈو بیوہ ہے۔ اسے شوہر چاہئے

لاڈو اٹھانے والی لڑکی پھر پہلا فقرہ یعنی لاڈو لاڈو نگہ سہ غواڑی دہراتی ہے۔

اس کے جواب میں لڑکیاں پھر پکارتی ہیں

"دآسمان خوی او بہ غواڑی"

ترجمہ: آسمان کا گدلا پانی مانگ رہی ہے۔

پہلی لڑکی پھر اپنا فقرہ دہراتی ہے۔ جس کے جواب میں باقی لڑکیاں کہتی ہیں۔

دمزکی شنہ واشہ غواڑی

ترجمہ: زمین پر سبز گھاس مانگ رہی ہے

الغرض پہلی لڑکی یوں ہی اپنا فقرہ دہراتی رہتی ہے اور باقی لڑکیاں جواب دیتی رہتی ہیں۔ آخر میں جب باقی لڑکیاں مل کر یہ پکارتی ہیں کہ:

یوہ کاسہ اوڑہ غواڑی

ترجمہ: ایک تھالی آٹا مانگتی ہے۔ تو دعا مکمل ہو جاتی ہے۔

اس وقت گھر سے کوئی خاتون یا بچی نکل کر آتی ہے، عموماً خواتین ہی باہر آتی ہیں جو ان لڑکیوں کو اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ دیتی ہیں اس میں آٹا، چاول، گھی، دال، لکڑی اور نقدی وغیرہ سب چیزیں شامل ہوتی ہیں گاؤں کی لڑکیاں مسلسل تین دن تک اسی طرح مختلف چیزیں جمع کرتی ہیں اور جو کچھ جمع ہوتا ہے چوتھے دن پکا کر تقسیم کرتی ہیں اور پھر بارش کے لیے دعا مانگی جاتی ہے۔

''سپین ژریک'' اور ''لاڈو'' دونوں کھیل تقریباً ایک ہی مقصد کے لیے کھیلے جاتے ہیں یا اگر ہم ان کو کھیل کے زمرے سے نکال کر رسم کہیں تو دونوں رسمیں خشک سالی دور کرنے اور بارش کی دعا کے لیے ادا کی جاتی ہیں جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے۔ ان رسومات سے ایک بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پشتونوں کی زندگی میں جن کی اکثریت کا دارومدار زراعت پر ہے۔

زراعت بھی بارش کے رحم و کرم پر بارش کی کتنی اہمیت ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ رسم اور کھیل و تفریح پر مشتمل ملی جلی تقریب کی صورت میں بارش کی اہمیت واضح کرتی ہے۔

اس کے برعکس اگر ہم لاڈو کے فقروں کو دیکھیں تو یہ سب ایک واضح معنی اور مقصد لئے ہوئے ہیں لاڈو گود میں اٹھانے والی لڑکی بار بار اس فقرے کو دہراتی ہے۔ کہ ''لاڈو کو کیا چاہئے'' جس کے جواب میں باقی لڑکیاں مختلف جملے دہراتی ہیں ان جملوں میں بات یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ کہ لاڈو یعنی دلہن کو شوہر چاہئے پھر دوسری بات جواب دیا جاتا ہے۔ کہ لاڈو کو آسمان کے پانی کی ضرورت ہے۔ یعنی بارش چاہئے اس کے بعد لڑکیاں جواب دیتی ہیں کہ لاڈو کو سبز گھاس چاہئے اور آخر میں کہتی ہیں کہ لاڈو کو آٹا چاہئے ان تمام جملوں میں پیدائش آبادی خوشحالی کی تمنا اور بھوک اور افلاس سے نجات کا خیال ملتا ہے۔ اگر ہم لاڈو کو آبادی کی دیوی تصور کر لیں تو باقی تمام عوامل یعنی بارش، سبز گھاس، آٹا وغیرہ آبادی کی علامتیں ہیں۔

اس کے برعکس سپین ژریک میں ان باتوں کا تذکرہ نہیں کیا جاتا بلکہ سپین ژریک جب یہ کہتا ہے۔ کہ میری پیٹھ پر بارش اور ہوا بندھی ہوئی ہے۔ تو یہ تصور سامنے آتا ہے۔ کہ سپین ژریک بھی زمانہ قدیم کے کسی دیوتا کی نقل ہے۔ جو وقت کے ساتھ بدل کر موجودہ شکل اختیار کر گیا ہے۔

کوبئ: یہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ جب دنبہ ذبح کیا جاتا ہے۔ تو اس کی کلیجی ہو جری میں مضبوط باندھ دیتے ہیں بعض لوگ ریت میں دبا کر اوپر آگ جلا دیتے ہیں جو گرم ریت میں پک جاتا ہے۔ پھر نکال کر کھاتے ہیں بہت لذیذ ہوتا ہے۔ بعض کئی دن تک لٹکا دیتے ہیں اور پھر کسی وقت اتار کر پکا لیتے ہیں اور مزے مزے سے کھاتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں۔

خوسئ اور خیسئ: اس کھیل میں دو ٹیم ہوتے ہیں جس طرح فٹ بال کے دونوں طرف گول ہوتے ہیں اس میں دونوں طرف مٹی کا ایک ایک چھوٹا سا ٹیلہ بنا لیتے ہیں جو لات مارنے سے خراب کیا جا سکے دونوں ٹیمیں بالمقابل کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہاتھ سے ایک ٹانگ پکڑ کر ایک ٹانگ سے چلتے ہیں اور ایک۔

توہمات وشگون

موجودہ سائنسی دور میں اگرچہ توہمات پر لوگوں کا یقین کم ہوتا جا رہا لیکن اب بھی مشکل سے کوئی ایسا قبیلہ ہوگا یا ایسی کوئی قوم ہوگی جس میں توہمات کسی نہ کسی صورت میں موجود نہ ہوں۔ وہ ممالک بہت ہی ترقی یافتہ کہلاتے ہیں جہاں خواندگی کی شرح بہت زیادہ ہے۔ وہ بھی اپنا دامن توہمات سے نہیں بچا سکے۔ بلکہ ان دنوں مغربی ممالک میں تو یوں لگتا ہے۔ جیسے توہمات کا نیا دور شروع ہو گیا ہے۔ نیک اور بد ساعت اچھا اور برا شگون ان تمام باتوں کا وجود اب بھی پایا جاتا ہے۔ ہر سال بہت سی کتابیں ان موضوعات پر چھپتی ہیں اور پڑھی جاتی ہیں اس سلسلے میں یورپی ممالک میں تیرہ کے ہندسے کی نحوست کے بارے میں تو ہم قابل ذکر ہے۔

پشتون قبائل میں بھی دوسرے قبائل کی طرح توہمات پائے جاتے ہیں ان میں بھی اچھے اور برے کاموں کیلئے نیک اور بد شگون ملتے ہیں۔

توہمات کیا ہیں۔ ان کی صداقت کیا ہے؟ یہ شروع کیسے ہوئے؟

چونکہ ان کی ابتداء کا ہمارے موضوع سے تعلق نہیں ہے۔ اس لئے ہم صرف ان چند مخصوص توہمات کے ذکر تک ہی محدود رہیں گے جو پشتون قبائل میں عام طور پر پائے جاتے ہیں توہمات اور نیک و بد شگون کے لیے کوئی خاص وقت کوئی خاص گھڑی یا کوئی چیز مخصوص نہیں زندگی کی ابتداء سے لے کر زندگی کی انتہا تک ہر

قدم پر توہمات کا سامنا ہوتا ہے۔ البتہ ایک بات ضرور ہے۔ کہ جہاں دیہاتی زندگی میں یہ زیادہ ہیں وہاں شہری زندگی میں نسبتاً کم ہیں لیکن ہیں ضرور، سفر ہو یا روزمرہ کی گھریلو زندگی پیدائش ہو یا موت خوشی ہو یا غمی ہر موقع اور محل کے لیے کوئی نہ کوئی نیک یا بد شگون ضرور موجود ہے۔

مسافر: سفر پر جاتے ہوئے مسافر کے گھر سے باہر نکلتے ہی اس کے پیچھے پانی چھڑکنا ایک عام سی بات ہے۔ بعض لوگوں میں یہ رسم عام تھی کہ مسافر کے پیچھے بھوسہ چھڑکا جائے تو اس کا سفر خیریت سے گزرے گا۔ لیکن بھوسے کی رسم اب کم دیکھنے میں آتی ہے۔ البتہ پانی نہ صرف دیہات میں بلکہ اچھے خاصے شہری لوگ بھی چھڑکتے ہیں پانی پھینکنے کی یہ رسم صرف پشتون قبائل ہی میں نہیں بلکہ دوسرے قبائل میں بھی عام ہے۔

اگر آپ کی آنکھ پھڑک رہی ہے۔ تو بس سمجھ لیں کہ آپ کا کوئی عزیز مسافر آنے والا ہے۔

کوے کا کائیں کائیں کرنا بھی مسافر آنے کا شگون خیال کیا جاتا ہے۔ بعض علاقوں میں کوا اگر گھر کی دیوار یا چھت پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرے تو اسے مسافر کے آنے کا شگون سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے جگہ کی کوئی پابندی نہیں یہاں تک کہ اگر کوا کسی کے گھر کے اوپر سے اڑتا ہوا کائیں کائیں کرے تب بھی اس گھر کے لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ آج ان کا کوئی مسافر واپس آنے والا ہے۔ مسافر کے آنے اور کوے کے شگون کا تذکرہ لوک گیتوں میں بھی بہت عام ملتا ہے۔

ہتھیلی پر خارش: ہاتھ کی ہتھیلی کا تعلق نہ جانے دولت کے آنے اور جانے کے تصور کے ساتھ کیسے وابستہ ہوا ہے۔ اگر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں خارش ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ دولت کہیں قریب ہی ہے۔ یعنی دولت ہاتھ آنے والی ہے اور اگر یہی ہے۔ عمل بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ہو تو شگون اس کے بالکل برعکس سمجھا جاتا ہے۔ یعنی دولت آپ ہاتھ سے جانے والی ہے۔ عورتوں کے معاملے میں یہ شگون بالکل الٹ ہیں یعنی بائیں ہاتھ سے دولت آتی ہے۔ اور دائیں سے خرچ ہوتی ہے۔

پانی: پانی کے گلاس کا الٹ جانا اور پانی کا گرنا بھی نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کسی کو بن مانگے پانی کا گلاس لا کر پینے کے لیے دے تو اس پانی کے پینے سے انکار نہیں کیا جاتا ایسے پانی کو کسی دلی مراد کے بر آنے کا شگون سمجھا جاتا ہے۔

بد شگونی: سورج غروب ہونے کے وقت پانی پینے سے گریز کیا جاتا ہے۔ چولہے میں پانی نہیں انڈیلا جاتا ہے۔ یہ برا شگون سمجھا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے گھرانے کے رزق میں کمی آتی ہے۔ نیک شگونوں کے ساتھ بہت سے ایسے شگون بھی ہیں جنہیں برا اور بد سمجھا جاتا ہے۔ یعنی بہت سے لوگ پہننے کے کپڑوں کے رنگ میں بھی احتیاط برتتے ہیں۔ بعض سیاہ لباس پہننے سے گریز کرتے ہیں اور بعض سرخ لباس کو برا سمجھتے ہیں۔

سورج غروب ہونے کے بعد کسی کو نمک دینا بھی اچھا تصور نہیں کیا جاتا۔ نمک کے بارے میں یہ تصور صرف پشتون قبائل میں ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے قبائل میں بھی مروج ہے۔

سبز پودے اور درخت نہیں کاٹے جاتے کیونکہ اس سے کاٹنے والے یا اس کے کسی رشتہ دار یا قریبی عزیز پر کوئی نہ کوئی مصیبت آجاتی ہے۔ سبز پودے اور جھاڑیاں جلائی بھی نہیں جاتیں۔

بیٹھتے وقت ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کو بھی برا خیال کیا جاتا ہے۔

انگلیوں کے ناخن ہفتے کے چند مخصوص دنوں میں کاٹے جاتے ہیں اس کے علاوہ باقی دنوں میں ناخن کاٹنے کو بد شگونی سمجھا جاتا ہے۔ ناخن کاٹنے کے بعد پھینکے نہیں جاتے بلکہ کسی کپڑے یا کاغذ کے ٹکڑے میں لپیٹ کر گھر کے باہر زمین میں دفنائے جاتے ہیں۔

سر کے بال جو کھنگی سے ٹوٹ جاتے ہیں لپیٹ کر دیوار کی کسی شگاف میں احتیاط سے رکھ دیئے جاتے ہیں۔

نماز پڑھتے وقت جانماز کو خالی نہیں چھوڑا جاتا کیونکہ یہ خیال جاتا ہے۔ کہ خالی جانماز پر شیطان قبضہ کر لیتا ہے۔

کتے کے رونے کو بہت ہی منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا شگون ہے جو تقریباً تمام دنیا میں پایا جاتا ہے۔ کتا جب رونے لگتا ہے تو اس کی آواز سنتے ہی کہا جاتا ہے۔ تیرے منہ میں خاک یعنی تجھے موت آجائے۔

سہ پہر کے وقت سونے کو بھی بہت ہی منحوس خیال جاتا ہے۔

گھر سے باہر نکلتے وقت یا گھر میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں رکھنا اچھا سمجھا جاتا ہے۔

دو آدمیوں کے بیچ میں اگر کوئی سیاہ برتن یا کالی دیگچی پڑی ہوئی ہو تو اسے بھی منحوس خیال کیا جاتا ہے۔

کالی بلی کا راستہ کاٹنا بھی اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا۔

آگ کے چمٹے کو بجانا یا یوں ہی قینچی کو ہلا کر اس سے آواز پیدا کرنا یا چھابیوں کے گھچے کو ہلانا بھی اچھا شگون نہیں عام عقیدہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے گھر میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔

گرمیوں کے موسم میں رات کو درخت کے نیچے سونے کو بھی منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی سائنسی توضیح الگ ہے۔

مرغی کے اذان دینے کو بھی بہت ہی برا شگون سمجھا جاتا ہے اور ایسے مرغی کو فوراً ذبح کر دیا جاتا ہے۔

جمعہ کی رات کو پیاز کھانے سے پرہیز کیا جاتا ہے کیونکہ عام عقیدہ ہے۔ کہ اس رات رزق تقسیم کرنے والے فرشتے گھروں میں اترتے ہیں اور اگر کسی کے منہ سے کچے پیاز کی بو آرہی ہو تو اس کے قریب نہیں جاتے اس طرح وہ گھر اگلے ہفتے کے لئے رزق سے محروم رہتا ہے۔

گھر میں سیاہ رنگ کا کتا یا خرگوش پالنے کو بھی منحوس خیال کیا جاتا ہے۔

اکثر لوگ کبوتر کے شکار حلال کرنے یا گھر میں پالنے کو بھی اچھا نہیں سمجھتے کبوتر کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کی بددعا کو نقصان دہ سمجھا جاتا ہے۔

غروب آفتاب کے وقت پانی پینا ٹھیک نہیں اگر کوئی پی لے تو اس کا کوئی عزیز فوت ہوگا یہ وقت مردوں کو پانی دینے کا ہوتا ہے۔

سورج غروب ہوتے وقت کسی کو آٹا نہیں دیا جاتا کہ اس طرح گھر کی برکت جاتی ہے۔

بہار کے پہلے پھول کو چوما جاتا ہے۔

مکڑی کو مارنے سے گریز کیا جاتا ہے۔

جن بھوت چڑیل وغیرہ پر عقیدہ رکھتے ہیں

تعویذ گھنڈوں پر بری طرح یقین رکھتے ہیں یعنی زندگی کے تمام معاملات میں، زندگی صحت روزگار اولاد کامیابی پسند کی شادی کے حصول اور بلاؤں، مسائل، مشکلات، دشمنی، نظر بند، جسمانی ونفسیاتی بیماریوں وغیرہ سے نجات کے لیے تعویذ کو بہتر وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔

جوتے: جوتوں سے بھی اچھا اور برا شگون لیا جاتا ہے۔ جوتے اگر ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہوں یا پاؤں سے اتارتے وقت وہ ایک دوسرے کے پیچھے پڑ جائیں تو اسے سفر پر جانے کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ جوتوں کے رخ سے سفر کی سمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ اتارتے وقت اگر جوتے اس طرح آجائیں کہ دونوں کے سامنے کے رخ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں تو اسے برا شگون اور گھر میں جھگڑے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اگر جوتے الٹے پڑے ہوئے ہوں تو اسے بدنصیبی کا شگون سمجھا جاتا ہے۔

کمرے کے دروازے کے چوکھٹے پر کھڑا ہونا بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔

سفر پر روانہ ہوتے وقت گھر سے نکلتے ہوئے پیچھے سے کسی کو پکارنے کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔

یہ چند وہ توہمات ہیں جو تمام آریائی قوموں میں پائی جاتے ہیں جن میں ایرانی، بلوچی، سندھی یہاں تک کہ ان میں سے اکثر ہندوؤں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ شہروں میں زیادہ تر لوگوں کا یقین اب ان توہمات سے اٹھ چکا ہے۔ لیکن دیہات میں جہاں ابھی تک جدید تعلیم کی روشنی نہیں پہنچی اب بھی لوگ ایسے توہمات پر یقین رکھتے ہیں توہمات کا تعلق زیادہ تر لوگوں کے خیالات اور اعتقادات سے ہوتا ہے۔

زمانہ قدیم میں جب لوگوں کی معلومات بہت ہی کم تھیں اور علم کی روشنی نہیں پہنچی تھی لوگ مافوق الفطرت چیزوں پر زیادہ یقین رکھتے تھے یقیناً اسی دور میں یہ توہمات وجود میں آئے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حادثات، اتفاقات اور عقیدے کی کمزوری نے نہ صرف ان کی تعداد میں اضافہ کیا بلکہ ان پر لوگوں کا یقین پختہ بھی ہوگیا جوں جوں انسانی علم نے ترقی کی، لوگوں کے معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اور مختلف واقعات کی سائنسی اور عقلی وجوہات معلوم ہوتی گئیں تو ان توہمات میں کمی آتی گئی مثال کے طور پر دیہی علاقوں میں یہ عام عقیدہ ہے۔ کہ رات کو درختوں کے نیچے سونا یا سفر کرنا اچھا نہیں یہ ایک عام عقیدہ تھا کہ رات کو جن اور پریاں درختوں کے نیچے رہتی ہیں اور اس وقت اگر انسان وہاں چلا جائے تو وہ اسے گزند پہنچاتی ہیں سائنس نے اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کی وجہ رات کے وقت درختوں کا کافی مقدار میں "کاربن ڈائی آکسائیڈ" گیس کا خارج کرنا ہے۔ اور "آکسیجن گیس" کا جذب کرنا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ چونکہ انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس لئے رات کو درختوں کے نیچے سونے والے یا گھنے جنگلوں میں سفر کرنے والوں کو اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ اب جہاں تک تعلیم یافتہ افراد کا تعلق ہے۔ وہ اس سے بخوبی واقف ہیں لیکن دیہات کے سادہ لوگوں میں وہی پرانا عقیدہ ابھی تک قائم ہے۔ ان توہمات میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کے پیچھے مذہبی اعتقادات کا عمل دخل بھی ہے۔ مثلاً آگ پر پانی ڈالنا یا اس پر تھوکنے کو برا خیال کیا جاتا ہے۔ اس بات کا تعلق ممکن ہے۔ زرتشتی عقیدے سے ہو کیونکہ اس مذہب کے اثرات آریائی اس علاقے کے باشندوں پر اسلام سے پہلے بہت موجود تھے۔ چونکہ زرتشتی مذہب میں آگ کو بہت ہی مقدس سمجھا جاتا تھا سفر پر روانگی کے وقت اس کے پیچھے پانی چھڑکنے کی رسم ایرانیوں افغانوں اور برصغیر کی دیگر قوموں میں یہاں تک کہ ہندوؤں میں بھی عام پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے بھی قدیم تہذیب وثقافت میں پانی کا متبرک ہونا اور آبادی اور زرخیزی کی علامت سمجھا جانا ہے۔ قدیم آریائی اقوام کا ایک عقیدہ ان اقوام میں اس وقت بھی پایا جاتا ہے۔ وہ یہ تھا کہ بلی میں سات جانیں ہوتی ہیں یعنی بلی سات روحیں رکھتی ہے اور یہ سردیوں کی طوفانی راتوں میں بلا کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے رات کے وقت بلی سے لوگ خوف کھاتے ہیں۔

جانور: اُونٹ کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اونٹ جس گھر میں آتا ہے۔ اس گھر میں خوشحالی آجاتی ہے۔ اواس کے برعکس جس گھر میں گھوڑا ہوتا ہے۔ اس گھر میں عموماً بدحالی کا دور دورہ رہتا ہے۔ اس نیک اور بدشگونی کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ اونٹ بار برادری کے کام آتا ہے۔ اس کے ساتھ اونٹ خوراک کے معاملے میں بھی بہت ہی کم خرچ جانور ہے۔ اس کی خوراک کانٹے دار جنگلی جھاڑیاں ہیں جو کسی دوسرے کام نہیں آتیں لہٰذا اونٹ کے فائدے بہت زیادہ ہیں اور نقصانات بہت کم ہیں جبکہ گھوڑا عام طور پر دولت مند اور صاحب ثروت لوگوں کی سواری ہے۔ گھوڑے کی خوراک اور دیکھ بھال پر بہت خرچ آتا ہے۔ ان تمام اخراجات کے باوجود گھوڑے سے کوئی خاص آمدن نہیں ہوتی پھر دولت مند لوگ گھوڑے عام طور پر گھڑ دوڑ وغیرہ کے لئے پالتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر گھرانوں کو برے دن دیکھنے پڑتے ہیں یہی وجہ ہے۔ کہ اونٹ کو نیک اور اچھا خیال کیا جاتا ہے۔ اور گھوڑے کو اتنا اچھا نہیں سمجھا جاتا پشتون قبائل میں عام طور پر سننے میں آتا ہے۔ کہ جس گھر میں اونٹ آئے وہ گھر آباد ہو جاتا ہے۔ اور جس گھر میں گھوڑا آجائے وہ گھر آباد نہیں ہوتا۔

توہمات اور عقائد کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ جن کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی خوبی اور کام کی بات اور عقلی توضیح موجود ہوتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں ترقی یافتہ قوموں تک میں توہمات دیکھنے میں آتے ہیں خواتین میں تو یہ باتیں عام ہیں انسان زمانہ قدیم سے بدی اور شر سے خوفزدہ رہا ہے۔ نیکی اور اچھائی کی تلاش میں کوشاں رہا ہے۔ یہی باتیں ان تمام توہمات اور عقیدوں کے پیچھے کارفرما رہی ہیں۔

صحت کا شگون: ان توہمات میں سے بیشتر کا تعلق زمانہ قدیم میں طریقہ علاج سے بھی رہا ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتی آرہی ہیں۔ اس طرح قدامت اور تواتر نے ان میں صداقت پیدا کر دی ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ بچوں کی پیدائش پر نومولود کے گلے میں ادرک کا ٹکڑا باندھ دیا جاتا ہے اور ہرمل کی دھونی دی جاتی ہے۔ ان عقائد کا بھی قدیم یونانی اور ہندی حکمت سے تعلق ہے۔ اس دور میں بیماریوں کا علاج اس طرح کیا جاتا ہے۔ زچہ کے کمرے میں ہرمل کی دھونی سے کمرے کی بدبو ختم ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ دھونی جراثیم کش بھی ہے۔ اسی طرح ادرک کا استعمال دافع بلغم ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں لوگ ناخواندہ ہوا کرتے تھے اس لئے طبیب ان کی اس ناخواندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے علاج و معالجے کے طریقوں کے ساتھ کچھ نیک اور بدشگون اور عقائد وابستہ کر لیتے تھے۔ اس طرح لوگ ان نیک اور بدشگونیوں کی وجہ سے بہت سی چیزوں کے استعمال سے پرہیز کرتے یا مختلف چیزوں کا استعمال مختلف موقعوں پر کرتے رہتے جس کی وجہ سے صحت کے ماہرین کا مقصد پورا ہو جاتا۔

آگ پر پانی ڈال کر اسے بجھانے کو برا شگون خیال کرنے کے نظریہ کے پس منظر میں بھی یہی صحت کے اصول کارما ہیں زمانہ قدیم میں عموماً آگ کمروں کے بیچوں بیچ جلائی جاتی تھی۔ اکثر کمروں میں دھوئیں کے نکلنے کا بندوبست بھی نہیں ہوا کرتا تھا ایسی صورت میں آگ پر پانی ڈال کر بجھانے سے یقیناً کمرے میں بدبودار گیس اور غبار پھیل جاتا جو صحت کے لیے بھی مضر سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں کو ایسا کرنے سے منع کرنے کیلئے اس عمل کو برا شگون قرار دیا گیا اس طرح سادہ لوح لوگ ایک ایسے عمل سے رک گئے جو انسانی صحت کے لئے نقصان دہ تھا۔ لیکن تمام عقائد اور توہمات کے پیچھے یہ اصول کارفرما نہیں ہیں۔ اکثر توہمات ایسے ہیں جو محض واہمے ہیں اور اس سے بڑھ کر ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

بلوچستان میں جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے۔ توہمات اور عقیدے پہلے کی نسبت اب کم ہو گئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ پہلے بھی بلوچستان میں بہت سی ایسی توہمات تھیں اگر ایک علاقے میں پائی جاتی تھیں تو دوسرے علاقے میں نہیں تھے اسی طرح توہمات ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں بھی بعض اوقات یا تو بدل جائیں یا بالکل مختلف ہوتے بلوچستان میں پشتون قبائل میں کاکڑ تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ یعنی بلوچستان میں کاکڑ پشتونوں کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ اس کے بعد ''زین'' قبیلہ ہے۔ اور ''زین'' کے بعد پشتونوں کے دیگر چھوٹے چھوٹے قبیلے ہیں جو زیادہ پشین کے علاقے میں آباد ہیں۔ مثلاً سادات اور اچکزئی سادات ضلع پشین کے دیہات میں آباد ہیں۔ جبکہ اچکزئی قبائل عنایت اللہ کاریز گلستان کاریز قلعہ عبداللہ چمن اور توبہ کے علاقوں میں سکونت پذیر ہیں۔ اب اگر ان مختلف قبائل مروج توہمات اور رسومات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سی رسمیں اور توہمات ایسے ہیں جو ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں پہنچ کر بدل گئی ہیں اس کے ساتھ ہی ایسی رسمیں اور توہمات بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو بعض میں بالکل نہیں پائی جاتے یہاں ہم ان رسومات اور توہمات کا تذکرہ کریں گے جو اکثر قبیلوں میں پائے جاتے ہیں کاکڑ قبیلہ چونکہ تعداد میں سب سے زیادہ ہے۔ اس لئے زیادہ تر قدیم رسومات اور توہمات اس قبیلے میں پائے جاتے ہیں۔ کاکڑ قبائل شروع سے ہی ایسے علاقے میں سکونت پذیر رہے ہیں جو پشتونوں کا مرکز رہا ہے۔ یا پھر مرکز کے قریب رہا ہے۔

اس خصوصیت کی بناء پر علاقے بیرونی اثرات سے یقیناً محفوظ رہے ہیں اور یہی

وجہ ہے کہ زیادہ تر قدیم رسومات اور توہمات ان قبائل میں پائے جاتے ہیں۔ پشتو زبان اور لغت بھی ان ہی قبائل میں اب تک قدیم رنگ میں محفوظ ہے۔ رسومات اور زبان کے علاوہ ان علاقوں کے لوک گیتوں میں بھی اپنا ایک مخصوص ثقافتی پس منظر اور رنگ موجود ہے۔

موت کی رسمیں

بین کرنا: اس علاقے کا ایک مخصوص مرثیہ ہے۔ جسے عورتیں کسی موت پر بین کرتے وقت گاتی ہیں اس مرثیہ کو علاقائی زبان میں ''ساندی'' کہتے ہیں اس مخصوص مرثیے میں عورتیں بین کرتی رہتی ہیں اور مرنے والے کا سراپا اس کی خوبیاں اور کارنامے دہراتی رہتی ہیں۔ اگرچہ ہم مرثیہ کی اس مخصوص صنف کو پشتو عوام میں ادب شعری کا ایک حصہ کہہ سکتے ہیں لیکن اس کی خصوصیت اور ثقافتی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اسے پشتون ثقافت کا ایک حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس کا تعلق پشتونوں کے رسم ورواج سے ہے۔ ویسے بھی انسانی فطرت کے مطابق کسی عزیز کی موت پر غمگین ہونا شامل ہے اور اس کا اظہار مختلف قوموں، قبائل اور مذاہب میں مختلف ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیا کے انسانوں میں دو چیزیں بنیادی طور پر مشترک ہیں۔ ایک خوشی اور دوسرا غم۔

تدفین و فاتحہ: جہاں تک موت کی رسومات کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں پشتون قبائل میں موت کی رسومات عام طور پر وہی ہیں جو عام مسلمانوں میں مروج ہیں یعنی میت کا قبرستان لے جانا اور دفن کرا اور جس گھر میں موت واقع ہوئی ہو جیسا کہ عام رواج ہے۔ پہلے دن اس گھر میں کھانا نہیں پکایا جاتا قریبی رشتہ داروں کے گھر سے کھانا پکا کر بھیجا جاتا ہے۔ اسی طرح رشتہ داروں اور کبھی کبھار عزیز دوستوں کے ہاں سے دوپہر اور رات کا کھانا بھیجا جاتا ہے۔ تین روز گزرنے کے بعد جس کسی نے ان کا کھانا کرنا ہو تو وہ انہیں اپنے گھر لے جاتے ہیں اس موقع پر گاؤں کے دوسرے لوگ اور گاؤں کا مولوی بھی موجود ہوتا ہے۔ البتہ شروع کے تین دنوں کے دوران مرنے والے کے قریبی رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے لوگ کھانے کے وقت اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔

تیسرے روز یعنی سوم کے دن جب فاتحہ ختم ہو جاتی ہے۔ تو اس کے بعد فاتحہ پر بیٹھے ہوئے لوگ دوسروں کے ہاں کھانے پر جاتے ہیں۔ تیسرے دن متوفی کے ایصال ثواب کیلئے خیرات کی جاتی ہے۔ اس دن دوسرے لوگ کھانا نہیں بھجواتے فاتحہ کیلئے متوفی کے قریبی رشتہ دار اور گاؤں کا مولوی فاتحہ پڑھتے ہیں مردے کو دفنانے کے بعد قبرستان میں مسلمانوں کے عام رواج کے مطابق ''اسقاط'' جسے ''سرخاکی'' کہتے ہیں گندم کی صورت میں ادا کی جاتی ہے۔ لیکن یہ اسقاط اب کھجور یا نقد رقم کی شکل میں ہوتا ہے۔

کونڈہ: پشتونوں میں شوہر کے مرجانے کے بعد بیوہ اپنی مرضی سے دوسری شادی نہیں کرسکتی وہ یا تو اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ اور زندگی کے باقی دن اپنے بچوں کے ساتھ گزارتی ہے۔ یا شوہر کے بھائی یا کسی قریبی رشتہ دار سے شادی کرلیتی ہے۔ یہ شادی بھی وہ اپنی مرضی سے نہیں کرتی بلکہ اس کے دیور سسر یا دوسرے رشتہ دار اس کا فیصلہ کرتے ہیں اگر وہ خاندان سے باہر شادی کرنا چاہے تو اس کے شوہر کے بھائی یا قریبی رشتہ دار اس رشتے کے بدلے کچھ رقم لیتے ہیں عموماً ایسی شادی میں بچے بھی رکھ لئے جاتے ہیں۔ شادی کے معاملہ میں یہ پابندی نہ صرف بیوہ پر ہے۔ بلکہ پشتون قبائل میں نوجوان لڑکی بھی اپنی پسند اور مرضی کی شادی نہیں کرسکتی اور گھر کے بزرگ ہی تمام رشتوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔

قدریں

جرگہ: پشتون قبائلی معاشرے میں جرگہ کی بڑی اہمیت ہے۔ تمام انفرادی اور اجتماعی قبائلی جھگڑوں تنازعات کا تصفیہ جرگہ میں کیا جاتا ہے۔ جرگہ پشتون ثقافت میں نہایت قدیم رسم اور ایک قابل قدر نظام ہے۔ جرگہ کو ہم عام الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک قبائلی عدالتی نظام ہے جس میں قبائل باہمی جھگڑوں کے فیصلے کرتے ہیں اور ان فیصلوں کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے بلکہ اس کی حیثیت قانونی ہوتی ہے۔ جرگہ میں فریقین اپنی جانب سے اپنے ثالث مقرر کرتے ہیں باہم بیٹھ کر جھگڑوں کے فیصلے کرتے ہیں۔

چونکہ جرگے کا فیصلہ پورے گاؤں یا پورے قبیلے کا مشترکہ فیصلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا فیصلہ لازمی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

بدلہ (انتقام): پشتون قبائل میں قتل کا انتقام یا بدلہ لینا ایک لازمی امر سمجھا جاتا مقتول کے قریبی رشتہ دار اور لواحقین خاص طور پر بھائی اور بیٹوں کا یہ اولین فرض ہوتا ہے کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے قاتلوں سے بدلہ لیں گے اگر بدلہ لینے میں دیر ہو جائے یا اس سلسلے میں کوئی پس وپیش کی جائے تو پورے قبیلے میں وہ تضحیک کا نشانہ بنتے ہیں اور ایسے لوگوں کو بزدل اور بے سیال سمجھا جاتا ہے۔ انتقام یا بدلہ مقتول کے اپنے قریبی رشتہ دار خود لیتے ہیں۔ اس کام کے لیے کرائے کے لوگ استعمال کرنے کو برا سمجھا جاتا ہے۔ سیاہ کاری کی صورت میں مرد اور عورت دونوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ اور اس صورت میں انتقام

نہیں لیا جاتا۔ قتل کی صورت میں قاتل کے رشتہ دار گاؤں کے معتبرین سید اور ملاؤں کو لے کر مقتول کے گھر عذر خواہی اور معافی کے لئے جاتے ہیں اس صورت میں بھی معاملہ جرگہ کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ جرگہ عموماً ایسی صورت میں قاتل کی بہن یا بیٹی یا اگر بہن اور بیٹی نہ ہو تو دوسری رشتہ دار لڑکی مقتول کے لڑکے یا بھائی سے بیاہنے کی شرط عائد کرتا ہے اور اس کے ساتھ ایک مخصوص رقم خون بہا کے طور پر مقتول کے لواحقین کو دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس طرح دشمنی دوستی میں بدل جاتی ہے۔ اور فریقین میں مصالحت ہو جاتی ہے۔ ورنہ بصورت دیگر انتقاماً قتل در قتل کا یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا ہے۔

آر: اگرچہ آر کی رسم اب دیکھنے میں نہیں آتی لیکن پرانے وقتوں میں اس رسم کا وجود تھا ''آر'' کو ہم اگر نوجوانوں کی معاشرے کے اصول سے بغاوت کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اگر کسی نوجوان کے لئے اس کے والدین کسی لڑکی کا رشتہ لے کر جاتے اور باوجود ہر قسم کی شرائط کے قبول کرنے کے بھی لڑکی کے والدین رشتہ دینے سے انکار کرتے تو ایسی صورت میں بعض اوقات وہ نوجوان بندوق اٹھا کر لڑکی کے گھر کے باہر ہوائی فائر کرتا اس طرح فائرنگ کرنے سے اس مقصد یہ ہوتا ہے کہ فلاں لڑکی اس کی ملکیت ہے۔ اور وہ اسے بزور بازو حاصل کرے گا۔ لہٰذا کوئی دوسرا اس سے شادی کرنے کی جرات نہ کرے ورنہ یقیناً دشمنی مول لے گا اس کے بعد عموماً اس لڑکی کا کوئی رشتہ مانگنے نہیں آتا اور لڑکی یوں ہی والدین کے گھر بیٹھی رہتی یا پھر مجبور ہو کر اس کے والدین اس کا رشتہ اسی نوجوان سے کر دیتے اگر کبھی یوں ہوتا کہ کوئی اور نوجوان اس لڑکی کا رشتہ مانگنے جاتا یا اس کے والدین لڑکی کا رشتہ کسی اور سے کر دیتے تو فائرنگ کرنے والے اور اس کے درمیان دشمنی ہو جاتی جس کا انجام اکثر قتل و خونریزی ہوتا لڑکی کے گھرانے والے بھی فائرنگ کرنے والے لڑکے کا جانی دشمن بن جاتے ہیں۔ کیونکہ اس نے اپنے اس فعل سے ان کی بے عزتی کی ہوتی اگر کبھی کوئی نوجوان ایسا کر بھی لیتا تو گاؤں کے معتبرین کوشش کرتے کہ معاملہ صلح وصفائی سے طے پا جائے اور ایسے موقعوں پر لڑکے والوں کو بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑتا اور بعض اوقات انہیں اپنی کسی لڑکی کا رشتہ بھی تاوان کے طور پر دینا پڑتا۔

آر کی رسم دیکھنے میں ایک رومانوی سی بات لگتی ہے۔ جس میں محبت کرنے والا نوجوان مجبور ہو کر بغاوت پر اتر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت بات یہ نہیں پشتون قبائلی زندگی میں نوجوانوں کے درمیان رومان کے لئے کوئی جگہ نہیں اگر ہم اس رسم پر ذرا غور کریں تو ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ بغاوت درحقیقت نوجوان کی خودداری اور عزت نفس کے تحفظ کا اظہار ہے۔ قبائلی معاشرے میں کسی غیر لڑکی کا نام لینا آسان نہیں ہر نوجوان اس اقدام کے سنگین نتائج سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اس طرح کا انتہائی قدم اٹھانے والا کوئی معمولی شخص نہیں ہوتا جو نوجوان یہ قدم اٹھاتا ہے۔ وہ یقیناً بہادر نڈر اور خودی کے جذبے سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کے لئے دوسروں کی دشمنی مول لینا معمولی بات ہے۔ لیکن وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ گاؤں کے نوجوان اس کا مذاق اڑائیں اور طعنے دیں اور وہ ایک دوسرے سے کہیں کہ دیکھا فلاں نے اپنی لڑکی کا رشتہ فلاں کو دینے سے انکار کر دیا لہٰذا اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے وہ قدم اٹھاتا ہے، یہ وہ حقیقی وجہ ہے جو اس نوجوان کو اس طرح خطرناک قدم اٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔ رشتہ سے انکار نہ صرف اس کی بے عزتی ہے۔ بلکہ اس کے والدین جو رشتہ مانگنے جاتے ہیں ان کی بھی بے عزتی تصور کی جاتی ہے اور پشتون کو عزت سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔

بول: بلوچستان کے کاکڑ قبائل میں ''بول'' (زبان دینا) یعنی قول و قرار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پشتون قبائل میں بہت سے ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں جہاں ایک بار کئے ہوئے وعدے کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دی گئی ہیں ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے ہیں جہاں اپنے بیٹے کے قاتل تک کو پناہ دینے کا وعدہ کیا گیا تو اسے آخری وقت تک نبھایا گیا اگر کوئی کسی علاقے میں جرم کر کے دوسرے علاقے میں جا کر پناہ مانگے تو ایسی صورت میں اگرچہ پناہ نہیں دی جاتی لیکن مجرم کو دوسروں کے حوالے بھی نہیں کیا جاتا وہ مجرم کو کھانا وغیرہ کھلا کر اور پھر اپنے کچھ لوگ اس کے ساتھ کر کے اسے بخیریت اپنے علاقے سے گزارتے ہیں ایسے لوگوں کو جو حفاظت کیلئے اس کے ساتھ جاتے ہیں بدرکہ یا بدرگہ کہا جاتا ہے۔ اگر مہمان اپنے ساتھ کسی خاتون کو لے کر آجائے اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ اس عورت کو اغوا کر کے لے آیا ہے۔ تو ایسی صورت میں عورت کے رشتہ داروں کو اطلاع کر دی جاتی ہے۔ مہمان بدستور پناہ میں رہتا ہے۔ البتہ عورت گاؤں کے کسی معتبر کے گھر میں رکھی جاتی ہے۔ رشتہ داروں کے آجانے پر گاؤں کے معتبرین جرگہ کرتے ہیں اس طرح جرگہ میں فریقین کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ فیصلہ ہو جانے پر میزبان گاؤں والے ایک پرتکلف دعوت کا بندوبست کرتے ہیں اور اس طرح تمام رنجشیں ختم ہو جاتی ہیں کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر فریقین میں سے ایک کمزور ہو اور کوئی جرم کرنے کے بعد دوسرے فریق کے اثر و رسوخ اور حیثیت کو دیکھتے ہوئے اس سے خوفزدہ ہو تو دنبہ لے جا کر دوسرے کے گھر کے دروازے کے سامنے ذبح کر دیتا ہے۔ دنبہ لے جاتے وقت وہ گاؤں کے سیدوں اور ملاؤں کو ساتھ لے جاتا ہے۔ لوگ دنبہ ذبح کرنے کے بعد دوسرے فریق کے پاس

مجرم کو لے جاتے ہیں اور اسے ان چیزوں کا واسطہ دیتے ہیں بعض اوقات وہ قرآن شریف بھی ساتھ لے جاتے ہیں ایسی صورت میں اکثر طاقتور فریق جرگہ کرنے پر راضی ہوجاتا ہے۔ اگر کبھی بدقسمتی سے طاقتور شخص اپنی ضد پر قائم رہے اور یہ تمام باتیں بے اثر ثابت ہوں تو بدی (دشمنی) قائم رہتی ہے۔ اور سالہا سال تک فریقین ایک دوسرے کو قتل کر کے بدلہ لیتے رہتے ہیں یوں بھی ہوا ہے کہ گھرانے کے گھرانے انتقام کی آگ میں جل کر تباہ ہوگئے ہیں اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کمزور فریق انتقام کے خوف سے مجبور ہوکر اپنا علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔ ان بدیوں کی وجہ سے کبھی کبھار خاندان کے خاندان تباہ ہوجاتے ہیں اور کچھ دشمنیاں سالہا سال دوام پاتی ہیں جو صرف ایک ضد ہٹ دھرمی یا جاہلانہ غیرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

طلاق: طلاق کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ طلاق شوہر اور اس کے رشتہ داروں اور بیوی اور اس کے رشتہ داروں دونوں خاندانوں کے لئے بے عزتی کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے پشتونوں میں بہت کم طلاق دیکھنے میں آتی ہے۔ اگر کبھی کوئی ایسی بات ہوجائے تو دونوں فریقوں کے مابین دشمنی ہوجاتی ہے۔ طلاق دینے کے لیے واضح ثبوت اور وجوہات کا ہونا لازمی ہے۔ گاؤں کے معتبرین کے لئے وجوہات کا جاننا بہت ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ طلاق کوئی معمولی بات نہیں ہوتی دونوں گھرانوں کے مستقبل پر بھی اس کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ پشتون گھرانوں میں اس طرح کے خانگی جھگڑے عدالتوں کی بجائے جہاں خواتین کا آنا جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ باہمی طور پر طے کئے جاتے ہیں۔

تربور: پشتونوں میں تربور کزن کو کہتے ہیں لیکن تربور ایک اصطلاح ہے۔ جس کے معنی اس ''سیالی'' یا برابری کے ہیں یعنی کچھ بھی ہو تربور کے آگے خود کو کمزور اور نیچا نہیں دکھانا چاہیے ان کے درمیان ایک سرد جنگ اور خفیہ دشمنی چلتی ہے۔ جس کو تربور گلوی کہتے ہیں۔ پشتو لوک شاعری میں اس موضوع پر بہت مواد حاصل جاتا ہے۔

پردہ: پشتون معاشرے میں پردے کی پابندی بہت سختی سے کی جاتی ہے۔ شادی شدہ یا غیر شادی شدہ دونوں قسم کی خواتین گھر سے باہر بہت کم نکلتی ہیں اور اگر نکلتی بھی ہیں تو کسی ضروری کام سے دوسروں کے گھر جاتے وقت وہ برقعہ پہنتی ہیں جس کو بوغرہ کہتے ہیں چادری زیادہ تر سفید لٹھے سے بنائی جاتی ہے۔ جس کے سر پر پہننے کے لئے کپڑے کی ٹوپی لگی ہوتی ہے۔ جس کو رخچن کہتے ہیں۔

قندھار کے علاوہ پشین کے علاقہ میں بھی سبز رنگ یا نسواری رنگ کے کپڑے سے چادر بنائی جاتی ہے۔ بلوچستان کے بیشتر علاقوں میں جس میں ژوب، لورالائی اور پشین، موسیٰ خیل کے کاکڑ ترین اور سادات قبائل شامل ہیں خواتین سر پر بڑی سی چادر اوڑھتی ہیں جس سے چہرہ ڈھانپ کر پردے کا کام لیا جاتا ہے۔ کوئٹہ، ژوب، لورالائی اور پشین کے علاقوں میں آباد پشتون قبائل کی خواتین اپنے دیور سے بھی پردہ کرتی ہیں۔ لیکن بعض گھرانوں میں جہاں سب آپس میں رشتہ دار ہوتے ہیں ایک دوسرے سے پردہ نہیں کیا جاتا۔

پیغور اور لغاز: طعنہ دینا جسے پشتون پیغور کہتے ہیں اور طنز کرنا جسے پشتو میں لغاز کہتے ہیں پشتون قبائلی میں بہت برے سمجھے جاتے ہیں اس کے بہت خطرناک نتائج نکلتے ہیں پشتون رسم و رواج میں ہر بات ہر فعل اور ہر اقدام جو کہ پشتونولی کے خلاف ہو اسے پیغور سمجھا جاتا ہے۔ پشتونولی بہت ہی وسیع لفظ ہے۔ پشتو معاشرے میں اس لفظ کے بے شمار معنی ہیں ہر وہ اچھا فعل جو پشتون ثقافت اور رسم و رواج کے مطابق پشتونولی کے دائرے میں شامل ہے۔ ہر وہ فعل جو اس کے برعکس ہو اسے پشتونولی کے دائرے سے خارج سمجھا جاتا ہے۔

بہادری پشتونولی کی علامت ہے۔ اور ڈرپوک اور بزدل انسان کو پشتون قبیلے خارج سمجھا جاتا ہے اور اس کا یہ فعل پشتونولی کے دائرے سے باہر گردانا جاتا ہے۔ کسی کے لئے اس سے بڑھ کر تعریفی جملہ نہیں ہوسکتا کہ اس کے بارے میں کہا جائے کہ فلاں بڑا پشتون ہے۔ پشتون سب سے اہم صفت ہے۔ اور اس میں تمام اچھے افعال شامل ہیں قبائلی زندگی میں قول و فعل کی ہم آہنگی سب سے بڑی خوبی جانی جاتی ہے۔

دوستی سرعام کی جاتی ہے اور دشمنی بھی سب کے سامنے کی جاتی ہے۔ منافقت ایک قسم کی گالی سمجھی جاتی ہے۔ ہر برا فعل پیغو سمجھا جاتا ہے اور ہر بری بات پر طنز کیا جاتا ہے۔ جس فرد کو طعنہ دیا جاتا ہے۔ یا اس پر طنزیہ جملے کسے جائیں ایسا شخص دوسرے الفاظ میں پشتونولی کے دائرے سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جس شخص کو طعنہ دیا جائے یا اس پر طنز کیا جائے وہ اپنی عزت کی حفاظت کرنے کے لیے مرنے کیلئے تیار ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات طعنہ دینے اور طنز کرتے پر دشمنیاں شروع ہوجاتی ہیں اور سالہا سال تک چلتی رہتی ہیں۔

سیالی: یہ پشتو زبان کا وہ لفظ ہے جس کا تعلق کسی پشتون کی انا اور خودداری سے ہے۔ سیالی یا سیالداری مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

سیالداری کے لفظی معنی ہیں اپنے رشتہ داروں اور عزیز و اقرباء کے برابر ہونا عام بول چال میں سیالداری ہمسری اور رقابت دونوں معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ سیالداری کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پشتو زبان میں اس کے

بارے میں بے شمار محاورے اور ضرب المثال مشہور ہیں مثلاً ایک عام کہاوت ہے کہ اگر سیال دوسرے سیال سے پیچھے رہ جائے تو اس کے کان کاٹنے چاہئیں۔ یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو سیال کا دوسرے سیال سے پیچھے رہ جانا اور دوسری بات کان کاٹنا سیال یہاں عزیز اور رشتہ دار کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی محلہ میں رہنے والے یا ہمسایوں یا قبیلے کے دوسرے افراد کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کہاوت میں کہا گیا ہے کہ سیال کو دوسرے سیال کے برابر ہونا چاہئے کسی معاملے میں اسے اس سے کمتر نہیں ہونا چاہئے اپنے سیال سے کسی بھی معاملے میں کم حیثیت رکھنے کو ایک طرح کا پیغور یعنی طعنہ سمجھا جاتا ہے۔ کان کاٹنا پشتو زبان میں انتہائی بے عزتی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ غرضیکہ سیال سے کمتر ہونے کو بہت ہی برا سمجھا جاتا ہے اور اسے انتہائی بے عزتی تصور کیا جاتا ہے۔

سیالداری کے مثبت اور منفی دونوں ہیں۔ ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ پشتون ایک دوسرے کے برابر ہونے اور ایک دوسرے کی طرح زندگی بسر کرنے کیلئے مسلسل جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں اس طرح معاشرے میں ایک صحت مند مسابقے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اکثر اوقات صرف نام ونمود اور ایک دوسرے کی رقابت میں بے جا اخراجات کی وجہ سے ہمیشہ قرضدار رہتے ہیں اکثر اوقات ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی دوڑ میں بدگمانیاں او دشمنیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

پشتون قبائل سیالداری اپنے پشتون قبیلوں کے ساتھ ہی کرتے ہیں دوسری قوموں کے ساتھ سیالداری نہیں کی جاتی اس کے علاوہ عام طور پر اچھے کاموں میں کی جاتی ہے۔ ہر وہ کام جس میں نام اور عزت حاصل ہو اس میں سیالداری یعنی ہمسری کی جاتی ہے۔ برے کاموں میں جس میں بدنامی ہو ہمسری نہیں کی جاتی سیالداری کرنے کے مختلف طریقے ہیں مثلاً اگر کوئی اپنے بیٹے کی شادی بہت دھوم دھام سے کرتا ہے اور اس میں گاؤں بھر کے لوگ شامل ہوتے ہیں تو دوسرا شخص جو اپنے آپ کو دوسروں سے کمتر نہیں سمجھتا وہ بھی اپنے بیٹے کی شادی اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ دھوم دھام سے کرے گا اور اس سے زیادہ لوگوں کو مدعو کرے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص اپنی لڑکی کے پانچ ہزار روپے ولور لیتا ہے۔ تو دوسرا شخص دس ہزار روپے رکھے گا گاؤں کا نوجوان سب سے زیادہ ولور دے کر شادی کرے یا جس لڑکی کے بدلے زیادہ ولور ملے دونوں کے لئے یہ بات قابل فخر ہوتی ہے۔

سیالداری باہمی برابری اور احترام کے معنوں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ ایک پشتون خواہ کتنا ہی غریب اور مفلوک الحال ہو سیالداری اور خودداری کے جذبے سے سرشار ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کسی سے کمتر تصور نہیں کرتا یہی وجہ ہے۔ کہ پشتون معاشرے میں خان اور بزگر (مزارع) دونوں ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں غریب سے غریب گھرانے میں بھی موت واقع ہو تو گاؤں کا خان خود قبرستان میں موجود ہوگا بلکہ اکثر جگہوں میں تو خان اہل خانہ کے ساتھ تین دن تک فاتحہ پر بیٹھتا ہے۔

پشتون معاشرے میں عام لوگ یا مزارع لوگ خان کے ہاتھوں کو بوسہ نہیں دیتے اور نہ ہی ان کے پیر پکڑتے ہیں اگر کسی غریب شخص کی بیٹی یا بہن کو خان یا خان کا بیٹا اغوا کرے تو ایسی حالت میں بدلہ لینے کے لیے تمام گاؤں غریب کا ساتھ دے گا۔

اسی طرح اگر کوئی غیر کسی کے پاس آکر پناہ لے اور اسے اس دوران کوئی نقصان پہنچ جائے تو یہ بھی بہت بڑی بے عزتی سمجھی جاتی ہے۔ جس کے لئے لوگ "پیغور" دیتے ہیں غرضیکہ پشتون معاشرے میں ایک دوسرے کا احترام کرنا اور مروجہ رسم ورواج کی پابندی لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اس کی خلاف ورزی کو بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اور قابل طعن وتشنیع ہے۔ جسے برداشت کرنے کے لیے کوئی پشتون تیار نہیں ہوتا۔

پیغور یا طعنہ کی طرح لغاز یعنی طنز کو بھی بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ کسی کا مذاق اڑانا اور اس پر ہنسنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اکثر اوقات اس کے بہت سنگین نتائج برآمد ہوتے ہیں سیالداری میں کبھی کبھار حسد اور عناد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کو پشتون معاشرے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

پیغور یا طعنہ ایسی جگہوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جہاں کسی کی بے عزتی ہو اور وہ اس بے عزتی کا بدلہ نہ لے سکے ایسے موقعوں پر اسے اکثر یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ فلاں نے فلاں کے ساتھ ایسا سلوک کیا لیکن اس نے کچھ نہیں کیا یعنی وہ اپنا بدلہ نہیں لے سکا پیغور یعنی طعنہ کے ردعمل کے طور پر ایک غریب شخص امیر سے امیر اور بڑے سے بڑے شخص سے ٹکراتا ہے۔

اشر: اشر یعنی اپنی مدد آپ کا رواج بلوچستان کے تقریباً تمام قبائل میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ آج اپنی مدد آپ کے جو اصول دیہی ترقی کے مختلف منصوبوں کے سلسلے میں پڑھائے جاتے ہیں ان سے ہمارا دیہی معاشرہ عرصہ دراز سے آشنا چلا آرہا ہے۔ قبائلی زندگی ایک اکائی کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں تمام معاشرہ ایک ہوتا ہے۔ تمام افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں ایک کی خوشی سب کی خوشی ہوتی ہے۔ کسی ایک فرد کا غم تمام معاشرے کا غم تصور کیا جاتا ہے۔ سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں اس کے برعکس شہروں میں جدید تہذیب کی روشنی نے

اندھیرا پھیلایا ہے۔ جہاں ذرائع آمد و رفت کی جدید سہولتوں کے باوجود انسانوں میں باہمی فاصلے روز بروز بڑھ رہے ہیں انسان اپنے آپ کو انسانوں کے ہجوم میں رہتے ہوئے بھی اکیلا محسوس کرتا ہے۔ اس کے دکھ درد میں کوئی شریک نہیں ہوتا وہ غموں اور دکھ کا بوجھ اٹھائے تنہا زندگی کا سفر طے کرتا ہے۔

پشتون معاشرے کو اس بات پر بجا طور پر فخر ہے۔ کہ وہ آج بھی اشر کے دستور کے تحت ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں فصل کی کٹائی کا وقت قریب آتے ہی گاؤں کے تمام افراد اکٹھے ہوتے ہیں اور سب مل کر ایک دوسرے کی فصل کاٹتے ہیں۔ مکان بنانے کی باری آئے تو سب مل کر مکان تعمیر کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

اشر کے لئے کوئی کام اور کسی موقع کی قید نہیں ہے۔ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں یہاں تک کہ موت یا شادی کے موقع پر بھی نہ صرف ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا کر پوری طرح شریک ہو جاتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مالی مدد کرتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ قبائلی معاشرے میں ہر فرد کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جدید شہری معاشرے کے برعکس جہاں کے افراد ایک پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے قبائلی معاشرے میں فرد کی اپنی جداگانہ حیثیت ہے۔ اور وہ معاشرے کا ایک فعال اور اہم رکن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ایسے معاشرے میں ہر فرد کی عزت کی جاتی ہے۔ خواہ وہ گاؤں کا خان ہو یا ایک عام دیہاتی سب کا درجہ برابر ہے۔

مرکہ: پشتون قبائل میں ''مرکہ'' کی بڑی اہمیت ہے۔ اس امر کے طفیل بڑے سے بڑے مسائل حل ہوتے ہیں اور افراد و خاندان کے درمیان رنجشوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ جب کسی کیلئے رشتہ مانگتے ہیں تو بھی وہ عمل اور جانے والا گروہ مرکہ کہلاتا ہے۔ جبکہ مرکہ میں قبائل اور خاندانوں کے درمیان صلح بھی ہو جاتی ہے۔ یعنی جب خاندانوں یا گروہوں کے درمیان دشمنی ہو تو ایک کی جانب سے دوسرے کے گھر مرکہ بھیجتے ہیں اس مرکہ میں خاندان کے بزرگوں کے علاوہ علاقے کا سردار خان یا ملک بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ بزرگ ہیں دونوں فریقوں سے اختیار طلب کرتے ہیں اور اس کے بعد پھر فیصلہ سناتے ہیں مرکہ کی شرائط کی پاسداری نہ کرنے والا یا گھر پر آئے ہوئے مرکہ کو منفی جواب دینے والوں کو بہت بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ننواتی: یہ وہ رسم ہے۔ جو عام پٹھانوں میں قابل احترام ہے۔ ننوات اس طرح کی جاتی ہے کہ مجرم یا قصوروار چند معزز سفید ریش یا سادات کو لے کر ایک دو دنبے کے ساتھ مخالف فریق کے گھر رات کو جاتے ہیں اور ان کے دروازے پر دنبہ ذبح کرتے ہیں اور اپنے لئے صرف پشیمانی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ فریق مخالف کی ہر بات ماننے کیلئے تیار ہوتے ہیں اگر جرم بہت سنگین ہو مثال کے طور پر قتل وغیرہ تو ساتھ قرآن مجید بھی لے جاتے ہیں۔ اب گھر والا ان کو مہمان خانے میں بٹھاتا ہے اور ان کی خاطر تواضع کرتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اس وقت تک کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگاتے جب تک ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ کبھی تو مجرم کفن۔ رسہ اور چھری بھی ساتھ لے جاتا ہے اور ان کو اختیار دے دیتا ہے کہ جو چاہے کریں لیکن یہ غیرت اور بہادری کے خلاف ہوتا ہے۔ اس لئے ننوات مان لی جاتی ہے اور کسی جرمانے پر فیصلہ کرتے ہیں جو اکثر قتل کے معاملات میں کچھ نقدی اور لڑکی دینے پر فیصلہ ہو جاتے ہیں بعض لوگ بلا کسی عوض کے مجرم کو معاف بھی کرتے ہیں البتہ سیاہکار کی ننوات کسی صورت میں نہیں مانی جاتی ''بول'' اور ''طلاق مہ دی'' میں بھی ننوات کرتے ہیں مثلاً کسی نے کسی کو قتل کرنے کا عہد یا قسم اٹھائی تو بھی ننوات جاتے ہیں اور وہ معاف کر دیا جاتا ہے۔

پڑونے نیول: پڑونے بمعنی چادر اور نیول بمعنی پکڑنا ہے اور اگر دو قبیلوں میں لڑائی ہو جائے اور کافی کشت وخوں بھی ہو تو اس لڑائی کے بند کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایک فریق کی طرف سے ایک عورت میدان جنگ میں نکل آتی ہے اور اپنی چادر ہلاتی ہے۔ تب جا کر لڑائی بند ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی اس چادر کا لحاظ نہ رکھے تو تمام پشتون قوم میں اس قبیلے کی مذمت کی جاتی ہے بلکہ چادر پھیلانے والے قبیلے کی مدد پر اتر آتے ہیں لیکن آج تک کسی قبیلے نے اس قسم کی خلاف ورزی نہیں کی یہ مقدس رسم اس قوم میں ہزاروں سال سے چلی آ رہی ہے۔ کہ نہ صرف عورت اور نابالغ پر ہاتھ نہیں اٹھاتے بلکہ عزیز ترین جانوں کا قتل بھی عورت کی چادر پر قربان کر دیتے ہیں۔

میلمستیا: میلمستیا مہمان نوازی کو کہتے ہیں پشتون کے گھر اگر مہمان آ جائے تو بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں اور باعث خیر و برکت خیال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ اس کے آنے کے ساتھ ستر آدمیوں کی روزی اس گھر میں خدا نازل فرماتا ہے۔ پشتون شروع سے مہمان نوازی کو بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں اور جو اس معاملے میں کوتاہی کرے پشتون معاشرے میں اس کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ کئی علاقوں میں تو کسی زمانہ میں فی کس ایک دنبہ ذبح کرتے تھے آج کل بھی یہ رسم ہے ژوب کے علاقے میں دنبہ ذبح کر کے سب سے پہلے دسترخوان پر ہر مہمان کے سامنے دنبے کا پکا ہوا سر رکھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر مہمان کیلئے ایک دنبہ ذبح کیا گیا ہے۔ پھر دوسرا گوشت اور رسم کے مطابق شوربا لاتے تھے لیکن اب زیادہ تر اس فعل کو مہمان اور میزبان دونوں اسراف سمجھتے ہیں ضرورت کے مطابق انتظام کرتے ہیں۔

سیّد و ملا: پشتون معاشرے میں سید اور مولوی گاؤں کی مسجد کا (پیش امام) دونوں بہت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں گاؤں کی مسجد کے طلباء جنہیں طالب کہا جاتا ہے۔ دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں گاؤں کے ہر گھر سے ان کے لئے کھانا دیا جاتا ہے۔ ایک طالب مغرب کی اذان سے پہلے گھر گھر جاتا ہے۔ جہاں حسب استطاعت اسے جو کچھ پکا ہوتا ہے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح گاؤں میں زکواۃ کی رقم میں مولوی کو اپنا حصہ دیا جاتا ہے۔ گاؤں میں غریب اور بے سہارا خواتین اور یتیم بچوں کو بھی زکواۃ میں سے حصہ دیا جاتا ہے۔ شمالی پشتون علاقوں کی طرح چونکہ بلوچستان میں ''حجرہ'' کا تصور نہیں ہے۔ اس لئے گاؤں میں اگر کسی اجنبی کو رات گزارنے کے لئے ٹھہرنا پڑے تو اسے مسجد میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ جہاں گاؤں والے مشترکہ طور پر اس کے کھانے، پینے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ کوئی ایسی رسم نہیں ہوتی جس میں مولوی شامل نہ ہو۔

قصہ خوانی: ژوب، لورالائی، کوئٹہ اور پشین کے ضلعوں میں سردیوں کے موسم میں لوگ رات کو ایک دوسرے کے ہاں جا کر وقت گزارتے ہیں۔ سردیوں کی یخ بستہ اور لمبی راتوں میں چونکہ دیہات میں وقت گزارنے کا اور کوئی مشغلہ نہیں ہوتا اس لئے وہ ایک دوسرے کے مہمان خوانوں میں جا کر بیٹھتے ہیں جہاں بہادری کے کارنامے سنائے جاتے ہیں بوڑھے اپنے ماضی کی داستانیں بیان کرتے ہیں اور موسیقی کی محفلیں جمتی ہیں۔

لوک موسیقی: قبائلی معاشرے میں موسیقی کی دو طرح کی محفلیں ہوتی ہیں ایک تو ایسی محفل جس میں سازوں کے ساتھ گیت گائے جاتے ہیں اور دوسرے قسم کی وہ محفلیں جن میں قبائلی رقص ہوتے ہیں۔

جہاں تک موسیقی کی محفلوں کا تعلق ہے۔ اس کی مختلف قسمیں ہیں بعض محفلیں ایسی ہوتی ہیں جن میں خاص طور پر پیشہ ور گانے بجانے والے بلوائے جاتے ہیں لیکن بلوچستان کے پشتون قبائل میں پیشہ ور گانے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ صرف چند پیشہ ور فنکاروں کے علاوہ لوگ خود بھی شوقیہ موسیقی کی مجلسوں میں گاتے ہیں۔

پشتو موسیقی کے سازوں میں رباب اور ڈھولک کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ آج کل ہارمونیم اور دیگر جدید ساز بھی استعمال ہونے لگے ہیں۔ لورالائی اور ژوب کے علاقوں میں ''سرود'' جیسے علاقائی زبان میں ''چغکہ'' کہتے ہیں۔ استعمال ہوتا ہے۔ یہ مشہور پشتون لوک ساز ''سرندہ'' کی ایک شکل ہے۔

بانڈار: دیہی علاقوں میں بانڈار موسیقی کیلئے بہت ہی مقبول عام ذریعہ ہے۔ بانڈار کے لغوی معنی جمع ہونے یا اکٹھا ہونے کے ہیں خوشی کے معنوں اور تہواروں مثلاً عید وغیرہ پر لوگ جب اکٹھے ہو کر گاتے ہیں تو اسے بانڈار کہا جاتا ہے۔ لیکن اب بانڈار کا نام چند مخصوص سازوں کے ساتھ اکٹھے مل کر گانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کا آغاز گاؤں میں دینی مدرسوں میں زیر تعلیم ان طلباء سے ہوا جو موسیقی اور سازوں کو خلاف شریعت سمجھتے تھے۔

بانڈار میں جو ساز دیکھنے میں آتے ہیں ان میں ''دف'' یا جسے ''درج'' کہتے ہیں شامل اس کے علاوہ دوسرے سازوں کو ساز نہیں کہا جاسکتا البتہ ان سے سازوں کا کام ضرور لیا جاتا ہے۔ جو چیزیں بانڈار گانے میں ساز کے طور پر استعمال ہوتی ہیں ان میں دَف کے علاوہ خالی کنستر تھال اور اسی طرح روزمرہ کے استعمال کی دوسری چیزیں شامل ہیں دیکھنے میں تو یہ تمام چیزیں جو ساز کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ بہت مضحکہ نظر آتی ہیں لیکن جب ان پر ہاتھ پڑتے ہیں۔ اور ایک مخصوص قسم کی آواز ابھرتی ہے۔ تو سننے والا جھوم اٹھتا ہے۔ شروع میں بانڈار کی محفلوں میں چونکہ عام طور پر دینی طالب علم حصہ لیتے تھے اس لئے اس میں مذہبی اور صوفیانہ کلام سنایا جاتا تھا لیکن اب بانڈار عام ہو چکا ہے۔ جہاں کہیں اس کی محفل سجتی ہے۔ اس میں عام غزلیں اور گیت گانے وغیرہ بھی گائے جاتے ہیں۔

بانڈار کی محفل کو شاعری کا ایک فی البدیہہ مقابلہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس میں دو پارٹیاں بنتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرتی ہیں ایک پارٹی کا لیڈر فی البدیہہ کوئی شعر کہتا ہے۔ اور دوسری پارٹی کو اس کا جواب شعر ہی میں دینا پڑتا ہے۔

بانڈار کے علاوہ گاؤں کے منچلے نوجوان اور زندہ دل بوڑھے رباب سرور اور ڈھولک کی سنگت میں بھی گیت گاتے ہیں ان گیتوں میں زیادہ تر لوک گیت شامل ہوتے ہیں لیکن ایسے عوامی شاعروں کا کلام بھی سننے کو ملتا ہے۔ جنہوں نے اپنی شاعری کی مٹھاس سے عوامی شاعر ہونے کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔

سروز یا چغکہ کے ساتھ زیادہ تر لوک گیت ہی گائے جاتے ہیں ژوب اور لورالائی میں یہ ساز زیادہ تر کاکڑی غاڑے جوان علاقوں کا بہت ہی مقبول لوک گیت ہے۔ کے گانے میں استعمال ہوتا ہے۔

قبائلی زندگی میں اتن (لوک رقص) کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ رقص صرف چند جسمانی حرکات کا نام نہیں بلکہ بقول علامہ اقبال یہ لہو گرم رکھنے کا ہے۔ اک بہانہ'' قبائلی رقص ان کی مخصوص طرز زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کی مخصوص حرکات سے مسلسل جدوجہد، تگ ودو اور بہادری اور جرات کا اظہار ہوتا ہے۔

اتن یا امئی: قبائلی اتڑ صرف خوشی کے موقعوں یعنی شادی وغیرہ پر ہی نہیں کئے جاتے' بلکہ مختلف تہواروں اور میلوں میں بھی قبائلی اتڑ عام دیکھنے میں آتے ہیں اتڑ کے ساتھ بعض اوقات گیت کے بول بھی گائے جاتے ہیں اور بغیر گیت کے اتڑ بھی ہیں قبائلی اتڑوں میں کاکڑی اتڑ اور دوسرا لوینیا نو اتڑ یعنی پاگلوں کا رقص جو لورالائی کے علاقے میں کیا جاتا ہے۔ مقبول ہیں یہ رقص زیادہ تر عید اور شادی بیاہ کے موقعوں پر کیا جاتا ہے۔ اتڑ کو کاکڑ امئی بھی کہتے ہیں۔

غمبر یا غنبر: قبائلی اتڑ کی ایک اور قسم جو خاص طور پر ژوب کے علاقے میں مقبول ہیں ''غمبر'' کہلاتا ہے۔ غمبر دراصل کبوتر کی اس آواز کو کہتے ہیں جو وہ مستی میں گلا پھلا کر زمین پر چکر میں گھومتے ہوئے نکالتا ہے۔ اس رقص میں رقص کرنے والے دائرے کی صورت میں ڈھول کی تال پر یا بغیر ڈھول کے چکر کاٹتے ہیں اور حرکت کے ساتھ مخصوص آواز گلے سے نکالتے ہیں۔ جوں جوں رقص میں تیزی آتی ہے۔ آواز کی رفتار بھی اتنی ہی تیز اور شدید ہوتی جاتی ہے۔ غالباً اس رقص میں اور کبوتر کے رقص میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس کا نام ''غمبر'' رکھا گیا ہے۔ عموماً یہ رقص بغیر ڈھول کے صرف مخصوص ہمکار کی لے پر جو کہ گلے سے نکالی جاتی ہے۔ کیا جاتا ہے۔ اس رقص میں حصہ لینے والے سفید رنگ کا مخصوص گھیرے دار لباس پہنتے ہیں سر ننگے ہوتے ہیں اور رقص کی تیزی کے ساتھ ایک مخصوص انداز میں اپنے سروں کو حرکت دیتے ہیں۔

''غنبر'' دراصل ایک جنگلی رقص ہے۔ غمبر رقص شروع شروع میں رات کو دشمن پر شبخوں مارنے سے پہلے کیا جاتا تھا اس رقص کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دوران گانا نہیں گایا جاتا صرف بارعب غرانے کی آواز ہی سنائی دیتی ہے۔

اس رقص کے بعد لیونیا تو اتڑ یعنی پاگلوں کا رقص ہے' جو بہت مقبول ہے۔ اس قبائلی رقص میں حصہ لینے والے اپنے ہاتھوں میں بندوق بھی اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں جوں جوں رقص کی لے تیز ہوتی جاتی ہے۔ رقص کرنے والوں پر ایک بے خودی سے چھا جاتی ہے اور اس عالم میں فضا گولیوں کی آواز سے گونج اٹھتی ہے۔

دیگر اتڑوں میں جعفر اور ناصر پشتون قبیلوں کے قبائلی اتڑ جعفری اور ناصری اتڑ مشہور ہیں خواتین کے اتڑ میں ''شلہ'' بہت ہی مقبول رقص ہے۔

اس علاقے کی موسیقی کے سازوں میں رباب کو اولیت حاصل ہے۔ یہ پشتون قبائل کا قدیم ترین ساز ہے اور ہر محفل اور ہر جگہ استعمال ہونے کی وجہ سے ''رباب'' پشتونوں کا مقبول اور نمائندہ ساز بن چکا ہے۔ رباب کے علاوہ لورالائی اور ژوب کے بالائی علاقوں میں ایک سارنگی نما ساز شغکہ ہے۔ یہ ساز کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔ یہ ساز زیادہ تر کاکڑی غاڑے کے ساتھ گانے میں استعمال ہوتا ہے۔

گڈا: ان قبائلی اتڑوں کے علاوہ مختلف علاقوں میں لڑکوں کا رقص جسے گڈا کہتے ہیں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ لڑکوں کا رقص صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن کا یہ آبائی پیشہ ہو دوسرے لوگ اس کام کو اچھا نہیں سمجھتے۔ یہاں کے لڑکوں کے رقص اور ''بنو چوں'' اور باجوڑ والوں کے رقص میں فرق ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں لڑکوں کے لئے مخصوص لباس تیار کیا جاتا ہے۔ جس کو جابہ کہتے ہیں اور دوسرے علاقوں میں لڑکوں کو پیشواز پہنایا جاتا ہے۔ ان دونوں لباس میں فرق یہ ہے کہ پیشواز ایک قسم کی لمبی قمیض ہوتی ہے۔ جس پر شیشہ کاری کا کام کیا ہوا ہوتا ہے۔ ان قمیضوں کا رنگ عموماً سفید ہوتا ہے۔ رقص کے وقت قمیض سے رنگ برنگ روشنی نکلتی ہے۔ اس بارے میں علی خان مرحوم کے چند شعر یوں ہیں۔

پھولدار پیشواز پہنے ہوئے تھے
جس پر ڈھیروں زیور لگے ہیں
سر سے پاؤں تک ستارے چمک رہے ہیں
وہ سرو قد ناز سے خراماں ہے

پیشواز کے مقابلے میں جابہ سرخ کپڑے سے بنایا جاتا ہے جو لمبائی میں ٹخنوں سے نیچے ہوتا ہے۔ اور دامن کی کٹائی گول ہوتی ہے۔ اس پر سدری یا واسکٹ پہنی جاتی ہے۔ واسکٹ پر چرمہ سے کشیدہ کاری کی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح قمیض پر بھی کشیدہ کاری ہوتی ہے۔ پاؤں میں گھنگرو پہنے جاتے ہیں رقص کی محفل میں رباب ڈھولک اور ہارمونیم عام ساز ہوتے ہیں۔ اس ناچنے والے لڑکے کو ''گلک'' یا لخنے کہتے ہیں۔ لخنے صوبہ سرحد میں کہا جاتا ہے۔

رقص کے ساتھ مقبول عوامی شعراء کا کلام بھی گایا جاتا ہے۔ جو زیادہ صوفیانہ رنگ لئے ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے۔ بانڈار کی محفلوں میں بھی جو کلام سنایا جاتا ہے۔ وہ بھی صوفیانہ ہی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس علاقے میں بیشتر شعراء صوفی اور دیندار لوگ تھے ان میں پیر محمد کاکڑ شمس الدین کاکڑ جان محمد کاکڑ اور علامہ عبدالعلی شاعر ہونے کے ساتھ ممتاز علمائے دین بھی تھے۔

موسیقی کی محفلوں میں جدید شعراء کا کلام بہت کم سننے میں آتا ہے۔ اس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ قدیم شعراء کا کلام موسیقی کی ایسی دھنوں میں ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ جن کا گانا گلوکار کے لئے آسان ہوتا ہے۔ پھر ان کی زبان بھی آسان اور عام فہم ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ موسیقی کی ان محفلوں میں

جدید کلام بالکل نہیں گایا جاتا یہ گانے والے کے اپنے ذوق پر بھی منحصر ہے۔ بہت سے ایسے فنکار بھی ہیں جو پشتو زبان کی جدید اور مشکل غزلیں محفلوں میں سناتے ہیں۔

اس کے علاوہ نوجوان شعراء میں بھی بہت سے شاعر ایسے ہیں جن کا کلام اپنی آسانی عام فہمی اور روانی کی وجہ سے عوامی گیتوں کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ ایسے شعراء کا کلام محفلوں میں عام سننے میں آتا ہے۔

میلے اور تہوار

پشتون علاقے میں میلے اور تہوار اور خاص موقعوں پر دیکھنے میں آتے ہیں میلوں کا موسم اور زراعت اور کاشت کاری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں زیادہ تر میلے چھوٹی اور بڑی عید کے موقعوں پر لگتے ہیں جو دو تین دن تک جاری رہتے ہیں۔

چمن کا میلہ: یہاں کے میلوں میں سب سے زیادہ چمن کا میلہ مشہور ہے۔ یہ میلہ پاک افغان سرحد کے شہر چمن میں نہیں بلکہ پشین سے دس میل کے فاصلے پر بند خوشدل خان اور ملک یار گاؤں کے درمیان ایک بہت بڑا میدان ہے۔ جسے چمن کہتے ہیں لگتا ہے کہ اس کے علاوہ گلستان میں بھی عید کے موقعہ پر بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ جس میں دور دراز علاقوں سے لوگ آتے ہیں ان میلوں میں قبائلی رقص اور موسیقی کی محفلوں کے علاوہ قبائلی کشتی نیزہ بازی اور گھڑ دوڑ کے مقابلے ہوتے ہیں میلے میں بڑی رونق رہتی ہے۔ دکانیں لگائی جاتی ہیں انڈے لڑائے جاتے ہیں۔

عید کے موقع پر چمن اور کوئٹہ میں بھی میلے لگتے ہیں پاکستان بننے سے پہلے کوئٹہ کا میلہ شہر کے قریب شیخ ماندہ کے مقام پر لگتا تھا اب ایوب اسٹیڈیم میں لگتا ہے۔

بلوچستان میں عید کے میلوں کے علاوہ ایک اور میلہ کوئٹہ سے نوے میل دور نوشکی کے قریب شیر جان آغا کے مزار پر لگتا ہے۔ یہ ویسے تو عرس ہے۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق نوروز کے پہلے دن سے ہے۔ اس لئے ہم اسے میلہ بھی کہہ سکتے ہیں شیر جان آغا کے عقیدت مند ملک کے دور دراز علاقوں سے اس میں شریک ہونے کیلئے آتے ہیں شیر جان آغا کے میلے میں خواتین بھی شریک ہوتی ہیں جن کیلئے جدا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس میلے میں کھیلوں وغیرہ کے مقابلے نہیں ہوتے صرف موسیقی کی محفلیں جمتی ہیں موسیقی کی ان محفلوں میں ملک کے گوشے گوشے سے نامور موسیقار شرکت کرنے آتے ہیں۔

نانا صاحب کا میلہ: ضلع لورالائی (دکی) میں تھل چٹیالی کے مقام پر میاں عبدالحکیم نانا صاحب کی زیارت پر بھی ہر سال میلہ لگتا ہے۔ اس میلے میں جو نانا صاحب کے عرس کے موقع پر لگتا ہے۔ موسیقی اور مقابلے وغیرہ نہیں ہوتے عقیدتمندوں کا زیادہ تر وقت ذکر و فکر میں ہی گزرتا ہے۔ بلوچستان کے پشتون علاقے کے میلوں میں سب سے زیادہ رونق اور بڑے میلے چمن اور گلستان کے میلے ہی ہیں ان میلوں میں دور دراز علاقوں سے لوگ شرکت کیلئے آتے ہیں تین دنوں کے لئے چمن کے میدان میں ایک شہر آباد ہو جاتا ہے۔ دکانیں لگتی ہیں اور جا بجا چائے ہوٹل قائم ہو جاتے ہیں ہیں یہ ہوٹل عموماً تمبوں میں (چھینلوں) میں ہی ہوتے ہیں ہوٹل والوں میں اس بات پر سخت مقابلہ ہوتا ہے کہ کس ہوٹل میں ملک کا بہترین گلوکار بلوایا جاتا ہے۔

ان میلوں کی خاص بات انڈے لڑانا ہے۔ انڈے لڑانے کے مقابلے میں چھوٹے بڑے بوڑھے جوان سب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں پشتون قبائل کی ثقافت میں انڈے لڑانے کا رواج قدیم دور سے چلا آ رہا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات ثابت ہے کہ آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے آریانہ میں جہاں زرتشتی مذہب پھیلا ہوا تھا بلخ اور اصفہان کے علاقوں میں انڈے لڑائے جاتے تھے۔ انڈے عموماً نوروز کے موقع پر لڑائے جاتے تھے اس تقریب کے لئے انڈوں کو ابال کر انہیں مختلف رنگ دیئے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میلوں میں لڑکیاں بھی انڈے لڑایا کرتی تھیں۔ انڈے لڑانے پر بڑی بڑی شرطیں باندھی جاتی تھیں جو بعض اوقات لڑکے اور لڑکی کی شادی تک کی بھی ہوتیں لڑکوں اور لڑکیوں میں انڈے لڑانے یہ رسم پشتون قبائل میں نہیں پائی جاتی۔ انڈے لڑانے کا رجحان ایام عید میں نظر آتا ہے۔ چند سال قبل لورالائی کے بھاگ بازار میں عید کے ایام میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی یہاں صرف انڈے لڑائے جاتے تھے۔

سوئے غار میلہ: ایک شکاری میلہ جسے ''سوئے غار میلہ'' کہتے ہیں پنج پائی کے علاقے میں ہوتا ہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ اکتوبر نومبر کے مہینوں میں جب خرگوش پہاڑوں سے اتر آتے ہیں تو دیہاتوں کے لوگ دو پارٹیوں میں تقسیم ہو کر ساز و سامان سے لیس ایک ایک ڈنڈا لے کر شکار کے لئے نکلتے ہیں ان کے ساتھ گھوڑے گدھے اور اونٹ وغیرہ بھی ہوتے ہیں جنہیں سامان لے جانے اور سواری کے لئے استعمال کرتے ہیں ان کی تعداد تین چار سو افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور تین طرفہ گھیرے کی شکل میں چلتے ہیں ان کے درمیان قریباً ایک ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اور قطار کی شکل جاتے ہیں جب خرگوش ان کے درمیان آ جاتا ہے۔ تو کسی کو بھی بندوق یا کسی اور ہتھیار سے مارنے کی اجازت نہیں ہوتی چونکہ ہر آدمی کے پاس ایک ڈنڈا ہوتا ہے۔ اس لئے صرف ڈنڈے سے مارا جاتا ہے۔ البتہ اگر گھیرا توڑ کر خرگوش نکل گیا تو پھر شکاری کتے بھی پیچھے چھوڑتے ہیں اور

دوسرے ہتھیار بھی استعمال کرتے ہیں۔

بہرحال جب خرگوش درمیان میں آجاتا ہے۔تو ہر طرف سے ہر گاؤں کے لوگ ڈنڈوں کے ذریعے خرگوش کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں جس نے مارا اس شخص کو اس کے گاؤں والے خوشی کے مارے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں خوشی سے پھولے نہیں سماتے اگر کسی شخص سے خرگوش فراز ہونے میں کامیاب ہوگیا۔تو اس کے ساتھی اس کو بڑی لعن طعن کرتے ہیں اس کھیل کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ پنجپائی کے علاقے میں ہوتا ہے دوسری جگہوں میں نہیں ہوتا۔یہاں کے رہنے والے مشوانی پٹھان ہیں۔

عام شوق: اگرچہ اب تمام قدیم رسومات میں کافی تبدیلی یا زوال آچکا ہے۔لیکن بعض علاقوں میں اب بھی کتے، مرغ، چکور، تیتر، بٹیر وغیرہ لڑانے کا شوق پایا جاتا ہے۔ بلکہ خاص کوئٹہ میں اب تک اس کے شوقین کا کافی تعداد میں موجود ہیں اور ہر جمعہ کے دن کسی نہ کسی کھلی جگہ میں جمع ہوکر کتے چکور اور تیتر اور بٹیر لڑاتے ہیں اور کافی روپے شرط بھی لگاتے ہیں البتہ مرغ لڑانے کا شوق اب نہیں رہا یہ شوق ضلع سبی اور سندھ کے علاقے میں ہوتا ہے۔اس قسم کے پرندوں کی قیمتیں بھی ہزاروں روپے تک پہنچتی ہیں یہ شوق صرف کوئٹہ پشین تک محدود ہے۔ضلع لورالائی اور ژوب میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

پشتو ادب: بلوچستان میں پشتو ادب کا آغاز آج سے ایک ہزار سال پہلے ضلع ژوب میں ہوا۔پشتو زبان کے مشہور مؤرخ، ادیب اور مفکر عبدالحئ حبیبی نے اس ضلع کو پشتو زبان وادب کے گہوارے کا نام دیا ہے۔پشتو زبان ابتدائی دور کے تمام نامور شاعر اور ادیب اسی علاقے میں پیدا ہوئے۔اور بعد میں علم کی روشنی پھیلانے اور دوسروں کے علم اور تجربے سے فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے دوسرے خطوں میں پھیل گئے۔

پشتو زبان کے صوفی شاعر اور روحانی پیشوا شیخ بیٹنی ضلع ژوب ہی میں پیدا ہوئے۔سلیمان ماکو نامی افغان مؤرخ اور مفکر نے تذکرۃ الاولیاء نامی کتاب میں شیخ بیٹنی کا ذکر کیا ہے۔صاحب تذکرہ نے لکھا ہے کہ شیخ بیٹنی بہت نیک۔پارسا اور متقی بزرگ تھے اور "کسے غر" نامی پہاڑ کے دامن میں اپنے اہل وعیال اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔"کسے غر" کوہ سلیمان کی ایک شاخ ہے۔اس خطے سے کئی سو سال پرانے برتن اور گھریلو استعمال کی دوسری اشیاء ملی ہیں۔یہ علاقہ اپوزی، ژوب کے قریب ہے اور اکثر مقامی لوگ وہ بستی دیکھ آئے ہیں جہاں شیخ بیٹنی کا خاندان آباد تھا۔

"کسے غر" نام کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ قیس عبدالرشید کی مناسبت سے اس پہاڑ کا نام "کوہ قیس" پڑا تاہم وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔قیس عبدالرشید کی مناسبت ہی سے پٹھانوں کا ایک طبقہ پشتونوں کو سامی النسل خیال کرتا ہے۔شیخ بیٹنی، بیٹ نیکہ اور بیٹ بابا کے نام سے بھی مشہور ہیں۔انہیں اپنے خاندان کے مختصر ہونے کا شدید احساس تھا۔چنانچہ وہ شب وروز اللہ سے یہی دعا مانگتے تھے کہ "اے رب، اے خلائق کے پروردگار، تو میرے گھرانے کو وسعت بخش، اور ہماری تعداد میں اضافہ کر"۔

بیٹ نیکہ کی یہ مناجات بہت مشہور ہے اور پشتو بولنے والا کوئی ایسا فرد نہ ہوگا جسے اس مناجات کے دو چار بند از بر نہ ہوں۔اس کے چند بند یہ ہیں:

لویہ خدایہ! لویہ خدایہ!
ستا پہ مینہ پہ ہر زایہ
عزولاڑ دے درناوئ کی
ٹولہ ژوی پہ زارئ کی
دلتہ دی دغرولمنی
زموڑ کڑ دئ یکی پلنی
داوگڑی ڈیر کڑے خدایہ
لویہ خدایہ! لویہ خدایہ!
دلتہ لڑ زموڑ اور بل دئ
ووڑ کور گئے دے ووڑ و بور جل دے
مینہ ستا کی موڑ میشہ یو
بل دچا بہ ملہ تلہ نہ یو
ھسک او مزکہ نغشتہ ستارہ
دمڑ وودہ لہ تادہ
داپالنہ ستادہ خدایہ
لویہ خدایہ! لویہ خدایہ!

ترجمہ:

اے عظیم رب! اے عظیم رب!
تیری محبت میں ہر ہر مقام پر
پہاڑ اپنی پوری گرانباری سے کھڑے ہیں
تمام خلائق بندگی میں زندگی بسر کر رہے ہیں
یہاں پہاڑوں کے دامن میں
ہمارے خیمے ان میں نصب ہیں
اے رب اس خاندان کو وسعت دے
اے عظیم رب! اے عظیم رب!
یہاں ہم نے تھوڑی سی آگ روشن کی ہے

یہاں ہم نے چھوٹا سا گھر سجا لیا ہے
تمہاری ہی محبت میں ہم پڑے ہیں
دوسروں کی ہم نے پیروی نہیں کی ہے
زمین و آسمان تیری شان کبریائی کے مظہر ہیں
دولتمند لوگوں کی فارغ البالی تیری وجہ سے ہے
یہ جہاں... درحقیقت تیرا پروردہ ہے
اے عظیم رب! اے عظیم رب!

عام قیاس یہ ہے کہ شیخ بیٹنی ۳۰۰ اور ۴۰۰ ہجری کے دوران میں تھے۔ وہ غوری بادشاہوں کے ہم عصر بتائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ٹھیٹھ پشتو زبان میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتے تھے۔ اس میں فارسی، عربی یا کسی دوسرے زبان کے الفاظ ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں گے۔ ان کے کلام میں بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جو ایک ہزار سال کے بعد بھی انہی معنوں میں مستعمل ہیں۔ اگرچہ وقت اور مقام کے تقاضوں نے ان الفاظ کے زیادہ سہل مترادف وضع کر لئے ہیں مگر ضلع ژوب کے اکثر قدیم قبائل میں اب بھی یہی الفاظ روزمرہ کی بول چال میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً آسمان کے لیے "هسک" جس کے لغوی معنی ہیں ارتفاع کا مظہر، اور حیوان کے لیے ژوی۔ ژوی لفظ "ژوند" یعنی "زندگی" سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح پالنہ یعنی پرورش۔

بیٹ بابا کے مزار کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ "کسے غر" کے علاقے میں دفن ہیں۔ افغانستان کے صوبہ ننگرھار میں "تورغر" کے مقام پر ایک مزار ہے جسے وہاں کے لوگ بیٹ بابا کی زیارت کہتے ہیں ممکن ہے کہ یہی بیٹ نیکہ کا مزار ہو۔

بیٹ نیکہ کے ایک نامور بیٹے کا نام اسماعیل تھا۔ اسماعیل کی پرورش اپنی پھوپھی کے ہاں ہوئی تھی۔ اسی لئے اپنی پھوپھی کے گھرانے کی مناسبت سے سٹر بن کہلایا۔ اسماعیل ۴۰۰ ہجری کے لگ بھگ بقید حیات تھے۔ اپنے باپ شیخ بیٹنی کی طرح مذہبی رہنما، متقی اور پشتو زبان کے اچھے شاعر تھے۔ مشہور مورخ سلیمان ماکو نے تذکرۃ الاولیاء میں اس کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔

اسماعیل کو اپنے پھوپھی زاد بھائی خرشبون سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ جب ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو اسماعیل نے ایک نارہ لکھا۔ نارہ پشتو شاعری اور موسیقی کی مخصوص صنف ہے۔ اسے مرثیہ تو نہیں کہہ سکتے البتہ "فراق نامہ" کہہ سکتے ہیں پشتو ادب کی قدیم تاریخ "پٹہ خزانہ" (مخفی خزانہ) میں اسماعیل کے اس فراق نامے کے چند اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں۔ جس کے چند شعر یہ ہیں:

کہ یون دے یون دے نخکی بیلتون دے
کہ کسے غرہ زخہ زی خرشبون دے
یہ ورورہ وروہ خرشبون ودورہ
تہ چہ بیلتون کڑے زما ویرتہ گورہ
دخدائے دپارہ خرشبون یارہ
چہ ھیر مونکڑے زمونبر کھول واڑہ
زڑہ می رپیژی یارمی بیلژی
بیلتون ئے اور دے زان پرے سوزیژی

ترجمہ:

ہمیں جدائی کا سفر درپیش ہے
کسے کے پہاڑ سے خرشبون جاتا ہے
اے خرشبون بھائی
تو جدا ہو رہا ہے تو میرے غم کی بھی کچھ فکر کر
خدا کیلئے اے خرشبون
ہمارے خانوادے کو بھول نہ جانا
میرا دل کانپ رہا ہے دوست کی جدائی میں
جدائی آگ ہے اور اس میں جلتا ہوں

خرشبون: سٹر بن کے بیٹے کا نام خرشبون تھا۔ تاریخی شواہد کی رو سے وہ ۴۱۱ ہجری کے لگ بھگ مرغہ نامی گاؤں میں فوت ہوئے۔ سٹر بن درانی اور ترین قبائل کے جد امجد مانے جاتے ہیں۔ وہ پشتو کے ایک عظیم المرتبت شاعر، ادیب اور عابد بزرگ تھے۔ خرشبون جب "کسے غر" سے "غوڑہ مرغہ" نامی مقام کی طرف کوچ کرنے لگا تو اسماعیل نے ایک فراق نامہ لکھا۔ اس کے جواب میں خرشبون نے مربع کے طرز پر ایک نظم قلمبند کیا۔ یہ اشعار سوز و گداز سے لبریز ہیں اور اس عہد کے شعراء کی بلند پروازی اور سادگی پر دلالت کرتے ہیں۔ اس نظم کا پہلا بند یہ ہے:

دبیلتانہ نارہ می وسوہ پہ کو رباندی
نہ پوھیزم چہ بہ سہ وی پیش بہ وڑاندی
لہ خپلو انو بہ بیلیزم پہ سر و ستر گو
دواڑہ سترگی می پہ وینودی ژڑاندی

ترجمہ: میرے گھر کے دروازے پر ہجر نے دستک دی ہے۔

نہیں جانتا کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔
میں چشم پرنم لیکر اپنوں اعزہ سے رخصت ہو رہا ہوں
میری دونوں آنکھیں خون کے آنسو رو رہی ہیں

یہ اشعار پشتو زبان کی اپنی مخصوص بحر میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں قدیم گھرانوں کی باہمی موانست، محبت اور دوستی کے پاک احساسات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم قبائل ایک دوسرے کی جدائی پر کس درجہ افسردہ خاطر ہوتے تھے اور وہ آپس میں کتنی چاہ اور پرخلوص محبت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

ملک یار غرشین: سابق بلوچستان کے قدیم پشتو شعرا میں ملک یار غرشین بھی خاص مقام رکھتے ہیں۔ غرشین قبیلے کے لوگ اب بھی ژوب اور کوئٹہ پشین میں آباد ہیں۔ پشتو زبان اور ادب کے مورخوں نے ملک یار کو صوفیائے کرام کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ وہ پشتو کے اچھے نثر نگار اور قادر الکلام شاعر تھے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ جب سلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا، تو ملک یار غرشین ان کے ہمراہ تھے۔ ایک جنگ میں مسلمان فوجوں کو پسپا ہونا پڑا۔ تو ملک یار نے آگے بڑھ کر فوجوں کو ان اشعار سے مخاطب کیا:

چشتن مو مل دے
اوس مویر عل دے
ھیواد دبل دے
غازیا نو گوری
چشتن مو مل دئ
توری تیرے کری
دشمن مو پرے کری ء
منگولی سرے کری ء
سلہ بہ تشتو
چشتن مو مل دے
کہ ٹینگ کڑو ز ژونہ
پہ بری یونہ
چہ زمری یونہ
اسلام راسخہ دے
چشتن مو مل دے

غازیا نو راسئ
ٹول شا و خواسئ
د شھاب پہ ملا سئ
دشمن موغوس کڑئ
چشتن موبل دئ

ترجمہ:

مالک ہمارا ناصر ہے
یہ حملے کا موقعہ ہے
اگرچہ غیر کی سرزمین ہے
دیکھو غازیو
مالک ہمارا ناصر ہے
شمشیروں کو تیز کر ڈالو
دشمن کے ٹکڑے کر ڈالو
اپنے ہاتھ رنگ کر ڈالو
کیوں بھاگیں کہ
مالک ہمارا ناصر ہے
اگر ہمت کریں گے
تو کامیاب ہونگے
کہ ہم تو شیر ہیں
اسلام ہمارے ساتھ ہے
مالک ہمارا ناصر ہے
غازیو آؤ
سب اکھٹے ہو جاؤ
شہاب کی پشت پناہی میں
دشمن کے ٹکڑے کر دو
مالک ہمار ا ناصر ہے

جب ملک یار نے گرجدار آواز میں اشعار پڑھے تو اسلامی فوج کے غازیوں نے لشکر کفار پر ہلہ بول دیا۔ اور خدا نے انہیں فتح و نصرت سے نوازا۔

ملک یار غرشین کے یہ اشعار کلاسیکی حیثیت رکھتے ہیں شیخ ملک یار دن رات حضرت شیخ اسماعیل کے مزار پر یاد خدا میں مصروف رہتے تھے۔ جب سلطان

شہاب الدین غوری نے پہلی بار ملتان پر حملہ کیا تو شیخ ملک یار بقید حیات تھے۔ یہ ۵۷۱ ہجری کی بات ہے۔ اس کے بعد ملک یار دہلی گئے اور وفات پا گئے اور اسی خطے میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔

شیخ ملک یار کی وفات کے بعد تقریباً ڈھائی سو سال تک اس خطے کے ادبی افق پر تاریکی چھائی۔ اس طویل عرصے میں یقیناً بہت سے ادیب اور شاعر ہو گذرے ہیں۔ مگر ان کے تذکروں سے ادبی تاریخ سردست خالی معلوم ہوتی ہے۔ چھٹی صدی ہجری میں کاکڑ نیکہ کے صاحبزادے تیمن بھی پشتو کے اچھے شاعر گذرے ہیں۔ نویں صدی ہجری میں ژوب کے علاقے میں بابڑ خان نامی پشتو ادیب اور شاعر پیدا ہوا ہے۔ یہ پشتو زبان کے صاحب دیوان شاعر دوست محمد کاکڑ کے والد تھے۔ دوست محمد کاکڑ خود بھی بلند پایہ نثار اور مورخ تھے۔ انہوں نے اپنے والد بابڑ خان کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے تذکرہ غرغشت کے نام سے ایک کتاب نظم میں تصنیف کی تھی۔ مگر چونکہ بابڑ خان کی وفات کے وقت دوست محمد ژوب میں موجود نہ تھے۔ اس لئے اس کتاب کا مسودہ ضائع ہو گیا۔

دوست محمد کو باپ کے مرنے کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے ضائع ہونے پر بھی بہت صدمہ ہوا۔ دوست محمد کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ بابڑ خان بلند پایہ شاعر اور مورخ تھے۔ البتہ ان کا کلام دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا اور ادب نواز دنیا آج تک اس پشتو شاعر کے رشحات قلم سے محروم ہے۔

دوست محمد: دوست محمد کاکڑ نے اپنے والد کی پیروی میں "غرغشت نامہ" نامی کتاب لکھی۔ اسی کتاب میں بابڑ خان کی کتاب "تذکرہ غرغشت" کا ذکر ہے۔ پشتو ادب کے ایک اور مورخ محمد ہوتک نے دوست محمد کی یہ کتاب دیکھی تھی۔ اس نے پشتو مثنوی کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے اشعار بہت میٹھے اور بلند پایہ ہیں۔ اسے درسی کتاب کے طور پر بچوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ غرغشت نامہ کے چند اشعار یہ ہیں:

لہ نیکانو روایت دے
ھسی توگہ حکایت دے
نور محمد کاکڑ راوی دے
چہ می فیض تل جاری دے
د نیکو نولہ خلے وایی
چہ منشت ئے راتہ شائی
چہ کاکڑ نیکہ زاہد وو
لوئ چشتن لہ تل عابد و و
تل ترتل یے عبادت کا
پردے لیارئے ریاضت کا

ترجمہ:

بزرگوسے مروی ہے
اس طرح کی حکایت ہے
نور محمد کاکڑ (اسکا) راوی ہے
کہ ہمیشہ میرا فیض جاری ہے
زرگوں کی زبانی کہتا ہے
ان کی چاہت دکھاتا ہے
کہ کاکڑ دادا زاھد تھا
عظیم رب کا عابد دائمی تھا
ہمیشہ وہ عبادت میں تھا
اس راہ پر ریاضت کرتا

دوست محمد کاکڑ کے کلام میں اس دور کی پوری عکاسی پائی جاتی ہے۔ اس افسردہ دور کا صحیح نقشہ ان اشعار میں پایا جاتا ہے۔

خلقو او کرل ملکونہ
باندی واختل فصلونہ
دَدوست محمد خانہ خراب
اوس پاشی د غم تخمونہ

ترجمہ:

لوگوں نے زمینیں بو ڈالیں
اور ان سے فصلیں کاٹیں
دوست محمد خان خراب
اب غم کی غم پاشی کرتا ہے

پیر محمد کاکڑ: پشتو ادب اور شاعری کا دوسرا دور سدوزئی بادشاہوں کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ احمد شاہ ابدالی پہلا سدوزئی بادشاہ تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ پشتو شعراء اور ادیبوں کی سرپرستی کی، بلکہ خود بھی پشتو زبان کا قادر الکلام شاعر تھا۔ اس بادشاہ کا پشتو دیوان کابل میں چھپا ہے۔ اور اس میں تقریباً تین ہزار اشعار ہیں۔

اس دور کا بہت ہی مشہور پیر محمد کاکڑ ہے۔ جو ژوب میں پیدا ہوا۔ اور درس و تدریس کے سلسلے میں قندھار جا کر فوت ہوا۔ پیر محمد کو شہرت دوام اپنے آبائی وطن ژوب میں نصیب ہوئی۔ اور اس کی شاعری کے چرچے قندھار تک ہونے لگے۔ احمد شاہ ابدالی نے اسے اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کیا۔ اور اسی کسب معاش کی خاطر اسے زندگی کے باقی دن قندہار میں گزارنے پڑے۔ پیر محمد کاکڑ نے پشتو زبان اور ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس نے معرفت الافغانی کے نام سے مشہور نصاب کی ایک کتاب قلمبند کی ہے۔ یہ کتاب اس نے احمد شاہ کے بیٹے شہزادہ سلیمان کے لیے لکھی تھی تا کہ شہزادہ پشتو لغت، قواعد اور زباندانی سے متعلق ضروری اصول سیکھ لے۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ ایک حصے میں نثر ہے اور دوسرے حصے میں نظم۔ نظم و نثر کے دو نوں حصے سلیس اور بامحاورہ پشتو میں ہیں۔ پیر محمد کاکڑ نے پشتو نثر میں وہی کردار ادا کیا ہے، جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے اردو میں کیا ہے۔ فقرے چھوٹے اور نہایت دل نشین پیرائے میں تحریر کئے گئے ہیں۔ معرفت الافغانی کے چند جملے یہ ہیں:

کشت خواری غواڑی
و کشت اوس وخت نہ دے
و کشت وخت لا اوس پسے دے
کشت ڈیرمہ کوہ واک بہ دی
پرے او نہ رسیوی
او بہ پرے و چی شی
حاصل بہ دی لہ لاسہ ووزی
خواری بہ دی ابتہ شی

ترجمہ:

کھیتی باڑی محنت چاہتی ہے
بوائی کا موسم اب نہیں
بوائی کا موسم بعد میں ہے
بوائی زیادہ نہ کرو
تمہارے قابو سے باہر ہوگی
اسے پورا پانی میسر نہ آسکے گا
زمین کی پیداوار سے ہاتھ دھو بیٹھو گے
اور محنت رائیگاں جائے گی۔

پیر محمد پشتو کے بلند پایہ شاعر و ادیب ہیں۔ انہوں نے ۱۱۹۶ ہجری میں پشتو اشعار کا ایک دیوان مکمل کر لیا تھا۔ پشتو کے علاوہ وہ حافظ شیراز کے اتباع میں فارسی غزلیں بھی کہتے تھے۔ ان کے پشتو کلام کے مجموعے کے ساتھ فارسی غزلوں کے نمونے بھی چھپے ہیں۔ پیر محمد کا رنگ نہایت سنجیدہ اور استادانہ تھا۔ انہوں نے تصوف، اور مجاز غرض ہر میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں وہی سادگی، دلنوازی، روانی اور مٹھاس ہے جو پشتو کے ایک اور عظیم المرتبت شاعر حضرت رحمٰن بابا کے کلام میں ہے۔ پیر محمد نے اپنے ہمعصر اور پیشرو شعراء پر تنقیدی زاویہ سے بحث کی ہے۔ اس اعتبار سے وہ پشتو زبان کے اچھے نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔

پیر محمد کی عشقیہ شاعری میں سوز و گداز بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے ضخیم پشتو دیوان کے چند اشعار یہ ہیں:

ساقی چہ راکڑہ پیالہ د مینہ
نوری پیالے می ذرے ذرے کڑے
پہ بوی دزلفوئے لیو نئے کڑم
چہ پہ بار خوئے نسیم خورے کڑے
غوٹی د کلوپہ غوڑید و دہ
بلبلہ راسہ کہ نندارے کڑے

ترجمہ:

ساقی نے جب محبت کا جام پیش کیا
باقی تمام پیالے میں نے توڑ کر رکھ دیئے
اس کے زلفوں کی خوشبو نے مجھے دیوانہ کر دیا
جب بادنسیم نے انہیں رخساروں پر بکھیر دیا
کلی، پھول کی صورت اختیار کر رہی ہے
اے بلبل، آ! اگر تو اس نظارے کو دیکھنا چاہتا ہے

پیر محمد کاکڑ نے اپنے پشتو دیوان کی تکمیل کی تاریخ خود لکھی ہے۔ یہ دیوان ۱۱۹۶ ہجری میں مکمل ہوا تھا۔

مولانا رومؒ نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی میں "نے" کو جس پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس کے اتباع میں پیر محمد نے بھی اپنے فراق کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

جدائی پہ غم شریک کڑم و غمجنو
دھر چا پہ غازہ ژاڑم لکہ نئے

ترجمہ:

ہجر و فراق نے مجھے ہر دردمند دل کا غم شریک بنا دیا ہے
یہی وجہ ہے کہ میں ہر شخص کے ساتھ "نے" کی طرح رو دیتا ہوں۔

پیر محمد کاکڑ کے بیشمار شاگرد تھے۔ سدوزی شہزادوں میں سلیمان اور تیمور شاہ خود بڑے اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ البتہ بلوچستان کے شعرا میں ابراہیم خان کاکڑ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اس نے بھی بڑے اچھے اشعار کہے ہیں۔ لیکن اب تک ان بکھرے دانوں کو ایک شیرازے میں نہیں پرویا جا سکا۔ ابراہیم خان نے ۱۲۰۳ ہجری میں وفات پائی۔

ملا جان محمد: اس خطے کے پشتو ادیبوں اور دوسرے شعرائے قدیم کی طرح ملا جان محمد کے بارے میں بھی بہت کم مواد میسر آ سکا ہے۔ پشتو زبان کا یہ قادر الکلام شاعر اور عالم دین شاہ شجاع کے زمانے میں ہو گزرا ہے۔ ملا جان محمد ژوب کے رہنے والے تھے۔ ان کا ایک قلمی دیوان حافظ خان محمد مرحوم کے پاس تھا۔ جس پر خود ملا جان محمد نے ۱۲۱۵ ہجری لکھی ہے۔ ملا جان محمد نے پند و نصائح سے بھرپور یہ پشتو دیوان قلمبند کیا ہے۔ ملا جان محمد مرحوم ژوب کے رہنے والے تھے اور کاکڑ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا پہلا دیوان ۱۲۱۴ میں مکمل کیا۔ جو "خلیدین" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس پہلے دیوان کا نسخہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ لیکن ۱۲۱۵ ہجری میں جو دیوان مکمل کیا گیا ہے اس میں "خلیدین" کی تکمیل کا ذکر ہے۔

سابق بلوچستان میں پشتو ادب اور شاعری کا تیسرا دور سر رابرٹ سنڈیمن کے آنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس خطے میں انگریزوں کو قدم جمانے کا موقع دینے والے بعض مقامی خود غرض عناصر تھے۔ مگر عمومی طور پر اس سرزمین کے بلوچوں اور پٹھانوں نے انگریزوں کے تسلط کو پسند نہیں کیا۔ چنانچہ اس جذبے کا اظہار پشتون مردوں اور عورتوں نے اپنے بیشمار لوک گیتوں میں کیا ہے۔ یہ لوک گیت اس خطے میں پشتو ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ ان گیتوں میں خلوص، سادگی اور جذبات کی فراوانی بدرجہ اتم موجود ہیں۔

اس دور میں مردوں کے معاشرتی اور معاشی تقاضے بھی بدل گئے۔ فارسی پشتو وغیرہ زبانیں جاننے والوں کا شمار پڑھے لکھے لوگوں میں نہیں ہوتا تھا۔ عدالتی اور دفتری زبان اردو اور انگریزی قرار پائی۔ اردو کی بدولت اگرچہ بلوچستان کے لوگوں کو برصغیر کے دوسرے باشندوں بالخصوص مسلمانوں سے رشتہ جوڑنے کا موقع ملا۔ لیکن کتنے لوگ تھے اس خطے میں جنہیں اردو اور انگریزی میں تعلیم حاصل کرنے کے پورے مواقع اور آسانیاں میسر تھیں۔ ہماری دیہی مسجدیں صرف عبادت گاہیں نہ تھیں۔ تحصیل علم کے بہترین مرکز بھی تھیں۔ علم کے نئے تصور نے ان مراکز کی ہیئت ہی بدل دی۔

پہلے لوگ اپنے بچوں کو مسجدوں میں بھیجتے تھے کہ وہ دینی علوم کے ساتھ وہ علوم بھی حاصل کریں جو انہیں دنیاوی کاموں میں مدد دے سکیں۔ لیکن جب دنیاوی کاموں کے تقاضے ہی بدل گئے تو اس اعتبار سے مساجد کی اہمیت بھی متاثر ہوئی۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ مسجدیں صرف عبادت گاہیں رہ گئیں اور ان کی دنیوی افادیت بطور علمی درسگاہ کی ختم ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور میں بہت طویل عرصے تک پشتو پڑھنے اور لکھنے والے خال خال نظر آتے ہیں۔ اس دور میں جو عالم اور پشتو ادیب نظر آتے ہیں۔ وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں کلی لاجور کے آغا سید محمد یعقوب شاہ، شالا باغ کے ملا عبدالسلام اور خانوزئی کے علامہ عبدالعلی اخوندزادہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

علامہ سید محمد یعقوب شاہ تحصیل پشین میں سرانان کے قریب شادیزئی کلی نامی گاؤں میں پیدا ہوئے اور تحصیل علم اپنے والد اور گاؤں کی مسجد کے امام صاحب سے کی۔ وہ عربی، فارسی اور پشتو کے عالم تھے اور تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وہ تحصیل پشین کے شادیزئی سادات میں سے ہیں۔ پشین کے شادیزئیوں میں علامہ سید محمد یعقوب شاہ لاجوری کا گھرانہ اپنے علم و فضل کے لئے بڑی شہرت رکھتا ہے اور صاحب زادہ خیل کہلاتے ہیں۔ آغا یعقوب شاہ کا فارسی دیوان کئی سو اشعار پر مشتمل ہے۔

آغا سید یعقوب شاہ مرحوم نے ہندوستان، پاکستان اور افغانستان میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۳ میں اسی کی عمر پا کر اس دار فانی سے راہی ملک بقا ہو گئے۔ آغا یعقوب کلی لاجور میں درس و تدریس کا شغل کرتے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا حسین احمد مدنی کے ہم جماعت تھے۔ پچپن سال تک کلی لاجور میں دینی تعلیم دیتے رہے۔

علامہ عبدالعلی آخوندزادہ: اس دور کے ایک اور شاعر، نثار اور عالم دین علامہ عبدالعلی اخوندزادہؒ ہیں علامہ عبدالعلی ۱۲۸۹ ہجری میں خانوزئی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ گاؤں کے لوگ بڑے باہمت اور علم دوست واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے برسوں پہلے بندات تعمیر کر کے اپنے گاؤں کو سرسبزی اور شادابی بخشی ہے جو آج اس دیہہ کو میسر ہے۔ افغانستان کے علاقہ قندہار کے کئی جدید شعراء علامہ مرحوم سے اکتساب علم و فن کرتے رہے ہیں۔ علامہ عبدالعلی نے بہت ہی کم عمری میں قندہار کی ادبی اور علمی محفلوں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا اور اپنے علم اور ستودہ صفات کی بدولت ایک اچھے دوست اور ہر دلعزیز رہنما کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پر درد دل اور روشن دماغ کے ساتھ ساتھ پرسوز آواز بھی عطا کی تھی۔ کبھی کبھی علامہ مرحوم پر مستی کی کیفیت طاری ہوتی اور شعر گاتے جاتے اور اتن کرتے جاتے۔ علامہ مرحوم قندہار میں اس قدر جلد مقبول ہوئے کہ دور دور سے لوگ ان کے پاس علم کے جویا آنے لگے۔

بلوچستان کے ایک پشتو شاعر اور ادیب حافظ خان محمد مرحوم نے اس خطے کی ادبی تاریخ قلمبند کی ہے جو "دکسے کلان" (کسے غر کے پھول) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے علامہ عبدالعلی مرحوم کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"ایک دن علامہ عبدالعلی میری دکان میں بیٹھے تھے اور اردو شعراء کے کلام کے مطالعے میں مصروف تھے۔ اسی دوران قدیم شعراء کے کلام پر رائے زنی اور تنقید شروع ہوئی۔ ایک شاعر کے ہاتھ میں مرزا عبدالقادر بیدل کا دیوان تھا۔ اس نے غالب کے حوالے سے بتایا کہ بیدل بہت ہی مشکل پسند شاعر تھے۔ مگر میرے خیال میں بیدل مشکل پسند شاعر نہ تھے۔ اس پر علامہ عبدالعلی نے بیدل کا ایک شعر پڑھا اور پھر ایسے دلچسپ انداز میں اس کی تشریح کی کہ اہل محفل عش عش کر اٹھے اور سب لوگ لاجواب ہو گئے۔"

علامہ عبدالعلی کے پاس اعلیٰ قلمی خطوط اور نادر کتب کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔ قلمی نسخوں میں پشتو ادب کی مستند تاریخ "پتہ خزانہ" کی ایک جلد بھی تھی۔ اس کتاب کا مولف محمد ہوتک ہے۔ اور یہ پشتو ادب کا پہلا تذکرہ اور بنیادی ماخذ ہے۔ ۱۳۴۹ ہجری میں علامہ عبدالعلی سابق ریاست قلات میں وزیر معارف مقرر ہوئے مگر اپنے بیٹے عبدالحق ہلال کی خودکشی کے بعد بہت ہی کبیدہ خاطر ہوئے اور وزارت چھوڑ کر خانوزئی چلے گئے۔ کچھ عرصہ کوئٹہ میں طبابت بھی کی۔ علامہ عبدالعلی مرحوم نے اردو، فارسی اور پشتو میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر ان کی تمام تحریریں اور اشعار بکھری صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان کا منتخب پشتو اور فارسی غزلوں کا مجموعہ "شاخ گل" کے نام سے ۱۹۵۵ء میں فضل احمد غازی نے شائع کیا تھا۔

علامہ عبدالعلی مرحوم نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۴ء مطابق ۱۶ شوال ۱۳۶۴ ہجری وفات پائی اور اپنے آبائی گاؤں خانوزئی میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ علامہ عبدالعلی کی شاعری میں بے باکی کا عنصر غالب ہے۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار میں اشاریت سے کام نہیں لیتے بلکہ ہر احساس اور جذبے کو زبان شعر میں واشگاف اور بے باکانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جبکہ فارسی میں سبک ہندی کے زیر اثر ہیں۔

ملا عبدالسلام اشیزئی: ملا عبدالسلام اشیزئی انقلابی فکر رکھنے والے شاعر ہیں۔ وہ ملا کم مفکر زیادہ تھے۔ ان کی شخصیت بھی صرف ادب تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ مذہبی اور سیاسی پہچان بھی رکھتے تھے۔ ملا سلام کا شعری مجموعہ "سوسن چمن" کو انگریز حکمرانوں نے ضبط کیا تھا، جو وطن کی آزادی کے بعد دوبارہ شائع ہوا۔ ان کی شاعری کا مزاج خوشحال خان خٹک سے ملتا ہے۔ ملا سلام نے بھی غزل ہی میں اپنا کمال دکھایا ہے اور اکثر غزلیں چھوٹی بحروں میں کہی ہیں۔ ان کی فکر میں زبردست جارحانہ اور قومی غیرت کی بیداری کا اظہار ہے۔ ملا عبدالسلام نے شاعری میں اپنی قوم اور قبیلے کی کم ہمتی اور بزدلی کی تردید کی ہے۔ ملا سلام نے اپنی شاعری کے ذریعے اخلاقی، روایتی اور دینی اقدار کی پاسداری کیلئے زبردست نشتر زنی کی ہے اور خود کو بدبخت قبیلے کا شاعر کہا ہے۔

سوسن چمن کے علاوہ ان کی دوسری کتاب جسے منظوم فقہی کتاب کہہ سکتے ہیں، "طلب مذہب" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں دینی مسائل اور موضوعات کو پشتو اور فارسی شاعری میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ کی تاریخ پیدائش 1883 اور تاریخ وفات 1974 ہے۔ آپ پر ایک چھوٹی سی کتاب مقدس خان معصوم نے لکھی ہے جو ان کے فن و شخصیت پر پہلی باقاعدہ کتاب ہے جبکہ مختلف ادیبوں کے مقالات پر مشتمل ایک کتاب عبدالرؤف رفیقی نے تالیف کی ہے۔ مذکورہ بالا دو شعرا کے علاوہ بلوچستان کی روایتی پشتو شاعری میں حافظ خان محمد، ملا محمد یعقوب لاجورہ عبدالمجید کاکڑ، علی محمد بزگر، گل شان خوستی، مقدس خان معصوم، کلیم اللہ صدام، غلام محمد صابر، مولوی عبدالخالق تارن، سلطان محمد صابر، عبدالغفور پردیس، شیخ صاحب خان، عبدالباری اسیر، سید محمد رسول فریادی، وزیر محمد سبوابی، نظیر محمد درانی، میر ابوعلا وٰالدین الہامی، شفیق العالم معذور یار، کمال الدین کمال، ضیاء الدین لاجوری اور چند دوسرے وہ شعراء ہیں جنہوں نے پشتو شاعری میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ چند ایک کے تو دیوان بھی مکمل ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بلوچستان کے بہت بڑے ادبی ناموں پروفیسر سیال کاکڑ، اور پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ نے شاعری کی طرف توجہ دی ہے۔ سیال کاکڑ کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور صاحبزادہ کا غزلوں اور نظموں پر مشتمل ضخیم دیوان چھپ چکا ہے۔ جبکہ ابوالخیر زلاند، کریم بریالے، سید عابد شاہ عابد، سعید گوہر، ربنواز مائل، سرور سودائی، عمر گل عسکر، راز محمد راز، درویش درانی، خیر محمد عارف، نظر پانیزئی، مقبول احمد ناصر، عبدالعزیز سوزانی وغیرہ موجودہ دور میں غزل کی جانب توجہ دے رہے ہیں۔ جن میں پروفیسر ربنواز مائل کی غزل قطعی طور پر جدید ہے بلکہ پشتو میں غزل کا جدید ترین لہجہ ہے۔ ان کی غزل کے بارے میں ایوب صابر نے لکھا تھا کہ "پشتو غزل میں انکا انداز وہی ہے جو اردو میں شہزاد احمد اور ظفر اقبال اور ایسے دیگر جدید شعراء کا ہے۔" پروفیسر عابد شاہ عابد کا انداز روایت و جدیدیت کے بین بین ہے۔ سعید گوہر نے جدت کے ساتھ غزل کہی ہے جبکہ ان کی زیادہ توجہ الفاظ کے انتخاب اور ردیف قافیوں کی انفرادیت پر بھی ہے۔ گوہر کی غزل میں دکھ کا عنصر غالب ہے اور فن کے اچھے ماہر ہیں۔ درویش درانی کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں ان کی غزلیں پشتو اقدار اور رسم و رواج کی عکاسی کرتی ہیں اور پشتو کے نمائندہ شاعر کہلاتے ہیں۔ پشتو غزل کی

آخری یا نوجوان نسل میں نسیم اچکزئی، افضل شوق، سہیل جعفر، مجیب پانیزئی، خلیل باور، کامران اچکزئی، ناظر صادق، ڈاکٹر عبدالروف رفیقی، مالک زہیر، قاسم صیاد، محمود ایاز، تیمور شاہ کمال، نعیم آزاد، فیض محمد شہزاد، ڈاکٹر اورنگ زیب احساس، رحیم شاہ فولاد، عارف تبسم، محمود ایاز، کامران اچکزئی، گل خان حیرت، عصمت اللہ زہیر، رازق فہیم، لاجان ترابی، نیاز خلجی، نصیب اللہ سیماب، عصمت زہیر، عبدالکریم عادل، وبزمہ درانی، بشرمل ناسر، نذر محمد شہاب وغیرہ سرگرم ہیں۔

نظم: غزل و نظم دونوں اصناف میں لکھنے والے تقریباً اکثر شعراء کا ذکر حصہ غزل میں ہو چکا ہے لیکن چند نام جو نظم میں نمایاں ہیں ان کے بارے میں یہاں بات کر لیتے ہیں۔ پروفیسر رنواز مائل نے غزل کی طرح نظم میں بھی بالکل نیا آہنگ اور مزاج پیدا کیا ہے اور آزاد نظم کے بانیوں میں سے ہیں۔ صاحبزادہ حمیداللہ کی نظمیں روایتی انداز میں ہیں اور پروفیسر سیال کاکڑ نے واقعات و شخصیات پر نظمیں کہیں ہیں جو ان کی کتاب "سنگر" میں شامل ہیں۔ درویش درانی کا ذکر نظم میں خصوصیت کا حامل ہیں کیونکہ ان کے مجموعے زیادہ تر نظموں پر مشتمل ہیں۔ درویش نے نظموں میں کہانی پن پیدا کیا ہے جو پابند اور معری ہیں۔ درویش اس طرح اپنے اس جداگانہ انداز میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کی ایک کتاب کو اکادمی ادبیات سے خوشحال خان ایوارڈ بھی ملا ہے۔ ابوالخیر زلاند کے بارے میں بھی لکھاریوں اور ناقدین کی رائے ہے کہ وہ غزل کی نسبت نظمیں اچھی کہتے ہیں۔ نسیم اچکزئی کی نظمیں انگریزی ادب کے زیر اثر ہیں۔ نسیم انگریزی ادب سے زیادہ متعلق ہیں اور جدید لہجے میں نظمیں کہتے ہیں۔ افضل شوق کی شاعری میں بھی ان کی نظمیں غزلوں پر بھاری ہیں۔ ان کی نظمیں مختصر اور بامعنی ہیں۔ رؤف رفیقی کی کتاب میں نظموں کا حصہ حاوی نظر آتا ہے اور اکثر نظمیں واقعاتی اور تاثراتی ہیں۔ رفیقی نظم میں اقبال کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمیل قزلباش کی نظمیں جدید پیرایہ رکھتی ہیں، ان کے علاوہ محمود ایاز بھی اچھی نظمیں کہتے ہیں۔

ہائیکو: اس صنف کو متعارف ہوئے کم مدت ہوئی ہے لیکن پانچ، سات، پانچ کی پابندی پشتو میں اور خصوصاً بلوچستان میں رکھی گئی ہے۔ سب سے پہلے پروفیسر رنواز مائل نے اس نام کو بلوچستان میں متعارف کیا اور پانچ، سات، پانچ کے وزن سے ہٹ کر ہائیکو کہے۔ پھر ایک طویل مدت بعد علی کمیل قزلباش نے پانچ، سات، پانچ کے وزن میں ہائیکو کہہ کر اس سلسلے کو دوبارہ جاری کر دیا۔ اس کے علاوہ ہائیکو کی ہیت اور تاریخ اور پشتو میں ہائیکو کے عنوان سے مقالے بھی لکھے۔ عبدالروف رفیقی نے کثرت سے اچھے ہائیکو کہے ہیں۔ ان کے علاوہ عمر گل عسکر، سرور سودائی، شفیق العالم معذور یار، تیمور شاہ کمال، عارف تبسم اور کامران اچکزئی نے پانچ، سات، پانچ کے وزن میں ہائیکو کے تسلسل کو قائم رکھا۔

بلوچستان میں پشتو نثر نگاری کا حصہ بھی کافی ہے لیکن تحقیقی اور تنقیدی تحریروں کے مقابلے میں تخلیقی اصناف کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔ حصہ نثر کی ابتدا موثر تخلیقی افسانے سے کرتے ہیں۔

افسانہ: پشتو میں افسانہ مجموعی طور پر بیسویں صدی میں داخل ہوا، لیکن بلوچستان میں اس طرف بہت بعد میں توجہ ہوئی۔ ستر کی دھائی کے بعد کبھی کبھار کوئی شاعر ایک آدھ افسانہ لکھ لیتا تھا۔ اور پھر اپنی شاعری کی طرف متوجہ ہوتا۔ لیکن باقاعدہ طور پر اسّی کی دھائی کے بعد چند نام منظر عام پر آ گئے جن میں درمحمد کاسی، حاجی میرزا خان، فاروق سرور، ولی محمد ولی اور نصیب اللہ سیماب کے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ درمحمد کاسی کے تین افسانوی مجموعے ہیں۔ ان کا انداز واقعہ نگار جیسا ہے اور اپنے تجربات و مشاہدات پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ حاجی میرزا خان "پچی" کی ایک کتاب چھپی ہے، میرزا خان کے افسانوں میں پشتون کلچر اور ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ انہوں نے خواتین کے مسائل پر زیادہ تر افسانے لکھے ہیں۔ نصیب اللہ سیماب کے مجموعے میں بھی پشتون ماحول زیادہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ولی محمد ولی کا انداز عامیانہ ہے۔ ایک افسانوی مجموعہ چھپا ہے۔ ان کے علاوہ نظر پانیزئی اور مقدس خان معصوم نے بھی افسانے لکھے ہیں۔ نئے ناموں میں محمود ایاز، خلیل باور اور ناظر صادق افسانے لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے نام ہیں جنہوں نے ایک آدھ لکھا ہے یا لکھ لیتے ہیں۔

انشائیہ: اس صنف میں باقاعدہ کام کسی نے نہیں کیا، بس کبھی کبھار کوئی ایک آدھ لکھ لیتا ہے۔ یا لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ ان میں پروفیسر رنواز مائل، کریم بریالے، خلیل باور، کمیل قزلباش اور شاید ایک آدھ نام اور بھی شامل ہوئے۔ خلیل باور نے نسبتاً زیادہ توجہ دی ہے اور ایک مقالہ بھی انشائیہ پر لکھ چکے ہیں۔

طنز و مزاح: یہ صنف ادب بلوچستان میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلکہ صرف قدوس درانی نے خصوصاً "شاغاسی اکا" اور چند دوسرے مضامین لکھ کر اپنی انفرادیت منوائی ہے۔ ان کے علاوہ امان اللہ ناصر نے بھی کچھ اچھی مزاحیہ شاعری کی ہے۔

سفرنامہ: افضل شوق نے اس صنف میں کام کیا ہے۔

ناول: بلوچستان میں پشتو کا پہلا ناول ناظر صادق نے لکھا۔ ان کے علاوہ افضل

شوق بھی ناول لکھتے ہیں۔

خاکہ: خاکہ نگاری میں صاحبزادہ حمیداللہ اور علی کمیل قزلباش باقاعدہ خاکہ لکھ رہے ہیں۔

تنقید: اس ضمن میں ہم موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بیان کر سکتے ہیں جن میں ایک حصہ فکری موضوعات یا اصناف پر مقالات کا ہے اور دوسرا کسی کے فن، شخصیت یا کتاب وغیرہ کے حوالے سے لکھے جانے والے مقالات ہیں۔ فکری اور توضیحاتی انداز کے مقالات لکھنے والوں میں سب سے اہم نام پروفیسر رنواز مائل کا ہے جنہوں نے مختلف علمی و فکری موضوعات پر مقالے لکھ کر پشتو ادب میں بھاری اضافہ کیا ہے بلکہ شاید پورے پشتو ادب میں اس نوعیت کی تحریریں ملنا مشکل ہوں۔ ان کے علاوہ فضل احمد غازی نے درجنوں مقالات مختلف موضوعات پر لکھے ہیں۔ ان کا انداز تحلیلی ہوتا ہے اور ثقافت و ماحولیاتی اثرات کو زیادہ موضوع بناتے ہیں۔ اس طرح کے ایک آدھ مقالے دوسرے لکھاریوں کے بھی شائع ہوتے رہے ہیں جبکہ دوسرے پہلو پر بہت سے ادیب لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر سیال کاکڑ کی اس موضوع پر ادبی، ثقافتی اور دوسری کتابیں چھپی ہیں اور پروفیسر صاحبزادہ حمیداللہ نے بھی تنقیدی حوالے سے بہت ساری کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ کریم بریالے نے بھی اچھے مقالے لکھے ہیں، جبکہ میرزا خان، خیر محمد عارف، عبدالخالق تارن، حافظ خان محمد، سعید گوہر، مقدس خان معصوم، فاروق شاہ، قدوس درانی، سلطان محمد صابر، ابوالخیر زلاند، عبدالرؤف رفیق، درویش درانی، ڈاکٹر خدائیداد، نسیم اچکزئی، نعیم آزاد، عصمت زہیر، خلیل باور، علی کمیل قزلباش، محمود ایاز اور عارف تبسم بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ لیکن یہاں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ صحیح تنقیدی شعور ابھی بہت کم لکھاریوں میں آیا ہے اور صرف تعریف و ستائش ہی کی شکل میں تنقیدی کام کا دعوی کیا جا رہا ہے۔

تحقیق: لفظ تحقیق کے ساتھ ہی دو معتبر ترین نام ذہن میں آجاتے ہیں اور وہ نام پروفیسر صاحبزادہ حمیداللہ اور پروفیسر سیال کاکڑ کے ہیں۔ صاحبزادہ حمیداللہ نے اس طرف زیادہ توجہ دے کر درجنوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں جن میں پشتو ادب، پہ جنوبی پشتونخواہ کی، اور دوسری شخصیات، سوانح، لغات، اور فولکلوری اصناف پر مشتمل کتابیں ہیں۔ آپ کی ۳۶ سے زیادہ کتابیں چھپی ہیں جبکہ سیال کاکڑ کی کتاب "دکسے دلمنی پشتاہ لیکوال"، غازی، چغیاں، فولکلوری، جواہر، پشتو ٹکلونہ، چغیان، انگئی اور بچوں اور بڑوں کے متعلق پشتو ادب و ثقافت پر کئی کتابیں موجود ہیں۔ انہوں نے ۳۶ کتابیں شائع کی ہیں اور پشتو ثقافتی ادبی و علمی حوالے سے نایاب قلمی نسخوں کا ذخیرہ بھی ان کے پاس موجود ہے۔ ابوالخیر نے بھی چند کتابیں تحقیقی حوالے سے شائع کی ہیں جن میں عبدالعلی اخوندزادہ کے فن و شخصیت پر کتاب کے علاوہ انگئی، دمتلونو قصے اور دوسری شامل ہیں۔ ان کے بعد تحقیقی حوالے سے عبدالرؤف رفیق کا نام آنا ضروری ٹھہرتا ہے کیونکہ رفیق نے تحقیق کی طرف انتہائی سنجیدگی سے توجہ دے رکھی ہے۔ سعید گوہر نے پٹہ خزانہ پر تحقیقی کتاب لکھی ہے جبکہ خیر محمد عارف کی مدد سے حنان بارکزئی کی کتاب پر حاشیہ لکھا ہے۔ خیر محمد عارف نے غازی پر کتابیں تالیف کی ہیں اور زموز غازیان لکھی ہے۔ ثقافتی حوالے سے تحقیقات کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ مزید ناموں میں کریم بریالے، ڈاکٹر معصوم کاسی، مولوی رحمت اللہ مندوخیل، شیخ صاحب خان، میرزا خان، حافظ خان محمد، قدوس درانی، کمال الدین شیرازی، سید عابد شاہ عابد، فضل احمد غازی، کلیم اللہ صدام، کمیل قزلباش، عبدالباری اسیر شامل ہیں۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھونگا کہ بہت سے دیگر نام بھی تحقیقی طور پر پشتو تذکروں میں آتے ہیں لیکن میں نے صرف ادبی اور ثقافتی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے مذکورہ ناموں کا انتخاب کیا ہے جبکہ دوسرے محققین میں سے اکثر اسلامی محقق کہلائے جا سکتے ہیں۔ کریم بریالے کی پٹہ خزانہ اور پشتو رسم الخط پر کتابیں پشتو اکیڈمی نے شائع کی ہیں۔

ادبی رسائل: پشتو میں ادبی صحافت میں سب سے اہم کردار ماہنامہ "روس" نے ادا کیا ہے۔ جس کا اجراء ۱۹۶۲ء میں ہوا اور ابھی چند سال پہلے بند ہوا اس ماہنامے نے ہر دور میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ بڑے معیاری ناموں کو بھی شائع کیا اور اچھے معیاری شمارے بھی چھپے ہیں۔ خصوصاً بلوچستان کی ثقافت کے حوالے سے اس کا کردار اہم ہے۔ جبکہ سب سے قدیمی ماہنامہ ڈاکٹر خدائیداد کا "پشتو" ہے جو ۱۹۵۳ء میں جاری ہوا اور ایک سال مکمل کرنے کے بعد بند ہوا اس کے علاوہ ۱۹۵۹ء میں ظفر اللہ خان نے ایک ہفت روزہ "ظفر الاسلام" کے نام سے جاری کیا جو اپنے دور میں اچھا خاصا معروف تھا۔ اس سے قبل فضل احمد غازی نے "گلستان" کے نام سے ماہنامے کا اجراء ۱۹۵۷ء میں کیا جس کی ہفت روزہ اشاعتیں بھی ہوئیں۔ یہ ماہنامہ بڑی تعداد میں شائع ہوتا رہا اور ۱۹۶۶ء تک جاری رہ کر بند ہوا۔ پھر ایک طویل مدت بعد ایک چھوٹا سا پرچہ "گیز" کے نام سے شائع ہوا جس کا دوسرا شمارہ نہیں چھپ سکا جبکہ پشتو اکیڈمی کی طرف سے ۱۹۸۴ء میں "لیکنزی" کے نام سے ایک ضخیم اور دو باریک مجلے شائع ہوئے۔ اس کے بعد دوبارہ ایک طویل مدت تک خاموشی چھائی رہی مگر ڈاکٹر معصوم نے ۹۰ء میں "گیز" ہی کے نام سے جعفر اچکزئی کی مدد سے ماہنامے کا اجراء کیا لیکن اس میں اکثر چھپا ہوا مواد چھپتا رہا اور پھر بند ہو گیا۔ پھر تماس کے نام سے علی کمیل قزلباش اور عارف تبسم نے خلیل باور کی

معاونت سے ایک سہ ماہی مجلّے کا اجراء ۱۹۹۴ء میں کیا جس کے ابھی تک چھ شمارے چھپ سکے۔ جن میں ایک "جدید پشتو ادب" کا ضخیم نمبر بھی شامل ہے۔ محمود ایاز نے اسی دوران سہ ماہی مجلّہ سکام کے نام سے شروع کیا اور پھر جلد اس کو ماہنامہ "لیک "میں بدل ڈالا جو ابھی بند ہو چکا ہے۔ اسکے علاوہ عصمت اللہ زہیر نے ایک شمارہ ماہنامہ "حسنی" کے نام سے پشین سے جاری کیا جو دوبارہ نہیں نکل سکا۔ اس وقت کوئٹہ سے صادق ژڑک کی ادارت میں "لمبہ "شائع ہوتا ہے جبکہ پشتو اخبارات میں "قدرت" "نوے ژوند" اور "زلاند" شامل ہیں۔

تراجم: اس ضروری کام کی طرف کم توجہ دی گئی ہے تاہم ایک اہم نام خان عبدالصمد خان کا ہے انہوں نے گلستان سعدی، کیمیائے سعادت، مولانا ابوالفلاح کی قرآنی تفسیر کا پشتو میں ترجمہ کیا۔ جبکہ ڈاکٹر خدائیداد نے بہت ہی معیاری تراجم سے پشتو ادب کو دوسری زبانوں سے اور دوسری زبانوں کو پشتو ادب سے متعارف کیا ہے۔ پروفیسر سید عابد شاہ عابد نے پیر محمد کاکڑ کا اردو میں ترجمہ کیا اور "سیلاب" کے نام سے عین سلام کی مدد سے پشتو فولکلوری صنف کو اردو میں شائع کیا ہے اور ابوالخیر زلاند نے عمر خیام کی رباعیات کی ایک بہت بڑی تعداد کو پشتو میں ڈھال کر بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جن میں کچھ رباعیات قطعی طور پر طبع زاد محسوس ہوتی ہیں۔ نسیم اچکزئی نے نور محمد ترکی کی ناولوں کو انگریزی میں بدل دیا ہے اور اب پشتو کے انتہائی نزاکت پسند کلاسیک شاعر کاظم خان شیدا کی شاعری کو انگریزی میں لکھا۔ سعیدہ گوہر نے بھی کچھ شعری تراجم کئے ہیں۔ علی کمیل قزلباش نے اُردو سے پشتو اور پشتو سے اُردو میں شعری ونثری تراجم کئے ہیں اور پشتو کے چھبیس افسانہ نگاروں کے افسانوں کے اُردو تراجم پر مشتمل ایک کتاب "شاہکار پشتو افسانے" کے نام سے چھپوائی ہے۔ ان کے علاوہ عصمت اللہ زہیر، یعقوب شاہ غرشین، عبدالحئی کاکڑ بھی تراجم کی طرف متوجہ ہیں۔

ادبی ادارے: اس حوالے سے اہم نام پشتو اکیڈمی بلوچستان کا ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ ادبی تنظیمیں جو مختلف ناموں سے بنتی اور ختم ہوتی گئیں جن میں پشتو ادبی ملگری لورالائی نے ایک دور میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا ہے اس کے علاوہ پشین کی "شیدایان پشتو ادب" لیکوال کام کر رہی ہے۔ کسی وقت پشتو ادبی بورڈ بھی قائم تھا۔ ملگری لیکوال کی شاخیں بلوچستان کے علاوہ صوبہ سرحد میں بھی ہیں۔ گذشتہ پندرہ سالوں میں ہر پندرہ روز میں ایک نشست کا اہتمام کرتی ہے۔ اس کے علاوہ زیارت، قلعہ سیف اللہ، ژوب، خانوزئی اور چمن کی پشتو ادبی تنظیمیں بھی سرگرم عمل ہیں۔

ادبی کالم: پشتو ادبی حوالے سے اردو اخباروں میں شائع ہونے والے کالموں میں سعید گوہر کے قلمی نام "خوشحال کاکڑ" کا کالم "عمر گل عسکر کی پشتو محفل" (جو روزنامہ جنگ کوئٹہ میں اب بھی جاری ہے) پشتو کا سب سے زیادہ مدت پر محیط کالم ہے۔ علی کمیل قزلباش کا روزنامہ مشرق میں "خبری سرگرمی" اور "رتماس" کے نام سے چھپتا رہا اور محمود ایاز کا پشتو اخبار "نوے ژوند" میں نجورا ادیب کے قلمی نام سے شائع ہونے والے کالم شامل ہیں۔ آخر میں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ بلوچستان میں حمد ونعت میں تقریباً اکثر شعراء طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن خصوصیت سے کسی شاعر کا نام نہیں لیا جاسکتا ہے کیونکہ کسی بھی شاعر نے ان اصناف کو خصوصیت کے ساتھ نہیں اپنایا ہے۔

بلوچستان میں اردو زبان وادب: ڈاکٹر فاروق احمد کے مطابق بلوچستان میں اُردو زبان وادب کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں۔ برصغیر پاک و ہند کا ایک صوبہ ہونے کے باعث یہاں اُردو زبان وادب کی لہریں اٹھتی رہی ہیں لیکن کوئی مربوط ادبی یا لسانی تحریک اس صوبہ میں بہت پہلے سے موجود نہیں تھی۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ بلوچستان کی تہذیبی اور ثقافتی زبان اور رسومات کا تعلق برصغیر سے زیادہ ایران اور افغانستان سے متاثر رہا ہے۔

علاوہ ازیں بلوچستان میں بولی جانے والی زبانیں بھی فارسی ادب سے زیادہ قریب رہیں کیونکہ یہاں پر جو نسلیں آباد ہیں ان میں بلوچی، پشتو، براہوی اور فارسی زبانیں بحیثیت مادری زبان کے رائج رہی ہیں۔ اس لئے یہاں کے تہذیبی رنگ میں افغانستان اور ایران کی لسانی تشکیل اور فکر وخیال کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

بلوچی زبان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لہجہ کی تبدیلی کے علاوہ یہ فارسی ہی کی مختلف شکل ہے پشتو زبان وادب پر ایک طرف صوبہ سرحد اور دوسری طرف افغانستان کے تہذیبی اثرات پوری طرح واضح ہیں۔ پشتو زبان بجائے خود قدیم ہے اس لئے پشتو زبان وادب کا ورثہ بھی بہت قدیم اور اپنی ہزاروں سال قدیم تہذیب کا پروردہ ہے۔ جہاں تک براہوی زبان کا تعلق ہے یہ زبان اپنے تمام پہلوؤں کے باوجود دراوڑی زبانوں میں شامل کی جاتی ہیں۔ اس زبان کی صوتی لفظیات اور لسانی تشکیل میں دراوڑی زبان کے اثرات بھی ملتے ہیں اور ابھی تک بیشتر محققین کا یہی خیال ہے کہ براہوی برصغیر کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ جبکہ پشتو، بلوچی، ہندی فارسی، سرائیکی، سندھی، پنجابی اور دیگر زبانیں ہند آریائی زبانوں کے قبیلے میں شامل ہیں۔ زبانوں کی اس رنگارنگی کے سبب صوبہ بلوچستان

سب سے زیادہ نمایاں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

بلوچستان کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ بھی بے حد قدیم ہے۔ژوب اور کوئٹہ ویلی سولائزیشن اپنے ارتقائی سفر میں مہر گڑھ میں جلوہ گر ہوئی جو آگے چل کر اپنی ترقی یافتہ شکل میں موہنجوداڑو کی عظیم تہذیب بنی۔

بلوچستان میں زبانوں کی گہما گہمی میں اردو زبان اور ادب کو پنپنے کا موقع نہ مل سکا۔

انیسویں صدی میں اُردو یہاں بحیثیت دفتری زبان کے رائج رہی ہے اگرچہ ہندوستان سے یہاں مختلف لوگ آکر رہتے رہے اور یہاں کے لوگ ہندوستان جاکر بستے رہے۔اور انفرادی سطح پر تو اردو زبان یہاں پہنچی۔لیکن پہلا مربوط رابطہ ہمیں سید احمد شاہ بریلوی کے ذریعے نظر آتا ہے۔جب وہ بلوچستان کے راستے سے گزرتے ہوئے قندھار قابل اور پشاور سے ہوتے ہوئے سکھوں کے خلاف جہاد کررہے تھے۔

سید احمد شاہ بریلوی کے ساتھ جو پانچ چھ سو علماء تھے انہوں نے یہاں اردو زبان و ادب کے لئے بہت کام کیا۔اس طرح ہم دیکھتے کہ ۱۸۲۶ء کے بعد اردو شاعری اور اردو زبان پڑھنے اور بولنے کا رجحان اور استعداد پیدا ہوچکی تھی اس رجحان کے زیر اثر ہمیں بلوچستان میں جو پہلا شاعر ملتا ہے وہ ملا محمد حسن براہوی ہے۔

اہل بلوچستان کے لئے اردو زبان کی جانب مائل ہونا صرف اس زبان کے بنیادی مزاج ہی کے باعث آسان نہ تھا بلکہ خود اہل بلوچستان کا مزاج بھی لسانی تغیر کے لئے برصغیر میں سب سے زیادہ موزوں تھا۔یہ خصوصیت صرف اس خطے کے لوگوں کو حاصل ہے کہ وہ بیک وقت ذوالسان ہیں۔قلات اور مکران ڈویژنوں میں اکثر لوگ بلوچی اور براہوی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔مغربی بلوچستان میں بلوچی اور پشتو بولنے والے اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔جنوبی و مشرقی بلوچستان میں سندھی اور براہوی دونوں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔شمالی و مشرقی بلوچستان میں سرائیکی بلوچی اور پشتو تینوں بولی جاتی ہیں اور کوئٹہ جو بلوچستان کا مرکز ہے۔لسانی تنوع کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز منظر پیش کرتا ہے۔اس میں براہوی بلوچی اور پشتو کے علاوہ فارسی اردو سرائیکی اور پنجابی بولنے والے افراد بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں اور قریب قریب ہر فرد تین تین چار چار زبانیں بیک وقت آسانی اور روانی سے بول سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اہل بلوچستان کے لئے اردو کو اپنا لینا قطعاً مشکل نہ تھا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ملا محمد حسن براہوئی نے نہایت روانی سے اپنے خیالات کا اظہار اردو زبان میں کیا، حالانکہ اس وقت کسی اردو تدریسی سکول کا ہمیں پتہ نہیں چلتا۔انہوں نے وہی اردو لکھی جو مرزا رفیع سودا وغیرہ کے ہاں ملتی ہے۔ملا محمد حسن کا اردو کلیات 1847 میں اختتام پذیر ہوا اور انگریزوں کا بلوچستان پر تسلط تیس سال بعد معرض وجود میں آیا۔اس کلیات کا اختتام گویا انگریزی تسلط سے تیس سال پہلے اور جنگ آزادی 1857ء سے دس سال پیشتر ظہور میں آیا اور ظاہر ہے کہ یہ پانچ سو سے زائد اشعار کا کلیات ملا موصوف نے ایک ہی سال میں تخلیق نہیں کرلیا بلکہ اس پر ان کے کئی سال صرف ہوئے۔

برصغیر میں مرکز اسلام سے مربوط ہونے والا اولین خطہ یہی بلوچستان تھا۔پنجگور (عربی فنز پور) خضدار (عربی قصدار) وغیرہ سب سے پہلے اسلامی تہذیب و تمدن سے آشنا ہوئے۔یہیں سب سے پہلے عرب اور ایرانی علماء فضلا تاجر کشوری عمال اور لشکریوں کا رابطہ مقامی آبادی سے ہوا اور باہمی اظہار خیالات کی ضروریات نے غالباً سب سے پہلے یہیں کسی ایسی زبان کے ہیولے کا روپ دھارنا شروع کیا جو ان مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے لئے مشترکہ ذریعہ اظہار کا کام دے سکتی۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بلوچی منظومات میں اردو الفاظ و تراکیب اور مصرعے اور بلوچستانی اردو شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب اور خیالات و جذبات کا استعمال اسی تاریخی تقاضے کا پیدا کردہ تھا ایک محقق کا کہنا ہے کہ ''اگر کوئی اسی طرح موازنہ کرتا جائے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اردو بلوچی اور براہوی فرہنگوں کا 25 فیصد سے 33 فیصد تک اشتراک ہے۔

پاکستانی دور 1947ء سے اس خطے میں جاری و ساری ہوا۔اس میں چند پرانے لکھنے والے بھی موجود ہیں۔لیکن آزادی کی فضا نے اگر ایک طرف سمندر تخلیق و تخیل کو مہمیز لگائی تو دوسری طرف آبادی کے اضافے نیز مواصلات و مطبوعات کی سہولتوں کی بنا پر اصحاب فکر و دانش میں زبردست ربط و ضبط پیدا ہوا۔اس دور میں نثری کارناموں کی رفتار بہت تیز ہوگئی۔

اس دور کی ابتداء عبدالرحمٰن غور کی مرتبہ کتاب ''مشعل'' سے ہوئی۔جس میں اس وقت کے بلوچستان کے اہم ترین لکھنے والوں کی تخلیقات جمع کردی گئیں۔

ڈاکٹر فاروق احمد کے بقول اردو باقاعدہ طور پر بلوچستان میں اس وقت رائج ہوئی جب ۱۸۷۷ء میں انگریزوں نے بلوچستان پر باقاعدہ تسط حاصل کیا۔انہوں نے بلوچستان کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ایک ریاستی بلوچستان اور دوسرا ایجنسی کے نام سے اپنی حکمرانی کو رائج کیا۔انگریزوں کے تسلط کے بعد ۱۸۷۷ء سے بلوچستان میں دفتری کارروائی اردو میں ہونے لگی یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری

رہا اور بلوچستان کی دفتری زبان اردو اور انگریزی رہی۔ ۱۸۹۳ء میں جام علی خان کا ایک خط بھی اُردو میں ملتا ہے جو انہوں نے ایک سندھی شاعر کو لکھا ہے۔

۱۸۸۳ء ٹرسٹ کا جدید طرز کا پہلا سکول کوئٹہ میں قائم کیا گیا آٹھ نو سال بعد ۱۸۹۰ء میں اس سکول کا نام سنڈیمن سکول رکھا گیا اور ۹۴۔۱۸۹۳ء میں اسے ہائی سکول کا درجہ دیا گیا۔ اس سکول کا نام الحاق پنجاب سے کیا گیا اور پنجاب یونیورسٹی کا نصاب بھی یہاں پر رائج کیا گیا۔ اس نصاب میں ذریعہ تعلیم اردو تھا آج تک بلوچستان میں اردو ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ اگرچہ پرائمری سطح پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے لیکن وہاں بھی اُردو کو ایک زبان کے طور پر لازمی پڑھایا جاتا ہے۔

بلوچستان میں اُردو کا چلن اگرچہ انیسویں صدی میں پوری طرح رائج ہو چکا تھا لیکن اردو کو بنانے سنوارنے اور اسے مقبول بنانے میں ان مشاہیر کا ادب میں ہاتھ ہے جو وقتاً فوقتاً کوئٹہ میں بلوچستان میں آباد رہے ان نامور ادباء میں مرزا ہادی رسواء بھی بلوچستان میں رہے جو محکمہ ریلوے سے وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ ۱۹۰۳ میں علامہ اقبال بھی بلوچستان تشریف لائے۔ محاسن کلام غالب کے مشہور مصنف ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری بھی ۱۹۱۲ء میں کوئٹہ میں رہے۔

بلوچستان میں اُردو کے پنپنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان کے مختلف صوبوں سے جن میں مشرقی پنجاب، یو، پی، سی، پی اور بہار کے لوگ شامل تھے۔ یہاں ہجرت کر کے آئے تھے ملک میں شعراء اور ادباء کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی اس لئے یہاں پر اس دور میں مختلف کر کے نظریئے کے لوگوں نے مختلف انجمنوں کے ذریعہ اردو زبان وادب کے فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

لوک ادب

شاعری: پروفیسر افضل رضا کہتے ہیں "یوں تو پشتو ادب کئی اصناف سخن پر محیط ہے لیکن ان اصناف میں لوک گیت سرفہرست ہیں، جو اپنی مقبولیت، معنویت اور قدامت کے لحاظ سے لوک ادب کا قیمتی سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔ لوک گیت جسے پشتو میں عموماً سندرہ، گانے والے کو سندرغاڑے گانے والی کو سندر غاڑی کہتے ہیں، اکثر و بیشتر لوک دھنوں میں گائے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لوک گیت عوام میں صدیوں سے رائج ہیں کیونکہ ان لوک دھنوں میں کسی خاص قسم کے ضابطے کی پابندی یا فنی پیچیدگی دکھائی نہیں دیتی۔ ان سادہ مگر مؤثر لوک دھنوں میں مقبول لوک گیت مشترکہ انسانی ورثے کی صورت میں ہر دل کی دھڑکن اور صدا سمجھے جاتے ہیں جو طرب و کرب کی کیفیتوں میں احساس انسانی کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بیساختہ انداز میں واہ و آہ کی وجہ بنتے ہیں۔ ان لوک گیتوں میں بیشتر لوک گیتوں کی قسمیں ایسی ہیں جو پشتو کی ملی اصناف ہیں۔ ان اصناف کے اپنے ملی اوزان ہیں جنہیں سیلاب کہا جاتا ہے۔ سیلاب چھند کے مترادف ہے۔ یہ اصناف اب تک اپنے ملی اوزان ہی میں چلی آتی ہیں۔ اکثر محققین کے مطابق چونکہ پشتون آریائی نسل سے ہیں اور آریائی زبانوں کی پرانی منظومات، کتب اور مناجات وغیرہ سیلیبل (Syllable) کی بنیادوں پر قائم ہیں اس لئے پشتو زبان میں "سیلاب" سیلیبل ہی سے آیا ہے۔ یہی سیلاب سنسکرت، اوستا اور پہلوی کی قدیم منظومات ہیں۔ اوزان اور ردم کا کام دیتے ہیں۔ یہی اوزان ہیں جنہیں سیلیبل، سیلاب یا علم چھند کہا جاتا ہے۔ یورپی زبانوں کی شاعری میں آج تک یہی اوزان رائج ہیں اور علم چھندے وید کی علوم میں ایک معروف علم شمار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ بات تسلیم کرنے میں کسی قسم کے شک وشبے کی بہت کم گنجائش نظر آتی ہے کہ پشتو نے یہ ملی اوزان اپنے آریائی خاندان ہی سے ورثہ میں پائے ہیں۔

لوک شاعری کی کئی قسمیں ہیں جن میں بلوچستان میں رائج اور معروف اقسام کا ذکر کرتے ہیں۔

ٹپہ (لنڈی): محققین اس بات پر متفق ہیں کہ پشتو شعر کی ابتداٹپہ یا لنڈی سے ہوئی جو لوک گیت کی اہم ترین صنف ہے۔ لنڈی کا وجود پشتو کی پہلی معلوم شدہ نظم امیر کروڑ (۱۳۶ ہجری) سے ہزار سال قبل بتایا جاتا ہے۔ لنڈی ڈیڑھ مصرعے میں مکمل ہوتی ہے چونکہ اس کا پہلا مصرعہ لنڈہ یعنی کوتاہ ہوتا ہے اس لئے اس کا نام لنڈی پڑ گیا۔ مصرعہ اول میں ۹ سیلاب اور ثانی میں ۱۳ سیلاب ہوتے ہیں۔ لنڈی کو ٹپہ بھی کہا جاتا ہے۔

اس کی وجہ تسمیہ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ٹپہ پشتو زبان میں "مہر" کو کہتے ہیں اور چونکہ پٹھان بات بات پر اس کو ضرب المثل کی طرح استعمال کرتے ہیں، اس لئے اسے ٹپہ کہا جاتا ہے۔ اور یا یہ کہ ٹپہ تالی مارنے کو بھی کہتے ہیں چونکہ ٹپے کی دھن کے ساتھ ساتھ اس کی لے پر تالیاں بھی پیٹی جاتی ہیں اس لئے اس صنف کا نام ٹپہ ہی قرار پایا۔ یا یہ کہ ٹپہ تھپکی کو بھی کہتے ہیں اور یہ محزون دلوں کیلئے بمنزلہ ایک تھپکی کے ہوتا ہے اس لئے اسے ٹپہ کہا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ ٹپہ زور سے گایا جاتا ہے اور چند ٹپے گانے کی بعد آواز (ٹپ) بیٹھ جاتی ہے اس لئے اس کا نام ٹپہ پڑ گیا لیکن اس ٹپے کو مصرع بھی کہا جاتا ہے۔ بعض پشتون کہتے ہیں کہ چونکہ اس کی مثال مصری تلوار جیسی ہوتی ہے۔ اثر کی کاٹ کی وجہ سے مصرعہ کہلاتا ہے اور یا یہ کہ چونکہ سارا مصرعہ شروع سے آخر تک ۹ اور ۱۳ سیلابوں کی وجہ سے ایک مصرعے کے

مانند لگتا ہے اس لئے مصرعہ کہلاتا ہے لیکن لفظ مصری پشتو میں شیرینی اور چینی کے معنوں میں بھی ہوتا ہے شاید اپنی شیرینی کی وجہ سے ٹپہ مصرعہ کہلایا۔

ٹپے ہزاروں سال سے سینہ بہ سینہ، نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ یہ لوک شاعری چونکہ عام انسانی زندگی کے ہر زاویے کی ترجمانی کرتی ہے، اس لئے مدتیں گذر جانے کے باوجود ان میں ایسی تازگی ہے گویا یہ ہمارے دور کی تصنیف ہوں۔ زندگی کا کون سا پہلو ہے جو ان میں عیاں نہیں اور انسانی جذبات ومحسوسات کا کون سا رخ ہے جسکی ترجمانی ان میں نہ کی گئی ہو۔ تاریخی واقعات، جغرافیائی خصوصیات، قومی نظریات، علاقائی رسومات اور قبائلی تعصبات غرضیکہ پشتون معاشرت وثقافت کے سارے رنگ اس شاعری میں نکھرے ہوئے نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مائیں بچوں کو دودھ پلاتے، کسان ہل چلاتے، لڑکیاں پنگھٹ پر پانی بھرتے اور اپنے چاہنے والوں سے جدا ہوتے اور عورتیں اپنے بچوں کو پالنے میں جھلاتے ٹپے گاتی رہتی ہیں۔ اذان کے بعد ہر پشتون کے کان میں دوسری انسانی آواز ہے۔

پشتو ٹپہ کیلئے صرف ایک ہی قافیہ مختص ہو چکا ہے۔ یعنی دوسرے مصرعے کے آخر میں "ہ" لازمی آئے گا۔ پشتون قوم کی اس ادبی میراث میں اس کی پوری تہذیب اور ثقافت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ لوک گیتوں کا یہ مؤثر اور مقبول صنف بلحاظ تکنیک کسی خاص موضوع تک محدود نہیں۔ اس میں ہر موضوع نہایت ہی آسانی سے بیان کیا جاسکتا ہے علاوہ ازیں ٹپے کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ عوام ان کے خالق سمجھے جاتے ہیں۔ سارے پشتون علاقے میں ٹپہ فنی لحاظ سے ایک ہی صورت میں موجود ہے۔ ٹپہ کا شاعر معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ ایک عوامی صنف ہے۔

پشتون قوم کی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جو ان میں سمویا نہ گیا ہو۔ جامعیت، اثر انگیزی اور سحر آفرینی کی وجہ سے اس مختصر عوامی تخلیق کو یاد کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ جہاں تک ٹپے کے گانے کے اسلوب اور گائیگی کے انداز کا تعلق ہے عموماً ٹپے دائیں کان پر دایاں ہاتھ رکھ کر ندائیہ کلمہ "یہ قربان" کی لمبی تان الاپ کر انفرادی طور پر گائے جاتے ہیں۔ غالباً کان پر ہاتھ دھرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آواز اونچی ہوتا کہ ٹپے کی گائیگی کے فنی تقاضے پورے ہوں۔ مقابلے کی صورت میں جوابی ٹپے بھی گائے جاتے ہیں جن میں سوال وجواب کی شکل میں گائے جانے والے ٹپوں سے سامعین بہت زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہر ٹپے کے آخر میں عموماً "تہ" یا "مہ" آتا ہے اس کی وجہ تیرھویں سیلاب کی کمی پورا کرنا ہے۔ ایک حیران کن بات یہ ہے کہ ٹپہ کہنے والا یا والی کو سیلاب کی تعداد کا قطعاً علم نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی آج تک ایسا کوئی ٹپہ پشتو ادب میں موجود نہیں جس میں نو اور تیرہ سیلابوں کی موجودگی میں رتی برابر فرق آیا ہو۔ ٹپہ کہنے والا غیر شعوری طور پر اس فنی پہلو کا خیال رکھتا ہے۔ یہی بات ٹپے کی مقبولیت اور آفافیت کی واضح دلیل ہے۔ موضوعی لحاظ سے ٹپے حمدیہ ونعتیہ، سیاسی، مذہبی، محاکاتی، معاشرتی، یعنی زندگی کے چھوٹے بڑے تمام موضوعات کے عکاس ہیں۔ ایک آدھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مینہ دخدائے درسول نبہ دہ!

دانورے مینے لباسی خاورے بہ شینہ!

ترجمہ: خدا اور رسول کی محبت اچھی ہے

باقی محبتیں دکھاوے کے ہیں۔ فنا ہو جائیں گی۔

کہ دوطن پہ ننگ شہید شوے

پہ تار دزلفو بہ کفن درتہ گنڈمہ

ترجمہ: اگر تو وطن کے ننگ پہ شہید ہو جائے

تو میں زلفوں کی تار سے تمہارا کفن سیوں گی۔

غاڑی: پشتو لوک گیتوں میں بلوچستان میں غاڑی کو بے حد مقبولیت حاصل ہے جسے مرد اور عورتیں دونوں اپنے نازک احساسات اور خوبصورت خیالات کا بہترین شعری وسیلہ سمجھتے ہیں۔ غاڑہ بظاہر تو سادہ مگر درحقیقت پشتو شعری ادب کا ایک نہایت دلکش اور موثر صنف ہے۔ غاڑوں میں اجتماعی، مذہبی، عشقیہ، ملی اور تاریخی موضوعات نہایت ہی موثر انداز میں بیان کئے جاتے ہیں۔ کاکڑ پشتون قبیلے کے غاڑوں کے بارے میں مشہور ہے:

کاکڑی غاڑی لاشینے دی

رنگا رنگ ٹپے پکشے دی

ترجمہ:

کاکڑی غاڑے اچھے ہیں

اس میں مختلف قسم کے ٹپے ہوتے ہیں۔

اسی لئے اس کو کاکڑی غاڑی بھی کہتے ہیں۔ بعض دیگر اصناف کی طرح غاڑے بھی سینہ بہ سینہ منتقل ہوا کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ غاڑوں کا ایک بہت بڑا عوامی سرمایہ ضائع ہوا ہے۔ پھر بھی مقبول عام غاڑے کافی تعداد میں پشتون عورتوں اور نوجوانوں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے دونوں برابر کے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ آٹھ آٹھ سیلاب پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یعنی ہر غزل کا مطلع ہے۔ کچھ غاڑی آزاد بھی ہوتے ہیں یعنی ان میں وزن کی پابندی تو ہوتی ہے

لیکن قافیے کی نہیں ہوتی۔

غاڑوں میں عام طور پر ایک خاص طرز کی چھوٹی بحر میں ہم قافیہ مصرعوں کا ایک ایک شعر ہوتا ہے جو مفہوم کے لحاظ سے ٹپوں سے ملتا جلتا ہے۔ کاکڑی غاڑوں میں اپنی اطراف کے مشہور قومی ہیروؤں کے نام آتے ہیں مثلاً شیر جان غازی، جانان، پالے خان، شیرک سردار، بنگل خان، سردار بلوچ خان، تورک، ارسلا، سردار کلا خان، وزیر خان، فتح خان، خانو خان، محراب خان، سردار ایاز خان، فتح شاہ، ملک عبداللہ، جلات خان، حسن خان، رحمت خان، گوہر خان، ملاسردار گل بارو اور ساون موسی وغیرہ۔

غاڑوں میں چند علامات ملتی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ کرجن، ژاولن، سپئی، بسلورہ، بورہ، ژرو، شین خالئی، نرئ، سپینہ، نازکہ، کران، نازک، کرانو، سرہ، سروبن، لویال، کل وغیرہ۔ غاڑوں میں عورتوں کا حصہ نمایاں ہے۔ غاڑوں کی تقسیم بلحاظ موضوع حسب ذیل ہے۔

مذہبی غاڑی، مجاہدین کے غاڑی، عصری غاڑی، اجتماعی غاڑی، دخوانئ غاڑی، دشین خالو غاڑی، رنگ پہ برنگ غاڑی، مزاحیہ غاڑی، مرثیہ غاڑی، جنسی غاڑی، حمدیہ، نعتیہ، مناجاتی وغیرہ۔ اس کو لنڈی بھی کہتے ہیں جبکہ ایک زہریلے سانپ کو بھی لنڈے یعنی (کوتاہ) کہتے ہیں جو بہت زہریلا ہوتا ہے۔ سو کہتے ہیں کہ غاڑہ بھی اس سانپ کے زہر کی طرح بااثر ہے۔ ویسے ٹپوں کو بھی لنڈی کہا جاتا ہے۔ غاڑہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

یہ کلاکی گرزے بوری
یے سپوژمئ ٹولوے ستوری

ترجمہ: اے حسینہ تم صحن میں (جو) پھرتی ہو
(دراصل) چاند ہو اور ستارے سمیٹتی ہو۔

پہ رباب دی گوتی کشیشر دہ
دا د غم خبری پرے پژ دہ

ترجمہ: اپنے رباب کو بجاؤ
اور غم کی باتیں چھوڑ دو۔

لوک کہاوتیں: پشتو زبان کی لوک کہاوتوں کی تاریخ بھی پشتو ٹپوں کی طرح معلوم نہیں اور نہ ہی ان کے تخلیق کرنے والوں کی تاریخ معلوم ہے۔ بلکہ پشتو لوک گیتوں خصوصاً ٹپوں اور لوبوں وغیرہ کی طرح یہ بھی مشترکہ عوامی میراث ہیں۔ کہاوتیں ہر دور میں کہی جاتی ہیں اور ہر کوئی اسے اپنا ورثہ سمجھ کر حسب موقعہ بات کی افادیت میں اضافہ کرنے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ پشتون کہاوتوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور کہاوت کو پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں۔ اسے دلیل کے طور پر مانتے ہیں۔ کہاوتیں اجتماعی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ شفاہی ادب کا یہ قدیم ورثہ سینہ بہ سینہ، نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔

پشتو کہاوتیں عموماً نثر میں ہیں۔ جن سے ہماری معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور پشتون زبان و کلچر کی وسعت اور ہمہ گیری پر یہ لاتعداد کہاوتیں مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں۔ پشتو زبان کی ضرب الامثال ایک لحاظ سے ادبی نثر کی حیثیت رکھتی ہیں جو اکثر وزن میں یکساں مرصع، مسجع اور مقفی ہوتی ہیں۔

پشتو ضرب الامثال میں ایسی کہاوتیں بھی پائی جاتی ہیں جو یا تو فارسی، عربی کہاوتوں کا ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔ یا پھر اڑوس پڑوس کے باہمی تعلقات اور میل جول کی وجہ سے پشتو میں آ گئی ہیں۔ اس اشتراک سے قطع نظر وہ کہاوتیں جو خالص مقامی روایات اور پس منظر رکھتی ہیں، ان میں پشتونوں کے مزاج، نفسیات اور اقدار کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ صدیوں کے تجربات کا نچوڑ اور اٹل حقائق کے واقعات سے یہ شعبہ مالا مال ہے۔

پشتو ضرب الامثال کا جائزہ لینے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عام تجربوں سے حاصل کردہ عام افراد کی کہاوتیں بھی ہیں اور دانا لوگوں کے وہ تاثرات بھی کہاوتوں کا اثر لئے ہوئے ہیں جو مختلف عوامل کے ردعمل اور واقعات اور تجربات کے نتیجے میں شاعروں، فلاسفروں اور مصنفوں کے مقولوں کے طور پر عوامی ورثے کا حصہ بن گئے۔ پشتو کہاوتوں میں بھی دوسری زبانوں کی کہاوتوں کی طرح بعض کہاوتیں بظاہر کرخت، عریاں اور غیر مہذب ہوتی ہیں۔ چونکہ عوامی زبان تصنع اور بے جا تکلف سے آزاد ہوتی ہے۔ اس لئے لوک کہاوتوں میں بھی بظاہر شائستگی کم نظر آتی ہے۔ لیکن ان کی بعض معنویت اور فطری اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ ضرب الامثال کو پشتو میں متل کہتے ہیں۔ بلوچستان کے کچھ علاقوں میں متل کو نکل بھی کہتے ہیں۔

چند پشتو متل اردو مفاہیم کے ساتھ ملاحظہ ہوں:

مور ہم شریکہ نہ دہ بنہ

ترجمہ: ماں بھی مشترک اچھی نہیں ہوتی۔

موڑنس فارسی وائی

ترجمہ: بھرا پیٹ فارسی بولتا ہے۔

وڑہ خولہ کوئی خبری

ترجمہ: چھوٹا منہ بڑی بات

چہ سومرہ دساد ر وی دومرہ پشے غزوہ

ترجمہ: جتنی چادر ہو اتنے پاؤں پھیلاؤ

ھڈ پہ ھڈ ما تیوی

ترجمہ: لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔

مار خوڑلے رسیٔ نہ ویریژی

ترجمہ: سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔

محاورے: ہر زبان کے الفاظ، لغات اور قواعد عموماً محاروں کے تابع ہوتے ہیں۔ محاروں کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کسی لغت یا لفظ کے اصلی اور وصفی معنی تک کو محاورہ تبدیل کر لیتا ہے۔ پشتو میں جہاں ادبی نثر میں محاورات کا بھر پور استعمال کیا جاتا ہے۔ وہاں لوک ادب میں نثر میں چند مشہور محاورات کو ہر چھوٹا بڑا بے دریغ بولتا ہے۔ ان محاورات میں چند محاورے دوسری زبانوں سے بھی داخل ہوئے لیکن اکثر ایسے محاورے ہیں جو پشتو زبان کے اپنے ہیں اور جن کا عام لوگ بھی روزمرہ بول چال میں فطری طور پر استعمال کر کے اپنا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ ان محاورات میں بھی پشتون ماحول کی بھر پور عکاسی ملتی ہے۔

محاورے: دانزر گل

ترجمہ: انجیر کا پھول (کسی کے کم نظر آنے پر کہتے ہیں کہ انجیر کا پھول کسی نے نہیں دیکھا۔ یعنی اردو کے عید کا چاند کے متبادل ہے۔)

دمرغیٔ پیٔ

ترجمہ: چڑیا کا دودھ (نادر شے کے بارے میں کہتے ہیں)

دسپی لکیٔ

ترجمہ: کتے کی دم

شین سترگے

ترجمہ: سبز آنکھوں والا (یعنی مکار اور بھوکا)

بین سترگے

ترجمہ: سفید آنکھوں والا (یعنی طوطا چشم)

غوڑلوشے

ترجمہ: چرب ترتن (بے حس شخص)

گرانہ ویناء: شتو کے لوک ورثے کی اس صنف سخن کو بلوچستان میں قیصیٔ اور صوبہ سرحد میں "گرانے وینا گانے"، "مشکل جملے" کہتے ہیں۔ ان جملوں کو عموماً جوان لڑکے باتوں کی فوری اور صحیح ادائیگی کے مقابلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان مشکل جملوں کی ادائیگی نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ کرنی پڑتی ہے۔ عموماً لوگ اس کی ادائیگی میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ادائیگی میں جہاں کسی جملے کو جلدی جلدی بولنا پڑتا ہے وہاں ایسے جملے بھی ہیں جن کو زبان پکڑ کر بولا جاتا ہے یا بولنے والے کے دونوں ہونٹ انگلیوں میں پکڑے جاتے ہیں۔ ایسے میں عموماً ان جملوں کی ادائیگی میں بہت زیادہ دقت محسوس ہوتی ہے۔ بولنے والا جوانوں کے ٹولے میں ان جملوں کی ادائیگی کے وقت غلطی کر کے مذاق کا نشانہ بن جاتا ہے اور اس کی غلط ادائیگی سے جملوں کا مفہوم غلط ہو جاتا ہے۔ یہی مفہوم ہنسی اور مذاق کا سبب بنتا ہے۔ دیہاتی ماحول کے نوجوان ان جملوں کو سینہ بہ سینہ منتقل کرتے چلے آتے ہیں۔ ان جملوں میں ایک ہی قسم کی آواز والے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ عموماً ان الفاظ کے ابتدائی حروف ایک جیسے ہوتے ہیں۔

کیسیٔ (پہیلیاں): کیسیٔ یا پہیلیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جہاں دنیا کی دیگر قوموں میں ذہنی تربیت، حاضر دماغی اور معلوماتی اضافے کیلئے مختلف زبانوں میں پہیلیاں بجھوائی جاتی ہیں۔ وہاں پشتون قبیلے میں بھی حجروں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی ذہنی اور معلوماتی ذخیرے کا جائزہ لینے اور ایک دوسرے سے اس سلسلے میں سبقت لے جانے کیلئے پہیلیاں بجھوائی جاتی ہے۔

پشتو زبان میں ویسے تو پہیلیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دیگر لوک اصناف کی طرح پشتو نثر اور نظم میں مقبول پہیلیاں عموماً سینہ بہ سینہ منتقل چلی آ رہی ہیں۔ گاؤں اور دیہاتوں کے بوڑھے اور جوان نوجوان لڑکے لڑکیاں اسے قومی ورثہ سمجھ کر اپنے سینوں میں محفوظ کرتی ہیں۔

پشتو کی ان پہیلیوں میں اختصار، الفاظ کی بندش اور اصل موضوع کی طرف نازک سا اشارہ ان پہیلیوں کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان پہیلیوں میں ان پڑھ لوگوں کی پہیلیاں بھی ہیں اور علماء اور شعراء کی بھی۔ آج کل تو عام طور پر عوامی شعراء اپنے شعری مجموعوں میں اس قسم کی پہیلیاں بھی شائع کرتے ہیں۔

جن چیزوں کے بارے میں پشتو میں بہت سی منظوم پہیلیاں مشہور ہیں ان میں مناظر فطرت، عام زندگی کی اشیاء، موسم، دن رات، چاند ستارے، عورتوں سے متعلق چیزیں اور دیگر کئی اشیاء شامل ہیں۔ چند پہیلیوں کا تعلق مذہب سے ہے۔ مثال کے طور پر

پہ خدائی نہ یوزائے کیشری پہ پیغمبر یوزائے کیشری

ترجمہ: خدا پر یکجا نہیں ہوتے لیکن پیغمبر پر یکجا ہوتے ہیں۔

بہت سی پہیلیاں ایسی ہیں جو عورتوں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق پن چکی، ڈیوٹ وغیرہ سے ہے۔ بچوں کیلئے بھی سادہ انداز میں پشتو زبان میں پہیلیاں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر درو کے ہندہ وکے شملہ ئے لویہ۔ بہت سی پہیلیاں زمینداروں کے اوزار اور گھریلو اشیاء کے بارے میں ہیں۔ ان پہیلیوں کو "اڑونہ" بھی کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادیب اور محقق سیال کاکڑ لکھتے ہیں۔ "یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کیسئ پشتون معاشرے کی اچھی طرح ترجمانی کرتی ہے۔ ہمارے آباء واجداد نے اپنی زندگی کے ہر باب کے بارے میں دلکش اور دلچسپ اقوال کہے ہیں اور ہمیں کیسو میں پشتون خاندان، اعتقادات، نظریات، بہترین احساسات، گہرے عواطف اور منعتات سامنے آتے ہیں۔ یہ پشتون معاشرے کا ایک صاف اور خوبصورت آئینہ ہے"۔ کیسئ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں سیال کاکڑ لکھتے ہیں۔

"ہمارے ہاں پشتو میں ایک لفظ کخشئ مشہور ہے۔ دراصل یہ فارسی لفظ کیسہ سے نکلا ہے جس کے معنی "بٹوہ" کے ہیں اور خود کیسہ بھی جیب کے معنوں میں آتا ہے۔"

پہیلیاں پشتو لوک ادب میں مقبول صنف کی حیثیت سے ایک مشترکہ لوک ورثہ ہیں۔ پٹے، متلونہ وغیرہ کی طرح اسکے بھی مصنف معلوم نہیں۔ جہاں مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بوڑھیوں، جوانوں کے سینوں میں یہ مشترکہ ورثہ محفوظ ہے وہاں بچوں نے اس کے تحفظ اور منتقلی میں بھرپور کردار ادا کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ بدقسمتی سے پشتو کی بعض ضرب الامثال اور پہیلیوں میں کثافت بھی پائی جاتی ہے جو ادب سے خالی نظر آتی ہے لیکن ان سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ پشتون قوم نے اس لوک ادب میں وہی کچھ کیا جو دل میں آیا۔ ایسی پہیلیوں میں ان اعضاء کا ذکر ہے جسے سن کر طبیعت ذرا کثافت محسوس کرتی ہے۔ البتہ ان پہیلیوں میں خالص پشتو کے الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔

پشتو پہیلیاں موضوع اور ساخت کے لحاظ سے فی البدیہہ پہیلیاں، معقول پہیلیاں، مجہول پہیلیاں، استفہامیہ پہیلیاں، نثری شاہکار، ورزشی پہیلیاں کہلائی جاسکتی ہیں۔ جبکہ سوال وجواب کی صورت میں بھی ہیں۔

دوڑے (مہمل باتیں): پشتو لوک ادب میں نثر یا نظم کی شکل میں جو مہمل باتیں یا اشعار، بچوں یا بڑوں میں مقبول ہیں اور تفنن کیلئے جن کا استعمال کیا جاتا ہے "دوڑے" کے نام سے مشہور ہیں۔ عموماً بچوں میں سے ایک بچہ کوئی لفظ کہتا ہے اور دوسرا اس کے جواب میں ہم قافیہ مہمل قسم کا جملہ یا نیم منظوم قسم کا مصرعہ کہتا ہے۔ بچوں اور بڑوں میں یہ دوڑے بہت ہی مشہور ہوتے ہیں۔

بڑوں کی محفلوں میں ایسی مہمل باتیں کرنے والے کو "دوڑے مار" کہتے ہیں۔ حجروں میں ایسے حاضر دماغ دورے مار مہمل جملے بول بول کر جوانوں کیلئے دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ پشتون معاشرے میں تقریباً ہر دیہات میں اس قسم کے دوڑے مار ہوتے ہیں جن کو کامیڈین سمجھا جاتا ہے۔ دوڑوں میں عموماً جھوٹ بولا جاتا ہے اور بکواس کی جاتی ہے۔ دوڑوں کو سوگڑے بھی کہتے ہیں۔ دوڑوں میں کبھی کبھی کثیف قسم کے لطیفے بھی سنائے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں دوڑوں کے چند نمونے۔

جوار	خبرہ دپہ وار
غنم	خبرہ دمنم
اکئی	ستامورزمابکئی
حلوادہ	زمابرسمہ اللہ دہ

لوک کہانیاں اور داستانیں

قصہ گوئی کا فن انسان کے ساتھ ساتھ سفر کرتا چلا آیا ہے۔ جب سے انسان نے بولنا سیکھا ہے۔ غالباً اس دور سے قصہ کا معمول رہا ہے۔ ابتدا میں انسانی ذہن پرانے اثرات چھوڑنے والے واقعات نے کہانیوں کو جنم دیا ہوگا۔ ذاتی تجربوں اور مشاہدات نے کہانی کی صورت اختیار کی ہوگی۔ بعد میں ان واقعات نے کہانی کی شکل اختیار کی جن میں تجسس اور دلچسپی کا مواد تھا۔ یہاں تک کہ قومی مشاہیر کے کارنامے اور مشہور واقعات کہانیوں میں بیان ہونے لگے۔ نیم منظوم قسم کی اصناف سخن میں ان کہانیوں کے چیدہ چیدہ حصے مناسب موقعوں پر گائے جانے لگے اور اس طرح نظم اور نثر میں لوک کہانیاں پروان چڑھتی رہیں۔ بوڑھے اور بوڑھی عورتیں اپنے بچوں کو پرندوں، بھوت، پریت، جنات، پریوں اور شہزادیوں اور دیگر فرضی قسم کے کرداروں سے متعلق کہانیاں سنا سنا کر اخلاقی اقدار کی ترویج اور ترتیب کا اہم فریضہ انجام دیتے ہوئے بچوں کی پرورش کیا کرتے تھے۔ مختلف میلوں اور تہواروں اور دیگر معاشرتی اور سماجی اجتماعات میں تجربہ کار افراد اور قصہ گوئی کے فن میں ماہر نوجوان نسل کو اپنے اسلاف کی بہادری کے کارنامے اور عظمت کی داستانیں سنا سنا کر دعوت عمل دیتے تھے اور یوں اس صنف سخن کا کاروان مستقبل کی طرف بڑھنے لگا۔

عربی زبان کی قدیم کہانیوں میں الف لیلی کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے شائع ہونے کے علاوہ حاتم طائی، لیلی مجنون، وامق

عذرا، یوسف زلیخا بھی دراصل عربی کی داستانیں ہیں جو پشتو میں ترجمہ ہوئیں۔

ایران میں فردوسی کا شاہنامہ اور "وامق عذرا" کے ساتھ ہی مثنوی مولانا روم اور گلستان و بوستان کی حکایتوں کے علاوہ رستم وسہراب، گل صنوبر، شہزادہ بہرام گور گل اندامہ، شیرین، خسرو وغیرہ بھی اس سرزمین سے متعلق داستانیں ہیں جو پشتو میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں جبکہ پنجاب، سندھ اور ہند کی مشہور رومانی داستانیں ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، رت پدم، نل دمینتی، سسی پنوں، وغیرہ پشتو میں ترجمہ ہوئیں۔

پشتو داستانیں: مشہور پشتو داستانیں پشتونوں میں سینہ بہ سینہ، نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔ یہ داستانیں نظم اور نثر دونوں صورتوں میں موجود ہیں۔ ان داستانوں کی ابتداء کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان داستانوں کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔

پشتو لوک کہانیاں اور پشتو ٹپے وغیرہ اتنی ہی قدیم ہیں جتنی قدیم پشتون قوم ہے۔ تاہم جب مشہور پشتو داستانوں کے تحریری ورثے کا جائزہ لیا جائے تو منظوم پشتو داستانوں میں سب سے پہلی معلوم شدہ منظوم پشتو داستان آدم درغائی عبدالقادر خان خٹک نے ۱۱۰۰ھ کے آخر میں لکھی تھی بعدازاں بھی منظوم داستانیں لکھی گئیں۔

پشتون رومانی داستانوں کی خصوصیات

ان داستانوں میں عموماً داستان سراؤں نے قصے کی ابتدا حمد ونعت یا مناجات سے کی ہے پھر تمہید میں قصہ یا داستان لکھنے کا سبب، روایت، تذکرہ اور واقعہ کے محل وقوع کے بارے میں تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

داستانوں کے واقعات میں اصل قصے کے ساتھ غیر ضروری اور ضمنی قصے بھی بیان کئے گئے ہیں تاکہ قارئین یا سامعین کیلئے زیادہ سے زیادہ دلچسپی کا مواد فراہم کیا جائے۔ فقرا اور بزرگان دین کی دعائیں اور غیبی طاقتوں کا تصرف، ان میں سے بیشتر داستانوں میں داستانی روایت کی اہم کڑی کے طور پر درج ہیں۔ عموماً ان رومانی داستانوں کے ہیرو کو کوئی نہ کوئی پیر فقیر عصا لئے مل ہی جاتا ہے جو کٹھن مرحلوں میں ہیرو کو دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پشتو کی رومانی داستانوں کے ہیرو انجام میں شہادت کی موت پاتے ہیں۔ آدم درخانئی، مومن خان شیرنئی، فتح خان رابیا، بنادی خان مبیو، رومانی داستانوں کا انجام ایک جیسا ہے۔

پشتو کی رومانی داستانوں میں ثقافتی رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ پشتونوں کے رسم ورواج کی روشنی میں ان داستانوں کے واقعات کا جائزہ لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ داستانیں پشتون معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان میں ننگ، پت، غیرت، حمیت، شجاعت، وفا، قربانی، اور پشتون قوم کی دیگر خوبیاں جلوہ افروز ہیں۔ جوانان سرحد کی دنیا اپنا ہی ایک عالم رکھتی ہے اس کے قصے کہانیاں بھی اتنے ہی فراواں ہیں۔ جتنی خود ان کی ہنگاموں سے لبریز زندگی کی وارداتیں اور افتادیں۔ ان میں سنگینی بھی ہے اور رنگینی بھی، رزم بھی ہے اور بزم بھی۔

ان میں سے بیشتر داستانوں میں بزمیہ شاعری کے ساتھ رزمیہ شاعری کے بہترین نمونے بھی ملتے ہیں خصوصاً ان صورتوں میں جب ان رومانوں کے خوبصورت ہیرو اپنی شجاعت اور بہادری کے کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔

اکثر داستانوں میں متعلقہ عہد اور زمانے کی معاشرتی کوائف کی ترجمانی ملتی ہے۔ معاشرے کی تصویر کشی میں مطالعہ کی وسعت، مشاہدے کی گہرائی اور بیان کی قوت نے روح پھونکی ہے۔ ہماری قدیم داستانوں میں بعض داستانیں متعلقہ ادوار کی بہترین تاریخی، معاشرتی اور ثقافتی عکاسی کی حامل ہیں۔

عموماً داستان سرا فطرت انسانی کے نباض ہوتے ہیں۔ پشتو داستان گو اپنے معاشرے کی اجتماعی خصوصیات سے آگاہ ہیں اور ان داستانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کردار نگاری میں پشتون داستان گو نہایت ہی کامیاب رہے ہیں۔ قصہ جو داستان کی جان ہوتی ہے پشتو کی اکثر وبیشتر داستانوں میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں ان داستانوں میں منظر کشی کے بھی دلچسپ اور معیاری نمونے ملتے ہیں۔ پشتو داستانوں میں حرماں کا احساس کہیں نہیں ہوتا۔ اس دنیائے خیال میں بھی دوسری زبانوں کی داستانوں کی طرح خیر وشر کے معرکے میں فتح ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے۔ اسی سے ان داستانوں کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

پشتو زبان کی ان داستانوں کے کردار بھی دوسری زبانوں کی معیاری داستانوں کے کرداروں کی طرح اولوالعزم اور مہم جو ہیں۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ ترین اقدار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ ان سے پڑھنے اور سننے والے زندگی گزارنے اور جینے کا حوصلہ پاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے کردار عموماً انسان کو نظر نہیں آتے لیکن یہ وہ کردار ہوتے ہیں جنہیں انسان دیکھنا چاہتا ہے۔

پشتو کی رومانی داستانوں میں حسن وعشق کی واردات کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ بعض قصے ابتدا ہی سے حسن وعشق کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، سرتاپا ہجر وفراق کے دلگداز واقعات اور المناک حادثات لئے ہوتے ہیں۔ ان میں عاشق ومعشوق دونوں کی ناکامی، نامرادی، اور حرماں نصیبی کے چرچے اور مذاکرے ہوتے ہیں۔ اکثر وبیشتر دو چاہنے والوں میں سے ایک محروم وصال کسی وجہ سے مایوس ہوکر پہلے مرتا ہے اور

دوسرا اس کی موت کا سن کر یا اپنے محبوب کی لاش پر غائبانہ جان دے دیتا ہے۔ دونوں کو علیحدہ علیحدہ دفنایا جاتا ہے مگر پھر قبریں کھود کر دیکھا جاتا ہے تو دونوں ایک ہی قبر میں ملتے ہیں جیسے مومن خان شیرینی اور آدم خان درخانئی وغیرہ۔

پشتو کی رومانی داستانوں میں رزمیہ، بزمیہ، طربیہ اور مزاحیہ سب ہی قسم کے متنوع مضامین ملتے ہیں لیکن کسی بھی صورت میں ان داستانوں میں تہذیب و شائستگی کا دامن نہیں چھوڑا جاتا۔ یہ داستانیں نہ بے حد طویل ہیں کہ سننے یا پڑھنے والا اکتا جائے۔ اپنے دلکش اور دلچسپ پیرایہ بیان کی وجہ سے ان داستانوں کو پشتون نہایت شوق کے ساتھ سنتے اور پڑھتے ہیں۔ خصوصاً موسیقی کی محفلوں میں ان داستانوں کی وجہ سے جان پڑ جاتی ہے۔ زبان کی سلاست، روانی اور چست بندش داستانوں کی خوبیوں میں نمایاں ہیں۔

پشتونوں کے ہر علاقے کی عوامی زندگی میں کہانیاں، داستانیں، کسریں اور پہیلیاں (نکلونہ) وغیرہ وغیرہ عام طور پر رائج ہیں۔ حجروں میں، خرمنوں میں، چوکوں اور مورچوں میں بیٹھے جوان اور نیم زال مردان کہانیوں پر وقت گزارتے ہیں۔ کہانیوں اور افسانوں وغیرہ کی مقبولیت ایک عالمگیر سی حقیقت ہے۔

موسیٰ خان گل مکئی: یہ قصہ بلوچستان کے علاقے ہرنائی کے دو عاشقوں کا ہے جنکی قبریں اب بھی موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ تورترین کے ملک عیسیٰ خان کا بیٹا موسیٰ خان جب اس قابل ہوا کہ اسے تعلیم دلوائی جائے تو اس کے باپ نے سپین ترین کے ایک قابل عالم کے پاس اسے بٹھایا۔ انہیں دنوں سپین ترین کے مالک شاہ مست خان نے بھی اپنی بیٹی گل مکئی کو اپنے گاؤں کے اسی قابل عالم کی شاگرد بنا دیا۔ سبق اور کھیل ہی کھیل میں موسیٰ خان گل مکئی ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ یہ محبت اس آگ میں بدل گئی جب ایک دوسرے کو دیکھتے رہنے کے باجود انسان کی تشنگی ختم نہیں ہوتی۔ ان کی زبانوں پر سبق ہوا کرتا اور آنکھیں ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتیں۔ آہستہ آہستہ لوگوں میں اس عشق کا چرچا ہونے لگا۔ اور یہ بات پھیلتے پھیلتے گل مکئی کی ماں تک پہنچ گئی۔ اس نے فوراً گل مکئی کی تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے اسے گھر پردے میں بٹھا دیا۔

عشق نے اب کانٹے بھرے راستوں پر چلنا شروع کر دیا۔ موسیٰ خان جب فراق کی انتہائی صعوبتوں سے تنگ آیا تو فوراً ایک آنسوؤں بھرا خط گل مکئی کے نام لکھا اور ایک بڑھیا کے ہاتھ اسے بھجوایا۔ گل مکئی نے بھی دل کا خون نچوڑ کر ایک درد انگیز جواب لکھا اور اس میں موسیٰ خان سے اپنی محبت کی پائیداری کا وعدہ کیا۔ دقسمتی سے یہ خط گل مکئی کے باپ کے ہاتھ لگا۔ وہ زخمی چیتے کی طرح گھر پہنچا اور جیسے اس نے گھر والوں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس کا غصہ اس پر ہی ٹھنڈا نہ ہوا بلکہ وہ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو جمع کر کے بدلہ لینے کی غرض سے تورترین کی جانب چل کھڑا ہوا۔ اس بات کا پتہ عیسیٰ خان کو بھی چل گیا۔ وہ بھی اپنے جوانوں لے کر گاؤں سے باہر آ گیا۔ دونوں غیرت مند اور جنگجو لشکر سامنے ہوئے۔ ڈھول بجنے لگے، تیر ہوا میں اڑنے لگے۔ دودھاری تلواریں چمک چمک کر گرجنے لگیں۔ تیروں نے واویلا مچا دیا۔ میدان ایک قیامت بن کر رہ گیا اور خون کی ندیاں بہ نکلیں۔ تین چار دن لڑائی اسی رفتار سے جاری رہی۔ اب یہ کشت وخون دیکھ کر دونوں دیہات کے بڑے بوڑھوں، عالموں اور فاضلوں کو بہت دکھ ہوا۔ اور وہ قرآن شریف سروں پر دھرے تلواروں کی جھنکاروں میں گھس آئے اور خدا کا واسطہ دے کر امن کی بھیک مانگی۔ دونوں اطراف کے لوگوں نے قرآن کے احترام میں خون سے سرخ اور بوٹیوں سے بھری ہوئی تلواروں کو زمین پر پھینک دیا۔ قہر بھرے پسینے خشک ہونے لگے۔ عالموں نے اس معاملے میں پڑ کر فریقین میں صلح کرادی اور موسیٰ خان اور گل مکئی کی منگنی کرادی گئی۔ دونوں دیہاتوں میں خوشیوں کے نغمے الاپے جانے لگے۔

لیکن موسیٰ خان کے دو نہایت عزیز دوستوں نے اس موقعہ پر شادی کے تمام نقائص بیان کر کے یہ ثابت کر دیا کہ شادی کے بعد انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ دوستوں کا بھی نہیں۔ صرف عورت کا ہو کر رہ جاتا ہے اور ایک بہادر پٹھان کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ زن مرید ہو کر رہ جائے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھول جائے۔ خدا جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے موسیٰ خان پر اس وقت بلا کا اثر کیا اور وہ یکلخت شادی سے انکاری ہو گیا۔ اس نے اپنی ماں کے ذریعے باپ کو اس کی اطلاع پہنچا دی۔ عیسیٰ خان اس پر بہت زیادہ جھلایا۔ اس نے موسیٰ خان کو طلب کیا اور سخت سست کہا اور کہا کہ محض موسیٰ خان کی وجہ سے دس بارہ نوجوان موت کی گھاٹ اتارے گئے لیکن اس وقت موسیٰ خان پر دوستی کا بھوت سوار تھا۔ منگنی توڑ دی گئی۔ شاہ مست خان نے گل مکئی کی منگنی اپنے بھتیجے سہیل خان سے کر دی۔ موسیٰ خان کو جب اس منگنی کا پتہ چلا تو ایک دفعہ پھر پرانی یاد اس کے ذہن میں سرسراتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے اپنے کئے پر ندامت ہوئی۔ بھولی ہوئی محبت ایک دفعہ پھر جاگ اٹھی اور وہ چھپ کر رونے لگا۔

ایک دن سپین ترین کی چراگاہ سے سہیل خان نے موسیٰ خان کے ملازم گڈریئے کو خوب پیٹا اور تورترین واپس چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ موسیٰ خان کو اس کا پتہ چلا تو وہ بہت جز بز ہوا یوں بھی سہیل خان رقیب بن کر اس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ وہ فوراً میان سے تلوار نکال کر چراگاہ کی طرف چل دیا۔ راستے میں سہیل خان ہی مل گیا۔ اس نے اسے للکارا اور گڈریئے کو پیٹنے اور چراگاہ سے نکالنے کی وجہ پوچھی۔ سہیل

خان نے نہایت بیباکی سے جواب دیا کہ اس مقام پر آس پاس کے دیہات کی دوشیزائیں اپنے مویشی چرانے آتی ہیں۔اس لئے ان کے پاس کسی غیر مرد کا ہونا اچھی بات نہ تھی۔ میں نے سمجھا تھا کہ میرے اس غیرت مندانہ فعل پر موسی خان کو خوشی ہوگی کیونکہ وہ خود ایک غیر تمند پٹھان ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے میری غیرت کو سراہا نہیں۔موسی خان کے دل پر سہیل خان کی باتوں کا بہت اثر ہوا اور اس نے خوشی سے سہیل خان کو سینے سے لگالیا۔انہوں نے اس وقت اپنی پگڑیاں بدل لیں اور بھائی بن گئے۔

چند دنوں کے بعد سہیل خان کی شادی گل مکئی کے ساتھ ہونے لگی تو اس نے اس موقعہ پر موسی خان کو بھی دعوت دی چونکہ وہ جانتا تھا کہ موسی خان اور گل مکئی کے عشق کا چرچا علاقے کے بچے بچے کی زبان پر ہے اس لئے وہ موسی خان کو اب بھی اپنا حریف سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس موقعہ پر موسی خان کے قتل کی سازش کی۔ شادی کی رات جبکہ راگ رنگ کی محفل اپنے پورے جوبن پر تھی۔ایک چھوٹا سا لڑکا موسی خان کو باہر لے گیا اور ایک دیوار کے پاس کھڑا کر دیا۔موسی خان حیران تھا کہ دوسری طرف گل مکئی نے اس پکارا۔ یہاں دو بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے ملے، گلے شکوے ہوئے، موسی خان اپنے کئے پر بے حد نادم تھا۔اس نے گل مکئی کو یقین دلایا کہ اب بھی اس کی محبت اس کے دل میں اس طرح ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔ گل مکئی گزری باتیں بھول گئی اور موسی خان سے التجا کی کہ راتوں رات ہی انہیں اس گاؤں سے چلا جانا چاہیے لیکن موسی خان کے راستے میں بدلی ہوئی پگڑی حائل ہوگئی۔لیکن گل مکئی نے موسی خان کو اس قتل کی سازش سے آگاہ کر دیا جس میں اس کی ماں بھی۔شریک تھی چنانچہ اس رات کے اندھیرے نے ان دو سچے محبت کرنے والوں کو نگل لیا۔اس کے بعد ان کو پھر کسی نے نہ دیکھا۔

مومن خان شیرینو: بلوچستان کے علاقے پشین سے ایک عشقیہ داستان منسوب ہے۔کہتے ہیں کہ ان کی قبریں اب بھی ایک پہاڑی، جوترین قلعہ کے قریب ہے، پر واقع ہیں۔ان کی کہانی میں اگرچہ دیومالائی نکتے ہیں جو ہمیں شاہنامہ فردوسی وغیرہ میں نظر آتے ہیں لیکن شاید بنیادی طور پر اس کہانی کے کردار اسی مٹی سے اٹھے ہوں۔ یہ داستان "مومن خان اور شیرینو" کے عنوان سے ہر پشتون معاشرے میں شہرت رکھتی ہے۔اس کا خلاصہ پیش کرنے سے قبل یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان کہانیوں کو محافل میں سناتے وقت حسب ضرورت اس میں ٹپے اور دوسرے فولکلوری اشعار بھی گا کر پڑھتے ہیں۔

کہانی کا آغاز یوں کرتے ہیں کہ کسی زمانے میں دو بھائی تھے جو اپنے علاقے کے خوانین میں سے تھے۔ان میں سے بڑا بھائی علاقے کا سربراہ تھا۔دونوں کی بیویاں حاملہ ہوئیں تو بڑے نے چھوٹے سے کہا کہ اگر اللہ نے مجھے بیٹا دیا اور تجھے بیٹی تو تیری بیٹی میری بہو ہوگی۔اور اگر میرے ہاں بیٹی ہوا تو میں تیرے بیٹے کو دونگا۔ خدا کا کرنا ایسا تھا کہ بڑے کے ہاں بیٹی ہوئی جس کا نام شیرینو رکھا گیا۔جبکہ چھوٹے کے ہاں بیٹا ہوا۔جس کا نام مومن خان رکھا گیا لیکن بڑے کے اس سے پہلے سات بیٹے تھے۔ دونوں بھائیوں کے موت کے بعد سات بیٹوں میں سرداری پر اختلاف پیدا ہوا۔دوسری جانب سے مومن خان نے بھی سرداری کا دعوی کرتے ہوئے کہا "اس سے پہلے تمہارے باپ نے بڑے بھائی کی حیثیت سے سرداری کی تھی اب چھوٹے بھائی کے بیٹے کی حیثیت سے میری باری ہے" رعایا میں بھی یہ معاملہ اٹھ گیا وہ مومن خان کو اسکے اچھے کردار کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ آدھے علاقے پر مومن خان اور آدھے پر اس کے تایا کا بڑا بیٹا زبردست خان سرداری کریگا۔اس فیصلے کے بعد ایک روز مومن خان کی ماں نے اس سے کہا کہ اب ذرا اپنی عزت کی بھی فکر کرو شیرینو تمہارے نام پر بیٹھی ہے۔مومن خان نے اس کا اہتمام کیا اور اپنی طرف سے شیرینو کے بھائیوں کے پاس مرکہ (رشتہ) بھجوادیا۔شیرینو کے بڑا بھائی نے جو مومن خان سے سرداری کی تقسیم پر پہلے ہی ناراض تھا انکار کیا اور بہت زیادہ ولور (لڑکی کی قیمت) رکھا تا کہ مرکہ انکار کرے اور اس کے بھی بہانہ ہاتھ آجائے۔لیکن مرکے کے شرکاء نے جو اس کی نیت کو جانتے تھے، یہ شرط قبول کی اور مومن خان کو آکر سارا ماجرا سنایا۔مومن خان نے ولور کا سن کر قصد سفر کیا۔کیونکہ اتنی بڑی رقم ادا کرنا اس کے بس میں نہیں تھی اور وہ عازم ہندوستان ہوا جہاں سے یہ رقم کما کر لاتا۔وہ اکیلا چل پڑا لیکن اس کا ایک قریبی دوست ریدی گل بھی اس کے ساتھ ہولیا۔شیرینو نے جو اسکے عشق کی اسیر ہوئی ہے۔ ٹپوں کی زبان میں اسے روکنے کی بہت کوشش کرتی ہے لیکن وہ نہیں رکتا۔ہندوستان میں اس وقت رسم تھی کہ جو بھی شہر میں داخل ہوتا وہ اپنا چہرہ چھپاتا، اور مومن خان بہت خوبصورت بھی تھا۔اس نے شہر میں داخل ہوتے ہوئے وہاں کے سپاہیوں کو دیکھا اور اسے اپنے نوکر چاکر یاد آگئے اور نقاب اٹھالیا۔اس کے نقاب اٹھاتے ہی ایک سپاہی کی اس کے چہرے پر نگاہ پڑی اور گر گیا، اور اس کا نیزا اس کے جسم میں پیوست ہوگیا۔

مومن خان اور ریدی گل ایک سرائے میں جا کر رہنے لگے۔زخمی سپاہی سے وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا "مجھے کسی نے نہیں مارا ہے بلکہ ایک اجنبی حسین چہرے کے دیکھنے سے میں زخمی ہوا۔" بادشاہ نے اس شخص کی تلاش کا حکم دیا۔بالآخر پتہ چلا کہ فلاں سرائے میں دو اجنبی مسافر رہتے ہیں۔سپاہی اس کے پاس آگئے اور مومن خان کو بادشاہ کا پیغام دیا۔وہ ان کے ساتھ ہو چلا۔بادشاہ نے ان دونوں کو دیکھ کر اندازہ

لگایا کہ یہ کوئی عام افراد نہیں ہیں بلکہ ضرور بادشاہ زادے ہیں۔ ان کو اپنے پاس بٹھا کر عزت دی اور رات خواب دیکھا کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے کہ تم بادشاہ کے پہلوانوں سے مقابلہ کرلو تمہیں فتح ہوگی۔ اس نے صبح جاگ کر بادشاہ سے کہا کہ میں تیرے پہلوانوں سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا تیرا نازک بدن اور میرے پہلوان، یہ کیسے ممکن ہے؟ بھلا اس نے کہا آپ آزما کر تو دیکھیں۔ جب اس کے بڑے پہلوان سے مقابلہ ہوا تو مومن خان نے ایک ہی وار میں اس کو شکست دی۔ بادشاہ کے نزدیک مومن خان کی اہمیت اور بڑھ گئی اور ہر وقت اس کو اپنے پاس رکھا۔

ایک روز مومن خان بادشاہ کے پاس بیٹھا تھا کہ اس کو ایک خط ملا۔ مومن خان کے اصرار پر بادشاہ نے اس کو خط دکھایا ایک ہمسایہ ملک کے بادشاہ کی طرف سے اس سے لینے والے سالانہ ٹیکس کے سلسلے میں تھا۔ یہ بادشاہ اس کے مقابلے میں کمزور تھا سو مجبوراً ادا کرتا تھا۔ مومن خان نے کہا کہ میں یہ ٹیکس ادا کرنے نہیں دونگا۔ بادشاہ نے اسے کہا کہ ہم اسکا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ وہ زور آور ہے لیکن مومن خان نے کہا کہ میں ایک پشتون ہوں جو بات کرتا ہوں اس پر قائم رہتا ہوں میں اس لئے اس بادشاہ کے پاس جا کر اس مسئلے کا حل نکالوں گا۔ مومن خان اس بادشاہ کی مملکت کی جانب چل پڑا۔ راستے میں ایک زرگر (سنار) کے ہاں گھوڑے کیلئے سونے کی نال بنوانے بیٹھا۔ زرگر کو حیرت ہوئی کہ گھوڑے کے نال اور سونے کے۔ لیکن اس نے تو اپنے پیسے لینے تھے۔ سو کام شروع کیا۔ اس دوران ایک اونٹ پر سجی سجائی لڑکی آئی اور سنار کی دکان کے سامنے جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ یہ ٹپہ پڑھا کہ اتنے مردوں کے ہوتے ہوئے میں اژدھار کی خوراک بننے جارہی ہوں۔ اس کے جواب میں وہاں موجود ایک مسخرے نے ٹپہ پڑھتے ہوئے کہا کہ تمہارا شوہر مونچیں لٹکائے ہوئے یہاں بیٹھا ہے اور تم ہم سے مدد مانگ رہی ہو۔

مومن خان نے سنار سے ماجرا پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ بادشاہ کی بیٹی ہے اور اس ملک کے پہاڑ میں ایک اژدھار ہے جو روز ایک انسان کو کھا جاتا ہے اور شہر اس طرح پرامن رہتا ہے اور وہ جو جوان بیٹھا ہوا ہے وہ وزیر کا بیٹا ہے اور اس کا منگیتر ہے۔

مومن خان نے کہا کہ میں اس لڑکی کو بچا کر ہی دم لونگا۔ تلوار لے کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ ایک شخص اونٹ کی مہار پکڑے پہاڑ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اژدھار کے علاقے میں پہنچ کر وہ شخص دوڑ پڑا۔ آگے سے مومن خان کو آتے دیکھ کر کہا کہ اس طرف مت جاؤ اژدھار نکلنے والا ہے۔ مومن خان اس کا جواب سنے بغیر آگے بڑھا، شہزادی نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئی اور اس خیال سے کہ یہی شاید اژدھار ہے اور انسان کے روپ میں آیا ہے، غش کھا کر اونٹ سے گر پڑی۔ مومن خان نے اسے سہارا دیتے ہوئے تسلی دی کہ میں مومن خان ہوں اور تمہاری مدد کیلئے آیا ہوں۔ اژدھار کی کوئی خبر نہیں تھی۔ مومن خان نے شہزادی سے کہا کہ میں سوتا ہوں اور جب اژدھار نکل آئے تو مجھے جگا دینا۔ شہزادی نے مومن خان کے سوجانے کے بعد سوچا کہ یہ جوان مرد اپنی ایسی جوانی کو میرے لئے قربان کررہا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اژدھار مجھے ہی نگل ڈالے اور آگے بڑھ کر مومن خان کے سر کو اپنے زانوں پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اژدھار نکل آیا اور ان کی جانب بڑھنے لگا۔ شہزادی نے اژدھار کو دیکھا تو سن ہوکر رہ گئی اس کا گلا روند گیا اور آواز دب گئی۔ خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور ایک آنسو مومن خان کے چہرے پر گرا۔ وہ جاگ اٹھا اور تلوار کو سیدھے لمبائی میں اپنے دونوں پیروں کیٹلوؤں پر باندھ کر پاؤں اژدھار کی جانب اٹھا کر لیٹ گیا اور شہزادی کو ایک جانب چھپنے کو کہا۔ اژدھار آگے بڑھا اور مومن خان کو پیروں کی جانب سے نگلنے لگا جوں جوں وہ اس کو نگلتا جاتا تلوار اژدھار کے دو ٹکڑے کرتی جاتی، آدھے تک پہنچ کر اژدھار مر گیا اور مومن خان شہزادی کے پاس صحیح سلامت لوٹ آیا اور اس کو اونٹ پر سوار کر کے رخصت کیا لیکن اس سے قبل اژدھار کے جسم سے ایک لمبا تسمہ الگ کر کے اپنے پاس رکھ لیا اور شہزادی کو کہا کہ جاؤ اور جو بھی اژدھار کے قتل کا پوچھے تو کہہ دینا کہ جس کے پاس نشانی ہوگی، وہی اس میدان کا مرد ہوگا اور میرا ٹھکانہ اسی زرگر کی دکان ہے۔ شہزادی کچھ چل کر ایک پہاڑی پر انتظار میں بیٹھ گئی کہ کوئی آئے گا تو اس کے ساتھ چل پڑے گی۔ اس دوران ملکہ نے اپنے ایک نوکر کو بھیجا کہ جا کر دیکھ لو میری بیٹی کو اژدھار اب تک کھا چکا ہوگا۔ اگر اس کی کوئی نشانی بچی ہو تو لے آؤ تا کہ اس کی قبر کی علامت کے طور پر سجادوں۔ وہ نوکر چلا آیا۔ اژدھار کو مردہ پایا اور شہزادی کو زندہ۔ شہزادی کو اونٹ پر سوار کر کے محل کی جانب بڑھا اور بادشاہ کو خوشخبری سناتے ہوئے کہا کہ میں نے اژدھار کو قتل کر دیا ہے اور تیری بیٹی کو سلامت لے آیا ہوں۔ اس سے قبل کہ بادشاہ اسے انعام سے نوازتا، شہزادی نے آواز دی کہ اژدھار کو مارنے والا مرد وہ کوئی ہے جس کے پاس اژدھار کی کوئی نشانی ہو۔ بادشاہ نے اس مرد سے نشانی مانگی تو اسکے پاس کچھ نہیں تھا۔ لہذا بادشاہ کے پوچھنے پر شہزادی نے مومن خان کا پتہ اسے بتا دیا۔ بادشاہ نے فوراً مومن خان کو بلا دیا اور اس سے نشانی مانگی۔ مومن خان نے اژدھار کی کھال کا تسمہ دکھایا تو بادشاہ نے خوش ہوکر اسے اپنی آدھی بادشاہی اور بیٹی انعام میں بخش دیئے۔ لیکن اس نے انکار کرتے ہوئے کہا میرا صرف ایک مطالبہ ہے۔ اسے پورا کر۔ مجھے نہ تو بادشاہی چاہیے اور نہ ہی آپ کی بیٹی، بادشاہ نے کہا جو تم کہو گے میں مانوں گا۔

مومن خان نے کہا کہ فلان بادشاہ کا ٹیکس معاف کردو اور یہ بتاؤ کہ تم اس سے کس چیز کا ٹیکس لے رہے ہو۔ بادشاہ نے کہا کہ میرے پہلوانوں نے اس

کے پہلوانوں کو شکست دی ہے۔ مومن خان نے کہا کہ میں تمہارے کے پہلوانوں سے مقابلہ کرتا ہوں اور اگر ان کو شکست ہوئی تو تم کو اس کا ٹیکس معاف کرنا ہوگا۔ بادشاہ نے کہا کہ مقابلے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے کسی بھی پہلوان نے اژدھار کا مقابلہ نہیں کیا تھا اور آپ نے کرلیا۔ ظاہر ہے کہ آپ ان کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہیں سو ٹیکس معاف کرتا ہوں لیکن آدھی حکومت نہیں لینی ہے تو نہ لیں لیکن میری بیٹی سے تم نے ہی شادی کرنی ہوگی۔ اس نے مجبوراً اس سے شادی کرلی۔ سہاگ رات کو مومن خان نے اپنے اور شہزادی کے درمیان تلوار کھڑی کرتے ہوئے کہا کہ میں کسی اور کی امانت ہوں جسکا نام شیرینو ہے۔ اگر میری طرف تم نے ہاتھ تک بڑھانے کی کوشش کی تو میں اس تلوار سے کاٹ ڈالوں گا شہزادی نے کہا تم میرے محسن ہو میرے لئے تمہارا ساتھ ہی کافی ہے۔ اگلی صبح مومن خان بادشاہ سے ٹیکس کی معافی کا خط لے کر چل پڑا۔

ادھر اس کی ماں کو زبردست خان نے در در ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردیا۔ اس کا سب کچھ چھین کر اسے حویلی سے نکال دیا۔ مومن خان کے ہاں ایک لاوارث پلا بڑا تھا۔ اس کی ماں کو اسی نے اپنے ساتھ رکھا۔ وہ گائے چراتا گزر اوقات کرتا رہا۔ ایک دن اس کی گائے زبردست خان کے کھیتوں میں چلی گئیں۔ زبردست خان کے نوکروں نے اُسے مارا پیٹا۔ وہ بھی بددل ہو کر وہاں سے ہندوستان کی جانب چل پڑا۔ جہاں مومن خان تھا۔ وہ بھی وہیں پہنچ گیا۔ مومن خان سے ملاقات ہوئی تو مومن خان نے ایک ٹپے میں شیرینو کا احوال پوچھا تو اس نے اس مقصد کے لیے کہ مومن خان گھر لوٹے، ٹپے میں ہی جواب دیتے ہوئے کہا کہ شیرینو تیرے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔ مومن خان نے یہ سن کر بادشاہ سے اجازت چاہی۔ بادشاہ نے اس کو ہر طرح کی مدد کا کہا لیکن اس نے انکار کیا۔ بالآخر بادشاہ نے سپاہیوں کا لشکر اس کے ساتھ کیا۔

دوسری جانب وہ شہزادی بھی اپنے باپ سے اجازت لے کر اپنے شوہر کی تلاش میں گھر سے نکلی۔ بادشاہ نے اس کے ساتھ اتنا لیس لڑکیوں کا لشکر روانہ کیا۔ یہ لشکر جب دوسرے بادشاہ کے ملک میں پہنچا تو وہاں اسے پتہ چلا کہ مومن خان کو تو اپنے وطن کی طرف نکلے ہوئے تین روز ہوگئے ہیں۔ شہزادی نے وہاں کا عزم کیا۔ ادھر مومن خان اپنے علاقے میں رات کو پہنچا تو راستے میں پڑاؤ کیا، اپنے ہمراہیوں کو وہیں روک کر یہ کہہ کر چل پڑا کہ میں جاتا ہوں کہ شیرینو کو دیکھ لوں۔ اگر اس کو کسی اور کے حوالے کردیا ہو تو دونوں کا خاتمہ کرنے کے علاوہ میرے پاس کوئی راہ نہیں ہے اور اگر ایسا نہیں تھا تو آ کر آپ لوگوں کو بھی خبر کردونگا۔

مومن خان جب شیرینو کے گھر پہنچا تو اپنا گھوڑا باہر باندھ کر دیوار پھلانگ گیا۔ دیکھا کہ شیرینو درمیان میں سوئی ہوئی ہے اور اس کے چاروں جانب اس کے سات بھائی سو رہے ہیں۔ مومن خان نے آگے بڑھ کر اسکا بوسہ لیا۔ تو وہ جاگ اٹھی اور ٹپے میں اپنے بھائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ سات بھائیوں کے ہوتے ہوئے غماز مجھ تک پہنچ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھائی اٹھا اور خنجر کے وار کرتے ہوئے مومن خان کو خون آلود کردیا۔ اسی دوران شیرینو کے بڑے بھائی زبردست خان نے اپنا خنجر مومن خان کے سینے میں اتار دیا، چراغ جلا تو شیرینو نے دیکھا کہ مومن خان خون میں لت پت پڑا ہوا ہے۔ اسی دوران اس کی ماں کو بھی خبر کردی گئی اس کی ماں کو دکھ ہوا کہ زبردست خان نے مجھے بری طرح خوار کردیا ہے اور مومن خان گیارہ سالہ مسافرت کے بعد سیدھا ان کے ہاں چلا گیا۔ لیکن ممتا نے اسے بے چین کردیا اور سیدھی وہاں چلی آئی۔ دیکھا تو مومن خان خون میں رنگا ہوا پڑا ہے اور زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہے۔ ماں نے پیار کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا سات زخموں میں کس میں سب سے زیادہ تکلیف ہے۔ مومن خان نے کہا کہ سینے کے زخم میں، یہ سن کر زبردست خان شرمندہ ہوا اور اسی خنجر کو اپنے سینے میں اتارا۔ اور کہا کہ میرا جنازہ مومن خان کے جنازے سے پہلے اٹھا لینا کہ یہ میرا ستایا ہوا ہے۔ مومن خان اور شیرینو کے درمیان کچھ ٹپوں کا تبادلہ ہوتا ہے اور اس کی جان نکل جاتی ہے۔ اس دوران شہزادی بھی اس علاقے میں داخل ہوتی ہے اور ایک مزارع سے مومن خان کے گھر کا پتہ پوچھتی ہے۔ وہ جواب میں اسے اس کی موت کی خبر دیتا ہے۔ وہ اپنا گھوڑا اسی مزارع کے پاس چھوڑ دیتی ہے اور فوجی لباس بھی اتار دیتی ہے اور مومن خان کے جنازے کو رکوا کر اس کے قریب لیٹ کر دعا مانگتی ہے کہ خدا میری سچی محبت کے صدقے مجھے بھی مومن خان کے ساتھ کردے اور اس کی روح بھی اس دعا کے بعد پرواز کر جاتی ہے۔ مومن خان کو ایک پہاڑی پر جبکہ شہزادی اور زبردست خان کو قبرستان میں دفن کردیا گیا۔ کہتے ہیں کہ کچھ عرصے بعد علاقے کے ایک سفید ریش نے خواب دیکھا کہ شہزادی اپنے قبر میں نہیں ہے۔ اگلے روز قبر کھودی گئی تو ایسا ہی تھا۔ اس سفید ریش نے کہا کہ مومن خان کی قبر کھود کر دیکھ لیں۔ اس کی قبر کھودی گئی تو شہزادی کی لاش وہیں موجود تھی۔ اس کو نکال کر دوسری جگہ دفن کرنے کا دوبارہ ارادہ کیا گیا تو سفید ریش نے کہا کہ جتنی مرتبہ بھی دور دفن کروگے یہ واپس آئے گی۔ بالآخر اسے راہرو کے دوسری جانب اس نیت سے دفن کیا گیا کہ راستہ ان کے درمیان حائل ہو کہتے ہیں کہ اس کے بعد ان کی قبروں پر دو درخت اگ آئے اور ان کی شاخیں اوپر سے آپس میں مل گئیں۔

یہاں چند عوامی قصوں کے خلاصے بھی بطور نمونہ بیان کرتے چلیں جو

یہاں کی محافل کو گرمانے کا اہم ذریعہ ہیں۔

چندن لالا: ایک بادشاہ تھا۔ اس کی پہلی بیوی بانجھ تھی۔ اولاد اور حکومت و نظام حکومت کیلئے وارث کی لالچ میں دوسری شادی کر بیٹھا لیکن خدا کا کرنا تھا کہ دوسری بھی بانجھ تھی کہ پہلی بیوی حاملہ ہوگئی۔ دوسری بیوی کی جانب بادشاہ کی توجہ کم ہوگئی اور ساری اہمیت اور محبت دوبارہ پہلی بیوی کو ملنے لگی۔ جسکی وجہ سے فطری طور پر دوسری بیوی حسد کی آگ میں جلنے لگی۔ اور روز و شب انتقام کی فکر کرتی رہی۔ کچھ مدت بعد بادشاہ نے ایک ماہر دایہ کو بیوی کی دیکھ بال کی غرض سے مقرر کرلیا۔ دوسری بیوی نے اس کی بڑی آؤ بھگت شروع کی اور یوں کرتے کرتے دایہ بادشاہ کی دوسری بیوی کی مطیع ہوگئی کیونکہ جب بھی دایہ آتی تو وہ اسے کھلاتی پلاتی اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتی۔ جب وہ جانے لگتی تو تحفے تحائف دیتی۔ دایہ جو ایک غریب اور نادار عورت تھی اس کو اپنی محسنہ سمجھنے لگی۔ جب بادشاہ کی حاملہ بیوی کے آخری ایام قریب ہوئے تو دوسری بیوی نے دایہ سے ایک روز کہا کہ اگر میں ایسی ایک مشکل تم سے کہوں تو کیا تم میری مدد کروگی۔ اس نے فوراً حامی بھرتے ہوئے کہا کہ کیوں نہیں تم جو بھی کہوگی میں کر چکوں گی، کیونکہ تم نے مجھ پر ہمیشہ احسان کئے ہیں۔ سو دوسری بیوی نے اسے اپنی کہانی سنائی کہ بادشاہ نے اس سے اولاد کی غرض سے شادی کی تھی جبکہ اس کی پہلی بیوی بانجھ تھی لیکن خدا کا کرنا معاملہ الٹا ہوگیا۔ اب بادشاہ کی ساری توجہ اس کی پہلی بیوی کی جانب ہے اور یہ قطعی نظرانداز ہو چکی ہے۔ جب یہ عورت بچہ جنے گی تب تو اسکا اس گھر میں جینا ہی محال ہو جائے گا۔ دایہ اس کے مقصد کو سمجھ چکی اور کہا کہ تم فکر مت کرو۔ میں ہوں۔ نا تم صرف دیکھتی رہو اور جو کچھ میں کروں۔ اس کو راز رکھو۔ اس نے خوش ہو کر اس کے ہاتھ اور چہرے پر بوسے دیتے ہوئے کہا کہ میں تمام عمر تمہاری مشکور رہونگی اور تم کو بھرپور طریقے سے نوازتی رہونگی اور یہ اس کے ساتھ اس کو خاصی رقم بھی تھمادی۔ اس کے بعد وہ دایہ بادشاہ کے گھر سے نکلنے کے بعد آس پاس کے گھروں کا چکر لگاتی رہتی اور یہی اس کے روز کا معمول بن گیا تھا۔ اس طرح ایک روز اس نے ایک گھر کے ساتھ کسی ویرانے میں ایک کتیا کو دیکھا جس نے تازہ بچے دیئے تھے۔ اس نے اگلے روز جا کر کتیا کیلئے گوشت کا ٹکڑا ڈالا اور جب کتیا اس کے کھانے میں مصروف ہوگئی تو دایہ اس کے دو پلوں کو اٹھا کر لے گئی اور بادشاہ کی دوسری بیوی سے کہا کہ انکو کسی ایسی جگہ چھپا کر رکھ لو تا کہ کسی کو ان کی خبر ہو اس نے وہی کیا۔ اگلے روز جب بادشاہ کی پہلی بیوی کو درد شروع ہوئے تو دایہ نے بادشاہ کی دوسری بیوی کو کہا کہ سب کو اس کے کمرے میں جانے سے منع کردو اور ان پلوں کو کسی طرح اس کمرے میں پہنچا دو۔ اس نے یہی کیا اور کچھ دیر میں حاملہ عورت نے دو بچے جن دیئے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ دایہ نے جلدی سے ان کی جگہ پلوں کو رکھا اور بچوں کو دوسری بیوی کے حوالے کردیا۔ اس نے ان بچوں کو بادشاہ کے محل کے نیچے کے حوض میں پھینک دیا۔ بادشاہ کو خبر دی گئی تو وہ خوش خوش گھر آیا لیکن دایہ نے اسے دیکھ کر رونا شروع کیا۔ بادشاہ نے کہا خدانخواستہ بچے مر تو نہیں چکے ہیں۔ دایہ نے کہا مرتے تو اچھا تھا۔ یہ دیکھو تیری بیوی نے بچوں کی جگہ پلے جنے ہیں۔ بادشاہ نے طیش میں آ کر پہلی بیوی کو اس کے پلوں سمیت اسطبل میں بھجوادیا۔ دوسری بیوی کی مراد بھر آئی اور بادشاہ کی ساری توجہ دوبارہ اس کو ملنے لگی۔ پہلی بیوی کو بچا کچا جو ہوتا وہ کھلاتے اور وہ ذلالت میں زندگی گزارتی اور اس کے دونوں بچے اس حوض میں دو سرکنڈوں میں بدل چکے تھے۔ ایک روز وہاں سے ایک چرواہا اپنے ریوڑ کے ساتھ گزر رہا تھا۔ حوض کے سرکنڈوں پر نظر پڑی تو سوچا کہ اتنے اچھے سرکنڈے ہیں ایک کو توڑ کر کیوں نہ اس سے بنسری نہ بنالوں۔ جونہی چرواہے نے ہاتھ سرکنڈوں کی طرف بڑھایا تو وہ چیخ اٹھے کہ "ہم سوتیلی ماں کے ستائے ہوئے ہیں۔ ہمیں کچھ نہ کہو" چرواہے کو حیرت ہوئی اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تو دوبارہ ہاتھ بڑھایا پھر اسی طرح کی آواز اٹھی۔ چرواہا گھبرا کر گاؤں کی جانب دوڑا اور گاؤں والوں کو بتایا تو وہ اس پر ہنسنے لگے لیکن اس کے زیادہ اصرار پر وہ اس کے ساتھ آئے اور ان کے ہاتھ بڑھاتے ہی سرکنڈے چیخ اٹھے کہ "ہمیں کچھ نہ کہو ہم سوتیلی ماں کے ستائے ہوئے ہیں" اسطرح ان سرکنڈوں کی یہ کہانی پورے علاقے میں پھیلتے ہوئے بادشاہ تک بھی پہنچ گئی۔ اس طرح ایک روز بادشاہ بھی اس صاحبزادے کی جستجو میں وہاں پہنچ گیا اس نے جب سرکنڈوں کی جانب ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے وہی جملہ دھرایا کہ اس کی دوسری بیوی جس کے اندر چور چھپا تھا۔ اس نے بھی ہاتھ بڑھایا تو وہ بول اٹھے کہ "ہمیں مت ستاؤ کہ ہم تیرے ستائے ہوئے ہیں" بادشاہ کو شک گزرا اور اپنی پہلی بیوی کو بھی گھر سے بلوا۔ یا وہ بے چاری خستہ و بدحال چلی آئی۔ بادشاہ نے اسے ہاتھ بڑھانے کو کہا اس نے ہاتھ بڑھایا تو وہ اٹھے کہ ماں ہمیں مت ستاؤ کہ ہم سوتیلی ماں کے ستائے ہوئے ہیں۔ بادشاہ نے یہ جملہ سنا تو اس کو یقین آیا کہ یہ سب اس کی دوسری بیوی اور دایہ کی کارستانی ہے۔ اس نے سرکنڈوں کو پانی سے نکلوایا تو وہ خدا کی حکمت سے لڑکا اور لڑکی بن گئے۔ بادشاہ نے دایہ کو بلوا کر اس سے تفتیش کی تو اس نے سارا راز اگل دیا اور اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ بادشاہ نے اپنی بیوی کو سزا دیتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ ایک گھوڑے سے دوسرا دوسرے سے، ایک پاؤں ایک گھوڑے سے دوسرا پاؤں دوسرے سے، اور اسطرح چاروں گھوڑوں کو دوڑایا اور اس کے چار ٹکڑے

کر دیئے گئے اور بادشاہ اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش خوش رہنے لگا۔

سیاہ دیو: "سیاہ دیو" بھی اس طرح کی کہانی ہے۔ جس میں ایک شخص اپنی زمین میں گیت گاتے ہوئے گندم کاشت کر رہا تھا۔ اس دوران سیاہ دیو آ پہنچا تو اس کی جان نکل جاتی ہے کہ یہ تو اب مجھے کھا بیٹھے گا۔ لیکن چارو ناچار دوبارہ بلند تر آواز میں ٹپے گاتے ہوئے کام کرنے لگتا ہے۔ دیو بلند آواز میں اسے بلاتے ہوئے کہتا ہے کہ کیا کر رہے ہو، وہ کہتا ہے گندم کاشت کر رہا ہوں۔ تو دیو کہتا ہے کہ اس میں میرا حصہ بھی ہوگا۔ وہ آدمی جو جان کی خیر مانگ رہا تھا ایک دم کہتا ہے کہ تمہارا کیا کہ تمہارے ماں اور باپ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔ دیو چلا گیا، وہ پریشان گھر چلا آیا اور بیوی کو سارا ماجرا سنایا، لیکن بیوی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ پہلے تو وہ دیو نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو چلا گیا۔ ابھی تو بوائی ہوئی ہے۔ کٹائی تک وہ آئے بھی یا نہ آئے۔ خیر عمر گزرتے دیر کب لگتی ہے۔ ایک روز وہ شخص گندم کی کٹائی کر کے گندم اکٹھا کرنے میں مصروف تھا کہ اسکو پیچھے سے دیو کی آواز سنائی دی کہ میرا اور میرے ماں باپ کا حصہ تیار ہے کیا؟ یہ دیکھو میں بوریاں لایا ہوں۔ وہ آدمی یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے کہتا ہے کہ اب تو دیر ہو چکی ہے۔ آج رات تم میرے گھر چل کے میرے مہمان بن جاؤ۔ کل صبح اکٹھے آ جائیں گے اور تمہارا اور تمہارے ماں باپ کا حصہ تم کو دے دوں گا۔ دیو بھی مان جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کے گھر چلتا ہے۔ گھر آ کر اسے مہمان خانے میں بٹھا کر بیوی کو سارا ماجرا بتاتا ہے بیوی کہتی ہے کہ اب تم مرغی ذبح کر لو تا کہ اسے کھلائیں دیو کو کھانا کھلا کر سلانے کے بعد وہ پریشان اپنی بیوی کے پاس آیا اور کہا کہ یہ بھی ہو گیا۔ اب بتاؤ کہ کرنا کیا ہے۔ بیوی نے کہا کہ تم کل دیو کو لے کر کھیتوں میں جاؤ اور اسکو مصروف رکھو تا کہ کچھ دیر میں، میں مرد کے حلیے میں گھوڑے پر سوار ہو کر پہنچ جاؤں۔ میں پہنچ کر تم سے کہوں گی کہ بھائی ادھر طیت میں لگے ہوئے ہو اور گاؤں سارا بادشاہ کی بیٹی کے علاج کیلئے سیاہ دیو کو تلاش کر رہا ہے۔ تم پوچھو گے کہ وہ کس لئے۔ تو میں کہوں گی کہ اسکا علاج سیاہ دیو کی کھال سے ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے انعام رکھا ہے جو بھی شخص سیاہ دیو کو تلاش کرے گا بادشاہ اس کو انعام سے نوازے گا۔ اس منصوبے کا سن کر مرد کے دل کو ذرا سکون مل جاتا ہے اور صبح دیو کو لے کر وہ کھیت پہنچا اور تھوڑی دیر میں اس کی بیوی مرد کے حلیے میں گھوڑے پر پہنچ گئی اور اس کو آواز دی۔ وہ دیو کو ایک جانب بیٹھنے کو کہہ کر اس کے پاس گیا اور اس نے بلند آواز میں اپنے شوہر سے وہی باتیں کہیں اور پھر کہا کہ وہ گوشے میں کالی شے کیا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک بوری ہے تو اس نے کہا کہ اس کا ایک ٹکڑا کاٹ کر لا دو، وہ جب دیو کے پاس گیا تو دیو نے جلدی سے اپنے کان کا ٹکڑا کاٹ کر اسے دے دیا۔ وہ جب ٹکڑا اس کے پاس لایا۔ اس سے خون رس رہا تھا۔ اس نے کہا کہ بھئی یہ اس سے تو خون رس رہا ہے کہیں سیاہ دیو تو نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی دیو نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ دیکھا اور بھاگ نکلا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا تو سامنے سے گیدڑ کو آتے دیکھا اور اس کو راستہ چھوڑنے کو کہا گیدڑ نے کہا بات کیا ہے۔ زرا مجھے بھی تو بتا دو اس نے ماجرا سنایا کہ شہر کے لوگ اس کی کھال کی تلاش میں بادشاہ کی بیٹی کے علاج کیلئے اس کے درپے ہیں لیکن وہ پہنچ نہ جائیں۔ گیدڑ نے کہا بھئی یہ سب دھوکہ ہے۔ دراصل یہ تیرے خلاف اس میاں بیوی کی سازش ہے۔ دراصل کل رات جب تم ان کے گھر میں مہمان تھے تو میں بھی وہیں مرغی کی بچی کچی ہڈیوں کے انتظار میں بیٹھا تھا اور ان کی سازش کا سارا ماجرا جو گیدڑ نے سنا تھا اس کو سنایا۔ دیو طیش میں آیا اور گیدڑ کو لے کر دوبارہ کھیتوں کی جانب چل پڑا۔ کسان نے دور سے دیو اور گیدڑ کو دیکھا اور گھبرا کر بیوی سے کہا کہ وہ تو پھر لوٹ آیا۔ بیوی نے کہا کہ تم حوصلہ رکھو میں اس کا چارہ جانتی ہوں۔ ابھی دیو اور گیدڑ پوری طرح ان کے قریب نہیں پہنچے تھے کہ کسان کی بیوی نے آواز دیتے ہوئے کہا کہ شاباش ہو تم پر گیدڑ، تم کتنے اچھے ہو کس طرح دیو کو ورغلا کر لے آئے۔ اب تم کو میں ایک سو مرغیاں انعام دونگا۔ دیو نے یہ سنا تو یکدم بارہ گیدڑ پر حملہ کرتے ہوئے اس کی دم پکڑ لی اور خوب گھما کر دور پھینک دیا، گیدڑ وہیں دم توڑ گیا اور دیو اسی لمحے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا اور یہ میاں بیوی خوش خوش اپنا سارا غلہ گھر لے گئے۔

نیکی اور بدی: ایک اور لوک کہانی "نیکی اور بدی" کے نام سے معروف ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک عمر رسیدہ شخص کہیں سفر پر نکلا تو راستے میں اسے ایک جوان بھی ملا۔ حال احوال کے بعد جوان نے بوڑھے سے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے تو اس نے بتایا میری ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ اس کے لیے سودا سلف لے کر آنا چاہتا ہوں۔ جوان نے جانچ لیا کہ اس شخص کے پاس مال موجود ہے۔ بوڑھے نے جوان سے پوچھا کہ تیرا کیا ارادہ ہے۔ تو اس نے کہا کہ کچھ لوگ بدی کے لیے نکلتے ہیں اور کچھ لوگ نیکی کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ سو میں بھی نکلا ہوں دیکھو کس سے سامنا ہو۔ بوڑھے نے کہا کہ میری عمر کے تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ بدی کا نتیجہ بدی ہے سو نیکی کی تلاش کرو۔ اس نے کہا کہ اگر کوئی بدی کرے تو اس کے ساتھ کیا کیا جائے تو بوڑھے نے کہا کہ اس کے برابر بھی نیکی کرنی چاہیے تا کہ نیکی کا وجود ختم نہ ہو۔ یہ سنتے ہی وہ بوڑھے پر حملہ آور ہوا۔ اس کو خوب مارا پیٹا اور پھر جو کچھ اس کے پاس تھا سب لوٹ کر

لے گیا۔ بوڑھا نڈھال وہیں پڑا رہا۔ جب شام ہوگئی تو۔۔ وہ اس خوف سے کہ کہیں دوسری بلا کا شکار نہ ہو، اٹھ کھڑا ہوا اور کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نکلا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اسے ایک غار نظر آیا تو اس غار کو غنیمت جان کر چلا گیا۔ غار کے آخری گوشے میں جا کر لیٹ گیا۔ رات ہوئی تو اس کو ایک بھیڑیا غار میں داخل ہوتے نظر آیا۔ اس کا خون خشک ہوا لیکن بھیڑیا وہیں ایک جانب لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک شیر غار میں داخل ہوا۔ یہ پھر گھبرا گیا لیکن وہ بھی بھیڑیا کے قریب لیٹ گیا۔ یہ سانس روکے ہوئے یہ سب دیکھ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد ایک گیدڑ بھی غار میں داخل ہو کر ان دونوں کے پاس لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں شیر نے گیدڑ سے پوچھا کہ بھئی سناؤ دن کیسا گزرا کچھ کھایا پیا، کچھ سنا دیکھا! گیدڑ نے کہا کیا کھانا پینا، میں تو کئی روز سے سارا وقت شہر کے دوسرے گوشے کی ایک پہاڑی پر بسر کر کے آ جاتا ہوں۔ شیر نے کہا وہاں کیا ہے۔ اس نے کہا کہ وہاں اس پہاڑی میں سات بادشاہوں کے خزانے دفن ہیں۔ ان کے خیال سے میں اتنا خوش ہوتا ہوں کہ بھوک پیاس خود بخود مٹ جاتی ہے۔ شیر نے بھیڑئے سے پوچھا تمہارے پاس سنانے کو کیا ہے اس نے کہا کہ میرے پاس کیا ہوگا دن بھر بھوکا رہتا ہوں۔ ایک چرواہے کے ریوڑ میں ایک انتہائی فربہ بھیڑ ہے جس کی چکی ہی ہم تینوں کے لیے کافی ہے اور اس کی کھال میں سات بیماریوں کا علاج موجود ہے لیکن ایک تو چرواہا چوکس رہتا ہے۔ دوسرے اس کے ساتھ دو بڑے خطرناک کتے بھی ہیں۔ موقعہ ہی نہیں ملتا کہ اس کو ہڑپ کر جاؤں۔ اس کے بعد گیدڑ نے شیر سے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا خبریں ہیں اس نے کہا کہ میں نے اس پہاڑ کے دامن میں ایک چشمہ دیکھا ہے جس میں نہانے کے بعد میری بھوک پیاس، تھکن اور بدن پر پڑے زخم اور داغ سب ٹھیک ہو جاتے ہیں بوڑھے نے یہ ساری کہانی سن لی اور صبح سب سے پہلے اس چشمے کی جانب گیا۔ وہاں نہانے کے بعد اس نے دیکھا کہ واقعی اس کے بدن کے تمام زخم مندمل ہو چکے ہیں اور اس کی تھکاوٹ وغیرہ بھی اُتر چکی ہے۔ اس کو یقین آیا کہ غار میں سنی ہوئی دوسری باتیں بھی درست ہیں اور چل پڑا اس پہاڑی کی جانب جو شہر کے دوسری جانب موجود تھا۔ شہر میں اس نے دیکھا کہ ایک ڈھنڈورچی ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔ یہ بھی قریب گیا اور سنا کہ بادشاہ کی بیٹی بیمار ہے اور اسکا علاج جو بھی کرے گا اسکو بادشاہ بہت انعام و کرام دے گا۔ اس نے ڈھنڈورچی سے کہا کہ میں اس کا علاج کروں گا۔ اسے بادشاہ کے پاس لے جایا گیا تو اس نے بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ وہ علاج سے قبل چاہتا ہے کہ ایک بھیڑ خرید کر ذبح کرے۔ لہذا اس کے لئے اسے رقم اور چند سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ بادشاہ نے فوراً حکم دیا اور وہ سپاہیوں کو لے کر دو تین ریوڑوں کے بعد اصل ریوڑ تک پہنچ گیا جس میں وہ دنبہ موجود تھا جس کا ذکر بھیڑیا نے کیا تھا۔ اس نے چرواہے سے متعلقہ دنبے کی فروخت کا مطالبہ کیا اور اس کو منہ مانگی رقم دینے کا وعدہ کیا۔ ہے چرواہے کے انکار پر اس نے کہا کہ بادشاہ کے سپاہی اس کے ساتھ ہیں لہذا وہ زور زبردستی کر کے بھی لے جائے گا۔ لہذا چرواہا راضی ہوا تو اس کو اس کے خیال سے زیادہ رقم دے کے دنبہ لے گیا۔ اس کو ذبح کروا کر کنیزوں سے اسکی کھال شہزادی کو پہنانے کو کہا۔ اگلے روز کھال اتادی گئی تو شہزادی مکمل طور پر تندرست ہو چکی تھی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس سے کہا کہ جو مانگتا ہے مانگ۔ اس نے کہا مجھے صرف اتنی رقم دو کہ شہر کے دوسرے حصے پر موجود پہاڑی پر ایک چاردیواری کھڑی کر سکوں اور اس میں رہ سکوں۔ بادشاہ نے اس کے اس معمولی مطالبے کو فوراً پورا کیا۔ اس نے وہاں چاردیواری مکمل کروالی اور پھر بیلچہ اور گنتی لے کر پہاڑی کو کھودنا شروع کیا۔ چند روز کی صبح تا شام محنت کے بعد ایک روز گنتی کی نوک کسی لوہے کی شے سے ٹکرا گئی۔ اس نے کھول کر دیکھا تو وہ ایک بڑا دیگ تھا۔ اس کا ڈھکن اٹھانے پر معلوم ہوا کہ وہ تو سونے کی اینٹوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کے بعد دوسرا دیگ نظر آیا جس میں ہیرے جواہرات تھے۔ اس طرح کرتے کرتے سات دیگ نکل آئے۔ اس نے اس کے بعد اس چاردیواری میں اچھا محل بنا ڈالا اور اپنے بچوں اور بیوی کو بھی بلوا کر اس میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ جبکہ اس نے روزانہ ایک لنگر بھی جاری کر دیا اور راہ چلتے مسافروں اور راہگیروں کو کھانا کھلاتا۔ ایک روز اسی جوان کا گزر بھی وہاں سے ہوا جس نے اس کو لوٹا تھا۔ اس شخص نے اسے بھی دعوت دی۔ وہ آیا تو اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اس کو رات کے کھانے کیلئے بھی روکا اور کھانے کے بعد اسے تحائف سے بھی نوازا۔ اس جوان نے ان تمام مہربانیوں کی وجہ پوچھی تو بوڑھے نے کہا کہ ہم کبھی ایک دوسرے کے ہم سفر رہ چکے ہیں اور پھر اسے وہ وقت یاد دلایا۔ جوان نے شرمندہ ہو کر معذرت کر لی اور پھر اسکی دولت مندی کا راز پوچھا۔ بوڑھے نے پہلے تو انکار کیا لیکن اسکے بہت اصرار کے بعد غار سے آخر تک کا سارا قصہ سنایا۔ جوان نے سوچا کہ اس ایک رات کے رازوں سے تو اس نے فائدہ اٹھایا ہے۔ کیوں نہ آج رات کے لیے میں اس غار میں جا کر نئے انکشافات سے مستفید ہو جاؤں اور یہاں سے نکل کر اسی رات وہ اس غار کو تلاش کر کے وہیں جا کر بیٹھ گیا جہاں یہ بوڑھا بیٹھ چکا تھا۔ کچھ دیر میں بھیڑیا اور پھر شیر آتے ہیں لیکن اداس ہوتے ہیں۔ شیر بھیڑئے سے گیدڑ کا احوال پوچھتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو اپنی پریشانی میں الجھا ہوں۔ تم گیدڑ کا پوچھ رہے ہو۔ گذشتہ کئی عرصے سے اس ریوڑ کے چکر کاٹتا ہوں لیکن وہ بھیڑ کہیں نظر نہیں آتا۔ نہ معلوم چرواہے نے اسے بیچ دیا ہے یا ذبح کر دیا ہے۔ اسی

دوران گیدڑ بھی کہیں سے آ پہنچتا ہے۔ شیر نے کہا کہاں ہو بھئی۔ تیری عمر طویل ہے ابھی تیرا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ گیدڑ نے کہا کیا پوچھتے ہو میں تو آج مرتے مرتے بچ گیا۔ کئی مرتبہ اس پہاڑی کے چکر کاٹے لیکن ناکام لوٹا ہوں کیونکہ وہاں ایک محل بن چکا ہے۔ جب بھی جاتا ہوں تو پہرے دار مجھے بھگا دیتے ہیں پھر انہوں نے شیر کو کہا تمہارے چشمے کا کیا حال ہے شیر نے کہا میرے چشمے کی بھی وہ کرامت چلی گئی ہے اب اس میں نہانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ ساری باتیں وہ جوان غار کے کونے میں بیٹھا سن رہا تھا۔ اور کسی نئی خبر کے انتظار میں تھا کہ گیدڑ نے پھر گفتگو کا آغاز کیا کہ ذرا سوچنا چاہیے کہ کیا وجہ ہے کہ ایک دم ہم سب کو اپنے اپنے مقامات سے ہاتھ دھونا پڑا، شیر نے بھی حامی بھرتے ہوئے کہا کہ ہاں شاید اسی رات کوئی بات ہو کہیں ہماری گفتگو اس رات کسی نے سن تو نہیں تھی گیدڑ نے کہا کہ یہاں کبھی کبھار انسان بھی آ جاتے ہیں۔ کہیں اس رات بھی تو کوئی انسان نہیں آیا تھا۔ جس نے ہماری باتیں سن لی ہو۔ شیر نے بھیڑیئے سے کہا ذرا جا کر دیکھو غار میں آج بھی انسان تو نہیں آیا ہے۔ بھیڑیا گیا تو ایک گوشے میں دیکھا کہ ایک انسان سکڑ کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے دوسروں کو بھی آواز دی کہ ہمارا دشمن یہیں ہے۔ وہ دونوں بھی آئے۔ شیر نے دو پنجے مار کر اس جوان کا کام تمام کر دیا اور اسی رات مدت بعد تینوں نے پیٹ بھر کر گوشت کھایا اور سو گئے۔

تین اندھے: کہ ایک روز ایک لکڑھارا جو بوڑھا ہو چکا تھا، گھر سے لکڑیاں توڑنے کیلئے نکل رہا تھا کہ اس کی بیوی نے آواز دی کہ تم سے ایک بات کرنی ہے وہ پلٹ گیا تو بیوی نے کہا کہ تم اب بوڑھے ہو چکے ہو اور لکڑیاں پیٹ پر لاد کر لانا تمہارے لئے مشکل ہو چکا ہے۔ میں نے تو ڑی سی رقم تمہاری مزدوی کی رقم سے بچا رکھی ہے۔ اگر اسے لے جاؤ اور ایک گدھا خرید لو تو تمہارے لئے آسانی ہو جائے گی۔ بیوی نے رقم اس کے حوالے کر دی اور وہ چل پڑا۔ پہلی مرتبہ اس کے جیب میں بیس روپے آ گئے تھے۔ وہ بہت خوش تھا اور اس کا جی کر رہا تھا کہ اس کا اظہار کر ڈالے۔ راستے میں دیکھا کہ ایک اندھا بیٹھ کر بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ اس کے قریب گیا اور پوچھا کہ تمہارے پاس کتنی رقم ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو فقیر آدمی ہوں میرے پاس کونسی رقم ہو سکتی ہے اس نے کہا کہ میرے برابر کی رقم بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا تیرے پاس کتنی ہے؟ اس نے کہا کہ بیس روپے تو اندھے نے کہا کہ نہیں بیس روپے تو میں نے ابھی تک اکھٹے دیکھے بھی نہیں ہیں مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کتنے ہوتے ہیں۔ اس سے مٹھی بھر سکتی ہے یا نہیں۔ کہا وہ تو تم میرے رقم سے بھی اندازہ لگا سکتے ہو اور رقم اس کو تھما دی اس نے رقم مٹھی میں لیتے ہوئے کہا کہ اس کو ذرا میں اپنی ڈبیا میں ڈال دیکھوں کہ اس کو بھرتی ہے یا نہیں۔ رقم تو ویسے بھی تم کو لوٹا دینی ہے۔ یہ راضی ہوا اور اس نے رقم اپنی ڈبیا میں ڈال کر تھیلے میں ڈال دی۔ یہ کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد اس کی خاموشی پر پریشان ہو گیا اور اپنی رقم کا مطالبہ کیا تو اندھے نے کہا کہ تمہاری تو کوئی رقم میرے پاس نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ تم مجھے تنگ مت کرو اور میری رقم دو لیکن اندھا ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس نے جب بہت زیادہ اصرار کیا تو اندھے نے چیخنا شروع کیا کہ لوگو دیکھو، یہ آدمی مجھ سے میری رقم لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں ایک اندھا شخص ہوتے ہوئے کیسے اس کی رقم اس سے لے سکتا ہوں لوگوں نے اس کی بات کا بھروسہ کرتے ہوئے اس کی خوب پٹائی کی۔ وہاں سے یہ گھر چلا آیا اور بیوی سے سارا ماجرا بیان کیا۔ چند روز بعد جب بہتر ہوا تو کام کی غرض سے نکلنا چاہا لیکن اس سے قبل ایک بار اس اندھے کو دیکھنے کے ارادے سے شہر کی جانب نکل آیا تو اندھے کو اپنی جگہ پر موجود پایا۔ اس نے کسی ایک گوشے میں انتظار کیا جب اندھا اپنی بساط سمیٹ کر روانہ ہوا، تو یہ اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا آخر ایک غیر آباد علاقے میں اندھے کو دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کٹیا میں داخل ہوا۔ اور ایک طرف زمین کھود ڈالی اور جو نوٹ تھے وہاں موجود ایک ڈبے میں ڈال دیئے اور پھر دوسرے گوشے کی طرف مڑا۔ ریزگاری کا ڈبہ موجود تھا لیکن وہ جب تک زیرگاری ڈال رہا تھا۔ اس نے پہلا ڈبہ نکال کر اپنی جیب میں ڈال دیا۔ وہ تیسری جگہ کے ڈبے کی طرف بڑھا تو اس نے ریزگاری والا ڈبہ نکالا اندھا پہلے ڈبے کی جانب بڑھا تو ہاتھ نہیں آیا اس وقت تک اس بوڑھے نے تیسرا ڈبہ بھی نکالا تھا۔ اندھے نے پہلے ڈبے کو اس کی جگہ پر نہ پا کر رونا شروع کیا۔ پھر دوسرا ڈبہ دیکھا وہ بھی نہیں تھا۔ تیسرا دیکھا تو وہاں بھی یہی صورتحال تھی اس نے رونا پیٹنا شروع کیا لیکن تب تک بوڑھا رفو چکر ہو چکا تھا گھر آ کر بیوی کو خوشخبری سنائی کہ میری رقم چند گنا ہو کر لوٹی ہے۔ بیوی بھی خوش ہوئی اور اسے کہا کہ اب جا کر گدھا خرید لو اور اپنی محنت مزدوری میں مصروف ہو جاؤ۔

لیکن اس نے کہا کہ نہیں میں پہلے جا کر اس اندھے کو دیکھوں گا کہ کس حال میں ہے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اندھا چلا کر کہہ رہا ہے کہ خدارا لوگو میں لٹ گیا۔ کم از کم مجھے اندھے بھائی ڈنگر (کمزور) کے پاس لے چلو۔ بہر حال کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی بتائی ہوئی سمت پر اسے اس کے بھائی تک لے گیا ہو گا۔ وہاں پہنچ کر اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے بھائی نے پوچھا کہ کیا آفت آن پڑی ہے تو اس نے کہا کہ میں تو لٹ گیا اور سارا ماجرا سنایا۔ اس کے بھائی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا تم جیسے احمق کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ پیسے بھی کوئی زمین میں دباتا ہے۔ مجھے دیکھو کہ کبھی بھی میری رقم گم نہیں ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنی اس پرانی واسکٹ میں ساری

رقم چھپائی ہے۔ اگر اسے کہیں پھینک بھی دوں تو کوئی نہ کوئی اٹھا کر میرے پاس لے آتا ہے۔ یہ دیکھو ابھی میں پھینکتا ہوں اور ابھی چند ہی لمحے میں کوئی راہگیر واپس اٹھا کر لا دیگا اور یہ کہتے ہوئے اپنی واسکٹ پھینک دی۔ وہ آدمی جو تاڑ میں بیٹھا یہ سب ماجرا سن رہا تھا فوراً لپکا اور واسکٹ لے کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ چند لمحوں تکجب کوئی واسکٹ دینے اندھے کے پاس نہیں آیا تو اسکو خدشہ ہوا اور آواز دی کہ بھائی ذرا میری واسکٹ جو ادھر پڑی ہوئی ہے یہ اٹھا کر دے دو۔ لیکن واسکٹ ہوتی تو کوئی لا کر دیتا۔ اب یک نشد دو شد والا معاملہ ہوا۔ دونوں حافظ رونے پیٹنے لگے۔ ادھر وہ آدمی اپنے گھر خوشی خوشی واسکٹ لے آیا۔ واسکٹ کے جیب ٹٹولی تو رقم پر رقم نکل آئی۔ بیوی نے پھر شوہر سے کہا بس اب سکون کی زندگی گزارو۔ خدا نے اتنی رقم تجھے دے دی۔ اس نے کہا کہ بس ایک مرتبہ اور مجھے جانے دو ذرا دیکھوں کہ ان کی کیا حالت ہے۔ آدمی جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ دونوں اندھے روتے پیٹتے کہہ رہے ہیں کہ ہم لٹ گئے ہمیں ذرا ہمارے اندھے بھائی کاپر (کافر) کے پاس لے چلو۔ پھر کوئی مخیّر شخص ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کی بتائی ہوئی سمت کو انہیں لے گیا ہوگا۔ وہاں پہنچ کر دونوں رونے پیٹنے لگے۔ کاپر نے پوچھا کیا آفت آن پڑی ہے تم پر؟ انہوں نے کہا کہ ہم دونوں لٹ گئے۔ اس نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا کہ بیقوفو کوئی واسکٹ یا زمین میں رقم چھپاتا ہے؟ تم جیسوں کا انجام یہی ہونا چاہیے۔ مجھ سے سیکھو کہ کس طرح اپنی کمائی چھپاتا ہوں۔ میں نے شروع دن سے ہی اپنی کمائی کی پونجھی کو اپنی اس لاٹھی کے اندر رکھنا شروع کیا تھا اور آج تک یہیں محفوظ ہے۔ میری لاٹھی اندر سے بالکل خالی ہے جس میں اچھی خاصی رقم سما سکتی ہے۔ اس لاٹھی پر کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ اس میں رقم ہے دیکھو میں ابھی لاٹھی کو پھینکتا ہوں لیکن کوئی بھی اسے نہیں اٹھائیگا۔ بلکہ لا کر خود ہی مجھے دے دے گا۔ اس نے لاٹھی پھینکی۔ وہ شخص جو تاڑ میں تھا، لاٹھی اٹھا کر لے گیا۔ کچھ دیر میں جب کسی نے اندھے کو لاٹھی نہ دی تو ڈنگر نے کاپر سے کہا کہ لگتا ہے کہ تیری لاٹھی میری واسکٹ کی طرح چلی گئی۔ تینوں اندھے رونے پیٹنے لگے اور آدمی خوشی خوشی گھر آیا۔ بیوی کے ساتھ مل کر لاٹھی کے اندر سے ساری رقم نکالی اور ان پیسوں سے گھر وغیرہ لے کر خوشی خوشی رہنے لگے۔ کچھ عرصے بعد شوہر نے بیوی سے کہا کہ میرا جی کرتا ہے کہ ان اندھوں کو دیکھ لوں کہ کس حال میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی ایک رات دعوت کرلوں۔ بیوی کی ہزار مخالفت پر اس نے اپنی مرضی کی اور تینوں کو ایک رات کھانے کی دعوت دی۔ وہ تینوں خوش خوش اس کے گھر آئے اور اسے دعائیں دینے لگے۔ کھانے کے بعد اس شخص نے انہیں ایک ایک جوڑا کپڑے بھی دیئے اور چاہا کہ بچی ہوئی رقم میں سے بھی کچھ کچھ انہیں دے دے۔ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ اپنے پیسے پہچان لیں گے اور مصیبت ہو جائے گی لیکن وہ نہیں مانا۔ جب کپڑوں کے علاوہ رقم بھی انہیں دی تو تھوڑی دیر بعد کاپر اندھا چیخ اٹھا کر پکڑ لو اس لعنتی کو۔ یہ ہمارے ہی پیسے ہیں۔ اس رقم سے میری لاٹھی کی بو آ رہی ہے۔ تینوں نے اسے پکڑ کر پیٹنا شروع کیا۔ اس دوران اس کی بیوی آ گئی۔ تلوار اٹھا کر کاپر پر وار کیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں پریشان ہو گئے لیکن بیوی نے کہا کہ اب ان دونوں کو بھی قتل کرنا چاہیے اور پھر دوسرے دو اندھوں کو بھی انہوں نے مار ڈالا۔ اب ان کے لاشوں کی پریشانی درپیش تھی۔ بیوی نے شوہر سے کہا کہ جاؤ اور میرے بیوقوف بھائی کو بلا لاؤ۔ اس نے فوراً جا کر اسے بلایا۔ بیوقوف آیا تو بہن نے اس کی تعریفیں کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو لوگوں کو ہم سے کتنی حسد ہے۔ ہمارے دن اچھے ہوئے تو کسی نے لاش لا کر ہمارے گھر میں پھینک ڈالی ہے۔ بیوقوف نے کہا کہ یہ کوئی بات ہی نہیں۔ میں ابھی اٹھا کر پھینک آتا ہوں اور لاش اٹھا کر دریا میں پھینک آیا۔ واپس لوٹا تو اس کی بہن نے دوسری لاش اس کی جگہ پر رکھ لی تھی اور بیوقوف سے کہا کہ مردہ تو تم سے پہلے واپس پہنچ چکا ہے۔ بیوقوف کو غصہ آیا اور چار لاتیں مار کر اسے اٹھا لیا اور دریا برد کر کے لوٹ آیا۔

اس مرتبہ گھر پہنچ کر خود بیوقوف نے کہا کہ کہیں وہ واپس تو نہیں آیا ہے۔ دیکھا کہ تیسری لاش اس کی جگہ پڑی ہوئی ہے۔ اس نے اسے بھی چند لاتیں رسید کرتے ہوئے کہا کہ کتنی بار آؤ گے میں ابھی تجھے دریا برد کر کے آتا ہوں، لاش اٹھا کر دریا میں پھینک دی۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی اور ایک شخص وہاں نہا رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر چلنے کے بعد اس خیال سے کہ کہیں پھر مردہ دریا سے تو نہیں نکلا مڑ کر دیکھا تو وہ شخص نہا کر آ رہا تھا اس نے دوڑتے ہوئے اسے پکڑ لیا اور خوب پیٹا اور لے جا کر دوبارہ دریا میں پھینک آیا اور گھر پہنچ کر بہن سے کہا کہ وہ بد بخت دوبارہ نکل کر آ رہا تھا لیکن میں نے اسے خوب مار کر دوبارہ دریا میں ڈبو دیا۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔

پشتو لوک کہانیوں کے سلسلے میں ان کہانیوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو پشتونوں میں دوسری کہانیوں کی طرح بے حد مقبول ہیں اور خاص موقعوں پر یہ کہانیاں سنی اور سنائی جاتی ہیں۔ ان کہانیوں میں مشہور کہانیاں "آدھ سر کے درد" کی کہانیاں "دنیم سیری درد قصئ" ہیں۔ جن کو بعض لوگ ان لوگوں کو سناتے ہیں جن کو آدھے سر کے درد کی شکایت ہو۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کہانیوں کو سن کر عموماً یہ شکایت ختم ہو جاتی ہے۔ واقعات اور زبان کے لحاظ سے یہ کہانیاں بہت عجیب ہیں۔ ہر شخص ان کو سنا بھی نہیں سکتا۔ ساتھ ہی سننے والے کے لیے واقعات کے لحاظ سے عجیب تعطل پایا جاتا ہے۔ عموماً نیم سیری کے قصوں میں بات سے بات نکالی جاتی ہے اور سنانے والا سننے والے کو حیرت میں ڈال کر اس کے درد سر کی شکایت بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔

پشتونوں میں ان کہانیوں کو نہایت ہی اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ عام طور پر لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کہانیوں کو سن کر درد سر کی شکایت یقیناً رفع ہوتی ہے۔ عورتوں میں ان کہانیوں کے اثر کے بارے میں بالکل کسی قسم کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا۔

نیم سیری کی کہانیاں بھی زمانہ قدیم سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ جن لوگوں کو یہ کہانیاں یاد ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔

گائیکی موسیقی اور آلات موسیقی

پشتون کلچر میں رقص وموسیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ موسیقی کے اکثر آلات اور ان کی دھن پر رقص وقت کی ضرورت رہی ہیں چونکہ یہ قوم ہمیشہ جنگ و احراب میں رہی ہیں وہ جنگ واحراب چاہے دشمن کے مقابلے میں ہوں یا پھر زندگی کے دیگر مسائل کے حوالے سے ہر ایک میں پھرتی اور چستی کی ضرورت رہی ہے سو اس ضرورت کے تحت پشتون رقص نے مختلف روپ دھار لئے ہیں۔ ان میں اکثر ورزشی نوعیت کے ہیں۔ سید خیر محمد کے نظریئے کے مطابق ہر پشتون رقص کو (Dance) کا نام نہیں دے سکتے بلکہ یہ اس ڈانس سے جدا شے ہے جسے مروجہ آئینے میں دیکھا جاتا ہے ان کے خیال میں یہ وقت، ماحول اور حالات کسی پیداوار ہے پشتون رقص مذہبی جذبے سے مملو عسکری تربیت ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ پشتون رقص کی قسموں میں ایک ایسی قسم بھی ہے جو تلواروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں ہم پشتون رقص کی قسموں کے بعد پشتون موسیقی، گائیگی اور موسیقی کے آلات کی جانب جائیں گے۔

اتن: سید خیر محمد عارف پشتون رقص کے انواع بیان کرتے ہوئے اس کو تین بڑے خانوں میں رکھتے ہیں۔ جیسے مقامی رقص، ملی اور عوامی رقص اور کلاسیک رقص۔ لیکن ان کے مباحث سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم بلوچستان میں پشتون رقص (جسے اگر پشتو میں کہیں تو "اتن" کہیں گے) کی اقسام پر روشنی ڈالیں گے۔ جن کو وہ ابتداء میں مردانہ اور زنانہ اتنڑوں پر تقسیم کرتے ہوئے کہتے ہیں گڈا اتن مرد وزن میں ایک طرح کا ہوتا ہے۔ اس میں اتن کے بول بھی ہوتے ہیں جن کو اتن چی خاص لے میں گاتے ہیں اور یہ جسمانی سکون کے علاوہ روحانی سکون کا ذریعہ بھی ہے۔

سیرم: اتن کی ایک قسم "سیرم" کے نام سے معروف ہے اس میں شریک تمام جوان اتنڑ کرتے ہوئے ڈھول بجانے والے کے ساتھ حالت رقص میں پورے گاؤں کا چکر کاٹتے ہیں جو عارف کے خیال میں یہ دشمن کو شکست دینے کے بعد مورچوں کا جائزہ لیا جارہا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ تالی بجاتے ہوئے "ھے ھم" کی آوازوں سے دلوں کو دھکانے کا عمل انجام دیتے ہیں۔

خلجی اتن: ایک اور قسم خلجی قبائل میں رائج ہے جو اتن میں ٹپوں کی طرح کے نعرے اٹھاتے ہیں۔ اس رقص میں لمبے بال ضروری ہوتے ہیں اتن کا آغاز خاص قسم کے ٹپوں سے کرتے ہیں اور جوں جوں رقص میں گرمی اور تیزی آتی ہے تو تھکنے والے ایک ایک کر کے باہر نکلتے ہیں اس میں بدن کے حرکات کے ساتھ ساتھ بالوں کا چہرہ پر ادھر اُدھر بکھرانے کا عمل بھی دلچسپ ہوتا ہے۔ آخری بچ جانے والے شخص کو عموماً تماشائی پکڑ کر اتن ختم کرواتے ہیں۔

ھکلہ: ایک اور قسم "ھکلہ" کہلاتی ہے جس میں کہ ایک بزرگ شخص آگے بڑھ کر ایک مصرعہ اپنی سریلی آواز میں اٹھاتا ہے دوسرے جوان اور ڈھول زن کو بخوں کے سیل کی طرح اس کی جانب پڑھتے ہوئے دیگر مصرعوں کو مکمل کرتے ہیں۔ وہی بزرگ کچھ شخص آگے بڑھ کر پھر مصرعہ اٹھاتا ہے اور ڈھول زن اور اتن چی اسی طرح اگلے مصرعوں کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔

لونی اتن: ایک قسم کا اتن لونی قبائل میں مخصوص لباس کے ساتھ انجام پاتا ہے، اس اتن میں جب وجد وگرمی کی حالت آتی ہے تو اتن چی اتنی تیزی سے چکر کاٹتے ہیں کہ جس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اس طرح اسی تیزی کے ساتھ ایک خاص وقت پر سب یکبارگی بیٹھ بھی جاتے ہیں اور پھر فوراً اٹھ کر چار مرتبہ یکے بعد دیگر گھوم جاتے ہیں۔ اسی طرح ڈھول کی ایک مخصوص تھاپ پر لیٹ بھی جاتے ہیں اور پھر اسی پھرتی سے اٹھ کر رقص کو جاری رکھتے ہیں۔

ناصری اتن: یہ ناصر قبائل کا اتن ہے جس میں اتن چیوں کے بال عموماً لمبے ہوتے ہیں اور ڈھول کی تھاپ پر گھومتے ہیں اور یہ عمل لحہ بہ لحہ تیز ہوتا جاتا ہے اس طرح ایک ایک تھک کر اتن سے نکلتے ہیں اور آخر میں ایک شخص رہ جاتا ہے جو انتہائی مہارت اور تیزی سے گھومتا ہے۔

خیر محمد عارف کے بقول اتن میں مختلف علاقوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر باریک سی نوعیت کی تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں جن کو نکتہ بہ نکتہ دم تحریر میں لانا آسان نہیں یعنی یہ بھی زبان کی طرح ہر چند میل کے فاصلے پر اپنی شکل بدل دیتا ہے۔ ایک خاص قسم کا اتن کمرہ یا قمرہ امئی بھی ہے جس میں ایک مرد ایک عورت ایک مرد ایک عورت، ایک مرد ایک عورت اسی ترتیب سے اتن کا دائرہ مکمل کر کے مرد وزن اکھٹے اتن کرتے ہیں۔

گائیکی: بلوچستان کے پشتون قبائل کی گائیگی میں بنڈار کو اہمیت حاصل ہے اس کے علاوہ عاڑی اور ٹپے گانے کا رجحان بھی بہت عام ہے۔ بالخصوص عاڑی ہر مقام پر ایک خاص لہجے میں گائے جاتے ہیں مثل فصل کی کٹائی، درختوں سے بادام توڑنے کے دوران، صحرا میں جڑی بوٹیاں اکھٹے وقت، بھیڑ بکریا چراتے وقت عوامی حجروں میں اکھٹے ہوتے ہوئے۔ دوستوں کی محفلوں میں، شادی بیان کی محفلوں میں یعنی زندگی کا کوئی پہلو اس سے خالی نہیں ہے۔ شادی بیاہ میں تو موسیقی کے خاص آلے چغک کے ساتھ مقامی گلوکار اسے گاتے ہیں، نوجوانوں کی محافل میں بہت بازی کی طرح کی فضا بنتی ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ فی البدیہ عاڑی بھی گائے جاتے ہیں جبکہ لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان بھی اس طرح کے مقابلے چلتے ہیں۔ حتی عاشق و معشوق کے درمیان بھی اس طرح کی فضا بنتی ہے کہ وہ عاڑی کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس طرح ٹپوں کو بھی مختلف مقامات پر ایک خاص لہجے میں گایا جاتا ہے۔

آج کل موسیقی کا رجحان بھی ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ کی وجہ سے کچھ تبدیل ہوگیا، مختلف آلات موسیقی کے ساتھ بھی ان کا اضاف کو گایا جاتا ہے۔

آلات موسیقی

آلات موسیقی میں پشتون ماحول میں اچھے بسے ہیں ان کا اجمالی ذکر بھی کرتے چلیں۔

ڈھول: یہ پشتون کلچر کا وہ جزو لاینفک ہے جس کے بغیر پشتونوں کی زندگی کا نہ صرف خوشی کا پہلو بلکہ غم کے محافل کو بھی خالی نہیں دیکھا جاسکتا، یہی ڈھول ہے جو ذریعہ معاش کی سختی میں بھی ساتھ ہے۔ یہی ڈھول ہے جس کے ذریعے اعلانات کا وظیفہ بھی انجام پاتا ہے۔

ڈھول جو کہ چھوٹے بڑے سائز میں گول لکڑی کے دونوں طرف کھال کے پردوں سے بنی ہوئی چیز ہے اپنے ماہرین رکھتا ہے جن کو ڈم کہتے ہیں جسے اردو میں مراثی کہا جاتا ہے۔ ویسے بھی محققین کی نکتہ ونگاہ سے یہ موسیقی کا قدیم ترین آلہ ہے، ڈھول کے ذریعے قدیم روایات کی طرح آج بھی اعلانات کا عوام کو گوش گزار کرنے کا سلسلہ ملتا ہے۔ جبکہ پشتون قبائل میں دشمن کے اچانک حملے کی خبر یا دشمن پر حملہ کرنے کا اعلان، یا کسی دوسرے ناگہانی واقعے کیلئے ڈھول ہی کا استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح کے ڈھول بجانے کو "چیفہ" کہتے ہیں۔

چیفکہ یا سرندہ: یہ مختصر سے تاروں کا ایک معروف ترین پشتون موسیقی کا آلہ ہے جو بلوچستان کے تقریباً تمام قبائل میں قبول ہے اس ساز کا بجانے والا خود گائیک بھی ہوتا ہے۔ اس پر فوک شاعری گائی جاتی ہے، جبکہ سنجاوی کے لوگ اس کی لے پر اتنڑ بھی کرتے ہیں۔ ڈھول کے بعد شاید مقبول ترین آلہ موسیقی ہے جو بلوچستان کے پشتون قبائل میں جانا جاتا ہے۔

سرنا: یہ وہ آلہ موسیقی ہے جو ڈھول کی طرح نہ صرف رقص وطرب کی محفل تک محدود ہے بلکہ اس کا استعمال جنگی حربوں کی تربیتی سلسلوں میں بھی ہوتا ہے، اس کو ہم نفیری (file) بھی کہتے ہیں جو ہمارے بینڈ یا جوں کے فوجی پریڈ وغیرہ میں موجود ہوتا ہے۔

سرنا وہ شے ہے جس کی مدد سے ڈھول کی تھاپ پر رقص کرنے والے اس کو ڈھول کے ہمراہ پاکر اور بھی مستی میں آتے ہیں ڈھول تو ایک ہم آہنگی اور ردہم پیدا کرتا ہے سرا اس دھن میں کسی نہ کسی گیت کے بول گاتا ہے۔

ارمونیہ: ھارمونیم ہی کی شکل ہے جس کو پشتون قبائل میں سرنا اور ڈھول کے بعد شاید کوئی جگہ دی جاسکتی ہے۔ اس کو پشتون گائیک بھی اپنی محفلوں کا لازمی جزو سمجھتے ہیں یعنی کسی پشتون کا ٹیک کو جب ڈھول کے علاوہ ارمونیہ میسر آئے تو وہ ہر کسی دوسرے ساز کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، اس ساز کو بھی اتنڑ وغیرہ میں رقص کرنے والے جوانوں کے درمیان دیکھا جاسکتا ہے۔

چرئی: چرئی کو ہم بین کے مشابہ کہہ سکتے ہیں لیکن اس آلے کو بھی اتن کی محفلوں میں ڈھول کی ہمراہی میں اپنی حیثیت منواتے دیکھا جاتا ہے جو ہمیشہ تو نہیں ہوتا لیکن اس کے ہونے کو ایک اضافی خصوصیت کے طور پر اتنڑ اور خوشی کی محفلوں میں پسند کرتے ہیں۔ اتن کے مخصوص دائرے کے شرکاء چرئی کی آواز سے اپنے زاویے بناتے ہیں یعنی اس کی آواز اگرچہ درد بھری ہوتی ہے لیکن یہ خوشی کی ساعتوں کا رفیق ہے۔

بنسری: یہ وہ آلہ موسیقی ہے جس کو عشق کی زبان کا بہترین ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے مولانا جلال الدین رومی نے اس آلے کی فریاد سے اپنی مثنوی کا آغاز کیا ہے اس کو چرواہوں کی تنہائی کا رفیق پایا جاتا ہے جبکہ بنسری پر لوگ گیت اور پشتو کی معروف دھنیں گانے والے باہنر لوگ بھی ہیں لیکن توہمات کے حوالے سے پشتونوں کے کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ جو شخص بنسری بجاتا ہے اس کی دروازے نیستی اور بدبختی کے لیے کھل جاتے ہیں۔

دریہ: یہ پشتون خواتین کے علاوہ بلوچستان کے فارسی بان خواتین کا بھی محبوب ترین آلہ موسیقی ہے تقریباً تین چار انچ کی چوڑی اور آدھ انچ کی موٹی لکڑی کو گول کردیا جاتا ہے اور اس پر کھال ٹھونک دی جاتی ہے، جبکہ خوبصورتی کیلئے اس پر مہندی

یا مہندی نما رنگ سے نقش ونگار بھی بنائے جاتے ہیں خواتین اسے تقریباً خوشی کی ہر محفل میں بجاتے ہوئے گیت گاتی ہیں۔

رباب: یہ پشتون ثقافت کی وہ میٹھی اور دلگداز صدا ہے جس کو یہ قبائل اپنی پہچان گردانتے ہیں اگر اقوام کی پہچان یا شناخت کے لیے (ملکوں کی طرح، پھول، رنگ وغیرہ کا انتخاب کا ہونا) کسی آلہ موسیقی کا انتخاب ضروری ہوتا ہے تو بلا مبالغہ پشتون رباب کو انتخاب کرتا ہے اس آلے کیلئے پشتون فولکلوری شاعری بڑی وسعت ملتی ہے یعنی جا بجا اس کے نام کے ساتھ اپنے جذبات کو منظوم کیا گیا ہے جبکہ معروف پشتو روحانی قصے "آدم خان درخانی" کے ہیرو کی ایک بہت بڑی خوبی اس کا رباب بجانا ہوتی ہے اس کو کدوں کے خشک کوزے، یا لکڑی سے بنے ہوئے عمودی سانچے پر باریک پوست (ہرن وغیرہ) چڑھا کر ان پر تار کسے جاتے ہیں۔ اسی کے بارے میں تو مولانا رومی نے کہا تھا کہ:

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
از کجا مے آید این آواز وست

طرز تعمیر

طرز تعمیر کو قوموں کی ثقافتی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ طرز تعمیر سے جہاں قوموں کے رہن سہن اور بود و باش کا پتہ چلتا ہے۔ وہاں ان کی ثقافتی زندگی کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ طرز تعمیر کا قوموں کی تمدنی اور معاشی ترقی سے براہ راست تعلق ہے۔ جو قوم جس قسم کی زندگی گزارتی ہے۔ اور ترقی کی جس منزل پر فائز ہوتی ہے۔ اس کا طرز تعمیر بھی انہی تقاضوں اور ضروریات اور حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ بلوچستان میں پشتونوں کا علاقہ ابھی تک اقتصادی زندگی کی اولین منزلوں میں ہے۔ یعنی جدید مشینی اور صنعتی زندگی ابھی تک ان تک نہیں پہنچی بیشتر علاقہ ابھی تک زرعی زندگی کی سطح پر ہے۔ زیادہ تر آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ گاؤں میں جتنی بھی تعمیرات ہیں سب مٹی کی بنی ہوئی ہیں مکان اور دوسری عمارتیں نہایت سادہ بنی ہوئی ہیں رہنے کے مکان کشادہ بنے ہوئے ہیں جن میں قطاروں میں کمرے بنائے جاتے ہیں۔ بر آمدے بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

دور دراز دیہات میں کمروں میں سردیوں کے لئے آگ جلانے کا بندوبست بھی ہوتا ہے۔ اکثر دیہات میں کمروں کے بیچوں بیچ آگ جلانے کیلئے چوکور سا آتشدان بنایا جاتا ہے۔ دھواں نکلنے کیلئے چھت میں عام سوراخ ہوتا ہے۔ اکثر علاقوں میں سردیوں اور گرمیوں کیلئے الگ الگ گاؤں ہوتے ہیں سردیوں میں تمام آبادی نقل مکانی کر کے دوسرے گاؤں میں چلی جاتی ہے۔ سردیوں کا گاؤں عموماً ایسی جگہ بنایا جاتا ہے۔ جہاں ہوا نہ لگے اور دھوپ سامنے پڑے سردیوں اور گرمیوں کے لئے مختلف آبادی زیادہ تر ژوب کے شمالی علاقوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ چمن کے علاقے میں کمرے کی چھت گنبد نما بنائی جاتی ہے۔

زراعت پر دارومدار ہونے کی وجہ سے آبادیاں ایسی جگہ بنائی گئی ہیں جہاں پانی دستیاب ہو پانی خشک ہونے پر لوگ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ جا کر آباد ہو جاتے ہیں بلوچستان میں ایسی آبادیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو انہی خصوصیات کی بناء پر اس وقت بالکل ویران پڑی ہیں۔

بعض علاقوں میں اور زیادہ تر سرحدی علاقوں میں مکان کے ارد گرد فصیل نما چار دیواری بنی ہوتی ہے۔ جس کے چاروں طرف کونوں پر مورچے (حفاظتی مینار) بنے ہوئے ہوتے ہیں دشمنوں سے حفاظت کے لئے ایسے قلعہ نما مکان زیادہ صاحب حیثیت اور صاحب ثروت لوگ اور گاؤں کے معتبرین بناتے ہیں۔

گھریلو استعمال کی اشیاء: برتن کو بھی قوموں کی ثقافتی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ برتنوں سے ہی قدیم تہذیبوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور برتنوں کی ساخت اور استعمال سے قوموں کی تہذیب کے بارے معلومات فراہم ہوتی ہیں پشتونوں کے برتنوں میں جو برتن قدیم اور اہم شمار ہوتا ہے۔ وہ کٹوہ ہے۔ کٹوہ دراصل مٹی کا بنا ہوا دیگچہ نما برتن ہے۔

کٹوہ یعنی مٹی کی ہانڈی میں صرف "شورا" یا یخنی پکائی جاتی ہے۔ یہ برتن سالن سبزی اور چاول وغیرہ پکانے میں استعمال نہیں ہوتا ہے۔ قبائلی علاقوں میں ویسے بھی سبزیوں کا استعمال بہت کم ہے۔ ماضی میں سبزیوں کی کاشت بھی بہت کم ہوتی تھی لیکن اب سبزیوں کا استعمال عام ہونے لگا ہے۔ اور اس کی کاشت بھی تقریباً تمام علاقوں میں ہونے لگی ہے۔ پشتون اگر کسی روز گوشت نہ کھائے تو وہ یوں محسوس کرتا ہے۔ کہ اس نے آج کچھ کھایا نہیں ہے۔ کٹوہ کے بعد جو برتن عام استعمال ہوتا ہے۔ وہ کاشین کاسہ ہے۔ کاشین بھی مٹی کا ایک کٹورا نما روغنی برتن ہوتا ہے۔ یہ برتن آٹا خمیر کرنے اور یخنی میں روٹی چورہ کر کے کھانے کے کام میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کھانے کو شوروا کہتے ہیں اور پشتونوں کی عام اور بہت ہی مقبول خوراک ہے۔ اس میں گوشت کو ابال کر پکایا جاتا ہے۔ پھر کاشین میں روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال کر ان پر گوشت کا شوربا ڈالا جاتا ہے۔ گوشت الگ رکھ دیا جاتا ہے۔ روٹی کے ٹکڑوں کو ہاتھ سے لقمے بنا کر کھایا جاتا ہے۔ بعد میں ابلے ہوئے گوشت کے بھی چھوٹے چھوٹے

ٹکڑے کئے جاتے ہیں اور اس پر نمک مرچ اور کالی مرچ ڈال کر کھایا جاتا ہے۔

شوروا (شوربا) تازہ گوشت اور خشک گوشت یعنی لاندی دونوں کا بنایا جاتا ہے۔ آٹا خمیر کرنے کیلئے لکڑی کا کاسہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ کٹوہ کی طرح کا ایک اور برتن بھی ہے۔ جسے دکئی کہتے ہیں دکئی بھی مٹی کی بنائی جاتی ہے۔ جس میں دہی جمایا جاتا ہے۔ اس برتن میں لسی بھی بنائی جاتی ہے۔ لیکن لسی بنانے اور پینے کیلئے مٹی کا ایک دوسرا مخصوص برتن استعمال ہوتا ہے۔

شمالی علاقوں میں یہ مٹی کے برتن عام طور پر پانی پینے کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ برتن قدیم زمانے سے استعمال میں لائے جارہے ہیں مٹی کے برتنوں کے علاوہ تانبے کے برتنوں کا استعمال بھی عام ہے۔ آج کل گھریلو استعمال کے تقریباً سارے ضروری برتن تانبے کے ہوتے ہیں جن میں بدنئ، مجمہ، لگنچہ، پتوس وغیرہ عام برتن ہیں تانبے کے برتن شروع شروع میں قندھار غزنی اور پشاور میں بنتے تھے لیکن اب دوسری جگہوں میں بھی بڑے خوبصورت برتن بننے لگے ہیں غزنی کو تانبے کے برتنوں کے لئے کافی شہرت حاصل تھی۔ برتن سازی کا یہ کام ایران سے ہوتا ہوا سلطان محمد کے دور میں غزنی پہنچا اور اس وقت بھی غزنی میں تانبے کے بہت ہی نفیس برتن بنتے ہیں۔

بچھونے: برتن کے علاوہ گھریلو استعمال کی دوسری چیزوں میں کمبل، دری، غالیچہ، سترنجی اور رضائی وغیرہ عام ہیں پشتون یہ چیزیں بہت نفاست اور خوبصورتی سے بناتے ہیں اور اس سے اپنے گھروں کو سجاتے ہیں پشتون گھروں میں کرسیوں کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ بیٹھنے کے لئے فرش ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ جس پر غالیچہ یا دری وغیرہ بچھا کر اس پر دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے نالیچے (گدیلے) بچھائے جاتے ہیں ان نالیچوں کے ساتھ بہت بڑے گول تکیے رکھے جاتے ہیں مہمانوں کے لئے جدا بستر بناتے ہیں جو روزمرہ استعمال میں نہیں لائے جاتے تاکہ ہمیشہ صاف ستھرے رہیں پشتون قبائل میں کرستے یعنی نمدہ سترنجی جو کہ چھوٹی دری ہوتی ہے۔ اون کے بنے ہوئے کمبل اور غالیچہ کے بنے ہوئے تکیوں کے غلاف بہت خوبصورت بنائے جاتے ہیں۔

یہ چیزیں زیادہ تر خواتین گھروں پر بناتی ہیں اون سے بڑی خوبصورت چادریں بھی بنائی جاتی ہیں قبائلی علاقوں میں اون سے سفید اور سیاہ رنگ کے کمبل اور نمدے بنائے جاتے ہیں جو بہت پائیدار ہوتے ہیں پشتون گھروں میں روزمرہ کے استعمال کیلئے لسی بنانے کا مشکیزہ پانی پینے کیلئے مشکیزہ جسے گوڈلی کہتے ہیں اور گھی رکھنے کیلئے مشکیزہ جسے ''زک'' کہتے ہیں بھی بنائے جاتے ہیں سردیوں میں پوستین او پوستینچہ کا استعمال عام ہے۔ پوستین عموماً افغانستان کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

نوپائی: بچہ جب چلنے کی کوشش کرنے لگتا ہے تو لڑکے کی ماں اس کیلئے روغنی روٹی پکاتی ہے اس میں چینی بھی ڈالی جاتی ہے۔ یہ روغنی روٹیاں گول، موٹی اور کلچے جیسی ہوتی ہیں۔ اس موقع پر آس پاس کے بچوں کو بھی بلایا جاتا ہے بچے کو صحن میں یا کمرے کے اندر کھڑا کیا جاتا ہے جونہی بچہ چلنے کیلئے قدم اٹھاتا ہے ماں بچے کے پیچھے روٹی کو لڑھکاتی ہے، یہ روٹیاں طاق تعداد میں بنائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ان روغنی روٹیوں کا چورہ بنایا جاتا ہے، جسے موجودہ بچوں کو بھی دیا جاتا ہے اور پڑوسیوں کے ہاں بھی یہ چوری بھیجی جاتی ہے۔

بچے کے پیچھے روٹیاں لڑھکانے کا مقصد رزق کی فراوانی ہے یعنی خدا کرے، تجھے ہمیشہ فراواں رزق ملتا رہے اور تو اس کے پیچھے بھاگتا نہ پھرے بلکہ یہ خود تیرے پیچھے آتا رہے۔

گوڈئے: یہ مشکیزے کا پشتو نام ہے جو کہ بھیڑ، بکری کے کھال سے بنتا ہے جبکہ گائے وغیرہ کے کھال سے بھی بناتے ہیں جن میں پانی وغیرہ رکھا جاتا ہے، جبکہ گوڈئے، پنکٹ سے پانی بھرنے کے علاوہ لسی بنانے اور اس میں لسی رکھنے کے کام آتا ہے۔ یعنی گوڈئے پانی بھرنے کے برتن کے علاوہ پشتون قبائل میں فریج کا کام بھی دیتا ہے۔

منگئے: منگئے مٹکے کا نام ہے، جو کہ پشتون کلچر کا مجموعی طور پر ایک خوبصورت جزء ہے۔ منگئے کا استعمال پنکٹ وغیرہ سے پانی بھرنے کے لئے ہوتا ہے۔ گھروں میں پانی ٹھنڈا کرنے کیلئے بھی مٹکوں ہی کا استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ لسی کے بھی چھوٹے سے مٹکے ہوتے ہیں لیکن ان کا استعمال کم ہے۔

فوک ادب اور بہت حد تک مجموعی طور پر شاعری میں اس کا ذکر آتا ہے، یعنی پشتون ثقافت میں منگئے ایک اہم ترین نکتہ ہے۔

کنجئی: یہ لسی پینے کا مخصوص مٹی کا کوزہ یا برتن ہے جو کہ قطعی طور پر اس کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار ضرورت کے تحت پانی پینے کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

ڈوبئ: لوٹے کو ڈوبئ کہتے ہیں لیکن ڈوبئ کا استعمال یہاں کے پشتون قبائل میں بہت اہم ہے۔ یعنی یہاں اسکا استعمال ہماری سیاسی فضا کے استعمال سے بالکل مختلف ہے۔ لوٹے کا استعمال وضو، اور استنجا وغیرہ کے پانی کے علاوہ پینے کا پانی کے لیے بھی ہوتا ہے۔ یعنی دسترخوان پر لوٹے میں پانی بھر کر رکھتے ہیں اور ہر شخص اس پر منہ لگا کر پانی پیتا ہے جبکہ یہی تمام کام چائے بنانے کے علاوہ کیتلی سے بھی لئے جاتے ہیں یعنی وضو اور استنجا کے علاوہ اس سے پانی بھی پیتے ہیں۔

کٹورے: تھالی کی ایک قسم ہے جس میں پانی، لسی وغیرہ پیتے ہیں اس کے علاوہ اس میں سالن وغیرہ بھی رکھا جاتا ہے۔ جبکہ مٹکے کا منہ بھی اس سے ڈھانپتے ہیں یعنی یہ ان کے لئے ڈھکنے کا کام بھی دیتا ہے۔

ان کے علاوہ دیگر برتنوں میں گلاس، تھالی، دیگچی اور پیالیاں وغیرہ تقریباً ہمارے دیگر قبائل سے ملتے جلتے ہیں۔

گڈوہ: یہ ایک قسم کا مقبول و معروف برتن ہے جیسے فارسی آفتابہ کہتے ہیں۔ اس میں پانی بھرا جاتا ہے لیکن پانی کے استعمال کے حوالے سے یہ ہر طرح کے استعمال میں آتا ہے۔ وضو وغیرہ سے لے کر دیگر ضروریات تک، یعنی پشتون قبائل میں یہ بہت ہی معروف برتن ہے، اس پر بڑے نقش و نگار ہوتے ہیں۔ بلکہ کچھ میں تو موتی بھی جڑے ہوتے ہیں۔

سیلمچی: اس کا استعمال مہمانوں کی حد تک رہتا ہے، جسے مہمانوں کے ہاتھ دھلواتے وقت ان کے ہاتھوں کے نیچے رکھتے ہیں تاکہ ہاتھوں کے دھلنے کا پانی اس میں آجائے اس میں بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ یعنی سادہ سے لے کر انتہائی خوبصورت اور منقش ہوتے ہیں۔ ہاتھوں پر پانی ڈالنے کے لیے لوٹے یا اکثر گڈوں کا استعمال ہوتا ہے۔

توکدان: یہ ہر گھر میں چند ایک موجود ہوتے ہیں جو نسوار کے تھوکنے کیلئے استعمال ہوتے ہیں ان میں بھی طرح طرح کی قسمیں ہوتی ہیں، جبکہ نسوار کی ڈبیا بھی کچھ باذوق آئینہ دار اور خوبصورت رکھتے ہیں۔

گڈو: یہ وہ آلہ ہے جس میں تمباکو ڈال کر پیا جاتا ہے گڈوں وہی آج کے "پائپ" کی قدیمی شکل ہے، جسے لکڑی سے بنایا جاتا ہے جبکہ کچھ لوگ مٹی سے بھی اپنے لئے گڈو بناتے ہیں اس کے علاوہ حقے کا استعمال بھی ان قبائل میں ہے جس کو "چلم" کہتے ہیں۔

ہتھیار: پشتون ایک جنگجو اور بہادر قوم ہے۔ اور ہتھیار بہادروں کی سب سے بڑی دولت اور زیور ہوتے ہیں یہی وجہ ہے۔ کہ ہتھیار ہر پشتون کا بنیادی زیور ہے۔ پرانے زمانے میں ہر شخص کے پاس تلوار ہوا کرتی تھی اور دوسرا ہتھیار نیزہ تھا۔ اور یہ ہتھیار ہر پشتون گھر میں موجود رہتے تھے۔

مشہور یونانی مورخ ایروڈوٹس جو ۴۰۰ء کے قریب پشتونوں کے علاقے میں آیا تھا لکھتا ہے۔ کہ "اس علاقے کے لوگ چمڑے کا لباس پہنتے ہیں اور تیر کمان ساتھ لئے پھرتے ہیں۔" زمانے کے ساتھ ساتھ آلات میں بھی تبدیلی آگئی اب تلوار اور نیزے کا دور نہیں رہا مشینی دور کے ساتھ ہتھیار بھی بدل گئے اب پشتون موجودہ دور کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں اس کے استعمال میں بڑے ماہر ہیں گھوڑے کا سواری کے طور پر استعمال اب بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ بلکہ زراعت کے لئے بھی گھوڑے استعمال نہیں ہوتے بیل اور اونٹ جو پہلے استعمال ہوا کرتے تھے اب ٹریکٹر وغیرہ کے آجانے سے ان کا استعمال بھی روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔

ٹوٹے ٹوٹکے

لوک علاج معالجہ: پشتون چونکہ جدید تہذیب و تمدن سے دور رہے اس لئے پشتون علاقوں میں وہ رنگا رنگی دیکھنے میں نہیں آتی جو دنیا کی دوسری قوموں میں پائی جاتی ہے۔ جدید تہذیب و تمدن سے دور اور الگ تلگ زندگی بسر کرنے کی وجہ سے پشتونوں کی اپنی قدیم ثقافت قائم رہی اور اس وقت بھی قبائلی علاقوں میں قدیم رسم و رواج دیکھنے میں آتے ہیں۔ شہروں میں بسنے اور آباد ہونے والے پشتونوں میں ایک بات دیکھنے میں آتی ہے کہ انہوں نے بعض توہمات چھوڑ دیئے ہیں دیہی علاقوں میں آباد پشتونوں کی زندگی اب بھی ویسی ہے۔ ان کی خوراک رہن سہن کے طور طریقے لباس غرضیکہ تمام باتیں قدامت کا رنگ لئے ہوئے ہیں علاج معالجے کے طریقے بھی وہی پرانے ہیں بیماریوں میں انگریزوں ادویات کا استعمال بہت کم کیا جاتا ہے۔ بلکہ مقامی جڑی بوٹیوں سے بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ ناف کا اترنا اب بھی ایک عام بیماری سمجھی جاتی ہے۔ جس کا علاج اس بیماری کے ماہر سے ناف پکڑوا کر کیا جاتا ہے۔

خراب زخم: زخم کے خراب ہونے پر اور پیپ نکلنے پر اس کا علاج آٹے اور گھی یا سرسوں کے تیل سے نیم خام روٹی پکا کر زخم پر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ ماہر "رگ گیر" یعنی مالش کر کے علاج کرنے والے عام ملتے ہیں۔

کھول پہنانا: بخار اور بعض دوسری بیماریوں کا علاج جانور کی کھال (پوست) پہنا کر بھی کیا جاتا ہے۔ جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ اپنی گرمی سے بیماریوں کو ختم کرتا ہے۔ "ہڈ بند" یعنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا جوڑنے والا بھی دیہات میں ملتا ہے۔

خال لگوانا: بعض بیماریوں میں خال لگوایا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے خیال میں فاسد خون بدن سے نکل جاتا ہے۔ یہ کام کچھ خواتین جو ایک مخصوص قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں باقاعدہ بطور روزگار کرتی ہیں جبکہ خال خواتین خوبصورتی کے لیے بھی لگاتی ہیں۔

داغنا: داغنے سے بھی اکثر بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ جلے کا علاج بھی مقامی طور پر کیا جاتا ہے۔ جس میں چونے میں جلا ہوا بھس ملا کر جلی ہوئی جگہ پر مرہم کے

طور پر زکھا جاتا ہے۔اس سے تکلیف میں کافی افاقہ ہوتا ہے۔

بدن پر نمایاں زخم ہونے اور کسی بھاری چیز کے جسم پر گرنے یا ڈنڈوں سے مارنے پر ایک باریک کپڑے میں ''بارتنگ'' باندھ کر اور اسے گرم گھی میں لگا کر سوجی ہوئی جگہوں پر لگایا جاتا ہے۔

نوزائیدہ بچے کو دودھ کے ساتھ برتن میں ذرا سا ''بارتنگ'' ملا کر دیا جاتا ہے۔جس سے اس کا ہاضمہ درست رہتا ہے۔اس کے علاوہ خام لیٹی اور انڈے کے مختلف پلاسٹر کا استعمال عام دیکھنے میں آتا ہے۔

پیٹ کا درد: پیٹ میں مروڑ کے لئے انار کے خشک چھلکے کا استعمال کیا جاتا ہے۔غرضیکہ اسی طرح کی بہت سی بیماریوں کا علاج مقامی طور پر جڑی بوٹیوں سے کیا جاتا ہے۔دیہی علاقوں میں اب بھی جڑی بوٹیوں اور مختلف دوسری چیزوں سے بیماریوں کا علاج عام ہے۔

پشتون قبائل میں مقامی طور پر اکثر بیماریوں کا کوئی نہ کوئی علاج موجود رہا ہے جبکہ ان میں اکثر آج تک مروج ہیں یہاں چند مزید کا ذکر پروفیسر سیال کاکڑ کی فولکلوری طب سے کرتے ہیں:

بخار: بخار میں عموماً گرم اشیاء مریض کو کھلاتے ہیں اور اسے پوری طرح ڈھانپتے ہیں تاکہ اسے پسینہ آئے۔جبکہ ٹائیفائیڈ (Typoid) کے علاج کیلئے اجوائن اور کالی مرچ کو اکھٹا کر کے پھیسا جاتا ہے اور ہر رات مریض کو کھلاتے ہیں عمومی عقیدہ یہ ہے کہ یہ بخار ساتویں، گیارویں، چودھویں یا پھر چالیسویں روز ٹھیک ہوتا ہے۔مریض کو بیماری کے دوران پرہیز کروایا جاتا ہے جبکہ صرف سبز چائے پلاتے ہیں۔ٹھیک ہونے پر اسے بھیڑ کا مغز کھلاتے ہیں اور اس کے بعد سادہ شوربہ دیتے ہیں۔

کوئے (چیچک): پشتو میں کہاوت ہے کہ چیچک کہتا ہے کہ یا تو تجھے دغدار کروں گا یا پھر قبر کی تہہ میں اتادونگا۔اس بیماری کے لیید فاعی طور پر داغ یا سینگ لگاتے ہیں۔یعنی فاسد خون نکالتے ہیں اور جب کسی کو یہ بیماری لگ جاتی ہے تو مریض کو گرم کمرے میں رکھا جاتا ہے اور سبز چائے میں زعفران ڈال کر پلاتے ہیں۔اس بیماری میں چالیس دن تک گوشت سے پرہیز کرواتے ہیں۔عمومی عقیدے کے مطابق گوشت سے انتڑیوں میں زخم پیدا ہوتے ہیں یا پھر پیچش میں مبتلا ہوتا ہے۔جبکہ اس مریض کے لیے بھاری آواز بھی خطرناک ہے۔

شرے (خسرہ): اس کو "سرے" بھی کہتے ہیں اس کا علاج بھی چیچک کے علاج کے مشابہ ہے اور گوشت سے پرہیز کروایا جاتا ہے جبکہ بخار ٹوٹنے پر اسکا پرہیز دہی یا لسی سے ختم کرواتے ہیں جبکہ جب تک دانے نہ نکلے ہوں تب تک مریض کو بھیڑ کے دودھ میں گڑ ڈال کر دیتے ہیں جبکہ دودھ کے علاوہ بھی گڑ کھلاتے ہیں۔

تورہ غاڑہ (کالی کھانسی): اس بیماری کو عمومی علاج پشتونی قبائل مریض کو گدھے کا دودھ پلا کر کیا جاتا ہے جبکہ پرہیزیں روغنی اور خنک خوراکیں منع کردی جاتی ہیں۔

ژڑے (یرقان): اس میں دم درود پر زیادہ تکیہ کرتے ہیں مولوی سے سفید پیاز دم کروا کر مریض کے گلے میں لٹکاتے ہیں جو پیلا ہوتا ہے اور یرقان کا اثر کم ہو جاتا ہے۔جبکہ دوا کے طور پر سرکہ میں پیاز کوٹ کر ملاتے ہیں جبکہ املی پانی میں ڈال کر پانی کو کھلے آسمان تلے چاندنی میں رکھتے ہیں اور نہار منہ اس کا پانی مریض کو پلاتے ہیں۔جبکہ کالی مرچیں اور پیاز دم کرواتے ہیں اور ساتھ تعویذ بھی لکھوائے جاتے ہیں۔پرہیز میں انڈے، مرغی کا گوشت، چاول اور دیگر روغنی اشیاء کی ممانعت شامل ہوتی ہے کیونکہ ان کے اثرات کو گرم گردانا جاتا ہے۔

پیچ (دست): دست لگنے پر سفید چاول یا دہی کھلاتے ہیں اور باقی تمام خوراکوں سے پرہیز کراتے ہیں جبکہ سبز چائے کو بھی بہتر جانا جاتا ہے، علاج کی غرض سے اسپغول یا پھیسا ہوا انار کا چھلکا دہی پر ڈال کر کھاتے ہیں۔جبکہ کچھ لوگ ملنگہ سے بھی علاج کرتے ہیں اس کے علاوہ بھیڑ کی نیم پختہ چکی بھی مریض کو کھلاتے ہیں۔

قبض: جس کو "کوز" تلفظ کہا جاتا ہے اس کے علاج کے لیے انتہائی معروف راستہ جلاب کا استعمال ہے لیکن اس کے علاوہ جڑی بوٹیوں کے جوشاندے بھی بنائے جاتے ہیں۔جڑی بوٹیوں کا جوشاندہ بنا کر رات بھر کھلے آسمان تلے رکھتے ہیں اور صبح سویرے مریض کو پلاتے ہیں۔ویسے بھی پرانے لوگ بہار کی آمد کے ساتھ جلاب کرتے ہیں ان کا عقیدہ ہے اس طرح بلغم کا اثر زائل ہوتا ہے۔

نزلہ: اس مسئلے کے حل کے لیے عموماً کھوپڑی کے اوپر داغ لگائے جاتے ہیں۔یعنی کھوپڑی کو ایک خاص طریقے سے جلایا جاتا ہے جس سے نزلہ باہر نکلتا ہے جبکہ کہیں پھر سینگ کے ذریعے سر سے فاسد خون نکالنے کا عمل انجام دیا جاتا ہے۔جبکہ

توری کے بیج کو پیس کر اسے سونگنے سے بھی نزلہ زائل ہو جاتا ہے۔

غاڑہ: غاڑہ گلے کے درد اور کھانسی کو کہتے ہیں، اس کے علاج کیلئے سبز چائے میں کالی مرچیں ڈال کر پی جاتی ہے اس کے لئے انڈے کی زردی بھی چائے میں ڈال کر پی جاتی ہے اس طرح نیم بھنے ہوئے نوشادر اور اجوائن کی پکی بھی اس مرض کے علاج کا ذریعہ ہے۔ ان کے علاوہ سینے کی خرابی اور کھانسی و گلے کی خراش کیلئے زرا سا افیون بھی کھاتے ہیں۔ جبکہ "پوست" کے پھل جس کو "کوکنار" کہتے ہیں اس کا جوشاندہ بھی اس مرض کا علاج ہے، لیکن اس میں سے خشخاش نکال کر جوش دیا جاتا ہے، ویسے خشخاش کو گڑ کے ساتھ پھیس کر یا پھر اس میں چینی ملا کر بچوں کو دی جاتی ہے جس کی تاثیر گرم بتاتے ہیں۔

افیون اور یہ جوشاندہ عموماً رات کو سوتے وقت استعمال ہوتا ہے جس کے بعد فوراً سونا پڑتا ہے اور پانی پینے کی سخت ممانعت ہوتی ہے۔

نظر کی کمزوری: پشتونوں میں جب کسی کی نظر کمزور ہو جاتی تو اس کو بھیڑ جگہ کا کباب کھلاتے تھے جس سے ان کے عقیدے کے مطابق نظر بہتر ہو سکتی ہے کہ جبکہ شب کور لیکن بھی یہی علاج ہے اس کے علاوہ وہ ساتھ دل پکا کر کھائے تو بھی اس کا یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

کان کا درد: کان کے درد کا پشتون معاشرے میں دیسی علاج مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ عام طور پر روغن بادام ڈالتے ہیں روغن بادام میسر نہ ہو تو سرسوں کے گرم تیل بھی اس درد کے علاج کیلئے کان میں ڈالا جاتا ہے۔ جبکہ سرسوں کے تیل میں کچھ لوگ لہسن کو جوش دے کر اس تیل کو کان میں ڈالتے ہیں۔ جبکہ افیون کو بھی سرسوں کے تیل میں ڈبو کر کان میں وہ تیل ڈالتے ہیں۔

اگر کان میں زخم یا پیپ وغیرہ پیدا ہو تو کان کے اوپر گرم گوبر رکھا جاتا ہے اسی طرح مٹی کا تیل بھی اس مرض کے علاج کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بچے کے کان میں درد ہو تو ماں اپنا دودھ اس کے کان میں ٹپکاتی ہے۔

پیٹ کا درد: اس کے لئے عموماً سونف کی پکی لی جاتی ہے دوسری صورت میں تقریباً وہی جوشاندہ جو قبض کے لیے استعمال ہوتا ہے اس مریض کو بھی پلایا جاتا ہے۔ اسی طرح جلاب کیا جاتا بھی اس بیماری میں آرام دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسے مریض کی غذا کچڑی یا کھیر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا، بہتر ہونے کے بعد شوربہ یا مکھن وغیرہ بھی کھلاتے ہیں۔

پیٹ کا گیس: اس صورت میں پشتون قبائل میں سونف کی پکی لینے کے علاوہ دیگر معالجے بھی رائج ہیں جیسے مٹی کے تیل کا گھونٹ بھرنا یا سرسوں کے تیل سے پیٹ کو مالش دینا وغیرہ۔

سر کا درد: اس کے علاج کیلئے عموماً تعویذ یا دم درود پر تکیہ کیا جاتا ہے لیکن ناک کے نسوار کا سونگھنا بھی موثر کہلاتا ہے۔ جبکہ سر کو کسی رومال وغیرہ سے مضبوطی سے باندھنے سے بھی درد جاتا رہتا ہے۔

بال گرنا: اس صورت حال سے دوچار ہو کر پشتون قبائل انڈے کی زردی یا گاچی سے بال دھوتے ہیں، (ویسے بھی ان دونوں سے بالوں کے دھونے کا رجحان ہے جو اپنی جگہ صابن یا شمپو کا کام دیتے ہیں) اس کے علاوہ "رٹہ" استعمال کرتے ہیں۔

دانت کا درد: دانت کے درد کیلئے دانتوں میں "لونگ" رکھا جاتا ہے اگر کیڑے لگنے کا شائبہ ہو تو پھر "لونگ" کو انگاروں پر رکھ کر اس کے اوپر منہ کھول کر رکھتے ہیں تا کہ دھواں منہ میں جائے اور اس طرح کیڑے خود بخود گر جاتے ہیں۔ کچھ لوگ مٹی کا تیل منہ میں ڈالتے ہیں جبکہ کالی مرچوں سے بھی دانت کے درد کا معالجہ کیا جاتا ہے اسکے علاوہ دانت کے درد کے ماہرین بھی ہوتے ہیں جو ایک خاص حساب سے لکڑی کا کھیل ٹونک کر اس کا درد بھگاتے ہیں۔ اسی طرح دانتوں میں ناک کا نسوار رکھنا یا آٹا اور نمک رکھنے سے بھی افاقہ ہوتا ہے۔

زخم کا علاج: زخم کے معالجے میں فوری طور پر خون رکوانے کیلئے زخم پر مٹی ڈالی جاتی ہے یا پھر کپڑا جلا کر اس کی راکھ زخم پر رکھتے ہیں۔ اس طرح سے زخم پر نسوار رکھ کر بھی خون رسنے کو منقطع کیا جا سکتا ہے۔ چونہ بھی ڈالا جاتا ہے اور کپڑے کو مٹی کے تیل میں بھگو کر اس پر رکھنے سے بھی خون رک جاتا ہے۔ زخم بڑا ہو تو پھر اس کو سبز ریشمی دھاگے سے سیا جاتا ہے اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کا جب کسی کے پیٹ یا ران پر زخم آ جاتا تو بڑی چیونٹی کو زخم پر چھوڑتے جب وہ زخم پر اپنا منہ لگاتی تو اپنے دانت پیوست کرتی تو اس کے بدن کو سر سے الگ کر کے پھینکتے ہیں اور اس کا سر اس زخم پر رہ جاتا ہے اس طرح وہ زخم جڑ جاتا ہے۔

نوو (پیپ): زخم یا کسی دانے میں پیپ بھر جانے سے پیاز کو انگاروں پر پکا کر توڑتے ہیں اور اس کے درمیانی پرتوں کو گرم گرم زخم پر رکھ کر باندھ دیتے ہیں، جو گھنٹوں بعد زخم سے پیپ کو نکال لیتا ہے۔ اس کے علاوہ گاچی، گوند یا آٹے کے

خمیری بھی رکھتے ہیں۔

جلنا: جب کسی کے بدن کا کوئی حصہ جل جاتا ہے اوس پر نیل ملا جاتا ہے یا پھر مہندی کو گائے کے مکھن میں گوندھ کر لگاتے ہیں، جبکہ آلو کے چھلکوں کو بھی جلی ہوئی جگہ پر باندھتے ہیں۔

پیشاب بند ہو جانا: بچوں میں پیشاب کے بند ہونے کا علاج مائیں نیل سے کرتی ہیں یعنی بچے کے پیشاب کے سوراخ میں زرا سا رکھ لیتی ہیں جس سے اس کا پیشاب جاری ہو جاتا ہے، یا پھر پانی میں نمک ملا کر اس برتن میں بچے کو بٹھایا جاتا ہے۔

ہچکی: جسے "سوگئی" یا "سولگئی" کہتے ہیں جب کسی شخص کو ہچکیاں آ رہی ہوں تو اس کے منقطع کرنے کیلئے وہ پانی کے گلاس کو سات مرتبہ بسمہ اللہ کہہ کر پی لیتا ہے یا پھر موجود افراد اس سے کوئی پریشان کرنے والی بات کہتے ہیں یا ڈرا دیتے ہیں اس طرح یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

پاگل کتے کا کاٹنا: پشتونوں میں جب کسی کو پاگل کتا کاٹتا ہے تو اس کا معالجہ دم اور درود سے کرتے ہیں یا پھر بزرگوں کی زیارتوں کا رخ کرتے ہیں جبکہ اس کے علاج کیلئے کچھ خاص زیارات یا روحانی شخصیات یا مولوی ماہر ہونے کی شہرت رکھتے ہیں جبکہ پاگل کتے کے کاٹنے کے بعد اس شخص کو چالیس دن تک ایک کمرے میں بند کر کے رکھتے ہیں۔ رفع حاجت وغیرہ کے لیے بھی اگر باہر لاتے ہیں تو اسکا چہرہ ڈھانپ دیتے ہیں اس کے ساتھ اسے سبز شے اور پانی کو دیکھنے کی بھی ممانعت ہوتی ہے۔

سانپ کا ڈسنا: جس کو سانپ ڈسے اس کا فوری علاج تو یہ بتاتے ہیں کہ سانپ کی ڈسی ہوئی جگہ پر منہ چپکا کر اس زہر کو چوس کر تھوکے جس سے زہر کا اثر کم ہو جاتا ہے اس کے علاوہ زہر مہرہ کا استعمال بھی سودمند کہلاتا ہے۔ لیکن سب سے بہتر علاج دم درود اور خوردہ وغیرہ کا لینا ہے۔ جگہ سانپ کا کاٹ رسی سے بھی ڈرتا ہے ہم معنی ضرب المثل پشتو زبان میں بھی رائج ہے۔

بھڑ یا ڈیمبو: جس کو بھڑ یا ڈیمبو سے اس کیلئے سب سے آسان اور کارآمد نسخہ نسوار ہے۔ بھڑ کی ڈسی ہوئی جگہ پر نسوار رکھ کر مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں جو بدن میں داخلی شدہ زہر کو جذب کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص منہ میں گھی لے کر اس جگہ کو چوسنے لگتا ہے یا پھر چینی کو پانی پر ٹپکا کر متاثرہ جگہ پر رکھتے ہیں ان طریقوں سے اثر زائل ہو جاتا ہے۔

بچھو کا ڈسنا: اس ظالم کے ڈسے کا درد شدید ہوتا ہے پشتون قبائل اول تو دم درود کے ذریعے اس درد سے نجات حاصل کرتے ہیں، لیکن دوسری صورت میں پٹھکڑی کو جلا کر متاثرہ جگہ پر رکھتے ہیں اور اگر وہی بچھو مل جائے تو اسے سرسوں کے تیل میں جوش دے کے وہی تیل متاثرہ جگہ پر ملتے ہیں کہتے ہیں کہ اس زہر کا اثر جاتا ہے۔ اور مریض کا آرام مل جاتا ہے۔

ان کے علاوہ پشتونوں کا عقیدہ ہے کہ انار کھانے سے خون صاف ستھرا ہوتا ہے سو زیادہ کھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بھرے پیٹ نہانے کو مضر صحت گردانا جاتا ہے ان کے خیال میں اس طرح کھائی ہوئی اشیاء کے ہضم ہونے میں مشکل پیش آتی ہے۔

پشتون گوشت کھانے کو ہر غذا پر ترجیح دیتے ہیں ایک محاورہ بھی ہے کہ "غوشہ دخدای غوشہ" یعنی گوشت اللہ کو بھی پسند ہے۔ اور یہ بات بھی عام ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ اگر مجھے کچھ کھانے کی حاجت ہوتی تو میں گوشت کھانا پسند کرتا۔

گرمیوں کے موسم میں پشتون گڑ کا مشروب پینا پسند کرتے ہیں۔

گوشت میں ان کو "سپینہ غوشہ" سفید گوشت یعنی چربی زیادہ مرغوب ہوتی ہے۔

جانوروں کا علاج معالجہ

حیوانات کے علاج کے سلسلے میں بھی پشتون قبائل میں کچھ معالجے عام ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر پروفیسر سیال کاکڑ کے حوالے سے کئے دیتے ہیں:

مرغی: مرغیوں میں مختلف بیماریوں کے مختلف علاج ہیں۔ مرغی کو رانی کھیت (سغاب) لگنے کی صورت میں اسے کالی مرچیں، پیاز، شنہ ترخہ، (تلخ قسم کا پودا) کو آٹے میں ملا کر ان کی گولیاں بنا کر مرغی کو کھلاتے ہیں۔ جبکہ زیارات سے ان کے لئے "خوردہ" وغیرہ بھی لایا جاتا ہے۔

اگر مرغیوں میں جوئے پیدا ہو جائیں تب نہیں سرسوں کا تیل لگا کر ان پر خاکستر ڈالا جاتا ہے یا پھر مرغیوں کے ڈربوں میں تلخ دھواں چھوڑا جاتا ہے جس سے جوئے ختم ہو جاتے ہیں۔

اگر کبھی کوئی مرغی خام انڈے دے تو اس مرغی کو چربی کھلائی جاتی ہے یا

پھر توے سے اتاری ہوئی گرم روٹی کے ٹکڑے دیتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ گندم وغیرہ کے گرم دانے بھی اس مرغی کو کھلاتے ہیں۔

جس وقت مرغی کو چوزے نکل آتے ہیں تو کچھ لوگ ابتدائی چند روز آٹے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر گھی میں ڈبوتے ہیں اور ان چوزوں کو کھلاتے ہیں۔

بکری: بکریاں اگر دودھ دینا کم کردیں تو ان کو سرسوں کے تیل سے معالش کرتے ہیں جبکہ دست لگنے کی صورت میں ان کو حرف بھوسہ دیا جاتا ہے اور سبز خوراک کے علاوہ پانی بھی بند کردیتے ہیں۔

سانس کی بیماری جس کو اوز مرگ کہتے ہیں ہو جائے تو اومان (ایک تلخ بوٹی) اور گڑ کا جوشاندہ پلایا جاتا ہے اسی طرح گرگ (جگر کی بیماری) کی صورت میں حقے کا پانی یا تمباکو دیتے ہیں اس کے علاوہ ایک تلخ بوٹی سے بھی اس کا علاج کرتے ہیں۔

بھیڑ بکریوں یا بیل کو خصی کرنے کے بعد ان کے زخموں کو راک کے علاوہ نمک بھی چڑکا جاتا ہے اگرچہ زخم اور نمک کی کبھی بھی نہیں بنی ہے لیکن شاید کوئی حکمت والی بات یہاں بھی موجود ہو۔ نمک اور خصی کرنے کے عمل کا بہت گہرا ہے۔ عام طور پر کسی ایسے شخص کو جو گھر کما کر کچھ لاتا تو نہیں بلکہ گھر لے جا کر دوسروں پر لٹاتا ہے یا کہیں کام کرنے کے باوجود گھر کو اس کی آمدنی فائدہ نہیں ہوتا تو ایسے موقع پر کہا جاتا ہے کہ "فلان خصی کا کام کرتا ہے لیکن نمک بھی اپنے گھر سے لے جاتا ہے۔"

بیل گائے: پشتونوں کا تعلق مال مویشی چرانے اور اس کو کسب معاش بنائے ہوئے صدیوں گزر چکی ہیں تو جب اتنا قدیم تعلق ہو تب کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کے علاج کی کوئی راہ وغیرہ کی بیماری کا علاج بھی ان کے پاس ہے۔ یعنی جب کسی گائے یا بیل کے پیٹ میں گیس بھر جائے تو اسے سرسوں کا تیل پلایا جاتا ہے اس کے علاوہ اسی بیماری کے علاج کیلئے سفید زیرہ، گھی اور گڑ وغیرہ کو جوس دے کر انہیں پلاتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ اس کے پیٹ پر پانی ڈال کر دوڑاتے ہیں۔

زخم آنے کی صورت میں اس پر چونا لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح منہ کر (کراب) کی بیماری میں اس کیلئے روٹی دم کر کے کھلاتے ہیں یا پھر تعویذ لکھواتے ہیں۔

بھیڑ: بھیڑوں کی بیماریوں کے علاج کے سلسلے میں بھی اکثر دم درود اور خوردے، تعویذ پر تکیہ ہوتا ہے جیسے منہ کر، زژی (چیچک) وغیرہ، پھیپھڑوں کی بیماری کے علاج کے لیے بھیڑوں کو خورمالو (خشک شدہ خوبانی) کھلاتے ہیں۔

اسی طرح بروھل کی بیماری (جس میں بھیڑ کو چکر آتے ہیں) میں اس کے سر میں داغ لگائے جاتے ہیں۔ داغ جو ایک طرح جلانے کا عمل ہے قبض کی صورت میں، سرسوں کا تیل، سیاہ چائے اور گھی سے علاج کرتے ہیں۔ جبکہ دست کی صورت میں اسے خورمالو کھلاتے ہیں۔ اس بیماری کے علاج کیلئے لسی بھی پلاتے ہیں۔

گھوڑے: گھوڑے کی کھانسی کا علاج پشتون قبائل میں سرسوں کا جوش دیا ہوا تیل ہے یعنی اس تیل کو پکا کر گھوڑے کو پلاتے ہیں۔ اگر کہیں گھوڑے کو فالج ہو جائے تو اس کو پشتون بلا کا سایہ سمجھ کر مولوی کے پاس جا کر تعویذ لکھواتے ہیں اسی طرح پیشاب بند ہونے کی صورت میں بھی زیارات وغیرہ کی طرف رجوع کرتے ہیں یا پھر پتاشے کھلاتے ہیں۔ حساسیت کی صورت میں گھوڑے کو نمکین پانی سے نہلایا جاتا ہے۔

اُونٹ: اُونٹوں کی بیماریوں کے مقامی نام ہیں جن میں ایک "سرپہ" ہے جو یقیناً فارسی کے لفظ سرفہ یعنی کھانسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے کیونکہ اس میں اونٹ کی ناک بہتی ہے اور کھانسی ہوتی ہے تو اس صورت میں اس کا علاج دم ودرود سے کرتے ہیں پیشاب کی بندش کی صورت میں اونٹ کو سرسوں کا تیل یا گھی پلاتے ہیں۔ دوسری بیماری کو "مزغنک" کہتے ہیں اس میں اونٹ کا منہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج بھی دم درود سے کرتے ہیں۔

کوائف نامہ پروفیسر ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر

محمد انعام الحق کوثر کا تعلق علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ آپ نے 1954 میں فارسی زبان و ادب میں ایم اے کیا۔ اس سے پہلے 1953 میں پنجاب یونیورسٹی سے جے ڈی (ڈپلومہ ان جرنلزم) کیا۔ 1963 میں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد بلوچستان کے پہلے پی ایچ ڈی ہیں۔ 1956 میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں لیکچرار تعینات ہوئے۔ آپ پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہوئے تھے۔ 1970 سے 1980 تک گورنمنٹ کالج مستونگ گورنمنٹ ڈگری کالج لورالائی اور گورنمنٹ ڈگری کالج سبی کے پرنسپل رہے۔ کچھ عرصہ بلوچستان یونیورسٹی میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر کام کیا۔ 1980 سے 1985 تک آپ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اور سیکنڈری ایجوکیشن بلوچستان کوئٹہ کے چیئرمین رہے۔ اس دوران انٹر بورڈ کمیٹی آف چیئرمین اسلام آباد کے بھی چیئرمین رہے۔ بعدازاں 1991 تک اورنصابیات و مرکز توسیع تعلیم بلوچستان کوئٹہ کے ناظم تعلیمات کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

اعزازات: تقریباً 60 کے لگ بھگ انعامات حاصل کئے ہیں جس میں قابل ذکر یہ ہیں:

۱۔ سند ہمراہ 5000 روپے انعام کتاب "نبی کریمؐ کا ذکر بلوچستان میں" پر۔

۲۔ 14 اگست 1991 میں اعزاز فضلیت۔

۳۔ صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی، 23 مارچ 1998۔

۴۔ سات دیگر مختلف میڈل، جن میں سے ایک سونے کا تاج ہے۔

۵۔ اردو، فارسی، انگریزی زبانوں میں 114 کتابیں چھپ چکی ہیں۔

۶۔ ان کتابوں کے علاوہ 76 ٹیکسٹ بکس رہنمائے اساتذہ، تعلیمی اور سائنسی رپورٹیں وغیرہ شامل ہیں۔

۷۔ 600 سے زائد مقالات، فارسی، اردو و انگریزی میں۔

۸۔ آپ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے بلوچستان کی تقریباً تمام زبانوں کے ادب اور ثقافت پر عرق ریزی کی ہے۔

ملک سے باہر علمی مسافرتیں۔

قرآن مجید عالمی کانفرنس، نئی دہلی 1982، انگلستان کے یونیورسٹیوں کا دورہ 1990

فلپائن، جنوبی کوریا، سنگاپور، ملائیشیا، تھائی لینڈ کا دورہ

فردوسی کے ہزارویں یوم وفات کے عالمی سیمینار، تہران میں شرکت 1990

پاکستان کی یونیورسٹیوں سے ایم فل، پی ایچ ڈی کرنے والے طلباء و طالبات کے بطور سپروائزر اور جج خدمات انجام دیتے ہیں۔

دیگر سرگرمیاں:

کالجوں میں مجلس فارسی، انجمن ادبی وغیرہ کے صدر رہنے کے علاوہ صوبے کی بہت سی دیگر انجمنوں اور تنظیموں کے سرپرست اعلیٰ اور صدر رہے ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی خدمات کی تفصیل کا یہ ایک اجمالی تذکرہ ہے جبکہ بلوچستان، یہاں کی تاریخ وادب اور تعلیمی شعبے میں آپ کی خدمات کے تذکرے کے لئے پوری کتاب درکار ہے۔

کوائف نامہ: ڈاکٹر علی کمیل قزلباش

15 اپریل 1967ء کو لورلائی میں پیدا ہوئے، تہران یونیورسٹی سے "علامہ اقبال اور خوشحال خان خٹک کے تقابلی مطالعہ" پر پی. ایچ. ڈی کے علاوہ ایم اے اردو، ایم اے فارسی، ایم اے پشتو گولڈ میڈلیسٹ ہیں۔

زبانیں: ۱۔اردو ۲۔ فارسی ۳۔ پشتو ۴۔ انگریزی

پیشہ: محکمہ تعلیم بلوچستان، میں پشتو کے اسسٹنٹ پروفیسر اور خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران کوئٹہ میں فارسی کے استاد ہیں۔

دیگر شعبے:

کالم نگاری، روزنامہ مشرق کوئٹہ، "خبری اثری" اور "ادیب اوراریب" کے عنوان سے

انچارج ادبی صفحہ روزنامہ کوہستان کوئٹہ ایک سال

انچارج میگزین پشتو، فارسی حصہ روزنامہ کوہستان کوئٹہ ایک سال

مدیر مجلّہ "تماس" پشتو کے ان کی ادارت میں چھ شمارے شائع ہوئے۔

تخلیق و تالیف:

شاعری: غزل، نظم اور دیگر شعری اصناف

نثر: تحقیق، تنقید، افسانہ، خاکہ انشائیہ وغیرہ

تراجم: فارسی، عربی، بوسنی، افریقی، تاجکی، پشتو اور اردو ادبیات کے تراجم

شائع شدہ کتب:

۱۔ شاہکار پشتو افسانے، کلاسیک پبلشرز لاہور 1995

۲۔ نہج البلاغہ کا پشتو ترجمہ (امیر حمزہ شنواری) دانش و بینش پبلیشرز کوئٹہ 2002

۳۔ ایک اس کے آگے بے انتہا تک صفریں (ڈاکٹر علی شریعتی کی کتاب کا فارسی سے اردو ترجمہ) قلات پبلیشرز کوئٹہ 2003

۴۔ درکوچہ ماہ (خوشحال خان خٹک کی فارسی شاعری) مجلس اقبال اور شاد پبلیشرز 2006

زیر اشاعت کتب:

۱۔ جام جم (ایران کا سفرنامہ) ۲۔ خاکے (پشتو خاکوں کا مجموعہ)
۳۔ عشق علیہ السلام (اردو شعری مجموعہ) ۴۔ پشتو لوک کہانیاں
۵۔ پشتو شعری مجموعہ ۶۔ مقالات فارسی (مختلف مقالات کا مجموعہ)
۷۔ مقالات اردو،
۸۔ محمود درویش کی نظمیں (معروف فلسطینی شاعر محمود درویش کی نظموں کا اردو ترجمہ)
۹۔ فلسطینی شاعری (فلسطین اور دیگر عرب شعراء کی مزاحمتی شاعری کے تراجم)
۱۰۔ جدید فارسی نظمیں (جدید فارسی شعراء کی نظموں کے تراجم اور ان کا تعارف)
۱۱۔ دفتر سبز (ڈاکٹر علی شریعتی کی نظموں کے تراجم)
۱۲۔ شعر معز اللہ خان مومند (معز اللہ مومند "افغان" کی رثائی شاعری تحقیقی مقالے کے ساتھ)

اعزازات:

۱۔ ممبر اعزازیہ کمیٹی، آکادمی ادبیات پاکستان برائے (اردو و فارسی ادب) بلوچستان
۲۔ صدر مجلس اقبال پاکستان، کوئٹہ
۳۔ تہران میں فارسی استاتذہ کی دوسری عالمی کانفرنس میں مدعو اور شرکت
۴۔ تہران میں دورہ دانش افزائی میں شرکت اور اچھی کارکردگی
۵۔ شیراز (ایران) کے دوروزہ حافظ شیرازی کانفرنس میں شرکت 2003
۶۔ اہل قلم کیلئے حکومت ایران کی جانب سے دس ممالک کے دورہ ایران شناسی 1998 میں شرکت
۷۔ قلم برائے امن کانفرنس ہندوستان اسلامیہ یونیورسٹی، دہلی 2006 میں مدعو

اس کے علاوہ انگلستان، جرمنی، ایران، انڈیا اور پاکستان کے متعدد شہروں سے شائع ہونے والے مختلف رسائل وجرائد میں تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

ڈاک کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 531 کوئٹہ پاکستان
مستقل پتہ: مکان نمبر 156/157 معجزہ اسٹریٹ فیز ون، اے ون سٹی بروری روڈ کوئٹہ
فون: گھر: 081-2856942 موبائل: 0333-7846856

کوائف نامہ: غوث بخش

نام: غوث بخش

تخلص: صابر

ولدیت: صفر خان

تاریخ پیدائش: 29 مارچ 1938ء

تعلیم: ۱۔ فاضل فارسی ۲۔ فاضل بلوچی ۳۔ ایم اے بلوچی یونیورسٹی آف بلوچستان

باندانی: اُردو، فارسی، بلوچی، براہوئی، سندھی، سرائیکی، پنجابی

خدمات:

۱۔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ، ۲۔ بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ،

۳۔ لوک ورثہ اسلام آباد، ۴۔ اقبال آکادمی لاہور

۵۔ قائداعظم اکیڈیمی کراچی، ۶۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

۷۔ آکادمی ادبیات پاکستان ۸۔ یونیورسٹی آف بلوچستان

۹۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن اسلام آباد، ۱۰۔ بلوچستان ٹیکسٹ بورڈ کوئٹہ

۱۱۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۲۔ بائیو بیٹل آرمی اسکول کوئٹہ کینٹ

۱۳۔ پی ٹی وی کوئٹہ، ۱۴۔ پی ٹی وی لاہور، ۱۵۔ ادارہ ثقافت بلوچستان کوئٹہ

ایوارڈ:

۱) صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی، ۲) اقبال آکادمی شلیڈ

۳) ریڈیو پاکستان ۴) پی ٹی وی لاہور

۵) نقد ایوارڈ حکومت بلوچستان 25-11-2006

تصانیف و تالیف:

آپ مختلف موضوعات پر مشتمل ۳۷ کتابوں کے مصنف ہیں۔

کتابیات (صفحہ ا تا ۱۱۸)

۱) بلوچستان، قدیم وجدید کی روشنی میں- میر گل خان نصیر

۲) للہ وگراناز..... میر احمد بلوچ

۳) ذکری مسئلہ..... مولانا عبدالحق

۴) سہ ماہی "سچ" سید ظہور شاہ اکیڈیمی کراچی

۵) سہ ماہی "برمش"

۶) تاریخ وجغرافیائے بلوچستان- مولائی شیدائی

۷) تاریخ ہند..... سر ہنری ایلیٹ

۸) چاکر اعظم- محمد سردار خان گشکوری رمترجم عبدالغفار ندیم

۹) سفرنامہ مہدی- نیاز کیش عومرانی

۱۰) نقش بلوچستان- ڈاکٹر انعام الحق کوثر

۱۱) تذکرۂ صوفیائے بلوچستان- ڈاکٹر انعام الحق کوثر

۱۲) کشف المحجوب- حضرت سید علی ہجویریؒ- داتا گنج بخش

۱۳) ڈھاڈر تاریخ کے آئینے میں- ماہنامہ "بلوچی دنیا" ملتان- اکتوبر ۱۹۶۷ء

۱۴) سرمست بلوچستان- محترمہ ذکیہ سردار خان

۱۵) بلوچستان کی تاریخی اہمیت (انگلش) پروفیسر انور رومان

۱۶) بلوچ وبلوچستان- ماہنامہ بلوچی دنیا ستمبر ۱۹۶۶ء قاضی عبدالصمد سربازی

۱۷) سسّی پنوں (سندھی) ڈاکٹر این اے بلوچ

۱۸) بلوچستان کے قبائل- بلوچی دنیا ملتان- میر عاقل خان مینگل

۱۹) بلوچستان کے قبائل (ترجمہ گزیٹر) پروفیسر انور رومان

۲۰) ثقافت وادی بولان- عبدالصمد درانی، سلطان محمد صابر، ملک محمد رمضان اور میر مٹھا خان مری

۲۱) تحفۃ الکرام- میر علی شیر قانع ٹھٹھوی

۲۲) تاریخ معصومی- میر معصوم بکھری

۲۳) تاریخ بلوچستان رائے بہادر ہتو رام

۲۴) صدف صد رنگ- غوث بخش صابر

۲۵) پاپولر پوئٹری آف بلوچستان- مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز

۲۶) بلوچی کہنیں شاحری- میر شیر محمد مری

۲۷) درچین کلام جام درک- میر بشیر احمد بلوچ

۲۸) شیرین دوستین- میر گل خان نصیر (منظوم اردو ترجمہ غوث بخش صابر)

۲۹) مست توکلی- مرتب غوث بخش صابر

۳۰) بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی- میر گل خان نصیر

۳۱) درین..... عطا شاد رعین سلام

۳۲) بلوچی زبان وادب کی تاریخ- سید ظہور شاہ ہاشمی

۳۳) کرپاس ءکسہ- غوث بخش صابر

۳۴) بلوچی نامہ- عطا شاد

۳۵) مڈاول مکران- کرنل ٹی ایچ اولڈج

حوالہ جاتی کتب ورسائل (صفحہ ۱۱۹ تا ۲۴۵)

۱) ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی، براہوی نامہ، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1978ء
۲) ڈینس برے، براہوی رسم ورواج، گوشہ ادب کوئٹہ
۳) ڈاکٹر انعام الحق کوثر، تذکرہ صوفیائے بلوچستان، اردو سائنس بورڈ لاہور 2004ء
۴) پروفیسر انور رومان (مترجم انعام الحق کوثر) کوئٹہ قلات کے براہوی، قریشی پبلی کیشنز 1987ء
۵) پروفیسر انور رومان، براہوی لوک کہانیاں، ادارہ تصنیف وتحقیق، کوئٹہ 2005ء
۶) نینا سوڈلر (مترجم: جاوید اختر) براہوی آبادی کا سیاسی سیاق وسباق، براہوی اکیڈمی 2006ء
۷) جاوید اختر، براہوی ادب کا سماجی پس منظر، براہوی اکیڈمی 2003ء
۸) سلطان احمد شاہوانی، کنا خضدار، براہوی اکیڈمی 2006ء
۹) ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی، بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور ان کی حکومتیں، زمرد پبلی کیشنز 1990ء
۱۰) اے، ڈبلیو، ہیوگر (مترجم: انور رومان) سرزمین بلوچستان، نادر ٹریڈرز مستونگ
۱۱) غوث بخش صابر، بلوچی لوک داستانیں، بلوچی اکیڈمی 1996ء
۱۲) پروفیسر ڈاکٹر شاہ محمد مری، بلوچ سماج میں عورت کا مقام، سیو پبلیشرز کوئٹہ 2005ء
۱۳) میر گل خان نصیر، بلوچستان کی شاعروں کی زبانی بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 2005ء
۱۴) محمد سردار خان بلوچ (مترجم: انور رومان) بلوچ قوم کی تاریخ نادر ٹریڈرز مستونگ
۱۵) ملک سعید دہوار، بلوچستان ماقبل تاریخ، روبی پبلیشرز کوئٹہ
۱۶) پروفیسر انور رومان، بلوچستان کے قبائل روبی پبلیشرز کوئٹہ
۱۷) سلطان محمد صابر، بلوچستان، ہیواد پبلی کیشنز اسلام آباد 2005ء
۱۸) کامل القادری، مہمات بلوچستان، نساء ٹریڈرز کوئٹہ
۱۹) جسٹس میر خدا بخش بجارانی، بلوچستان تاریخ کے آئینہ میں، نساء ٹریڈرز کوئٹہ
۲۰) رشید الحق، قلات انیسویں صدی میں، نساء ٹریڈرز کوئٹہ
۲۱) اخوند محمد صدیق (مترجم: گل خان نصیر) تاریخ خوانین قلات، نساء ٹریڈرز کوئٹہ
۲۲) چارلس مسن (مترجم: انور رومان) سفرنامہ قلات، نساء ٹریڈرز کوئٹہ
۲۳) شفیق احمد عزیز، ادب لوک گیت اور کہانیاں، نیشنل بک فاؤنڈیشن 1999ء
۲۴) ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، سندھی لوک گیت، لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد 1985ء
۲۵) قیوم بیدار، براہوی زبان وادب، براہوی ادبی سوسائٹی مئی 1986ء
۲۶) ڈاکٹر فاروق احمد، بلوچستان میں اردو زبان وادب، بولان اکیڈمی لاہور، 1998ء
۲۷) عبدالرحمان کرد، براہوی ادب، بزم ثقافت کوئٹہ 1966ء
۲۸) نور محمد پروانہ، براہوی ثقافت، بزم ثقافت، کوئٹہ 1966ء
۲۹) گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، قلات پبلیشرز 2005ء
۳۰) نائلہ قادری، بلوچستان میں پیٹری آرکل رسم ورواج، ماہنامہ نوکین دور 1995ء
۳۱) ڈینس برے، سینیسس آف انڈیا بلوچستان، گورنمنٹ پریس کلکتہ 1911ء
۳۲) ملک رمضان، ثقافت وادی بولان میں، بزم ثقافت کوئٹہ 1966ء
۳۳) ناصر براہوی، سٹڈیز ان براہوی ہسٹری، ہیرالڈ پریس، کراچی 1977ء
۳۴) انور رومان، ایجوکیشن ان بلوچستان، گوشہ ادب کوئٹہ
۳۵) علی عباس جلالپوری، رسوم اقوام، خرد افروز، جہلم 1993ء
۳۶) عزیز بگٹی، بلوچستان، ادب، ثقافت اور سماج، سپنز پرنٹرز کوئٹہ 1995ء
۳۷) پیکولین (مترجم: شاہ محمد مری) بلوچ تخلیقات لاہور 1991ء
۳۸) شاہ محمد مری، بلوچ قوم قدیم عہد سے عصر حاضر تک، تخلیقات لاہور، 2000ء
۳۹) اختر بلوچ، مختصر تاریخ بلوچ وخوانین بلوچ، 1972ء
۴۰) عبدالرحمان غور، ہماری جدوجہد ادارہ ادب بلوچستان کوئٹہ 1954ء
۴۱) محمد اسلم بنگلزئی براہوی مڈی، براہوی اکیڈمی کوئٹہ 2002ء
۴۲) اشیر عبدالقادر شاہوانی، آئینہ خاران بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 1978ء
۴۳) ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی، براہوی اور اردو کا تقابلی مطالعہ، سندھ یونیورسٹی حیدر آباد، 1979ء
۴۴) کامل القادری، براہوی کہاوتیں، مجلس بشریات بلوچستان، 1974ء
۴۵) جی پی ٹیٹ، (مترجم: انور رومان) بلوچستان اور سیستان کے خدوخال، نساء ٹریڈرز 1984ء
۴۶) ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی، براہوی زبان وادب کی مختصر تاریخ، مرکزی اُردو بورڈ لاہور 1982ء
۴۷) کلیات ملا محمد حسن براہوی، مرتب ڈاکٹر انعام الحق کوثر
۴۸) جاموٹ قبائل کی تاریخ، نور احمد جاموٹ، محمود ابڑو

افراد، جن سے مشورے، کتب کی فراہمی، تراجم ورہنمائی کے لیے مدد لی گئی۔

۱) ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی:
وکیل بلوچستان ہائیکورٹ براہوی ادیب محقق، دانشور
۲) ڈاکٹر شاہ محمد مری:
اسسٹنٹ پروفیسر بولان میڈیکل کالج کوئٹہ، مدیر ماہنامہ "سنگت" بلوچ ادیب، محقق دانشور
۳) افضل مراد:
ریزیڈنٹ ڈائریکٹر اکادمی ادبیات پاکستان کوئٹہ، براہوی شاعر وادیب
۴) وحید زہیر:
انفارمیشن آفیسر محکمہ اطلاعات بلوچستان، براہوی ادیب وشاعر

DATA ENTRED

۵) سلطان احمد شاہوانی:
پروڈیوسر ریڈیو پاکستان خضدار، براہوی ادیب

۶) منظور بلوچ:
لیکچرار شعبہ براہوی، جامع بلوچستان، کوئٹہ

۷) شبیر شاہوانی:
لیکچرار شعبہ براہوی، جامعہ بلوچستان کوئٹہ

۸) مصطفیٰ حسین:
سندھی ادیب و ترجمہ نگار

۹) آصف لہڑی:
سماجی ورکر، پروگرام، آفیسر آئی ڈی ایس پی خضدار

۱۰) علی گل پندرانی:
سکول ٹیچر جعفر آباد، براہوی نوجوان شاعر

۱۱) باقی بلوچ:
طالبعلم جامعہ بلوچستان، نوجوان براہوی ادیب

۱۲) محمد فاروق:
نوجوان طالبعلم، کوئٹہ

لوک ورثہ اسلام آباد اور الفیصل ناشران لاہور کے مشترکہ اشاعتی پروگرام کے تحت
پاکستان کے ثقافتی انسائیکلوپیڈیا کے درج ذیل والیمز شائع کیئے جا رہے ہیں:

-- شمالی علاقہ جات

-- سرحد

-- بلوچستان

-- پنجاب

-- سندھ

-- پاکستان کی موسیقی اور موسیقاروں کا انسائیکلوپیڈیا

پاکستانی ثقافت، فنون اور صوفیاء کے حوالے سے کتابیں شائع کرنے کا منفرد مشترکہ
اشاعتی پروگرام

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

ISBN 969-503-737-2

Muhammad Ali
CAD LIBRARY P.U. LHR
8845

Rs: 2500

کتابیات (صفحہ ۳۸۲ تا ۳۸۶)

۱) اولس-(خصوصی نمبر) کوئٹہ، اکتوبر، نومبر، 1963

۲) اولسی انکلونہ-تالیف سید عابد شاہ عابد، پشتو اکیڈمی کوئٹہ، اشاعت دوم 2006

۳) اُردو کی تشکیل میں پشتونوں کا کردار-حنیف خلیل، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، سال 2006

۴) بلوچستان چند پہلو-ڈاکٹر انعام الحق کوثر، ادارہ تصنیف و تحقیق بلوچستان، کوئٹہ 2005

۵) بلوچستان آزادی کے بعد-ڈاکٹر انعام الحق کوثر / پروفیسر انور رومان، مشاورہ تعلیمی تحقیق، کوئٹہ اگست 1997

۶) بلوچستان ایک مطالعہ-ڈاکٹر انعام الحق کوثر، ادارہ تصنیف و تحقیق بلوچستان کوئٹہ 2007

۷) بلوچستان میں تعلیم پس منظر و پیش منظر-پروفیسر انور رومان ادارہ تصنیف و تحقیق، بلوچستان کوئٹہ 2005

۸) بلوچستان کے قبائل (ضلعی گزیٹر سے انتخاب) ترجمہ انور رومان، روبی پبلشرز کوئٹہ

۹) پشت کوہ قاف-محمد جواد فاوری، انتشارات سراج، تہران 1376

۱۰) پشتو نیات-پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ، انجمن ترقی پشتو پشین، اشاعت دوم 1994

۱۱) پشتو لوک ادب-محمد افضل رضا، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، فروری 1989

۱۲) پشتو نولی-قیام الدین خادم، پشتو ادبی غورزنگ، اشاعت دوم 2002

۱۳) پشتونوں کی تاریخ-پروفیسر انور رومان گوشہ ادب کوئٹہ

۱۴) تذکرہ صوفیائے بلوچستان-ڈاکٹر انعام الحق کوثر، اردو سائنس بورڈ، لاہور، اشاعت سوم 2004

۱۵) تاریخ و ثقافت ہزارہ-کوثر علی کوثر، یونائیٹڈ پرنٹرز، سال 2005

۱۶) داتن نارے-سید خیر محمد عارف پشتو اکیڈمی کوئٹہ، سال 2005

۱۷) دبلوچستان ضلعی گزیٹر (ضلع کوئٹہ پشین) ترجمہ: فاروق شاہ سائلزے، پشتو اکیڈمی کوئٹہ 1997

۱۸) دکوئٹی تاریخ-عبداللہ جان نورزئی، پشتو ادبی غورزنگ، کوئٹہ سال 2004

۱۹) دپشین لنڈ تاریخ-عصمت اللہ زہیر، پشتو ادبی غورزنگ، کوئٹہ 2004

۲۰) زموژ غازیان-سید خیر محمد عارف، پشتو اکیڈمی، کوئٹہ

۲۱) فولکلوری طب-پروفیسر سیال کاکڑ، پشتو ادبی دنیا، کوئٹہ 1974

۲۲) لرغونے بورے (لورالائی) تلخیص و ترجمہ: فاروق شاہ پشتو اکیڈمی بلوچستان، 1976

۲۳) ملی هیندارہ-محمد گل نوری، صدیقی کتب خانہ کوئٹہ 2005

۲۴) نقوش بلوچستان-ڈاکٹر انعام الحق کوثر، ادارہ تصنیف و تحقیق بلوچستان، کوئٹہ 2005

شخصیات (جنہوں نے تعاون فرمایا):

۱) پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر-معروف علمی و ادبی و سماجی شخصیت

۲) پروفیسر فضل داد جلالزئی-سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج، لورالائی

۳) سید خیر محمد عارف-معروف ادیب، شاعر، محقق

۴) عبدالصمد جلالزئی-لیکچرار نفسیات، ڈگری کالج لورالائی

۵) خلیل باور-لیکچرار پشتو، ڈگری کالج کوئٹہ

۶) عصمت اللہ زہیر-پشتو کے ادیب، شاعر و مترجم

۷) صادق زڑک-لیکچرار پشتو، گورنمنٹ کالج خانوزئی

۸) تاج الدین اوتمانخلیل-سماجی و سیاسی شخصیت

۹) قاری جمال الدین مسافر-پشتو کے شاعر و ادیب

۱۰) سید اسد اللہ علوی-لائبریرین، خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران، کوئٹہ

۱۱) شازیہ واحد-لائبریرین، آئی ڈی ایس پی بلوچستان

۱۲) سلیم الحق-ٹیچر ٹیکنیکل سکول کوئٹہ

DATA ENTRED